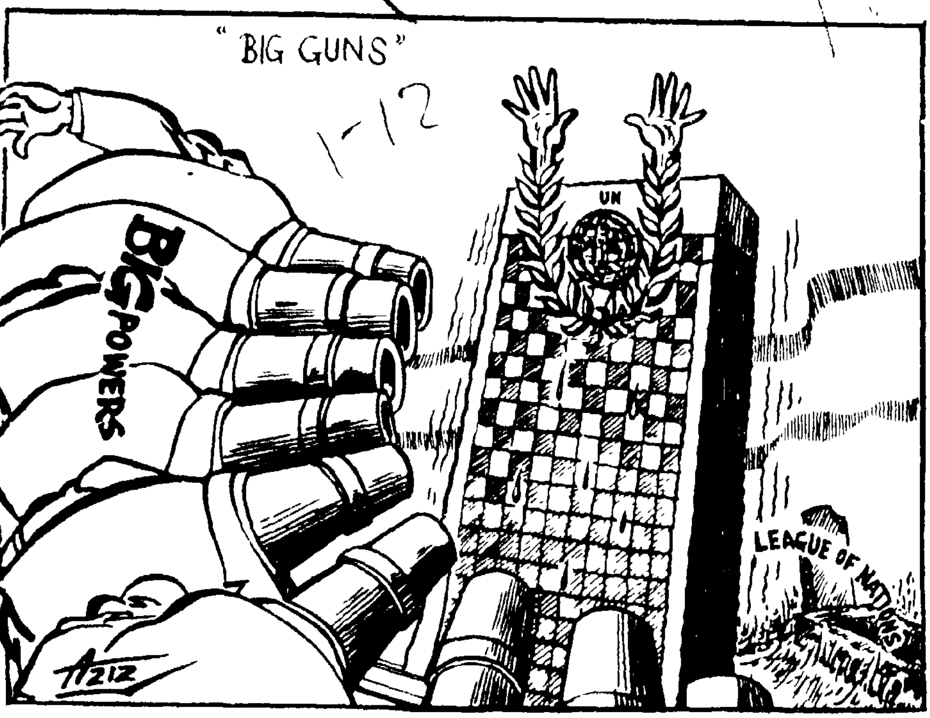
ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد





سالنامہ

Rs 15/-

قیمت ۱۵ روپے

نوری ۱۹۹۷ء


TO HEALTH

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

سالنامہ

جنوری / فبروری ۱۹۹۷ء

جلد : ۳۰ شمارہ : ۱، ۲

ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت : محمود سلیم ۔ محمد غالب ۔ عبدالرؤف

طباعت : دائرہ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت : ۱۵ روپے
سالانہ خریداری : ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱
فون آفس : 595716 رہائش : 4576064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

دخل در نامعقولات (کہانیاں)

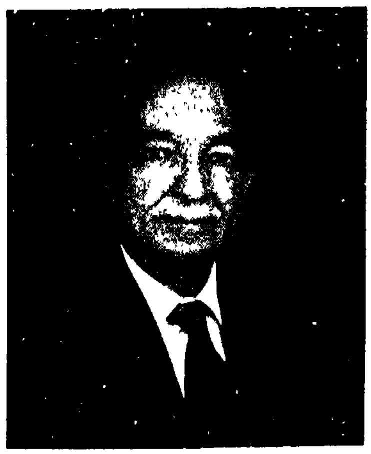
چورن (منظومات)



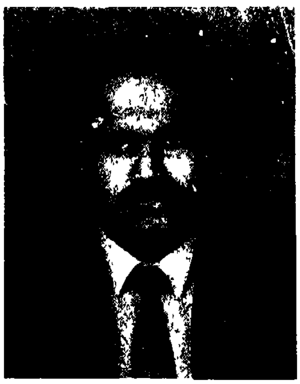
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
رکن مشاورتی کمیٹی، شگوفہ



جناب ایم اے باسط آئی پی ایس
رکن مشاورتی کمیٹی، شگوفہ



جناب حسن چشتی (شکاگو)
رکن اوورسیز کمیٹی



ڈاکٹر عابد مُعز
ایڈیٹر اوورسیز



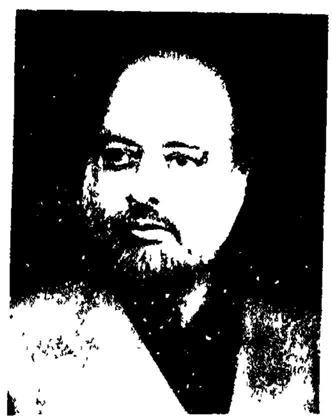
جناب یوسف ناظم



جناب مجتبیٰ حسین



حمایت اللہ



جناب پرویز یداللہ مہدی



جناب مسیح انجم



جناب محمد علی رفعت



ڈاکٹر حبیب ضیاء



ڈاکٹر راہی قریشی



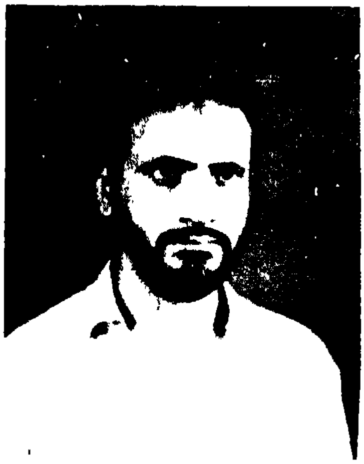
ڈاکٹر محبوب راہی



ڈاکٹر عباس متقی



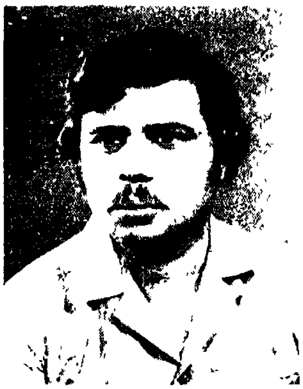
اقبال شانہ



اقبال ہاشمی



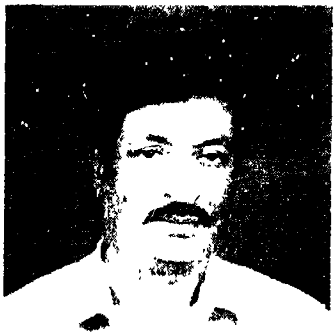
جناب طالب حسین زیدی



رؤف رحیم



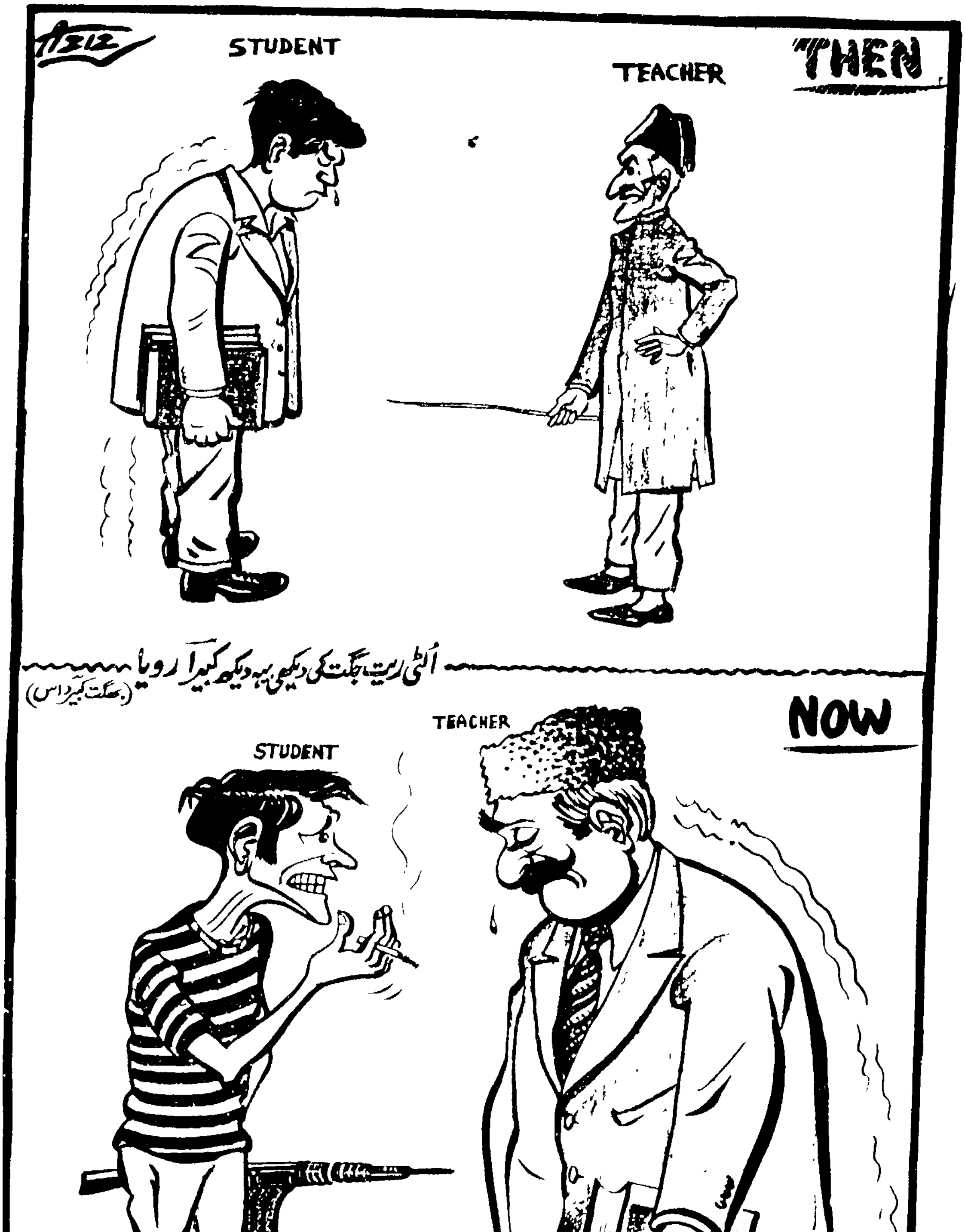
جناب رشید الدین



جناب رحیم الدین توفیق

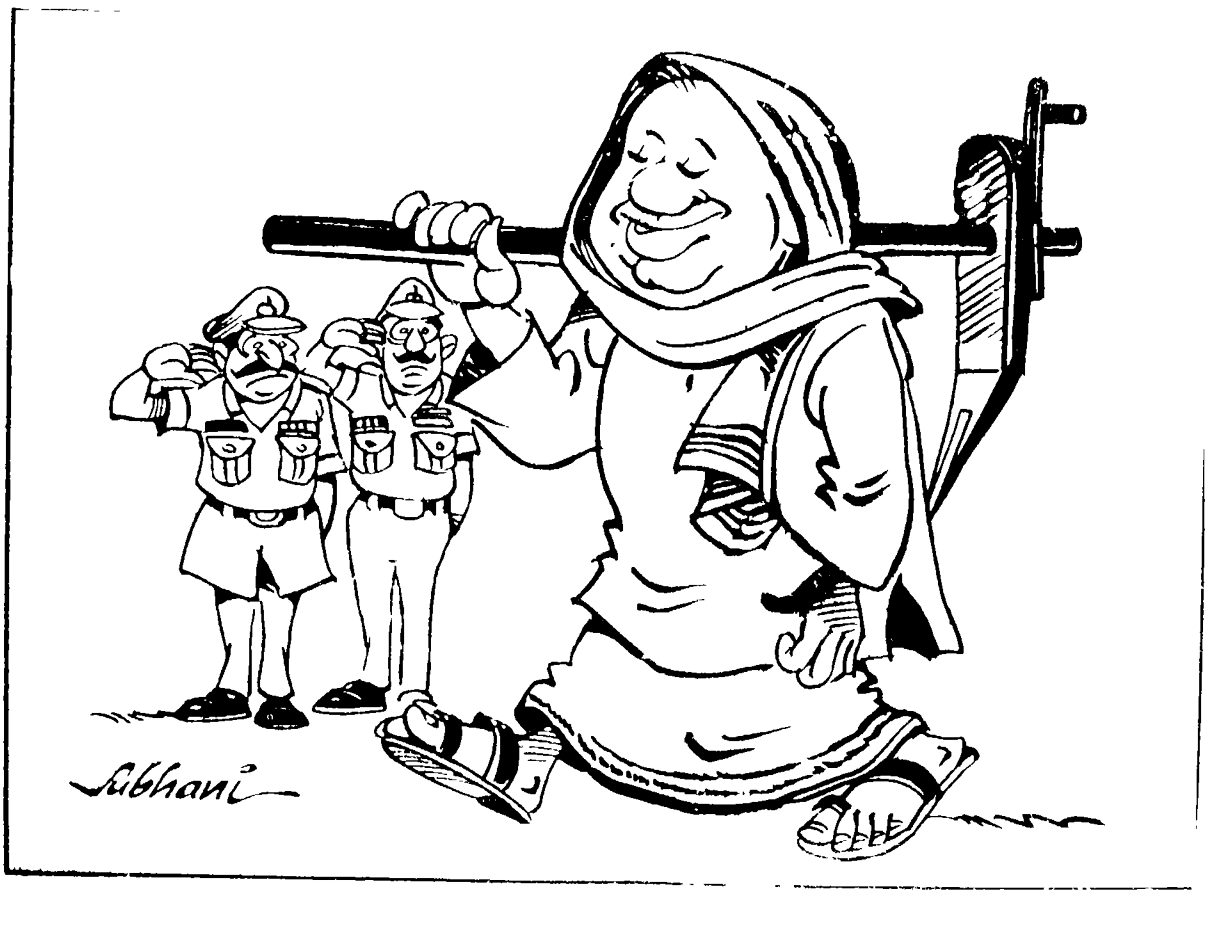
عزیز کارٹونسٹ (حیدر آباد) کے، چند کارٹون




THEN
STUDENT
TEACHER
اُلٹی ریت جگت کی دیکھی یہ دیکھ کبیرا رویا
(بھگت کبیر داس)
NOW
STUDENT
TEACHER

THE PROMISING NATION





ہوتی۔ پالتو جانور کسی صورت میں بھی سامان برائے فروخت نہیں ہوتے۔ ایک شریف آدمی خود بک جائیگا لیکن اپنے پالتو جانور کو نہیں بیچے گا۔ پالتو جانوروں کی ایک مخصوص حیثیت ہوتی ہے اور یہ سارے افراد خاندان کے نور نظر ہوتے ہیں۔ بچے ان پر جان چھڑکتے ہیں اور بڑے ان کی ایسی پالتو جانوروں کی تربیت کے لیے جان توڑ کوشش کرتے ہیں کہ کہیں یہ تمیز داری اور سلیقے کے معاملے میں ان کی اولاد سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ (کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ پالتو جانور آگے نکل گئے ہیں (تو صبر اور تن دہی) سے یہ سانحہ تو بہت کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو تو سخت وسست [illegible] کہتے ہیں (اگلی صدی میں یہ نہیں ہو سکے گا) لیکن پالتو جانوروں کے ساتھ ان کا رویہ بہت [illegible] اور محبت آمیز ہوتا ہے۔ خاص طور پر اپنے پالتو کتے پر تو ان کی شفقتیں موسلا دھار بارش کی طرح برستی رہتی ہیں۔ پالتو جانوروں تو بے زبان ہوتے ہیں لیکن انسانوں کی زبان سمجھنے کی ان میں بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ پالتو کتے زیادہ تر انگریزی داں ہوتے ہیں۔ انھیں اسی زبان میں بلایا، بہلایا اور دھمکایا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ زبان ان کی گھٹی میں پڑ جاتی ہے۔ کسی دوسری زبان میں ان سے باہر جانے کے لیے کہا جائے تو وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ بس دم ہلاتے کھڑے رہتے ہیں۔ زبان الگ منہ سے باہر لٹکی رہتی ہے۔ شاید یہ بتانا چاہتے ہوں کہ وہ کتنے لمبے زبان ہیں۔ (ان کی یہ ادا سیٹھ کو بہت پسند آتی ہے) کوئی بچہ سیٹھ کا کہنا نہ سنتا تو شاید وہ اس کی گوشمالی کر دیتے۔

پالتو جانوروں میں کتوں کو اولیت حاصل ہے۔ ان دنوں مہنگائی اتنی نہیں تھی جتنی کہ اب ہے۔ تو ایک پالتو کتے پر جو معمولی جسامت کا ہو پانچ سو روپے خرچ ہوتے تھے۔ خرچ کا یہ تخمینہ کسی اونچی نسل کے کتے کا نہیں ہو سکے ماہانہ مصارف تو بہت ہوتے ہیں [illegible] الگ۔ اس کتے کے ساتھ نوکروں کا برتاؤ بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خود اس کی خدمت پر ایک نوکر مامور ہوتا ہے۔ پالتو کتا بجائے خود ایک علیحدہ مضمون ہے جس کی جزئیات بیان کرنے کے لیے خاصا وقت اور خاصی اسٹیشنری درکار ہے اور اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ یہ مضمون کسی ایک ادیب کے بس کا ہے نہیں۔ اسی لیے اس موضوع پر جتنے مضامین اور مقالے لکھے جا چکے ہیں اتنے تو خود کسی ادیب کے بارے میں نہیں لکھے گئے ادیب کے دن کبھی نہیں پھرتے صرف ادیب پھرتے رہتے ہیں۔ [illegible] جو شخص یہ سمجھتا ہے وہ ایک کتے کا مالک ہو گیا اس کی غلط فہمی جلد دور ہو جاتی ہے۔

پالنے کو تو بکری بھی پال لیتے ہیں لیکن بکری کو ہم نشینی کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسے کتنا ہی دھلاؤ، نہلاؤ، اس کی مہک برقرار رہتی ہے۔ جوں جوں بکری کی عمر بڑھتی ہے اس کی مہک میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ بکری کے نومولود بچوں کو گود میں لیا جا سکتا ہے۔ لیکن چند دنوں کے لیے خرگوش پالنے میں بھی یہی دقتیں پیش آتی ہیں اور خرگوش گو کہ شکل و صورت اور جسامت کے لحاظ سے گوارا جانور ہے لیکن پالتو جانور کی حیثیت میں اسے مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس لیے پالتو جانوروں میں دوسرے نمبر پر اگر کوئی چوپایہ ہے تو وہ بلی ہے۔ ایسی مخلوق کا نام جو ہر گھر میں پایا جاتا ہے بلی کسی عمر کی بھی ہو شیر خوار رہتی ہے۔ اس کے لیے الگ دودھ کا بات مقرر کرنا ہوتا ہے۔ انھیں بلیاں دودھ کی

شناخت کی ماہر ہوتی ہیں۔ ان کی خدمت میں ایسا ویسا دودھ نہیں پیش کیا جاسکتا۔ ٹون دودھ کو تو یہ منہ ہی نہیں لگاتیں۔ ان کے لیے ایک سیکل سوار راست طبیلے سے دودھ لے کر آتا اور دروازے پر آواز دیتا ہے یا سیکل کی گھنٹی بجاتا ہے۔ بلی جو رات بھر کی جگی ہوئی ہوتی ہے سوتے سوتے چونک پڑتی ہے۔ دودھ کے اس خرچ کے باوجود بلی کتے کے مقابلے میں سستی پڑتی ہے۔ وقت آتا ہے تو بچے بھی بہت دیتی ہے جو رشتہ داروں کے علاوہ پڑوسیوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ بھوکی بلی ایک بھوکے آدمی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اکثر بلیاں اپنے ہی بچوں کو کھا کر جوان رہتی ہیں۔ پالتو بلیوں کو چوہے . . . . پکڑنے کا بھی شوق نہیں ہوتا حالانکہ چوہے انہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ کیوں یہ آزادی کے ساتھ ایک سمت سے دوسری سمت میں دوڑ لگانے والے چوہے کافی طاقت ور ہوتے ہیں۔

یہ بات بلیاں بھی جانتی ہیں۔ وہ گھر میں ہی رہنا پسند کریں گی لیکن تلاش معاش میں گھر کے دروازے کے باہر نہیں جھانکیں گی اور اگر کبھی باہر گئیں بھی تو بھیگی بلی بن کر منہ لٹکائے واپس آجائیں گی۔ لیکن کوئی بھی بلی اپنے پیٹ پر پتھر نہیں باندھ سکتی۔ ان کا ایک پیٹ کم ہو جاتا ہے۔ جس کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

جس طرح اچھے اور اعلیٰ درجے کے کتے باہر سے منگوانے پڑتے ہیں۔ اسی طرح عمدہ بلیاں بھی باہر سے منگوائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایرانی بلیوں کو مثالی شہرت حاصل ہے اور ہمارے یہاں جس گھر میں ایرانی بلی پلی ہوتی ہے اس گھر کی شہرت سارے شہر میں ہو جاتی ہے۔ ایرانی بلی نظر آئے نہ آئے لوگ اس گھر کے سامنے سے گزرتے ضرور ہیں۔ یہ بلیاں بے حد نرم گداز اور ذہین ہوتی ہیں۔ تعجب ہے ان بلیوں کو فر کوٹ وغیرہ کے سلسلے میں کبھی استعمال کیا جاتا۔ یہ تو فارن ایکسچینج کمانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ پالتو بلیاں زیادہ بردبار نہیں ہوتیں۔ جب کسی اندرونی وجہ سے غصے میں ہوتی ہیں تو صرف غراتی نہیں پنجہ مارتی ہیں اور اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کرتیں کہ جس گھر میں وہ زیر پرورش ہیں اس گھر کے افراد سے ہوئی کسی بیمار پر بلا ہے۔ وہ اس غریب مریض پر بھی پنجہ جھاڑ دیتی ہیں۔

یہ پنجہ نہ صرف تکلیف دہ ہوتا ہے بلکہ بلیوں کے ساتھ کھیلنے کا دم خم یعنی اسٹیمینا کم ہی ہوتا ہے یہ بہت جلد اوب جاتی ہیں۔ بالتو کتا تو چاہتا ہے کہ بچے اس کے ساتھ کھیلتے ہی رہیں۔ بچہ ۱۵ بار بھی گیند پھینکے تو کتا اسے واپس لا کر دیتا ہے کہ لو اور پھر پھینکو، بعض وقت تو شبہ ہوتا ہے کہ بچہ کتے کے ساتھ کھیل رہا ہے یا کتا بچے کو ورغلا رہا ہے۔ کتوں کے اسی شوق اور لگن کی وجہ سے ان کی صحت جسمانی کے علاوہ سو میٹر کی دوڑ کے مقابلے مقرر کیے جاتے ہیں اور شہر کی معزز شخصیتیں اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر کتوں کی ان حرکتوں سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر عوام الناس بھی کثیر تعداد میں موجود رہتے ہیں۔ بلیاں اس اعزاز سے محروم ہیں اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے۔ خالص گھریلو چیزیں ہیں اور زنانہ صحبتوں میں خوش رہتی ہیں اور شاید اسی لیے ان کی عقل و فراست محدود ہوتی ہے۔ زیادہ کرتب وغیرہ بھی نہیں دکھاتیں۔ جس تربیت یافتہ کتے کو کسی مقابلے میں انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے اس کے سرپرست کو کتے کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہو کر کتے کی طرف سے انعام حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ لمحہ بڑا نازک اور منظر بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ انعام لیتے وقت دونوں کی باچھیں

لکھی ہوتی ہیں [illegible]

[illegible] خوبی ہے طوطوں میں لسانی تعصب نہیں ہوتا۔ یہ ہر زبان سیکھ لیتے ہیں [illegible] سہولتوں کی وجہ سے ایک ہی گھر میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں [illegible] بولی لیتے ہیں۔ (طوطا کچھ بھی کہے صاحب خانہ اپنے ملاقاتیوں کو بتاتا ہے [illegible] بول رہا ہے۔ دوسرے مجھے طوطا اپنے روسی جملے کا فارسی ترجمہ پیش کرتا ہے [illegible] آدمی کے مقدر میں نہیں لکھی ہوتی۔ طوطوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ [illegible] بھی اور صحیح بولتے ہیں ورنہ ہم جیسے لوگ تو بولتے بھی غلط اردو میں ہیں اور لکھتے وقت غلطیوں کا [illegible] ساری غلطیاں کاتبوں کے کھاتے میں جاتی ہیں۔ طوطوں کو [illegible] صورت پنجرہ چاہیے جس کی تیلیوں سے نہ صرف دھوپ چھن کر اندر آئے [illegible] ہو کہ "چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی"۔ پنجرے میں ایک چھوٹی سی [illegible] پنجرے سے باہر نہ آسکے۔ اس پرندے کو ہری مرچیں اور بچوں کی انگلیاں بہت پسند [illegible] کوئی بچہ اسکول نہیں جانا چاہتا طوطے سے مدد طلب کرتا ہے۔ طوطا دل ہی دل میں [illegible] آواز بلند ہوتا ہے "سلمان میاں اسکول جاؤ اور سلمان میاں شرمندہ ہو کر اپنی [illegible] جس طرح [illegible] مقرر اپنے الفاظ واپس لیتا ہے۔ طوطے بہت ذہین طلبا [illegible] کے موقع پر استعمال کرنے لگے ہیں اور انھیں سکھا پڑھا [illegible] کے بارے میں مغلظات تک کہلوانے لگے ہیں [illegible]

[illegible] طوطوں پر نہیں ہوا ہے ورنہ وہ امیدوار جس کے حق میں یہ طوطا [illegible] سال کے لیے نااہل قرار دے دیا جاتا۔ (یہ نااہلی مستزاد ہوتی) پالتو [illegible] نقب اور چوری کی وارداتوں کا بھی سدباب کیا ہے اور عین وقت پر چور [illegible] جس راستے آئے تھے اسی راستے سے خالی ہاتھ واپس چلے گئے خاموشی [illegible] دیتا۔ طوطوں میں حفظ کرنے کے علاوہ تخلیقی صلاحیت [illegible] ضرورت کے وقت استعمال کر [illegible] پرندے کو طوطا چشم کہہ کر خواہ مخواہ بدنام کیا ہے۔ یہ تو اس کی [illegible] کی صحبت میں سیکھی ہے۔ طوطوں کو اتفاق سے ایسے لوگوں کے [illegible] طالب علموں کے امتحانی پرچے جانچنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں وہ پرچے [illegible] طالب علموں کی قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ پرچے پر جب نظر ثانی کروائی [illegible] طالب علم اعلا نمبروں سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ کون سی چشمی ہے؟ (طالب علموں نے اسے [illegible] کا نام دیا ہے)

[illegible] ایک پالتو جانور خواہ بلی ہو یا کتا کافی ہونا چاہیے۔ گھر کے سبھی

لوگوں کی ضرورتیں اس ایک پالتو جانور کی موجودگی سے پوری ہو سکتی [illegible] چند دن کے مہمان اور ملاقاتی بھی اس جانور سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔ بلی تو خیر [illegible] ہو جاتا ہے اور اتنا کہ بعض صورتوں میں میزبان کو مداخلت کرنی پڑتی ہے [illegible] ہوتے کے علاوہ مہمان کا بھی قبضہ ہو جاتا ہے۔ چند گھروں میں ایک سے [illegible] شروع شروع میں تو ان کے تعلقات خاصے کشیدہ ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ایک چھت کے نیچے رہنے کی بنا پر ان میں بین مخلوقاتی یک جہتی کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ خوش دلی کے ساتھ آپس میں شب و روز گذارنے کا عہد کر لیتے ہیں۔ جن گھروں میں مرغیاں پلی ہوتی ہیں وہاں کا منظر نامہ مختلف ہوتا ہے اور اگر کسی دن کوئی بلی اپنا موڈ خراب ہونے کی وجہ سے کسی مرغی یا اس کی اولاد پر جھپٹے تو گھر [illegible] کمزور فریق کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ خود مرغیاں بلی پر اتنی [illegible] کے بغیر گھر ایوانِ بالا بن جاتا ہے۔ بلی بار ندامت سے سر جھکا کر [illegible] عام تو نہیں لیکن انہونے بھی نہیں ہیں۔ پالتو جانور گھروں کی رونق ہوتے ہیں [illegible] ہے اگر کتے اور بلی کی پرورش کی استطاعت نہ ہو تو [illegible] عمل ہے کم خرچ بالانشین۔ بالانشین اس لیے کہ طوطا چھت سے [illegible] ہوتا ہے پنجرے کو فرش پر رکھ دیا جائے تو طوطا اسے اپنی ہتک سمجھتا [illegible] کی حیثیت اصل میں ایک معلق اسمبلی کے اسپیکر [illegible] خود ساختہ اسپیکر [illegible] پیدا کرتے یہ عوام الناس کی طرح ہوتے ہیں اور انھیں تو مرچیں تک نہیں [illegible] کہ پنجرے کا دروازہ کھول دینے پر بھی الٹے پاؤں پنجرے میں واپس چلے [illegible] ●●

اِسکرو (SCREW)

طالب خوندمیری

ذرا سی چیز ہے یہ جس کو اِسکرو کہیئے
یا چوبِ خشک کا کارِندۂ رفو کہیئے
کلوں کو جوڑ کے رکھنا ہی اس کی خُو کہیئے
اِسے تو صنعت و حرفت کی آبرو کہیئے

کہ یہ بگاڑ مشینوں کے رائٹ کرتا ہے
کسی کی چوُل ہو ڈھیلی تو ٹائٹ کرتا ہے

جکڑنا، کسنا، اسی کا کمال ہوتا ہے
پکڑ سے اس کی کھسکنا محال ہوتا ہے
اِسی سے ٹھیک مشینوں کا حال رہتا ہے
محاورے میں بھی یہ اک مثال ہوتا ہے

وہ بدنصیب کہ بھیجہ خراب ہو جس کا
تو لوگ کہتے ہیں "ڈھیلا ہے اِسکرو اس کا"

وہ بس ہو، کار ہو، سیکل ہو یا ہو اسکوٹر
فرج ہو، فیان ہو، ٹی وی ہو یا ہو فرنیچر
یہی تو رکھتا ہے اِن سب کو ٹھیک حالت پر
کہ جوڑ جوڑ کو کستا ہے ان میں گھس گھس کر

پلنگ، تخت، تپائی میں، میز کرسی میں
لگا ہوا ہے یہ سب کی مزاج پُرسی میں

یہ ہر مشین کی ہے اوّلیں ضرورت بھی
ہے اِس سے کاریگری میں بڑی سہولت بھی
اسی کے پیچ سے پُرزوں میں ہے رفاقت بھی
بہت حقیر ہے، لیکن ہے جانِ صنعت بھی

اگر یہ اپنی جگہ سے کبھی نکل جائے
تو پھر مشین کے پُرزوں کی ناف ٹل جائے

کچھ اِس طرح سے یہ پُرزوں کو باندھ رکھتا ہے
جگہ سے اپنی سرکتا، نہ کوئی ہٹتا ہے
اگرچہ سب کو یہ سختی سے داب سکتا ہے
اِک اور ٹول ہے جس سے یہ خود بھی دبتا ہے

یہی تو "اسکرو ڈرائیور" گرو ہے اِس کا بھی
کبھی گرفت سے اس کی کہیں یہ کھسکا بھی؟

جنھیں نہیں ہے کوئی اِسکرو کا اندازہ
بھگت رہے ہیں تجاہل کا اپنے خمیازہ
نہ اُن کی کھڑکی سلامت، نہ کوئی دروازہ
بکھرتا رہتا ہے اُن کے مکاں کا شیرازہ

ہمیشہ رہتے ہیں سب جوڑ ان کے ڈھیلے سے
جو لوگ کام چلاتے ہیں صرف کیلے سے

نہ جانے ذہن میں ایسا خیال کیوں اُبھرا
جو خواب میں بھی ہمیں آج تک نہیں سُوجھا
عجب طرح کا تھا وہ خیال کچھ ایسا
کہ اِسکرو سے کرشمہ یہ ہو گیا ہوتا

ہماری سمت بھی پیچ اس کے مڑ گئے ہوتے
مدد سے اس کی ہم آپس میں جُڑ گئے ہوتے

مجتبیٰ حسین

تھوکنا منع ہے

ممبئی شہر کا انتظامیہ اِن دنوں ممبئی کو صاف ستھرا شہر بنانے کی خاطر مختلف تجویزوں پر غور کر رہا ہے ان میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جو کوئی بھی ممبئی کی سڑکوں پر تھوکتا ہوا پایا جائے گا اس پر بھاری جرمانہ عاید کیا جائے گا۔ تجویز تو خیر بہت اچھی ہے لیکن اگر اس تجویز پر سختی سے عمل کیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس سے ممبئی میں سیر و سیاحت کے کاروبار پر بُرا اثر پڑ جائے گا۔ ممبئی ملک کے ان شہروں میں ہے جہاں آدمی صرف فلموں میں کام کرنے کے لیے نہیں آتا بلکہ چوپاٹی اور میرین ڈرائیو کے دلفریب نظاروں کو بھی دیکھنے جاتا ہے۔

یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ تھوکنا اور بسا اوقات تھوکے ہوئے تھوک کو پھر سے چاٹنا ہمارا محبوب مشغلہ ہے ہمارے ایک دوست ہیں جن کے بچے امریکہ میں آباد ہیں۔ بچوں نے انھیں کئی بار امریکہ آنے کی دعوت دی لیکن یہ محض اس خیال سے امریکہ نہیں گئے کہ وہاں تھوکنے اور بے دریغ تھوکنے کی آزادی نہیں ہے۔ جس ملک میں آدمی کو اپنا تھوک اپنے منہ میں ہی رکھنا پڑے وہاں جاکر کوئی کیا کرے۔ ایک دن ہم نے انھیں اس مسئلہ پر منانے کی کوشش کی تو اتنے خفا ہوئے اور کچھ اس زور و شور سے ہم سے بحث کی کہ ہمیں گھر جاکر بڑی دیر تک اپنا چہرہ دھونا پڑا۔

ہمارے ایک اور دوست پہلے تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں وہ مرنے کے بعد جنت میں جائیں گے اور اوپر سے جنت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کے مطابق جنت میں جہاں جگہ جگہ دودھ اور شہد کی نہریں ہونگیں انواع اقسام کے پھلوں کے درخت ہوں گے، حوریں تو خیر ہونگی ہی وہیں جگہ جگہ نفیس اُگالدان بھی رکھے ہونگے کہ موقع آنے پر تھوکنے وغیرہ کی سہولت رہے۔ ایک بار ہم نے ان سے کہا کہ میاں ان دنوں دنیا کے حالات اتنے خراب ہوتے جارہے ہیں اور زندگی اتنی اذیت ناک ہوتی جارہی ہے کہ اگر آدمی مرنے کے بعد دوزخ میں بھی چلا جائے تو وہاں انشاء اللہ خوش رہے گا۔ پھر ہم نے انھیں یہ قصہ بھی سُنایا کہ ایک صاحب نے ایک ایسا طریقہ دریافت کیا تھا جس کی مدد سے روحوں سے بات چیت کی جاسکتی تھی۔ ایک خاتون نے ان صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی روح سے بات چیت کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ کچھ دیر بعد خاتون کے مرحوم شوہر کی روح سے رابطہ قائم ہوگیا اور دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ کچھ اس طرح کی تھی۔

خاتون نے پوچھا "کہیے آپ کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں"؟

شوہر کی رُوح نے جواب دیا "بہت اچھا ہوں اور بہت مزے میں ہوں"۔

خاتون نے پھر پوچھا "کیا تم اتنا ہی مزے میں ہو جتنا کہ دنیا میں رہا کرتے تھے؟"
شوہر نے کہا "بے شک۔ بہت خوش ہوں اور آرام سے ہوں۔"
خاتون نے پوچھا "اچھا یہ بتائیے جنت کیسی جگہ ہے؟ وہاں اور کیا کیا آرام اور سہولتیں ہیں؟"
اس پر شوہر کی روح نے کہا "ڈارلنگ! میں جنت سے کہاں بول رہا ہوں۔ میں تو دوزخ سے بول رہا ہوں"۔
اتنا سنتے ہی خاتون نے اپنے شوہر کی روح سے تعلق کو منقطع کرلیا۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ معترضہ تھا جو اچانک یاد آگیا۔ بات تھوکنے کی عادت اور اس سے متعلق سہولتوں کی ہو رہی تھی۔ بعض لوگ ہر جگہ تھوکنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں جہاں یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ "یہاں تھوکنا منع ہے" وہاں وہاں لوگ سب سے زیادہ تھوکتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک صاحب کو جو ایسی ہی ایک عبارت کے نیچے تھوکنے میں مصروف تھے ٹوکا تو بولے "قبلہ! میں اس عبارت کی تختی پر تھوڑی تھوک رہا ہوں۔ میں تو اس تختی کے نیچے تھوک رہا ہوں۔ کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے"۔

خدا نے ہر قوم کے ہر فرد کے منہ میں تھوک کا لعاب بننے کی گنجائش فراہم کر رکھی ہے لیکن اس کے باوجود اس نعمت سے جتنا ہم ہندوستانی فائدہ اٹھاتے ہیں اتنا کوئی اور قوم نہیں اٹھا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم کا زیادہ تر وقت تھوک کے لعاب کو اپنے منہ میں پیدا کرنے اور حتی الامکان اس کی ذخیرہ اندوزی کرنے اور پھر جب صورتحال بے قابو ہو جائے تو اس لعاب کو منہ سے باہر نکالنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ بعض لوگوں نے تھوکنے اور اس سے متعلق بعض سرگرمیوں کو باضابطہ ایک فن بنا دیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض افراد پان کی پیک کو تو اپنے منہ میں جمع کر کے بات کرنے میں ایسی مہارت حاصل کر لیتے ہیں کہ بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر بات کرتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ آپ سے نہیں بلکہ آسمان سے باتیں کر رہا ہو۔

اس معاملہ میں بھی ہمارے ایک دوست نے مزید تحقیق کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پان کی پیک کو اپنے منہ میں جمع کر کے صرف اردو زبان میں ہی بات کر سکتے ہیں کسی اور زبان میں نہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ پان کھانا اور اس سے متعلق لوازمات اردو تہذیب کی دین ہیں۔ انھوں نے جب کبھی اس حالت میں انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آیا۔ ایک بار ہم نے جان بوجھ کر اس حالت میں ان سے انگریزی میں بات کی اور نتیجہ میں گھر آکر ہمیں خود اپنے کپڑوں کو دھلوانا پڑا۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان کا صوتی مزاج اور آہنگ ہی کچھ ایسا ہے جو پان کھانے والوں کو ہی راس آتا ہے بلکہ جو آدمی پان نہیں کھا سکتا اسے اردو بولنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل زبان پان کھاتے اور پان کی پیک کو اگالدان میں انڈیلتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ہم انھیں کیا سمجھاتے کہ ایسی ہی باتوں کی وجہ سے تو اردو زبان کی یہ حالت ہوتی جارہی ہے۔ غرض اردو زبان اور تھوکنے کا رشتہ کچھ اتنا پرانا اور اٹوٹ ہے کہ بارہ تیرہ برس پہلے جب ہمیں لندن جانے کا موقعہ ملا اور وہاں کے ہیتھرو ایرپورٹ پر اترے تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوگیا کہ وہاں جگہ جگہ اس عبارت کی تختیاں نظر آئیں کہ "یہاں تھوکنا منع ہے"۔ ہم انگریزوں کی رواداری کے قائل ہو گئے کہ وہ اپنے ملک میں بھی ہماری اردو کو اس کا جائز مقام دے رہے ہیں۔ مگر جب بعد میں غور کیا کہ اس عبارت کے علاوہ کسی اور عبارت کی تختی ہیتھرو ایرپورٹ پر اردو میں موجود نہیں ہے تو ہمیں احساس ہوا کہ ... اردو زبان میں ہی اس عبارت کو لکھوانے ... ہے اور

عبارت کا "سخن کس کی طرف ہے" برصغیر کو چھوڑ کر ہم نے کسی اور ملک میں انسانوں کو پان کھاتے ہوئے نہیں دیکھا اور
کنے کے فن میں برصغیر نے جو ترقی کی ہے اس کا راز اسی پان میں پوشیدہ ہے۔

جن غیر ملکی اصحاب کو یہ پتہ نہیں ہے کہ پان کھانے کے بعد انسان کے منہ میں پیک کا رنگ لال ہو جاتا ہے وہ
"لال پیک" کو دیکھ کر پریشان سے ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک غیر ملکی دوست پہلی بار ہندوستان آئے تھے۔
تین دنوں میں انھوں نے یہاں لوگوں کو پان کی پیک کو تھوکتے ہوئے جو دیکھا تو پریشان ہو کر ہم سے بولے "حیرت کی بات
ہے کہ اکثر ہندوستانی جگہ جگہ اپنے منہ سے خون تھوکتے رہتے ہیں، یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اس بیماری کی روک تھام
کیوں نہیں کی جاتی؟" تب ہم نے انہیں سمجھایا کہ میاں جسے تم خون سمجھ رہے ہو وہ اصل میں پان کی پیک ہے۔ بھلا ہم اتنی آسانی
سے خون کیسے بہا سکتے ہیں ہم نے تو اپنی جدوجہد آزادی میں بھی بڑی احتیاط سے خون بہایا تھا۔ پان کی پیک البتہ دن بھر بہاتے
رہتے ہیں ہمارے کہنے کے بعد موصوف نے خود بھی پان کھایا اور اپنے بل بوتے پر جگہ جگہ تھوکنے کے مظاہرے کرتے رہے چند
دن اور ہندوستان میں رہ جاتے تو ہمارے مجلسی آداب کو بھی ضرور سیکھ لیتے۔

پان کی پیک کے لیے جو انواع و اقسام کے اگالدان محفلوں میں رکھے جاتے ہیں تو ان سے کتنی غیر ملکیوں کو بڑی غلط فہمیاں
ہوتی ہے۔ ہمارے ایک جاپانی دوست ہمارے ساتھ ایک مشاعرے میں چلے سامعین میں ہم دونوں بالکل پیچھے بیٹھے تھے۔ صدر
مشاعرہ کے آگے ایک خوبصورت اگالدان بھی رکھا تھا۔ انھوں نے صدر مشاعرہ کو دو ایک بار اگالدان کو اپنے منہ تک لیجاتے
ہوئے دیکھا تو نہایت رازدارانہ انداز میں ہم سے پوچھا "صدر مشاعرہ کونسے مشروب کا استعمال کر رہے ہیں" اس پر ہم نے
انہیں بالتفصیل سمجھایا کہ "صدر مشاعرہ اگالدان میں سے مشروب نہیں پی رہے ہیں بلکہ اگالدان میں مشروب کو منتقل کر رہے ہیں" یہ
سن کر ہمارے جاپانی دوست کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بہرحال تھوکنا اور برسرِ عام تھوکنا ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ بعض افراد نے
اسے ایک باضابطہ "کھیل" کا درجہ دے دیا ہے ہمارے ایک اور دوست ہیں جو پان کی پیک کو بارہ فیٹ کی دوری تک پھینکنے کی صلاحیت
رکھتے ہیں اور اس فن میں انھوں نے یدطولیٰ حاصل کیا ہے کہ پیک کا ایک چھینٹا بھی اِدھر اُدھر ہونے نہیں پاتا۔ ہم نے دیکھا کہ
بعض اوقات اپنے احباب کے ساتھ پان کی پیک کو پھینکنے کے مقابلے منعقد کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک کالونی میں دوسری
منزل کے فلیٹ میں رہتے ہیں اور ان کے فلیٹ کے مقابل دوسری منزل پر ہی ان کے ایک اور پڑوسی کا فلیٹ واقع ہے۔ ایک بار
ان کے پڑوسی سے کسی بات پر ان بن ہو گئی تو وہ آدھی رات کو بڑی خاموشی کے ساتھ ازراہِ دشمنی پان کی پیک اس کے فلیٹ کی
بالکونی میں پہونچا دیا کرتے تھے اور کسی کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ پان کی پیک کس راستہ سے بالکونی میں داخل ہوئی ہے۔ بہرحال
تھوکنے پان تھوکنے کی ایک طبی روایت ہے اور اس پر اچانک پابندی عاید کرنے سے عوام کی صحت پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے
بلدی کارپوریشن کو پہلے اس نکتہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ □□

ٹی این راز کا شعری مجموعہ

درگت

بتوسط شگوفہ
قیمت: ۷ روپے

ڈاکٹر راہی قریشی
گلبرگہ

... دیکھتے جانا

حکومت کے لیے ہوتا ہے کیا کیا دیکھتے جانا
کبھی ٹی۔وی پہ یہ سارا تماشہ دیکھتے جانا

لیا جاتا ہے جو سب سے، وہ پیسہ بھول جا لیکن
دیا جاتا ہے جو سب کو وہ دھوکا دیکھتے جانا

یہ نیتا، دیش سیوک، سنت سادھو یا سوامی جی
کبھی خلوت میں ان کا کام دھندا دیکھتے جانا

مری اُردو کے حق میں پھر ہوا انصاف کا وعدہ
مری سوکھی بریڈ پہ تازہ مسکہ دیکھتے جانا

جو زیرِ آسماں پیدا ہوا ہے دشتِ غربت میں
جلال الدین اکبر سادہ بچہ دیکھتے جانا

مری بے روزگاری دیکھنے والو! گزارش ہے
مِلا تھا مجھ کو سونے کا جو تمغہ دیکھتے جانا

سبھی اُردو کتابیں، فارسی دیوان، مخطوطے
ابھی نیلام ہوگا یہ اثاثہ دیکھتے جانا

وہی افلاس، بیماری، بڑھاپا اور مجبوری
کبھی گھر آ کے یہ احوال بیٹا! دیکھتے جانا

ہمیشہ بام و ایواں جن کے بھاشن سے لرزتے ہیں
کبھی بیوی کے آگے اُن کا لرزہ دیکھتے جانا

میں تھیلی بھر کے پیسہ دے کے آیا ہوں دکانوں میں
مگر تھیلی میں جو آیا ہے سودا دیکھتے جانا

سفر کو لوگ عقبیٰ کا سفر کہنے لگے، یعنی
سڑک پہ روز بس میں اک دھماکا دیکھتے جانا

کسی بھی جامۂ زریں کی حاجت اب نہیں باقی
یہ کُرتا ملٹی پرپز ہے، یہ کُرتا دیکھتے جانا

بھلا لیلیٰ کا کالا رنگ تجھ کو کیا خوشی دے گا
میاں مجنوں! کبھی لیلیٰ کا کتّا دیکھتے جانا

گزر اوقات کرلی ہم نے بیوی کی کمائی پر
ہماری زندگی کا یہ سلیقہ دیکھتے جانا

کلر ٹی۔وی بہت اچھا ہے، لیکن دیکھنے والو
کلر ٹی۔وی پہ اُلّو جی کا چہرہ دیکھتے جانا

اداکاروں کا ہوتا ہے اضافہ چونکہ ہر گھر میں
سو بعدِ عقد، ہر گھر میں ڈرامہ دیکھتے جانا

خُسر، ہم زلف، بیگم، ساس سالے سالیاں راہی
یہ شادی ہو تو بدلہ سب سے لوں گا دیکھتے جانا

پرویز یداللہ مہدی
(حال مقیم شارجہ)

ٹر اعظم

زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف شکلوں میں مختلف ٹروں سے آدمی کا پالا پڑتا ہے، بچپن میں سکول ٹروں ہیڈ ماسٹروں اور مانیٹروں سے اوائل جوانی میں کالجوں و فنی درس گاہوں کے انسٹرکٹروں، انویجیلیٹروں، سے دوران ملازمت دفتر شاہی و سرخ فیتے کو فروغ دینے والے اڈمنسٹریٹروں سے علاج کے نام پر لوٹ کھانے والے ڈاکٹروں سے مقدمات کو مزید پیچیدہ بنانے والے بیرسٹروں سے دوران سفر بار بار ٹکرانے والی بسوں و ٹرینوں کے نک چڑھے کنڈکٹروں سے سرکاری وردی کی آڑ میں ظلم ڈھانے والے پولیس انسپکٹروں سے ہوٹلوں و بھٹیار خانوں کے بدتمیز ویٹروں سے اخباروں اور رسالوں کے سرپھرے ایڈیٹروں و سب ایڈیٹروں فلمی و غیر فلمی کمپنیوں کے تنگ مزاج ڈائرکٹروں سے ڈنڈے کے زور پر حکومت کرنے والے ڈکٹیٹروں سے جمہوریت کے نام پر عوام کو ٹھگنے والے منسٹروں و ڈپٹی منسٹروں سے بلدی سطح پر چارسو بیسی کرنے والے کارپوریٹروں سے سویرے سویرے 'رانگ نمبر' کا آموختہ پڑھنے والی ٹیلی فون آپریٹروں سے ازدواجی محاذ پر گولیوں کی طرح برسنے والے گندے انڈوں اور سڑے ہوئے ٹماٹروں سے بیویوں کی طرح بات بات میں آگ بگولہ ہونے والے ہیٹروں سے سسرالی رشتہ داروں کی طرح سرد مہر ریفریجریٹروں سے ڈبل روٹی کے سلائس اور کھانے والے کے موڈ کو جلا کر خاک کر دینے والے ٹوسٹروں اور روسٹروں سے قدم قدم پر راہگیروں کے جذبات کو مشتعل کرنے والے مخرب الاخلاق فلمی پوسٹروں سے قصہ مختصر یہ کہ ٹروں کا ایک لا متناہی سلسلہ ڈگر، ڈگر پر آدمی کی تفریح تباہ کرنے کے لیے موجود ہے!

ٹروں کا یہ فتنہ پرور سلسلہ آدمی کی حشر سامانی کو شاید کم تھا کہ حالیہ عرصے میں ٹروں کے خانوادے میں .... ایک ایسے ٹر کا اضافہ ہوا جسے اکبر اعظم اور سکندر اعظم کی طرح اگر ٹر اعظم کہا جائے

تو غلط نہیں ہوگا کیوں کہ مذکورہ بالا ٹروں کے مقابلے میں اسے وہی رتبۂ بلند حاصل ہے جو انسان کے جسد خاکی میں سر کو ہر دکھوں کے مقابل میں بُرے کو اور ماداؤں کے ریوڑ میں نر کو حاصل ہے حالاں کہ مذکورہ ٹر کے نہ آنکھ ہے نہ کان، ناک ہے نہ منھ، ہاتھ ہے نہ پاؤں بس صرف ایک دماغ ہے جس کی بدولت یہ اس منصب جلیلہ پر فائز ہے۔ دماغ تو خیر قدرت نے گدھوں کو بھی عطا کیا ہے لیکن خر کے دماغ اور ٹر کے دماغ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خر کے دماغ میں بھیجہ تو ہوتا ہے۔ حافظہ نہیں ہوتا جبکہ ٹر کے دماغ میں حافظہ ہی حافظہ ہے اور وہ بھی . . . . . اس بلا کا کہ الاماں والحفیظ۔ ایک بار کوئی بات اس کے حافظے میں داخل ہوگئی تو سمجھیے عمر بھر کے لیے محفوظ ہوگئی۔ اس دماغ خصوصی کے علاوہ اس میں رہنمائی کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے چنانچہ جو بھی ضرورت مند اس سے رجوع ہوتا ہے وہ پورے خلوص کے ساتھ اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ آج کل کے سیاسی رہنماؤں کی طرح رہبری کے پردے میں رہزنی ہرگز نہیں کرتا۔ غالباً انہی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے دنیا کے تمام عوام الناس چاہے تازہ ہوں یا باسی یعنی ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر یا پسماندہ سبھی اس ٹرِ اعظم کو اپنی ترقی اور بقا کا ضامن سمجھتے ہیں۔ بیسویں صدی کی اس معرکۃ الآرا ایجاد عرف اکیسویں صدی کی منہ بولی اولاد کو جنم دینے والوں نے بڑے پیار سے بڑے دلار سے نام دیا ——— کمپیوٹر ———

ذرا جھوٹ نہ بلوائے آج زندگی کے ہر شعبہ ہر نقار خانے میں اسی ٹرِ اعظم عرف کمپیوٹر کا طوطی بول رہا ہے، دفاتر ہوں یا بینک، اسپتال ہوں یا کالج، ریلوے اسٹیشن ہوں یا ہوائی اڈے، ریڈیو اسٹیشن ہوں یا ٹی۔ وی سنٹر، ڈاک خانے ہوں یا زچگی خانے، شیئر بازار ہوں یا سپر مارکٹ، عدالت عالیہ ہوں یا پولس ہیڈکوارٹرس، ہوٹل ہوں یا کلب، اشتہاری کمپنیاں ہوں یا . . . .

یا اخبارات کے دفاتر تمام پبلک اور پرائیویٹ لمیٹیڈ اداروں کے ارباب اقتدار و اختیار اپنے اپنے اختیارات کمپیوٹر کے حوالے کر کے اپنی کل ذمہ داریوں سے کلیتہً بری الذمہ ہوگئے ہیں۔ مغربی ممالک میں تو سنا ہے اب پرائیویٹ لمیٹیڈ یعنی ذاتی کمپیوٹر رکھنے کا فیشن چل پڑا ہے۔ غالباً وہاں جائیداد مملوکہ بلکہ منکوحہ کی طرح کمپیوٹر کا شمار بھی جائیداد مقبوضہ میں ہونے لگا ہے۔ نئی زمانہ کمپیوٹر کی مقبولیت کا محض اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح اپنے وقت میں مرزا غالب نے یہ تمنا کی تھی کہ:

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اسی طرح دورِ حاضر کے میر و مرزا نوحہ گر کی جگہ کمپیوٹر کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ گویا یہ تمنا کرنے لگے ہیں:

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں کمپیوٹر کو میں ——— !

عام آدمی کے مقدور میں تو خیر تمنائیں، حسرتیں، خواہشیں ہی لکھی ہوتی ہیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں البتہ جہاں تک رؤسا و امرا کا تعلق ہے بیشتر اپنا اپنا نوحہ گر عرف پرائیویٹ کمپیوٹر ساتھ رکھنے لگے ہیں جس کی پروگرامنگ (programming) مالک کمپیوٹر کی افتادِ طبع کی مناسبت سے کچھ اس ڈھنگ سے ترتیب دی جاتی ہے کہ سویرے آنکھ کھلتے ہی صاحب بہادر کا روزمرہ ٹائم ٹیبل روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے یعنی حوائج ضروریہ و غیر ضروریہ سے کب فارغ ہونا ہے! ناشتے میں کیا لینا ہے! لنچ میں کیا نوش

فرماتا ہے! ڈنر میں کون سی غذا لینی ہے؟ اور کس غذا میں کتنی کیلوریز (Calories) ہیں، کتنے حرارے ہونے چاہئیں! نمک کتنا، لوہے کی مقدار کتنی! چربی کا تناسب کیا ہونا چاہیے! یہی کچھ کمپیوٹر تجویز کرتا ہے مالک کمپیوٹر کا کام اس کی جاری کردہ ہدایات پر بلا چوں چرا کے صرف عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لیے کس وقت کس سے ملنا ہے، کس کی آؤ بھگت کرنا اور کسے جاؤ بھگت، کہنا ہے یہ مشورہ بھی کمپیوٹر ہی [illegible] دیتے ہیں، یہی نہیں کون سی شب منکوحہ کے پہلو میں اور کون سی رات مسٹریس، کی معیت میں بتانی ہے یہ بھی کمپیوٹر ہی طے کرتا ہے۔

آج کمپیوٹر عوامی زندگی میں اس حد تک گھس پیٹ کر چکے ہیں کہ کھیل کے میدانوں سے ریسرچ کے ایوانوں تک، انہی کی استادی مسلمہ ہے فرینڈ فلاسفر، گائیڈ اب یہی ہیں، مغرب کی نئی نسل تو اب اپنے ہر مسئلہ کے حل کے لیے والدین اور استادوں کے بجائے کمپیوٹروں سے رجوع ہو رہی ہے۔ یہاں ہمیں ایک لطیفہ نما واقعہ یاد آرہا ہے، امریکہ کے ایک کمپیوٹر انجینیر نے ایک ایسا کمپیوٹر ڈھالا جس میں ایک مخصوص علاقے کے باشندوں کے مکمل کوائف، سارا کچا چٹھا محفوظ کر دیا۔ چنانچہ علاقے کے جس کسی فرد کو اپنے یا اپنے آباو اجداد کے بارے میں جو بھی معلومات درکار ہوتیں، کمپیوٹر ہذا سے رجوع کر کے حاصل کر لیتے۔ ایک دن علاقے کے ایک نوجوان نے کمپیوٹر سے رجوع کیا اور اپنے والد کے بارے میں دریافت کیا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟" چند ثانیوں کے بعد کمپیوٹر نے تحریری جواب دیا" آپ کے والد فی الحال علاقے کی ندی کے کنارے موجود ہیں اور مچھلیاں پکڑ رہے ہیں — !"

نوجوان نے سوال پھر سے دہرایا، جواب میں پھر سے وہی تحریر کمپیوٹر کے اسکرین پر نمودار ہوئی۔
نوجوان غصہ سے آگ بگولہ ہو کر کمپیوٹر کے موجد کے پاس پہنچا اور برس پڑا — "آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے کمپیوٹر میں علاقے کے سارے ہی باشندوں اور ان کے آبا و اجداد کا صحیح صحیح اور مکمل و مفصل 'ڈاٹا' "DATA" محفوظ ہے۔ موجد نے پرسکون لہجے میں جواب دیا — "جی ہاں میرا یہی دعویٰ ہے اور یہی دعویٰ ہے آپ کو کیا شکایت ہے؟ نوجوان بولا — "میں نے آپ کے کمپیوٹر سے رجوع ہو کر اپنے والد کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت کہاں ہیں — ؟"

موجد نے پوچھا — "پھر کمپیوٹر نے کیا جواب دیا — ؟"

نوجوان بولا — "کمپیوٹر نے بتلایا کہ میرے والد فی الحال علاقے کی ندی کے کنارے موجود ہیں اور مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔"

موجد نے پوچھا — "کیا آپ کو کمپیوٹر کے جواب سے اتفاق نہیں — ؟"

نوجوان بولا — "بالکل نہیں — میرے والد فی الحال علاقے کی ندی پر مچھلیاں ہرگز نہیں پکڑ سکتے کیوں کہ ان کو مرے ہوئے دس برس ہو چکے — !"

موجد نے حتمی لہجے میں کہا — "یہ نہیں ہو سکتا — میرا کمپیوٹر کبھی غلط جواب نہیں دے سکتا۔ آئیے میرے ساتھ آپ کا یہی سوال میں اپنے طریقے سے پوچھتا ہوں۔ آئیے — !!"

موجود نوجوان کے ہمراہ کمپیوٹر کے روبرو پہنچا اور کمپیوٹر سے رجوع ہوا ـــــ اس نوجوان کی والدہ کے شوہر یعنی کہ اس نوجوان کے والد اس وقت کہاں ہیں۔ اور کیا کر رہے ہیں -؟

کچھ توقف کے بعد کمپیوٹر کے اسکرین پر تحریر نمودار ہوئی ـــ اس نوجوان کی والدہ کے شوہر کے انتقال کو دس برس ہو چکے ہیں، البتہ اس نوجوان کے والد فی الحال علاقے کی ندی کے کنارے موجود ہیں۔ اور مچھلیاں پکڑ رہے ہیں ـــــ !!!"

بنی نوع انسان کی ذاتی زندگی میں اس درجہ دخل در معقولات کرنے والے کمپیوٹروں کا بار یقیناً وہی افراد اٹھا سکتے ہیں جن کے ہاں شراب پانی کی طرح اور دولت سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتی ہو، ہمارا شمار تو بس دور ہی سے ان کا جلوہ دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اتفاق سے کچھ عرصہ پہلے ہم اپنے ایک شناسا کے توسط سے ایک غیر ملکی بینک کے فعال کمپیوٹر کا کافی نزدیک سے دیدار کر چکے ہیں۔ نتیجتاً اس کی بے مثل کارکردگی کی دھاک ہمارے دل و دماغ پر تادم تحریر جمی ہوئی ہے۔ ایسا نہیں کہ اس سے پہلے کسی کمپیوٹر کے دیدار کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ محکمہ ریلوے کے شعبہ ریزرویشن میں نصب باجماعت انداز میں کام کرنے والے بے شمار کمپیوٹروں کو آئے دن بھگتتے رہتے ہیں بلکہ اب آپ سے کیا پردا۔ ریلوے کا ایک عدد کمپیوٹر پہلے ہی مرحلے میں ہمارا ریزرویشن فارم اس حقارت کے ساتھ ٹھکرا چکا ہے جس حقارت سے فرقہ پرست سیاسی جماعتیں اقلیتوں کے مطالبات کو ٹھکرا دیتی ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریلوے کے شعبۂ ریزرویشن میں کمپیوٹر کا چلن نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ہم ریزرویشن فارم لے کر وہاں پہنچے اور فارم آپریٹر کے حوالے کیا، آپریٹر نے کمپیوٹر کی خدمت میں ہمارا فارم پیش کیا اور دو چار بٹن دبا کر ہمارا معروضہ گوش گزار کرنے کی کوشش کی پھر مسکرا کر ہم سے کہا ـــــ

سوری جی! کمپیوٹر نے آپ کا ریزرویشن فارم ریجیکٹ (Reject) کر دیا ـــــ!

ہم نے گڑبڑا کر کہا ـــــ ریجیکٹ کر دیا، وہ کیوں ـــ!

آپریٹر نے فرمایا ـــــ "وہ اس لیے کہ تین مسافروں کے بیچ صرف ایک "برتھ" بک نہیں ہو سکتی؟ یہ ریلوے کے قانون کے خلاف ہے -!"

ہم نے حیرت سے کہا ـــ تین مسافر؟ کون تین مسافر ـــــ؟ فارم میں تو صرف ایک ہی مسافر کا نام لکھا ہے -! ذرا غور سے پڑھیے ـــــ!"

آپریٹر بولا ـــــ "غور سے کیا پڑھوں؟ تین مسافروں کے نام ایک ساتھ ایک ہی لائن میں لکھ دینے سے تین مسافر ایک نہیں ہو جاتے تین ہی رہتے ہیں، آپ خود پڑھیے۔ پرویز یداللہ مہدی، یہ تین نام ہیں کہ نہیں ـــ؟"

عرض کیا ـــــ بھیا یہ ایک ہی نام ہے۔ ذرا لمبا ہے، پرسنالیٹی کے حساب سے رکھا گیا ہے۔ اور اس ایک نام سے اب سے پہلے تک کئی بار ٹکٹ ریزروڈ ہوتا آیا ہے اور کبھی کسی بکنگ کلرک بھائی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا!

آپریٹر طنزیہ لہجے میں بولا ــــ پہلے کی بات اور تھی۔ بکنگ کلرک پہلے اکیلا تھا کوئی بھی اسے چکر دے سکتا تھا۔ لیکن اب کمپیوٹر اس کا ساتھی ہے اور کمپیوٹر کو چکمہ دینا آسان نہیں جائیے پھر سے نیا فارم بھر کر لائیے اور یہ تینوں مسافروں کے نام الگ الگ لکھیے۔ اب آپ پہلے کی طرح تین مسافروں میں صرف ایک برتھ سے کام نہیں چلا سکتے ــــ!"

ہم نے جھنجھلا کر کہا ــــ پھر وہی تین مسافر! بھیا میں قسم کھا کر کہتا ہوں یہ تین نہیں ایک ہی نام ہے!

آپریٹر نے بھی جھنجھلا کر جواب دیا ــــ ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن کمپیوٹر کی نظر میں یہ ایک نہیں تین نام ہیں اور جب کمپیوٹر کسی کو ایک بار تین الگ الگ خانوں میں بانٹ دیتا ہے تو پھر چاہے وہ سچ مچ ایک ہی کیوں نہ ہو، تین ہی رہتا ہے بلکہ تین تیرہ ہو جاتا ہے یا تو تین نام الگ الگ لکھ کر تین برتھ بک کروا دیجیے یا پھر ان تینوں ٹکڑوں میں سے کوئی ایک نام لکھ کر ایک برتھ بک کروا لیجیے جلدی کیجیے ایسا نہ ہو کہ کمپیوٹر آپ کو مستقل بلیک لسٹ کر دے پھر آپ زندگی بھر ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کو ترس جائیں گے اور باقی عمر ان ریزروڈ بوگی میں کسی بے یار و مددگار بیوگی کی طرح بس آس ہی کرتے ہوئے گزر جائے گی ــــ!!"

ہمارے نام کی طوالت کو تختۂ مشق بنانے کے پیچھے کمپیوٹر کی شرارت کا اتنا عمل دخل نہیں تھا جتنا کہ شریمان آپریٹر کی فتنہ پرور ذہنیت کا مذکورہ آپریٹر یقیناً اس سیاسی پریوار کا لے پالک تھا جس کا نصب العین ہی کسی نہ کسی بہانے اقلیتوں کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔ ہمارے تشخص کو ٹھیس پہنچانے کی آپریٹر مہاشے نے کوشش تو بہت کی لیکن کامیاب اس لیے نہیں ہو سکے کہ ریزرویشن کا دائرہ صرف ان کے کاؤنٹر تک محدود نہیں تھا بلکہ دیگر کاؤنٹرس تک پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی کے مصداق ہم نے سوچا جس طرح ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کو بڑھاوا دینے والی فسطائی قوتوں کے بیچ امید کی کرن کی صورت سیکولرزم کا پرچار کرنے والی چند برائے نام طاقتیں ہی سہی موجود ہیں، اس طرح شعبۂ ریزرویشن کے بے شمار کاؤنٹرس میں ایک آدھ "سیکولر کاؤنٹر" یقیناً موجود ہوگا چنانچہ تلاش شروع کر دی اور تھوڑی ہی دیر میں ایک ایسا کاؤنٹر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور یوں اپنے تشخص اپنی شناخت اپنے نام کو باقی و برقرار رکھتے ہوئے وہاں سے بامراد و کامران لوٹے۔ معاف کیجیے ریلوے کمپیوٹر کا قصہ ذرا طوالت ہو گیا۔ اصل میں ہم کمپیوٹر بذا کے حوالے سے عرض یہ کرنا چاہتے تھے کہ ریلوے اسٹیشن کے شعبۂ ریزرویشن کی گرد آلود فضا اور ایک غیر ملکی بنک کی خواب آلود فضاؤں میں وہی فرق ہوتا ہے جو ایک مچھلی بازار اور چمن زار کے ماحول میں ہوتا ہے کمپیوٹر چاہے کسی غیر ملکی بنک کا ہو یا خالص ملکی ریلوے اسٹیشن کا ایک چیز بہر حال اس کی طبع نازک پر گراں گزرتی ہے اور وہ ہے گرمی، ظاہر ہے کمپیوٹر آدمی تھوڑی ہے جو تپتی دھوپ میں اس سے زیادہ تپتی ہوئی چھت کے نیچے بیٹھ کر کام کیے جائے اور اف نہ کرے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو منجمد کر دینے والی ٹھنڈ میں ننگے بدن بوجھا اٹھائے اور چوں نہ کرے یا موسلا دھار بارش میں بھیگتے ہوئے کڑی محنت مشقت کرے اور حرف شکایت زبان پر نہ لائے آدمی اور مشین میں یہی تو فرق ہے۔ کمپیوٹر کے لیے ماحول اگر سازگار نہ ہو تو اس کے کل پرزے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کام کی رفتار سست ہو جاتی ہے، موڈ آف ہو جاتا ہے، چڑچڑاپن طاری ہو جاتا ہے اور یہ بیماری کی علامتیں ہیں

سے بالآخر اس مقام پر لے آتی ہیں جہاں اس میں اور سرکاری ملازمین میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا وہاں کمپیوٹر نصب کرنا ہو وہاں کی فضا کو ایئر کنڈیشننگ کے ذریعہ عین اس کے مزاج کے مطابق ڈھالنا نہایت ضروری ہے۔ بینکوں کے حدود داربعہ یوں بھی کلی طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہوتے ہیں۔ اس پر جس غیر ملکی بینک میں ہمیں اپنے شناسا کے توسط سے جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں کی فضا ایئر کنڈیشنڈ ہونے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹرائزڈ بھی تھی۔ چنانچہ بینک کے اس مخصوص گوشے میں جیسے ہی ہم نے قدم رکھا ایک پُر ہول سناٹے نے ہمارا سواگت کیا۔ اس وقت وہاں دُور دُور تک ہمارے علاوہ نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد حالانکہ کاروباری اوقات کے دوران بھیڑ بھیڑ سے بینک میں بھی لوگوں کی چہل پہل اور ریل پیل ہوتی ہے لیکن اس غیر ملکی عالی شان بینک کے اس مخصوص گوشے میں نہ چہل تھی نہ پہل، نہ ریل تھی نہ پیل، ہم نے ہڑبڑا کر اپنے شناسا سے پوچھا ــــ "برادرم، یہ کیسا بینک ہے جہاں نہ کوئی چیک وصول کرنے والا ہے نہ رجسٹر میں اندراج کرنے والا نہ ٹوکن دینے والا نہ چیک پاس کرنے والا نہ رقم حوالے کرنے والا ــــ؟"

جواب میں ہمارے شناسا نے سامنے نصب کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا اور تبسم فرما کر بولے۔ "ایک عام بینک میں ایک عدد چیک جتنے ہاتھوں سے گزر کر نقدی کی صورت کھاتے دار کے ہاتھ میں واپس پہنچتا ہے یہاں وہ سارے کے سارے فرائض منصبی مسمّی کمپیوٹر تن تنہا انجام دیتے ہیں وہ بھی نان اسٹاپ!"

اتنا کہہ کر موصوف کمپیوٹر کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو گئے۔ پہلے اپنا شناختی کارڈ کمپیوٹر کے ایک مخصوص گوشے میں داخل کیا جس کے جواب میں اسکرین پر کچھ آنکڑے نمودار ہوئے موصوف نے کچھ بٹن دبائے اور کچھ توقف کے بعد کمپیوٹر کے نچلے حصے والے شگاف سے مطلوبہ رقم کڑکڑاتے نوٹوں کی شکل میں برآمد ہوئی گویا وہی شاعرانہ معاملہ تھا:

کیا خوب سودا نقد ہے ۔ اِس ہاتھ دے اِس ہاتھ لے

لین دین کا یہ فی الفور تجربہ ہمارے لیے خوش گوار بھی تھا اور حیرت انگیز بھی، اور سب سے بڑھ کر کمپیوٹر کی جس ادا نے ہمیں متاثر کیا وہ تھی اس کی خوش اخلاقی یعنی کھاتے دار کا لمس محسوس کرتے ہی اسے خوش آمدید کی تحریر سے نوازتا تھا اور لین دین کی کارروائی کے اختتام پر شکریہ پھر تشریف لائیے کے الوداعی کلمہ سے بھی اس کا جی خوش کرتا تھا۔ ہم نے توصیفی لہجے میں کہا ــــ "بھائی جان یہ کمپیوٹر مستعد ہی نہیں کافی خوش اخلاق بھی ہے۔ ویلکم بھی کرتا ہے، شکریہ بھی ادا کرتا ہے، ورنہ بیشتر بینکوں کے تعلق سے ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ وہاں کھاتے داروں کو خود اپنی جمع پونجی میں سے حسب ضرورت رقم نکلوانے کے لیے ٹوکن کلرک سے لے کر خزانچی مہاشے تک سب کی عاجزی کرنا پڑتا ہے، پھر مطلوبہ رقم کی وصولی پر فرداً فرداً سب کا شکریہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے ــــ!"

ہمارے شناسا بولے۔ "یہی خوش اخلاقی اور مستعدی تو کمپیوٹروں کی مقبولیت کا راز ہے، ان دو معاملات میں میرا خیال ہے خود ان کے موجد بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، سچ کہتا ہوں، گھروں کو جہنم بنانے والی بیویاں اگر کمپیوٹر سے صرف ویلکم اور شکریہ ادا کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں تو ہر گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں حافظے کے ساتھ اگر کمپیوٹر دیگر اعضائے رئیسہ و غریبہ سے متصف ہوتا تو بہت یار لوگ یقیناً شادی کے بندھن میں ہرگز نہیں بندھتے، صرف

پیوٹروں سے کام چلاکر ازدواجی زندگی کا بھرپور سکھ بھوگتے ——— !!!

اس سے قطع نظر کہ مستقبل قریب میں نر کمپیوٹر شوہروں کے اور مادہ کمپیوٹر بیویوں کے فرائض
مبی و غیر منصبی نباہ پائیں گے یا نہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا تاہم ان کی کارکردگی سر دست
ں اعتبار سے اطمینان بخش ہے کہ جتنے بھی کام فی الحال ان کے ذمہ تفویض کیے گئے ہیں یہ انھیں
ایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے رہے ہیں اور اس کا واحد سبب یہ ہے کہ کمپیوٹر ہمیشہ
ینے کام سے کام رکھتے ہیں۔ حضرتِ انسان کی طرح نہ تو دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں
یر متعلقہ بکھیڑوں میں پڑتے ہیں۔ اصل میں کمپیوٹروں کے موجد اور انھیں ڈھالنے بنانے والے
ارے، گاہکوں کی ضروریات، ان کے پیشے کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کمپیوٹروں کے
فظے میں متعلقہ معلومات کی تفصیل نیز ان کے مسائل اور مسائل کے ممکنہ حل سبھی کچھ محفوظ کر دیتے ہیں۔
انچہ آج بین الاقوامی مارکیٹ میں جیسی روح ویسے فرشتے کے مصداق جیسا پیشہ ویسے کمپیوٹر جگہ
ہ آسان قسطوں پر دستیاب ہیں نتیجتاً ایک طرف اگر جرائم پیشہ افراد کی ہسٹری شیٹ عرف کچا چٹھا
ل کر محکمہ پولیس کی مدد کرنے والے کمپیوٹر دستیاب ہیں تو دوسری طرف مجرموں کی دستگیری بالفاظ دیگر اعانت
رائم کرنے والے کمپیوٹروں سے بھی بازار لدے ہوتے ہیں۔ ان مخصوص کمپیوٹروں کے حافظے میں علاقے
تمام بینکوں کے نقشے ان کی تجوریوں کے بلو پرنٹ، ان میں محفوظ دعوتِ سرقہ دینے والی دولت، زیورات
جواہرات کی تفصیلات اور اس دولت تک پہنچنے کے نہایت ہی آزمودہ و سائنٹیفک طریقے کوٹ کوٹ
بھرے ہوتے ہیں بس بٹن دبانے کی دیر ہے کمپیوٹر کا منہ کسی پیٹ کے ہلکے شخص کے منہ کی طرح فوراً کھل
اتا ہے۔ اس قبیل کے ڈبل کراس کمپیوٹروں پر یہ پرانا محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے۔ چور کو بولے چوری کر، ساہوکار
و بولے گھر سنبھال ——— !

اور تو اور اب کمپیوٹروں نے ستاروں کی چال، قسمت کا جال، شادی بیاہ کی شبھ مہورت، گرہوں کے
چکر جنم کنڈلیوں کے پیچیدہ نقشے فٹ کرنے جیسے خالص علم نجوم کے ہتھکنڈوں میں بھی دخل دینا شروع
ر دیا ہے البتہ اپنے ہاں چونکہ ابھی ابتدائے عشق والا مرحلہ ہے اس لیے ان مخصوص کمپیوٹروں کی عمل داری
الحال صرف انہی دائرِ عملیات و بلیات عاملوں و عاملوں کی مایا نگری، عرف طلسمی دنیا تک محدود ہے
و اپنے پرائیویٹ لمیٹڈ دفتروں میں بیٹھ کر موٹے موٹے اسامیوں کو پھانستے اور ان لمیٹڈ دھن کماتے
ہیں۔ کمپیوٹروں کے اس میدان میں عمل دخل کو دیکھتے ہوئے وہ دن دور نہیں لگتا جب فٹ پاتھی طوطا
ومیوں کی بغل میں رکھے پنجروں میں طوطوں کی جگہ کمپیوٹر ٹیں ٹیں کرتے دکھائی دیں گے۔ ۔ !

کمپیوٹروں کے تعلق سے سائنس دانوں کا عموماً یہ دعویٰ ہے کہ ان کی کارکردگی صد فی صد بے عیب
ہے، یہ اپنے مشن میں کبھی ناکام نہیں ہوتے حالانکہ بے عیب ذات صرف خدائے بزرگ و برتر کی ہے باقی
ام چیزیں فانی اور عیوب سے پُر ہیں۔ چنانچہ کمپیوٹروں سے منسوب اس لطیفہ پر اپنی تحریر کو فل اسٹاپ

لگتے ہیں ——— ایک سپر جیٹ طیارہ اڑان بھر کر جیسے ہی بلندی پر پہنچا اس کے اندر لگے مائیکروفون سے آواز آئی معزز مسافرین آپ کو یہ جان کر بے پایاں مسرت ہوگی کہ یہ دنیا کا پہلا خود کار طیارہ ہے۔ اس میں نہ کوئی اسٹیوارڈ ہے نہ ایر ہوسٹس حتیٰ کہ پائیلٹ بھی نہیں ہے، یہ پوری طرح کمپیوٹرائیزڈ ہے اور اس کا کمپیوٹر کنٹرول زمین پر ہے . . . . اس وقت ہمارا طیارہ زمین سے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا ہے نیچے ہزاروں میل تک پھیلا ہوا سمندر ہے اور اوپر خلا ہی خلا لیکن آپ گھبرائیں نہیں۔ اس طیارے میں حفاظت اور سلامتی کا سارا عصری بندوبست ہے، یہ آواز جو آپ کو سنائی دے رہی ہے ٹیپ پر ریکارڈ شدہ ہے، آپ کو ایک بار پھر اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ اس طیارے کو کبھی کوئی حادثہ پیش نہیں آ سکتا کیونکہ اس کا کنٹرول کمپیوٹر کے ہاتھ میں ہے اور کمپیوٹر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کبھی فیل نہیں ہوتا ——— کبھی فیل نہیں ہوتا ——— کبھی فیل نہیں ہوتا ——— کبھی فیل نہیں ہوتا ———

آخری فقرے پر ٹیپ اٹک گیا ٹیپ کا اٹکنا تھا کہ تمام مسافروں کا دم بھی اٹک گیا ——— !!!

●

مسیح انجم

انیس سو چھیانوے انیس سو ستانوے

(نوٹ: ہر سال کے اختتام پر صرف سن بدل کر یہ مضمون پڑھ لیا کیجئے۔ اور پھر مصنف کے حق میں دعائے خیر فرمائیے)

وقت کو سکنڈ، منٹ، گھنٹوں، مہینوں اور سال میں تقسیم کر کے کیلنڈر کو ایجاد کرنے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ گزرے ہوئے سال کو کوسنے اور گالیاں دینے میں بڑی سہولت حاصل ہو گئی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کو ہر گزرا ہوا سال خراب اور ہر آنے والا سال اچھا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انسان سال کے گزرنے پر اپنے کئے پر افسوس کرنے، اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کے بجائے گزرے ہوئے سال کو کوسنے اور گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال لینے پر اکتفا کرتا ہے۔ اور پھر نئے سال کا خندہ پیشانی سے یوں استقبال کرتا ہے، جیسے وہ نیا سال نہ ہوا ـــ نئی نویلی دلہن ہوئی۔

اب یہی دیکھئے کہ سال انیس سو چھیانوے "سالِ کبیسہ" تھا، جسے ہمارے دوست واحد کلام "سالِ خبیثہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ انیس سو چھیانوے والے "سالِ کبیسہ" میں، "امراضِ خبیثہ" میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ انیس سو چھیانوے گزر گیا، لیکن وہ نہیں گزرے! پتہ نہیں، انیس سو ستانوے میں وہ کیا کر گزرتے ہیں، اور کن کن خباثتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ انیس سو ستانوے میں بھی وہ اپنے آپ کو دہراتے رہیں گے۔

بنیادی طور پر ہم سال اور سن کو یاد رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اس لیے کہ سن و سال کو یاد رکھنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ انسان کو قبل از وقت بڑھاپے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور وہ عمرِ طبعی کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی ایڑیاں رگڑنا شروع کر دیتا ہے۔ سن اور سال کو یاد وہ شخص رکھے جسے وظیفہ پیرانہ سالی پر علحدہ ہونا ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے دفاتر میں "سروس ریکارڈ" اسی لیے مرتب کیا جاتا کہ سرکاری ملازم کو ساٹھ سال تک پہنچنے سے پہلے ہی ساڑھ ستی لگا دی جائے اور اس کو فاترالعقل قرار دیا جائے۔ جبکہ ہمارے نیتا ساٹھ کراس کرنے کے باوجود جنتا کا خون پی پی کر جوان ہونے لگتے ہیں اور ساٹھا پاٹھا کہلاتے ہیں۔

جب بھی نیا سال آتا ہے تو ہمیں یہ لطیفہ نما قصہ ضرور یاد آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کو علم نجوم پر بڑا اعتقاد تھا۔ جب بھی پرانے سال کے گزر جانے کا وقت آتا، وہ اپنے درباری نجومی کو بلا کر پوچھتا کہ نیا سال کیسا ہوگا۔ اور کیا کیا مسائل پیش آئیں گے؟ ایک سال یوں ہوا کہ نئے سال کے بارے میں بتاتے بتاتے نجومی نے بادشاہ کو

گوئی خبردار کیا کہ نئے سال میں جو بارش ہوگی، اس کا پانی انتہائی مضر ہوگا، جسے پی کر رعایا بہکی بہکی باتیں کیا کرے گی۔ اس پیشین گوئی کو سن کر بادشاہ کو سخت تشویش لاحق ہوگئی۔ چناں چہ اس نے نجومی کو رخصت کیا اور صلاح و مشورے کے لیے اپنے وزیر کو بلوایا جب وزیر با تدبیر آپہنچا تو بادشاہ نے اپنی تشویش ظاہر کی اور وزیر سے کہا کہ وہ اس کا حل تلاش کرے۔ وزیر نے کچھ دیر تک اپنے عقل کے گھوڑے کو دوڑانے کے بعد کہا "بادشاہ سلامت! اس میں فکر و تردد کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سال بھر کے لیے پانی کا ذخیرہ کر کے محفوظ کر لیجئے، اور بس وہی پانی نوش فرماتے رہیے۔ اب رہا رعایا کا معاملہ! ۔۔ تو وہ جائے بھاڑ میں! وہ وہی پانی پیا کرے گی جو برسے گا، اور پھر بہکی بہکی باتیں کیا کرے گی۔ لیکن آپ تو اسٹور کیا ہوا پانی پی پی کر عقل مند ہی رہیں گے"! بادشاہ کو وزیر با تدبیر کی یہ تجویز نہایت ہی معقول معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے لیے سال بھر کے لیے پانی اسٹور کر کے محفوظ کر دینے کا حکم دیا۔ خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ اس سال بارش خوب ہوئی۔ چنانچہ رعایا نے اسی بارش کا پانی پینا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔

اب یہیں سے وہ مسئلہ پیدا ہوگیا جسے جدیدیت کی زبان میں "ترسیل کا المیہ" کہتے ہیں۔ ادھر بادشاہ جو کچھ احکامات صادر کرتا، وہ عوام کے پلے نہ پڑتے۔ اور ادھر عوام جو کچھ فریاد بادشاہ کے گوش گزار کرتے، وہ اس کے ایک گوش میں داخل ہو کر دوسرے گوش سے نکل جاتی۔ بادشاہ کے احکامات رعایا کو یوں لگتے جیسے کوئی جدید علامتی افسانہ ہو۔ اور رعایا کی سیدھی سادی فریاد بادشاہ کے سر سے یوں گزر جاتی جیسے کوئی جدید نثری نظم ہو! ۔۔ مختصر یہ کہ ترسیل کا زبردست المیہ پیدا ہوگیا تھا۔ اور صورت حال بالکل اس مصرعے کے مطابق ہوگئی تھی:

دونوں طرف تھی "آگ برابر لگی ہوئی!"

جب آگ حد سے سوا ہوگئی تو عوام نے سوچا کہ ہمارا بادشاہ ہمارے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا اس کا تختہ الٹ دینا چاہیے۔ کسی طرح یہ بات جاسوسوں کے ذریعہ بادشاہ تک پہنچی، تو وہ بے حد پریشان ہوا۔ اس نے فوراً اپنے وزیر با تدبیر کو طلب کیا، اور حکم دیا کہ وہ فوراً اس مسئلہ کا حل پیش کرے۔ وزیر نے کچھ دیر سوچ کر بادشاہ سے ادباً درخواست کی کہ:
حضور! اس کا بہت سیدھا سادا حل یہ ہے کہ آپ اپنا اسٹور کیا ہوا پانی فوراً بہا دیں، اور وہی پانی پیا کریں جو عوام پیتے ہیں!"

چنانچہ بادشاہ نے اسی وقت اسٹور کیا ہوا سارا پانی بہا دیا۔ جب عوام کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب ان کا بادشاہ راہ راست پر آگیا ہے!

تو صاحبو! ہم بھی اس لطیفہ نما قصے کو بنیاد بنا کر چند پیش گوئیاں کرنا چاہیں گے کہ انیس سو ستانوے میں کیا ہوگا، اور کیا کیا مسائل پیش آئیں گے؟ اب جبکہ ہم چند عجیب قسم کی پیشین گوئیاں کرنے جا رہے ہیں تو ہمیں وہ قصہ یاد آرہا ہے جو کبھی بزرگوں سے سنا تھا۔ غالباً آپ نے حسن بن صباح کا نام سنا ہوگا۔ وہ نہایت ہی چالاک، ہوشیار اور عیار قسم کا دانشور تھا۔ اس کو مصنوعی جنت بنانے کی سوجھ رہی تھی۔ لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کو مطیع و فرمانبردار قسم کے عملے کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے ایک دن اُسے یہ موقع بھی ہاتھ آگیا۔ ایک دن وہ ایک کشتی پر بیٹھا سمندر کا سفر کر رہا تھا اس کشتی سے اور بھی بہت سارے مسافر سفر کر رہے تھے۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اچانک سمندر میں تموج کے آثار پیدا ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر میں طوفان نے آدبوچا۔ اس طوفان میں گھر کر کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ پھر تو تمام مسافروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ (۱) موقع کو حسن بن صباح نے غنیمت جانا۔ اور (۲) اس سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے (۳) کو قابو رکھا

اور پھر بہ بانگ دہل اعلان کیا کہ اگر تمام مسافر اس کو اپنا قائد تسلیم کرلیں تو وہ ان کو اس سمندری بلا سے نجات دلائے گا۔ اس اعلان کو سن کر تمام مسافروں نے رضامندی ظاہر کردی کہ صحیح و سلامت کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ اس کو اپنا قائد تسلیم کرلیں گے۔ پھر تو حسن بن صباح نے آسمان کی طرف دیکھا اور کچھ الابلا قسم کے الفاظ یوں بڑبڑائے جس طرح ہمارے ٹی وی کے سیریلوں میں جادوگر بڑبڑایا کرتے ہیں۔ اب آپ اس کو اتفاق کہیے یا جگ کے ڈھکوسلے کا ڈائریکشن کہ آناً فاناً میں طوفان تھم گیا، اور کشتی صحیح و سلامت کنارے تک جا پہنچی۔ تب تمام مسافروں نے حسن بن صباح کو بلا مقابلہ اپنا قائد منتخب کرلیا۔ اور اس کے اشاروں پر نہ صرف چلنے لگے بلکہ آج کل کے انتخابی کرائے کے غنڈوں کی طرح ناچنے بھی لگے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک بے تکلف فری لانس جرنلسٹ قسم کے دوست نے حسن بن صباح سے پوچھا کہ "آخر وہ کیا ٹرک (TRICK) تھی کہ طوفان تھم گیا تھا"؟ اس سوال پر حسن بن صباح نے ہمارے پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کی طرح مسکرا کر جواب دیا کہ "ٹرک ورک کچھ نہیں تھی، بس میں نے ایک "تیر تکا" چلا کر رسک لے لیا تھا کہ مسافر بچ جائیں گے تو میں ان کا قائد تسلیم کرلیا جاؤں گا۔ اور اگر ترکیب نہ چلتی تو ان مسافروں کے ساتھ ساتھ میں بھی غرق ہو جاتا اور مجھے پوچھنے والا کوئی نہ ہوتا!"۔۔۔۔۔

اس قصے سے خدارا آپ ہرگز یہ مطلب نہ لیں کہ ہم بات میں بات پیدا کرکے [illegible] تسلیم کروانا چاہتے ہیں یا روئے زمین پر کوئی مصنوعی جنت بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بخدا قطعاً یہ بات نہیں ہے ہمیں تو معشوق کو بھی اپنا بنانا نہیں آتا! جنت بنانے کا تصور کیا خاک کرسکتے ہیں۔ البتہ ہماری یہ تمنا ضرور ہے کہ سال انیس سو ستانوے آپ کے لیے نئی نئی خوشیاں لے کر آئے، اور یہ دنیا جنت کا نمونہ بنے! لیکن ایسے آثار تو کچھ دکھائی نہیں دیتے۔ تاہم پچھلے سال کے تجربات کی روشنی میں اگر ہم چند پیشین گوئیاں عرض کریں تو حرج ہی کیا ہے!؟:

- ★ ہر سال کی طرح انیس سو ستانوے بھی ابتدا میں کچھ کچھ اچھا لگے گا، اور پھر اس کے بعد آپ اس کو بھی کوسنا شروع کردیں گے۔
- ★ دنیا کے تمام شوہر اپنی بیویوں کی ماریں رہیں گے، اور چوں چپاخ نہ کریں گے۔ "اٹھو!" کہنے پر "ربنا!" کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور "بیٹھو!" کہنے پر کمر پکڑ کر (بیوی کی نہیں - اپنی) بیٹھ جائیں گے۔
- ★ تاجر پرانی چیزوں کے لیبل بدل کر زیادہ دام والے نئے لیبل چسپاں کریں گے۔
- ★ عالمی امن کے نام پر جنگ کی دھمکیاں دی جائیں گی جو بندر بھبکیاں قسم کی ہوں گی۔
- ★ گرما کے موسم میں ایک آدھ بار ضرور بے موسمی بارش ہوگی اور خوب اولے برسیں گے جو گنجوں کی چندیا کے لیے بڑے خطرناک ثابت ہوں گے۔
- ★ دفتروں میں کام کم اور گپ بازی زیادہ ہوگی اور ملازمین کو جو سالانہ انکریمنٹ (INCREMENT) حاصل ہوگا، وہ ان کی کارکردگی کا نہیں، گپ بازی کا ہوگا۔
- ★ لوگ تھیلیوں کے حساب سے کرنسی لے کر مارکٹ جائیں گے۔ اور وہاں سے اس کرنسی کے عوض صرف اپنی جیب میں سودا سلف لے آئیں گے۔

- ★ سیاسی جلسوں میں اردو زبان [illegible] مظلومیت پر زبردست چرچے ہوں گے لیکن جب اس کے مستحق مقام کا مسئلہ درپیش ہوتا تو اس کو دوبدہ فردا پر ٹال دیا جائے گا۔
- ★ برسات میں کچی دیواروں کے منہدم ہونے اور کھاپھوس کی جھونپڑیاں بیٹھ جائیں گی ... اور بلدیہ کے ایمرجنسی اسکواڈ کے آنے تک ان مکانوں کے مکین جاں بحق ہو جائیں گے۔ اور پکے مکانوں کے مکین بارش کا لطف اٹھائیں گے۔
- ★ سیلاب کے مصیبت زدگان اور بے گھر افراد کے لیے ریلیف کیمپ لگائے جائیں گے، جہاں صرف بیا شعبدہ ساز اور مسٹنڈے موج منائیں گے۔
- ★ سرمامیں اتنی ہی سردیاں ہوں گی جتنی قدرت کو منظور ہیں۔ امیر لحاف اوڑھیں گے، تو غریب بونتہ اوڑھ کر سو جائیں گے۔

اگر ہم یوں ہی پیشین گوئیاں کرتے جائیں تو اندیشہ ہے کہ سن انیس سو ستانوے کے تین سو پینسٹھ صحیح ایک ٹا چار دن بھی ختم ہو جائیں گے، اور آپ کو مبارکباد دینے کی مہلت ہی نہ مل سکے گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنے مضمون کو ختم کریں اور آپ کو نئے سال کی مبارکباد دیں :

زبردستی کا سالِ نو مبارک!

پھر ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ آپ کو کس کس سال کی مبارکباد دیتے رہیں۔ کیوں کہ ہم جس سماج میں سانس لیتے ہیں، اس میں پہلے ہی سے انواع و اقسام کے سال رائج ہیں۔ سن عیسوی تو خیر برسوں سے بین الاقوامی سطح پر رائج اور مسلط ہے لیکن اس کے متوازی کئی اور سال بھی رائج ہیں۔ جیسے قمری سال، فصلی سال، ہندوؤں کا سال، مسلمانوں کا سال، ایرانیوں کا سال، تورانیوں کا سال، پارسیوں کا سال، مالیاتی سال، تعلیمی سال، بچوں کا سال، بوڑھوں کا سال، بدھوؤں کا سال، ناریوں کا سال، اناڑیوں کا سال وغیرہ وغیرہ۔ اِن تمام سالوں کو دیکھ کر ہمیں یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ سال نہ ہوں، بلکہ سالیاں ہوں۔ اب ان تمام سالوں اور سالیوں کے نرغے میں گھِر کر سماج کا ایک فرد (یعنی آپ اور ہم) بہنوائی یا جیجاجی کے روپ میں کس کس کے ناز اُٹھائے اور کس کس کے نخرے برداشت کرے؟

□□

عابد معز
(ریاض)

معزز سامعین

توجہ چاہتا ہوں!

چند ماہ قبل بزم اُردو ادب ' الاحساء' نے مجھے مشاعرہ کا صدر بنایا تھا اور اب بزم کا اصرار کہ میں آج کے مشاعرے میں بہ طور مہمان خصوصی حاضر رہوں۔ ظاہر ہے کہ مہمان خصوصی ہونے کے ناطے مجھے کچھ عرض کرنا بھی ہے۔ پتہ نہیں آپ لوگ اس قسم کی غیر روایتی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں۔ یہ آپ کرم فرمائی ہے یا میرا امتحان ۔ میں نے جناب محمود شاہد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ " مشاعرہ کے دوران شری تخلیقات پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔ شعراء ناراض ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں بدعتی قرار یں " جواب ملا: " ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ شعراء اور ادباء کا ایک ہی برادری سے تعلق ہے " ر حاصل کرنے کے لئے میں نے دوسرا عذر پیش کیا۔ " میں ریاض سے مشاعرہ سننے اور ہوٹنگ کی تیاری ے آیا ہوں " جواب ملا " مہمان خصوصی بن کر آپ 'خصوصی ہوٹنگ' کر سکتے ہیں " آخر میں نے انہیں انتباہ یا۔ " میں مہمان خصوصی بن گیا تو تمہارا ایک سامع کم ہوگا۔ مشاعرہ کے لئے یہ ایک عظیم نقصان ہے" محمود شاہد اس وارننگ کا بھی اثر نہ ہوا ۔ انہوں نے تین مرتبہ "آپ مہمانِ خصوصی ہیں " کا ورد کیا تو مجھے مجبوراً مان خصوصی کا اعزاز قبول کرنا پڑا۔

ایک سامع کے مہمان خصوصی بننے سے جو نقصانات ہوتے ہیں اس کا اندازہ آپ حضرات نہیں لگا رہے ں۔ مہمان خصوصی کو اسٹیج پر خصوصی جگہ فراہم کرنی پڑے گی ۔ دور حاضر میں مشاعروں کے اسٹیج پر بوجھ اور بار ھتا ہی جا رہا ہے۔ ماضی میں تکیوں کے حساب سے' چار یا پانچ تکیوں والا اسٹیج سجایا جاتا تھا ۔ دلھن کی طرح سجائے گئے اسٹیج پر دو چار عمائدین نیم دراز ہوتے تھے ۔ آج اسٹیج کو ناپ کر بنایا جاتا ہے ۔ دس گز اور ندرہ گز طویل اسٹیج تو معمولی مشاعروں کے ہوتے ہیں۔ بعض اسٹیج پر ریلوے پلیٹ فارم کا گمان گذرتا ہے۔ یٹ فارم پر لوگ ریل گاڑی کی طرح سامعین کی آمد کے انتظار میں بے چین پہلو بدلتے بیٹھے ہوتے ہیں ۔

(بزم اُردو ادب ' الاحساء ' سعودی عرب کے مشاعرے میں پڑھا گیا مضمون)

اکثر لوگ اسٹیج پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں، چاہے وہ کلام سن سکیں یا نہ سن سکیں۔ ان بن بلائے مہمانوں کی وجہ سے اسٹیج کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے۔ صدر کا گھٹنا مہمان خصوصی کے پیٹ میں گھسا رہتا ہے۔ منتظم مشاعرہ کی کہنی ناظم کو ٹھوکے دیتی رہتی ہے۔ جونیئر شعراء بلا مبالغہ سینئر شعراء کی گود میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔ مشاعرے کا ناتواں اسٹیج صدر بلکہ صدور مشاعرہ، مہمانان خصوصی، مہمانان اعزازی، شعراء حضرات، ناظم، منتظمین مشاعرہ، صحافی، ارباب اقتدار، معززین شہر، مائیک ٹھیک کرنے، فوٹو اور ویڈیو لینے اور اونچا بیٹھنے کے خواہش مند اصحاب کے بوجھ سے ٹوٹنے لگتا ہے۔ یہی حال رہا تو عین ممکن ہے کہ مشاعرہ کے لوازمات سے اسٹیج کو ہی ختم کرنا پڑے۔ مشاعروں کو ختم ہونے سے بچانے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسٹیج کا بوجھ کم کیا جائے۔

اسٹیج کی آبادی میں مستقل اور مسلسل اضافے کے برخلاف مشاعرہ گاہ کے سامعین کی تعداد میں تشویشناک حد تک کمی ہو رہی ہے۔ سامعین کی تعداد اسٹیج پر بیٹھنے والوں سے کئی گنا کم ہو گئی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ سامعین کو اسٹیج فراہم کیا جائے۔ اور شعراء برادری مشاعرہ گاہ میں براجمان ہو۔ عرصہ تک شعراء سر اور گردن نیچی کر کے شعر سناتے رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اونچے اسٹیج پر بیٹھے سامعین کو کلام سنانے کے لئے وہ اپنی گردن سیدھی کر لیں۔ سر خود بخود اونچا ہو جائے گا۔ شعراء پر سامعین کی فراہمی کی پابندی عائد کرنے کے تعلق سے بھی سوچا جا سکتا ہے۔ دو سامعین کے عوض ایک قطعہ، تین کے لئے ایک غزل اور پانچ سے زائد سامعین کے بدلے میں طویل نظم سنانے کی اجازت دی جا سکتی ہے ایک سامع لانے پر غزل کا صرف مطلع سنانے کیلئے کہا جائیگا۔ جو شاعر اکیلا آئے گا اسے سامعین میں بیٹھنا ہوگا۔ چند دن قبل اخبار میں ایک مشاعرے کی رپورٹ پڑھی تھی جس کی سرخی "ایک سامع کا مشاعرہ" تھی۔ رپورٹ نامکمل تھی۔ رپورٹ میں شعراء اور ان کے کلام کا ذکر تھا لیکن یہ اطلاع نہیں دی گئی تھی کہ شعراء کو سننے اور برداشت کرنے پر اکلوتے سامع کا کیا حشر ہوا۔ اس بے چارے سامع کی تصویر، نام اور پتے کے ساتھ شائع ہونی چاہیئے تھی۔ اخبار والوں سے گذارش ہے کہ ادبی روداد میں سامعین کو شعراء پر فوقیت دیں۔ ان کے نام اور تاثرات شائع کریں۔ تاکہ سامعین کی ہمت افزائی ہو اور ادبی محافل میں ان کی تعداد میں اضافہ ہو۔ سامعین کے ساتھ بلکہ سامعین سے زیادہ تیزی سے اُردو کے قارئین عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ ادب تخلیق ہو رہا ہے اور ادیب اور شاعر حضرات ایک دوسرے کو سنا کر اور پڑھ کر داد اور بے داد دونوں پا رہے ہیں لیکن سامع اور قاری کی کمی سے تخلیق کا مقصد بھی پورا نہیں ہو رہا۔

سامعین اور قارئین سے محرومی اُردو زبان کا المیہ ہے۔ وجوہات کئی ہیں اور یہ محفل اسباب پر بحث کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ سامعین کو اکٹھا کرنے کے لیے منتظمین کو جو تگ و دو کرنی پڑتی ہے، اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ میں اور میرے رفقاء گاہے ماہے سامعین کو اکٹھا کرنے کی ریاضت کرتے ہیں۔

وہ دن خواب ہو گئے جب ادبی محفل کا اعلان سُن کر لوگ شوق اور اشتیاق سے استفسار کرتے تھے۔ اور مقررہ دن جوق درجوق جمع ہوتے تھے۔ ہمیں تو لوگوں کو فرداً فرداً دعوت دینی پڑتی ہے کہ فلاں دن مشاعرہ ہے' براہ کرم تشریف لائیے۔ جواب میں عجیب وغریب باتیں سننی پڑتی ہیں۔ اکثر لوگ مقررہ دن مصروف رہتے ہیں۔ پہلے ہی سے پروگرام طے رہتا ہے۔ کسی کے گھر دن ڈش تو کسی کے یہاں برتھ ڈے پارٹی رہتی ہے۔ کوئی چادر تان کر سونا چاہتا ہے تو کوئی چکن تکہ تیار کرلے پر مامور ہے۔ کسی کو گھر میں جھینگر مارنا ہے تو کسی کو شاپنگ کروانی ہے۔ ایک صاحب نے بچوں کے ساتھ وقت گذارنے کا عذر پیش کیا۔ ہم نے بچوں کو ساتھ لانے کا مشورہ دیا تو فرمایا۔ "بچوں کو اُردو نہیں آتی"۔ ہم نے آسانی سے ہار نہ مانتے ہوئے جواب دیا۔ "مشاعرہ میں شرکت سے بچوں کو اُردو سے لگاؤ پیدا ہوگا اور انہیں اُردو سکھانے میں سہولت ہوگی"۔ موصوف نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ " انہیں کون سکھائے گا' اُردو۔ مجھے خود اُردو نہیں آتی"۔ ہماری رسائی ان کے والد محترم تک نہ تھی اس لئے چپ ہونا پڑا۔ ادبی محافل منعقد کرنے کی پاداش میں لوگوں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سہنی پڑتی ہے۔ "کیا آپ لوگ کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کرسکتے؟ جب دیکھو تب عرض کیا ہے' عرض کیا ہے' کی رٹ لگائے وقت ضائع کرتے رہتے ہیں"۔ قصہ مختصر نامساعد حالات میں منتظمین کو کام کرنا پڑتا ہے۔ ہال میں موجود سامعین کی تعداد منتظمین کی محنت اور حسنِ انتظام کا ثبوت ہے۔

سامعین کرام' توجہ چاہتا ہوں۔ مجھے سامع بننے سے محروم کرکے محمود شاہد نے میرا ذاتی نقصان کیا۔ میں مہمان خصوصی نہ بن کر آپ کے درمیان بیٹھا کسی بہتر مہمان خصوصی کی تقریر سن رہا ہوتا۔ ہر سامع خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہنگامہ اور یہ محفل سامعین کے لئے ہے۔ آپ ادبی محفلوں کے نوشہ ہیں اور آج مجھے نوشہ بننے سے محروم کردیا گیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوں تو شعراء حضرات ایک پلیٹ فارم پر مشکل سے جمع ہوتے ہیں۔ مختلف مکاتبِ خیال کے شعراء کو آپ نے یکجا کیا ہے۔

سامعین' مشاعروں میں شرکت کا ایک اہم گُر آپ کو بتاتا ہوں۔ داد شاعر کی سب سے بڑی کمزوری اور سامع کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ کسی شاعر سے پوچھئے داد کیا ہوتی ہے۔ داد شہرت کا درجہ رکھتی ہے اسی لئے شاید شاعر کو معاوضہ سے زیادہ فکر داد کی رہتی ہے۔ داد کے ذریعہ سامعین شاعر اور مشاعرے کو قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ آپ شاعر کو داد پر نچا سکتے ہیں۔ واہ' واہ کہتے جائیے اور شاعر کے سلام وصول کرتے جائیے۔ واہ واہ کا شور بلند ہوا کہ شاعر کے ہاتھ آداب بجانے کے لئے اُٹھ گئے اور پھر واہ' واہ کی لے پر شاعر رکوع میں چلا جاتا ہے۔ ریموٹ کنٹرول کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ مکرر مکرر کہہ کر شعر دوبارہ' سہ بارہ بلکہ کئی مرتبہ پڑھوا سکتے ہیں۔ بعض سامعین مکرر مکرر الاپ کر شعر کا مطلب سمجھ میں آنے تک پڑھوا لیتے ہیں۔ مکرر مکرر کا نعرہ تحسین بلند کرکے غلط شعر پر شاعر کو سزا بھی دی جاسکتی

ہے۔ غلط شعر پڑھتے پڑھتے شاعر نڈھال ہوجاتا ہے۔ صدر مشاعرہ شاعر کو کلام سنانے کی اجازت دیتا ہے لیکن شاعر کو روکنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ سامعین بااختیار ہوتے ہیں۔ شاعر اور مائیک میں مقناطیسی ربط ہوتا ہے، قریب ہوتے ہی دونوں چمٹ جاتے ہیں۔ سامعین غلط وقت پر 'واہ' واہ اور 'مکرر' مکرر کا ورد کر کے شاعر کو مائک سے جدا کر سکتے ہیں۔

مشاعرہ کو کامیاب بنانے میں سامعین کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہاتھ اُٹھاکر، ہاتھ ہلاکر، ہاتھ لہراکر، ہاتھ دکھاکر، ہاتھ بٹھاکر اور ہاتھوں سے تالی بجاکر مشاعرے کو کامیابی یا ناکامی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ ہاتھوں سے داد اور بے داد کے اور بھی طریقے ہیں جو خوش قسمتی سے اردو ادب میں رائج نہیں ہیں!

داد دینا ایک فن ہے۔ بعض سامعین اس فن میں ماہر و یکتا ہوتے ہیں۔ ایسی داد دیتے ہیں کہ شاعر پریشان ہوجاتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ داد دی جارہی ہے یا وہ ہوٹ ہو رہا ہے۔ بے بسی سے ٹکٹکی باندھے سامعین کو دیکھتا رہتا ہے۔ غلط فہمی میں مبتلا ہوکر ہوٹنگ کے جواب میں بھی جھک جھک کر سلام کئے جاتا ہے۔

سامعین کے بغیر مشاعرہ کا لطف نہیں آتا۔ داد کے شور کے درمیان جملے اور فقرے چست کر کے سامعین مشاعرے میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ شہر ریاض کے مشاعرے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک شاعر اپنی طویل نظموں سے سامعین کو بور کر کے چلے گئے۔ دوسرے شاعر پڑھنے آئے، مضطرب سامعین پر نظر دوڑائی اور کہا "ماحول کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا پڑھوں"۔ سامعین میں سے آواز آئی۔ "لاحول پڑھئے اور بیٹھ جائیے۔"

سامعین کرام۔ آپ کو اپنی اہمیت اور ذمہ داری کا اندازہ نہیں ہے۔ ماضی میں ادب کی سرپرستی نواب اور بادشاہ کیا کرتے تھے۔ جمہوری دور میں ادب کی آبیاری سامعین اور قارئین کے ذمہ آن پڑی ہے ادب زندگی کی تنقید ہے اور تنقید کے بغیر زندگی نکھر نہیں سکتی۔ جب آپ اپنی ذمہ داری نبھانے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو شعراء اور ادیبوں کا بڑا سخت امتحان ہوگا اور ان کی تعداد میں خاطر خواہ کمی ہوگی۔ ہمارے ایک شاعر دوست کہتے ہیں۔ "اردو کا قاری اور سامع خوابِ غفلت کی نیند سو رہا ہے۔ یوں ہی اسے سونے دو۔ اسے نہ جگاؤ" ان کے ساتھ ہوتا بھی یہی ہے جب وہ کلام سناتے ہیں تو آدھے سے زیادہ سامعین خراٹے بھر رہے ہوتے ہیں۔

معزز سامعین۔ ادب آپ کی توجہ کا طلب گار ہے۔ اُٹھیئے اور اپنا فرض نبھائیے۔ ••

ڈاکٹر حبیب ضیاء (حیدرآباد)

دعوت، میزبان اور ہم

حیدرآباد اپنی مخصوص تہذیب اور روایات کے لیے شہرت رکھتا ہے یہاں کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ شیروانی اور بریانی۔ لیکن اب نہ وہ شیروانی رہی نہ بریانی۔ شیروانی اتنی مہنگی پڑنے لگی ہے کہ بعض لوگ اپنے بچوں کی شادی میں بھی اپنی شادی کی شیروانی پہننے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ بریانی کا جو حشر ہو رہا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

گذشتہ زمانے میں دعوتوں کے لوازمات کچھ اور تھے۔ عموماً لقمی، کباب، مرچ کا سالن، دہی کی چٹنی، نان، دو قسم کی بریانی، اور ایک یا دو قسم کے میٹھے دسترخوان کی زینت ہوا کرتے۔ رفتہ رفتہ لوازمات میں تیزی سے تبدیلی آتی گئی۔ اب تو یہ حال ہے کہ نودولتیوں اور شیخی خوروں میں دیوانہ وار مقابلہ چل رہا ہے کہ کس کے پاس دعوت میں کتنے لوازمات تھے۔ چنانچہ ایک دعوت کے بارے میں سنا گیا کہ بکرے کے تمام اعضاء کی ہمہ اقسام کی ڈشیں دسترخوان پر چنی گئی تھیں۔ جیسے نہاری، دم کا قیمہ، دم کا گوشت، کوفتے، سیخ کے کباب، بوٹی کباب، پسندے، تلے ہوئے گردے، بھونی ہوئی کلیجی، جلا ہوا دل، ابلا ہوا پھیپھڑا وغیرہ۔ ہم دنگ رہ گئے ہم نے میزبان کے لیے دعا مانگی۔ اے ساری دنیا کے مالک، تو انھیں اتنا نواز کہ بکرے کی کھال، دم اور کھروں کی بھی نت نئی ڈشیں بنا کر لوازمات میں اضافہ کرسکیں۔ آج کل اکثر دعوتوں میں بوفے کا طریقہ رائج ہے۔ بوفے کا مطلب ہے جو دوڑے وہ لوٹے۔ حیدرآبادی بوفے ایک انگریز کے لیے الجھن کا باعث بن گیا۔ مغربی نفاست کے ساتھ آداب محفل کو ملحوظ رکھ کے وہ دیگر مہمانوں کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا۔ آن کی آن میں سارے مہمان کھانوں پر ٹوٹ پڑے، چھینا جھپٹی ہونے لگی۔ پریشانی کے عالم میں وہ واپس اپنی کرسی پر آگیا یہ کہتے ہوئے کہ دولہا دلہن والوں میں زبردست لڑائی چل رہی ہے۔

ایک دعوت ہمیں بہت اچھی لگی۔ بوفے سسٹم تھا۔ بہت بڑے احاطے میں کھانے کا انتظام تھا۔ نمائش کے اسٹال لگ رہے تھے۔ کھانے میں سبھی کچھ تھا۔ ہر ڈش کے پاس منتظمین کھڑے کھانے والوں کی مدد کر رہے تھے۔ تعجب تو اس بات پر ہو رہا تھا کہ گلاب جامن، چمچم، آئسکریم جیسے مہنگے اور لذیذ لوازمات پر بچے ٹوٹ نہیں پڑ رہے تھے۔ مزید تعجب یہ کہ ان کے ماں باپ بھی بہت تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پان، چائے، کافی پر بھی لوٹ مار نہیں تھی۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا اگر ہر دعوت کے مہمان ایسے بن جائیں تو حیدرآبادی تہذیب پھر

لوٹ کر آ سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں حیدرآباد کی دعوتوں کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ میزبان اور مہمان تو وہی حیدرآبادی ہیں لیکن پرانی اقدار باقی نہیں رہیں۔ دسترخوان کے لوازمات میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً امیر، فقیر، رئیسی والے گوشت کا حلیم سب سے پہلے میز پر نظر آتا ہے۔ کبھی سادہ تو کبھی کاجوؤں سے ڈھکی ہوئی۔ پیچھے سے اٹھاؤ تو ـــــ یا تو آنا نہیں چاہتی یا ساری کی ساری پیچھے سے لپٹ کر چمچہ گری کا ثبوت دیتی ہے۔ بٹلروں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ جب تک کرسیوں پر بیٹھے آٹھ افراد حلیم کھا کر مرچ کے سالن سے آدھا شیرمال نہ کھالیں مرغ کو میز پر ہرگز نہ لائیں۔ نتیجہ یہ کہ جو حلیم کھانا پسند نہیں کرتے مرچ کے سالن کا پرہیز ہے تو خفت مٹانے کے لیے ترکاری کی ڈش سے مولی گاجر کے ٹکڑے اٹھا کر چبانا شروع کردیتے ہیں۔ مرغ کی طرف آئیے۔ اس ظالم نے تو مہمانوں کے رہے سہے آداب دسترخوان بھی مکمل طور پر چھین لیے ہیں۔ مرغ جیسے ہی میز پر آتا ہے ویڈیوگرافر حرکت میں آجاتے ہیں اور ٹوٹ کر کنگالی پن سے کھانے والوں کے نوالوں، بلکہ گالوں کو زندگی بھر کے لیے ویڈیو میں بند کرلیتے ہیں۔ ایک صاحبہ ڈنر کے دوسرے دن خاندان بھر میں شکایت کرتی پھر رہی تھیں کہ سمدھاوے میں انھیں کسی نے پوچھا تک نہیں۔ میز پر مرغ کی صرف گردنیں ہی گردنیں تھیں۔ ویڈیو تیار ہو کر آیا۔ سبھوں نے مل کر دیکھا۔ شاکی خاتون کو جیسے سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ رکابی مرغ سے بھری ہوئی تھی اور ایک گال ایسے پھولا ہوا تھا جیسے ہندوستانی فلموں کے ہیرو کی مار سے ویلن کا پھول جاتا ہے۔ مہمان نڈر سے بن کر کھانے لگے ہیں۔ میزبان بھی کافی بدل گئے ہیں۔ اپنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ صرف اپنی جان پہچان والوں ہی کی رکابی پر نظر رکھتے ہیں بعض شیرنیاں جلدبازی اور لوازمات کو لوٹنے کے لیے چمچوں کی بجائے ہاتھوں کا بھی استعمال کرتی ہیں۔ ان حرکات سے ہمیں بڑی کوفت ہوتی۔ اکثر ہم خاموشی سے بھوکے ہی اٹھ جاتے۔ لیکن برسوں کی ریاضت کے بعد ہم نے بھی دعوتیں لوٹنے کا گر سیکھ لیا ہے۔ تلخ تجربات کی روشنی میں ہم نے چند موثر نسخوں کو اپنایا ہے۔ اب ہم گھر ہی سے ہاتھ دھو کر نکلتے ہیں۔ ڈائننگ ہال کی قریب ترین کرسی کا انتخاب کرتے ہیں۔ میزبان خواتین کی ہر چھوٹی بڑی حرکت پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ جیسے ہی وہ چند مخصوص خواتین کو اڑا لے جانے کی کارروائی شروع کرتی ہیں اس سے پہلے نہ صرف ہم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں بلکہ قریب بیٹھی ہم جیسی دو چار معصوم خواتین کو بھی ورغلاتے ہیں "جلدی چلیے"۔ "کیوں؟" "میرے پیچھے چلیے"، "کہاں" ـــ "یہ سوال پوچھنے کا وقت نہیں بس جلدی سے اٹھیے"۔ ڈائننگ ہال پہنچ کر کرسی سنبھال لینے کے بعد ذرا دم لے کر وہ ہمارا شکریہ ادا کرتی ہیں کہ اگر آپ نہ ہوتیں تو ہمیں دوسرے دسترخوان کا انتظار رات کے گیارہ بجے تک کرنا پڑتا۔ بہرحال ہم کھانا کھا لیتے ہیں لیکن اس پر بھی ہمارا ضمیر ہمیں ٹوکتا ہے۔ بے وقوفی چھوڑو۔ لوازمات پر نظر ڈالو۔ دعوت میں تم نے کھایا ہی کتنا ـــ؟ آٹو پر کتنا خرچ کیا ـــ؟ سوچو تو!! ہم خوابِ غفلت سے جاگ اٹھتے ہیں۔ اب ہم اپنے ساتھ تین قسم کے لفافے رکھتے ہیں۔ ایک سو ایک روپیہ والا، اکاون روپیہ والا اور اکتیس روپیہ والا۔ اگر میزبان نے ہماری اچھی خاطر کی، لوازمات بھی من پسند رہے دسترخوان کی سیٹنگ سے سابقہ نہ پڑا ہو تو ہم کھانا کھانے کے بعد خوشی خوشی، فاتحانہ انداز سے ایک سو ایک روپیہ والا لفافہ تھما دیتے ہیں۔ کچی پکی مرغی، حلیم جیسے لوازمات ہوں تو اکاون روپیہ والا ـــ بغیر

گوشت کے قیمے سے، تیل میں ڈوبے چاولوں کی بریانی، اور دیگر لوازمات بھی پسند آئیں تو پچیس روپیہ۔ اگر لوازمات میں سے ایک، آدھ ہم کھانا چاہتے ہیں اور ہم سے پہلے کوئی شیرنی ان کو کھا رہی ہیں۔ تو ہم تینوں فاقے والیوں سے آتے ہیں۔ آنسو وہ اور کار گرنے ہیں۔ ایک بار کوشش کیجیے۔ یقیناً ہمارے لیے دعا کی دعا یا یا!

روشن لال روشن بناری

غزل

○

رخ پہ بارہ بجائے بیٹھے ہیں
مار بیگم سے کھائے بیٹھے ہیں
ہم کو دے کر خطاب شوہر کا
اپنا نوکر بنائے بیٹھے ہیں
لوا سر بزم پیٹ ہت بیگم
دیکھ اپنے پرائے بیٹھے ہیں
جب سے کرسی نشیں ہوئے صاحب
اک قیامت اٹھائے بیٹھے ہیں
کاش بنیا ادھار دے دیتا
چند مہمان آئے بیٹھے ہیں
ہم انہیں چاہتے تھے دل دینا
وہ ہو بٹوا چرائے بیٹھے ہیں
وہ کھڑے ہلو ہلو صاحب ہیں
یہ غریب ہائے ہائے بیٹھے ہیں
کیوں نہ مائک پہ رینکتے لیڈر
یہ گدھے گھاس کھائے بیٹھے ہیں
حسن کے استرے کی دھار نہ پوچھ
عشق میں سر منڈائے بیٹھے ہیں
یہ مرے باپ کا فیض ہے روشن
آپ وہ بیٹھے بٹھائے بیٹھے ہیں

ﷺ دعوت

رباعیات

پنڈت ہیں مولوی ہیں یا افسر ہیں
ناقد ہیں محقق ہیں کہ ایڈیٹر ہیں
شاعر کی یہ ذات اور تیور دیکھو!
لگتا ہے کسی ملک کے ڈکٹیٹر ہیں

○

منظور ہے فلم میں وہ ایکٹر بن جائے
اچھا ہے پسر میرا جو لوفر بن جائے
لیڈر وہ بنے کہ چور اچکا کوئی
یارب نہ مگر وہ کہیں شاعر بن جائے

○

محنت کرے مزدور تو کمائے زردار
شاعر کا کلام گا کے کمائے گلوکار
یہ سب ہے روا جب تو برا کیا اس میں
پبلک کی کمائی کو جو کھائے سرکار

○

مذاق جھانسوی
(جھانسی)

کچھ دوہے

اس نے مجھ کو پیار کی کبھی نہ ڈالی گھاس
دل میرا بن پیار کے رہنے لگا اُداس

گُم صُم دونوں ہی رہے کھولی نہیں زبان
دروازے کی دستکیں دیواروں کے کان

خوش ہو کر سسرال کو آج کی دلہن جائے
بیوٹی پارلر میں سبھی کیسے نیسر بہائے

ابھی اکیلے ہو میاں، بیوی گھر میں لاؤ
تمہیں پتہ چل جائے گا آٹے دال کا بھاؤ

بچہ بولا باپ سے آپ رہیں چپ چاپ
آپ آج کے باپ ہیں مَیں ہوں کل کا باپ

انگ انگ کا لے لیا درزی نے جب ناپ
جانے کیوں شرما گئی گوری اپنے آپ

کر کے ختم مشاعرہ جب ہم گھر پہ آئیں
غزل ملے بس جاگتی مصرعے سب سو جائیں

اثر بدایونی
بمبئی

غزلیں

مُنہ میں تو ہے زبان مگر بولتے نہیں
ہلتا ہے بات بات پہ سر بولتے نہیں

ناراض ہم سے کوئی جو ہے تو ہُوا کرے
کہتے ہیں گُڑ کو گُڑ ہی، شکر بولتے نہیں

بیگم یہ پوچھتی ہیں، بریک فاسٹ کے لئے
مرغوب ہے چنا کہ مٹر بولتے نہیں

کہتے ہیں "ابّا جان" وہ جورو کے باپ کو
لیکن سگے پدر کو پدر بولتے نہیں

شاید کہ ہے درازیٔ شب کا بہت ملال
"پر جھاڑتے ہیں مرغِ سحر بولتے نہیں

مالی نے دونوں ہاتھ سے لوٹا ہے یہ چمن
کب تک یہ بات برگ و ثمر بولتے نہیں

کیا تم نے روزہ رکھ لیا چُپ شاہ کا اثر
سُن کر اُدھر کی بات اِدھر بولتے نہیں

رشید عارف
(پٹنہ)

سُسرال میں کھڑا ہوں گنہگار کی طرح
ہر شخص ہے یہاں کا حوالدار کی طرح

یہ سوٹ اور ٹائی کہاں اور تم کہاں
صورت سے لگ رہے ہو چڑیمار کی طرح

لرزے ہے دل ہمارا سرِ راہ خوف سے
جب گھورتا ہے کوئی چھُری مار کی طرح

"بارو" کے رہنے والے ہو! آتا نہیں یقیں
باتیں تو کر رہے ہو سمجھ دار کی طرح

بھاری کمر ہے پتلی ہیں ٹانگیں جناب کی
ہے جسم اِک ستارۂ دمدار کی طرح

دولت کا ہے نشہ کہیں طاقت کا ہے نشہ
ہر شخص لگ رہا ہے نشہ خوار کی طرح

رشتوں کا احترام بھی باقی نہیں رہا
اب شادیاں تو ہوتی ہیں بیوپار کی طرح

چوری، ڈکیتی، جھانسہ وغیرہ بہت ہیں کام
کیوں مارے مارے پھرتے ہو بیکار کی طرح

مجروح کی زمین عارف کی یہ غزل
لگتی ہے ایک شوخ کی گفتار کی طرح

ع۱۔ بے وقوفی کے لیے بہار کا مشہور قصبہ

شفیقہ فرحت
(بھوپال)

سمتِ رانچی

چلتے چلاتے ہم پہنچے رانچی - بات حیرت کی قطعی نہیں کہ ہماری جو حرکتیں ہیں - اس میں ہمارا رخ گوالیار اور آگرہ کی جانب ہی ہونا چاہیے تھا اور منزل رانچی لیکن وہ محفل دانش وروں کی تھی اور سفر دانش مندی کا۔ اور اسی سفر میں ہاتھ آئی ہے یہ سرگزشتِ شہاب یا شہاب نامہ جو نام بھی آپ اسے دے لیں - کہیں یہ نہ پوچھ بیٹھیے کہ یہ حضرتِ شہاب کون صاحب ہیں شاعر ویسے ہی نازک مزاج ہوتے ہیں - ان کا مجموعۂ کلام سورج کا شہر اسی زمانے میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر رہا تھا - پھر وہ تو اسٹیج ایکٹر بھی ہیں - ایسی گھن گرج کے ساتھ ڈائیلاگ بولتے ہیں کہ سننے والا بے وجہ کانپ جائے۔

خیر ان شہاب جعفری کو تو راستے میں چھوڑیں اور اپنے سفر پہ چلیں

کل ہند یونیورسٹی ٹیچرس اردو ایسوسی ایشن پتہ نہیں کب سے قائم ہے اور خبر نہیں کب تک قائم رہے گی - کہ ان دنوں خبر سے زیادہ بے خبری کا دور دورہ ہے --- اکیسے کیسے اہم اور پُرفضا مقامات میں کانفرنسیں ہوئیں - سری نگر، دلی، لکھنو، جے پور - مگر ہمیں جانا نصیب نہ ہوا - اور کشش کھینچ کر کہاں لے گئی ---- رانچی - کوئی ربط خاص تو ہوگا ہی ---- !

ہاں صاحب - تو ہم موسم سرما کی چھٹیوں میں یونہی چلتے چلاتے دہلی تک آئے تھے - ڈاکٹر قمر رئیس سے ملاقات ہوئی - وہ انجمنِ اساتذہ کے سکریٹری تھے -

فرمایا - " رانچی کانفرنس میں چل رہی ہیں ---- " بالکل ایسے جیسے کوئی کہے - " پرانی دلی سے نئی دلی چل رہی ہیں "

یہ قمر رئیس کا مخصوص انداز ہے - دھیما دھیما - کچھ جاگا سا کچھ سویا سا -

لوگ سگ گزیدہ ہوتے ہیں - مردم گزیدہ ہوتے ہیں - ہم بے چارے مروت کے مارے ہیں - مروتاً

حامی بھرلی۔ اب جو وعدہ کرلیا تو پھر مکرنا کیسا ۔؟

حالاں کہ اس زمانے میں رانچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو تھے ۔ پروفیسر ڈاکٹر وہاب اشرفی ۔ ان سے ہم ویسے ہی خوف کھاتے تھے اور ہر ذی ہوش کو کھانا چاہیے ۔ ثبوت کے طور پر یہ ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ "سہیل" میں ان کا تازہ ترین خط جو اس برق رفتاری سے بھیجا گیا ہے کہ اس پر روایتی اور پرانے خطوط نویسوں کا آخری جملہ :

"اس خط کو تار سمجھنا" یاد آگیا !

واقعی ڈاک کیے نے بھی اسے تار سمجھا ۔

اور ہم نے بے تار برقی ——!

ہاں صاحب تو وہ فرماتے ہیں ۔

" شاید آپ کو یہ اطلاع مل چکی ہوگی کہ میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کا چیرمین بنا دیا گیا ہوں ۔ یہ عہدہ بہار میں پہلی بار کسی مسلمان اور اردو داں کے حصے میں آیا ہے ۔ کمیشن کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے ۔ تمام لکچرار، ریڈر، پروفیسر کا تقرر اسی ادارے سے ہوتا ہے ۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسل، یونیورسٹیوں کے رجسٹرار، فینانس آفیسر سب ہی اسی ادارے سے بحال کیے جاتے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔"

خیر یہ تو دور پرے یعنی مستقبل کی بات تھی ۔ مگر کہا گیا ہے نا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ۔ تو ماہ، بالا کا رکھ رکھاؤ، اشرفی صاحب میں ۱۹۷۷ء میں ہی اور میں بھی پایا جاتا تھا ۔ گویا اس وقت بھی وہ اشرفی تھے چوبیس کریٹ کی ۔ ہمارے آپ کی طرح گلٹ کے روپے اٹھنی نہیں) ۔!

شرکا کی فہرست A to Z ہمارے ذہن میں نہیں ۔ ہم سفروں کے اسمائے گرامی بتادیتے ہیں ۔ جس سے آپ کے ذہن میں خود بخود سفر کی نگینیوں کی بجلیاں کوند جائیں اور ان قہقہوں کا شمار کرسکیں جو دس بارہ گھنٹوں میں لگائے گئے تھے ۔

نمبر ۱ ۔ روشن آرا بیگم ۔ یعنی بیگم ڈاکٹر محمد حسن ۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر محمد حسن صدر انجمن تھے ۔ لہذا وہ ہمارے استقبال کی خاطر دو دن پہلے اڑ چکے تھے ۔ آزاد پنچھی کی طرح —— !

نمبر ۲ ۔ ڈاکٹر قمر رئیس ۔ صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی ۔

نمبر ۳ ۔ عبدالحق ۔ جو شاید اس وقت ڈاکٹر نہ تھے (صرف طبیب یا مریض ہوں گے)

نمبر ۴ ۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں

نمبر ۵ ۔ ڈاکٹر کامل قریشی نمبر ۶ ، ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین ۔ یہ دونوں عالم بالا کی جانب پرواز کر چکے ہیں ۔

نمبر ۷ ۔ جناب انور احمد خاں ۔

نمبر ۸ پروفیسر شہاب جعفری اور نمبر ۹ یہ خاکسار ۔

گاڑی غالباً تامل ناڈو ایکسپریس تھی جو خدا جانے کہاں سے چل کر انئی دلی صبح چھ بجے پہنچتی تھی ۔ بھلا بتائیے یہ یوں رات والی گاڑی سے جانے کی کیا تک تھی . . . . مگر سفر رانچی میں عقل کا کیا دخل —— !

طے یہ ہوا تھا کہ قافلہ رات گیارہ بجے اسٹیشن پہنچ جائے گا اور گپ بازی اور دھما دھم بازی کے سہارے شب بیداری کے مزے لوٹے گا۔ میں چاندنی چوک میں جناب کوثر چاندپوری کے گھر ٹھہری تھی۔ لہٰذا مجھے بے کسی و بے بسی کو دس بجے بجے ہی اسٹیشن پہنچ جانا پڑا۔ لیکن بقیہ افراد کا کہیں پتہ نہ پایا۔ تھک ہار کر لیڈیز ویٹنگ روم میں بستر کھول کے منہ ڈھانپ کے پڑے رہے۔

صبح تڑکے ایک ایک کر کے سب نجم السحر کی طرح نمودار ہوئے۔ گاڑیاں بھی عہدِ رفتہ میں کبھی کبھی وقت کا خیال رکھ لیا کرتی تھیں اور آپ کو اپنی ریزرو برتھ بھی مل جایا کرتی تھی۔

مہینہ نومبر کا تھا اور شہر دلی کا۔ سردی کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجیے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی چائے کے دو ریلے اور سب رات کی بقیہ نیند پوری کرنے لگے۔

دس گیارہ بجے ناشتے اور چائے سے فارغ ہو کر گپ شپ شروع ہوئی۔ باتیں تو ہزار ہوئی ہوں گی۔ عالمانہ بھی اور فاسقانہ بھی مگر ان سب کا سرگزشتِ شہاب یا شہاب نامے سے کوئی تعلق نہیں (ویسے ہمیں وہ ساری باتیں یاد کب ہیں ـــ) میں تو صرف وہ بارہ اشعار سنا رہی ہوں جو سب نے مل ملا کر فی البدیہہ شہاب جعفری پر کہے۔

اس وقت ہم سب کا نشانہ شہاب جعفری ہی تھے۔ کیوں کہ وہ دوسرے ڈبے میں تھے۔ اور جاتے جاتے ہمیں ایک جملہ عنایت کر گئے تھے۔

"ذرا مرغا پر پھڑپھڑا لے تو تو پھر آتا ہے"

وہ تو چسکیاں لے لے کر پھڑپھڑاتے ہی رہ گئے اور یہاں یاروں کی رگِ شاعری ایسی پھڑکی کہ بحرِ خفیف اور بحرِ طویل میں ہائیکو اور دو غزلے اور سہ غزلے عالمِ وجود میں آ گئے۔

مطلع شاید قمر رئیس نے کہا کہ میر کارواں وہی تھے۔ یا ہو سکتا ہے کامل قریشی کی نیت ہو کہ شہاب جعفری نے جملہ انھیں کی طرف اچھالا تھا۔

ہاں صاحب۔ تو مطلع عرض ہے:

شغل فرماتے ہیں اب ہم سے شہاب جعفری
اس سفر میں ہیں جدا ہم سے شہاب جعفری

ایک مصرعہ کوئی کہہ رہا ہے۔ دوسرا کوئی۔ کاٹ چھانٹ، اصلاح سب چل رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ریل کی گڑگڑاہٹ کے باوجود ڈبے کی آہنی چھت اڑائے دیتے رہے ہیں۔ دوسرے مسافر پریشان کہ بظاہر سنجیدہ اچھے خاصے سن رسیدہ عورتوں، مردوں کو ہو کیا گیا ہے۔ نہ بھنگ کا موقع نہ زعفران کے کھیت آس پاس۔

اب انھیں کون سمجھاتا کہ سمتِ ناتجی کا یہی عالم ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت منشی گیری پہ معمور کر دیا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی چونی، اٹھنی والی نوٹ بک تھما دی گئی کہ شعر آپ کہہ نہیں سکتیں۔ نوٹ تو کر سکتی ہیں۔ لہٰذا اس سرمایۂ سخن کو محفوظ کیجیے ـــ"

پھر تو ہماری نوٹ بک ساری کانفرنس میں، کانفرنس میں پڑھے جانے والے تمام مقالوں سے زیادہ مقبول ہوگئی۔ جہاں کوئی "راہ مستقیم" سے ہٹا اور ہم نے نکالی نوٹ بک اور ادھر ادھر سے آوازیں آنے لگیں۔۔ "ذرا سنبھل کے ورنہ داخل دفتر ہسٹری شیٹر ہو جاؤ گے ۔۔۔۔"

کیا کوئی پولس کے روزنامچے سے خوف زدہ ہوگا جو اہل کانفرنس ہماری نوٹ بک سے تھے۔ وہ خزانہ جو اس میں بند ہے اس کے دیدار ہم پھر کبھی کرائیں گے۔ فی الحال اشعار سنیے۔ شہاب جعفری کی شان میں کہے گئے۔

شہاب جعفری کو شاید کسی مخبر نے خبر کر دی یا ان کی ساتویں آٹھویں حس بیدار ہو گئی کہ میاں سارا ڈبہ آپ کے ترییوں حزب مخالف کا رول ادا کر رہا ہے۔ سو چند اشعار کے نزول کے بعد ہی وہ ہمارے ڈبے میں آگئے اور طائفۂ شعراء میں شامل ہو گئے تو عرض کیا کسی نے:

تو عرض کیا کسی نے :

شغل فرماتے ہیں اب رم سے شہاب جعفری
اس سفر میں ہیں جدا ہم سے شہاب جعفری

جب بھی آدھمکے ادھر دم سے شہاب جعفری
کم نہیں تھے ایٹمی بم سے شہاب جعفری

غم کدے میں خم کے خم سر ہیں وہ محو ناؤ نوش
کہہ رہے ہیں کیا کسی ۔۔۔۔ شہاب جعفری

قیصر و زریں[۱] کے بدلے قاسمی و انجمی ہیں ساتھ
لے رہے ہیں کام مرہم سے شہاب جعفری

انجم و انور جہاں سے کر کے قطع دوستی
پھر رہے ہیں آج برہم سے شہاب جعفری

سامنے سے کوئی شئے آتی ہے دیکھو تو سہی
لگ رہے ہیں ابن آدم سے شہاب جعفری

سوچ گنگا نے کہا دریا ہو تم بھی
آج جب گذرے تھے سنگم سے شہاب جعفری

صورتاً لگتے ہیں جیم جم سے شہاب جعفری
ہیں مزاجاً یوں تو ضیغم سے شہاب جعفری

چھوڑ کر وسکی و رم پینے لگے آب حیات
ہو گئے آزاد ہر غم سے شہاب جعفری

آئیں پینے پہ تو دریا بھی چڑھا جائیں شہاب جعفری
اور کبھی مدہوش شبنم سے شہاب جعفری

۱؎ قیصر اور زریں ۔۔۔ علی گڑھ گرلز کالج کی طرح دار ریڈر اور لکچرار۔ قاسمی ۔ یعنی عبدالستار قاسمی

دخترِ رز نے گو رکھنے دیا نہ پیٹ پہ ہاتھ
کر گئے کام اپنا تنگ دم سے شہاب جعفری
بحرِ رم کے لغزشِ رفتار بابھی ہے غضب
رقص کرتے ہیں چھم چھم سے شہاب جعفری

جب شہاب جعفری کا قافیہ تنگ ہو گیا تو نصیر خاں کو فاتر لک ریخ پر لا کھڑا کیا گیا۔

پھر پیٹتے ہیں تاش کے پتے نصیر خاں
بھاری ہیں اب تو سو پہ ہنستے نصیر خاں
وہ چاہتے تھے میم ملے وہ نہ مل سکی
ہاتھ آ گئے ہیں ہاتھ میں سب کے نصیر خاں
میٹھی اگر ہے شہد تو کڑوے بہت ہیں ڈنک
چھیڑو نہ اب بھڑ دل کے یہ چھتے نصیر خاں

کامل قریشی (فضل حق) پتہ نہیں کب اور کیوں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ کسی نے فرمایا:

نام اس قاتل کا سن کے فضل حق ہیں خموش

فی البدیہہ مشاعرہ کے ختم ہونے سے پہلے کسی اسٹیشن پہ خوش رنگ لال چتیوں والے بڑے بڑے امرود خریدے گئے تھے۔ ایک لطیفہ اور ایک شعر اس پہ ہو گیا۔ پہلے شعر سنیے:

پیوند سیب میں جو لگا ہے انار کا
ساغر میں گویا عکس ہے رخسارِ یار کا

اور لطیفہ یہ ہے:

روشن آرا صاحبہ نے چھانٹ کر بڑا سا امرود اٹھایا۔ کسی نے انتخاب کی داد دی۔ کسی نے واہ وا کا نعرہ لگایا۔ میں نے کہا:

"انھیں سب سے بڑی چیز لینے کی عادت ہے۔

شاید اس سفر میں اس سے پہلے بھی وہ اپنی اس عادت کا مظاہرہ کر چکی ہوں گی۔
اس پر انھوں نے انتہائی فخر سے فرمایا:

"میں کیا کروں میری قسمت میں بڑی ہی چیزیں ہیں"

قمر رئیس نے چھکا مارا:

"بڑا تو ہے مگر ذرا ہلکا ہوا"

اس پر جو قہقہے لگے انھیں تولا تو جا سکتا ہے۔ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔
بس یونہی ہنستے ہنساتے، موجِ حوادث سے گزرتے ڈوبتے ابھرتے، دوسری صبح رانچی پہنچے۔ رانچی آنے

سے پہلے پھر تین مصرعے نازل ہو گئے :-

اے وادیِ دہاب
جب آگئے شہاب
یوں خانماں خراب

ہمیں بھی اشعار کے دائرے میں باندھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر ہم نے پھر ہماری نوٹ بک، ویسے ہی سب کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ بڑی محنت سے صرف ایک مصرعہ موزوں ہو سکا :۔

اس سفر میں چلیں ساتھ شفیقہ فرحت

اس کے آگے ہماری نوٹ بک کوری ہے ۔

لہذا ہم بھی قلم ہاتھ سے رکھ دیں ۔ اس اعتراف کے بعد کے کانفرنس میں احمد جمال پاشا، بیگم و ڈاکٹر ثریا حسین ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں، افسر جہاں، قاضی عبدالستار، پروفیسر مجاہد اللہ خاں ۔ پروفیسر آفاق صدیقی اور پروفیسر تنویر احمد علوی بھی تھے ۔ ان سب کی قاتلانہ اور علوی صاحب کی عالمانہ باتیں ہم پھر کبھی سنائیں اگر کوئی سنے :

ہم کہیں اور سنا کرے کوئی

اگر اشعار میں سکتہ ہو تو اسے ہماری نثر پرستی پر محمول کیا جائے ۔ شعرا حضرات کی شاعرانہ صلاحیت پر شبہ نہ کیجیے ۔

سید رحیم الدین توفیق
حیدرآباد

بپتا فلموں کی!

یادش بخیر جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہمیں موسیقی کا شوق رہا ہے۔ ہم گانے سنتے بھی اور ان کی نقل بھی کیا کرتے۔ ہماری پہنچ صرف فلمی سنگیت تک تھی اور ہم ٹھاٹھ سے فلمی گانوں کی نقل کرتے۔ اس دور میں فلمی گانوں اور فلموں کو انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ویسے آج بھی دیکھا جاتا ہے مگر کم۔ ہم تین بہن بھائی ہیں، ایک دن شامت اعمال ہماری بہن نے ایک فلمی گانا گنگنایا۔ "او سلونے ساجنا کیسے چھپو گے"۔ یہ آواز ہماری نانی جان کے کان میں پڑ گئی، جو ہماری نظروں سے اوجھل تھیں قریب ہی تھیں۔ وہ فوراً چھڑی لے کر آئیں اور نواسی کا ہاتھ پکڑ کر چھڑی اُٹھائی۔ سوال ہوا۔ "سجنا۔ بول سجنا کا کیا مطلب، ابھی سے سجنا۔ بول کیا مطلب۔" وہ بے چاری کیا بولتی۔ شکاری کے ہاتھ میں سہمی ہوئی فاختہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پھر غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو تنبیہہ کی گئی۔ اگر آئندہ سنوں گی تو زبان جلا ڈالوں گی۔ جاؤ کلی کر کے آؤ۔ ہماری طرف انھوں نے صرف گھور کر دیکھا۔ پھر ماں باپ کو صلواتیں شروع ہو گئیں کہ ماں باپ خود بچوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ بچوں کی پرورش میں دل کو مارنا پڑتا ہے۔ بچوں والے گھر میں ریڈیو لانے کی کیا ضرورت تھی۔

ہر نئی چیز کی پہلے پہل بہت مخالفت ہوتی ہے لیکن پھر اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ صرف فلم ہی ایسی ایجاد ہے جس کے بارے میں لوگوں کی رائے نہیں بدلی۔ اگرچہ انھیں قبول کر لیا گیا۔ فلم دیکھنے والے بھی فلموں کو بُرا سمجھتے ہیں مگر دوسروں کے لئے اپنے لئے نہیں۔ جو کچھ بھی ہو فلموں نے ترقی کی اور ان کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ وجہ یہ ہے کہ فلموں میں اتنی ہی لذت اور کشش ہے جتنی گناہ میں۔ فلموں کی اسی کشش نے تھیٹر کو ملک کی خوش حالی کا مظہر بنا دیا ہے۔ مفلسی، بیروزگاری اور مہنگائی کے بوجھ سے جب عوام کراہتے ہیں تو حکمراں اسے ڈھونگ سمجھتے ہیں۔ اُلٹا سوال ہوتا ہے اگر مفلسی ہے تو سینما ہال اتنے آباد کیسے ہیں۔ یہ پیسہ کہاں سے آ رہا ہے۔ ہمارے لیڈر سینما ہال کی بھیڑ دیکھ کر ہی خوش ہوتے ہیں کہ ملک کتنا خوشحال ہے۔

شہر میں جب بھی کوئی چوری ہوتی ہے یا ڈاکہ پڑتا ہے یا کوئی لڑکی اور لڑکا گھر سے بھاگ جاتے ہیں تو نزلہ فلموں پر گرتا ہے۔ ایک فلم آئی تھی "قسمت"۔ یہ مسلسل تین سال تک چلتی رہی۔ اس کا ہیرو چور تھا۔ یقیناً لوگوں نے چوری کے گُر سیکھنے کے لئے ہی اس فلم کو بار بار دیکھا ہوگا۔ تبھی تو یہ تین سال چلی۔ ہم سوچتے ہیں، آخر بابا آدم نے کونسی فلم دیکھ کر وہ گناہ کیا جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالے گئے اور مجنوں تو لیلیٰ کی شکل دیکھ کر ہی اس پر عاشق ہوا تھا۔ کوئی فلم دیکھ کر نہیں۔ پڑوس کے گھر سے کاغذ میں لپٹا ہوا پتھر آنگن میں آگرا۔ ماں کام کررہی تھی۔ وہ زخمی ہوتے ہوتے بچی۔ اس نے پتھر اٹھالیا۔ کاغذ محبت نامہ تھا جو کسی پروانے نے اپنی شمع کو لکھا تھا۔ نام نہ ہونے سے چور پکڑا نہ جاسکا۔ ماں کو یقین تھا کہ یہ خط اس کی بیٹی کے لئے نہیں ہوسکتا۔ وہ تو فلم دیکھتی ہی نہیں، ضرور اس بڈھے پڑوسی نے لکھا ہوگا۔ اور اسے صلواتیں سنانی شروع کردیں بدمعاش، بے شرم، قبر میں پاؤں لٹکائے بال بچے والی پڑوسنوں کو محبت نامے بھیجتا ہے۔ آنے دے ان کو کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔ لڑکی سہمی ہوئی تھی، جب اسے خطرہ ٹل جانے کا یقین ہوگیا تو اس نے کہا "لائیے امی میں پڑھتی ہوں" ماں نے کہا۔ نہیں بیٹے ایسے خط کنواری لڑکیوں کے پڑھنے کے نہیں ہوتے۔ اور لڑکی منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر بھاگ گئی۔ پڑوس کی بات چلی ہے تو ہمیں ہمارا دوست یاد آگیا۔ وہ ہمارا پڑوسی بھی تھا اور کلاس میٹ بھی۔ اس کے گھر میں جملہ چار افراد تھے۔ صاحب خانہ یعنی اس کے والد بزرگوار۔ اس کا بڑا بھائی، وہ خود اور ایک پُراسرار عورت جس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ یقین سے نہیں کہتے کہ اس کا گھر کے مالک سے کیا رشتہ ہے یہ گھر دوہرے معیار کا اچھا نمونہ تھا۔ ہمارے دوست کے فلمیں دیکھنے پر پابندی تھی۔ مگر شوق جتنا دبائی اتنا ہی ابھرتا ہے۔ اور فلموں کا شوق توبہ۔ وہ اسکول کو پٹ مار کر میٹنی شو دیکھنے چلا جاتا۔ گھر آتے ہی سوال ہوتا کیا بابو آج دیر ہوگئی، جی وہ اسکول میں فٹ بال میچ تھا۔ اور پھر جب بھی بابو کا دل فلم دیکھنا چاہتا وہ اسکول میں فٹبال میچ منعقد کردیتا۔ امتحان کے قریب تو لگاتار اسپیشل کلاسس شروع ہوجاتیں۔ اسکول کو چھٹیاں تھیں، بابو کی شامت آئی تو اس نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا، پانچ بجے وہ بن ٹھن کر نکل رہا تھا کہ پیچھے سے بھائی نے ٹوکا۔ "بابو اتنا بن ٹھن کے کہاں جارہے ہو" "جی وہ دوست کے پاس دعوت ہے"۔ "مگر دعوت تو رات کے کھانے کی ہے، ابھی سے جاکر کیا کریں گے۔ "وہ دوست نے کہا تھا جلدی آ گئے تو کام میں ہاتھ بٹا سکتے ہو۔" "تو آپ باورچی کا ہاتھ بٹانے جارہے ہیں" اس نے جھنجھلا کر کہا، معلوم نہیں۔ رات دیر گئے وہ لوٹا تو اس کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر بستر پر لیٹ گیا۔ بھائی کی رگ اذیت پسندی پھڑکی۔ اندھیرے میں تیر چلا۔ کیا بابو کیسی تھی دعوت اچھی تھی۔ کیا کیا کھائے۔ بابو کے منہ میں پانی آگیا۔ اس نے گھونٹ بھر کر کہا۔ تھی۔ کباب۔ بریانی۔ بگھارے بیگن، دہی کی چٹنی، ڈبل کا میٹھا غریب سے اتنا بھی نہ ہوا کہ آتے آتے ہوٹل سے ہی کچھ کھا کر آجاتا۔ یا کم از کم ایک کپ چائے ہی پی لیتا۔ شائد اس کے پاس پیسے نہیں تھے یا پھر گھر آنے کی جلدی۔

فلمیں دیکھنے پر ماں باپ کی طرف سے ہم پر کوئی پابندی نہیں تھی، مگر ہمارے ایک چچا ہماری بہت مخالفت کرتے اور ہمارے بارے میں بڑے خطرناک اور شرمناک ریمارک اور پیشین گوئیاں کرتے۔ ہم ان کے ریمارکس کو جتنا نظر انداز کرتے وہ اتنا ہی مشتعل ہوکر اس میں شدت پیدا کرتے مگر کب تک۔ ایک دن فلمی کمٹل نے انھیں کاٹ ہی لیا اور انھوں نے فلم "حاتم طائی" دیکھ کر اپنا روزہ توڑ دیا۔ پھر وہ اسی قسم کی تاریخی اور مذہبی فلمیں دیکھتے اور ہمیں بھی مشورہ دیتے کہ ہم ایسی ہی فلمیں دیکھیں تاکہ ہمارے اخلاق سدھریں اور ایمان تازہ ہو گویا ایمان نہ ہوا حقہ ہوگیا کہ ذرا سا کریدا اور تازہ کرلیا۔ انھیں اس فلم کی مناجات "پروردگار عالم تیرا ہی ہے سہارا" اتنی پسند آئی کہ وہ پوسٹر جس پر یہ چھپی تھی اور جس میں ہیرو کو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے دکھایا گیا تھا، دیوان خانہ کی زینت بن گیا۔ پھر ایسی ہی تاریخی فلموں کے پوسٹرس سے دیواریں سج گئیں اور دیوان خانہ پر اصلاح خانہ کا گمان ہونے لگا۔

فلموں کی سب سے بڑی خرابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں محبت اور سیکس کو بڑی بے باکی سے پیش کیا جاتا ہے مگر اس میں فلموں کا کیا قصور۔ سیکس کے ذکر سے ادبی، طبی، سماجی اور مذہبی کتابیں بھری پڑی ہیں مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ ہم نے ایک مذہبی کتاب پڑھی تھی جو بچوں اور بیبیوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ کتاب تو معقول ہے لیکن اس میں ایک باب طہارت اور پاکی کے بیان میں ہے۔ جسے انتہائی "سیکسی" انداز میں لکھا گیا ہے اگر یہی باتیں فلم کے پردے پر بتائی جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ تھیٹر کا لائسنس منسوخ ہو جائے گا۔ سنا ہے بعض بیبیاں یہ کتاب اپنی بچیوں کو جہیز میں دیتی ہیں۔

ابھی چند دن پہلے ایک فلمی گانا "چولی کے پیچھے کیا ہے" مارکٹ میں آیا تھا۔ جسے فحش اور مخرب اخلاق گانوں کا سرتاج ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس گانے نے دھوم مچادی اور بچے بچے کی زبان پر آگیا۔ جب بھی ایسا کوئی گانا مارکٹ میں آتا ہے یا فلم ریلیز ہوتی ہے تو ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ اس گانے کی بڑی لے دے ہوئی اور اخباروں میں تنقیدوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ ایک جج صاحب نے لکھا: "میں نے جب اپنے نواسے کو یہ گانا گاتے ہوئے سنا تو بہت دُکھ ہوا، کہ نئی نسل کدھر جارہی ہے۔ میں اسے منع کرنا چاہتا تھا مگر مارے شرم کے اس کے سامنے نہ جاسکا اور مجھے اس کے چپ ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔" اخباروں میں جتنے بھی خطوط چھپتے ہیں ان میں یہی شکوہ ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق اور کردار بگڑ رہے ہیں۔ کوئی بندہ یہ نہیں لکھتا کہ "میں بگڑ رہا ہوں" (میں سے مراد ہم نہیں، خط لکھنے والا)۔ یا تو وہ بگڑے ہوئے ہیں یا پھر لکھوں میں اتنا دم خم نہیں کہ انھیں بگاڑ سکیں۔ اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مچھلی کے بچے کو تیرنا کس نے سکھایا۔ ان خطوط کی روشنی میں فلموں کے مخرب اخلاق اور فحش ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک تو ایسی فلموں سے بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق اور کردار بگڑتے ہیں، دوسرے باپ بیٹی کے ساتھ اور ماں بیٹے کے ساتھ یا پورا خاندان یہ فلم ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب لوگ فیملی کو چھوڑ کر ہوٹلوں

اکیلے اکیلے بریانی، مرغ، نہاری شیرمال اُڑا سکتے ہیں یا ٹھیلہ گاڑیوں کے پاس کھڑے ہوکر کیلے، چھولے
ٹ اور گول گپے کھا سکتے ہیں تو فلم کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارا انہیں مشورہ ہے کہ وہ فلمیں بھی تنہا دیکھیں اور
ائیں کر پھر ان کی رائے کیا ہے۔ وہ فلموں سے لطف اندوز ہوئے یا نہیں۔ اگر نہیں تو —— پھر ہم اپنی
ے واپس لے لیں گے۔ ویسے فیملی فلمیں بھی بنتی ہیں جو صرف فیملی کے ساتھ ہی دیکھی جاسکتی ہیں۔

حضرات فلموں کے تئیں ہمارے دل میں نرم گوشہ ہے ہم اچھی، بُری ہر طرح کی فلمیں دیکھتے ہیں مگر
ابھی تک نہیں بگڑے، جب بھی کوئی فلموں اور فلم بینی کے بارے میں بُرا بھلا کہتا ہے تو ہم زیر لب گنگناتے
ں —— نہ سنو گر بُرا کہے کوئی . . .

آج کل پرانی مخرب اخلاق اور ناکام فلموں کو ٹی وی پر "پرانی کلاسک" یا کلا آتمک اور سوپر ہٹ
وں کے نام سے بتایا جارہا ہے۔ یہ درجہ انھیں ان کی کہنگی کی وجہ سے ملا ہے۔ لوگوں کی رائے نہیں بدلی۔ اس
ں شک نہیں کہ آج کی فلمیں بہت بے باک ہوتی ہیں۔ پرانی فلموں کے مقابلے میں۔ پرانی فلموں میں جب ہیرو
روئین ملتے تو ان کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ ہوتا۔ آج کی فلموں میں ہیرو ہیروئین جب ملتے ہیں تو ایک دوسرے
ں ضم ہو جاتے ہیں اور پھر ہیرو ہیروئن کو باہوں میں لے کر ایسا جکڑتا ہے کہ بیچاری کی ہڈیاں چرمرا جاتی
ں۔ پھر وہ اسے لے کر ڈھلانوں پر لڑھکتا ہے، پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا ہے اور اسکے ہاتھ پیر مونڈھے
ور کمر پکڑ کر وہ جھٹکے دیتا ہے کہ فری اسٹائل کشتیوں کا گمان ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے ہم سے پوچھا کہ کیا
ج کل ڈانس بھی فائٹ ماسٹر کمپوز کر رہا ہے۔ ہم نے کہا۔ نہیں۔ یہ ڈانس ماسٹر اور فائٹ ماسٹر کے تال میل
ا نتیجہ ہے۔ اس سے فلم کے رومانٹک اور فائٹ سین میں یکسانیت اور ہم آہنگی رہتی ہے۔

آج کل ہیرو ہیروئن ماحول سے بے نیاز گھاس کے ڈھیر میں رومانس کرتے ہیں اور قریب ہی بانس کی اٹریا
سے ایک ڈانسر ہیرو ہیروئن کے جذبات منتقل کرتی ہے "چڑھ گیا اوپر رے اٹریا پہ سونا کبوتر رے" اور نیچے
پچیس تیس لڑکیاں غٹرغٹر کرکے آگ پر تیل چھڑکتی ہیں۔ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ گانا کسی بگڑے ہوئے
وی کی کلپنا ہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس کے پیچھے کسی کو پتری کی آشائیں مچل رہی ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی جو
بیجا تھی۔ اگر اٹریا نہ ہوتی تو کبوتر کہاں جاتا۔ آج کی اور پرانی فلموں کے محبت بھرے سین کا مقابلہ کریں تو کل کی
مخرب الاخلاق فلمیں انتہائی صاف ستھری اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہیں۔ ہمارے ذہن میں پھر ایک سوال کلبلانے لگتا
ہے، کیا آنے والے دور میں ایسی فلمیں بنیں گی، جن کے آگے آج کی فلمیں صاف ستھری اور پھیکی نظر آئیں گی۔ کون جانے
فی الحال تو ہم سیاست دانوں کے اس مشورہ پر عمل کر رہے ہیں جو وہ اخباری نمائندوں کو وقتاً فوقتاً
دیتے رہتے ہیں —— "انتظار کرو اور دیکھو"۔ ٭٭

مختار احمد منو (گلبرگہ)

کُتّے سے انٹرویو

یوں تو ہم مشہور سیاسی و ادبی، سماجی شخصیتوں کے انٹرویو لے چکے تھے۔ اس ہفتے ہم کسی ایسی ہستی کی تلاش میں تھے جس کے انٹرویو سے نہ صرف ہماری بلکہ اس کی بھی شہرت ہو۔ راہ چلتے بلّی کا آڑے آنا بدشگون سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی گہری سوچ میں ہو اور اس کی بیوی درمیان میں کچھ کہے تو بھی بدشگون سمجھا جاتا ہے۔ اس بات کو ایک مرد کی انا سمجھئے یا پھر عورت پر برتری کا احساس لیکن ہماری سوچ کے درمیان جب کبھی بھی ہماری بیوی حائل ہوتی ہے تو ہم اس کو ایک شگون سمجھتے ہیں۔ آج بھی ہماری بیوی نے ہماری سوچ کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "انٹرویو لینا ہی ہے تو کسی مشہور شخصیت کے بجائے جانور کا کیوں نہیں لیتے۔ آخر جانور بھی تو سانس لیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارے درمیان رہتے ہیں ہماری طرح یہ بھی تو آزاد جمہوری ملک کے شہری ہیں۔"

بیوی کا مشورہ سن کر ہم حیران رہ گئے۔ عورتیں اکثر مردوں کو ایسے ہی مشورے دیا کرتی ہیں۔ خاص کر ہر شوہر کو۔ بیچارہ شوہر بیوی کے مشورہ پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے درمیان معلق لٹکا رہتا ہے۔

ہم نے بیوی سے کہا۔ "آپ کے مشورے پر جانور سے انٹرویو تو کرلیں گے لیکن اس انٹرویو کو چھاپے گا کون" ؟ بیوی نے کہا "ذرا سنجیدگی سے سوچیئے جانور پر انٹرویو پہلی بار آپکے سر جائے گا۔ صحافت کی دنیا میں آپ کا نام بلند ہوگا۔ آپ کی شہرت میں اضافہ ہوگا یہ انٹرویو کوئی چھاپے یا نہ چھاپے اس کی فکر نہ کریں کسی جلسے میں یا ادبی نشست میں پڑھ لینا۔ پھر دیکھنا اخبار والوں کی اور جانوروں کی قطار لگ جائے گی"۔ ہم بیوی کی باتیں ایک فرمانبردار شوہر کی طرح خاموش نیچی نظریں کیے سنتے رہے تو بیوی نے کہا۔ "بیوی جب کبھی کوئی عقلمندی کی بات کرتی ہے تو نادان شوہر نیچی نظریں کئے نظر انداز کردیتا ہے"۔ پھر کسی قدر ناراضگی سے کہا۔ "ہر بیوی کی طرح میری بھی دلی خواہش ہے کہ میرے شوہر کا نام بھی شہرت کی بلندی پر ہو"۔ ہم نے بیوی سے کہا، "میں دراصل پستی اور بلندی کے درمیان کے فاصلے پر غور کر رہا تھا۔ یہ بھی آپ بتلائیں کہ ہم کس جانور سے انٹرویو لیں"۔ بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا، "ہمارے سب سے قریب ایک ہی جانور رہتا ہے۔ وہ ہے کتّا" ہم نے کہا "میڈم مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بھلا کتّا بھی کوئی جانور ہے۔ ہمارا اتنا کہنا تھا کہ کتّے کے بھونکنے کی آواز ہمارے دروازے پر آئی۔ بیوی ایسے مسکرائی جیسے پردیس سے آکر ان کا بھائی کہہ رہا ہو "باجی میں آگیا"۔ بیوی نے کہا، لیجیئے ہم نے یاد کیا اور جناب حاضر ہوگئے۔ میں کتّے کے لیے ناشتہ کا انتظام کرتی ہوں۔ کتّے کو اندر بلوائیے اور انٹرویو لیجیئے۔ ہم نے کتّے سے کہا، آ، کو، کو

کتّا اندر آنے کے بجائے بھونکنے لگا۔ ہم نے کہا ارے بھونکتے کیوں ہو بھائی صاحب اندر تشریف لائیے۔ آپ سے انٹرویو لینا ہے۔ کتّا ہماری بات سُن کر دُم دبائے بڑے ہی مودبانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوا اور ہمارے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہم کتّے کے اس انداز پر حیران رہ گئے۔

ہم نے کہا ہاں تو کتّے " کتّے کو ہمارا کتّا کہنا اِتنا ناگوار گزرا کہ وہ بھونکنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ دیکھیے جناب آپ مجھے کتّا کہہ کر مخاطب نہیں کریں گے۔ ہم بھی لاکھوں کی تعداد میں رہتے ہیں۔ شناخت کے لیے ہم لوگوں کے بھی اپنے نام ہوتے ہیں۔

ہم نے کہا، معاف کرنا۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ جناب آپ کا اسم شریف؟

کتّے نے کہا، ناچیز کو ٹائیگر کہتے ہیں۔ کتّے کا نام سُن کر ہمیں ہنسی آئی اور کہا۔" آپ تو کتّا ہیں پھر آپ کا نام ٹائیگر کیسے ہو سکتا ہے۔ ٹائیگر نے کہا، کیوں نہیں ہو سکتا۔ آپ کے خسر کا نام شیر خاں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سالے کا شہباز خاں ہو سکتا ہے تو پھر آپ کو میرے نام پر اعتراض کیوں؟ ہم نے کبھی اعتراض کیا ہے۔ ہم یہ سن کر سٹپٹا کر رہ گئے۔ ٹائیگر نے کہا۔ آپ کی اہلیہ کا نام بھی تو ...... ہم نے فوراً ٹائیگر کو مزید آگے کچھ کہنے پر ٹوکتے ہوئے کہا۔ آپ مردانے میں ٹھیک ہیں براہ کرم زنانے میں گھسنے کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہوگا۔" ٹائیگر نے کہا، معاف کرنا ہم بلا وجہ زنانے میں تو کیا کسی کے گھر میں بھی داخل نہیں ہوتے۔ میں تو آپ کے سوال کا اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب ہم نے بہتر یہی سمجھا کہ ٹائیگر خاندان کے افراد کے نام نہ پوچھیں۔

ہم نے کہا، آپ کے کتنے بچے ہیں۔ ٹائیگر نے کہا،" ہم بچوں اور بیویوں کا حساب کتاب نہیں رکھتے۔ اُوپر والا دیتا ہے بس ہم پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا،" کثرت آبادی کی وجہ سے غربت اور فاقہ کی زندگی گزرتی ہوگی؟" ٹائیگر نے کہا اُوپر والا جنم دیتا ہے تو رزق اور عمر کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔ اِن باتوں پر ہم خواہ مخواہ کیوں سوچیں۔ انسان کو اپنے خُدا پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ قدرت کے قانون میں مداخلت کرکے بچوں کی پیدائش پر پابندی لگاتا جارہا ہے۔ اِسی لیئے وہ فاقہ اور غربت کی زندگی گزار رہا ہے۔

" آپ کام کیا کرتے ہیں "۔ ٹائیگر نے کہا میں اپنے مالکین کی نگرانی کرتا ہوں۔ میرا اصل کام مالک کی نگرانی کرنا ہے ہم نے کہا، کیا تمہارے مالک کی جان کو خطرہ ہے۔ جواب دیا" جی نہیں، میرے مالک کی صحت اور معیشت کو خطرہ ہے۔ ہم نے کہا، میں کچھ سمجھا نہیں۔ ٹائیگر نے کہا، میرے مالک اکثر رات گئے دیر سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم نے کہا، آپ کے مالک کو نیند میں چلنے کی بیماری ہے۔ ٹائیگر نے کہا، انہیں شعر لکھنے اور سُنانے کی بیماری ہے۔ ان کی اس خطرناک بیماری سے نہ صرف ان کی بیوی بلکہ میں بھی پریشان رہتا ہوں۔ ہم نے کہا، یہ تو آپ کے اور آپ کی مالکن کے گھٹیا خیالات ہیں۔ شاعر اور شاعری کی قدر آپ کیا جانیں۔ ٹائیگر نے کہا، شاعری کو ادبی ذوق تک ہی محدود رکھا جائے تو بھلا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ہمارے مالک نے شاعری کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا ہے۔ نیند، صحت اور روپیہ پیسے کی بربادی کے باوجود آج تک بھی ڈھنگ کا ایک شعر نہیں کہہ سکے، بے دریغ واہ واہ کہنے والوں پر روپیہ خرچ کرتے اور اکثر مشاعروں کا خرچ برداشت کرتے ہیں اسی لیئے لوگ ان کو کبھی صدر مشاعرہ تو کبھی مہمان شاعر اور کبھی میزبان شاعر بنا دیتے ہیں۔ اِنہی باتوں کی وجہ سے مالک اسی خوش فہمی میں مُبتلا ہیں کہ وہ عظیم شاعر ہیں۔

ہم نے ٹائیگر سے کہا۔ کیا آپ کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہے۔ ٹائیگر نے کہا، مالک کی صحبت میں رہتا ہوں تو

ظاہر ہے کہ مجھ پر بھی تو کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ ہاں مجھے شعر کہنے کا نہیں صرف اچھے شعر سننے کا شوق ہے۔ ہم نے ٹائیگر سے کہا۔ آپ اپنی پسند کا کوئی شعر سنانے کی زحمت گوارا کریں گے۔ ٹائیگر نے کہا، ضرور ضرور، لیکن میں مرحوم شعرا کا شعر سناؤں یا پھر باحیات شعرا کا ہم ٹائیگر کے ادبی ذوق کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے ادبی ذوق کا امتحان لے۔ ہم نے کہا۔ آپ کی برادری کے لوگ اکثر راتوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ عجیب و غریب خوفناک، ڈراؤنی آوازیں نکال کر لوگوں کی نیندیں خلل پیدا کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ایک خوف کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ راستوں پر ایسی تیزی سے دوڑتے ہیں کہ مارے ڈر کے لوگ اپنی گاڑیوں سمیت گر جاتے ہیں۔ وہ اس قدر زخمی ہو جاتے ہیں کہ اپنی منزل کے بجائے ہسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ ہمارے ایک دوست کے خسر لونا موپیڈ پر جا رہے تھے ایک کتا پہلے تو بھونکا۔ پھر ان کا پیچھا کیا۔ اس کی شرارت اور دل لگی کی حد تو دیکھئے کہ ان کی لونا کے پہیوں میں گھس گیا ضعیف آدمی بری طرح گر کر زخمی ہوگیا۔ وہ مارے درد کے کراہ رہا تھا اور اس کتے نے پہیوں سے نکل کر انگڑائی لی اور بھاگ گیا۔ وہ ضعیف آدمی دواخانے میں اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے۔

ہماری بات سن کر ٹائیگر ہنسنے لگا تو ہم نے کہا، آپ کتے کی حرکت پر نادم ہونے کے بجائے ہنس رہے ہیں۔ ٹائیگر نے کہا۔ معاف کرنا میں کتے کی حرکت پر نہیں بلکہ آپ کے دوست کی حرکت پر ہنس رہا ہوں۔ یہ سن کر ہم نے حیران کن لہجے میں کہا۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ ٹائیگر نے کہا، جناب آپ کے دوست اس کتے کو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ اور مسلسل چار دن سے صبح و شام پابندی سے اس کتے کے پاس آتے ہیں۔ بسکٹ، بریڈ، گوشت کھلاتے ہیں اور اس کتے کے آگے ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے کہتے ہیں۔ آپ کی مہربانی سے میرے خسر دواخانہ میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں مجھ غریب پر ایک احسان یہ بھی کر دینا کہ میری خوش دامن صاحبہ گھر میں ڈیرا ڈالی بیٹھی ہیں ان کو بھی ان کے شوہر کے پاس پہنچا دینا پھر ٹائیگر اچانک سنجیدہ ہو کر بولا۔ اس طرح ہم پر بے بنیاد الزام نہ لگانا۔ ہم ان ہی لوگوں پر غراتے ہیں جو گاڑی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہیں اور کسی راہ چلتے کو ٹکر دے کر اس کو زخمی کر دیتے ہیں اور خود بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی غلط حرکت پر پہلے تو ہم غراتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ گاڑی کی رفتار میں کمی نہ کریں تو ہم جان خطرے میں ڈال کر خود کو پہیوں کے درمیان جھونک دیتے ہیں۔ ہم پولیس والے تو نہیں جو ان کو چالان کر سکیں یا ان کا لائسنس ضبط کر لیں۔ ٹریفک کنٹرول نظام کا ہمارا ایک اپنا طریقۂ کار ہے۔

ہم رات کو اس لیے آوازیں لگاتے ہیں کہ ہمارے دیگر ساتھی سو نہ جائیں۔ جس طرح گشتی پولیس رات کو سیٹی بجا کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو ہی نہیں بلکہ چوروں کو بھی آگاہ کرتی ہے کہ ہم ابھی سوئے نہیں جاگ رہے ہیں ہم کسی تنخواہ یا پھر رشوت کے طالب نہیں ہوتے پھر بھی ہمدردی کے ناطے انسانوں کی مفت خدمت انجام دیتے ہیں۔ اگر کوئی ہماری خدمات کے اعتراف میں لذیذ کا ایک ٹکڑا ڈال دیتا ہے تو کوئی احسان نہیں کرتا۔ بلکہ اس ٹکڑے کے بدلے ہم وفاداری کی وہ مثال قائم کرتے ہیں کہ تاریخ ہی نہیں بلکہ لوگ بھی ہماری وفاداری پر فخر کرتے ہیں۔ آپ نے یہ تو سنا ہوگا، ارے جا نمک حرام تجھ سے تو وہ کتا اچھا ہے جو روٹی کے ایک ٹکڑے پہ وفاداری نبھاتا ہے۔

ہم خوفناک ڈراؤنی آوازیں اس لیے نکالتے ہیں کہ لوگوں کو بدروحوں اور آفتوں کی آمد کی قبل از وقت اطلاع دیں کیوں کہ بدروحیں اور آفتیں و بلائیں ہم کو نظر آتی ہیں۔ ہم نے زلزلے سے قبل بھی لوگوں کو خوفناک آوازوں کے ذریعہ اطلاع

دی ہے۔ جو ہماری آوازوں پر توجہ دیا وہ بچ گیا۔

ہم نے ٹائیگر سے کہا۔ ہم نے ایک مراسلہ پڑھا، شہر میں آوارہ اور پاگل کتوں کی بہتات سے شہری پریشان ہیں۔ ایک خصوصی اسکواڈ قائم کر کے آوارہ کتوں کو پکڑا جائے، پاگل کتوں کو ہلاک کیا جائے۔ آپ اخبار میں چھپے اس مراسلے کے بارے میں کیا کہیں گے۔

ٹائیگر پہلو بدل کر بڑے مفکرانہ انداز میں بولا، مجھے "حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہے"۔ ہم نے کہا آوارہ اور پاگل کتوں کے انجام پر۔ ٹائیگر نے کہا۔ جی نہیں۔ "مجھے آپ جیسے لوگوں اور ہماری حکومت کی سوچ پر افسوس ہی نہیں دکھ بھی ہوتا ہے۔ میں آپ سے اور حکومت سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے بچے آوارہ نہیں ہوتے۔ کیا آپ لوگوں میں پاگل نہیں ہوتے کیا ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جانا چاہیے جو ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جناب ہمارے بچے اگر وہ آوارہ ہیں تو کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ کسی کے گھر چوری نہیں کرتے۔ شراب نہیں پیتے جوا نہیں کھیلتے۔ کسی کی عزت تو نہیں لوٹتے۔ اگر پاگل ہو تو کسی کی جان نہیں لیتے۔ کسی کا گھر نہیں جلاتے خود اپنے لوگوں پر اپنے ہی بھائیوں پر بم نہیں پھینکتے۔ ایسی آوارگی اور پاگل پن تو آپ لوگوں کی فطرت ہے جو کبھی شیطان کی ہوا کرتی تھی۔ لیکن ہمارے لوگ اگر واقعی کچھ آوارہ اور پاگل ہیں بھی تو اتنے خطرناک نہیں کہ انہیں ہلاک یا گرفتار کیا جائے۔

جس طرح آپ کے مسائل ہیں۔ ہمارے بھی مسائل ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے بھی DOG'S MENTEL HOSPITAL کھولے جائیں تاکہ پاگل کتوں کا علاج ہو سکے۔ DOG'S GENERAL HOSPITAL کھولے جائیں جہاں پر کتوں کی عام بیماریوں کا مفت علاج ہو سکے۔ DOG'S SCOAD TRAINING CENTER کھولیں جہاں ہم لوگ تربیت حاصل کر سکیں۔ ہم لوگ محکمہ پولیس میں بڑی عمدگی کے ساتھ اپنا کام انجام دے کر اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے ایسا کام بھی کر جاتے ہیں جو پولیس کے بس میں نہیں ہوتا۔ چند گھنٹوں ہی سونگھنے کے بعد چور کون ہے۔ کہاں سے آیا۔ کہاں گیا بتلاتے ہیں یہ ہی نہیں بلکہ چھپے ہوئے مال کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اب تو ہمارے لوگ اتنے نڈر اور چالاک ہو گئے ہیں کہ خطرناک ہتھیار اور بم تلاش کرنے میں پولیس کی مدد کرتے ہیں۔

ہمارے بھائی اداکاری میں بھی کافی حد تک مشہور ہیں۔ ان کی شاندار اداکاری کی وجہ سے فلمیں ہٹ جاتی ہیں۔ خود ہیرو نے یہ اعتراف کیا کہ فلم تیری مہربانیاں کتے کی اداکاری سے کامیاب رہی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ DOG'S ACTING CENTER کھولے جائیں۔ اس کی وجہ سے بے شمار آوارہ کتوں کی آوارگی کم ہوگی بلکہ کتوں میں بھی کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

ہم بھی کھیل کے شوقین ہیں۔ کرکٹ، گلی ڈنڈا، کھو کھو، کبڈی، تیراکی، فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں یہ بات الگ ہے کہ آپ لوگوں کے کھیلنے اور ہمارے کھیلنے کے انداز جدا گانہ ہیں۔ حال ہی میں لال بہادر اسٹیڈیم حیدرآباد میں کھیلے گئے کرکٹ میاچ میں کرکٹ کا شوقین کتا اسٹیڈیم میں داخل ہوا۔ آپ نے ٹی وی پر دیکھا ہوگا کہ کس طرح پولیس ہاتھ دھو کر کتے کے پیچھے پڑ گئی تھی کتے کو دوڑا دوڑا کر پولیس خود بھی بے دم ہو گئی اور کتے کو بھی بے دم کر دیا۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کرکٹ کے دیوانے آپ لوگ ہی ہیں۔ کیا آپ کے بچے روڈ پر، چھتوں پر، گلیوں میں نہیں کھیلتے۔ اگر ہم کھیلتے ہیں تو اعتراض کیوں ہوتا ہے ہم کو آوارہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے بچے تو آپ کے بچوں کی طرح کسی کے گھر شیشے تو نہیں توڑتے کسی کا سر تو نہیں پھوڑتے۔ پھر بھی آپ لوگوں کے گ

کے لیے کھیل کے میدان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے بھی کھیل کے میدان مہیا کیے جائیں۔

ہمیں بھی FAMILY PLANNING کی ضرورت ہے۔ آپ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ ہم بچوں کی پیدائش پر گھبراتے ہیں۔ بیماری اور کمزوری ہو تو علاج کے لیے خصوصی فیملی پلاننگ سنٹرز کھولے جانے چاہییں۔

ہمارے ساتھ ہو رہی کن کن ناانصافیوں اور الزامات کی تشریح کرتا چلوں یہاں تک کہ آپ لوگ جب آپس میں لڑتے ہیں تو ہم کتوں کی بے عزتی کر جاتے ہیں کہتے ہیں اسے وہ کتے کی اولاد، کتے کی دُم، کتے کے منہ کا۔ کتے کی طرح مت پکارنا۔ کتا کہیں کا۔ حد تو یہ ہے جناب کہ اپنے داماد کی بے عزتی مقصود ہو تو ہمارا نام لیا جاتا ہے۔ دیکھو تو سسرال کی دہلیز پر کتے کی طرح دُم ہلاتا پڑا ہے۔ آپ ذرا سنجیدگی سے اس بارے میں سوچیئے اور ایمانداری سے بتلائیے کہ کیا کبھی ہم نے آپس میں لڑتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اسے وہ آدمی کی اولاد، آدمی کے مُنہ کے، آدمی کہیں کا۔ آدمی کی طرح کیوں پکارتا ہے آدمی کا پلا ——— اگر ہم بھی ایسا کہیں تو آپ کے دلوں پر کیا گزرے گی۔ یہ سب سن کر ہمارا سر مارے شرم کے جھک گیا۔ ہم نے کہا آپ بجا فرماتے ہیں۔

ہم نے ٹائیگر سے پُوچھا، آپ لوگ کتنی زبانیں بولتے ہیں۔ کتنے مذاہب میں بٹے ہوئے ہیں؟

ٹائیگر نے کہا! انہی باتوں کو لے کر آپ کی دنیا میں دنگے فساد ہو رہے ہیں۔ ہمارے یہاں صرف ایک ذات اور ایک زبان ہے۔ ہم نے ٹائیگر سے کہا۔ آپ کی برادری کے کچھ لوگ ہمارے لوگوں کے ساتھ بڑے عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگ انہیں اپنی اولاد کی طرح پرورش کرتے ہیں خاص صابن سے نہلاتے ہیں۔ بسکٹ، چاکلیٹ، بریڈ، گوشت کھلاتے ہیں۔ اپنی گاڑیوں پر اپنی گود میں بٹھا کر تفریح اور شاپنگ کو لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ عورتیں تو اپنے شوہر اور بچوں کو کم اور کتے کو زیادہ قریب رکھتی ہیں۔ انھیں چومتی ہیں۔ کیا آپ کو خواہش نہیں ہوتی کہ آپ کی زندگی بھی ایسے ہی گزرے۔ آپ کو ان کتوں کی زندگی دیکھ کر رشک نہیں ہوتا۔

ٹائیگر ہماری بات پر بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولا، جناب ہم لوگوں میں کینہ، حسد، جلن نہیں ہوتا۔ ہم تو اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ جو جہاں رہے خوش رہے۔ ہاں افسوس اور دُکھ ہوتا ہے تو آپ لوگوں کی بیوقوفی اور تنگ نظر حرکتوں پر۔ پیار و شفقت کے مستحق تو یتیم و بے سہارا غریب بچے ہیں۔ ان کا پیار کتوں کو دیا جاتا ہے۔ جناب ہم تو اُس وقت رو دیتے ہیں جب کسی دعوت یا پارٹی کے بعد جھوٹا کھانا باہر پھینک دیا جاتا ہے تو ہمارے ساتھ آپ کے غریب بے سہارا یتیم بچے بھی اس کھانے پر لوٹ پڑتے ہیں۔ بڑے بدنصیب بچے ہیں اور بڑا بدنصیب شہر ہے یہ جن کی جگہ ہمارے کتے ان کی ماؤں اور بیوی کی گود میں رہتے ہیں۔ کتے سے یہ سب سُن کر ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے ننگے جسم پر شرافت کی چادر کتنی پتلی ہے۔

ہم نے ٹائیگر سے کہا، اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے آپ کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ لیکن آپ کے مسائل کے حل کے لیے ایک سیاسی نمائندے کا ہونا بے حد ضروری ہے جو حکومت کے سامنے موثر انداز میں مسائل کو پیش کر سکے۔ کیا آپ سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ٹائیگر نے بڑے ہی مُدبرانہ انداز میں کہا، کسی ملک کی ترقی اور عوام کی بھلائی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے سیاست اور سیاست داں کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن موجودہ سیاست اور سیاست دان کو دیکھ کر جی نہیں کرتا کہ سیاست میں دلچسپی لوں۔ ہاں مگر جب کبھی روپیہ کمانے کا ارادہ ہوا تو ضرور سیاست دان بنوں گا۔ ہمارے ملک میں سیاست دان اور کوئی کام کریں نہ

کریں ایک کام پوری توجہ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ غریبی ہٹاؤ پروگرام کس حد تک کامیاب ہوا شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔ ہم نے کہا، ٹائیگر صاحب کہیں آپ لیڈروں پر طنز تو نہیں کر رہے ہیں۔

ٹائیگر نے کہا۔ جناب یہ طنز نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اب سکھ رام جی کو لیجیے۔ ان کے بیڈ روم سے کروڑوں روپیے برآمد ہوئے تو سکھ رام جی نے کہا کہ یہ روپیہ میرا نہیں ہے۔ لیڈری سے پہلے سکھ رام جی کلرک تھے تو کتنے دکھی تھے۔ شاید خود کو بھی سکھی رام کہنے سے کتراتے تھے۔ دراصل عوام نے غریبی ہٹاؤ نعرے کو صحیح طرح سے سمجھا نہیں ہے لیڈروں نے کہا تھا پہلے ہم لیڈروں کی غریبی ہٹاؤ پروگرام پر توجہ دیں گے۔ آپ کے بچے انڈین ہسٹری پڑھ کر سوال کرتے ہوں گے کہ پاپا پہلے ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہتے تھے پر آج کیوں نہیں کہتے۔ آپ اس سوال پر پریشان نہ ہوں بچوں سے کہیے ہمارے ملک کو پہلے سونے کی چڑیا کہتے تھے آج سونے کی جے للیتا کہتے ہیں۔ بڑی شرم آتی ہے۔ لیڈروں کی حرکت پر کسانوں کی کھاد پر نہیں جانوروں کے چارے سے اپنی غریبی کو امیری میں بدل رہے ہیں۔ بہرحال فی الحال سیاست میں آنے کا ارادہ نہیں جب بھی آؤں گا بڑی دھوم دھام سے آؤں گا۔

ہم نے ٹائیگر سے کہا، آپ کا بہت بہت شکریہ انٹرویو کے لیے آپ نے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا۔ میں بہت جلد اس انٹرویو کو چھپوانے کی کوشش کروں گا۔ ہماری بیوی ٹائیگر کے لیے ناشتہ لے آئی تو ٹائیگر نے اوں کے ساتھ بڑی نرم آواز نکالی جیسے کہہ رہا ہو۔ بھابی جی اس کی کیا ضرورت تھی۔ ناشتے کے بعد ٹائیگر کرسی سے اترا اور دُم اٹھا کر بھرپور انگڑائی لے کر باہر جاتے ہوئے یوں بھونکا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ شکریہ جناب جس اخبار میں میرا انٹرویو چھپے اس کی ایک کاپی مجھے بھی بھجوا دینا۔
□□

اسپیشلسٹ

اقبال شانہ
(مقیم سعودی عرب)

ہم وفا کی آن کے اسپیشلسٹ
وہ ہماری جان کے اسپیشلسٹ

کر رہے ہیں آپریشن ناک کا
ہیں وہ شاید کان کے اسپیشلسٹ

خاک اُردو میں بتائیں کیفیت
وہ ہیں انگلستان کے اسپیشلسٹ

کیا بھلا ہم کو خبر تلوار کی
ہم تو ہیں بس میان کے اسپیشلسٹ

رہ نہیں سکتا یہاں زندہ مریض
ہیں یہ قبرستان کے اسپیشلسٹ

آرہے ہیں اونٹ پر ہوکر سوار
ریگ و ریگستان کے اسپیشلسٹ

ہم خود اپنا آپ کرتے ہیں علاج
خود ہیں اپنی جان کے اسپیشلسٹ

آدمی کو ٹھیک کرنے کے لئے
آگئے حیوان کے اسپیشلسٹ

کیا ہوا شانہ میاں شادی کے بعد
بن گئے پکوان کے اسپیشلسٹ

غزل

ظفر کمالی
(سیوان)

ہمیشہ روس و امریکہ کی انگلستان کی باتیں
ظفرؔ سیواں میں رہتے ہو کرو سیوان کی باتیں

عمل ایسا کہ جس کو دیکھ کر دوزخ بھی شرمائے
کریں گے ہم مگر باغِ ارم رضوان کی باتیں

دماغوں کا ہُنر کہیئے کہ اَجل کے ہیں سوداگر
لبوں پر رات دن لیکن ہیں جیون دان کی باتیں

پٹاخے کی دھمک سے شاعرِ اعظم لرزتے ہیں
مگر اشعار میں دار و رسن زندان کی باتیں

اُنھیں ہی گولڈ میڈل مل گیا آخر حماقت کا
بتاتے تھے ہمیشہ جو ہمیں لقمان کی باتیں

وہی بھگوان کی مورت چُرا کر لے گئے جن کی
زباں تھکتی نہ تھی کرتے ہوئے بھگوان کی باتیں

چلائیں گے چُھری انصاف کی گردن پہ بے کھٹکے
بگھاریں گے بہت یُوں دین کی ایمان کی باتیں

غزل کے نام پر تُک بندیاں دو چار کہلاتے ہیں
حماقت دیکھیئے کرتے ہیں وہ دیوان کی باتیں

کروڑوں کی رقم چھاپے میں اک گھر سے نکلتی ہے
نہیں سُلطاں یہ ہیں اِک خادمِ سُلطان کی باتیں

بھروسے پہ خدا کے چل رہا ہے ایک مدّت سے
سناؤں آپ کو کیا اور ہندستان کی باتیں

اصولوں پر ظفرؔ چلتا ہے چلنے دو اُسے چھوڑو
کہو کچھ اور کیوں کرتے ہو اس نادان کی باتیں

رؤف رحیم
(حیدرآباد)

نئے سال پر چند اشعار

اک نجومی نے مجھ سے کہا دوستو! مست اپنی کٹے گی نئے سال میں
جوتی اپنے لیے ایک محفوظ رکھ، دال اس میں بٹے گی نئے سال میں

مفلسی انتہا پر ہے جنتا میں اب لیڈروں میں کروڑوں کا ہے ہیر پھیر
پونجی نیتاؤں کی آئے گی سامنے اور غریبی ہٹے گی نئے سال میں

جعلسازی، کرپشن اور اسکام ہے، یہ تو اپنے لیے بات اِک عام ہے
ساری دنیا کی نظروں میں کیا دیش کی اور عزت گھٹے گی نئے سال میں

جھونپڑی میں اسی دھن میں رہتے ہیں ہم، یہ سنا ہے وہ دیتا ہے چھت پھاڑ کے
یہ توقع ہے اپنے خدا سے ہمیں اپنی چھپر پھٹے گی نئے سال میں

شاعروں کو بھی عزت ملے گی میاں اور دولت و شہرت بھی مل جائے گی
یہ گھٹائیں جو افلاس کی ہیں رحیم اب سنا ہے چھٹیں گی نئے سال میں

غزل

وہ قید کرتا بھی ہے اور چھڑا بھی دیتا ہے
کہ مجرموں کو یہ 'لاء'[1] آسرا بھی دیتا ہے

چراغِ خانہ کو رکھنا بڑی حفاظت سے
ضیاء بھی دیتا ہے اور گھر جلا بھی دیتا ہے

مری غزل مرا شاگرد کس وقار کے ساتھ
نہ صرف پڑھتا ہے بلکہ چھپا بھی دیتا ہے

مرض شکر کا بھلاتا ہے آدمی کو کبھی
کبھی شکر کی طرح وہ گھلا بھی دیتا ہے

خدا رکھے مرے استاد کو مرے سر پر
غزل کے ساتھ مجھے وہ دعا بھی دیتا ہے

شجر یہ لگتا ہے جیسے غریب کا سسرال
یہ پھول پھل ہی نہیں آسرا بھی دیتا ہے

تعلقات رکھو تم مدیر سے اچھے
اگر گراتا ہے یہ تو چڑھا بھی دیتا ہے

ہمارے دور کا لیڈر ہے اک بڑا فن کار
وہ گھپلے کرتا ہے درسِ ریا بھی دیتا ہے

رحیم صرف ہنساتا نہیں ہے شعروں سے
دلوں پہ طنز کے نشتر چلا بھی دیتا ہے

[1] LAW

ڈاکٹر سید عباس متقی
(حیدرآباد)

لو یہ سال بھی گیا

لو یہ سال بھی گیا، عمر عزیز کا ایک اور سال جو اپنے اندر ہمہ اقسام کی الجھنیں لیے آیا تھا [illegible] تھا۔ (سال بھی عجیب ہوتے ہیں نہ روکنے سے رکتے ہیں نہ ٹھہرانے سے ٹھہرتے ہیں)۔ مرگ ناگہاں کے محاورہ کو آسانی سے سال ناگہاں کہا جاسکتا ہے۔ جنوری سے دسمبر تک کا ایک ایک ماہ خود ایک ایک سال لگتا تھا۔ یہ سال گزشتہ سالوں سے مختلف نہ تھا لیکن اس کی حیثیت گزشتہ سالوں سے عجیب تھی۔ واقعی زندگی بھی عجیب رنگ کی شے ہوتی ہے نہ ایک پہلو پر رہتی ہے نہ ایک انداز پر رکھتی ہے۔ یہ سال جب نمودار ہوا تھا تو ہم سوچ رہے تھے کہ کم از کم اس سال ہماری طوفان جیسی تمناؤں کو ساحل مقصود مل جائے گا مگر افسوس کہ تمنائیں ایک ڈھیلی سی انگڑائی لے کر پھر لحاف دل میں دبک گئیں۔ غریب آدمی کیا اور اس کی تمنائیں کیا۔ غریب آدمی محض تمنا کرسکتا ہے۔ تمناؤں کو پورا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ہم ہر سال کی طرح یہ سال بھی یہ سوچ کر گزار لیے کہ آئندہ سال کم از کم ہماری تمنائیں پوری ہوں گی شاید ہم یہ نہیں جانتے کہ جو بات پوری ہو جاتی ہے وہ کچھ اور ہوتی ہے تمنا نہیں ہوتی۔

جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو گزرا ہوا ہر ماہ ہمیں منہ چڑاتا ہوا نظر آتا ہے۔ جنوری آنکھ دباتی ہے تو فروری آنکھ دکھاتی ہے۔ مارچ ٹاٹا کرتا ہے مئی منہ بناتا ہے۔ جون سیٹی بجاتا ہے تو جولائی بغل۔ اگست مست ہے تو ستمبر ستمگر۔ اکتوبر تھرک رہا ہے۔ نومبر لرز رہا ہے اور آخر میں دسمبر ہمیشہ کی طرح اپنے چہرے پر ہندوستان کی ناسور مایوسی اور افلاس زدگی لیے آنے والے سال کی طرف اشارہ کرتا ہے گویا زبان حال سے کہہ رہا ہو:

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس سال کی یادیں ان مٹ اور حیرانیاں بیکراں تھیں۔ زندگی نے [illegible] پوچھ لیا تھا۔ جلد نظر دوڑایئے ماضی کے نقوش پردۂ سیمیں پر تصویروں کی طرح دل و دماغ میں [illegible] یاد آیا اسی سال تو حسینۂ عالم کے اعزاز کے لیے ایک شہر میں ایک تقریب [illegible] اپنی رہنمائی میں ان کے درشن کروائے۔ ہر صورت سورت [illegible] تصویر شیریں بنے فرہاد بن جانے کا پیغام دے رہا تھا۔ اور [illegible] کو [illegible] شاید ایسے ہی موقع پر کہا تھا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

محض دیدار کی خوش بختیاں حاصل تھیں اور [illegible] آنکھ غرور [illegible] جاتی تھی۔ کچھ لوگ بلا وجہ معترض بھی تھے۔ تعجب [illegible] کی مشغولیت [illegible] آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ [illegible] اور حسینائے عالم کے دعوتِ نظارہ پر جب کنجوسی سے اور آنکھیں شرم سے موند لیتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ دو غلامین [illegible] میاں کو بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ بندے تو اللہ ہی کے [illegible] ہیں۔ اس سال ہمارا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہم مرے نہیں۔ اگرچہ [illegible] اس سال کی خواہش رہا تھا ہوائی جہاز میں اڑنے کی تھی۔ بچپن سے ہوائی جہاز کو دیکھا [illegible] آسمان پر جاتے تمنا سے پرواز جاتی رہی۔ بہت خوشی ہوئی کہ غربت [illegible] ہماری خوش بختی کے سبب اس لائق [illegible] رکھا کہ مرنے کے لیے اڑتے [illegible] اڑنا تو کجا آج چلتے [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] تو مسرت، رنگینی [illegible] آسودگی ہے تو سنبھلنے میں ایک [illegible] پاؤں میں پہیہ تو نہیں۔ [illegible] فالج نہیں سر پہ سیاست نہیں [illegible] دل شکر [illegible] نعمت ہزار نعمت ہے اور اگر دل کفرانِ نعمت کی نحوست سے دو چار ہو تو [illegible] نعمت نہیں۔ شاید مولانا روم نے اسی نکتہ کو اپنی مثنوی کی زینت بنایا تھا

شکرِ نعمت نعمتت افزوں کند
کفرِ نعمت از کفت بیروں کند

سال گزشتہ کے چند ایک [illegible] بھی یادگار [illegible] ہیں۔ ہندوستان کی چند [illegible] شخصیتیں بھی عدالت کی لت میں گرفتار [illegible] خواص عوام کے کٹہرے میں [illegible] کی طرح کھڑے نظر آئے۔ شیطان نے حسبِ عادت ان سے انا بری کہہ کر راہِ فرار اختیار کی اور پیر بیٹھے بے دردی سے سانپ کے گزر جانے کے بعد لکیر پیٹتے رہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ نادانی عقل جاہل کیا کرتے ہیں مگر ۱۹۹۶ نے جاتے جاتے خبردار کیا کہ عاقل و بالغ بھی ایسا کر سکتے ہیں شرط بس اتنی ہے کہ عقل جڑ سے ماری جائے۔ رہبروں کے چہرے کیا بے نقاب ہوئے کہ [illegible] چہرے والے رہزنوں کا دیدار ہوا۔ رقاصوں نے دنیا کو نچایا۔ بہروپ سے زیادہ [illegible] جانے لگے۔ انقلابِ عظیم رونما ہوا وہ جن کے ساتھ ایک [illegible] تھا اپنے سامنے [illegible] نظر

نے جنھوں نے رعونت وکبر کے طفیل دیوار چین کو ڈھا دیا تھا۔ انھیں دست عدل نے دیوار زنداں میں چنوا دیا۔ یہ محاورہ کہ نہ جانے ما ندن نہ پائے رفتن طلائے سیاست کو خوب سمجھ میں آ گیا۔ شہر دآبرو کا نیلام ہوا۔ عظمت و بزرگی کو دیوانے نے کاٹ لیا اور وہ چاک داماں پریشاں زلفیں اس جنگل کو بھاگ کھڑی ہوئی جہاں لیلیٰ کا عاشق کا غذ چباتا ہے۔ عدالت بھی عجیب شے ہے کرسی قدر سے اٹھا کر کرسی مرگ پر بٹھا دیتی ہے۔ ایک مادہ اُلو کو سونے کی چڑیا" کا خطاب دیا گیا۔ جس کے گھونسلے سے ایک ایک کیلو کے (۴۰) سونے کے انڈے برآمد ہوئے جسے وہ حرص کی تبداد کے پنکھوں میں لیے چوری چوری سینک رہی تھی۔ یقین ہے کہ اگر دن پورے ہو جاتے تو ان انڈوں سے شیاطین برآمد ہوتے جو ہندوستان جنت نشان کی معیشت میں ایسا زہر گھول دیتے کہ بھارت فخر افلاس کے لائق نہ رہ جاتا۔

...نی بھی بنانے والوں نے یہ اعلان کر دیا کہ اصلی گھی سے بلڈ پریشر اور موٹاپے کا تیر بہدف علاج ممکن ہے۔ یہ جیتے ہی " موٹو ابا" نے گھی کو دوا کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا اور چند ہی دنوں بعد انھیں کسی اور دوا کی ضرورت نہ رہی۔ اب ہندوستان میں باشعور لوگ فیملی پلاننگ سے زیادہ اغذیہ کو ادویہ کے طور پر استعمال کی دعوت دے رہے ہیں۔ شاید ان کا خیال ہو کہ اس طرح پبلک پر کنٹرول ممکن ہے۔ عدالتوں نے عوام کو ... کی اجازت دی کہ وہ خوشی سے خودکشی فرمائیں ان پر کوئی جرمانہ عائد نہیں ... مرنے کے بعد جرمانہ ادا کرنے کی پاداش کے تصور سے لوگوں نے خودکشی پر لمحہ لمحہ مرنے کو ترجیح دی ... ہے کہ اور مقامات پر لوگوں نے جرمانے سے بچنے کے لیے خودکشی کو واحد حل سمجھا ... جب خودکشی کو شادی کرنے کی طرح جائز قرار دیا تو بعض دانشوروں نے ججوں کو ... کروانے کا سلیقے سے مشورہ دیا۔ اور ججوں نے ان حضرات کو بیک قلم پاگل قرار دیتے ہوئے ... ہی دیوانگی کا ثبوت پہنچایا۔ ہمارے ملک میں لوگ واقعی ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں۔ اور ... وں کے انوسار دنیا میں ہر چھ منٹ پر ایک "خودکشی" ہونے لگی۔ اور اگر خودکشی کا یہ شوق ترقی کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہر منٹ میں چھ خودکشی کے واقعات وقوع پذیر ہوں گے۔ بعض کنجوس لوگ سستے زہر کا استعمال کر کے اپنے ہاتھوں اپنی موت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ... معلوم ہونا چاہیے کہ مرتے وقت کنجوسی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جس طرح فیاضی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ خودکشی کی وارداتوں کے طفیل ہمارے شہر کی واحد تفریح گاہ حسین ساگر خودکشی کا ... ہے کہ وہاں کے وفادار پولس والوں نے نازک اندام حسینوں کو تیر کر ڈوبنے سے بچانے کی کوشش میں محکمہ کا نام روشن کیا۔ یہ پولس والے بھی عجیب ہیں۔ جب مرد چھلانگ لگاتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ تیراکی کے لیے چھلانگ لگایا ہے۔ جب صنف نازک چھلانگ لگاتی ہے تو خیال کرتے ہیں کہ ضرور یہ خودکشی کی کوشش کر رہی ہے۔

امسال بعض لوگ اپنے ملک میں اپنی بدنصیبی کی بدولت ایک عدد بیتی نہ بن سکے اور بعض ہندوستانی اپنی بدنصیبی کے طفیل دوسرے ممالک میں ... بن گئے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں اس سے

ہمارے ملک ہی کا نہیں غیر ممالک کا وقار بھی متاثر ہوتا ہے۔ لوگ یقیناً سوچتے ہوں گے یہ کروڑپتی بننے ہمارے ملک کیوں آجاتے ہیں۔ ورلڈکپ مقابلہ منعقد ہوا تو دو بھائیوں کی پورے ۴۲ سال بعد ملاقات ہوئی۔ شاید اب بچھڑے ہوئے بھائیوں میں ملاقات کے لیے ہر ماہ سالانہ ورلڈکپ مقابلے کا انعقاد ناگزیر ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی مقابلہ ایسا بھی منعقد ہو جس کے طفیل دو ممالک مل جائیں۔
ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک شعلہ پوش شخص آدمی بھری عدالت میں جج کے سامنے حاضر ہوا اور خود کو چشم دید گواہ کی حیثیت سے پیش کر کے جج کو اپنی موت کا چشم دید گواہ بنا دیا۔ سنا گیا کہ جج نے اسے جاگتی آنکھوں کا ڈراؤنی خواب تصور کرتے ہوئے حقیقت سے گریز کیا اور جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں لاش کو پوسٹ مارٹم کی سزا سنائی۔ ایک مقرر نے جو دھما کو خبریں سنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے یہ اطلاع دی کہ ایک نو بیاہتا دلہن کو جہیز کے لیے اس کے دولھے نے جلوے کی رات آتشِ شوق کے نتائج نذر کرنے کے بجائے خود اسے نذرِ آتش کر دیا۔ اب کوئی دولہن اپنے دولھا کو سگریٹ جلانے بھی ماچس نہیں دے گی۔ کیا عجب کہ وہ لبطور نیشن اپنی دلہن کو سگریٹ ہی بنا دے۔ مگر عورت کوئی سگریٹ نہیں جو دھیرے دھیرے جلے اسے یکمشت جل جانا خوب آتا ہے۔ تعجب تو اس امر پر ہے کہ کیروسین کی قلت کے دور میں بھی لوگ اس قسم کے اصراف سے گریز نہیں کرتے۔ اگر وہ اپنی دلہنوں کا خیال نہیں کرتے نہ کریں گیاس کے تیل کا تو خیال کریں!
اسی سال ہم نے یہ حیران کن اور مسرت افزا خبر سنی کہ ایک اونٹنی چھ برس کی طویل مدت کے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ کاش آج کا انسان اس اونٹنی سے سبق حاصل کرے اور جس منصب جلیلہ ورتبۂ خلیفہ کو وہ چھوڑ آیا ہے اس کی بازیافت میں کوشاں ہو۔ کم از کم لیڈروں کو تو اس اونٹنی کے پاؤں دھو کر پینا چاہیے کہ وہ ایک جانور ہے لیکن اسے اپنے ٹھکانے اور مقام کا احساس ہے اور یہ انسان ہیں جو اپنے مقام اور اپنے ٹھکانے سے گمراہ ولاپرواہ۔ آزادی کے بعد جس گمرہی کو صراطِ مستقیم کا بدل سمجھا ہے۔ اب اس سے دامن کشی کو جادۂ جہنم سمجھتے ہوئے قدم بہ قدم اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی ہمیں اس اونٹنی سے ملاقات کروا دے تو ہم سیڑھی لگا کر اس باوفا اونٹنی کا منہ چوم لیں گے۔ گلاب سے رخساروں سے اب وفا کی امید لایعنی سی ہو گئی ہے۔
ایک لطیفہ اور سننے میں آیا باہر کے راوی نے یہ اطلاع دی کہ یہ اندر کی بات ہے کہ جارج واشنگٹن کی دستخط والی کتاب کا (۳۱۰۰۰) ڈالر میں ہراج ہوا۔ خریدنے والا بھی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اچھا ہوا کہ جارج واشنگٹن امریکہ کے آدمی تھے۔ اگر وہ ہندوستانی ہوتے تو یوں رقم تو ہراج کروانے والے ایجنٹ کو گزارنا پڑتا۔ ہندوستان میں ہراج کروانا گویا افلاس مزید کو دعوت دینے کے مترادف ہے ادیبوں کو چاہیے کہ جس کتاب پر ان کے دستخط ہوں اس کی نگہداشت کرتے رہیں کیا عجب جو حال واشنگٹن کی کسی کتاب کا نہ ہوا ہو وہ ان کی کتاب کا ہو جائے۔ اسی سال ایک خاتون امیدوار کو اپنے زندہ انتخابی نشان "ببر" کے ساتھ گھومتے ہوئے پایا گیا مگر اس سے اس خاتون کی کم ببر کی زیادہ شہرت ہو گئی۔ لوگ سمجھے کہ ببر ایک عورت کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر ہماری بیگم نے کہا کہ اگر میں انتخاب لڑوں گی تو میرا نشان

" ہوگا اور میں بھی اس کے ساتھ پدیا ترا کروں گی۔ ہم نے کہا۔ جانِ من تم اکولاؤ گی کہاں سے سارے
یہاں سے ہجرت کر گئے ہیں۔ بیگم نے کہا۔ چپ رہیے کیا کچھ دنوں کے لیے تم میرے ساتھ ساتھ نہیں
سکتے۔ یہ سن کر ہم نے خود کو سلیقہ سے پڑھنے کی کوشش کی۔ آئینہ دیکھا تو خود کو نرا ہندوستانی پایا اور خوشی
، رات دیر گئے تک بولتے رہے۔

الغرض یہ سال لطیفوں کا سال رہا اور حسب قاعدہ اس سال کا آخری لطیفہ بھی ہم پر نازل
یا۔ مدتوں بعد اردو والوں کے مقدر جاگے اور ایک کالج میں ایک لکچرر کی جائیداد قارون کے
انے کی طرح نکل آئی۔ انٹرویو ہوا تو انٹرویو لینے ... والوں میں خدا کی قدرت سے اپنے ایمان دار
رشناس اور لائق لوگ تھے کہ ہم اپنی مایہ نازبے ہنری، فلک آشنا نالائقی اور شریا مزاج ایرصاتی
باوجود سلکٹ ہوگئے مگر ہوش ربا مصلحتوں .. اور ہنگامہ خیز سیاست نے تقرر سے محروم کر دیا۔

غرض ہم اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو نئے سال کی آمد پر دماغ کی اونچائی سے مبارکباد
ے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں یہ کام دل کی گہرائیوں سے انجام دینا چاہیے۔ محاورہ سے انحراف اس
بہ ہے کہ دنیا نے ترقی کو محض دماغ کا مرہونِ منت قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ انسانوں کی ترقی ان کے
ان کی نہیں ان کے قلوب کی منت پذیر ہوتی ہے۔ ●●

ڈاکٹر محبوب راہی
(اکولہ)

ضرورت ہے ایک ٹیچر کی

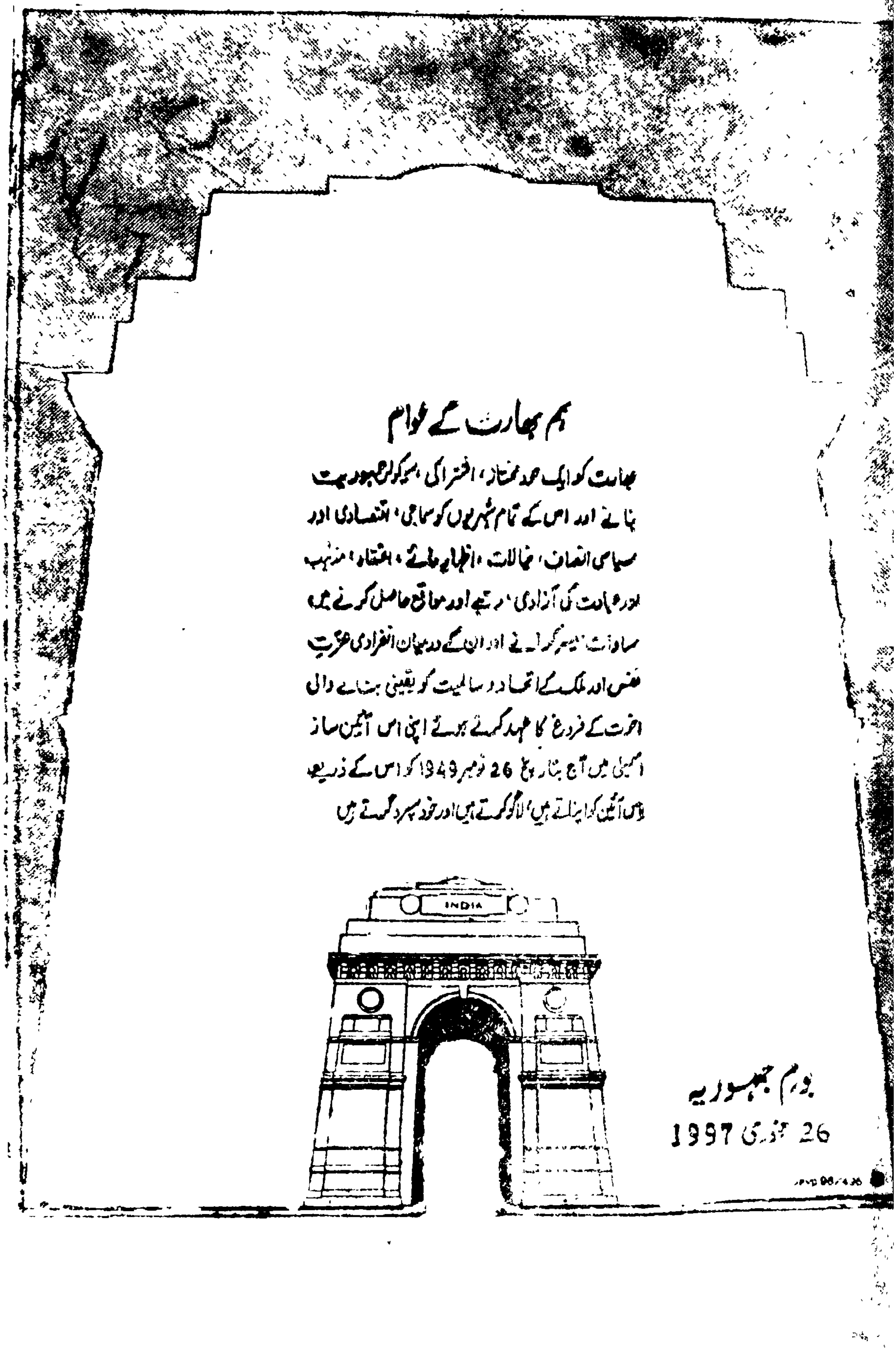
ضرورت ہے ہمارے گاؤں کو اک ایسے ٹیچر کی — اٹھائے جوتیاں جو گاؤں کے ہر ایک لیڈر کی
بڑا ہو چاہے چھوٹا سب کو خوش رکھنے کا عادی ہو — ہر اک کڑوی کسیلی ہر گھڑی چکھنے کا عادی ہو
لگائے حاضری ہر شام جو سرپنچ کے گھر پر — کرے ڈنڈوت جو ادھیکش کو ہر صبح جا جا کر
کرے جو چاپلوسی راؤ صاحب خاں صاحب کی — رکھے چیلے سے چپراسی کے جو پہچان صاحب کی
خوشامد میں ہو ماہر چاپلوسی میں ہو لاثانی — جو پانی کو بنا دے دودھ اور پھر دودھ کو پانی
جو رکھے دوستی ہر اک سیاست کے کھلاڑی سے — نکلے اس کی اگاڑی سے کبھی اس کی پچھاڑی سے
ہنر جو جانتا ہو اپنے افسر کو پٹانے کا — جسے آتا ہو گُر ہر ایک بگڑی کو بنانے کا
نہ رکھے واسطہ کوئی پڑھائی اور لکھائی سے — اسے ہو کام صبح و شام بس اپنی کمائی سے
کھپائے ذہن کو اپنے نہ وہ بیکار بچوں پر — غریبوں، مفلسوں کے گندے اور نادار بچوں پر
پڑھائے جا کے بچوں کو گھروں پر مالداروں کے — کہ وارے نیارے ہوں گے جن سے لاکھوں اور ہزاروں کے
لگائے ٹیوشن جو اس کے نمبر جا کے بڑھوائے — بتائے اس کا پرسنٹیج میرٹ میں اسے لائے
جو کچھ بھی دے نہیں سکتا ذہانت لاکھ رکھتا ہو — وہ دو کوڑی کا ہے چاہے لیاقت لاکھ رکھتا ہو
کرے جو دوستی داداؤں سے اور سٹہ بازوں سے — ہو واقف کالے دھندوں کے نشیبوں اور فرازوں سے
سیاسی پینتروں، داؤں سے ہتھکنڈوں سے واقف ہو — وہ ان پاکھنڈیوں کے سارے پاکھنڈوں سے واقف ہو
ملائے لیڈروں کی ہاں میں ہاں جو بات وہ کہہ دیں — کہے "بالکل بجا ہے" دن کو بھی گر رات وہ کہہ دیں
نہ لکھنا جانتا ہو جو نہ پڑھنا اس کو آتا ہو — مگر سیڑھی پہ پرموشن کی چڑھنا اس کو آتا ہو
رسائل سے ہو اس کو اور نہ کچھ اخبار سے مطلب — نہ غالب سے نہ اس کے دلنشیں اشعار سے مطلب
جوا کھیلے پئے دارو وہ چاہے بھاڑ میں جائے — بس اتنی شرط ہے ریزلٹ وہ سو فیصد ہی لائے

نہ قدرے اس سے بہتر کی نہ قدرے اس سے بدتر کی
ضرورت ہے ہمیں ایسے ہی اک ایسے ہی ٹیچر کی

محمود شریف محمودؔ
(حیدرآباد)

غزل

رہبروں کے روپ میں ہے رہزنوں کی دھوم دھام — کیوں نہ ہو اسکام کے اسکینڈلوں کی دھوم دھام
کام کوئی اب بنا رشوت نکل سکتا نہیں — ہر طرف ہے کرسیوں پر راشیوں کی دھوم دھام
نشہ بندی ہے یہ کیسی اب ہمارے شہر میں — جس طرف دیکھو ادھر ہے میکشوں کی دھوم دھام
کھڑکیوں سے جھانکنے کی اب کوئی حاجت نہیں — ہے سرِ بازار ہر سو گلرخوں کی دھوم دھام
شہر میں ہوتی ہیں جس دن سینکڑوں ہی شادیاں — بیوٹی پارلر میں دیکھو دلہنوں کی دھوم دھام
مل گئی محمودؔ مسٹر جین کی اک ڈائری! — ہے حوالہ کیس میں اب لیڈروں کی دھوم دھام


ہم بھارت کے عوام
بھارت کو ایک خود مختار، اشتراکی، سیکولر جمہوریت
بنانے اور اس کے تمام شہریوں کو سماجی، اقتصادی اور
سیاسی انصاف، خیالات، اظہار رائے، اعتقاد، مذہب
اور عبادت کی آزادی، رتبے اور مواقع حاصل کرنے میں
مساوات میسر کرانے اور ان کے درمیان انفرادی عزت
نفس اور ملک کے اتحاد و سالمیت کو یقینی بنانے والی
اخوت کے فروغ کا عہد کرتے ہوئے اپنی اس آئین ساز
اسمبلی میں آج بتاریخ 26 نومبر 1949 کو اس کے ذریعہ
اس آئین کو اپناتے ہیں، لاگو کرتے ہیں اور خود سپرد کرتے ہیں
INDIA
یوم جمہوریہ
26 جنوری 1997

اقبال ہاشمی

سن چھیانوے کے داغ

جواب آپ ہی اپنے سوال کا نِکلا
گزشتہ سال نہایت کمال کا نِکلا

پہاڑ رائی میں تبدیل ہوگئے کتنے
یہ حال دیکھ کے دم بھی زوال کا نِکلا

تمہارے گھر سے خزانے حرام کے نکلے
ہمارے گھر سے بھی کچھ کچھ حلال کا نِکلا

کئی طرح کے تماشے جنوب نے دیکھے
مگر عجیب تماشا شمال کا نِکلا

کسی میں دم نہ تھا مسند پہ بیٹھ جانے کا
چلو یہ سال بھی قحط الرجال کا نِکلا

محاورے کے مطابق کسی کسی کے لیئے
گزشتہ سال بھی "روٹی پہ دال" کا نِکلا

تمہارے واسطے خوشحالیوں کا ضامن تھا
ہمارے واسطے لیکن وبال کا نِکلا

کہیں یہ غیظ و غضب بارشوں نے دکھلایا
کہیں یہ سالِ گزشتہ اکال کا نِکلا

وہاں پہ ہاشمی طوفاں تھا، یہاں دل سے
غبار آپ کے دستِ سوال کا نکلا

محمد علی رفعت
حیدرآباد

غزل

کرنے آئے تھے جو ہم سے پیار تیرے شہر میں
جانے کیوں وہ پڑ گئے بیمار تیرے شہر میں

کون ہے اپنا؟ پرایا کون ہے، کیا جانیئے
ایک سے لگتے ہیں سب دلدار تیرے شہر میں

عشق میں ایسے پھنسے کہ نوکری جاتی رہی
بیچتے پھرتے ہیں اب اخبار تیرے شہر میں

عمر میں مجھ سے زیادہ ہی ملی، جو بھی ملی
میں ہوا شادی کو جب تیار تیرے شہر میں

لالچی نرسیں ہوتی ہیں آج کل تیمار دار
ہوگئی نرسنگ بھی بیوپار تیرے شہر میں

جن کو روزے کی کبھی توفیق ہوتی ہی نہیں
کھا رہے ہیں دعوتِ افطار تیرے شہر میں

منظور الامین
ہوسٹن (امریکہ)

اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

امریکہ آنے کے بعد سے یہاں کے Malls (فیشن ایبل بازار) اور اسٹورز میں ہم اکثر جاتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر Window shopping کے لیے ویسے جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان دکانوں میں مسلسل خریداری کرتے رہیں لیکن انگریزی کے اس محاورے کو ذہن میں رکھ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اگر خواہشیں اور آرزوئیں گھوڑا ہوتیں تو گدا اگر اس پر ضرور سوار ہو جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ امریکی بازار حاتم طائی کا گنبد افسوں ہے جہاں پہنچ کر انسان کھو سا جاتا ہے اور اس گنبد سے یہ آواز آتی رہتی ہے :

یہ بازار میں کیسا گیا نہ دوا نہ ملنگے

ہم عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ پر یہ امتناع عاید کر لیا جائے کہ ۔

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

یہ کہنا بے سود ہے کہ ہماری جیب کی صلاحیت محدود ہے ، اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ !

حال میں دکانوں کا باہر ہی سے مشاہدہ ، مطالعہ اور معائنہ کرتے۔ غیر شعوری طور پر ہم ایک ایسی دکان کے اندر جا پہنچے جو قیمتی جواہرات کی دکان تھی ۔ ویسے دکان کے اندر تو ہم آگئے تھے لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ اس سے باہر نکلنے کا راستہ قدرے مشکل ہوگا ،

ایک راز کی بات ہم آپ کو بتا دیں کہ ایک غریب ملک کے شہری ہونے کے باوصف ہماری شکل سے افلاس نہیں ٹپکتا ویسے غور سے دیکھیں تو ہن بھی نہیں برستا مگر پتہ نہیں کیوں مالک دکان کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ہم کوئی راجے مہاراجے قسم کی شخصیت ہیں ۔ پس اس تاجر جواہرات نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ پہلے ہماری توجہ فیروزہ ، یاقوت ، زمرد ، نیلم پکھراج وغیرہ کیطرف مبذول کروا کے وہ ہمیں ہیروں کے سیکشن میں لے گیا یہ کہہ کر کہ Sir, diamonds are for ever ۔

صاحبزادہ ہیرے کیا تھے ہمیں یوں لگا آسمان کی بلندیوں سے ستارے زمین پر اتر آئے تھے ۔ ہم اپنی حیثیت اور اوقات سے اچھی طرح واقف تھے اور آج بھی ہیں ، ہم نے ان ہیروں کی خوب خوب تعریف کی اب

تاجر ہمیں اپنے ذاتی چیمبر میں لے گیا۔ جہاں اس نے ہمیں کئی اور قیمتی ہیرے دکھائے۔ اب ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ ہیروں کا وہ سوداگر ہمیں آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ اس بیچ اس نے ہماری تواضع میکڈونلڈ کے فش برگر اور cake سے کی جو واقعی بے حد لذیذ تھے۔ اب ہم نے سوچا کہ جب ہیرے و سلطان تک کو ہم جیسا شاہین کا فوری میسر نہیں تو بھلا اس سوداگر کی کیا حقیقت کہ ہم پر دام ڈال سکے۔

لہٰذا ہم نے اپنی Strategy بدل لی۔ ہم اس ماہر فلزات اور تاجر جواہرات سے ان الفاظ میں گویا ہوئے۔ یاد رہے کہ الفاظ تو اردو زبان کے ہیں لیکن ہم نے یہ سب باتیں اس سے انگریزی زبان میں کہی تھیں)۔

"اے ناصح معدنیات، یہ سچ ہے کہ وطن میں ہم بہت سارے ہیروں اور جواہرات کے مالک تھے لیکن اب ہم زندگی میں بہت دور نکل آئے ہیں۔ ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں جہاں کی زندگی کی قدریں مختلف ہیں۔ ہماری زندگی کا فلسفہ اور اخلاقیات ہمیں قناعت کا درس دیتے ہیں۔" تاجر ہمہ تن گوش تھے۔ ہم نے اپنا وعظ جاری رکھا۔

"مادی طور پر دیکھا جائے تو ہیرے کی زبردست مالیت ہے لیکن ویسے بھلا اس کی کیا حیثیت اور حقیقت ہے ---- ایک مرغ بھوکا تھا اسے دانے کی کھوج تھی اس نے ایک ہیرا پڑا پایا تب مرغ ہیرے سے بولا:

"اے ہیرے تو میرے لیے ایک معمولی سا پتھر ہے مجھے تو اس وقت اناج کے دانے کی تلاش ہے۔ میری بھوک مٹانے کی تجھ میں یہ قابلیت نہیں۔"

سوداگر اپنی دکان اور کاروبار کو بھول گیا تھا۔ ہم نے سلسلۂ کلام قطع نہیں کیا۔ "آپ کو ایک اور واقعہ سناؤں، گاؤں کی ایک ان پڑھ عورت نے ندی کے کنارے ایک چمک دار پتھر پڑا پایا وہ پہچان نہیں پائی کہ وہ ایک بڑا قیمتی ہیرا تھا وہ ندی پر روز نہانے جاتی۔ اس ہیرے سے اپنے پاؤں گھستی اور ہیرا اسے ایک بڑے پتھر کے نیچے چھپا کر رکھ دیتی۔ ایک دن وہ اسے پتھر کے نیچے رکھنا بھول گئی اور نہا کر گھر چلی گئی وہ ہیرا کنارے پر پڑا رہا اتفاق سے اُدھر سے ایک جوہری کا گزر ہوا اور دیکھتے ہی جوہری کا پاؤں اس ہیرے پر پڑ گیا۔ ہیرا کرب سے بلبلا اٹھا اور بولا:

جان اجان پگ گھسوت ہے نہ ہووے پیر
جان جوہری پگ دھرو پھاٹت جلے سریر

یعنی ایک لاعلم مجھے لے کر اپنے پاؤں گھستی تھی اسے میری حیثیت اور مالیت کا اندازہ نہیں تھا۔ مگر مجھے اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن جب ایک جانکار کا پاؤں مجھ پر پڑ گیا تو درد سے میرا کلیجہ پھٹ گیا کیونکہ وہ پاؤں ایک جوہری کا تھا جو ہیرے کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ اس نے مجھے اس طرح روندنا نہیں چاہیے تھا۔"

اب وہ امریکی باشندہ ہندوستانی درشن شاستر اور نیتی میں کھو گیا تھا۔ قریب تھا کہ گوتم بدھ کی طرح وہ یہ اعلان کر دیتا کہ دنیا اور اس کا مال و متاع ہیچ ہے۔ ہیرے جواہرات، کنکر پتھر

اور اپنی دکان اس حقیر، فقیر، پُر تقصیر کے حوالے کر کے " بدّم شرنم گچھامی" کا جاپ کرتا راہی اختیار
لیا کہ ہم نے اپنا ہاتھ اس کی دور درشتی آنکھوں کے آگے لہرا کر اسے یاد دلایا کہ یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت'
ری میں ضایع کرو اسکو مت ، دکان میں ادرکا ہک ا۲۰ کے منتظر ہیں پھر ہم نے اعلان کیا ہم اُس کے
درجے کے ہیرے خریدنے، اس بار اپنی بیوی کو لے کر دو ایک دن میں ضرور آئیں گے اور وہاں سے
رخصت ہوئے جیسے کبھی اس دکان کے اندر ہم نے قدم رکھا ہی نہیں تھا۔

کچھ نہ پوچھ

ٹی این راز
پنچکولہ-ہریانہ

ملک پر چھائی ہوئی ہے اک قیامت کچھ نہ پوچھ
کیا بتائیں کس نے کھائی کس کی دولت کچھ نہ پوچھ

پھکڑوں کے کتنے بینکوں میں اکاؤنٹ کھل گئے
یعنی دولت جعل سازی کی بدولت کچھ نہ پوچھ

جتنی جیلیں ہیں بڑی آن سب میں رونق آ گئی
لیڈروں کی بن رہی ہے کیسی دُرگت کچھ نہ پوچھ

سب گھٹالوں کے یہاں حمام میں ننگے ہوئے
ہر جماعت بن گئی اپنی حقیقت کچھ نہ پوچھ

ہر ضمانت کی غرض سے کورٹوں کے پیہم طواف
عمر کے اس موڑ پر بے جا خجالت کچھ نہ پوچھ

ہیں سبھی اہلِ ہوس بس اس کی زلفوں کے اسیر
بن گئی ہے اک طوائف یہ سیاست کچھ نہ پوچھ

جس طرف دیکھو کھڑا ہے اک سوالوں کا ہجوم
بن گیا ہے میڈیا بھی ایک آفت کچھ نہ پوچھ

جانچ میں حرفِ ملامت سہہ کے بھی ہر کورٹ سے
سی۔بی۔آئی کو نہیں پھر بھی ندامت کچھ نہ پوچھ

مسجد و مندر کے جھگڑوں میں پھنسا کر دیش کو
جاہلانِ وقت کی گھٹیا قیادت کچھ نہ پوچھ

کوئی لکھو، کوئی ماما اور کوئی دھرماتما
چوریوں میں سچے رشتوں کی صداقت کچھ نہ پوچھ

ان حوالوں اور گھٹالوں کے مسلسل فیض سے
راز کی ہے کُل جہاں میں کتنی شہرت کچھ نہ پوچھ

غزل

محبوب مانجھومی
بلاسپور (مدھیہ پردیش)

پڑھ کے بی۔اے جوان بیچتے ہیں
بیڑی، سگریٹ، پان بیچتے ہیں!

کاجو، اخروٹ، کشمش و بادام
"قوم جنگجو" پٹھان بیچتے ہیں!

ان کو جوّے کی لت نے مارا ہے
خاندانی مکان بیچتے ہیں!

باپ سُلطانی تھے، مگر بیٹے
پاؤ روٹی و نان بیچتے ہیں!

اس قدر گر گئے ہیں اب کچھ لوگ
"حرمتِ خاندان" بیچتے ہیں!

پان کی لت میں دھان پان سے شیخ
قیمتی پاندان بیچتے ہیں!

ہیں جو غدّارِ ملک و قوم، وہی
ملک کی آن بان بیچتے ہیں!

کوچۂ مہ رخاں میں ہم محبوب
مفت میں اپنی جان بیچتے ہیں

رشید الدین
(حیدرآباد)

نام منظور ہے تو......!

شیکسپیر نے کہا ہے "نام میں کیا رکھا ہے"۔ مگر صاحب ہماری تو یہ رائے ہے کہ نام ہی سب کچھ ہے۔ اگر نام نہ ہو تو انسان بے نام، گمنام، بے ننگ و نام اور نہ جانے کیا کیا ہو کر رہ جائے۔ یہ نام ہی تو ہے جو انسان کو اس کی شناخت دیتا ہے۔ کل کو بچہ جب بڑا ہوگا تو اپنے نام ہی سے پہچانا جائے گا۔ اس لیے نام کافی غور و خوض کے بعد رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ سوچا نہ سمجھا جو نام چاہے رکھ دیا۔ اسی لیے لوگ اپنے بچے کا نام رکھتے وقت سو سو جتن کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام سے ستاروں کا بھی کچھ واسطہ ہوتا ہے اور اس کا اثر اس کی راشی پر پڑتا ہے جس کا قسمت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہم یہاں علم نجوم اور ستاروں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ اس معاملے میں ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں اور پھر ہم علامہ اقبال کے اس خیال کے حامی ہیں کہ:

ستارہ کیا تیری تقدیر کی خبر دے گا
کہ وہ تو خود ہے گردشِ افلاک میں گم

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم نام رکھا ہی، لوگ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ نام بامعنی ہونا چاہیے بہت سے لوگ اس میں مذہبیت کا پہلو بھی تلاش کرتے ہیں اور لوگ اکثر بڑے اور مشہور لوگوں کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں تاکہ وہ بھی مشہور ہوں اور ان میں بھی وہی اوصاف پیدا ہوں اور لوگوں کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے لیکن اپنے دوست اور آپ کے "شگوفہ" کے ایڈیٹر کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک یعنی بابائے ترک کہلائے تو ہمارے مصطفیٰ کمال!!۔ بابائے ظرافت ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بابائے ظریف گر ہیں۔

لیکن عام صورتوں میں اس کا اطلاق مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اقبال ایک ایسا نام ہے جو بہت عام ہے اور آپ سڑک پر ایک اقبال کو پکاریں تو تین چار افراد پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں۔ لیکن ہم نے زیادہ تر اقبال نام کے لڑکوں کو بڑے ہو کر انتہائی غیر اقبال مند بلکہ اس وصف سے عاری پایا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کوئی بڑے آدمی کا نام رکھ لینے سے آدمی بڑا نہیں بن جاتا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں یہی حال ہے۔ جب عراق کے صدام حسین نے امریکہ سے ٹکر لی تو اس زمانے میں بہت سے لوگوں نے جن کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے ان کا نام صدام رکھ دیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ صدام حسین کو چند ہی دن میں منہ کی کھانی پڑی۔ مگر اب بچوں کا نام تو نہیں بدلا جا سکتا تھا خدا جانے بڑے ہو کر ان صداموں کا کیا حشر ہوگا۔

اور شہروں کے بارے میں تو ہمیں علم نہیں مگر ہمارے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں اور رسموں کے علاوہ نام رکھنے کی رسم بہت عام ہے۔ یہاں لڑکے یا لڑکی کا نام بہت اہتمام سے نال کھول کر رکھا جاتا ہے اس کے نام کی ایک سلپ چھپوائی جاتی ہے جس پر نومولود کا نام مع ولدیت، تاریخ پیدائش شمسی اور قمری دونوں مہینوں میں سن اور دن بلکہ وقت پیدائش کے ساتھ چھپا ہوتا ہے۔ جسے دو لڈوؤں کے ساتھ اسٹین لس اسٹیل کی ایک پلیٹ میں پیک کیا جاتا ہے اور دوستوں اور عزیز و اقارب میں تقسیم کیا جاتا ہے کہ لیجیے صاحب ہندوستان کی آبادی میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ہماری خوشیوں میں شامل ہو جائیے ملک اور قوم کا جو ہوگا سو ہوگا۔ اس کی کسے پڑی ہے!

جہاں ہم نام کے اتنے اہتمام کے قائل نہیں وہیں اس کے بھی قائل نہیں کہ آپ اپنے بچے کا نام کچھ بھی یعنی گھرو، پتھرو، ہونڈو یا ایسا ہی کوئی بے تکا اور مضحکہ خیز نام رکھ دیں۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اچھا سا نام رکھ دیں اور انہیں کانا بنا دیں یعنی نہ لکھائیں اور نہ پڑھائیں بلکہ آوارہ گردی کرنے یا سائیکلوں کے پنکچر جوڑنے چھوڑ دیں۔ ایسے ہی موقع کے لیے یہ کہاوتیں وجود میں آئی ہیں: پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ یا کرتوت شیطان کے نام عبداللہ۔ ہر انسان کو اپنا نام پیارا ہوتا ہے اور جب وہ بچہ ہوتا ہے تو اپنے ماں باپ کا بھی پیارا ہوتا ہے لیکن اس کے بڑے ہونے کے بعد اسی کے ماں باپ کو یہ کہتے بھی سنا ہے کہ پیدا ہوتے ہی کیوں نہیں مر گیا۔ ہمارے ملک کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اتنے وسیع و عریض ملک میں اور ایسے مسابقتی دور میں کوئی کچھ بنے اور اپنا نام روشن کرے بھی تو کس طرح۔ چراغ علی نام رکھ دینے سے کوئی بچہ دوسروں کو روشنی دینے سے تو رہا اکثر صورتوں میں تو گھر کا چراغ ہی اپنے گھر کے اندھیرے کا باعث بن جاتا ہے۔

لیکن اس آب و گل میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ نام کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ بباطن کچھ بھی ہوں لیکن بظاہر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان کا سا نیک اور قابل کوئی اور نہیں۔ نام کی خاطر لوگ جان جوکھم میں ڈالنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہمالیہ کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے لیے لوگوں نے کیا کیا نہیں کیا اور ایک دن اسے سر کر بھی لیا۔ لیکن اس سے پہلے اس راہ میں کتنے لوگوں کی جانیں گئیں۔ اس کا باضابطہ حساب کتاب کسی حکومت کے پاس بھی نہیں۔

انسان نے مہتاب پر بھی قدم نہیں رکھا بلکہ دنیا تک بھی پہنچ گیا۔ اور زندہ سلامت واپس بھی آگیا

یہ سلسلہ اور کوششیں ایورسٹ کے سر کرنے کی طرح آج بھی جاری ہیں۔ اور اس پر اربوں روپے خرچ کیے جا چکے ہیں لیکن ہمیں اعتراض اس بات پر ہے کہ صدیوں سے چاند کی خوب صورتی کا جو تصور ہمارے پاس تھا اور ہم جو اپنے بچوں کو کہانی سناتے تھے کہ چاند میں ایک بڑھیا بیٹھی چرخہ چلا رہی ہے اس کی توثیق نہیں ہوئی خیر بڑھیا اور اس کی کہانی کو مار دیجئے گولی۔ ہمارے سائنسدانوں نے چاند کی خوب صورتی میں جو زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے وہ سب خواب ہو گئے اور سارا بھرم جاتا رہا۔

نام کمانا یا نام کی لاج رکھنا اصل میں انسان کی جبلت میں ہے اور اسے اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ اس شوق اور دھن میں کئی لوگوں نے خود کو لٹا دیا بلکہ اپنی جان تک گنوا دی۔ آپ پوچھیں گے اس میں جان گنوانے کی کون سی بات ہے تو غرض یہ ہے کہ یہ جو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ ہے اس میں اپنا نام شامل کرانے کے لیے لوگ مختلف میدانوں میں نت نئے تماشے اور حماقتیں کرتے ہیں۔ اور اس کوشش میں اپنی جان تک گنوا بیٹھتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ بچھو کے کاٹے کا منتر نہ آتا ہو تو سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ لوگ نام پیدا کرنے کے شوق میں اونچی اونچی بلندیوں سے چھلانگ لگا دیتے ہیں یا کسی اونچے درخت کی چوٹی سے کود پڑتے ہیں۔

آج کل تو نئے نئے جان لیوا اور خطرناک کھیل محض انفرادیت کے نام پر ایجاد ہوئے ہیں۔ نیک نام بن کر نام کمانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بہت سے لوگ بدنامی میں بھی نام پیدا کرتے ہیں اور فخریہ طور پر کہتے ہیں کہ :

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

لیکن صاحب میر صادق، میر جعفر، امیر علی ٹھگ، چارلس سوبھراج اور داؤد ابراہیم جیسے بن کر نام پیدا کرنا بھی کوئی تک ہے۔

نام پیدا کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے لیکن یہ خواہش کسی میں زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں کم اس معاملے میں سب سے زیادہ شعرا بہت بدنام ہیں لیکن خود ہمارے شہر میں قدیم زمانہ میں ایسے شعرا بھی گزرے ہیں جنھوں نے شہرت کی بجائے گمنامی میں ہی عافیت سمجھی۔ ایک ایسے ہی شاعر محترم کا نام یہاں بتانے میں ہم کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ جنھیں ان کے ایک شعر پر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے بادشاہ نے انھیں دربار میں طلب کیا لیکن وہ جانے کی بجائے گھر میں بیٹھے رہے۔ یہ شاعر کوئی اور نہیں حضرت توفیق حیدرآبادی تھے۔

اجمال اس تفصیل کی یہ ہے کہ نام پیدا کرنے کے لیے انسان [illegible] کر گزرتا ہے۔ وہ اس کے لیے رسی پر چلتا ہے۔ شیر کے منہ میں سر ڈال دیتا ہے اور موت کے [illegible] جاتا ہے۔ بہت سے لوگ عجیب عجیب سوانگ بھرتے ہیں کہ لوگ .... ان کی طرف توجہ ہوں۔ بہت سے لوگ اپنا مذاق آپ اڑا کر شہرت کے متلاشی ہوتے ہیں اور بہت سے اپنا تماشہ کر کے بھی [illegible] ہوتے ہیں۔

انسان کو بخوبی علم ہے کہ یہ دنیا چار دن کی ہے ...... اپنی دنیا بنانے میں اور نام کمانے میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کے نت نئے طریقے تلاش کرتا رہتا ہے۔ جتنا دنیا ترقی کرتی جا رہی ہے اور جتنا دنیا کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے اتنے ہی نام پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈے جا رہے ہیں لیکن ہمیں تو اس سلسلے میں استاد ذوق کا یہ شعر پسند ہے : نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا، پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

ظہیر قدسی
مالیگاؤں

دُعا

جنّت الاٹ کر کے مجھے خط یا تار دے
مرضی تری اٹیک دے، سردی بخار دے

پہلے تو ایک دوست مجھے جاں نثار دے
پھر دوستوں کی بھیڑ میں دشمن ہزار دے

ڈی ایڈ میری بیٹی ہے بیٹا گریجویٹ
سروس انھیں دلانے کو ستّر ہزار دے

میری انا پرست طبیعت کے واسطے
احباب مجھ کو جو بھی دے جاہل گنوار دے

تنہا کہاں کہاں یہ میں لائن لگاؤں گا
یا رب مری مدد کو فرشتے اُتار دے

اس عمر میں بھی شیخ عرب کی طرح دلہن
میں ایک بار مانگوں تو، تو چار بار دے

شہرت کے آسمان پہ اُڑتے ظہیرؔ کو
انوارِ فکر و فن بھی اے پروردگار دے

غزل

چشم و لب اور قد و گیسو نہیں دیکھے جاتے
بنا چشمے کے پری رو نہیں دیکھے جاتے

چاہئیں لاکھوں روپے ہاتھ صفائی کے لیے
صرف دس پیسے میں جادو نہیں دیکھے جاتے

کوئی آندھی ہی چلا کر تو گرا دے یا رب
شاخِ جمہور پہ اُلّو نہیں دیکھے جاتے

بے لباسی کا ہُنر دیکھنے سب جاتے ہیں
اب تو سرکس میں بھی بھالو نہیں دیکھے جاتے

جس میں جھگڑے کا ہو امکان اسے کر لو قبول
شعر میں حسن کے پہلو نہیں دیکھے جاتے

سرد جذبات ہوئے سوکھ گیا پانی بھی!
شیخ صاحب جو، لبِ جُو نہیں دیکھے جاتے

قوتِ صبر کرو پیدا یا مر جاؤ ظہیرؔ
تم سے گر بچوں کے آنسو نہیں دیکھے جاتے

ڈاکٹر بانو سرتاج
(چندرا پور، مہاراشٹر)

داستانِ ریفریشر کورس

جب ہم چھوٹے تھے اور والدہ سے کسی خاص چیز کی فرمائش کرتے تو جواب ملتا "جماعت میں اول آؤ تو دلا دیں گے۔"

سونے کے جھمکے، چاندی کی پازیب، حیدرآباد کے کنگن وغیرہ وغیرہ، سب ہم نے اسی طریقہ سے حاصل کیے۔ لونا حاصل کرنے کے لیے تو ہمیں دسویں کلاس کی میرٹ لسٹ میں آنا پڑا تھا۔

شادی کے چند برسوں بعد ہم نے شوہر محترم سے کار کی فرمائش کی تو وہ بولے...... "میری حیثیت کار خریدنے کی نہیں ہے۔ میں غلط طریقہ سے روپیہ کماؤں اس سے بہتر ہے کہ تم اپنی تعلیمی قابلیت کا فائدہ اٹھاؤ، ملازمت کرو اور کار خرید لو۔"

بات ہمارے دل کو لگ گئی۔ ہم لکچرر بن گئے۔

یہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں لکچررشپ صرف تعلیمی قابلیت پر ملتی تھی۔ آج تو لاکھ سوا لاکھ کی تھیلی دینا پڑتی ہے یا انتظامیہ کے ممبران کی مصاحبی کرنی پڑتی ہے۔ تب نوکری ملتی ہے۔ (کار والی بات تو رہ گئی۔ کیونکہ ہم آج بھی ... نہیں خرید سکے۔ ایمان داری کا ... نہیں ہے۔ ایماندار پیدل چلتا ہے، رشوت خور اور چالباز گاڑی میں)

تین سال تک ہم جی جان سے طلبا کو پڑھاتے رہے اور اس انتظار میں رہے کہ کوئی اعزاز جھولی میں گرے۔ (آپ کہیں گے تین سال کی ملازمت میں اعزاز کی بھی امید کرنے لگے؛ تو ہم جواباً عرض کریں گے کہ لینے والے چھ ماہ میں اعزاز لے لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کچھ نہ پڑھا کر اعزاز لے لیتے ہیں تو ہم نے کچھ نہیں، بہت کچھ پڑھایا تھا...... مگر اعزاز تو دور رہا، حکم ہوا ڈاکٹریٹ کرو۔ ہم نے سر آنکھوں پر چڑھا لیا۔ پی ایچ۔ ڈی سے سرفراز ہو گئے...... اور یہ سوچ کر کہ پڑھائی سے چھٹکارا ملا، بیٹھ گئے

... پندرہ برس گزر گئے لیکچرر کہلاتے کہلاتے ... بور ہو گئے ... دریافت کیا "کچھ گنجائش ہے؟"

بولے "گنجائش کیوں نہیں! ریفریشر کورس کر لیجیے اور ... ریڈر ..."

تو صاحبانِ قدردان! اس ... ہم بھی ریفریشر کورس کے ... کی جو تمہید بیان کی اس کورس کی سنیے اب داستان!

ریفریشر کورس میں ہم سمیت اکیس شریک کار تھے۔ ایج رینج تھا چالیس سے ... اور تعلیمی نفسیات مخصوص ایریا تھا۔

شریک کار حضرات کی عمروں سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مردہ دل تھکے ہوئے لیکچررز کا گروپ تھا جو یو۔جی۔سی کے احکامات کی خانہ پری کرنے آیا تھا۔

افتتاحیہ پروگرام میں سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنا تعارف کرایا۔ آدرشوں کی ... بڑی بڑی ... ہانکیں کہ ریفریشر کورس ... علم کو تازہ کرنے کا زرین موقع ہے۔ استاد کو روشن چراغ کی مانند ہونا چاہیے۔ چراغ اگر روشن ہو تو ہزاروں چراغ اس سے روشن ہو سکتے ہیں ... استاد اگر خود مطالعہ ... ہے تو طلبا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

کلاسز شروع ہوئیں تو سب کے نقاب ... گزرا تھا کہ ... کا ... فیسر کے سامنے سب نے دل کھول کر ... اور ... مناسبت ... کلاس کا سائز چھوٹا ہوتا چلا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچے ایک شریک کار بولے "مجھے ریفریشر کورس کی کیا ضرورت نہیں ہے۔ میری ملازمت تیس برس ہو چکا ہے پرنسپل مجھ سے عداوت رکھتے ہیں۔ بدلہ لینے کی غرض سے ... یہاں بھیج دیا ... میرا کوئی انٹرسٹ اس کورس میں نہیں ہے۔" دوسرے صاحب بولے "میں دائمی ... ہوں۔ مجھ سے علمی سرگرمی یا تعاون کی امید نہ رکھیں۔" تیسرے شریک کار نے اقبال کیا "میں تو ... صاحب ... کورس تو اک بہانہ ہے!"

ایک صاحب نے صاف ... "ہمیں لیکچر سننے کی نہیں سنانے کی ... ہے۔ لیکچر بازی ہوگی تو میں کانوں پر ... ڈال کر بیٹھ جاؤں گا، قطعی دھیان نہیں دوں گا ... بحث و مباحثہ کے ذریعے کلاس ... گی تو میں حصہ لوں گا۔" مگر دوسرے شریک کار مباحثہ کے ... نہیں تھے۔ ایک دو ... قسم کے شریک کاروں نے ... سب کو ... تھا کہ ... سیشن میں کوئی ہرگز ان سے سوال نہ کرے۔ کوئی سوال کرنے کے وقت ... کرے گا تو ... بس جب ... لیکچر ... کیا کرنا ... مقصد صرف ... وقفہ ...

دو تین شریک کار [illegible] کچھ ماہرین کورس نے کلاس میں نہ آنے کی رعایت دے رکھی تھی کیونکہ وہ لیکچر کے دوران سوالات پوچھ کر ان کی بولتی بند کرنے کی کوشش کرتے تھے۔
مقامی شریک کار کورس کو خالہ جی کا گھر سمجھتے تھے۔ حاضری لگا کر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ دو چار صاحبان کو تو بہانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ کلاس سے غائب رہنا [illegible] سمجھتے تھے۔

باقی بچے تھے ہم سات آٹھ تین۔ [illegible] کوئی بہانہ یا تو تھا نہیں یا ہم بہانہ بنانا نہیں جانتے تھے۔ پہلی اولاد اگر نالائق نکل جائے تو والدین دوسری اولاد پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دیتے ہیں [illegible] ہم سے تھے کھوں سے مکمل [illegible] اور فرماں برداری کی امید کرتے تھے۔ ہم نے ان کی امید پر پورا اترنے کا عزم مصمم کر لیا۔ ویسے بھی ہم حلال کی کمائی پر یقین رکھتے ہیں۔ [illegible] کے تئیں باخبر ہیں۔ جس پیشے کی روٹی کھاتے ہیں اس کے تئیں [illegible] ہیں ۔۔۔ پھر طالب علم بن کر اپنا سکھ ہے۔ بچپن، لڑکپن کے دن لوٹا [illegible] لائے جا سکتے مگر زمانہ طالب علمی میں لوٹنے کا موقع مل رہا تھا اور ہم [illegible] موقع کا مکمل فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اس لیے ادبی ذوق کی بھی بھرپور تسکین کی ہم نے۔

[illegible] یوں تھا کہ جسمانی طور پر تو ہم کلاس میں حاضری دے دیتے اور اسی سے اخراج لونغرش تھی مگر [illegible] تصور [illegible] بھرتا رہتا۔ لیکچر میتھڈ میں یہی فائدہ ہے۔ لیکچر دینے والا اپنا کام کرے، سننے والا اپنا۔ [illegible] سوال کرتے یا کلاس [illegible] شریک کار ان کا مشاہدہ کرتے۔ چلیے اپنے مشاہدات اپنے تجربات کا آغاز کریں۔۔۔۔

[illegible] دیکھنے [illegible] لیکچر دیتے دیتے کوئی مسلسل آنکھیں بند رکھتا جیسے سامنے بیٹھے بوڑھوں کو کلاس میں [illegible] کو آواز دے رہا ہو ۔۔۔ کوئی ارسطو، افلاطون پڑھاتے پڑھاتے خود کو قدیم یونانی تہذیب کا حامل اور وارث مان کر ولاسفروں جیسی باتیں کرنے لگتا ۔۔۔ کوئی سوا گھنٹہ [illegible] ایک گھنٹہ کھڑکی کے باہر نظریں گڑائے رکھتا تو کوئی [illegible] شریک کار کو [illegible] کر [illegible] پورا لیکچر ختم کر دیتا۔ [illegible] میں [illegible] گیا بننے والا تو [illegible] سے زیادہ دوسرے اسے توجہ ملنے سے گڑگڑاتے۔ ایک بات ہم نے خاص طور پر نوٹ کی کہ ہر لیکچرر پڑھاتے پڑھاتے اسٹینڈ پر ہاتھ ضرور مارتا تھا۔ جو [illegible] کم جاتا تھا وہ اتنی ہی زیادہ زور سے ہاتھ [illegible] اونگھنے والے سب جاگ جاتے تھے۔ ایک لیکچرر کی عادت تھی جو سوتا ہوا نظر آتا اسی سے سوال پوچھتے حالانکہ خوب جانتے تھے کہ وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کو ستانے میں لطف آتا ہے۔

ایک روز ایک بہاری بالو آتے ہی [illegible] ٹوٹی پھوٹی بگڑتی ہوئی ہندی اور اس سے بھی زیادہ [illegible] انگریزی کی دھجیاں بکھارتے ہوئے بولے "آپ جس بھاشا میں کہو گے اسی ایم ریڈی ٹوٹاک۔ بولیے ہندی بھاشا [illegible] یا انگریزی بھاشا میں"۔

ہم سب نے بیک زبان کہا۔" انگریزی میں"

بولے "بڑی حیرت کی بات ہے۔ آپ لوگ اپنی بھاشا چھوڑ کر بدیسی بھاشا کو پسند کرتے ہیں"۔

ایک صاحب تڑپ کر بولے " وہ ایسا ہے کہ لیکچر سمجھ میں آنے والا تو ہے نہیں۔ الزام انگریزی بھاشا کے سر جائے تو اچھا ہے نا"

یہ تو تھا لیکچر دینے والوں کا حال۔ سننے والوں کا حال اس سے کچھ بہتر حالت میں نہیں ہوتے تھے۔ مشاہدہ ہم عموماً روز ہی کرتے تھے۔ ایک دن کا حال سنیے۔ .... بہت بور کر رہے تھے لیکچرر صاحب۔ سب کی صورت حالت قابلِ رحم تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا ہاتھ پاؤں باندھ کر کرسی سے چپکا دیا گیا ہو کہ اٹھ کر بھاگنا بھی ممکن نہ ہو۔ قابو تھا صرف آنکھوں پر جنھیں گردش دے کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ کچھ تو آرام سے آنکھیں بند کر کے بیٹھے تھے۔ دو لوگ چھت کو تک رہے تھے کہ آخر یہ گر کیوں نہیں جاتی کہ قصہ پاک ہو۔ ایک دو زمین میں نظریں گڑائے بیٹھے تھے، شاید اس توقع پر کہ ایسے واہیات لیکچر کو آخر کب تک برداشت کرے گی؟ یقیناً شرم سے پھٹ جائے گی۔ ایک کھڑکی کے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ ایک دیوار پر آویزاں تصاویر کو گھور رہے تھے۔ ایک صاحب اپنے پن کو ہاتھ میں لیے اس طرح بیٹھے تھے جیسے کچھ نکلنے کے متوقع ہوں۔ ...... شاید ریوالور کے ..... کہ بور کرنے والے کو شوٹ کرنا ممکن ہو جائے۔ ایک انگلیوں سے کاپی پر تال دے رہے تھے جیسے تصور میں اندر لوک کی محفل موسیقی میں شریک ہوں ——— باقی سب سو رہے تھے۔

ہم نے اپنی داہنی طرف بیٹھی محترمہ سے کچھ دریافت کیا۔ ہمیں ہرگز نہیں پتہ تھا کہ آپ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہیں۔ انھوں نے ہڑبڑا کر ——— نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور "مجھے سونے دو" یوں کہا جیسے "مجھے جینے دو" کے اپنے پیدائشی حق کی مانگ کی ہو۔ ہم نے ان کی مانگ پوری کر دی۔ بائیں ہاتھ والی محترمہ کی طرف مڑ کر اپنا سوال دہرایا۔ انھوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کچھ سکنڈ ادھر اُدھر دیکھا پھر ہذیانی انداز میں بولیں ——— "آخر یہ کیا ہے؟ کیا چل رہا ہے یہ؟

ہم انھیں کیا بتاتے کہ کیا چل رہا ہے؟

چائے کے وقفے میں موخرالذکر شریمتی جی نے ہم سے معافی طلب کرتے ہوئے کہا بھئی میں تو سینما روم میں جاتے ہی سو جاتی ہوں۔ جب بھی آنکھ کھلتی ہے سنائی دیتا ہے۔ دی سکنڈ پوائنٹ از .... دی تھرڈ پوائنٹ از ...... پہلا پوائنٹ مجھے آج تک سنائی ہی نہیں دیا۔

ایک روز ہم بھی بور ہو رہے تھے۔ لیکچرر ڈرامائی انداز میں مسلسل گردان کیے جا رہے تھے .... یہ گیان ہے؟ گیان کا اپیوگ ہے یا گیان نہیں ہے؟ یہ کیا ہے ..... ؟ کیا ہے؟ کیا ہے یہ؟

ہم نے ایک پرچی پر لکھا ...... یہ ہیسرڈ ہے؟ بورنگ سیشن ہے؟ یا سزا ہے؟ کیا ہے؟ کیا ہے یہ؟

پرچی ایک ہاتھ سے پھرتی ہوئی سب تک پہنچ گئی۔ سب نے ہمیں اس تک بندی پر بہت داد دی ———

ایسے کئی دل چسپ تجربات ہمیں ریفریشر کورس میں حاصل ہوئے۔ موقع موقع سے سناتے رہیں گے فی الحال تو اس مضمون کا خاتمہ بالخیر کردیں۔

جیسے جیسے کورس کی مدت ختم ہورہی تھی۔ صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا جارہا تھا۔ کلاس سے غائب رہنے کے نت نئے طریقے دریافت کیے جانے لگے۔ حاجت کے بہانے سے نکلنا اور خالی کلاس روم میں جاکر سو جانا عام بات ہوگئی۔ ...... ایک دن بڑا مزا آیا۔ ایک صاحب بُرا سا منہ بنائے کلاس میں آبیٹھے۔ دوسرے نے مزاج پوچھا۔ بولے اچھا بھلا وہاں سویا تھا کہ پانی پلانے والی بائی نے آکر بتایا کہ کلاس شروع ہوگیا ہے ...... " دوسرے صاحب فوراً بولے " دوڑ جا کر بائی سے کہہ دو کہ اب کوئی سوتا ہوا نظر آئے تو جگا کر ہرگز ہرگز یہاں نہ بھیجا۔

بھاگنے والوں نے نئے نئے طریقے نکالے تو انچارج کیوں پیچھے رہتے ؟ کسی مقبول لیکچرر کا اعلان کرتے اور کسی بور کو لیکچر دینے بھیج دیتے۔ پنجرے میں تیل سے چپڑی روٹی دیکھ کر لالچ میں چوہا چلا جاتا ہے اور قید ہو جاتا ہے۔ بس اسی طرح شریک جماعت سوا گھنٹہ کے لیے کلاس روم میں قید ہو جاتے۔

چوہے بلی کا یہ کھیل ایک مہینے تک چلا۔ دونوں فریق برابری پر رہے۔ کیونکہ یونیورسٹی کورس مکمل کرنے میں کامیاب رہی ...... ریفریشر کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے میں۔

ہم سے ریفریشر کورس کے تجربات کا خلاصہ مانگیں تو ہم ایمان داری سے کہہ دیں گے :

کر یا ہے یو۔ جی۔ سی کی   اے۔ ایس۔ سی کا ہے کمال
لے گئے تھے جھولی خالی   لوٹے ہیں مالا ۔ مال

غزلیں

شاہد صدیقی

مئے کوثر ہے جنت میں فقط، دنیا میں کیا کیا تھا
مدک تھی، بھنگ تھی، افیون تھی، بمبو تھا گانجا تھا

ترس کھا کر میں جس شاعر کو اس محفل میں لایا تھا
سُنائے اُس نے اتنے شعر جیسے اس کو ہیضہ تھا

جنابِ شیخ کے چہرے پہ کیوں شملے کا ڈھاٹا تھا
کھلے برقعے میں اُن کے ساتھ کیا اُن کا زنانہ تھا

وہ پھل دُنیا میں اُگ کر ہوگیا گندم کا اک دانہ
وہ پھل جنت میں تھا جب تک تو خربوزے سے تگڑا تھا

غرض ہے حال و ماضی سے نہ مستقبل سے کوّے کو
رہے گا کل بھی کالا آج بھی ہے کل بھی کالا تھا

گیا تھا ملنے اک یم پی سے لیکن دال کیا گلتی
کہ دُم چھلّوں میں اُس کے اک سے بڑھ کر اک لفنگا تھا

میں اتنی دیر تک تیرا کہ تم کرتے ہو گلُ پوشی
مگر یہ تو بتاؤ کس نے دریا میں ڈھکیلا تھا

ہُوا پولیس میں وہ بھرتی، منا‌ؤ خیر اب اپنی
وہ جو پاکٹ پلیری میں جواب اپنا نہ رکھتا تھا

گیئں مایوس ہوکر ہونے والی ساس اے شاہد
نہ سمجھیں میری پیشانی پہ وہ سجدوں کا گٹھا تھا

روشن علی

تھیٹر کو میں جو پہنچا تھا مِس کونسلر کے ساتھ
فادر میرے تھے رکیو میں اُسر کی فدر کے ساتھ

آٹو ہمارے شہر کے بدنام ہو گئے
راضی نہیں چلانے کو آٹو میٹر کے ساتھ

دفتر سے ہم جو لوٹے تو بچّے لپٹ گئے
چھ چڑھ گئے ہیں پیٹھ پہ بارہ کمر کے ساتھ

دینا کبھی نہ بیوی کو طعنہ جہیز کا
ٹپ ٹپ گریں گے آنکھ سے آنسو اثر کے ساتھ

رشوت بھی خوب لیتے ہیں مالِ حرام بھی
لاکھوں جہیز دیتے ہیں وہ کرّو فر کے ساتھ

شوہر کے کیا حقوق ہیں معلوم ہی نہیں
بیگم اُچھل کے آتی ہیں ہم پر جو غر کے ساتھ

لڑکی کی خوبیوں کو کوئی دیکھتا نہیں
شادی تو ہو رہی ہے فقط مال و زر کے ساتھ

اپنی حماقتوں کی سزا پائے گا ضرور
وہ پھنس رہا ہے جال میں اپنے پسر کے ساتھ

اُن کے جو ٹیکس لگ گیا پیٹرول پہ جناب
روشن گزارہ کرتے ہیں سیکل سفر کے ساتھ

سراج نرملی

گدھے جو کھاتے ہیں وہ منجلا نہ دے مجھ کو
پڈنگ[1] چاہیے تو گلگلہ نہ دے مجھ کو

مَیں نرم دل ہوں بہت، آپ روتی صورت ہیں
کہیں یہ آپ کی صورت رُلا نہ دے مجھ کو

پسر ترے مجھے، فٹ بال ٹریٹ[2] کرتے ہیں
بڑا تو اتنی کرٹی، ڈراکلا[3]! نہ دے مجھ کو

ہے آج ٹی وی[4] پہ اک لیٹ نائٹ[5] شو[6] بھی ڈیئر[7]!
تو دے کے نیند کی گولی سُلا نہ دے مجھ کو

نہیں ہے جوائنٹ[8] کلکٹر تو بِل کلکٹر[9] ہے
سراج! ایسا بھی دھوکا کھلا نہ دے مجھ کو

1. PUDINING 2. TREAT 3. DRACULA 4. T.V. 5. LATE NIGHT

6. SHOW 7- DEAR 8. JOINT COLLCTOR 9. BILL COLLECTOR

سید طالب حسین زیدی (حیدرآباد)

دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا

سن ۹۴ء کے اپریل مہینے میں پچیس ۲۵ برس کے طویل عرصے کے بعد ہمارا دلی جانا ہوا تھا، اس ربع صدی کے وقفے میں دلی اپنا چولا کافی بدل چکی تھی جو جو نمایاں اور واضح تبدیلیاں ہم کو اپنے اس دورے میں نظر آئیں انہیں آپ بھی اس طرح دیکھئے جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

سب سے پہلے تو ہمیں عام بول چال اور تحریر کی انقلابی تبدیلی نے متاثر کیا، مثلاً پہلے جہاں، سٹول سکول اور "سپ رنگ"، وغیرہ سننے اور پڑھنے میں آیا کرتا تھا اب وہاں، اِسٹول، اسکول اور اسپرنگ (SPRING) کا چلن نظر آیا۔

اصلی دلی جامع مسجد کے اطراف بسائی گئی تھی اور آج بھی بڑی دھوم دھام سے اُسی مقام پر آباد ہے جس نے اس کو نہیں دیکھا، اُس نے دلی نہیں دیکھی، آکٹوپس (OCTOPUS) کی آٹھ سونڈوں کی طرح اس کی سونڈیں ہیں سے دراز ہو کر اب تیس تیس چالیس چالیس میل تک پھیل چکی ہیں۔

اِس مرتبہ ہم سب سے زیادہ جس بات سے مرعوب ہوئے وہ ہے سارے علاقے پر "شاہی" کا بول بالا، جو شئے نظر آئی وہ "شاہی" نظر آئی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سے جب اگلے وقتوں کے "مُبَتا" کبابیے نے اپنا خوانچہ اٹھا کر دکان بڑھائی تو اب وہاں نیچے "لالو کبابیے" کے شاہی کبابوں نے اپنا ڈیرہ ڈال دیا۔ گویا "لال قلعے کے شاہی دسترخوان پران ہی کبابوں سے بادشاہ اپنا فاسٹ بریک کیا کرتے تھے۔ دوسری جانب، جامع مسجد کے در و دیوار پر حسرت و عسرت کی جھلک نظر آئی اور اندر، حرونِ شاہی" کی "سِکھا شاہی" اس کے گنبدوں کی درازوں میں ۔۔ از قسم پیپل وغیرہ کے پودوں نے اس طرح اپنے سر اُبھار رکھے ہیں جیسے حیدرآباد کی تاریخی کالی کمان کی چھت پر پیپل کا ایک درخت، کبھی نظر آ کر کبھی چھپ کر آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔

مسجد کا سنگ مرمر ہے تو وہ دھندلایا ہوا رنگ و روغن، اکھڑا اکھڑا ایا ہوا۔ جنوبی دروازہ جو ہے، سو وہ ایمرجنسی کے زمانے میں فائرنگ سے چھدا چھدایا ہوا۔ مرمریں طغروں پر بنا ہوا پھول کمھلایا ہوا۔ اور بے چارہ بڑا گنبد، وہ ہے سو گرد سے اَٹا اَٹایا ہوا۔

بے چارہ اپنا گزر بسر اور قوتِ لایموت کی برقراری کے لیے اپنے میناروں سے یا حرمن کر دلی شہر کا نظارہ کروا کر

فی کس پانچ روپے کے حساب سے اُجرت لے کر اپنا پیٹ آپ پال رہی ہے۔ ہم نے پوچھا، اس کے جھاڑ فانوس کیا ہوئے؟ کہا گیا، وہ اب دلی والوں کی عدمِ توجہی کا شکار ہو کر "نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئے"! پوچھا گیا، ایک سیلنگ فین تک نظر نہیں آتا، فرمایا گیا، قدرت نے تازہ تازہ ٹھنڈی ہوا کا انتظام بڑی فراخدلی سے کر رکھا ہے پنکھوں کی ہوا خوری سے اسراف کر کے کیوں گناہ مول لیا جائے؟ سنا گیا، اس کے توسے پرانی روٹی سینکنے والے ایئر کنڈیشنڈ کوٹھیوں میں استراحت فرماتے ہیں اور ایئر کنڈیشنڈ کاروں ہی میں دلی کی گرمیوں کو مار کر "نیسل سپاٹے" کرتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر میکنند

بمقابلۂ جامع مسجد مسجد فتحپوری[*] بیگم کے رنگ و روغن میں رعنائی کی جھلک اور فرش و فروش، دیوار و سقف کی صفائی میں چمک دمک نظر آئی، اپنی سیکڑوں دکانوں (جو اس کے اطراف بنی ہوئی ہیں) والی جاگیر کی بدولت یہ مسجد اپنی بہن جامع مسجد سے زیادہ دولت مند ہے، مگران دونوں کے مقابلہ میں حیدرآباد کی "مکہ مسجد" (جو عمر کے لحاظ سے رشتے میں ان کی بڑی بہن ہوتی ہے) کی آسودہ حالی اور اس کے جہازی جھاڑ و فانوس کی انٹیک (ANTIQUE) خوش جمالی قابلِ رشک ہے ایک دن ہم عصر کے وقت مسجد فتحپوری میں جوتے اتار کر جماعت میں جو کھڑی ہو چکی تھی شامل ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں سامنے سے ایک اکبرالہ آبادی" گلے میں گلوبند لپیٹے ہوئے ہماری سمت آتشزدہ ہوا رہے ہیں اور قریب آ کر نہایت مشفقانہ تنبیہ میں بولے، میاں!! اپنے جوتوں سے ہشیار کئی بزرگ یہاں گھومتے پھرتے ہیں ....." باور آیا اس "معاملۂ خاص" میں ہر مسجد برابر کا درجہ رکھتی ہے، چاہے وہ دلی کی مسجد فتحپوری ہو، لاہور کی بادشاہی مسجد ہو یا پھر حیدرآباد شریف "سرکارِ عالی" کی محبوب چوک (چوک مرغاں) کی مسجد، خضر صورت بزرگ بہ انداز ہائے ہاک (KARK) نمازیوں کی نظریں بچا کر جھپٹا مارنے کی فکر میں منڈلاتے رہتے ہیں۔

ہم نے اپنے قیامِ دہلی کے دوران فجر کی نماز بالالتزام جامع مسجد میں پڑھنے کا معمول بنا لیا تھا، ساڑھے چار بجے صبح پہنچ جاتے اور جماعت کے انتظار میں حوض کے اطراف بنے چھوٹے بڑے سرمئی چبوترے پر بیٹھ کر مسجد کے گنبدوں، اس کے سربلند مناروں اور کلامِ الٰہی کے نظر افروز طغروں کو دل کی آنکھوں سے دیکھتے، درود پڑھتے اور جی میں آتا تو تھوڑا رو بھی لیتے تھے .....

ایسے میں کبھی تصور ہی تصور میں اُن نفوس ہائے قدسیہ کی شکلیں بھی نظر آ جاتیں جو کبھی اسی مقام پر بیٹھ کر کم بخت "نگر سخت جاں" "بازاری زبان" کے نوک پلک درست کرتے اور سولہ سنگھار سے سجا سنوار کر دلی میں بٹھا کر قلعۂ معلیٰ میں پہنچا دیتے جہاں اس کو "کنگس اردو" (اردوئے معلیٰ) کا زر و جواہر سے مرصع تاج پہنا کر "عروس[1] اللسان ہائے عالم" کے خطاب سے نوازا جاتا اور میر، سودا، ذوق، مومن اور غالب اس کی شان میں قصیدے اور سہرے پڑھا کرتے تھے ..... اور یہی وہ فرشتہ خصلت نفوسِ قدسیہ تھیں جو ہمیں بیٹھ کر دنیا کو علم و آگہی کی روشنی اور معرفت کے اسرار و رموز کے نکتہ ہائے حکیمانہ کا درس دیا کرتے تھے ..... اور نہ جانے ایسے میں ہمیں کیا کیا یاد آتا تھا؟

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی!

---

[1] بروزن KINGS ENGLISH [2] یہ خطاب احقر کی اختراع ہے (طالب)

[*] یہ مسجد شاہجہاں کی بیوی "فتحپوری بیگم" کی بنوائی ہوئی ہے۔ [2] یہ خطاب احقر کی اختراع ہے (طالب)

فقیر کی دریا دلی

روزانہ نماز سے فارغ ہو کر جنوبی دروازے کے روبرو مٹیا محل کے نکڑ کے قریب اردو بازار سے لگے ہوئے "سبحان اللہ ہوٹل" کے آگے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر ہم گرم گرم کھیر والی چائے سڑکا کر چسکیاں لیتے ہوئے دلی کے جاگنے کا تماشا کیا کرتے تھے۔

ایک دن دیکھا کہ آٹو رکشہ سے ایک نابینا فقیر ہاتھ میں لکڑی لیے اور کاندھے سے جھولی لٹکائے ہوئے برآمد ہوا، ڈرائیور سے کرایہ پوچھا، اس نے بتلایا چار روپے، فقیر نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ میں تھما کر لکڑی کے سہارے آگے بڑھنے لگا آٹو والے نے آواز دی، شاہ جی یہ اپنا ایک روپیہ تو لیتے جاؤ، اور شاہ جی نے ہاتھ اٹھا کر نہایت تجاہل عارفانہ سے فرمایا، جا! "رہن دے" اور پھر تیز تیز آگے بڑھ کر مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ہاتھ پھیلا کر نمازیوں اور راہگیروں کے آگے صدا لگاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

نمازیو! اللہ تمہاری خیر کرے، "اگلے" کو خوش کر دو اللہ تمہیں خوش کرے گا۔ اگلے کا پیٹ بھرو، اللہ تمہارا پیٹ بھرے گا۔ اگلے کو ایک دو اللہ تمہیں دس دے گا۔ ۔ ۔ ۔ الخ

●

جن دنوں ہم دلی میں تھے وہ بقرعید کی آمد آمد کے دن تھے دلی کے مشٹنڈے بکروں نے اپنی قربانی کی خوشی میں سرشار سارے علاقے پر قبضہ جما کر آدمیوں کو اپنے سینگوں پر ایسا دھر رکھا تھا کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا تھا، مسموع ہوا کہ ہر سال بقرعید کے موقع پر بقیہ ہندوستان کو یکسر نظر انداز کر کے صرف دلی ہی کی سرزمین پر کہ "بائیس" خواجوں" کی چوکھٹ بھی ہے آسمان سے اپنی کھالوں پر قرآنی آیات لکھوا کر نازل ہوا کرتے ہیں، قیمت ایک لاکھ، دو لاکھ اور اگر کوئی بڑا سورہ تحریر ہو تو ڈھائی لاکھ۔ عقیدت و احترام کے جذبوں سے سرشار ان کے خریدار بھی وافر مقدار میں موجود۔　　بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

ہم نے ایک ایسے ہی گدھے کے برابر جثہ والے بکرے کو نہایت غور سے دیکھا، اس کا پہلوان مالک گلا پھاڑ پھاڑ کر بتلا رہا تھا کہ کھال کے علاوہ کانوں پر بھی آیات پاک کا "شان نزول" ہوا ہے جس کا جی چاہے آگے آ کر تلاوت کر لے۔

ہم نے یوں تو بچپن میں ہی مولوی نور محمد صاحب سے تجوید کے ساتھ قرآن پڑھا تھا اس واسطے عربی تحریر کا پڑھ لینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور لکھ لینا دائیں ہاتھ کا۔ مگر توبہ کیجئے کوشش بسیار کے باوجود کہ آنکھیں دکھنے لگیں ان بکروں کی کھال اور کانوں پر مندرج آڑی ترچھی لکیروں والی عربی کا ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکے، بس ہوتا یہ تھا کہ پہلوان معجزے بیان کرتا جاتا اور سادہ لوح اپنے سروں کو ہلا ہلا کر ایمان لاتے جاتے، ایسے ہی ایک بکرے والے نے جس کی قیمت سوا لاکھ تھی بولا، جناب من! آیتوں کے علاوہ اس کا ایک دوسرا کمال یہ ہے کہ یہ بوتلیں پینے کی کرامت بھی دکھاتا ہے، لوگوں نے جب اپنا استعجاب ظاہر کیا تو کہنے لگا، آزما دیکھئے، منگوائیے پانچ بوتلیں۔ ایک صاحب آگے آئے اور پچیس روپے دے کر کوکا کولا کی پانچ بوتلیں منگوائیں، پہلوان نے منجملہ پانچ کے تین تو نہایت اطمینان سے حضار مجلس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے مگدر نما زانو کے نیچے دبالیں اور دو کو کھول کر یکے بعد دیگرے بکرے کے حلق میں انڈیل دیں۔ ۔ ۔ ۔ اور واقعی ہم نے نظر بندی کا دھوکہ کھائے بغیر اپنی بینا آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ندیدہ بکرا فل اسٹاپ

کراچی کے صدر کے علاقے میں ہم "اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل" کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔

صحیح "س" سے ہے، مگر چونکہ زور نہیں پیدا ہوتا اس لیے س پر تین نقطے لگا دیتے ہیں۔

(۰) لگائے بغیر اُن کو غٹاغٹ پی گیا، اب تو جناب! اس زندہ کرامت نے عقیدت مندوں کی آنکھیں ہی نہیں دل و دماغ
دروازے کی طرح کھول دیئے، کھال اور رکانوں کی تحریریں اُن کی جبینِ نیاز جھکانے کے لیے بہت کافی تھیں، اس ایسے شخص
کوکا کولا کی دو دو بوتلوں کا بغیر ڈکار لیے پڑھا جانا اور جگالی کرتے ہوئے پہلوان کو دیکھ کر تمہارا اگر یاد، کہہ رہے ہوا ہو
خوب ست آتا دیگر بار"! .... اس کے خدا رسیدہ ہونے کی رہی سہی کسر پوری کرنے کے بعد بھی باقی بہت کچھ بچ گیا۔

اب تک جو عقیدت مند "بکرے شاہ صاحب" کو اپنے حلقے میں لیے بے ادبی سے آیاتِ قرآنی کی "تلاوت" کرتے انھوں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں کہ "بزرگوں" کی طرف گھور کر دیکھنا سوءِ ادبی ہے اور پاسِ ادب سے ہاتھ باندھ کھڑے ہو گئے۔ ایک صاحب نے ہمت دکھائی اور کمال وضع احتیاط ادب سے "شاہ صاحب" کی طرف پشت کئے بغیر اپنا بریف کیس کھولا اور پچیس ہزار روپیوں کے کرارے نوٹوں کے بنڈل نکال کر پہلوان کے حوالے کئے کہ یہ تو ایڈوانس (ADVANCE) ہے "ہدیئے" کی بقیہ رقم کچھ دیر بعد ادا کر کے "حضرت" کو اپنے گھر لے جاؤں گا ....

عید کے دو چار روز پہلے ہی سے اردو بازار، مینا بازار اور مولانا آزاد کے مقبرے کے اطراف والے میدان پر چلنا پھرنا محال ہو جاتا ہے کھوے سے کھوا چھلتا اور توند سے توند "بیچا بیچ" ٹکراتی ہے، دلی کے پہلوان لوگ جو دا[illegible] میں یہاں گھومتے پھرتے ہیں ایسے موقعوں پر راستہ بنانے کے لیے اپنی توند کو بجا استعمال میں لاتے ہیں۔

تنوک سے بازار میں نکلتے ہوئے : زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا!

متنے کی پھوٹ گئیں :- ایک صبح ہم گھر جانے کے لیے جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے روبرو مٹیا محل والی گلی میں داخل ہوئے، جس میں مشہور زمانہ "کریم ہوٹل" بھی واقع ہے، کچھ آگے بڑھنے کے بعد یاد آیا، اسی گلی میں منشی صدرالدین خان آزردہ صدرالصدور کی حویلی بھی ہوا کرتی تھی، جب آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ اس کی بھی زیارت کر لی جائے کہ آپ کو بھی ہمارے ولی نعمت چچا غالب سے نسبت تھی (قریب کی)" ایک کرفونڈار دکان والے سے جو اپنی اپنی پرچون کی دکان کھول کر جھاڑ پونچھ کر رہا تھا، دریافت کیا، بھائی! حویلی صدرالصدور کہاں ہے؟ جواب میں جو ہتو ان نے سر پیٹ اس کا حال سنیئے! "سیدرو کی حویلی"؟ کیا تمہارے متنے کی پھوٹ گئیں؟ وہ "رُدی" سامنے (وہ رہی سامنے) اپنا سر ہلاتے ہوئے جب ہم "سیدرو" کی حویلی پہنچے تو دیکھا کہ دیوڑھی کے بیچوں بیچ گندے نالے کا پانی ابل ابل کر گلی میں پھیل رہا تھا، پائینچے چڑھا کر اور ناک پر رومال جما کر ہم تیز تیز وہاں سے گزر گئے۔

مٹیا محل کی گلی میں حویلی صدرالصدور سے ذرا آگے جائیے تو داہنے ہاتھ پر ایک گلی بازار چوڑی والاں میں پہنچاتی ہے۔ اور بائیں ہاتھ والی چھتلی قبر ہوتی ہوئی مقبرہ "رضیہ سلطان" پر ختم ہوتی ہے؟ اگر کوئی ان کا نشانہ بنانا چاہیں تو غلیل کے دو شاخے کا ٹھونگ کر لیں مقصد پورا ہو جائے گا۔ چھتلی قبر کے متعلق مشہور ہے کہ یہ کسی "حضرت گھوڑے شاہ صاحب شہید" کا مزار ہے جن کی کھال کا رنگ چتکبرا تھا اور سننے میں آیا کہ اسی مناسبت سے قبر کا تعویذ بھی چتکبرا ہی بنایا گیا ہے، ہمارے لیے یہ کچھ حیرت کا مقام نہیں ہے کہ ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد "سرکارِ عالی" میں بھی آپ کے کاونٹر پارٹ "گھوڑے شاہ صاحب" کی قبر شاہ عنایت گنج مشکل ہاؤس میں مرجع خلائق موجود ہے ....

کاشی کی گلیوں کو لوگوں نے ناحق ہوّا بنا رکھا ہے، ٹھیٹھ مذکر کا ٹھیٹھ گلیاں تو دلی کی گلیاں ہیں کہ انہی کے فراق کے ڈر سے استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق نے حیدرآباد جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا.... گلی در گلی ہوتی ہوئی

ٹیکسی آپ کو دلی کے سات دروازوں° میں سے کسی ایک دروازے پر لا کھڑا کر دے گی ۔ مگر وہاں پہنچنے تک دھکے کھانے پھکے کھانے کے باعث آپ کا حال کافی پتلا ہو چکا ہو گا۔

صاحبقران شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ غازی نے اپنے "چیف آرکیٹیکٹ" معمار آصف کی خدمات حاصل کر کے انہی سے تاج محل آگرے میں، دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد جیسی عدیم النظیر عمارتیں تعمیر کروائیں مگر بیچارے معمار آصف میں آنے والے سو دو سو برس کو پیش نظر رکھ کر سڑکوں کا پلان بنانے کا سلیقہ کما حقہ نہیں تھا اور جامع مسجد کو مرکزی نقطہ قرار دے کر اس کے اطراف گلیوں پر گلیاں تعمیر کرتا چلا گیا جس کا خمیازہ دو سو برس بعد آج، آپ اور ہم کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر صاحبقران نے ہم سے مشورہ فرمایا ہوتا تو یہ بندۂ درگاہ اسپین اور فرانس کے ایسے "نقشہ" نویسوں° کو دیوان خاص میں تخت طاؤس کے آگے لا کھڑا کر دیتا جنھوں نے چنڈی گڑھ اور اسلام آباد جیسے رانوی شہروں کا نقشہ بنایا ہے جن کی سڑکیں ہوائی اڈے کے رن وے (RUN WAY) کی مانند اس قدر چکنی اور چوڑی، عمارتوں اور بازاروں کے درمیان، ناک کی سیدھ میں چلی جاتی ہیں کہ اگر کبھی ہمارے انڈین ایر لائینس کے کسی بوئینگ طیارے کو شہر کی سیر کی جی میں سمائی تو بڑے آرام سے اپنے پنکھ پھیلائے بازار کے بیچوں بیچ سڑک پر بجائے کریش (CRASH) ہونے کے نہایت اطمینان اور سہولت سے لینڈ ہو کر خراماں خراماں شہر کی سیر جی بھر کے کر لیا کرتے اور ہم "موج خرام یار کی دلفریبیوں میں گم ہو کر گلوں کی کتریں چننے لگتے"۔۔۔

مگر وہ جو کہتے ہیں "خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا" اور صد حیف! کہ شاہجہاں کو ہم "ناخن" کا زمانہ نصیب نہ ہوا ورنہ دلی شہر کی گلیاں آکٹوپس کی سونڈوں کی بجائے کچھ اور چیز ہوتیں ۔ ۔ ۔

میر صاحب کی غلط بیانی!

دلی آنے والوں کو آج کل جو بات سب سے زیادہ کھلتی اور نقطۂ اشتعال پر لانے والی ہوتی ہے وہ ہے "بیشتر"° دلی والوں کا کھردراپن۔ چال کھردری، ڈھال کھردری، صوت وصورت کھردری اکثر صورتوں کو تو دیکھ کر تو ایسا لگا کہ وصوف اُس آتش زیر پا بین الاقوامی نچنیے مائیکل جیکسن کی طرح ابھی ابھی اپنے چہرے کی بھی پلاسٹک سرجری" کروا کر آئے ہیں۔ ہم گن کر جامع مسجد کی تیس سیڑھیوں سے اُترے اور میر صاحب کے دعوے کی تصدیق کے لیے ادھر کوچۂ اسپ سواراں سے لے کر کوچۂ چیلاں، کوچۂ پنڈت، کوچۂ قاسم جان اور ادھر کٹرہ نواب مرزا داغ سے کٹرہ آسمجاہ تک ہر کوچہ و بازار کا چپہ چپہ چھان مارا مگر ہم کو جو شکل بھی نظر آئی وہ بے ہنگم (یا بدرخت گھر دری) اور کارٹون نما ہی نظر آئی ان مذکورہ "چغتائی آرٹ" والی نمکین، ملیح اور صبیح شکلوں کا دور دور تک پتہ نہ چلا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے میر صاحب کے ساتھ ہی وہ بھی لکھنؤ ہجرت کر گئی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

° ۱. دلی دروازہ ۲. ترکمان دروازہ ۳. اجمیری دروازہ ۴. لاہوری دروازہ ۵. موری دروازہ ۶. کشمیری دروازہ ۷. نئی دروازہ

° ۱. اسپین LE CARBUSIER (چنڈی گڑھ) فرانس RICHARD NURPHA اسلام آباد۔

° ہم نے بطور حفظ ماتقدم "بیشتر" لکھا ہے کیوں کہ چند ملیح اور صبیح صورتوں والے لوگ بھی ہوں گے لہٰذا ایسے کرم فرما اپنے آپ کو اس زمرہ سے خارج سمجھیں اور ہم سے خوش گمانیوں کی نہ سوچیں۔

جامع مسجد کے شمالی دروازے کے روبرو "دریبہ بازار" ہے جو سونے چاندی کے زیورات اور ہاتھی دانت کی مصنوعات کا مخزن ہے اس سونڈ کا دوسرا سرا چاندنی چوک سے جا ملتا ہے یہ وہی "دریبہ" ہے جس کا ذکر کسی مولوی کے چھیڑنے کے باعث غالب نے نہایت چلبلے انداز میں اپنے ایک خط میں کرکے دل کا بخار نکالا ہے۔ خاصے کی چیز ہے۔

"دریبے کے نبیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل . . .○. . . میں "غوطے" مارنا اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے"۔

دریبے کی سونڈ سے خارج ہو کر سامنے نگاہ ڈالیے "شمرو کی بیگم کی حویلی" نظر آئے گی جو کبھی کمپنی باغ کا ٹاؤن ہال کہلاتی تھی اور جس کے آگے "ملکا لوریا"● کا سنگی مجسمہ کسی نیپڑ (گاؤں) کی چودھرائن کی مانند ایک سنگی چبوترے پر جما ہوا تھا اور اب کہیں آثار قدیمہ کے مال گودام کے کسی تاریک گوشے میں پڑا اپنی قسمت کو رو رہا ہوگا۔ اسی چاندنی چوک کے بیچوں بیچ کبھی گھنٹہ گھر کی خوبصورت، دیدہ زیب مخروطی عمارت مع اپنی چار گھڑیوں کے سر اٹھائے ہوئے کھڑی تھی جو سن پچاس کے ابتدائی برسوں میں خدا جانے اس کے جی میں کیا سمائی کہ بغیر کسی زلزلہ اور طوفان یا دو یاراں کے قبل از قبل نوٹس دیے بغیر آپ ہی آپ ڈھے پڑی، اُس مقام پر اب ایک چوگوشہ پتلی زنجیری حصار اس کی یاد باقی رکھنے کے لیے بنا دیا گیا ہے۔

چاندنی چوک میں ہم نے دیکھا، غلط سنگھوں پر پارک کی ہوئی دو پہیہ، تین پہیہ اور چو پہیہ واہنوں کو ٹریفک پولیس کے کارندے کرینوں سے اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے، اس قسم کے معاملوں میں "کوتوال صاحب" سے زیادہ ان کارندوں کی مستعدی دیکھنے لائق ہوتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بین الاقوامی شہرت یافتہ کرن بیدی دہلی کی ٹریفک کمشنر تھیں اور دلی والوں کو آداب راہ روی کے اسرار و رموز سکھانے کے لیے درس کا یہ طریقہ اختیار کر کے دلی والوں کی زبانوں پر کرین بیدی کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ چند ہی دن ہوئے تھے کہ آپ نے دلی کے وکیلوں کی اچھی خاصی مزاج پرسی کی تھی۔ جس کا چرچا سارے ملک میں "ٹاک آف ٹیبل" (TABLE TALK) بنا ہوا تھا۔ ان کے ایسے "ٹھیٹھ مذکر کاٹھ" کے کارناموں کو سن سن کر اور اخباروں میں پڑھ پڑھ کر ہم گمان کرتے تھے کہ "سماۃ کرن بیدی" کوئی "حمیدہ پہلوان" قسم کی چیز ہوں گی اور چھوٹتے ہی ایس یو سی کی فلم "بابل" میں "منشی شکارپوری کی بیٹی" "ٹن ٹن پہلوان" کی طرح کسی "دلیپ کمار" کو اپنے بازو کی تنی ہوئی مچھلیاں دکھا کر چیلنج کریں گی "پنجہ لڑائے گا"؟ اور دلیپ کمار بے چارہ سہم کر اپنے منہ کو انگریزی حرف "O" کی شکل میں کھول کر صرف "آں" کر کے رہ جائے گا۔ مگر تجربے نے ہماری اس بدگمانی کو جلد ہی رفع کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن ہم مخدومی و محبی سید امین الحسن صاحب رضوی⊙ ایڈووکیٹ سے ملنے کے واسطے پٹ پڑ گنج جانے کے لیے دریا گنج کی بڑی کوتوالی

○ نقطوں والی جگہ میں رنگ بھرنے کے لیے خط بنام نواب مرزا علاء الدین احمد خاں پڑھیے۔ اللہ قسم، اگر مزہ نہ آئے تو چوگنا چور کی سزا دہ ہماری ● دلی کے کرخنداروں کی زبان میں ملکہ وکٹوریہ کی مجنی۔

⊙ سابق ایڈیٹر ریڈینس اور اب مسلم پرسنل لا بورڈ کے فعال ممبر اور مشیر قانونی اور مولانا علی میاں مدظلہ عالی کے رفیق کار

کے گیٹ سے قریب بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑے تھے، ایک کار گیٹ کے پاس آکر رکی ہم بلا ارادہ یہ دیکھے بغیر کہ اس میں کون سوار ہے لطف سے خوش گزرے ڈال کر پھر بس کے راستے پر نگاہیں گھما ہی رہے تھے کہ ہمارے قریب کھڑے بس کا انتظار کرنے والے ایک صاحب نے مخاطب کرکے کہا، دیکھا! بابو صاحب وہ آگئی، پلٹ کر ہم نے پوچھا، کون آگئی، کہاں سے آگئی بولے اجی وہی "مرد مار ستی" کرن بیدی اور کون؟..... یہ نام سن کر ہم اپنی قیاسی حمیدہ پہلوان" کو دیکھنے کے لیے مڑے مگر وہاں دیکھا کیا؟

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ؛ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا!

اللہ اللہ..... سبحان تیری قدرت، اس سرو قامت کی دید سے اِدھر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اُدھر گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے اٹنشن ہوکر سلیوٹ بجالایا، مگر ہم یہ بھی دیکھ رہے تھے جس مقام پر وہ کھڑا ہوا تھا زمین کا اتنا خطہ شاید زلزلے سے دہل رہا تھا۔ کیوں؟ تب ہی تو اُس کے بوٹوں کی ایڑی سے ایڑی اور اس سے سوا فٹ اوپر گھٹنے سے گھٹنا کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ بجنے لگے تھے اُس بے چارے کے پورے بدن پر رعشہ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور سلیوٹ کو اٹھا ہوا ہاتھ کبھی پیشانی سے ناک پر تو کبھی ناک سے پیشانی پر "شمالاً جنوباً" زین زٹ۔ زین زٹ" کرتا ہوا مسلسل نیچے اوپر ہو رہا تھا..... اور یہ "زین زٹ۔ زین زٹ" اُس وقت تک ہوتی رہی جب تک کہ وہ فتنۂ محشر کوتوالی کے گیٹ کے اندر داخل نہ ہوگیا....

افسوس کا مقام ہے کہ حکومت اور ارباب حکومت ایسے ایماندار، فرض شناس، جرأتمند اور بے خوف کام کرنے والوں کی سونے میں تولی جانے والی خدمات کا یہ صلہ دیتے ہیں کہ کرن بیدی کی بیٹی کو میرٹ لانے کے باوجود میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملتا اور دنیا کے آگے اپنی کوتاہ ظرفی کا عملی ثبوت دینے کے لیے کرن بیدی کو امریکہ کے پریسیڈنٹ بل کلنٹن کی جانب سے دی گئی دعوت کے درمیان روڑے اٹکا کر اپنے اوچھے پن کو آشکار کیا گیا۔ ہم نے تو اس کی خدمات کے صلے میں کچھ نہ دیا مگر ہمارے پڑوسی ملک برما کے حق پسندوں نے "میگسیسے" ایوارڈ دے کر اس کی بلند قامتی کو تسلیم کیا۔ اور ہمیں یاد آیا کہ "حنا" پسنے کے بعد ایک نہ ایک دن رنگ ضرور لاتی ہے۔

ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کی تیوریوں کے بل کو دیکھتے ہوئے کہ بے چارے سید صاحب اپنے ہاتھ میں ایڈیٹنگ کی قینچی پکڑے پکڑے تھک کر اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں" کا ہو بہو مرقع بنے ہوئے بیٹھے ہیں اور خدا کا واسطہ دے کر مسودا سمیٹنے ہی والے ہیں کہ.......

اس واسطے آج اتنا ہی کافی ہے۔ آگرہ کے احوال، غالب کی خوشحالی دیکھی، خسرو کی زبوں حالی دیکھی۔
زیر زمیں اک جنت دیکھی اس جنت میں وحشت دیکھی۔ کہ آئندہ پر انتظار کھیئے۔ یار زندہ صحبت باقی.....
کہانی جاری ہے۔

□□

قلمی معاونین سے خواہش کیجاتی ہے کہ مسودات صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔
اور آخر میں اپنا پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں۔

فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

چھاپہ مار

ہم مجتبیٰ حسین صاحب کی طرح دل میں یہ تمنا نہیں رکھتے کہ کوئی ہمارے گھر پہ چھاپہ مارے بلکہ خود چھاپہ مارتے ہیں لوگوں کے پاس تارے گنتے گنتے ہمیں محسوس ہوا کہ چاند چوری ہو گیا ہے۔

کسی نے چھپایا ہوگا؟ یہ سوچتے سوچتے ہم بالآخر چاند کی کھوج میں چھاپہ مارنے نکل پڑے۔ ہم پہلا چھاپہ جس گھر پہ مارا وہ تھا پڑوسی کا گھر ——— جس کے پاس موجود سونے کے زیور، چاندی کے برتن قیمتی ملبوسات کے علاوہ بھاری رقم بھی ہماری نظر سے گزری لیکن چاند نہیں تھا، ہم واپس ہو گئے، سو شاید اس شوخ و چنچل دوست نے چھپا رکھا ہے چاند کو۔ جس کا نام . . . . . خیر! ہم جا دھمکے اس کے گھر اندھیرے کی پرواہ کیے بغیر اس کے اونچے گیٹ سے ابنِ صفی کے کسی جاسوسی کردار کی طرح کمپاونڈ کے اندر کود پڑے۔ اوب نواز دوست کے پالتو کتے نے ہمیں دیکھا قریب آکر ہماری قدم بوسی کی اور وہیں ایک گوشے میں جا بیٹھا یہ پالتو کتا ہمیں پہچانتا تھا اسی لیے اُس نے ہماری عزت افزائی کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی اور ہم شانِ بے نیازی سے ڈرائنگ ہال سے گزرتے ہوئے ڈائننگ ہال میں آپہنچے۔ یہاں بھی اندھیرا تھا۔ ہم نے لائٹ آن کی تو دیکھا میز پر انواع و اقسام کے کھانے اور پھل جالی سے ڈھکے رکھے ہیں، ہم شروع ہو گئے چھاپہ مار جو ٹھہرے . . . . . . شکم سیر ہونے کے بعد چاند کی دوبارہ تلاش کی ہماری دوست کی خواب گاہ اندر سے بند تھی۔ ہم دستک نامناسب سمجھ کر وہاں سے لوٹ گئے، اُمیدوں کا سہرا بہر حال ہمارے ہاتھ میں تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی شاعرہ کے گھر چھاپہ مارنے پر ہم کامیاب ہو ہی جائیں گے۔

ہم پہنچے شاعرہ کے گھر، اس دروازے کی اونچائی ہمارے قد سے بھی زیادہ تھی دیواروں کی بلندی چھلانگ لگانے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ہم نے گیٹ کے بازو والے چھوٹے سے دروازے پر ایک گھونسہ رسید کیا مگر دروازہ کھلا ہوا تھا، شاید ہمارے ہی انتظار میں . . . . . . چوکیدار نے ہمیں فوجی انداز میں سلام کیا

وقت ہمیں دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

ہم نے اسے دھمکاتے ہوئے خطرناک لہجے میں بتایا کہ اس وقت ہم چھاپہ مارنے آئے ہیں۔ خبردار! ابھی حرکت کی ——

چوکیدار لرزنے لگا اور خوف کے مارے اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ ہم اُسے، اسی حال چھوڑ کر دوسرے دروازے سے اندر جا گھسے۔ آہنی جالی کے دروازے پر اندر سے تالا لگا ہوا تھا اور شاعرہ والدہ کے ساتھ شاید اپنی خواب گاہ میں سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے کتے کوں کوں کر کے ہماری طرف اور ہماری جوتیوں کو پھولوں کی طرح سونگھ کر چلے گئے۔ ہم نے جالی کے اندر ہاتھ ڈال کر تالا اپنی نذر کیا کہ زلزلے کا جھٹکا سمجھ کر شاعرہ اور ان کی والدہ گھبرا کر خواب گاہ سے نکلیں اور ہال میں آگئیں۔ شاعرہ نائٹی کی جیب سے کنجی نکال کر تالا کھولا اور چاہتی تھیں کہ باہر کی طرف دوڑ پڑیں۔ ہم نے دونوں کو بے مروتی سے پکڑ لیا اور کہا، خبردار! جو یہاں سے ہلنے کی کوشش کی۔ ہم چھاپہ مارنے آئے ہیں، کھسیانی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تھی مگر ہمارے تیور دیکھ کر دونوں کی گھگھی بندھ گئی اور ہم اندر گھس پڑے۔

خواب گاہ اسٹور روم کی طرح منتشر تھی بے شمار کاغذات، خوابوں کی طرح بکھرے ہوئے رنگے کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ خواب گاہ میں بہت روشنی تھی جیسے چودھویں شب کا چاند اسی خواب گاہ میں خواب ہو، ہم نے تمام بڑی بڑی الماریاں کھول ڈالیں، کئی کتابیں، کئی فائلیں، کئی البم ۔ ۔ ۔ ۔ دو جلد فائلوں کے فیتوں کو بے دردی سے کھینچ کر کھولا اور ورق گردانی کرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واقعی ہم کامیاب چھاپہ مار تھے، ہم نے دیکھا، ورق ورق ہماری شاعری لکھی ہوئی تھی، ہر صفحہ ہماری تحریر دل سے بھرا ہوا تھا.... چھاپہ مار اسکیم نے وہ راز فاش کیا تھا جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا۔ ہماری اپنی غزلیں، نظمیں، ہیرے فیروزاں کی طرح ہماری آنکھوں کے آگے جھلملا رہی تھیں اور ہمارے نام کی جگہ ان صاحبہ کا نام لکھا تھا جن کے گھر میں اس وقت ہم چھاپہ مارنے میں مصروف تھے ہم نے اپنی تحریروں کا پلندہ اٹھایا اور انھیں الوداع کہے بغیر وہاں سے چلے آئے۔ چاند کی تلاش میں ہم اپنا ادبی گمشدہ سرمایہ کھوج لائے تھے۔ ہیں نا ہم کامیاب چھاپہ مار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

ڈاکٹر اختر بستوی
صدر شعبۂ اُردو۔ گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور (یوپی)

جلیبی اور شادی

بھابیاں یوں بھی نوجوان اور غیر شادی شدہ دیوروں کے لیے آفت ہی ہوتی ہیں لیکن اگر کہیں کسی کنوارے کو ایسی منچلی اور ستم ظریف بھابی مل گئی جیسی کہ میں نے پائی ہے تو پھر تو اس کی وہ گت بنے گی کہ سارے ہونے والے شوہروں کے لیے درسِ عبرت ثابت ہو۔ میری بھابی کیا ہیں، مذاق، چھیڑ چھاڑ اور قہقہوں کا فوارہ ہیں اور ان کا مزاحیہ جوڑ توڑ تو اتنا تیکھا ہوتا ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ وہ جس کے سر ہو جائیں اُسے بھاگنے زمین نہ ملے۔ اگر کوئی ان کے جال میں ایک بار پھنس جائے تو اس کا اس میں سے نکلنا اتنا ہی دشوا دشوار ہو جتنا کہ گیلے گڑ میں پھنسے ہوئے چیونٹے کا نکل پانا۔

وہ اپنے شکار کے اردگرد من گھڑت واقعات کا ایسا تانا بانا بنتی ہیں کہ ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی گاؤدی بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میری مثال موجود ہے مجھے یہ غرّہ تھا کہ بہت بڑا شاطر ہوں اور مجھ کو زیر کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ زندہ مینڈک کو ترازو میں تول لینا مگر صاحب انھوں نے مجھے ایسا پچھاڑا کہ طبیعت ہری ہوگئی۔ یہ انھیں کا دم خم تھا کہ مجھ جیسے اڑیل گھوڑے کو گھاس کھلا دی۔

جب میں نے تعلیم ختم کر کے پہلی نوکری کی، تو خاندان کی بڑی بوڑھیوں میں کھسر پھسر شروع ہوگئی اور اشاروں ہی اشاروں میں امی سے میری شادی کی باتیں کہی جانے لگیں۔ میری اور بھابی کی ہمیشہ چلا کرتی اور ہر وقت دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ یہ موضوع انھیں اچھا ہاتھ آیا۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، آتے جاتے میرا ناک میں دم ہوگیا۔ وہ جب یہ موضوع اٹھاتیں تو بھائی جان اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے قانون کی اس موٹی سی کتاب سے اپنا چہرہ ڈھانک لیتے جو ہمہ وقت ان کے زیرِ مطالعہ اس طرح رہتی تھی جیسے پرانی نسل کے بنئے ہر وقت اپنی بہی پہ نظریں جمائے رہتے ہیں، امی دوپٹے کا آنچل نیچے سرکا کر سوپ میں چاول اور زور زور سے پھٹکنے لگتیں اور میں اکثر اپنا ریکٹ یا کوٹ سنبھالتے ہوئے باہر

مجبور ہو جاتا مگر اس طرح کب تک کام چلتا۔ آخر میں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔
ایک دن اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ بھابی قدرے جھلا کر بولیں "اے تو کیا اب تمھارے لیے حور اتر کے آئے گی جنت سے!"
"نہیں بھابی مجھے تو بس اپنی ہی جیسی کوئی دلھن ڈھونڈ کے لا دو" میں نے اپنی دانست میں گویا انھیں لاجواب کر دینے والا وار کیا لیکن خدا بچائے ان کی بے باکی سے۔ ان کا جواب سن کر خود مجھے ہی جھینپنا پڑا۔ بولیں "تو اب بھلا میری ہی طرح کی کوئی دوسری لڑکی کہاں ملے گی۔ ہاں اگر تم اپنے بھائی جان کو راضی کر لو تو میں تیار ہو جاؤں"
اصولاً میں شادی کو وبال جان سمجھتا ہوں۔ بظاہر تو یہ بہت ہی لذیذ چیز معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً وبال ہے۔ چنانچہ اکثر اس پہلو سے بھی بھابی سے بحث ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے کہا "بھابی شادی بھی جلیبی کی طرح ہوتی ہے، میٹھی لیکن پر پیچ!" وہ بولیں "گھبراؤ نہیں، یہ جلیبی ایک نہ ایک دن تمھیں بھی کھانی پڑے گی" نہ جانے کس منحوس گھڑی میں بھابی کی زبان سے یہ بات نکلی تھی کہ اس طرح صحیح ثابت ہو گئی جیسے مزاح نگار کا کوئی جملہ حقیقت بن کر سامنے آجائے۔
ہوا یوں کہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک قریبی عزیز کے یہاں شادی آپڑی اور چونکہ اس میں گھر کے تمام افراد کا جانا ضروری تھا اس لیے مجھے بھی جانا پڑا۔ ویسے تو اس گھر میں کوئی بھی مجھ سے پردہ نہیں کرتا تھا لیکن چونکہ شادی کا موقع تھا اور نہ جانے کہاں کہاں سے عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ اس لیے ضابطے کے تحت میرا اندر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہ اور بات تھی کہ میں جب چاہتا زبردستی اندر گھستا چلا جاتا۔ کوئی برا بھی نہیں مانتا تھا۔ برا ماننے کا سوال ہی کیا تھا، وہاں کسی کو اتنا ہوش ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون آیا اور کون گیا۔ ہمارے گھرانوں کی شادیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ گھر کیا ہوتا ہے اچھا خاصا نمونۂ حشر ہو جاتا ہے۔ بچوں کو گویا ایک دن کی بادشاہت مل جاتی ہے۔ کہیں کسی کونے میں چھپے بیٹھے "شادی شادی" کھیل رہے ہیں، کہیں چھت پر ٹنگے ہوئے کپڑے کے موروثی پنکھے کو اتارنے کی اجتماعی کوششیں کر رہے ہیں۔ کوئی کسی کے گھڑے میں سمدھن کی جوتی ڈال آیا تو کوئی کسی کے سنگاردان سے کاجل کی ڈبیا نکال کر کسی کے پاس رکھی ہوئی ریشمی شلوار پر نقش و نگار بنا آیا۔ بھاگ دوڑ، چھینا جھپٹی، مار دھاڑ، چیخ پکار، شور شرابہ یہی سب کچھ بچے اپنے اپنے گھر میں علٰحدہ علٰحدہ کریں تو مائیں طمانچوں سے ان کے منہ لال کر دیں۔ لیکن یہاں سب روا ہوتا ہے۔ بڑی بوڑھیوں کو بھی بچوں سے کم سروکار نہیں ملتا، پان کے پیک دان اگل اگل کر اور بیٹھے جھل جھل کر کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ لڑکیوں کی بہتات اور ان کے لیے اچھے رشتوں کی کمیابی کا رونا رویا جاتا ہے۔ کسی کی جوان لڑکی بغیر نقاب کے اسکول جاتی ہے وہ ان کا موضوع، کسی کی بہو ایسا بلاؤز پہنتی ہے جس سے پیٹ دکھائی دیتا ہے وہ ان کا موضوع، کسی کی بیٹی بیس سال کی ہو گئی اور اب تک بن بیاہی بیٹھی ہوئی ہے وہ ان کا موضوع، کسی کی بہن اس کے دوست کے ساتھ بھاگ گئی وہ ان کا موضوع۔ اس کے علاوہ ہزاروں بار کے دہرائے ہوئے گھسے پٹے قصے بڑے لطف کے ساتھ بیان

بھی ابھری۔

"ارے ارے یہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ باہر ہی سے کسی لڑکی نے احتجاج کیا مگر وہ ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ دروازہ بدستور بند رہا۔

ہائے اللہ دروازہ کھولو زینت! ارے نکہت! بلقیس! شبانہ! اللہ میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ یہ کیا مذاق ہے؟" اندر والی لڑکی گھبرا گھبرا کر اپنی سہیلیوں کو آواز دے رہی تھی۔ اس کی حالت اس وقت کچھ ایسی ہی تھی جیسے کسی لفٹ کے اچانک چلتے چلتے بجلی کے فیل ہو جانے کی وجہ سے رک جانے سے اس میں کھڑا ہوا کوئی شخص سخت گھبراہٹ کے عالم میں ہو۔

پھر دور سے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ باہر سے آنے والی ہنسی کی آواز اچانک بند ہو گئی۔ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور ساتھ ہی بجلی بھی جل گئی۔ بھابی بہت تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں اور ایک طرف جھک کر کچھ نکالنے لگی تھی۔ میں انھیں دیکھ کر بوکھلاہٹ میں جو پیچھے ہٹا تو اس بڑی لگن میں الٹ گیا جس میں شیر مال کے لیے خمیر اٹھانے کی غرض سے آٹا گوندھ کر رکھا ہوا تھا۔

پھر کیا تھا۔ بھابی کا قہقہہ ابل پڑا "ارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاہا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیا ۔ ۔ ۔ ہاہا ۔ ۔ ۔ ۔ تم یہاں ہاہا ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن یک بیک ان کے قہقہے کو جیسے بریک سا لگ گیا۔ ان کی نظریں چاول کے ایک بورے کی پشت سے جھانکتے ہوئے ہرے دوپٹے پر جمی ہوئی تھیں اور پھر بھابی نے اس حسین و معصوم مجرم کو بورے کے پیچھے سے اس کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے یوں نکالا جیسے کوئی کھلنڈرا بچہ مچھلیاں پالنے والے پانی سے بھرے شیشے کے بکس میں سے کسی ننھی سی رنگین مچھلی کو دھیرے سے پکڑ کر نکال لے۔ انھوں نے گھور کر مجھے دیکھا، پھر ایک معنی خیز مسکراہٹ، اُن کے ہونٹوں پر ناچنے لگی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف پلٹیں۔ کواڑ بند ہو گئے اور ساتھ ہی میں نے تالے میں کنجی گھومنے کی بھی آواز سنی اب ہم دونوں کوٹھری میں اکیلے رہ گئے۔ بجلی جل رہی تھی، لیکن ہم میں سے کسی میں ہمت نظر اٹھا کر اوپر دیکھنے کی نہیں ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ پھر کھلا۔ اس بار بھابی کے ساتھ دو عورتیں اور بھی تھیں، ایک بوڑھی اور دوسری ادھیڑ عمر کی، جن کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ رشو کی امی اور باجی تھیں۔ رشو بے چاری کا چہرہ انھیں دیکھ کر اس طرح فق ہو گیا جیسے امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑ لیے جانے والے طالب علم کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ وہ دونوں عورتیں چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑی ہم دونوں کو گھورتی رہیں۔ پھر رشو کی امی تیزی سے آگے بڑھیں لیکن بھابی ان کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر انھیں باہر کی طرف گھسیٹ لے گئیں۔ اس بار دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس لیے میں چپکے سے باہر کھسک آیا۔

شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے اور سب کے ساتھ میں بھی گھر لوٹ آیا مگر میں امی اور بھابی سے نظریں ملاتے ہوئے شرماتا تھا۔ اس لیے روز صبح ہی گھر سے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ ایک دن حسب معمول دس بجے کے قریب ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا اور دبے قدم اپنے کمرے کی سمت بڑھنے لگا۔ جب میں امی کے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ امی سے کہہ رہی تھیں "مگر

امّی جان آخر اس لڑکی میں خرابی ہی کیا ہے! ماشاءاللہ صورت شکل کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ گھرانا بھی اچھا ہے ...... نہیں نہیں تو ضرور کل پیغام لے کر جاؤں گی۔"

امّی بولیں "مگر دلھن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر ارشد کا دماغ یک بیک کیسے خراب ہو گیا تھا کہ وہ اتنی غیر شریفانہ حرکت کر بیٹھا؟" جواب میں بھابی کا ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا، اور پھر وہ دیر تک امّی کو چپکے چپکے کچھ سمجھاتی رہیں۔ آخر میں امّی نے ایک اطمینان کی سانس کھینچی "اچھا تو یہ بات تھی! مگر دلھن تمھیں اس اتفاق سے فائدہ اٹھا کر یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ان کے یہاں یوں بھی تو پیغام بھجوایا جاسکتا تھا۔ اس طرح تو رشو سے اس کی امّی بے حد خفا ہو گئی ہوں گی۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے امّی جان مگر مجھے ارشد کو بھی تو سر کرنا تھا۔ وہ کسی طرح شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا لیکن اب ایسا بُرا پھنسا ہے کہ چوں بھی نہیں کرے گا۔" رہا رشو کی امی کے خفا ہونے کا سوال تو میں اتنی بے وقوف تھوڑی ہوں۔ ادھر بھی سب کچھ ٹھیک کر چکی ہوں۔ اچھا تو کل میں پیغام لے کر جا رہی ہوں ...؟"

"جاؤ! لیکن اس کا خیال رکھنا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے ان دونوں خاندانوں میں سے کسی کی بھی عزت پر حرف آئے۔ ایسا نہ ہو کہ ناک ناک کھیلتے ہوئے ناک ہی کٹ جائے۔"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں امّی جان! میں کوئی بچی تھوڑی ہوں۔" پھر بھابی کے اٹھنے کی آہٹ سن کر میں جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔

اس گفتگو کو دو ہفتے ہو چکے ہیں اور اب جب کہ میری شادی رشو سے طے ہو چکی ہے میں سوچ رہا ہوں کہ اب تک میں شادی ہی کو جلیبی سے تشبیہ دیا کرتا تھا مگر کیا بھابی کسی جلیبی سے کم ہیں؟ وہ بھی ...... بالکل جلیبی ہی کی طرح میٹھی اور پیچ در پیچ ہیں۔ ابھی ابھی وہ جلیبیوں سے بھری ہوئی طشتری لے کر آئی تھیں، جسے میز پر رکھ کر یہ کہتی ہوئی قہقہے بکھیرتی واپس گئی ہیں کہ "ارشد میاں لو یہ جلیبیاں کھاؤ اور بہت جلد "وہ" جلیبی کھانے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ!" اور میں دل ہی دل میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ کاش کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ طشتری کی جلیبیاں کھانے تک ہی بات رہ جائے اور جس جلیبی کی طرف بھابی نے خصوصیت کے ساتھ اشارہ کیا ہے اسے حلق سے نیچے اتارنے سے جان بچ جائے لیکن اب یہ ہو پانا مجھے اتنا ہی ناممکن نظر آ رہا ہے جتنا کہ ٹیوب میں سے نکلے ہوئے ٹوتھ پیسٹ کا پھر سے اس میں واپس جا پانا۔

●●

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

صورت شناسا

آم کی طرح عوام بھی کئی اقسام کے ہوتے ہیں ان کی ایک قسم جن سے ہمیں واسطہ پڑا انھیں صورت شناسا کہتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ہم ایک بار اپنے بزنس کے سلسلے میں، کافی عرصہ شہر میسور میں قیام پذیر رہے اور یہ تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ بنگلور، میسور، اوٹی تمام ہی سیاحتی مقامات ہیں جہاں لوگ بغرض تفریح جاتے رہتے ہیں۔ ایک بار جو ہم اپنے وطن عزیز حیدرآباد آئے اور شاپنگ کے لیے بازار گئے تو وہاں ہمیں ایک صورت شناسا مل گئے۔ ہم تو رسماً سلام کر کے آگے بڑھ گئے لیکن وہ ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ کہنے لگے "جناب سنیے تو۔ آپ بہت دن سے نظر نہیں آئے، کہاں رہے اتنے دن" ہم اتفاق سے ذرا صاف گو واقع ہوئے ہیں انھیں بلا کم و کاست سب کچھ بتلا دیا۔ اب تو ان کی دونوں آنکھیں پھیل گئیں بولے: "آپ نے پہلے تو کبھی ذکر ہی نہیں کیا"۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ آنجناب سے کب اتنی بے تکلفی تھی کہ اپنے ذاتی و خانگی راز ان جیسے راہ رووں پر وا کرتے لیکن چونکہ دل رکھنا ہر انسان کا فرض بنتا ہے۔ ہم نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ" بھائی اس کا کبھی موقع ہی نہیں آیا"۔ فرمانے لگے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب وہ زریں موقع آ ہی گیا ہے۔ مجھے بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ میسور و اوٹی جیسے تاریخی و تفریحی مقامات کی سیر کروں۔ آپ از راہ کرم اپنا پتہ لکھوا دیں۔ میں جب آؤں گا تو آپ سے ضرور ملوں گا۔ میرا نام تو آپ جانتے ہی ہوں گے نا، مجھے اسرار احمد کہتے ہیں"۔ ہم نے انتہائی تپاک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا وزیٹنگ کارڈ ہی ان کے ہاتھ میں تھما دیا جس میں یوں سمجھیے کہ سوائے ہمارے حسب و نسب کے باقی تمام تفصیلات درج تھیں۔ ہم دراصل کسی طرح ان سے پیچھا چھڑا کر جلد سے جلد اپنی شاپنگ مکمل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم آگے بڑھ گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ ہم بھی چند دن گزار کر میسور واپس چلا گئے۔

ایک بار آدھی رات کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بڑی زور و شور سے بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی۔

"میں اسرار بول رہا ہوں"۔ ہم نے پوچھا "اجی کون اسرار" کہنے لگے۔ "کمال ہے یار! اتنی جلدی بھول گئے اجی میں وہی آپ کا پرانا دوست اسرار حیدرآباد والا، آپ نے موتی گلی کے قریب اپنا کارڈ نہیں دیا تھا۔ اب اب ہمیں اچانک صورت شناسا یاد آگئے۔ ہم نے کہا "اچھا اچھا اسرار صاحب کہیے کب آئے" بولے "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ پہلے آئے ہوتے تو اب تک آپ سے بھلا کیسے نہ ملتے" ہم نے کہا "ذرہ نوازی کا شکریہ لیکن یہ تو بتلائیے کہ قیام کہاں ہے" اب ان کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ بولے "اجی پھر وہی بات۔ آپ کے ہوتے ہوئے بھلا ہم کہیں اور قیام کریں گے۔ اجی لاحول پڑھیے۔ ابھی ابھی بس سے اترے ہیں۔ آپ کا پتہ تو وہی ہے نا جو آپ کے کارڈ پر ہے بس یوں سمجھیے کہ دس پندرہ منٹ میں آہی رہے ہیں۔ ٹیلی فون اس لیے کر دیا کہ آپ کو روم وغیرہ صاف کروانے کی تو کم از کم مہلت مل جائے"۔ "جی جی جیم!" ہم ذرا ہکلائے۔ کہنے لگے "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کھانے وغیرہ کے انتظام میں دیر بھی ہو جائے تو فکر نہ کیجیے۔ ہم انتظار کر لیں گے"۔ ابھی ہم کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ ٹیلی فون کٹ ہو گیا۔ ہم سٹپٹا کر اٹھے۔ بیوی کو جگایا۔ سارا واقعہ سنایا۔ ہماری بوکھلاہٹ دیکھ کر وہ بھی بوکھلا گئیں۔ کہنے لگیں "اجی یہ کون اسرار صاحب ہیں۔ آپ نے پہلے تو کبھی ان کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔" اب ہم کیا کہتے کہ ہم نے سڑک پہ اپنا کارڈ دے کر خود ہی یہ گل کھلایا تھا۔ "بھئی بیگم سچ تو یہ ہے کہ ہم پر ان میرا اسرار صاحب کی بے تکلف شخصیت کا انکشاف تو آج ہی ہوا ہے۔ ورنہ وہ کل تک تو ہمارے لیے صرف صورت آشنا سا ہی تھے لیکن اب جو ہو گیا سو ہوا۔ بیگم تم ذرا جلدی سے کچن میں جاؤ اور میں ذرا گیسٹ روم والا کمرہ ٹھیک کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر ہم کمرے کی طرف لپکے اور وہ کچن میں گھس پڑیں۔ اتنے میں آٹو کے ہارن کی آواز آئی۔ باہر کی لائٹ جلائی تو دیکھا کہ لدے ہوئے دو عدد آٹو کھڑے ہیں۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ایک آٹو میں پانچ بچے سوار تھے۔ دوسرے میں کچھ کچھ سامان کے ساتھ اسرار صاحب اپنی بھدی سی بیگم کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے "اجی صاحب اتنی دور کیوں کھڑے ہو گئے۔ ذرا سامان اتار لیں تاکہ ہم آپس میں بغل گیر تو ہو لیں۔ اتنے دنوں بعد ملے ہیں"۔ ہم اپنی منحنی سی جان لیے آگے بڑھے۔ ہو سکتا ہے کہ سامان کا وزن کم ہی ہو۔ لیکن اس وقت ہمیں منوں وزن لگا۔ جوں توں کر کے رکشہ والے کی مدد سے سامان اتارا کیونکہ وہ بغلگیر ہونے کے لیے بے چین ہوئے جا رہے تھے۔ چنانچہ وہ وقت بھی آ ہی گیا کہ صورت شناسا نے ہمیں دونوں ہاتھ پھیلا کر دبوچ لیا اور اس قدر سا اظہار بے تکلفی کی جیسے برسوں بعد ملنے پر کوئی رات دن کا ملنے والا دوست کرتا ہے۔ ہم عوام کی اس نادر قسم پر حیران انھیں دیکھتے ہی رہے۔ پھر انھوں نے اپنے بیوی بچوں سے ہمارا یوں تعارف کروایا "دیکھو میں نہ کہتا تھا۔ یہی ہمارے قدیم دوست ہیں۔ حیدرآباد والے ہیں۔ ان کے یہاں ہوتے ہوئے ہم کہیں اور ٹھہرنے کا بھلا تصور بھی کر سکتے ہیں۔ چلو اندر چلو بھائی صاحب سے ملیں"۔ یہ کہہ کر وہ سب کے سب ہم سے آگے اور ہم سب کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ بیوی سے بھی صاحب سلامت ہوئی۔ ہم نے انھیں کمرہ بتلایا۔

ان کی بیگم نے تیکھے انداز میں سوال کیا "بھائی صاحب باتھ روم کہاں ہے"۔ ہم نے کہا "ویسے تو گھر میں دو دو باتھ روم ہیں ایک ہمارے کمرے سے متصل ...

آپ برا نہ مانیں تو آپ کا کمرہ ہمیں دے دیں۔ دس پندرہ دن ہی کی تو بات ہے۔ ہمیں اٹیچ باتھ روم کی عادت سی ہوگئی ہے۔" صورت شناسا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ٹالنے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ہم نے اپنا ضروری سامان وہاں سے نکال لیا اور اپنا کمرہ ان کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر غیر ضروری باتیں ہوتی رہیں پھر بیوی نے کھانا لگوایا اور ان سب نے سیر ہوکر کھایا۔ بیگم صورت شناسا نے کہا اور یقیناً رسماً ہی کہا کہ "ہم نے آکر آپ کو بہت تکلیف دی۔ صورت شناسا یہ سن کر بپھر گئے۔ کہنے لگے" بیگم تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو۔ بھلا اپنوں میں بھی کوئی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ خاطر و مدارات کرنا تو ہر میزبان کا فرض ہوتا ہے۔" پھر ہم سے یوں مخاطب ہوئے "کیوں بھائی صاحب میں نے ٹھیک کہا نا" اس وقت ہمارے دل کی جو کیفیت تھی وہ تو ہم ہی جانتے تھے یا شاید اب آپ سمجھ رہے ہوں لیکن ہم نے اپنی بیگم کی صورت دیکھی تو ہنسی آگئی۔ منہ سے کچھ نہ نکلتا تھا۔ کبھی بن بلائے مہمانوں کو اور کبھی ہم کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ گھر میں نہیں کسی عجائب گھر میں بیٹھی ہوں۔ اتنے میں صورت شناسا نے کہا "بھائی میں ایک بات تو پوچھنا ہی بھول گیا۔ آپ کی کار جو باہر کھڑی ہے۔ ماشاءاللہ اچھی حالت میں لگتی ہے۔ اسی میں سیر کو جایا کریں گے۔ اب ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے۔ کیسا رہے گا۔" ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کچھ سحر زدہ ہوگئے ہوں۔ ان کی ہر بات کا اثبات میں جواب دیتے رہے۔ یوں باتوں باتوں میں کافی رات ہوگئی۔ صورت شناسا نے گھڑی دیکھی کہنے لگے "اوہ! دو بج گئے کیا مصیبت ہے۔ صبح صبح سیر پر بھی نکلنا ہے۔ بے چاری بھابی صاحبہ کو تو ناشتے توشے کی بھی تکلیف کرنی ہے۔ چلیے اب آرام کریں۔ یہ سن کر سب اٹھ کھڑے ہوئے وہ تو خیر سے ہمارے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے لیکن ہمیں آنجہانی جواہر لال نہرو جی کا قول یاد آگیا۔ شاید یہ ایسے ہی موقعوں کے لیے پنڈت جی نے فرمایا تھا کہ "آرام حرام ہے" ہم نے فوراً ہی صبح کی تیاری شروع کر دی۔ بیوی کو صبح ہی ناشتے توشے کی تیاری کے لیے کہہ دیا۔ گھر میں رکھا ہوا سودا سلف چیک کیا۔ خود اپنی کار دیکھ آئے کہ واقعی آرڈر میں ہے کہ نہیں پھر ذرا اطمینان سے لیٹے ہی تھے کہ آنکھ لگ گئی۔

صبح صبح کال بیل کی آواز نے ہمیں جگا دیا۔ دیکھا تو ہم اپنے ہی روم میں موجود تھے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ کال بیل پھر بجی۔ اتنے میں بیوی نے آواز دی "اجی دیکھیے باہر کوئی کار آکر رکی ہے" ہم نے جلدی سے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک سفید "ایمبیسیڈر" ٹیکسی کھڑی ہے اور اس میں صورت شناسا اپنی حسین و جمیل بیگم کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ ہم نے آنکھ مل کر اچھی طرح دیکھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ فوراً کار سے اتر آئے پیچھے ان کی بیگم بھی اتر آئیں۔ دونوں مجسم اخلاق لگ رہے تھے۔ صورت شناسا نے آگے بڑھ کر معانقہ کیا۔ ہم نے اندر آنے کی درخواست کی کہنے لگے" بھائی صاحب صبح صبح آپ کو جگانے کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میسور آئیں گے تو آپ سے ضرور ملیں گے سو حاضر ہوگئے۔ دراصل ہم راست اوٹی جا رہے تھے سوچا یہاں تک آگئے ہیں تو وعدہ نبھاتے چلیں۔ اتنا کہہ کر انھوں نے ڈرائیور کو آواز دی جو دو ٹوکرے آم کار سے اتار لایا "بھائی ہم اور تو کچھ لا نہ سکے اب یہ حقیر سا تحفہ قبول کر لیجیے اور ہمیں اجازت دیجیے۔ ہم نے کہا" ایسا کیسے ہو سکتا ہے کم از کم ناشتہ تو کر لیجیے"۔ بولے" نہیں بنگلور سے ہوائی جہاز میں سیٹیں بک کروائی ہیں وقت بالکل نہیں ہے۔ انشاءاللہ پھر کبھی ضرور حاضر ہوں گے۔ لاکھ اصرار کے باوجود اصرار صاحب نے چائے تک نہیں پی۔ اتنے میں ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی السلام علیکم کہا اور ہم دور تک بھاگتی ہوئی کار کو دیکھتے ہوئے سوچتے رہے "کیا واقعی بدگمانیاں خوابوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں ---؟"

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن!

رجسٹرڈ آفس 8/825 ـ 1 ـ 4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد (اے پی)

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے. یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (ا). غربت ہٹاؤ اسکیم [2] خود روزگار اسکیم جو غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار ننگ کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل بکس بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا %25 کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود %4 کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے.

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں. اس جملہ لاگت کا %20 کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود $6\frac{1}{2}\%$ پر دیا جاتا ہے. کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری 97ء تک 63288 افراد میں 25 ـ 1753 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 92 ـ 7120 لاکھ روپے ہوتی ہے. اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1501 افراد میں (6) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 25 ـ 119 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے. جس کی جملہ لاگت 22 ـ 476 لاکھ روپے ہوتی ہے.

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے. حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے.

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کررہی ہیں.
خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں.

محمد علی رفعت
ایم کام۔ ایل ایل ایم
نائب صدر نشین و مینجنگ ڈائرکٹر

نمائش سوسائٹی

اِدارے، جنھیں نمائش سوسائٹی مالیہ فراہم کرتی اور چلاتی ہے

۱ــــ عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن، نمائش میدان۔
۲ــــ اکنامک کمیٹی، نمائش میدان۔
۳ــــ کملا نہرو پالی ٹیکنک فار ویمنس، نمائش میدان۔
۴ــــ سروجنی نائیڈو ونیتا مہا ودیالیہ، نمائش میدان۔
۵ــــ سردار پٹیل کالج، سکندرآباد۔
۶ــــ لال بہادر کالج، ورنگل۔
۷ــــ کستوربا گاندھی جونیر کالج فار ویمنس، سکندرآباد۔
۸ــــ کستوربا گاندھی ڈگری کالج فار ویمنس، سکندرآباد۔
۹ــــ سری وینکٹیشورا کالج، سُریا پیٹ۔
۱۰ــــ سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر۔
۱۱ــــ سری راما لنگیشورا کالج، نکلک چرلا۔ رنگا ریڈی ڈسٹرکٹ۔
۱۲ــــ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس، سکندرآباد۔
۱۳ــــ وسویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر، سکندرآباد۔
۱۴ــــ راجیو گاندھی انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر، نرمل، عادل آباد ڈسٹرکٹ۔
۱۵ــــ روی نارائن ریڈی انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر، ہالیہ، نلگنڈہ ڈسٹرکٹ۔
۱۶ــــ شنکرجی میموریل گرلز ہائی اسکول، نمائش میدان
۱۷ــــ ایل۔این۔گپتا میموریل ڈسپنسری، نمائش میدان

جے رام سنگھ
معتمد اعزازی

ڈاکٹر لئیق صلاح
صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی

طنز و مزاح کے ابتدائی نمونے

طنز و مزاح کی تاریخ نہایت قدیم ہے، چنانچہ بعض متقدمین شعراء کے ہاں طنز و مزاح کے نمونے مل جاتے ہیں۔ نصرتی نے علی نامے میں مغلوں کے حملے پر اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے ؎

مغل اصل نامرد ہور حیلہ گر　　شجاعت ہماری ہمیں سب پہ ور
مغل آکے اول جولت کھائے ہیں　　دکن کی لڑائی سے کترائے ہیں

جب بھی طنز و مزاح کے تعلق سے گفتگو ہوتی ہے تو اس سلسلے میں صرف سوداؔ اور جعفر زٹلی کا نام لیا جاتا ہے لیکن شاہ حاتم کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کے مرتبہ ایک تذکرے "مجمع الانتخاب" میں صفحہ ۲ پر شاہ حاتم استاد مرزا محمد رفیع سوداؔ کا حال درج ہے۔ "مجمع الانتخاب" کے مولف شاہ کمال نے دیوان شاہ حاتم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں چند عبارتیں "مفرح الضحک، معتدل من طب الظرافت" کے عنوان سے ہیں، جس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ "جو چنگا بھلا کھائے سو بیمار ہو جائے"، نسخہ ملاحظہ کیجئے

"چاندنی کا روپ، دوپہر کی دھوپ، چڑیل کی چوٹی، بھتنے کی لنگوٹی، پریوں کا گذر، دیو کی نظر..... تیس تیس ٹکے بھر، کبوتر کی غٹکوں، مرغی کی کڑکڑوں، چیل کی چل بل، کیڑوں کی کل بل..... جوگا لئی ششتر، بکرے کی میں، کوے کی ٹیں ٹیں، آٹھ آٹھ رتی، ان سب دواؤں کو لے کر نہ رات ہو نہ دن ہو، نہ صبح ہو نہ شام ہو، نہ باسی پانی نہ تازہ پانی، اوس میں سکھا کر، کالی کی سل پر ممنی کی بٹی سے پیسے، پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر، فرشتے کے (موت) بار خشخش کے ساتویں حصے برابر گولی باندھے، وقت نزع بطخ کے دودھ سے ایک کف پا پھانکے کھانے پینے، سوتے بیٹھنے، دیکھنے بولنے، سننے سونگھنے سے پرہیز کرے، جب خوب بھوک لگے تو نو سے، پیزاروں زیادہ نہ کھاوے۔ حاتم کہے "ایک روگ سے ستہر روگ کو پیدا کرے"۔

اس اقتباس میں مزاح کے ساتھ ساتھ، مقفیٰ و مسجع نثر بھی موجود ہے۔ یعنی مواد اور ہیئت دونوں کی پیشکشی پر بطور خاص توجہ کی گئی ہے۔

سوداؔ ہی کے ایک ہم عصر شاعر، میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدرآباد میں مقیم تھے۔ ان کا نام غلام حسین تھا۔ وہ سنجیدہ اور مزاحیہ کلام موزوں کرتے تھے۔ ان کا تخلص سنجیدہ شاعری میں ہدایت اور

مزاحیہ شاعری میں اُفسقؔ تھا۔ وہ نواب شمس الامراء کے دربار سے وابستہ تھے۔ افسقؔ نے نہ صرف معمولی افراد، بلکہ دیوانِ دکن نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ کو اپنی طنز کا نشانہ بناکر ہجوئیہ قصائد لکھے ہیں، اور تمام آفات و بلیات کا مرکز انھیں قرار دیا ہے۔ ان قصائد کے علاوہ مثنوی کے فارم میں بھی "ہجو" کہی گئی ہے۔ کسی میں آقا اور غلام کا مکالمہ ہے جو مونچھوں کو بالائی لگانے والے غلام سے کچھ کم نہیں۔ غلام کا بیان ملاحظہ کیجئے ؎

دن کو کھایا نہ بہت ہوئی یہ چوک — بے طرح سے لگے ہے اب تو بھوک

بولا سودے کو میں اگر جاؤں — اور جو بنیا نہ ہو تو پھر آؤں

اس سے بہتر ہے تم سنو یہ بات — اس طرح سستی کاٹو رات

فاقہ اختیاری کا ہے ثواب — ہے شکم پروری کا سخت عذاب

افسقؔ کی دو اور ہجوئیہ مثنویاں "دائی" اور "حمام" ہیں۔ اس عنوان کی ہجویہ نظمیں دوسرے شعراء کے ہاں بھی ملتی ہیں۔

میرؔ اور مرزاؔ کے دور کے شاعر شاہ کمال جو مانک پور کڑہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی عمر کا ایک حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ بعد میں وہ حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک ماہ وہ انگریزوں کے مہمان رہے تھے۔ اس تعلق سے انھیں جو تلخ تجربہ ہوا اُسے رباعی کی شکل میں منظوم کیا ہے، جو میزبانوں پر بھرپور طنز ہے ؎

انگریزوں کا جیئے نگر کے ہو وہ مہمان — جو فاقہ کشی سے ہووے خوگر انسان

سنتے تھے مثل سو بارے آنکھوں دیکھی — اونچی دوکان اور پھیکا پکوان

نعیمؔ کو بھی میرؔ اور مرزاؔ سے صحبت رہی ہے۔ ان کی دو ہجویہ نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں سے ایک مخمس کی شکل میں ہے اور دوسری میں چند شعر مرزا صاحب کے تعلق سے موزوں کئے ہیں ؎

ہمارے ایک مشفق ہیں دھیلے — کچھ اک میٹھے ہیں کچھ کڑوے کسیلے

جہاں جاتے ہیں یہ واں اُن کے چیلے — کوئی کھینچے کوئی اُن کو ڈھکیلے

ہمارے مرزا صاحب نویلے — بہت خوش ہو کے کھاتے ہیں کریلے

مخمس میں بھی مرزا صاحب کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے ؎

ارے او کنجڑے چل اُن کنے تو — میں اُن سے لے کے اب ملواؤں تجھ کو

و لیکن ایک ہے اب ان میں بدخو — نہیں کھاتے وہ ڈھینڈس اور کدو

ہمارے میرزا صاحب ...... الخ

جو کوئی اُن کنے مہمان رکھے — یہ پہلے دل میں اپنے ٹھان رکھے

اگر چاہے کہ اُن کا مان رکھے — کریلوں کا وہ بھر کر خوان رکھے

ہمارے میرزا صاحب .....

کریلے گھر میں یہ جس دم پکا ویں مسالے بھر نہ اُس کے جی جلاویں
بہت تعریف کر کر یلہ، کھاویں کسی کی بات پھر جی میں نہ لاویں

ہمارے میرزا صاحب .....

جو تنہا چھیڑیں لڑکے مل کے اُن کو تو یہ کہتے ہیں اُن سے وہ ہیں رو رو
ہماری آبرو مت کھوؤ لڑکو مری یہ چڑ نہیں کھاتا ہوں خوش ہو

ہمارے میرزا صاحب

تنہا باز آ اس گفتگو سے یہ بھاگے ہیں کریلوں کی تو بُو سے
نہیں واقف تو ان کی بار خو سے کچھ حاصل ان کی تجھ کو دو بدو سے

ہمارے میرزا صاحب ...

لالہ لچھمی نارائن شفیق نے "تذکرۂ چمنستانِ شعرا" میں، حکیم محمد کبیر سنبھلی انصاری کا ذکر کیا ہے۔ جن کا ریختہ کا ایک مختصر سا دیوان ہے۔ اُس زمانے میں کہتے ہیں کہ غلہ کی گرانی کی وجہ سے، اکثر لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی شرمندگی کا اظہار منظوم انداز میں کیا ہے اور بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

زاہد سے بہت عید کو ہم شرمائے اس قحط میں رمضاں مبارک آئے
ناچار اور کچھ میسر نہ ہوا بھر پیٹ بہت سے ہم نے روزے کھائے

حکیم محمد کبیر نے زاہد کے بعد، واعظ کو بھی چھیڑا ہے اور اندازِ گفتگو بالکل مولیانہ ہے۔ مخاطبت بالکل واعظ ہی کی زبان میں کی گئی ہے۔ شعر کے ایک مصرعے میں اپنے خیال کا اظہار اور دوسرے میں جس جواب کے وہ واعظ سے متوقع ہیں۔ ان کلمات کو نظم کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

واعظ کی باتوں سے میں ہوں گمراہ استغفر اللہ، استغفر اللہ
آتا ہے وہ بُت کیا سج بنا کے اَللہ، اَللہ، اللہ
کہتا ہے قاصد خط اُس کا آیا الحمدللہ، الحمدللہ الحمدللہ

میر حسن کو ہم صرف ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اُن کے یہاں بھی مولوی ساجد کی ہجو ہے جس میں وہ ابتذال کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں۔ ایک نظم "نقل قصاب (برائے تفریحِ مزاج)" کے عنوان سے ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور "نظم" دیگر نقل قصائی" ہے، اس میں بھی کلام فحش ہے۔

جرأت کے کلام میں بھی "ہجو کریلا" "ہجو بھانڈ" نقل شیخ (فحش) اور نقل دیگر کریلا بھی فحش ہے۔ سودا کے یہاں تو ایسی نظمیں کثرت سے موجود ہیں مثلاً ہجو میر ساجد، قصیدہ ہجو اسپ جو شہرت کا حامل ہے "شیخ جی" پر تو کئی نظمیں موزوں کی گئی ہیں مثلاً۔ جب میں سنا کر بیاہ رچاتے ہیں شیخ جی۔

ایک دو مخمس جس کے مصرعے ہیں ع تجھ کو جملہ میں جو دلھن سے ہے منت داری

ع اک مسخرا کہتا ہے کوا ہے حلال ع روٹی تو کما کھا دے کس طور مچھندر

ع وارد احمد نگر ایک ہیں مرد عزیز

ان کے علاوہ "مثنوی ہجو دامی" "ہجو طبیب" "ہجو پدر غازی الدین خان اور ہجو مرزا قدوی لاہوری یعنی پنجابی۔

سودا کے شاگرد قائم بھی طنز و مزاح میں اپنے استاد کے مقلد تھے۔ اُن کے ہاں بھی ہجویہ نظمیں ہیں جن کے عنوانات اور مصرعے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مثنوی ہجو لونڈا پتنگ باز ۔ ع ایک لڑکا پتنگ کا ہے کھلاڑ (مخمس)

مثنوی ہجو لالہ ۔ ع یاں جو کوئی غنی ہے یا محتاج (مخمس)

مثنوی فارشت ۔ ع خارش کی ہے اس ہوا میں یہ دھوم (مخمس)

مثنوی ہجو سرما ۔ ع سردی اب کے برس ہے اتنی شدید

میر بقاء اللہ بقاؔ، میرؔ کے ہم وطن تھے۔ ان کے کلام میں بعض شعر ایسے ہیں جن میں میرؔ و سوداؔ پر طنز ہے

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ سخن فارسی سے تا ہندی

پر جُدا ہے تمام عالم سے طرز سوداؔ و طرز میر تقی

کھول دیوان دونوں صاحب کے ہم نے جس دم بقاؔ زیارت کی

شعر سوداؔ و میرؔ کے دیکھے وہ تو، تو تو کریں ہیں یہ ہی ہی

-:-

میرؔ نے تو ترا مضمون دو آنے کا لیا پر بقاؔ تو یہ دعا دے، جو دینی ہو

یا خدا میرؔ کے دیدوں کو دوآبا کر دے اور بینی یہ بہا اس کی کہ ترببینی ہو

مذکورہ بالا اقتباسات سے، اس بات کا اندازہ ہوا کہ طنز و مزاح کے نمونے شاعری میں تو کثرت سے ہیں، لیکن نثر کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، سوائے شاہ حاتم کے۔ • •

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اِداریہ

"شگوفہ" نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس رسالہ کو مختلف شعبہ ہائے زندگی کی نمایندہ شخصیتوں کا تعاون حاصل رہے۔ ڈیڑھ ماہی شگوفہ کا اجرا ہوا تو ملک کے نامور ادیبوں کرشن چندر، کنھیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی اور بھارت چند کھنہ کے نام نامی مجلس مشاورت میں شامل تھے۔ بعد میں نریندر لوتھر، خواجہ عبدالغفور، مہندر سنگھ بیدی سحر یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین (ابتداء میں مجتبیٰ صاحب اور حمایت صاحب مجلس ادارت میں شریک تھے) دلیپ سنگھ اور حمایت اللہ مجلس مشاورت کے رکن بنے ۔۔۔ اس مرتبہ ہم نے ادب و سیاست کی نامور شخصیت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور پولیس کے سینئر ترین عہدہ دار جناب ایم اے باسط (آئی پی ایس) سے مجلس مشاورت میں شمولیت کی درخواست کی تو دونوں حضرات نے اس پیشکش کو قبول کیا۔ گوڑ صاحب نے اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود اردو زبان و ادب سے جو رشتہ قائم رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بذلہ سنجی بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ طنز و مزاح کے ادبی رسالہ سے ان کا رسمی بلکہ شرعی تعلق رہے یوں بھی شگوفہ اور زندہ دلان حیدرآباد سے انھیں ہمیشہ تعلق خاطر رہا ہے۔

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے اردو کے مسائل پر حال ہی میں منعقدہ ایک نمایندہ میٹنگ میں جناب ایم اے باسط صاحب نے اردو زبان کے موقف پر بے باکانہ اور مدلل انداز میں گفتگو کی، اور نئے زاویہ سے چند اہم امور کی نشاندہی کی۔ تو ہمیں خیال ہوا کہ باسط صاحب جیسے سینئر عہدہ دار کی خدمات، تجربہ اور مشوروں سے استفادہ کرنا چاہیئے اردو زبان و ادب کے ترویج کی صحتمند اور مثبت تحریکوں میں ایسے خاموش خدمت گزاروں کے رول کی بڑی اہمیت ہے۔

شگوفہ کے ایڈیٹر اوورسیز ڈاکٹر عابد معز اور ان کی کمیٹی کے ارکان نے ۱۹۹۱ء سے رسالہ کی توسیع اشاعت اور سعودی عرب و اردو کی دوسری نئی بستیوں تک طنز و مزاح کی روایت کو وسعت دینے میں جو اہم حصہ ادا کیا ہے اس کے لیے تحسین کے چند لفظ کافی نہیں۔ اوورسیز کمیٹی کے تمام ارکان کے ہم ممنون ہیں کہ ان کی ساعی سے "شگوفہ" نئے حلقوں میں متعارف ہوا۔
شجاع الدین غوری صاحب اور بعض دوسرے ارکان کا اصرار تھا کہ اوورسیز کمیٹی کی تشکیل جدید ہو چنانچہ ڈاکٹر عابد معز اور اوورسیز کمیٹی کی خواہش پر جناب حسن چشتی اور غوثیہ سلطانہ صاحبہ (امریکہ) اور جناب محمد باقر اور جناب عبدالرحمٰن سلیم (سعودی عرب) سے اوورسیز کمیٹی کی رکنیت قبول کرنے کی خواہش کی گئی۔ اور ان حضرات نے اپنی رضامندی سے بھی نوازا۔ جس کے لیے ہم سراپا سپاس ہیں ۔۔۔ طنز و مزاح کے اس منفرد کاروان میں ہم اپنے نئے ساتھیوں کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور امید کرتے کہ شگوفہ اپنی تازگی اور شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک عالمی جریدہ کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کرتا جائے گا۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

مارچ ۱۹۹۷ء

جلد: ۳۰ ——— شمارہ: ۳

ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت:

محمد سلیم، محمد غالب، محمد عبدالرؤف

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد۔۲

قیمت فی پرچہ: ۱۰ روپے
زر سالانہ: ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۱۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون: آفس، 595716 رہائش: 4576064

شگوفہ

کے ابتدائی ۲۵ سال کا

نثری انتخاب

... اب جون ۱۹۹۷ء میں شائع ہوگا

مہمان مدیر : جناب سکندر علی خان

تفصیلات آئندہ شمارے میں

*

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن!

رجسٹرڈ آفس 4-1-825/8 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد (اے پی)

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں ا۔ غربت ہٹاؤ اسکیم 2۔ خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی سازی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بینک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیمات کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری 97ء تک 63288 افراد میں 1753-25 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 7120-92 لاکھ روپے ہوتی ہے اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1501 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 119-25 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 476-22 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹر پر بھی کام کررہی ہیں۔
خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمدؐ علی رفعت
ایم کام۔ ایل ایل۔ ایم
نائب صدرنشین وینجنگ ڈائرکٹر

مجتبیٰ حسین

اُردو شاعری اور آٹو رکشا

ادھر کچھ دنوں سے اُردو زبان وادب پر آٹو رکشا والوں کے احسانات کا خاصہ ذکر ہونے لگا ہے۔ بعض افراد کا خیال ہے کہ یہ جو آٹو رکشا والے اپنے رکشا پر اُردو کے شعر بڑے ذوق وشوق سے لکھواتے ہیں تو اس سے اُردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ رکشا جہاں جہاں جاتے ہیں وہاں وہاں اُردو بھی چلی جاتی ہے۔ ع

جب تم چلو زبان چلے، آسمان چلے

یوں بھی اُردو اب ایک ایسی کمزور اور نحیف زبان بن گئی ہے کہ جو خود سے تو نہیں چل سکتی البتہ رکشہ میں سوار ہوکر ضرور چلی جاتی ہے۔ یہ رکشا والوں کا کرم نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ وہ اُردو کو اپنے رکشا میں سوار کر کے تو لے جاتے ہیں لیکن اس سے کوئی کرایہ وصول نہیں کرتے ورنہ رکشا والے کب کسی کو مفت میں لے جاتے ہیں۔ حکومت بھی اُردو کے لئے کچھ کرتی ہے تو بھلے ہی کرایہ نہ مانگے اُردو والوں سے "ووٹ" تو مانگ لیتی ہے۔

اُردو زبان وادب کی خدمت کرنے والوں یا اس پر احسان کرنے والوں کی فہرست اب لمبی ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔ فلمیں بنانے والوں کا اُردو پر احسان یہ ہے کہ وہ اپنی فلموں میں اُردو کا استعمال کررہے ہیں۔ مشاعروں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاتی ہے کہ جہاں جہاں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں وہاں وہاں اُردو الفاظ کا چلن عام ہوجاتا ہے۔ قوالوں کا احسان یہ ہے کہ ان کے پروگراموں کے ذریعہ اُردو کی 'مقبولیت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے' وہ فقیر بھی اُردو کے محسن ہی ہیں جو اُردو شعروں کی مدد سے بھیک مانگتے ہیں۔ اب اُردو کے ان محسنوں میں آٹو رکشا والوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو یا نہ ہو، اس کے محسنوں کی تعداد میں اضافہ خود ایک خوش آئند بات ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک صاحب

نے آٹو رکشا والوں کی اُردو خدمات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ آٹو رکشہ والوں کو اُردو کی مقبولیت میں اضافہ کا سبب جاننا سراسر غلطی ہے کیونکہ آٹو رکشا والے عموماً ایسے شعر اپنے رکشاؤں پر لکھواتے ہیں جن کا نہ کوئی سر ہوتا ہے اور نہ پیر۔ بے تکے سے شعر ہوتے ہیں جو اکثر بحر سے خارج ہوتے ہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں ہماری عرض یہ ہے کہ آٹو رکشا سواری ہی ایسی ہے کہ اس میں آدمی بیٹھے یا شعر اس کا بحر سے خارج ہوجانا یقینی ہوجاتا ہے۔ جن لوگوں کو آٹو رکشا میں بیٹھنے کا تجربہ ہے اور جو علم عروض سے بھی واقف ہیں وہ اس نکتہ کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سواری میں بیٹھنے کے بعد خود آدمی کا قافیہ نہ صرف تنگ ہوجاتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنے وزن سمیت رکشا سے گر جاتا ہے۔ ہمیں یہ اعتراض بھی فضول سا نظر آتا ہے کہ آٹو رکشاؤں پر لکھے جانے والے شعروں کا کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر اور یہ کہ ان میں سے بیشتر اشعار میں کوئی معنی نہیں ہوتے۔ شعر تو صرف شعر ہوتا ہے اس میں سر اور پیر کو تلاش کرنا بے وقوفی کی بات ہے۔ پھر ان دنوں جس قسم کی شاعری ہورہی ہے اس میں سر اور پیر کہاں ہوتے ہیں جو آٹو رکشا والوں سے اس بات کی توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی شاعری میں سر اور پیر کی گنجائش فراہم کریں۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے، پھر جدید شاعری میں ہمیں تو کوئی معنی نہیں نظر آتے۔ جب مسلمہ شاعروں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو آٹو رکشا والوں کو کیوں مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ ہمیں تو آٹو رکشا والوں کی شاعری، جدید شاعری کی ہم پلہ ہی نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ بیچارے باضابطہ شاعر نہیں ہوتے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھار آٹو رکشا والوں سے "املا" کی غلطیاں یقیناً سرزد ہوجاتی ہیں لیکن اُن کی ان غلطیوں سے بھی شعر میں نئے معنی اور مفہوم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے ہم نے ایک آٹو رکشا پر علامہ اقبالؔ کا مشہور شعر اس طرح لکھا ہوا دیکھا تھا۔

نہیں تیرا نشیمن "خسر سلطانی" کی گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

آٹو رکشا والا چونکہ "قصر سلطانی" سے واقف نہیں تھا اس لئے اس نے "خسر سلطانی" لکھا تھا اور "خسر سلطانی" لکھ کر اور اپنے خسر کے گھر میں اپنا نشیمن نہ بنا کر یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنی محنت کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتا ہے اور "گھر داماد" ہرگز نہیں بننا چاہتا۔ دیکھا جائے تو املا کی اس غلطی سے علامہ اقبالؔ کے شعر میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی تھی۔

رکشاؤں پر لکھی جانے والی تحریروں میں بعض اوقات "قول محال" کی کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر رکشاؤں پر لکھا ہوتا ہے "ماں کی دعا" یہ عبارت قول محال نہیں تو اور کیا ہے ایک آدمی رکشا چلا رہا ہے لیکن پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ رکشا محض اس لئے چلا رہا ہے کہ اس میں "ماں کی دعا" شامل ہے۔ اگر "ماں کی دعا" سچ مچ شاملِ حال رہتی تو وہ رکشا کیوں چلاتا۔ کسی پارٹی کا نیتا نہ بن جاتا۔ پھر بھی رکشا والے کے جذبہ قناعت اور وسیع القلبی کی داد دیجئے کہ وہ رکشا چلانے کو بھی "ماں

کی دعا" سمجھتا ہے۔ حالانکہ رکشا چلانے کو "ماں کی دعا" نہیں بلکہ "باپ کی بد دعا" سمجھنا چاہیئے۔ یوں بھی ان دنوں "ماں کی دعا" اتنی اثرانگیز نہیں ہوتی جتنی کہ "باپ کی بد دعا" ہوتی ہے۔ جو آٹو رکشا والے اپنے رکشاؤں پر "ماں کی دعا" والی عبارت لکھواتے ہیں ہم تو انہیں طنز نگار بھی سمجھتے ہیں۔ اس عبارت کے ساتھ رکشا چلانے کے عمل میں ہمیں تو طنز کی ایک گہری کاٹ دکھائی دیتی ہے۔

بعض رکشاؤں پر ایک طرف تو ہمیں نہایت اعلیٰ و ارفع اشعار نظر آتے ہیں جن میں اخلاقی اقدار کی حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے تو دوسری طرف بعض رکشاؤں پر ایسے عاشقانہ اور فاسقانہ اشعار بھی نظر آتے ہیں جو آپ کے جذبات میں خواہ مخواہ ہلچل سی پیدا کر دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو زندگی دو انتہاؤں کے بیچ اعتدال پیدا کرنے کا ہی نام ہے۔

آٹو رکشاؤں اور اردو شاعری کی بات چل نکلی ہے تو ہمیں تیس برس پہلے کے ایک رکشا والے کی بھی یاد آگئی جس کے رکشا میں ہم نہایت پابندی سے بیٹھا کرتے تھے۔ اس کے رکشا پر اگرچہ شعر نہیں لکھے ہوتے تھے لیکن رکشا چلانے والا خود بہ نفس نفیس شاعر تھا۔ اسے جب اچانک پتہ چلا کہ ہمارا بھی تھوڑا بہت تعلق لکھنے پڑھنے سے ہے تو اس نے ایک دن ہمیں ایک شعر سنایا۔ شعر ہمیں پسند آیا اور ہم نے داد دی تو اس نے اچانک رکشا کو روک دیا اور خالص شاعرانہ انداز میں ہمیں یوں سلام کرنے لگا جیسے شعر کی داد وصول کر رہا ہو۔ جو فاصلہ ہم عموماً بیس منٹ میں طے کرتے تھے اس دن آدھے گھنٹے میں طے ہوا کیونکہ ہماری داد کے جواب میں اسے بار بار رکشا کو روک کر اُترنا پڑتا تھا اور سلام کرنا پڑتا تھا۔ اس انکشاف کے بعد سے وہ ہمیشہ ہماری سواری میں رہنے لگا۔ اگرچہ وہ رکشا چلاتا تھا لیکن ادب کے وسیلے سے ہمارا دوست بن گیا تھا۔ پتہ چلا کسی زمانے میں وہ باضابطہ شعر کہتا تھا لیکن جب اس کے خاندان والوں نے کہا کہ اسے شاعری کرنے کے علاوہ کوئی شریفانہ کام بھی کرنا چاہیئے تو اس نے رکشا چلانا شروع کر دیا۔ دیکھا جائے تو وہ ان شاعروں سے ہزار درجہ بہتر تھا جو صرف شعر کہتے ہیں اور شعر کہنے کے سوائے کوئی اور کام نہیں کرتے (بشرطیکہ شعر کہنے کو کام سمجھا جائے) ہم نے اس سے ایک دن کہا کہ وہ مشاعروں میں اپنا کلام کیوں نہیں سناتا تو کہنے لگا "حضور! یہ زمانہ شاعروں کا نہیں متشاعروں کا ہے۔ ان متشاعروں نے اپنا "تحسین باہمی" والا ایک گروپ بنالیا ہے اور مشاعروں میں ان ہی کی اجارہ داری چلتی ہے۔ اگر آپ اس گروپ سے تعلق نہ رکھتے ہوں تو آپ کو مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن اپنی انا کا سودا نہیں کر سکتا۔ شعر اچھے کہتا ہوں تو کیا ضروری ہے کہ مشاعروں میں بھی کلام سناؤں۔ میں تو اپنی تسکین کے لئے شعر کہتا ہوں۔ دوسروں سے مجھے کیا غرض"۔ وہ ایک بے لوث شاعر تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ زمانے نے اس کی قدر نہیں کی۔ وہ ہر شام کو ہمیں گھر لے جانے کے لئے ہمارے دفتر پہونچ جاتا تھا۔ ایک شام وہ دفتر آیا مگر ہم دفتر میں نہیں تھے۔ دوسرے دن اس نے شکایت کی تو ہم نے کہا "بھئی! کل شام ہم ایک محفل شعر

میں چلے گئے تھے جو مخدوم محی الدین صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی ۔" یہ سنتے ہی وہ اُداس سا ہوگیا۔ کہنے لگا " صاحب! ان سینیئر شاعروں کی وجہ سے ہم جیسے جونیئر شاعروں کو پنپنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ کل میں آپ کے لئے ایک نئی غزل لکھ کر لے آیا تھا۔ آپ کو سنانے کی بڑی تمنا تھی لیکن آپ بھی سینیئر شاعروں کے چکر میں پڑ گئے ۔" اس کی بات چونکہ معقول تھی اس لئے ہم نے ازراہ ہمدردی اس دن نہ صرف اس کی تازہ غزل سنی بلکہ اس پر اتنی داد دی کہ ایک مرحلہ پر ہم نے یہ پیشکش کی کہ رکشا ہم چلائیں گے اور وہ پیچھے بیٹھ جائے کیونکہ ہماری داد کے جواب میں اسے بار بار رکشا سے اُتر نا پڑتا تھا۔ ہماری پیشکش کے جواب میں اس کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے ۔ ہماری سخن فہمی کی داد دیتے ہوئے کہنے لگا۔" آپ جیسے سخن فہم حضرات دو چار اور پیدا ہو جائیں تو ادب کی صورتحال کیا سے کیا ہو جائے گی ۔" ہم نے اسے سمجھایا کہ " قدرت تم جیسے انمول شاعروں اور ہم جیسے بے مثال سخن فہموں کو پیدا کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتی ہے۔ زمانہ میں اچھے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔"

رکشا چلانے والا یہ شاعر ہمیں اب بھی اکثر یاد آتا ہے ۔ کبھی ہمارے پاس رکشا کا کرایہ دینے کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو کہتا تھا " مال و متاع ' دولت و ثروت سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ جب آپ کے پاس آجائیں تو دے دیجئے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے ؟" لیکن قدرت کو کچھ اور ہی مقصود تھا۔ ہم اچانک دہلی چلے گئے اور ہم اسے کرایہ کی باقی رقم ادا نہ کرسکے ' بعد میں ہم نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔ اُردو زبان کے بے لوث اور خاموش خدمت گذار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ جہاں کرایہ دینا چاہیے وہاں داد دے کر انجان بن جاتے ہیں ۔

--

یوسف ناظم

مشرق سے اُبھرتے ہوئے مغرب کو ذرا دیکھ

مشرق اور مغرب دونوں جیسا کہ مشہور ہے ایک ہی خطہ ارض کے دو حصے ہیں بلکہ ارضی اعتبار سے دونوں حصے ایک ہی ہیں لیکن حالات نے انہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف بنادیا۔ اتنے اختلافات تو میاں بیوی میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کی زبان الگ، رہن سہن الگ، لباس الگ بلکہ مغرب میں تو لباس نام کی چیز صرف غیر موسمی پھل کی طرح کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ مشرق اور مغرب کے کلچر میں غضب کا فرق۔ روزمرہ کے معاملات کے فرق پر ہمارے شاعر مشرق اقبالؔ نے تو تبصرہ نہیں کیا لیکن مجموعی صورتحال کو اہل ذوق و شوق کے لئے یوں پیش کیا ؎

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

کبھی کبھی تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ قدرت نے ان دونوں جڑواں بھائیوں کی پیدائش میں کہیں صدیوں کا وقفہ تو نہیں حائل کر دیا۔ شروع شروع میں تو ٹھیک تھا اور ان دونوں خطّوں کے لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے اور اگر کبھی اتفاق سے کہیں مل گئے تو ان کے درمیان ایک مترجم کی ضرورت پیش آتی تھی (اس مترجم کو کبھی کبھی مستشرق بھی کہا جاتا تھا) لیکن اب تو مواصلاتی نظام کی ترقی، مسافرت نواز اداروں کی افراط، ہوائی جہازوں میں تبسم ریز تقررات، زمین پر وقت پر نہ چلنے والی ریلوں کی بہتات اور سڑکوں پر از کار رفتہ بسوں کے حادثات نے بیرون اور اندرون ملک کے مختلف علاقوں میں آنے جانے کی اتنی سہولتیں مہیا کردی ہیں کہ صرف مشرق اور مغرب نہیں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کا سفر کرنے میں لوگوں کو کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ تو اپنا وطن چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا کر بس جاتے ہیں اور ممکن ہوا تو وہاں ایک اور بیوی پیدا کر سکتے ہیں۔ پہلی بیوی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ان کے شوہر نامدار کی مزید ایک خانہ آبادی ہو چکی ہے۔ دنیا کے لوگوں میں اتنی قربت اور قرابت کے وسیع پیمانے پر انتظامات ہو جانے کے باوجود اب تک مشرق اور مغرب کا کلچر ایک نہیں ہو سکا ہے، کوششیں بہت ہوتی اور ہو رہی ہیں۔ مشرق میں مغرب کے رقاص اپنا کمال دکھا رہے ہیں، بین الاقوامی حسن کے مقابلے منعقد ہو رہے ہیں۔ علاوہ اب صورتحال اتنی خراب نہیں ہے جتنی کہ اس صدی کے آغاز کے وقت تھی۔ لوگ

بیرونی ملکوں کے سفر پر ضرور جاتے تھے لیکن جو کچھ سیکھنے جاتے تھے وہ تو نہیں سیکھ پاتے تھے اور دوسرے میدانوں میں اپنا جوہر دکھاتے تھے۔ محفلوں میں غلطیاں بھی کر بیٹھتے تھے۔ انہوں نے سُن رکھا تھا کہ روم جاؤ تو رومن کی طرح رہو سہو۔ کچھ لوگوں نے رومن لفظ کے درمیان میں ایک الف زائد لگا دیا اور اسے رومان میں تبدیل کر کے بے گھر داماد بن گئے یا کم سے کم دیوار قہقہہ۔ اس مقولے نے یعنی ملک روم والے مقولے نے بعض معاملوں میں بڑی پیچیدگی پیدا کردی۔ وہ واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ اس زمانے میں جب ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے رواج اور رسوم سے واقف نہیں تھے۔ دو چینی سیاح (جو کافی مال دار اور ساتھ ہی ساتھ معزز بھی تھے) انگلستان کے سفر پر گئے۔ لندن میں ایک اونچے ہوٹل میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے اور جب لندن کے کسی دوسرے مالدار اور معزز شخص کے بیٹے کی بپتسمہ (Baptism) کی تقریب اس ہوٹل میں منعقد ہوئی تو ان دونوں چینی مہمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تاکہ محفل میں دلچسپی رہے اور یہ غیر ملکی سیاح بھی جب اپنے وطن جاکر کسی اخبار کے نمائندے کو انٹرویو دیں یا خود اپنے سفر نامے کی تخلیق کریں تو اپنے قابل ذکر تجربات میں اس تقریب کا بھی ذکر کریں۔ ان چینی سیاحوں نے اس عالمی شہرت کے حامل مقولے پر عمل کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا کہ روم میں رہو تو رومن بن کر رہو۔ تقریب کا آغاز ہوا اور ان غریب سیاحوں نے اپنی نقل کرنے کی صلاحیت کا اچھا مظاہرہ کیا۔ اہل تقریب بھی بے حد مسرور اور لڑکے کے والدین بے انتہا ممنون ہوئے لیکن معاملہ نقطہ عروج پر تو اس وقت پہنچا جب پادری صاحب نے اپنے خطبے کے بعد لڑکے کے والد سے کھڑے رہنے کیلئے کہا (کیونکہ یہ بھی ایک رسم ہے) تو متعلقہ والد کے کھڑے ہوتے ہی یہ دونوں چینی سیاح بھی سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ (گویا اپنے کئے پر شرمندہ ہوں) محفل میں اس انکشاف پر حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکے کے والد کی حالت تو غیر تھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے کس طرح عہدہ برآ ہوں۔ وہ نہ تو اپنے حق سے دستبردار ہو سکتے تھے اور نہ ان چینی شرپسندوں سے دست و گریباں ہو سکتے تھے۔ پادری صاحب نے بہرحال اپنے ہوش و حواس کو جو کافی حد تک بکھر گئے تھے۔ بڑی مشکل سے مجتمع کیا اور باآواز بلند یہ کہہ کر کہ خدا ہمارے گناہوں کو معاف کرے، محفل برخاست کردی۔ (ویسے ان کا یہ دعائیہ جملہ کبھی معنوی اعتبار سے خطرناک بھی تھا) ہوٹل کے منتظمین نے چینی سیاحوں کو (جو درحقیقت معصوم لوگ تھے) فوراً اپنے حلقے میں لے کر ان کے کمرے میں منتقل کردیا اور کمرہ بھی مقفل کر کے اس پر "خالی ہے" (Vacant) کی تختی لگا دی۔ وہ تو لندن تھا جہاں مغربی تہذیب میں مزاح کا عنصر بھی شامل ہے اور نازک معاملات کو خوش دلی کے ساتھ ہنس بول کر ٹال دیا جاتا ہے لوگوں نے اس واقعے کو اسی لئے اس کے صحیح تناظر میں دیکھا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ کہیں ایسا یا اس نوعیت کا کوئی واقعہ کسی ایسی جگہ رونما ہوتا جہاں ایسے واقعات کا انتظار کیا جاتا ہے کہ کچھ ہو تو ہم کچھ کریں تو اس پنج ستارہ ہوٹل کے پانچوں ستارے دمدار ستاروں کی طرح زمین پر گر کر ٹوٹ جاتے اور بعد ازاں اس واقعے کی نوعیت بھی کچھ ہو جاتی۔ سفارت خانوں پر مظاہرے ہوتے۔ جہاں بھی چینی زیورات یا چینی کراکری بھی نظر آتی، محفوظ نہ رہ پاتی اور

اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے کارنامے انجام دیئے جاتے۔ ایسے کارنامے جو ہماری سوچ اور سمجھ کے دائرے سے کافی فاصلے پر ہوتے۔ روم جاؤ تو رومن بن کر رہو کتنا خطرناک اور زلزلہ انگیز مقولہ ہے۔

مغربی کلچر کا کوئی جزیا نکتہ ہمارے یہاں آزمایا جاتا ہے تو لوگ آزمائش میں پڑ جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے ایک دلدادہ بلکہ زائیدہ نوجوان کو اپنے وطن مالوف میں جو بڑی حد تک پسماندہ لیکن ترقی پذیر دیہات تھا ایک شادی میں شرکت کے لئے جانا پڑا۔ وہاں ہمارے مہانوں نے اس نوجوان کو تجسس کی نظروں سے دیکھا اور آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے اس کی ستائش بھی کی لیکن جب دولہے کے ساتھ اس نوجوان کو بھی زنان خانے میں لے جایا گیا اس نے جوکہ مغربی تہذیب کا علمبردار تھا' دولہن کی صورت دیکھتے ہی کہا۔ بھابی آپ کتنی خوبصورت ہیں' دولہن کے رشتہ داروں نے جن میں کافی تندرست و توانا لڑکے شامل تھے' اس نوجوان کو الگ کمرے میں لے جاکر مغربی تہذیب کا جنازہ بڑی دھوم سے نکال دیا۔ نوجوان کی واویلا سن کر اس کے والد نے بڑی منت سماجت کے بعد کمرے کا دروازہ کھلوایا اور لڑکوں سے درخواست کی کہ جانے دو۔ بچہ ہے۔ لڑکوں میں سے کسی نے جواب دیا' جانے کیسے دیں' بچہ ہی تو آدمی کا باپ ہوتا ہے۔ انگریزی کا یہ مقولہ بھی دیکھئے کیا رنگ دکھاتا ہے۔ مقولہ نہ ہوا آسمان ہوگیا۔ آسمان نہ سہی زمین چمن ہی سہی جو گل کھلاتی ہے کیا کیا۔

مغربی تہذیب میں خواتین کے حسن کی تعریف کرنا (خواہ وہ کیسی ہی شکل وصورت کی ہوں) لازمی قرار دیا گیا ہے ہماری تہذیب میں یہ منع ہے۔ صرف شاعروں کو اجازت ہے کہ وہ غزل میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور سراپا بیان کرتے وقت خواتین کا سراپا یا تجزیہ پیش کریں۔ (اس میں سسر کا ذکر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں)۔

مغربی تہذیب کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ اس میں وقت کی قدر بہت کی جاتی ہے حالانکہ دیکھنے سننے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے اہل مغرب کھلنڈوں کا ایک منظم گروہ ہیں جن کی ہوس سیر و تماشا' اس وقت بھی کم نہ ہونے کے باوجود روبہ کمال ہے لیکن اسی تہذیب کے نقیبوں میں سے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وقت دولت ہے تو ہمیں افسوس ہوا کہ اہل مغرب دولت جیسی نعمت کو اتنا حقیر سمجھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بیٹھے بیٹھے ہمارا سر خود بخود فخر سے بلند ہوگیا' اس لئے کہ اگر اہل مغرب کی رائے کے مطابق وقت دولت ہے تو ہم اہل مشرق اور خاص طور پر اہل ہند متمول سے بھی زیادہ دولت مند لوگ ہیں کیونکہ وقت تو ہمارے پاس اس کثرت سے ہے کہ مسلسل بلکہ مستقل طور پر مبتلائے عناد و فساد رہنے کے باوجود ہمارے پاس اتنا وقت وافر مقدار میں بچا پڑا رہتا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس بچے ہوئے وقت کو کس مشغلے میں صرف کیا جائے۔

جوں ہی ہمیں اپنے بے انتہا دولت مند ہونے کا احساس ہوا ہمیں یہ بھی یاد آیا کہ مغرب کے کسی دانشور نے (دانشور کبھی کبھی وہاں بھی پیدا ہوجاتے ہیں اس میں تعجب یا افسوس کی کیا بات ہے) کہا ہے کہ دولت سب سے بڑی نیکی ہے۔ اگر یہ مقولہ بھی صحیح ہے تو اس لحاظ سے ہمارے نیک اور خوش خصال ہونے میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔ یہ الگ بات ہے ہم جتنی بھی نیکیاں کرتے ہیں سب کی سب دریا میں ڈال دیتے ہیں

اور اسی لئے یہ نیکیاں کسی کو دکھائی نہیں دیتیں بلکہ بعض صورتوں میں تو خود ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ ہم کتنی بڑی نیکی کر بیٹھے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہم صرف وقت کی دولت کی وجہ سے دولت مند ہیں۔ اصلی دولت بھی ہمارے یہاں موجود ہے لیکن یہ اصلی دولت صرف مخصوص لوگوں کے پاس ہے یعنی ایسے لوگوں کے پاس جو دل و جان سے اس کی حفاظت کر سکیں اور اتنی شدید حفاظت کہ جب تک تفتیش نہ کی جائے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے یہاں کی اونچی دوکانیں بدنام تھیں کہ ان دکانوں کا پکوان پھیکا ہوتا ہے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ دوکانوں کا کلچر بھی بدل گیا ہے اور اب دوکان جتنی اونچی ہوتی ہے اس کا پکوان اتنا میٹھا ہوتا ہے۔ بالکل دسترخوان پر پیش کئے جانے والے شاہی ٹکڑوں کی طرح۔ ہم سے متعلق ایک شکایت یہ بھی عام تھی کہ ہمارے یہاں حسن کی صحیح قدر افزائی نہیں ہوتی ہے۔ اب ہم لوگ بھی اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور اپنے عوامی طور پر غریب ہونے کے باوجود عالمی پیمانے پر حسن شناسی کی تقاریب منعقد کر رہے ہیں۔ ہماری پُرخلوص کوششیں اس لئے بارآور ہو رہی ہیں کہ چند مہربان اور محب وطن لوگ جو اپنی دولت کا صحیح مصرف جانتے ہیں ہمارے آگے ہیں۔ نیا کلچر اسی طرح رفتہ رفتہ بنتا ہے۔ بہرحال ہم نے طئے کر لیا ہے کہ جب بیرونی مصنوعات (جن میں اسلحہ سرفہرست ہیں اور دوائیں شامل نہیں ہیں) بصد شوق درآمد کی جاسکتی ہیں تو بیرونی کلچر کیوں نہیں منگایا جا سکتا اور اسے تو منگانے کی بھی نہیں صرف اپنانے کی ضرورت ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اب اپنے غریب خانے کو اینگلو اُردو یا انڈو امریکن انسٹی ٹیوٹ بنا کر زندگی گزارتے ہیں، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس ثقافتی انقلاب سے ان کے خلیے اور حلقے میں کیا انقلاب آئے گا۔ مخلوط کلچر کی ترویج و اشاعت کے لئے جب کوئی شخص کمر باندھ لیتا ہے تو پھر یہ کمر عمر بھر بندھی ہی رہتی ہے اس مضمون کی طرح جو شاعر حضرات اپنے شعر میں باندھتے ہیں۔ یہ بندھا ہوا مضمون پھر کسی کے کھولے نہیں کھلتا اور اس وقت تک یوں ہی بندھا رہتا ہے جب تک کہ کوئی اچھا شارح پیدا نہیں ہو جاتا۔ مخلوط کلچر کے فدائی کی کمر کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔

انگلستانی کلچر میں کتوں کا اور امریکی کلچر میں سانپوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہمارے یہاں ان دونوں اشیاء کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ کچھ لوگ کتے پالتے ضرور ہیں لیکن ان کے گھر کے پھاٹک پر ان کے اپنے نام کی تختی کی بجائے اس اعلان کی تختی لگی رہتی ہے کہ کتوں سے ہشیار رہیئے۔ صاحب خانہ جب گھر پر نہیں ہوتے یہ تختی بہت کام آتی ہے۔ اس کے فائدے بہت ہیں جو لوگ زیادہ ذہین ہوتے ہیں کتا نہیں پالتے صرف کتوں سے خبردار رہنے کے اعلان کی تختی اپنے پھاٹک پر ٹانگ دیتے ہیں۔ دوسروں کی ٹانگ کھینچنے اور خود کو کلچر یافتہ بنانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے۔ مخلوط کلچر کے فدائی جلد کمر خمیدہ ہو جاتے ہیں۔ مشرق کی دھوپ پر مغرب کا سایہ بھی "فارن ایڈ" کی تعریف میں آتا ہے۔

■■

وجاہت علی سندیلوی ★

غالب کے شریکِ غالب

یہ مضمون وجاہت علی سندیلوی صاحب مرحوم نے انتقال سے
ایک ماہ قبل شگوفہ میں اشاعت کے لیے ارسال کیا تھا — مدیر

ادھر کئی مہینوں سے مکان کی تلاش میں شہر کے بہت سے حصّوں اور گوشوں کی خاک چھاننے اور کئی محلوں کی آب و ہوا کو نمونے کے طور پر چکھنے کا اتفاق ہوا تو پتا چلا کہ جس طرح ہر گلی کے لیے کم سے کم ایک کم تول پنساری، ایک گھر کا شیر کتا، ایک لڑاکا ساس، ایک بدزبان بہو، ایک نصیحت کرنے والے بزرگ، ایک طفیلی بنی جانے والا رنڈوا اور ماں باپ کی شامتِ اعمال کی صورت میں بہت سے بچوں کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح کسی نہ کسی بھیس میں ایک ماہرِ غالبیات کا ہونا بھی یقینی ہوتا ہے اور بغیر اس کے گرد و پیش کا جغرافیہ کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔

اچھا بھلا ایک مکان مل گیا تھا لیکن ابھی اس میں منجملہ اسبابِ ویرانی، میرا لپٹا ہوا بستر بھی ٹھیک سے کھلنے نہ پایا تھا کہ محلے کے ماہرِ غالبیات نے نہیں معلوم کیسے سونگھ لیا کہ میں سخن فہم نہ سہی غالب کا طرفدار ضرور ہوں اور مجھے اپنی غالبانہ گرفت میں ایک صیدِ زبوں کی طرح جکڑ لیا۔ آتے ہی آتے انھوں نے غالب کے متعلق دو چار حیرت انگیز انکشافات کے بعد مجھے اپنے ڈھب پر لانے کے لیے ایک آدھ ہلکا پھلکا سوال کر دیا۔ اب میری حماقت ملاحظہ ہو کہ میں نے ان کو نرم چارہ سمجھ کر ان پر دو چار منہ مار دیے اور اپنی غالب فہمی کا رعب جمانے کی سعیِ لاحاصل کر بیٹھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں کسی بارود کے ذخیرے کے قریب دیا سلائی جلانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ پھر کیا تھا "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" چیخ کر ماہرِ غالبیات پھٹ پڑے مجھ پر! اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے فنِ غالبیات کی ایسی ایسی توپوں اور آتش فشانوں کے دہانے کھول دیے کہ میں سراسیمہ، مبہوت اور ششدر ہو کر ہمیشہ کے لیے عہد کر بیٹھا کہ آئندہ کسی اجنبی بزرگ کے سامنے مرزا غالب کا نام اپنی زبانِ بے لگام سے ہرگز ہرگز نکلنے نہ دوں گا۔

دوسرے ہی دن سے ماہرِ غالبیات نے "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں" کے عنوان سے میری باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ صبح سویرے میں بستر ہی پر ہوتا کہ وہ "لا لذتِ خوابِ سحر" پڑھتے ہوئے آ پہنچتے اور پہلے غالب کے کچھ انتہائی مشکل اشعار پڑھ کر ان کے معنی مجھ سے پوچھتے گویا میرا آموختہ سنتے اور پھر قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکال پاؤں وہ "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں" فرما کر ان کے معنی اور مطالب خود بیان کرنا شروع کر دیتے اور پھر اپنی

گُل افشانی گفتار سے جدت آفرینی حسنِ تخیل، لطفِ بیان، شکوہ الفاظ نشاط تصور، ندرتِ کلام بلکہ معانی کو بانس اور رائی کو پہاڑ بنانے کے لیے ایسے ایسے گُل کترتے کہ میرے لیے "صاعقہ و شعلہ و سیماب" کا عالم ہو جاتا اور خود ان پر کچھ اس قسم کی ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ؛ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اور پھر نوبت یہاں تک پہونچی کہ میں داڑھی بنا رہا ہوں اور وہ غالب کا نظریہ تصوف سمجھا رہے ہیں۔ میں کنگھا کر رہا ہوں اور وہ آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز، میں مسئلہ ارتقاء کو پروان چڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ میں کپڑے بدل رہا ہوں اور وہ "ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا" پڑھ پڑھ کر اور گا گا کے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگا لگا کر غالب کو ہندوستان کا سب سے پہلا انقلابی شاعر ثابت کر رہے ہیں۔ میں جوتے کی ڈوریاں باندھ رہا ہوں اور وہ "بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے" والے مصرع سے خلائے آسمانی پر اسپٹنک چھوڑ رہے ہیں۔ میں ناشتہ کر رہا ہوں اور وہ "مے سے پیگیں کی نفی نہیں ہے" دہرا دہرا کر غالب کے علم الغذا پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں کہ میرے منہ کا نوالہ حلق میں جانے سے انکار کر بیٹھتا۔ میں دفتر جانے کے لیے سائیکل نکال رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفۂ عمرانیات بیان کر کے اپنا سینہ کوٹ رہے ہیں۔ میں سائیکل پر بیٹھ چکا ہوں اور وہ شام کو دفتر سے میری واپسی پر غالب اور ضبطِ تولید کے موضوع پر اپنے تازہ ترین الہامات کو مجھ پر نازل کرنے کی دھمکیاں دے دے کر اپنے سر کے رہے سہے بال بھی نوچے ڈال رہے ہیں۔

شام کو ظہور پذیر ہوتے تو پہلے غالب اور دوسرے شعراء کا موازنہ شروع کر دیتے اور غالب کے منہ لگنے والے دیگر تمام شعراء کو گردن زدنی قرار دے کر بھی جب تسلی نہ ہوتی تو غالب کے مختلف شارحین کا پہلے سرکس پھر کشتی شروع کرا دیتے اور کافی دھر پٹخ کے بعد جب ہر شارح کافی پست ہو چکتا تو خود بھی اکھاڑے میں کود پڑتے اور فرداً فرداً ہر شارح کو پچھاڑتے اور پھر ہر شعر کے متعلق اپنی ایک انوکھی، اچھوتی اور عجوبۂ روزگار شرح کا آغاز کر دیتے جس کا انجام غالباً اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میں اپنے ہوش و حواس کی قید و بند سے نجات پا کر وہاں نہ پہونچ جاتا جہاں سے خود مجھ کو میری خبر نہ آتی، یعنی بالکل ہی بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر نہ جاتا۔

میں اکثر خواب میں دیکھتا کہ حضرت غالب اپنا دیوان بغل میں دبائے بے تحاشا چیختے ہوئے بھاگ رہے ہیں "بچاؤ! بچاؤ! مجھے میرے شارحین اور ماہرین سے بچاؤ" اور ان کے پیچھے شارحین، ماہرین اور پرستاروں کا ایک غول بیابانی ان کا تعاقب کر رہا ہے جس کی قیادت ایک ڈنڈا لیے میرے محلے کے ماہر غالبیات کر رہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی ایک زنجیر میں باندھے گھسیٹ رہے ہیں۔

کئی دفعہ تکلف برطرف کر کے ان کی منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، داڑھی میں ہاتھ دیا، کان پکڑ کر اٹھا بیٹھا کہ اب اس خطا کار کا قصور معاف کر کے اسے بخش دیجیے۔ کئی مرتبہ گڑگڑا کر حرفِ مطلب یوں زبان پر لایا "اے ماہر غالبیات آپ کو آپ کے حضرت غالب مبارک! مجھ مغلوب کو میرے ہی حال پر چھوڑ دیجیے تو آپ کی غالبیت میں کون سا بٹہ لگ جائے گا؟ میں ایک گدائے بے نوا ہوں، احمق، جاہل اور بے سمجھ ہوں میرے جیسے ذرۂ ناچیز کو غالب جیسے آفتابِ عالم تاب سے کیا نسبت؟ میں حضرت غالب کا صرف اس قدر

کہتا رہا ہوں کہ عالمِ طفولیت میں ایک مولوی صاحب نے اسکول میں کورس کی کتاب سے ان کی چند غزلیں زبردستی پڑھا دی تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے قسم لے لیجیے جو میں نے انھیں ہاتھ بھی لگایا ہو اور ہاتھ لگاتا بھی خاک۔ ہاتھ آئیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے! غالب کوئی کیا میری سات پشتیں بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ میں نہ انھیں سمجھا ہوں نہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ آپ بے کار میرے ہوش و حواس پر چاند ماری گویا بنجر زمین میں تخم ریزی اور آبیاری کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا اور میرے بیوی اور بچے آپ کو اور مرزا غالب کو کوستے پھریں گے۔"

لیکن ماہر غالبیات بھلا کب ماننے والے تھے؟ میرے اظہارِ بے چارگی سے ان کی ہمہ دانی میں اور بھی چار چاند لگ جاتے اور فخر و تمکنت سے ان کے گلے کی رگیں پہلے سے بھی زیادہ پھولنے لگتیں۔ ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے؟ سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا، دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں! اے دریغا وہ رندِ شاہد باز!" اور یہ فرمانے کے بعد وہ غالب کے متعلق اپنی تحقیق اور دریافت کی گولہ باری مجھ پر کچھ اور تیز کر دیتے مجھے بھی اگر اونگھتا یا حواس باختہ دیکھتے تو چوکنا کرنے کے لیے مجھ پر دو چار انتہائی زلزلہ خیز سوالات داغ دیتے۔ "غالب کے نظریۂ فلکیات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کے ماتحت مہ نخشب کے ساتھ دستِ قضا نے کیا برتاؤ کیا تھا؟" "غالب نے قدرتی مناظر سے جو نفسیاتی موشگافیاں کی ہیں اس سے ان کے تحت الشعور کی کس الجھن کا پتہ چلتا ہے؟" "غالب کے سماجی شعور میں سیاسی اور اقتصادی بلوغت کب اور کیسے پیدا ہوئی؟" وغیرہ وغیرہ۔ میں بھلا ان سوالات کا جواب کیا دیتا؟ مجبوراً ماہر غالبیات کی طمانیتِ قلب کے لیے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیتا اور ان کی خواہش کے مطابق انھیں اپنے حیرت زدہ ہونے کا پورا پورا یقین دلا دیتا لیکن دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر میں اپنی نفسیاتی الجھن کو کام میں لاتے ہوئے اپنا وزنی قلمدان ماہر غالبیات کی کھوپڑی پر پوری قوت سے پٹخ دوں تو ان پر فلکیات کے کتنے طبق روشن ہو جائیں گے اور میرے سماجی شعور میں کیسی بلوغت پیدا ہو جائے گی؟

بس کیا عرض کیا جائے کہ کس طرح عاجز اور پریشان کر رکھا تھا ان ماہر غالبیات نے؟ ان سے جان چھڑانے کے لیے بیسیوں ترکیبیں کیں۔ محلے کے بااثر لوگوں کا دباؤ ڈلوایا۔ گمنام خطوط لکھے۔ ایک انسپکٹر پولیس سے ان کے خلاف کوئی فرضی مقدمہ چلا دینے کی فرمائش کی۔ بیماری کا ڈھونگ بنایا۔ بہرے بنے (تو التفات دونا ہو گیا۔) دوستوں کے گھر جا کر پناہ لی۔ گھر کے دروازے بند کرائے۔ نوکر کو ہدایت کی ہر چند کہیں کہ "ہے نہیں ہے"! لیکن اجی توبہ کیجیے — اہلِ تدبیر کی درماندگیاں۔ ماہر غالبیات مجھے نہ پاتے تو گھنٹوں غالب کا کوئی شعر اور اس سے متعلق ایک نئی داستانِ ہوش ربا اپنے اوپر طاری کیے ہوئے میرے دروازے کے سامنے گلی میں ٹہلا کرتے اور جب تک مجھے گھر جاتے یا گھر سے نکلتے گرفتار کر کے مجھ پر یہ شعر صادق نہ کر دیتے دم ہی نہ لیتے۔ ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ÷ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ان حالات میں اسے چاہے میری بدذوقی کہیے چاہے اقدامِ قتل سے گریز کہ جیسے ہی مجھے ایک دوسرا مکان ملا جو اگرچہ میرے پہلے مکان کا صرف نصف بہتر معلوم ہوتا، میں رسیاں تڑا کر بھاگا۔ ماہر غالبیات سے میں نے کہہ دیا کہ [illegible] چھوڑ رہا ہوں اور وہ مجھے آبدیدہ ہو کر رخصت کرنے آئے تو بڑے رقت انگیز لہجے میں فرمایا "آپ غالب [illegible] سمجھے ہیں [illegible] اور اگر میں" شرم تم کو مگر نہیں آتی" [illegible] چھپا اور غلطی سے تانگے والا اس کا [illegible] آپ کو سمجھ کر فوراً

تانگا ہانک نہ دیتا تو یقیناً ماہر غالبیات مجھے ایک فی البدیہہ الوداعی جلاب دیے بغیر ہرگز باز نہ آتے۔

تانگے کے تعاقب میں کافی دور تک ماہر غالبیات کچھ اس قسم کی حماقتیں چیخ چیخ کر اگلتے رہے "اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے۔ اے عندلیب چل کر چلے دن بہار کے۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور لیکن میں اپنی آزادی کا پرسرورؔ مژدہ لیے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں، گنگناتا اپنا تانگا بھگواتا رہا۔

مکان تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنا ایک مکان سے انتہائی بدحواسی اور سراسیمگی سے باندھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے لوٹ کر لائے ہوئے مال غنیمت کا لطف آجاتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرا وہ آئینہ جس کو میں نے یقیناً کسی بہت محفوظ جگہ بڑی احتیاط سے چھپا دیا تھا انتھک تلاش اور جستجو کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتا لیکن میری بیوی کا وہ جوتا جس کے متعلق یقین کامل تھا کہ دو مہینے ہوئے کھو چکا ہے لہٰذا اس کے جوڑی دار کو میں نے چلتے چلاتے ماہر غالبیات کے مکان کی طرف اچھال دیا تھا، ایک ڈبے سے بے ساختہ نکل پڑا ہے۔

میں اپنے سامان سے کشتی لڑلڑ کر اسی قسم کے حوادث سے دوچار تھا کہ دفعتاً کسی نے باہر کا دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت سچ پوچھیے تو ملک الموت سے بھی ملنے کی فرصت نہ تھی لیکن طوعاً و کرہاً لاحول پڑھتا اور جل جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کہتا ہوا لپکا اور دروازہ کھول دیا۔

داڑھی بڑھائے اور صرف بنیائن اور تہمد پہنے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے سلام علیکم کہتے ہوئے بیٹھکے میں داخل ہو کر آیا۔ کرسی گھسیٹی اور اس پر اکڑوں بیٹھ گئے اور کچھ جھوم کر یہ شعر کیا گویا کہ اس کا کارٹون بنا کر پیش کیا ؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے؟ ۞ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

مجھے مجبوراً "وعلیکم السلام" کہہ کر ایک سونڈھے پر پناہ لینی پڑی۔

"اس مکان کے نئے کرائے دار آپ ہی ہیں؟ ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے؟ مطلب یہ کہ ؏

"آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے!"

مرزا غالب کا نابڑ توڑ کلام سننے کے بعد غصّے اور خوف سے میرے کان بلا ارادہ خود بخود ہلنے لگے اور بڑی مشکل سے میرے منہ سے فقط ایک "جی" نکل سکی۔

"ابھی ابھی مرزا کمن صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف لانے سے قبل آپ دلی میں رہتے تھے ؏

کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے"

"جی ہاں دو تین ماہ دلّی بھی رہا ہوں۔ لیکن میرے خلاف اس تحقیقات کا مطلب؟"

مسکرا کر چیخ اٹھے ؎

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ ۞ اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

میں نے ہمت کر کے دبی زبان سے عرض کیا۔ "آپ نے ابھی تک مجھے خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کا شرف نہیں بخشا۔"

اپنی داڑھی کھینچتے ہوئے بولے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ÷ آستانۂ یار سے اٹھ جائیں کیا ؟

اب میری بدحواسی مکمل ہو چکی تھی ÷ "جی۔آپ؟ حضرت غالب؟"

"جی ہاں حضرت غالب! ع ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا۔ میں اس وقت صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا تھا کہ آپ دہلی میں رہے تو شہنشاہ اقلیم سخن حضرت غالب سے تو ضرور ہی واقف ہوں گے؟"

مجھے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی اور میں نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "جی ہاں سنا ہے کہ اس نام کے ایک شاعر کا مزار دہلی میں ہے۔"

اپنا سر پیٹتے ہوئے بولے "معاف کیجئے گا آپ نے بھی بے رحمی کی حد کر دی! سنا ہے کہ اس نام کے ایک شاعر کا مزار دہلی میں ہے! ع جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

اجی آپ کو یہ کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ آپ خود اس بارگاہ فلک منزلت پر ع

رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

سر عقیدت خم کر کے کم سے کم شرفِ قدم بوسی تو حاصل ہی کر لیتے۔ وہی مثل بارہ برس دہلی میں رہے اور ع

سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر، بھاڑ ہی جھونکتے رہے؟"

میں نے بھی کچھ اس جھلاہٹ سے جواب دیا جیسے اگر میرا بس چلتا تو غالب کو ان کی خواہش کے مطابق 'غرق دریا' ہو جانے دیتا اور کچھ نہیں تو دہلی میں ان کا مزار ہرگز بننے نہ دیتا۔" میں مزار پر حاضر بھی ہوتا تو مرحوم قبر کے اندر تھے میں شرفِ قدم بوسی کیسے حاصل کر پاتا؟"

کلیجہ پکڑ کے بولے ہے ہے! ع

رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں ÷ تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

اجی آپ کو کیا خبر ع

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے ÷ نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

میں خاموش رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے "کم سے کم ازراہ تعزیت آپ کو مرحوم کے بیوی بچوں کے پاس تو چلا ہی جانا چاہیے تھا ع بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور"

"اب کسی روز آپ کو ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔"

میرے جواب کو سنا ان سنا کر کے اچانک بڑبڑائے اور میری کتابوں کے گٹھر پر جو ابھی میز پر بڑی بے ترتیبی سے رکھا ہوا تھا جھپٹے اور سب سے اوپر کی کتاب جو اتفاق سے دیوانِ غالب تھا اٹھا کر جوش بہار جلوہ بنتے ہوئے بولے یہ صحیفہ آپ کو کہاں سے دستیاب ہوا۔ مدت کے بعد آج ایک مسلم دیوانِ غالب ہاتھ آیا ہے جو کسی طرح بھی مجھے مرغِ بسمل سے کم عزیز نہیں ع کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور!

"بازار سے"

"بازار سے؟" ع اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا! کیا بازار میں اس قسم کا بھی کلام بکتا ہے؟

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سترہ اٹھارہ سال ہوئے میرے پاس بھی ایک نسخہ دیوانِ غالب تھا جو میرے ایک رشتے کے نانا میرے گھر پر بھول گئے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک روز برخوردار مجنوں کی والدہ محترمہ آگ جلانے بیٹھیں ع

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔

تو اس صحیفۂ نادر کو کچھ اس طرح پھاڑا کہ بس ع دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی۔ یعنی دیوان کا قریب قریب ہر مصرعِ اولیٰ اپنے مصرعِ ثانی سے جدا ہو گیا۔ وہ تو کہیے کہ بروقت میری نظر پڑ گئی ورنہ ع آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ کا مضمون درپیش آجاتا۔ کیوں صاحب یہ لفظ خوش قسمتی پر آپ چونکے کیوں؟ جی ہاں ع اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔"

میں نے اپنا پیٹ پکڑتے اور منہ بناتے ہوئے عرض کیا "اس وقت پیٹ میں کچھ درد ہو رہا ہے اگر یہ گفتگو آپ کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیں۔"

نادر شاہی حکم دیا ؎

دردمنت کشِ دوا نہ ہوا ؛ کام گر رُک گیا روانہ ہوا

جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اب جو والدہ محترمہ مطلب یہ کہ مجنوں کی ماں ان اوراقِ پریشاں کو جو کسی عاشق کا گریباں ہو چکے تھے جوڑنے بیٹھیں تو ان کو کچھ ایسا جوڑ دیا کہ فنِ غالبیات میں ایک نئے دور کا آغاز بلکہ اضافہ ہو گیا، اور جس پر ناچیز اپنی عمرِ عزیز کے بارہ سال صرف کر چکا ہے اور اب بہت جلد دیوانِ غالب حسبِ ترتیب کاذب منظرِ عام پر جلوہ افروز ہو کر مشتاقانِ غالب اور [illegible] ان کا ذب کے لیے ہمہ تن نگاہ اور فردوسِ گوش بننے والا ہے محض مصرعوں کی تھوڑی سی الٹ پلٹ سے کلام کی لطافت، ظرافت اور صداقت نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے اور یقیناً اب مرزا غالب کو یہ فرمانے کا ع

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔ کاش کہ وہ خود اس کو دیکھتے تو عش عش کر کے کفِ افسوس ملتے کہ ہائے خود مجھے یہ کیوں نہ سوجھی اور بلا امداد کاذب میں نے یہ پہیلی کیوں نہ بوجھی۔

سلسلۂ کلام یک طرفہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ دیکھیے کس طرح دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے؟ ایک روز مجنوں اسکول سے روتا ہوا لوٹا تو اس نے اپنے نانا [illegible] مرزا غالب سے شکایت کی کہ اس کو ماسٹر نے بے قصور مارا ہے۔ مرزا غالب کا افراسیابی خون جوش میں آ گیا اور وہ ماسٹر کے "پرزے اڑانے" اسکول پہونچے تو عین موقع واردات پر شاہد مل گیا۔ اس نے انھیں سمجھایا کہ ماسٹر نے برخوردار مجنوں کو جو سزا دی وہ بالکل حق بجانب تھی کیوں کہ یہ صاحبزادے کوئلے سے اسکول کی دیوار خراب کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے ؎

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی ؛ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ذرا خدا لگتی کہیے گا کہ اب شعر کی اخلاقی حیثیت کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے؟ عاشق کی عزتِ نفس کے متعلق غالب نے بہت سے اشعار کہے ہیں لیکن خدارا اس شعر کے تیور ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفتر میں کلرک ہو جانے کے بعد

عاشق کے لہجے میں کیسی خود اعتمادی آجاتی ہے؟

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ۔ وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

حضرت کاذب اب کسی خودکار مشین کی طرح چالو ہوگئے تھے۔

ملاحظہ ہو کہ قرض کی شراب پی کر مرزا غالب ساقی کی دھمکی سے بچنے کے لیے اُس کو کس طرح پچکارتے ہیں۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ۔ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوا نہیں

"کون کہتا ہے کہ مرزا غالب عاقبت نااندیش تھے۔ دیکھئے کس طرح اپنے چھوٹے بھائی اسد کو مشورہ لینے کے بہانے نصیحت کرتے ہیں۔

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر ۔ فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد

اور غالباً یہ آپ کے مذاق کا شعر ہو۔ ذرا معشوق کی جلد بازی تو ملاحظہ فرمائیے ۔

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا ۔ جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اور ملاحظہ ہو کہ غالب کی بے اثر آہ کو میں نے کیسا بے اثر بنا دیا ہے ۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ۔ مست کب بند قبا باندھتے ہیں

اور معشوق کی تیز رفتاری تو غالباً اس سے بہتر کبھی بیان ہی نہیں کی جاسکتی۔

تھا ان سے وہ غیرت صرصر کھلا ۔ کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا

اور غالباً یہ شعر تو داد سے مستغنی ہے۔ ساقی اس سے بڑھ کر مرزا صاحب پر اور احسان ہی کیا کرسکتا تھا ۔

ہیں اور خط وصل خدا سازیات ہے ۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور پھر معشوق کے بڑھاپے کی جب وہ کئی بچوں کی ماں بن کر اپنے شوہر یعنی غالب کے پرانے رقیب کے ساتھ بہ خیریت ہے، قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے کیا خوب تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے ۔

یقین ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے ۔ رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے

دیکھئے یہ ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد! یہ سب مصرعے حضرت غالب ہی کے ہیں اور میں نے ان میں ہرگز کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں کی ہے صرف ذرا چابک دستی سے ان کی ترتیب میں تھوڑی سی الٹ پلٹ کر دی ہے۔"

میں نقش حیرت بنا یہ سب سن رہا تھا لیکن نہیں معلوم میرے ہاتھوں میں ایک خاص تشنجی کیفیت کیوں پیدا ہو رہی تھی۔

حضرت کاذب کی روانی طبع کچھ اور تیز ہو چلی " دیکھئے مرزا صاحب معشوق کو بہلا پھسلا کر اسے چھپ چھپ کر ملنے کے کیسے کیسے مقامات بتاتے ہیں؟ گرگ باراں دیدہ تھے کہ باتیں ۔

مجھ کو بھی پوچھتے ہو تو کیا گناہ ہو ۔ مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اور جگر تھام کر ذرا یہ شعر تو ملاحظہ فرمائیے کیا تیکھا طنز ہے ان لوگوں پر جو اپنی ریاکاری سے جنت خرید لینے پر تلے ہوئے ہیں ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور یہ شعر تو حاصل دیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے شعر سُن لیجئے پھر میں اس کے موضوع پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں ؎

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے ؛ سوجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کر یوں

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیے ؎

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں ؛ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

اس کے بعد کیا ہوا ؟ تفصیلات برطرف ایک تہمد اور بنیائن کی کچھ دھجیاں میرے حصے میں آئیں اور میرا پُرانا رفیق دیوان غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا فی الحال میں اسپتال میں ہوں اور بیوی بچے ہوٹل میں۔ الاٹمنٹ افسر کو درخواست دے رکھی ہے کہ مجھے کوئی ایسا مکان الاٹ کیجئے جس میں چاہے روشن دان تا بدان بلکہ چھتیں اور دیواریں تک نہ ہوں لیکن اس سے ایک میل کے نظر میں کوئی ماہر غالبیات نہ پایا جاتا ہو۔ ابھی تک تو ایسا کوئی مکان مل نہیں پایا ہے۔ □□

اقبال شانہ
(حقل ۔ سعودی عرب)

ہیپی نیو ایر

آگیا طوفان ہیپی نیو ایئر — بہہ گیا سامان ہیپی نیو ایئر
لُٹ گیا سب کچھ خدا کا شکر ہے — بچ گئی ہے جان ہیپی نیو ایئر
بہتے بہتے کہہ رہے ہیں چیخ کر — ہائے میری جان! ہیپی نیو ایئر
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ بس! — ہوگئیں آسان ہیپی نیو ایئر
بھاگ سکتے بھی نہیں گھر چھوڑ کر — آ گئے مہمان ہیپی نیو ایئر
کھا گئے ہیں دیش کے نیتا مگر — سارا ہندوستان ہیپی نیو ایئر
میں سناتا ہوں ترنم میں غزل — صاف کرلو کان ہیپی نیو ایئر
عقد ثانی کا ارادہ ہے میاں — دِل میں ہے ارمان ہیپی نیو ایئر

ہو مبارک سال یہ شانہ ترا
چھپ گیا دیوان ہیپی نیو ایر

ڈش اینٹینا

ہوا میں اُڑ رہا ڈِش اینٹینا — عجوبہ بن گیا ڈش اینٹینا
نظر "ڈش اینٹینی" سے مِلا کر — دِوانہ ہوگیا ڈش اینٹینا
ترا "سیٹلائیٹ" سے ہے دوستانہ — نئے "چینل" دکھا ڈش اینٹینا
جو "چینل لاک سسٹم" توڑ ڈالے — وہ "ڈی کو ڈر" بتا ڈش اینٹینا
پکائیں کون سی 'ڈش' تیرے اندر — ذرا کچھ تو بتا ڈش اینٹینا
بجائے چھت کے میں نے گھر پہ اپنے — اُلٹ کر رکھ دیا ڈش اینٹینا
کبھی چھتری لگے چنگیز خاں کی — کبھی یہ ڈھال سا ڈش اینٹینا
میں باہر سو رہا ہوں احتیاطاً — ہے چھت پر ڈولتا ڈش اینٹینا

چلی آندھی ہوا مرحوم شانہ
ہمارا دِلربا ڈش اینٹینا

اسرار جامعی
دہلی

اُردو کا تحفہ

گھر پہ آکر بیٹوں نے اک ماہرِ تحقیق کے — سیکڑوں اُردو کتابوں کا دیا تحفہ مجھے
وہ یہ بولے یہ کتابیں "پتا" کی یادگار — جن کو پڑھتے تھے سُناتے تھے وہ سب کو بارہا
بعد ان کے میرے گھر میں قدرداں کوئی نہیں — اس زباں کا جاننے والا وہاں کوئی نہیں
اس لیے تحفہ میں اس کو دے دیا ہوں آپ کو — شانتی مل جائے اس سے تاکہ میرے باپ کو
جب ملا یہ نادر و نایاب تحفہ خوش ہوا — علم و فن کا اک خزانہ مفت مجھ کو مل گیا
اس خوشی سے جس قدر مسرور تھا مغرور تھا — ساتھ ہی اک غم تھا جس سے دل بھی میرا چور تھا

قدر اُردو کی تھی پہلے جس کے گھر میں اس قدر
ہوگئی اُردو بچاری اب وہیں سے "گھر بدر"

محبوب مانجھومی
بلاسپور

غزلیں

دعویٔ شعر و سخن کرتے ہیں بڑھ بڑھ کے بہت — کیا کہا ہے یہ سمجھتے نہیں ہنڈرڈ پرسنٹ
میرؔ و غالبؔ پہ وہ تنقید کیا کرتے ہیں — میرؔ و غالبؔ کو جو پڑھتے نہیں ہنڈرڈ پرسنٹ
خود کو الفاظ کا بھنڈار سمجھتے ہیں، مگر — چُست الفاظ برتتے نہیں ہنڈرڈ پرسنٹ
دعویٰ کرتے ہیں بہت اُردو پہ جاں دینے کا — سچ تو یہ ہے کبھی مرتے نہیں ہنڈرڈ پرسنٹ
شانہ کرتے نہیں خود گیسوئے اُردو میں کبھی — چانس اوروں کو بھی دیتے نہیں ہنڈرڈ پرسنٹ

کیا سناؤں میں غزل اپنی جنابِ محبوبؔ
سامعین جم کے جو سنتے نہیں ہنڈرڈ پرسنٹ

ڈاکٹر ہادی منزہ
نرمل

★

یہاں ہر ایک رشوت خور ہے منتری سے سنتری تک — جسے دیکھو اُسے وہ چور ہے منتری سے سنتری تک
ہزاروں لاکھوں ڈالر کے یہاں ہر روز گھپلے ہیں — مٹانے اپنی غربت زور ہے منتری سے سنتری تک
کبھی بوفر کبھی ہرشد دِ وادوں میں پڑا سنسد — وطن کو بیچنے پر غور ہے منتری سے سنتری تک
مخالف کی زباں کیا گردنیں بھی کاٹ دیتا ہے — حکومت کرنے کا یہ طور ہے منتری سے سنتری تک
نچائے انگلیوں پر آج وہ جنتا، بچاری کو — سنبھالا ہاتھ میں جو ڈور ہے منتری سے سنتری تک
زباں کو دی گئی طاقت بصیرت چھین کر اس کی — سماعت بھی بہت کمزور ہے منتری سے سنتری تک
شکنجے میں یہاں قانون کی پھنسنے لگا ہے اب — نحوست کی گھٹا گھن گھور ہے منتری سے سنتری تک

تقدس ہے منزہؔ ملک میں قانون کا باقی
سزا مجرم کو ہوگی شور ہے منتری سے سنتری تک

خادم رسول عینی
(ممبئی)

ڈالر

سب کو تحویل میں رکھتا ہے یہ تنہا ڈالر
کس قدر ماہر و شاطر ہے نہتا ڈالر

ین و تم دیکھ کے ڈیلر کی جبیں پر ہے شکن
اپنی قیمت میں یہ رہتا نہیں یکجا ڈالر

ابھی ہے پینتیس تو چھتیس ہوا منٹوں میں
بینک ڈیلر کا یہ ٹینشن ہے سراپا ڈالر

ین ہو، رینڈ ہو یا پاؤنڈ کہ لیرا شیلنگ
سب کے بھاؤ کو یہ کرتا ہے نکما ڈالر

سارے سکوں کا یہ ڈالر ہوا انٹرونشن
اور روپے کا اٹھاتا ہے جنازہ ڈالر

آج امریکہ بڑے فخر سے کہتا ہوگا
میری شوکت کو بڑھاتا ہے یہ میرا ڈالر

سیف گارڈ اپنی تو عظمت کا ہمیشہ رکھنا
کہہ رہا ہے ہمیں عینی یہ نرالا ڈالر

ٹی ین سمانز
(ہریانہ)

میرے شہر میں

کوئی نیتا الٹس نہ آیا ہو یہ چل کر دیکھ لوں
بڑھ رہا ہے کیوں بھرشٹاچار میرے شہر میں

... آ رہے ہیں اس طرف
رلیوں کا جیسے ہو تیوہار میرے شہر میں

زیر بیلن ہیں سبھی جتنے بھی شوہر ہیں یہاں
بیویوں کی چلتی ہے سرکار میرے شہر میں

کوئی جھگڑا ہے نہ چوری ہے نہ رشوت ہے یہاں
ہے بہت مایوس تھانیدار میرے شہر میں

میڈیکل میں لڑکیوں نے جب سے ایڈمیشن لیا
ڈاکٹر سب پڑ گئے بیمار میرے شہر میں

ایم پی اپنا جیتنے پہ پر لگا کر اڑ گیا
اس کا اب ہوتا نہیں دیدار میرے شہر میں

اسلحہ بارود گانجہ چرس اور افیون کا
چل رہا ہے انٹرنیشنل بیوپار میرے شہر میں

شیخ و پنڈت مر رہے ہیں ایک ہی معشوق پر
ہے یہ کیسا اک انوکھا پیار میرے شہر میں

جب سے دارو پہ لگی ہیں دیکھیے پابندیاں
ہر شرابی ہے خجل اور خوار میرے شہر میں

ایک پیسہ بھی یہ حضرت دان میں دیتے نہیں
راز سے کنجوس ہیں زردار میرے شہر میں

اسمٰعیل آزر
(کٹک)

دانت

سمجھو نہ سبھی دانت چبانے کے لیے ہیں
ایسے بھی ہیں ان میں جو دکھانے کے لیے ہیں

شفاف و چمک دار دکھانے کے لیے ہیں
جو میلے کچیلے ہیں چھپانے کے لیے ہیں

کچھ کھانے چبانے میں ہی مصرف نہیں ان کا
سردی کے زمانے میں بجانے کے لیے ہیں

★

غزلیں

ظفر کمالی
سیوان

نچھاور ہو گئی تجھ پہ جوانی
تجھے قربان جاؤں اے گرانی

اڑانا مضحکہ دن رات دیں کا
بنی روشن خیالی کی نشانی

محبت، آدمیت، خاکساری
بھلا کس دور کی ہے یہ کہانی

مہذب ہیں ہمیں دیکھا تو بولے
ارے توبہ، یہ ٹوپی شیروانی!

یہاں لنگڑے ہمیں چلنا سکھائیں
یہاں گونگے سنائیں لن ترانی

قیامت ہے ادب ہو بے ادب کا
جو ناقدرے ہیں ان کی قدر دانی

سفیدی سر پہ غالب آگئی ہے
مگر باقی ہے دل میں چھیڑ خانی

شریفوں کی نہ کیوں پگڑی اچھالیں
یہی پیشہ ہو جن کا خاندانی

مرے حصے میں تخت اوروں کو تختہ
اسی کا نام ہے اب حکمرانی

جو کھل کھیلے وہی چالاک ٹھہرے
برتتے رہ گئے ہم ساودھانی

"گھٹالستان" کے ہم رہنے والے
گھٹالا ہے ہماری زندگانی

انھیں بھی آج کل دنیا نے گھیرا
کہا کرتے تھے جو دنیا ہے فانی

لگی ہے جن کو مصنوعی بتیسی
ہوا اُن کو بھی شوقِ عقدِ ثانی

وہ بھارت کو مہا بھارت ہی سمجھے
عجب ہے عقل ان کی زعفرانی

نہ ہوتے ہم اگر پاتال باسی
تو کیوں سنتے بھلا آکاش وانی

نہ مل پائی ابھی عزت کی روٹی
جہاں میں دربدر کی خاک چھانی

اُسی کے ہو گئے وارے نیارے
ہوا جو خادمِ راحت رسانی

ظفر اک بات ہے غزلوں میں تیری
نہیں ہیں اُن میں اگر گنجِ معانی

غافل قریشی
گلبرگہ

●

کون آتا ہے سراپے میں شرابیں لے کر
صورتِ حسن میں دھوکے کی نقابیں لے کر

باپ بیٹے کے نئے داؤ سے واقف ہی نہیں
سینما جانے لگا ہے وہ کتابیں لے کر

چھت پہ بے وجہ کبھی چاند نکل آتا ہے
عید ہوتی ہے کسی کی تو حجابیں[1] لے کر

دونوں ہاتھوں میں ہے رعشہ تو زباں پر لکنت
شیخ جی کیا کریں اس سن میں شبابیں[2] لے کر

ڈھول میں مل گئے سب ڈھول چٹلنے والے
خیمہ گرتا ہے تو گرتا ہے طنابیں لے کر

اُسترے ہی سے یہاں سر نہیں مُنڈاتا غافل
جوتے ٹھگتے ہیں تو ٹھگتے ہیں جرابیں لے کر

[1] حجاب کی جمع [2] شباب کی جمع

مسیح انجم

[رپورتاژ]

پانچ گھنٹے گلبرگہ یونیورسٹی میں

سالِ اُنیس سو چھیانوے بالکل ہی بے کیف و افسردہ اپنے آخری ایام پورے کررہا تھا کہ اس کی رخصتی سے عین ایک ہفتہ قبل ڈاکٹر مصطفےٰ کمال مدیر "شگوفہ" نے یہ مژدہ جاں فزا سنایا کہ ۳۰؍ ڈسمبر کو گلبرگہ چلنا ہے۔ تفصیلات دریافت کیں تو پہلی قسط میں ایک "ٹرنکنگ" قسم کے جواب سے سرفراز فرمایا کہ ایک مضمون اور ایک خاکہ اپنے ساتھ رکھ لو، تمہاری جان کے لیے یہ بہت کافی ہے۔ آج کل وہ قسطوں میں بات کرنے لگے ہیں کیوں کہ کام کچھ زیادہ ہیں، اور فرصت ذرا کم۔ یوں بھی، دوستی جب پکی و پختہ ہوجاتی ہے، اور فریقین ایک دوسرے کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہوجاتے ہیں تو چھیڑخانی کے لیے قسطوں میں بات کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ چنانچہ گفتگو کی پہلی قسط کے اختتام پر میں صرف اتنا سمجھ سکا کہ گلبرگہ میں ایک عدد کوئی ادبی جلسہ ہے جہاں مجھے ایک مضمون اور ایک خاکہ پڑھنا ہوگا۔ گفتگو کی دوسری قسط کے آغاز پر تھوڑی سی کھوج کی کہ آخر چلنا کس طرح ہے اور ساتھ میں کون کون ہوں گے؟ تو میرے اشتیاق کو بھانپ کر دو تین مبہم قسم کے اشارے اور عنایت فرمائے کہ کار سے چلنا ہے (اگر آگئی تو!) ساتھ میں طالب خوندمیری اور حمایت اللہ کے علاوہ وہ خود بھی ہوں گے۔ جب مصطفےٰ کمال نے ان دو شرفا کے نام لیے تو میں نے تیسری قسط کے طور پر مزید کچھ کریدنا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ جب سفر میں طالب خوندمیری، حمایت اللہ اور مصطفےٰ کمال ہوتے ہیں تو میں اپنے طور پر ہر چیز سے بے نیاز ہوکر گھر سے نکل پڑتا ہوں۔

پروگرام کے مطابق مجھے ٹھیک چھ بجے طالب خوندمیری کے مکان پر رہنا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے وارننگ دے رکھی تھی کہ "اویر" کے وہ ذمہ دار نہ ہوں گے۔ البتہ "سویر" ہر ایک کے حق میں مفید ہوگی۔ میری کمزوری یہ ہے کہ جب کبھی سفر درپیش ہوتا ہے تو اس رات میری نیند بالکل ہوا ہوجاتی ہے، اور سارے معمولات درہم برہم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو حوائج ضروری کے نظام میں خلل پڑجاتا ہے۔ چنانچہ ۲۹؍ ڈسمبر کی شب یہی کچھ ہوا۔ بہ ظاہر تو بستر پر میری آنکھیں بند تھیں۔ لیکن مختلف وسوسے تھے کہ دل کے دروازے پر دستک دیے جارہے تھے۔ یعنی یہ کہ اچانک آنکھ لگ گئی تو کیا ہوگا؟ حوائج ضروری سے کہاں فارغ ہونا پڑے گا؟ راستے میں کار خراب ہوجائے تو کیا ہوگا؟ کھانسی اور نزلے کا حملہ ہو تو کون پرسان حال ہوگا؟ انہیں وسوسوں میں کروٹ پر کروٹ بدلتے بدلتے ۲۹ اور ۳۰ ڈسمبر کی درمیانی شب کٹ گئی۔

۳۰ ڈسمبر کی صبح ہر چیز معمول کے مطابق تھی لیکن غیر معمولی طور پر سردی اپنے شباب پر تھی۔ اعلان سی تھی کہ "میں ہوں!"۔ کہر سے جاری تھی، جس کی موجودگی میں نظروں کا آر پار ہونا اور دس قدم والی چیز کو دیکھنا ناممکن سا ہوگیا تھا۔ جب میں

اپنے لڑکے ریاض الدین کی موٹر سیکل کے پیچھے بیٹھ کر دفعلی پورم کے مضافات سے گزر کر طالب کے گھر پہنچا تو صبح کے ٹھیک چھ بج رہے تھے۔ میں نے کال بل کا بٹن دبایا تو کچھ ہی دیر میں طالب نمودار ہوئے۔ وہ کنٹوپ اور جرسی نما اوورکوٹ میں یوں ملبوس تھے جیسے وہ کوئی اسکیمو ہوں۔ انھوں نے دروازہ کھولنے کو تو کھول دیا لیکن جھانکا کچھ اس احتیاط سے کہ ایک قدم بھی باہر نکالیں تو جاڑا انہیں لپک لے گا۔ ان کے اس عمل پر مجھے ہنسی پڑا تو طالب نے جگالی کرتے ہوئے فرمایا "آپ کا کیا ہے آپ تو گاؤں کی مخلوق ہیں۔ نہ سردی کا اثر ہوتا ہے اور نہ گرمی کا!" میں نے ان کی غیرت کو للکارا تو تھوڑی سی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولے "جناب دو دن سے بخار میں تپ رہا ہوں! ابھی ابھی کچھ لائٹ قسم کا ناشتہ کرکے ایک خوراک دوا لی ہے۔ اور دو خوراک دوا ساتھ ہے۔ اب آپ آگئے کچھ فرمائیں گے تو ایک ڈوز آپ کو بھی دیدوں گا!"

ان کے جملے سے محظوظ ہوتے ہوئے میں نے کہا کہ "خیر یہ باتیں تو راستے میں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بتائیے کہ کار کہاں ہے"؟

تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولے "میں بھی اسی سوچ میں ہوں کہ کار ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ چلیے، چل کر پتہ لگاتے ہیں!"

کار کو ٹھیک چھ بجے طالب خوندمیری کے گھر پر رہنا چاہیے تھا۔ چھ سے ساڑھے چھ بج گئے، کار کا پتہ نہ تھا۔ طالب جھنجھلا رہے تھے اور ہر گزرنے والی کار کو گلبرگہ کی کار سمجھ کر لپک رہے تھے اور پھر کھسیانے ہو کر کھمبے کو نوچنے کی بجائے خاکسار کی چٹکیاں لے رہے تھے۔ جب ساڑھے چھ سے پونے سات بج گئے تو گلبرگہ والی کار نمودار ہوئی۔ طالب بغیر کسی "اخیر و تامل" کے کار میں گھس گئے اور میں نے بھی ان کی تقلید میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہاں سے آگے چل کر ہمیں ڈاکٹر مصطفٰے کمال کو لینا تھا۔ وہ سڑک کے ایک کنارے اپنے بغلوں میں ہاتھ دبائے (سردی کی وجہ سے) یوں کھڑے تھے جیسے لانچنگ پیڈ پر کھڑے راکٹ کے داغے جانے کے منتظر ہوں۔ طالب پر نظر پڑتے ہی وہ فوراً اپنا بیاگ اٹھائے کار میں آ بیٹھے اور پھر اپنے مزاج کے ناساز ہونے کی خبر یوں سنائی جیسے وہ کوئی خوشخبری ہو۔ محلہ دبیر پورہ سے کار ماں صاحب ٹینک کی طرف چل پڑی، جہاں سے حمایت بھائی کو لینا تھا۔ حمایت اللہ اپنے فلیٹ پر پوری تیاری کے ساتھ مستعد کھڑے تھے۔ جب وہ کار کے قریب آئے تو انہیں پانی یاد آیا۔ طالب سے پوچھا "پانی کی بوتل ساتھ ہے؟" جب طالب نے "ہاں" میں جواب دیا تو وہ اپنی بوتل سے لیس بیگ کو بغل میں دابے اپنے آپ کو بڑی جتن و احتیاط کے ساتھ تہہ کیا۔ اور پھر کار میں سما گئے۔ (بلند قامت والوں کو ایسی ہی دشواریاں پیش آتی رہتی ہیں۔)

پروگرام کے مطابق ہم سب کو نو بجے ظہیر آباد پہنچ کر کسی ہوٹل میں ناشتہ کرکے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے گلبرگہ یونیورسٹی پہنچنا تھا لیکن جب ہم حیدر آباد سے نکلے تو پون گھنٹہ لیٹ تھے۔ کار کے ڈرائیور کا نام سدو تھا۔ وہ اپنی غلطی کو نبھانے کے لیے بار بار تسلی دیے جا رہا تھا کہ ٹھیک مقررہ وقت پر گلبرگہ پہنچا دے گا۔ مگر صرف بولنے سے کیا ہوتا ہے؟ ٹریفک اور سڑکوں سے بھی تو اجازت لینی پڑتی ہے۔ طالب اور حمایت اللہ گھڑی گھڑی، گھڑی دیکھتے ہوئے امریکہ کے حوالے سے وقفہ وقفہ سے امریکہ کی ٹریفک اور وہاں کی سڑکوں کی تعریف کیے جا رہے تھے۔ (کیوں کہ حالیہ عرصہ میں وہ امریکہ ہو آئے تھے) اس تعریف کا مقصد دھونس جمانا نہیں، بلکہ ڈرائیور کا دل جلانا اور اس کا خون کھولانا تھا۔ لیکن ڈرائیور تو اپنے حساب سے گاڑی چلا رہا تھا۔ جب ہم ظہیر آباد پہنچے تو پورا ایک گھنٹہ لیٹ تھے۔ مگر ڈرائیور تو یہی کہے جا رہے تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر گلبرگہ پہنچا دے گا۔ ہم ناشتے کے لیے ایک ہوٹل کا رخ کر ہی رہے تھے کہ ہمارے شاعر دوست مسعود عابد اپنے بھاری بھرکم قہقہے کے ساتھ یوں نمودار ہوئے، جیسے وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے ہوں! انھوں نے ایک "پوش ہوٹل" کی نشاندہی کی۔ جب ہم ہوٹل میں داخل

ہوئے تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر "یہ لوش ہوٹل" ہے تو پھر گھٹیا ہوٹل کسے کہیں گے۔ ہوٹل میں "دو سنسے" زہر مار کرکے باہر نکلنے تک آرکیٹکٹ طالب اپنی سائٹ (SITE) اور "اسپاٹ" کا معائنہ کر کے واپس آ چکے تھے۔ جہاں ان کے ڈیزائن اور پلان کے مطابق ایک مسجد زیرِ تعمیر تھی۔ چونکہ طالب اپنے مزاج کی ناسازی کے مطابق سازگار ناشتہ اپنے گھر پر ہی کر چکے تھے۔ اس لیے وہ "گیس اور غذا" کے استعمال سے بال بال بچ گئے۔ وہاں سے ہماری کار گلبرگہ کے لیے چل پڑی۔ جب کار ظہیر آباد کی سرحد پار کر چکی تو مجھے اچانک فکر تونسوی مرحوم اور ہمارے مزاح نگار دوست مجتبیٰ حسین یاد آگئے جو کوئی تیرہ، چودہ برس پہلے "یاد سلیمان خطیب" پروگرام میں حصّہ لینے کے لیے اسی روٹ سے اسی طرح کار میں سفر کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ وقت رات کا تھا اور آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ نہایت ہی پُر کیف منظر تھا۔ ایک جگہ مجتبیٰ حسین نے کار رکوائی اور "چھوٹی ضرورت" سے فارغ ہونے کے بعد بڑے ہی خوشگوار موڈ میں ستاروں سے مخاطب ہو کر کہا تھا "اے ستارو! تم گواہ رہنا، اور اے مورخ تو بھی یاد رکھنا کہ اس روٹ سے برصغیر کا عظیم طنز نگار فکر تونسوی گزر رہا ہے"، فکر تونسوی نے ہنس کر کہا تھا "اے مجتبیٰ! تو یہ بہکی بہکی باتیں کیا کر رہا ہے۔ خیر یہ تارے تو رہیں گے ہی لیکن تو مورخ کہاں سے لائے گا؟" مجتبیٰ حسین نے میری طرف اشارہ کر کے کہا تھا "یہ جو ہمارے ساتھ مسیح انجم ہے، وہ مورخ ہی تو ہے۔!"

فکر تونسوی نے پوچھا تھا "کیا اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟" مجتبیٰ نے کہا تھا "فکر بھیا! یہ آپ جانیے، اور آپ کا مورخ جانے! میرا کام تھا، نشاندہی کر دینا سو میں نے کر دی۔!" . . . .

میرے دماغ میں یہ خیالات کار کی رفتار سے کہیں زیادہ گردش کر رہے تھے اور ادھر ڈرائیور سدو کار کی رفتار کو بڑھائے جا رہا تھا۔ چنانچہ طالب نے ایک بار ڈرائیور سے پوچھ ہی لیا "کار کی اسپیڈ کیا ہے؟"

سدو نے جواب دیا "اسّی کلومیٹر!"

طالب کو پھر امریکہ یاد آگیا۔ بولے "امریکہ میں تو کاریں ۱۲۰ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلائی جاتی ہیں!" یہ سنتے ہی حمایت بھائی کو بھی امریکہ یاد آگیا اور پھر دونوں مِل کر وہاں کے مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال جو سنانا شروع کیا تو پتہ ہی نہ چلا کہ کار کب گلبرگہ یونیورسٹی کے کیمپس میں داخل ہوئی۔ جب ہماری کار یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے پہنچی تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ اور ایک گھنٹہ لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ہمارے چہروں پر بارہ بج رہے تھے لیکن ہم لوگوں کو دیکھتے ہی منتظرین کے چہرے کھل اُٹھے۔ سب سے پہلے محترمہ لئیق خدیجہ صدر شعبہ اردو نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ ان کے ساتھ جناب افتخار الدین لکچرر اور عبدالرب استاد لکچرر (پتہ نہیں "استاد" ان کا تخلص ہے یا عرفیت؟) اور کچھ طلباء پیش پیش تھے جن کے چہروں سے خیر مقدم و خوش آمدید کے آثار نمایاں تھے۔ سب سے پہلے ہمیں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤز میں لے جایا گیا۔ تاکہ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوں۔ گیسٹ ہاوز واقعی گیسٹ ہاوز تھا۔ "گھوسٹ ہاوز" نہ تھا۔ صاف ستھرے ہوادار اور کشادہ بیڈ روم۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ پلنگ اور بستر کے تو کیا کہنے! صرف کمر سیدھی کرنا چاہیں تو نیند آجائے۔ مگر وہاں کمر سیدھی کرنے کے لیے مہلت ہی کہاں تھی؟ اجازت تھی تو بس اتنی کہ منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا سا بن سنور لیں تاکہ حلیے سے حواس باختہ مخلوق نہ معلوم ہوں، بلکہ مزاح نگار معلوم ہوں۔ جب مصطفےٰ کمال، حمایت اللہ، طالب خوندمیری اور یہ خاکسار محترمہ لئیق خدیجہ کے ہمراہ مزاحیہ (د.ب)

اجلاس میں حصہ لینے کے لیے پہنچے تو ہال پورا سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج کو نہایت ہی سلیقے سے سجایا گیا تھا ہال میں ایک طرف کرسیوں پر خواتین لکچررس، طالبات اور معزز خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ تو دوسری طرف لکچررس، پروفیسرس دانشور اور طلباء نہایت ہی پروقار انداز میں بیٹھے کارروائی کے آغاز کے منتظر تھے۔ ہال میں کئی ایسی خاتون لکچررس اور طالبات بھی تھیں جن کی مادری زبان کنڑی ہونے کے باوجود محض اردو زبان سے دلچسپی کی بنا پر مضامین و شاعری کو سننے کے لیے تشریف لائی تھیں۔ جو بات سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تھی، وہ طلباء و طالبات کا ڈسپلین تھا جو آج کل اکثر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عنقا ہے۔ گلبرگہ یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے نظم و ضبط اور ان کے نشست و برخاست کو دیکھ کر یہ سوچنا پڑا کہ ..... ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

مزاحیہ ادبی اجلاس، کو دو سیشن میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے سیشن کو مضامین، شاعری اور مہمانان خصوصی کی تقاریر کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ جب کہ دوسرا سیشن کالج کے مجلہ "ارمغان" کی رسم رونمائی اور اس میں شائع مضامین پر تبصرے کے لیے وقف تھا۔ ان دو سیشنوں کے درمیان آدھے گھنٹے کا وقفہ رکھا گیا تھا۔ جو لنچ کے لیے وقف تھا۔

ادبی اجلاس کے پہلے سیشن کی صدارت محترمہ لئیق خدیجہ صدر شعبہ اردو نے فرمائی۔ اس اجلاس کے کنوینر جناب حمید سہروردی لکچرر اردو تھے۔ اور کمپیرنگ کے فرائض جناب محمد افتخار الدین لکچرر کے ذمہ تھے۔ وہ اپنی عمر اور وضع قطع سے لکچرر کم اور اسٹوڈنٹ زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے برجستہ جملوں اور پُرمزاح لطیفوں سے ادبی اجلاس کو ابتداء سے اختتام تک خوشگوار بنائے رکھا۔ سب سے پہلے مسٹر ایم گوئندان فینانس آفیسر نے (جو خود بھی مہمان خصوصی تھے) مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر مصطفےٰ کمال، طالب خوندمیری، [illegible] اور دو مقامی مزاح نگار جناب مختار احمد منو اور امجد علی فیض اور پھر راقم الحروف کی گلپوشی کی اور قیمتی و خوبصورت شالیں تحفے میں دیں۔ تحفوں کی پیش کشی اور گلپوشی کے لیے جو طریقہ کار اختراع کیا گیا تھا، وہ بڑا ہی متاثر کن تھا گویا تھا، فلمی ہیروز کے بسٹ ایکٹرس ایوارڈز کی پیش کشی کی کوئی سالانہ تقریب ہو۔ جب گلپوشی والا رنگارنگ فریضہ اختتام کو پہنچا تو ادبی اجلاس کے کمپیئر جناب محمد افتخار الدین لکچرر نے مہمان خصوصی مسٹر ایم گوئندان کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ مسٹر گوئندان نے اپنی مادری زبان کنڑی میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ ہمیں کنڑی تو نہیں آتی۔ لہٰذا ہم ان کے تاثرات کو پڑھنے کے لیے ان کے چہرے کو مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ دورانِ تقریر انھوں نے دو تین بار "اردو، اردو" کہا۔ تو سامعین نے تالیاں بجائیں۔ اس سے ہماری سمجھ میں یہ آیا کہ موصوف نے شاید، اردو زبان کی مٹھاس اور اس کی مقبولیت کے بارے میں ہی کچھ فرمایا ہوگا۔ ان کی مختصر و مفید تقریر کے بعد مقامی مزاح نگار جناب امجد علی فیض اور مختار احمد منو نے اپنے مزاحیہ مضامین پیش کیے۔ ان کے مضامین سے اتنا تو اندازہ ہوا کہ گلبرگہ یونیورسٹی کے طلباء و طالبات میں حس مزاح ہے اور وہ مناسب موقع پر ہنسنا اور داد دینا بھی جانتے ہیں۔ مقامی مزاح نگاروں کے بعد کمپیئر نے میرے نام کا اعلان کیا اور صدر جلسہ کی فرمائش پر مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک مضمون کے علاوہ چند لطیفے اور نمائش بھی سناؤں (یہ میرے لیے "لوچ" نہیں "تھری پچ" تھا)۔

جب میں مائیک پر پہنچا اور ہال میں ایک سرسری نظر ڈالی تو سامعین میں پروفیسر راہی قریشی، پروفیسر قیوم صادق، جناب وہاب عندلیب، افسانہ نگار حمید سہروردی (لکچرر) "قلم بولتا ہے" کے شاعر وقار ریاض، ممتاز شاعر

محب کوثر اور بہت سارے دانشور موجود تھے۔ چنانچہ میں نے لطیفوں کو حیدرآباد کے مزاح کا دولت رام کے لیے اُٹھا رکھا، اور ایک مضمون سنانے کے بعد خیرات ندیم مرحوم پر لکھا تازہ خاکہ سنایا، جسے سامعین نے بے حد پسند فرمایا اور داد سے نوازا۔ میرے بعد طالب خوندمیری کی باری آئی۔ انھوں نے چند قطعات اور اپنی تازہ نظم "اسکوٹر" سنا کر خوب داد پائی۔ ان کے بعد دکنی کے ممتاز شاعر حمایت اللہ کی باری آئی۔ انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں چند چوکے اور پھر اپنی مشہور پیروڈی "سانٹوں پر زبان رکھ دی" سنا کر پورے ہال کو قہقہہ زار بنا دیا۔ حمایت اللہ داد سے لدے پھندے رخصت ہوئے تو کمپیئر نے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ کمال صاحب نے جب اپنی تقریر شروع کی تو ہال میں سناٹا سا چھا گیا۔ حالانکہ مزاحیہ مضامین اور مزاحیہ شاعری کے بعد "تقریر کا چلنا" بڑا دشوار سا ہوتا ہے لیکن مصطفےٰ کمال نے یہ مشکل کام بھی کر دکھایا اور اپنی فکر انگیز تقریر کے ذریعہ طلباء و طالبات اور دیگر سامعین کو پندرہ بیس منٹ تک بالکل باندھے رکھا ... طنز و مزاح ان کے لیے ایک ایسا موضوع ہے جس پر وہ جب چاہے اور جتنا چاہے نہ صرف بول سکتے ہیں بلکہ تنازعات ... کر سکتے ہیں۔ انھوں نے گلبرگہ کے ادبی ماحول سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اور پھر طنز و مزاح کے حوالے سے گلبرگہ کے فرزندان سلیمان خطیب، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کی گراں قدر خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے، طنز و مزاح کے فروغ میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے تاریخ ساز کارناموں کو سراہا۔ میں نے دیکھا کہ بعض طالبات کمال صاحب کی تقریر کے اقتباسات نوٹ کر رہی تھیں۔ کمال صاحب محفل کو گرما کر رخصت ہوئے تو صدارتی کلمات سے نوازنے کے لیے صدر جلسہ محترمہ لئیق خدیجہ مائک پر تشریف لائیں۔ ان کا مختصر سا تعارف یہ ہے کہ وہ لئیق صلاح کے نام سے مزاح لکھا کرتی ہیں۔ وہ نہایت ہی رکھ رکھاؤ والی خاتون ہیں... ... دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی ہیں۔ وہ جب اپنے سر پر ساڑی کا پلو اوڑھ لیتی ہیں تو بالکل ملانی سی دکھائی دیتی ... گلبرگہ میں طنز و مزاح کو مقبول کرنے اور اس کی ادبی حیثیت کو منوانے میں جو وکالت اور پیروی فرمائی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں، وقت کی نزاکت کی مناسبت سے (کیونکہ لنچ کا وقت نکلا جا رہا تھا) اجلاس میں سنائے گئے مضامین اور کلام کی بے حد ستائش کی۔ ریسرچ اسکالر صبیحہ یاسمین کے شکریہ پر اجلاس اول اختتام کو پہنچا۔ ہم لوگ اسٹیج سے اتر ہی رہے تھے کہ طلباء و طالبات کا ایک جھنڈ کا جھنڈ آٹو گراف بکس لیے ہماری طرف بڑھا۔ ہم آٹو گراف بکس سے بچتے بچاتے اور چند ایک پر دستخط کر کے باہر نکلے تو پروفیسر قیوم صادق ملے۔ میں ان سے شخصی طور پر واقف تو نہیں تھا۔ البتہ ان کے نام اور کام سے ضرور واقف تھا۔ انھوں نے اپنی تصنیف "دکنی ادب" عنایت فرمائی اور پھر اپنے افکار عالیہ کا اظہار کرتے ہوئے اس خاکسار کے بارے میں فرمایا کہ "آپ کے مضامین میں وہ مسالہ نہیں ہوتا جو دوسرے مزاح نگاروں کے پاس ہوتا ہے۔ آپ کا مزاح ... حقیقی مزاح ہوتا ہے..."

ہمارے ملنے ملانے میں وقت نکلا جا رہا تھا۔ طلبہ بہت بے چین سے ہو رہے تھے کہ لنچ کے بعد ایک زیرِ تعمیر مسجد کے معائنہ کے لیے جانا تھا۔ اور پھر "مسجد خونی الادہ" کی انتظامی کمیٹی کو بھی مسجد کی توسیع کے ضمن میں کچھ مفید مشورے بھی دینے تھے۔ ہم لوگ فوراً کیمپس میں واقع ڈاکٹر لئیق صلاح کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے جہاں نہایت ہی معقول لنچ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اب ہم لنچ کی ڈشوں کا ذکر کر کے آپ کے منہ میں پانی نہیں لانا چاہتے۔ البتہ اشارتاً اتنا بتلائے دیتے ہیں کہ لنچ کا جو اہتمام کیا گیا تھا وہ کسی حیدرآبادی اوسط گھرانے کے ولیمہ ڈنر یا چوتھی ڈنر سے کچھ کم نہیں تھا۔

لنچ سے فارغ ہو کر نکلے تو اسی ہال میں دوسرا سیشن بالکل تیار تھا۔ ٹکا ٹکایا ہوا۔ اس اجلاس کی کمپیئر اسماء تبسم ریسرچ اسکالر

اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ اور پھر جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ اجلاس دوم کی صدر بھی محترمہ لئیق خدیجہ تھیں۔ ایک ہی دن میں دو مرتبہ صدارت کو نپٹانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن لئیق خدیجہ صاحبہ نے صنف نازک ہونے کے باوجود پانچ گھنٹوں کے اندر "نان اسٹاپ" دو مرتبہ صدارت کو جس انداز سے نپٹایا، وہ ان کے حوصلے و ہمت کی دلیل ہے۔ وہ اس میدان میں کافی منجھ گئی ہیں۔ اللہ کرے "زور صدارت" اور زیادہ!

اجلاس دوم کے مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر قیوم صادق، ڈاکٹر راہی قریشی اور جناب وہاب عندلیب تھے۔ اور مہمان خصوصی جناب طالب خوندمیری کو شعبۂ اردو کے مجلہ "ارمغان" کی رسم اجرا انجام دینا تھا۔ پروفیسر لئیق خدیجہ صاحبہ نے مجھے بتایا کہ طالب خوندمیری کا طنزیہ و مزاحیہ کلام اور مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس پر مجھے مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کا وہ قول یاد آیا جو کتابوں کو نصاب میں شامل کیے جانے کے بارے میں ہے۔ یوسفی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

"اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرانا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیا جائے!"

ہماری رگ ظرافت یہ کہتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے یہ فقرہ نہایت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لکھا ہے کہ اگر ماہرین تعلیم اور ناقدان ادب پڑھ لیں تو طیش میں آکر ان کی تصانیف کو بھی نصاب میں لگا دیں (جس کا کھلا ثبوت یوسفی کے وہ مضامین ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں)۔

ہاں تو بات "ارمغان" کے رسم اجرا کی چل رہی تھی۔ اجلاس دوم کے آغاز پر جناب عبدالرب استاد لکچرر نے حاضرین کا خیر مقدم کیا اور جناب حمید سہروردی لکچرر نے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ انھوں نے ہمارے شاعر دوست ڈاکٹر راہی قریشی کے تعارف میں جب یہ کہا کہ "جس طرح راہی قریشی اپنا ایک ہاتھ ایک بیوی پر اور دوسرا ہاتھ دوسری بیوی پر رکھ کر زندگی کی گاڑی کو لے چل رہے ہیں، بالکل اسی طرح وہ ایک طرف سنجیدہ شاعری اور دوسری طرف مزاحیہ شاعری سے شغل فرما رہے ہیں۔ اور حیرت ہے کہ وہ دونوں میدانوں میں کامیاب بھی ہیں" تو ہال میں قہقہے بلند ہوئے۔ اور خود راہی قریشی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ بہرحال حمید سہروردی نے سنجیدہ اور جدید افسانہ نگار ہونے کے باوجود اپنے پر مزاح فقروں سے مہمانوں کے تعارف میں جان ڈال دی۔ اس کے بعد جناب طالب خوندمیری نے شعبۂ اردو کے دیدہ زیب مجلہ "ارمغان" کی رسم اجرا انجام دی۔ ہال میں تالیاں گونجیں۔ طلباء و طالبات نے طالب خوندمیری سے فرمائش کی کہ وہ اپنا کلام بھی سنائیں تو طالب خوندمیری نے (وہ اپنی بیج دھج میں کالج کے طالب علم ہی لگ رہے تھے۔) اپنا کلام سنایا اور ہمارے لیے یہ کہنے کا موقع فراہم کیا کہ شاعر کو کتنی ہی عجلت اور کتنا ہی اہم کام کیوں نہ ہو وہ اپنا کلام سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طالب اپنا کلام سنا کر اور صدر جلسہ سے اجازت لے کر اسٹیج سے اتر پڑے تو مجلہ میں شامل مضامین پر تبصروں کا دور شروع ہوا جو تبصرہ در تبصرہ کوئی پون گھنٹے تک چلتا رہا۔ پروفیسر راہی قریشی اور جناب وہاب عندلیب نے تبصروں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کامیاب کوشش کی! اس کے بعد لئیق خدیجہ صاحبہ نے صدارتی کلمات سے نوازا۔ مسز رفعت ہاشمی ریسرچ اسکالر نے شکریہ کا خوشگوار فریضہ انجام دیا۔ اسماء بشیر نے اس اجلاس کی نظامت کے فرائض نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اجلاس دوم جب برخواست ہوا تو شام ہونے کو تھی۔ جب ہم لوگوں کو پروفیسر لئیق خدیجہ صدر شعبہ اردو، پروفیسرس، لکچررس اور طلباء و طالبات نے رخصت کیا تو ان کے چہروں پر مسرت و شادمانی کے آثار نمایاں تھے اور صدر شعبہ اردو تو انتہائی مسرور تھیں کیونکہ پروگرام توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ ■

علیم خاں فلکی

(جدہ)

قصہ ناموں کا

دنیا کی آبادی میں جتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ناموں کی قلت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ کوئی نام کہا جائے چار پانچ آدمی پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ پہلے یہ مسئلہ صرف ایشیا میں تھا جس میں ہر گھر میں ایک چیانگ دوسرا یونگ اور تیسری لڑکی چینگ ہوتی تھی۔ کوریا، تھائی لینڈ سے اگر سارے کم اور لی کو نکال دیں تو سارا ملک خالی ہو جائے لیکن اب یہ مسئلہ یورپ تک پھیل گیا ہے۔ ہر بستی میں کئی کئی جان، باب اور مائیک ہونے لگے ہیں وہاں ناموں کی اس قلت کی وجہ جانور بھی بتائے جاتے ہیں۔ یوں کہ لوگ پالنے سے پہلے ہی نام بک کر لیتے ہیں۔ اس لیے وہاں اب آپ کسی جان یا ٹام کا پتہ پوچھیں تو الٹا سوال ہوگا "یہ آدمی ہے یا کتا"۔ ہندو پاک میں بھی یہی مسئلہ ہے لیکن لوگوں نے کچھ نہ کچھ حل ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ حیدرآباد میں جہاں ہر بستی میں دو قاسم بھائی تین غفور صاحبان، چار جہانگیر اور تھوک کے حساب سے احمد، رحیم، کریم، انور پاشا وغیرہ مل جاتے ہیں، وہاں نانی، دادی یا پھر محلے کے شریر بزرگوں کی طرف سے دیئے گئے القابات کے ذریعے آسانی سے پہچان ہو جاتی ہے۔ جیسے گورے وحید بھائی، پٹا خالد، انور تالو (گنجے) قاسم پیٹ (بڑے پیٹ والے) پاکستان میں ذرا نوعیت مختلف ہے۔ خوب صورت مرکب ناموں کا ایسا سلسلہ چل پڑا ہے کہ بعض اوقات محترم ہیں یا محترمہ، پتہ ہی نہیں چلتا مثلاً شمیم کوثر، حیات گل، منور سلیم، فردوس نعیم۔ اب عورتوں نے اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھنا شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ دشواری پٹھانوں کو بھی درپیش ہے کہ تذکیر و تانیث کا فرق کیسے کیا جائے۔ عربوں میں بھی یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ اکثر بیٹا بھی محمد، باپ بھی محمد اور دادا بھی محمد ملتے ہیں مگر چونکہ انھیں عربی آتی ہے اس لیے فرشتوں کو آسانی سے سمجھا لیتے ہوں گے۔ لیکن عورتوں کو بڑی دشواری ہوتی ہے چونکہ ان کے ہاں شوہر کو بھی نام لے کر پکارتے ہیں اس لیے جب خاندان کے مختلف افراد کے سامنے یہ شوہر کو "یا محمد" "یا صالح" کہہ کر پکارتی ہیں تو دو

چار مرد ضرور اٹھ کھڑے ہوتے ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے ہمارے ہاں ابھی تک عورتیں شوہر کا نام لینے میں شرم محسوس کرتی ہیں۔ "اجی" "جناب" وغیرہ سے کام چلاتی ہیں بلکہ دیہاتوں میں تو کوئی رحمت اللہ کی بیوی ہو تو نماز میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ بھی نہیں کہتی بلکہ السلام علیکم منے کے ابا کہتی ہے۔ البتہ اب تھوڑی زمانہ نے کچھ تبدیلیاں دکھائی ہیں۔ عورتوں میں اب منی بی بی، صبیحہ، عطیہ، شہناز کی جگہ شگفتہ، کہکشاں عنبر، گل افشاں وغیرہ نے لی ہے مگر اس میں خامی صرف یہ ہے کہ سننے والے اگر انھوں نے محترمہ کو دیکھا نہیں ہے تو بڑی حسین خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب سامنا ہوتا ہے تو شگفتہ کی شگفتگی اور کہکشاں کی کہکشانی ایسی بجلی گراتی ہے کہ پھر ساری زندگی خوش فہمیوں سے توبہ کر لیتے ہیں۔

خیر یہ سارا مسئلہ تو خاندانی اور محلہ داری تھا۔ اب کے اس مسئلے کے جو سیاسی قومی اور بین الاقوامی طور پر اثرات پڑنے لگے ہیں۔ ان کا ...... اندازہ شہاب الدین صاحب کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اب تک زیادہ سے زیادہ محلے کے پولس تھانوں تک یہ غلطی محدود تھی کہ ایک مجرم کے ہم نامی کو پکڑ لاتے حتیٰ کہ جرم بھی قبول کروا لیتے لیکن صحافی اور لیڈر بھی اس مسئلے کا شکار ہو چکے ہیں۔ جب خبر آئی کہ شہاب الدین نامی لیڈر نے اپنے آپ کو پولس کے حوالے کر دیا۔ اخبارات نے خبر کے نیچے جس شہاب الدین کی بھی تصویر میسر آئی چھاپ دی جتنے دستیاب شہاب الدین تھے ان کے گھروں پر فون اور ملاقاتیوں کا تانتا سا لگ گیا۔ غلط فہمی یہاں تک بڑھی کہ جس شہاب الدین کا بھی جو مخالف گروہ تھا اس نے شام تک جلسہ طلب کر لیا اور اپنی شرافت اور نیک نامی کے ثبوت میں شہاب الدین کی گرفتاری کی رپورٹ پیش کر دی۔

ہمیں پتہ نہیں بنگلہ دیش میں اس مسئلے کو کیسے حل کرتے ہیں۔ وہاں تو اس کثرت سے عبدالسلام اور نذرالاسلام ہیں کہ ایک کے نام وارنٹ نکلے تو ہر محلے میں پچاس گرفتار ہو جائیں

جدہ آ کر تھوڑی سی صورتِ حال بدلی ہے اب القابات کی جگہ لوگوں نے اپنے پیشوں کو اپنی کنیت بنا لیا ہے جس سے عام نام ہونے کے باوجود پہچان آسان ہو گئی ہے۔ جیسے: "انور نا ہد ٹریکیٹر" "کریم جیمائی" "اطہر سعودیہ" اور "اطہر اردو نیوز"۔

بہرحال ناموں کی بڑھتی ہوئی قلت کی وجہ سے ہمیں ابن انشا کے مشورے میں معقولیت نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو فیملی پلاننگ سختی سے نافذ کی جائے

●●

صفیہ شاہین (حیدرآباد)

★

چوتھی سیٹ

آج کی مہذب دنیا میں سفر کرنے والوں نے یوں تو ہوائی جہاز کو بھی عام سواری بنالیا ہے مگر ایک اوسط شہری کے لیے آج بھی بس سے بہتر کوئی سستی سواری نہیں۔

ہمارے شہر حیدرآباد کی آر ٹی سی بسوں میں پہلی تین نشستیں خواتین کے لیے محفوظ کرنے کا رواج رہا ہے ادھر کچھ سال سے پہلی سیٹ معذوروں کے لیے وقف کی جانے لگی ہے۔ معذوروں والی سیٹ کبھی ڈرائیور کی سیٹ سے قریب ہوتی ہے تو کبھی بائیں جانب والی لائن میں یا کبھی ڈرائیور کے پیچھے۔ مختصر یہ کہ ارباب آر ٹی سی کی غیر مستقل مزاجی کا شکار مرد و خواتین بنتے ہیں جو چوتھی سیٹ کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کبھی یہ خواتین کے لیے مختص ہوتی ہے تو مرد اٹھنے سے انکار کرتے ہیں اور کبھی خواتین ان سیٹوں پر قبضہ کرلیتی ہیں تو مرد حضرات خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں کبھی معمولی سی ٹکرار بھی ہوتی ہے کبھی اچھی خاصی جنگ۔ جنگ کے بعد ہار جیت کا فیصلہ ہوکر رہتا ہے۔ چاہے اس چوتھی سیٹ پر کوئی بھی بیٹھے وہ اوروں کی طرح اونگھتا یا اُکتاتا نہیں یا کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتا کم ہی دکھائی دیتا ہے کیوں کہ بس کے اندر کی دنیا پُر رونق اور دلفریب ہوتی ہے۔ وہ اپنے آگے والوں پر نظر بھی رکھ سکتا ہے اور پیچھے والوں کے عمل ردعمل کی بھی اسے پوری خبر ہوتی ہے۔

اس نفسا نفسی کے زمانے میں زندگی کی تیز رفتاری کے ساتھ بس بھی چلتی ہے اور اس میں سوار مسافرین بھی۔ ایک مرتبہ بس چلتے چلتے رُکی اور سفید پوش ٹکٹ چیکر داخل ہوئے۔ چوتھی سیٹ پر بیٹھی خاتون نے جب بس پاس ٹکٹ چیکر کو دکھایا تو اس نے لمبی سی 'ہوں' کہہ کر پاس اپنے قبضہ میں کرلیا اور دوسری جانب چلا گیا۔ خاتون بوکھلائی اور پوچھا آخر اس پاس میں کیا خرابی ہے اس پر ٹکٹ چیکر نے ہنس کر کہا محترمہ کیا چوتھی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کسی مرد کی فوٹو لگانی ضروری ہے۔؟ کیا مطلب۔ خاتون جھلائی تو ٹکٹ چیکر نے پاس دکھایا جس پر مرد کی فوٹو لگی تھی۔ اوہ — ! — اس نے لمبا سانس لیا وہ ابھی پاس کی تجدید کروا کر آرہی تھی اپنا بھی۔ اپنے شوہر کا بھی — اور جلدی میں اُس نے اپنے شوہر کا پاس حوالے کر دیا تھا۔ بدحواسی سے بچاؤ کا دوسرے دفتر جانے والے بابو نے اچھا طریقہ اپنایا اور اُنھوں نے جیب سے مہینہ بھر کی ٹکٹوں کا پلندہ نکال کر ٹکٹ چیکر کے حوالے کر دیا کہ اس میں سے آج کا ٹکٹ ڈھونڈ لیجیے اور اگر پہلی کو نکلنے والی لاٹری میں اس ٹکٹ پر انعام نکل جائے تو آپ رکھ لیں۔

مگر خدارا مجھے جلدی جانے دیں میرا آج انٹرویو/انسپکشن ہے۔ یہ تو رہی دفتروں میں کام کرنے والوں کی بات مگر جب گرہست خواتین چوتھی سیٹ پر بیٹھی ہوں تو وہ ذاتی مسائل کو سلجھانے میں اتنی مصروف گفتگو ہوتی ہیں کہ انھیں اپنے صاحبزادے کے کھڑکی سے سر نکالنے کی خبر تک نہیں ہوتی۔ آپ سوچتے ہوں گے ایک ماں اور وہ بھی ہندوستانی ماں اتنی لاپرواہ نہیں ہوسکتی۔ ذرا ٹھہر نہ بلوائے آپ خود چل کر دیکھ لیں دراصل وہ چوتھی سیٹ پر بیٹھ کر آزادی کا صحیح لطف اٹھاتی ہیں۔ دراصل ان کے اطراف ہی خواتین ہوتی ہیں تو بھی انھیں کسی بی جمالو کا خطرہ نہیں۔ کوئی بھی اتنی بہری نہیں ہے بھروسہ نہیں کہ ان کی باتیں سننے اور مخالفین کے کان بھرے۔ پیچھے مرد حضرات جو کھڑے ہیں وہ بھی گھر کی طرح یہاں حکم نہیں چلاتے بلکہ بہت ہمدردانہ اور مہربان لہجہ میں کہتے ہیں اماں ذرا بچہ کو گود میں لے لو کچل جائے گا۔ اور گود میں موجود صاحبزادے جب گھٹن سے رونے لگتے ہیں تو کنڈکٹر کی "ٹکٹ ٹکٹ" کے ساتھ چٹکیوں کی صدا سن کر چٹکیوں میں بہل جاتے ہیں۔

اکثر بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ بس اسٹاپ پر رکتے ہی کوئی فیملی جو مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہوتی ہے فاتحانہ انداز میں داخل ہو جاتی ہے۔ مرد پچھلے دروازے سے اور عورتیں اور بچے سامنے والے سے مگر بس کے اندر پہنچتے ہی فاصلہ کا دوریاں حائل ہو جاتی ہیں ادھر خواتین ہچکولے کھاتیں سامنے کی بھیڑ میں گم اُدھر مرد آخری سیٹ سے ہوتا ہوا چوتھی سیٹ تک پہنچنے کی تگ و دو میں حیراں۔ ایسے میں کنڈکٹر اگر خواتین سے ٹکٹ مانگ لے تو وہ پیچھے پیچھے کہہ کر پیچھا چھڑا لیتی ہیں اور کنڈکٹر مردانے کی نشان دہی میں شاید ہی کامیاب ہوتا ہوگا۔

کبھی کبھی تو کنڈکٹر عدالت کے ملازمین کی طرح، مردوں کے نام زنانے سے پوچھ کر باآواز بلند انھیں طلب کرتا ہے اور کنڈکٹر کی تلاش نامہ بر کی تلاش بن جاتی ہے۔ نامہ بر نہ پہنچ سکا تو نامہ بر ذحمہ گر بن جائے کیوں کہ خواتین کے پاس پیسے برآمد نہیں ہوتے۔ باپ ساتھ ہو تو بیٹی پیسے ساتھ نہیں رکھتی۔ بہو سفر کر رہی ہو تو سسر کے پاس پیسوں کا اختیار رہے۔ بہنا ہو تو بھائی۔ بیوی ہو تو شوہر۔ بہرحال کنڈکٹر کے لیے ضروری ہے کہ ان رشتہ داروں کو ڈھونڈ نکالے بلکہ اس کی دریافت مہاجر کیمپوں میں سے رشتہ داروں کی برآمدگی اور ... پُرخلوص اور دیانت داری سے پُر ہوتی ہے۔ کنڈکٹر کے لیے سب سے سہولت بخش سیٹ چوتھی سیٹ ہے اِدھر زنانے سے اشارہ ہوا اُدھر مردانے سے ٹکٹ cash.

کالجوں سے ہو کر گزرنے والی بسوں میں طلباء و طالبات کا ہجوم رہتا ہے اور چوتھی سیٹ پر لڑکے غاصبانہ قبضہ جمائے نظر آتے ہیں تاکہ سامنے کی سیٹوں پر نظر التفات پڑتی رہے اور جملہ بازی بھی ہوتی رہے۔ اکثر لڑکیاں سنی ان سنی کر جاتی ہیں مگر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک لڑکے نے جب بار بار ہیلو سنیئے تو سہی۔ ہیلو سنیئے تو سہی کہا تو ایک لڑکی نے جو ذرا تیز تھی پلٹ کر پوچھا فرمایئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ! لڑکا اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہنے لگا "کیا آپ بھی اسی بس سے سفر کر رہی ہیں ۔ ؟"

سوال و جواب اور بذلہ سنجی کے لیے مسافر ہی نہیں کنڈکٹر ڈرائیور بھی تیار رہتے ہیں۔ جب جب آصف نگر سے بس گزرتی اور قبرستان سے ہو کر گزرتی ہے ڈرائیور بڑی بوڑھیوں کو اترنے کے لیے تیار دیکھ کر کہتا ہے "قبرستان — کون کون جانے والا ہے جلدی جاؤ"۔

بوڑھی خواتین اترتے اترتے کہتی ہیں "الو بادا۔ ابھی تو پیروں سے جارئیں۔ وقت آیا تو کوئی اٹھانے کو آنا کیا ہے"۔

ایک مرتبہ ہمارا حیدرآباد سے باہر کسی ضلع پر جانا ہوا۔ ہم چوتھی سیٹ پر بیٹھے تھے کہ بس کسی ریلوے گیٹ پر رکی۔ ٹرین کے گزرنے تک بس کا رکنا لازمی تھا اس لیے کچھ مسافر بس سے اتر گئے کچھ نے قریب موجود ہوٹلوں کی راہ لی۔ سخت گرمی

کے دن تھے اس لیے آئس کریم اور کول ڈرنکس کے ہاکرس بھی بس کے قریب آگئے۔ ابھی ہم نے لمکا، تھمس اَپ اور پیپسی میں سے کونسی لی جائے فیصلہ بھی نہ کیا تھا کہ سامنے سے لسّی اور چھاچ لیے سر پر گھڑے رکھی عورتیں بھی نمودار ہوئیں۔ پیسوں کی بھی بچت اور صحت کی بھی سلامتی اس شدت کی گرمی میں معدے کو ناراض نہ کرنے چھاچ سے بہتر کیا چیز ہو سکتی تھی سو ہم نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھان لی۔ اتنے میں بڑی مندناتی سامنے سے گزر گئی اب کچھ لمحوں میں لائن صاف ہوتے ہی بس چلنے والی تھی چھاچ والی عورت جو تین روپے میں ایک گلاس چھاچ دے رہی تھی اور جس سے ایک گلاس لینے ہم نے پانچ کا نوٹ بھی نکال رکھا تھا دوسری جانب چلی گئی۔ اور پچھلے حصّہ سے کوئی دوسری عورت سامنے آئی جس کے ہاتھ میں بھی گلاس تھا اور سر پہ گھڑا۔ دودھیا رنگ کا سیال گھڑے میں صاف نظر آرہا تھا ہم نے اس عورت کی موجودگی کو غنیمت جانا اور ایک گلاس کی قیمت پوچھی۔ جواب ملا۔ ایک روپیہ — ارے واہ آج تو بچت ہی بچت ہے ہم نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا اور اپنی دانش مندی اور دیر سے فیصلہ کرنے کی عادت پر مُسکرانے لگے جلدی جلدی پانچ کا نوٹ واپس پرس میں رکھا اور ایک کا سکّہ نکالا ہی تھا کہ بس جھٹکے سے چل پڑی ہم اپنی خشک زبان پر پیاس لیے پپڑی جمے ہونٹوں پر اسے پھیرا اور دیر تک گم صم رہنے کے بعد محسوس کیا کہ بازو والی مسافر خاتون ہمیں سر سے پیر تک گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ آخر ہم سے رہا نہ گیا اور پوچھ لیا۔ کہ وہ ہمیں اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں وہ جیسے گفتگو کے آغاز کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں فوراً سوال کر دیا آپ حیدرآبادی ہیں نا — ہم نے کہا بلاشبہ صد فیصد۔ ہم ہی نہیں ہمارے آباء واجداد بھی حیدرآباد کے ہی رہنے والے تھے۔ اس جواب سے مطمئن ہوتے ہوئے گویا انھوں نے جلدی جلدی کچھ نتیجے اخذ کیے اور اگلا سوال کیا کہ آپ ابھی جو مشروب پینا چاہتی تھیں جانتی ہیں وہ کیا تھا۔ ہم نے جلدی سے کہا۔ چھاچ — تب جیسے انھوں نے چین کی سانس لی اور کہا جی نہیں۔ وہ چھاچ نہیں۔ سیندھی تھی سیندھی!

چوتھی سیٹ پر بیٹھنے سے یہ ہوا کہ اگلی سیٹوں کے لیے لائی گئی چھاچ ہم تک نہ پہنچ پائی اور چلتی بس نے ہمیں اُس مشروب سے بچالیا جو پچھلی سیٹوں کے لیے لائی گئی تھی۔ □□

اقبال ہاشمی

سردیوں کے باوجود

ایک بھی روزہ نہ رکھا سردیوں کے باوجود
گرم تھی معدے کی دنیا سردیوں کے باوجود

مرغ و ماہی کے اثر کو توڑنے کے واسطے
تھا ذہن میں غرق معدہ سردیوں کے باوجود

گرمیوں کے گرم روزوں کا منافع چھوڑیئے
ہوگیا اب کے خسارہ سردیوں کے باوجود

ٹھنڈے ٹھنڈے گھر تھے اپنے ٹھنڈی ٹھنڈی مسجدیں
گرم ہر بازار دیکھا سردیوں کے باوجود

گرم تھا بازار میوؤں کا بہت اب کے برس
سرد میوہ بھی تھا مہنگا سردیوں کے باوجود

سرد سحری سے بہت بچتے رہے ہم ہاشمی
لخلخہ افطار کا تھا سردیوں کے باوجود

واجد ندیم
(شکاگو)

غزل

ہم کو سننے کے لیے آجایئے
اور چاہیں تو چلے پھر جایئے

آپ کو مطلع اگر آئے پسند
پھر تو مقطع تک ٹھہر ہی جایئے

ہیں مقامی ہم شکاگو شہر میں
ہم کو سننا ہو تو پہلے آیئے

آپ کو پوچھے نہ کوئی شہر میں
میہمان بن کر کہیں سے آیئے

شعر سننے کا مزہ لینا ہو گر
واہ وا ہر شعر پر فرمایئے

یہ جو آئے ہیں ہمارے شہر میں
قدر اُن کی آپ بھی فرمایئے*

گھر کی رونق دیکھ کر وہ کہہ اُٹھے
جی میں آتا ہے یہیں رہ جایئے

آ رہے ہوں گے وہ میری ہی طرف
جی کو اپنے اس طرح بہلایئے

ہے رقیبوں کی طرف چشم کرم
کچھ ادھر بھی مرحمت فرمایئے

سرخرو ہونا ہے ٹھوکر سے اگر
کھایئے ٹھوکر پہ ٹھوکر کھایئے

جس قدر پیسے لیے ہیں، کم سے کم
ہار اتنے تو مجھے پہنایئے

ساس کا حلوہ ہوا تو کیا ہوا
پیٹ کو اپنا سمجھ کر کھایئے

کر رہا ہے لان میرا ستیہ ناس
اپنے کتے کو کہیں ٹہلایئے

ہیں مرے اشعار بے حد قیمتی
پھر نہ بکنے کے لئے فرمایئے

مجھ کو آخر میں ہے پڑھنا صدر ہوں
رات کتنی بھی ہو سن کر جایئے

جتنی چادر ہے تمھاری اے ندیم
پاؤں اپنے اتنے ہی پھیلایئے

* شکاگو میں حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، بھلاوان اور خواہ مخواہ کی مشاعرے میں شرکت کے موقع پر۔

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

میرزا پھویا چنگیزی

نام تو آپ کا از قسم جواد حسین، سجاد حسین ہی تھا مگر عرف عام میں مرزا پھویا سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ کوچہ چیلان دہلی کے رہنے والے اور گورنر آصف علی کے پڑوسی، لنگوٹیا یار اور جگری دوست دونوں کا بچپن ساتھ کھیل کود کر گزرا۔ جب آصف علی لندن سے بیرسٹری پاس کرکے لوٹے تو اپنے دوست کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور اپنی بے پناہ سیاسی مصروفیتوں میں جٹ گئے۔ ادھر اس بے رخی کے برتاؤ سے دل ٹوٹ گیا' دوستی کی ڈور میں جو بجائے خود بڑی نازک ہوتی ہے گرہیں پڑتی چلی گئیں۔ ان ہی کی ہجو کہنے اور دل کا بخار ہلکا کرنے کے لیے اچھے بھلے آدمی سے شاعر بن گئے۔ ایک کہنہ مشق استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور استاد نے آپ کو جثے اور کلام بلاغت نظام کی مناسبت سے "پھویا" تخلص عطا فرمایا' فراقیہ اور ہجویہ شعر کہنے لگے احباب کو جمع کرکے بڑے شوق و ذوق سے سناتے اور وہ لے اڑتے۔ نمک مرچ لگا کر آصف علی کے کانوں میں ڈال دیتے مگر وہ "قطب از جانمی جنبد" ہی بنے رہے۔ ناکام عاشق ہجر کی آگ میں جل بلکر مایوس ہو گئے۔ احباب کو دل لگی کے لیے ایک مشغلہ ہاتھ لگا۔ تھا۔ گھیر لیتے۔ اور اشعار سن سن کر واہ واہ۔ سبحان اللہ، مکرر، مکرر کی تکرار سے آگ کو اور ہوا دیتے۔ یوں اور ہاتھوں سے نکل گئے۔

کچھ تو ہوتے ہیں عشق میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اور شعر پڑھنے کا انداز "مرنے مارنے" کا سا تھا۔ دو ہاتھ اچھل اچھل خوب کڑک کڑک کر پڑھتے، فرماتے تھے کہ جوش نے مجھ سے ہی "یہ ہنر" سیکھا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے:

اُف اے آصف بالس قدر بے وفا نکلا تو اُف
بچپن یاد آیا ادھر، ادھر کلیجہ منہ کو آیا، اُف

شعر سن کر پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی فرماتے ہیں مرزا یہ شعر تو تمھارا نہیں لگتا، ایسا معنی آفریں اور پرسوز شعر تم نہیں کہہ سکتے۔ اللہ قسم دیوانِ غالب میں یہی شعر میری نظر سے گزر چکا ہے۔ یہ تو صریح سرقہ ہوا، ہاں مگر وہاں بجائے آصف کے کسی اور "پری زاد" کا نام تھا...... چہرہ مارے خوشی کے شفق رنگ ہو جاتا مگر اوپری ناراضگی اور مصنوعی خفگی سے فرماتے ہوئے کہتا، غالب کا پتّا کہ ایسا شعر نکالے ؟ تیر کا کلیجہ چاہیے۔ آغا صاحب اپنے دلآویز تبسم سے فرماتے۔ شاید مجھ سے بھول ہو گئی۔ بہت دن ہو گئے غالب اگر نہیں تو پھر کلیاتِ میر میں یہ شعر میرا پڑھا ہوا ہے..... دل میں لڈو پھوٹ کر اس کی شیرینی کا مزہ منہ پر پھیل جاتا کہ آپ کے شعر پر لوگوں کو غالب اور میر کا گمان گزرتا ہے اور آپ کا کلام فصاحت نظام ایسے استادوں کے کلام سے پہلو مارتا ہوا نکل رہا ہے۔ چہرہ تمتما اٹھتا، باچھیں کھل کر کانوں تک کھنچ جاتیں۔ دل باغ باغ ہو جاتا، لہراتی ہوئی آواز میں فرماتے، آغا تمھارے سر کی قسم یہ شعر میرا ہی کہا ہوا ہے...... آغا صاحب تو پہلے دریلتے خود بھی چھیڑ چھیڑ کر اور مزے لے لے کر خوب ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے.........

حلیہ آپ کا یوں سمجھیے کھڑا الف (ا) کا سا تھا، طول تو خاصا نمایاں تھا مگر عرض نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کبھی گرمیوں میں دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے سن ہیٹ (Sun Hat) بھی زیب سر کر لیا کرتے تھے تو فاصلے سے لگتا تھا الف مد (آ) چلا آ رہا ہے۔

ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد آنا ہوا اور ایسے آئے کہ اسی کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ مزاج کے سیدھے سادے، ہیر پھیر سے نابلد، جو دل میں وہی زبان پر۔ بچوں میں بچے، بڑوں میں بڑے اور جوانوں میں "نوجوان"۔ ہم سے بھی یاد اللہ ہو گئی اور ہوتے ہوتے اپنائیت، بے تکلفی اور یارانے کا روپ دھارن کر گئی۔ ہم کو بھی مرزا کی، اور مرزا سے زیادہ "مرزائیت" کے نت نئے شگوفوں کی گویا چاٹ پڑ گئی تھی۔ ملاقات میں کبھی دو چار دن کا وقفہ حائل ہو جاتا تو اسی طرح بدن میں اینٹھن ہونے لگتی جیسے تمباکو نوشی کو سگریٹ اور افیمیوں کو افیم کے نہ ملنے پر ہوا کرتی ہے......

عمر کے اس مقام سے گزر رہے تھے جہاں پہنچ کر آدمی ایک ہلکی سی ٹھوکر لگ جانے سے اوندھے منہ گر پڑتا ہے اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے اس کی زبان سے بے اختیار مگر ذرا اونچی آواز سے نکل جاتا ہے "ہائے جوانی" اور پھر دونوں ہاتھوں کے سہارے خمیدہ کمر کو سیدھا کر کے ادھر ادھر باخبر ہو کر نہایت مہین کھسر پھسر والی آواز میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

"جوانی میں کون سے تیر مارے تھے ؟"......

گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ کا اعلیٰ ترین نمونہ واقع ہوئے تھے۔ ابھی بحال ابھی بیزار سخت متلون مزاج اپنی "چنگیزیت" پر سو جان سے فریفتہ آپ کی صفات کی ان ہی بوقلمونیوں کے چند نقش ہم نے اپنے لوحِ سینے پہ آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے ثبت کر رکھے ہیں کہ نوشتہ آید بکار، سینہ کھولتے ہیں۔ دیکھیے، لطف اٹھائیے، تفریح لیجیے، مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت، ہمارے اور ماہنامے شگوفہ کے لیے اللّٰھمّ زد فزد کہ قارئین!

دوران مطالعہ مضمون ہذا کسی مقام پر اگر آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اور حلق سے قہقہہ ابل پڑے تو ہم یہ سمجھنے میں سولہ آنے حق بجانب ہوں گے کہ ہمارا وہ نوشتہ "بکار آمد" ہوا۔ کیوں۔؟ آج کے زمانے میں یوں تو ہر شئے قیمت ادا کرنے پر آسانی سے مل جاتی ہے مگر دل کی پہنائیوں میں بسی ہوئی شادمانیوں سے پھوٹی ہنسیوں ہی کا توڑا پڑا ہوا ہے اور مخدومی کرنل محمد خاں صاحب کے قول کے مطابق کہ آپ نے بیورلی نکلز (Beverly Nichols) کی کتاب ورڈکٹ آن انڈیا (Verdict on India)° کا ایک حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے "اس برصغیر میں مسکراہٹوں ہی کا توڑا ہے"

اور قارئین کرام کرنل صاحب کو بھی اپنی دعائے خیر میں شامل کر لیجیے کہ آپ نے ایک ہلکی پھلکی کتاب تصنیف فرمائی ہے جو صرف ایک ہی نشست میں باد صبا کے عطر بیز جھونکے کی طرح پلک جھپکتے ہیں ختم ہو جاتی ہے مگر کرنل صاحب اس کا ڈویڈنڈ یعنی اجر خوب بٹورے جا رہے ہیں۔ آپ کی یہ تصنیف جن کو ہضم ہوئی وہ تو ان کے لیے دعائے صحت، سلامتی اور درازی عمر کریں ہی گے مگر وہ بھی کریں جن کے سروں پر سے یہ شعر غالب اور نثر ابوالکلام کی طرح بالا بالا ہی گزر گئی، کیوں؟ امام کی اس دعا پر بھی کہ الٰہی! پڑوسی کے گھر میں جھاڑو پھر جائے" مصلی کے منہ سے بلا اختیار و ارادہ خلوص دل سے آمین نکل ہی جاتا ہے، اب یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے وہ پڑوسی، خود آپ ہی کی ذات والاصفات کیوں نہ ہو؟....

ایک مرتبہ کہیں جانے کے لیے ہم بھی مرزا پھویا کے ہم رکاب تھے۔ بس میں سوار ہونے سے پہلے شیروانی کے اوپری جیب سے نسوار کی چاندی مڑھی ہوئی خوب صورت چوبی ڈبیہ نکالی اور اس میں سے چٹکی بھر وہ اس جما اصلی مکھن سے داغی ہوئی تھی اپنی ناک کے دونوں نتھنوں میں زور سے چڑھا کر سوار ہو گئے کہ کسی کام کو بخاطر خواہ انجام دینے سے پہلے اس نسخے کا استعمال لازم تھا اور اپنی نشست پر بیٹھ چکنے کے بعد اطمینان سے متواتر چھینکنا شروع کیا۔ رومال سے ناک صاف کرتے جاتے، چھینکتے بھی جاتے ان کی ہر الحمد للہ کے جواب میں پچھلی نشستوں سے کسی کا دیوجھک۔ اللہ بھی سنائی دیتا رہا اگر تا بہ کے۔۔؟ جب ادھر سے الحمد للہ کی تکرار رکنے ہی پر نہ آئی تو پندرھویں یا سولھویں چھینک پر یرحمک اللہ کے ساتھ Once all بھی سنائی دیا....

ایک دن اپنے صاحبزادے کے ہاتھ ہمارے نام ایک چٹھی بھجوائی فوراً پڑھی گئی، لکھا تھا:

آج شام آپ کے دوست دہلی جا رہے ہیں، براہ کرم آپ انھیں کہہ کر میرا ایک کام کروا دیجیے (اس کے بعد "ایک" کام کی طویل فہرست تھی) چونکہ آج دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے ورنہ خود آتا اور آپ کو ساتھ لے کر وہاں جاتا اور خود اسے اپنی غایت بیان کرتا، زحمت معاف والسلام"

اس پیام کو پڑھ کر ہم بے حد گڑبڑا گئے بات پوری طرح پلے نہ پڑی۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے دوڑے

° اس کتاب میں موصوف نے گپیں بھی اعلیٰ درجہ کی ہانکی ہیں (طالب) dividend ⊖

دوسرے جناب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ خود موصوف ہی سے پڑھوا کر سمجھ لیں گے۔ پوچھا مرزا صاحب آپ کی تحریر میں دو مقام پر الف دو پیش (اُ) لکھا ہے، جس کا مطلب ہمارے سر سے بالا بالا گزر گیا۔ براہ کرم ان کی تفسیر مع شرح و بسط کے ارشاد فرمائیے کہ آپ کی (اُ)، انشا کا مطلب کسی رخ سے بھی ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ روداد سن کر چھت پھاڑ قہقہہ لگایا اور بولے میاں صاحب بزادے وہ "اُن" ہے۔

عرض کیا پھر سیدھے سیدھے "اُن" لکھنے کی بجائے یہ الف دو پیش (اُ) کا شوشہ کیوں چھوڑا گیا۔؟ فرمایا جناب من! جب الف دو پیش (اُ) سے کام نکلتا ہو تو کیوں لمبا چوڑا "اُن" لکھ کر کاغذ، روشنائی اور توانائی کا زیاں کیا جائے؟ سمجھو یہ "ابداع بندہ" ہے۔ حیف کہ اب ہماری بات اور زبان سمجھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

موصوف کی اس کفایت شعارانہ چیستاں اور "ابداع بندہ" پر ہم عش عش کر کے رہ گئے۔ جو ایجاد بندہ" کے جواب میں" جواب آں غزل کے طور پر لائی گئی تھی ......

بازار میں ساتھ چلتے چلتے کہیں اٹک گئے۔ ادھر دیکھا ادھر دیکھا دکھائی نہیں دیئے پلٹ کر دیکھا تو دور ایک دیوار پر فلمی پوسٹر پڑھتے نظر آئے، لپٹے چل کر قریب پہنچے اور دیکھا کہ پلک جھپکائے بغیر نیم برہنہ فلم ایکٹریس کے نشیب و فراز اور پیچ و خم کو ٹکٹکی باندھ کر پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا، مرزا صاحب کون سا فلم ہے؟ بولے، وہ ابھی نہیں پڑھا ......

شہر کے ایک سینما ہال میں سہراب مودی کا پچاس سال پرانا فلم "پکار" لگا ہوا تھا، مرزا کو معلوم ہوا تو اسے دیکھنے کے لیے ماہی بے آب ہو گئے اور اپنی اولین فرصت میں ہم کو بھی اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور نہایت والہانہ ذوق و شوق سے اپنی پرانی یادوں کو تازہ کر کے پردے پہ نگاہیں جمائے فلم دیکھنے لگے اور جب وہ منظر سامنے آیا جس میں ملکہ نور جہاں کے ہاتھ سے کبوتر اڑ جاتا ہے۔ اور وہ کچھ ملول ہو جاتی ہے، جہانگیر نمودار ہو کر پوچھتا ہے مہرو! کبوتر کیسے اڑا۔؟ اور جواب میں "ہر مجسٹی دی کوئین پری چہرہ نور جہاں نسیم بانو" اپنے دوسرے ہاتھ کا کبوتر اڑا کر بھولپن سے جواب دیتی ہے، "جہاں پناہ، ایسے ......

نور جہاں کے اس الھڑپن، ادائے دلربایانہ اور انداز معشوقانہ سے اُدھر "پردۂ سیمیں" پہ ہز مجسٹی دی کنگ ایمپرر نور الدین محمد، چندر موہن جہانگیر" اور ادھر "آرمار دیا" کا نعرۂ مستانہ لگا کر میرزا پھویا چنگیزی، سو سو جان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ فلم ختم ہوا، ہال سے باہر نکلے اور نسیم کے بادۂ حسن سے سرشار مرزا پھویا نے نہایت تاسف اور حسرت کے ملے جلے آمیزے سے فرمایا "یارو" "ذرا دیکھنا، ان پچاس برسوں میں ہم کیا سے کیا ہو گئے ـــ؟ جیسے ہینگر پہ شیروانی ٹنگی ہو اور ادھر دیکھنا گویا، وقت اس کی خاطر سے ٹھہر گیا ہے۔ ذرا بھی تو نہیں بدلی آج بھی ویسی کی ویسی ہے جیسے پہلے تھی ......

مرزا کو ذرا موڈ میں لانے کے لیے ایک دن ہم نے کہا ابھی ماضی "بالکل" قریب میں آپ کے ہم جدی ایک نامور شاعر بھی تو ہو گزرے ہیں ان سے تو آپ کی بھی صاحب سلامت اور دوستی رہی ہو گی؟ فرمایا ہاں صاحب کیوں نہیں۔؟ ہم میں اور ان میں تو یارانہ تھا۔ رات دن کا اٹھنا بیٹھنا، گنجفے کھیلنا، سمجھو دانت کاٹی

روڑ تھی، ہماری کم نصیبی کہ ایسا باکمال آدمی دنیا سے اٹھ گیا مرحوم کی ہر ادا میں چنگیزیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی
تھی۔ مکھی تک ناک پر بیٹھتے ہوئے گھبراتی تھی۔ انھوں نے تو آپ کے "غالب صاحب" کی بھی خوب خبر لی تھی
انت کھٹے کرکے "غالب شکن" ہی مشہور ہو گئے تھے۔ عرض کیا جی ہاں کیوں نہیں، ہم نے سنا ہے کہ مجسم قہر
ندا تھے، ہمارا غالب بے چارہ کس کھیت کی مولی ہوا۔ وہ تو اللہ میاں سے بھی دو دو ہاتھ کر لیتے تھے۔ وہ کیسے؟
رض کیا جی ایسے:

جی خوش ہوا ہے مسجدِ ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

مگر غالب؟ وہ ماوراالنہری مغل بچہ ایسی بُری بلا ہے کہ اپنی قبر میں لیٹے لیٹے ہی شیشے سے پتھر کو توڑ کر ریزہ
ریزہ کر دیتا ہے۔ جب کسی نے بھی جب جب اس پر خاک اڑائی اس نے اسی دم اس کو خاک چٹائی اور ان خاک
چاٹنے والوں میں آپ کے "غالب شکن" صاحب کا مقام بہت اونچا ہے .... حق بات کڑوی لگی۔
نسہ پلٹ جانے سے سیخ پا ہو گئے۔ چہرہ مارے چنگیزیت کے لال بھبھوکا ہو گیا اور بولے اماں! پھر
ہی دل پھٹنے کی باتیں۔ ایسی واہی تباہی بک کر ہمارے منہ نہ آیا کرو، اللہ قسم رگوں میں دوڑنے والا چنگیزی
ن ان فرخرفات کو سن کر کھولنے لگتا ہے۔ عرض کیا مگر ہم کیوں کر قائل ہو جائیں کہ ابھی تک تو آپ کی آنکھیں چنگ
ندنی ہی بنی ہوئی ہیں .... مسکرا دیے اور فرمایا۔ یار تمھارا غالب کام کی چیز تو ہے ....
اپنے جداعلیٰ چنگیز خاں کا نام نہایت احترام اور پورے القاب سے لیا کرتے تھے جب بھی کہتے "خاقان
خاقان چنگیز خانِ اعظم" ہی کہتے اگر کوئی شامت کا مارا چنگیز خاں کے نون کو بلا اعلان یعنی نون غنہ
ادا کرتا تو ہتھے سے اکھڑ جاتے اور تنبیہ کرتے کیا وہ بھی کوئی "بندو خاں" تیلی تھے؟
پھر موڈ میں آکر فرمانے لگے، وہ تو کہیے ہندوستان اور التمش کی قسمت نے یاوری کی کہ حضرت جداعلیٰ
ت مکانی" نے اخیر وقت کسی دوسری مہم کے لیے ادھر کا ارادہ ترک فرما دیا ورنہ یہاں بھی خون کی ندیاں
جاتیں اور گنگ و جمن کا پانی بھی دجلہ کے پانی کی طرح خوں رنگ ہو جاتا۔ عرض کیا۔ اعلیٰ قسم کے دہشت
د واقع ہوئے تھے کہ آپ کی کتاب زندگی کا ہر باب خون خرابے، مار کاٹ، لاشوں کے انبار اور سروں کے
مینار کی ان "آتنک وادی حرکتوں" ہی سے عبارت ہے، مرزا صاحب! کہیں ایسا تو نہیں کہ مسمی چنگیز خاں
آپ وحید بجیرہائے منگولستان دستگیر اندازہ کے چودھری تھے ....؟ اصولاً ہونا تو یہ چاہیے تھا۔ آپ کی
میں بجائے آپ جیسے مرنجاں مرنج نستعلیق بزرگ کے ہٹلر، مسولینی اور اسی قبیل کے فتنہ پرداز "آتنک وادی"
ہوئے ہوتے ..... سن کر سخت مکدر ہو گئے اور "عف عف" کو بڑی مشکل سے روک کر فرمایا اماں تم ملکا کرتا ہی
سر پھیر کی" ان ہی باتوں سے تو دل پھٹتا ہے یاروں کا" ......
ہم اور مرزا ایک دوست کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ان کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔
نے والے صوفے پر ان کا چہیتا پاکٹ سائز کتا پومیرینین (Pomeranian) محوِ استراحت تھا۔ اس

Butcher

کو وہاں دیکھ کر مرزا نے فرمایا دیکھا، موڈرن کہلانے کے شوقینوں نے ایسے نجس و ناپاک جانور کو کس قدر سر چڑھا رکھا ہے۔ جس کی موجودگی میں رحمت کے فرشتے بھی گھروں میں داخل نہیں ہوتے اور پھر ایک جھرجھری لے کر کراہت سے منہ بنا کر فرمایا، ہو سکتا ہے جن صوفوں پر ہم بیٹھے ہوئے ہیں ان پر بھی آپ نے ایک ایک نیند لی ہو گی۔ گھر جانے کے بعد سب سے پہلے نہا کر لباس تبدیل کرنا ہو گا کہ یہ ناپاک ہو گیا ہے۔ سمجھو ان لوگوں نے مذہب کے ساتھ ایک کھلواڑ کر رکھی ہے۔ کیا انہیں اپنا شوق پورا کرنے کے واسطے کوئی دوسرا پاکیزہ جانور نہیں ملتا؟ ——— گویا آپ کے حساب سے اونٹ جیسے "مسلمان" جانور کو یہاں ہونا چاہیے تھا کہ اس کی "ہر کل" کو دیکھ دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا رہتا اور آخری چہار شنبہ کے دن کھانے کے کام آ کر اجر پانے کا باعث بھی ہوتا مگر ایک مجبوری ہے کہ وہ یہاں سما نہیں سکتا۔ اور موڈرنگ والک میں گلے میں پٹا ڈال کر ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ دوسرے بابا لوگ گود میں لے کر اپنا منہ چٹوا نہیں سکتے "ہاؤ سویٹ"، "کارلی" یہ صورت ہے۔ مجبوری ہے کتے ہی سے کام چلا لیتے ہیں اور ان صاحب لوگوں کو اس کے عالی مرتبت ہونے کے جواز میں ساری داستان میں سے ایک پتے کی بات یہ یاد رہ گئی کہ "اصحاب کہف" کا رفیق بھی تو ہے ..... ہمارے دلائل سن کر فرمایا!

اجی ہٹاؤ ان خرافات کو یہ تو وہی بات ہوئی تا کہ ساری داستان میں سے صرف اتنا ہی یاد رہ گیا کہ "اورنگ زیب" یہ تھا وہ تھا اور وہ تھا یہ تھا۔ ہماری اس دخل در معقولات سے پوم ریشین موصوف کے آرام میں خلل واقع ہو گیا۔ اور وہ اپنے بدن کو جھٹکتے ہوئے انگڑائی لے کر اور چاروں پیروں کو لمبے لمبے کھول کر کھڑے ہو گئے اور ہم اجنبیوں کی طرف دیکھ کر پہلے تو بطور ریلیکس سلیک اور مزاج پرسی کے تیکھی ہوئی آواز میں ایک ہلکی سی "بھف" کی اور پھر دیدے نکال کر اس جرأت، پر کہ آپ کے آرام میں مخل ہوئے تھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے پھانسی کے مجرم سے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ "ذبح لیا جائے یا جھنجھوڑ دیا جائے، بول! تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" مگر ہماری طرف سے جنگ، کا نہیں بلکہ مکمل سرینڈر کا رویہ دیکھ کر ہم اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی فکر میں اپنی سٹی بٹی گم کیے ہوئے تھے۔ انھیں یہ اطمینان ہو گیا یہ اجنبی لوگ شر پسندانہ عزائم کے حامل نہیں ہیں تو ذرا دیر بعد مرزا سے آنکھیں چار کیں اور منہ اوپر اٹھا کر "کوئیں" کرتے ہوئے ایک لمبی جماہی لی۔ ادھر ادھر ہم نے دیکھا اور کیا دیکھا؟ کہ مرزا بھی کہ اپنے بچاؤ کی خاطر پیترا بدلنے کے لیے "جھوٹے میاں" پر نظریں گاڑھے ہوئے تھے۔ جماہی کی چھوت کا شکار ہو گئے لہٰذا جماہی پر جماہی لے لے کر اپنا بدن توڑے جا رہے ہیں.....

ہمارے اور مرزا کے کئی احباب کراچی ہو آئے تھے اور شہر کراچی کی رونقوں، وہاں کی محفلوں، دعوتوں اور "مہندی" کی رسموں کی دھوم دھام ".... اور گھر کی بیبیوں کے سڑکوں پر رقص کے رطب اللسان تھے۔ ہم نے مرزا سے کہا کہ کبھی آپ بھی اس دیار کی سیر کر آتے کہ وہاں آپ کے عزیزوں کے علاوہ بے شمار قدیم احباب بھی ہیں۔ فرمایا ایک بار گیا تھا مگر دوبارہ جانے کی قسم کھا رکھی ہے وجہ بیان فرمائی کراچی میں سر راہ ایک لنگوٹیا یار مل گئے۔ بڑی گرم جوشی دکھائی۔ گلے ملے سینہ سے لگایا اور پیار کیا اور محبت کے دو چار آنسو بھی آنکھوں سے ٹپکائے، حیدرآباد اور اس کی گلیوں تک کی خیریت پوچھی اور بے حد اصرار کر کے اپنے گھر لے چلے کہ [illegible] گھر تو دیکھ لو پھر جب تک یہاں قیام ہے آتے رہنا راستے میں بڑی اپنائیت و ایک جا [illegible] باتوں سے مرزا [illegible]

سوچتے رہے کہ برسوں کی جدائی نے بھی دوستی کے بندھن میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا تھا۔ گھر کے قریب
کر دوست "دہلی کافی ہوٹل" کے آگے رک گئے اور بولے مرزا تم یہاں فٹ پاتھ پر دو چار منٹ انتظار
۔ مجھ کو ادھر سے گزرتے ہوئے اس ہوٹل میں چائے پینے کی عادت ہے بس یوں گیا اور ایک پیالی پی کر
ں بجاتے میں یوں آیا۔ مرزا "جانی دوست" کی اس سفید خونی اور اس پر دیدہ دلیری پہ پہلے تو بحث اچنبھے
پڑ کر چکرائے اور پھر ایسی دوستی اور دوست دونوں پر ایک ساتھ واسوخت پڑھتے ہوئے واپس
آئے کہ یہاں کے پانی کی تاثیر معلوم ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد جب بھی کسی نے کراچی کا نام لیا تو کمال خفگی اور نہایت ناراضگی سے کہتے ہیں۔ میاں!
ندا" کی خبر لانے کے واسطے روانہ ہونے سے بیشتر حاتم طائی نے منیر شامی کو نصیحت کی تھی" تین کھونٹ
چوتھے اصلا نہ جانا" ہم بھی اس کی اتباع میں کہیں گے کہ دنیا کے تین کھونٹ خوب مزے سے گھوم پھر
جدھر چاہو جاؤ موج مستی اُڑاؤ مگر چوتھا کھونٹ کراچی کا نام بھی اپنے حاشیہ خیال میں نہ لانا ۔ ۔ ۔
ورنہ تم ہوں گے اور "دہلی کافی ہوٹل" کا فٹ پاتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایم اے حنّان
(حیدرآباد)

چشمکِ آشوبِ چشم

بیماری اور حضرتِ انسان کا پیدائشی ساتھ رہا ہے۔ بسا اوقات تو بیماری قبل از پیدائش ہی لاحق ہوجاتی ہے۔! چنانچہ بعض معززین بطنِ مادری کو بسترِ علالت میں بدل دیتے ہیں۔ ادھر بیمار اور بیماری کے ہمراہی منتظر، ڈاکٹر وید اور حکیم بلا تاخیر شکمِ مادری میں اس ان دیکھے مریض کا علاج شروع کردیتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو انسان کو اس کی پیدائش سے مرنے تک مختلف عوارض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعضوں کو تو بہ یک وقت مختلف بیماریاں اپنے نرغہ میں لے لیتی ہیں اور وہ کافی صبر و استقامت کے ساتھ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ بالآخر کوئی انتہائی مہلک یا معمولی سی بیماری ان کا کام تمام کردینے کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہلِ دنیا ہلاکو اور چنگیز سے کیسے چھٹکارا پاتے اور انھیں شیطان صفت افراد سے کیسے نجات ملتی!۔

یوں تو بیماریوں کی سینکڑوں اقسام ہیں۔ جن سے طب کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کی ایک خاصی تعداد سے تو آپ اور ہم بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ ہماری ہی مثال لیجیے۔ بیتالیس برس کی اس کم سنی میں متعدد عوارض کا شکار رہ چکے ہیں۔ چنانچہ ملیریا سے ہمیں دو بار مصافحہ و معانقہ کرنے کا شرف حاصل ہوچکا ہے۔ ٹائیفائیڈ سے بھی تین چار مرتبہ بغل گیر ہوچکے ہیں۔ مرضِ دق سے بھی ایک بار پنجہ لڑایا ہے۔ یرقان سے بھی دو ایک بار ٹکر لی ہے۔ کمی خون کو بارہا زیر کیا ہے۔ سردی، کھانسی، بخار، سردرد، داڑھ کے درد، متلی چکر، دست و قبض سے تو اکثر ہمارا "انکاؤنٹر" ہوتا رہتا ہے!

حقیقت تو یہ ہے کہ درجِ بالا بڑی سے بڑی بیماری بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکی اور سخت سے سخت بیماری اور جاں کنی کے عالم میں بھی لوگوں نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ دل کھول کر مزاج پرسی کی۔ گلے لگایا، سر پہ ہاتھ رکھا اور ہماری عاجلانہ صحت یابی کے لیے گڑگڑا کر کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی دعائیں بھی کیں۔

لیکن بُرا ہو اس آشوبِ چشم کا جس نے نہ صرف ہماری عزتِ نفس کو سخت دھکا

پہنچایا بلکہ ہمیں سر بازار رسوا کر کے چھوڑا۔ دوران بیماری نہ کسی نے ہماری مزاج پرسی کی اور نہ ہی ہمدردی کے دو ایک بول کہے بلکہ الٹے ہمیں دیکھتے ہی لوگ تیر کی طرح نکل جاتے۔ شناسا، احباب اور رشتہ داروں کا ذکر ہی کیا ایسے اشخاص جن سے ہماری خون کی رشتہ داری ہے وہ بھی ہم سے کترانے اور دامن بچانے لگے۔ یعنی عارضی طور پر داغ مفارقت دے گئے۔ قیامت کے ان پانچ دنوں میں نہ کوئی ہمارے گھر آیا اور نہ ہی کسی نے ہمیں اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ غلطی سے کہیں چلے بھی گئے تو لوگوں نے اسمبلی کی طرح ہمارا بائیکاٹ یا واک آؤٹ کر دیا۔ ہر قسم کے مطالعے سے ہم محروم رہے۔ آپ کو تو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ آج کل اخبار کا مطالعہ کس قدر ناگزیر ہو گیا ہے۔ ہم کو تو یہ ناشتہ ہی کا ایک گرما گرم اور چٹ پٹا آئیٹم نظر آتا ہے۔

بھائیوں کہ ایک منحوس دن ہماری سیدھی سادی آنکھیں کسی آہو چشم سے ٹکرانے کے بجائے۔ ایک سادہ لوح کی خونبار لیکن قدرے بھیگی آنکھوں سے کچھ ایسے چار ہوئیں کہ گھر پہنچنا تو کجا راستہ ہی میں گلابی ہونی شروع ہو گئیں اور اشک افشانی کرنے لگیں پھر اس چشم نم ناک میں متعدد کھجلاہٹیں لہرانے لگیں۔ اور گھر پہنچتے پہنچتے گلی کے سارے کوڑے کرکٹ اور کنکریوں کے ہماری آنکھوں میں سما جانے کا احساس ہونے لگا۔

اس ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر حسب عادت سب سے پہلے ہم نے دفتر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ حالانکہ تین ماہ کی رخصت، خاص سے فراغت پا کر دو دن قبل ہی رجوع بہ کار ہوئے تھے۔ اس طرح تیسرے ہی دن غیر حاضری اور سرکاری فرائض سے منہ موڑ لینا دفتری آداب کے منافی محسوس ہوا۔ اگرچہ کہ بعض ملازمین اس معاملے میں اس قدر خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ دفتر میں حاضر رہ کر بھی غیر حاضری کے مزے لوٹتے رہتے ہیں۔ غرض کہ عرضی لے کر بہ نفس نفیس افسر بالا کی خدمت میں پہنچے وہ ہمیں دیکھتے ہی حیرت انگیز طور پر کرسی سمیت اچھل کر دو چار گز پیچھے ہٹ گئے اور آسان انگریزی میں فوری دفع ہو جانے کو کہا۔ اگر وہ اسی پر ہی اکتفا کرتے تو بہتر ہوتا لیکن انھوں نے اپنی شخصیت میں پوشیدہ ساری رعونت، نخوت، حقارت اور کثافت کو اپنے چہرے پر یک جا کر کے کچھ اس انداز سے دوبارہ اندر نہ آنے کی تاکید کی کہ ہمارے احساس کو ٹھیس پہنچی اور آبگینۂ دل چور چور ہو گیا۔

افسر بالا کے لفظی حملے سے نڈھال اور نیم مردہ اپنی آنکھیں سہلاتے ہوئے باہر نکلے تھے کہ ان سے دو چار قدم کم درجے کے ایک افسر نے ہماری آشوب چشم کے تئیں اپنی پر آشوب انگریزی میں بآواز بلند کہا ،
Don't come here ; go away , others will get it

چنانچہ بائیس سالہ دفتری رفاقت اور متعدد سرکاری اور غیر سرکاری احسانات کو نظر انداز کر کے دس پندرہ فٹ کے فاصلے سے نہایت بے مروتی سے ایسا کہنے پر ہمیں بے حد ملال ہوا۔ لیکن دو چار دن اور دوبارہ ملاقات ہونے پر انھوں نے ہم سے انگریزی ہی میں یہ کہہ کر اس کی تلافی کر دی کہ میں ان کے قریب نہ آؤں۔ کیونکہ وہ آشوب چشم کا شکار ہیں!

اس دوران ہمیں خیال آیا کہ دفتر ہی کے ایک ساتھی کے پاس ہماری کچھ رقم بطور امانت رکھی ہے کیوں نہ اسے حاصل کرلیں تاکہ علاج معالجہ میں کچھ سہولت ہو۔ یہ سوچ کر آگے بڑھے تھے کہ راستہ میں اُن سے ملاقات ہو گئی لیکن وہ کافی صحت مند رجحانات اور خیالات کے حامل ہونے کے باوجود بار بار ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ پھر اچانک ایسے چمکے جیسے کوئی اعلیٰ نسل کا گھوڑا بدکتا۔ گدھوں کے انسانی تعلق کا ہمیں تھوڑا بہت ادراک تھا، لیکن گھوڑوں کی خصوصیات کا فطرت انسانی میں پایا جانا پہلی بار معلوم ہوا۔ پھر وہ اپنی رخصتی کے لیے اس قدر بے چین ہے کہ گڑبڑ میں بطور امانت رکھوائی گئی رقم سے کچھ زیادہ ہی رقم ہمارے حوالے کردی اور روایتی تہذیب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خداحافظ کہے بغیر رخصت ہو گئے۔

بہر حال ' بڑے بے آبرو ہو کر تیری کچہری سے ہم نکلے"

کچھ ہمارے چلبلانہ بیٹھ جانے کی عادت کی وجہ اور کچھ "آشوب چشم" کی سہ روزہ نظر بندی سے تنگ آ ایک دن ایک قریبی عزیز سے ملاقات کو پہونچے۔ انھوں نے کافی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ لیکن یہ گرمجوشی دیر پا ثابت نہ ہوسکی۔ جیسے ہی صاحب خانہ اور اُن کے متعلقین کی نظریں ہماری ہلکی گلابی آنکھوں پر پڑیں۔ دفعتاً سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں، اور اشاروں کی زبان میں گفتگو ہونے لگی۔ نہ جانے خاوند نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی جائز بیوی سے کیا کہا کہ وہ بادل نخواستہ اٹھ کر دروں خانہ چلی گئی۔ پھر خدا معلوم بیگم نے اندر جاتے ہوئے شوہر کو کیا اشارہ کیا کہ وہ بھی چائے لانے کے بہانے زنان خانہ میں داخل ہو گئے اُن کی لڑکی نے پڑھنے کا عذر کرکے ہم سے رخصت چاہ لی "میاں پاور" کی اس گرتی ہوئی شرح سے پریشان بیٹھے ہمیں یہ پتہ بھی نہ چلا کہ روبرو بیٹھا صاحب خانہ کا لمبا تڑنگا ہٹا کٹا نوجوان بیٹا جانے ہم سے کیا کہہ کر بلا سر چلا گیا اور ہم منہ تکتے رہ گئے۔

اس آشوب چشم کی عنایتیں صرف ہم تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ بے شمار افراد اس کے التفات بیجا کا شکار ہوئے۔ حتیٰ کہ اس نے نہایت اہم شخصیات اور نازک موقف کے حامل اشخاص کو بھی نہیں بخشا چنانچہ اس کی چشمک ایک ایسے "نوشہ" سے ہوئی جنھیں طویل ترین انتظار کے بعد یہ شادمانی نصیب ہونے والی تھی لیکن عین عقد سے دو دن قبل اُن کے گھر آشوب چشم نے مہمانی کی اس نے فرداً فرداً سب کو شادی کی مبارکباد دینا شروع کردیا اور حسب روایت سب سے پہلے نوشہ سے بغل گیر ہو گئی۔ اب کیا تھا۔ شادی کے گھر کافی چل چل پڑ گئی۔ اُن کا خصوصی علاج کیا گیا یعنی آنکھوں کے علاوہ پیٹ وغیرہ میں دوائیں ڈالی گئیں لیکن ے
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق وقت مقررہ پر اُن کی آنکھیں ٹھیک نہ ہو سکیں۔ بالآخر تھک ہار کر پدر بزرگوار نے برخوردار سعادت آثار کی شادی ایک مہینہ کے لیے آگے بڑھا دی اور سب نے ہی سکون کی سانس لی۔

پھر بھی یہ ایک شرمیلے نوشہ کا معاملہ تھا جنھوں نے اپنی خود سپردگی کی خو کو غلط جگہ راہ دے دی تھی۔ لیکن اس آشوب کی دیدہ دلیری ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے ایک ماہر امراض چشم کو اپنی آنکھیں دکھائیں کہ

بے چارہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ موصوف؟ اسی وبا کے تناظر میں اپنا ذاتی مطلب کھولنے کی تیاریاں کر رہے تھے کلینک کے افتتاح سے چند گھنٹوں قبل اس نے ایسا شب خون مارا کہ ساری ڈاکٹری دھری رہ گئی۔ چنانچہ مطب کے افتتاح کے بجائے اس کے التوا پر اکتفا کرنا پڑا۔

ایک مقام پر تو اس آشوب چشم کی وجہ سے نقص امن کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ نند کے بچوں کو آنکھیں آ گئی تھیں بھاوج کے بچوں کو آگے آنے والی تھیں لیکن انھوں نے اپنی عارضی خوش بختی پر نازاں ہو کر اپنے بچوں کو نند کے بچوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے سے منع کر دیا۔ جب بچوں پر ان ہدایات کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تو وہ بدکلامی پر اتر آئیں۔ بعد ازاں مار دھاڑ کرنے لگیں۔ فطری طور پر نند نے احتجاج کیا۔ اس دوران زندگی میں پہلی مرتبہ انجانے میں شوہر کے منہ سے بہن کی تائید میں دو ایک کلمات کیا ادا ہو گئے کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سسرال اور میکے کے اعزا کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہو گیا۔ دوران گفتگو طلاق اور خلع جیسے ناپسندیدہ الفاظ کا اس کثرت سے استعمال ہوا کہ ہمارے ایک لمبی داڑھی والے دوست نے جو بڑی دیر اور انہماک سے اس جھگڑے کی کارروائی کا مشاہدہ فرما رہے تھے جائے واردات سے کھسکتے ہوئے ہمارے کان میں آہستہ سے کہا کہ "طلاق" واقع ہو گئی!

گزشتہ دو تین دہوں کی تیاری کے بعد اس مرض کا حملہ اس قدر کاری اور وسیع پیمانے پر تھا کہ معالجین نے نسخے پرچوں پر تحریر کرنے کے بجائے موقر اخبارات میں شائع کروائے۔ البتہ کمال ہوشیاری سے انھوں نے اس کا طریقہ استعمال نہیں بتلایا تاکہ طریقہ استعمال جاننے کے لیے عام الناس دوبارہ ان سے رجوع ہوں اور مقررہ فیس کی ادائیگی کے بعد ہی وہ ان دواؤں کو استعمال کرنے کے لائق ہو سکیں! چند ایک احتیاطی تدابیر بھی شائع کیں۔ جن میں اس مرض میں گرفتار مریضوں کو سیاہ چشمہ لگانے کا مشورہ دیا گیا تھا تاکہ آنکھیں روشنی گرد و غبار وغیرہ سے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن ہمارے استحصال پسند معاشرہ نے اس کا بھی استحصال کیا۔

چنانچہ ہمارے ایک دوست جو اس وبا سے قطعی غیر متاثر تھے، سیاہ چشمہ لگائے سیدھے اپنے ایک ایسے کرایہ دار کے یہاں پہنچے جو گذشتہ تین مہینوں سے کرایہ ادا کرنے سے گریز فرما رہے تھے۔ وہ گھر کے باہر ہی کھڑے کسی سے بات چیت کر رہے تھے لیکن جیسے ہی انھوں نے مکان دار کو سیاہ چشمہ لگائے اپنے گھر کی جانب آتے دیکھا، فوری دوبارہ گھر میں داخل ہو گئے اور نوکر کے ذریعہ نہ صرف پچھلے تین ماہ کا کرایہ بلکہ دو مہینوں کا پیشگی کرایہ روانہ کر دیا کیوں کہ کسی نے ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ شہر میں مزید دو مہینے اس مرض کی گرفت برقرار رہے گی!

خدا جھوٹ نہ بلوائے اسی آشوب چشم کی بدولت ہمیں کئی ایک فائدے بھی ہوئے چنانچہ بس میں سفر کے دوران دو آدمیوں کے لیے مختص سیٹ پر ہم واحد شخص کو آرام سے سفر کرنے کا موقع ملا۔ کیوں کہ کوئی دوسرا شخص ہمارے بازو بیٹھنے کو ہرگز تیار نہ تھا بلکہ اچھا بھلا بیٹھا ہوا آدمی ہم کو دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوتا اور ایستادہ حالت میں اپنا سفر جاری رکھتا لیکن اسے ہمارے نزدیک بیٹھنا کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ بازار جاتے تو سب سے پہلے ہماری شنوائی ہوتی جیسے ہم کوئی عام آدمی نہیں بلکہ وی آئی پی ہوں۔ اور دوکاندار سب سے پہلے ہم سے نپٹ کر چلتا کر دیتے! ان دو ایک فائدوں سے قطع نظر اس علامت سے گھبرا کر ایسے نسخے کی تلاش میں

[illegible]

بابو آر کے
(اچل پور سٹی)

الیکشن الیکشن

یوں تو اسمبلی اور پارلیمنٹ میں نمائندگی کا ارمان ایک عرصے سے ہمارے دل میں پل رہا تھا لیکن عدالت کے کٹہروں میں اچھے اچھے سیاسی سورماؤں کی درگت دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہوگئے اور ہم نے اسمبلی و پارلیمنٹ میں اپنے داخلے پر روک لگا دی اور طے یہ کیا کہ پہلے ہم خاک سے اٹھیں گے اور پھر عرش کو چھوئیں گے یعنی ابتدا ہم وارڈ کی ممبری سے کریں گے . . . . اس لیے الیکشن کی آمد آمد سے قبل ہم نے وارڈ میں اپنے رفاہی کاموں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بیماروں کی تیمارداری، سوگ واروں کی عزاداری کے علاوہ شادیوں کی تقاریب میں حاضری اور جنازوں میں شرکت ہم نے اپنے لیے لازمی قرار دے دی۔ وارڈ کی صاف صفائی سے لے کر نکاسیٔ آب کی ذمہ داری بھی ہم نے اپنے اوپر لادلی۔ گویا الیکشن سے قبل ہمارے دن رات اسپتال، پولیس تھانے، کورٹ اور قبرستان کی نذر ہونے لگے۔ ہماری ان تمام مصروفیات کا ایک فائدہ کم از کم یہ تو ہوا کہ لوگ الیکشن سے قبل ہی ہمیں ممبر صاحب، ممبر صاحب کہنے لگے گویا ہماری خدمات کا صلہ دینے لگے۔ ہماری انہیں مصروفیات کے دوران خدا خدا کرکے الیکشن کا اعلان ہوا اور ہمیں اپنی منزل بالکل سامنے نظر آئی۔

الیکشن میں حصہ لینے سے قبل ہم نے وارڈ کے اس معمولی الیکشن کو باوقار بنانے کے لیے ایک پریس کانفرنس بلوائی۔ ہماری اس کانفرنس میں صحافی آئے نہیں بلکہ لائے گئے۔ صحافیوں نے اخبارات میں ہمارا انٹرویو شائع کرنے کے لیے الفاظ کا چارج ٹیلی گرام کے چارج سے دس گنا زیادہ طلب کیا اور ہم نے دیا۔ خیر صاحب پریس کانفرنس شروع ہوئی۔

ایک صحافی نے پہلا سوال داغا . . . سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ سیاست میں آنے کا خیال آپ کے دل میں کب اور کیسے آیا؟ — ہم نے کہا سب سے پہلے تو آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ سیاست میں

ہمیں خیال نہیں بلکہ خواب لاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا جواب سن کر تمام صحافیوں کے چہرے فق ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویسے تو اچھے برے خواب ہمیں اکثر آتے رہے ہیں ـــ

لیکن ادھر پچھلے کچھ دنوں سے ایک جیسے خواب متواتر نظر آتے رہے ہیں۔ یعنی ادھر ہم نے بستر پہ پر لیٹ کر آنکھیں جھپکائیں اور ادھر راشٹر پتا، مہاتما گاندھی، سردار پٹیل کا غصہ اور اپنی لاٹھی لیے ہم پر حملہ زن ہوتے ہوئے کہتے۔ کیا ٹانگیں پسارے لیٹے ہو یہاں۔ ۔ ۔ ۔ اٹھو جاؤ اور دیش کو بچاؤ۔ نالائق نیتاؤں نے دیش کی نیا ڈبو دی اور تم سوتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اس نیا کے اب تم ہی کھیون ہار ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ اور دیش کو بچاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الغرض گاندھی جی کی ناراضگی اور ان کی تنبیہ نے ہمیں سیاست میں جھونک دیا اور صاحب اس طرح ہم سیاست میں آ گئے۔ دوسرا سوال تھا۔ ۔ ۔ ۔ کیا آپ اپنے سوشیل کاموں پہ روشنی ڈال سکتے ہیں؟ ہم نے کہا: ۔ ۔ ۔ سوشیل کاموں کا تو ایک لامتناہی سلسلہ ہے جی ہمارے پاس۔ اب آپ ہی بتایئے اس سلسلے میں ہم اپنی بات کہاں سے شروع کریں۔ ماں کی گود سے قبرستان کی گور تک ہمارے سوشیل کاموں کا کینوس پھیلا ہے جی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ یقین کریں۔ یہ میں ہی ہوں جس نے وارڈ کے سیکڑوں نومولود بچوں کے کانوں میں اذانیں دی ہیں اور بے شمار مردوں کو قبروں میں اتارا ہے۔ شادیاں جوڑی بھی ہیں اور توڑی بھی ہیں۔ وارڈ کو صاف ستھرا ماحول فراہم کرنے کے لیے تو ہم ہمیشہ ہی کوشاں رہے ہیں۔ ۔ اس میدان میں ہم نے بڑے بڑے ۔ ۔ ۔ کیجیے کہ جب کبھی میونسپلٹی نے D.D.T. فراہم نہیں کیا ہے تو ہم نے وارڈ میں گھوم پھر کر تالیاں بجا بجا کر مچھروں کو اپنے ہاتھ سے مارا ہے۔ ہتھیلیاں لال کی ہیں لیکن لوگوں کو ملیریا اور ڈینگو سے بچایا ہے۔ ہم نے اپنے سیاسی کیریر میں وارڈ میں پڑے ہوئے پانچ مردہ کتوں، آٹھ مردہ بلیوں، دس مرغیوں اور بیس سڑے ہوئے چوہوں کو اپنے ہاتھوں سے کھینچ کھینچ کر پھینکا ہے۔ لیکن وارڈ کو صاف ستھرا رکھا ہے جی۔ ایک اور صحافی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے وارڈ میں ایک "گوررسنگ" ہے۔ پچھلے دنوں اخبارات میں اس کے کافی چرچے ہوئے۔ کیا آپ اس کی تفصیل پریس کو دے سکتے ہیں؟ ہم نے کہا۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے یہ محاورہ تو سنا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ کہ جس گھر میں بیری کا درخت ہو وہاں پتھر ضرور آتے ہیں، لیکن صاحب اس محاورہ کو ہم نے اپنے وارڈ میں بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔ آپ یقین کیجیے، بیری کے درخت ہمارے وارڈ میں بے شمار ہیں لیکن پھر بھی لوگ گھروں میں بیٹھے پتھروں کو ترستے رہتے ہیں اور پتھر نہیں آتے۔ جب وارڈ میں ہم پتھر رہنے ہی نہیں دیتے تو آپ ہی بتایئے کہ پتھر آخر۔ ۔ ۔ آئیں گے کیسے؟ ہمارے وارڈ میں آپ کتنا ہی گھوم پھیر لیں۔ آپ کو پتھر نہ تو بیری کے درخت پر پھینکنے کے لیے دستیاب ہوں گے نہ سر پھوڑنے کے لیے نہ ٹھوکریں کھانے کے لیے۔ آپ یقین کیجیے، ہمارے وارڈ میں دانا ٹھوکریں کھانے کے لیے اور دیوانے لہولہان ہونے کے لیے پتھروں کے لیے بے چین رہتے ہیں اور بات یہاں تک پہنچی ہے کہ وارڈ کے اکثر بچے پتھروں کو دیکھنے کی ضد کرنے لگے ہیں اور بجائے کھلونوں کے پتھروں کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس تعلق سے پچھلے دنوں ہمارے وارڈ میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن محلہ میں کہیں کوئی پتھر نظر آ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس کیا تھا جناب دیکھتے ہی دیکھتے تمام محلہ میں پتھر آیا۔ پتھر آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا شور مچ گیا۔ عورتیں بچے، جوان، بوڑھے وارڈ میں پتھر دیکھنے دیوانہ وار دوڑے بھگدڑ مچ گئی۔ کئی لوگوں کو چوٹیں آئیں۔ ہم بھی اپنے وارڈ میں اس انہونی کو

دیکھنے موقعہ واردات پہ پہنچے۔ واقعی لوگوں کی بھیڑ کے درمیان ایک پتھر گلی میں پڑا ہماری صاف صفائی مہم کو منہ چڑا رہا تھا۔ پتھر کی موجودگی کے متعلق ہر طرف چہ میگوئیاں تھیں۔ لوگ حیران پریشان اور ہم فکروں میں ڈوبے ہوئے تھے کہ آخر یہ پتھر آیا تو کہاں سے اور لایا تو کس نے؟ ہم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مٹھیاں بھینچتے ہوئے مجمع کو مخاطب کیا۔ کون ہے وہ جس نے ہماری صاف صفائی کی تپسیا کو بھنگ کیا؟ بولو جواب دو۔ یہ پتھر آیا کہاں سے۔ کون نابنجار اس خبیث کو اٹھا لایا؟ بولو جواب دو۔ ہمارے سیاسی کیریر کو داؤ پہ لگایا کس نے؟ لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا، ہمارا گلا رندھ گیا۔ ہم نے کہا دوستو ... ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ ہم اس پتھر کی موجودگی کا پتہ نہیں چلا لیں گے۔ ہم بھوک ہڑتالیں کریں گے۔ دھرنے دیں گے۔ یہاں تک کہ ہم اس پتھر سے اپنا سر پھوڑ لیں گے۔ دم توڑ دیں گے لیکن اس پتھر کی موجودگی کا راز تو ہم جان کر رہیں گے اور پھر پتھر اٹھا کر ہم اپنا سر پھوڑنے والے ہی تھے کہ رحم رحم کہتا ہوا مجمع میں سے ایک شخص نادم، شرمسار، سر جھکائے نمودار ہوا۔۔۔ جناب اس ... کا میں ذمہ دار ہوں۔ اس پتھر کو میں اٹھا لایا تھا۔ آپ جو چاہیں مجھے سزا دے لیں۔ میں تیار ہوں۔ ہم نے ... آلود نظروں سے دریافت کیا، تم نے ہمارے ہوتے ہوئے وارڈ میں پتھر لانے کی جرأت کیسے کی؟ جواب میں وہ شخص بولا، اب میں کیا بتاؤں۔۔۔۔ میں بے ... لاچار تھا۔۔۔ اولاد کی محبت اور بچے کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ غلطی میں نے کی ہے۔ گزشتہ کئی دنوں سے میرا چھوٹا منا پتھر دیکھنے کے لیے بے چین تھا اور پتھر لا دو، پتھر لا دو کی ضد کیا کرتا تھا۔ اس نے کھانا ... سب کچھ چھوڑ دیا تھا، میں باپ تھا۔ مجھ سے بچے کا تڑپنا اور پتھر کے لیے ترسنا دیکھا نہ گیا اور دل پر پتھر رکھ کر پڑوس کے وارڈ سے جان جوکھم میں ڈال کر یہ پتھر اٹھا لایا۔ پھر وہ شخص گریہ و زاری کرتے ... کر دیجیے اس پتھر ... مجھے ... واقعی مجھے اس وارڈ میں جینے کا حق نہیں ہے۔ ... میری زندگی پر۔۔۔ بعد ازاں ہم نے ... نے اس شخص کو معاف کیا اور جم غفیر کے درمیان وارڈ کے نکڑ پر گورستان کھود کر اس پتھر کی تدفین کی اور وہاں گورستان کا کتبہ لگوایا۔ اس دن سے آج تک ہر آنے جانے والا اس کتبہ کو پڑھتا ہے اور ہماری صاف صفائی کی مہم کو سلام کرتا ہے۔۔۔۔۔ اب تیسرا صحافی ہم سے مخاطب تھا، آئے دن آپ اسپتالوں کے چکر کاٹتے نظر آتے ہیں تو یہ بتائیے کہ آپ کو کون سی بیماری لاحق ہے؟ ہم نے فوراً سنبھل کر کہا، دیکھیے جی ہمیں کوئی بیماری لاحق نہیں ہے بلکہ بیماروں کا ہم پر حق ہے جو ہم اسپتالوں میں ان کی مزاج پرسی کو جاتے ہیں۔ خصوصاً آپریشن کیس میں ہم ذرا بھی غفلت نہیں برتتے اور آپریشن ہوتے ہی ہم فوراً اسپتال پہنچ کر بجائے مریض کے ڈاکٹر سے رجوع ہوتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ بتائیے ہمیں وہ قینچی جس سے آپ نے آپریشن کیا ہے۔ اس موقع پر بہت سے ڈاکٹر تو واقعی قینچی ہماری ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں لیکن کچھ ڈاکٹر پس و پیش میں پڑ جاتے ہیں اور قینچی کے لیے مریض کا پیٹ کھولتے نظر آتے ہیں۔

خیر صاحب ہمارا انٹرویو دوسرے دن اخبارات میں شائع ہوا۔ جس سے ہمارے ووٹرس میں جوش و خروش پیدا ہوا اور مقابل امیدوار کے خیمہ میں کھلبلی مچ گئی۔ الیکشن سے قبل ہم نے اپنا انتخابی منشور بھی جاری کیا جس میں ہم نے اپنے ووٹرس سے وعدہ کیا کہ ہم الیکشن میں منتخب ہونے کے بعد حسب ...

وارڈ میں صاف صفائی کے کام کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے اور اپنے وارڈ میں گندگی کو پنپنے نہیں دیں گے لیکن اس کے باوجود بھی گندگی ہو جاتی ہے تو ہم کوشش یہ کریں گے کہ گندگی کے ڈھیروں پر مچھروں کا بسیرا نہ ہو اور اگر پھر بھی مچھروں کی نسل پروان چڑھ ہی جاتی ہے تو ہم گاندھی جی کے اہنسا کے اصولوں کو مشعلِ راہ بنا کر نیز مینکا گاندھی کے خوف کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے وارڈ کے اس بین الاقوامی پرندے کو ماریں گے نہیں بلکہ ہم محکمۂ صحتِ عامہ کو ہلا کر رکھ دیں گے اور اسے مجبور کریں گے کہ وہ نس بندی کے کیمپ لگوا کر مچھروں کی نس بندی کرے تاکہ ملیریا اور ڈنگو بخار سے ہمارے وارڈ والوں کو نجات ملے۔ ہم نے انتخابی منشور میں یہ بھی کہا کہ جن ووٹرس کے گھروں میں بہوئیں ہوں گی ان گھروں میں گھاسلیٹ کے آزادانہ استعمال پر ہم کڑی نظر رکھیں گے تاکہ گھروں میں چراغ اور اسٹو ہی جل سکیں اور بہوئیں محفوظ رہیں اسی طرح ہم وارڈ کے نونہالوں کو ٹی۔بی۔ چیچک اور کالرا سے بچانے کے لیے تمام تر احتیاطی اقدامات بروئے کار لائیں گے۔ خصوصاً پولیو کی دواؤں کی خوراک تو ہم اپنی موجودگی میں گود میں لٹا کر ہر بچہ کو پلوائیں گے تاکہ وارڈ میں ایک بچہ بھی معذور نہ ہونے پائے۔

ہمارے انتخابی منشور کے شائع ہو کر تقسیم ہوتے ہی ہمارے مخالف امیدوار نے بھی اپنا انتخابی منشور پیش کیا ..... جس میں اس نے ہمارے ہر اچھے تعمیری کام سے اختلاف کیا اور ووٹروں سے وعدہ کیا کہ وہ بھی صاف صفائی کے کاموں کو اولیت دے گا لیکن اتنی بھی نہیں کہ وارڈ کے لوگ بیری کے درخت دانا اور دیوانے پتھروں کو ترس جائیں۔ اسی طرح اس نے عوام سے جلی حروف میں وعدہ کیا کہ جن گھروں میں بہوئیں ہوں گی ان گھروں میں گھاسلیٹ کی وافر مقدار فراہم کروانا اس کا اخلاقی فرض ہوگا، سماجی ذمہ داری ہوگی۔ وارڈ کے عوام کی غریبی اور بے روزگاری دور کرنے کے متعلق ایک انوکھا وعدہ اس نے یہ بھی کیا کہ الیکشن میں منتخب ہونے کے بعد وہ ننھے بچوں کو پولیو کی دی جانے والی دواؤں کی خوراک کی بھرپور مخالفت کرے گا نیز بچوں میں پولیو کو پروان چڑھانے کے تمام تر مواقع فراہم کرواتا رہے گا کیوں کہ اس کی دانست میں آج کے موجودہ دور میں بچوں کو جسمانی طور پر تھوڑا بہت معذور رہنا ہی چاہیے تاکہ مستقبل میں سرکاری سہولتوں سے وہ فیض یاب ہو سکیں، اپنے خاندان کی کفالت کے اہل ہو سکیں۔

الغرض ہم وارڈ میں اپنے تعمیری کاموں اور سماجی خدمات کے تئیں بہت زیادہ مطمئن تھے اور الیکشن میں کامیابی کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ..... لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ جب الیکشن کے نتائج سامنے آئے تو ہم دم بخود تھے۔ پتہ نہیں کیوں ووٹروں کو ہمارے تمام ہنر عیب لگے تھے اور ہمارے مخالف امیدوار کے عیبوں کو خدا جانے انھوں نے کیسے ہنر مان لیا..... خیر جو بھی ..... الیکشن میں نہ تو "گورسنگ" ہمارے کام آئی نہ مردہ کتے، بلّیاں، مرغیاں اور چوہے پھنکوانا ہی کام آیا ..... الیکشن میں ہمیں شکست ہوئی اور مخالف امیدوار جیت گیا۔ نتیجتاً ہمارے مخالف امیدوار کے گلے میں الیکشن کے پھول ہار آئے اور ہمارے نصیب میں الیکشن کی ہار آئی۔

●●

جیونت دلوی
مترجم : محمد اسد اللہ (ناگپور)

(مراٹھی کہانی)

تیرا آنا نہ تھا ظالم

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بیان کرتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ بالائی منزل پر ایک خاتون آکر رہنے لگی اور چال میں برسوں سے رہنے والے مجھ جیسے شریف لوگ بدمعاشوں میں شمار ہونے۔ بھلا اس بات پر کون یقین کرے گا۔ اب یہی دیکھیے۔ سردیوں کے موسم میں ہم لوگ "گوند پاک" کھانے کے عادی ہیں کہ یہ مقوی بدن ہے اور ایسا بھی نہیں کہ اس چال میں چندرا بائی کی آمد کے بعد ہم یہ قوت بخش دوائی کھانی شروع کی۔ اس کا استعمال کرتے ہوئے زمانہ گزر گیا اسی لیے تو گولڈن جوبلی کے باوجود صحت برقرار ہے۔

خیر اسے جانے دیجیے۔ اصل مدعا یہ کہ اب ہمارے گوند پاک کھانے پر پابندی کیوں۔ ہمارا ان کا خیال ہے کہ ہم یہ چندرا بائی کے لیے کھا رہے ہیں۔ یعنی اسے طاقت دکھانے کے لیے۔ کل ہی کی بات لیجیے۔ موسلے وید اوپر آئے تو آپ کے ہاتھ میں گوند پاک کی شیشی تھی۔ ہم نے ان سے کہا۔ بھئی مصیبت تم اپنے ہی گھر لے جاؤ"۔

ہم پر دوسرا الزام یہ ہے کہ ہم گیلری سے اس عورت کو دیکھتے ہیں۔ بالفرض اگر دیکھیے تبھی ہیں (واقعی دیکھتے ہیں) تب صرف دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ آخر اس سے کسی کا کیا بگڑتا ہے؟ مگر سمجھائے کون؟

گزشتہ پورا مہینہ یونہی گزر گیا۔ مگر ہم کیرم نہیں کھیل پائے۔ ؟ تو صاحب گیلری میں مت بیٹھو ورنہ تم اس عورت کو دیکھوگے۔ بھلا اس کا کیا جواب دیں۔

آج موسلے جان ہتھیلی پر لے کر کیرم بورڈ اٹھا لایا لہٰذا ہم کھیلنے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس کے آتے ہی گوکھلے نازل ہو گیا۔ ہمیں دیکھ کر جوشی ماسٹر بھی کھینچے آئے۔ پڑوسیوں کی ایکتا اسی کو تو کہتے ہیں۔ . . . .

جوشی ماسٹر سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو کہا

بولے۔ "کنڈر پاک کھا رہے تھے"۔

ہمارا سینہ خواہ مخواہ دھڑکنے لگا ۔۔۔ "تو آخر وہ بوتل آپ نے ان کے ماتھے پہ مار ہی دی"
ہم نے گھبراتے ہوئے پوچھا ۔

"اور کیا"۔ انھوں نے جواباً کہا۔

"اور اگر ان کی بیوی نے دیکھ لیا تب؟" ۔۔۔ ہم

"زیادہ سے زیادہ ماسٹر کو کان پکڑوا کر بنچ پر کھڑا کر دے گی"۔

ہم نے پوچھا ۔۔۔ "جوشی صاحب! پاک کیسا لگا؟"

"ابھی کھایا کہاں ہے؟"

"یعنی؟"

"کل رات میں نے بوتل گھر میں چھپا دی تھی"۔ جوشی ماسٹر کہنے لگے۔ "اور آج اسے اسکول میں لے جا کر چھپا دیا۔ سوچا تھا کم از کم وہاں تو چین سے کھا سکوں گا۔ مگر جوشی ماسٹر یہ کیا ہے؟ ماسٹر اس شیشی میں کیا ہے؟"

خواہ مخواہ پوچھ تاچھ شروع ہو گئی۔ میں نے کہا آنولے کا مربہ ہے۔ کم از کم اب تو خاموش ہو جانا چاہیے تھا

اسی دوران گوکھلے نے کیرم بورڈ پہ پاؤڈر چھڑکنا شروع کیا۔ میں پہلے بری طرح چونکا۔

"بھائی پاؤڈر ذرا دیکھ بھال کر ڈالو"۔

"کیوں؟" گوکھلے بیزاری سے بولا۔

اتنی رامائن ہو چکی ہے۔ پھر بھی عقل نہیں آئی۔

یعنی

"بھئی بے احتیاطی سے پاؤڈر مت ڈالو۔ پاؤڈر ہاتھوں کو لگے گا۔ ہاتھ منہ کو ۔۔۔ اس کے بعد وہی انکوائری ۔۔۔ دوبارہ انکوائری، یہ پاؤڈر کس کا ہے؟ وہ تمھارے منہ کو کیسے لگا۔" وغیرہ

ہم نے تنگ آ کر کہا ۔۔۔ "بس! ۔۔۔

کھیل شروع بھی کرو۔ یہ موضوع بہت ہو چکا۔

"ہاں ہاں ضرور"۔ جوشی ماسٹر بولے "مگر موسلے کی بات لوڈی پائنٹ ہے"۔

"کیسا پائنٹ؟"۔

یعنی ہم مرد ہیں اس کے باوجود ہماری بیویوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کھانا منع، گیلری میں کھڑے رہنا بند وہاں پر اگر پان کا داغ پڑ گیا تو لگتا ہے کہ لپ اسٹک کا داغ ہے۔ ابھی دو دن پہلے میں ذرا گنگنایا۔ گنگنایا یعنی ایک لہر سی آئی، سوچا تھوڑا گا دوں اور بس بے موت مر گیا۔

گوکھلے دل کھول کر ہنسا اور بولا ۔۔۔ بھئی تم نے تو گانا گایا۔ میں نے تو صرف ریڈیو شروع جس میں اتفاق سے یہ گیت بج رہا تھا۔ "میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند سا مکھڑا ۔۔۔"

بس پھر کیا تھا۔ اس نے سارا گھر سر پہ اٹھا لیا۔ اسی وقت موسلے کو کچھ یاد آیا اور وہ زور سے ہنسا اور بولا۔
ارے باپ رے۔"

"اب تمھیں کیا ہوا؟"

"کیا بتاؤں، پرسوں بابٹ پر کیا قیامت ٹوٹی۔"

"کیوں کیا ہوا؟ —— ہم سب کا تجسس جاگ اٹھا۔

موسلے بولا۔" جوشی ماسٹر تم ہی سناؤ"، جوشی بولا نہیں تم ہی ٹھیک رہوگے۔

"اوں ہوں! یہ تمھارا پہلے آپ، پہلے آپ بند کرو —" ہم بھڑک اٹھے۔

"اچھا سنو" — موسلے بولا —— دو دن پہلے کی بات ہے، ویسے غلطی پوسٹ مین کی تھی۔ سنا ہے پوسٹ مین نے بابٹ کے نام آیا ہوا

لفافہ غلطی سے چندرا بائی کے کمرے میں ڈال دیا۔

"ارے باپ رے" ہم سب گھبرا گئے۔

"ٹھہرو —— گھبرانے کی کوئی بات نہیں" موسلے بولا "شام کو بابٹ جب سر جھکائے اوپر چڑھ رہا تھا اور وہ اوپر پہنچا"

"ٹھہرو ٹھہرو" اس کے آگے میں سناتا ہوں،" جوشی ماسٹر بولا۔ کیونکہ اس کے آگے کا سب میں نے دیکھا ہے۔ اسی کو مشاہدہ کہتے ہیں"۔ وہ اسکول میں بچوں کو پڑھانے کے انداز میں بولا۔

"ماسٹر۔ املا نویسی بند۔ مطلب کی بات کرو"

ہاں! ذرا غور سے سنو، جوشی ماسٹر اٹھ کھڑا ہوا اور جو کچھ ہوا اداکاری کے ساتھ بیان کرنے لگا۔" ہاں تو بابٹ ایسے مڑا اور پھر وہ آگے آئی اور بولی" بابٹ"۔

"کیا واقعی اس نے ایسے کہا۔"

بالکل ایسے ہی کہا۔ اس کے ایسا کہتے ہی میں گھبرا گیا۔

تم کیوں گھبرائے؟

مجھے لگا کہ وہ مجھ ہی کو بلا رہی ہے۔

پھر؟

جوشی ماسٹر چونکے —— ہاں تو میں کہاں تک آیا تھا؟

"زینے تک"

"زینے تک میں کہاں آیا تھا۔" جوشی ماسٹر بری طرح گھبرائے۔ ہاں زینے تک بابٹ آئے تھے۔ وہ آگے بڑھے۔ ایسے —— بابٹ رکے۔ رکے نہیں ٹھٹکے۔ اس نے وہ لفافہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ہے بھگوان" ہم جان بوجھ کر گھبرا گئے۔

"ہے بھگوان کیا کہتے ہو۔ بابٹ اوپر کس طرح آئے یہ بابٹ کو معلوم اور مجھے۔ بابٹ ہی کیا خود میں بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بابٹ کی بیوی نے دیکھا۔ میری بیوی نے دیکھا اور نہ جانے کس کس نے دیکھا

یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"بات کو خواہ مخواہ طول مت دو۔ آگے کیا ہوا ذرا جلدی بتا دو۔" گوکھلے جھلایا۔ بابٹ وہ خط لے کر اسی طرح اوپر آئے بابٹ کے اوپر آتے ہی بابیٹنی (بابٹ کی بیوی) فوراً آگے بڑھی۔ ہم وہیں تھے بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ مگر خط میں کیا تھا؟"

بابٹ نے سب کے سامنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے وہ لفافہ کھولا۔

"اسی کا، اسی کا خطرہ؟"

"پھر کس کا؟ گوکھلے بے قرار ہو اٹھے۔

"خط میں کیا تھا؟"

خط میں Best کمپنی کا بسٹ یعنی بی ای۔ ایس۔ ٹی۔ یعنی بامبے الکٹریکل سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ۔ اس سے پہلے یہ ٹرانسپورٹ کے بجائے ٹرام ویز

ہوا کرتا تھا۔ لیکن ٹرام ویز بند۔۔۔۔۔۔"

"شٹ اپ" گوکھلے غصے سے اکھڑ گیا۔ "کلاس روم میں پڑھانے جیسا مت بولو۔ خط میں کیا تھا؟"

"خط میں نوٹس۔ بجلی کا بل پندرہ دن کے اندر بھر دو ورنہ بجلی کاٹ دی جائے گی۔"

"بس اتنا ہی؟"

"تمھیں اور کیا چاہیے؟"

"ہمارا خیال تھا کوئی اور لفڑا ہوگا۔"

Best کمپنی کے لفافے میں اور کیا ہوگا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟" ہم نے جوشی ماسٹر کو آگے بڑھایا۔

"بابٹ کے کمرے کے گرد بھیڑ لگ گئی تھی۔ بابٹ تھوک نگلتے ہوئے بولے"۔ ماسٹر! یہ بھیڑ ہٹاؤ یہاں سے۔ اتفاق سے میں اسکاؤٹ ماسٹر بھی ہوں۔ اس لیے فوراً جیب سے وِسل نکالی۔ وِسل بجاتے ہی بھیڑ فوراً چھٹ گئی۔ تب بابٹ اپنے کمرے میں گئے۔ پھر بابیٹنی داخل ہوئی۔ کمرہ کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے۔

"اور پھر مارا ماری؟ گوکھلے نے گھبرا کر پوچھا۔ لیکن جوشی ماسٹر کلاس روم میں بچوں پر جھلا اٹھنے کے انداز میں چیخے۔ "تمھیں یہ باتیں ترتیب وار چاہیے یا ایک دم ختم کر دوں۔ اسکول کے بچوں کی طرح حرکتیں مت کرو۔"

"ہاں ہاں۔ ترتیب وار بتاؤ۔" ہم نے کہا۔

اس کے بعد اس نے بابٹ کی تلاشی لی۔"

کھڑکیاں اور دروازے تو بند تھے۔ تمھیں پھر کیسے پتہ چلا؟"

معلوم کیا ہوا۔ اسی لیے تو لغباری بھا شا میں بول رہا ہوں کہ تلاشی لی۔

پھر کیا ہوا؟"

دروازے کھڑکیاں بند، آدھی رات تک، دونوں میں سے ایک کھلے گی۔ میں اسی امید پر جاگتا رہا۔

"پھر؟"

"مگر نہیں ایک بھی کھڑکی نہیں کھلی"

"پھر؟"

"میں کہاں تک جاگتا۔ صبح اٹھ کر اسکول بھی جانا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے سو گیا"

"افوہ! پاگل ہو تم۔ گوکھلے دانت پیس کر بولا۔ اگر تم نہ سو دیتے .... نہیں سوتا؟ ——— جوشی ماسٹر بری طرح جھلا گیا۔ کیا مجھے گورکھا چوکیدار سمجھ رکھا ہے۔

"خیر۔ خیر۔ لیکن صبح کیا ہوا؟"

صبح دیکھا تو باپٹ کے کمرہ پر تالا پڑا ہوا تھا۔

"اندر سے؟"

اندر سے کیوں باہر سے۔ یعنی باپٹ کی بیوی اسے لے کر مائیکے چلی گئی۔

بس تمھیں اور کیا چاہیے؟" جوشی ماسٹر۔

یہ سنتے ہی گوکھلے جوشی پر برس پڑا۔ "ماسٹر اسکول کے لڑکے تمھیں گالیاں دیتے ہیں تو کچھ برا کرتے۔ تم اسی قابل ہو۔ دولائین کی خبر اد ہر سے کھینچ تان کر شیطان کی آنت بنا دیا۔

"بس بس بہت ہو چکا۔ چلو اب کھیلو" ——— ہم نے کہا۔

یہ سب سن کر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ آخر ہم نے کیا سنا؟ شاید کچھ بھی نہیں مگر یہ بات اپنی جگہ فی صد سچ ہے کہ ہم شریف لوگوں کے تجسس کی کوئی انتہا نہیں۔!

فارم IV حسب قاعدہ 8

بابت ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد 500001

۱۔ مقام اشاعت ۳۱ بیچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

۲۔ وقفہ اشاعت ماہنامہ

۳۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

۲۴۸-۶-۱۷ دبیرپورہ حیدرآباد حیدرآباد 500023

۴۔ مالک کا نام اور پتہ قیصر کمال " " " " " "

۵۔ پتہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد 500001

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

سید مصطفیٰ کمال

دستخط

۵۔ مارچ ۱۹۹۷ء

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد: ۳۰ شمارہ: ۴ اپریل ۱۹۹۷ء

قیمت فی پرچہ: ۱۰ روپے

زر سالانہ: ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔۱

فون آفس: 595716 فون رہائش: 4576064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چورن (منظومات)

آندھراپردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس: 825/8-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد (اے پی)

حکومت آندھراپردیش کی جانب سے چلایا جانے والا اِدارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مُسلمان، سکھ، عیسائی، پارسائی، جینی اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں ۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سُود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابا قی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ۔ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری ۹۷ء تک 63288 افراد میں 1753.25 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 7120.92 لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1501 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 119.25 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 476.22 لاکھ روپے ہوتی ہے

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مُفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو، نظام آباد میں 197، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشن، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔

خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت
ایم کام۔ ایل ایل۔ ایم
نائب صدر نشین و مینجنگ ڈائرکٹر

یوسف ناظم ٭

لوگوں کے محبوب

سیاست کے جگر

ہندوستان میں دو جگر بہت مشہور ہوئے۔ ایک علی سکندر جگر اور دوسرے محبوب حسین جگر۔ علی سکندر جگر کی شہرت ذرا زیادہ ہوئی۔ اس لیے کہ انھوں نے تخلص بھی رکھا اور اس کی خاطر شعر بھی کہے۔ جب کہ محبوب حسین جگر نے صرف تخلص رکھا۔ تخلص رکھنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کا کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ یہ پابندی تھی کہ تخلص رکھا تو شعر بھی کہو۔ شعر کہنے کی انھیں اس لیے بھی ضرورت پیش نہیں آئی کہ ان کی طرف سے علی سکندر جگر نے خاصہ کلام کہہ ڈالا انھوں نے اتنا کلام کہہ ڈالا کہ دونوں کے لیے کافی تھا۔ وہ زمانہ برادرانہ تعلقات کا تھا اور دو ہم تخلص لوگوں میں اتنا بھائی چارہ تھا کہ خاص طور سے شاعری کے معاملے میں کوئی غیریت نہیں برتی جاتی تھی۔ یہ تیرا وہ میرا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس طرح محبوب حسین جگر فائدے میں رہے میں نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ حیدرآباد کے مشاعرے میں جگر مرادآبادی کلام سناتے رہے اور جتنی بھی داد انھیں ملی اس کے جواب میں محبوب حسین جگر سلام کرتے رہے۔ جگر مرادآبادی یوں بھی اس زمانے میں ڈوب کر کلام سناتے تھے اس لیے انھیں شاید خبر بھی نہیں ہوئی کہ داد کون سمیٹ رہا ہے ایسے مستغنی شاعر اب کہاں ہیں۔ مانگ مانگ کر داد حاصل کرتے ہیں اور اپنا مقابلہ موسیقاروں سے کرتے ہیں کہ میں ان کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوں جن سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں ان کی صنف بھی نہیں دیکھتے۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے اس وقت سنہ شاید ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء رہا ہوگا۔ محبوب حسین جگر جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تھے اور چوں کہ جامعہ عثمانیہ سارے ہندوستان میں پہلی اردو یونیورسٹی تھی اس لیے اس یونیورسٹی کے طالب علموں کو اجازت تھی کہ جس شاعر کا کلام پسند آئے اُسے اپنا سمجھ کر داد حاصل کریں لیکن محبوب حسین جگر نے اس رعایت کا فائدہ صرف ایک ہی بار اُٹھایا۔ جگر مرادآبادی اس کے بعد بھی کئی مرتبہ حیدرآباد آئے۔ انھوں نے مشاعرے بھی پڑھے۔ محبوب حسین جگر بھی ان مشاعروں میں موجود تھے لیکن شاید انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ جگر مرادآبادی اب ڈوب کر شعر نہیں سناتے ہیں۔ دونوں محتاط ہو گئے تھے۔

محبوب حسین جگر سے میری پہلی ملاقات جامعہ عثمانیہ ہی کے اقامت خانہ الف میں ہوئی۔ میں اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے سال اول کا طالب علم تھا اور آرٹس کالج کے افتتاح کی تقریب کے موقع پر بین الکلیاتی تقریری مقابلہ منعقد ہوا تھا اس میں اورنگ آباد کالج کے نمائندے کی حیثیت سے حیدرآباد آیا تھا۔ ابراہیم جلیس گلبرگہ کے کالج کے نمائندے تھے۔ لیکن میری شاید ان

سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ محبوب حسین جگر اسی ہاسٹل میں تھے اور اس تقریری مقابلے کے نگراں کار تھے۔ اصل مقابلے سے ایک دن پہلے انھوں نے میرا امتحان لیا اور ہاسٹل میں ایک ریہرسل مقابلہ منعقد کیا۔ میری تقریر انہیں اتنی پسند آئی کہ انھوں نے شاید اعلان کر دیا کہ اصل مقابلہ میرے ہی ساتھ رہے گا۔ دوسرے دن جب مقابلہ ہوا مجھ پر کافی ہوٹنگ ہوئی۔ ہوٹنگ تو دونوں پر ہی ہوئی لیکن مجھ پر زیادہ دیر تک رہی۔ ہاں میں نے مقابلہ جیتا۔ یہ ثابت قدمی کا انعام تھا تقریر کا نہیں کیوں کہ تقریر تو کسی کو سنائی ہی نہیں دی۔ محبوب حسین جگر نے اس دن بھی مجھے مبارکباد دی۔ اس واقعے کو نصف صدی اور [illegible] سال ہو گئے ہیں لیکن ان کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ ان کی اس مبارکباد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں میں نے کسی تقریری مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ (سامعین بھی ہاتھ ملتے رہ گئے)۔

محبوب حسین جگر اور عابد علی خاں میں اسی زمانے میں دوستی ہوئی۔ حالانکہ عابد علی خاں اقامت خانہ میں نہیں رہتے تھے لیکن ان دونوں کی دوستی کا شہرہ دور دور تک تھا اور اس کی مثال دی جاتی تھی اور عابد علی خاں نے جب روزنامہ سیاست جاری کیا تو اس وقت ان کے دست راست محبوب حسین جگر ہی تھے۔ اس وقت لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کا شعر نہ کہنا سیاست کے کتنا کام آیا۔ میرا خیال ہے صحافت اس سے پہلے ہندوستان میں ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو باضابطہ شعر کہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا فضل الحسن حسرت موہانی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی سب باضابطہ شاعر تھے۔ عبدالمجید سالک بھی شاعر تھے اور جوش ملیح آبادی نے بھی ایک رسالہ کلیم کی ادارت کی۔ خود حیدرآباد میں جتنے اخبار شائع ہوتے تھے ان کے مدیر شاعر بھی تھے۔ نائب مدیر بھی شاعر تھے۔ صرف سیاست وہ اخبار تھا جس کے مدیر اور منتظم دونوں غیر شاعر تھے۔ عجیب بات ہے کہ اس اخبار کی وجہ سے حیدرآباد میں سیاست کا مشاعرہ پیدا ہوا اور وہ آج بھی زندہ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں "سید برادران" کا نام اس لیے مشہور ہے کہ یہ بادشاہ نہیں تھے۔ لیکن بادشاہ گر تھے۔

محبوب حسین جگر کو میں نے دفتر سیاست میں کبھی سیدھی کرسی پر بیٹھے نہیں دیکھا۔ ان کی کرسی کا زاویہ ہمیشہ کج رہا ہو سکتا ہے وہ اسے کج کلاہی قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہوں۔ ان کی نشست کا یہ اسٹائل ہمیشہ میرے دل کو لگا۔ ساتھ بیٹھنے میں قربت کا احساس الگ ہوا (ویسے دوری کا کبھی احساس ہوا ہی نہیں) سیدھے آدمیوں کو ہمیشہ ایسی ہی کرسی پر بیٹھنا چاہیے جس کا رخ دوسری ساری کرسیوں سے مختلف ہو۔ نہ مشرق نہ مغرب، جنوب مشرق یا جنوب مغرب۔ (شمال کی سمت میں نے جگہ مزار آباد کے لیے چھوڑ دی) محبوب حسین جگر نے شاید ہی زندگی میں کبھی فاؤنٹن پن خریدا ہو۔ رف کاغذ پر لکھنے کی اتنی عمدہ مشق کسی اور کو ہوگی بھی نہیں۔ کسی طبیب نے شاید انہیں سفید کاغذ کا پرہیز بتایا تھا۔ سیاست کے دفتر میں جتنا بھی اخباری کاغذ کا کوٹہ درآمد ہوتا ہے اس کا دس فیصد تو یقیناً جگر ہی استعمال کرتے ہوں گے۔ کوئی مضمون کوئی تحریر کوئی خط ان کے قلم کی زد سے شاید ہی بچا ہو۔ طویل مضمون کو مختصر کرنا تو سبھی کو آتا ہے لیکن مختصر مضمون کو مختصر کرنا صرف محبوب حسین جگر کا حصہ ہے (معاوضہ کا بھی یہی قصہ ہے) عابد علی خاں سے میں نے دو چار مرتبہ ذکر بھی کیا کہ کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان میں مہنگائی بہت ہو گئی ہے اور انھوں نے بس ایک ہی جواب دیا جگر صاحب سے کہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ عابد علی خاں سے لوگ بات کرتے تھے [illegible] ان کے اس پہلو پر شاید لوگوں کی نظر نہ گئی ہو۔ میری بھی بہت دنوں بعد گئی۔

حیدرآباد میں بٹوہ استعمال کرنے والے اب کتنے رہ گئے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر زور البتہ جب بھی کلاس میں

آئے بٹوہ ان کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد میں نے شاذ تمکنت کو بٹوے کے ساتھ دیکھا لیکن مرحوم پان کھانے کے معاملے میں بہت فیاض تھے فیاض ان معنے میں کہ پان کھاتے بھی تھے اور جگہ جگہ چھڑکتے بھی تھے۔ وہ پان کھائیں یا نہ کھائیں اُن کا لباس بتا دیتا تھا کہ وہ پان کھاتے ہیں۔ محبوب حسین جگر کو پان کھانے کا سلیقہ تھا کیا مجال جو اس کا ایک قطرہ بھی اِدھر اُدھر ٹپک جائے۔ عزّتِ انفعال ان کے یہاں آیا ہی نہیں۔ اخلاق و آداب میں حیدرآباد کی روایتی کمزوریاں برقرار ہیں۔ کھڑے رہ کر گلے ملنے کی رسم اُن سے چھوٹتی نہیں تھی۔ انھیں شاید معلوم نہیں تھا کہ گلے ملنے سے فریق ثانی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کتنے دُبلے ہو گئے ہیں۔ دُبلا ہونا بُری بات نہیں ہے لیکن اس کی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ ایک بات بہرحال یہ اچھی ہے کہ ان کی کم سخنی نے انہیں گوشہ نشینی پر راغب نہیں کیا۔

محبوب حسین جگر بے حد نقطہ سنج شخص تھے۔ اتنی باریک بینی سے مضامین اور نظموں کا مطالعہ کرتے تھے کہ حرفوں کے نقطے تک ان کی نظر میں رہتے تھے۔ اگر "ش" پر انھیں ایک نقطہ کم دکھائی دیتا تھا تو وہ نقطہ نہیں لگاتے تھے اُس لفظ ہی کو تحریر سے جدا کر دیتے تھے اور مضمون خود بخود مختصر ہو جاتا تھا۔ ان کی اس عادت کا ہر اس شخص کو علم تھا کہ وہ کاغذ اٹھانے سے پہلے قلم اٹھاتے تھے۔ تصحیح پہلے کرتے تھے مضمون کا مطالعہ بعد میں۔ جب تک مطمئن نہیں ہو جاتے دوسرا پان نہیں کھاتے تھے۔

اکثر صحافی اپنے لیے اعلیٰ درجے کے قلم کا انتخاب کرتے تھے بلکہ بعض صحافی تو صرف اچھے اچھے قلم جمع کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ یہ قلم دشمن صحافی ہوتے ہیں۔ محبوب حسین جگر نے ہمیشہ لوگوں کے نتیجہ قلم کو اہمیت دی اور یہ دیکھا کہ اس میں "فکر" کا عنصر ہے یا نہیں اور اسے نتیجہ فکر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اتنی فکر کرنے والے صحافی کو کم سے کم میں نے نہیں دیکھا۔ ان کے بس میں نہیں تھا ورنہ وہ اخبار کا نام بھی سیاست کی بجائے "صحافت روزنامہ" کر دیتے۔ □□

چوکے

دلاور فگار
(پاکستان)

○

ایک دن ویدر رپورٹ اخبار میں نل ہے تو پھر
کیا قیامت آگئی ، کیوں حشر برپا ہوگیا
گوشت کے ہفتے میں دو ناغے ہیں اور پانی کے تین
ایک دن موسم کا ناغہ ہوگیا تو کیا ہوا

○

قیمت اپنی گائے نے لکھ رکھی تھی پچیس ہزار
ساتھ ہی تاکید یہ تھی بات اس کی مان جاؤں
یہ ہدایت دیکھ کر میں نے یہ پوچھا گائے سے
تیری قربانی کروں یا میں ترے قربان جاؤں

○

ایک صاحب توتے کے مرنے پہ یوں غمگین ہیں
جیسے دادا کو یہ غم ہو اس کا پوتا مر گیا
تعزیت کرتے ہیں اب ہم بھی کہ ہے ہم کو یہ غم
طوطا چشمی رہ گئی دنیا میں توتا مر گیا

○

تھا سپاہی اور چور اک کھیل لیکن اب کہاں
چور ڈرتے تھے سپاہی سے یہ جب کی بات ہے
اب سپاہی اور چور اس کھیل پر راضی نہیں
اس سے آگے کیا کہوں حدِ ادب کی بات ہے

○

مہدی حسن کی کار برآمد ہوئی جو آج
حالات پہلے جیسے پھر اک بار ہو گئے
جو رہ گئے تھے صرف گلوکار کے بغیر
جب کار مل گئی تو گلوکار ہو گئے

○

وحدتیں ہیں ملک میں چار، آپ یہ کیا کہہ گئے
ہم کو تو اللہ کی وحدت پہ ہے پورا یقیں
چار دیواری تو بے شک میرے گھر میں ہے مگر
چار دیواری کا مطلب چار دیواریں نہیں

○

دفتروں میں خورد بھی موجود ہیں اور برد بھی
آپ کیا جانیں جو ان دونوں میں گہرا ناتا ہے
مرتشی دونوں ہیں ان میں صرف اتنا فرق ہے
برد رشوت لاتا ہے اور خورد رشوت کھاتا ہے

○

اک قطع شدہ کان کو بھی جوڑ دے گا سرجن
پھر کیوں ہمیں اس کان کے کٹ جانے کا غم ہو
کیا اور کسی کان سے مطلب نہیں لیکن
جس کان پہ رکھا ہے قلم وہ نہ "قلم" ہو

○

مجتبیٰ حسین (دہلی)

★

اردو یونیورسٹی اور سہرا بندی

پچھلے دنوں اردو کے ایک بہی خواہ کا ایک درد بھرا مراسلہ ہماری نظر سے گزرا ہے جس میں مراسلہ نگار نے حیدرآباد میں مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی کے قیام کے حوالہ سے یہ شکایت کی ہے کہ اب، جب کہ اس یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوگیا ہے مختلف اصحاب اور ادارے اس دعوی کے ساتھ میدان میں کود پڑے ہیں کہ اس یونیورسٹی کے قیام کا سہرا ان کے سر باندھا جائے۔ مراسلہ نگار نے اس ضمن میں بعض اصحاب اور جماعتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ پوچھا ہے کہ کیا اس یونیورسٹی کے قیام کا سہرا کسی کے سر باندھنا نہایت ضروری ہے اور اگر یہ ضروری ہے تو پھر یہ سہرا کس کے سر باندھا جائے۔ مراسلہ نگار نے جس درد بھرے دل کے ساتھ یہ سوال پوچھا ہے اس کے پیچھے چھپے ہوئے جذبہ کی ہم دل و جان سے قدر کرتے ہیں اور اس مشکل کو حل کرنے کی خاطر اس نیک کام کے لیے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ ہم خود اپنا سر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف یوں بھی ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی بار سہرا بندھوایا ہے۔ (مزید تین سہروں کے بندھوانے کی گنجائش ابھی موجود ہے) سوچا کہ جہاں اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بندھوانے کے لیے اتنے سارے امیدواروں کے سر میدان میں موجود ہوں وہاں ہم اپنا سر بھی کیوں نہ پیش کردیں۔ اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائیں کیوں۔ مجنوں سے کسی نے بادشاہ کی جانشینی کے بارے میں پوچھا تھا کہ "میاں بتاؤ بادشاہ کے جانشین کی حیثیت سے کس کا دعوی ثابت ہوتا ہے؟" اس پر مجنوں نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بادشاہت کی اصل حقدار تو میری لیلیٰ ہی ہے"۔ مجنوں تو خیر پرانے زمانے کا عاشق تھا۔ لیلیٰ کے عشق میں اتنا ڈوب چکا تھا کہ بادشاہت پر خود اپنا حق جتانے کی جرأت نہ کرسکا اور لیلیٰ کے حق میں دستبردار ہوگیا لیکن زمانہ اب بدل گیا ہے۔ ہر کوئی اتنی آسانی سے اپنا حق چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ مجنوں اگر آج زندہ ہوتا تو نہ صرف لیلیٰ کے حقوق کو سلب کرلیتا اور اس کی جائیداد ہڑپ کرلیتا بلکہ کیا عجب ہے کہ اب تک اسے طلاق بھی دے چکا ہوتا۔ ماضی کے بہت سے عشق صرف اس لیے مشہور ہوئے کہ وہ آج کے زمانے میں وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو موجودہ ماحول میں اگر کوئی انصاف پسند انسان اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا خود اردو زبان کے سر باندھنے کی کوشش کر بیٹھے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بندھوانے کے خواہشمند امیدوار کہیں اردو زبان کا ہی سر قلم کردیں کیوں کہ ان دنوں اردو کے بیشتر بہی خواہوں کا وطیرہ یہ ہے کہ اردو زبان کی ترقی ہو یا نہ ہو خود ان کی شخصی ترقی ضرور ہونی چاہیے —

بہرحال اب جب کہ ہم نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے اپنا سر پیش کردیا ہے تو اس میں کسی کو اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس دعوے کے معاملے میں ہمارا یہ استدلال ہے کہ نوجوانی میں ہم نے ایک اردو یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور ہمارا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی تھا اگرچہ ہم سراپا عجز و انکسار ہیں لیکن پھر بھی ہمارا یہ حقیر سا دعویٰ ہے کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بندھوانے کے کئی خواہشمند حضرات سے کہیں بہتر اردو جانتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو مقابلہ کرا کے دیکھ لیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ اتنا تو ہونا ہی چاہیے کہ جس کے سر اردو یونیورسٹی کا سہرا باندھا جائے وہ خود بھی تو اردو جانے۔ پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ پچھلے چالیس برسوں سے ہم اردو میں قلم گھسنے کے علاوہ اپنے آپ کو بھی گھس رہے ہیں۔ جیسا کچھ بھی لکھتے ہیں اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ کسی اور زبان میں نہیں لکھتے (یہ الگ بات ہے کہ ہمیں کوئی اور زبان نہیں آتی) ہم مذکورہ بالا سہرے پر اپنا حق منوانے کے لیے اور بھی کئی دعوے پیش کرسکتے ہیں لیکن عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یوں بھی ہم نے چالیس برس پہلے اپنی شادی کا سہرا بندھوایا تھا پھر اس کے بعد کوئی سہرا نہیں بندھوایا۔ آپ چاہیں تو ہمارا ریکارڈ دیکھ لیں۔ اب اگر کوئی سہرا بندھوانے کا جھوٹ موٹ بھی اشارہ کردے تو ہم اس لنگڑے بھکاری کی طرح انتظار کرنے کو تیار ہیں جو بھیک مانگنے کے ارادے سے ایک گھر کے دروازے پر گیا تو دیکھا کہ نند اور بھاوج میں زوردار لڑائی ہو رہی ہے۔ لڑتے لڑتے ایک مرحلہ پر بھاوج نے نند کو دھمکی دی۔ "اگر تو راہ راست پر نہیں آئے گی تو میں تیری شادی اس لنگڑے بھکاری سے کروادوں گی" بعد میں تو خیر نند اور بھاوج لڑتے لڑتے اندر چلی گئیں اور ان کا جھگڑا بھی ختم ہوگیا لیکن بڑی دیر بعد گھر کے دروازہ سے اس بھکاری کی آواز آئی۔ بی بی آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے میرے لیے کیا حکم ہوتا ہے "ٹھہروں یا چلا جاؤں"۔

اصل میں سہرا بندھوانے کی روایت اردو تہذیب کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے اچھے شاعروں نے شادیوں کے موقع پر بے پناہ سہرے لکھے ہیں۔ استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق نے تو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پر سہرا لکھ کر ایک مصرعہ میں مرزا غالب کو للکارا تھا کہ

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اس کے جواب میں مرزا غالب کی شاعرانہ چمک نے زور مارا تو انھوں نے بھی سہرا لکھا اور مقطع میں ذوق کو یہ کہہ کر للکارا کہ

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

غرض ہم نے کسی اور زبان کے شاعر کو کسی اور کی شادی کے موقع پر خوش ہو ہو کر سہرے کہتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دنیا بھر میں شادیاں ہوتی ہیں لیکن سر سے سہرا باندھنے کی روایت خالص ہندوستانی ہے۔ ہمارے ایک جاپانی دوست نے ایک شادی میں دولھا کو سر سے پاؤں تک سہرے میں بندھا ہوا دیکھ کر پوچھا تھا۔ "آخر دولھا نے اپنا منہ کیوں چھپا رکھا ہے۔ اپنے چہرہ سے سہرے کو کیوں نہیں ہٹاتا" اس پر ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ "بھیا شادی کے موقع پر چونکہ اکثر دولھے اپنے منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہتے اس لیے سہروں میں ملفوف ہوجاتے ہیں" اگر ہم نے اپنی تہذیب میں سہروں کو اتنی اہمیت نہ دی ہوتی تو آج اردو یونیورسٹی کے قیام کی آڑ میں اپنے سروں پر سہرے بندھوانے کے خواہشمندوں کی اتنی بھیڑ نہ لگی ہوتی۔ ہماری اردو زبان کی یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ان دنوں جو کوئی بھی اس کے لیے ذرا سا کام کرتا ہے تو فوراً اپنا سر سہرا بندھوانے کے لیے پیش کردیتا ہے۔ اردو تو مرجھا رہی ہے لیکن اس کے نام نہاد بہی خواہوں کے سہروں کے پھول کھلتے چلے جارہے ہیں۔ ہم نے تو اپنے سہرے کا ناپ بھی پہلے سے لے رکھا ہے کہ عین وقت پر سہروں کے بنوانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ مبادا ہم اسے سر سے باندھنے

کی کوشش کریں تو سہرا گلے میں آجائے۔

سچ پوچھئے تو جب سے اس یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا ہے ہمیں فرانس کی ملکہ میری انطونیت کی بے پناہ یاد آرہی ہے۔ اس کے زمانہ میں جب فرانس میں بھیانک قحط پھیلا تو لوگوں نے میری انطونیت سے کہا "عوام کے پاس کھانے کے لیے روٹی تک نہیں ہے"، اس پر میری انطونیت نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تھا "اگر عوام کے پاس کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے"، اردو یونیورسٹی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یونیورسٹی سے نیچے کے درجات میں تو اردو پڑھانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے تاہم طلبا سے کہا جارہا ہے کہ وہ بی۔ اے کریں اور اگر ایم۔ اے بھی نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم پی ایچ ڈی ہی کرلیں۔ آپ کو کس نے روکا ہے۔ گویا اردو والے بیچارے اردو کی روٹی نہ کھا سکیں اردو کا کیک تو کھائیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ آزادی کے وقت اس ملک میں اردو کی ایک عالیشان یونیورسٹی موجود تھی جسے پہلے تو ختم کردیا گیا۔ اب پچاس برس بعد پھر ایسی ہی یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یونیورسٹی نہ ہوئی بچہ کا بنایا ہوا ایک ریت کا گھروندا ہوگیا کہ جب جی چاہا توڑ دیا اور جب جی چاہا بنادیا۔

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض اصحاب نہ صرف اس یونیورسٹی کے قیام کا سہرا اپنے سر بندھوانا چاہتے ہیں بلکہ بعض اصحاب تو اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے کے لیے دوڑ دھوپ کررہے ہیں۔ وائس چانسلروں کے بارے میں ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے کیوں کہ خدا کے فضل سے ہمارے کئی بے تکلف دوست مختلف یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر بنے ہوئے ہیں۔ دوستی کا حق نبھانے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم اس معاملہ میں خاموش رہیں تاہم ہمیں اس وقت مشہور شاعر حسن نعیم مرحوم یاد آگئے جو اردو کے بڑے طرحدار شاعر تھے لیکن تھے بے حد معصوم آدمی۔ وزارت خارجہ کے عہدہ دار تھے لیکن شاعرانہ رنگ میں وزارت خارجہ سے مستعفی ہوگئے تھے۔ آخری زمانے میں وہ ممبئی میں مقیم ہوگئے تھے جہاں انھوں نے غزل گانے والوں کی نئی نسل کو غزل گائیکی کی تربیت دینے کے لیے ایک "غزل کالج" کھول رکھا تھا۔ ایک بار دہلی آئے تو ہمارے دفتر بھی آئے۔ کسی مسئلہ پر انھوں نے ایک مراسلہ اپنے "غزل کالج" کے لیٹر پیڈ پر لکھ دیا جس کے بائیں طرف جلی حروف میں چھپا تھا "حسن نعیم پرنسپل غزل کالج"۔ ہماری رگ ظرافت پھڑکی تو ہم نے حسن نعیم سے کہا "حسن نعیم صاحب! آپ کو گھاٹے کا سودا کرنے میں ہمیشہ لطف آتا ہے۔ آپ کو غزل کالج قائم کرکے صرف پرنسپل بننے کی مجبوری تھی۔ اگر آپ نے غزل کالج کے بجائے غزل یونیورسٹی قائم کی ہوتی تو آج آپ اللہ کے فضل سے اس کے وائس چانسلر ہوتے۔ ہم نے سوچا تھا کہ حسن نعیم ہماری بات سے محظوظ ہوں گے لیکن وہ اچانک سنجیدہ ہوگئے اور بولے "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو میں تو بڑی آسانی سے وائس چانسلر بھی بن سکتا ہوں"۔ بعد میں پتہ چلا کہ چند مخلص احباب نے انہیں غزل یونیورسٹی کا لیٹر پیڈ چھپوانے سے روک دیا ورنہ وہ تو وائس چانسلر بننے چلے تھے۔ اتنا کہہ کر ہم وائس چانسلروں کے بارے میں اور کچھ نہیں کہیں گے۔ جہاں تک اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے سہرا بندھوانے کا سوال ہے تو ہم نے مسابقت کی اس دوڑ میں اپنا سر بھی پیش کردیا ہے۔ اب ہم اردو والوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ "اب آپ کا یہاں کیا کام ہوتا ہے"۔ "ٹھہریں یا چلے جائیں"۔

شامتِ اعمال

بازغ بہاری
(کلکتہ)

جب محفلِ گیتی سے مرا اُٹھ گیا دانہ
آخر ہوا دنیا سے اچانک میں روانہ

پہنچی جو مری روح ستاروں کی زمیں پر
آئی یہ صدا غیب سے رُک جاؤ یہیں پر

کھاتے لیے نازل ہوئے پھر چند فرشتے
ہر فعل و عمل کے مرے جس میں تھے نوشتے

داروغۂ رضوان نے رجسٹر کو جو کھولا
تفتیشِ عمل کے لیئے ہر پیج ٹٹولا!

لکھا تھا، ہے یہ طنز و ظرافت کا مداری
بنگال میں رہتا ہے مگر ہے یہ بہاری

طنّاز و ہزل گو ہے یہ شاعر یہ نہیں ہے
اوصافِ حمیدہ سے ریٹائر یہ نہیں ہے

ہر لمحہ گریزاں یہ رہا کذب و غلو سے
اور دُور رہا صبح و مسا جام و سبُو سے

قلّاش ہے لیکن نہیں پروردۂ الحاح
کرتا ہے فقط طنز سے یہ قوم کی اصلاح

منّت کشِ نقّاد و محقّق یہ نہیں ہے
حق بات لکھا کرتا ہے فاسق یہ نہیں ہے

نشتر جو لگاتا ہے یہ منقارِ قلم سے
ہتّھے سے اُکھڑ جاتے ہیں بھگوان ادب سے

فرمایا فرشتے نے ہے یہ مست قلندر
لے جاؤ اِسے جنّتِ فردوس کے اندر

جنّت میں عجب دیکھی مشیّت یہ خدا کی
تھی بیٹھی ہوئی باغِ اِرم میں مری بیوی

کی عرض فرشتے سے وہ بیٹھی ہے جو بڑھیا
وائف ہے مری وہ مگر آفت کی ہے پُڑیا

چالیس برس تک مجھے دُنیا میں رلایا
ماں باپ کے ایما پہ مجھے خوب ستایا

یہ بات بھلا پھر ہو مجھے کیسے گوارا
میں ساتھ رہوں پھر اسی آفت کے دوبارہ

تسلیم نہیں، میں نے کہا مجھ کو یہ جنّت
للّٰہ! مجھے کیجئے دوزخ ہی عنایت

آرڈر ہوا، لے جاؤ اسے سوئے جہنّم
لے جا کے سُنگھاؤ اسے خوشبوئے جہنم

پھر گیٹ پہ دوزخ کے جو پہنچا تو میں ٹھٹکا
افتاد نئی دیکھ کے ماتھا مرا ٹھنکا

یکلخت مرا ہونے لگا بائی پریشر
دیکھا جو خطرناک وہاں میں نے یہ منظر

تقدیر کی گردش مرے پیچھے یوں پڑی تھی
دروازۂ دوزخ پہ مری ساس کھڑی تھی

○

مصطفیٰ شہاب
(لندن)

یوسٹن
سے
سڈکپ تک

(مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ایک سفر)

فروری انیس سو ستانوے کی ایک کہر آلود صبح فون کی گھنٹی بجی بدمعاش، کل کیا کر رہے ہو؟

میں سمجھ گیا کہ دوسری جانب ساقی فاروقی بول رہے ہیں کیونکہ نہ صرف ان کی شاعری اور نثر دوسروں سے مختلف ہے بلکہ طرزِ کلام بھی ......

میں نے کہا "رمضان کا مہینہ ہے، روزے سے ہوں۔ کل چھٹی کا دن ہے لہذا دن بھر سونے کا ارادہ ہے۔"

بولے "خبردار..... یوسفی صاحب دو چار دن کے لیے ٹھورنٹن اپنی بیٹی کے ہاں آئے ہوئے ہیں۔ کل سارا دن ہم کو ان کے ساتھ گزارنا ہے۔" "کہاں" میں نے دریافت کیا "کیا ٹھورنٹن میں؟"

انھوں نے کہا "نہیں، وہ صبح ٹھورنٹن سے بذریعہ ریل ادریس بھابی کے ساتھ یوسٹن پہنچ رہے ہیں۔ سوا گیارہ بجے وہاں ان سے ملنا ہے۔ عدیل کو بھی اطلاع دے دی ہے۔ تم دونوں ٹھیک دس بجے میرے گھر پہنچ جانا۔" یہ کہہ کر انھوں نے بغیر جواب سنے فون بند کر دیا۔

چراغ تلے، خاکم بدہن اور آبِ گم کے مصنف، مزاح کے عہد ساز یوسفی صاحب چھ سال بعد لندن آرہے تھے۔ میں نے ان کی کتابیں کئی بار پڑھیں۔ یہ اردو زبان کی

خوش قسمتی ہے کہ یوسفی نے اس کو برتا۔ قیامت، کا اندازِ بیان، نپے تلے جملے۔ ہر جملے میں احساسات کا کروٹیں لیتا ہوا سمندر۔ ہر موڑ پر یہی خوف کہ ہنستے ہنستے نہ جانے کہاں رونا پڑے۔ ان کے لندن میں قیام کا دور آنکھوں میں گھومنے لگا۔ کیسی کیسی جید ادبی شخصیتیں یہاں موجود تھیں۔ ن۔م راشد، فیض احمد فیض، مشتاق احمد یوسفی، زہرہ نگاہ، ساقی فاروقی، احمد فراز، افتخار عارف، فہمیدہ ریاض، عبداللہ حسین، اکبر حیدرآبادی اور ایسے ہی کئی نام جن کی موجودگی سے لندن میں یادگار ادبی محفلیں دن رات منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جی گھبرایا تو اٹھ کر پکاڈلی کی نکڑ پر اُردو مرکز ہی چلے گئے۔ کبھی احمد ندیم قاسمی کبھی حبیب جالب کبھی پروین شاکر کبھی ضمیر جعفری کبھی گوپی چند نارنگ کبھی اوپندرناتھ اشک کبھی قرۃ العین حیدر، شاعر، مزاح نگار، ادیب، تنقید نگار کوئی نہ کوئی ضرور وہاں مل جاتا۔ ہم ان سے ملتے، ان کی باتیں سنتے، ان کے شعر اور نثر سے لطف اندوز ہوتے اور اپنی قسمت پر خود ہی رشک کرتے۔

چھ سال پہلے یوسفی صاحب سے لندن میں آخری ملاقات افتخار عارف کے گھر دعوت میں ہوئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہوا کے تھمنے سے حبس بڑھ گیا تھا۔ اس دعوت سے کوئی دو ہفتے قبل افتخار کے گھر چوری ہوگئی تھی۔

چور کھڑکی کو توڑ کر اندر داخل ہوئے اور بہت سا قیمتی سامان اٹھا لے گئے۔ اس شام کئی لوگوں نے کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یوسفی بڑی متانت سے ایک کونے میں زہرہ نگاہ کے ساتھ بیٹھے تھے اور حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جب کوششیں تمام ہوچکیں تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا" افتخار عارف کے گھر کی کھڑکیاں باہر سے کھلتی ہیں"۔
کوئی ساڑھے دس بجے میں اور عدیل ساقی کے گھر پہنچے اور ٹھیک گیارہ بجے ہم تینوں یوسٹن اسٹیشن کے نمبر ۱۳ پلیٹ فارم پر بلیک پول سے آنے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

کسی محفل میں اگر ساقی فاروقی موجود ہوں تو کسی دوسرے کو مشکل ہی سے بات کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے مگر وہ باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہیں اور اپنی خوب صورت دہکتی ہوئی نظمیں اور غزلیں بہت گھن گرج کے ساتھ سناتے ہیں۔ نظموں میں ان کے تجربات بہت اہم ہیں دوستوں کے دوست ہیں اور دشمنوں کے لیے نئے نئے سلوک ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ کلیشے سے نفرت کرتے ہیں اور اس نفرت کی چکی میں نہ صرف کلیشے کو بلکہ اس سے ہمدردی رکھنے والوں کو بھی پیس کر رکھ دیتے ہیں۔

عدیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ "ملٹی کلر" (براہ کرم اس کا ترجمہ اردو میں نہ کیجیے) آدمی ہیں۔ شاعری اور ادب سے بے حد لگاؤ ہے۔ ان کو اچھے اشعار یاد رکھنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ خود بھی شاعری کرتے ہیں مگر بہت کم لکھتے ہیں۔ اپنی پچاسویں سالگرہ پر ایک آزاد نظم

لکھی تھی۔ کوئی دس سال سے اسی نظم سے کام چلا رہے ہیں۔ موسیقی کے بھی رسیا ہیں۔ خاص کر گلوکاراؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ چاہے وہ کہیں کی بھی ہو۔ مرنجاں مرنج آدمی بھی ہیں کہ مہینے میں ایک بار اپنے ہی گھر چائے پانی کے خرچے پر ہم جیسے گناہ گاروں کو قرآن اور حدیث کا درس بھی دیتے ہیں۔

پروگرام یہ طے ہوا کہ مہمانوں کے ساتھ اسٹیشن سے چل کر کہیں لنچ کھایا جائے (ساقی ہم دو روزے داروں کی نمائندگی فرمائیں) شام کی چائے ساقی کے گھر پی جائے جس کے دوران ساقی یوسفی صاحب کو اپنی نئی نویلی چونکا دینے والی نظم سنائیں۔ پھر چل کر سڈکپ گاؤں میں صدیقہ شبنم کے گھر یوسفی صاحب کے اعزاز میں دی گئی دعوت میں شرکت کی جائے یوسفی صاحب اور ادریس بھابی سے صدیقہ اور ان کے مرحوم شوہر حبیب حیدرآبادی کے دیرینہ مراسم تھے۔ حبیب زندہ تھے تو ادبی محفلیں آئے دن ان کے گھر ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں ان کا فلیٹ سنٹرل لندن کے پرفضا مقام کنزنگٹن میں تھا۔ حبیب کے بعد صدیقہ شبنم نے اپنی بیٹی سلمیٰ کے گھر کے قریب کینٹ کاؤنٹی میں ایک خوب صورت سے گاؤں سڈکپ میں اپنے لیے ایک گھر خرید لیا۔

ٹرین خلاف معمول کچھ دیر سے پہنچی۔ کئی مسافر گزر گئے مگر یوسفی اور ان کی بیگم نظر نہیں آئے۔ کچھ دیر بعد ہجوم کی پشت سے مجھے ایک پیشانی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے کہا وہ یوسفی صاحب آرہے ہیں۔ میرا قیاس صحیح تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سامان بھری ٹرالی کھینچتے ہوئے میاں بیوی ہم تک پہنچے حالانکہ چار گھنٹوں کا سفر جھیل چکے تھے مگر دونوں کے چہرے تازہ آنکھوں میں خلوص کی چمک اور چہروں پہ مسکراہٹ تھی۔ دونوں بہت گرم جوشی سے ملے۔ پھر ہم ٹہلتے ہوئے اسٹیشن سے لگی ہوئی ڈرامنڈ اسٹریٹ پر نکل آئے جہاں کئی ہندوستانی پاکستانی رسٹورنٹ ہیں۔
ادریس، یوسفی صاحب کی بیگم بہت خوش اخلاق خاتون ہیں۔ ادب سے جتنا لگاؤ ہے اتنا ہی باغبانی سے بھی ہے۔ شادی کو جگ بیت گئے مگر ابھی تک اپنے شوہر کی باتیں بڑی دل چسپی سے سنتی ہیں اور لطف اٹھاتی ہیں۔ خاکم بدہن کے دیباچے میں یوسفی شان الحق حقی کو دعا دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہماری اردو کی نوک پلک سنوارنے میں انھوں نے ہماری بیگم کا ہاتھ بٹایا ہے۔ یوسفی خاموش طبع آدمی ہیں۔ اجنبیوں ملو، انھیں چپ لگ جاتی ہے۔ اگر دوست ہو اور کم گو ہو تب بھی اس سے بات نہیں کرتے۔ ان کی اور فیض کی ملاقاتیں مشہور رہیں۔ دونوں گھنٹوں ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں اور خاموشی میں ایک دوسرے کی صحبت کا لطف اٹھا رہے ہیں مگر جب یوسفی دوستوں میں کھلتے ہیں تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

رسٹورنٹ میں کرسیاں پر بیٹھتے ہی ساقی نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا " آپ نے

سنا یوسفی صاحب، مصطفیٰ نے پچاس سال کی عمر میں شاعری کرنی شروع کردی ہے۔ (دوستوں کی عمروں میں اضافہ کرکے ساقی لطف اٹھاتے ہیں) شہاب تخلص کرتے ہیں اور صاحب دیوان بھی ہو چکے ہیں۔

میں یہ سن کر بڑا کھسیانہ ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ یوسفی کو لندن میں، شاعروں کی زیادتی کی ہمیشہ شکایت رہا کرتی تھی۔ بقول ان کے مشاعروں میں اتنے زیادہ شاعر جمع ہو جاتے ہیں کہ صاحب صدر اور مہمانِ خصوصی کو اپنے فطری تقاضے دبائے اپنی غزلیں ضبط کیے گھر جانا پڑتا ہے۔

گو اس بات کا موقع نہیں تھا مگر گفتگو اچانک ساقی کے شوق وصیت کے بارے میں چل نکلی۔ میں نے کہا کہ ساقی کی آسٹرین بیوی گنڈی کہتی ہے کہ دفنانے اور جلانے میں جو بھی نسخہ اس دن سستا ہوگا وہی ساقی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس پر ساقی بولے "میں نے تین کا فروں عبید صدیقی، عدیل اور مصطفیٰ اور ایک مسلمان جتندر بلّو کے سامنے وصیت کردی ہے کہ مجھے نہ جلایا جائے ——— " راکھ میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں "۔ یوسفی بولے "مگر برخوردار تم نے ایک کو تو جلوا دیا۔"

ساقی اپنی دفاع میں وہ داستان جو انھوں نے ن م راشد کے واقعۂ تجہیز و تکفین کے بارے میں اپنی کتاب ہدایت نامۂ شاعر میں لکھی ہے دہرانے لگے۔ بولے راشد صاحب کے بیٹے شہر یار لگزمبرگ سے اسی صبح لندن آگئے۔ ان کا بھی یہی اصرار تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایک شام وہ اور راشد صاحب ان کے گھر کی بالکنی پر کھڑے وائن پی رہے تھے انھوں نے کہا تھا کہ میں ایک صاف ستھرا خاتمہ چاہتا ہوں۔"

ایسی باتیں لوگ وائن پی کر ہی کہہ سکتے ہیں، یوسفی بولے۔

پھر بات ایک لیڈر کی طرف مڑ گئی کہ کس طرح وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر احکامات جاری کیا کرتا تھا کہ کسی کی گرفت میں نہ آئے اور پکڑا نہ جائے۔

اس پر یوسفی ساقی سے مخاطب ہو کر بولے "تم بھی اپنی شاعری کاغذ کے پرزوں پہ لکھا کرو۔"

بہت دیر ریسٹورنٹ میں بیٹھے یوسفی اپنی لندن کی یادیں تازہ کرتے رہے اور مختلف لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے کہ وہ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ بی سی سی آئی بینک کے کسی پرانے ساتھی کے بارے میں پوچھا تو ساقی بولے "یوسفی صاحب صرف آپ کو چھوڑ کر بینک کا سارا عملہ جیل میں ہے۔"

جب ہم کار میں بیٹھ رہے تھے تو موضوعِ سخن پرانی استادانہ شاعری تھی۔ ساقی کو کسی استاد کے کلیشے میں سرتاپا ڈوبا ہوا شعر یاد آیا۔

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دل گیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

"شعر سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ معشوق بھینگا ہے۔" یوسفی نے اپنی رائے دی۔

ہلکی ہلکی پھوار گرنے لگی تو پروگرام بدلا کہ بجائے ساقی کے گھر چائے پینے کے سیدھا صدیقہ کے گھر چلا جائے تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ آفس بند ہونے ہی والے تھے اور امکان تھا کہ ٹریفک کی زیادتی سے صدیقہ کے گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ راستہ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کا تھا۔

راستے میں شاعروں اور شاعری پر گفتگو چھڑ گئی۔ ان کا ذکر آیا جو آج کل پنجابی زدہ شاعری کر رہے ہیں اور ردیف میں "نے" کا استعمال صحیح سمجھتے ہیں۔ مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ پطرس بخاری ریڈیو میں ڈائرکٹر جنرل تھے۔ ایک ڈرامے میں ہیرو کہتا ہے "میں نے پشاور جانا ہے"۔ پروڈیوسر نے گرامر پر اعتراض کیا مگر رائٹر اکڑ گئے۔ مقدمہ بخاری تک پہنچا۔ وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولے جملہ سو فیصد درست ہے بلکہ فصیح ہے۔ اس جملے سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسافر کہاں جا رہا ہے بلکہ اس کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ آ کہاں سے رہا ہے۔

پھر گفتگو کا رخ ایک ایسے شاعر کی جانب ہو گیا جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو ساقی فوبیا ہو گیا ہے۔ ہمیشہ اس کے ذہن پر ساقی سوار رہتا ہے۔ ہر بار اسی کا ذکر، ہر بار اسی کی شکایت لوگ سن سن کر تنگ آ چکے ہیں کچھ دن پہلے یہ اپنے دوستوں کے ہمراہ کار میں لندن سے کوئی پچیس میل دور کسی کے گھر دعوت میں جا رہے تھے۔ راستے میں ساقی کے خلاف جو شکایتوں کا پلندہ کھولا تو سب بور ہو گئے۔ یہ سن کر یوسفی بولے "وہ تو غنیمت تھا کہ دعوت گلاسگو میں نہیں تھی"۔ پھر کار ایک قبرستان کے سامنے سے گزری۔ ساقی نے بتلایا کہ اس جگہ فلاں فلاں بھی ہیں۔ ساتھ ساتھ قبرستان کے باغ اور صاف صفائی کی اس قدر تعریف کی کہ یوسفی بولے "اب تو ہمارا بھی دل للچانے لگا ہے"۔

عدیل کار چلا رہے تھے اور چونکہ میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہم لوگ راستہ بھٹک گئے اور جب راستہ پانے میں کافی دیر ہو گئی تو یوسفی بولے "یہ روزہ دار حضرات بھٹک نہیں رہے ہیں بلکہ اصطلاحاً اپنا روزہ بہلا رہے ہیں"۔

کسی بات پر ساقی بولے "یوسفی صاحب یاد رہے ہمارے اور آپ کے درمیان چالیس سال سے تعلقات ہیں" اس پر یوسفی بولے "تعلقات چالیس سال سے آگے نہ لے جائیے"۔

ہم کو ابھی راستہ نہیں ملا تھا۔ افطار کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ساقی حسب عادت باتوں کے موڈ میں تھے۔ ادریس بھابی اپنی چالیس پلک جھپکنے والی نیند لے چکی تھیں۔ عدیل اتنے اطمینان اور احتیاط سے کار چلا رہے تھے کہ سڑک پر گرے ایک چھوٹے سے کاغذ کے پرزے کو بھی صاف بچا جاتے

تھے۔ بادلوں سے سورج باہر نکل آیا۔ ہری بھری کینٹ کا ونٹی کے رنگ اور بھی نکھر گئے۔ میں نے گرمی محسوس کی تو اپنی ٹائی کی گرہ کھول لی اور یوسفی سے پوچھا کہ کہیں ان کو بھی گرمی تو نہیں محسوس ہو رہی ہے۔

ساقی بولے " ن م راشد" فیض اور یوسفی صاحب میں ہمیشہ سے یہ قدرِ مشترک رہی کہ ان حضرات نے ہمیشہ اپنی ٹائی لگائی رکھی اور کبھی اپنی گردن سے علٰحدہ نہیں کی"۔

"جب تک کہ وہ مرحوم نہیں ہو گئے"۔ یوسفی بولے " اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تو ساقی کے سامنے اپنی ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے"۔

ساقی نے کہا کہ وہ اور گنڈی آج کل دو عدد بلی کے بچے پال رہے ہیں۔ ایک ہندو ہے جس کا نام ام راج ہے .... اور دوسرا مسلمان ہے جس کا نام شیر خان ہے۔ دونوں کا باپ یہودی تھا اور ماں عیسائی "۔ پالنے والے کا کیا مذہب ہے "۔ یوسفی نے پوچھا۔

جواب دیئے بغیر ساقی نے بتلایا کہ دونوں کا رنگ بالکل سیاہ ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ کون ام راج ہے اور کون شیر خاں۔

پھر تم ان کو کیسے پہچان لیتے ہو' ادریس بولیں۔

"ام راج خاموش ایک کونے میں بیٹھا رہتا ہے مگر شیر خاں گنڈی کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے"۔

" یہی مسلمان کی پہچان ہے" یوسفی بولے۔

دو روزے داروں کی افطار کا وقت گزر چکا تھا۔ سڑکیں کاروں سے پر تھیں۔ لوگ تھکی ہوئی صورتیں لیے اپنے گھر لوٹ رہے تھے جیسے دیہاتوں میں شام کے وقت مویشی سر جھکائے ہوئے جگالی کرتے ہوئے لوٹتے ہیں اور اس وقت ہماری کار صدیقہ کے گھر کی گلی میں داخل ہو رہی تھی ....

پرویز یداللہ مہدی

زمینی اڑن طشتریاں

پہلے طشتری وجود میں آئی یا اڑن طشتری اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے کس کو کس پر سبقت حاصل ہے یہ ثابت کرنا اتنا ہی کٹھن ہے جتنا کہ یہ ثابت کرنا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا اڑن طشتریوں کے تعلق سے اولادِ آدم شروع سے عجیب وغریب مفروضات، تصورات، تخیلات بلکہ توہمات کا شکار رہی ہے۔ ان کے وجود و عدم کے تعلق سے ترقی یافتہ ملکوں کے سائنسدانوں اور علم فلکیات کے ماہروں میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے ایک طبقہ اسے محض انسانی ذہن کی قیاس آرائی سے تعبیر کرتا ہے تو دوسرا اسے مختلف دلائل کی وجہ سے ایک ٹھوس حقیقت تسلیم کرتا ہے اور ثبوت کے طور پر مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں مختلف اوقات میں اڑن طشتریوں کے دیکھے جانے کے سلسلہ ریکارڈ کو پیش کرتا ہے۔ آخر الذکر طبقے کی برسوں کی ریسرچ کے مطابق اڑن طشتریاں دراصل اُن اَن دیکھی انجانی مخلوق کی صبا رفتار سواریاں ہیں۔ جو علم فلکیات کی رو سے مریخ و دیگر سیاروں میں پائی جاتی ہیں اور سائنس، ٹیکنالوجی اور خلائی ترقی کے معاملے میں ہم اشرف المخلوقات سے کہیں زیادہ اڈوانس ہیں۔ چنانچہ جب ان کا جی چاہا اپنی اڑن طشتریوں کو ایڑھ لگا کر تفتیش و تحقیق کی نیت سے کرۂ ارض کا رُخ کرتی ہیں۔ زناٹے کے ساتھ آتی ہیں اور زناٹے کے ساتھ یہ جا وہ جا آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔ تب ہی تو اُڑن طشتریوں پر ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ اپنی آمد و رفت کو ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھتی ہیں۔ نہ آنے سے پہلے اپنی آمد کا پتہ دیتی ہیں نہ جاتے ہوئے اپنی رخصت کی خبر۔ ان کے اس سسپنس کی وجہ سے دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ان کے تعلق سے آج بھی تحیر تجسس اور تعجب میں مبتلا ہیں۔ بقول غالب ؎

ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز ؛ تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے بارے میں تو خیر ہم نہیں جانتے البتہ اپنے یہاں اڑن طشتریوں کے نزول سے مایوس ہو کر یار لوگ برسوں سے ان کا نعم البدل ڈھونڈنے کی جو کوشش کر رہے تھے وہ بالآخر ایک روز بار آور ہوگئی اور ہم اپنی خود ساختہ اڑن طشتریاں ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اتفاق سے ان زمینی اڑن طشتریوں میں سارے کے سارے اوصاف حمیدہ بدرجہ اتم موجود ہیں جو مریخی اڑن طشتریوں کا خاصا ہیں۔ یعنی یہ بھی اپنی صبا رفتار کے باعث مثالِ صورت خورشید اِدھر ڈوبیں اُدھر نکلیں، اُدھر ڈوبیں اِدھر نکلیں کی دوڑتی پھرتی تصویریں ہیں۔

یہ زمینی اڑن طشتریاں عرف عام میں آٹو رکشا کہلاتی ہیں اگرچہ اپنی چشم گنہگار سے تا حال کوئی اصلی اڑن طشتری

دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تاہم آٹو رکشاؤں کی ساخت ہیئت، ڈیزائن بلکہ ان کی افتاد اور کردار کو دیکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اڑن طشتریاں یقیناً ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

ماہرینِ فن نے اس نادرِ روزگار عجوبے کے ڈھانچے کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ صرف تین عدد پہیے اس کا بوجھ ڈھونے کے لیے کافی وشافی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے کہ وقتِ واحد میں اس میں صرف تین سواریوں ہی کی سمائی ہو سکے۔ گویا تین کے عدد سے آٹو رکشا کو خاص نسبت ہے!

آٹو رکشاؤں کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں ڈیزائن کرتے، ڈھالتے اور بناتے وقت یقیناً اڑن طشتریوں کے ایسے تمام "بلو پرنٹ" متعلقہ انجینیروں اور کاریگروں کے پیشِ نظر رہے ہوں گے جو ترقی یافتہ ملکوں کے اکثر وبیشتر سائنسی میگزینوں اور رسالوں میں اڑن طشتریوں کے باب میں کچھ اصل ہے کچھ خواب ہے کچھ طرزِ ادا ہے کی بنیادوں پر تصویروں کی صورت شائع کیے جا رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اڑن طشتریوں کے بلو پرنٹ اگر رہنمائی نہ کرتے تو آٹو رکشا جیسی تکونی سواری کا وجود میں آنا ناممکن ہوتا۔ دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ بے ڈھب اور بے ہنگم سواری کی مثال ملنا مشکل ہے۔ پیچھے سے مستطیل آگے سے تکونی ڈھانچے کی بناوٹ میں بھی ملاوٹ، یعنی آدھی دھات آدھا ٹاٹ، اس پر یہ ٹھاٹ باٹ، سارا تکونی وجود، چھوٹی بحر کے تین عدد پہیوں پر ٹکا ہوا اس پر چال ؎ اسداللہ خاں قیامت ہے۔

ہم اپنے مشاہدے بلکہ تجربے کی بنیاد پر یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ سڑکوں پر دوڑتی لاتعداد "جفت" سواریوں کے بیچ آٹو رکشا وہ واحد طاق سواری ہے جو پر بے شک نہیں رکھتی طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے بلکہ قدم قدم پہ اپنی طاقتِ پرواز کا عملی مظاہرہ بھی کرتی ہے۔

اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں تو شہر کی شاہراہوں پر دیگر سواریوں سے لوہا لیتے انھیں اوور ٹیک OVERTAKE کرکے پیچھے چھوڑتے ہوئے آٹو رکشاؤں کا دور سے جائزہ لیجیے۔ چند ہی لمحوں میں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ دوڑنے اور اڑنے کے بیچ جو خطِ فاصل ہے وہ کس طرح کھینچ کر ایک ہی نقطہ پر آ جاتا ہے اور پھر یہ نقطہ اتصال رگوں میں دوڑتے پھرتے خون کو شرطیہ نقطۂ انجماد پر پہنچا کر دم لیتا ہے۔ اگر یہ ہوشربا منظر دیکھنے کے باوجود کسی کے ہوش وحواس بدستور قائم ودائم نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ شخص مذکور کا جی یا تو دنیا سے اچاٹ ہو چکا ہے یا پھر وہ ذاتِ شریف بذاتِ خود آٹو ڈرائیور ہے۔

جس شخص کے ہاتھ میں آٹو رکشا کی نکیل سہاگنوں کا سہاگ، شوہروں کا بھاگ، بہنوں کی راکھی کی لاج، معصوم بچپن کا آسرا اور مخدوش بڑھاپے کا آسرا ہوتا ہے اور جس کی ذرا سی غفلت اور ناعاقبت اندیشی بیویوں کو بیوہ، شوہروں کو رنڈوا، بہنوں کو لاوارث، بچوں کو یتیم اور بوڑھوں کو بے سہارا کر سکتی ہے وہ اصطلاحِ عام میں آٹو ڈرائیور کہلاتا ہے گویا یہ اپنی جان تو ہتھیلی پہ رکھتا ہی ہے دوسروں کی بھی جان وقتی طور پر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے۔ ٹیکسیوں اور دیگر چار۔۔۔ سواریوں میں آپ ڈرائیور کی بغل والی نشست پر قبضہ جما کر اس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر عملی مداخلت بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آٹو رکشا میں آپ کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اس میں نشستوں کا انتظام کچھ اس ڈھنگ سے کیا گیا ہے کہ صدارتی کرسی بلاشرکتِ غیرے ڈرائیور کے حصہ میں اور بجلی کی کرسی یعنی الکٹرک چیئر سواریوں کے حصہ میں آتی ہے۔ بالفاظِ دیگر مسافر کو بے زبان مقتدی کی طرح ڈرائیور کی امامت میں بے چوں وچرا کیے سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے مقتدی کا قد ہماری طرح غیر ضروری حد تک اونچا ہو تو آٹو کی نیچی چھت اسے دورانِ سفر تہہ بہ تہہ

ہوکر بیٹھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس طرح سر تو زخمی ہونے سے بچ جاتا ہے لیکن گھٹنوں کی خیریت خطرے میں پڑ جاتی ہے ہم تو جب بھی آٹو میں سفر کرتے ہیں رکوع کی حالت میں کرتے ہیں شاید اس مخصوص پوز کی وجہ سے ابھی تک زندہ ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ٹریننگ کے دوران آٹو رکشا ڈرائیوروں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی جاتی ہے کہ آٹو رکشا کا سب سے اہم اور فعال حصہ اگر کوئی ہے، تو وہ اگلا حصہ ہے لہٰذا اوورٹیک کرتے وقت تمام تر توجہ اس حصہ پر مرکوز ہونا چاہیئے۔ اگر آٹو کا اگلا حصہ اس مرحلۂ سخت سے بخیر و خوبی مسکہ میں سے بال کی طرح نکل گیا تو پچھلا حصہ از خود پتنگ کے پیچھے ڈور کی صورت آگے نکل آتا ہے۔ خدانخواستہ اگر اس مرحلے کے دوران کوئی ناگہانی حادثہ پیش آجائے تو بقول شاعر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

کے مصداق صرف پچھلے حصہ پر اغل بغل اور عقب کی گاڑیوں کا قہر ٹوٹتا ہے۔ ویسے بھی آٹو ڈرائیور کو پچھلے حصہ سے کوئی خاص مطلب نہیں ہوتا سوائے ان اوقات کے جب مسافروں کو مقام مطلوبہ پر پہونچا کر ان سے کرایہ وصولنا ہوتا ہے۔

آٹو ڈرائیوروں کے انداز، اطوار، کردار، گفتار، اور رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے اسی طرح ناکام پائیلٹ اگر چاہے تو آسانی سے ایک کامیاب آٹو ڈرائیور بن سکتا ہے۔ یہ بات ہم بے شمار پائیلٹ نما ڈرائیوروں کو شخصی طور پر بھگتنے کے بعد کہہ رہے ہیں۔ اس قبیل کے آٹو ڈرائیوروں کی پہچان بڑی آسان ہے جس طرح پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ ان حضرات کی ماہرانہ ڈرائیونگ کا اندازہ آٹو اسٹارٹ کرتے ہی ہو جاتا ہے (اس جھٹکے سے اسٹارٹ لیتے ہیں) کہ طیارے کے ٹیک آف کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ جب اسٹارٹ ہی ایسا ہو تو ظاہر ہے کہ سفر کا اختتام لینڈنگ پر ہی ہوگا!!

ایک زمانہ تھا جب کبھی بھی 'سواری' کی خدمات حاصل کرنے سے پہلے 'سواری چالک' سے کرایہ کی بابت خاص بحث و تکرار بہ الفاظ دیگر اچھا خاصا مناظرہ و مباحثہ کرنا پڑتا تھا، بلکہ چھوٹے شہروں میں ایسے نظارے آج بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں بالخصوص ایسے شہر جہاں تانگے اور سائیکل رکشا، حمل و نقل کے باب میں آج بھی سرفہرست شمار کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ تانگے میں گھوڑا اور سائیکل رکشا میں آدمی جتا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود کرائے کی مد طے کرتے وقت دونوں ایک ہی اصول پر عمل کرتے ہیں، یعنی فاصلے کے علاوہ سواری کی سائز کی مناسبت سے اُجرت طلب کیا کرتے ہیں جہاں اُجرت کے ایسے پیمانے ہوں وہاں مول تول اور بھاؤ تاؤ میں سودے بازی اور تکرار لازمی ہے جب صرافے میں روپے کی قیمت کو گھٹنے بڑھنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی پھر آدمیوں کی منڈی میں جہاں عبرت یہ نقشہ پیش کیا کرتی ہو کہ ؂

رکشے میں جو بیٹھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی ؎ رکشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی۔

وہاں قدرت کی کاریگری جو تماشا دکھائے سو کم ہے ایک مرتبہ ہم نے اپنی چشم گنہ گار سے دیہات کے ایک تانگا اسٹانڈ پر یہ تماشہ بھی دیکھا۔ ایک تانگے والے اور ایک کنجوس مکھی چوس مسافر کے مابین اُجرت کی بابت بحث و تکرار بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گئی کہ بحث آسمان سے اور اُجرت زمین سے باتیں کرنے لگی تو تانگے والے نے مسافر کو خبردار کیا۔ بھیا ذرا دھیرے بول اگر گھوڑے نے تیری بات سن لی تو طیش میں آکر دُلتی جھاڑ دے گا!

بڑے شہروں میں چونکہ زندگی کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے نہ مسافروں کے پاس بحث و تکرار کا وقت ہوتا

نہ سواری چالکوں کو تضیعِ اوقات کا شوق۔ لہٰذا ہر دو کی سہولت کی خاطر ایسے خودکار میٹر ایجاد کئے گئے جو فاصلے کی مناسبت سے کرائے کی کل رقم آنکڑوں کی صورت مسافروں کے ملاحظے میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان خودکار میٹروں کے باکمال ہونے میں تو خیر کوئی کلام ہی نہیں ہے لیکن منجملہ تمام خوبیوں کے ان میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان کا جوڑ صرف پٹرول سے چلنے والی سواریوں کے ساتھ فٹ بیٹھتا ہے ایسی سواریاں جو، چوپائے کے پسینے اور انسان کے خون سے چلتی ہیں وہ دورِ جدید کی اس معرکۃ الآراء ایجاد کے استفادے سے کلیتہً محروم ہیں۔ کاش موجدوں نے کم سے کم کوئی ایسا آلہ ایسا میٹر ایجاد کیا ہوتا جو یہ بتا سکتا کہ سائیکل رکشا کھینچتے وقت ایک غریب رکشا راں کے نحیف جسم سے کتنا خون پسینے کی شکل میں بہہ کر اس کی حیات کی ڈور کو قبل از وقت کاٹ کے انسانیت کا سر کتنا اور کس قدر بلند کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میٹر کی ایجاد و اختراع کے بعد مدعی و مدعا علیہ کے مابین جرح بحث اور قانونی موشگافیوں کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے ضرور موقوف ہوگیا۔ شروع شروع میں فریقین بڑی ہی فرمانبرداری سے میٹر کی تابعداری کرتے رہے۔ مسافروں کی مستقل آہ و زاری اور ڈرائیوروں کی مسلسل گلہ گزاری جیسے ماضی کا افسانہ بن گئی اور ڈرائیور سواریٔ ھذا ٹی وی نیوز ریڈر والی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کسی دست بستہ ملازم کی طرح پہلے میٹر کا فلیگ FLAG ڈاون کرے پھر مسافر سے اس کی منزلِ مقصود کے بارے میں استفسار فرماتے۔ گویا ایک حقیر میٹر کے اضافے نے چوہے کو شیر اور شیر کو زیر بلکہ ڈھیر کر دیا۔ لیکن سدا چاندنی رات نہیں رہتی ایک دنیا جانتی ہے کہ ہم اس دیش کے واسی ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے اور بہتے بہتے کہتی ہے کہ دھرم اور مذہب کا شوشہ کھڑا کر کے مندر، مسجد اور گردوارے کے نام پر آپس میں سر پھٹول کرنا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے اور پھر دیش کے واسیوں' بلکہ لیڈروں کے دلوں میں خود اپنے دیش کے پرچم عرف 'فلیگ' کا احترام برائے نام ہو، اس کی عظمت کا احساس سرے سے مفقود ہو، وہاں سواریوں میں نصب میٹر کے معمولی فلیگ کا احترام بھلا کس طرح ہوتا، چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں میٹر کی تابعداری بری طرح کھلنے لگی، اس کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کی ایک لہر چلنے لگی نتیجہ اس بغاوت کا یہ ہوا کہ ڈرائیور برادری میٹر سے زائد رقم کا مطالبہ اس دھڑلے سے کرنے لگی جیسے ساہوکار و مہاجن قرض کی اصل رقم کے ساتھ سود طلب کرتے ہیں۔ معاملہ اگر اسی مرحلے پر ختم ہو جاتا تو پھر بھی غنیمت تھا لیکن یار لوگوں کو لگا کہ یہ زائد مطالبہ بھی ان کے حرص و ہوس کے دامن کو حسبِ منشا بھر نہیں سکتا، پھر کیا تھا میٹر کے وجود ہی کے منکر ہو گئے۔ نتیجتاً آٹو ڈرائیوروں کی اکثریت میٹر کو اب محض شوپیس SHOW PIECE ہی تصور کرتی ہے اور میٹر کے بجائے اپنی "مرضی" سے چلتی ہے۔ مرضی جس کا دوسرا نام ہے خود غرضی اور خود غرضی کے آگے نہ کسی اور کی مرضی چلتی ہے نہ عرضی کیوں کہ مرضی چاہے ایک معمولی آٹو ڈرائیور کی ہو یا عالی جناب عزت مآب صدرِ امریکہ کی بے بس و لاچار عوام الناس کے پاس دونوں کے آگے سر جھکانے کے سوائے کوئی چارہ نہیں بقول شاعر ؎

کس میں دم ہے جو روک سکے رستا تیرا
مرضی تیری، میٹر تیرا، رکشا تیرا !

سید طالب حسین زیدی
حیدرآباد

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ......

قصہ شروع کرنے سے پہلے ایک لطیفہ سن لیجئے، ایک شخص دِق و سِل کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر سینے سے خون تھوکتے ہوئے ملکِ عدم سدھار گیا، بہت دنوں بعد بیوی کو میاں کی یاد آئی کہ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے ایک حاضرات لگا کر روحوں سے بات کروانے والے تانترک کے پاس گئی اور بولی میرے شوہر کی روح سے بات کرواؤ لائن لا دی گئی بیوی نے پوچھا، میاں کہو کس حال میں ہو اور وہاں کیسی گزر رہی ہے؟ روح نے جواب دیا بہت مزے میں ہوں اور بے حد سکون و آرام سے گزر رہی ہے۔" اچھا، تو تم جنت میں ہو اور خوب عیش اڑا رہے ہو، ذرا بتلانا، جنت کے کس مقام سے بول رہے ہو" "بیوی! عیش تو بے شک خوب اڑا رہا ہوں، مگر جنت سے کون بول رہا ہے؟....."

اب آیئے! وہ قصہ یہ ہے کہ ایک دن ہم ایک مضمون کا جواب لکھنے میں پوری توجہ سے مشغول و منہمک تھے کہ برابر کے کمرے سے "قدرتی ٹیپ ریکارڈ" بجنا شروع ہو گیا۔ "نہ کسی کو خیال ہے ہمارا اور نہ اچھے برے کی کوئی خبر لینے والا، ہر بات کو ترسنا، ہر مصیبت جھیلنا، عمر ساری گزر گئی مگر اس گھر میں کبھی دو گھڑی کے لیے خوشیاں نصیب نہ ہوئیں"... ادھر قلم کی روانی میں لڑکھڑاہٹ، تیوری چڑھ گئی..... "نہ جانے ہم سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہوا تھا جو ایسے پتھر کے گوتم بدھوں سے پالا پڑا کہ کان پر جوں تک نہیں رینگتی"... حالانکہ ہم گوشت پوست کے گوتم بدھ کے کانوں پر سے ہمیشہ سناسن سناسن "تیر" گزرتے رہتے ہیں کہ جن کی سناسنی سے ہمارا دم رکا رہتا ہے، تحریر بے ربط ہونے لگی... "دکھ بیماری سے تڑپ تڑپ کر مر بھی جاؤں تو کوئی جھوٹے منہ پوچھنے والا نہیں، اللہ ایسوں سے سمجھے نالت ہے ایسی زندگی پر "تھو"..... قارئین سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اس "تھو" کے ناوک بیداد کا ہدف بے خطا ہماری ہی ذات ستودہ صفات کے سوا کوئی اور نہیں ...... سر میں بخارات اٹھنے لگے، آنکھوں کے آگے دائرے بننے لگے خط کی سطریں ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے لگیں اور قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا... کیسٹ کے ختم ہونے کا انتظار کر کر کے جب اگزاسٹ (EXHAUST) ہو گئے تو اس خیال نے اور سہما دیا کہ ابھی تک تو اس کا پہلا رخ (A) ہی ابھی پھرکی پر پھیرا جا رہا ہے، خدانخواستہ جب (B) کی باری آئے گی تب ہمارا کیا حشر ہوگا؟ ریکارڈر کا سوئچ آف کرنے

کے لیے ہم نے کہا، او نیک بخت! کچھ دیر دم لے کر کبھی ہم کو تھوڑا بہت کام تو کر لینے دیا کرو'۔ ۔ ۔ جواب میں ٹیپ رکارڈر ایک زناٹا بھرتے ہوئے خود ہی چلا آیا۔ "اچھا، تو اب نوبت یہ ایں جا رسید، جناب گالیوں پر بھی اتر آئے ہیں"۔ ۔ ۔ آواز گلے میں گندھی ہوئی تھی، ہمارے اوسان خطا ہو گئے، نصیب دشمناں، کہیں آپ جنون میں تو مبتلا نہیں ہو گئیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ "اگر اور چند روز گھر کے یہی لچھن رہے تو یہ "آرزو" بھی پوری ہو جائے گی"۔ ۔ ۔ رونا جو گلے سے اٹکا اٹکا کر "قدے گریہ و ہم بر سر افسانہ رود" کی شکل میں تال اور سُر کے ساتھ نکل رہا تھا اب "الدم" آہے۔ وا" یعنی بہ انداز قوالی چھلانگ مار کر باہر آ گیا۔

اس تو تو۔ میں میں کا شور سن کر باجی بھی اپنے کمرے سے۔ سلیپر پہنے سٹر پٹر کرتے ہوئے اپنے آپ کو کھینچتی ہوئی چلی آئیں اور پریشانی سے پوچھا، بوی! کیا بات ہے، کیوں اس قدر طوفان مچا رکھا ہے، ایسی کون سی اُفتاد آن پڑی آخر؟

ٹیپ رکارڈر ان کی آمد سے ذرا شیر ہو کر کہنے لگا، "دیکھئے نا باجی، اپنے دلہا بھائی کے کرتوت، گالیوں پر تک اتر آئے ہیں"۔ ۔ ۔ باجی نے ہم سے موعظہ حسنہ کے انداز میں خطاب فرمایا، "میاں شریفوں کی زبان پر گالیاں زیب نہیں دیتیں تم نے ایسا کیا تو بہت برا کیا"۔ ۔ ۔ ۔ عرض کیا یہ "سراسر بہتان ہے قسم لے لیجئے ہم نے گالی والی نہیں بکی"۔ "بے شک، بکی" ہم نے تو ان کو اک ذری" بھی کچھ نہیں کہا، اب آپ کو دیکھ کر جھوٹ پر اتر آئے ہیں، ابھی تو آپ نے ہم کو "نیک بخت" کہا تھا ناں" ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باجی نے یہ سن کر کہا! "اے بوی، کیا غضب فرماتی ہو، اللہ کا نام لو "نیک بخت" بھی کوئی گالی ہوئی! ہوش میں آؤ یہ تو دعائیہ کلمہ ہے"۔ ۔ ۔ ۔ "جی نہیں، آپ نہیں سمجھ سکتیں، زیادہ لغت نہ چھانٹیے، "نیک بخت" کے پردے میں ان جناب کی نیت ہم کو گالی ہی دینے کی تھی اور اللہ نیتوں ہی پر سزا و جزا کا حساب کرتا ہے"۔ ۔ ۔ "اِنّما الاعمالُ بِالنّیات" کی اس سے اچھی شرح و تفسیر بہ انداز ہائے تھیوری و پریکٹیکل کسی مفسر نے ہم سے اس شرح و بسط کے ساتھ آج تک بیان نہ کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر : یہ تو چچا غالب ہی کی قسمت تھی کہ ان کے "وہ" اپنی جفائیں یاد کر کے شرما جایا کرتے تھے اور ہم مارے رشک کے ان کے اوجِ طالع خرمند کی سربلندیوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے، مگر ادھر کا معاملہ یہ ہوا کہ کبھی راستہ بھٹک کر برس چھ مہینے میں ایک آدھ بار "نیکی" نے اِدھر کا رُخ کیا بھی تو بھونچال آسا ہی کیا کہ ایسی نیکی کے ہاتھوں روح تک تھرا اٹھی اور دل مارے ہیبت کے دہل کر رہ گیا۔ ۔ ۔ ۔

"یہ مئی" کا مہینہ، اس قدر چلچلاتی دھوپ اور گرمی میں ایسے وقت سواری بادِ بہاری کہاں تشریف لے جا رہی ہے؟ اگر لو نے مزاج پرسی کر لی تو "گردن کٹے مرغے" کی مانند پھڑپھڑا کر دم توڑ بیٹھیں گے، سڑک پر حلق میں دو بوند ٹپکانے والا بھی کوئی نہ ملیگا۔

بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

اسلامک سنڈروم : ایک روز ایک خاتون وقت گزاری کے لیے تشریف لائیں، ہماری خواتین با تمکین کی وقت گزاری کا محبوب ترین مشغلہ، دوسروں کی ہانڈیوں میں ڈھکنا اٹھا کر جھانکنا یا پھر اپنی اپنی روز بروز گرتی ہوئی صحت کی خطرناک صورتِ حال پر بیان چبا چبا کر تبصرہ، بشمول مشورہ کرنا اور اُن عوارض کے وارد ہو جانے کا بیان ہوتا ہے جن کی ابھی ولادت ہی نہیں ہوئی۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے دوست ڈاکٹر اے ایم پٹھان ضلع رائچور کے مشہور و مقبول ای۔ این۔ ٹی (E.N.T) سرجن اپنے

طالب علمی کے دور کی ایک دلچسپ بات بیان کرتے ہیں کہ اُن کے ایک پروفیسر "اسلامک سنڈروم" (Islamic Syndrome) کے عنوان سے ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں پر لکچر دیا کرتے تھے جن سے معالج کو خواتین (خصوصاً مسلم خواتین) کے علاج کے موقع پر سابقہ پیش آیا کرتا ہے۔ جسم کے کسی بھی عضو کے بارے میں پوچھا جائے وہ ناکارہ اور بیمار ہی نکلے گا۔

"پاؤں؟ من من بھر کے ہوگئے ہیں، اُٹھتے ہی نہیں۔ ٹخنے؟ ٹھن ٹھن بجتے رہتے ہیں۔ گھٹنے؟ گھن گھن کرکے مُردے کے گھٹنوں کی طرح اکڑ گئے ہیں بیٹھیں تو اٹھا نہیں جاتا اور اُٹھیں تو بیٹھا نہیں جاتا، مڑتے ہی نہیں۔ پیٹ؟ لوہار کی دھونکنی بنا ہوا ہے آگ بھر گئی ہے، ڈکاریں تو ایسی آتی ہیں جیسے P.I.A ریلوے کا انجن اسٹیم خارج کر رہا ہو ___ سینہ؟ بیٹے کی زبان درازیوں نافرمانبرداریوں اور بہو کی زہرافشانیوں کے ہاتھوں درد کی ٹیسوں سے کچا پھوڑا .... اسی طرح دل؟ دھک دھک .... کان؟ بھربھر .... اور سر جھن جھن ......

پان کی نیری گلوری منہ میں رکھ کر پانی پیتی ہوئی مرغی کی طرح سر آسمان کی طرف اُٹھا کر انگلیوں میں تولہ بھر زردہ لے کر کٹی کی طرح کھاتے ہوئے منہ میں رکھنے کے بعد ان خاتون نے معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتلایا آج کل شہر میں کون سا ڈاکٹر اچھا ہے؟ کس کے ہاتھ میں قدرت نے شفا رکھی ہے؟ .... یہ ہے ہماری خواتین کا محبوب ترین مشغلہ اس روز آئی خترمہ نے جاتے جاتے اپنے ایک ایسے خطرناک اور موذی مرض کا تذکرہ کر دیا جو ابھی تک میڈیکل ڈکشنری اور دنیائے طب کے باوا آدم شیخ بو علی ابن سینا کی "قانون شیخ" میں درج نہیں ہوا تھا ورنہ تو یہ شگوفہ چھوڑ کر یہ جا وہ جا ہو گئیں۔ دن خیریت سے گزرا، رات بھی آرام سے خراٹے لیتے ہوئے بسر ہوئی مگر دوسرے ہی دن صبح ناشتے پر پانچ عدد نان، دو نیم برشت انڈے اور کھچڑی، قیمہ، اچار کھا کر ذرا بالائی دار چائے کا ایک بڑا پیالہ پی چکنے کے بعد (لمبی) ڈکار لیتے ہوئے فرمایا گیا کہ اسی مرض کا جس کو ابھی تولد ہونا ہے شدید حملہ ہوا ہے اور حالت اس قدر غیر ہو چکی ہے کہ اگر فوراً کسی "اچھے" ڈاکٹر سے رجوع نہ کیا گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ لینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ ہاں "دینے کے دینے" ہی سے واسطہ رہتا ہے۔ جب اس بھیانک صورتِ حال کو سنا سالت بھی غیر ہوتی نظر آئی اور زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تو ہمارے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے، صاحبزادے سے کہا سواری کا انتظام کرو اور کسی فزیشن کے پاس لے چلو ہم بھی ساتھ ہی چل رہے ہیں۔

ڈاکٹر کے مطب پہنچے انھوں نے "صیغہ جمع" میں شکایت سنی اور علامات شکایات کو دیکھا، جانچا، تھوڑی دیر غور کیا، مسکرائے .... اور نسخہ لکھنے لگے۔ ادھر اچھی اور قیمتی سے قیمتی" دوائیں تجویز کروانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے "حسنِ ڈاکٹری" کو بڑی چابکدستی سے تازیانہ، بہ انداز دگر لگایا گیا۔ "ڈاکٹر صاحب! دنیا میں میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ نہ ماں ہے نہ باپ اور نہ بھائی، آپ کے پاس بڑی اُمید سے آئی ہوں، بس، اُوپر ایک اللہ ہے اور نیچے ایک آپ"... بھول گئیں .... ہم نے صاحبزادے کے کان میں آہستہ سے کہا، میاں! ذرا یاد دلا دینا ان دونوں کے درمیان پچھلے پینتیس چھتیس برسوں سے ایک "ہم بھی" ہیں ....

لہ طب کے ماہرین کا بیان ہے کہ انسان کو اگر ذرا سی بھی تکلیف ہو تو وہ نیند میں خراٹے نہیں لیتا۔

لہ اچھے ڈاکٹر سے مراد بیشتر "تگڑی فیس لینے والے" سے ہوتی ہے۔

آ بیل! مجھے مار: ایک دن سوڈ کو اتنا بہت کا جامہ پہنے ہوئے دیکھ کر ہم نے بڑے دلار سے کہا، ارے میاں، سنتی ہو یہ جو تمہاری بہن میرو ہے ماشاء اللہ اب سیانی ہوگئی ہے، اپنی پڑھائی بھی اس نے پوری کرلی کیوں نہیں اس کے ہاتھ پیلے کروا دیتیں؟ فرمایا، ہاں امی جان بھی پرسوں یہی کہہ رہی تھیں کہ اب اس کو "اٹھا دینا" چاہیے، آپ دیکھیں نا اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ۔

ہم نے ہم کو اس معاملہ میں کہاں ڈر کے ہے اپنے اباجی سے کیوں نہیں کہتیں، داماد پھانسنے کے معاملے میں ان کی چابکدستی کی تو بڑی شہرت ہے، ان ہی سے کہوکہ ہم جیسے "گبرو" پر ڈورے ڈال کر پھانس لیں ..... میرے ابو نے تم کو پھانسا تھا؟ یا آپ ہی کے ابا، یا دادا ان کے گھر کے طواف کر رہے تھے؟ جی بے شک کر رہے تھے اور کیوں نہ کرتے؟ جب، وقت بے وقت آکے دن کبھی چائے پر تو کبھی ناشتے پر تو کبھی عشائیہ پر بلا بلا کر رجھایا جا رہا تھا، آخر اخلاق بھی تو ایک چڑیا کا نام ہے .... پھر انہی باروں میں اُدھر لگا ہوا کہ انہیں دو دو بھائیوں کے "سعودی" سے آرہے ہیں کے دام بچھا بچھا کر شکار پھانسنے جا رہے تھے، مگر خدا بھلا کرے اس اخلاق نام چڑیا کا، ایک بھائی تو رشتے کے طے ہو جانے کی بھنک کان میں پڑتے ہی بجائے ادھر آنے کے چھٹیوں میں پروگرام بنا کر ادھر یورپ کی سیاحت پر نکل گیا۔ اور دوسرا بھائی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" سعودی عرب کی ملازمت ہی ترک کر کے اپنے بیوی بچوں کو لے کر بمع اپنی جمع پونجی تمہارے ابا کو ٹھینگا دکھا کر شتابی سے امریکہ منتقل ہوگیا اور ادھر ہمارا حشر ویسا ہی ہوا جیسا کہ "ذوق اسیری" کا ہونا چاہیے۔

مژدہ اے ذوق اسیری، کہ نظر آتا ہے دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

تو ارا تلخ ترمی زن: بڑی آپا نے اپنی صاحبزادی کی شادی کا جو طے ہو چکی تھی، ذکر کرتے ہوئے ایک دن ہم سے فرمایا، میاں! تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے سارا جہیز تو جوڑ لیا مگر ایک "قرآن شریف" کا لینا بھول گئی، تم آج یہ بھی لے آؤ تو "کسر" پوری ہوجائے گی اور ہاں، اس کے لیے "تفسیر نسیم" کا ایک جزدان بھی خرید لینا سن کر محترمہ نے فرمایا، باجی! کیوں فضول خرچی کرتی ہو وہ کلام پاک کیوں نہیں دے دیتیں جسے امی جان نے تمہارے "جہیز" میں دیا تھا، جس کا نوں نئے کا نیا اور کھواہٹ کسی کی انگلیوں کا ایک دھبا تک اس پہ نہیں لگا۔ ہاں البتہ، گھر تبدیل کرنے وقت ایک بار بلاؤں کو رفع کرنے کے لیے امی جان نے کھلے بال اس کو بڑے احترام سے اپنے سر پر رکھ کر دہلیز میں پہلا قدم رکھا تھا ..... ہم پوچھ بیٹھے، اس مبارک کام کے لیے اس وقت کیا آپ "امراؤ بیگم" کا وجود کافی نہ تھا؟ ...

باجی نے فرمایا منجھلی، تم نے اچھا یاد دلایا، اللہ بخشے نانی جان جنت نصیب کی نشانی ہے جس کو انھوں نے خاص طور پر تاج کمپنی لاہور سے منگوا کر اور خود اپنے مبارک ہاتھوں سے قیمتی اطلس کا جزدان سی کر امی جان کے جہیز میں دیا تھا اور پھر انھوں نے اس نایاب منقش طلائی کلام پاک کو مجھے دے دیا۔ واہ! کتنی بزرگوں کی یہ نشانی میرے دم تک میرے ہی پاس رہے، جزدان کا اطلس تو ایسا کم یاب ہے کہ اب ڈھونڈنے سے کسی قیمت پر بھی نہیں ملنے کا اور پھر ادھر تاج کمپنی ہی کو تالے پڑ گئے، پھر ایسا قرآن کہاں سے آئے؟ مگر چلو تم کہتی ہو تو یہی ان کو دے ہی دیتی ہوں، یہاں نہ رہا دہاں

○ امراؤ بیگم مرزا غالب کی نیک خصال اور شوہر پرست بیوی، کہتے ہیں شوہر کے کہنے پر ایک مکان دیکھ آئیں۔ غالب نے پسند یا پسند کا حال پوچھا، بولیں اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں، غالب جو کسی حال شوخی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیتے جھٹ پوچھ بیٹھے۔ "کیا دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے"؟ .....

رہے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ ....

ہم نے بھی فوراً تائید کر دی، ہاں باجی! ٹھیک ہی تو ہے، اس کا یہی مصرف اچھا ہے۔ یہ کیا کہ ملا ابد الآباد گھر گھومتا پھرے اور "بلاؤں" کو بھگانے کی "ڈیوٹی" انجام دیتا رہے۔ جزدان میں لپٹا ہوا، ایک ہی گھر کے طاق پر دھرا دھرا اس کا جی بھی تو گھبرا جاتا ہوگا۔ اب علامہ کی تو عادت ہی ہے۔ بات بات پر قدغن لگانے کی، "وہ معزز تھے کر خوار ہوئے، شرمسار ہوئے" وہ جانیں یا ان کا خدا جانے ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ کبھی فرماتے ہیں! "یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود" بڑے علامہ بنتے ہیں، اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس دیار میں اس ذوقِ لطیف کی کاشت ہوتی ہی نہیں ....

باجی! میں تو کہتا ہوں، بس، اب بہت ہوچکا ان کو بھی ایک جزدان میں لپیٹ کر طاق پر دھر دینا چاہیے۔ "دانائے راز" پھر نہ کہے گا کہ نہ آئے گا اس نگر، کون اپنا جی کڑھائے؟ ...... جب ایک ایک معمولی ٹکڑا [illegible] ڈراکیولا (Dracula) جیسے منتر کے بھوت کو بھگا سکتا ہے تو پھر طاق پر دھرا [illegible] ہمارا قرآن کہ اللہ کا کلام ہے ان معمولی معمولی "دیسی بلاؤں" کو نہیں پچھاڑ سکتا؟ آپ ان [illegible] ecce homo) کو [illegible] کے جہیز میں دے دیجیے .... اگر آپ فرمائیں تو "بہشتی زیور" کا ایک نسخہ لے آتا ہوں کہ یہ بھی بچیوں کے جہیز میں دینے کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔ اور پھر آج کل اس کا [illegible] نام ہے ......

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل!
نوا را تلخ تر می زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی!!

□□

کلیجہ

ہمارے تن کا سرمایہ کلیجہ
دلِ بسمل کا ہمسایہ کلیجہ

چبا کر یار نے کھایا کلیجہ
جو میں نے بھون کر لایا کلیجہ

بڑی مشکل سے دل کو جب سنبھالا
ہمارا منہ کو ہے آیا کلیجہ

نہیں ٹکرا سکا دل اُن کے دل سے
کلیجے سے ہے ٹکرایا کلیجہ

کہا ویٹر نے محبوبہ سے اپنی
کروں دل پیش یا پایا، کلیجہ

کہا کھانے میں کیا ہے میں نے بیگم
تو غصے میں یہ فرمایا "کلیجہ"

بہت خوش لان پر ہوتا ہے یارو
مجھے لگتا ہے چوپایا کلیجہ

خوشی میں بھی چھلک جاتے ہیں آنسو
تمہیں دیکھا تو بھر آیا کلیجہ

کہو سنجیدگی سے شعر شانہ
یہ کیا گردن، کمر، پایا، کلیجہ

اقبال شانہ
سعودی عرب

●

سوچنا پڑا

کیوں قرض میں نے اُس کو دیا سوچنا پڑا
وہ قرض لے کے ایسے ہنسا سوچنا پڑا

میں سوچتا رہا مری گاڑی نکل گئی
کیا خاک سوچتا میں رہا، سوچنا پڑا

پانی کی ایک بوند نہ ٹپکے گی آج بھی
نلکے سے جب یہ آئی صدا، سوچنا پڑا

"کھانا نہیں ملے گا اگر لیٹ آؤ گے"
جب اہلیہ نے ڈانٹ دیا، سوچنا پڑا

ہوٹل سے کیسے بچ کے نکلتے ہیں یار لوگ
بل پر جو میں نے غور کیا، سوچنا پڑا

تنخواہ اپنی ہار کے، جوئے میں دوستو
کس منہ سے جائیں گھر بخدا، سوچنا پڑا

صابن لگا کے منہ کو میں بیٹھا ٹٹولتا
حمام میں کہاں ہے گھڑا سوچنا پڑا

شانہ یتیم خانے پہ جوں ہی نظر پڑی
کیا ہے یہی مکان مرا، سوچنا پڑا

★

(خاکہ)

مسیح انجم
(حیدرآباد)

سائینسی ادب کا وہاب ثاقب

ممتاز کالج کے وائس پرنسپل اور میرے عزیز ترین دوست ڈاکٹر وہاب قیصر نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ میں ان کا خاکہ لکھوں لیکن جب میں نے حامی بھری تو وہاب نے اپنی پچیس سالہ دوستی کا واسطہ دے کر یاد دلایا کہ "دیکھو مسیح بھائی! میں آپ کا پرانا دوست ہوں۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ لکھ مارنا۔ ہاں، آپ میرا خاکہ ضرور اڑا سکتے ہیں لیکن ذرا سنبھال کے"۔

میں نے وہاب کی تشویش کو بھانپ کر انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا، میرے پیارے وہاب! شاید تمھیں یہ اندازہ نہیں کہ تمھارے خد و خال میں کوئی سقم نہیں ہے کہ وہ نظر کی گرفت یا قلم کی گرفت میں آجائے اور تم نک سک سے ایسے درست ہو کہ تمھارا قلمی کارٹون نہیں بنایا جاسکتا"۔

میرے اس تبصرے پر وہاب قیصر کچھ اس طرح جھینپ گئے جیسے وہ کوئی دوشیزہ ہوں۔ یہ تو رہا وہاب قیصر کے بیرونی اسٹرکچر کا حال۔ اب رہ جاتا ہے وہاب قیصر کا انٹیریر ڈیکوریشن (Interior Decoration)! ـــــ تو اس ضمن میں عرض ہے کہ ظالم نے باطن بھی کچھ ایسا پایا ہے کہ اس پر پہرہ لگائے بیٹھے کراماً کاتبین کی تعیناتی بالکل "سرپلس اسٹاف" کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔

اگر آپ میری باتوں کو حقِ دوستی پر محمول نہ کریں تو میں یہ کہوں گا کہ وہاب قیصر ابتدا ہی سے بالکل "اھدنا الصراط المستقیم" قسم کی زندگی گزارنے کے عادی رہے ہیں۔ ان کے شریف النفس ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ نہایت ہی راست باز واقع ہوئے ہیں۔ ساز بازی سے انھیں سخت نفرت ہے۔ اگر کوئی کارٹونسٹ ایک سیدھی سی لکیر کھینچ کر مجھ سے عنوان تجویز کرنے کے لیے فرمائے تو میں بلا تامل یہ کہہ دوں گا کہ یہ تو وہاب قیصر ہے! اگر وہاب قیصر اپنے چہرے پر تھوڑی سی داڑھی اگا لیں اور جبہ و عمامہ کا بندوبست کرلیں اور پھر آنکھوں میں سرمہ بھر کر، ہاتھ میں تسبیح لے کر "اللہ اللہ" شروع کردیں تو کوئی اور نہ ہی میں تو ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار رہوں۔

موصوف ایک سنت پر بڑی پابندی سے عمل کیا کرتے ہیں۔ کھانا کھانے سے قبل، وہ دو تین گھونٹ پانی ضرور پی لیا کرتے ہیں۔ ایک بار میں نے پوچھا تو موصوف نے فرمایا "کھانے سے پہلے تھوڑا سا پانی پی لینا کی سنت ہے!" بھلے ہی وہ دوسری سنتوں پر عمل نہ کریں، لیکن اس سنت پر بڑی سختی سے عمل کیا کرتے ہیں (میں سمجھتا ہوں) کہ ان کے بعض اعضا کی کارکردگی اور ان کی اچھی صحت کا راز اسی سنت پر سختی سے عمل کرنے میں پوشیدہ ہے۔

میں وہاب قیصر کو اس وقت سے جانتا ہوں جبکہ ٹیڈی پینٹ کا فیشن دم توڑ رہا تھا اور اس کی جگہ (Bell Bottom) پینٹ نے لے لی تھی۔ میں نے اپنی دوستی کو وہاب قیصر کی عمر سے ملانے کی بجائے بل باٹم پینٹ سے محض اس لیے ملایا کہ وہ بدلتے فیشن کے دلدادہ رہے ہیں۔ وہ اس تیزی سے نئے فیشن کو قبول کرلیا کرتے کہ فیشن کی ماری الٹرا موڈرن قسم کی لڑکیاں انھیں دیکھ کر عش عش کرتی رہ جاتیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہاب قیصر پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ ورنہ آپ دیکھتے، وہ اگر کسی اور پیشے سے وابستہ ہو جاتے تو فیشن کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیتے۔ وہاب قیصر کے گھر میں ایسے کئی پینٹ اور شرٹس بکھرے پڑے ہیں جو فیشن کے بدلتے رجحانات پر سیر حاصل مقالہ سپرد قلم کرنے والوں کے لیے مواد کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

آج سے پچیس برس پہلے جب میں نے انھیں دیکھا تھا تو وہ بالکل دبلے پتلے لم چھڑ قسم کے نوجوان تھے۔ شانوں تک چھوتے ہوئے گھنے بال اور بل باٹم پینٹ میں وہ مجھے امیتابھ بچن سے کچھ ملتے جلتے سے دکھائی دیتے تھے۔ وہ ان دنوں ایم۔ ایس سی فائنل کے اسٹوڈنٹ تھے اور امیتابھ کی اداکاری کے قائل بھی تھے اور نقال بھی۔

وہاب سے میری ملاقات ولی تنویر کی دکان پر ہوئی تھی۔ جہاں وہاب گھنٹوں بیٹھ کر ولی تنویر کے افسانوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ جس کے جواب میں ولی تنویر جھک کر "آداب عرض ہے" کہنے کی بجائے وہاب قیصر کو ایک عدد پیپر منٹ (پیسے میں دو والا) اپنی دکان کے ڈبے میں سے نکال کر چوسنے کے لیے دے دیا کرتے اور وہاب اس پیپر منٹ کو تبرک کے طور پر قبول کرلیا کرتے۔ یہ لین دین چل ہی رہا تھا کہ راقم الحروف بھی ان میں شامل ہوگیا پھر اسی پیپر منٹ کی مد سے نکل کر "دو میں تین پیاسے" اور فی کس ایک بسکٹ کے زمرے میں آگیا۔ چند ہی دنوں میں ہم تینوں ایسے گہرے دوست بن گئے جیسے مثلث مساوی الاضلاع کے تین ضلعے ہوں۔ تین ضلعوں میں سے ایک ضلع (یعنی ولی تنویر) بہت پہلے ہی سے افسانے لکھ رہا تھا۔ اس کا دیکھا دیکھی دوسرا ضلع (یعنی وہاب قیصر) بھی افسانے لکھنے لگ گیا تھا۔ البتہ یہ خاکسار اپنی پرانی ڈگر پر قائم تھا۔ ہم تینوں مل کر ایک ادبی انجمن چلایا کرتے تھے جس کا نام "ادارۂ محورِ ادب" تھا۔ ولی اور وہاب یعنی "ٹو ڈبلیوز" (TWO WS) کے ادبی جنون کا یہ عالم تھا کہ ان کی زائد از نصاب قسم کی سرگرمیاں، اسی انجمن کے محور کے اطراف گھومتی تھیں۔ لیکن وہاب قیصر کے لیکچرر ہو جانے کے بعد وہ مثلث ٹوٹ گیا۔ ولی تنویر نے دکانداری چھوڑ دی اور پبلسٹی اور ایڈورٹائزمنٹ کے کاروبار سنبھال لیے اور پھر وہ اس کاروبار میں کچھ ایسے ڈوب گئے کہ ان کی ساری تخلیقی صلاحیتیں اشتہارات کی سرخیوں کی اختراع میں صرف ہوتی گئیں، جس کے نتیجے میں ولی تنویر خود ایک گم شدہ افسانہ بن کر رہ گئے۔

وہاب قیصر نے ابتدا میں چند اچھے افسانے بھی لکھے تھے، جن میں عشق کم اور مسائل زیادہ ہوا کرتے تھے بلکہ مسائل ہی مسائل ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے افسانے کے ہیرو کو رام گڑھ کے ایک چڑھاؤ پر چڑھایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں وہ رام گڑھ کہاں ہے؟ اور اس کا اتا پتا کیا ہے؟ اور اس رام گڑھ کے چڑھاؤ پر چڑھتے وقت ہیرو کی ٹانگیں کتنی دکھتی تھیں۔ اور کتنا سانس پھولتا تھا اور ہیروئن کہاں مرزا ہوتی تھی؟ اور ہیرو کی مدد کے لیے کیوں نہیں آتی تھی؟ ہیں وہاب قیصر کو چھیڑنے کے لیے کہتا "یار، وہاب! کبھی تو ہیرو کو ذرا اتار پر لے چلو!" وہ جواب میں کہتے نہیں ہرگز نہیں! مجھے جب تک ملازمت نہیں ملے گی، میں اپنے افسانے کے ہیرو کو رام گڑھ کے چڑھاؤ پر چڑھاتا ہی رہوں گا۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر کیوں نہ ہو جائے!"

جیسے ہی وہاب قیصر کو لکچرر کی پوسٹ مل گئی، انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو سائنس کی طرف موڑ دیا اور پھر ان کو سائنسی ادب کا ایسا چسکا پڑا کہ وہ نت نئے سائنسی موضوعات پر دلچسپ مضامین لکھتے گئے۔ وہاب کے مضامین کی خوبی یہ ہے وہ ان میں تھوڑی سی ادبی چاشنی شامل کر دیتے ہیں۔

وہ کوئی پندرہ بیس سال سے سائنسی مضامین لکھتے آرہے ہیں۔ پچھلے چار پانچ سال سے وہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اپنے سائنسی مضامین کا ایک اچھا سا مجموعہ شائع کرا دیں اور "صاحبِ کتاب" کہلائیں۔ لیکن جب بھی وہ صاحبِ کتاب بننے کی پلاننگ کرتے کوئی نہ کوئی اڑچن انھیں اڑنگ لگاتی۔ ایک بار تو انھوں نے پوری تیاری کے ساتھ اپنے مضامین، فزکس کے اپنے ایک پروفیسر و سابق پرنسپل کی خدمت میں پیش کیے کہ وہ کتاب کا مقدمہ لکھ دیں۔ پروفیسر صاحب نے وہاب قیصر سے مضامین لیے، پڑھے اور اپنے شاگرد کی کارگزاری پر اتنے متاثر ہوئے کہ وعدہ کیا کہ وہ ایک اچھا سا مقدمہ لکھ دیں گے لیکن ایک دن جب وہاب قیصر نے اپنی کتاب کے مقدمے کے حال احوال جاننے کے لیے پروفیسر صاحب کے درِ دولت پہ دستک دی تو معلوم ہوا کہ فاضل مقدمہ نگار اب اس دنیا میں نہیں رہے، پرلوک سدھار گئے ہیں۔ یہ وہاب قیصر کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی، اور نہ کوئی اچھا شگون تھا۔ چناں چہ وہاب قیصر نے سوچا کہ کسی فاضل مقدمہ نگار سے اپنی کتاب کا مقدمہ لکھوا کر اس کو عدم آباد روانہ کرنے سے بہتر کتاب چھپوانے سے باز آنا مناسب ہے (ویسے وہ توہمات کے قائل نہیں ہیں) تاہم وہاب نے رسک لینا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ وہاب دوسروں کو تکلیف پہنچائے بغیر زندگی گزارنے کے عادی رہے ہیں)۔ لیکن وہ آخر کب تک چپ رہتے۔ انھیں تو صاحبِ کتاب بننا تھا۔ ابھی وہ اسی پس و پیش میں تھے کہ ان کی نظرِ انتخاب پروفیسر جعفر نظام صاحب پر پڑی۔ چنانچہ مقدمہ نگاری کے دوسرے ایپی سوڈ (Episode) میں وہاب قیصر نے پروفیسر جعفر نظام صاحب سے رجوع کیا کہ وہ ان کی کتاب کا مقدمہ لکھ دیں۔ اس پر پروفیسر جعفر نظام صاحب نے آمادگی ظاہر کی کہ وہ پندرہ بیس دن کے اندر مقدمہ لکھ دیں گے لیکن اس وعدہ کے آٹھ، دس دن بعد وہاب قیصر کو یہ اطلاع ملی کہ پروفیسر جعفر نظام صاحب ہارٹ اٹیک کی بنا پر ہاسپٹلائیز کر دیے گئے ہیں لہٰذا وہ اپنے مضامین کے مسودے واپس لے جائیں۔ پھر تو وہاب قیصر پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ اس حادثے کے بعد وہاب تھوڑے سے چوکنے ہو گئے کہ ان کی کتاب کی مقدمہ نگاری کے سلسلے میں فاضل مقدمہ نگاروں کی بیماریوں کا

سلسلہ یوں ہی چل پڑا تو پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ سو انہوں نے بغیر مقدمے کی کتاب شائع کروانے کا فیصلہ کرلیا لیکن کتاب کی پرنٹنگ کے عین آخری دنوں میں وہاب کو اچانک یاد آگیا کہ کیوں نہ کبیر احمد صاحب، اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ایک اچھا سا تعارف لکھوالیا جائے۔ وہ کبیر احمد صاحب سے ملے اور اپنا مدّعا ان کے گوش گزار کیا۔ اس پر کبیر احمد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ایک اچھا سا تعارف لکھ دیں گے لیکن اس وعدے کے بعد کبیر احمد صاحب اس دن اپنے گھر نہ جاسکے بلکہ سیدھے اسپتال لے جائے گئے۔ حد ہوگئی جب وہاب قیصر نے جوائنٹ ڈائرکٹر تعلیمات سے مل کر لائبریریوں کے لیے اپنی کتاب کی خریدی کے ضمن میں سرکلر جاری کروانا چاہا تو ملاقات کے دوسرے ہی دن جوائنٹ ڈائرکٹر پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ شریکِ دواخانہ کردیئے گئے۔ جب وہاب قیصر کی سلسلہ وار مہمات اور لگاتار ناکامیوں کا علم ہوا تو مجھے ایک ڈیری فارم کے ایک سادہ لوح مالک کا قصّہ یاد آیا۔ جو تفریحِ طبع کے لیے پیش ہے۔ اس کے علاوہ اس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ قدرت کس طرح ایک نیک بندے کا امتحان لیتی ہے۔ قصّہ یوں ہے کہ ڈیری فارم کے ایک مالک نے کسی واعظِ محترم کے وعظ و نصیحت سے متاثر ہوکر نیک زندگی گزارنے کی نیت سے پنج وقتہ نماز پڑھنے کا ارادہ کرلیا۔ پہلے دن وہ ظہر کی نماز ادا کرکے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی ایک بھینس مری پڑی ہے۔ دوسرے دن جب اس نے فجر کی نماز پڑھی تو دوسری بھینس مرگئی۔ اسی طرح تیسرے دن تیسری بھینس ـــــ اور چوتھے دن چوتھی بھینس۔ چنانچہ ہفتے عشرے میں سات آٹھ بھینسیں چٹ پٹ ہوکر رہ گئیں۔ اب لے دے کے ایک بچھڑا بچا ہوا تھا۔ ایک دن ڈیری فارم کا مالک کسی کام سے باہر جاکر تھکا ماندہ اپنے گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ بچھڑا مسلسل "بھیں بھیں" کی آوازیں نکالے جارہا تھا۔ یہ دیکھ کر مالک سے رہا نہ گیا۔ طیش میں آکر بولا "ابے مسلسل چلّا رہا ہے کیوں؟ ذرا وضو کرکے نماز کو کھڑے ہونے تک تو صبر کر! تجھے بھی ٹھکانے لگاتا ہوں۔ تُو تو صرف ایک رکعت کا محتاج ہے!"

تو صاحبو! وہاب قیصر کا کیس بھی کچھ ایسے ہی EVENTS پر مشتمل نظر آتا ہے۔ اگرچہ کہ اتنا سنگین اور سیریس نوعیت کا نہیں ہے۔ چنانچہ وہاب قیصر نے دوسروں کو زحمت سے بچانے کے لیے اپنا تعارف آپ لکھا تاکہ جو بھی گزرے انھیں پر گزرے کیونکہ وہ جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے۔ دوسروں کو تکلیف پہنچائے بغیر زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔

وہاب قیصر نے تین شوق پال رکھے ہیں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی بری ساری فلمیں دیکھ ڈالنا۔ اور پھر مضطر مجاز، مصطفیٰ کمال اور پرویز یداللہ مہدی کے پیچھے پڑ کر خبردار کردینا کہ دوستو اور بزرگو، فلاں فلاں فلم مت دیکھیے کہ بالکل واہیات قسم کی ہے۔ اور واقعی وہاب قیصر کی رائے صدفی صد درست ثابت ہوتی ہے۔ فلم بینی اور سینما بینی کے معاملے میں وہاب نے نہایت ہی شائستہ ذوق پایا ہے (اور لے دے کے ان کی یہی ایک تفریح ہے) اچھی فلموں کی نشان دہی کے لیے وہ اپنا کوئی ذاتی ادارہ۔ "ادارۂ بیانات و رشتہ" کی طرح سائیڈ بزنس کے طور پر کھول لیں تو اچھی خاصی آمدنی ہوگی اور شرفا قسم کے فلمی ناظرین بری فلمیں دیکھنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ اور وہاب کے حق میں دعائے خیر بھی فرمائیں گے۔

ڈاکٹر وہاب قیصر پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ لیکن مجھے یہ کہنے دیجیے کہ فی زمانہ اس پیشے میں وہ تقدس باقی نہ رہا جو کبھی کالجوں اور یونیورسٹیوں کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ مگر وہاب قیصر نے اپنے پیشے کے تقدس کو اپنے کالج کے حد تک ہی کیوں نہ ہو، بحال رکھا ہے۔ وہ ان لیکچرروں اور پروفیسروں میں شامل نہیں ہیں جو اپنی ہی طالبات سے اظہارِ عشق فرما کر زوجۂ دوم کی گنجائش نکال ہی لیتے ہیں اور نہ وہاب ان لیکچرروں میں شامل ہیں جو کالج کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی کسی اسکول بیزار لڑکے کی طرح واپسی کے لیے پر تولنے لگ جاتے ہیں، اور اپنے کالج کی گھنٹی کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔ آپ نے پیدائشی شاعر کی اصطلاح سنی ہوگی۔ لیکن وہاب قیصر اپنے آپ کو بڑے فخر سے "پیدائشی استاد" کہا کرتے ہیں کیونکہ ان کی تاریخ پیدائش ۵ ستمبر ہے جس دن ہمارے ملک میں "یوم اساتذہ" منایا جاتا ہے جو بھارت کے ایک مایہ ناز سپوت ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تاریخ پیدائش سے منسوب ہے۔ آپ نے پیدائشی شاعر کو تو نہیں دیکھا ہوگا لیکن ایک پیدائشی استاد وہاب قیصر کو اس کے اپنے کالج میں دیکھ لیجیے جو وہاں کے ماحول اور وہاں کی سرگرمیوں میں گھرا نہایت ہی مصروف نظر آئے گا۔ وہاب قیصر بظاہر کالج سے اپنے گھر آنے کو تو آ جاتے ہیں لیکن ان کا دل وہیں کہیں اٹکا رہتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے حساس، اتنے ذمہ دار اور اپنے طلبا و طالبات کو ٹوٹ کر چاہنے والے استاد کو نہیں دیکھا۔ میں یہ تجزیہ کرنے سے قاصر ہوں کہ وہاب نے ممتاز کالج کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے یا کالج خود ان پر طاری ہو گیا ہے۔ مجھے کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی ہونے لگتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہاب قیصر ممتاز کالج کو اپنی خانقاہ سمجھ کر وہیں کہیں نہ بیٹھ جائیں اور پھر "سائنس کے نئے افق" کا سلسلہ شروع نہ کر دیں۔ مجھے بڑی شدت سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہاب کے اس خاکے میں ممتاز کالج کچھ زیادہ ہی آ گیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ ممتاز کالج کے بغیر وہاب کا وجود اور وہاب کا خاکہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ وہاب قیصر نے ممتاز کالج کے نام کو اپنے نام کے ساتھ یوں جوڑ رکھا ہے جیسے وہ ان کا تخلص ہو۔ یعنی ——— سید عبدالوہاب المتخلص بہ ممتاز کالج۔ ان کا بس چلے تو وہ ممتاز کالج کے نام کو اپنے بازوؤں پر گدوا لیں جس طرح بعض قبائلی نوجوان محبت سے سرشار ہو کر اپنی محبوبہ کا نام اپنے بازوؤں پر گدوا لیتے ہیں۔ وہاب کی صحت و تندرستی کا راز بھی ممتاز کالج ہی میں پوشیدہ ہے جہاں سے انھیں توانائی ملتی ہے ——— مختصر یہ کہ وہاب کے لیے ممتاز کالج سرچشمۂ وجدان بھی ہے۔ وہاب قیصر سے ممتاز کالج چھین لیجیے، وہ بوڑھے ہو جائیں گے۔

دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے اور وہاب قیصر "سائنس کے نئے افق" لیے آسمانِ اردو پر نمودار ہوئے ہیں۔ اردو والوں کے لیے اُن کی آمد ایک نوید سے کم نہیں کہ اردو کے آکاش پر ایک نیا ثاقب طلوع ہوا ہے۔ یہ کوئی شہاب ثاقب نہیں ——— بلکہ وہاب ثاقب ہے، جس کی تابانی سے سائنسی ادب کے وہ تاریک گوشے جو اُردو والوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا کرتے تھے، منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ اسی لیے میں وہاب قیصر کو سائنسی ادب کا وہاب ثاقب کہتا ہوں۔

قیسی قمر نگری
(کرنول)

ہائیکو

۱۔ ڈاکٹر کا مشورہ تھا بعد تشخیصِ مرض
مجھ کو دس دن تک مسلسل ریسٹ لینا چاہیئے ہر حال میں
اس لیے اتوار کو دفتر مجھے جانا پڑا

○

۲۔ مجھ سے لڑتی ہے ناسمجھ بیوی
اپنی مردانگی دکھاؤں گا اُس کو ایسا سبق سکھاؤں گا
آج کھانا نہیں پکاؤں گا۔

۳۔ مجھے یہ لگتا ہے چنبل کی وادیوں کو چھوڑ
غضبناک، خطرناک، اور دہشتناک، خوں بہ لب ڈاکو
مرے شہر میں چلاتے ہیں نرسری اسکول

○

۴۔ مری بیوی نمائندہ ہے قومی یک جہتی کی
کرسمس ہو کہ رمضاں ہو، دسہرہ ہو، دِوالی ہو کہ پونگل ہو
ہر اک تہوار کو بے شک خریدے گی نئی ساڑی

—○—

مُنہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

چراغ لے کے بھی ڈھونڈیں اگر زمانے میں — ترا جواب نہیں پولسن لگانے میں
ہمارے جیسا کوئی نامور ہو تو لاؤ — لگی ہے فوٹو ہماری ہر ایک تھانے میں
تمام لوگ ملے گھر اُجاڑنے والے — دیا نہ ساتھ کسی نے بھی گھر بسانے میں
جو پوسٹ مین تھے، اللہ کو ہوئے پیارے — تمہارے گھر سے مرے گھر تک آنے جانے میں
جو کال ہے تو گوالوں کا کال ہے مُنہ پھٹ
لگا ہوا ہے زمانہ دہی جمانے میں

★

مانگے سبیل کے لیے چندہ گلی گلی — واعظ کے سر پہ ڈال دو پانی فرات کا
چاہت کا بھوت سر سے اُتر جائیگا ابھی — گر اس پہ استعمال ہو دو چار لات کا
دس بج کے تیس منٹ تھی ساعت نکاح کی — دو بج چکے، پتا نہیں اب تک برات کا
اسلام کا وقار دکھانے کے واسطے — شروان میں لگا دیا پیسہ زکات کا
بہتر تو ہے یہی کہ گرانی کے دور میں — ٹھرّا چڑھاؤ، گاؤ ترانہ حیات کا
کل رات ہارٹ اٹیک نے شاعر کو دھر لیا — بے چارہ لکھ رہا تھا قصیدہ ثبات کا
بیوی کو دے رہا ہے طلاق ابنِ مولوی — وقت اس کے واسطے کیا فِکس آدھی رات کا
مُنہ پھٹ بھلا نہ ہوگا کسی کا ودربھ سے
کر ذکر مولوی کی طرح کائنات کا

ایس ایم معین قریشی (کراچی)

کتے ـــــ دو ہی اچھے

غالباً کتا آپ کا وہ واحد مخلص دوست ہے جسے آپ بازار سے خرید سکتے ہیں۔ اہلِ مغرب تو اس کے اتنے گرویدہ ہیں کہ پہلے پیار سے اس کو گود میں بٹھاتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ خود ان کی گود میں بیٹھنے لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی بعض "بیگم گزیدہ" لوگ اپنی پوری زندگی کتوں کی نازبرداری میں گزار دیتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصے قبل ایک سیاسی رہنما کے نصف درجن کتوں میں سے ایک نے انھیں داغِ مفارقت دیا تو انھوں نے آنجہانی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ایک نامور مصور سے ۵۰ ہزار روپے میں اس کا پورٹریٹ تیار کروایا اور اسے اپنی خوابگاہ میں انتقاماً اس جگہ لگوایا جہاں اصولاً کسی اور کی تصویر ہونی چاہیے تھی۔ اب ان کی زبان پہ یہی ورد ہے کہ

نام لے لے کے ترا ہم تو جیئے جائیں گے ؛ لوگ یونہی ہمیں بدنام کیئے جائیں گے

تاہم یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم کتوں سے اسی طرح ڈرتے ہیں جیسے منتخب وزرائے اعظم آٹھویں ترمیم سے۔ گزشتہ دنوں ہمیں ڈیفنس سوسائٹی میں واقع ایک صاحب کے محل نما گھر میں جانے کا اتفاق ہوا یہ صاحب یعنی شاہ صاحب ریڈیو پر سادگی، انکسار اور قناعت جیسے موضوعات پر بہت بلیغ لکچر دیتے ہیں۔ جوں ہی ہم نے دروازے کے اندر قدم رکھا چار بھونکتے ہوئے کتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم واپس بھاگ جانا چاہتے تھے کہ شاہ صاحب گھر سے باہر آگئے اور انھوں نے یہ کہہ کر ہمیں دلاسہ دیا کہ "ڈریئے نہیں یہ کتے بھونکتے ہیں کاٹتے نہیں"۔ ہم نے کہا "ظاہر ہے جس وقت بھونک رہے ہوں گے تو کاٹیں گے کیسے؟ اور ویسے بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ابھی بھونکنا بند کرکے کاٹنا نہیں شروع کردیں گے۔ اور سو باتوں کی ایک بات، شاہ صاحب، کتے دو ہی اچھے"۔ فرمانے لگے "دو ہی کیوں اچھے"؟ ہم نے عرض کیا "دیکھئے نا، حکومت کہتی ہے کہ بچے دو ہی اچھے دو تو یہ ہوگئے ان میں دو کتے شامل کرلیجئے یہ کل چار ہوگئے۔ آخری منزل تک پہنچنے کے لیے بھی انسان کو چار کی ضرورت ہوتی ہے"۔

آخری منزل پر یاد آیا، بعض اوقات، کتے انسان کو بڑی بڑی مشکلات سے چھٹکارا بھی دلا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک صاحب کی بیوی کا انتقال ہوگیا جب ان کی میت یعنی ان کی بیوی کی میت بازار سے گزر رہی تھی تو صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ تین اطراف کے کندھے تو مسلسل بدل رہے تھے مگر بائیں جانب کا پچھلا پایا ایک صاحب نے مستقلاً پکڑا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک کتا چلا جا رہا تھا جس کی زنجیر انھوں نے اپنے دوسرے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ ان کے پیچھے لوگوں کی

ایک لمبی قطار بھی ساتھ چلی آتی تھی۔ ایک راہ گیر نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو حیران ہوکر ان سے پوچھا "بھائی یہ جنازہ کس کا ہے؟" انھوں نے جواب دیا "میری بیوی کا" اس نے سوال کیا "بے چاری کو کیا ہو گیا تھا؟" "اس کتے نے کاٹ لیا تھا"۔ راہ گیر نے گڑگڑاتے ہوئے التجا کی "بھائی صاحب ایک دن کے لیے یہ کتا مجھے دو گے؟" بولے "لگ جاؤ لائن میں"۔

ہمارے محترم سیاست داں نے اپنے جس مرے ہوئے کتے کا پورٹریٹ بنوایا ہے شاید اس نے بھی ان کے لیے کوئی ایسی ہی گراں قدر خدمت انجام دی ہوگی۔

جہاں تک کتے کی انسان دوستی کا تعلق ہے ہمارے ذہن میں اس کی تین وجوہ آتی ہیں یعنی ۱. یہ انسان کو کوئی مشورہ نہیں دیتا۔ ۲. یہ کبھی قرض نہیں مانگتا اور ۳. یہ شاعری نہیں کرتا۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود کاٹنے کی حد تک اس کی دوستی پہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ایک دوست اپنے کسی عزیز سے ملنے ان کے گھر گئے ابھی انھوں نے دروازے کے اندر قدم ہی رکھا تھا کہ وہاں بیٹھے ہوئے ایک پلے نے ان کے ٹخنے میں بڑی محبت سے دانت گاڑ دیئے۔ ہمارے دوست نے تکلیف سے منہ بسورتے ہوئے اپنے میزبان سے شکایت کی "یہ دیکھیے اس نے ٹخنے میں کاٹ لیا"۔ میزبان نے بے پروائی کے ساتھ کہا "اب اتنا سا کتا آپ کی گردن تک تو پہنچنے سے رہا"۔

ہمارے دوست نے علاج کے لیے ایک ڈاکٹر صاحب سے فون پر رابطہ قائم کیا تو وہاں سے جواب دیا "آپ کو معلوم نہیں میرے مطب کا وقت شام آٹھ سے دس بجے تک ہے اور اب گیارہ بج رہے ہیں؟" مریض نے کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے تو معلوم ہے لیکن کتے کو معلوم نہیں ہے"۔ نہ جانے بے چارے کا کیا ہوا۔

آج کل کتے بطور اسٹیٹس سمبل بھی بہت مقبول ہیں۔ مارک ٹوین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کے اصرار پر ہم نے شہر کے ایک پوش علاقے میں مکان کرائے پر لے لیا لیکن رات کو جب پاس پڑوس سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتیں تو ہمیں بڑی شرمندگی ہوتی۔ چونکہ ہم فوری طور پر کتا AFFORD نہیں کر سکتے تھے اس لیے ہم نے اس مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ آدھی رات کے قریب سب گھر والے ایک کمرے میں جمع ہو کر خود ہی بھونک لیا کرتے تھے۔ ہمارے دوست ضیاء الحق قاسمی نے اس صورتِ حال کو ایک قطعہ میں یوں رقم کیا ہے۔

گھر کی رکھوالی کی ہم میں استطاعت ہی نہیں ÷ ہم نے اخراجات گرچہ کر لیئے ہیں کم سے کم
اپنے ہمسایوں کے کتے بھونکتے ہیں رات کو ؛ اپنے گھر میں بھونک لیتے ہیں بھی مل جل کے ہم

علماء اور مشائخ نے کتے کے ایسے گیارہ اوصاف گنوائے ہیں کہ کسی انسان میں یہ جمع ہو جائیں تو وہ ولی بن جائے۔ ان میں ایک وصف یہ ہے کہ کتا مرنے پر کوئی میراث نہیں چھوڑتا۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اسے استغنیٰ کہا جاتا ہے لیکن کتے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک انگریزی اخبار میں پڑھا کہ لندن کے ایک کتے نے ڈیڑھ لاکھ پونڈ کا ورثہ چھوڑا ہے اور حکام کو اس کے جائز وارث کی تلاش ہے۔ کہانی اس طرح ہے کہ مسٹر ولیم لندن کے STOCK EXCHANGE میں بحیثیت تاجر رجسٹرڈ تھے۔ کون ولیم؟ یوں تو برطانوی شہزادوں میں بھی ایک ولیم ہے لیکن ہم جس ولیم کا ذکر کر رہے ہیں وہ ایک کتا تھا۔ جب وہ اس دنیا سے سدھارا تو اسٹاک ایکسچینج کے ریکارڈ کے مطابق اس کے جمع شدہ سرمائے کی مالیت ڈیڑھ لاکھ پونڈ تھی۔ اس کی مالکن مسز انیتا کلفٹ نے اس رقم کو حاصل کرنا چاہا تو کہا گیا کہ قانوناً جانور تو انسان کا وارث بن سکتا ہے لیکن کوئی انسان کسی جانور کا وارث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دیکھیے انسان ہونے کا بعض اوقات کتنا نقصان

سامنے آتا ہے۔ تاہم مسز کلفٹ نے بھی ہمت نہیں ہاری انھوں نے مس لوسی کی جانب سے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ آنسہ لوسی ایک کتیا ہیں جو رشتے میں ولیم کی بھتیجی لگتی ہیں اور اس لحاظ سے اپنے چچا کے وارثہ کی واحد حقدار ہیں اب عدالت کو یہ طے کرنا ہے کہ ولیم کی دولت اس کی بھتیجی کے نام منتقل کی جاسکتی ہے یا نہیں ؟ شکر ہے یہ کیس برطانیہ کا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا ہوتا تو ہم میں سے کتنے ہی جو اشرف المخلوقات ہونے کی تہمت بہت پہلے سر سے اتار کر پھینک چکے ہیں بھونکتے ہوئے جاتے اور عدالت کا گھیراؤ کر لیتے ..... آخر نوبت ریفرنس تک آجاتی۔

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آج کل انسان ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح کا سلوک کر رہے ہیں جس وحشت اور بربریت کے مظاہرے دن رات دیکھنے کو مل رہے ہیں ان پر انسان تو اپنی جگہ کتوں کو بھی تشویش ہے۔ اس تشویش کو ایک نوجوان شاعر نے اس طرح رقم کیا ہے۔

ایک کتا دوسرے کتے سے بولا بھاگ لے ٭ بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا

وجہ اس کی یہ ہے کہ کتے کا کاٹا تو چودہ ٹیکوں میں ٹھیک ہو جاتا ہے انسان کے کاٹے کا کوئی ٹیکہ آج تک ایجاد نہیں ہوا اسی لیئے غالب نے بھی کہا تھا۔

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اردو ادب میں دو وی آئی پی کتوں کا ذکر ملتا ہے ایک خواجہ سگ پرست کا کتا تھا جو مخمل کے قالین پر اس کے ساتھ بیٹھتا تھا اور دوسرا سگ لیلے جو اپنی مالکن کی نیابت کرتے ہوئے قیس کے سینے سے لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھار جب نجد کے شریر لڑکے قیس کو پتھر مارتے تھے تو یہ کتا اس طرح اس کے سامنے آجاتا تھا جیسے ہماری فلموں کی بری عورت آخری سین میں سینے پر گولی کھا کر اپنی جان پر کھیل جاتی ہے اور بوڑھے ہیرو کو اگلی فلم کے لیے پھر سے ہم پر مسلط کر جاتی

بعض لوگ کتوں کو انسانوں کی اصلاح کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ میری لینڈ کے ایک رئیس نے مرتے ہوئے وصیت کی "میری تمام دولت اور جائیداد میری بیوی کے نام ..... بشرطیکہ وہ میرے پیارے کتے ٹوٹو جو میری ہی جیسی عادتوں کا مالک ہے اس سے زیادہ آزادی دے جتنی اس نے مجھے دے رکھی تھی۔ سنا ہے کہ بیوی نے دولت کے حصول کے خاطر ہی سہی کتے کو شوہر کے برابر درجہ دے دیا۔

نثار عباسی
الہ آباد

بیوٹی پیجنٹ
(نمائشِ حُسن)

عریانیت کا جشن ہوا آج شام کو
اس جشن کو میں کیا کہوں اس اہتمام کو

کیا کیا نمائشیں ہوئیں ہر شے کی یاں مگر
جنسِ حیا مِلی نہ کہیں کوئی نام کو

"پبلکلی پراسٹیٹوٹ" کیا اپنے جسم کو
دِکھلایا عضو عضو خواص و عام کو

کس کس ادا سے "سین" "کیا" "آبسین" کو
کیا کیا مِلی ہے داد ادائے خرام کو

دیدہ دلیری دیکھئے دوشیزگانِ حسن
خود داغدار کرتی ہیں عورت کے نام کو

تہذیبِ مشرقی کی ہوئیں قدریں پاش پاش
اہلِ ہوس نے توڑا ہے عفت کے جام کو

عورت کو ایک جنسِ تجارت بنا دیا
بدنام کر کے رکھ دیا عورت کے نام کو

ثابت یہ کر کے چھوڑا کہ مغرب زدہ ہیں ہم
دنیا میں اونچا کر دیا بھارت کے نام کو

آیا یہ کس کے ذہن میں اس جشن کا خیال
عریانیت جو پہونچی حدِ اختتام کو

حیران ہوں لفظ ملتے نہیں کیا کہوں نثار
اس ذہنیت کو ذہن کے سودائے خام کو

محبوب مانجھوی
بلاسپور

غزل

جہاں میں اس سے بڑی اور کوئی بَلا ہی نہیں
یہ بھوت عشق کا چمٹا تو چھوڑتا ہی نہیں

ابھی سے ہونے لگا جائداد پر جھگڑا
ابھی تو باپ تمہارا میاں مرا ہی نہیں

ہزار لعنتیں بھیجیں، کئی اُپائے کئے
بڑا ہی ڈھیٹ ہے شیطان، بھاگتا ہی نہیں

وہ گاؤں، گاؤں نہیں جس میں ہو نہ اِک بھٹّی
وہ شہر، شہر نہیں جس میں میکدا ہی نہیں

کیا تھا جس کے لیے میں نے سارا دن میک اَپ[ـہ]
مُوا وہ میری طرف مُڑ کے دیکھتا ہی نہیں

مشاعرہ جو ہُوا آل انڈیا محبوبؔ
سوائے میرے کوئی دوسرا جما ہی نہیں

ـہ ریختی

مانک ٹالہ (ممبئی)

کالکی اوتار

"برہما لوک" میں وشنو بھگوان تیار ہوکر باہر ٹہل رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں گرز ہے، دوسرے ہاتھ میں چکر، تیسرے ہاتھ میں شنکھ اور چوتھے میں تازہ کنول ہے جو چاروں طرف اپنی خوشبو پھیلا رہا ہے برہما اپنی اردھانگنی کا انتظار ہے۔ ان کی اردھانگنی (نصف بہتر) لکشمی دیوی ابھی تیار ہوکر باہر تشریف نہیں لائی ہیں۔ صنف نازک چاہے دیوی ہو یا عورت۔ تیار ہونے کے لیے دو منٹ کا مطلب ہوتا ہے دو گھنٹے۔ آج برہما اپنی پتنی کے ساتھ اپنی سواری گرڑ (عقاب سے ملتا جلتا پرندہ) پر بیٹھ کر تینوں لوکوں کی سیر کے لیے جانے والے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر گرڑ اپنے پر پھیلائے پرواز کے لیے بالکل تیار تھا۔ بیٹ انجن طیارے سے بھی کہیں زیادہ تیز رفتار گرڑ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک بارہا اپنے فن کا مظاہرہ کرچکا تھا۔

اِتنے میں "نارائن نارائن" کا ورد کرتے ہوئے نارد مُنی جلوہ افروز ہوئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ان کی اپنی ایجاد کردہ وِینا ہے اور دوسرے ہاتھ میں کھرتال ہیں۔ گلے میں "رودراکش" کی مالائیں۔ اور بازوؤں اور کلائیوں میں گل موتیا کے گجرے ہیں۔ انھوں نے آتے ہی وشنو بھگوان کو ڈنڈوت بجالائے، اور ایک طرف ادب سے کھڑے ہوگئے

تشریف لائیے نارد مُنی! آپ کا گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے"۔ بھگوان وشنو نارد مُنی سے مخاطب ہوکر بولے "آج بڑے عرصے کے بعد ادھر کا رُخ کیا ہے۔ لگتا ہے کہ اس بار دھرتی پر بہت ہی زیادہ قیام فرمایا تھا۔ آپ کے چہرے مہرے سے پتا چلتا ہے کہ آپ بھولوک (دنیا) سے بڑے بڑے سماچار بٹور کر لائے ہیں۔ اور ہمیں سنانے کے لیے بے چین و بے قرار ہیں۔"

نارد مُنی نے سر جھکا کر جواب دیا "جی بھگوان! آج کل دھرتی پر بڑی عجیب و غریب گھٹنائیں ہو رہی ہیں وہاں کے حالات کا جائزہ لینے میں کافی وقت لگ گیا تھا ——— (تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے) لیکن بھگوان آپ تو کہیں جانے کی تیاری کررہے ہیں ——؟ محترم نارد! آپ جب تشریف لائے ہیں تو ہم کہیں جا بھی سکتے ہیں؟ دراصل ہم تو تینوں لوکوں کا دورہ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ویسے بھولوک (زمین) کے سماچار تو آپ لے ہی آئے ہیں۔"

اِتنے میں رنگ و نُور میں نہائی ہوئی لکشمی دیوی، نہایت ہی قیمتی ساری میں ملبوس پروقار انداز میں نپے تُلے قدم اُٹھاتی ہوئیں براجمان ہوتی ہیں۔ کانوں، گلے اور بازوؤں میں سونے جواہرات کے زیور اُن کی شوبھا کو چار چاند لگا رہے تھے۔ وہی زیور تھے جو ابتدائے کائنات سے وہ پہنتی چلی آرہی تھیں۔

نارد مہاراج، لکشمی دیوی کے گلے اور بازوؤں میں سجے زیوروں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئے :

ے بھوشن بھار سنبھاری ہیں کیوں تن سکمار
زیور نازک
سودھے پایں نہ پرت دھر سوبھا ہی کے بھار
سیدھے پاؤں بوجھ

نارد مُنی کے مُنہ سے غیر متوقع طور پر تلسی جی کا دوہا سُن کر لکشمی دیوی اور وشنو بھگوان دونوں حیرت زدہ رہ گئے ــــ نارد جی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بڑی نمرتا سے بولے ــــ "لکشمی میّا! یہ دوہا میں نے آپ کے لیے نہیں کہا بلکہ آپ کے بدن پر کے زرق برق والے لباس اور چمکیلے زیورات کو دیکھ کر مجھے دھرتی لوک کی ایک "سکمار" ناری کا دھیان آگیا جس کے پاس آپ کی کرپا (مہربانی) سے ڈھیروں چمکتے بھاتے زیورات ہیں کہ اگر وہ سارے کے سارے ایک ساتھ پہن لیں تو موٹاپے کے باوجود اس کی کمر جھک جائے۔۔۔ وہ مہیلا جن سیوکا کہلاتی ہیں اور دن رات جنتا جناردھن کی سیوا کے بدلے میں وہ مہینے بھر میں صرف ایک روپیہ تنخواہ لیتی تھیں۔ اب ایسی سیوکائیں کہاں ملیں گی کہ ایک روپے مہینے میں ڈھیروں سونے چاندی کے ساتھ ساتھ دس ہزار بڑھیا سے بڑھیا ساڑیاں بھی خرید سکیں ـــ!
ــــ ہو سکتا ہے کہ انہیں دروپدی کی طرح چی ر (چیر) ہرن کا ڈر ہو۔ اب یہ ست یگ تو ہے نہیں کہ دروپدی کی پرارتھنا پر اُن کی عصمت کو بچانے کے لیے کرشن مہاراج ساڑیوں کا نہ ختم ہونے والا اسٹاک (STOCK) لے کر براجمان ہو جاتے اس لیے اپنی عزت کے تحفظ کا خود ہی انتظام کر لیا ہوگا۔

لکشمی میّا اور وشنو بھگوان تھوڑے سمے کے لیے تو حیران سے رہ گئے۔ لکشمی دیوی کچھ کہنے کے لیے لب وا کرنا ہی چاہتی تھیں کہ بیچ ہی میں نارد رشی پھر بول پڑے کہ ابھی اُن کی بات ختم نہیں ہوئی :

"میں اِدھر آنے سے پہلے کیلاش پربت بھی گیا تھا۔ گنگوتری پر پاروتی میّا اپنی ساڑی دھو رہی تھیں اور گنگنا رہی تھیں ــــ "جے جے شیوشنکر۔ کانٹا لگے نہ کنکر! ۔۔۔۔ تو میں اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ اور کھل کھلا کر بولا ـــ میّا آپ تو بھگتی کے رس میں اتنی مگن ہیں کہ اس بے کار و ناکارہ وجود کے آنے کا آپ کو پتا بھی نہ چلا ـــ

میری بات سُن کر پاروتی میّا کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔ شرما کر بولیں ارے نہیں نارد مہاراج ـــ یہ بھگتی بھجن نہیں ہے بلکہ کسی فلم کا گانا ہے۔ برسوں پہلے آپ کے بھولے شنکر ضد کر کے مجھے اس پربت سے نیچے اُتار کر ایک بڑے سے نگر میں لے گئے تھے۔ ہم دونوں نے گنواروں کا بھیس بدل لیا تھا اور "نندی بیل" (شوجی کی سواری) کو ٹوٹی پھوٹی سائیکل کے روپ میں ڈھال دیا گیا تھا۔ (نوٹ : نارد مُنی کے مکالموں کا تسلسل ہی ہے) اس پر سوار ہو کر پہنچے اور بلیک میں ٹکٹ خرید کر سینما ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں ہیرو ہیروئن فلم کے پردے پر بھانگ پی کر یہ گانا گا رہے تھے۔ اور ڈانس بھی کر رہے تھے۔ اُسی دن سے تمہارے بھولے شنکر تانڈو نرت بھول گئے ہیں ـــ

ے ایسے ہی موقع پر حضرت اکبرالہ آبادی کا ایک شعر ہے :
ے ناز کہتا ہے کہ زیور سے ہو نسرین جمال ؛ نازکی کہتی ہے سُرمہ بھی کہیں بار نہ ہو۔

____ مجھے تو بس یہی ایک گانا آتا ہے جو گنگناتی رہتی ہوں۔ گھر پر نہ ریڈیو ہے نہ ٹی وی (T.V)۔ تفریح کا کوئی سامان ہی نہیں۔ تمہارے بھولے ناتھ تو آسن جمائے، آنکھیں بند کیے نہ جانے کن کن لوگوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔" پاروتی میّا نے بھگوان شِو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ____ سامنے ان کا نندی بیل بیٹھا جگالی کر رہا تھا اور دُم سے مکھیاں اڑائے جا رہا تھا حالانکہ وہاں ایک بھی مکھی نہیں تھی ____ لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ کیسے اپنی دُم کو نہ ہلاتا؟

"ہمیں آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر بھولے ناتھ کی سمادھی بھنگ ہوگئی اور وہ 'بم بم بھولے' کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اٹھ کر ڈنڈوت بجالائے۔ بھولے ناتھ نے آشیرواد دی اور سُکھ سماچار پوچھا ____ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر شِو مہاراج سے کہا "بھگوان آپ کیسے تپی ہیں ____؟ ریڈیو۔ ٹی وی نہ سہی پر اپنی پتنی کو کم سے کم چار چھے ساڑیاں تو لا دیں۔ بچاری ایک دھوتی ہیں، دوسری پہنتی ہیں ____ آپ اجازت دیں تو میں اُس دُشٹ (؟) سے دس بیس ساڑیاں لے آتا ہوں۔ اُس کے پاس تو ہزاروں ساڑیوں کا ڈھیر ہے۔ وہ پاروتی میّا کے لیے منع تھوڑے ہی کریں گی۔ بلکہ اسے تو وہ اپنی خوش نصیبی سمجھیں گی۔ اس پر پاروتی میّا فرمانے لگیں ____ ارے نہیں نارد مہاراج، میری ساڑیاں آج کے سمے کی ساڑیاں نہیں کہ جنھیں "نرما آبا" سے دھونا پڑے۔ یہ تو گنگا جل کے نرمل جل سے ہی صاف ستھری ہو جاتی ہیں، نہ رنگ پھیکا پڑتا ہے اور نہ پھٹتی ہیں۔

"اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ یہ گنگا وہ گنگا نہیں رہی جس کے تقدس کی قسمیں کھائی جاتی تھیں گنگوتری سے نیچے اُترتے ہی اس میں ایسی ایسی گندگی شامل ہونا شروع ہو جاتی ہے کہ اس کا چُلّو بھر پانی پینے سے ایک جاندار اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ اسی لیے تو لوگ اب پانی کو ہاتھ نہیں لگاتے بلکہ کوک (COKE) اور پیپسی (PEPSI) سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتی کے بجائے کوک کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے"۔

بھگوان وشنو نے پوچھا ____ محترم منی سُنا ہے کہ اب بھارت ورش میں غذا اور غلے کا مسئلہ تو ختم ہو گیا ہے۔

"جی پربھو ____" نارد منی گویا ہوئے ____ "اب تو وہاں "کینٹکی چکن" اور "میک ڈانلڈ" کی دکانیں جگہ جگہ کھل گئی ہیں۔ اور تو اور اناج کی مصنوعی قلت پیدا کی جانے لگی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اناج کی مصنوعی قلت کبھی اس قدر زیادہ کر دی جاتی ہے کہ دیش میں "ہاہاکار" مچ جاتی ہے۔ اور پھر اس مسئلہ کو دور کرنے کے لیے سرکار کو پھر سے اناج کی درآمدات شروع کرنا پڑتی ہیں۔ اِن مرحلے پر گھٹالے کے جو سلسلے شروع ہو جاتے ہیں ان میں بڑے بڑے لوگوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں اور ...."

یہاں نارد منی کی بات کاٹتے ہوئے وشنو بھگوان نے پوچھا "منی راج یہ حوالے گھٹالے کا کیا چکر ہے ....؟"

"بھگوان کس کس گھٹالے حوالے کا ذکر کروں؟ یہاں تو چوروں کی بارات اُتری ہوئی ہے ____ چارے کے گھٹالے کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ایک مرغی ایک دن میں چالیس کلو دانہ کھا لیتی ہے۔ گائے بھینسوں کو دو پہیے کی گاڑی جسے وہاں اسکوٹر کہتے ہیں میں بٹھلا کر اُن کا یاتایات کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ عام پرانی کے دُکھ دلدر دور کرنے کے نام پر ہو رہا ہے۔ لیکن ایک عام انسان بالکل لاچار سا ہو گیا ہے۔ اب تو اس کے کھانے میں بھی چارا ملا دیا جاتا ہے ____ اور پربھو ایک جین ڈائری حوالہ کا بھی معاملہ ہے۔ اس میں کوڈ (CODE) کی بھاشا میں [illegible] بیادار [illegible] دل [illegible]

روپے کی بھگتان کی گئی ہے۔ ایک بڑے نیتا کی تو اسی دکھ میں ہردے گتی رک گئی۔ کئی ان سے بھی چھوٹے بلکہ پٹیچر نیتاؤں کو پانچ، دس اور پندرہ پندرہ کروڑ روپے دیئے گئے لیکن انہیں صرف پانچ لاکھ پر ہی ٹرخا دیا گیا۔ ان سے اپنی یہ مان ہانی سہن نہ ہو سکی تھی۔

۔۔۔ اور سوٹ کیس کے گھوٹالے کے بعد یہ سنا گیا ہے کہ لوگ یاترا پر جانے کے لیے دکان پر سوٹ کیس خریدنے کے لیے جاتے ہیں تو دکاندار پوچھتا ہے کہ پچاس لاکھ کے سائز کا سوٹ کیس چاہیے یا ایک کروڑ کے سائز کا ۔۔۔!"

بھگوان وشنو فکر مند سے ہو کر بولے "تو اس دیش میں اب کوئی بھی انسان ایماندار نہیں رہا!"

"نہیں بھگوان ایسی بات نہیں ہے" نارد منی دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔ "مہاراج آج سے آج جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ بالکل ایماندار ہے ۔۔۔"

"اور کیا سماچار ہے، نارد مہاراج"

"کیا بتلاؤں پربھو! دھرتی پر ایک دیش ہے امریکہ۔ وہاں کا پردھان اب ساری دھرتی پر یوں دندناتا پھر رہا ہے جیسے شیوجی کے نام پر چھوڑا ہوا بیل ۔۔۔ جدھر سینگ سماتے ہیں چلا جاتا ہے۔ کسی کی فصل روندتا ہے کسی کا گھر جلاتا ہے۔ کسی کو گھاتک ہتھیار سپلائی کرتا ہے۔ کسی کی روٹی چھین لیتا ہے کسی کو پیاسا مارتا ہے۔ کوئی اف تک کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ سارے سنسار میں بم دیوالی کے پٹاخوں کی طرح چل رہے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے ہیں ۔۔۔ بھگوان آپ نے انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے ہر یگ میں اوتار لیئے اور آپ نے وچن دیا تھا کہ آپ کل یگ میں "کالکی اوتار" لے کر آئیں گے ۔۔۔"!

وشنو بھگوان کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہے، پھر فرمانے لگے "نارد منی ۔۔۔ پہلے میں پرانی نسلوں کو راکشسوں اور اسروں کی چنگل سے چھڑانے کے لیے اوتار لیتا تھا لیکن جب انسان خود ہی راکشس بن جائے اور اپنے آپ کو نہس نہس کرنے پر تل جائے تو اس کا کلیان ممکن نہیں ہے ۔۔۔ نارد رشی ۔۔۔! اب میں اوتار نہیں لوں گا ۔۔۔"

مرزا کھونچ
بیتیا (بہار)

ہنگامہ کے فوائد

کہنے والے نے خوب کہا:

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

مطلب صاف ہے کہ ہنگامہ کے بغیر جیسے گھر کی رونق نہیں ہے تو باہر کی رونق کیسے برقرار رہے گی۔ آج ہنگامہ ہر گوشۂ زندگی میں اپنا دبدبہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ گھر میں ہنگامہ، شہر میں ہنگامہ، محلہ میں ہنگامہ، دفتر میں ہنگامہ، سیاست میں ہنگامہ، ادب میں ہنگامہ، شادی میں ہنگامہ، پیدائش پر ہنگامہ، موت پر ہنگامہ، اگر شراب خانے میں ہنگامہ ہے تو خدا خانہ بھی ہنگامے سے خالی نہیں ہے۔ جہاں دیکھیے ہنگامے کا بازار گرم ہے۔ اگر ہنگامہ نہ ہو تو لوگ بارات کو بھی جنازہ سمجھ بیٹھیں گے اور ہنگامہ آرائی نہ ہو تو سہرا بھی مرثیہ کا تاثر پیدا کرنے لگے گا۔ ہنگامہ کے بدولت ہی اخبارات کی اہمیت باقی ہے۔ ویسے بھی بھارت میں اخبارات پڑھے کم جاتے ہیں، بچھا کر سونے کے کام میں زیادہ آتے ہیں۔ اخبارات کی ہنگامہ خیز سرخیوں سے ہی ہمارے خون کی سرخ حدت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہنگاموں کی نوعیت بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ کچھ ہنگامے خود ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی طے شدہ وقت ہوتا ہے نہ موسم بلکہ یہ ہنگامے سال تمام کہیں نہ کہیں ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ ہنگامے کرائے جاتے ہیں۔ کبھی مسجد کو مسمار کر کے ہنگامہ کرایا جاتا ہے۔ کبھی مسجد کی تعمیرِ نو کے معاملے پر ہنگامہ ہوتا ہے۔ جس گھر میں ہنگامے نہ ہوں تو وہ گھر بھوتوں کا ڈیرہ لگنے لگتا ہے۔ آپ دفتر سے خالی الذہن ہو کر لوٹے ہیں۔ گھر میں بچے نہیں ہیں ہنگامہ نہیں ہے۔ ہنگامے کی امی جان یعنی بیگم صاحبہ بھی کہیں گئی ہیں۔ آپ اداس ہو جاتے ہیں۔ "نہ جانے سب کہاں گئے ہیں۔" خدانخواستہ اگر بچے اور بچوں کی امی جان بلائے جان کی طرح آدھمکیں تو پھر وہی ہنگاموں

غزلیں

عبدالحفیظ لقبؔ عمران
اچلپور

جو اس کے منہ پہ چھوڑا قینچی سگرٹ کا دھواں ہم نے
کہا اس نے دکھایا چونا بھٹّی کا سماں ہم نے

گرانی سے ہوئی وہ سرگرانی بے تحاشہ کل
منسٹر کو سرِ بازار دیدیں گالیاں ہم نے

نہ چھوئے خادماؤں کے چرن ہم نے زمانے میں
بڑھا جب کام گھر کا تو بڑھالیں بیویاں ہم نے

اُٹھاتے ہاتھ میں تلوار تو کچھ بات بن جاتی
ڈریں کیا خاک دشمن کر پہن لیں چوڑیاں ہم نے

محبّت کی جسارت اب تو ہرگز کر نہیں سکتے
تمہارے شہر کی دیکھی ہیں پولس چوکیاں ہم نے

بہر صورت لقبؔ ہم ایک قد آور قریشی ہیں
مقابل جو بھی آیا اس کی کر دیں بوٹیاں ہم نے

●

دیکھ کر صبح کے آثار غـزل کہتے ہیں
کر کے اس چہرہ کا دیدار غزل کہتے ہیں

کوئی کج فہم کہیں آکے نہ ڈسٹرب کرے
لے کے ہم ہاتھ میں تلوار غزل کہتے ہیں

ہجر میں اور تو کچھ ہم کو نہیں سوجھتا بس
یاد کر کے تمہیں سرکار غزل کہتے ہیں

شاعری دھندا نہیں اہلِ طرب کا یارو
غم سے ہوتے ہیں جو دو چار غزل کہتے ہیں

ان کو دنیا میں کبھی ہوتی نہیں فکرِ علاج
آپ کے جتنے ہیں بیمار غزل کہتے ہیں

لینا دینا نہیں کچھ بھی غم دنیا سے ہمیں
حُسن کے پازیب کی جھنکار غزل کہتے ہیں

جب بھی بیگم نے کی درخواست کہ آلو لادو
کہہ دیا ہم نے خبردار غزل کہتے ہیں

اس روایت میں کبھی فرق نہیں آتا لقبؔ
اُن کی زلفوں کے گرفتار غزل کہتے ہیں

○

ہمّت تو اس کی دیکھو مرے پاس بیٹھ کر
وہ پیتی ہے سگار ارے باپ کیا کروں

اک دلربا نے پیار محبّت کے نام پر
لوٹا مرا قرار ارے باپ کیا کروں

اک شعلہ رو سے پیار کا انجام الاماں
سینہ ہے داغدار ارے باپ کیا کروں

جینا مرا حرام نہ ہو جائے جانِ من
دل میں ترے غبار ارے باپ کیا کروں

★

کا زدہ چوں کے ہنگاموں سے فرصت ملی تو نمک تیل کے لیے ہنگامہ۔ ہنگامہ سے گھریلو محبت کو تقویت ملتی ہے۔ دوستوں کو گھر بلانے پر ہنگامہ، دوستوں کے گھر جانے پر ہنگامہ، ساس بہو کے درمیان ہنگامہ، نند اور بھابی کے بیچ ہنگامہ، نہ کچھ بن پڑا تو نوکرانی سے محاذ آرائی! اگر یہ ہنگامے نہ ہوں تو گھریلو زندگی کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے گا۔ ازدواجی زندگی کا چاند گہن آلود ہو جائے گا۔ اگر باورچی خانہ میں ہنگامہ نہ ہو تو کھانے میں لذت ہی نہیں ملتی۔

شہر میں ہنگامہ نہ ہو تو شہر بے رونق ہو کر رہ جائے۔ ماتم کدہ دکھائی دینے لگے اور پولس والوں کی کارکردگی پر حرف آنے لگے۔ ان کی وردی پر کاہل پن کا داغ تک لگ جائے۔ اگر انھیں بیٹھ کر روٹی توڑنے کی عادت ہو گئی تو آئندہ لا اینڈ آرڈر کا اللہ ہی حافظ۔ ہنگامہ آرائی سے پولس والوں کے لیے کام نکل آتا ہے۔ پولس ہنگامہ کی بدولت ہی چست اور چالاک نظر آتی ہے۔ دوڑ کر ادھر آتی ادھر جاتی، بدمعاش نہیں پکڑے جائیں تو کیا ہوا، شریف لوگوں کو پکڑ کر خانہ پری کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ ادھر کے دس ادھر کے حساب برابر۔ اخباروں میں دھڑا دھڑ خبریں چھپنے لگتی ہیں کہ پولس نے ہنگامے پر فوراً قابو پا لیا۔ گو حالات کشیدہ ہیں مگر قابو میں ہیں۔ ان ہنگاموں سے افواہوں کو بھی تقویت ملتی ہے۔ ان ہنگاموں سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پولس کی گشت بڑھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے چوروں کا ڈر ختم ہو جاتا ہے اور رات میں مکین کی نیند آتی ہے بچے باہر نکلنے سے گھبراتے ہیں۔ بیگم کا شوقِ سنیما اور ذوقِ شاپنگ بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ جس سے مالکِ خانہ چین کی بانسری بجاتے ہیں۔ شوہر بھی دم دبائے بھیگی بلی کی طرح کونے میں دبکے پڑے رہتے ہیں۔ بیگمات شوہرِ نامراد کا انتظار کرنے کی زحمت سے بچ جاتی ہیں۔ ہنگامے کے دنوں میں مہمانوں کی آمد کم ہو جاتی ہے اور جو آ جاتے ہیں انھیں جانے کی جلدی ہوتی ہے جان سب کو عزیز ہے۔ ہنگامے کے دنوں میں شہر کا وقار دوبالا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بڑے افسران، حکام اور لیڈران کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔ امن و شانتی قائم کرنے کے نام پر۔

یونین والے اگر ہنگامہ نہ کریں تو دفتروں میں پژمردگی چھا جائے۔ کام کرنے سے دل اچٹ جائے کون ان کی تنخواہ بڑھوائے گا، کون ہڑتال کروائے گا۔ اس یونین کے ہنگامے کی بدولت ہی ملازموں کی غلطیوں پر صاحب کی ڈانٹ کا اثر نہیں پڑتا ہے۔ محنت ادھوری اور تنخواہ پوری کے رواج کو اسی یونین کے ہنگامے سے تقویت پہنچتی ہے۔ ہنگامے کی وجہ سے دکان داروں کی آمدنی اور بڑھ جاتی ہے۔

دکان دار سپلائی میں کمی کا رونا رو کر مال چھپا دیتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ منافع خوری کرتا ہے ادب میں ہنگامہ نہ ہو تو ادیبوں کے قلم کی روشنائی خود بخود خشک ہو جائے گی۔ تخلیق کی رفتار ماند پڑ جائے گی۔ پرانی پونجی لے کر نئے بازار میں کوئی کب تک ٹکے گا۔ ایک ادیب نے کچھ لکھا اس پر دوسرا ادیب لٹھ لے کر سوار ہو گیا۔ پیچھے صاحب ہنگامہ شروع ہوا۔ کچھ ادیب اس طرف کچھ اس طرف محاذ آرائی کا آغاز ہوا۔ ریفری کی ذمہ داری بیچارے ناقدوں نے سنبھال لی۔ ہنگامے کی بدولت تخلیقی ادب کا سلسلہ چل پڑا۔ مشاعرے میں ہنگامہ مچانے والا شاعر ہی ہر جگہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ ہنگامہ خیز ادب پیش کرنے والا رسالہ ہی قارئین کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے اور ہنگامہ حرکت کے نقطۂ عروج کو کہتے ہیں۔ پھر اس سے فائدہ کیوں نہ ہو۔

سیاست والے شائد اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ اسی لیے تو جگہ جگہ ہنگامہ کرکے یا کرا کے وہ اپنی گوٹی لال کرلیتے ہیں ۔کبھی مذہب کے نام پر ہنگامہ تو کبھی ذات کے نام پر ہنگامہ اور اس سے بھی آگے بڑھے تو امیر غریبی کے نام پر ہنگامہ ۔ ان ہنگاموں کا بس ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد ہے کرسی اور کرسی حاصل ہو بھی جاتی ہے ۔ سیاست کا پہلا سبق بھی یہی ہے کہ ہنگامہ کراؤ فائدہ اٹھاؤ ۔ اگر مخالف پارٹی کا جلسہ ہو رہا ہے اور وہاں آپ کی پارٹی کا تیا پانچہ ہو رہا ہے تو کھڑے کیوں ہیں فوراً وہاں ہنگامہ کرا دیجیے ۔ جلسہ دیکھتے ہی دیکھتے برخواست ہو جائے گا ۔ مذہب کے نام پر ہنگامہ کرا دیجیے فوراً قوم کے رہبر بن جائیں گے ۔ ذات کے نام پر ہنگامہ کرائیے اور آئندہ الکشن میں اپنی جیت کی ضمانت حاصل کر لیجیے ۔

اس طرح دیکھا جائے تو ہنگامہ میں ہمیشہ افادیت ہی نظر آتی ہے ۔ پتہ نہیں کیوں لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں ۔ کیا ہنگامے کے بغیر تہوار اچھے لگیں گے ، شادی اچھی لگے گی ۔ کسی کو کچھ نہ کچھ ہنگامہ نہ کروالیں کیا آپ کا نام حاتم طائی کے ساتھ لیا جا سکے گا ۔ جنازہ میں ہنگامہ نہ ہو تو مرحوم کا نام شہر کے بڑے بڑے آدمیوں میں کیسے آئے گا ۔ آپ کچھ مت کیجیے بس ہنگامہ مچائیے صرف ہنگامہ ! ہنگامہ زندگی کی علامت ہے ـــــــ ہنگامہ کامیابی کی کنجی ہے ۔ ہنگامہ انسانیت کی معراج ہے ! ہنگامہ زندہ باد ۔۔ ●●

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

کُشتی نہیں تو شادی نہیں

صاحبان و بیگم صاحبان - جب سے ہم نے یہ خبر پڑھی ہے تب ہی سے ایک نئی الجھن میں گرفتار ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی نوجوانی ہی سے یہ عارضہ لاحق ہے کہ ہم صبح صبح پہلے اخبار بینی کرتے ہیں تو پھر ناشتہ کرتے ہیں اور ناشتے ہی پر کیا منحصر ہے؟ چاہتا ہے کہ گزر جاتے ہیں مگر بس شرط یہی ہے کہ پہلے اخبار پڑھ لیں ہاں یہی تو لیں انہی - سیدھی سادی سی شرط ہے لیکن لوگ دیکھیے کہ دل والوں پر کیسی کیسی شرائط مسلط کرتے ہیں - یقین مانیے کہ بعض دفعہ تو یقین کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے تو ہم کو جب بھی کوئی محیر العقول خبر پڑھنے کو ملتی ہے تو ہم گھنٹوں گم سُم سے ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے اور جب تک کوئی چشم دید گواہ ہمیں یقین نہ دلائے ہمیں خبر پر یقین ہی نہیں آتا چنانچہ ۱۹۵۷ء میں روس نے جب اپنا پہلا اسپٹنک خلا میں داغا تو دنیا بھر کے اخباروں میں یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی لیکن کیا مجال جو ہم نے سچ مانا ہو - بالآخر جب ہمارے ایک قریبی ساتھی و جگری دوست نے گواہی دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے روسی اسپٹنک کو آسمان میں چکر لگاتے دیکھا ہے تب کہیں جا کر اس چشم دید گواہی پر ہم نے یقین کیا۔ لیکن یہ خبر جس کے مطالعے کے ہم خود چشم دید گواہ ہیں اس قدر حیرت ناک ہے کہ روسی سپٹنک کی مندرجہ بالا خبر بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی - یہ کوئی ایسی ویسی گھٹیا قسم کی خبر نہیں کہ کہیں کوئی اسکینڈل یا اسکام ہو گیا ہو بلکہ دلوں کو چھو لینے والی محبت بھری داستان ہے - خبر یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے دو لڑکوں کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی - صاحبان اگر یہی بات ہندوستانی فلموں میں بار بار نہ بتلائی گئی ہوتی تو بات یقیناً قابلِ نظر انداز ہوتی لیکن اس کے آگے جو خبر ہے وہ نہ صرف حیرت ناک ہے بلکہ ہم جیسے کمزور دل والوں کے لیے دہشت ناک بھی ہے اور وہ یہ کہ لڑکی کو بھی دونوں لڑکوں سے محبت ہو گئی - اب کچھ ہوئی نہ بات! لیکن ذرا سوچیے کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہو کہ دونوں لڑکوں سے وقت واحد

میں لڑکی کی شادی بھی ہو جائے۔ چنانچہ اسی ذہانت سے لبریز لڑکی نے بڑے سوچ وبچار کے بعد دونوں والوں کے دل رکھنے کی ٹھان لی اور یوں انوکھی شرط لگائی کہ دونوں میں کھلم کھلا کشتی کا ایک عدد مقابلہ منعقد ہو۔ اب جو دوسرے کو پچھاڑ دے وہی نوجوان اس لڑکی کا بر ٹھیرے۔ چنانچہ شرکائے محفل کے روبرو ایک بہت وجری نوجوان نے دوسرے کو پچھاڑ دیا اور لڑکی کے ماں باپ نے ریفری کے فرائض انجام دیتے ہوئے جیتنے والے کے حق میں فوراً ہی فیصلہ صادر فرمایا چنانچہ جھٹ کشتی و پٹ بیاہ کے قیمتی اصول پر عمل پیرا ہو کر دونوں فوراً رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ یہ کار خیر تو بخیر و خوبی انجام پا گیا لیکن اس شادی خانہ آبادی نے ہماری تشویش میں بے اندازہ اضافہ کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم فکر میں دن بدن کمزور و لاغر ہوتے چلے گئے دراصل ہماری سوچ ہی کچھ ایسی دور اندیشانہ ہے جو ہمارے پورے سماج کا احاطہ کرتی ہے اس لیے کہ ہمارے ملک کی رسم و رواج اس نوعیت کے قطعاً نہیں ہیں چنانچہ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ دلہن کے والدین نے باقی ساری باتوں کو نظر انداز کر کے اپنی پیاری نورچشمی دختر نیک اختر کے لیے صرف اور صرف پہلوان ہی کو منتخب کیا ہو یا کسی تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ لڑکی نے اپنے عقد سعید کے لیے کشتی جیسی کوئی تجویز پیش کی ہو۔ اب اگر ہمارے ملک کے اندر بھی والدین یا سرپرست ایسے اشتہارات شائع کروانے لگیں تو یقیناً دنگل والوں کی تو چاندی ہو جائے گی لیکن ان نوجوانوں کا کیا بنے گا جو صرف پڑھ لکھ کر ہی شادی کے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اشتہار کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"ضرورت رشتہ۔ ایک نہایت حسین وجمیل دولت مند گھرانے کی لڑکی کے لیے جس کے نام جائیداد بھی ہے۔ صرف اور صرف ایسے پہلوان سے رشتہ مطلوب ہے جو پلک جھپکتے میں ہمارے محلہ کے ایک نامور پہلوان کو چت کر سکے۔ شادی معیاری کی جائے گی۔ لڑکی کے بھائی دوبئی سے آئے ہوئے ہیں اندرون پندرہ دن کشتی جیتنے والے پہلوان کو ترجیح دی جائے گی۔ رابطہ کریں۔ فون نمبر ۵۵۵۵"

اب بتلائیے کہ اگر ہمارے ملک میں جہاں پہلے ہی مختلف انوکھی باتیں ہو رہی ہیں، یہی شادی بیاہ کا معیار بھی طے پا جائے تو ان معززین کی شریک حیات کون بنے جو دبلے پتلے سنکی اور پہلوانی کے لیے قطعاً ناموزوں ہوتے ہیں، معاملہ حالانکہ بڑا دل دہلانے والا ہے یعنی لڑکی بھی خوب صورت ہو اور سونے پر سہاگہ صاحب جائیداد بھی ہو لیکن حصول کے لیے شرط ایسی کٹھن کہ توبہ بھلی! بھلا پندرہ دن کی مدت میں کوئی پہلوانی سیکھے تو کیونکر سیکھے آخر اکھاڑے والوں کے بھی تو کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اگر پندرہ پندرہ دن کی قلیل مدت میں ہر کس و ناکس کو پہلوان بنا کر چھوڑ دیں تو بھلا ان کا گزارہ کیسے ہو اور غیر تیار شدہ پہلوان بھلا مقابلہ جیتے تو کیوں کر جیتے ویسے بھی ہمارے ہاں جو بلند پایہ لوگ ہوتے ہیں ان کی خواہشات بھی ذرا زندہ ہوتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لڑکا ڈاکٹر یا انجینئر ہو اور وہ کسی طرح اس بلند سطح سے نیچے اترنے تیار ہی نہیں ہوتے۔ بھلے اس تمنا میں بے چاری لڑکی عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں سوچ سوچ کر ہم دن رات گھلے چلے جا رہے ہیں اور بس یہی فکر لاحق ہے کہ کیونکر ایسا کوئی حل ڈھونڈ نکالیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی دلہن والے اور خیر سے نوشاہ والے بھی کچھ ایسی پیاری پیاری باتیں کرنے لگیں کہ سماج میں بیٹھی ساری کنواری لڑکیاں سہاگنیں بن جائیں باقی رہا پہلوان صاحب کا معاملہ ہماری تمنا ہے کہ [illegible]

مختار احمد منو
(گلبرگہ)

شناختی کارڈ

"شناختی کارڈ" کی اجرائی کو ضروری قرار دینے پر ہم سابق الیکشن کمشنر ٹی این سیشن کو یاد رکھیں گے ویسے بھی سیشن کو ان کے اپنے عجیب و غریب احکامات، حرکات و بیانات پر بھی یاد رکھا جاسکتا ہے۔ فی الحال ہم ان کے شناختی کارڈ کو ضروری قرار دینے پر ہی اکتفا کریں گے۔ سیاسی لیڈر سیشن کے اس غیر متوقع اور سخت گیر موقف پر کہ شناختی کارڈ کے بغیر انتخابات نہیں ہوں گے۔ حیران و پریشان ہیں اس لیے کہ انتخابات میں لیڈروں کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر بوگس ووٹنگ پر ہی ہوتا ہے۔ بوگس ووٹنگ ہمہ اقسام سے کی اور کروائی جاتی ہے۔ ہم نے ایک ایسے لیڈر کو بھی دیکھا ہے جو زندوں کے تو کجا مرحومین کے ووٹ بھی اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ ورکرس گروپ میٹنگوں میں خاص طور پر یہ ہدایت کرتے ہیں کہ ایک ووٹ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ خاص طور پر ان کے ووٹ سے بھرپور استفادہ کریں۔ یہاں "ان کے ووٹ" سے مراد "گھاتی ووٹ" یعنی "مرحومین کا ووٹ" ہے۔۔

یوں تو ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ دفاتر میں فائیلوں میں ہیرا پھیری کی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ شناختی کارڈ میں درج ناموں، عمر، مکان نمبر، پتے، تصاویر اور جنس میں بھی ہیرا پھیری کی جائے گی۔ اس ہیرا پھیری کی وجہ ہم نے کارپوریشن کے ایک ملازم سے دریافت کی تو ملازم نے کہا "بھکٹ کی حمالی میں اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ "بلدیہ ہے اسی کا جس نے کچھ دیا"

تصاویر اس حد تک بھیانک، ڈروانی، خوفناک، کینسر زدہ، دق زدہ، چیچک زدہ ہیں کہ لوگ خود اپنی تصویر کو پہچاننے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ حیرت اور پریشانی کے عالم میں خود کو آئینے کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آئینہ سے تسلی نہ ہوئی تو گھر والوں سے تصدیق کروا رہے ہیں کہ آیا یہ تصویر انہیں کی ہے۔ اگر یہ تو یہ کیمرے کا نقص ہے یا واقعی ان کی شکل ہی اتنی بدصورت ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ شناختی کارڈ کی وجہ سے لوگوں میں یا تو شناختی کارڈ پانے کی خوشی ہے یا پھر شناختی کارڈ کی تصویر کی بگڑی شکل کی وجہ سے غصہ۔ ایک صاحب نے اپنی تصویر کو دیکھا تو ہکا بکا رہ گئے۔ جب یہ تصویر کھنچوانے گئے تھے۔ تب خود کو آئینہ

کے سامنے کئی بار پیش کیا تھا۔ آئینہ سے تسلی نہ ہوئی تو خود کو اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھا۔ شادی کے بعد عورت کا شوہر بھلے ہی لنگور جیسا ہو لیکن اس کی بیوی کی نظروں میں انگور نظر آتا ہے۔ بیوی نے مجبوراً اور اخلاقاً کہا کہ آپ تو بالکل شاہ رخ خاں نظر آرہے ہیں۔ شوہر نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا کہ ڈارلنگ تم بھی تو جوہی چاولہ معلوم ہوتی ہو۔ ہر بیوی اپنے شوہر سے دو چیزوں کی آرزو رکھتی ہے ایک، تو یہ کہ اٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے اس کے حسن کی تعریف کیا کرے۔ دوسرے زیور پہناتا رہے۔ بیوی نے اپنے شوہر سے اپنے حسن کی غیر معمولی تعریف سنی تو مارے خوشی کے شیشن کو دعائیں دینے لگی۔ صدقے جاؤں شیشن کے جس نے تمھیں یہ احساس دلایا کہ میں بھی خوب صورت ہوں لیکن آج وہی بیوی اپنے شوہر کی تصویر دیکھ کر بے ساختہ بولی، یہ تو کسی تارا خاں ڈاکو کی تصویر لگتی ہے!

ہمارے ایک دوست صبح سویرے ہمارے گھر کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ ہم نے دروازہ کھولا پہلے دوست کو دیکھا پھر سورج کو دیکھا۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں میں ہمارے دروازے پر پہلے کون نمودار ہوا۔ دوست نے خود کہا "میں سورج کے طلوع سے قبل تمھارے دروازے پر حاضر ہوا ہوں" اور اپنا شناختی کارڈ ہمیں تھما دیا۔ ہم نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا تو دوست نے کہا۔ پہلے میری تصویر دیکھ لو پھر جی بھر کے خوش یا رونا تمھارے اختیار میں ہے۔ تصویر پر جب ہماری نظر گئی تو ہم چونک پڑے۔ خود کو انسانی ڈھانچے کی زد میں پایا۔ ہم میں نہ تو ہنسنے کی سکت تھی نہ تو رونے کی۔ بس ایک چیخ مارنے کو تھے کہ دوست نے کہا "میں تمھیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تم چیخ مار کر میرے بدصورت ہونے کی تصدیق کر دو۔ ہم نے لرزتے ہاتھ سے دوست کے چہرے کو اچھی طرح ٹٹولا، اچھا بھلا گوشت پوست والا چہرہ تھا۔ ہم نے کہا کارپوریشن والوں نے بڑا ہی بھیانک مذاق کیا ہے۔ یہ تمھاری تصویر ہے کہ کھوپڑی کی شان دار ایکسرے کاپی ہے۔ کرناٹک الکٹریسٹی بورڈ والوں کی نگاہ میں یہ تصویر آجائے تو فوراً رجسٹرڈ کروا کر جگہ جگہ خطرے کے نشان کے طور پر استعمال کریں گے۔

ہمارے مالکِ مکان مرزا قدرت اللہ بیگ بڑے ہی خوش نظر آرہے تھے۔ ہم نے کہا۔ خیریت مرزا صاحب بہت خوش ہیں۔ کہیں اس سال حکومت نے یوم جمہوریہ کے موقع پر آپ کو کرائے داروں کے ساتھ بہترین حسنِ سلوک پر بیسٹ مالک مکان کا ایوارڈ دینے کا اعلان تو نہیں کر دیا۔ مرزا صاحب نے جواباً اپنا شناختی کارڈ ہمیں تھما دیا۔ کارپوریشن والوں کا واقعی یہ شان دار کارنامہ تھا۔ کارپوریشن والوں نے جم کر مرزا صاحب کی جھریوں دار کانٹے بھری کالی کلوٹی شکل و صورت پر بھرپور توجہ کے ساتھ صفائی کی تھی۔ کاش کہ یہ توجہ کارپوریشن نے شہر کی کینسر زدہ سڑکوں، زخمی نالیوں، گندی گلیوں کی صفائی پر دی ہوتی۔ ہم نے مرزا صاحب سے کہا "آپ کی تصویر دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ آپ اپنی عمر سے پچیس برس پیچھے لوٹ گئے ہیں۔ مرزا صاحب مسکراتے ہوئے فلمی نغمہ گنگنانے لگے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ نغمے کا دوسرا مصرع گنگنانے والے تھے کہ ان کی اہلیہ محترمہ یوں وارد ہوئیں جیسے ٹی وی پر چترہار کے دوران اکثر یہ تحریر آجاتی ہے کہ ہمیں رکاوٹ کے لیے کھید ہے۔ ہم نے مرزا صاحب کی اہلیہ سے کہا۔ اپنے شوہر کی اتنی خوب صورت تصویر پر خوشی کے بجائے افسردگی کے بادل کیوں؟ بڑی بی نے غصہ بھرے لہجے میں کہا، اوبے او منوا ہمرے سنگ بہت ناانصافی ہوئی ہے۔ ایلوے والوں کی طرح ایکسپریس ٹرین کو روک کر پاسنجر ٹرین کو آگے کر دیا۔ ہمرے میاں تو پچیس سال پیچھے کر دیا اور ہم کا پچیس سال آگے کر دیا۔ بہت ناانصافی ہوئی۔ پتہ نہیں مرحوم امجد علی خاں کی روح کو کتنی تکلیف ہوئی ہو

بنے ادا کیے ہوئے مکالمے کی مٹی پلید زنانہ گھبری سنگھی کی آواز میں سن کر ہم میاں بیوی کے اس فلم زدہ اثرات میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کے اول و آخر اکلوتے فرزند اچانک یوں آدھمکے جیسے مائیکل جیکسن اندھیرے سے اجالے میں اسٹیج پر آجاتا ہے۔ ہم سے کہا انکل میری تصویر کے ساتھ یہ کیسا مسخرا پن ہے۔ میری تصویر اس زخمی بچے کی طرح نظر آرہی ہے جس پر ون ڈے میچ کھیلا گیا ہو۔ میرے کان کے قریب وکٹ بھی نظر آرہی ہے۔ ہم نے کہا میاں کارپوریشن کا کیمرہ بہت ہی پورفل تھا۔ تمہارے دل و دماغ کی اندرونی کیفیت کو تمہارے چہرے پر نمایاں کر دیا گیا ہے۔ تمہارے کان کے قریب وکٹ نہیں ہے بلکہ پولس کا ڈنڈا ہے۔ شاید تمھیں کیمرے کے سامنے سے ہٹ جانے کا اشارہ کر رہا ہے۔

ہم نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک ہی وقت میں دو شادیوں میں کس طرح دلہنوں کی تبدیلی ہوگئی تھی لیکن دولہوں کو اپنی دلہن تبدیل ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ جو بھی ملا مقدر کی بات تھی۔ لیکن یہاں تو دان دھوانڑھے مالک مکان کی بیوی کی تصویر اور نام کرایہ دار کے نام میں اور کرایہ دار کی بیوی کی تصویر اور نام کو مالک مکان کے نام میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

سائیکالوجی کے پروفیسر ہمارے پاس آئے اور ہم سے کہا "للہ میرا اتنا کام کر دیجیے نا بھائی جان۔ اور بڑے شرمیلے انداز میں اپنا شناختی کارڈ ہمیں دیا۔ ہم نے حیران کن لہجے میں کہا۔ آپ کے ساتھ بھی غالباً کوئی سنگین غلطی ہوگئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا صرف میری جنس تبدیل ہوگئی ہے۔ میل کی جگہ فی میل لکھ دیا ہے۔"

دو لڑکیاں آپس میں بحث کر رہی تھیں۔ پہلی نے کہا۔ ہمیں بھی شناختی کارڈ ملا۔ بڑے کمال کا ہے میری عمر ممی کے نام اور ممی کی عمر میرے نام لکھی ہے۔ دوسری نے کہا۔ لگتا ہے کہ تم دونوں ماں بیٹی نے بھگوان سے گڑگڑا کر دعا کی ہے۔ اے بھگوان میری عمر بھی میری ممی کو لگ جائے۔ اے بھگوان میری عمر بھی میری بیٹی کے نام کر دے۔ بھگوان نے تم دونوں ماں بیٹی کے اس جذبہ ایثار اور پیار سے متاثر ہو کر تمھاری دعا قبول کر لی۔ پہلی نے کہا تمھیں دل لگی سوجھی ہے میں ادھر پریشان ہوں کہ میری عمر کا پتہ جب میرے بوائے فرینڈ کو ہو جائے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ دوسری نے کہا۔ یہ بھی تو سوچو کہ جب تمہارے پپا کو تمھاری ممی کی عمر معلوم ہو تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔

ہمارے محلے کی مشہور شخصیت ہیں جن کی شناخت ان کے والدین کے رکھے نام سے نہیں بلکہ ان کی اپنی فطرت سے ہوتی ہے۔ ان کا دلچسپ مشغلہ لوگوں کو مفت مشورہ دینا ہے۔ لوگ ان کو مشورہ خاں کہتے ہیں۔ ان ہی کے مشورہ پر ہم نے اپنی آزادی کو شادی کر کے بیوی کی غلامی میں بدل دیا تھا۔ ہم نے اللہ سے دعا کی تھی کہ ایک دن ایسا آئے کہ مشورہ خاں ہم سے مشورہ لینے آئیں۔ آخر کار وہ دن کارپوریشن والوں کی مہربانی سے آگیا۔ مشورہ خاں آئے اور ہم سے کہا۔ برخوردار جس ڈیڑھ فٹ زمین کے لیے ہم اپنے پڑوسی سے پچھلے پچیس سال سے مقدمہ بازی کر رہے ہیں۔ وہ فیصلہ آج تک بھی عدالت سے نہیں ہوا لیکن کارپوریشن نے ایک ہی جھٹکے میں ہمارا مکان نمبر پڑوسی کے نام لکھ دیا۔ حد تو یہ ہے کہ میاں پڑوسی کی ولدیت میں ہمارے ابا حضور کا نام بھی لکھ دیا۔ مجھے تم سے مشورہ کرنا ہے کہ آخر یہ کس کی شرارت ہوسکتی ہے۔

ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ ہم نے کہا یہ شرارت تو کارپوریشن کی ہو نہیں سکتی کیوں کہ کارپوریشن والے کبھی بھی کوئی کام ایک ہی نشست میں نہیں کرتے۔ وہ ہر کام اقساط میں کرتے ہیں۔ آپ کے پڑوسی کی شرارت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی بھی شریف آدمی اپنے والد کے نام کے بجائے دوسرے کا نام نہیں لکھ سکتا۔

ہمارے محلے کے کارپوریٹر صاحب کے ساتھ بھی بڑی ستم ظریفی ہوئی۔ ان کا نام ہمت یار خاں کے بجائے تہمت یار نکال اور ان کی اہلیہ کا نام جمیلہ بانو کے بجائے حاملہ بانو لکھ دیا گیا۔ کارپوریٹر صاحب نے برہمی کی حالت میں کارپوریشن فون کیا۔ ہمارے ناموں کے شناختی کارڈ میں کیا دھاندلی کی گئی ہے۔ جب ہم لوگوں کے ساتھ ایسا ہے تو عام جنتا کا کیا حال ہوگا۔ منیجر نے کہا۔ سرکامیاب لیڈر وہی ہے جو الیکشن کے وقت جنتا کا خیال رکھے۔ اب تو آپ کارپوریٹر ہیں۔ صرف اپنی فکر کیجیے۔ کارپوریٹر صاحب نے کہا، میرے خسر کا نام مرزا شوکت علی اختر جنگ بہادر یار جنگ اول کے بجائے صرف مختصر جنگ لکھا ہے۔ منیجر نے کہا۔ جناب شارٹ ہینڈ کے زمانے میں اتنی لمبی سطر کے ناموں کا رواج نہیں رہا تو ہم نے سمجھا کہ غلطی سے نام کے ساتھ پتہ بھی شامل ہو گیا۔ اس لیے شاید مختصر جنگ لکھ دیا گیا ہے اور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ناموں کی غلطی صرف آپ کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہاں تو ایم ایل اے صاحب کا نام کانتا ریڈی کے بجائے کانٹا رہٹی لکھ دیا گیا ہے۔ آپ تو محض ایک کارپوریٹر ہیں۔ کارپوریٹر صاحب نے کہا، پھر تو ایم ایل اے صاحب تم پر برسے ہوں گے۔ منیجر نے کہا۔ ہاں ہم پر برسنے اور گرجنے کے ارادے سے ہی آئے تھے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ سر میرا نام بھی لال چند کے بجائے لال چنڈ لکھا گیا ہے۔ میری بیوی کا نام شوبھا پوری چند کے بجائے چوبہ لوری چنڈ لکھا ہے۔ ایم ایل اے صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ صحیح ناموں کی تلاش جاری رکھیں۔ کارپوریٹر صاحب نے کہا، پھر ہمارے ناموں کا کیا ہوگا۔ منیجر نے کہا۔ معاف کرنا فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا۔ سارا اسٹاف ہڑتال پر ہے۔ آپ کے ناموں کی صفائی آج نہیں ہو سکتی۔

ہمارے چپراسی نے ہم سے کہا۔ صاحب جی ناموں کی درستگی کا فارم بھر دینا۔ کارپوریشن والوں نے ہم دونوں میاں بیوی کے ناموں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ بڑا ہی بھونڈا مذاق کیا ہے۔ میرا نام امیر علی کے بجائے دولت علی لکھا ہے۔ بیوی کا نام درخشاں بیگم کے بجائے چمک دار بیگم لکھ دیا ہے۔ ہم نے کہا۔ یہ بھونڈا مذاق نہیں ہے اس کو نفسِ مذاق کہتے ہیں۔ دراصل تمہارے ناموں کا ترجمہ کر کے لکھا گیا ہے۔

ہم کارپوریشن آفس پروفیسر صاحب کی جنس تبدیل کروانے گئے تھے۔ وہاں ایک آدمی آیا اور کلرک سے کہا یہ میری تصویر ہے یا پھر بلدیہ میں لگے شہر کی گلیوں، سڑکوں کا نقشہ۔ تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں کہ میں کون ہوں۔ میں وزیر شہری و بلدی ترقی کا ڈرائیور ہوں۔ کلرک جواباً مسکرایا اور اپنا شناختی کارڈ اس کو دکھلاتے ہوئے اس نے کہا۔ پہچانیے تو یہ تصویر کس کی ہے۔ ڈرائیور نے کہا، یہ تو کسی طوفان سے متاثر آدمی واسی کی لگتی ہے۔ کلرک نے کہا، جناب یہ تصویر میری ہے۔ شاید تم بھی مجھے نہیں جانتے میں تمہارے وزیر کا اکلوتا سالا ہوں۔

کارپوریشن سے سیدھے گھر پہنچے تو بیوی کو شناختی کارڈ کا منتظر پایا۔ ہم نے سمجھا کہ ہمارے شناختی کارڈ میں بھی کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ ہم نے کہا بیوی سے خیریت تو ہے، اس طرح خاموش کیوں ہو۔ بیوی نے کہا۔

شناختی کارڈ تقسیم کرنے والا آیا تھا۔ اس کو ہمارے کتے نے کاٹ لیا۔ میں نے اس آدمی کو کتے سے بچانے کے لیے بیلن دے مارا۔ بے چارہ لہولہان ہو گیا۔ تب سے پریشان ہوں۔ ہم نے کہا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ایک ماہ قبل کارپوریشن والے کتوں کو ہلاک کیا تھا۔ کتوں کے ہلاک اسکواڈ میں یہ آدمی بھی رہا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ہمارے کتے کی گرل فرینڈ بھی اس آدمی کے ہاتھوں ہلاک ہوئی ہو گی۔ کتے کا انتقام لینا درست ہے رہی بیلن دے مارنے کی بات۔ میڈم بیلن نشانہ بازی کے لیے عورتوں کے اپنے شوہر ہی موزوں ہوتے ہیں۔ خیر مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ کا نشانہ اتنا پکا ہو گیا۔" بیوی نے کہا "اس آدمی نے پولیس تھانے میں رپورٹ لکھوائی ہے کہ کارپوریشن کے کام میں مداخلت کے علاوہ مجھ پر جان لیوا حملہ بذریعہ کتا اور بیلن کیا گیا ہے۔ پولیس آئی تھی اور بیلن لے کر گئی۔ آپ کے لیے دو بارہ آچکی ہے۔" ہم نے بیوی سے کہا "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں جب تک رشوت اور ضمانت ہے، کچھ نہیں ہو گا۔ ویسے بھی ہمارے ملک کا قانون ایک عظیم دانشور کے اس قول پر پابندی سے عمل کرتا ہے کہ مجرم کے بجائے جرم کو ختم کیا جائے۔"

شام کو ہمارے خسر آئے تو ہم نے ان سے پوچھا "کارپوریشن والوں نے شناختی کارڈ میں اتنا [illegible] ناموں، پتوں اور عمروں، مکان نمبروں میں غلطیاں کیوں کی ہیں۔ اعداد پر اس قدر بھیانک، ڈھٹائی کیوں آئی ہیں۔ ان کا کچھ اندازہ ہے؟" خسر صاحب نے کہا "برخوردار بات دراصل یہ ہے کہ بلدیہ کھایا پیا نہیں دیا۔ بلدیہ والوں کے لیے مفت کام کرنے کا پہلا تجربہ ہے۔ آہستہ آہستہ مفت کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔" ہم نے کہا "اس تبدیلی کے لیے کتنا وقت لگے گا۔" خسر صاحب نے کہا "برخوردار اس تبدیلی کے لیے تم کو کم سے کم دس سال یا پھر ایک نئی این سیشن کا انتظار کرنا ہو گا۔"

●

رزاق اثر شاہ آبادی

بغلیں تو ذرا جھانک

دنیا کے ہر حصے میں جہاں جہاں بھی انسانی آبادی ہے لوگ دن ہو کہ رات بغلیں بھی بجاتے ہیں اور بگل بھی۔ البتہ ان دونوں میں ایک فرق یہ ہے کہ بگل بجنے کی آواز کے ساتھ بگل بجانے والا بھی آپ کو نظر آسکتا ہے (اگر آپ اسے دیکھنا پسند کرتے ہوں) لیکن جہاں تک بغل بجانے کا سوال ہے ... معاملہ الٹا ہے۔ آپ کو بغل بجانے والا تو ضرور نظر آئے گا لیکن آپ بغل بجنے کی آواز کو سو بار مر کر بھی نہیں سن سکتے کیوں کہ یہ صرف محسوس کرنے کی چیز ہے۔ جس طرح ہوا کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اسی طرح بغل کی آواز کو بھی صرف اور صرف محسوس کیا جا سکتا ہے سنا نہیں جا سکتا۔

آپ نے یقیناً "بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا" کا یہ محاورہ ضرور سنا ہوگا۔ (بلکہ کسی وقت آپ بھی اس محاورے کی زد میں آچکے ہوں گے) یہ محاورہ عقلی اور بے عقلی دونوں اعتبار سے عوام اور خواص دونوں کی زبانوں پر اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ جب ... کبھی کہیں ایسا موقع ملتا ہے کوئی بھی شخص اس محاورے کو دہرانے سے نہیں چوکتا بادشاہِ وقت ہو کہ فقیر بے کشکول سب کو اس پُل صراط سے گزرنے کا کبھی نہ کبھی موقع مل ہی جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا بہت سے غائب دماغ تعلیم یافتہ حضرات آنکھوں پر عینک لگا کر اپنی عینک ڈھونڈتے رہتے ہیں یا کچھ لوگ ہاتھ میں چھتری رکھ کر برسات میں بھیگتے ہوئے یہ سوچتے چلتے ہیں کہ وہ آج ہی کیوں چھتری لانا بھول گئے۔

ہمارے ایک پہلوان نما دوست ہیں ان کی یہ عادت ہے کہ بعد نماز جمعہ لوگوں سے بعد مصافحہ بغل گیر بھی ہوتے ہیں۔ جہاں تک مصافحہ کی بات ہے ہمیں کیا کسی بھی اللہ کے بندے کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن جب سوال بغل گیر ہونے کا آتا ہے اکثر اس میں اختلاف رائے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ہمارے پہلوان نما دوست جب "یاہو" کا نعرہ لگا کر کسی سے بغل گیر ہوتے ہیں تو سامنے والے کی دونوں پسلیاں بھی پیٹ کے اندر بغل گیر ہو جاتی ہیں کیونکہ ہمارے یہ دوست سامنے والے کو بغل کا دشمن سمجھ کر ہی بغل گیر ہوتے ہیں۔ اس لیے بہت سے نمازی حضرات مصافحہ کیے بغیر ہی ان کی بغل سے نکل جانے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں لیکن ان کے چاہنے والے

دوستوں کا خیال ہے کہ موصوف بغل میں چھری نہیں رکھتے اس سبب ان کے اس انداز بغل گیری سے اپنی کمر کے منکے ڈھیلے پڑجانے کے خطرے کے باوجود وہ اُن سے بغل گیر ہوتے ہیں کہ ان کی نیت بغل گیری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

فلموں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح فلم کا ہیرو (دُبلا پتلا ہو کر بھی) اپنی محبوبۂ دلنواز کو بچانے کے خاطر اکیلا دس دس غنڈوں کی فوج کو دھول چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے سین تو آج کل ہر فلم میں ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سین دیکھ دیکھ کر ہمارے بہت سے نوجوان کراٹے اور جوڈو سیکھے بغیر کسی بھی لڑائی جھگڑے میں بے خطر کود پڑتے ہیں اور فلمی اسٹائل میں لڑنے کی کوشش میں اپنی ہڈیاں، پسلیاں اور ٹانگیں تڑوا لیتے ہیں اگر وہ فلمی اسٹائل کے بجائے اپنے فطری اسٹائل یعنی بغلی گھونسوں سے اپنے دشمن کی خاطر تواضع کرتے تو اس طرح شرمندگی کے ساتھ لنگڑا کر چلنے کی نوبت نہ آتی۔

ہمارے بہت سے بغلی دشمن ہمیشہ سے اسی تاک میں ہیں کہ کہیں انھیں موقع ملے اور وہ ہمیں اپنے بغلی گھونسہ سے چاروں خانے چت کر دیں لیکن چونکہ ہم بھی ان کی ان چالوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے انھیں کوئی ایسا موقع ہی نہیں دیتے۔ اس لیے ہمارے بغلی دشمن ہمیں بغلی گھونسہ سے دوچار کرنے کی کوشش ناکام کے بعد اکثر ہم کو بغلیں بجاتے دیکھ کر راہ فرار اختیار کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ بھانت بھانت کی زبانیں بولتے ہیں حیرت انگیز طور پر اختلافات شدید کے باوجود یہ "قدر مشترک" ان میں پائی گئی ہے کہ ان کے بغلیں بجانے کا انداز ایک جیسا ہی ہے۔ بہت سے دانشور اہم ملک اور شکست خوردہ سیاست دانوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی بات اس ملک کے عوام کو اتحاد کی لڑی میں پرو سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف بغلیں بجانے کا مشترکہ انداز ہے۔

اگرچہ کہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر چلنے والے خود غرض سیاست داں ہماری اس قدر مشترک کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش ضرور کریں گے لیکن کروڑوں بغلیں اگر ایک ساتھ بغل در بغل بجنے لگیں گی تو مٹھی بھر اتحاد دشمن افراد ان بغلوں کی آوازوں میں ہمیشہ کے لیے دب کر ختم ہو جائیں گے۔

اداریہ

روزنامہ "سیاست" کے جوائنٹ ایڈیٹر بزرگ اور سینئر صحافی جناب محبوب حسین جگر کا ۱۱ر مارچ ۹۷ء کو مختصر سی علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ انھیں چند دن قبل ہی پیس میکر لگایا گیا تھا۔ انتقال سے ایک دن قبل تک بھی وہ چاق و چوبند تھے۔ اور دواخانہ میں شریک ہونے کے باوجود 'سیاست' کے روزمرہ کے معاملات میں حسب معمول دلچسپی لیتے رہے ۔۔۔ میں ۹ر مارچ کی شام مزاج پرسی کے لیے ڈاکٹر وہاب قیصر کے ہمراہ ان کے ہاں پہنچا تو بڑی دیر تک ادبی رسائل کی صورتحال پر گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو طویل ہوتی گئی تو جگر صاحب کے بھائی اور نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اشارہ سے ہم کو کمرہ سے باہر بلالیا اور کہا کہ ڈاکٹروں نے جگر صاحب کو زیادہ بات چیت سے منع کیا ہے۔ پھر ہم جگر صاحب کو خدا حافظ کہہ کر لوٹ آئے۔ کسے پتہ تھا کہ ایسی مشفق و مہربان شخصیت سے ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔

محترم محبوب حسین جگر سے میں پہلی بار ۱۹۵۶ء میں ملا تھا جب کہ میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور میرے ایک رشتہ دار فلم ایکزیبیٹر نے اردو اخبارات کے لیے اشتہار تیار کرنے اور شائع کروانے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ سیاست کے چھوٹے سے آفس میں جگر صاحب نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ خیر مقدم کرتے اور اپنے مشفقانہ برتاؤ کے ذریعہ یہ احساس دلایا کرتے کہ میں یہ کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہوں ۔۔۔ جگر صاحب کا یہ انداز میری پچھلی ۴۰ سالہ زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے میری مصروفیات میں تبدیلی آتی رہی اور جگر صاحب نے میرے ہر کام کو سراہا اور ہر کام پہ سرپرستی سے نوازا ۔۔ اور یہی اُن کی شخصیت کا وصف تھا۔ زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے فعال افراد اور خاص طور پر نوجوانوں سے وہ شخصی ربط قائم رکھتے تھے۔ 'سیاست' کے دفتر میں بیٹھ کر ادبی، سیاسی، ثقافتی، مذہبی، علمی، فلمی اور اس نوعیت کی تمام سرگرمیوں اور تحریکات کے اُتار چڑھاؤ سے وہ نہ صرف واقف رہتے بلکہ اپنے مشوروں اور ضرورت پڑنے پر عملی تعاون کے ذریعہ تحریک کا حصہ بن جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار 'سیاست' کی جڑیں حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں پیوست ہو گئیں۔

جگر صاحب نے حیدرآبادی تہذیب کے فروغ، ترقی پسند ادبی اور سیکولر اقدار کے تحفظ، خواتین کی ذہنی تربیت، اردو زبان کی ترویج اور مرحوم جامعہ عثمانیہ کی علمی ترقی، ہندو مسلم اتحاد اور غیر مسلم حضرات کی اردو سے دلچسپی جیسے موضوعات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اخبار سیاست کا ہر کالم جگر صاحب کی فکر، نقطۂ نظر اور کاوش کا مظہر ہے۔

زندہ دلان حیدرآباد کی تشکیل و ارتقا کی تمام منزلوں میں جگر صاحب کی شخصی دلچسپی اور مشوروں کو دخل رہا ہے۔ شگوفہ کے معیار، صحافتی وقار اور پابندیٔ اشاعت پر وہ حد درجہ مسرور رہا کرتے۔ تحریری طور پر بھی بارہا وہ اپنی پسند کا اظہار کر چکے تھے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن عصری تقاضوں سے ہم آہنگ محبت، خلوص اور عمل پیہم کا جو درس انھوں نے دیا ہے وہ ہمیشہ ہمارے لئے مشعل راہ رہے گا۔ ہم ان کے انتقال پر اُن کے بھائی مجتبیٰ حسین، جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" اور سیاست خاندان کے تمام ارکان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ جگر صاحب مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ (آمین)

ہندوستانی بزم اُردو کی جانب ۲۹ر مارچ کو ریاض میں 'شام شگوفہ' کے زیر عنوان ایک شاندار اور بڑے پیمانہ پر مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ مشاعرہ کی تفصیلات آئندہ شمارے میں شائع کی جائیں گی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

جلد ۳۰ شمارہ : ۵ مئی ۱۹۹۷

قیمت فی پرچہ = ۱۰ روپے
زرِ سالانہ = ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے = ۳۰ ڈالر

سرورق . تصاویر شام شگوفہ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
۲۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

فون (آفس) 595716
فون (رہائش) 4576064

اشاعت محمود سلیم محمد طالب محمد عبدالرؤف
طباعت دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

گوشۂ شامِ شگوفہ

منظومات :

سرورق کی تصاویر :
شام "شگوفہ" کے شرکاء ۔۔۔
(اوپر دائیں سے بائیں) اقبال شانہ، ڈاکٹر عابد مُعز، ڈاکٹر پرویز احمد، محترمہ عذرا نقوی (درمیان) سہیل تشنہ، انور اسحاقی، عبدالرحمٰن سلیم، حسن عسکری، محمود شاہد (نیچے) محمود حیدر آبادی، منصب علی، حقیق الزماں حقیق اور غوث خواہ مخواہ۔

مالِ مفت (انشائیے)

قاضی جی دبلے

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

भारतीय राजदूतावास
السفارة الهندية بالرياض
EMBASSY OF INDIA
Post Box No 94387
RIYADH 11693 (SAUDI ARABIA)
Tel 488 4144 488-4691 488-4692 488-4697
Fax 488 4750 Telex 408040 INDEMB SJ

جناب ڈاکٹر عابد معز صاحب!
ایڈیٹر اور سیز ماہنامہ "شگوفہ" حیدر آباد

السلام علیکم!

یہ بات باعث مسرت ہے کہ ہندوستانی بزم اردو ریاض کے زیر اہتمام ۲۰ مارچ ۱۹۹۷ء انڈین ایمبسی ریاض کے آڈیٹوریم میں "شام شگوفہ" کے عنوان سے ایک محفل سجائی جارہی ہے۔ میری جانب سے پر خلوص تمنائیں اس محفل کی کامیابی کے لئے قبول فرمائیں۔

محترم !! آج کے اس پر آشوب دور میں روتی بسورتی دنیا کو شگفتہ تخلیقات کے ذریعہ گذشتہ ۲۹ سال سے طنزومزاح کے شگوفے ادب کے شائقین تک ہر ماہ پابندی سے پہنچانا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ یقیناً حیدر آباد سے شائع ہونے والے "ماہنامہ شگوفہ" نے طنز و مزاح کے ادب کو نا قابل تسخیر بلندی تک پہونچایا ہے۔

"اللہ کرے زور اشاعت اور زیادہ"

جسطرح عابد معز اور شگوفہ لازم و ملزوم ہیں اسی طرح مصطفی کمال کا یہ کمال ہے کہ گذشتہ ربع صدی سے شگوفہ کے خوش رنگ پھولوں کو سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ میری جانب سے آپ کے تمام ساتھیوں کو بھی مبارکباد دیجئے جو "شگوفہ" کی آبیاری میں آپکا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔

میری نیک تمنائیں ہمیشہ "شگوفہ" کے ساتھ ہیں۔

مخلص

ڈاکٹر اوصاف سعید
فرسٹ سکریٹری و ہیڈ آف چانسری

۹ مارچ ۱۹۹۷ء



مہمان شاعر جناب ... خواہ مخواہ کلام سناتے ہوئے جنہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا



... پرنسپل انٹرنیشنل انڈین اسکول، جناب افضل جلال سنانی چیرمین انٹرنیشنل انڈین اسکول، جناب ندیم ترین وغیرہ
... میں



ناظم مشاعرہ نواب سکندر علی خاں مائیک پر ۔



سنیر ہند جناب محمد حامد انصاری نامور مزاحیہ شاعر اقبال شانہ کے مجموعہ کلام "شانہ بہ شانہ" کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے ۔



ِ.رت حا.ہ ہند کے ہیڈ آف چانسلری ڈاکٹر اوصاف سعید سامعین میں سے پانچ ناموں کی قرعہ اندازی کرتے ہوئے جنہیں چھ ماہ کے
ے ..وفہ مفت جاری کیا گیا۔



سامعین کا ایک گوشہ



سفیر ہند جناب محمد حامد انصاری، ڈاکٹر اوصاف سعید، بیگم و جناب اختر عالم مینجر سعودی امریکن بینک و دیگر سامعین لطف اندوز
ہوتے ہوئے



بے ساختہ قہقہہ۔ ڈاکٹر ماجد قاضی، ڈاکٹر رفعت حسین انصاری اور دیگر سامعین



بزم شگوفہ کے موقع پر لی گئی گروپ فوٹو (دائیں سے بائیں) آرکیٹکٹ رحمٰن سلیم، ڈاکٹر رفعت حسین انصاری، ڈاکٹر عابد معز، محمد
محمد غوث معین الدین۔ محمود حمید رامادی، اقبال خان، ڈاکٹر ماجد قاضی، غوث جواد شجواد، انور اسحاق، نواب شمشیر علی خاں
شریف احمد اور سعید شوکت

(فوٹوز۔ بہ شکریہ کے این واصف)



بزم شگوفہ کے سام شگوفہ۔ جن کا بے لوث تعاون تمام شگوفہ کی کامیابی کا ضامن بنا (دائیں سے بائیں) محمد عبدالرحیم اکرم، محمد تاج الدین
محمد اسلم اور محمد نعیم الدین۔

خطبہ استقبالیہ

عابد معز (ریاض)

راوی واقعہ یوں بیان کرتا ہے کہ ایک محفل میں سمع خراشی کی انتہا ہوگئی ۔ سامعین گندے انڈے ، ٹماٹر اور گلی سڑی ترکاریاں لئے منتظمین کو ڈھونڈنے لگے اور منتظمین روپوش ہوگئے ۔ جسے جہاں اماں ملی وہ وہاں چھپ گیا ۔ چند اصحاب اسٹیج کے نیچے لیٹ گئے تو کچھ نے پردوں میں اپنے آپ کو لپیٹ لیا ۔ تھکے ہارے اور بے بس سامعین نڈھال ہوکر برا بھلا کہتے واپس ہوگئے ۔ منتظمین کی جان میں جان آئی ۔ واپس ہال کی صفائی کے لئے جمع ہوئے تو دیکھا ایک سامع اکیلا بیٹھا زار و قطار رو رہا ہے ۔ حیران اور پریشان منتظمین اس کے اطراف اکٹھا ہوئے اس کے آنسو پونچھے اور رونے کی وجہ پوچھی ۔ سامع نے جواب دیا " خدارا ۔ مجھے بتاؤ ۔ یہ محفل کیوں منعقد کی گئی تھی ؟ " ۔

صاحبو ! میں اپنے رفقا کی جانب سے یہ بتانے حاضر ہوا ہوں کہ ہم نے یہ محفل کیوں سجائی ہے اور صدر محفل کی اجازت لے کر آپ سے کچھ میٹھی اور کچھ کڑوی باتیں کروں ۔ سب سے پہلے ہم آپ ، خواتین و حضرات کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں ۔ خیر مقدم کرتے ہیں اور آپ سب کو خوش آمدید کہتے ہیں ۔

ادبی محفلیں آپس میں مل بیٹھنے کا بہانہ ہیں ۔ روٹی روزگار کی مصروفیت نے ہماری ملاقاتوں کو اس قسم کی محفلوں تک محدود کردیا ہے چار ماہ قبل اسی ہال میں شب غزل کے دوران میں نے دونوں ہاتھ اٹھاکر داد کو دراز کرتے ہوئے اپنے ایک دیرینہ ساتھی کو سلام کیا تھا ۔ موصوف نے جواب میں تحسین کی آمیزش کی " سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔ وعلیکم السلام ۔ واہ ۔ واہ ۔ کیا شعر ہے ۔ بہت دنوں بعد دکھائی دیئے ۔ " میں نے مکرر مکرر خیریت پوچھی تو انہوں نے " بہت خوب ، بہت خوب ، کیا کہنے " کی ہانک لگائی ۔ وقفہ ہوا تو گلے مل کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کچھ صورت بہر ملاقات تو ہے ۔ اور عہد کیا کہ ہم داد کے شور شرابے سے ہٹ کر بھی ملا کریں گے محمود شاہد سے ملنے کے لئے ہم الاحساء کے مشاعرے میں گئے تھے ۔ جواباً عرض کرنے اور ہم سے ملنے کے لئے وہ اس محفل میں تشریف لائے ہیں ۔

بین الاقوامی شہرت کے حامل نامور شاعر جناب غوث خواہ مخواہ کی شرکت سے اس محفل کو کامیابی کی ضمانت حاصل ہوئی ہے خواہ مخواہ صاحب کا ایک مجموعہ کلام شائع ہوچکا ہے اور دوسرا عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہوگا ۔ ہماری دعوت پر تبوک سے جناب اقبال شانہ تشریف لائے ہیں ۔ موصوف کا پہلا مجموعہ کلام " شانہ بہ شانہ " حال میں شائع ہوا ہے ۔ اس محفل میں " شانہ بہ شانہ " کی رونمائی ہوگی ۔ جدہ میں مقیم ، فی البدیہہ مصرعے موزوں کرنے میں کمال رکھنے والے شاعر جناب ناظر قدوائی والد کو ہم نے دعوت

تھی موصوف کا " اقامہ " تجدید کے لئے گیا ہوا ہے ۔ اقامہ ساتھ نہ ہو کے سبب انہوں نے شرکت سے مجبوراً معذرت کرلی
محفل کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے ۔ شہر حیدرآباد کی نمائندگی کر نے والے مزاحیہ شعراء جناب محمود حیدرآبادی اور جناب
حاتی دمام سے تشریف لائے ہیں ۔ الاحساء کے جدید لب و لہجہ کے شاعر و افسانہ نگار جناب محمود شاہد نے ہماری فرمائش پر مزاحیہ
ہے ۔ جناب محمود شاہد کے افسانوں کا مجموعہ " ڈھانچہ " شائع ہو کر شرف قبولیت حاصل کر چکا ہے ۔ جدہ میں مقیم خوش گلو
جناب سعید احمد منتظر کو بھی ہم نے مدعو کیا تھا لیکن انہیں " پروانۂ سفر " نہ مل سکا اور وہ اس محفل میں شریک نہیں ہیں ۔
جناب جاوید میسوری کے خلوص سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ پچھلے مشاعرے میں ہم نے ان کی غزلیں سنیں اور پسند کی
اس مرتبہ وہ دمام سے سنانے کی بجائے صرف سننے کے لئے تشریف لائے ہیں ۔ ہم مہمان شعراء کا پرتپاک استقبال کرتے ہیں ۔
حضرات کے تشکر گزار ہیں کہ سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے شریک محفل ہیں ۔

محترمہ قدرالنقوی شہر ریاض کی نامور شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں ۔ ہماری خواہش پر انہوں نے مزاحیہ کلام کہا ہے ۔ ہماری
ہے کہ وہ گاہے ماہے مزاح کی طرف توجہ دیتی رہیں ۔ ادبی اور سماجی محفلوں کے انعقاد میں پیش پیش رہنے والے ہمارے
جناب عبدالرحمن سلیم کا نیا روپ اس محفل میں سامنے آئے گا ۔ وہ مزاحیہ شاعری بھی خوب کرتے ہیں ۔ اس محفل میں
شعراحباب سید حسن عسکری ، جناب سہیل تشنہ ، جناب حقیق الزماں حقیق ، جناب منصب علی اور جناب عبدالحمید النعیمی اپنا
کلام پیش کریں گے ۔ ہم میزبان شعراء کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔

آج کی محفل کے صدر ڈاکٹر پرویز احمد ہیں جو کمپیوٹر سائنس اور ادب میں یکساں مہارت رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر پرویز کی شاعری
شخصیت کی طرح منفرد اور ممتاز ہے ۔ ہم صاحب صدر کو خوش آمدید کہتے ہیں ۔ ہماری کامیاب محفلوں کی ایک وجہ نواب سکندر
اپنی دلچسپ نظامت کے ذریعہ محفل کو گرمائے رکھتے ہیں ہم ناظم کا خیر مقدم کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں ۔

ادبی محفلوں میں ہمیں مقتدرین اور اکابرین کو دیکھنے ، ان سے ملنے اور ان کو سننے کا موقع ملتا ہے ۔ عام حالات میں ان تک
رسائی ممکن نہیں ہوتی ۔ اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھنے اور ان کے تعلق سے پڑھنے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے ۔ نامور
شخصیتوں کو سننے کے علاوہ ان تک اپنی بات پہنچانے کا موقع بھی ہاتھ آتا ہے میرے ایک شاعر دوست نے مشاعرہ کے مہمان
خصوصی سے تعلق سے انکشاف کیا تھا ۔ منسٹر صاحب کو شاعری کچھ میں آتی ہے ۔ گڈ اور ویری گڈ کہہ کر داد دی ۔ داد کے بدلے میں
جب حال ۔ تو موصوف جواباً سلام کرنے لگے ۔ ہر شعر کے بعد بلکہ بعض مرتبہ مصرعوں کے درمیان بھی ہم ایک دوسرے کو دیر تک
سلام کرتے رہے ۔ ادبی محفلوں میں مجموعہ کو دیکھ کر مقتدرین بہت خوش ہوتے ہیں ۔ اور اپنی حد سے زیادہ خوشی کا اظہار
بے ساختہ کرتے فرماتے ہیں ۔

ہماری اس محفل میں سفیر ہند جناب محمد حامد انصاری کی شرکت باعث صد افتخار ہے ۔ ہم عزت ماب کا دل کی گہرائیوں سے
خیر مقدم کرتے ہیں ۔ ہندوستانی سفارت خانے کے ہیڈ آف چانسلری ڈاکٹر اوصاف سعید ہر دم ہماری رہنمائی کے لئے تیار رہتے
اس محفل میں ہم ڈاکٹر اوصاف سعید کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں ۔ جناب پی ہریش ، پریس اینڈ انفارمیشن سکریٹری کے تعاون
کے بغیر اس محفل کا انعقاد ممکن نہ تھا ۔ ہم موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اس قسم کی محافل بپا کرنے
سے ہمیں اجازت ملتی رہے گی ۔

جناب محمد باقر ادب دوست اور سماجی کارکن ہیں ۔ انہیں ہم سے خاص تعلق خاطر ہے وہ شگوفہ اوورسیز کمیٹی کے رکن بھی ہیں ۔
جدہ سے تشریف لائے ہیں ۔ بڑی فعال شخصیت ہیں ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ منطقۂ غربیہ میں وہ اس قسم کی محفلیں منعقد کریں
گے ۔ ہمارے ایک اور کرم فرما جناب سعید شوکت اس تقریب میں شرکت کے لیے جدہ سے آئے ہیں ۔ چند سال قبل وہ ریاض ہی میں
تھے ۔ شگوفہ اوورسیز کمیٹی کے رکن رہ چکے ہیں ۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔

اس محفل میں ادب سے بہت گہرا تعلق رکھنے والی ایک شخصیت موجود ہے جو اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے سبب ادب
سے کنارہ اختیار کئے ہوئے ہے ۔ ڈاکٹر افسر خاں پرنسپال انٹرنیشنل انڈین اسکول ، ریاض ، ادبی محافل کے انعقاد میں بھرپور تعاون

کرتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر افسر خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ اپنے شوق کو جلا بخشیں۔

ہم اپنے عزیز دوست، ممتاز فوٹو گرافر اور صحافی جناب کے این واصف کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ان کی بدولت ہماری اس محفل کے چرچے دور دور تک ہوں گے۔ جناب سید مسعود مینجر العطاوی گروپ باذوق اور باکمال شخصیت کے مالک ہیں۔ شوقیہ ویڈیو گرافی کرتے ہیں۔ عکس کشی کے ذریعہ وہ اس محفل کی یادوں کو محفوظ کرلیں گے۔

شہر ریاض میں اخبار "عرب نیوز" کے چیف آف بیورو جناب جاوید حسن کا تعاون ہمارے لئے ایک نعمت ہے۔ ملاقات ہونے پر وہ استفسار کرتے ہیں "آئندہ پروگرام کی نیوز کب دیں گے؟" جناب غوث ارسلان بہت اچھے کاتب، صحافی اور سب رس کے نمائندے ہیں۔ اخبار سعودی گزٹ کے نمائندے جناب شاہد علی خاں ہمارے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ان صحافیوں کے خلوص کا فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیں دو تین مہینوں میں کوئی نہ کوئی محفل سجانی پڑتی ہے۔

ادبی محفلوں کے انعقاد میں ہمیں شہر ریاض کی ممتاز شخصیتوں کی سرپرستی اور تعاون حاصل ہے۔ جناب افضل سنائی چیرمین انڈین انٹرنیشنل اسکول مینجمنٹ کمیٹی اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ہمارے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ماجد قاضی معالج فرمانروا مملکت سعودی عرب کی اس محفل میں موجودگی ہمت افزائی کا باعث ہے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رفعت حسین انصاری اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت اور ذمہ داریوں کے باوجود ہماری محفلوں میں پابندی سے شریک رہتے ہیں۔ یہ ان کی ادب دوستی کا بین ثبوت ہے۔ جناب اختر عالم ایک کامیاب بینکر ہیں۔ موصوف سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں ادبی انجمنوں کی مالی حالت بہتر بنانے کے گر سکھائیں۔ انجینیر عبدالحمید، اکاؤنٹنٹ میر انور الدین اور پرچیز مینجر انتصار علوی ہر دم ہماری مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہم ان حضرات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

پس پردہ کام کرنے والوں کی اہمیت کا اندازہ وہی لگاسکتے ہیں جو ان حضرات کے سہارے محفلیں سجاتے ہیں۔ جناب محمد اکرم سیلز ایجنٹ ڈی ایچ ایل، مختصر نوٹس پر محفل بپا کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جناب غوث معین الدین مارکیٹنگ مینجر، البینا میگزین کا تعاون بے مثال رہتا ہے۔ جناب تاج الدین، جناب محمد نعیم الدین اور جناب محمد مکرم اسٹیج کے انتظامات سنبھال لیتے ہیں

خواتین و حضرات۔ ادبی محافل سخن وری کا سب سے موثر اور تیر بہدف میڈیا ہے۔ اردو زبان میں مشاعروں اور ادبی اجلاسوں کا جو مقام ہے وہ شاید ہی کسی اور زبان میں ہوگا۔ اخبارات اور رسائل کی تعداد گھٹتی جارہی ہے لیکن مشاعروں کی تعداد میں ریکارڈ توڑ اضافہ ہورہا ہے۔ مشاعرے شعراء برادری کو اسٹیج فراہم کرتے ہیں۔ کئی شعراء ہاتھوں میں بیاض اٹھائے مشاعروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ مشاعروں کی بو سونگھتے۔ بعض شعراء سمندر پار سفر بھی کرتے ہیں۔ میں نے چند مشاعرے دیکھے ہیں جہاں صرف شعراء ہی موجود تھے۔ ایسے مشاعرے بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ باادب شرکاء خالص داد دیتے ہیں لیکن محفلوں کی حقیقی کامیابی باذوق سامعین کی موجودگی سے ہوتی ہے۔ صاحبان ذوق کی تسکین کے لئے بھی ادبی محفلوں کا انعقاد ضروری ہے۔ باذوق سامعین مشاعرے کی تہذیب اور داد کے سلیقے سے واقف ہوتے ہیں۔ اب اس کو کیا کہئے کہ باذوق سامعین ادبی محفلوں سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی جگہ "مشاعرے باز" سامعین لے رہے ہیں۔ خوب ادھم مچاتے اور ہوٹنگ کرتے ہیں۔ ایک مشاعرے میں ہوٹنگ اس وقت بند ہوئی جب مشاعرہ ناظم اور صدر کے بجائے سامعین کی مرضی سے چلنے لگا۔ سامعین شعرا کے نام پکارتے اور شعراء سامعین سے اجازت لے کر کلام سنانے لگے۔ اردو زبان پر آج وہ وقت آن پڑا ہے کہ ہوٹنگ کے لئے مشاعرے منعقد کئے جارہے ہیں اور "بسٹ ہوٹر" اور "بہتر ہوٹر" جیسے ایوارڈ سے سامعین نوازے جارہے ہیں۔

ادبی محفلیں دراصل سخن وری کا سامان فراہم کرکے سامعین کی سخن شناسی کا امتحان لیتی ہیں۔ داد دینے کا انداز اور طریقہ پیمانے بنتے ہیں۔ زبانی داد پر اکتفا کرتے ہیں یا تالیاں اور کرسیاں پیٹی جاتی ہیں۔ مترنم شعراء کے حق میں زیادہ داد و تحسین جاتی ہے یا تحت میں پڑھنے والے شاعر مشاعرہ لوٹتے ہیں۔ سطحی اشعار بار بار پڑھوائے جاتے ہیں یا خیالات کی گہرائی اور گیرائی والے اشعار پر مکرر مکرر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ایسی تمام باتیں سخن شناسی کا بھرم کھولتی ہیں۔ احتیاط سے اور سوچ سمجھ کر داد دیجئے لیکن ایسا نہ

...ی باریکیوں میں الجھ کر داد دینے کے حق سے محروم رہ جائیں ۔ آپ کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ شاعر کی ہمت افزائی نہیں ہوتی ، وہ ... جاتا ہے ۔ بعض مرتبہ صورت حال مختلف ہوتی ہے ۔ میرے ایک شاعر دوست کو داد مشاعرے کے دو ، تین دن بعد سے ملنے ... موصوف کے اشعار سمجھنے کے لیے وقت لگتا ہے اور محنت درکار ہوتی ہے

میں اپنے ایک کانونٹ تعلیم یافتہ دوست کو زبردستی مشاعروں میں گھسیٹ لے جایا کرتا ہوں ۔ انہیں کئی اشعار یاد ہوئے ... نقل اشعار بھی سنانے لگے ہیں لیکن اب بھی وہ اردو پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے ۔ بڑے توجہ سے صاحب سمجھ ہیں ۔ نئے بھی ... سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ مشاعرے میں شرکت کے بعد ایک چھوٹی بچی نے فون پر سہیلی سے اپنی تجربہ بیان کیا ... کے ساتھ مشاعرہ گئی تھی ۔ وہاں میں نے شاعر دیکھا وہ گا رہا تھا ۔ گانا اچھا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں لوگ ہاتھ اٹھا کر شاعر ... رہے تھے ۔ کچھ دیر فائٹ ہوتی رہی آخر شاعر ہار کر بیٹھ گیا ۔ بعض لوگوں میں مشاعرے کچھ زیادہ ہی رنگ دکھا دیتے ہیں ... مشاعرہ سننے کے بعد سخنوری پر اتر آتے ہیں اور ایک درجن مشاعروں کے بعد باضابطہ شاعر بن جاتے ہیں

ادبی محفلیں باعث احتساب بھی ہیں ۔ تفریح طبع کے دوران چند لمحوں کے لیے ہم اردو کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کے ... میں غور کریں ۔ سوچیں کہ مادری زبان سے ہم کس درجہ وفادار ہیں ۔ خود احتسابی کے لئے اپنے آپ سے چند سوالات کئے ... جاتے ہیں ۔

سوال نمبر ۱　کیا ہم اپنی مادری زبان اردو پڑھنا اور لکھنا جانتے ہیں ؟

اس سوال کا جواب کہیں ایسا نہ ملے ۔ نہیں جانتے ۔ اردو کیوں پڑھیں اور لکھیں نوکریں ملنے سے رہی ۔ اردو کا چلن ... اور پھر اردو کا رسم الخط مشکل ہے ۔ اردو سیدھے جانب سے لکھی جاتی ہے ۔ سالم حرف کے بجائے صرف سر کردن اتاری ... زیر زبر سمجھ میں نہیں آتے ۔ اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط تبدیل ہونا چاہیئے

سوال نمبر ۲　روزمرہ کی بول چال میں ہم کتنے فیصد اردو الفاظ استعمال کرتے ہیں ؟

بہت آسان سوال ہے ۔ جب ہماری صبحیں گڈ مارننگ سے شروع ہوتی ہیں ، ابو ، امی ، چچا ، ماموں ، خالہ جیسے قریبی رشتہ دار ... انکل اور آنٹی بن جائیں اور خواب گاہ بیڈ روم ہو جائے تو پھر ہارڈ اور ٹیکنیکل ورڈز تو انگلش ہی کے ہوں گے ۔

سوال نمبر ۳　گھر میں مادری زبان اردو کی کتنی کتابیں ہیں ؟

یہ سوال ذرا مشکل ہے ۔ ذہن پر بار دے کر سوچنا پڑتا ہے ۔ ابا حضور اور دادا جان کی چند پرانی اور دیمک زدہ کتابیں ... صندوں میں پڑی تھیں ۔ اب ہیں یا انہیں پھینک دیا گیا ہے ، اماں بی سے پوچھنا پڑے گا ۔

سوال نمبر ۴　کیا ہم اپنی مادری زبان کا کوئی اخبار اور کوئی رسالہ پابندی سے پڑھتے ہیں ؟

وئی نہیں ۔ اول تو اردو پڑھنا نہیں آتا اور پھر اردو زبان میں معیاری اخبار اور رسالے بھی نہیں ہیں ۔

سوال نمبر ۵　کیا ہم مہینے میں کوئی خط اردو میں تحریر کرتے ہیں ۔ ؟

دقیانوسی سوال ہے ۔ چٹھی لکھنا ماضی کا شغل ہے ۔ ہم ماڈرن ہیں فون کی موجودگی میں خط لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ... ہوتی

سوال نمبر ۶　ہم آمدنی کا کتنا حصہ اپنی مادری زبان کی ترقی و ترویج پر خرچ کرتے ہیں ؟

آسمان سے باتیں کرتی مہنگائی کے دور میں فضول کاموں کے لئے رقم مختص کرنا بے وقوفی ہے

سوال نمبر ۷　کیا ہم اپنے بچوں کو مادری زبان اردو پڑھاتے ہیں ؟

عجیب مضحکہ خیز سوال ہے ۔ جب ہمیں ہی اردو نہیں آتی تو بچوں کو کون پڑھائے گا ۔ ہم نے اردو زبان کو مادری زبان کا ... رکھا ہے ، یہی کافی ہے ۔ اردو کے تعلق سے مزید سوالات کر کے شرمندہ اور پریشان نہ کیجئے ورنہ ہم مادری زبان انگلش ... اور آپ ہمارا کچھ نہ کر لیں گے ۔

ہم آپ کے شکر گزار ہیں ۔ ہم ایک مرتبہ پھر آپ خواتین و حضرات کو خوش آمدید کہتے ہیں ۔ اھلاً و سھلاً اور مرحبا بکم

شام شگوفہ

ہندوستانی بزم اردو ریاض کے زیر اہتمام ایک یادگار محفل

امریکہ اور خلیجی ممالک میں آئے دن کسی نہ کسی عنوان سے چھوٹی بڑی ادبی محفلوں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے ۔ پچھلے دو صحرائے عرب میں کچھ شگوفے کھلے جس کی مہک یوں تو دور دور تک پہنچی لیکن ریاض کے شائقین شعر و ادب کے ذہن و دل آج تک مسرور ہیں ۔ خلیج میں اس قسم کی محفلیں آراستہ کرنے والی چند انجمنیں ہیں جن میں ہندوستانی بزم اردو ان دنوں کافی فعال ہے بزم ریاض میں صرف مل بیٹھنے یا تسکین ذوق کے ساماں نہیں کرتی بلکہ زبان کی ٹھوس خدمات بھی انجام دے رہی ہے ۔ ادبی محفلیں اور معیاری مشاعرے منعقد کرنے کے علاوہ نئی نسل میں اردو زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے کے لئے بھی کوشاں ہے ۔ چنا انڈین اسکول ریاض میں بزم کی جانب تحریری و تقریری مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں ۔ ریاض میں اردو دانی کے امتحانات منعقد کروانے کا بھی انتظام ہورہا ہے ۔ اس بزم نے پچھلے دنوں انڈین ایمبیسی آڈیٹوریم میں 'شام شگوفہ " کے عنوان سے ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد کیا ۔

آج کے دور میں خوش مزاجی ، بذلہ سنجی اور مزاح کو لوازمہ حیات سمجھا جاتا ہے ۔ وقت کی رفتار سے ہم قدم رہنے ، مسابقت کی دوڑ میں اوروں کے شانہ بہ شانہ چلنے کے لئے آج کا انسان جس جاں فشانی سے کام لیتا اور جو ذہنی بوجھ برداشت کرتا ہے اس کو زائل کرنے کا یہ سب سے اچھا ذریعہ ہے ۔ حیدرآباد میں مزاح نگاری کو ایک تحریک کے طور پر آگے بڑھایا گیا ۔ حیدرآباد کے حوالے سے طنزومزاح کی بات زندہ دلان حیدرآباد اور اس کے ترجمان ماہ نامہ شگوفہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب اور دیگر سرگرمیاں اسی تحریک کو توانائی بخشتی ہیں ۔ شگوفہ طنزومزاح کی تحریک کا سرخیل ہے جو پچھلے 29 سال سے سنجیدگی کے ساتھ اور پابندی سے شائع ہورہا ہے ۔ جو ایک معجزے سے کم نہیں ۔ ابتذال اور پھکڑپن سے پاک ادب کے اعلیٰ معیار کو ملحوظ رکھنے کا کام شگوفہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے ۔

ادب و زندگی میں مزاح کی اہمیت کے پیش نظر ہندوستانی بزم اردو نے محفل "شام شگوفہ " کا اہتمام کیا ، جس میں نہ صرف ایک کامیاب ترین مشاعرہ شامل تھا بلکہ مزاح کے نام پر بپا کی گئی ریاض کی سب سے کامیاب محفل سمجھی گئی ۔ طنزومزاح کی اس محفل میں ابتدا سے آخر تک قہقہوں کی بجلیاں کوندتی رہیں ۔ مزاح کا سماں مسلسل بندھا رہا ۔ اسی مشاعرے میں مملکت کے مختلف شہروں میں رہنے والے شعراء نے حصہ لیا ۔ عزت ماب جناب محمد حامد انصاری سفیر ہند برائے سعودی عرب نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت فرمائی ۔ ڈاکٹر پرویز احمد نے صدارت کی ۔ سفارت خانہ ہند کے ہیڈآف چانسلری ڈاکٹر اوصاف سعید نے خوش نصیب سامعین کے ناموں کی قرعہ اندازی کی جس کے ذریعہ پانچ سامعین کو چھ ماہ کے لئے مفت شگوفہ جاری کیا جائے گا ۔ ہندوستان سے آئے ہوئے عالمی شہرت یافتہ مہمان شاعر جناب غوث خواہ مخواہ کے علاوہ اقبال شانہ (تبوک) محمود شاہد (الاحساء) انور اسحاقی ، محمود حیدرآبادی (دمام) اور مقامی شعراء میں محترمہ عذرا نقوی ، رحمن سلیم ، حسن عسکری ، حقیق الزماں حقیق سہیل تشنہ ، عبدالحمید الغیبی اور منصب علی نے حصہ لیا ۔ اس مشاعرے کی ایک خاص بات یہ رہی کہ اس میں چند سنجیدہ شعراء نے بھی بطور خاص شام شگوفہ کے لئے مزاحیہ کلام موزوں کیا اور اس کاوش کے لئے بھرپور داد بھی پائی ۔

اس محفل شعر میں ریاض کے سینکڑوں باذوق سامعین نے عطیات کے عوض دعوت نامہ حاصل کرکے شرکت کی ۔ بر صفحہ

سے باہر اردو بولنے، سمجھنے اور پڑھنے والوں کی سب سے بڑی تعداد خلیجی ممالک میں بستی ہے۔ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے کم نہیں۔ عربی کے بعد اردو ہی یہاں کی سب سے بڑی اور مقبول زبان ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت جدہ سے "اردو نیوز" کا اجرا اور اس کی مقبولیت ہے۔

ابتداء میں ہندوستانی بزم اردو کے معتمد آرکیٹکٹ رحمن سلیم نے مشاعرے کی کارروائی کی ابتداء کرتے ہوئے شعرا کو شہ نشین پر مدعو کیا۔ اور ہندوستانی بزم اردو کی سرگرمیوں سے سامعین کو واقف کروایا۔ اس کے بعد ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز نے جو برصغیر کے اردو جرائد اور رسالوں کے ذریعہ طنز کے انجکشن اور مزاح کی گولیاں تجویز کرتے ہیں، مہمانوں کا استقبال کیا۔ طنز و مزاح سے بھرپور لپنے پر اثر خطبہ استقبالیہ میں انہوں نے اردو زبان کی بقاء و ترقی کی طرف بھی حاضرین محفل کی توجہ مبذول کروائی۔ ڈاکٹر پرویز احمد نے لپنے صدارتی کلمات میں اردو ادب میں طنز و مزاح کے حصہ اور اہمیت کا جائزہ لیا۔ مزاح کی پھلجھڑیاں بکھیرتی اس محفل کی نظامت ہندوستانی بزم اردو کے صدر نواب سکندر علی خاں نے کی۔ جن کے برجستہ اشعار اور فقروں نے محفل کو مسلسل پر مزاح بنائے رکھا۔ یکے بعد دیگرے شعراء مائیک پر آتے رہے اور ہنسی اور قہقہوں کے سلسلہ کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے ملاتے رہے۔ مہمان شاعر جناب خواہ مخواہ تالیوں کی گونج میں مائیک پر آئے قہقہوں کے طوفاں میں کلام سنایا اور آڈیٹوریم کے مقررہ وقت تک، آخری لمحہ تک سامعین کو مسرور کرتے رہے۔

قارئین شگوفہ کی دلچسپی کے لئے جو نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں ہر ماہ اپنی کاپی کے منتظر رہتے ہیں، ریاض میں منعقدہ اس یادگار محفل میں پڑھے گئے اکثر شعراء کا کلام اور دیگر تقاریر بمعہ تصاویر شائع کی جارہی ہیں۔

طنز و مزاح کی اس یادگار محفل میں باذوق سامعین جو کثیر تعداد تھی ان میں حسب ذیل قابل ذکر معززین شامل تھے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی، جناب افضل جلال سنائی، چیرمین انٹرنیشنل انڈین اسکول ریاض، مسٹر اتل راز داں، کونسل پاسپورٹ سرویسس انڈین ایمبیسی۔ ڈاکٹر افسر خان، پرنسپل انڈین اسکول، مسٹر آختہ عالم مینجر سعودی امریکن بینک، ڈاکٹر رفعت حسین انصاری، جناب اقبال فرید میسوری، جناب محمد باقر، جناب سعید شوکت، جناب سید مسعود مینجر العطاوی کمپنی۔ آخر میں آرکیٹکٹ رحمن سلیم کے شکریہ پر یہ قہقہہ زار محفل اختتام کو پہنچی۔ مسٹر سلیم نے الکبیر کمپنی کے تعاون اور مشاعرے کے کامیاب انعقاد میں معاونت کے لئے سید انتصار علوی، محمد غوث معین الدین، عبدالرحیم اکرم، محمد تاج الدین، محمد نعیم الدین اور محمد مکرم کا بہ طور خاص شکریہ ادا کیا۔

قرعہ اندازی کے ذریعہ منتخب اصحاب

جنھیں چھ ماہ کے لئے شگوفہ جاری کیا جائے گا

۱۔ فصیح الدین احمد

۲۔ خواجہ ناصر حسین

۳۔ خالد منور

۴۔ ڈاکٹر آفتاب احمد شیخ

۵۔ طاہر حسین

شانہ بہ شانہ کی رسم اجرا

کے این ڈی واصف

اردو میں کسی دور میں بھی ادیب و شعراء کی کمی نہیں رہی ۔ لیکن مزاحیہ شاعر و ادیب ہر دور میں انگلیوں پر گنے گئے ۔ بہت کم مزاحیہ شعراء نے فن، ادب، زبان اور شاعری کے اعلیٰ معیار کو ملحوظ رکھا اور سنجیدگی سے مزاحیہ شاعری کے سرمایہ میں اضافہ کیا اقبال شانہ کا نام ایسے ہی معتبر شعرا میں لیا جا سکتا ہے جو بڑی سنجیدگی سے مزاح میں طبع آزمائی کرتے ہیں ۔ ہندوستان میں مزاح کے حوالے سے دکن کی سرزمین ہمیشہ بڑی زرخیز رہی ۔ نظم ہو یا نثر ہر دور میں اہل دکن ہی مزاح کے سرخیل رہے ۔ اسی مٹی سے اٹھے اقبال شانہ بھی ہیں جنہوں نے مزاحیہ شاعری میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے ۔ مزاحیہ شاعری میں اقبال شانہ کی انفرادی انداز کے بارے میں نامور مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز نے لکھا ۔

"اقبال شانہ نے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے ۔ انہوں نے اکثر ان نئے موضوعات کو ردیف کے طور پر اپنا کر غزل کا جزو بنا دیا ہے ۔ مثلاً کمپیوٹر، انگوٹھا، دستخط، ہچکیاں، ایکس رے، ڈینوسار، بم، پسلیاں، جراثیم، انجکشن وغیرہ ۔ روایتی مضامین سے ہٹ کر نئے مشکل اور غیر مانوس موضوعات کو مزاحیہ انداز میں باندھنے کے لئے وسیع مشاہدے بالغ النظری اور شدت احساس درکار ہے ۔"

اقبال شانہ کے اشعار پھیپھڑوں کو پھیلا نہیں سکتے یا بے ساختہ قہقہے نہیں دے سکتے لیکن ان کے اشعار کا چلبلا پن اور ظرافت قاری کو مسلسل گدگداتا ضرور رہے ۔ مدیر شگوفہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اقبال شانہ کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا

"اقبال شانہ نے انسانی فطرت کی متضاد کیفیتوں، فروگذاشتوں اور سماج کے مضحک واقعات کو کسی قدر نئے لہجے میں خوش دلی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کیا ہے ۔ وسیع مشاہدہ، ذہانت اور شوخئ طبع حس کے بغیر مزاح نگار دو قدم نہیں چل سکتا، اقبال شانہ کے شعری مزاج کے اہم عناصر ہیں ۔ اور یہی خوبیاں اقبال شانہ کے کلام کو مقبول بناتی ہیں ۔"

سعودی عرب کے شہر تبوک میں بر سر خدمت اقبال شانہ ایک عرصہ سے نثر و نظم میں طبع آزمائی کر رہے ہیں ۔ لیکن اپنا مجموعہ کلام حال میں شائع کروایا ۔ اپنے مجموعہ کلام "شانہ بہ شانہ" کی اشاعت کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ان کے کرم فرماؤں اور احباب نے پہلے انہیں مشورے دیئے پھر لالچ دلائی، ورغلایا اور پھر آخر کار دھمکیاں دیں ۔ اقبال شانہ باتوں سے ماننے والوں میں سے تھے ۔ اور آخری حربہ ہی کارآمد ثابت ہوا ۔ آج وہ صاحب کتاب ہیں ۔

پچھلے دنوں شام شگوفہ کے موقع پر انڈین امبیسی آڈیٹوریم میں سفیر ہند جناب محمد حامد انصاری کے ہاتھوں ان کی کتاب کا رسم اجرا عمل میں آیا ۔ خوبصورت ٹائٹل اور اعلیٰ قسم کی طباعت کے ساتھ اقبال شانہ کا یہ مجموعہ کلام "شانہ بہ شانہ" 112 صفحات پر مشتمل ایک دلچسپ مجموعہ کلام ہے ۔

K N WASIF
P O Box 522
Riyadh - 11421
K S A

قطعات

غوث خواہ مخواہ
(ممبئی)

یہ نہ سمجھیں شاعری کا اک نیا انداز ہوں
اس لیے کہ دیکھنے میں بھی پرانا ساز ہوں
ہاں مگر، جو چھپ نہیں سکتا میں ایسا راز ہوں
غور سے سنیے مجھے میں آپ کی آواز ہوں

○

ملوں گا خواب میں اس سے یہی طے کر کے سوتا ہوں
ملن کا وقت جو ملتا ہے وہ اس طرح کھوتا ہوں
مری معشوق امریکن ہے، اردو سے ہے ناواقف
وہ جب انگلش میں ہنستی ہے تو میں اردو میں روتا ہوں

○

گر نہ ہوں پھول تو ڈالی بھی بھلی لگتی ہے
شکل اچھی ہو تو کالی بھی بھلی لگتی ہے
پیار کے بول بھلے لگتے ہیں ہر بھاشا میں
گر ہو اردو میں تو گالی بھی بھلی لگتی ہے

○

مشکل میں اک نجات دہندہ ضرور ہو
سر جس پہ رکھ کے روئیں وہ کندھا ضرور ہو
معشوق ہو حسیں، یہ ضروری نہیں، مگر
عاشق کو چاہیئے کہ وہ اندھا ضرور ہو

صدائیں مری گھنٹیاں بن گئی ہیں
گریبان کی دھجیاں بن گئی ہیں
مسلسل جو تم آنے جانے لگی ہو
خیالوں میں پگڈنڈیاں بن گئی ہیں

○

کون سا غم ہے جو یہ حال بنا رکھا ہے
نہ تو میک اپ ہے نہ بالوں کو سجا رکھا ہے
خواہ مخواہ چھیڑتی رہتی ہیں یہ رخساروں کو
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

○

دِل اپنا کیسے پھنستا بھلا زلفِ یار میں
موسم خزاں کا سر پہ تھا فصلِ بہار میں
زلفِ دراز مانگ کے لائے تھے چار بال
دو آرزو میں جھڑ گئے دو انتظار میں

○

ٹھکانہ ہی نہیں، نام و نشاں تبدیل کر ڈالو
زمیں کی بات کیا ہے آسماں تبدیل کر ڈالو
کسی کو گھر بلا کر خواہ مخواہ حیران کرنا ہو
پتہ اپنا وہی رکھو مکاں تبدیل کر ڈالو

خواہ مخواہ

قرضہ اک اور پچھلے بقائے پہ کون لے
اک چلچلاتی دھوپ کو سائے پہ کون لے
شادی کروں میں آپ سے شعلہ بدن کے ساتھ
جلتا ہوا مکان، کرائے پہ کون لے

یہ چاہوں گا مجھ سے کوئی اچھا کام ہو جائے
بھلے سے خواہ مخواہ بدنام میرا نام ہو جائے
مزاح کی شمع ہر دم اس لیے میں ساتھ رکھتا ہوں
خدا جانے کہاں سنجیدگی کی شام ہو جائے

سب زخم خود بھریں گے بھرے گا کوئی نہیں
مرنے سے پہلے قدر کرے گا کوئی نہیں
تلوار گر ہوا میں چلاؤ گے خواہ مخواہ
بازو تھکیں گے اور مرے گا کوئی نہیں

پریشانی میں یا فکر کی بیشی میں مت رہنا
پشیمانی ہو تم کو ایسی خوش فہمی میں مت رہنا
صبح کی دھوپ میں سایہ اگر لمبا نظر آئے
تم اپنے قد کے بارے میں غلط فہمی میں مت رہنا

مجھے اشکوں سے اپنے زخم دل دھونا نہیں آتا
ملے لمحے جو خوشیوں کے انھیں کھونا نہیں آتا
میں اپنے غم بھلانے خواہ مخواہ ہنستا ہنساتا ہوں
مگر سب یہ سمجھتے ہیں مجھے رونا نہیں آتا

دل کے زخموں کو یوں چھپاتا ہوں
رنج و غم میں بھی مسکراتا ہوں
لوگ تو خواہ مخواہ ہنستے ہیں
میں تو بس آئینہ دکھاتا ہوں

کڑوا ہے سچ تو ماننے تیار ہی نہیں
بس ہوش اس قدر ہے کہ ہشیار ہی نہیں
لڑنا تو درکنار کہ یارو ہمارے پاس
ہتھیار خاک ڈالیے، ہتھیار ہی نہیں

کنوارا اپنی آزادی کا بٹوارا نہیں کرتا
کسی کے ساتھ بیٹھا مکھیاں مارا نہیں کرتا
لگا کر داؤ پر خود کو وہ جیتے گا ہر اک بازی
اکیلا کھیلنے والا کبھی ہارا نہیں کرتا

اقبال شانہ

دُعا

زندگی بے مثال دے مولا — مجھ کو رزقِ حلال دے مولا
ایک ملین ریال دے مولا — مال مجھ پر اُچھال دے مولا
سونے چاندی کی چار چھ اینٹیں — میری جھولی میں ڈال دے مولا
دے مقدر مجھے سکندر کا — راک فیلر کا مال دے مولا
بخش دے مجھ کو کان سونے کی — سب کو لکڑی کی ٹال دے مولا
عمر میری دراز تر کردے — چار سو بیس سال دے مولا
کب تلک کھیلتے رہیں کرکٹ — قوم کو "بیس بال" دے مولا
حشر میں پل صراط سے فوراً — میری گاڑی نکال دے مولا
شعر بن جائیں آسماں گیر — شاعری کو اچھال دے مولا

ٹھیک کردے دماغ شانہ کا
سر میں کچھ اس کے ڈال دے مولا

سہیل تشنہ
(ریاض)

انجامِ عاشقی

اک روز رسوا کردیا ان کے نقاب نے
بیٹھے بٹھائے آن کے گھیرا عذاب نے

برقع میں جارہی تھیں وہ خاتون پرفتن
دیکھا انھیں تو روک نہ پائے ہم اپنا من

پیچھا کیا تو ان کے قدم دھیرے ہوگئے
ہم بھی حسیں خیالوں کی دنیا میں کھوگئے

پھر التجا یہ کی، ذرا پردہ ہٹائیے
للہ اپنی چاند سی صورت دکھائیے

رخ سے ہٹا نقاب تو واللہ ڈر گئے
ایسے ڈرے کہ خوف سے بے ہوش پڑگئے

آیا جو ہوش سامنے پیرانہ سال تھیں
لیکن زباں کے زور میں وہ باکمال تھیں

بولیں کہ چھیڑا کیوں مجھے کیوں روکے راستے
اپنے ہی واسطے یا پھر ابا کے واسطے

★

محمود شاہد
(الاحساء)

فون

خبر روز گھر کی سناتا ہے فون
جدائی کے غم میں رلاتا ہے فون

بجا کر مرے دل میں یادوں کی گھنٹی
خیالی پلاؤ پکاتا ہے فون

غلط نمبروں کی حسیں چال چل کر
زمانے کو اُلّو بناتا ہے فون

ضرورت نہیں ہے ابھی قاضیوں کی
بہت خوب شادی کراتا ہے فون

ابھی تو دلالی بھی کرنے لگا ہے
ابھی تو کمیشن بھی کھاتا ہے فون

صداؤں کے جھولوں میں ہم کو بٹھا کر
زمیں سے فلک تک جھلاتا ہے فون

محبّت، عداوت، سیاست، تجارت
ہر اک راز دل میں چھپاتا ہے فون

چلو چل کے شاہد کرو میٹھی باتیں
اُٹھاؤ ریسور بُلاتا ہے فون

ریال

پلاؤ گھول کر گھٹی ریالوں کی
مجھے لاحق ہے بیماری ریالوں کی

ہمارا واسطہ کیا ہے روپیوں سے
مری لنگی تری ساڑی ریالوں کی

بنا دیتی ہے انساں کو ڈبل روٹی
یہ چکنی روغنی چربی ریالوں کی

جدھر دیکھو اُدھر انڈے ہی انڈے ہیں
بڑی زرخیز ہے مرغی ریالوں کی

چھپا دیتے ہیں سارے عیب انساں کے
یہ جُبّہ اور یہ ٹوپی ریالوں کی

گدھے کو باپ کہتا ہوں جہاں والو
عجب ہے کار فرمائی ریالوں کی

اُتر جائے گی موسم کے بدلتے ہی
لہو میں دوڑتی گرمی ریالوں کی

پھسلتے ہیں یہاں آکر سبھی شاہد
بچھی ہے ہر طرف کائی ریالوں کی

غزل

محمد عبدالرحمٰن سلیم
(ریاض)

ان سے دوری کی سزا بھی کیسی پائی کچھ نہ پوچھ
لٹ گئی سب دل کی دولت پائی پائی کچھ نہ پوچھ

اُس سے ملنے کے لیے چھٹی کا ملنا تھا محال
عرضی دے کر کس قدر لیبی لگائی کچھ نہ پوچھ

گھر کو جاتے وقت آئیں کس قدر فرمائشیں
کس قدر کرنی پڑی شاپنگ بھائی کچھ نہ پوچھ

چوڑیاں سونے کی لے جانا تھا ان کے واسطے
رات بھر ہوتی رہی کیسی لڑائی کچھ نہ پوچھ

اچھے اچھے کالجوں میں داخلوں کے واسطے
دے کے عطیہ پونجی سب ہم نے لٹائی کچھ نہ پوچھ

گھر کا بنوانا بھی یارو معرکہ سے کم نہ تھا
میستری نے لوٹ لی کتنی کمائی کچھ نہ پوچھ

باس کی خفگی کے ڈر سے واپسی کا رُخ کیا
کس قدر غمگیں تھی وہ شامِ جدائی کچھ نہ پوچھ

کہنے کو تو ایک ین۔آر۔آئی ہیں حضرت سلیم
شام ہوتے ہی وطن کی یاد آئی کچھ نہ پوچھ

سہیلی کی کہانی

عجب داستاں ہے یہ میری زبانی
سہیلی کی میری تو سن لے کہانی

وہ ہے خوبصورت دکھائی دے اچھی
وہ کہتی نہیں سچ ، لگے پر ہے سچی
وہ دیوانی، بھولی ہے کانوں کی کچی
سہیلی کی میری تو سُن لے کہانی

وہ عینک سے کرتی ہے جگ کے نظارے
وہ شوہر کو کرتی ہے ایسے اشارے
ہیں بے بس وہ بیوی کے آگے بیچارے
سہیلی کی میری تو سُن لے کہانی

وہ جب بھی پہنچتی ہے گھر میں کسی کے
وہ بھونچال لاتی ہے سر میں اسی کے
مگر پھر بھی در ہیں کھلے ہر کسی کے
سہیلی کی میری تو سُن لے کہانی

کہیں لنچ کھاکر، ڈنر لیتی جاتی
کہیں کول ڈرنک چائے بھی پیتی جاتی
کبھی قرض بھی ساتھ ہی لیتی جاتی
سہیلی کی میری تو سُن لے کہانی

وہ گوسپ کی ماہر ہے ہوشیار بھی ہے
زباں اس کی اسپیڈی تلوار بھی ہے
سبھی دوستوں کی وہ دلدار بھی ہے
سہیلی کی میری تو سُن لے کہانی

ہے اس کا وطیرہ نہ کچھ راز رکھنا
جو سننے میں آئے یا آواز ہٹنا
سنا کر زمانے کو پھر ناز کرنا
سہیلی کی میری تو سُن لے کہانی

Gossip

(سلسلہ صفحہ ۲۲ پر)

کبھی تلملاتی کبھی بڑبڑاتی
کبھی چوٹ کرتی کبھی دل دکھاتی
کبھی دوست، دوست کو ہے لڑاتی
سہیلی کی میری تو سن لے کہانی

وہ موجود ہے ہر لڑائی کے پیچھے
وجود اس کا ہے ہر برائی کے پیچھے
مگر ٹانگ اس کی نہ ہوتی ہے پیچھے
سہیلی کی میری تو سن لے کہانی

وہ کہتی ہے بچے ہیں، اس کے ہی سچے
اسے پیارے لگتے ہیں، اپنے ہی بچے
بظاہر بھی اچھے ہیں، من کے بھی اچھے
سہیلی کی میری تو سن لے کہانی

خدایا میرے تو نہ اس کو سزا دے
برائی و غیبت سے اس کو بچا لے
کوئی راہ سیدھی تو اس کو دکھا دے
سہیلی کی میری تو سن لے کہانی

محمود حیدرآبادی
دمام (سعودی عرب)

قطعات

اُردو کے تعلق سے:

شور کرنے سے یہ جاتی ہے کیا اُردو بولو
ہندو مُسلم کو لڑاتی ہے کیا اُردو بولو
آپ اُردو کے طرف دار بہت ہیں لیکن
آپ کے بچوں کو آتی ہے کیا اُردو بولو

گھر سے فیشن کو ہٹاؤ تو کوئی بات بنے
ڈوبتی ناؤ تراؤ تو کوئی بات بنے
تم تو غیروں کو اشاروں پہ نچاتے ہو مگر
گھر میں بیوی کو نچاؤ تو کوئی بات بنے

عورتیں فیشن میں خالی مست ہیں خوشحال کم
عمر پوچھو تو بتائیں آٹھ یا دس سال کم
آج کے شادی شدہ مردوں کی یہ پہچان ہے
بیوی سے دہشت زدہ ہیں اور سر پہ بال کم

غزل

سید حسن عسکری
(ریاض)

دھن مڑیوں کے پرانے ذکراں نکّو نا — امری کے وہ بیتے یاداں نکّو نا
حج پو حج کرتے جارئیں پن بدلے نئیں — سٹّے بٹّے، ہوندے کاماں نکّو نا
بس چلتا تو چارمینار تم بیچ کھاتے — سدھرو اب، بے ڈھنگے چالاں نکّو نا
اپنے گھر میں کیا ہو رائے سو فکر نہیں — سارے جگ کے جھوٹے فکراں نکّو نا
عید تو گئی پن پڑوسن کے گلے پڑے کو — روز روز کے مبارکبادیاں نکّو نا
کھوڑا لگا تو منہ کو بیٹھیں گانے کو — بوما بوم اور لمبے راگاں نکّو نا
مجھ سے زیادہ ہے خوش بیگم کنگ ڈم ایں — واپس جانے کے اب باتاں نکّو نا
ڈائٹنگ کا نام لے کو کھانے کو ترسا رئیں — بدلے لینے کے ترکیباں نکّو نا
ڈش اینٹینا لگا تو بیگم یہ بولی — سب دیکھو پن آسر ساٹڑاں نکّو نا
یوں تو پیسہ خوب کمائے باہر آ کو — کیا کیا کھوئے ہم، اب یہ باتاں نکّو نا

پیار حسن کا جھوٹا ہو سکتا ہی نہیں
پیار میں جھوٹے وندے قسماں نکّو نا

ہلّو ہلّو

مجھے وہ بلاتے گئے ہلّو ہلّو — قدم پیار میں بڑھتے گئے ہلّو ہلّو
دوپٹے کے پلّو کو منہ میں مڑ کو — اشارے وہ کرتے گئے ہلّو ہلّو
میرے پیار کا کچھ چلا ایسا جادو — صنم تم جکڑتے گئے ہلّو ہلّو
نشہ پیار کا تھا چڑھا جلدی جلدی — گرہ پیار کے کھلتے گئے ہلّو ہلّو
ہوئی کوششیں کامیاب ان کی اک دن — کہ ہم بھی سدھرتے گئے ہلّو ہلّو

حسن آئے غصے میں جب وہ ہمیشہ
منہ ہی منہ میں کچھ کہتے گئے ہلّو ہلّو

غزل

حقیق الزماں حقیق (ریاض)

ماضی کے روز و شب کو بھلاتا نہیں کوئی — ہر اک کو حالِ دل تو سناتا نہیں کوئی
وہ کیا چلا گیا کہ چمن ہی اجڑ گیا — اب پھول توڑنے کو بھی آتا نہیں کوئی
تیرے بغیر حال مرا کیا ہے آ کے دیکھ — اپنوں کو اس طرح تو ستاتا نہیں کوئی
تجھ کو دیارِ غیر میں کیونکر سکوں ملا — غیروں سے راہ و رسم بڑھاتا نہیں کوئی

رہنا نہیں حقیق کو گھائل کیے بغیر
درماں کہیں سے ڈھونڈ کے لاتا نہیں کوئی

انور اسحاقی
(دمام)

غزلیں

امیری کے سانچے میں ڈھل کو چلے گیئں میری زندگی سے نکل کو چلے گیئں
میں خدمت کرا تھا محبّت میں لیکن دُعاؤں کے بنڈل انڈل کو چلے گیئں
وہ شادی کسی غیر سے کرلیئے اور میرے دل کے ارماں کھنڈل کو چلے گیئں
مروّت کا مارا کھڑا رہ گیا میں وہ اُلفت کا جنگلہ اُنگل کو چلے گیئں
جو ابّا کو ان کے پلٹ کو میں دیکھا وہ مینڈک کے جیسا اچھل کو چلے گیئں
میں رستوں پو اُن کے جو پھولاں بچھایا وہ پاؤں سے اپنے کھندل کو چلے گیئں
بُھلا دے کو قسماں بھلادے کو وعدے وہ چکنا گھڑا تھے پھسل کو چلے گیئں
زمانہ ہے پیسے کا دیوانہ انورؔ
وہ چاہت کی کلیاں مَسل کو چلے گیئں

○

جواں زندگی ہے، جواں ہے زمانہ ہیں موجود محفل میں اقبالؔ شانہ
جمیئں آج واؔلا بھی محفل میں دیکھو بنائیں خواہ مخواہ سب کے دل میں ٹھکانہ
سلیم و سکندر بھی عاؔبد و واصؔف تمہیں ہو مُبارک یہ محفل جمانا
بڑا کام ہے ویسے عابد میاں یہ یوں صحرا میں شامِ شگوفہ منانا
گزارش ہے تم سے یہ محمود بھائیؔ حسینوں کا دل آج تم نہ دکھانا
جو دولت کمانا ہے تم کو تو یارو تُمیں سیکھ لیو تھوڑا چُنّا لگانا
اگر قوم کا تم کو بننا ہے لیڈر ذرا سیکھ لیو سب کو اُلّو بنانا
جہاں تک ہو تم سے تمیں لوٹ لیو جی لُٹانے ہم آئے ہنسی کا خزانہ
نہ سگریٹ چائے نہ شربت نہ پانی یہاں منع ہے کچھ بھی پینا پلانا
یہ مصروف و بے کیف دنیا میں انورؔ
ہے مشکل بہت کام ہنسنا ہنسانا

★

ٹیچر وہ بن کو جب سے اسکول جا رہے ہیں — گھر میں بھی اے بی سی ڈی مجھ کو پڑھا رہے ہیں
جس دن سے ساس گھر میں لاکو بھلاواں ڈالیں — بیگم کے ناز نخرے ہر دن اٹھا رہے ہیں
اپنے پڑوسی سمجھے ہم گانا گا رہے ہیں — لوری سنا کو جب ہم بچے سلا رہے ہیں
میوزک لگا کو گھر میں بیگم تو سو گئیں، ہم — دنیا کو کیا بتائیں جھاڑو لگا رہے ہیں
نوکر ہوئی ہیں جب سے تنگ قافیہ ہے میرا — اللہ پلیز کر کو برتن دھلا رہے ہیں
کھانا پکائیں ہم خود کپڑے بھی دھوئیں ہم خود — شوفر بھی ان کے بن کو گاڑی چلا رہے ہیں
غصہ ہے ناک پو اور وہ بھی جلدی جلدی — پاواں دبا دبا کو اُن کو منا رہے ہیں
ایڈوانس زندگی کا آئور ہے یہ فسانہ
مینٹین خود کو کرنے، ہر دکھ اٹھا رہے ہیں

انور بھائی (دمام)

قطعات

آج کل انگریزی بول رئیں اُردو بولی خال ہے
گھوڑا تو دیسی ہے پیروں میں بدیسی نال ہے
اُردو کے سارے مدرسوں پو بھری کنجال ہے
انگریزی کی درس گاہ والا تو لالم لال ہے

بال مسکے میں سے کھینچے جیسا منجے کھینچتیں
غصے میں آئیں جو بیگم انکھیوں سے بھینچتیں
گھور کو وہ محفلوں میں جب بھی منجے دیکھتیں
کیا بتاؤں ہاتھاں پاواں میرے تھر تھر کانپتیں

○

اُردو اُردو کا ہی نعرہ آجکل چل رأے مگر
کام مشکل ہے بہت اب چھوڑنا انگلش ڈگر
کٹ رہی ہے آس میں آئے گی اک دن وہ سحر
ڈیڈی چھوڑ ابّا پکارے گا میرا لختِ جگر

جب بھی تیور کسی بیگم کے بدل جاتے ہیں
جسم کیا چیز ہے یہ دل بھی دہل جاتے ہیں
ہم نے دیکھے ہیں پہلوان سے شوہر بھی جناب
ایک آواز پہ بیگم کی اُچھل جاتے ہیں

○

جب جب پلان بیگم پک نک کا ڈالتیں
گھر کا تمام بدلہ باہر نکالتیں!
خود بیٹھتے ہیں شان سے کرسی پو اور مجے
چنڈل بنا کو بچوں کے آگے اچھالتیں

لڑکی والوں کی چھپی اخبار میں یوں سُرخیاں
ڈاکٹر پیشہ ہو شوہر کم وہ شوفر چاہیئے
خانہ داری سے ہو واقف اور سلیقہ مند ہو
سچے معنی میں ہمیں نوکر سا شوہر چاہیئے



"آزادی کا مطلب سیاسی بندھنوں سے نجات ہی نہیں
بلکہ اس کا مطلب دولت کی برابر تقسیم، ذات پات کے
بندھنوں اور سماجی ناانصافیوں کا خاتمہ اور فرقہ واریت
و مذہبی ناروا داری کی فنا بھی ہے۔"

——— نیتاجی سبھاش چندر بوس

قوم اپنے عظیم محبِ وطن کو ان کے ۷۵ ویں یوم پیدائش پر خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے

م - ش - غوری
(جدہ، سعودی عرب)

تماشائے اہلِ سخن

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نئے نئے سعودی عرب آئے تھے۔ سعودی عرب کے بارے میں ہم کچھ زیادہ جانتے نہ تھے۔ دنیا کے ہر مسلمان کی طرح ہمارا علم بھی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک ہی محدود تھا یا یہ جانتے تھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ پٹرول یہیں سے نکلتا ہے۔ پٹرول مشینوں کو اور دولت انسانوں کو حرکت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ دنیا کا ایک اہم ترین ملک ہے۔

ایک شام ہمارے ایک دیرینہ دوست نے جو ہم سے پہلے سے اس شہر میں قیام پذیر تھے، شہر کے بازاروں کی سیر گشتی کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں شہر ریاض میں نہ اتنے شاپنگ سنٹرز تھے نہ آج کل جیسی بڑی بڑی سوپر مارکٹیں اور تفریح گشتی کے لیے بلدیہ باغیچے اور سبزہ زار گھومنے پھرنے کے لیے۔ 'بطحاء' 'شارع وزیر' 'دیرہ' 'شارع ثمیری'، 'شارع جمیرا' اور 'شارع متنبیہ' شارع ثمیری اور شارع متنبیہ متمول افرادِ خانہ یعنی مال دار خواتین کی خریداری کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان مراکز پر حفظِ ماتقدم کے طور پر پولس اور مطوعون (وہ عالم حضرات جو حکومت کے ایک ادارہ "امر بالمعروف نہی عن المنکر" کی جانب سے بازاروں میں شرعی احکام پر پابندی کی نگرانی پر مامور ہوتے ہیں) کی کثرت ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا ہم جیسے "دیداری خریدار" اس جانب کم ہی رخ کیا کرتے تھے ۔۔ ان مقامات کی شکل وصورت پہلے اتنی حسین نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔

ہم اس شہر کے معروف محلے "حارہ" میں رہا کرتے تھے۔ عربی زبان میں حارہ بستی یا محلے کو کہتے ہیں۔ نہ جانے کیوں اور کیسے یہ اپنے سابقے اور لاحقے سے محروم ہو کر صرف "حارہ" رہ گیا۔ یہ محلہ وزارت دفاع کی پشت پر واقع ہے۔ اسی مناسبت سے اسے "حارۃ الدفاع" بھی کہتے ہیں۔ اس کا بلدیاتی نام جس کی [illegible] تختیاں لگی ہیں "المنتزہ" (AL MUNTAZA) ہے۔ ۱۹۷۶ء میں جب ہم اس محلے میں نازل ہوئے تھے تو اس [illegible] برصغیر کے محنت کشوں کے "رفیق محلے" یعنی [illegible] نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ پورے شہر میں گرد و غبار کے طوفان یہیں سے اٹھا کرتے تھے۔ جگہ جگہ مٹی کے ٹیلے [illegible] مکانات پر مشتمل یہ محلہ [illegible]

کے لیے نہ جانے کیوں اپنے اندر اتنی کشش رکھتا تھا کہ ہر آنے والا یہیں آباد ہونا چاہتا تھا

ان دنوں پرانے ایرپورٹ سے بطحا کے لیے حافلے (کوسٹر بس / منی بس) اور پیلی ٹیکسیاں چلا کرتی تھیں سرکاری ادارہ (SAPTCO) سعودی پبلک ٹرانسپورٹ کمپنی) کا قیام ابھی عمل میں نہیں آیا تھا۔ حافلہ کا کرایہ فی سواری ربعہ ریال (پاؤ ریال) یعنی 25 ہللے اور پیلی ٹیکسی کا کرایہ نصف ریال (آدھا ریال) یعنی 50 ہللے ہوا کرتا تھا۔

ہم اپنے میزبان کی رہنمائی میں بطحا پہنچے دیگر بازاروں کے مقابلے میں بطحا غریب پرور بازار ہے۔ یہاں چھوٹی بڑی بے شمار دکانیں ہیں۔ ہر دکان میں ایک نئی چیز اور ہر چیز ایک نئے رنگ اور ایک نئے ڈھنگ کی انواع و اقسام کی اشیا سے سجی سجائی دوکانیں یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کی مصنوعات و پارچہ جات اس بازار میں سمٹ آئے ہوں۔ دوکانوں میں موجود اشیا کے سحر میں ڈوبے، خریداروں کے بے پناہ ہجوم میں گم چلے جا رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر ایک بورڈ پر پڑی۔ لکھا تھا "BARKING" اس تحریر کو دیکھ کر ہمارے ہوش و حواس جاتے رہے۔ سنا تھا کہ سعودی عرب میں کتے نہیں ہوتے اور ہوتے بھی ہوں گے تو صحرا کے کسی نخلستان میں کسی چرواہے کے ساتھ صحرا نوردی کرتے ہوں گے۔ ہم نے اپنے رہنما سے جو ہمارے ہر پر تجسس سوال کا جواب دیا کرتے تھے پوچھا۔ "اے پیرِ شہر اس نووارد شہر ناواقفِ حال و احوال کو بتا کہ یہ کیا اسرار ہے؟"

اس ستم ظریف کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے۔ کہنے لگا۔

"[illegible]۔ میں جس طرح لوگ اپنے دل کا غبار نکال لیتے ہیں بالکل اسی طرح یہ جگہ بھی ان افراد کے لیے مخصوص ہے جو بھونکنا چاہیں تو مکمل آزادی کے ساتھ بھونک سکتے ہیں۔"

"یا مظہر العجائب!" ہم نے نعرہ لگایا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وطن سے دور، اپنوں کی محبت اور چاہنے والوں کی چاہت سے محروم یہ لوگ، کام اور مسلسل کام کر کے جب تھکن اور ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اعصابی تناؤ سے نجات پانے کے لیے مختلف مشغلے اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی شاعر بن جاتا ہے کوئی ادیب کوئی نقاد کوئی محقق کوئی موسیقار کوئی گویا تو کوئی رسام اور جو ہماری تمہاری طرح کچھ نہیں کر پاتے وہ بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ تم ابھی نئے ہو سمجھ نہیں پاؤ گے۔ رفتہ رفتہ اس شہر کے اسرار کھلیں گے۔" "تو کیا یہاں شاعر اور ادیب بھی پائے جاتے ہیں ـــــ؟" ہم نے مزید حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کہاں نہیں پائے جاتے! سنا نہیں تم نے چاند پر پہنچ کر امریکی خلا باز نیل آرم اسٹرانگ نے جیسے ہی پہلا پتھر اٹھایا اس کے نیچے سے ایک شخص اچکن اور دوپلی ٹوپی پہنے ہاتھ میں بٹوا اور گلے میں گلوری دبائے برآمد ہوا۔ جھک کر فرشی سلام بجا لایا اور کہا "مطلع عرض کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔" یہ سننا تھا کہ امریکی خلا باز وہی ایک پتھر جو اس کے ہاتھ میں تھا اٹھائے واپس خلائی جہاز کی طرف دوڑ پڑا۔ اندیشہ تھا کہیں دو چار پتھر اٹھا لیے تو پورا مشاعرہ سننا پڑے گا۔"

"تو پھر یہاں مشاعرے بھی ہوتے ہوں گے؟" ہم نے ان کی شگفتہ بیانی کو نظر انداز کرتے ہوئے مسرت و تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ایسے ویسے! اماں سنو گے تو کانوں پر اور دیکھو گے تو آنکھوں پر یقین نہ آئے گا۔"

"تو پھر کسی دن ہمیں بھی لے چلو۔"

"کسی دن کیا کل ہی کی رہی۔ کل جمعرات ہے۔ کل یہاں کی ایک معروف علمی، ادبی و سماجی شخصیت کے دولت کدے پر مشاعرہ ہونے والا ہے۔"

دوسرے دن شام ہی سے ہم پر مشاعرہ سوار تھا۔ مختلف شعرا کے کلام کو ترنم میں گنگناتے، ہم نے آپ کو مشاعرے میں شرکت کے قابل بنا سنوار اور ڈھال رہے تھے۔ سفید ململ کا کلی دار کرتا، ڈھیلا پاجامہ سیاہ واسکٹ اور سلیم شاہی جوتی پہنے، جیب میں رومال، الائچی اور چھالیہ کے دانے ڈالے، ہاتھ میں کراؤن "A" کا سگریٹ پیکٹ تھامے تقریباً 8 بجے ہم مشاعرے میں جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔

انتظار کرتے کرتے 9 بج گئے تو سمجھا شاید ہمارے دوست بھول بھال گئے یا وہ بھی ان کا ایک مذاق تھا۔ انتظار کی یہ گھڑیاں ہم پر بے حد شاق گزر رہی تھیں۔ امید اور نا امیدی کی اس کیفیت میں۔ بج گئے اب ہم بالکل مایوس ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ شاعرانہ جامے سے نکل کر بستری لباس میں آجائیں۔ ٹھیک ۱۰ بج کر چند منٹ پر موصوف تشریف لے آئے۔ انھیں دیکھ کر ہم پر خوشی کی وہ کیفیت طاری ہو گئی جسے شادیٔ مرگ کہا جاتا ہے۔

"شوقین! کان میں عطر کا پھایا اور کلائی میں ایک گجرے کی کمی ہے!"

ان کے اس اندازِ تخاطب پر ہم کچھ جھینپ سے گئے۔

"لگتا ہے کافی دیر سے تیار بیٹھے ہو۔؟"

"جی ہاں ـــ آپ نے بتایا نہیں تھا کہ کس وقت چلنا ہے۔"

"بھائی میرے۔ مشاعرہ رات ۱۱ بجے سے پہلے شروع نہیں ہوگا۔ ۱۰ بجے سے پہلے وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اگر کوئی آ بھی جائے تو سمجھ لو کہ وہ شہر کا نومولود شاعر ہے۔ نئے فقیر کو بھیک کی جلدی تو نئے شاعر کو داد کی۔ تمھارا حال بھی ان دو سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

تقریباً ½ ۱۰ بجے ہم مشاعرہ گاہ پہنچے۔ ہمارے دوست کا ایسا پُر تپاک استقبال ہوا کہ ہمیں ان پر حسد کی حد تک رشک آنے لگا۔ فرداً فرداً ہر ایک سے سلام۔ ہر ایک تھا کہ انھیں گلے لگا رہا تھا۔ ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہوا۔ ہم اپنے دوست سے چپکے چپکے ایک جانب کو بیٹھ گئے۔ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لوگ آتے رہے اور محفل کی رونق بڑھاتے رہے۔

۱۱ بجے یا شاید کچھ زیادہ ہی بجے تھے۔ مشاعرے کا آغاز ہوا۔ صاحبِ صدر کا اعلان ہوا تو ہمارے دوست نے سرگوشی کی۔ "یہ یہاں کی ہونے والی تمام محافل کے مستقل صدر ہیں۔"

مشاعرے میں شریک شعرائے کرام کے ناموں کا اعلان سن کر معلوم ہوا ہال میں موجود پچیس تیس حاضرینِ محفل میں ہم جیسے چند سخن ناشناس کے سوا سب کے سب صاحبِ سخن ہیں

خواتین و حضرات! مشاعروں کی ادبی تاریخ میں دو مشاعروں نے بڑی شہرت پائی۔ ایک کنہیا

لال کپور کا مشاعرہ دوسرا پطرس بخاری کا مگر خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہم اللہ کو حاضر و ناظر جان کر حلفیہ بیان کر رہے ہیں کہ آج کا مشاعرہ جس کا کہ ہم بہ نفسِ نفیس کامل ہوش و حواس میں مشاہدہ فرما رہے تھے۔ منفرد و بے مثال تھا کہ ایسا مشاعرہ چشمِ فلک نے کبھی دیکھا نہ ہوگا۔ بفضل تعالیٰ اگر پطرس بخاری اور کنہیا لال کپور بقید حیات ہوتے تو یہ دیکھ کر اپنی کم مائیگی کے احساس شدید پر بہت ممکن ہے وہ پیالۂ ظلم اپنے ہی سینے میں گھونپ کر جان جانِ آفریں کے حوالے کر دیتے۔ مشاعرے کے پہلے شاعر کے پہلے ہی مصرع پر واہ واہ کی ایک لمبی مشترکہ داد سے ہال گونج اٹھا۔ شاعر نے مصرعۂ اولیٰ کو ۳ بار دہرایا۔ سامعین نے اتنی ہی بار بآوازِ بلند مصرع کو اٹھایا۔ چوتھی بار مصرعۂ ثانی کو پڑھ کر شعر مکمل کیا۔ جیسے ہی شعر مکمل ہوا سامعین میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایسا لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ واہ واہ! واہ واہ! کا وہ شور و غلغلہ اٹھا کہ الاماں والحفیظ۔ ہم سمجھے آج طلسم ہوش ربا کا ظالم جادوگر سامری مارا گیا۔

جب واہ واہ کا گرد و غبار چھٹا، آنکھیں کچھ دیکھنے اور کان کچھ سننے کے قابل ہوئے تو ہم نے اپنے ایک پڑوسی سے پوچھا۔

"جناب وہ کیا شعر تھا جس پر اتنی داد پڑی کہ یہودیوں پر فلسطینیوں کے اتنے پتھر نہ پڑے ہوں گے۔"
ہمارا یہ جملہ غالباً ان کی طبیعتِ شعر فہمی پر کوہِ گراں گزرا۔

"شعر فہمی عالمِ بالا معلوم" یہ کہہ کر انھوں نے کچھ ایسی نظروں سے ہمیں دیکھا کہ ہم نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ ویسے بھی فارسی ہمیں آتی نہ تھی۔

باری باری شاعر آتے رہے۔ کلام سناتے رہے۔ کلیاں اکھڑتی رہیں۔ چھت اڑتی رہی۔ لوگوں کے داد دینے کے انداز بھی عجیب نرالے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ داد دے رہے ہیں یا کوسنے۔ یا کہ یہ جمرات ہو رہی ہے۔ شعرا کو ان کے ہر شعر پر ابتدا تا انتہا یوں ہی داد ملتی رہی۔ ایسے میں کہیں سے کوئی آواز مکرر ارشاد کی آتی تو ہماری جان جل کر کباب ہو جاتی اور ہم اپنے رب سے خواہش کرتے کہ "اے ربِ کریم ایک رات صرف آج رات کے لیے تو ہمیں نادر شاہ ہی عطا فرما۔"

خدا خدا کرکے رات ۲ بجے وقفہ کا اعلان ہوا۔ لذتِ کام و دہن کا عالی انتظام تھا لیکن ہمارے لیے یہ کھانا "عشائے ربانی" سے کم نہ تھا۔ وحشت ہم پر بری طرح سوار تھی کہ اڑیل بھینسے کی طرح رسی تڑا کر بھاگ نکلنا چاہتے تھے لیکن وہ کھونٹا جس سے ہم بندھے تھے اتنا مضبوط تھا کہ نہ اکھڑتا تھا، ورنہ توڑے سے ٹوٹتا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ بڑی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ گڑگڑائے کہ بھئی ہم سن چکے ہیں اور جو کچھ ہم دیکھ چکے ہیں وہ ہماری باقی ماندہ حیاتِ فانی کے لیے کافی ہے۔ اس سے زیادہ کے ہم متحمل نہ ہو سکیں گے۔ لیکن وہ سخن پرور و سخن فہم کسی طور راضی نہ ہوا۔ کہنے لگا۔

"شوقین! اصل مشاعرہ تو وقفہ کے بعد ہوگا۔ شہر کے معروف و مقبولِ عام شعرائے کرام و استادانِ فن اپنا کلام سنائیں گے۔ سنو گے تو عش عش کر اٹھو گے۔"

ہمیں ابھی غش پر غش آ رہے ہیں کچھ دیر اور رکے تو ہماری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی اور ہماری

روح تربت پر لکھا ہوگا۔ "مقتول مشاعرہ"

"یار، تمھارے حضور شعر و شاعری کو کیا ہوا؟ ہم نے تو تمھیں بڑا باذوق جانا تھا۔ تم تو بڑے ہی بدذوق نکلے۔ جانتے ہو اس طرح ادھوری محفل چھوڑ جانا خلافِ تہذیب و آدابِ مشاعرہ ہے۔"

آپ کے دل میں جو آئے کہہ لیجیے، بدتمیز، بداخلاق، بدذوق، بے ادب۔ لیکن خدارا آج، فقط آج کی رات ہماری خاطر یہ بے ادبی گوارا فرما لیجیے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ پھر کبھی آپ سے مشاعرہ کی خواہش نہ کریں گے۔

چلیے جناب! اس سے پہلے کہ مشاعرہ کا دوبارہ آغاز ہو، خاموشی سے نکل چلیے۔ آپ ہی کی خاطر مشاعرے میں آئے تھے۔ آپ ہی کی خاطر آج یہ بے ادبی بھی کر گزرتے ہیں۔"

ہال سے باہر آکر ہم نے ایک لمبا سانس لیا، اطمینان کا، آزادی کا۔ ●●

محمد باقر

(تبوک، سعودی عربیہ)

میاں ڈیٹ

MANDATE

موجودہ دور میں اپنے آپ کو انگریزی سے واقف بتلانے کا کچھ زیادہ ہی دور دورہ ہے۔ اردو کی بول چ
کھا اردو کے اخبارات میں بھی انگریزی کے الفاظ کا چلن اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ اب اردو کی چال چلن کے
متاثر ہونے کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اردو کی جگہ انگریزی کے الفاظ کا آزادانہ استعمال تحریر میں آزاد خیا
ستے تاری کو مرعوب کرنے۔کے رجحان کا صاف صاف اشارہ ہے۔ حالیہ عرصے میں اس طرح کا ایک لفظ m
ہمیں یہاں سے شائع ہونے والے اکلوتے اردو جریدے میں بار بار پڑھنے کو ملا چنانچہ ہم اس لفظ andate
میاں ڈیٹ کو ہدف مان کر آپ سے مخاطب ہیں۔

یوں تو برِ صغیر کے نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنی کتاب الغرض میں کہا ہے کہ وہ ملن لد گئے ج
لفظوں کے لغوی معنی اور غیر لغوی معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا" لیکن ہمارے مشاہدے کے مطابق یہ لفظ برِ صغیر
ایک ملک میں جہاں حال ہی میں انتخابات عمل میں آئے ہیں اور جہاں دو طاقت ور سیاسی جماعتیں مقابلہ آ
کے لیے مخالف جنس صدور کے ساتھ ایک ہی قسم کے لباس میں برسرِ پیکار تھے، مرد سربراہ کی سیاسی جماع
نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔عوام کی اس اکثریتی رائے کو Mandate نے مرد۔ تار
قرار دیا۔اس کی معقول وجہ شاید یہ ہے کہ یہ انتخابات ایک مرد نے جیتے ہیں اور ان انتخابات
کی تاریخ شاید مرد کی مرتب کردہ ہے اگر اس انتخاب میں محترمہ کی سیاسی جماعت کو سبقت حاصل ہوتی تو شاید عو
رائے WOMANDATE کہلاتی!

تو لیجئے Mandate مرد۔ تاریخ کا جائزہ لیں۔مرد اصحاب نے تو ایسے ایسے کارہائے نمایا
انجام دیئے ہیں کہ ازل سے دنیا کی تاریخ ان واقعات اور کارناموں سے بھری پڑی ہے ہاں تا
کے ذکر پر ہمیں ہمارے معظم و مکرم استادوں کی ایک نصیحت یاد آتی ہے کہ وہ ہمیں اہم واقعات کو ہمیشہ تا
پس منظر میں دیکھنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور چنانچہ ہم ایک فرماں بردار شاگرد ہونے کے ناطے ہم میں اد ہما

نصف بہتر کے درمیان وقوع پذیر ہونے والے تمام ترمعاملات اور واقعات کو نصف بہتر کی ماں کی زندگی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں کیونکہ ہماری نصف بہتر اس تاریخ کا ایک بے ترتیب باب ہے اور ویسے بھی ابھی اس تاریخ میں تحریف نہیں ہو پائی ہے۔ گو ہمارے ملک کی تاریخ کو دوبارہ لکھنے اور اس میں آزاد خیالی کے ساتھ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے مقصد کے ساتھ کچھ منچلے کام کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ ڈر ہے کہ یہ منچلے تاریخ میں تحریف کرنے سے پہلے ہی اپنا جغرافیہ کھو بیٹھیں گے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ جب ہم وطن عزیز میں برسر روزگار تھے کام سے لوٹ کر گھر آئے تو ہماری نصف بہتر کے تیور ہی کچھ بدلے ہوئے تھے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ غیر ضروری استقبال اور ہماری روزمرہ سے ہٹ کر کیوں آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ ہم پہلے پہل تو یہ سمجھے کہ شاید ننھے نے گھر میں کوئی قیمتی چیز کو توڑ ڈالا ہوگا اور یہ لوگ ہماری توجہ ہٹانے کے لیے اس طرح سے ہماری آؤ بھگت کر رہے ہیں۔ یا پھر ہماری بیگم نے کھانے پکانے میں کوئی چیز جلا بھنا کر غیر معمولی نقصان کر ڈالا ہے جیسا کہ وہ اکثر اپنے مخصوص رویہ کے اظہار کے طور پر اپنے سسرالی مہمانوں کے آنے پر کرتی ہیں۔ ہم ماجرے کی تہہ تک پہنچنے اور کھوج لگانے میں مصروف تھے کہ ہمیں پتہ چلا کہ آج پہلی تاریخ ہے۔ تاریخ کا کیا کیا ذکر کریں۔ آج کا ہر واقعہ کل کے لیے تاریخ ہے۔ اہم تاریخی دنوں میں تاریخ پیدائش بھی شامل ہے۔ پیدائش کا یہ وہ دن ہے جس پر مولود روتا ہے۔ قطعہ تاریخ وہ تاریخ ہوتی ہے جس پر مرنے والا دوسروں کو رلاتا ہوا دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ تاریخ زواج یہ وہ تاریخ ہوتی ہے جس پر دولہا اپنی زندگی کی آخری آزادانہ خوشی و مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ دلہن اس دن روتی ہے لیکن اس کے بعد ہر روز وہ خوش و خرم گزارتی اور اس کا شوہر حیران و پریشان رہتا ہے۔ اور تنخواہ کی پہلی تاریخ یہ ایسی تاریخ ہے جس میں :

تیرے آنے کی خوشی سے پہلے
تیرے جانے کا خیال آتا ہے

ایک شادی میں ہم دولہا کی طرف سے پیش پیش تھے تمام تر باتوں کے طے ہو جانے کے باوجود شادی کی تاریخ کی یکسوئی خواتین کے بورڈ نے ہی کی مشرق کی اس روایت کے برخلاف مغربی ممالک میں خواتین فراخدلی سے اپنے مرد دوستوں کو ڈیٹ دیتی ہیں تاکہ انھیں فرصت سے اپنے جغرافیہ سے واقف کرا سکیں اور اسی طرح شادی سے پہلے ماں بننے کا کمال فن بھی انہی کی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

DATES کے معاملے میں عرب ممالک بھی دنیا میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن ابھی تک ان کے DATES مرغوب غذا کے علاوہ کسی اور میدان میں نمایاں نظر نہیں آتے۔

دنیا کی تاریخ آدم اور حوا کے میل ملاپ، پیار محبت اور ازدواجی زندگی کے مراحل سے عبارت ہے ان مراحل پر غور و فکر کرنے اور عملی طور پر اسے جاری و ساری کرنے کی ضرورت ہے۔

DATES لینا یا دینا آپ کا اپنا اختیار ہے لیکن سوچ سمجھ کر اس پر عمل کیجیے۔ شاید آج کی DATE آپ کی زندگی کی ڈائری کی آخری DATE ہو اور پھر مورخ جب آپ کی زندگی کے مثبت اور اچھے پہلوؤں کو بگاڑ کر پیش کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو منفی پہلو کا کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

خلیل یوسف صدیقی
(ٹورنٹو کنیڈا)

ذرا سی غلطی

شادی سے پہلے ہمیں بھی ہاتھ دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس ضمن میں دست شناسی کی دو چار مشہور کتابیں پڑھ لی تھیں اور بس ماہرین بیٹھے تھے، اس شوق کا بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ ہر محفل میں ہر گھر میں خواتین اور خاص طور پر بن بیاہی لڑکیاں ہم سے متعارف ہونا شروع ہو گئیں اور ہمارے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی رہتیں کہ ذرا یہ ہاتھ دیکھیے اور "کچھ" بتائیے، ہمیں اس "کچھ" کے معنی بھی اچھی طرح سمجھ میں آ گئے تھے، اسی ہاتھ دیکھنے کے چکر میں ہم نے ایک خوب صورت لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور اسے بتایا کہ اس کی قسمت میں ہماری بیوی بننا لکھا ہے اور پھر اس سے ہماری نسبت ہو گئی!

اب تک تو ہم دوسروں کو بے وقوف بنایا کرتے تھے مگر جب اپنی شادی کا معاملہ آیا تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ کسی علم فراست الید کے ماہر یا علم جفر کے عالم سے اپنی زندگی کے متعلق بھی پوچھا جائے، پتہ چلا ہمارے ہونے والے سسر صاحب قبلہ جو انڈیا میں کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے تھے، دست شناسی اور علم نجوم و جفر سے بڑا شغف رکھتے ہیں اور بڑے بڑے لوگ ان کے قائل ہو چکے ہیں، چنانچہ ہم ان کے پاس پہنچے اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور عرض کی کہ ماسٹر صاحب بتائیے کہ ہماری جوڑی کیسی رہے گی، ماسٹر صاحب نے پہلے تو ہمارا ہاتھ دیکھا ہتھیلی کی تمام لکیروں کے نقش لیے، ہماری اور ہماری والدہ مرحومہ کی پوری ہسٹری لکھی، پھر کہا میاں ان صاحبزادی کو بھی لے آؤ اور ساتھ میں ان کی ماں کا نام اور تاریخ پیدائش بھی پوچھ آنا، صاحبزادی کا نام پوچھنا مشکل کام نہ تھا ہاں ان کی والدہ کا اصلی نام اور تاریخ پیدائش کا معلوم کرنا دقت طلب امر تھا مگر یہ مشکل خود صاحبزادی نے ترکیب نمبر گیارہ کے استعمال سے حل کر لی۔ ایک دن جب وہ کالج سے گھر واپس جا رہی تھیں تو ہم انھیں راستے سے اغوا کر کے ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے جہاں ان کے دست مبارک پر بھی ان لکیروں کے نقوش اتار لی گئیں جن سے ہماری تقدیر وابستہ تھی پھر ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ مبار

ہفتے بھر بعد آنا، میں زائچہ بنا دوں گا اور ہدایت نامہ بھی تحریر کر دوں گا۔ ایک ہفتہ ہم "اھدنا الصراط المستقیم" کا ورد کرتے رہے اور پھر ماسٹر صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے ازراہ کرم ایک بڑے سے لفافے میں ہمارا زائچہ ہمارے حوالے کر دیا اور کہا کہ برخوردار اسے سنبھال کر رکھنا "نکاح ہو جانے کے بعد اکیلے میں کبھی پڑھ لینا" ماسٹر صاحب کے اس حکم سے ایک بات تو سمجھ میں آگئی کہ مجھے ان صاحبزادی سے شادی کر لینے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ بہرحال ہماری شادی ہو گئی اور نئی زندگی کی رنگینی میں ہم اپنے زائچے کو بھول گئے۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ہمارا ٹرانسفر کراچی سے لاہور ہو گیا اور ہم دونوں وہاں پہنچ گئے۔ دو کمروں کا ایک مکان کرایہ پر لیا اور جب گھر جمانے لگے تو اتفاق سے وہ زائچے والا لفافہ ہاتھ آگیا، میں نے بیوی سے چھپ کر اسے پڑھا تو سکتے میں آگیا، لکھا تھا کہ شادی تو ہو جائے گی مگر شادی کے تین سال بعد ہماری طلاق ہو جائے گی. جس کی وجہ یہ ہوگی کہ بیوی کسی بات پر ہم سے ناراض ہو گی اور یہ ناراضگی طلاق کا سبب بن جائے گی۔ زائچے کا پڑھنا تھا کہ طلاق کا خوف ہمارے دل و دماغ پر چھا گیا، کبھی ہم اپنی حسین و جمیل بیوی کے معصوم چہرے کو دیکھتے اور کبھی اس جدائی کا تصور کرتے جو طلاق کے بعد ہوتی ہے بہرحال ہم نے طے کر لیا کہ اپنی بیوی کو کبھی ناراض ہونے نہیں دیں گے تاکہ طلاق کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ ہماری بیوی نے کچھ دنوں بعد فرمائش کی کہ وہ دن بھر گھر میں اکیلی رہتی ہیں لہٰذا ان کی والدہ کو کراچی سے بلوا لیا جائے، ہم فوراً راضی ہو گئے۔ ساس صاحبہ کو ٹکٹ کے پیسے بھجوائے اور کہا کہ آپ تشریف لائیں ہمارے گھر میں ہماری عزت افزائی ہو گی اور وہ دوسرے ہی ہفتے مع اپنے ساز و سامان کے وارد ہو گئیں۔ ویسے بھی وہ اپنی بہوؤں سے بڑی عاجز تھیں، اب یہ ہونے لگا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی جہاں جاتے ساس صاحبہ کو ساتھ لے جانا پڑتا، چاہے وہ پکچر ہاؤز ہو یا ہوٹل، کوئی دعوت ہو یا کاروباری تقریب، صرف ہمارا بیڈروم وہ واحد جگہ تھی جہاں ہم رات کے کچھ گھنٹوں کے لیے تنہا ہوتے ورنہ جہاں بیوی ہوتی وہاں ساس صاحبہ ہوتیں!

کچھ دنوں بعد ہمارے چھوٹے سالے صاحب کا خط آیا کہ انھیں کراچی کے مقابلے میں لاہور میں اچھی ملازمت مل سکتی ہے چنانچہ اپنی بیوی کی خوشی کی خاطر ہم نے انھیں بھی لاہور آنے کی دعوت دے دی اور دس دن بعد وہ بھی لاہور میں دھرے تھے، خدا کا شکر ہے کہ وہ اس وقت تک کنوارے تھے ورنہ شاید بیوی کی خوشی کی خاطر ان کی بیوی بچوں کو بھی گھر رکھنا پڑتا، سالے صاحب آئے اور اپنی ماں کے کمرے میں رہنے لگے، ان کے لیے ایک بیڈ، ایک ٹیبل، کرسی اور ایک وارڈ روب خریدا گیا تاکہ انھیں کوئی تکلیف نہ ہو، آنے کے بعد کچھ دن تو آرام فرمایا پھر نوکری کی تلاش پہلے ہمارے ٹیلی فون کے ذریعہ شروع کی اور دن میں سو پچاس دفاتر اور دوستوں سے گفتگو کر لیتے، پھر کچھ دن بعد وہ کار پر ہمارے ساتھ دفتر جانے لگے۔ جہاں سے وہ ہمارے ڈرائیور کو لے کر نوکری کی تلاش میں نکل پڑتے اور جب تک کار میں پٹرول ختم نہ ہو جاتا نوکری کی تلاش میں رہتے، بارہا ایسا ہوا کہ دفتر سے ہمیں کہیں جانا ہوتا تھا اپنی کار موجود نہ ہونے کی وجہ سے ٹیکسی کی سرپرستی کرنی پڑی، ایک دفعہ بیوی سے اس بات کی دبی زبان سے شکایت کی کہ تمھارے بھائی صاحب ہماری کار لے کر سارا سارا دن غائب رہتے ہیں تو محترمہ کچھ ناراض ہو گئیں اور ہم طلاق کے خوف سے اپنے "بے کار" رہنے ہی پر راضی رہے! اللہ اللہ کر کے سالے صاحب کو

نوکری ملی مگران کو دفتر پہچانے اور لانے کی ذمہ داری ہمارے ہی سر رہی، اپنی اس مصیبت کو ختم کرنے کے لیے ہم نے ایک ویسپا اسکوٹر خرید لی تاکہ سالے صاحب اس کی طرف راغب ہو جائیں اور ہماری کار کا پیچھا چھوٹے، سالے صاحب کو تو اسکوٹر بہت پسند آئی مگر ساس صاحبہ کو اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے وہ بہت خطرناک سواری لگی، لہٰذا وہ حسبِ دستور اپنے دفتر ہماری ہی کار میں آتے جاتے رہے، البتہ جب دفتر سے واپس آکر کو اپنے دوستوں یا کلب جانا ہوتا تو اپنی ماں سے چھپ چھپا کر اسکوٹر اڑا لے جاتے۔ اسکوٹر چونکہ ہماری تھی اس کی نگہداشت اور تیل پانی کی ذمہ داری بھی ہماری رہی، بیوی کی ناراضگی اور طلاق کے خوف سے یہ ظلم سہتے رہے۔

لاہور کے حسن، جم خانہ اور محفلوں میں حسین و جمیل لڑکیوں اور بیگمات کی عنایات اور صحبت یاراں جیسے لغویات کا ہم تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ کہیں بیوی ناراض نہ ہو جائے۔ کوئی دفتر کا مہمان آجاتا تو بیوی سے باضابطہ اجازت لیتے کہ آج دفتر کے بعد فلاں جگہ جاؤں گا، فلاں ہوٹل میں کھانا کھاؤں گا اور اتنے بجے گھر پہنچوں گا۔ دفتر میں یا کسی جگہ بھی کتنی ہی اہم میٹنگ میں ہوتا اور بیوی کا فون آجاتا تو سر تاپا نیاز بن کر جواب دیتا۔ لوگ میری "زن مریدی" پر زیر لب مسکراتے، انھیں کیا پتہ تھا کہ طلاق کے بھوت نے مجھے کتنا بے بس اور مجبور کر رکھا تھا۔

گھر میں کئی خادمائیں تھیں، ایک برتن دھونے آتی تھی، ایک سودا بنانے والی تھی، ایک کپڑے دھونے آتی تھی اور ایک سیالکوٹ کی جوان بدمست کرسچن جمعدارن صحن اور غسل خانوں کی صفائی کے لیے آیا کرتی تھی دنوں بعد بیگم صاحبہ نے امید کا دامن تھام لیا تو ان کی خدمت خاص کے لیے ایک مشکی ملتانی لونڈیا رکھی گئی جو دن اور رات میں ہمارے کمرے میں داخل ہونے تک بیگم صاحبہ کے ہاتھ پاؤں دبایا کرتی۔ مگر ہماری ہمت نہ پڑتی کہ ان سے کسی سے بات کر لیں یا کسی کو جی بھر کر دیکھ لیں۔ طلاق کا خوف [illegible] پوری طرح ہمارے ہوش و حواس پر چھایا رہا۔

دفتر میں ہماری جو پارسن لیڈی سیکریٹری تھی وہ کم بخت ہماری بیگم صاحبہ کی بہن بن گئی تھی اور جو دو سہیلیاں تھیں وہ کمپنی کا کام کم اور ہماری بیگم صاحبہ کے لیے انارکلی، کشمیری بازار اور شاہ عالمی سے فضولیات کی خریداری میں مصروف رہتیں، ہم یہ ساری مصیبتیں طلاق کے خوف سے بڑے صبر و سکون سے برداشت کیے جا رہے تھے۔

شادی کے دوسرے سال کے اختتام سے کوئی ایک ماہ قبل ہمارے گھر پہلی ولادت ہوئی۔ ہم ایک خوبصورت بیٹی کے باپ بن گئے، اب طلاق کا خوف کچھ اور بھی بڑھ گیا کہ اگر بیوی ہاتھ سے گئی تو ساتھ میں بیٹی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا لہٰذا بیٹی کی پیدائش نے ہم کو اپنی بیوی کا اور بھی تابعدار بنا دیا۔

بیوی کی غیر موجودگی میں گھر کا تمام انتظام ساس صاحبہ کے سپرد تھا ہر کام اُن کی مرضی سے ہوتا تھا جو وہ پکاتا اور ہر ملازم ان کے حکم کا پابند ہوتا، بیوی سات دن بعد ہسپتال سے گھر واپس آئیں تو اس پوزیشن میں نہ تھیں کہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکیں لہٰذا ان کی والدہ صاحبہ ہی کا راج رہا اور جب مہینہ بھر بعد بیگم صاحبہ

چارج سنبھالا بھی تو اسی طرح جیسے جنرل ضیاء الحق نے ۷۷ء میں بھٹو کی وزارت عظمیٰ کی تھی! ہماری بیوی ویسے تو کافی سیدھی سادھی تھی، ہم اپنی ساری تنخواہ اور جملہ آمدنی اس کو بتا دیا کرتے تھے اور وہ اپنی ماں کو۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ ہمارے سالے صاحب کو ہوا کہ ہماری آمدنی ماشاء اللہ معقول ہونے کی وجہ سے انہیں ملازم ہو جانے کے باوجود کھانے پینے اور رہنے سہنے کے کسی خرچ سے دوچار نہ ہونا پڑا بلکہ وہ گاہے بگاہے ہم سے دس بیس روپے قرض حسنہ بھی مانگ لیا کرتے تھے جسے ہماری بیوی اکثر معاف کر دیا کرتی اور ہم نے بیوی کی خوشی کو اپنی خوشی ظاہر کیا۔

ہماری بیگم اپنی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی چنانچہ اس کے گھر ولادت کی خوشی میں اور اس کی ہمت افزائی کے لیے ہماری ایک سالی کراچی سے اور ایک اسلام آباد سے معہ اپنی آل و اولاد کے وارد ہو گئیں، گھر کا کونہ کونہ مہمانوں سے بھر گیا، ڈرائنگ روم کے صوفے قالین سب بستروں میں تبدیل ہو گئے، فریج اور نعمت خانہ صبح بھرتا اور شام تک خالی ہو جاتا، دودھ، دن میں دو بار آنے لگا اور تمام نوکروں نے کثرت کام کی وجہ سے زیادہ اجرت کا مطالبہ کر دیا مگر ہم نے ہمت نہ ہاری کہ کچھ ہو جائے طلاق نہ ہو گی! مہمانوں کو بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، جہانگیر کا مقبرہ، شالیمار باغ حتیٰ کہ واگہ لے جا کر ہندوستان کی سرحد تک دکھا لائے، اپنی کار کے علاوہ دو عدد ٹیکسیوں کا بوجھ بھی اٹھایا، اللہ اللہ کر کے دس دن کی مہمان داری کے بعد جب اس قافلے کو کراچی اور اسلام آباد رخصت کیا تو جاتے جاتے بیوی کی خوشی کی خاطر سالیوں اور ان کے بچوں اور ان کے شوہروں کے لیے کپڑے اور تحائف بھی نذر کیے، ساتھ ساتھ اتنی دور زحمت کرنے پر واپسی کا کرایہ بھی دیا۔

اسی عرصے میں بدقسمتی سے ہماری ترقی بھی ہو گئی اور کمپنی کی طرف سے نئی کار بھی مل گئی۔ لہٰذا بیگم کی خوشی کی خاطر چار بیڈ رومز کا ایک بڑا گھر کرایہ پر لیا گیا، اب ایک کمرے میں سالی صاحبہ، ایک میں سالے صاحب، ایک میں ہم میاں بیوی اور چوتھے کمرے میں ہماری بیٹی اور اس کی دایہ صاحبہ رہنے لگے، دایہ خاص طور پر اس لیے رکھی گئی تھی کہ بیگم صاحبہ کو بیٹی رات میں تنگ نہ کرے مگر وہ دائی سونے کی بڑی ماہر نکلی، رات بھر سوتی اور دن بھر اونگھا کرتی، رات میں بیٹی کے مسلسل رونے کی آواز پر ہماری آنکھ کھل جاتی اور ہم گھبرا کر اس کے کمرے میں جانے لگے تو بیگم صاحبہ کی للکار سنائی دیتی کہ وہ جوان عورت ہے رات میں آپ کو اس کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، میں جا رہی ہوں بلکہ امی آ چکی ہوں گی۔ بعد میں ہمیشہ یہ پتہ چلتا کہ بیٹی رو رہی تھی، سالی صاحبہ [illegible] تھیں مگر ہم کو نہ اٹھنے کا حق تھا نہ اس کے کمرے میں جانے کا اختیار!

نئے گھر کو سجانے اور جمانے میں بیگم نے اپنی تمام آرائشی صلاحیتیں صرف کر دیں، ہفتوں وہ ہر روز صبح اپنی اسپیشل اسسٹنٹ یعنی ہماری دفتر کی سیکرٹری یاسمین بھٹی کے ساتھ انارکلی اور مال روڈ کی دوکانوں میں پردے، قالین، صوفوں، بیڈز وغیرہ کا انتخاب کرتی اور آرڈر دیا کرتی رہیں اور جب گھر جم گیا تو اس کی نمائش اور اپنے ذوق کی داد اور تحسین وصول کرنے کے لیے محلے کی تمام معزز خواتین اور ہمارے کاروباری دوستوں کی بیگمات کو مدعو فرماتی رہیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر ہماری [illegible] سیکرٹری صاحبہ بھی [illegible] "ڈیوٹی" کے نام پر ہمارے گھر موجود رہتی اور بارہا ہم کو اپنے ایئر کنڈیشنڈ [illegible] اور فون ریسیو

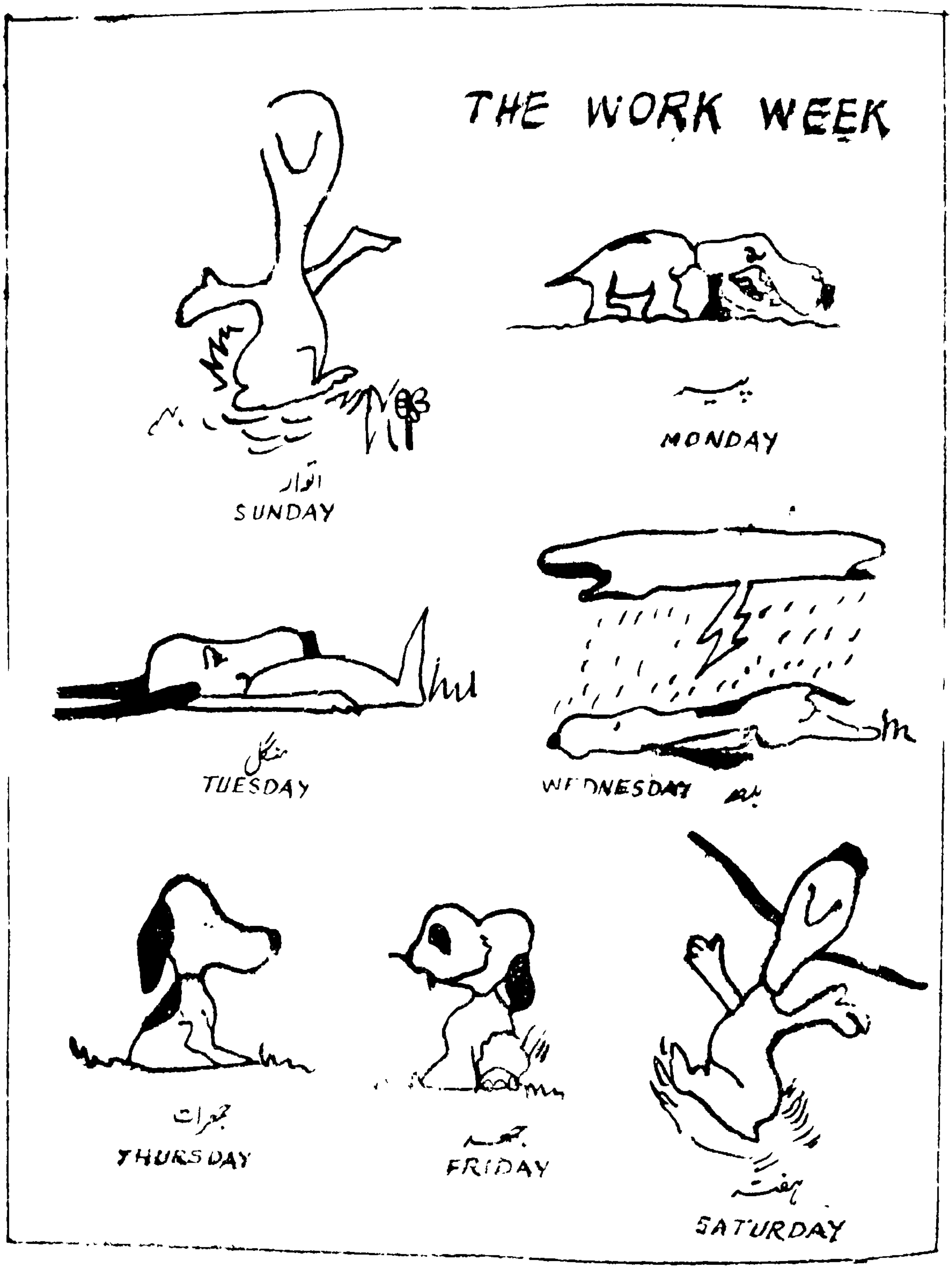
بیوی ہماری کاکوری کی علوی تھی چنانچہ سارا سال ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہندوستان جاتا پاکستان آتا رہتا، چونکہ دونوں ملکوں میں آمدورفت لاہور کے واگھا بارڈر سے ہوتی تھی لہٰذا ہر ماہ اپنے کسی نہ کسی سسرالی عزیز کی مہمان داری، لاہور کی سیر اور اس کی منزل مقصود تک روانگی کی سعادت ہمیں حاصل کرنا پڑتی تھی، شادی کے تیسرے سال تک تو ہم اس سعادت سے اس حد تک تنگ آ چکے تھے کہ شالیمار باغ سے ہمیں نفرت اور جہانگیر کے مقبرے سے وحشت ہو گئی تھی، شاہی قلعے میں ہمیں جن، بھوت نظر آنے لگے تھے، ایک دن سسرالی رشتہ داروں کو بادشاہی مسجد دکھانے لے گئے تو ہمیں اپنی بے بسی پر بے اختیار رونا آ گیا، جھٹ دو رکعت نماز نفل کی نیت باندھی اور سجدے میں جا کر خوب روئے کہ مولا یہ تین سال کب ختم ہوں گے اور اس مصیبت سے کب نجات ملے گی۔ گھر پہنچے، زائچہ نکالا، حساب کیا تو پتہ چلا کہ شادی کو اب تو تین سال پانچ ماہ ہو چکے ہیں، شکر کیا کہ وہ خطرناک مدت پوری ہو چکی ہے اور ہم ثابت قدم رہے، بیوی خوش رہی اور طلاق کی نوبت نہیں آئی۔

دوسرے دن بڑے آرام سے دیر تک سویا کیے کہ چھٹی کا دن تھا ویسے بھی دل و دماغ تین سال کے خوف طلاق سے آزاد ہوئے تھے۔ یوں آرام سے سوتا دیکھ کر بیوی صاحبہ سے برداشت نہ ہوا، کہنے لگیں کہ کب تک سوؤ گے کیا جیل سے چھوٹ کر آئے ہو کہ اب آرام اور آزادی ملی ہے، ہم نے کچھ گرجنے برسنے کی کوشش کی تو بیوی نے کڑک کر پوچھا کہ کیا کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے، ادھر سے ساس صاحبہ کی آواز آئی کہ صبح اتنی دیر تک سونا بڑی نحوست ہوتی ہے، سالے صاحب نے طعنہ دیا کہ تو شہ بھائی لگتا ہے کل دفتر میں لندن سے آئی ہوئی کاغذ کی پیٹیوں کو خود ٹرک سے اتار اتار کر گودام میں جاتے رہے ہیں، ہم نے کچھ بگڑنے کی کوشش کی تو بیگم گرج پڑی کہ اب زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اٹھیے منہ ہاتھ دھو کر میز پر آ جائیے۔ ہم لوگ تو ناشتہ کر چکے ہیں مگر بیٹی اپنے ڈیڈی کی منتظر ہے۔ ہم نے ایک سرد آہ بھری، ہتھیار پھینکے اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے میز پر پہنچ گئے۔

ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس تین سال کی ناز برداری نے سب کی عادتیں بگاڑ کر رکھ دی ہیں لہٰذا اب آہستہ آہستہ اپنا انداز بدلنا ہوگا۔ زندگی کے آئندہ اکیس سال ہم نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی کہ بیوی پر قابو پالیں مگر پہلے تین سالوں میں جس پودے نے جڑ پکڑ لی تھی وہ پھلتا اور پھولتا ہی چلا گیا، ہم ایک بیٹی کے علاوہ تین بیٹوں کے باپ بھی ہو گئے، پرائیویٹ فرم کی نوکری ترک کر کے حکومت پاکستان کے بڑے افسر بھی بن گئے مگر اپنے گھر میں بیوی کے سامنے چوہے ہی بنے رہے، ساس سالوں اور سالیوں اور تمام سسرالیوں کے نرغے میں پھنسے رہے، ہماری بہنیں، بھائی، بھاوجیں اور رشتہ دار حسرت سے ہماری جانب دیکھا کرتے اور ہماری بے بسی پر ترس کھایا کرتے۔

اللہ اللہ کر کے شادی کے چھبیسویں سال میرا تبادلہ کراچی ہوا اور میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بھائی کے گھر اترا کہ کچھ دن اُن کے گھر قیام کروں، اپنے مکان کا انتظام کروں اور منتقل ہو جاؤں، دسمبر کا مہینہ تھا اور ۲۲ دسمبر کو ہماری شادی کو پچیس برس ہوا چاہتے تھے، بھابی کو خبر ہوئی تو انھوں نے ٹھانی کہ ہم تو آپ کی شادی کی سلور جوبلی کا جشن منائیں گے اور پھر وہ دن بھی آیا کہ تمام مہمان جمع ہوئے اور مہمانوں ... جلسے میں ... خسر محترم بھی تشریف

ے جنھوں نے ہمارا زائچہ بنایا تھا کافی ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے، آئے تو میں نے ان کا استقبال کیا، بڑے تپاک سے ملے پھر شادی کی سلور جوبلی پر مبارک باد دیتے ہوئے انکشاف فرمایا کہ میاں ہم نے جو تمھارا زائچہ بنایا تھا اس میں ذرا سی غلطی ہو گئی تھی کہ ان دنوں تمھارے ایک ہم نام خلیل احمد صاحب کا بھی زائچہ بنا رہا تھا۔ غلطی سے وہ تم کو دے دیا تھا اور تمھارا ان کو۔ کئی بار سوچا کہ تمھیں مطلع کر دوں مگر موقع ہی نہ ملا!!



علیم فلکی
(جدّہ)

ٹانگ اونچی رہے

جب سے کانگریس کی حکومت ختم ہوئی ہے ہم خواہ مخواہ خوش تھے جیسے ہم نے کانگریس کو ووٹ نہ دے کر کانگریس سے بہت بڑا انتقام لے لیا ہے۔ ہم اپنے طور پر خود کو ایک کامیاب سیاست داں بھی سمجھنے لگے تھے کہ عوام کی سمجھ میں نہ آنے والی چالیں چل کر بڑی بڑی سیاسی بازیاں الٹ دیتے ہیں۔ ویسے تو ہم نے زندگی میں کبھی اپنے نام کا ووٹ استعمال نہیں کیا لیکن ایک مرتبہ ہم نے کسی اور کے نام کا ووٹ ڈالا تھا کیونکہ جب ہم بالغ نہیں ہوئے تھے حالانکہ ہمارے مسلمان لیڈروں نے بی جے پی کے جواب میں اپنی شاندار گرجدار تقریروں کے ذریعے ہم کو شعوری طور پر سیاسی بالغ بنا دیا تھا۔ ان کی تقریریں ایسی شاندار اور جذباتی ہوا کرتی تھیں کہ بچہ بچہ سیاسی طور پر بالغ ہو جاتا تھا۔ تقریروں میں اللہ اور رسول کے ذکر سے بات شروع ہوتی اور کہا جاتا ——

مسلمانو! یاد رکھو ہم بابری مسجد کی طرف اٹھنے والے ہاتھوں کو قلم کر کے رکھ دیں گے اور قدموں کو کاٹ پھینکیں گے وغیرہ وغیرہ ہر بچے کو یقین کامل ہو گیا تھا کہ ایسے دو چار لیڈروں کو منتخب کر کے ہم سارے ہندوستان پر حکومت کر لیں گے۔

دوسری مرتبہ جب ہم بحیثیت بالغ رائے دہندہ پوری شان اور وقار کے ساتھ پولنگ اسٹیشن داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ ہمارا ووٹ تو پہلے ہی ڈالا جا چکا ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی ہمیں ووٹ ڈالنے کی توفیق نہیں ہوئی لیکن اس مرتبہ تو ہم نے جس استطاعت جوش کے ساتھ ووٹ نہیں ڈالا عالم تصور میں سارا دن کانگریس ہماری خوشامد کرتی رہی لیکن ہم اسے تڑپاتے رہے۔ اس کا ایک ایک کارنامہ گنا تے رہے اور وہ رو رو کر معافیاں مانگتی رہی لیکن ہم بھی ٹاڈا کے جیلر کی طرح اس کو دھکے مارتے رہے ہمارا دل دہیجا —— اتنا بڑا انتقام ہم سوائے عالم تصور کے اور لے بھی کہاں سکتے تھے؟ الکشن کا دن گزرا جیسے جیسے

نتیجہ آنا شروع ہوئے ہمارا دل باغ باغ ہو گیا تھا پھر اسی جوشِ تصور سے ہم ہر نتیجے پر کانگریس کو حقارت بھری نظروں سے گھور گھور کر کہہ رہے تھے کہ "دیکھ لیا ہمارا انتقام ابھی تو دیکھتی جا ہمارے ایک ووٹ نہ ڈالنے کا عبرت ناک انجام"۔

جب دیوے گوڑا جی نے حکومت سنبھال لی تب ہمیں اطمینان ہوا کہ ہمارا انتقام پورا ہو گیا۔ اپنے تئیں ہم نے کانگریس کا نہ صرف کورٹ مارشل کر دیا بلکہ سزائے موت دے ڈالی لیکن جب سے نرسمہا راؤ جی کا وہ بیان پڑھا سارا اطمینان جاتا رہا جس میں انھوں نے انکشاف فرمایا تھا کہ "اپوزیشن کو حکومت کرنے کا موقعہ ہم نے خود بہت سوچ سمجھ کر دیا ہے تاکہ انھیں بھی اور عوام کو بھی پتہ چل جائے کہ حکومت سنبھالنا سب کے بس کی بات نہیں اور اس دوران ہمیں بھی پارٹی کو مستحکم کرنے کا موقعہ ملے گا"۔ گویا ہم ووٹ نہ ڈال کر بھی کانگریس کے استحکام کے کام آ گئے! بیان آگے اور بھی تھا لیکن اس سے زیادہ پڑھنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی بالکل اسی طرح جیسے اخبار میں امتحانی نتائج میں اپنا رول نمبر غائب ہو تو آگے کے نمبر دیکھنا جی نہیں چاہتا۔ ہماری سیاسی چال بالکل بے وقعت بن کر رہ گئی۔ قبل از الکشن کے تمام حالات کو حافظے میں لا کر ہم راؤ صاحب کی صداقت کی شہادت دے سکتے ہیں کہ جتنا کوئی جیتنے کے لیے بھاگ دوڑ کر سکتا ہے انھوں نے اس سے کہیں زیادہ ہارنے کے جتن کیے تاکہ ہار کر پارٹی مستحکم ہو جائے۔ جیت کر پارٹیاں مستحکم ہوتی ہیں یہ تو سنا ہے دیکھا بھی ہے۔ اس لیے ہم ان کی ہار پر اکڑ رہے تھے لیکن پارٹی کو ہرا کر مستحکم کرنے کا فارمولہ ہمارے لیے ایسا ہی انکشاف ہے جیسے کوئی استاد پہلوان اپنے شاگرد کو سارے گر بتا دیتا ہے سوائے ایک کے تاکہ وقتِ ضرورت سبق سکھائے۔ راؤ جی واقعی استاد نکلے۔ کانگریس کے استحکام کے لیے عوام نے اتنے جوش و خروش اور مکمل قومی یکجہتی کے ساتھ نہرو اور گاندھی جی کے زمانے میں بھی کوشش نہیں کی تھی جتنی راؤ جی کے لیے کی۔ تانڈا، بابری مسجد، بوفورس چارہ و شکر اسکام وغیرہ وغیرہ جیسے اسکینڈلس کو ناخواندہ سیاست عوام خواہ مخواہ ان کی بدعنوان سیاست سے تعبیر کر رہے تھے حالانکہ وہ یہ صرف عوام کی بھلائی کے لیے کر رہے تھے تاکہ اپوزیشن حکومت تشکیل دے اور عوام کو پتہ چل جائے کہ حکومت چلانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں پھر اپوزیشن اور عوام خود ہی گڑگڑا کر معافی مانگیں گے کہ "آئیے آپ ہی دوبارہ حکومت فرمائیے" اتنی دیر میں وہ پارٹی کو مستحکم کر لیں گے۔ اس کوشش میں انھوں نے پوری ایمان داری سے محنت کی اور اس بات کا مکمل خیال رکھا کہ کہیں کوئی ایسا آدمی نہ کھڑا ہو جائے جو الکشن جیت کر پارٹی کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کرے اور کسی حلقۂ انتخاب میں ایسی سہولتیں فراہم نہ کر دی جائیں جس سے عوام خوش ہو کر دوبارہ انہی کو منتخب نہ کر لیں جو کہ سراسر اس نادان غلام جیسی حرکت ثابت ہو جاتی جو مالک کی محبت میں مالک کی ناک پر بیٹھنے والی مکھی کو پتھر دے مارتا ہے۔ ایک ایک آدمی کو چن چن کر پارٹی سے الگ کیا۔ ایک ایک حلقۂ انتخاب کو اپنے سے دور کیا تاکہ اپوزیشن جیتے اور پارٹی مستحکم ہو۔

اس بیان کو پڑھنے سے قبل ہم جب بھی راؤ جی کو ٹی وی پر عدالت کے چکر کاٹتے ہوئے دیکھتے۔ اسی عالمِ تصور میں عورتوں کی طرح کوستے "دیکھا اللہ نے بتایا" لیکن اب ٹی وی پر جب ان کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے

ہم جیل جا رہے ہیں اور وہ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ ابھی تو ہم طفلِ مکتبِ سیاست ہیں پتہ نہیں اور کیا کیا سیکھنا ہے۔ اگر مکتبِ سیاست کا نصاب درسِ نظامی کی طرح ہوتا جو دو سو سال سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا تو ہم بھی اڈوانس میں پڑھ کر اندازہ لگا لیتے لیکن یہ تو ہیروئن کے کپڑوں کی طرح ہوتا ہے کب کتنی بار بدلے اور کیا کیا منظر دکھائے پتہ نہیں چلتا۔ آج راؤجی نے یہ بیان دیا ہو سکتا ہے کل کانگریس سے بچھڑ کر دوبارہ ملنے والے حضرات بھی یہی کہہ دیں کہ ہمارا پارٹی سے نکالا جانا اور دوبارہ واپس لیا جانا ہماری پارٹی کا اپنا منصوبہ تھا تاکہ پارٹی کو استحکام بخشا جائے۔ راؤجی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف عدالتی کارروائیوں کی رفتار یہ بتا رہی ہے کہ ابھی استحکام میں تاخیر ہے کوئی ایک آدھ کیس ہار بھی جائیں تو شاید استحکام کے لیے یہ ناگزیر ہونے کی وجہ سے ہاریں ورنہ ذاتی طور پر وہ اتنے خوددار ہیں کہ ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر بھی حب الوطنی اور عوام دوستی کے پیشِ نظر پارٹی کے استحکام کی خاطر ہارنا پڑے تو وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے کیونکہ کیس اتنے ہیں کہ ان کے ختم ہوتے ہوتے پارٹی مستحکم ضرور ہو جائے گی۔ ہماری نیک تمنائیں کانگریس کے ساتھ ہیں۔ ہم خوش بھی ہیں کہ کانگریس کا ساتھ نہ دے کر جسے ہم اپنی جیت اور خوشی سمجھ رہے تھے یہی کیفیت ان کو عین مطلوب تھی گویا ہم عملی طور پر کل بھی ان کے معاون تھے آج بھی ثابت ہو گئے اور شاید کل بھی رہیں! ●●

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا

(دوسری قسط)

قارئین کرام! آپ کو یاد ہوگا پہلا حصہ ختم کرتے ہوئے ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا آگے کا احوال بھی سنایا جائے گا بشرط "یار زندہ صحبت باقی"۔

تو قارئین، الحمدللہ یار زندہ ہے۔ اب سننے کے لیے بہ چشم ہوش و گوش آپ بھی تیار ہو لیں

ڈاکٹر کی دکان:

دلی والوں نے اپنے ڈاکٹروں کو اور خود ڈاکٹروں نے اپنے آپ کو طرفہ تماشا بنا رکھا ہے لیکن اس کی تفصیل ذرا بعد میں۔ پہلے ہم آپ سے ایک سوال کرتے ہیں، اگر یہاں حیدرآباد میں ہم آپ سے کہیں کہ ڈاکٹر شاہد علی خاں کی دکان "کیور ویل" جا کر اپنے **مرض کا علاج** کروالو یا ڈاکٹر وید پرکاش کی "دکان" ادے آرتھوپیڈک سنٹر میں اپنی کمر گھٹنوں کے بال بیرنگ، کن پن وغیرہ ریپیر کروالو تو کیا آپ "انگشت حیرت در دہاں" کی صورت ہمارے سراپا کو چھ فٹ اوپر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھیں گے یا نہیں ـــ؟ ضرور دیکھیں گے۔ مگر دلی میں یہ بات "ایسی حیرانی تعجب" والی نہیں ہوا کرتی۔ وہاں دواخانوں اور نرسنگ ہوموں کو "دکان" ہی بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ جیسے مٹھائی کی دکان سبزی، ترکاری اور پان کی دوکان ویسے ہی ایک "ڈاکٹر کی دکان" بھی ہوئی ...... اور اگر کوئی مریض ہریانے یا پنجاب کی طرف کا آ نکلا تو اپنی مشہور عالم "لسی" کی طرح ڈاکٹر صاحب کو بھی ذرا گاڑھا بنا دے گا "ڈاگدر"...... "ڈاگدر شاہد علی خاں"۔ "ڈاگدر وید پرکاش" الخ

یہاں کی لیڈی ڈاکٹروں کا حال کچھ اور ہی سوا ہے۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو طرفہ معجون بنا لیا ہے۔ "لیڈی ڈاکٹر" ویملا سردیپ"۔ "لیڈی ڈاکٹر شوکت خانم" الخ گویا "لیڈی ڈاکٹر" کا اسکارف (حجاب) کا دم نہ ہو تو شاید لوگوں کو "نر۔ مادہ" کی تمیز دشوار ہو جاتے......

پچھلی محفل میں ہم نے جامع مسجد اور اس کے اطراف بنی آکٹوپسی سونڈ" والی گلیوں کا آپ سے بالتفصیل تعارف کروایا تھا کہ "نجیب الطرفین" دلی تو یہی دلی ہوئی اور ہماری یتیم و بیچارے حال اردو کی "ماں مادر مہرباں"

بھی یہی ہے مگر آج اس جنم جلی کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے کہ یہاں تو کالوں انا ولا غیرے اور من چیرتنے ہستم" کا "وہ اٹھا شورِ قیامت" ہی سدا برپا رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نئی دہلی :

ایک دن ہمیں بھی مخدومی کرنل محمد خاں کی طرح خیال آیا کہ "گھر سے نکل اور ٹہلتے ٹہلتے ذرا روم چل" ہمارا روم جو ہے سو وہ "نیرو" والے روم سے دور ہے اس لیے جلنے بھننے کا کوئی خدشہ ہے نہ ڈر، اس روم کا نام ہے "نئی دہلی" ذات کی ذرا دوغلی ہے مگر حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ انگریزوں کی بنائی اور بسائی ہوئی ہے۔ "پرستارِ نرادی" اور کہا جاتا ہے اس کے بال بال موتی پرونے میں محترم خوشونت سنگھ صاحب کے والدِ بزرگوار نے بھی جو خطاب "نائٹ ہڈ" (Knight hood) سے مزین تھے، بڑا رول ادا کیا تھا۔

اور آپ تو اس راز سے واقف ہی ہیں "پرستارِ نرادیاں" ذرا دامن دل کی کشادہ قسم کی واقع ہوتی ہیں۔ "بانکی، چھیل چھبیلی، کسیلی، نشیلی اور رسیلی"۔ پانچوں ہتھیاروں سے لیس، یہ نئی دہلی ہے جو ہندوستان کے دل پر حکومت کرتی ہے۔ سنتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ ادھر کا ارادہ کرنے سے پہلے ذرا "بڑا صاحب" لوگوں کے مزاج اور موڈ کو دیکھ لینا پڑتا تھا، ان کی "دیو قامتی" سے ہر ایک ہول کھائے رہتا تھا مگر وہ تو جیسے آئے تھے ویسے ہی سمندر پھاند کر چلے گئے لیکن، ان کے جانے کے بعد اب بہت سے "بونے" اپنے پیروں میں بانس باندھ باندھ کر اپنے آپ کو "دیو قامت" ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اکثر دیکھنے میں آتا ہے اس کوشش میں "اڑا - ڑا - ڑا - دھڑام" منہ کے بل گر بھی جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ٹی وی کے اسکرین پر کچھ ایسے ہی سین دکھائی دیئے ۔ ۔ ۔ ۔

پہلے جب کبھی کسی کام سے ادھر آیا کرتے تھے تو کاموں کو نپٹانے سے پہلے مشہور زمانہ انڈیا کافی ہاؤس ضرور جاتے اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ گزار کر ایک دو تلخ کافی کے پیالے پی کر تازہ دم ہو لیا کرتے تھے اور کچھ وہاں کی دانشوری کو بھی سمیٹ لیتے، یہ کافی ہاؤس بازار ڈلوک کناٹ میں ہوا کرتا تھا، "کناٹ پلیس" کہیں جسے۔ مگر اب جو دیکھا تو وہاں ایک میدان نظر آیا جہاں ریڑھی اور خوانچے والوں نے اپنی "طرحوں طرحوں" کی دکانیں لگا رکھی ہیں پوچھا گیا بھائی! وہ کافی ہاؤس کیا ہوا ۔؟ جہاں ایک سے بڑھ کر ایک رنگ رنگ کے دانشورانِ ہند کے طائفے صبح سے لے کر شام تک براجمان رہا کرتے تھے ۔؟

ہر چہ دیدم جلوہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ازعشق و گبر و نصارا و یہود را

کہا جاتا ہے قلو پطرہ اول کی ناک اگر ایک ملی میٹر بھی اور لمبی ہوتی تو آج اس عالم کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور ملکہ قلو پطرہ ثانی الزبتھ ٹیلر کی ناک بھی ایک دو ملی میٹر اور لمبی ہوتی تو رچرڈ برٹن کے بعد راک ہڈسن، جان تین - پُل برینر کے علاوہ کلارک گیبل بھی میرلن منرو کو ٹھینگا دکھا کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اپنی باری کے انتظار میں کیو میں کھڑا ہو جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی طرح کافی کی چسکیوں کے درمیان ادھر کی میز پر "دانش وروں" میں گھنٹوں اس بات پر بحث اور مناقشہ ہوتا رہتا کہ اگر مدھوبالا "انارکلی" کے رخسار کا مسّا بجائے اس رخسار کے اس پر ہوتا تو مغلِ اعظم پرتھوی راج کا بیٹا شہزادہ سلیم دلیپ کمار اس ایک مسے کے عوض سمرقند و بخارا کی دونوں ولایتیں اس پر قربان

کردیتا، دوسرا دانش در کہتا، ہرگز نہیں بلکہ اس سے پہلے خود مغلِ اعظم بجائے انارکلی کے شہزادہ دلیپ کمار کو دیوار میں چنوا کر مدھوبالا انارکلی کو اپنی حرم کی زینت بنا کر "تخلیے" کا حکم دے ڈالتا...... ناممکن، اگر یوں ہوتا "چیف میکنیکل انجینئر"، ڈائرکٹر کے آصف چار پانچ سو میل لمبی سرنگ کھدوا کر ایک کل یعنی ایکسلیٹر (escalator) ایجاد کر کے شہزادے کو اندر ہی اندر "تڑی پار" کر کے آزاد کر دیتا اور وہ باہر آکر پھر ایک بغاوت "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" گاتے ہوئے بپا کر دیتا........ کے آصف" فلم ڈائرکٹر تھا یا سائنس داں جو "کل ول" ایجاد کرتا؟ کیوں نہیں ایک "عظیم ڈائرکٹر" سے کچھ بھی بعید نہیں، جب وہ احمد نگر سے آگرے تک "تار روڈ" بچھا سکتا ہے کہ شہزادے کا ہاتھی آرام سے منزلیں طے کرتا ہوا آگرہ پہنچ سکے اور سڑک کے ساتھ پل پل کی تازہ خبریں بھیجنے کے لیے ٹیلیگرافک پول بھی نصب کروا سکتا ہے تو ایک "اسکیلیٹر" کا تیار کر لینا اس کے لیے کیا مشکل تھا...... ؟ یہ تو تو میں میں" یہاں تک طول کھینچ لیتی کہ دو چار پیالے کافی کے حلق سے نیچے اتر جاتے اور دن بھر ہو جاتا اور یہ بے چارہ مسا کسی رخسار پہ جمنے نہ پاتا آخر تھک ہار کر یہ طے پاتا کہ چل کر دلیپ کمار ہی سے اس کی ماہرانہ "رائے لینی چاہیے ——

اور ادھر کی میز پہ دنیا بھر کی سیاست پر حکم لگائے جاتے کہ اسٹالن یا خرشچوف کے اس الٹی میٹم کا جواب ٹرومین یا آئزن ہاور (یا جو کوئی بھی اس موقع پر ان کے لیے حاضر ہوتا) یوں دے گا اور وہ یوں جواب نہ دیتا تو دوسرے دن کافی کا ایک لمبا گھونٹ "کھینچ کر فرماتے،" طفلِ مکتب "ہے، اسے سیاست کرنی نہیں آتی....

فرمایا گیا وہ یادگار کافی ہاؤس اپنے تمام اثاثے جات و مشمولاتِ "انٹلکچوالز" (intellectuals) زمین پر سے اس طرح غائب کر دیا گیا جیسے کسی کے سر سے سینگ......"

حریفاں کہ بادہا خوردند و رفتند تہی خمخانہا کردند و رفتند

اور اس کو غائب کر دینے کے بعد زمین کے اندر "پالیکا بازار" کی ولادت عمل میں لائی گئی۔ سنا گیا کہ اس کی رنگا رنگیوں اور بوقلمونیوں کی نظیر سارے ایشیا میں دوسری نہیں...... دل نے فرمایا چلو، جب روم آ ہی گئے ہیں تو ذرا اس کا بھی (آگا پیچھا بلکہ نیچا) کی دید کر لی جائے۔ ہم کہ تابع امام ہیں، فوراً آمادہ ہو گئے اور نیچے زمین کے سینے میں اترتی ہوئی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جب فرش پر قدم ٹکے تو سر اٹھا کر دیکھا، رنگ و روشنی کا ایک جھماکا ہوا پھر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ تو کہے بیت خانہ ءِ آذر کھلا" اول تو ٹھنڈی ٹھنڈی سیلی سیلی روشنی اور طرب ناک فضا نے مبہوت کیا یعنی "بادہ گلرنگ کا ساغر کھلا" دوئم جب ہوش ذرا ٹھکانے آئے تو ادھر دیکھا، جنت نگاہ دکانوں کی قطار۔ ادھر دیکھا خوش جمال خریداروں کی بھرمار۔ ادھر کے اسٹال میں شو کیس سنبھالی ہوئی پری جمال سیلس گرل اور اس کا وہ اشارہ کہ ہائے ہائے۔ ادھر پرفیوم اور کاسمیٹکس کے اسٹال پر کہ "لوگ جانیں طبلہ ءِ عنبر کھلا" فردوس گوش چوڑیوں کی جھنکار کہ وائے وائے "اسی" نے کھٹ" نے اندر سے مچل کر پکارا،"اے ترا لطف زندگی افزا" یہاں چندیاں لپیٹے ہوئے "ہپیّوں اور ہپنوں" کی ٹولیاں وہاں" صرف نظارے کو نکلا ہوں، خریدار نہیں ہوں" کے ہاتھوں میں ہاتھ، بازو میں بازو پھنسائے ہوئے ان کی ہم جولیاں........

گھنٹے بھر تک تو "علامہ" کے مشورے پر عمل پیرا ہو کر ہم نے اپنے "نٹ کھٹ" کو تنہا چھوڑ دیا تھا

اور اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر جو تماشے اس نے دکھائے ان کو ہم ٹکر ٹکر دیکھتے رہے پھر خوش کام ہوتے
اور چل نکلے۔ یاد آیا "اگر فردوس" برروئے زمین است، ہمیں ست و ہمیں ست و ہمیں ست۔ اس سینٹرل جنت
سے نکل کر اوپر پھر اسی دنیا میں آگئے جہاں ایک روز "پٹکے" گئے تھے ....
پروگرام میں محبوب الرحمٰن صاحب فاروقی ایڈیٹر ماہنامہ "آج کل" سے ملاقات۔ چنانچہ پٹیالہ ہاؤس پہنچے اور
سیڑھیاں طے کر کے غلام گردش میں سے ہوتے ہوئے جہاں دلوار دلوار "پینٹنگس" ٹنگی
ہوئی ہیں اور شوکیسوں میں کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھتے بھالتے فاروقی صاحب کے دفتر میں داخل ہوئے
بڑے تپاک سے ملے۔ دیکھا گیسوئے اردو کے پیچ و خم سنوارنے میں مصروف ہیں۔ اردو ہی آپ کا اوڑھنا
اور اردو ہی بچھونا نظر آیا۔ چائے بھی آگئی۔ اس بیچ دیویندر اسّر صاحب لکھنؤ کے عابد سہیل صاحب اور دیگر شعراء
کی بھی آمد و رفت رہی اور تعارف بھی حاصل ہوتا رہا۔ فاروقی صاحب گوناگوں خوبیوں کے حامل ہیں، اردو
بے چاری کا زیادہ ہی خیال رکھتے ہیں اور اسی کے غم میں گھل گھل کر دبلے بھی ہوئے جا رہے ہیں اور اسی کی
خاطر "لاکھوں کے بول" بھی سنتے رہتے ہیں۔ جن "بے نظیر" ادیبوں اور شاعروں کے "شاہکار" آج کل میں نہیں
چھپتے وہ نوحہ داریوں پر آمادہ ہو جاتے ہیں کوئی کوئی تو عدالت اور پارلیمنٹ تک کھینچائی کرنے کی دھمکی بھی دے دیتے
ہیں۔ دور دور سے تیر بھی چلائے جاتے ہیں جن کے استقبال کے لیے یہ ہمیشہ اپنا کشادہ سینہ کھلا رکھتے ہیں۔
ہم نے دیکھا دو چار زہر میں بجھے ہوئے تیر ہماری خاطر میں بھی چلائے گئے تھے مگر اوچھے سینے کو ذرا چھیلتے ہوئے
ہوا میں نکل گئے۔ بڑی مضبوط چھاتی ہے۔ طبیعت کے مرنجان مرنج، خوش اطوار، شیریں گفتار، نرم دم گفتگو گرم
دم کار بائے اردو۔ خلیق و ملنسار اوصاف حمیدہ۔ خصائل شریفہ اور ذوق خورد و نوش نہایت اعلیٰ و پاکیزہ
سگریٹ بھی پیتے ہیں۔ ہم نے اجازت طلب کی فرمایا "وہ تو لنچ کے بعد ہی ملے گی۔" کھانے کے بعد اصرار سے ہاتھ دھلوائے
پٹیالہ ہاؤس کے گیٹ کے نکڑ پر چل کے اسٹال سے چائے پلوائی، رخصت لی اور لوٹ کر خوشگوار یادوں کے ساتھ
بنے ڈیرے پہنچے........

ایک روز ہمارے ایک دوست نے کھانے پر بلایا وہ حویلی حکیم احسن اللہ خاں، فراشخانے میں رہتے ہیں۔
ان جانے کے لیے لال کنواں پہنچے جہاں قدیم ہمدرد دواخانے سے متصل بہادر شاہ ظفر کی چہیتی ملکہ زینت محل کی
حویلی بھی واقع ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے فراشخانے کی گلی میں داخل ہوئے۔ ایک دکان کے آگے بھیڑ نظر آئی،
راستہ مسدود ہو گیا تھا ہم بھی بلا ارادہ رک کر تماشا دیکھنے لگے۔ دکان دار اور خریدار کے درمیان کسی بات پر گرما گرم
مناقشہ چل رہا تھا، معلوم ہوا خریدار نے کوئی چیز خریدنے سے پہلے اسے چکھ کر دیکھا اور ناپسند کیا۔ دکاندار طیش
میں آگیا۔ اور گاہک پر چوٹ چلی "مال ہضم کر کے واپس جا رہے ہو۔ ؟ ہم خوب جانتے ہیں جو اصلی خریدار ہوتا ہے وہ
چکھنے "(نمونہ) سے اپنا پیٹ نہیں بھرا کرتا۔ آپ جیسے خریدنے والے پہلے "منسپلٹی" (Municipality) کے نلکے پر
اپنا منہ دھو آئیں پھر خریدنا...." بھیڑ ہنسنے لگی۔ گاہک بھی شرمندہ ہو کر بھنّا گیا۔ ملاوٹ کا مال بیچ کر لوگوں کو ٹھگتے
ہو۔ میں دھوکے میں آنے والا نہیں کہ خود ہی اپنی اصلیت پر آ کے ہتھے سے اکھڑ کر بولا میاں جی بس چپ ہی گھر تشریف لے جائیں ورنہ لا
قسم کھائے دے رہا ہوں گھر جانے پر جوڑا سوتر مال کے بھی چھپائی نہ پاویں گی" ازائی ہاتے ہیں" کو تماشے تک (تصدق) کی سرخی ملائی بڑھا دے گی۔

ماما کی ضرورت

صفدر حسین (ریاض)

ہم اسے شامتِ اعمال ہی سمجھیں گے کہ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کوئی اچھی ماما نہ ملی تو ہم نے اخبار میں "ضرورتِ ماما" کا اشتہار دیا۔ انٹرویو کے لیے مختلف عمر کی چار مامائیں آئیں لیکن ایک ماما اس بات پر مصر تھی کہ پہلے وہ ہمارا انٹرویو لے گی۔ پہلے تو اس ماما نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ ہم نجیب الطرفین کے ساتھ ساتھ خادم الزوجین بھی ہیں؟ پھر اس نے ہمارے عادات و اطوار اور صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ بلڈ پریشر، خون میں شکر اور کولسٹرول کی مقدار، سگریٹ کا برانڈ، دھواں چھوڑتے ہیں یا نہیں چھوڑتے؟ گھر پہ بیویوں کو بور کرنے کے بجائے کلب کیوں نہیں جاتے تاکہ تاش سے آمدنی بڑھائی جا سکے۔ سینما بینی کا شوق ہے، فلم اکیلے دیکھتے ہیں یا دونوں بیویوں کے ساتھ؟ پہلی شادی عام ڈاکٹر سے کیوں کی؟ ڈنٹری ڈاکٹر سے کیوں نہیں کی؟ غرض کہ امیدوارہ نے دریافت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی —— اب ہماری باری تھی۔ ویسے عورت سے عمر اور مرد سے اس کی آمدنی نہیں پوچھنا چاہیے۔ اس سے ہر دو کا سارا بھرم جاتا رہتا ہے۔ امیدوارہ نے پہلی شرط یہ رکھی کہ پاسپورٹ میں تو محترمہ کا نام ممتاز بیگم ہے لیکن ہم انھیں "ممتاز محل" پکاریں گے کیونکہ وہ کسی جنم میں ممتاز محل تھیں (دروغ برگردنِ دروغ گو!)

ممتاز محل یہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ "The way to a mans heart is through his stomach"

وہ پکوان کے بارے میں کہنے لگیں کہ میں تو الٹے توے کی چپاتی یا پنگ کی طرح پتلی بناتی ہوں۔ یہ سن کر ہماری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی تو ہم نے پوچھا کہ پھر تو آپ جو پاپڑ بناتی ہیں وہ تو نظر ہی نہیں آتے ہوں گے؟ مذاق کو بھانپ کر حاضر جواب ممتاز محل نے کہا کہ آپ انھیں صرف تصوّر میں کھا سکتے ہیں! پھر کہنے لگیں کہ میں چکن (اللہ کرے عمر رسیدہ) میں مرغ اور دہی میں مچھلی اتنی مزیدار بناتی ہوں کہ آپ انگلیاں چباتے (چاٹتے) رہ جائیں گے یا یوں سمجھیے کہ اگر ڈاکٹروں کے ہاتھ میں سلطانیِ جہاں کا مزہ ہے۔ اچھا کہنے لگیں کہ BED TEA کب ملے گی؟ میں ناشتے میں کارن فلیکس، بکری کا دودھ اور ابلے ہوئے انڈے بغیر زردی کے کھاتی ہوں۔ سہ پہر میں چائے کے ساتھ اسنیکس، کھانے کی عادی ہوں۔ اگر رات کا کھانا مرغن ہو تو کبھی کبھار ایک آدھ فارن سگریٹ بھی لیتی ہوں۔ لوگ پانی میں چونا گھول کھاتے ہیں۔ یہ خیالات میں یکسوئی کی خاطر صرف "گٹکا" استعمال کرتی ہوں۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر میں نے کھانوں میں کمی کردی ہے۔ صرف سفید گوشت جیسے مرغ، شتر مرغ مچھلی مگر مچھ استعمال کرتی ہوں۔ بدن کو چھریرا رکھنے کے لیے سبزیاں زیادہ اور چاول کم استعمال کرتی ہوں۔ اب ممتاز محل کی پسند کی ترجیحات کی ایک لمبی فہرست ہے وہ کہتی ہیں کہ لتا منگیشکر میری محبوب گلوکارہ ہے۔ باورچی خانہ میں لوریت سننے کے لیے ایک ٹرانسسٹر ضروری ہے۔ مجھے پاکستانی ڈرامے بہت پسند ہیں۔ رنگین ٹی وی مع ڈش اینٹنا میری خواب گاہ میں ہر قیمت ہونا چاہیے۔ استری میرے لیے عذاب جاں ہے۔ براہ کرم اس سے مجھے دور رکھا جائے۔ جھوٹے برتن مجھ سے دھوئے نہیں جاتے لہٰذا گھر میں Dish washer ہونا ضروری ہے۔ باورچی جلنے میں دھوئیں سے میرا دم گھٹتا ہے اس لیے Cooking range کے ساتھ Exhaust ضرور ہونا چاہیے ورنہ دال بدمزہ ہو جائے گی! ہفتہ میں ایک بار اتوار کو میری سہیلیاں رمی کھیلنے آیا کریں گی۔ اس ملاقات پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے —— ہم دم بخود یہ سب بڑے صبر سے سنتے رہے۔ بالآخر جب انٹرویو ختم ہوا تو میں نے غیر ڈاکٹر بیگم سے کہا کہ ممتاز محل کی پسند اور ناپسند آپ کی پسند ناپسند بنتی ہے تو بیگم نے سنی ان سنی کردی اور بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے کہا کہ ہمارے دارالامن میں کسی اور عورت کے داخلے کو روکنے کے لیے جہاں دیدہ، دیدہ زیب ممتاز محل کی بجائے گھر کا سارا پکوان میں خود بنایا کروں گی لیکن دگنی تنخواہ پر! بھوکا شوہر کیا جا سکتا ہے تو وقت پر دال رکھا تا! لہٰذا ہم نے اس خیال سے حامی بھر لی کہ اگر گھر کی دلوا ہی گھر میں گرے

مُجتبیٰ حُسین

اردو اساتذہ اور اردو کا مستقبل

انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" میں کچھ عرصہ پہلے انگریزی کے مشہور صحافی رکشت پوری کا ایک کالم شائع ہوا تھا جس میں اردو اکیڈیمی کے ایک حالیہ سمینار کے حوالہ سے اردو کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں نہایت اطمینان بخش اور دل خوش کن تصویر پیش کی گئی تھی۔ اتفاق سے ہم نے بھی یہ کالم پڑھا تھا لیکن اس کے بارے میں کسی اظہار خیال کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی تھی کہ رکشت پوری انگریزی کے صحافی ہیں۔ انگریزی جیسی خوشحال زبان میں اگر کوئی کسی اور زبان کے بارے میں کچھ لکھے گا تو وہ اچھا ہی لکھے گا۔ شخصی خوشحالی اور مرفع الحال زندگی کو دیکھنے کا زاویہ ہی بدل دیتی ہے۔ ہماری جیب میں اگر کبھی دو تین سو روپے فالتو موجود ہوں تو خدا زندگی بہت حسین نظر آنے لگتی ہے۔ جھگیاں اور جھونپڑیاں بھی قدرت کا ایک انمول تحفہ معلوم ہوتی ہیں۔ غریب آدمی تو ہمیں دکھائی دیتا ہے لیکن غربت نہیں دکھائی دیتی۔ ایسا زاویہ نگاہ وقتی خوشحالی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ پھر رکشت پوری تو انگریزی کے صحافی ہیں۔ اردو میں تھوڑی بہت جان پہچان رکھتے ہیں لیکن انہیں کیا پتہ کہ ان دنوں اردو اس ملک میں کن حالات سے گذر رہی ہے۔ دس بارہ برس پہلے اردو کے مشہور شاعر اور نقاد ساقی فاروقی جو لندن میں رہتے ہیں اپنی جرمن بیوی کے ساتھ پہلی بار ہندوستان آئے تھے۔ بیگم ساقی فاروقی نے ساقی کے ساتھ دہلی کی چند اردو محفلوں میں شرکت کی اور جب دیکھا کہ لوگ ساقی کے کلام پر دوہرے ہو ہو کر داد دے رہے ہیں اور ہلکان ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں تو بیگم ساقی فاروقی نے ہم سے انگریزی میں جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ "مجھے پتہ نہیں تھا کہ ساقی اردو کے اتنے بڑے شاعر ہیں۔ میں نہ جانے کتنے ہی برسوں سے ساقی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں اردو کے اتنے بڑے شاعر کی رفیقہ حیات ہوں۔ اگر میں ان کے ساتھ ہندوستان نہ آتی تو اندھیرے میں ہی رہتی"۔ اس پر ہم نے بیگم ساقی فاروقی سے کہا تھا "آپ چونکہ اردو نہیں جانتیں اس لیے آپ اپنے شوہر کے بارے میں ایسی رائے قائم کر لیتی ہوں تو یہ بات حق بجانب ہے۔ اردو نہ جاننے کے بھی تو فائدے ہیں" اردو کی محفل میں لوگ جس طرح سماں باندھ دیتے ہیں اس کے باعث وہ لوگ جو اردو نہیں جانتے اکثر غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ماحول بنانا یا سماں باندھنا اردو تہذیب کا خاصہ رہا ہے۔ ہم نے مشاعروں میں بعض شاعروں کے ایسے کلام پر سامعین کو بے پناہ داد دیتے ہوئے دیکھا ہے جس پر شاعر کو اصولاً سزا ملنی چاہیے تھی۔ سزا اور داد کا فرق جب مٹ جاتا ہے تو زبانوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ رکشت پوری نے اردو کی موجودہ صورت حال کے بارے میں جو دلخوش کن تحریر لکھی ہے وہ اصل میں ایسی ہی کسی محفل میں شرکت کے بعد لکھی ہے۔

اس کے جواب میں اردو کے ایک بہی خواہ ایل اے عباسی کا ایک تفصیلی مراسلہ "اردو کا مستقبل" کے عنوان سے ہندوستان ٹائمز میں

ہی شائع ہوا ہے جس میں مراسلہ نگار نے رکشت پوری کے مندرجہ بالا کالم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایسی گمراہ کن تحریریں اردو والے خواہ مخواہ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ ساری گڑبڑ اردو کے ان معدودے چند پروفیسروں اور اساتذہ کی پیدا کردہ ہے جو دہلی، علی گڑھ، بھوپال، لکھنؤ اور حیدرآباد میں بیٹھ کر اردو کے بارے میں جان بوجھ کر ایسی خوش فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اور خوش فہمیوں کے پھیلانے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اردو کے یہ پروفیسر اور اساتذہ اپنے زندہ رہنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں اصل میں اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہوتا ہے۔ اردو اساتذہ کا یہ ٹولہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان اداروں اور انجمنوں پر قابض ہو جاتا ہے جنھیں مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے امداد ملتی ہے۔ پھر یہ آپس میں مل کر اردو کے لیے ملنے والی اس امداد کو بانٹ لیتے ہیں ان کے سامنے اردو کی بقاء کا نہیں بلکہ اپنی بقاء کا مسئلہ ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جلتے گھر کے بانس کو بھی لوگ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اردو کے جلتے ہوئے گھر کے ساتھ بھی یہ اساتذہ یہی کر رہے ہیں۔ مراسلہ نگار نے اردو کے بارے میں دلخوش کن تحریریں لکھنے والوں سے کہا ہے کہ وہ اردو کی محفلوں میں اساتذہ کی جانب سے کی جانے والی چکنی چپڑی باتوں پر بالکل نہ جائیں بلکہ ایک نظر اردو کی کسی بھی محفل میں موجود شرکاء کے سروں کے اندر نہیں بلکہ سروں کے اوپر ڈال لیں تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ اردو کی صورت حال کتنی سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ان میں سے بیشتر شرکاء کے سروں پر یا تو بال نہیں ہوں گے اور اگر ہوں گے تو وہ سفید ہوں گے۔ اردو کی کسی بھی محفل میں اب جتنے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں ان کی عمریں پچپن اور ساٹھ برس سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اردو کی محفلوں میں نئی نسل آ ہی نہیں رہی ہے تو کالے بالوں والے سامع کہاں سے آئیں گے اردو کی موجودہ سنگین صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ ثبوت کافی ہے۔ مراسلہ نگار کی اس رائے سے ہمیں پوری طرح اتفاق نہیں ہے کیوں کہ دہلی کی ادبی محفلوں میں کبھی کبھار کوئی کالے بالوں والا سامع بھی شریک ہو جاتا ہے۔ ہماری مراد ہے ڈاکٹر خلیق انجم سے۔ جو اپنے بالوں میں بڑے اہتمام سے خضاب لگاتے ہیں۔ ہم انھیں جب بھی دیکھتے ہیں تو اردو کا مستقبل اتنا تاریک نظر نہیں آتا اگر بالوں کی سیاہی کا مطلب اردو کے روشن مستقبل سے ہے تو اردو والوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اردو محفلوں میں جانے سے پہلے اپنے بالوں میں خضاب ضرور لگایا کریں کیوں کہ بالوں میں خضاب لگانا بھی اردو کے مستقبل کے بارے میں دلخوش کن تحریریں لکھنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ اردو کے مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی اور پر امید تحریریں لکھتے ہیں وہ بھی تو آخر اپنی تحریروں میں خضاب ہی لگاتے ہیں۔ بادش بخیر! اردو کے تاریک مستقبل اور روشن ماضی کے بارے میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ پندرہ برس پہلے بنگلور میں ایک سمینار تھا جس میں پروفیسر ثریا حسین جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو تھیں اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، جو ان دنوں ترقی اردو بورڈ کی ڈائرکٹر تھیں بھی موجود تھیں پروفیسر ثریا حسین کا رنگ نہایت سرخ و سفید ہے اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا رنگ کسی قدر سیاہی مائل ہے۔ سمینار میں دونوں برابر برابر بیٹھی ہوئی تھیں ایک مقرر نے سمینار میں تقریر کرتے ہوئے کہا "حضرات! اردو کا ماضی اگرچہ نہایت روشن تابناک تھا لیکن اب اس کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے"۔ اس پر ہم نے دونوں معزز خواتین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور اتفاق سے اس وقت اردو کا روشن ماضی اور تاریک مستقبل دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں"۔ بہرحال یہ ایک لطیفہ معترضہ تھا جو ہمیں اچانک یاد آگیا۔ غرض مراسلہ نگار نے اپنے مراسلہ میں اور بھی بہت سی باتیں کہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے بھی دو ایک برس پہلے اس کالم میں لکھا تھا کہ اردو کی محفلوں میں اب زیادہ تر بوڑھے ہی شرکت کر رہے ہیں۔ سوچا تھا کہ ہمارے لکھنے کے بعد کچھ نوجوان بھی اردو کی محفلوں میں آنے لگیں گے در اتفاق سے چند روز بعد ہی ہمیں اردو کی ایک محفل میں بارہ برس کا ایک لڑکا نظر آگیا۔ اردو سے اس کی محبت کو دیکھ کر ہم نہال ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے اسے اپنے پاس بلایا اس کی ہمت افزائی کی۔ اتا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اردو کے ایک پروفیسر جو ہمارے دوست،

بھی ہیں" کا نواسا ہے۔ جب ہم نے اپنے پروفیسر دوست سے ان کے نواسے کی اردو سے محبت کی تعریف کی تو بولے "نعوذ باللہ بھیا! اسے اردو سے کیا لینا دینا ہے۔ مجھے اصل میں اس محفل کے بعد ایک تقریب میں جانا ہے اس لیے اسے ساتھ لے آیا ہوں بڑی مشکل سے آیا ہے۔ پورے دس روپے کے چاکلیٹ دلائے ہیں تب کہیں جاکر اردو کی اس محفل میں آنے کے لیے راضی ہوا ہے۔ آپ بھی بڑے معصوم آدمی ہیں، آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے نواسے کو اردو کے چکر میں مبتلا کروں گا۔ یہ تو انگلش میڈیم کے اسکول میں پڑھتا ہے۔ اردو کے حروف تہجی سے بھی واقف نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے اتنا نا عاقبت اندیش سمجھتے ہیں کہ میں اپنے نواسے کو اردو پڑھاؤں" اس جواب کے بعد ہم نے اردو محفلوں میں نوجوانوں کو تلاش کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر کوئی نوجوان مل بھی جاتا ہے تو اس سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ وہ کتنے روپیوں کے چاکلیٹ لے کر اس محفل میں آیا ہے۔ مراسلہ نگار نے اردو اساتذہ کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہمیں بھی صد فی صد اتفاق ہے لیکن ہم اس بارے میں کھل کر اس لیے کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ اردو کے بیشتر نقاد ہی اساتذہ ہوتے ہیں۔ بھیا! ہمیں بھی تو ادب میں زندہ رہنا ہے (بھلے ہی زبان مر جائے) اردو کے سوائے کسی اور زبان میں یہ نہیں دیکھا کہ جو کوئی بھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں ایم اے کرکے کسی کالج میں اردو کا استاد لگ جاتا ہے تو فوراً ناقد بھی بن جاتا ہے اور اردو ادب کے بارے میں غلط زبان لکھ کر غلط فیصلے صادر کرنے لگ جاتا ہے۔ آپ کو اردو کا کوئی خالص استاذ نہیں ملے گا جو اردو کی تعلیم سے مطلب رکھتا ہو۔ جو بھی ملے گا ناقد ہی ملے گا۔ اس کی دکان بھی ایسی ہی لنگڑی لولی تنقیدی تحریروں کے ذریعہ چلتی ہے۔ ہمارے پاس اردو کے بعض اساتذہ کے ایسے کئی خطوط ہیں جن میں ان کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں۔ اردو کے ان اساتذہ کی خواہش یہ نہیں ہوتی کہ اردو زبان کو عام کیا جائے۔ ان کی ساری توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ اردو کے نام پر امداد کہاں سے حاصل کی جائے کونسی کمیٹی کی رکنیت پر قبضہ کیا جائے۔ اور جوڑ توڑ کے ذریعہ "بندر بانٹ" کو کس طرح فروغ دیا جائے ہم نے تو اب اردو کے مستقبل کے تعلق سے ان اساتذہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں تو وہ نادار اور مفلس کارکن اچھے لگنے لگے ہیں جو رضاکارانہ طور پر اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ اردو کا مستقبل روشن ہوگا تو ایسے ہی بے لوث لوگوں کے ذریعہ ہوگا۔ اردو کے بے لوث اساتذہ کو تو اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر لفظوں کے طوطا مینا بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ □□

ڈاکٹر محمد اسداللہ
(ناگپور)

بانو سرتاج
ایک ادھورا خاکہ

اردو کی معروف افسانہ نگار بانو سرتاج کا یہ خاکہ اس خاکسار کے لیے ایک امتحانی پرچہ سے کم نہیں تھا کیونکہ چندر پور میں ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی ایک مجلس میں اسے پڑھنا تھا۔ ڈاکٹر منشا صاحب نے موصوفہ پر ایک جھٹ پٹ خاکہ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے جان کی امان پاتے بغیر ہی انکار کردیا کیونکہ میں نے ابھی تک موصوفہ کو دیکھا تک نہیں۔ ان پر خاکہ کیا خاک لکھوں۔

اس پر منشا صاحب نے فرمایا "یہ تو ادبی بات ہے"

اس جملہ پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کسی کے بارے میں جانے بغیر کچھ لکھ دینا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ایکسر صاحب نے فرمایا،

"کم از کم ایک آدھ ملاقات تو ضروری ہے۔" اس پر یاد آیا کہ اگر آدمی ملاقات سے کام چل سکتا ہے تو خط سے بھی آدمی کا اتا پتا لگ سکتا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی کتاب کسی کو بھجوائیں تو اس کی رسید نہیں آتی۔ ایک آدھ سال یاد دہانی کروانے پر جواب آتا ہے "ہاں بھیج ملی گئی تھی اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" مگر جب میں نے اپنی پہلی کتاب - جو مراٹھی تراجم کا مجموعہ تھی بانو سرتاج کو بھجوائی تو ادھر کتاب پہنچی ادھر جواب حاضر جو نہ صرف ترو تازہ بلکہ پلاٹ کیک کی طرح گرم بھی تھا۔ مضمون کیا تھا تین گن بھر کر کئی سوالات داغ دیئے تھے — اس کتاب میں شامل فلاں ڈرامہ کے مصنف سے آپ نے ترجمہ کی اجازت کہاں لی تھی؟ کیوں لی تھی؟ اور کب لی تھی۔ تاریخ کے حوالہ سے لکھیے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ان کے میاں [illegible] سپرنٹنڈنٹ ہیں یعنی سمان بھیے کوتوال والا معاملہ ہے۔ لہذا فوراً اس مراٹھی ڈرامہ نگار کے اجازت نامہ پر درج تاریخ لکھ بھیجی ورنہ مجھ پر مقدمہ دائر کر کے مجھے تاریخوں کے چکر میں نہ پھنسا دیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مراٹھی ڈرامہ نگار [illegible] نے بھی اسی ڈرامہ کے ترجمہ کی اجازت دی تھی۔

مجھے یاد ہے اس خط میں بانو سرتاج صاحبہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں آپ کے اس ترجمہ سے متفق نہیں

ہوں اور میرا جواب جو شاید لاجواب تھا کہ ——— محترمہ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی آپ میرے ترجمہ سے متفق نہیں ہیں کیونکہ میں خود بھی متفق نہیں ہوں اور آپ جانتی ہیں آج کل ماں باپ اور اولادوں میں اتفاق نہیں رہا پھر بے چارہ مترجم تو کسی طرح سوتیلے باپ سے کم نہیں ہوتا۔"

افسانہ نگار بانو سرتاج سے اس آدھی ملاقات سے پہلے ہماری ایک یا ڈیڑھ ملاقات بھی رہی اور وہ ان کی تحریروں کے توسط سے۔ ہمارے ہاں خواتین کے پردے میں رہنے اور انھیں پردے کی اوٹ سے دیکھنے کی روایت اردو شاعری میں بہت پرانی ہے۔ بانو صاحبہ کو ہم نے ان کے افسانوں، مزاحیہ مضامین، ڈراموں اور کالموں کی چلمن سے دیکھا۔ ہم بھی اس زمانے میں ناگپور ٹائمز میں لکھا کرتے تھے اور وہ بھی۔ ان کی انگریزی تحریروں پر بھی ان کی شخصیت، ذہنیت، نسوانیت اور افسانویت کی گہری چھاپ تھی۔ ان کے لیٹر ہیڈ پر چھپی ان کی قطار اندر قطار ڈگریاں ——— ہندی اردو تاریخ میں ایم اے، ایم ایڈ، ڈپلوما ان گائیڈنس، ڈپلوما ان رورل سرویسز، بھاشا سناتک مراٹھی اور پی ایچ ڈی وغیرہ اتنی ڈگریاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی پانچوں انگلیوں میں رنگ برنگے نگینوں والی انگوٹھیاں سجائے بیٹھی ہیں۔

مزید یہ کہ ایک کالج آف ایجوکیشن میں استادوں کی استانی ہونا، ڈرامہ نگاری اور ان ڈراموں میں بر سر اسٹیج اداکاری کے جوہر، دستکاری میں ید طولیٰ، ہندوستان بھر میں چھپنے والے ان کے افسانے، ان افسانوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ، دوسروں کے افسانے وہ اردو میں ترجمہ کریں یہ جدا، ان کا اپنا گھر، سماجی انجمنوں کا بار ——— پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ ہماری زبان میں استعمال ہونے والی گوناگوں مصروفیات والی مرنجاں مرنج شخصیت" کی ترکیب بانو سرتاج ہی کے لیے گھڑی گئی تھی۔

ترقی کی دوڑ میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی باتیں ہم نے سنی تھیں۔ بانو سرتاج صاحبہ کے Bio-data میں ایک ایسی عورت کو چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ نہ صرف ان کے کاموں میں مردوں کی طرح دنیا جیت لینے اور چھا جانے کا انداز نمایاں ہے بلکہ ان کے نام میں بھی یہ مردانہ تیور پوری بے باکی کے ساتھ موجود ہیں گویا وہ اپنی سرگرمیوں سے یہ ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں کہ وہ زمانہ لد گیا جب بیگم اور بانو مرد کے پیروں کی جوتی ہوا کرتی تھی۔ اب تو بانو سر کا تاج ہے۔ ہم نے ایک صاحب سے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ یہ صاحبہ افسانے، ڈرامے، خاکے، مزاحیے، بچوں کے لیے، بڑوں کے لیے، ان کے لیے، ان کے لیے آخر کتنا لکھ لیتی ہیں۔

وہ صاحب فرمانے لگے۔ ارے میاں! یہ ایک عورت کا تو کیا کسی مرد کے بھی بس کا روگ نہیں ہے دراصل یہ لکھنے والے دو لوگ ہیں۔"

"دو لوگ" ہم بری طرح چونکے۔

"ہاں بھئی! ذرا نام پر غور کرو۔ بانو اور سرتاج۔ سرتاج ہمارے ہاں شوہر کے لیے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عورت خواہ مرد کے اعصاب پہ سوار ہو یا تاج بن کر سر پہ جگمگائے لیکن "سرتاج" یہ کسی عورت کا نام ہو ہی نہیں سکتا۔ ہماری تہذیب و تمدن کے ابھی اتنے برے دن نہیں آئے ہیں کہ ایک عورت

دو...ی عورت کی سرتاج کہلائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بانو اور ان کے شوہر یعنی ان کے سرتاج دونوں مل بات کر لکھتے ہیں اور دونوں کے نام سے یہ چیزیں چھپتی ہیں۔ ورنہ اپنا گھر بار، بال بچے، نوکری نمٹاتے ہوئے اس قدر بے تحاشہ لکھنا کون کھیل ہے؟

میں نے ان صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا "جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ تحریریں جنھیں ادب میں "اولاد معنوی" کہا جاتا ہے، یہی بانو سرتاج کی حقیقی اولادیں ہیں۔ ان تخلیقات کو انھوں نے ایک ماں کی طرح خون جگر دے کر پالا ہے اسی لیے ان کا دل، دماغ، زبان، ان کی سوچ، نسلی اثرات، دکھ سکھ، آرزوئیں، امنگیں سب ان کی تحریروں میں ابھر آئی ہیں۔

بانو سرتاج کے افسانے پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے ایک تنہا عورت دوسری عورت کی تلاش میں نکلی ہے۔ یہ سفر شاید اپنی تلاش اور شناخت کا ہے ان کی کہانیوں کے عام کردار چھوٹی چھوٹی بچیاں، کم سن لڑکیاں، دوشیزائیں۔ ساس بہوئیں، بیویاں، مائیں ـــــ ہندوستانی عورت کا روپ ہے۔

عام طور پر عورت کی نظر اپنی ہم جنس کے لباس، ڈیزائین اور رنگوں سے آگے نہیں جا پاتی، عورت کی روح کی گہرائیوں کو ناپنے کے لیے جو نظر درکار ہے وہ تخلیق کار ہی کو میسر آتی ہے اور بانو سرتاج کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ نفسیات کی انگلی تھامے عام ہندوستانی عورت کے دل و دماغ کی سرنگوں میں اترتی چلی گئی ہیں۔

بانو سرتاج کی تصویر دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے گویا وہ ابھی سو کر اٹھی ہیں (بہر حال اٹھ ضرور گئی ہیں) بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے بانو سرتاج نہیں ہندوستانی عورت کھڑی ہے، جس کی آنکھوں پر مغرب سے ابھرنے والے سورج کی تیز روشنی پڑ رہی ہے اور وہ سراسیمگی کی شکار آنکھیں اس چکا چوند کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آس پاس بکھری ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہی ہیں۔ یہی کیفیت ان کے افسانوں میں بھی نمایاں ہے جہاں مشرقی تہذیبی قدروں کی بازیافت کی ایک کوشش نظر آتی ہے۔ تحریک آزادیٔ نسواں کے نام پر مورچہ سنبھالنے والی عورتیں عام طور پر مغرب سے اس قدر متاثر ہوا کرتی ہیں کہ اونچی ایڑی کی سینڈل پہننے کے بعد ان کے قدم مشرقی زمین پر نہیں پڑتے۔ بانو سرتاج اس ترقی کی دوڑ میں پیش پیش ہونے کے باوجود وہ مغرب گزیدہ نہیں ہیں۔ ٹی وی کی خرافات اور عورتوں کی ترقی کے نام پر فحاشی کے سیلاب کو وہ برا سمجھتی ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے بتایا تھا کہ "پورن پوری ان کی پسندیدہ ڈش ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی زمین میں ان کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔

بانو سرتاج ہمارے زمانے کی عورتوں کی آزادیٔ اظہار کا سمبل بھی ہے۔ گزشتہ دنوں میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا:

کیا بانو سرتاج کا تعلق اسی چندرپور سے ہے جس ضلع سے ایک نیا ضلع گڑھ چرولی بنایا گیا ہے۔ میں نے کہا ہاں تب وہ پوچھنے لگے کہ چندرپور کی کیا چیز مشہور ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ "چندرپور کی بانو سرتاج اور گڑھ چرولی کے آتنک وادی ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔"

"بانو سرتاج اور آتنک وادی کیا ان دونوں میں کوئی تال میل بھی ہے؟" ان کے استفسار پر میں نے جواب دیا کہ ان دونوں میں کوئی تال میل تو نہیں ہے لیکن جب سے بانو سرتاج نے اپنا مشہور افسانہ پاگل خانہ لکھا ہے تب سے لوگ سی بی آئی افسران اور آتنک وادیوں سے اتنا نہیں گھبراتے جس قدر بانو سرتاج سے ڈرنے لگے ہیں کہ نہ جانے یہ خاتون کب کس گھوٹالے کو اپنے افسانے کے بہانے میں بھر کر چوک پر پھوڑ دے۔

پہلی مرتبہ ہم بانو سرتاج صاحبہ کے گھر پہنچے تو ہمیں مختلف چیزیں دکھائی گئیں۔ ہم آخر تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ہم لائبریری میں ہیں، میوزیم کی سیر کر رہے ہیں یا گھر میں چہل پھیر رہے ہیں۔ تقریباً ہر کمرے میں الماریوں اور شیلف پر ان کی کتابیں، مفتوحہ مڈل تحفے، ان کی بنائی ہوئی چیزیں فن کاری اور دستکاری کے نمونے سجے تھے۔ جنھیں عجیب سی بے معنی فضول اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں مثلاً چھلی ہوئی لکڑی کی کترن پھلوں کے خول، بیج، پینسل کا برادہ، سبزیوں کے ٹکڑوں وغیرہ سے بنایا گیا تھا۔ ان ہی اشیا سے عجیب عجیب سے خوش نما گل بوٹے بنائے تھے۔ یاد آیا کہ اسی بے معنویت میں معنی کی تلاش ان کا افسانوں کا فن ہے۔ کہیں مختلف سائز کی گولیوں اور کیپسول کے خول سے بنے شجر کا ماڈل دیکھ کر محسوس ہوا کہ یہی فن کاری ان کے افسانوں میں بھی ہے۔ جن میں درد بھرے مسائل بھی ہیں اور ان کی دوا بھی۔

بانو سرتاج کا یہ خاکہ ادھورا ہے۔ ہماری آپ کی اور ان کرداروں کی طرح جنھیں بانو سرتاج نے اپنے افسانوں میں بسایا ہے۔ یہ ادھورا پن ہی تو زندگی کی ضمانت ہے۔ زندگی کا یہ سفر جاری ہے تو مجھے امید ہے کہ یہ خاکہ بھی کبھی نہ کبھی مکمل ہو ہی جائے گا۔

(مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے تعاون سے بانو سرتاج کے اعزاز میں منعقدہ شب افسانہ میں پڑھا گیا)

●●

طالب خوندمیری

ہر مسجد میں ہمیں شیخ نے رسوا کیا [illegible]
سر مے خانہ ہم نے بھی شرافت جیب میں رکھ لی
ہمیں دنیا نہیں ملتی مگر کچھ لوگ ایسے ہیں
جنھوں نے صرف دو سجدوں میں جنت جیب میں رکھ لی

خلوص دل سے ہر سوغات [illegible] جیب میں رکھ لی
سمجھ کر اس کو [illegible] امانت جیب میں رکھ لی
ہمارے کوٹ سے تصویر جاناں گر پڑی گھر میں
یہ ہم نے کیا کیا کیسی مصیبت جیب میں رکھ لی
ذرا سی ہے بچا کر پھینک دی بوتل جو رندوں نے
تو واعظ نے اٹھا کر حسب عادت جیب میں رکھ لی

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس 8/25 ۔ 1 ۔ 4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد (اے۔ پی)

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت تے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں، اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے۔ سے کم ہونی چاہیے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 000 [illegible] روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، پریکٹس، مشین آٹو رکشہ، آڈیٹالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ [illegible] دیے جاتے ہیں [illegible] جملہ لاگت [illegible] 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی [illegible] سود [illegible] دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری 97ء تک 63288 افراد میں 25 ۔ 1753 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی لاگت 20.92 71 لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ [illegible] کے اشتراک سے اب تک جملہ 1501 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 25 ۔ 9 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 22 ۔ 476 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93 سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 197 گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں، خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت
ایم کام ۔ ایل ایل ایم
نائب صدر نشین و منیجنگ ڈائرکٹر

دسے کے خط

(مراسلے)

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

شگوفے میں اب تک جو مضامین شائع ہوئے ہیں لوگوں کے فون اور ملاقاتوں کے ذریعہ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ لوگ شگوفہ نہ صرف غور سے پڑھتے ہیں بلکہ اس کی تبلیغ بھی کرتے ہیں آپ کے قارئین کے خلوص سے متاثر ہو کر میں نے اپنے اندر کے مزاح نگار کو زندہ کرنے کی ٹھانی ہے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ سنجیدہ مضامین کے مقابلے میں طنز و مزاح بات پہنچانے کے لیے زیادہ آسان راستہ ہے۔

علیم خاں فلکی، جدہ

○

مکرمی۔ سالنامے میں میری ایک غزل طبع ہوئی ہے جس کے تیسرے شعر میں ظریفانہ چھیڑ چھاڑ کر کے اسے بے وزن بنا دیا گیا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہیے تھا:

دماغوں کا ہنر کہیے اجل کہیے ہیں وہ سوداگر
سادہ سے کما حاصل عزیز حیدرآبادی کے کارٹون

ہیں خصوصاً فیض کے مصرعے پر بنایا گیا کارٹون بہت خوب صورت ہے فیض صاحب بھی اسے دیکھتے اپنے شعر کی معنوی تعبیر پر بغیر مسکرائے نہ رہتے۔ میری مبارکباد عزیز صاحب تک پہنچا دیجیے گا۔ یہ شمارہ آپ بیگم فیض کو بھجاتے تو وہ بھی خوش ہوتیں۔

ظفر کمالی۔ پٹنہ

○

شگوفہ ہمارے غلام نبی آزاد اردو ہائی اسکول کلم نوری میں مہاراشٹر اردو اکیڈیمی کے تعاون سے پابندی کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔ شگوفہ بلاشک و شبہ اردو دنیا کے طنز و مزاح نگاروں کی تحریروں کو منظر عام پر لانے کا جہاں تک میرا خیال ہے واحد ذریعہ ہے۔

نذر کلم نوری

○

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

شگوفہ کے اس شمارے میں گزشتہ مہینے ریاض میں منعقدہ "شام شگوفہ" کے سلسلے میں ایک خصوصی گوشہ شامل کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانی بزم اردو ریاض کے زیر اہتمام منعقدہ یہ مقصدی محفل بے حد کامیاب رہی اس موقع پر مشاعرہ میں سنایا گیا کلام جو ہمیں حاصل ہو سکا۔ ڈاکٹر عابد معز کی خیر مقدمی تقریر کے ایک وصف کی رپورٹ اور تصاویر اس شمارہ میں شائع کی جا رہی ہیں۔ موقع کی مناسبت سے اس بار مال مفت کے تحت بیرون ملک مقیم قلم کاروں کے مضامین خاص طور سے منتخب کیے گئے ہیں۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وطن سے دور رہ کر یہ حضرات توسیع اشاعت کے ساتھ قلمی اعانت میں بھی کس قدر وسیع حصہ ادا کر رہے ہیں۔

آئندہ شمارہ کے مہمان مدیر ہندوستانی بزم اردو ریاض کے صدر جناب سکندر علی خاں ہیں موصوف نے شگوفہ کے ابتدائی پچیس سال کے شماروں سے مضامین بھی منتخب کر لیے ہیں اور کمپوزنگ کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ خصوصی نمبر کے لیے تصویروں کی بجائے کیری کیچر شائع کیے جائیں گے۔ امید ہے کہ نثری انتخاب کا یہ خصوصی نمبر شگوفہ کا ایک اور یادگار خصوصی شمارہ ثابت ہوگا۔

ایجنٹ حضرات سے خواہش کی جاتی ہے کہ نثری انتخاب کی زائد کاپیاں درکار ہوں تو قبل از قبل محفوظ کروالیں۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۰
شمارہ ۶

جون ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

قیمت فی پرچہ : ۱۰ روپے
زر سالانہ : ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

کتابت : محمود سلیم ، محمد غالب ، محمد عبدالرؤف
طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۱۳- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱
فون (آفس) 59 5716 رہائش : 4576064

آئندہ شمارہ

'شگوفہ' کے ۲۵ سال کا

'نثری انتخاب'

ہوگا

مشتاق احمد یوسفی ۔ کنہیالال کپور ۔ فکر تونسوی ۔ کرشن چندر ۔ احمد جمال پاشا ۔ یوسف ناظم ۔ مجتبیٰ حسین، عطاالحق قاسمی ۔
کرنل محمد خاں، خامہ بگوش، بھارت چند کھنہ ۔ خواجہ عبدالغفور ۔ دلیپ سنگھ ۔ رشید قریشی ۔ وجاہت علی سندیلوی،
نریندر لوتھر، مسیح انجم، ڈاکٹر رشید موسوی، پرویز یداللہ مہدی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، عابد معز، فیاض احمد فیضی،
رؤف پاریکھ، عاتق شاہ، برہان حسین، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شکیل اعجاز، حلیمہ فردوس ۔ ڈاکٹر عباس متقی،
بانو سرتاج اور دوسرے نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات

تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر عقیل ہاشمی

تقریباً ڈیڑھ سو صفحات :
مکمل آفسیٹ طباعت

مہمان مدیر :
سکندر علی نہاں

قیمت:
/20 بیس روپے

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن!

رجسٹرڈ آفس 4-1-825/8 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد (اے پی)

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گذار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے

کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری 97ء تک 63288 افراد میں 1753.25 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 7120.92 لاکھ روپے ہوتی ہے! اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1501 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 119.25 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 476.22 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد کو کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

○ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹرس پر کام کر رہی ہیں۔
○ خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت ایم کام۔ ایل ایل۔ ایم
نائب صدر نشین و مینیجنگ ڈائرکٹر

یوسف ناظم
(بمبئی)

اردو کا ایک مردانہ شعر

اکبر الہ آبادی کے کلام کا مطالعہ اگر آپ اس نقطۂ نظر سے کریں جس نقطۂ نظر سے میں نے کیا ہے تو آپ کو ان کے یہاں خالص مردانہ اشعار بکثرت ملیں گے۔ خالص مردانہ اشعار سے مراد وہ اشعار ہیں جن کا تعلق مردوں ہی سے ہے غزلیہ شاعری کے محبوب سے نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہماری غزلیہ شاعری میں محبوب کا ذکر ہمیشہ بصیغۂ تذکیر آیا ہے۔ یہ صیغۂ تذکیر بربنائے مصلحت ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ صیغۂ تذکیر دراصل صیغۂ راز ہے۔ (یہ کھلا راز تھا) اکبر الہ آبادی کے کلام میں گو طبقۂ اناث کا ذکر بڑی فراخ دلی کے ساتھ ہوا ہے لیکن خواتین کے ذکر میں مرد بھی برسبیل تذکرہ نمودار ہو گئے ہیں۔ مثلاً وہی قطعہ جو عورتوں کے پردے سے متعلق ہے جس میں اکبر چند بے پردہ خواتین کو دیکھ کر غیرت قومی سے زمین میں گڑ جاتے ہیں اور یہ پوچھنے پر کہ اے خواتین آپ کا وہ پردہ کیا ہوا انھیں جواب ملتا ہے کہ وہ تو مردوں کی عقل پر پڑ گیا۔ اس قطعے کو میں امداد باہمی پر مبنی قطعہ سمجھتا ہوں جس میں مرد اور عورتیں دونوں اشتراکِ عمل کا مظاہرہ پیش کر رہے ہیں حالانکہ دونوں میں اشتراکِ عمل کی صورت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے اور اب تو پردۂ نسواں، زمانۂ ماسبق کی داستان بن چکا ہے۔ برقعے نظر ضرور آتے ہیں لیکن برقعوں میں مستور کوئی نہیں ہوتا۔ (فالحال کی بات اور ہے ورنہ پردہ پوشی خواتین کا کال ہی کال ہے) برقعے اب صرف مجرموں کا جہیز رہ گئے ہیں۔ اور وہ بھی صرف اس وقت جب کسی مجرم کو عدالت میں پیش کیے جانے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ اس طریقۂ کار میں مصلحت یہ ہے کہ عوام دیکھ نہ لیں کہ کیسے کیسے مسکین صورت اعلیٰ درجے کے جرائم میں برسرِ پیکار ہیں۔ برقعہ پوش مجرموں کی تصویریں پابندی کے ساتھ اخباروں میں چھپنے لگی ہیں۔ اخباروں کی تعدادِ اشاعت کے بڑھنے کا ایک راز یہ بھی ہے (یہ جملہ معترضہ تھا) بوگس ووٹنگ کے لیے بھی برقعے کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے مردانہ اشعار میں سے ہم اس وقت صرف ایک شعر پیش کر رہے ہیں جسے نمونے کا شعر سمجھنا چاہیے:

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا　　پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

اگر اس شعر کا تعلق کسی مرد کی وفات حسرت آیات سے ہوتا تو ظاہر ہے کہ اکبرالہ آبادی جو تذکیر و تانیث کے معاملے میں بہت محتاط رہتے تھے، فاتحہ ہوگا کی بجائے فاتحہ ہوگی کے الفاظ لکھتے۔ یہاں فاتحہ کا مذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کا ممدوح (جواب مرحوم ہے) مرد تھا۔ اکبرالہ آبادی چونکہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک منصف مزاج جج بھی تھے اس لیے انھوں نے اپنے بیان کو مزید مدلل بنانے کی خاطر بلاؤ نوشی کے لیے "احباب" کو منتخب کیا۔ اس لفظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الم ناک واردات ایک "صاحب خانہ" سے تعلق رکھتی ہے یہ کسی خاتون کی تعزیت کے سلسلے کا شعر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اکبرالہ آبادی احباب کی بجائے سہیلیوں یا ہم جولیوں کو دسترخوان نشینی کا موقعہ دیتے یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اکبرالہ آبادی کے زمانے میں جو معاشرہ رائج تھا (اپنی نزاعی اور نزعی حالت) میں وہ خالص مشرقی معاشرہ تھا اور اس معاشرے میں احباب صرف مردوں کے ہوا کرتے تھے خواتین کی سہلیاں، سکھیاں اور ہمجولیاں وہ بھی ساری کی ساری در پردہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوائے فرینڈ اور گرل تو بعد میں تولد ہوئے۔ (لڑکوں نے بھی اپنے عنفوان شباب کے پیش نظر احباب کی بجائے گرل فرینڈ کی صحبت میں زیادہ دل چسپی لینی شروع کی) معاشرہ جو صرف اہل خاندان کو میل ملاپ کی اجازت دیتا تھا جیسے کہ پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد قسم کے افراد کو اندرون خانہ آنے اور آنے سے زیادہ جانے کی چھوٹ تھی اور اس کے علاوہ دیگر انواع و اقسام کے لوگوں پر پابندیاں عاید تھیں جو آج کل پولس ایکٹ کے مطابق ناپسندیدہ اجنبیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان دنوں کے معاشرے میں "لوپ ہول" بالکل نہیں تھے۔ اب تو پورا معاشرہ "مین ہول" ہے۔ اردو کے اشعار میں اگر کسی پردہ نشین کے نظر آجانے کا ذکر ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ صرف شاعر کے تخیل کی دیدہ وری ہے۔ بصارت اور نظارے سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اس معاشرے میں لڑکیوں کو گھر کی چھت پر جانے کی اجازت ضرور تھی لیکن صرف ضرورتاً ایسے موقعوں پر اگر کسی راہ رو کو لڑکی کی جھلک دکھائی بھی دی تو وہ صرف لباس کے رنگ کی جھلک تھی جیسا کہ ایک مصرعہ میں کہا گیا ہے کہ:

سرخ پوشے بہ لب بام نظر می آید

اس مصرعے میں صرف پوشش کا ذکر ہے۔ شاعر نے اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ذکر تا تو یہ اس کا آخری شعر ہوتا)۔ اردو شاعری میں محبوب کے سراپا سے متعلق جتنے بھی اشعار ہیں وہ صرف مفروضے ہیں "عین الیقین" سے کوسوں دور ـــــ اردو کے شاعروں کی بینائی بالعموم کمزور رہا کرتی ہے اور اس پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کے اکثر و بیشتر شاعروں نے اپنے کلام پر نظر ثانی نہیں کی۔ مانا کہ ان دنوں جو رہائشی مکانات تھے وہ ... سے زیادہ دو منزلہ ہوا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ پندرہ بیس منزلہ عمارت کھڑی کر دی۔ اس وقت مثال کے طور پر پوری دلی میں ایک عمارت تھی جو بہت اونچی تھی اور یہ اب بھی قائم ہے۔ ہمارا اشارہ قطب مینار کی طرف ہے لیکن یہ رہائشی عمارت کب تھی۔ ایک پورا دن تو اس کی ... سیڑھیاں چڑھنے میں لگ جاتا تھا اور لوگ

کہتے ہیں اتنی اونچی عمارت سے تو لوگوں کو خودکشی میں بھی کوئی مزا نہیں آتا تھا۔ زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی جان نکل جاتی تھی۔ ہم اصل میں یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ دو منزلہ عمارتوں کی چھت پر بھی کبھی کبھی دکھائی دینے والی لڑکیاں اپنا چہرہ نمایاں نہیں کرتی تھیں اور اگر ایسا کبھی ہو بھی گیا ہو تو اردو کے کسی شاعر کی بصارت وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہاں تخیل البتہ آسمانوں کی سیر کر سکتا تھا تخیل کے معاملے میں اردو کے شاعر کسی سے دبتے نہیں ہیں۔ وہ بلا تامل کہہ سکتے ہیں :

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   خلد میں گر ترا گھر یاد آیا

اور کمال یہ ہے کہ شاعر نے یہ گھر دیکھا تک نہیں تھا کیونکہ اس سے پہلے کہ شاعر کا لپٹا ہوا بستر کھلتا ، صاحبِ خانہ اپنے وعدے سے پھر جاتا —

(یہاں بیت خانہ کو صاحبِ خانہ کہا گیا ہے) ایسے اشعار جن میں صیغۂ تذکیر کا استعمال کیا گیا ہو۔ . . . . لیکن اشارہ مرد کی طرف نہ ہو تو اسے مردانہ شعر نہیں کہا جا سکتا لیکن ایسا نہیں ہے کہ مردانہ اشعار غالب کے یہاں نہیں ہیں بلکہ جواں مردانہ اشعار بھی ہیں مثلاً :

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

لیکن اکبر الہ آبادی کا جو شعر ہم نے پیش کیا اس میں دو دلیلیں بہت واضح بلکہ حتمی ہیں۔ ایک فاتحہ کا مذکر ہونا اور دوسری دلیل ہے احباب کا تذکرہ۔

خاکسار کا مشورہ ہے کہ آپ اکبر الہ آبادی کو از سر نو پڑھیں۔ کیا کلام ہے مردوں کے ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں مثلاً :

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید ترے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

اکبر کے زمانے کے لیڈر، لیڈر کہاں تھے صرف پالیڈر تھے۔ آج کے لیڈر، ایک زلیخا کے قائل نہیں ہوتے بشرطیکہ انھیں دوسرے سند خیز کاموں سے فرصت ملے۔

غزل

مصطفیٰ شہاب (لندن)

دن میں گھر دلدل نظر آیا ہمیں
رات کو ہلچل نظر آیا ہمیں

وہ گھرا تھا جاں نثاروں میں مگر
جانے کیوں سنگل نظر آیا ہمیں

ذکر حوروں کا چلا تو مولوی
شوخ اور چنچل نظر آیا ہمیں

سن کے جنت کے بیاں کو باغِ عام
تاڑ کا جنگل نظر آیا ہمیں

راستے میں کھو گیا جب راستہ
تب سفر کا پھل نظر آیا ہمیں

کر رہا تھا سب کو جھک جھک کر سلام
اک معطل کل نظر آیا ہمیں

دن چڑھے جو تن رہا تھا شان سے
شام کو خل خل نظر آیا ہمیں

ہائے غربت پانچ کا اک نوٹ بھی
لاکھ کا بنڈل نظر آیا ہمیں

جانے کیا دکھ لے کے بیٹی سو گئی
صرف تند کا حل نظر آیا ہمیں

باولے تھے ہم بھی راہِ عشق میں
وہ بھی کچھ پاگل نظر آیا ہمیں

مسئلہ اتنا تھا پیچیدہ شہاب
حل میں بھی اک بل نظر آیا ہمیں

غزل

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

میں نے رکھ چھوڑے ہیں اردو کے رسالے گھر میں
مکڑیو شوق سے تم تان لو جالے گھر میں

آپ نے جیسے کیے ویسے ہی گھپلے کر کے
میں بھی کر لوں گا دھنک رنگ اجالے گھر میں

وقت پڑنے پہ نکل آئیں گے سڑکوں پہ نحیف
چادریں تان کے سوئیں گے جیالے گھر میں

آج سڑکوں پہ وہی کھل کے کیا کرتے ہیں
کل جو کرتے تھے ذرا چھپ کے گھوٹالے گھر میں

گھر سے باہر مجھے جانے کی ضرورت کیا ہے
جب کہ مل جاتے ہیں منہ مانگے حوالے گھر میں

خاک صحراؤں کی میں چھانتا کیوں کر یارب
چین سے ملتے اگر چند نوالے گھر میں

کھڑکیاں ہیں نہ تو در نام کی دیواروں میں
کیسے ڈالو گے بھلا ہاشمی تالے گھر میں

مجتبیٰ حسین (دہلی)

اُردو پہ مرنا ۔ اُردو میں مرنا

دو ڈھائی مہینے پہلے اردو کے ممتاز عالم اور مستند محقق ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا گوہاٹی میں انتقال ہوگیا۔ اِس پر اردو کے ایک اور بڑے عالم اور محقق پروفیسر نثار احمد فاروقی سخت خفا ہیں، برہم ہیں، مشتعل ہیں، طیش میں ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ ان کا یہ شدید غصّہ اس بات پر نہیں ہے کہ ڈاکٹر رستوگی کیوں انتقال کر گئے (مشیت ایزدی کے آگے کس کی چلی ہے) بلکہ ان کی خفگی اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا انتقال فروری کے آخری ہفتے میں گوہاٹی میں ہوا، لیکن اردو دنیا کو ان کے اُٹھ جانے کی اطلاع پورے دو مہینوں بعد ہوئی۔ وہ بھی اس طرح کہ رسالہ "انشاء" کے ایڈیٹر نے ڈاکٹر رستوگی کو کسی مسئلہ پر دو چار ضروری خط لکھے تو ڈاکخانہ والوں نے تنگ آ کر مدیر انشاء کو لکھا کہ قبلہ مستقبل میں آپ اس پتہ پر خط لکھ کر اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کریں کیونکہ مکتوب الیہ فوت ہو چکا ہے۔ اتنی سی بات پر نثار احمد فاروقی ناراض ہوئے تو ناراض ہوتے ہی چلے گئے۔ یوسف ناظم نے بہت عرصہ پہلے باقر مہدی کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کے پہونچنے میں ابھی دیر ہے" یہی بات پروفیسر نثار احمد فاروقی پر بھی صادق آتی ہے۔ چنانچہ ان کے علم کی وجہ سے ہم ان کے غصہ کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ تارا چرن رستوگی کے گزر جانے پر ان کا غیض و غضب سے بھرا ہوا ایک خط "ہماری زبان" میں شائع ہوا ہے جس کے کچھ اقتباسات ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

"مجھے اس خبر سے کتنا صدمہ ہوا اور کتنا دُکھ پہونچا ہے بیان نہیں کرسکتا۔ مجھے خود کو اس زبان کے اہل قلم میں شمار کرنے سے شرم آتی ہے جو اپنے اتنے بڑے اسکالر کو اس طرح گمنامی اور بے کسی کے عالم میں مرنے دے اور جس کے خود ساختہ چودھری منظر نامے بدلنے میں اور اپنی شہرت کو چمکانے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ کیسے رنج کی بات ہے کہ ایک ایسا عالم اسّی (۸۰) کی عمر میں کینسر کے مرض میں مکمل تنہائی اور کسمپرسی میں انتقال کر جائے اور دو مہینے تک ادھر کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ ہندوستان کا کوئی بھانڈ اگر ٹمبکٹو میں بھی مرتا تو یہاں کے اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن سب اس کے گیت گا رہے ہوتے۔ لعنت ہے اس سماج پر جہاں ایسے لوگوں کا یہ حشر دیکھنے کو ملے۔"

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے انتقال کی خبر پڑھ کر ہمیں بھی دُکھ ہوا وہ بے نیاز آدمی اور ایک بڑے اسکالر تھے لیکن آج کے زمانے میں صرف بڑے اسکالر ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آج کے زمانے میں زندہ رہنے کے لیے بڑے اسکالر کے اندر ایک چھوٹے آدمی کا بھی ہونا ضروری ہے یقین نہ آئے تو ہمارے نام نہاد بڑے اسکالروں کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔

بڑے آدمی کو اصل غصہ اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر رستوگی کے انتقال کے پورے دو مہینوں کے بعد اردو والوں کو ان کے گزر جانے کا علم ہوا۔ ان کا غصہ سر آنکھوں پر لیکن ہمیں یہ بتائیے کہ اگر ان کے گزر جانے کا علم اردو والوں کو بروقت ہو بھی جاتا تو وہ کیا کر لیتے۔ اب ہم پروفیسر نثار احمد فاروقی کو کیسے سمجھائیں کہ آج کے اردو معاشرہ میں زندہ رہنے کے لیے آدمی میں تھوڑی سی بے حسی اور کٹھورپن کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ غالب دیکھیے۔

بارِ الم اٹھایا رنگِ نشاط دیکھے ؛ آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

اردو میں اتنے برسوں تک لکھتے رہنے کے بعد ہم تو اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اردو کے ادیب کو بھلے ہی ادب تخلیق کرتے وقت تو ضرور حساس رہنا چاہیے لیکن عملی زندگی میں بے حس بنے رہنا چاہیے اسی میں عافیت ہے۔ اردو معاشرہ میں پنپنے کی یہی تو باتیں ہیں۔ ہمارا چرن رستوگی کا اردو والوں کو بتائے بغیر یا ان سے اجازت لیے بغیر دنیا سے گزر جانا کوئی بات نہیں ہے۔ پندرہ سولہ برس پہلے اردو کے سب سے بڑے طنز نگار کنہیا لال کپور بھی اسی طرح دنیا سے چلے گئے تھے اور اردو والوں کو ان کے گزر جانے کے دو ہفتوں بعد خواجہ عبدالغفور مرحوم کی معرفت پتہ چلا تھا کہ اردو طنز نگاری کا قطب مینار گر گیا۔ اس زمانے میں ہماری رگوں میں خون ذرا تیزی سے دوڑتا تھا اور ہم میں وہ بے حسی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ماشاء اللہ آج ہمارے مزاج میں دکھائی دیتی ہے۔ ہم نے بھی اس بات پر بڑا واویلا مچایا تھا اور اردو دنیا کو جھنجھوڑا تھا کہ لعنت ہے تم پر کہ اردو کا اتنا بڑا طنز نگار تم میں سے اٹھ گیا اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو سکی۔ اس وقت ہم بھی اس معاملہ میں بالکل نثار احمد فاروقی بنے ہوئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک دن عمیق حنفی مرحوم سے ہماری ملاقات ہوگئی تو انھوں نے ہم سے وہی سوال پوچھا تھا جو آج ہم نثار احمد فاروقی سے پوچھ رہے ہیں کہ "میاں! اگر تمہیں ان کے انتقال کی خبر بروقت مل جاتی تو تم کیا کر لیتے، کیا تم بھی مر جاتے؟ اس پر اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ کنہیا لال کپور بڑے طنز نگار تھے اور اس سہانی دنیا کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ مر گئے اور لوگوں کو بروقت پتہ بھی نہیں چلا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ان ادیبوں سے تو ہزار درجہ بہتر تھے جن کے انتقال کی بروقت خبر اخباروں میں چھپتی ہے تو پڑھنے والوں کو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ارے کمال ہے، یہ تو اب تک زندہ تھے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ کب کے مر چکے ہیں۔ کنہیا لال کپور تو آخر وقت تک اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیتے رہے۔" عمیق حنفی ہمارے ان دوستوں میں سے تھے جن کی باتیں سننے کے بعد دل کو قرار آجاتا تھا۔ سو ہمیں بھی قرار آگیا۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بھی کسی ادیب کے قبل از وقت یا بعد از وقت مرنے کی شکایت نہیں کی۔ یوں بھی اردو معاشرہ میں ان دنوں زندہ رہنا اور مرنا دونوں برابر ہیں۔ ہمیں وہ پرانا لطیفہ یاد آیا کہ ایک بزرگ شکاری اپنے شکار کا کوئی قصہ سنا رہے تھے۔ کہنے لگے "میں جنگل سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک شیر نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت میری بندوق میں کارتوس بھی نہیں تھے۔ شیر بہرحال شیر ہوتا ہے۔ اس نے مجھے پچھاڑ دیا اور میرے حلق پر اپنے نوکیلے دانت رکھ دیے۔ پھر وہ میرا سارا خون پی گیا۔" سننے والوں نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟" شکاری نے کہا "ہونا کیا تھا، پھر میں مر گیا۔" سننے والوں نے کہا "حضرت! یہ کیسے ہو سکتا ہے، آپ تو ابھی زندہ ہیں۔" اس پر شکاری نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "میاں! یہ بھی کوئی زندگی ہے"۔

دیکھا جائے تو ان دنوں اردو کے بہت سے ادیب اور فنکار بھی مذکورہ شکاری صاحب کی طرح ہی زندہ ہیں۔ یہ وہ لاشیں ہیں جنہیں اٹھانے والا کوئی نہیں مل رہا ہے۔ یوں بھی ادیبوں اور فنکاروں کی موت کئی سطحوں پر ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے بعض ادیبوں کی طبعی موت تو واقع ہو جاتی ہے لیکن ان کی "ادبی موت" کبھی واقع نہیں ہوتی۔ دوسری طرف اکثر ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی "ادبی موت" تو بہت پہلے واقع ہو جاتی ہے لیکن "طبعی موت" بعد میں واقع ہوتی ہے۔ ایسے ادیب

اور نہ کار خال خال ہی ہوتے ہیں جن کی "ادبی" اور "طبعی" موتیں ساتھ ساتھ ہی واقع ہوتی ہیں۔

تاہم ہمارا خیال ہے کہ تارا چرن رستوگی کے انتقال سے ہمیں کچھ نہ کچھ سبق تو لینا ہی چاہیئے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو چاہیئے کہ ان کا آخری وقت قریب آتا دکھائی دے تو انہیں اس کی اطلاع، اپنے چاہنے والوں کو ضرور دیں۔ دوسری طرف اردو کے بہی خواہوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ادیبوں اور شاعروں کی وقفہ وقفہ سے خبر لیتے رہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اردو ادیبوں اور شاعروں کا ایک "رجسٹر حاضری" رکھا جائے جس میں ان کے موجود ہونے کی ہر روز اطلاع درج کرائی جاتی رہے۔ تاہم اتنا تو ہونا چاہیئے کہ کبھی کبھار ان کی حاضری لے لیا کریں۔ ہماری مراد ہے خیریت پوچھ لیا کریں۔ تارا چرن رستوگی کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ آخری عمر میں وہ بالکل تنہا رہ گئے تھے اور گوالی جیسے مقام پر رہتے تھے جہاں دور دور تک اردو لکھنے والے نظر نہیں آتے۔ اگر خدانخواستہ ہم بھی اپنی کتابیں اور کاغذ لے کر کبھی جون کے مہینے میں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ کر بیٹھ جائیں اور وہاں تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو جائیں تو ہمارے موجود ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع پورے آٹھ دس مہینوں بعد اس وقت ملے گی جب کوئی جاپانی، جرمن یا برطانوی کوہ پیماؤں کی ٹیم ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے ارادہ سے وہاں آئے گی۔ اردو ایک زمانہ میں سارے ملک میں پائی جاتی تھی لیکن اب جزیروں میں پائی جانے لگی ہے۔ مانا کہ اس کے کچھ جزیرے تو امریکہ اور یورپ میں بھی موجود ہیں لیکن اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اردو معاشرہ میں اب منظم ہونے کے آثار کم اور منتشر ہونے کے آثار زیادہ نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ان حالات میں اردو والوں کو چاہیئے یقین کے ساتھ اپنی بقاء کے علاوہ اپنی زبان کی بقاء کے بارے میں بھی سوچنا چاہیئے۔

٥٥

آنجہانی

آب نظر برنی کہاں مل پائیں گے؟ / شخصیت وہ آسمانی بن گئے
دورِ مہنگائی کے ہاتھوں ایک دن / "ایں جہانی" "آنجہانی" بن گئے

نظر برنی

○

بٹر فروش

کھپا دی جان ہی ہم نے بٹر لگانے میں / نہیں ہے ہوش ہمیں اپنے تن کا ہوش نہیں
زمانہ لاکھ مخالف ہو گیا بگڑتا ہے / "بٹر نواز" ہے صاحب "بٹر فروش" نہیں

نظر برنی

○

لیڈر بنا دیا

ایک بھائی ہے مدیر، بڑے ہی مزے میں ہے / قسمت نے ایک بھائی کو ٹیچر بنا دیا
ابا کی سرپرستی عجیب و غریب تھی / میں کچھ نہ کر سکا مجھے لیڈر بنا دیا

نظر برنی

○

شاعر

اللہ کسی شخص کو شاعر نہ بنائے / اس کو تو سدا شکوۂ شیطان رہے گا
شاعر پہ ہمیشہ سے ہے اللہ کی پھٹکار / مقروض رہے گا وہ پریشان رہے گا

نظر برنی

غزل

اف یہ سِن یہ شباب، ونڈرفل / اس پہ الٹا نقاب ونڈرفل
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوئے / تھے وہ غالب جناب ونڈرفل
خط جو لکھا نہیں گیا تھا کبھی / اس کا آیا جواب ونڈرفل
حضرت شیخ کھائیے ڈٹ کر / ہے یہ شامی کباب ونڈرفل
چمچے ہم بن گئے منسٹر کے / مل گیا ہم کو جاب ونڈرفل
کھلی آنکھوں سے روز و شب ہم تو / دیکھتے اب ہیں خواب ونڈرفل
اب دھتورے کی شاخ پر تھیلہ / کھل رہے ہیں گلاب ونڈرفل
حسنِ فطرت کا شاہکار ہے یہ / ڈوبتا آفتاب ونڈرفل
واہ رے، واہ وقت سے پہلے / نل میں آیا ہے آب ونڈرفل
حیدرآباد کی یہ .. بریانی / ہے بڑی لاجواب ونڈرفل
پارسا لوگ چھپ کے پیتے ہیں / میکدے میں شراب ونڈرفل
شاخ گل پر ہے الوؤں کا ہجوم / آیا ہے انقلاب ونڈرفل
پیتے اب ہیں جیل میں چکی / تھے جو عزت مآب ونڈرفل
دفتروں کے لگاتے ہیں چکر / خاندانی نواب ونڈرفل
اب بڑھاپے میں یاد آیا ہے / فکرِ روزِ حساب ونڈرفل
وعظ فرما رہے ہیں مولانا / میکدے میں جناب ونڈرفل
گھر کی رونق وہ بی بیاں محبوب / ہو گئیں بے نقاب ونڈرفل

محبوب مانجھی
(بلاس پور)

ڈاکٹر بانو سرتاج
(چندراپور)

مونچھیں

مونچھیں دو قسم کی ہوتی ہیں ـــــــ تنہا مونچھیں اور مونچھیں accompained by داڑھی۔
مونچھوں کی پوزیشن سر اور داڑھی کے بالوں کی عدم موجودگی میں خاصی مستحکم ہوتی ہے۔ مونچھیں، سوئی کی طرح پتلی، تیر کی طرح نوکیلی، تلوار کی طرح کٹیلی، گلہری کی دم کی طرح گھنیلی، پلکوں کی طرح سنفلی زلفوں کی طرح چھیلی وغیرہ وغیرہ ہوتی ہیں۔

جسامت کے اعتبار سے ہٹلر مارکہ مونچھیں مختصر ترین ہوتی ہیں جو لکشمن ریکھا کی طرح نتھنوں کے دائرہ حدود ہی میں رہتی ہیں۔ کوئی اس میں بھی کھانچی مار دیتا ہے۔ اتنی مختصر کر دیتا ہے جیسے نقطہ کا ٹیکہ تلاش کرنے جاؤ تو گمان ہوگا ہے کہ نہیں ہے۔

سوئی کی طرح پتلی مونچھیں اتنی باریک ہوتی ہیں جنھیں اور باریک کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مونچھیں ناک کو انڈرلائین کرکے چہرے کے دوسرے اعضا کی بہ نسبت زیادہ اہم قرار دے دیتی ہیں۔

تیر کی طرح کی مونچھیں وہ ہوتی ہیں جن میں مونچھوں کے باہری سروں کو کلف لگا کر سخت کر دیا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی تیر انداز بہ یک وقت مخالف سمتوں میں تیر روانہ کرنے کو مستعد ہے۔

تیر کی طرح کی مونچھیں پاکٹ سائز ہوتی ہیں تو تلوار کی طرح کی مونچھیں ان کا لارج ایڈیشن ہوتی ہیں۔ کٹیلی مونچھیں دہشت طاری کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔ پرانے وقتوں میں زمین دار، جاگیردار، ٹھاکروں وغیرہ کا رعب مزارعوں پر بنائے رکھنے میں یہ مونچھیں اہم کردار نبھاتی تھیں۔

گلہری کی دم کی طرح گھنیلی مونچھیں خصوصی توجہ کی طلب گار ہوتی ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی انھیں دوسری کٹیگری میں ڈال دیتی ہے یعنی گھنیلی نہ رہ کر وہ پھیلی پھیلی ہو جاتی ہیں۔

پلکوں کی طرح سنبھلی مونچھیں ہوتی تو اصلی ہیں مگر نقلی پلکوں کی طرح سنبھال کر رکھی جاتی ہیں۔

چلبلی مونچھوں کے رکھ رکھاؤ میں سلیقے کو دخل نہیں ہوتا۔ محبوب کی پریشان زلفوں کی طرح انھیں بار بار سنوارنا پڑتا ہے۔

کچھ مونچھیں ناک کے نیچے تو جمی جمائی ہوتی ہیں مگر ناک کے حدود پار کرتے ہی گالوں پر پھیل جاتی ہیں جیسے پل کے نیچے پانی ٹھہرا رہتا ہے۔ آگے بڑھ کر پھیل جاتا ہے

سائبان کی طرح چھائی ہوئی مونچھیں اوپری ہونٹ اور دانتوں کا عیب چھپانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کھاتے پیتے وقت ان کی مداخلت بے جا برداشت کرنی پڑتی ہے۔

ناک اور مونچھیں لازم و ملزوم ہیں لمبی کھڑی ناک کے نیچے گھنی مونچھ ایسی لگتی ہے جیسے چھتری الٹی رکھ دی گئی ہو۔ پکوڑے جیسی ناک کے ساتھ چھوٹی گھنی مونچھ دو پہلوانوں کے آمنے سامنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

کچھ مونچھیں وہاں نہیں ہوتیں جہاں انھیں ہونا چاہیے۔ وہ ناک کو بریکیٹ میں رکھتی ہیں۔

کچھ مونچھیں ناک کی دونوں طرف آنکھوں کی جانب سیدھی اٹھی ہوئی یا ٹھوڑی کی طرف سیدھی جھکی ہوئی ہوتی ہیں جیسے کوئی پیالہ سیدھا یا اوندھا رکھا ہو۔

مونچھ اونچی ہوتی ہے، مونچھ نیچی ہوتی ہے۔ مونچھوں پر تاؤ دیا جاتا ہے۔ مونچھ اکھاڑنے کی دھمکی دی جاتی ہے اور ناکامی کی صورت میں مونچھ منڈا لینے کا اعلان کیا جاتا ہے.... کوئی کسی کی مونچھ کا بال بن جاتا ہے کوئی جا بے جا سب اس وقت ہوتا ہے جب مونچھوں کے ساتھ داڑھی نہیں ہوتی۔

داڑھی مونچھ مل کر چہرے کی ہڈیاں چھپانے میں خاصے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے سوا ان کے باہمی ارتباط [illegible] اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

جو مونچھیں accompanied by داڑھی ہوتی ہیں ان میں درج ذیل خاص ہیں۔ مونچھیں اکمپنیڈ بائی باغ و بہار داڑھی، جھاڑ جھنکاڑ داڑھی، فرنچ کٹ داڑھی، چگی داڑھی اور مونچھیں اکمپنیڈ بائی قلمیں وغیرہ وغیرہ۔

باغ و بہار داڑھی کی شگفتگی، جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کی بے ترتیبی، فرنچ کٹ داڑھی کی خوبصورتی اور چگی داڑھی کی مضحکہ خیزی مونچھوں کو سکینڈری بنا دیتی ہے۔

باغ و بہار داڑھی کی وسعت مونچھوں کی اہمیت کم یوں کرتی ہے کہ چونکہ تین چوتھائی چہرے پر داڑھی کا قبضہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ .... ٹھیک اسی طرح جیسے مال دار بیوی غریب شوہر پر حاوی ہو جاتی ہے۔

جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں مونچھوں کا وجود گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس قسم کی داڑھی مونچھوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ان کی موجودگی میں دست شفقت مونچھوں تک پہنچتا ہی نہیں۔ دبنگ بچہ ماں کی توجہ پہلے حاصل کرتا ہے۔

فرنچ کٹ داڑھی فرانس میں عام ہے ہندوستان میں خاص۔ ایسی داڑھی وہ لوگ رکھتے ہیں جو خوب صورت ہوتے نہیں مگر خوب صورت نظر آنا چاہتے ہیں۔ داڑھی بھلے ہی غیر ملکی ہو، ان کے ساتھ مونچھیں سو فی صد ملکی ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اپنی فطرت کے عین مطابق غیر ملکی داڑھی کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ مونچھوں کو دوسرا درجہ ملتا ہے۔

چکّی داڑھی کو دیکھ کر جگالی کرتے ہوئے بکرے کی یاد آکر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ نظروں کا مرکز داڑھی بن جاتی ہے۔ مونچھیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔

گول دائرہ نما مونچھوں کو دیکھ کر اندازہ لگانا آسان نہیں ہوتا کہ مونچھیں کہاں ختم ہوئیں اور داڑھی کہاں سے شروع ہوئی؟ ویسے ففٹی ففٹی کے اصول پر ان کا کام چلتا ہے۔ مونچھیں ہونٹوں کے کناروں پر ڈیرہ ڈالتی ہیں جہاں داڑھی پہنچ کر ان سے بغل گیر ہو جاتی ہے۔

جن مونچھوں کے ساتھ صرف قلمیں ہوتی ہیں انھیں دیکھ کر سوال اٹھتا ہے کہ سفر درمیان ہی میں کیوں روک دیا گیا؟ ذرا آگے بڑھ کر منزل کو گلے لگا لینے میں کیا قباحت تھی؟ ... پھر خیال آتا ہے۔ ... شاید ایسی ہی کوئی رکاوٹ ہوگی جیسی ہمیں اس مضمون کو یہیں ختم کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ●●

غزل

رشید عارف (بہار)

کسی دل بد لو کو بھی گھاٹے کا کھٹکا نہ رہا
ایک ہی پارٹی کی دم میں تو یہ لٹکا نہ رہا

کنکری جھ گئی پینڈے میں عجب شوخی کی
ساقیا! اب تو کسی کام کا مٹکا نہ رہا

کر کے گودام کو خالی یہ پھرے ہے آزاد
ایک چوہا بھی کسی بل میں تو سٹکا نہ رہا

مونچھ پہ تاؤ وہی چہرے پہ روغن بھی وہی
کسی مجرم کا بھی چہرہ یہاں لٹکا نہ رہا

کل بھی آزاد تھا اور آج بھی آزاد ہے یہ
کوئی پھندہ مرے دل پر "تری لٹ" کا نہ رہا

نقد سب ہار گئے اور اثاثہ گروی
چورا چسکوں کا ہمیں اب کوئی کھٹکا نہ رہا

شیخ ماہر ہے نگل جانے میں مرغ و ماہی
ایک کانٹا بھی گلے میں کبھی اٹکا نہ رہا

ایک رشوت نے کئی کام نکالے عارف
مسئلہ کوئی ہمارا کہیں لٹکا نہ رہا

غزل

محمود نشتر (حیدرآباد)

مدد پر کرم کر کے تصویر دے دی
مجھے جھوٹے وعدوں کی تحریر دے دی

کیے شیخ نے جٹ جو میٹھے کے کوشش تھے
فقط ایک چمچہ مجھے کھیر دے دی

سنورنے سے بیگم نے فرصت نہ پاکر
مجھے دیگچی اور کفگیر دے دی

کمایا بڑا نام لیڈر نے اس سے
اسے میں نے لکھ کر جو تقریر دے دی

نوازا ہے شاعر کو یوں بھی خدا نے
کہ افلاس کی اس کو جاگیر دے دی

ہوا اُن سے آخر مرا عقد ثانی
دعا کو مری حق نے تاثیر دے دی

کبھی فن کا دعویٰ نہ کرنا تو نشتر
اگر سننے والوں نے توقیر دے دی

غزل

شاہد عدیلی (حیدرآباد)

کیوں تعجب ہے کہ ہے زوروں پہ رشوت ہر جگہ
خود ہی سوچو اس کی ہے کتنی ضرورت ہر جگہ

جو رعورت ہے تو پھر سمجھو ہے عورت ہر جگہ
دوسرے لفظوں میں گویا ہے مصیبت ہر جگہ

عاشقی میں لیڈری میں اور دستر خوان پر
پڑتی تھی، پڑتی ہے چمچوں کی ضرورت ہر جگہ

ہو عقیقہ یا ولیمہ یا کہ چہلم ہو کہیں
ہم پہنچ جاتے ہیں کھانے مفت دعوت ہر جگہ

یہ کرو جی، وہ کرو جی، یہ نہیں جی وہ نہیں
بیویوں کو ٹانگ اڑانے کی ہے عادت ہر جگہ

زندگی میں ہے محل تو مقبرہ مرنے کے بعد
کام دولت مند کی آتی ہے دولت ہر جگہ

کچھ لچک رکھتی ہے ایسی طرح مصرع کی طرح
"ہر طرف" پڑھ لیجے یا حسبِ ضرورت ہر جگہ

غسل بھی دیتے ہیں جلدی دفن بھی کرتے ہیں جلد
مرنے والوں کے لیے ہوتی ہے عجلت ہر جگہ

جھوٹ بھی کیا چیز ہے دنیا میں شاہد کیا کہوں
مال کھوٹا ہے مگر اس کی ہے قیمت ہر جگہ

بابو آر کے
(ایلچپوری)

جنگ مابین لیفٹ رائیٹ

موجودہ دور عیبوں کو ہنر بنانے کا دور ہے۔ اسی لیے تو آج ہر طرف ہنر بے وقعت ہیں اور عیبوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں عیبوں کو ہنر بنانے کی ایک دل چسپ کڑی کا اضافہ ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ پچھلے دنوں ریاست کے لفٹ ہینڈرس نے ریاستی سطح پر لیفٹ ہینڈرس کی ایک تنظیم کا نظم کر ڈالا۔ یہ تنظیم سماج میں لیفٹ ہینڈر حضرات پر جاری ظلم و ستم کا قلع قمع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور ان کی سرپرستی کا جنون بھی اس کے سر پر سوار ہے۔ یعنی یہ تنظیم لیفٹ ہینڈرس کے سروں پر اپنا دستِ شفقت (چاہے وہ بایاں ہی کیوں نہ ہو) رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ ویسے بھی دستِ شفقت چاہے دایاں ہو یا بایاں اس سے سرپرستی قطعی متاثر نہیں ہوتی اور دستِ شفقت رکھنے کے عمل میں دائیں بائیں کی کوئی قید بھی نہیں ہوتی۔ البتہ دستِ شفقت باعثِ خفت تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ دولت کی لکیر سے عاری ہو۔ ارے یہ کیا، بات ہو رہی تھی لفٹ ہینڈرس کی اور ہم الجھ گئے ہاتھوں کی لکیروں میں، خیر جانے دیجیے۔ تو صاحب لفٹ ہینڈرس کے متعلق مذکورہ خبر نے ہمیں خاصا مطمئن کیا ہے اور ہم خوش ہیں کہ چاہے جس سمت سے ہو ہمارے سماج میں بیداری کی لہر چل ضرور رہی ہے۔ خدا کرے یہ بیداری ہاتھوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں، ناکوں اور سروں تک بھی چل جائے تاکہ کانے، چپٹے اور گنجے حضرات بھی اپنی اپنی تنظیمیں بنا کر سماج میں اپنے خلاف ہماری زیادتیوں، طعنوں، تشنیعوں کا منہ توڑ جواب دے سکیں یا کم از کم کانے چپٹے اور گنجے جیسے اعضا شکن الفاظ کا سدِ باب ہی کر سکیں۔ رائٹ ہینڈر ہونے کے باوجود ہم نے اور مذکورہ تنظیم کے ذمہ داران نے مل جل کر، لیفٹ ہینڈرس کی تکالیف و شکایات کا جو دفتر تحریر کیا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں بے چارے لیفٹ ہینڈرس کے ساتھ اوّل دن سے ناانصافی اور زیادتی ہوتی آئی ہے۔ بچپن سے ہی ان کو بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی پاداش میں والدین اور اساتذہ کی جھڑکیاں اور مار کھانی پڑی ہے اور یہ بھی حقیقت

ہے کہ سماج میں ایک عرصہ سے ان پر ستم و غضب کیے جا رہے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بسوں میں چڑھنے اترنے کے لیے جو ڈنڈے آویزاں ہوتے ہیں وہ بھی "رائٹ ہینڈرس" کو نظر میں رکھ کر لگائے جاتے ہیں جس کے باعث ان کا استعمال وہ بآسانی نہیں کرسکتے۔ اس طرح نل کی ٹونٹیاں الکٹرک کال بیل کے بٹن، شرٹ پینٹ کے بٹن اور قمیضوں کی ساخت بھی ان بیچاروں کی کھلی اڑاتی ہے کیوں کہ یہ تمام چیزیں بھی "رائٹ ہینڈرس" کے لیے ہی موزوں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ لیفٹ ہینڈرس ہونے کے جرم کی پاداش میں، وہ "ٹو وہیلرس" بھی من چاہے طریقہ سے نہیں چلا سکتے کیونکہ ان سواریوں کا میکانزم بھی "رائٹ ہینڈرس" کے لیے مناسب ہوا کرتا ہے۔ ویسے اسکوٹر یا چھوٹی موپیڈ وہ چلا تو لیتے ہیں لیکن چلاتے وقت انہیں دشواری اور پریشانی سے گزرنا پڑتا ہے کیوں کہ ان سواریوں میں ایکسلیٹر سیدھی جانب ہوتا ہے اور بریک گیئر بائیں جانب رہتے ہیں جب کہ لیفٹ ہینڈرس کا بایاں ہاتھ ہی زیادہ مضبوط رہتا ہے۔ اسی لیے یہ بے چارے ڈرائیونگ کے دوران رفتار بڑھاتے وقت یا تو وہ بریک لگا جاتے ہیں یا گیئر بدلتے رہتے ہیں نتیجتاً سواری یا تو چلتے چلتے کھڑی رہتی ہے یا جھٹکے کھا کر بند ہو جاتی ہے بہرصورت دیگر سواری اسی صورت میں چل سکتی ہے جب لیفٹ ہینڈرس اپنے ہاتھوں کو "کراس" کرکے ہینڈل تھامے رکھیں یعنی ان کا دایاں ہاتھ ہینڈل کی بائیں جانب ہو اور بایاں ہاتھ سیدھی جانب رہے۔ اب آپ ہی تصور کیجیے۔ اگر کوئی لیفٹ ہینڈر اس ہیئت کے ساتھ گاڑی سڑک پر چلائے تو اس کا یہ انوکھی ڈرائیونگ کو دیکھ کر چلتا ہوا ٹریفک رک سا نہیں جائے گا ...... بس اسی لیے مجوزہ موٹر کار رینے سے محفوظ رہنے کے لیے اور عمدہ ڈرائیونگ کے لیے اس تنظیم نے "بجاج" آٹوموبائل سے استدعا بھی کی ہے کہ وہ مستقبل میں اپنی گاڑیوں کا میکانزم ان کو بھی ذہن میں رکھ کر ترتیب دیں۔ ویسے اس تنظیم کے ذمہ داران کو ان کی موثر کارکردگی کے لیے ہم نے بھی اپنے سیدھے ہاتھ سے چند مشورے رقم کیے ہیں۔ شاید انہیں پسند آئیں جیسے بائیں ہاتھ کے چلن کو مزید فروغ دینے کے لیے "لیفٹ ہینڈر" کی بالادستی وہ سماج کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی دلیل تو وہ یہ دے سکتے ہیں کہ ٹریفک کا سب سے پہلا اصول جو بائیں ہاتھ کی جانب سے چلنے کا ہے وہ انھیں سے مستعار لیا گیا ہے یعنی بایاں ہاتھ سلامتی کا ضامن بننے لگی کا۔ اسکے علاوہ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک مدت سے وقت انھیں کے ساتھ رہا ہے کیوں کہ گھڑی ہر ملک اور ہر سماج میں بائیں ہاتھ پر ہی باندھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور دلیل وہ یہ بھی دے سکتے ہیں کہ ان کی پیروی اہل زبان ہی نہیں کرتے بلکہ خود زبانیں بھی انھیں ہی follow کرتی ہیں اس لیے تو دنیا کی بیشتر زبانیں بائیں جانب سے لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ کرکٹ کھیل میں "لیفٹ ہینڈرس" کے زبردست چوکوں، چھکوں کی مثال بھی دے سکتے ہیں۔ ماسوا ان تمام دلائل کے وہ ایتابھ بچن سے بھی استفادہ حاصل کرسکتے ہیں اور فلموں میں ان کے "لیفٹ ہینڈ" کے کرارے گھونسوں کو بطور نمونہ پیش کرسکتے ہیں، یا وقت ضرورت رسید بھی کرسکتے ہیں۔ مزید برآں سماج میں رائج چند محاوروں کے خلاف بھی سبردست وہ احتجاج کرلیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا ..... جیسے کسی معمولی کام کی انجام دہی کے لیے کہا جاتا ہے کہ "یہ کام تو فلاں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"! جب کہ "لیفٹ ہینڈرس" کے لیے محاورہ میں دائیں

ہاتھ کا کھیل کہنا صحیح ہوگا۔ اس محاورہ کے علاوہ دائیں ہاتھ کے کھیل کا محاورہ بھی عام بول چال میں مروج ہونا چاہیے۔ اسی طرح "رائیٹ ہینڈرس" کے لیے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ "فلاں، فلاں کا دایاں ہاتھ ہے جبکہ "لیفٹ ہینڈرس" کے تعلق سے مذکورہ محاورہ میں " فلاں فلاں کا بایاں ہاتھ بھی کہنا چاہیے۔

نیز "لیفٹ ہینڈرس" کی فلاح و بہبود کے پیش نظر تنظیم کو چاہیے کہ وہ سماج کے مختلف شعبۂ حیات سے متعلق نامور "لیفٹ ہینڈرس" کی خدمات حاصل کرے اور ان کی گوناگوں فنی سرگرمیوں سے تنظیم کو فعال بنائیں۔ درین اثنا ملک کے مشہور "لیفٹ ہینڈرس" کرکٹرس کے کرکٹ میچ اور "لیفٹ ہینڈیڈ شعرائے کرام کے آل انڈیا مشاعرے بھی تنظیم کو فعال بنانے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ بعدازاں ان بھیرتی سرگرمیوں کی آمدنی سے شہروں قصبوں کے "لیفٹ ہینڈرس" کے لیے وظیفے بھی مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ "لیفٹ ہینڈیڈ پریکٹس" کو مقبول خاص و عام بنانے کے لیے مذکورہ تنظیم "لیفٹ ہینڈرس" کے جلسے سمینار اور مذاکرے بھی منعقد کراتی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے نیز "لیفٹ ہینڈ ورکنگ" کے ورکشاپ بھی تنظیم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ اسی طرح تنظیم کو چاہیے کہ وہ پارلیمنٹ اور اسمبلی میں "لیفٹ ہینڈرس" کے لیے آبادی کے تناسب سے چند سیٹوں کا مطالبہ ضرور کرے تاکہ جمہوری ایوانوں کے کامیاب اجلاس میں رائٹ ہینڈیڈ اراکین کے کمزور گھونسوں کی خفیف آوازیں بھی گونجتی رہیں اور ساتھ ہی لیفٹ ہینڈیڈ اراکین کے کرارے گھونسوں کی بازگشت بھی سنائی دیتی رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جس طرح لفٹسٹ نظریات رکھنے والوں کو حکومت میں اہم مقام حاصل ہے اسی طرح لیفٹ ہینڈرس کو کابینہ میں بھی نمائندگی حاصل ہوسکتی ہے اور ان نمائندوں کی کوششوں سے ملک میں لفٹ ہینڈرس کے لیے علحدہ فیکٹریاں اور ادارے ہی نہیں علحدہ ریاست بھی قائم ہوسکتی ہے لفٹسٹ خیالات کے حامل جیوتی باسو جیسا لیڈر لیفٹ ہنڈرس میں پیدا ہوتا ہو تو کچھ عجب نہیں کہ وزارت عظمیٰ کا اسے پیشکش ہو!

●●

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

(آخری قسط)

دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا

درگاہ حضرت سلطان جی رح :

سڑک کے بیچوں بیچ نیلی گنبد سے آگے بڑھ کر ہمایوں کے مقبرے کے سامنے بس رکی ہم اتر کر سڑک پار کر کے بستی نظام الدین میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف مرکز تبلیغی جماعت اور مسجد۔ بائیں جانب غالب اکیڈمی کی عالی شان عمارت اور اسی کے برابر مقبرہ غالب ان کے درمیان سے گزر کر ہم درگاہ شریف کے احاطے میں داخل ہوئے۔ پچیس تیس سال پہلے تک یہ احاطہ اچھا خاصا ایک میدان تھا جس میں سے گزر کر زائرین اطمینان اور آرام سے درگاہ اور مسجد تک جاتے اور آتے تھے مگر اب وہ غائب ہو گیا۔ کنجڑے۔ قصائیوں۔ پھول والوں۔ بھٹیاروں اور تعویذ گنڈے، فلیتے بیچنے والے ملاؤں نے سارے علاقے کو اپنے نرغے میں لے کر اس قدر تنگ و تاریک کر رکھا ہے کہ سارا آرام و اطمینان غارت ہو گیا اور درگاہ کے زیر سایہ ابدی نیند سونے والے مغل بادشاہ، شہزادے اور شہزادیاں بھی شاید اپنی قبروں میں دم گھٹتا ہوا محسوس کرتے ہوں گے۔ ..... اس بے ہنگم بھیڑ بھاڑ کے باوجود درگاہ پر حاضری ہوئی۔ فاتحہ گزرانی اور مسجد میں نماز بھی ہوئی۔ دل چاہ رہا تھا ذرّے ذرّے پہ سجدہ کروں اور آنکھیں چھپے چھپے کو چوم لیں تھیں سلطان جی رح کے پائنتی امیر خسرو کا مزار ہے جہاں وہ مشہور کھرنی کا درخت آج بھی موجود ہے جس کی یہ کرامت ہے کہ دو چار کھرنیاں کھا لینے سے فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔ مزار کے کمرے اور حصار کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے اس باکمال، صاحب دل شاعر کی آرام گاہ عرصے سے عدم توجہی کے باعث رنگ و روغن اور صفائی کی محتاج ہے، جی بہت دکھا۔۔ ذرا آگے بڑھے ایک کمرہ نظر آیا جس پر لکھا تھا " خواجہ حسن نظامی صاحب کی بیٹھک "چھوٹی بڑی تقریباً پانچ سو تصانیف کی اس عبقری شخصیت کی یاد نے سر جھکایا اور اسی عالم میں ان کا " روضہ کا تعویذ اور روزنامچہ یاد آ گئے تعویذ تو مریدوں میں بٹتے تھے اور روزنامے میں وہ سارے دن کی مصروفیت کا اندراج کیا کرتے تھے۔ کون آیا۔ کس سے ملے؟ کیا کھایا۔؟ آج سرسوں کا ساگ پکا تھا۔ صبح کھچڑی کھائی تھی"۔ لارڈ ارون بتھ گمّے وائسرائے ہند سے ملاقات کا احوال جس کو وہ ہمیشہ "مشکل نام وائسرائے" سے یاد کیا کرتے تھے۔ اس روزنامچے

کے حاشیہ پر یہ وظیفہ بھی خاصے کی چیز ہوا کرتا تھا۔" ہر گھر اردو ہر گھر اللہ۔ ہر گھر اردو۔ ہر گھر اللہ"۔ اس کو روزنامچے کے حاشیہ کے چاروں طرف لکھا جاتا تھا۔ . . . . ادھر سے فارغ ہو کر شتابی سے سیدھے وہیں پہنچے جہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ یعنی حضرت غالبؔ کے آستانے پر۔ یہاں کی رونق سے وہ بمقابلہ امیر خسروؒ زیادہ خوش حال اور زندگی نظر آئے اور اب تو انھیں اپنے یہ الفاظ "سوری" (sorry) کہہ کر واپس لے لینا چاہیے "میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں" کیونکہ ساری دنیا ان کی زمزمہ سنجیوں کو سننے کے لیے چمنوں پہ چمن اور باغوں پہ باغ بنائے جا رہی ہے اور کے۔ ایل سہگل اور دوسرے آتش نواؤں کے گائے ہوئے ان کے نغموں پر سر دھننے لگی ہے اور اب کوئی یہ کہنے والا نہیں رہا۔" اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے"۔ میر

تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل

بخدا واجب الزیارت ہے

فلم غالب کی کامیابی اور مقبولیت کے بعد سہراب مودی نے ازراہِ اظہارِ عقیدت یہ خوب صورت مرمریں مقبرہ مرزا غالب کی عسرت و بدحالی کو چھپانے کے لیے ۱۹۵۵ء میں بنوایا تھا۔ ایک اور بات بھی ہمارے علم میں آئی کہ غالب کے بائیں جو قبر ہے وہ ان کے چہیتے بھانجے (بیوی امراؤ بیگم کی بہن کے بیٹے) زین العابدین خاں تخلص عارف کی ہے جو غالب کو بہت پیارے تھے اور ایک خوش گو خوش فکر شاعر بھی تھے، جب جوانی العمری میں ان کا انتقال ہوا تو غالب نے غم و اندوہ کے عالم میں ڈوب کر ایک پُر درد مرثیہ کہا تھا اور خون کے آنسو بہائے تھے، یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔ مقبرہ سے لگی ہوئی "غالب اکیڈمی" کی پرشکوہ عمارت یہ گویا آج کل نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اسد اللہ خاں بہادر کا دیوانِ عام ہے جہاں آئے دن کوئی نہ کوئی سیمینار یا کانفرنس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مزارِ غالب پر گلہائے عقیدت نچھاور کرنے کے بعد کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے اور پھر دلی واپس . . . چلے آئے اور چاندنی چوک کی طرف سے بلی ماران میں داخل ہو کر "شریف منزل" مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی حویلی پہنچے، اسی کے روبرو گلی قاسم جان (آج کل جو اردو والوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے) میں پچاس ساٹھ قدم چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک اینٹوں کا گودام نظر آیا، کہا جاتا ہے گودام کی یہ عمارت ہی کبھی غالب کا مکان ہوا کرتا تھا۔ شاید اپنے اسی مکان کے تعلق سے انھوں نے فرمایا تھا۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے!!!

اس کی خستہ حالی اور ویرانی کو دیکھ کر دل کو ایک دھچکا لگا دیوڑھی میں تشریف فرما سیٹھ صاحب سے پوچھا کیوں صاحب، کیا یہ وہی حویلی ہے جس میں کبھی مرزا نوشہ رہا کرتے تھے۔ ایک کرخت، کھردری اور ٹھیٹھ کرخندار لب و لہجے میں جواب ملا" ہاں جی، ایں ہی رہا کرتا تھا"۔ (جی ہاں! یہیں رہا کرتا تھا) . . . صرف دیوڑھی ہی کے سقف و دیوار اپنی اصلی حالت میں باقی رہ گئے ہیں اندر کی عمارت معدوم ہو چکی ہے۔ اندر تلے اینٹیں دھری ہوئی دیکھیں۔ ہم نے اس مشہور معروف کوٹھری کی زیارت کرنے کی غرض سے اندر جانے کی اجازت

حاصل کی۔ اس میں بقول ان کے کبھی شیطان ان کا روم میٹ ہوا کرتا تھا اور شاید وہ اس کی روم میٹی کا کریڈٹ لے کر دلی کی جھلسا دینے والی گرمی اور لو کے جھکڑوں سے بچنے کے لیے ساری دوپہر اس کے ساتھ چوسر کھیل کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے ......

حیف نہ وہ کوٹھری ملی اور نہ وہ محلسرا جس میں ان کی نیک نہاد، وفا شعار دکھ سکھ کی ساتھی عمت آب شریکِ حیات، استاد ذوق کے ممدوح نواب الہی بخش خاں معروف کی لختِ جگر امراؤ بیگم، اپنے "ستم زدہ روزگار" شوہر کی محبت میں گرفتار شکر گزاری اور امتنان کے جذبے سے سرشار رہا کرتی تھیں اور نہ وہ مسجد ہی نظر آئی جس کے زیرِ سایہ بعجلت ... ممکنہ اپنی حاجت روائیوں کی خاطر غالب نے اپنے لیے یہ "خرافات" بسائی تھی:۔

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوؤں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

اور بچھواڑے کے اس پیپل کے درخت کو غائب پایا جس کی دو چار پیلیاں کھا لینے سے حضرت غالب "غالب علی شاہ" کی کرامت سے کھانے والے پر چودہ طبق روشن ہو جایا کرتے تھے اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگتے ... چاہے دس چل کر حضرت امیر خسرو کے مزار والے کھرنی کے درخت کی کھرنیاں کھانے کی زحمت سے بچ جاتے تھے ..... جو کچھ وہاں ملا اور نظر آیا وہ تھا ایک ویرانہ، اینٹوں کا پڑاوہ، ہو کا سناٹا، خرابات کا عالم ان البتہ دیوڑھی کی چھت اور دیوار کی زیارت سے ہم نے اپنے دکھی اور مجروح دل کو تسلی کر لی کہ یہ وہی سقف و دیوار ہے جن پہ کبھی ایشیا کے عظیم المرتبت بو گزیدہ حکیم و دانا شاعر کی نظریں پڑا کرتی ہونگی۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے وہ آیا جایا کرتے ہونگے۔ (یہ ۱۹۷۲ء کا منظر ہے اب کہا جاتا ہے کہ بجائے اینٹوں کے دوسرے قسم کے "کارخانے" کھل گئے ہیں)

ایک وہ زندہ قوم ہے جو اپنے ہیرو کے گھر کو قومی دولت و اثاثہ سمجھ کر یادگار بنا لیتی ہے اور ٹکٹ لگا کر عقیدت کے جذبے اور شوق کی آنکھوں سے زیارت کرتی ہے اور ایک ہم ہیں کہ ہماری کور چشمی و بے حسی کے ہاتھوں فخر ہندوستاں اور فیلسوفِ دوراں کا رہائشی مکان حسرت و یاس کی تصویر اور مقام عبرت بنا ہوا ہے۔ کبھی کوئلے کا تو کبھی اینٹوں کا گودام بنتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار..... یہاں سے اپنے دل پر بوجھ لیے اس گلی قاسم جان میں آگے بڑھ کر ایک موڑ پر پہنچے سامنے ہی "احاطہ کالے صاحب نظر آیا۔ کالے صاحب بادشاہ کے شیخ تھے اور غالب کے ممدوح۔ جب ایک سازش کے تحت گرفتار ہو کر انگریزوں کی قید سے چھوٹے تو تھوڑے عرصہ کے لیے کالے صاحب کے مہمان رہے، لوگوں نے گرفتاری اور قید کا حال پوچھا، فرمایا بھائی، قید سے چھوٹا کون ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب "کالے" کی قید میں ہوں ....

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

اک سگرٹ ہمیں بھی پلاؤ باؤجی:

"غالبیات" سے مغلوب ہو کر گھر واپسی کے لیے ایک دوست کے ہمراہ بس میں سوار ہوئے جوں ہی اندر داخل ہوئے سگریٹوں کی خوش بو نے مشکک بار نے معطر کر دیا۔ اپنے یہاں تو بسوں میں سگریٹ نوشی کی عیاشیوں کو حاشیۂ خیال میں

بھی نہیں لایا جاسکتا۔ دیکھا اگلی نشستوں پر براجمان بگڑے دل چوہدری قسم کے لوگ ٹونٹے کی جوٹ سگریٹ کو مٹھی میں دبائے ہوئے "سلفا" کر رہے ہیں "جلا کر راکھ نہ کر دوں تو داغ نام نہیں" سگریٹ کی علت نافرجام بھی ایک مت ہی زرعی ہے۔ اُسے دیکھا طلب جاگی۔ اسے دیکھا ہوک اٹھی۔ ہمارا ہاتھ خود بخود جیب میں جا گھسا۔ ٹٹولا وہ خالی تھا۔ دوست رمز شناس نکلے، بھانپ گئے اور فوراً اپنا سگریٹ کا پیکٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ برانڈ دوسرا تھا۔ اس معاملے میں سگریٹ کی غیرت مندی اور خوبیوں کے ساتھ قابل ستائش ہے کہ "ہرجائی پن" کو پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ سگریٹ بھی اس کارخانے کا تیار کردہ تھا جس کے بنائے ہوئے دوسرے برانڈ کے ہم عادی ہیں۔ سمجھا بلڈ گروپ (Blood group) تو ایک ہی ہوا۔ غربت کے عالم میں کام چلایا جاسکتا ہے۔ ایک سگریٹ نکالا اور لائٹر دکھا کر ابھی پہلا کش ہی لیا تھا کہ کنڈکٹر بیچ گیا "کیا سگرٹ پی رہے ہو باؤجی؟" اور باؤجی کے اوسان خطا ہو گئے، پیروں تلے بس کا فرش کھسکا محسوس ہوا اپنے ہی منہ شرمندہ ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کنڈکٹر کی فہمائش کا انتظار کرنے لگے کہ وہ اب بولا کہ اب بولا "سگریٹ پینے والے فوراً بس سے اتر جائیں......" مگر کچھ بھی نہ بولا اور ٹکٹ ٹکٹ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہم نے راحت کی ایک گہری سانس لی۔ اور سگریٹ کے رکے ہوئے کش کو منہ اور ناک کے رستے خارج کیا۔ وہ پلٹ کر پھر ہماری طرف بڑھا۔ ہم پھر انجان بن کر کھڑکی سے باہر گزرتے ہوئے بجلی کے کھمبوں اور دکانوں کے سرناموں کو دیکھنے لگے ...... ایک ملتجیانہ بلکہ بھکاریانہ "آواز" آئی اور کیا آواز آئی؟ "اک سرگٹ ہمیں بھی پواؤ باؤجی" وہ مارا۔ اس آواز پر فدا ہو جانے میں تاخیر نہ کرتے ہوئے ہم نے فوراً بکمال طیب خاطر ایک "سرگٹ" اسے پیش کیا بلکہ اس کی اس عنایت کریمانہ اور سلوک "غریب پروررانہ" پر اپنے لائٹر سے سلگا بھی دیا..........

یہ واقعہ سن چوراسی کا ہے سنا گیا کہ اب دہلی کی حکومت ایک "بھیانک" قانون بنا کر اس فعل شریفانہ "دھوم پان" کو بسوں اور پبلک مقامات سے بے دخل کرنے، دو گوشہ دیس نکالا دے رہے ہیں۔

دلی کے اور بھی کوائف ہیں تو بڑے مزے کے مگر سننے اور دیکھنے لائق ضبط تحریر میں لانے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اور حیف ہم ان دونوں سے محروم ہیں...... اللہ بس باقی ہوس!

دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے جہاں منتخب ہی روزگار کے

●●

پرویز یداللہ مہدی

چائے کی چیاس

جب پینے والے کو پیاس لگتی ہے تو طرح طرح کے مہنگے مشروب عرف کولڈ ڈرنکس (COLDRINKS) نوش فرماتا ہے لیکن جب غریب کو پیاس لگتی ہے تو میونسپلٹی کے نلکے یا کسی پرائیویٹ لمیٹڈ مٹکے کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے اور یوں اپنی پیاس کو کم کرتا ہے۔ جب صاحب حیثیت اور بے حیثیت دونوں کو پیاس کی جگہ چیاس لگتی ہے تو دونوں ہی بلا تخصیص چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگاتے ہیں کہ چیاس۔ محض پیاس کا ہم قافیہ لفظ نہیں اس کی ہم وزن، ہم مطلب، بلکہ ہم طلب شئے ہے۔ جس طرح پانی کی طلب، پیاس کو اور بڑھاتی ہے۔ اسی طرح چائے کی چاہ، چیاس کو بڑھاتی ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح پانی اور پیاس لازم و ملزوم ہیں اسی طرح چائے اور چیاس بھی ایک دوسرے کا لاحقہ ہیں۔ البتہ پیاس اور چیاس میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پیاس کے مارے کو اگر پانی نہ ملے تو دیگر مائع جات، عرف کولڈ ڈرنکس سے بہل جاتا ہے۔ جب کہ چیاس کا مارا چائے کی چسکیوں کے علاوہ کسی اور شئے سے ہرگز نہیں بہلتا۔ آپ ہمیں کفرانِ نعمت کا مرتکب نہ گردانیں تو عرض کریں کہ پانی اگر نعمت ہے تو چائے نعمتِ غیر مترقبہ۔ ہماری نظر میں چائے کو اس اعتبار سے، پانی پر فضیلت حاصل ہے کہ پانی محض انسان ہی نہیں، جانور بھی پیتے ہیں جب کہ چائے صرف انسانوں کا مرغوب ترین مشروب ہے۔ ہم نے آج تک کسی چوپائے کو چائے پیتے نہیں دیکھا سوائے مالداروں کے پالتو کتوں اور بلیوں کے جنھیں چائے کے علاوہ اور بھی کئی نعمتیں نصیب ہیں جن کا ایک عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا، ان پالتو چوپالیوں کے درجات چونکہ دیگر فالتو، چوپالوں اور چوپالیوں سے بدتر زندگی گزارنے والے انسانوں سے بدرجہا بلند ہوتے ہیں اس لیے ان کی چائے نوشی استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔

چائے کب؟ کہاں؟ اور کیوں کر ایجاد ہوئی یہ ہنوز ایک تحقیق طلب نکتہ ہے، البتہ جہاں تک اس کی دریافت کا معاملہ ہے محققین میں اس کے تعلق سے خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ چائے کی دریافت کا سہرا چینیوں کے سر باندھتا ہے تو دوسرا انگریزوں کے سر۔ خیر سہرا چاہے کسی کے سر بندھے چائے آج ہر کس و ناکس کے منھ سے لگی ہوئی ہے، اور اس بری طرح لگی ہوئی ہے کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ؎

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی!

دنیا ترقی کر کے چائے جیسی حقیر فقیر شئے اس کمبل کے مماثل ہوگئی ہے جس کے تعلق سے کسی دانا کا یہ قول اکثر موقع بے موقع دہرایا جاتا ہے کہ میں تو کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کم بخت کمبل ہی مجھے نہیں چھوڑتا!

ایسا نہیں ہے کہ چائے کی کھوج سے پہلے، لوگ بآگ مشروبات کے نام پر صرف پانی پی کر گزارا کیا کرتے تھے انسان جو کہ فطرتاً پینے پلانے کا شوقین ہے اسی لیے منہ کا مزا بدلنے کے لیے مفلس و قلاش لوگ ٹھرّا نا تیزاب اور صاحب استطاعت افراد خالص انگوری شراب کے جام لنڈھایا کرتے تھے لیکن چائے کے بنی نوع انسان کے روزمرہ معمولات عرف ماکولات و مشروبات کے زمرے میں داخل ہونے کے بعد مے نوشی پر چائے نوشی کی عادت غالب آگئی نتیجتاً مئے نوشوں کے مقابلے میں چائے نوشوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، کیوں کہ عادی قسم کے رند بلانوش بھی محض اس تہمت سے بچنے کے لیے دن میں کم از کم ایک آدھ بار چائے کا پیالہ ہونٹوں سے ضرور لگاتے ہیں کہ ؎

ہائے ظالم تو نے پی ہی نہیں

چائے کی دریافت سے دنیا میں کوئی سرخ سبز یا پیلی کلر انقلاب آیا یا نہیں، یہ تو ہم نہیں جانتے البتہ کسی من چاہے یا ان چاہے انقلاب سے قطع نظر ہمارے معاشرے میں چائے کے چلن کے عام ہوتے ہی ایک حیرت انگیز بلکہ تاریخ ساز تبدیلی ضرور آئی۔ تبدیلی سے مراد یہ نہیں ہے کہ چائے کی پیالی نے انسانی سماج میں صدیوں سے رائج طبقاتی درجہ بندی کی لعنت کو یکسر ختم کر کے دنیا کے سارے غریبوں کو راتوں رات امیر اور تمام امیروں کو غریب کر دیا۔ چائے میں اگر یہ تاثیر ہوتی تو پھر دنیا بھر میں آج جس طرح کمیونزم کا قلع قمع ہوا ہے وہ بہت پہلے ہو گیا ہوتا۔ تبدیلی سے ہماری مراد صرف اتنی ہے کہ پہلے سماج کے جو دو طبقہ جات کے مابین ان کے مختلف معیار زندگی رہن سہن کے الگ الگ طور طریقوں کی وجہ سے کوئی قدر مشترک خورد بین کے ذریعہ بھی دکھائی نہیں دیتی تھی، اب انہی کے بیچ چائے کی شکل میں کم سے کم ایک قدر مشترک، بلکہ مشروب مشترک دکھائی تو دیتا ہے جو انھیں لمحاتی طور پر ہی سہی ایک پیٹ فارم پر اکٹھا کرتا ہے، یعنی پہلے جو محمود و ایاز صرف خانہ خدا میں پہنچ کر ایک ہوا کرتے تھے اب چائے خانوں میں بھی ایک ہونے لگے ہیں۔ بقول شاعر ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے ؛ چائے خانوں میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

چائے چوں کہ فی زمانہ خاطر تواضع کا سب سے آسان سستا اور مجرب نسخہ ہے اس لیے گھروں بازاروں، ہوٹلوں، پارکوں، ٹرینوں غرض سبھی پرائیویٹ اور پبلک مقامات پر اس کا طوطی نہ صرف بولتا ہے بلکہ ٹھونگیں بھی مارتا ہے ایسے مفلوک الحال گھرانے جہاں کھانا دن میں صرف ایک بار بنتا ہے وہاں چائے خدا جھوٹ نہ بلوائے دن میں کئی کئی بار بنتی ہے۔ دنیا بھر کے مروجہ مشروبات میں صرف چائے ہی وہ مشروب خصوصی ہے جو بلا تکلف ہر موسم میں ہر وقت پی اور پلائی جاتی ہے۔ موڈ خراب ہے تو چائے پیجیے کہ اس سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے۔ موڈ اچھا ہے تو چائے پیجیے کہ اس سے موڈ مزید اچھا ہوتا ہے، کسی کا انتظار ہے تو چائے نوش فرمایئے کہ اس سے انتظار کی تلخی کم ہوتی ہے جس کا انتظار تھا وہ آجائے تو اس کے آنے کی خوشی میں چائے پیجیے کہ اس سے خوشی کا لطف دوبالا ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ سویرے آنکھ کھلنے سے رات گئے آنکھ لگنے تک ایسے ایسے مواقع آتے ہیں جب چائے کی چاٹ مٹائی جا سکتی ہے چائے دیگر مشروبات کی طرح بظاہر حلق سے نیچے ضرور اترتی ہے لیکن اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور کچھ اس طرح بولتا ہے کہ آدمی پھر اگلے وقتوں کے محاوروں میں ترمیم کر کے انہیں نئے انداز میں بولتا ہے، مثال کے طور پر جہاں چاہ وہاں راہ، اب جہاں چائے وہاں جا بولا جاتا ہے بلکہ یہ محاورہ بھی گھڑ لیا گیا ہے' پہلے چائے پیچھے رائے! حتیٰ کہ اب چائے نے آدمی کے چال چلن اس کے عادات و اطوار تک بدل دیے ہیں پہلے غریب الوطنی کے عالم میں آدمی ؎

بیٹھ جاتا تھا جہاں چھاؤں گھنی ہوتی تھی

ب کہ آج ؎

بیٹھ جاتا ہے جہاں چائے بنی ہوتی ہے

چائے اصل میں ایک خاص قسم کی پتی کا نام ہے، جس کا رنگ اوپر سے تو پکا سیاہ ہوتا ہے لیکن اندر سے یہ بڑی رنگارنگ نی ہے، یہ اپنا اصل رنگ کھولتے ہوئے پانی میں پڑنے کے بعد ہی دکھاتی ہے۔ گویا چائے کی پتی بھی مہندی کی طرح اوپر سے ر اور اندر سے کچھ اور ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ؎

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

اسی طرح چائے بھی رنگ لاتی ہے اپنا خوب پک جانے کے بعد۔!

چائے کا شمار اگرچہ موسمی یا غیر موسمی میوہ جات میں نہیں ہوتا پھر بھی یہ اجناس کی طرح کھیتوں میں نہیں اُگتی، اناس کی طرح نوں میں پروان چڑھتی۔ اور پھولتی پھلتی ہے البتہ اسے چوں کہ صرف ہل اسٹیشن کی آب و ہوا ہی راس آتی ہے اس لیے ے شہری باشندے جنھیں باغبانی کا جز وقتی مشغلہ بے حد مرغوب ہوتا ہے وہ اگر چاہیں بھی تو اپنی تمام تر زرعی صلاحیتوں ، باوجود اپنے گھر کے اگاڑی یا پچھاڑی چائے کا باغیچہ نہیں اُگا سکتے۔ ظاہر ہے چائے کا باغ کوئی MONEY PLANT ں پلانٹ تو ہے نہیں کہ کہیں بھی جڑ پکڑ لے اس کے لیے سطح زمین سے کافی اوپر اٹھنا لازمی ہے اور شہر کے لوگ اتنا ر اسی وقت اٹھتے ہیں جب مستقلاً جہاں سے اٹھتے ہیں پھر ایک چائے کے باغ ہی پر کیا موقوف، سارا باغ ارم ان کی ترس میں ہوتا ہے، اگر کوئی جہاں سے اُٹھے بغیر چائے کے باغ دیکھنا چاہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، دو نمبر کے ندے کی بدولت اگر اس کی تجوری میں دولت ہی دولت بھری ہو تو پہلی فرصت میں کسی بھی ہل اسٹیشن کا رُخ کرکے چائے کے ات کی بہ نفس نفیس سیر کرسکتا ہے۔ اور اگر ایک نمبر کی محدود آمدنی میں بمشکل گزر بسر کرتا ہو تو کسی بھی نزدیکی سینما ہال میں جاکر دہ سیمیں پر چائے کے باغ کی ایک آدھ جھلک دیکھ سکتا ہے کہ ہندوستانی فلموں میں چائے کے باغات کا ایک آدھ منظر یقینی طور پر ہوتا ہے! (جاری)

پروفیسر امیر عارفی
صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

سرور ڈنڈا

حیدرآباد ہمیشہ سے دکنی زبان وادب کا مرکز رہا ہے اور اس زبان کی مٹھاس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو دکنی سے شناور ہیں اور اس کا لطف بھی وہی اٹھا سکتے ہیں جو زبان وادب اور مختلف الفاظ کے معنی ومفہوم سے آشنا ہیں۔

خالص دکنی زبان کی شاعری کی اپنی روایت رہی ہے۔ جاریہ صدی میں دکنی کو عوامی زبان (شعر میں) اور وہ بھی صوتی آوازوں کے ذریعے اسی شعر کے سارے محاکات کو منتقل کرنے میں رحیم صاحب میاں کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم لوگ اپنے آبائی محلہ قاضی پورہ سے عارضی قیام کے لیے نامپلی اسٹیشن کے پاس "گیان باغ" کی ملگیوں میں منتقل ہوئے۔ دو ملگیوں میں ہمارا ایک "مطبع، مطبع ادبیہ" تھا اور دو ملگیوں میں ہمارا قیام تھا۔ غالباً وہ طاعون کا زمانہ تھا وہیں پر میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ اسٹیشن سے لگا ہوا چھوٹا ناکہ (تھانہ) وہاں رحیم صاحب میاں محکمۂ پولس میں ملازم تھے اور ان کی ڈیوٹی اسی ناکہ پر تھی۔ وہ اکثر شام میں میرے والد محترم قاضی عارف ابوالعلائی سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ، شیروانی اور سر پر ہلکے رنگ کا پیلا شملہ، پان بہت کھاتے تھے۔ مختصر ترین ڈاڑھی تھی وہ ہمیشہ مسکراتے تھے۔ ہم لوگ کبھی کبھی فرمائش کرتے تھے کہ چچا شیر کی آواز سنائیے اور وہ اس انداز سے نقل کرتے جیسے جنگل میں شیر دہاڑ رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ ہنکا لگانے والوں کی آوازوں کی نقل بھی کرتے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں میرے والد دکنی زبان کی لغت تیار کر رہے تھے جس کی دو جلدیں "الف، ب، دکنی زبان کی حیثیت" شائع ہو رہی تھیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں رحیم صاحب میاں کے مشورے بھی شامل تھے۔ اس کے بعد ذرا ہوش سنبھالا تو قاسم رضوی کے زمانے میں مجلس کے جلسوں میں نذیر دہقانی کا طوطی بول رہا تھا اور وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے دکنی شاعری میں سیاسی موضوعات کو بے تکلفی سے استعمال کیا۔ اس کے بعد اعجاز حسین کھٹا کو سنا، پھر علی صاحب میاں کو سنا جن کے "پچوّے" بڑے مشہور ہوئے۔

۱۹۴۸ء کے بعد ساری محفل درہم برہم ہوگئی۔" دہقانی اور کھٹا پاکستان چلے گئے، علی صاحب میاں کبھی کبھی اپنے "چوؤں" سے مشاعروں کو نوازتے رہے۔

پولیس ایکشن سے قبل فن کاروں کا ایک زبردست گروپ تھا۔ جو "نانگو برادرس" کے نام سے بڑا عمدہ پروگرام پیش کیا کرتے تھے۔

۱۹۵۲ء کے الیکشن میں دکنی زبان کا ایک اور شاعر ابھرا جو مختصر سے عرصے میں ساری محفل پر چھا گیا۔ دکنی شاعری کو نذیر دہقانی نے سیاسی موضوعات سے متعارف کیا تھا اور سرور ڈنڈا نے سیاسی موضوعات کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح سے شاعری کا دامن مالا مال کر دیا۔

سرور بھائی کا نام۔ غلام سرور خاں تھا انھوں نے فائن آرٹس کالج سے ڈپلوما حاصل کیا۔ اس کے علاوہ ہندی کے ابتدائی امتحانات پاس کیے تھے۔ "کمرشیل آرٹ" سے بھی انھیں دل چسپی تھی۔ سعادت علی خاں ان کے گہرے دوست تھے۔ معظم جاہی مارکٹ پر "انگارے" کے دفتر کے نیچے ان کا نگار خانہ تھا۔ وہاں سرور بھائی ایک دو گھنٹے کام کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ "صبا" کے دفتر یا "پھر" اورینٹ ہوٹل" میں گزرتا تھا۔ رات میں جب ساری دوکانیں بند ہو جاتیں تو گلبہار کمپنی پر محفلِ یاراں جمتی تھی سعید بن محمد نقش، سعادت علی خاں، حمایت اللہ، اقبال قریشی اور خدا جانے کتنے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔ گلبہار کمپنی کی محفل میں نئے نئے محاورے ایجاد کیے جاتے تھے اور اور حمایت بھائی نئے ائیٹم پر مشورہ کرتے، اقبال قریشی مختلف نظموں، غزلوں کی دھنیں سناتے اور کبھی کبھی عزیز قیسی بھی اس محفل میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس محفل کے شرکا میں میں سب سے چھوٹا تھا۔ سرور بھائی کی محبت اس قدر اٹوٹ تھی کہ وہ مجھے اور نصیر اختر کو اپنا چھوٹا بھائی کہہ کر ہر ایک سے . . . متعارف کرواتے تھے محبت کی وجہ سے میرا ان کا ساتھ ۲۴ گھنٹوں میں کم از کم ۱۴ گھنٹے رہتا تھا۔ ہر جگہ ساتھ گھومتا تھا۔ اس وقت تک میرا ادبی شعور تو بیدار ہو گیا تھا لیکن میں نے باقاعدہ شاعری کی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا۔ ان دنوں مشاعروں کے ہیرو، مخدوم، اریب اور سرور بھائی تھے۔

۱۹۶۰ء میں میرے علی گڈھ جانے پر یہ سلسلہ عارضی طور سے ٹوٹ جاتا تھا، چھٹیوں میں جب میں حیدرآباد آتا تو پھر رات دن میرے اور نصیر اختر کے سرور بھائی کے ساتھ گزرتے تھے۔ اکثر مشاعروں میں دو بجے بجے رات تک ان کے ساتھ رہتا تھا — مشاعروں کی سرگرمیوں کے نتیجے میں "کمرشیل آرٹ" کو جو وقت اور محنت چاہتا ہے خیرباد کہہ کر سرور ڈنڈا نے "گتہ داری" شروع کی لیکن وہ اس کوچہ سے ناآشنا تھے۔ سپروائزر انھیں ہر طرح کا اطمینان دلا کر خوب کھاتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ محکمہ تعمیرات سے جو چیک ملتا وہ سیدھا مارواڑی کے پاس چلا جاتا — اس چکر سے وہ بڑی مشکل سے چھٹکارا پا سکے۔

بیوی لیڈی ڈاکٹر تھیں جو ان کی رشتہ دار بھی تھیں لیکن ان کی نجی زندگی کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ ایک لڑکا (فیروز) اور ایک لڑکی (فردوس) سے وہ بڑے مطمئن تھے۔

کمرشیل آرٹسٹ اور گتہ داری کے زمانے میں وہ دکنی کے مقبول ترین شاعر بن چکے تھے سیاسی جلسوں اور مشاعروں میں انھیں سننے کے لیے ہزاروں لوگ شریک ہوتے تھے اور صبح تک ان کے کئی شعر اور مصرعے زبان زد خاص و عام ہو جاتے تھے۔ مخدوم، اریب، شاہد صدیقی وغیرہ ان کی شاعری کے مداح تھے۔ جونیر شاعر ان کی مقبولیت سے خار کھاتے تھے لیکن کبھی ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ مجھے اکثر بھی شعری محفلوں میں سرور بھائی کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا۔ بنجارہ ہلز کی ایک محفل میں بڑی مشکل سے شرکت کے لیے راضی ہوئے اور وہاں انھوں نے فی البدیہہ ایک غزل پڑھی جس کے ایک شعر نے مشاعرہ کو لوٹ لیا تھا ۔۔۔

سرِ شام پلکاں پو جل رئیں چراغاں
بہت آج دل کی لگی کھل گئی نا ں

مشاعرہ تو انھوں نے لوٹ لیا لیکن وہ خود بھی لٹ گئے تھے۔ سارا رستہ خاموش رہے۔ اس سے پہلے کبھی میں نے انھیں مغموم نہیں دیکھا تھا۔

وہ اپنی زندگی کے ایک ایک واقعہ اور حادثے سے مجھے متعارف کرا چکے تھے۔ اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں انھوں نے بتایا تھا کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی گنبد واقع گلبرگہ میں نقاشی کا کام سعید بن محمد وغیرہ نے کیا تھا اور شاگرد کی حیثیت سے سرور بھائی بھی ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ پینٹ کرنے لگے میں چانک کچھ مصرعے گنگنانے لگا تو سعید بھائی نے کہا کہ ارے تو شاعری کرنے لگا یہ خواجہ کا فیضان ہے۔ اس طرح باقاعدہ ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔

سرور ڈنڈا کی والدہ کو دکنی زبان و محاوروں پر بڑا زبردست عبور تھا۔ وہ اکثر اپنی والدہ سے دکنی الفاظ کی سند حاصل کرتے تھے۔ سعید بن محمد نقش کے تو وہ شاگرد تھے ہی اپنی ابتدائی نظمیں انھوں نے اعجاز حسین کھٹا کو دکھائی تھیں جس کو دیکھ کر کھٹا نے کہا تھا کہ "سرور تیرے میں شاعری کے بڑے جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ تو ریاض کر ایک دن تیرا بھی نام چمک جائے گا۔" اس لیے وہ مرتے دم تک کھٹا کو معنوی استاد مانتے رہے۔

انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے کا کلام لکھ کر مجھے دیا تھا جو قیام دہلی کے زمانے میں سیلاب کی نذر ہو گیا۔ لیکن ایک خط اور کافی کلام ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ابھی تک میرے ہاں محفوظ ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر میں قرض ادا کر رہا ہوں۔

سنہ ۶۰ء میں انگارے کی ہفتہ وار اشاعت میں ان پر میرا پہلا مضمون شائع ہوا۔ جس سے وہ بہت خوش تھے۔ ۱۹۶۲ء میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) کی فرمائش پر میں نے "عوامی دور" ہفتہ وار کے لیے سرور بھائی پر ایک صفحہ کا طویل مضمون لکھا جس سے وہ شمالی ہند میں متعارف ہوئے۔ اپنی زندگی میں ہی انھوں نے اپنا کلام اکٹھا کر لیا تھا اور اس کا نام میں نے "املی پن" رکھا تھا جو انھیں بہت پسند آیا۔ ان کی ابتدائی شاعری کو چھوڑ کر سنہ ۱۹۵۲ء سے تا دم زیست ان کے ہر شعر اور نظم وغیرہ کا پہلا سامع

راقم الحروف ہوا کرتا تھا۔

بہت جلد سرور بھائی اچھوتے موضوعات اور سیاسی مضامین کو نظموں اور غزلوں کا روپ دینے لگے۔ اپنے حالات کو دکنی تشبیہوں اور محاوروں کا جامہ پہنانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا اور وہ ایک لفظ کو کئی کئی معنوں میں استعمال کرکے زبان کے لطف میں اضافہ کردیتے تھے۔ سرور بھائی نے بتایا تھا کہ انھوں نے اپنی پہلی نظم رائچور کے آل انڈیا مشاعرہ میں سنائی تھی جس کی صدارت حضرت امجد حیدرآبادی فرما رہے تھے۔ حضرت امجدؔ نے سرور بھائی کی نظم سن کران کی بڑی ہمت افزائی کی تھی اور انھیں دعائیں بھی دیں۔ علی صائب میاں کو میں نے سرور کو "ارے تُرّے" سے مخاطب کرتے دیکھا۔ وہ اکثر کہا کرتے "ارے پوٹے نیا کچھ لکھا ہے تو سنا"

وہ عوام کے دلوں کی بات کو سیدھے سادے انداز میں دکنی زبان میں عوام کے سامنے پیش کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کئی مصرعے اور اشعار ضرب المثل بن گئے تھے۔ غزل جیسی نازک صنف میں سیاسی طنز ملاحظہ کیجیے۔ یہ غزل سنہ ۱۹۶۲ء میں کہی گئی جب چین نے حملہ کیا تھا۔ اور کرشنا مینن وزیر دفاع تھے:

چو رستے پہ پہنچے جو سیاست کی یہ بولے
ہندا بھوں مائی باپ ذرا رستہ بتانا
تعریفِ سیاست کی فقط اتی ہے یارو
جس کو بھی ملیا موقع اسے ڈھول جمانا

پولس ایکشن کے بعد کی تباہی و بربادی کا کس قدر دل دوز نقشہ پیش کیا ہے، اس شعر پر مشاعرے میں اکثر لوگ رو پڑتے تھے شعر دیکھیے:

کیا ہم پو گزرگئی اے بات تو نکو پوچھ
پاپڑ کے نا دبیل دیا ہم کو زمانہ

سرور ڈنڈا ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری مڈل کلاس کے سیاسی، سماجی اخلاقی اور تہذیبی دائرے کے گرد گھومتی تھی، غزل میں نادر تشبیہ و استعارے کا استعمال برمحل ہوتا تھا۔ غزل کے چند شعر دیکھیے:

نظر بھر کو جب بھی اُنوں منجے دیکھیں
میری آرزوؤں کی مشعل جل گئی ناں
سرِ شام پلکوں پو جل رئیں چراغاں
بہت آج دل کی کلی کھل گئی ناں
میں ان کے لیے جنگل جنگل بھٹک رہوں
اُنوں سمجھیں سر سے بلا ٹل گئی ناں

دکنی محاوروں کا استعمال کس خوبی سے کیا ہے:

جب سے کسی کے اُپر دل آگیا ہمارا
ارماں کلاٹیاں کھائیں گردش میں ہے ستارا
رنگ لا ئینگا نہ اک دن گمت کریگا اک دن
کچھ بانکپن تمارا کچھ بانکپن ہمارا

ب ایک شہکار سراپا پڑھیے۔ سراپا سے اندازہ لگائیے کہ یہ بنجارہ ہلنکی بل کھاتی ہوئی راہوں پہ واقع عالیشان
کان سے کسی حسین مکیں کا ذکر تو نہیں!

چال بولے تو نشہ بھی پانواں پڑنا
چال بولے تو ندی کا پانی چڑھتا
چال بولے تو بجلی چمکنا کتے
چال بولے تو شعلہ لپکنا کتے
چال بولے تو پھولاں مہکنا کتے
چال بولے تو شعراں مہکنا کتے
چال بولے تو پنگٹ پہ چھلنا کتے
چال بولے تو مٹی میں ڈولنا کتے
چال بولے تو شاخوں کا ہلنا کتے
چال بولے تو پھولوں کا ہسنا کتے
چال بولے تو بنگوئی میں جھلنا کتے
چال بولے تو پھولوں کا کھلنا کتے

یھا آپ نے صرف متوالی چال کے کتنے "غلید" انھوں نے پیش کیئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نظم ناتمام رہی۔
م غزل کے ساتھ ساتھ انھوں نے دوہوں کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی اور بہت کامیاب دوہے لکھے:

اب ذرا دکنی غزل کا ایک اور رنگ دیکھیے:

میرے چمن میں پھولاں کم کم ہور دھتورے اُبل پڑئیں
جنگاں جنگاں سے کاٹی بھرآئی جنگلی بیلاں منڈوے چڑئیں
امیداں کی کونپل سوکھی، ارماناں کے کلیاں آ جڑئیں
انسانوں کا حال کیا بولوں بن پتوں بسیر کھڑئیں
پورب پچھم، تر دکن، دھوم ہماری کاں کاں نیئں ہے
کیرالہ سے بنگالہ تک، بھرے نام کے بستے کھڑئیں
بن پیسوں کا عجب تماشہ نوازمانہ دکھلا رائے
مجبوروں کے بھاگاں جاگیں، فن کاراں مجبور پڑئیں

ڈنڈے صاحب پیتے پیئیں حال اٹھائیں کا ئیکو جی
زلفاں گتیاں چال چمن کی الکھیا صبح وشام پڑھیں

یہ مقطع نہیں ہے بلکہ ڈنڈا کی اپنی تصویر ہے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا اور مشاعروں میں سنا ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے مشاعروں میں شریک رہنے کے باوجود انھوں نے کبھی شراب کو چھوا نہیں بلکہ وہ مے نوشوں سے دور بھاگتے تھے

کہتے کہ "میاں رات میں ان سے دوستی اچھی نہیں، یہ لوگ اچھے خاصے انسان کو وہاب حیدر بنا دیتے ہیں!"

گیت کے میدان میں سرور بھائی نے دکنی روایات کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھا ہے اور ہر دے کی آگ کو غم دوراں میں بدل دیا ہے۔

لیکن وہ جب بھی غم جاناں کی بات کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک کے دل کی بات ان کے اشعار میں ڈھل گئی ہے۔ ایک گیت دیکھیے:

میں کہوں ہائے صنم، دل کہے ہائے ستم
موسم انگڑائی لیا، جھوم کے گایا جیا
یاد تم آئے پیا، آ بھی جا موری قسم
پریم کی اوٹ رہے، نینوں کی چوٹ رہے
ہونٹوں پہ ہونٹ رہے
تجھ بنا جینا ہے غم، کیوں مانے صنم

ایک دوسرا گیت:

ہوک سی مورے من میں اٹھے نیر برسائے
کل نہ آئے بے کل من کو جب ساجن یاد آئے
نیند کی مدھرا پی کر سارے جگ باسی چپ سوتے ہیں
ایسے میں پھر دھرتی پر کچھ کھیل نرالے ہوتے ہیں
میٹھے سُر میں سرور بیٹھا گیت یہ رو رو گائے
ہوک سی مورے من میں اٹھے ....

وہ ذات پات، رنگ و نسل اور مذہب کی دیواروں کو کبھی انسانیت کے بیچ حائل ہوتا دیکھتے تو ان کی سوچ میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ وہ زندگی کا شاعر تھا اور راست زندگی کے مشاہدہ اور مطالعہ سے اپنی شاعری کا مواد اکٹھا کر کے انھیں شعری صورت میں ڈھال کر پھر زندگی کو دوام بخش دیتا تھا۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے زمانے میں ایک کامریڈ ایک برہمن لڑکی سے عشق کرتا تھا لیکن ذات پات کی فصیل

حائل تھی اور وہ کامریڈ بڑا افسردہ رہا کرتا تھا۔ اس کی داستانِ عشق "گلبہار کمپنی" پر رات کے دو بجے تک سنتے رہے۔ اس زمانے میں سرورؔ بھائی محلّہ رزاق پورہ میں رہتے تھے۔ گرمیوں کی چاندنی رات تھی۔ جب گھر جانے کے لیے نکلے تو راستہ تمام وہ گنگناتے رہے اور دارالسلام کے قریب یہ گیت مکمل ہوگیا۔

سرور بھائی کی یہ شاعرانہ خصوصیت تھی کہ وہ جب بھی طنز و مزاح کا وار کرتے تو بھرپور کرتے اور بات کو اس طرح کہتے کہ یہ سامنے کا واقعہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ پولیس ایکشن سے پہلے مجلس اتحاد المسلمین کے عروج کے زمانے میں دکنی شاعری میں نذیر دہقانی نے سیاسی موضوعات کو موضوعِ سخن بنایا لیکن وہ یک رخی اور محدود دائرہ تھا۔ سرور بھائی نے اس موضوع کو وسعت عطا کی اور محدود سے لامحدود تک شاعری کو وسیع کردیا اور اس میں عوامی جذبات کا ابلتا ہوا لاوا بھر دیا۔ انھوں نے فراخ دلی کے ساتھ تلگو شاعری کی ایک صنف "بُراکتھا" کے فارم کو دکنی شاعری میں پورے اہتمام سے استعمال کیا اور اس کو "ڈنڈا کتھا" کے نام سے سناتے تھے۔ ●●

مانک ٹالا
(ممبئی)

ایک خود روزگار اسکیم

ایک روز صبح سویرے میرا دوست بھورے لال میرے گھر کے صدر دروازے پہ لات مار کر اسے کھول کر اندر گھس آیا۔ میرے گھر کے صدر دروازے پہ کنڈی ہی نہیں تھی کہ اس میں میری بیوی سمیت کوئی بھی چیز چوری کے قابل نہیں تھی۔

بھورے لال کے ہاتھ میں آٹو رکشا کا ایک ٹائر تھا جسے آتے ہی اس نے صحن کے کچے فرش پہ پٹخ دیا۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی اپنی ماں کی چتا کو منہ لگا کر آ رہا ہے۔

میں نے اس کے لیے صحن میں اپنی اکلوتی جھلنگی چارپائی بچھاتے ہوئے پوچھا —— "یہ کیا لیے چلے آ رہے ہو صبح سویرے —؟"

اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا —— "سرکار نے خود روزگار اسکیم کے تحت آٹو رکشہ خریدنے کے لیے جو قرضہ منظور کیا تھا اس کی رقم مجھ تک پہنچتے پہنچتے بس اس قدر رہ گئی تھی کہ میں اس کے بدلے میں صرف یہ ٹائر خرید سکا ——"

اتنے میں میرا دوسرا دوست علی میاں بھی آ دھمکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جو اس نے آتے ہی چارپائی پہ پٹخ دیا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ چنانچہ اس نے بنڈل اس انداز میں کھولا جیسے اس میں سے الہ دین کا چراغ برآمد ہونے والا ہو لیکن اس میں سے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دس بیس چڈیاں برآمد ہوئیں اور اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ ویسے تو ہمیشہ سے ہی ان کی تقریر کو ما' قل استعاروں سے عاری ہوتی ہے لیکن آج اس کی رفتار ہوائی جہاز کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ بہر حال میں نے سرکار کی مدح میں کہے گئے گل ہائے رنگین کو چھننے کے بعد اس کی تقریر کا جو مطلب اخذ کیا وہ یہ تھا ——

—— "سرکار نے خود روزگار اسکیم کے تحت میرے لیے جنرل اسٹور کا جو قرضہ منظور کیا تھا اس کی بس اتنی ہی رقم بچ سکی ہے کہ میں اس سے بچوں کی یہ دس بارہ چڑیاں ہی خرید پایا۔ اب میں "پانچ روپے، پانچ روپے" کی ہانک لگا کر بازاروں میں پھیری لگا کر یہ چڑیاں فروخت کروں گا۔"

میں گھر کے اندر گیا اور سیکل کی ٹیوب میں ہوا بھرنے والا پمپ اٹھا لایا اور انھیں دکھلاتے ہوئے گویا ہوا —— "یارو، دل دار دا! میں نے سیکل رکشا کے لیے قرضے کی جو درخواست دی تھی اس کے نتیجے پر یہ ایک پمپ میرے ہاتھ لگا ہے۔ تھوڑے سے غبارے اپنی پاکٹ سے خرید کر لایا کہ ان میں ہوا بھر کر آٹھ آٹھ آنے میں بچوں کو فروخت کروں گا لیکن دس میں سے صرف ایک غبارہ پھولتا ہے باقی پھُس ہو جاتے ہیں۔"

پھر میں نے بھائی لوگوں کو دانشی ورانہ انداز میں سمجھایا کہ ہماری سرکار نادار غریبوں کے دلدر دور کرنے کے لیے جو خود روزگار قسم کی اسکیمیں بناتی ہے یہ سب ووٹ کی سیاست ہے۔ ان اسکیموں کا حال [illegible] کے نل کی طرح ہے جو پانی آنے سے پہلے لگاتار سانپ کی طرح پھنکارتا رہتا ہے اور جب پانی آتا ہے تو دو آنسو بہا کر اس طرح خاموش ہو جاتا ہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

بھورے لال نے پھر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس قرضے [illegible] اصل رقم کی قسطیں کیسے چکا پائیں گے۔ علی میاں بڑے گھاگ آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ میاں فکر نکو۔ اگلے الیکشن پر سبھی قرضے معاف ہو جائیں گے۔ پچھلے الیکشن سے پہلے کسانوں کو جو دس دس ہزار کے قرضے ملے تھے وہ الیکشن کے موقعہ پر معاف کر دیے گئے تھے۔ انہیں بھی اسی قبیل کے قرضے ملے تھے جس قبیل کے قرضے ہمیں ملے ہیں۔

علی میاں کی بات تو معقول تھی لیکن ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم اپنا اور اپنے بیوی بچوں کی پیٹ پوجا کے لیے کون سا ذریعہ اختیار کریں —— ایک زمانہ تھا کہ ہم [illegible] نا کارہ لیکن ہمت ور اور جیالے لوگوں نے 'بھائی' لوگوں کا دامن پکڑ کر 'خود روزگار' کی اسکیمیں خود بخود تیار کر لی تھیں۔ اس زمانے میں تسکری اپنے پورے شباب پر تھی۔ سونا چاندی۔ کرنسی۔ گانجہ۔ ہیروئن اور کوکین وغیرہ کی ایکسپورٹ امپورٹ کا بول بالا تھا۔ متعلقہ محکموں اور نیتا جیوں کی بھی اُن سے گہری چھنتی تھی۔ سبھی ناکارہ بے کار دھندے پر لگ گئے تھے۔ اس طرح بے کاری اور غریبی کے مسئلے حل ہو گئے تھے لیکن جب سے ڈھول کے پول کھلنے لگے ہیں۔ حوالے اور گھوٹالے بے نقاب ہونے لگے ہیں [illegible] یعنی تحفظ کے نام پر رقمیں وصول کرنے والے پولیس Encounters میں پولس کی گولیوں سے بھونے جانے لگے ہیں۔ دنیا کا قافیہ تنگ ہو گیا ہے تو بے روزگاری نے پھر اپنے پنجے گاڑھنے شروع کر دیے ہیں۔

ہم تینوں دوست کسی زمانے میں ان حوالوں، گھوٹالوں وغیرہ کے لفڑے میں پڑے بغیر ہی بڑی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے ایک پارٹی بنائی تھی۔ پی۔پی۔پی (P.P.P.) جس کا اصل مطلب تھا پیٹ پوجا پارٹی لیکن علی میاں کی دور اندیشی ہمارے آڑے آئی۔ انھوں نے کہا کہ کہیں ہم شریف لوگوں کو پاکستان پیوپلز پارٹی کا ایجنٹ سمجھ کر سرکاری مہمان خانے میں نہ ڈال دیا جائے اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ چنانچہ ہم نے اس کا نام پی۔پی سنڈیکیٹ رکھ دیا۔ اتنا بڑا ملک ہے اس کے کسی نہ کسی حصے میں کوئی نہ کوئی

الیکشن تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہم نے سبھی سیاسی پارٹیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انھیں الیکشن کے جلسے جلوسوں کے لیے نعرے لگانے اور تالیاں پیٹنے کے لیے ٹرکوں کے ٹرک بھر بھر کر بے کار لوگ مہیا کرنے شروع کر دیئے۔ ان جلسے جلوسوں میں حصہ لینے والے تین تین پالیاں کرتے۔ اہتر نا ر اُن کے ساتھ ساتھ ان کی حلوے مانڈے سے بھی آؤ بھگت کی جاتی۔ اس لین دین میں ہزاروں بے روزگاروں کو روزگار ملتا اور ہمارے گھروں میں بھی گھی کے چراغ جلتے۔ یہ نہ صرف شریفانہ اور محفوظ و مامون پیشہ تھا کہ اس سے بے روزگاری اور غریبی کے مسائل بھی حل ہو سکتے تھے چنانچہ ہم بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ دیش کے بڑے بڑے نیتاؤں کو مشورہ دیں کہ الیکشن پانچ سال کی بجائے ہر سال کرائے جائیں۔

لیکن خدا غارت کرے ٹی۔ این۔ سیشن کو کہ جس نے یہ نادر شاہی حکم جاری کر دیا کہ الیکشن میں ہونے والے اخراجات پارلیمنٹ کی منظور شدہ رقوم سے اوپر نہیں ہونے چاہئیں اور کہ ان کا بہی کھاتہ بھی رکھا جائے ـــــ ورنہ ـــــ!

اس 'ورنہ' نے سب کی بدھیا بٹھا دی ہے کہ یہ اخراجات اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مصداق ہیں۔ اب الیکشن کے موقعوں پر نہ لاؤڈ اسپیکر بجتے ہیں۔ نہ اشتہار چھپتے ہیں اور نہ جلسے جلوسوں کی گہما گہمی رہتی ہے۔ اب الیکشن کے جلسوں میں ایسا لگتا ہے کہ لوگ اپنے کسی قریبی عزیز کی میّت کو مٹی دے کر آ رہے ہیں۔ وہ خود تو بے اولاد ہے۔ رشتہ داروں سے بنتی نہیں۔ کوئی چیچہ بھی نہیں پال رکھا۔ سرکار سے ملنے والی پگار سے عیش کی زندگی گزارتا تھا اور اب سبک دوش ہونے کے بعد پنشن سے مزے اڑا رہا ہے لیکن ہم جیسے شریف لوگوں کو یوسفِ بے کارواں بنا کر چھوڑ گیا ہے۔

ہم سرکاری 'خود روزگار' اسکیموں کا حشر دیکھ ہی چکے تھے۔ جمع جتھہ سبھی رقم بے کاری کی گاڑی ہانکتے ہانکتے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گئی تھی۔ عالی شان مکان بھی کب کے ٹھکانے لگ چکے تھے اور ہم لوگ کمہار کے محلوں میں کچے پکے مکانوں میں زندگی کی نہیا کھینے رہے تھے۔

آخر ایک روز ہم تینوں یار سر جوڑ کر بیٹھے کہ کوئی نہ کوئی تو ایسا راستہ نکالیں جو شریفانہ اور بے خطر ہو۔ جہاں الیکشن کمیشن کا ڈر ہو نہ پولس کا۔ بھائی لوگوں کا خطرہ ہو نہ مافیا کا اور نہ ہی طوطا چشم لیڈروں کی حقہ برداری کی ضرورت پڑے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد ہم ایک دھانسو قسم کی اسکیم پر متفق ہوئے ـــــ

دیش میں ہر سال کسی نہ کسی علاقے میں سیلاب سے تباہی آتی ہے یا سوکھے کی چپیٹ پڑتی ہے۔ ہم نے اپنی بی۔ پی سنڈیکیٹ کے نام میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی اور اس کا نام " جنتا سیلاب سوکھا راحت کمیٹی" رکھ دیا۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ہم کسی سے نقد رقم وصول نہیں کریں گے کیونکہ مندر، مسجد اور گوردوارہ کے نام پر بوگس چندہ مانگنے والوں نے اس دھندے کو بہت بدنام کر دیا ہے۔

اب ہم سیلاب اور قحط کے زمانے میں متاثرہ لوگوں کے لیے پرانے کپڑے جمع کرتے ہیں۔ ہم اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ امیروں کے علاقے کا چکر نہ لگائیں کہ امیر عورتیں بڑی شکی مزاج ہوتی ہیں اور ان کے میاں ان سے بھی زیادہ تنک مزاج۔ آپ کی ٹانگ اپنے جبڑے کے شکنجے میں اس طرح جکڑ لیتے ہیں کہ دل کے

وقت بھی تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ کپڑے الگ پھاڑ ڈالتے ہیں اور پیٹ میں جو چودہ تکلیف دہ انجکشن لگوانے پڑتے ہیں وہ الگ ——— !

ہم صرف درمیانہ اور نچلے درمیانہ درجہ کے لوگوں کے گھروں کا ہی چکر لگاتے ہیں۔ ان علاقوں کی عورتیں بڑی حساس اور درد مند ہوتی ہیں۔ ہم کلام میر او تلسی داس کے دوہے بڑے دردناک پیرائے میں سنا کر سیلاب زدگان اور سوکھا سے متاثر بخت انسانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہیں کہ بے چاری عورتوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا ہے اور وہ بقدر ہمت پھٹے پرانے کپڑوں کے ڈھیر لگا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ان گٹھریوں کو اٹھانے کے لیے ہمیں دو ایک حمالوں کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ہماری یہ یاترا ہماری امیدوں سے بڑھ کر کامیاب ہو جاتی ہے۔

ہم یہ پھٹے پرانے کپڑے لے کر ممبئی میں بھنڈی بازار کے قریب چندی گلی میں فروخت کر آتے ہیں۔ اس محلے کے لوگ نسل در نسل یہی دھندا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ پھٹے پرانے کپڑوں کو ان کی کوالٹی اور اہمیت کے مطابق الگ الگ کرتے ہیں۔ بالکل چندی چندی کپڑے دھو کر انھیں چھوٹی موٹی فیکٹریوں میں فروخت کر آتے ہیں یہ چندیاں وہاں مشینیں صاف کرنے کے کام آتی ہیں۔

باقی کپڑوں کو دھو پھٹکار کر انہیں رنگ سے بے رنگ کرتے ہیں۔ پھٹے کپڑوں میں رنگا رنگ چندیاں لگاتے ہیں اور ثابت کپڑوں کو بڑے سلیقے سے پھاڑ کر ان میں بھی چندیاں چٹکلتے ہیں اور پھر قریب کے چور بازار کے دکان داروں کے ہاتھ اچھے داموں فروخت کر آتے ہیں۔

آج کل طبقہ اشراف کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں چندی لگے کپڑے زیب تن کرنے کا فیشن نصف دل پہ ہے۔ چور بازار میں ان کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے ہیں اور وہ: ———

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

کی تعد رہنے باہوں میں باہیں ڈال کر کسی فیشن ایبل ڈسکو میں 'دم مارو دم' کی دھن پر رقص کرتے نظر

●●

کے پی جوزف

انگریزی سے ترجمہ :
ڈاکٹر میر گوہر علی خاں
(حیدرآباد)

گھیراؤ کا ایک سنہری دن

ہندوستان میں گھیراؤ کے اصول باضابطہ طور پر ضبطِ تحریر میں نہیں لائے گئے ہیں مگر یہ اصول ہیں بڑے بار کرد ــــــ ایسے ہی جیسے برطانیہ کا پارلیمانی دستور۔ جہاں اصول نہیں ہوتے وہاں بے اصولی اور فراتفری سر چڑھ کر بولتی ہے۔ میں گھیراؤ کی بے قاعدگی سے خوب واقف ہوا، کیونکہ میں وہاں کام کرتا تھا جو گھیراؤ کا گڑھ تھا۔ یعنی کلکتہ! اور وہ زمانہ تھا گھیراؤ کے سنہری دنوں کا۔

کلکتہ میں میں وہاں کی سرکار کے ایک مالی ادارہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ جہاں دو ہزار سے زائد افراد کام کرتے تھے اور ان لوگوں کے پاس گھیراؤ جیسے مشغلے کے لیے بے حساب فالتو وقت تھا۔ میرے اکثر ساتھی عہدیدار اس گھیراؤ کے ہنگاموں کا سامنا بڑی ہمت اور دلیری سے کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے وہ حکومت ہند کے وفادار باہمت اور جواں مرد سپاہی ہیں لیکن میں ہمیشہ ہی سے ایسی ہڑبونگ سے دور بھاگتا ہوں۔ جوں ہی فضا میں "انقلاب زندہ باد"، "این جی او یونین پائندہ باد"، "ہائے ہائے جوزف" کے نعرے گونجتے ہیں میں آہستہ سے آفس کی پچھلی گیٹ سے فرار ہو جاتا ہوں۔ میری کیفیت ان چوہوں کی سی ہے جو زلزلہ کی بو سونگھتے ہی بوسیدہ مکانوں اور کارخانوں سے اپنی اپنی بلوں سے نکل پڑتے ہیں اور جنگل کی طرف رخ کرتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں ایسی ہمت نہیں پاتا جیسی کہ اُس بچے میں تھی جو جہاز کے جلتے ہوئے عرشہ پر تن تنہا کھڑا اپنے پپا کے حکم کا منتظر تھا کہ کب اسے جہاز چھوڑنے کی اجازت ملے۔ مجھ میں ویسی دلیری بھی نہیں ہے جو ایک کپتان میں ہوتی ہے جو جہاز کے ساتھ ڈوب جاتا ہے اور اس کے چہرے پر ڈر اور خوف کی پرچھائی تک نہیں پڑتی۔

دیدہ دلیری سے گھیراؤ کا سامنا کرنے والے عہدیداروں کی عجیب وغریب داستانیں بھی سنی ہیں۔ ایک محکمہ کے قابلِ قدر صدر صاحب کی کمر سے اُن کا پتلون اتار لیا گیا۔ تب وہ اپنے شرٹ کے اگلے حصے

سے عریاں جسم کو چھپاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک جنرل منیجر کو میز پر کھڑا کر دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ نمستے کے انداز میں جوڑیں اور تیرہ مرتبہ پکار پکار کر کہیں کہ "میں ایک بن مانس ہوں"۔ ایک خوش پوش منیجر کو بہلا دھا ریا ہتی میں ان کے دفتر کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے کھڑا کر دیا گیا۔ اطراف میں ہمارے گھیراؤ وادی (بانی) چھتریاں تھامے ایک حلقہ بنائے لگاتار قہقہے لگاتے رہے۔ بعد میں ان کی قمیص اور ٹائی اتار دی گئی اور ان کے جوتوں کا ہراج کر دیا گیا۔ تب جا کر انھیں اپنے گھر جانے کی اجازت ملی۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایسے حالات میں مبتلا عہدیدار اپنے مثانے پر قابو نہیں رکھ سکتے اور اپنی پتلون خراب کر لیتے ہیں۔

گھیراؤ جیسے دل خراش حادثات سے دیدہ دلیری سے مقابلہ کرنے حکومت ہم افسروں کو نئے نئے ہتھکنڈوں کی ٹریننگ اور ترغیب دیتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ ہوم سکریٹری صاحب دلی سے کلکتہ تشریف لے آئے۔ ہم سب افسروں کی میٹنگ بلائی گئی اور ہمیں یہ سنہری مشورہ دیا گیا ہم ان اوچھی حرکتوں سے بالکل دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ سینہ تانے سپاہیانہ انداز سے ان کا مقابلہ کریں۔ ہم سے انھوں نے وعدہ بھی کیا کہ وہ ہمیں قیمتی اور عمدہ کیمروں سے لادیں گے تاکہ ان شریر النفس ملازمین کی تصویریں دیکھنے کے بعد ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جاسکے۔ اس تجویز کو بہتوں نے بہت سراہا مگر اس "بوڑھے چوہے" کی طرح ایک سینئر افسر اٹھ کھڑے ہوئے اور یوں گویا ہوئے "صاحب کیا پتہ ہڑتالی ملازم ان کیمروں سے ہماری کھوپڑیاں ڈھیلی کر دیں"۔

میرا سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا اور اپنا دامن بچاتے رہنا آخر کب تک کام آتا؟ ایک دوپہر جب میں فائلوں کے ڈھیر میں اپنا سر چھپائے بیٹھا تھا۔ احتجاجی ملازمین کا ایک زبردست ریلا دبے پاؤں بغیر کسی شور و شرابے اور ہڑبونگ کے میرے کمرے میں اچانک داخل ہو گیا۔ انھوں نے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کی توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ کرسیاں، میز اور اسٹول لاٹھیوں کی مدد سے توڑ ڈالے گئے۔ میز پر رکھے ہوئے گلدانوں کو چکنا چور کر دیا گیا۔ کمرے میں لگے ہوئے (ایر کنڈیشنر کی بری درگت بنا ڈالی گئی۔ چند منچلے حضرات مجھے معہ کرسی کے اپنی مضبوط باہوں میں لیے جھولے کی طرح جھلانے لگے اور حلق پھاڑ کر مجھے ڈرانے لگے کہ اگر میں آج ہی پانچ بجے کے اندر اندر مغربی بنگال کی سرحد پار نہ کر دوں تو وہ میرا بھرتہ بنا ڈالیں گے۔ میری چوہوں جیسی بزدلی اور کم ہمتی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اب کی بار میں اس بلی کی طرح غرّا دیا جو اپنی جان بچانے کا کوئی راستہ نہ پا کر غصے میں بپھر اٹھتی ہے۔ میں نے کہا "ہاں، جو آپ خوب جانتے ہیں کہ میں ٹریونڈرم کا رہنے والا ہوں۔ آپ کی اس خواہش کا میں ضرور بالضرور احترام کروں گا مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے آپ کے شہر کلکتہ اور آپ کے پردیش کی سرحد پانچ بجے کے اندر چھوڑ دینے کے حکم کی پابجائی کے لیے مدراس تک ہوائی جہاز میں سفر کرنا پڑے گا اور مدراس جانے والا ہوائی جہاز کب کے نکل [illegible]

[illegible] ڈم ڈم ایرپورٹ سے روانہ ہو چکا ہے۔ اگر میں ریل گاڑی سے جاؤں تو یہ ۵ بجے کے بعد [illegible] ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ ہے میرا پیدل سفر [illegible] مجھے یقین [illegible] اندر اندر مغربی بنگال

کی سرحد نہیں چھوڑ سکتا اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دفتر کی ملازمت چھوڑنے کے لیے نئی دلی سے میرے تبادلہ کے کاغذات کا آنا بے حد ضروری ہے۔"

میری اس فلسفیانہ گفتگو پر ہجوم کی جانب سے قہقہے ابھرنے لگے اور آوازیں آنے لگیں "۔یہ ایک بہت بڑا بے وقوف ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ اسے یہیں رہنے دو۔"

اور ہڑتالی ملازمین آہستہ آہستہ میرے کمرے سے باہر کی جانب روانہ ہونے لگے۔ جاتے جاتے وہ لوگ میرے کمرے کی دیوار سے لگی گھڑی اپنے ساتھ لے گئے۔ شاید وہ مجھے پانچ بجنے کے علم سے لاعلم رکھنا چاہتے تھے!

●●

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

آج کی اُردو دانی

علی میاں کے کارخانے میں خیر الدین نامی ایک صاحب کام کرتے تھے۔ بے چارے گریجویٹ ہیں زمانے کے مارے ہوئے ہیں۔ دوسری کسی بڑی جگہ ملازمت ملی نہیں اس لیے کارخانہ کی ملازمت پر اکتفا کیے ہوئے ہیں۔ ویسے بڑے محنتی اور اطاعت گزار ہیں۔ انھوں نے اردو میڈیم سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔ چنانچہ انھیں نہایت فصیح اردو بولنے کا نہ صرف شوق ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ خبط ہے۔ اپنی دانست میں ہمیشہ صحیح اور بامعنی اردو بولتے ہیں۔ وہ اکثر فخریہ انداز میں اردو بولتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ انھوں نے اردو کو پڑھا ہے۔ خیر تو صاحب ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے کچھ رقم علی میاں سے بطور قرض حاصل کی اور جب طویل عرصے تک نہیں لوٹائی تب علی میاں کو انھیں یاددہانی کروانے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ایک دن صبح صبح انھوں نے میاں خیرالدین کو بلوایا اور کہا کہ فلاں صاحب کے ہاں جائیں اور ان کا سلام بولیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ وہ جلد آکر دوسرے کام پر رجوع ہوں۔ ابھی خیرالدین گھر سے نکلے ہی تھے کہ مذکورہ صاحب کا آدمی شکریہ کے ساتھ ان کی پوری رقم لوٹا گیا۔ اب تو علی میاں کو بہت افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ انھوں نے سلام کہلوایا کچھ اور انتظام کر لیتے تو بہتر ہوتا۔ وہ بے چینی سے خیرالدین کا انتظار کرنے لگے بلکہ دل ہی دل میں دعائیں بھی مانگنے لگے کہ خدا کرے خیرالدین ان کا سلام پہنچائے بغیر ہی واپس آجائیں لیکن خیرالدین ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ خدا خدا کرکے شام میں ان کی صورت نظر آئی۔ علی میاں تو پہلے ہی ان کی تاخیر کے باعث غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ صورت دیکھتے ہی برس پڑے۔ علی میاں کو تھمتا نہ دیکھ کر خیرالدین میاں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور وہ یوں گویا ہوئے "صاحب آپ کو میرے حالاتِ حاضرہ کی خبر ہی نہیں ہے۔ اس لیے آپ ایسا غصہ فرما رہے ہیں ورنہ ویسے تو سب ٹھیک ہی ہے کیوں اللہ کی ناشکری ادا کروں لیکن راستہ میں اس قدر مجمع تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جگہ جگہ لوگ جمع تھے۔ شہر میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ قدم بقدم پولیس نمایاں تھی۔ دو دن کا پھیرا مار کر آ رہا ہوں۔ ویسے بھی آج کل میں کتنا پریشان کن ہوں آپ کو کیا معلوم ہے۔ ایک زمانہ میں صحت میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ اب تقریباً ساٹھ فیصد تک ساتھ

نہیں دے رہی ہے۔ چار قدم چلتا ہوں تو دم ٹانسلس میں اٹکتا محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ کی خاطر دور افتادہ تک سیکل مارتا ہوں، آگے اگر کچھ فرماؤں تو ڈر ہے کہ آپ غصہ عرض کریں گے۔ اس لیے بھیگے بلے کی طرح چپ رہتا ہوں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ بل نہ بھرنے کے باعث گھر کی لائٹ تک کٹ ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر اب پہلے کی طرح روشن دان نہیں رہا۔ حالات اگر پہلے کی طرح خوش آئند رہتے تو یقیناً ہلت بھی پر فضا رہتی۔ ہمارے باپ دادا غیرت کے پتلے تھے اس لیے میں بھی باغیرت ہوں کسی سے کچھ کہنے سننے کا عادی نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بات بات پر اپیل فیل فرمانے لگیں۔" جھلا کر علی میاں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا "خیر خیر یہ تو بتلاؤ کہ تم نے ان سے ہمارا سلام بولا کہ نہیں۔" بولے صاحب آپ نے حکم فرمایا میں بھلا کیسے نہیں بولتا، بولا اور بار بار بولا۔ علی میاں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا کہ "ہائے خیر الدین تم کیوں بولے۔ نہ بولتے تو اچھا تھا۔" اب تو میاں خیر الدین بھنا گئے۔ بولے "صاحب آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں آپ بولو بول کر بولے۔ بول کے میں اتنی دور جا کر بولا۔ اگر آپ خیر الدین مت بولو بول کر بولتے تو میں کاہے کو بولتا۔ میں نے کون سا گناہ کیا۔ میں نے فقط آپ ہی کے بول بولا کہ صاحب نے آپ کو سلام بولنے کے لیے بولا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ بڑبڑانے لگے کہ بڑے لوگوں سے بڑی مصیبت ہے کام کرو تو باتیں سنو نہ کرو تو صلواتیں سنو جیسا کہ میں پہلے فرمایا اب آپ ہی عرض کیجیے کہ حالات حاضرہ میں میرا اپریشن ہونا ضروری ہے کہ نہیں"۔ علی میاں نے کہا کہ "بے شک، بے شک" "بہت ضروری ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، اب تم جا کر آرام کرو"۔ اتنا کہہ کر میاں خیر الدین سے تو جان چھڑائی لیکن نئی نسل کی اردو دانی پر بڑی دیر تک متفکر رہے۔ ●●

عبدالقدیر مقدر
(نظام آباد)

خطوط

اور

راجہ مہدی علی خاں

خطوط ایک دوسرے سے رابطہ اور کوائف معلوم کرنے کا نہ صرف ذریعہ ہیں بلکہ دنیا کے ادبیات میں بھی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ خطوط لکھنے کا رواج بڑا قدیم ہے۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے چمڑوں، تانبے کے پتروں، درختوں کی چھال اور پتوں پر بھی نامے لکھے جاتے تھے۔ بعض خطوط تحقیق کے ماخذ بھی ثابت ہوئے ہیں۔ ٹیلی فون کی ایجاد کے باوجود خطوط کے لکھے جانے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں خطوط مختلف زمروں کے لکھے جاتے ہیں۔ جن میں تجارتی، دفتری سرکاری اور خانگی خطوط شامل ہیں۔ ایسے خطوط مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ ان کا فرد ثالث کا پڑھنا غیر اخلاقی فعل کہا جاتا ہے لیکن ادبی خطوط جو مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کے ہوتے ہیں ان کے قدر دانوں کے لیے پوشیدہ نہیں رہ سکتے چونکہ ادیب یا شاعر یا کسی بڑے انسان کی زندگی نجی نہیں ہوتی بلکہ اس کے چاہنے والوں کو اس کی نجی معاملات میں بھی تانک جھانک کا اختیار ہوتا ہے جو جتنا بڑا انسان ہوگا اس کی زندگی کا نجی پن باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کی زندگی کے تمام پہلو ایک تاریخی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں بالخصوص ادبی خطوط سے مکتوب نگار کی ادبی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ادبی، علمی اور لسانی کیفیت کا علم ہوتا ہے۔ وہیں زمانے کے تغیرات سیاسی و سماجی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض ادبی خطوط میں تنقید و تحقیق کے اہم مسائل بھی سامنے آتے ہیں

چھوٹی سی صنف "مکتوب" بڑی بڑی اصناف ادب کا موضوع بھی بنی ہے۔ خطوط پر مشتمل افسانے اور ناول بھی لکھے گئے ہیں۔ نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری نے فرضی حسیناؤں کے خطوط لکھ کر علمی و ادبی

معلومات فراہم کی ہیں ۔ وہیں "نامۂ غالب" سے نہ صرف علمی ادبی بلکہ لسانی معلومات میں اضافہ ہوا ہے ۔ طنز و ظرافت کا ذائقہ ادب کو نصیب ہوا ۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے مکتوب کے روپ میں "غبارِ خاطر" جیسے انشائیے ادب کو دیئے ۔

پروفیسر گیان چند نے ادیبوں کے خطوط کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے ۔ لکھتے ہیں : "ادیبوں کے خطوط دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ نجی اور ادبی ۔ ادیب بھی خاندان اور سماج کا ایک فرد ہوتا ہے ۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کو چٹھیاں لکھتا ہے ۔ یہ نجی نوعیت کی ہوتی ہیں اس کے دوسرے مکتوب الیہ ساتھی ادیب، رسالے اور انجمنیں ہوتی ہیں ۔ یہ ادبی خطوط ہیں لیکن یہ دو قسمیں اب بند خانے نہیں ۔ نجی خطوط میں بھی ادبی امور آجاتے ہیں اور ادبی رقعات میں بھی نجی باتیں دراندازہ ہو جاتی ہیں ۔ نجی خطوط میں مکتوب نگار کی شخصیت بغیر کسی مکھوٹے کے بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے" ۔ ایسے خطوط بڑے اہم ہوتے ہیں ۔ ان خطوط سے نہ صرف مکتوب نگار کی شخصیت بلکہ اس دور کے سیاسی، سماجی ، معاشی اور تاریخی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ مکتوب نگار کی نفسیاتی کیفیات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

سنجیدہ خطوط ادب میں اضافہ کا باعث بن جاتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ طنزیہ و مزاحیہ خطوط بھی ادب میں کم اہمیت کے حامل نہیں ہوتے ۔ یوں تو اس قسم کے خطوط بہت ہی کم لکھے گئے ہیں ۔ مرزا غالب اس قسم کے خطوط میں یگانہ سمجھے جاتے ہیں ۔ ان کے خطوط میں ظرافت اور شگفتگی ہے ۔ اسی طرح ہم بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں راجہ مہدی علی خاں کو فراموش نہیں کر سکتے ۔ یوں تو ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا بلکہ ان کی طنزیہ و مزاحیہ نظمیں اور پیروڈیاں منصۂ شہود میں آچکی ہیں ۔ بہت کم لوگ شاید اس بات سے واقف ہوں کہ راجہ مہدی علی خاں کے خطوط بھی ظرافت سے بھرپور ہیں ۔ ان کے خطوط میں شگفتہ مزاج اور بے باکی ہے ۔

نمونہ کے طور پر چند خطوط ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں :

رام لعل صاحب کے نام راجہ مہدی علی خاں کے خطوط :

(۱) مائی ڈیر راجہ رام علی خاں!

السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا ۔ جس سے معلوم ہوا کہ آپ دو دفعہ میرے شہر میں تشریف لائے اور مجھ سے نہ ملے ۔ اس پر ستم یہ کہ "خوش خبری" سے مجھے آگاہ بھی کیا جا رہا ہے ۔ یعنی ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری (اردو محاورہ) چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد (فارسی محاورہ) ایک تو اشٹو پراچ، دوسرے کرم بچا چھ (ہندی محاورہ) اس مجرمانہ فعل کی آپ کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ آج سے میرے اور آپ کے غائبانہ تعلقات سماپت ہوئے ۔

اگر آپ مسلمان ہوتے تو میں لکھتا ۔ "قیامت" کے روز آپ نہیں بخشے جائیں گے افسوس کہ میرا "اصلی کلام" شاید آپ نے نہیں پڑھا ۔ میری اصل پسند کی چیزیں "ادبی دنیا" لاہور

"نقوش" "ادب لطیف" "ساقی" "نیا دور" وغیرہ میں چھپی ہیں۔

نظموں میں میں اور ہوں اور احباب سے ملاقات کے سلسلے میں کیا ادر، جب آپ آئیں گے تو میں آپ کے گلے مل کر اور چیخیں مار مار کر روؤں گا۔

بمبئی میں آپ کی جن گرل فرینڈز سے دوستی تھی وہ اکثر ہمارے یہاں آکر آپ کو یاد کرتی ہیں۔ کبھی کبھی آپ کو یاد کرکے رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں "یہ آدمی بڑا ہی بے وفا نکلا"۔ لکھنؤ سے بھی لڑکیوں کے شکایتی خطوط آپ کے بارے میں آتے رہتے ہیں۔

. . . . آپ تو چھپے رستم نکلے۔ سوشیلا نامی لڑکی اب بھی یہاں بیٹھی ہے۔ آپ کو نمستے اور پیار لکھوا رہی ہے۔ آپ کو خوشتر گرامی کی قسم! بھابی صاحبہ کو یہ خط ضرور سنائیے اور ان سے میرا اسلام ضرور کہہ دیجیے۔

خاکسار

راجہ ناراشن علی خاں

(۲) محترمی و مکرمی جناب رام لعل

پاس ملٹی ملینئیر اسٹوری فلیٹ

چار باغ، رئیس اعظم لکھنو

تسلیم کے بعد عرض ہے کہ میں مرگیا تھا۔ ایک ٹانگ مسلمانوں نے قبر میں دفن کردی، ایک ٹانگ ہندوؤں نے جلا دی۔ سر سکھ لے گئے۔ ایک بازو مہاتما بدھ کے پجاری لے گئے۔ باقی حصّہ کتّے کھا گئے

یہ ہوا میرا انجام ۔ مرحوم

سمت پرکاش شوق جرنلسٹ نئی دہلی کے نام :

پیارے شوق ! اسلام شوق !

ان دنوں آپ بڑی باقاعدگی سے ایک "فرمانبردار سگے بھائی" کی طرح مجھے خط لکھ رہے ہیں اور آپ کی اس محبت سے کبھی کبھی میں شرمسار اور اکثر مسرور ہوتا ہوں۔

اب ہم دونوں کی محبت (ان چند خطوط کے بعد) اس مرحلے پر پہنچ گئی ہے کہ اگر کبھی آپ سے مصروفیت کے باعث اس معاملے میں تساہل بھی ہو جائے تو بُرا نہ مانوں گا جب کبھی فرصت ہو اپنی کچھ نظمیں جو آپ کو نسبتاً زیادہ پسند ہوں مجھے بھی بھیجیے۔

میں بھاردواج صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے پچھلے خط پر توجہ دی اور ایک فرماں بردار بھائی کی طرح میرے خط کے ہر لفظ پر ازراہ خلوص و محبت عمل کیا۔

پچھلے خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ جنوری میں پیسے بھجوا رہا ہوں میں نے تو پہلے ہی بھجوا دیئے تھے۔ کلرک نے نہیں بھیجے، اب جنوری کے پہلے ہفتے میں بھجوا رہا ہوں، آج پندرہ جنوری ہے۔

یہ لکھنے سے میرا مطلب حسنِ طلب نہیں ہے بلکہ بھاردواج صاحب کی تعریف کرنا ہے ۔
زندہ باد بھاردواج کی!

آپ کے کتنے بچے ہیں ۔ کیا کیا عمر ہے؟ میرا محترم بھابی صاحبہ سے سلام بچوں کو دعا ۔

آپ کا ——— راجہ مہدی علی خاں

مائی ڈیر شوق!

سلام شوق ۔ بیماری نے میرا حافظہ تباہ کر دیا ہے ۔ مجھے کچھ یاد نہیں، میں نے آپ کے خط کا جواب لکھا تھا یا نہیں ۔ بہر حال آج پھر لکھ رہا ہوں ۔ میں آپ کی چیزیں نہیں سن سکا تھا ۔ اب ریڈیو ٹھیک ہو کر آ گیا ہے ۔ جب کبھی پروگرام ہو ضرور اطلاع دیجیے ۔ ہم لوگ ضرور سنیں گے ۔

آپ نے جس خاتون کا پچھلے خط میں ذکر کیا تھا اور جسے آپ بھابی کہنا چاہتے ہیں ۔ ان کا نام طاہرہ سلطانہ مخفی ہے لیکن یہ بات کسی وجہ سے چھپا کر رکھی گئی ہے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے صرف آپ کو بتا رہا ہوں ۔ شاید خوشتر صاحب کو بھی یہ بات معلوم ہے کیوں کہ وہ میرے دل کے بہت قریب ہیں ۔

بھابی صاحبہ کو بہت بہت نمستے ۔ بچوں کو دعا ۔ تمھاری بھابی تمھیں سلام کہتی ہیں اور بھابی صاحبہ کو بھی ۔

تمھارا

راجہ مہدی علی خاں

تیج ناتھ زار پروڈیوسر کے نام :۔

جناب زار صاحب!

تسلیم ۔ آج اپنا کام ختم ہو گیا ہے ۔ اپنی محدود قابلیت کی مدد سے میں نے بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کی ہے ۔ خدا کامیابی دے ۔

آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی پکچر کے گانے دھوبیوں اور درزیوں کے ریٹ سے بھی کم ریٹ پر لکھے ہیں ۔ (اپنی خوشی سے) لیکن اس دوران میں سنے نوٹ کیا کہ کسی وقت بھی شاید بعض مجبوریوں کی وجہ سے آپ مجھ سے دوستانہ رویہ اختیار نہ کر سکے لیکن آج میں آپ کو پروڈیوسرانہ سنگ دلی اور بزنس مین شپ اختیار نہ کرنے دوں گا کیونکہ میں سخت مجبور ہوں ۔

(۱) مجھے ۵۰۰ انکم ٹیکس ۱۶ مارچ تک دینا ہے
(۲) مجھے تین ماہ کا کرایہ ادا کرنا ہے ۔
(۳) مجھے بنیے اور دوسرے لوگوں کے بہت سے بل ادا کرنے ہیں ۔

(۴) مجھے اپنا علاج کرانا ہے جس کے لیے کم از کم ۱۵۰ روپے کی ضرورت ہے۔

اگر آپ نے اب بھی مجھے فل پے منٹ ۸۲۰ روپے نہ دیئے تو میں سمجھوں گا کہ مجھ میں کوئی بہت بڑی خرابی ہے کہ دوست ہونے کے باوجود بھی میں آپ سے دوستانہ سلوک نہ کر سکا۔ اور آپ میں کوئی ایسی خوبی ہوگی کہ ہمیشہ میں ہی اس کے سامنے جھکنے پر مجبور رہا۔

اگر آپ نے اس وقت ہمدردانہ رویہ اختیار نہ کیا اور مجھے پانچ چھ سو روپے دے کر ٹالنا چاہا تو میں یہ رقم لینے سے انکار کروں گا اور اپنا فرنیچر اور عزت انکم ٹیکس والوں کے حوالے کر دوں گا۔

خاکسار

سانگ رائٹر

۲۔ اے تیج ناتھ زار!

میں تیرے در پہ آن کے لوٹا ہزار بار

یکطرفہ دوستی کو نبھایا ہے رات دن

اس زندگی کو سمجھا ہے بکواس تیرے بن

میں جانتا ہوں مجھ کو سمجھتا ہے تو حمار

اے تیج ناتھ زار!

میں تیرے در پہ آن کے لوٹا ہزار بار

کیوں آ... کل حضور کو دفتر ... ہے

آتے نہیں حضور ... کیوں ... خیر ہے؟

صحن چمن اداس ہے آتی نہیں بہار

اے تیج ناتھ زار!

میں تیرے در پہ آن کے لوٹا ہزار بار

آفس نہ آیئے۔ اجی رومانس کیجیے

زلفوں کے سائے میں ... فائن کیجیے

وہ غم دیئے ہیں آپ نے سینہ ہے انگار

اے تیج ناتھ زار!

راجہ مہدی علی خاں کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا۔ روزانہ سینکڑوں خطوط ان کے نام آیا کرتے تھے اور راجہ صاحب بہ نفس نفیس خود ان کے جواب دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے سکریٹری پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ خود لکھتے اور پوسٹ کرواتے تھے۔ راجہ صاحب کے خطوط اگر کتابی شکل میں شائع ہوں تو یقیناً ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں اضافہ کا سبب بنیں گے۔

⊛

گلزار جاوید

براہِ راست

پاکستان کے نامور طنز و مزاح نگار شاعر انور مسعود سے لیا گیا "چہار سو" راولپنڈی کے مدیر گلزار جاوید کا یہ انٹرویو شگوفہ کے قارئین کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔
محمد انور مسعود شہر گجرات میں پیدا ہوئے۔ (تاریخ پیدائش ۸ نومبر ۱۹۳۵ء) ایف اے کے بعد میڈیکل میں داخلہ لیا، لیکن چونکہ یہ مضمون مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا اس لیے میڈیکل چھوڑ کر آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے فارسی امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے مختلف شہروں میں کام کیا۔ اور ۹۶ء میں وظیفہ پر علٰحدہ ہوئے۔
"قطعہ کلامی" اور "غنچہ پھر لگا کھلنے" اردو مزاحیہ اور طنزیہ کلام کے مجموعے ہیں کئی عالمی مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں۔ پنجابی کے بھی مقبول ترین شاعر ہیں۔ (مدیر)

★ نوجوانی میں بالعموم واردات قلبی کے زیر اثر شعر گوئی کا آغاز ہوتا ہے کیا آپ نے بھی۔۔۔۔؟؟؟

○ .. واردات قلبی کے ڈانڈے تو تصوف اور روحانیت سے جا ملتے ہیں۔ غالباً آپ کا استفسار واردات رومانی کے بارے میں ہے۔ آپ نے بہت جھجک جھجک کر یہ سوال کیا ہے لیکن میں اس کے جواب میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ میں اس تجربے سے گزرا ہوں اور میری ابتدائی اور عہد جوانی کی شاعری میں اس کی بھرپور جھلکیاں موجود ہیں۔ نہ صرف غزلوں میں بلکہ پوری پوری نظموں میں اس تجربے کا اظہار ہوا ہے۔ ایک پرانی غزل کے تین شعر سنانا چاہوں گا۔

میں تو قائم ہوں ترے غم کی بدولت ورنہ ÷ یوں بکھر جاؤں کہ خود ہاتھ نہ آؤں اپنے
تیرے رستے کا جو کانٹا بھی میسر آئے ÷ میں اسے شوق سے کالر پہ سجاؤں اپنے
شعر لوگوں کے بہت یاد ہیں اوروں کے لیے ÷ تو ملے تو میں تجھے شعر سناؤں اپنے

★ کیا واقعی آپ نے سنجیدہ شاعری کی بھیڑ چال سے اکتا کر مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا تھا؟

○ میری ظریفانہ شاعری کسی بھیڑ چال کی اکتاہٹ کا نتیجہ ہرگز نہیں ہے۔ مزاح میرے مزاج کا حصہ ہے لیکن اس کی نوعیت سنجیدہ ہے۔ میرے قہقہے نچوڑے جائیں تو ان میں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ میرا حال بادل کا سا ہے جب اس میں بجلی چمک جا

تو مسکراتا ہوا لگتا ہے اور جب برسنے لگے تو روتا ہوا لگتا ہے؟

○ خالص مزاح اور طنز آمیز مزاح میں فرق ضرور ہے۔ محض طنز تو ظرافت کا حصہ ہی نہیں بن پاتی۔ طنز کی آمیزش سے مزاح بامقصد بن جاتا ہے۔ ظرافت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ طنز کو مزاح کا لباس پہنائے۔ میں نے مقدور بھر یہی کوشش کی ہے۔ ضمیر جعفری صاحب کے دو شعر سنئے جن سے خالص مزاح اور طنز آمیز مزاح کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا۔

آٹھ دس کی آنکھ پھوٹی آٹھ دس کا سر کھلا — لو خطیبِ شہر کی تقریر کا جوہر کھلا
ان کا دروازہ تھا مجھ سے بھی سوا مشتاقِ دید — میں نے باہر کھولنا چاہا تو وہ اندر کھلا

★... HUMOUR اور COMEDY میں کیا فرق ہے؟ یا شاید ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ مزاحیہ شاعر اور مزاحیہ اداکار میں کیا فرق ہے؟

○.. کامیڈی حرکات و سکنات سے متعلق ہے یعنی اس کا تعلق اسٹیج سے ہے جب کہ ہیومر کا تعلق تحریر سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ظریفانہ تحریر کو کامیڈی بھی بنایا جا سکتا۔ کامیڈی تحریر کی صورت میں ظرافت ہے جب کہ ظریفانہ تحریر اداکاری کی شکل میں کامیڈی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

★... نثری اور نظمی مزاح میں کیا فرق ہے؟ کیا یہ ایک ہی شعبے کے دو نام ہیں یا انہیں الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے جانچنا اور پرکھنا ضروری ہے؟

○.. دونوں میں آہنگ کا فرق ہے۔ آہنگ شامل ہو جائے تو تاثر اور نوعیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا مزاحیہ نثر اور مزاح منظوم کے پرکھنے کے اصول ایک سے نہیں ہو سکتے۔ مضامین پطرس اور اکبر الہ آبادی کی شاعری کو ایک ہی پیمانے سے جانچا اور پرکھا نہیں جا سکتا۔

★.. برصغیر کی حد تک یہ تاثر عام ہے کہ ہمارے ہاں اکثر بڑے تخلیق کار کسی نہ کسی مغربی تخلیق کار سے متاثر یا مشابہ ہوتے ہیں! نثری مزاح نگاری پر تو ہو بہو کا الزام بھی لگتا رہا! آپ اپنے بارے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟

○.. میں اپنے اسلوبِ مزاح نگاری میں کسی مغربی ادیب و شاعر سے متاثر نہیں ہوں اور میرے کسی نقاد یا تبصرہ نگار نے کبھی یہ بات نہیں کہی۔ ... مجھے اگر مشابہ بھی ٹھہرایا گیا تو وہ بھی ایک مشرقی شاعر یعنی نظیر اکبر آبادی کا ہے۔

★... ملک کے نہایت محترم اور معتبر اہلِ قلم نے آپ کو پنجابی زبان کا نظیر اکبر آبادی کہا جس کا آپ نے ابھی خود ذکر کیا ہے۔ کیا آپ خود بھی نظیر سے ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں؟

○... میرے نزدیک نظیر اکبر آبادی ایک منظر نگار ہے کبھی کبھی زندگی کا کوئی مضحک منظر بھی اس کے کیمرے کی آنکھ کی زد میں آجاتا ہے لیکن مجموعی طور پر وہ مزاح نگار نہیں ہے۔ عوامی زبان کے استعمال اور عوامی موضوعات کے اشتراک کی حد تک مجھ میں اور نظیر میں مماثلت کی بات شاید درست ہے لیکن یاد رکھیئے کہ زندگی اپنے آپ کو دہراتی نہیں ہے۔

پسند اُس کو تکرار کی خو نہیں ÷ کہ تُو میں نہیں اور میں تُو نہیں

میرے یہاں ظرافت میں ایک سمت کی موجودگی کے باعث بعض ناقدین نے میری شاعری کے مزاج کو نظیر سے زیادہ اکبر سے قریب تر قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات زیادہ قرینِ صحت ہے۔

★.. کیا یہ تاثر درست ہے کہ ہر ہنسانے والا اندر سے غمگین یا دکھی ہوتا ہے؟ یا یوں کہئے کہ مزاح افسردگی کے ردِعمل کا پیدا ہوتا ہے؟

○. کیٹس (KEATS) کی یہ بات بہت مشہور ہو گئی ہے کہ OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT

TELL OF SADDEST THOUGHTS حالانکہ اسے کلیہ اور قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر قہقہہ درد آلود نہیں ہوتا البتہ میں اپنی حد تک اس بات کو درست سمجھتا ہوں۔

کوئی دیوارِ گریہ ہے ترے اشعار کے پیچھے ؛ بڑے نمناک سے ہوتے ہیں انور قہقہے تیرے

★.. حافظے پر زور دے کر بتائیے کہ معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف آپ کے قلم نے کب اور کس واقعہ کے زیر اثر طنزی جہاد کا آغاز کیا؟

٥.. اتنا یاد پڑتا ہے کہ جنرل ایوب خاں کے دور میں ایک عید کے موقع پر رویتِ ہلال کا مسئلہ خاصی نزاعی صورت اختیار کر گیا تھا۔ علماء کی رائے سرکارِ عالی کی رائے کے بالکل برعکس تھی۔ اس وقت اس اختلاف سے بڑا بحران پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر ایک قطعہ کہا تھا جس میں اس معاشرتی صورتحال کو طنز کا ہدف قرار دیا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ میرا معاشرتی طنز کا حامل پہلا قطعہ تھا۔ اور کچھ یوں تھا۔

چاند کو ہاتھ لگا آئے ہیں اہلِ ہمت
ان کو یہ دھن ہے کہ اب جانبِ مریخ بڑھیں
ایک ہم ہیں کہ دکھائی نہ دیا چاند ہمیں
ہم اسی سوچ میں ہیں عید پڑھیں یا نہ پڑھیں

★.. انسان کے سیکھنے اور سمجھنے کا عمل ہر عمر اور ہر دور میں جاری رہتا ہے۔ آپ نے جب اس کارزار میں قدم رکھا تو کن سے رہنمائی حاصل کی اور کن کو آئیڈیل بنا کر اپنے سفر کا آغاز کیا اور کون آج آپ کے تصورات پر پورا اترتا ہے؟

٥.. آپ کا کہنا بجا ہے کہ آموزش و اکتساب اور اخذ فیض کا سلسلہ عمر بھر جاری رہتا ہے اور ہر شخص کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل بھی ہوتا ہے۔ یوں تو میں نے اردو کے ہر قابلِ ذکر ظرافت نگار سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہے لیکن میری تربیت میں زیادہ حصہ اکبر الہ آبادی اور ضمیر جعفری کی بنائی ہوئی فضاؤں کا ہے۔ میں ان دونوں کا معتقد اور معترف ہوں۔

★.. مزاحیہ شاعری کے مستقبل کے حوالے سے اردو زبان سے آپ کی کیا توقعات وابستہ ہیں؟

٥.. کسی زبان کا ماضی اور حال اس کے مستقبل کی سمت نمائی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ظریفانہ شاعری کے اعتبار سے اردو زبان ماضی میں بھی ثروت مند رہی ہے اور اس کا آئندہ بھی تابناک ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں میری زیادہ تر توقعات پاکستان کے مزاح گو شعراء سے وابستہ ہیں۔

★.. آپ اردو، پنجابی اور فارسی کے قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ جید استاد بھی ہیں۔ آپ کا قلبی رشتہ کس زبان کے ساتھ استوار ہے؟

٥.. میں سمجھتا ہوں کہ میرا قلبی رشتہ اردو اور پنجابی دونوں سے ہے۔ مجھے یہ دونوں زبانیں بے حد عزیز ہیں۔ پنجابی میری مادری زبان ہے اردو پاکستان کی قومی زبان ہونے کے ناتے سے بھی عزیز ہے اور اس سے ایک قلبی رابطہ یہ بھی ہے کہ یہ میرے بچوں کی مادری زبان ہے۔ فارسی کو میں اس لیے بھی اہمیت دیتا ہوں کہ اس کے بغیر اردو سے بھی کامل آشنائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اقبال سے مستقیم رابطہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ اپنا قومی ترانہ بھی اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

★.. آپ کے شعری مجموعوں کے علاوہ تنقیدی تصنیف "فارسی کے چند گوشے" نے بڑی پذیرائی حاصل کی! آپ کی اس کتاب کی بے پناہ مقبولیت کا سبب کیا ہے؟

o.. سوال بہت تفصیل طلب ہے اجمالاً یہ عرض کروں گا کہ میں ذاتی طور پر فارسی ادب کے جن کلاسیکی اور جدید ادیبوں اور شاعروں اور جس دبستان شعر سے زیادہ متاثر ہوا ہوں ان کے بارے میں بڑی محنت اور تحقیق سے میں نے یہ مقالات تحریر کیے ہیں۔ فروغ فرخ زاد، عشقی، علی اکبر ، غنیمت، کنجاہی اور خیام وہ شخصیتیں ہیں جن کے ادبی اور شعری کارناموں پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ اقبال کے افکار کا ایرانی انقلاب پر جو اثر مرتب ہوا ہے اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔ یہ مضامین ادبی اور تخلیقی سطح پر تحریر ہوئے ہیں۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے صحت تحقیق بھی میرے پیشِ نظر رہی ہے اور میں نے حتی الامکان روایتی محققانہ خشکی سے بھی احتراز کیا ہے۔

★.. ہم آپ سے آپ کی جد و جہد کی داستان اور اس کے آپ کے فنی سفر پر اثرات کی بابت کچھ جاننا چاہیں گے؟

o.. بچپن میں مجھے بڑے نامساعد حالات کا سامنا رہا۔ جوانی کا زمانہ بھی بڑی حسرت میں گزرا۔ والد صاحب اپنے میلان تصوف کے باعث علائق دنیوی سے بے نیاز ہو گئے تھے گھر کی ساری ذمہ داریاں میرے کندھوں پر آ پڑیں۔ اسی وجہ سے بی اے میں انتہائی امتیازی پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود دو سال کے لیے میرا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا اور میں نے کنجاہ کے ایک اسکول میں ایک ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں مجھے دیہاتی ماحول کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور پنجابی زبان سے میری آگاہی میں کافی اضافہ ہوا۔ اسکول کی سروس سے پہلے میں نے پی ٹی سی میں ایک کلرک کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ کنجاہ کے زمانے ہی میں میں نے 'امبڑی' اور 'رنجھاں' جیسی نظمیں لکھیں۔ ایم اے کرنے کے بعد میں نے لاہور میں ایک پریس میں پروف ریڈنگ کا کام کیا۔ پریس تک پہنچنے کے لیے مجھے روزانہ دس میل کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ اس پُرمشقت کام کی ایک ماہ کی مزدوری صرف ۱۵ روپے وصول ہوئی۔ اس دور میں میں نے ایسے شعر بھی کہے۔

کب تک لئے پھروں گا یونہی قتل گاہ میں ؛ زخموں کے انتظار میں دُکھتا ہوا بدن

اس زمانے میں میرا سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں کی مناسب کفالت نہیں کر پاتا تھا اور اپنی بیمار والدہ کے علاج کے لیے جتنا خرچ درکار تھا اتنی رقم میسر نہیں تھی۔

میری زندگی عوامی سطح پر بسر ہوئی میں نے تندور سے روٹیاں لگوائیں۔ بسوں میں اور ریل کے تھرڈ کلاس میں کھڑے ہو کر سفر بھی کیا معمولی سے معمولی ملازمت کی ..... مجھے عوام کے دکھ سکھ کا گہرا تجربہ حاصل ہوا۔ اب سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ آزمائشوں میں قدرت کی کتنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ میرے حالات ایسے نہ ہوتے تو میں کبھی آج ایسا نہ ہوتا۔ میری وہ عوامی نظمیں جو بے انتہا مقبول ہیں وہ انہی حالات و واقعات اور تجربات کی دین ہیں۔ کبھی جس تلخی اوقات کا گلہ مند تھا آج اس کا صلہ و ثمر دیکھتا ہوں تو شکر کے الفاظ نہیں ملتے۔ یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ میں اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اس نے مجھے سختیوں کا مقابلہ کرنے کی توفیق بخشی اور میں نے ایسے شعر بھی کہے۔

تو نے کیا سمجھا ہے اے گردشِ حالات ہمیں ؛ ہم تجھے گردشِ حالات سمجھ لیتے ہیں

★.. پروفیسر صاحب دل پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ بتایئے کہ کبھی آپ کو قنوطیت کا سامنا ہوا اور آپ نے محسوس کیا کہ آپ نے غلط شعبے کا انتخاب کیا ہے اور آپ اپنی صلاحیتیں کسی اور شعبے میں اس سے بہتر انداز میں استعمال کر سکتے تھے؟

o.. میں نے دو شعبوں کا انتخاب کیا۔ شاعری اور تدریس۔ مجھے ان میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ان شعبوں نے مجھے انتخاب کیا ہے۔ مجھے صرف اس کا افسوس رہا کہ میں نے دو سال ایف ایس سی میڈیکل میں ضائع کیے۔ میرے استاد گرامی چوہدری فضل حسین کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے میری صلاحیتوں کو پہچانا اور مجھے میڈیکل سے آرٹس کی

لے آئے اور پھر مجھ پر کامیابیوں کے دروازے کھل گئے اور میرے اندر کی تدریسی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملا۔ شاعری اور تدریس نے مجھے جو عزت اور شہرت دی ہے وہ شاید کسی اور شعبے میں حاصل نہ کرسکتا۔ میں ہنر تدریس اور فن شاعری کے علاوہ کسی اور شعبے کو اپناتا تو اپنی فطری استعداد سے انحراف کا مرتکب ہوتا۔

★.. ملکی اور غیر ملکی مشاعروں کا مزاج اور رواج آج کے شاعر کے فن اور زندگی پر کیا اثرات مرتب کررہے ہیں؟

ㅇ.. مشاعرے کی روایت ہماری تہذیب کا حصہ ہے یہ روایت تفریح بھی فراہم کرتی ہے اور ذوق شعر کی ترویج و ترغیب کا خوبصورت وسیلہ بھی ہے اور شاعر کے لیے حوصلہ افزائی کا ذریعہ بھی ہے۔ غیر ملکی مشاعروں کی بدولت شعرا کو سیاحت اور سیر وسفر کے مواقع بھی میسر آتے ہیں اس سے شاعر کے VISION میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے دوسرے ممالک کی اردو شاعری کے معیار سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور اپنی شاعری سے موازنے کا موقع بھی ملتا ہے عالمی مزاحیہ مشاعروں کے انعقاد سے یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کے مزاحیہ شعرا کا معیار کہیں بہتر ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ بالعموم مشاعرے کا مزاج زیادہ گہری اور فکری شاعری کا متحمل نہیں ہوتا اور اس فضا میں سنجیدہ تخلیقی کاوشوں کی بے وقاری ایک ایسا رجحان ہے جس کے ایک حد سے زیادہ اضافے پر تشویش کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اس سے شعر کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے داد وتحسین کا غلط آہنگ شاعر کو گمراہ بھی کرسکتا ہے۔ مجموعی طور پر بین الاقوامی غیر ملکی مشاعرے شعراء کے لیے منفعت بخش ہیں۔

★.. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سنجیدہ ادب کی طرح مزاحیہ ادب نقد ونظر کا محتاج ہے اور کیا یہ خیال بھی درست بھی ہے کہ تنقید نگاروں کی اکثریت نے مزاحیہ ادب کو سنجیدگی کا اہل نہ جانا؟

ㅇ.. میں آپ کے خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ ظریفانہ ادب بھی سنجیدہ ادب کی طرح نقد ونظر کا محتاج ہے میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ ناقدین ادب نے اس سلسلہ میں بے توجہی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر خواجہ ذکریا کے علاوہ کسی اور نقاد نے اس کی طرف بھرپور توجہ نہیں کی۔

★.. سید ضمیر جعفری کے حوالے سے ناقدین ادب کا خیال ہے کہ ان کی اعلیٰ پائے کی سنجیدہ شاعری مزاحیہ شاعری کے شور میں دب کر رہ گئی ہے اگر ہم آپ کے بارے میں بھی اس تاثر کا اظہار کریں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا۔ یہ رجحان آپ کے فنی سفر کے لیے کیوں کر سودمند ثابت ہوسکتا ہے؟

ㅇ.. مجھے اللہ کے فضل سے اس سلسلے میں بڑا اطمینان حاصل ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے شعر شناس حضرات نے میری سنجیدہ شاعری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ میری سنجیدہ شاعری کا نمائندہ یہ شعر تو میری ظریفانہ شاعری سے بڑھ کر مقبول ہے؂

یہی اندازِ دیانت ہے تو کل کا تاجر برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

جو امتیازی مقام مجھے مزاحیہ شاعری میں حاصل ہوا ہے وہ اللہ کی خاص دین ہے اور اس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ سنجیدہ شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری ہے اور یہ مجموعہ بھی ترتیب واشاعت کے مرحلے میں ہے۔

تازہ بہ تازہ

انور مسعود

یہی درماں ہے میری اقتصادی تیرہ بختی کا
مرے اندر کوئی پھوٹے کرن خود احتسابی کی
مری منصوبہ بندی میں چھپی ہے قرض کی دیمک
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

بات جب ہو چکی ہے انہونی
تب زمانے نے اعتبار کیا
کیا کبھی آپ نے سنا پہلے
شیر نے تیر کو شکار کیا

دعا کرتا تھا کوئی تانگے والا
خدا کی بارگہ میں، گڑگڑا کر
مجھے گھوڑا اگر بخشا ہے تو نے
تو سیبوں کا مربہ بھی عطا کر

کس طرح کا احساسِ زیاں ہے جو ہوا گم
کس طرح کا احساسِ زیاں ہے جو بچا ہے
ملک آدھا گیا ہاتھ سے اور چپ سی لگی ہے
اک لونگ گواچا ہے تو کیا شور مچا ہے

بیٹھ رہنے سے نہ نکلے گا نتیجہ کوئی
گھر سے نکلو تو نکل آئے گا رستہ کوئی

چاند کی دوسری جانب کا بھی منظر دیکھیں
شاید ایسا کبھی کھل جائے دریچہ کوئی

تلخی زہرِ غم زیست گوارا ہو جائے
نہیں دنیا میں محبت سا کرشمہ کوئی

دل کے آئینے میں سوغاتِ سفر لایا ہوں
پھول سا ہاتھ کوئی، چاند سا چہرہ کوئی

اک یہی بات کہی تھی دمِ رخصت اُس نے
کیا کیا جائے ٹھہرتا نہیں لمحہ کوئی

ہائے وہ شاخ کہ بے برگ و ثمر ہو انورؔ
اور اس پہ کبھی بیٹھے نہ پرندہ کوئی

خوابِ خواب

انور مسعود

وہ اپنا سا وہ بیگانہ سا لہجہ
وہ تلخی کا مزاجِ انگبینی

"اُتر جاؤ مری گاڑی سے فوراً"
پیادہ طے کرو راہِ زمینی

محبت کو بھی کیا کیا عارضے ہیں
رقابت، بدگمانی، بے یقینی

مقابل پھر کوئی دستِ گداگر
وہی فریاد کی اندوہ گینی

ہوا میں اک صدا کا لہریا سا
"ملانا مت مری کافی میں چینی"

سرِ رہ اک دکانِ گُل فروشاں
عجب اک محفلِ خندہ جبینی

کسی کالر پہ لمسِ دستِ سیمیں
گلِ تازہ کی خوشبو بھینی بھینی

دھرا ہو سر اسی شانے پہ دائم
پسند آئی ہے یہ گوشہ گزینی

"کوئی معصوم سا، تجھ سا اور اپنا"
تمنا کی ہمکتی پیش بینی"

جھلک محرومیوں کی موتیوں پر
دکھوں کے خرمنوں کی خوشہ چینی

مہکتی ہے مری تنہائیوں میں
وہی رودادِ دورِ ہم نشینی

چنانچہ

معلوم ہوا کتنا ہے دشوار چنانچہ
مطلعے میں جو لانا پڑا دوبار چنانچہ

تو نے بھی تو پیمانِ وفا باندھا ہے مجھ سے
تو بھی ہے مرے ووٹ کا حقدار چنانچہ

دیکھا تھا ذرا میں نے کلس اُن کے محل کا
ٹھیری نہیں سر پر مرے دستار چنانچہ

افسر کو سلیقہ ہے کہ مصروف نظر آئے
ہرگز نہیں لگتا ہے وہ بے کار چنانچہ

قانون کی پابند گرانی نہیں چونکہ
جنگل کی طرح لگتا ہے بازار چنانچہ

ہر سو ہیں ترے حُسنِ فسوں کار کے چرچے
ہم بھی ہیں ترے عشق کے بیمار چنانچہ

درپیش ہے ڈستا ہوا اک موسمِ ہجراں
مدہم ہے بہت وقت کی رفتار چنانچہ

صحت کے تحفظ میں غافل نہیں انور
پڑھتا ہی نہیں ہوں کبھی اخبار چنانچہ

انور مسعود

سائیڈ ایفیکٹس

سر درد میں گولی یہ بڑی زود اثر ہے
پر تھوڑا سا نقصان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہے پیدا کوئی تبخیر کی صورت
دل تنگ و پریشان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہے کچھ ثقل سماعت کی شکایت
بیکار کوئی کان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ممکن ہے خرابی کوئی ہو جائے جگر میں
ہاں آپ کو یرقان بھی ہو سکتا ہے اس سے
پڑ سکتی ہے کچھ جلد خراشی کی ضرورت
خارش کا کچھ امکان بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہیں یادیں بھی ذرا سی متاثر
معمولی سا نسیان بھی ہو سکتا ہے اس سے
بینائی کے حق میں بھی یہ گولی نہیں اچھی
دیدہ کوئی حیران بھی ہو سکتا ہے اس سے
ہو سکتا ہے لاحق کوئی پیچیدہ مرض بھی
گردہ کوئی ویران بھی ہو سکتا ہے اس سے
ممکن ہے کہ ہو جائے نشہ اس سے ذرا سا
پھر آپ کا چالان بھی ہو سکتا ہے اس سے

غزل

بجیرو بھی کھڑی ہے اب تو ان کی کار کے پیچھے
عظیم الشان بنگلہ بھی ہے سبزہ زار کے پیچھے
کہاں جچتی ہے دیسی گھاس اب گھوڑوں کی نظروں میں
کہ سرپٹ دوڑتے پھرتے ہیں وہ معیار کے پیچھے
عجب دیوار اک دیکھی ہے میں نے آج رستے میں
نہ کچھ دیوار کے آگے نہ کچھ دیوار کے پیچھے
تعاقب یا پولس کرتی ہے یا ازراہِ مجبوری
کوئی گلزار پھرتا ہے کسی گلنار کے پیچھے
سرہانے سے یہ کیوں اٹھے، وہ دنیا سے نہیں اٹھتا
مسیحا ہاتھ دھو کر پڑ گیا بیمار کے پیچھے
ہوا خواہانِ سرکاری تو بس پھرتے ہی رہتے ہیں
کوئی سرکار کے آگے کوئی سرکار کے پیچھے
بڑے نمناک سے ہوتے ہیں انور قہقہے تیرے
کوئی دیوارِ گریہ ہے ترے اشعار کے پیچھے

○

انور مسعود

مہمان

عین راحت ہیں ہمیں سب اس کی خاطر داریاں
دال روٹی اُس کے حصّے کی جو ہے کھاتا رہے
سانس کی مانند ہے انور ہمیں مہماں عزیز
غرض اتنی ہے کہ بس آتا رہے، جاتا رہے

خروسِ بے خروش

اے راہرو گزرتی ہوئی ویگنوں میں دیکھ
انساں کی باوقاریاں، بااختیاریاں
کیا اس میں جھوٹ ہے کہ اسی ایک روٹ پر
مرغا بنی ہوئی ہیں ہزاروں سواریاں

فی الفور

ابھی ڈپو سے آجاتی ہے چینی
گوالا گھر سے اپنے چل پڑا ہے
حضور اب چائے پی کر جائیے گا
ملازم لکڑیاں لینے گیا ہے

فن کار

اے بندۂ مزدور نہ کر اتنی مشقت
کاندھے پہ تھکن لاد کے کیوں شام کو گھر آئے
جا کر کسی دفتر میں تو صاحب کا ہنر دیکھ
بے کار بھی بیٹھے تو وہ مصروف نظر آئے

بندوبستِ دوامی

ہر اک چیز فانی ہے مِٹ جائے گی
ہے یارا کسے اس کی تردید کا
مگر پھر بھی باقی رہے گی جو شے
وہ ہے محکمہ ضبط تولید کا

میٹنی شو

یہ حُسنِ اتّفاق نہ ہوتا تو لازماً
مجھ سے کوئی خطا سی خطا ہو گئی تھی آج
انور دعائیں فلم کے وقفے کو دیجیے
ورنہ نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی آج

جمالو

نکل آئی ہے اک ترکیب آخر
ذرا سا غور کرنے، سوچنے سے
کمر باریک ہوگی ڈائیٹنگ سے
اور ابرو موچنے سے نوچنے سے

فقیر آئے اور بد دعا کر چلے

تیری خواہش ہے اے مرے دشمن
عین جنگل میں مجھ کو شام پڑے
لے مری بددُعا بھی سُنتا جا
جا تجھے سی۔ ڈی۔ اے سے کام پڑے

داخلی برآمد

اُجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپا ہے جس کا نام
اُس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

شانہ بہ شانہ

چھوڑ دینا چاہیے خلوت نشینی کا خیال
وقت بدلا ہے تو ہم کو بھی بدلنا چاہیے
یہ بھی کیا مردوں کی صورت گھر میں ہی بیٹھے رہیں
عورتوں کی طرح باہر بھی نکلنا چاہیے

مطبوعات، مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی

مراٹھی آموز	ڈاکٹر عصمت جاوید	25 روپئے
ایک ہی پیالہ (ڈرامہ)	رام گنیش گڈکری مراٹھی سے ترجمہ / خلیل مظفر	20 روپئے
ناگپور میں اردو	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	50 روپئے
علم الامراض	ڈاکٹر کرنل محمد غفران	90 روپئے
چاند تارے	اسحاق خضر	15 روپے
[illegible]ٹر اور اس کی بیسک زبان	عبدالباری مومن	20 روپے
تھور شلیت کار	بی آر دیودھر مراٹھی سے ترجمہ / دستگیر شہاب	25 روپئے
امکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		40 روپے
امکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		25 روپے
امکان یک بابی ڈرامہ (خصوصی شمارہ)		10 روپے
امکان سراج اورنگ آبادی (خصوصی شمارہ)		20 روپے
امکان ذات سوانح (خصوصی شمارہ)		

ملنے کے پتے - مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی / فون 2672703

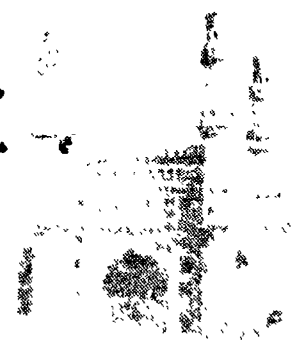
اولڈ کسٹم ہاوس-ڈی ڈی بلڈنگ ، شہید بھگت سنگھ مارگ ممبئی

2-مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنس بلڈنگ جے جے اسپتال ، ممبئی 008 400

الفلاح
کمپنی (رجسٹرڈ)

کی
طرح
مستحکم



کی
طرح
منفرد

نظر اٹھائیے ، دیکھئے الفلاح کی جانب
رواں دواں ہیں بلا سودی کاروبار یہاں

سکون قلب کا یہ بھی تو اک سہارا ہے
ہمارے شہر کا یہ منفرد ادارہ ہے

تاج محل کی طرح منفرد اور چار مینار کی طرح مستحکم

بلا سودی کاروبار کے ذریعہ اطمینان بخش کمیشن فراہم کرنے والا منفرد ادارہ
اپنی رقم مشغول کر کے ہر ماہ گھر بیٹھے کمیشن حاصل کرتے رہیے !!
آپ کے روپے کی حفاظت کا یقین دلاتی ہے
اس میں سرمایہ مشغول کر کے اپنے خاندان کے بہتر مستقبل
کی طمانیت حاصل کیجئے —

الفلاح
کمپنی
رجسٹرڈ



با اخلاق اسٹاف آپ کی رہنمائی کے لئے دفتر

AL FALAH COMPANY
POLICE COMMISSIONER OFFICE ROAD
PURANI HAVELI, HYD. PHONE 4565848
PIN 500 002 FAX -040-4565848

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ **شگوفہ** حیدرآباد

جلد ۳۰ —— شمارہ ۷ —— جولائی ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد مُعز

اوورسیز کمیٹی:

حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
محمود حسینی (آسٹریلیا)
محمد عبدالرحمن سلیم (ریاض)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس ادارت:

مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

مجلس مشاورت:

نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
حمایت اللہ

کتابت:
محمود سلیم، محمد غالب، محمد عبدالرؤف

طباعت:
دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

قیمت فی پرچہ: ۱۰ روپے
زرِ سالانہ: ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:

۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۱

فون (آفس) 595716 رہائش: 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چوُران (منظومات)

آندھراپردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس 5/825_1_4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈ روڈ حیدرآباد (اے پی)

حکومت آندھراپردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مُسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔ (۱)۔ غربت ہٹاؤ اسکیم (2)۔ خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ٪25 کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود ٪4 کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ۔ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ٪24 کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود ٪6 پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری 97ء تک 63288 افراد میں 1753.25 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 7120.92 لاکھ روپے ہوتی ہے! اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1501 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 119.25 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 476.22 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مُفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

○ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کررہی ہیں۔

○ خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمّد علی رفعت

ایم کام. ایل ایل. ایم

نائب صدرنشین و مینجنگ ڈائرکٹر

مُجتبیٰ حُسین

دِلّی جو ایک شہر ہے

دِلّی بھی بڑا عجیب و غریب شہر ہے۔ ایسا طوطا چشم شہر ہے کہ خود طوطے بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہ جملہ لکھ دینے کے بعد ہم نے غور کیا تو احساس ہوا کہ دہلی میں رہتے ہوئے پچیس برس بیت گئے لیکن واقعی ہم نے آج تک اس شہر میں کسی طوطے کو نہیں دیکھا۔ کوے اور گِدھ تو بہت سے دیکھے ہیں طوطا واقعی نہیں دیکھا۔ گِدھ تو یہاں بہت سے ہیں بشمول سیاسی گِدھوں کے (کاتب صاحب! براہِ کرم، گِدھ کے نیچے زیر لگائیے ورنہ لوگ اشارہ اس جانور کی طرف سمجھیں گے جسے ہم بہت عزیز رکھتے ہیں بلکہ اس کی کچھ خصوصیات تو ہم اپنی ذات میں بھی پاتے ہیں یہ جانور ہماری ہی طرح کان تک نہیں ہلاتا اور کام ہے کہ برابر کئے جاتا ہے) ہاں تو یہاں گِدھ بھی بہت ہوتے ہیں۔ پروں والے گِدھ تو مُردہ جانوروں کو نوچ نوچ کر کھاتے ہی رہتے ہیں البتہ سیاسی گِدھ زندہ قوم کو نوچ کر کھاتے ہیں اور بڑے پیمانے پر کھاتے ہیں۔ طوطا دہلی میں اس لیے نہیں دکھائی دیتا کہ یہاں رہنے سے طوطوں کی انا مجروح ہوتی ہے جب طوطوں نے دیکھا کہ دہلی میں رہنے والے باشندے ان سے کہیں زیادہ "طوطا چشم" ہو گئے ہیں تو انہوں نے دہلی میں رہنا ہی چھوڑ دیا۔ البتہ کتے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ اس شہر میں کتوں کی شناخت اور انفرادیت ابھی برقرار ہے۔ کتے میں جو وفاداری ہوتی ہے وہ یہاں کے باشندوں میں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ تو خیر جملۂ معترضہ ہے۔ آج دِلّی کا خیال ہمیں اس لیے آیا کہ پچھلے دنوں دہلی میں ایک ہی دن میں اکہتر (۷۱) جگہ آگ لگنے کی وارداتیں پیش آئی تھیں فائر بریگیڈ کے عملہ نے اس دن کھانا نہیں کھایا۔ فرصت ہی نہیں تھی تو کیا کرتے۔ ایک جگہ آگ بجھاتے تھے تو دوسری جگہ لگی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے بھاگنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ تو ایسا بھی ہوا کہ تھوڑی سی آگ پہلے بجھائی اور باقی کی آگ بعد میں آکر بجھائی گویا آگ بھی قسطوں میں بجھائی گئی۔

ہمارے ایک دوست فائر بریگیڈ کے عملہ میں کام کرتے ہیں اس دن کی وارداتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے اس دن ایک ہی آگ تھی جو ہم نہ بجھا سکے اور وہ تھی پیٹ کی آگ۔ اس پر ہم نے کہا تھا "میاں! تم پیٹ کی آگ تو سال بھر دن میں تین مرتبہ بجھاتے رہتے ہو اگر کبھی سارا دن اصلی آگ بجھانے کا موقع ملے تو تمہیں یوں شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ پھر تم تو آگ بجھانے کے حوالے سے ہی اپنے پیٹ کی آگ بھی بجھاتے رہتے ہو۔ جب سے یہ پتہ چلا ہے کہ دہلی میں ایک ہی دن میں ۷۱ جگہ آگ لگ سکتی ہے تو تب سے ہم دلی کی عظمت کے قائل ہو گئے ہیں اور ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے کہ ہم بھی کیسے عظیم شہر کے باسی ہیں۔ ایک ہی دن میں آگ لگنے کی ۷۱ وارداتیں: اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ جس رفتار سے یہاں ایک دن میں آگ لگی ہے اس رفتار سے تو ہمارے کرکٹ کھلاڑی

ون ڈے کرکٹ میچ" میں رن بھی نہیں بنا سکتے۔ اکثر تو نصف سنچری بنانے سے پہلے ہی آؤٹ ہو جاتے ہیں اور اپنی ہی آزادی کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے میچ کی ٹرافی کسی دوسرے ملک کی ٹیم کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ لو بھئی! یہ ٹرافی اپنے پاس رکھو تم بھی یاد کرو گے کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔ ہم تو اتنے فراخ دل ہیں کہ اچھا وقت آنے پر اپنی آزادی کو بھی اسی طرح طشت میں رکھ کر پیش کر سکتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے انگریزوں کی خدمت میں بھی تو اپنی آزادی اسی فراخدلی کے ساتھ ہنستے ہنستے پیش کی تھی۔ جس دن آگ لگنے کی وارداتیں پیش آنے لگیں اس دن ہمارے خوف کا یہ عالم تھا کہ بخدا سگریٹ جلانے کے لیے ماچس تک نہیں جلائی اور دوسری طرف ہماری بیوی نے چولھا نہیں جلایا کہ کیا عجب فائر بریگیڈ والے گھنٹیاں بجاتے ہوئے ہمارے گھر کی آگ بجھانے کے لیے نہ آجائیں۔ آپ ماچس کی آگ کی بات کرتے ہیں۔ ہم نے تو اس دن اپنے دل کی آگ کے شعلوں کو بھی ضرورت سے زیادہ بھڑکنے نہیں دیا۔ زمانہ ماضی میں ہمارے دل کی آگ کا ایندھن کچھ اور ہو گیا تھا اور اب ہمارے دل کی آگ کا ایندھن کچھ مختلف ہے۔ پھر یہ آگ ایسی ہے جسے دنیا کا کوئی فائر انجن بجھا نہیں سکتا۔ خیر ہم بھی کیا اپنے دل کی آگ لے بیٹھے۔ اس آگ کو بجھانے والے تو کوئی اور ہی تھے جو نوجوانی میں ہی ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم تو دلی میں لگنے والی آگ کا ذکر کر رہے تھے۔ پورا ایک دن تو ہم نے آگ لگنے کی وارداتوں کی خبریں سننے میں گزار دیا۔ دوسرے دن ہماری جو شامت آئی تو ان جگہوں کو دیکھنے کے لیے نکلے جہاں جہاں آگ لگی تھی۔ تھوڑی دور بھی نہیں گئے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اس دن دہلی میں ایسی موسلا دھار بارش ہوئی اور قدرت نے فائر بریگیڈ نے ایسا پانی برسایا کہ آگ لگنا تو دور کی بات ہے انسانوں کو ڈوبنے سے بچانا دشوار نظر آنے لگا۔ تب اندازہ ہوا کہ دہلی میں چاہے آگ برسے یا پانی برسے دونوں صورتوں میں یہاں زندہ رہنا دشوار ہے۔ جگہ جگہ پانی جمع ہونے لگا اور دھڑا دھڑ مکان گرنے لگے۔ ہماری گاڑی دہلی کے مشہور و معروف تلک برج کے نیچے پہنچی تو احساس ہوا کہ ہم نقل و حمل کے وسیلے میں بیٹھ گئے ہیں ہمیں تو یہاں موٹر بوٹ میں بیٹھ کر آنا چاہیے تھا۔ پل کے نیچے جو پانی جمع ہو گیا تھا وہ پہلے تو ہماری گاڑی کے انجن میں چلا آیا۔ پھر بعد میں رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ ہماری گاڑی کی سیٹیں ڈوبنے لگیں۔ ہمارے ڈرائیور نے کہا صاحب! پل کے نیچے آنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہم کم از کم آسمان سے برسنے والے پانی سے تو محفوظ ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ جو پانی نیچے سے آ رہا ہے وہ اوپر سے برسنے والے پانی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ سینکڑوں گاڑیاں پانی میں ڈوبتی چلی جا رہی تھیں۔ کچھ موٹر نشین حضرات تو اپنی گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھے تھے۔ بالآخر فائر بریگیڈ کا وہ عملہ جو کل سارا دن آگ بجھانے میں مصروف تھا اب پانی کو نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ دہلی بڑا عجیب و غریب شہر ہے۔ آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم نے تو یہاں میچ کھیلنے سے انکار کر دیا تھا کہ دہلی میں اتنی فضائی آلودگی ہے کہ اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ بمبئی کلکتہ اور مدراس میں جتنی موٹریں ہیں ان سب کو ملایا جائے تو ان سے کہیں زیادہ موٹریں دلی میں ہیں۔ پتہ نہیں اس ایک شہر میں اتنی موٹریں کہاں سے آتی ہیں۔ یہاں فضائی آلودگی کا وہ عالم ہے کہ اندھا بھی کسی سڑک سے گزرے تو بتا سکتا ہے کہ وہ کس علاقہ سے گزر رہا ہے۔ اگر پیٹرول کی بو آ رہی ہو اور آدمی کا دم گھٹ رہا ہو تو سمجھئے کہ وہ کناٹ پلیس سے گزر رہا ہے۔ سڑی ہوئی مچھلیوں اور مرغیوں کی بو آ رہی ہو تو سمجھئے کہ وہ جامع مسجد کے سامنے ہے۔ اگر آپ کی سانس باہر آنے کے بعد اندر جانے سے گریز کر رہی ہو تو جان لیجئے کہ آپ اوکھلا میں جمنا کے کنارے سے گزر رہے ہیں۔ اور بھی علاقوں سے گزرنے کی الگ الگ کئی صفات ہیں کہاں تک بیان کریں۔ یہ تو رہی مقامی آلودگی اور گندگی کی بات۔ اخلاق اور کردار کی گندگی کی بات ہم اس لیے نہیں کریں گے کہ دہلی ملک کی سیاسی راجدھانی ہے اور ہمارے موجودہ سیاستدانوں کے اخلاق اور کردار اتنے گندہ ہو گئے ہیں کہ کبھی ٹیلی ویژن

[illegible] دیتے ہیں تو ناک پر رومال رکھنے کی نوبت آجاتی ہے۔ ایک زمانہ میں دہلی کا حدود اربعہ کچھ کچھ ہمیں معلوم تھا۔ اب تو یہ حدود اربعہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا دہلی کے مشرق میں بھی دہلی ہی واقع ہے مغرب میں بھی دہلی ہی موجود ہے یہی حال شمال اور جنوب کا ہے۔ ہمیں دہلی کے کسی دور دراز جنوبی علاقہ میں جانے کی ضرورت پیش آتی تو ہم جائز طور پر یہ سوچتے ہیں کہ یہاں جانے کی بجائے ہم حیدرآباد ہی کیوں نہ چلے جائیں کیوں کہ حیدرآباد بھی تو کہیں جنوب میں ہی واقع ہے یہاں جانا ہمیں زیادہ آسان نظر آتا ہے۔ دہلی میں قدم قدم پر موت آپ کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں پلیگ کی وبا پھیلی تو دلی کے باشندوں نے نقاب اوڑھ لیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے لیے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا دشوار ہوگیا تھا جس [illegible] سے گفتگو کرنا چاہتے تھے وہ نقاب ہٹانے کے بعد دشمن نکلتا تھا۔ پچھلے سال ڈینگو بخار نے آفت مچائی۔ اب پھر [illegible] آمد آمد کی خبریں ہیں۔ پتہ نہیں کب آجائے۔ ذوق نے بہت پہلے کہا تھا۔

کون جائے ذوق پر
دلی کی گلیاں چھوڑ کر

[illegible] نہیں [illegible] میں دلی کی جن گلیوں کا ذکر کیا ہے وہ کیسی تھیں اور کہاں تھیں۔ ہمیں تو دلی کی یہ گلیاں نظر نہیں آئیں۔ [illegible] تو وہ ٹکسالی زبان بھی سنائی نہیں دی جس کے تحفظ کی خاطر میر تقی میر عام آدمی سے بات نہیں کرتے تھے ہندوستان کے ہر شہر کا کوئی نہ کوئی کردار ہے ہو سکتا ہے کہ کردار میں تھوڑی بہت خرابی بھی ہو لیکن دلی وہ واحد شہر ہے جس کا کوئی کردار ہے بھی تو وہ سیاستدانوں کے کردار کی طرح ہے اور آپ جانتے ہیں کہ سیاست داں اور کردار دو مخالف اور متضاد چیزیں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ دلی سات بار اجڑی اور سات بار بسی لیکن ہماری رائے میں یہ ہے کہ دلی تو اب ہر روز اجڑنے لگی ہے اور اس طرح اجڑی ہے کہ اس کے بسنے کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے۔ ہم پچیس برس پہلے جس دلی میں آئے تھے وہ خود اب ہمیں ایک خواب کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

□□ □□

مصطفیٰ علی بیگ
(حیدرآباد)

"بی فور می" (BEFORE ME)

دھوکا، فریب، سٹہ حوالہ بی فور می
میدان ہیں کمانے کے کیا کیا بی فور می

لٹنے کا RISK ہے مجھے دونوں کے ہاتھ سے
ڈاکو BEHIND می ہے تو نیتا بی فور می

بچپن سے میری آنکھ کے دو دو ہیں زاویئے
کوئی کھڑا رہا نہ اکیلا بی فور می!

HUNDRED گرام چہرے پہ پوڈر کو تھوپ کر
کہتی ہیں خود کو چاند کا ٹکڑا بی فور می

منڈوے چڑھایا سب کی محبت کی بیل کو
ٹھہرا ہے میرے پیار کا پودا بی فور می

پیچھے تو میرے ڈھونڈھتے رہتے ہیں تتلیاں
رہتے ہیں بن کے پارسا قبلہ بی فور می

کل تک منسٹری بھی اک آنر کی بات تھی
لیکن کھڑی ہے بن کے یہ خطرہ بی فور می

اقبال شانہ
(حقل، تبوک)

غزل

ہم سے جو آپ برسرِ پیکار ہو گئے
اعضاء تمام آپ کے ہتھیار ہو گئے

میک اپ کی لیپ سے وہ چمکدار ہو گئے
چہرہ جب ان کا ڈھل گیا تو خوار ہو گئے

گو تیرنا ہمیں نہیں آتا تو کیا ہوا
آنکھوں میں تیری ڈوب کے ہم پار ہو گئے

رکشا کہیں سے بھیج دے میرے خدا کوئی
چلنے کو میرے ساتھ وہ تیار ہو گئے

کب تک بس ایک چاند پہ ہی اکتفا کریں
ہم دیکھ دیکھ کر انہیں بیزار ہو گئے

پہچانتے نہیں ہیں مجھے بزمِ غیر میں
چوٹی کے اب تو وہ بھی اداکار ہو گئے

شانہ کی شاعری پہ بھی ملنے لگی ہے داد
اب لوگ رفتہ رفتہ سمجھ دار ہو گئے

اسرار جامعی
(دہلی)

"اردو کا گھر"

(قطعہ)

اردو جسے کہتے ہیں اک ایسی زباں ہے
جس کا وطنِ خاص ہے کوئی نہ مکاں ہے
جو گھر بھی نظر آئے کہیں نام سے اس کے
بزنس کا وہ اڈہ ہے سیاست کی دکاں ہے

سید طالب حسین زیدی
حیدرآباد

رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ایلیٹ اچھا پیراک پانی میں اترنے سے پہلے دریا کے بہاؤ اور اُس کی گہرائی کا اندازہ کر لینے کے بعد ہی چھلانگ لگاتا ہے دوسری صورت میں کسی نہ کسی جنجال میں پھنس جانے کا قوی احتمال ہے۔
علیٰ ہذا القیاس آج کل سڑکوں پر پیدل یا کسی سواری پر یہ دیکھ بھال کر گزرنا چاہیئے کہ ٹریفک کا موڈ کیا ہے؟ اور کس رُخ اور رفتار سے چلنے میں سلامتی ہے ورنہ نتیجہ معلوم!
اسی مقصد کو پانے کے لیے اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں بے ہنگم اور مُنہ زور ٹریفک کی خر مستیوں سے بچنے اور ناگہانی حادثوں کو ٹالنے کے لیے راہروی کے چند اسرار و رموز آپ کی خدمت میں "پیش کرنے جا رہے ہیں" (یا للعجب° ؟) (پیش کر رہے ہیں) بے شک آپ موٹر بائیک اور کار ڈرائیونگ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں مگر یہ کہ ضروری ہے کہ سامنے سے آنے والا بھی آپ ہی کی طرح ایک منجھا ہوا اور احتیاط پسند ڈرائیور ہو؟ آیئے ان ہی نکات اور نزاکتوں پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔
آر۔ ٹی۔ سی۔ کے بھُلگے°: یہ بن ہاتھی کے بیلوں کی طرح اپنے جُثّے اور بھونڈی، بھدّی آواز کی دھاک ڈال کر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے ان سے خبردار رہنے کی شدید ضرورت ہے آئے دن اخباروں میں ان کی شوریدہ پشتیوں کی وجہ سے معصوم انسانی جانوں کے اتلاف کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ویسے اُن ہرے اور لال رنگ والے پُرانے گھسٹے پٹے، کھوسٹ کھُلگوں سے کچھ زیادہ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ اب یہ ازکار رفتہ ہو چکے ہیں پھر بھی، "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" کی کیفیت میں محض وضعداری نبھانے کی خاطر اپنے آپ کو سڑکوں پر کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ البتہ، "میٹرو اکسپریس" اور "میٹرو لائینر" نام کے یہ نوجوان مشٹنڈے اپنے زور و مستی میں مست مست کرتے ہوئے دوسروں کو پیس ڈالنے کی فکر میں چڑھ آتے ہیں ہماری طرح آپ نے بھی ضرور دیکھا ہوگا جب ٹریفک کی رفتار نقطۂ انجماد کے قریب پہنچ جاتی ہے وہاں بھی یہ بھونچال بنے مست ہاتھی کی مانند ساری ٹریفک کو چیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور ان کھلگوں کے کھلگے پن سے ساری خلقت "تیرہ تیرہ" پکار اٹھتی ہے۔ ان سے

° بروزن ‎ ⊖ I am going to say you ⊖۔ حیدرآباد میں بھینسے کو کھلگا کہتے ہیں۔

بچنے کی ہر موثر تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔

ڈبل ڈیکر: دیکھنا! سامنے سے ایک پہاڑ پہیوں والے تختے پر گھسٹتے ہوئے" وہ آرہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے" کی صورت چلا آرہا ہے، کون؟ عرف عام میں اسے "ڈبل بس" بولا جاتا ہے۔

پیری سے کمر میں اک ذرا خم ؛ توقیر کی صورتِ مجسّم

وقت ستم شعار نے سارے انجر پنجر ڈھیلے کردیئے ہیں، کٹی کھائی ہوئی پتنگ کی طرح آپ کا ایک ہینگل زمین چاٹ رہا ہے اور دوسرا مائل بہ پرواز۔ لگتا ہے اپنے دن گن رہے ہیں، آپ سے گھبرانے اور ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں بوڑھے اور بیمار شیر کی طرح بالکل بے ضرر ہیں۔ ترس کھائیے، ایک طرف کو ہو جائیے آرام سے گزر جانے دیجئے معذوروں اور بزرگوں کا احترام بھی داخلِ انسانیت ہے ورنہ آپ کی خاطر اگر بریک لگا دیا گئے تو ان کی ہوا نکل جائے گی اور پھر سے اسٹارٹ لینے کی خاطر نہ جانے کتنے اور کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑ جائیں۔ ؟ ۔ ۔ ۔

ایمبسڈر کا دھڑا: بسوں کے بعد نمبر آتا ہے ایمبسڈر کے دھڑے کا۔ نشتہ نخوت، زشت رو جالیں اور پردہ یا چار برسوں سے مسلسل بجا جارہا ہے۔ سنتے سنتے کان بہرے اور دیکھتے دیکھتے آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔ قومی توانائی کے سرخیل، ذہین و فطین چکرورتی راج گوپال آچاری آنجہانی نے جو بلا کے باتونی اور ہمیشہ دکھتی رگوں پر نشتر لگایا کرتے تھے، سچ ہی فرمایا تھا" اس کی ہر چیز بجتی ہے سوائے ہارن کے"۔ ۔ ۔ قسام ازل سے شگفتہ حالی، شوریدہ سری مانگ لائے ہیں۔ ۔ ۔ جب اپنے گھر کے گیٹ سے نکل کر "دھڑا" سڑک پر آتا ہے تو دوسری شریف بالذات کاریں بھی پناہ مانگتی ہیں، مجال ہے یہ کسی دوسری کار، موٹر بائیک یا اسکوٹر کے پیچھے رہنا گوارا کرے؟ دھڑے کی "دھڑ دھڑ" سنتے ہی اپنی گاڑی کو ایک طرف کر لیجئے اور خیر منائیے اس کی سرشت ہی میں شر اور ٹیڑھ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ہم نے دیکھا معقول اور وضعدار قسم کے لوگ بھی جن کی نشست و برخاست میں ایک طرح کا وقار اور شائستگی ہوتی ہے وہ بھی جب اس دھڑے کا اسٹیرنگ سنبھالتے ہیں تو شمال مغرب کو رخ کرکے "ترکیں" ① ہو جائیں گے اور پھر جب دھڑے کو دوڑائیں گے تو ساری وضع داریاں اور شائستگیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ کسی اور کار کے اسٹیرنگ پر یہ چھچھورپن نظر نہیں آتا۔ ۔ ۔" بندر آپ خراب سو خراب سارا طویلہ خراب"۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب "شریف گھرانوں" کی شریف المزاج، حلیم الطبع کاریں بھی اس کی دیکھا دیکھی سڑکوں پر اپنی مقدور بھر اچھل کود مچانا شروع کرکے رہروں کو ننگی کا ناچ نچا رہی ہیں ورنہ پہلے یہ سڑکوں پر شریف بہو بیٹیوں کی طرح شرافت و متانت سے سر نیوڑھائے نظریں نیچی کیے چلا کرتی تھیں۔ سچ ہے ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

یاماہا: ہماری مانیے تو سب سے زیادہ اپنی خیر منائیے۔ "یاماہا موٹر سیکل" یوں لگتا ہے کوئی جٹ بمبار جو ابھی ٹیک آف لینے کے لیے "زوووں" کرتا ہوا ۳۰۳ رائیفل کا بلٹ بنا آپ کے قریب سے سنسنی پیدا کرتا ہوا نکل گیا اس کی "زوووں" سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ ہم پہلے سمجھتے تھے یہ سب نوجوان لڑکوں کی خرمستیاں ہیں، ارادہ تھا ارباب ٹریفک پولیس کو مشورہ دے کر ان کے ڈرائیونگ لائیسنس منسوخ کروادیں جو اس بمبار پر اپنی اور دوسروں کی جانوں کا جوکھم مول لیتے ہیں مگر ذرا غور کیا تو معلوم ہوا یہ کچھ "یاماہا" ہی کی پیدائشی فطرت، شور زیادہ ہے ۔ ۔ ۔ یہ نیکے تو دوسری موٹر سیکلیں اور اسکوٹر بھی چلاتے ہی ہیں اور نہایت شرافت اور اندا۔۔

سے چلاتے ہیں اس "یاماہی" خصلتِ ناہنجار کی ایک دن تصدیق بھی ہوگئی، ہوا کیا! دیکھتے ہیں کہ سامنے سے ایک خضر صورت بزرگ "یاماہا" پر سوار "گولی" بنے چلے آرہے ہیں، عمر شریف "عاقبت" سنوارنے کے آخری مرحلے میں، لباس خواجگی میں ملبوس، سر پر زرد رنگ کا طرۂ پوش گلے میں سبز رومال جو ہوا میں یوں لہرا رہا تھا جیسے گارڈ انجن کو ہری جھنڈی دکھا رہا ہو.... اور ہوائی مار سے ریشِ مبارک دو حصوں میں بٹ کر آٹھ کا ہندسہ (۸) بنی ہوئی تھی....

غالباً شوق اور لہر میں آکر اپنے آپ کو "ابھی تو میں جوان ہوں" کی تسلی دینے کے لیے اپنی "موپڈ" کو چھوڑ کر صاحبزادے کی نظریں بچا کے اس کی "یاماہا" لے اڑے تھے....

آٹو کرشمہ: اس طرح اپنی خیر منائیے جیسے کسی دُم اٹھا کر دوڑ لگانے والے "گائے" کے "پاڑے" سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں پاڑا جب "آکرامک" (جارحانہ) انداز سے ایک مرتبہ اپنی دُم اٹھا کر بکریں ارتا ہوا دوڑ لگاتا ہے تو پھر رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا وہیں پہنچ کر دم لے گا جہاں کا اُس نے قصد کر لیا ہوتا ہے....

ہمارے ایک دوست کو راہ چلتے لوگوں سے پنگا لینے کا بڑا شوق ہے۔ ایک دن ہمارے ساتھ آٹو میں سوار ہونے سے پہلے ہمیشہ کی طرح ڈرائیور سے ملتجیانہ درخواست کی کہ بھائی صاحب! بندہ دل کا مریض ہے اور کمر کی ہڈی بھی سرکی ہوئی ہے۔ ذرا احتیاط اور آرام سے لے چلیں مگر وہ آٹو ڈرائیور ہی کیا جو آئے دن کی ایسی درخواستوں پر پسیجتا پھرے۔ دُم اٹھائی اور دوڑ لگادی نہ سڑک کے گڑھوں کو خاطر میں لاتا اور نہ کسی راہ رو کو۔ جب دو چار مرتبہ ہم اور دوست اچھل اچھل کر آٹو کی کمانی سے اپنے سر ٹکرا چکے تو جناب نے اپنا سر سہلاتے ہوئے ہم سے فرمایا آپ نے کچھ سنا؟ پولیس اور بلدیہ والے ایک "قانون" بنانے جا رہے ہیں" جس کے ذریعہ ڈرائیور کے منہ میں لگام دے کر باگیں سواری کے ہاتھوں میں دی جائیں گی تاکہ رُخ اور رفتار پر ان کا کنٹرول رہے.... آٹو والا جو یہ گفتگو غور سے سن رہا تھا (اور ان کا مقصد بھی اسی کو سنانا تھا) بولا واہ صاحب، ہم بھی کوئی گھوڑے ہوئے جو لگام ڈالی جائے گی؟.... بولے، وہ ہو تو نہیں مگر چال بس اسی کے سے ہیں صرف دولتی جھاڑنا باقی ہے....

ایک مرتبہ انھوں نے اسی طرح دُم اٹھا کر دوڑنے سے پوچھا، بھیا! کیا آپ کا دولت خانہ بھی اسی طرف ہے؟ بات کو نہ سمجھتے ہوئے ہم نے پوچھا، اس استفسار سے آپ کا مطلب؟ بولے تانگے کا گھوڑا جب تھان کی طرف کا رُخ کرتا ہے تو فطرتاً اس کی رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے....

اُچکنا: قارئین کرام "داہنوں" کی رفتار کو کنٹرول کرنے کے لیے سڑکوں پر فاصلے فاصلے سے اسپیڈ بریکر speed breaker بنائے گئے ہیں جن کی فیض رسائیوں سے … اور آپ جیسے عاقبت اندیشوں کو بھی سابقہ پڑتا رہتا ہے یہ رفتار پر تو قابو پاتے ہی ہیں ساتھ ہی کار اور اسکوٹر کے … پرنگ اور ہمارے بدن کا کبھی مزاج پوچھ لیا کرتے ہیں ان پر سے گزرتے ہوئے منہ سے "الٰہی خیر" بے ساختہ نکل جاتا ہے اس لیے ہم نے ان کو اسپیڈ بریکر کی بجائے "اُچکنے" کا نام دیا ہے، جب کبھی ان "اُچکنوں" سے سابقہ پڑے احتیاط کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے، دوری سے اپنی گاڑی کی رفتار کو قابو میں لے آئیں ورنہ یہ "اُچکنا" آپ کو "پنگ پانگ" کی گیند کی طرح اچھال دے گا نتیجے میں آپ کمر پکڑ کر بیٹھ

- "آ بیل مجھے مار" کی پنجابی

جائیں گے .... اکثر تو سنگل "اُچکنے" ہی ملتے ہیں لیکن بعض جگہوں پر کاروگیٹیڈ corrugated اُچکنوں سے
بھی پالا پڑتا ہے (〰) ان پر سے گزرتے ہوئے ہمیں بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے، کیوں؟ ہماری طرح آپ بھی
غور سے دیکھیں تو نظر آئے گا ان پر سے گزرنے والا موٹر بائیک سوار خود بھی از گردن تا کمر کاروگیٹیڈ (ق) ہوجاتا ہے۔
اچکنوں پر سے اپنا اسکوٹر گزارنے کے معاملے میں ہمارے عزیز دوست جناب فریدالحسن کمالی صاحب کا فلسفہ
کچھ اور ہی تھا جوں ہی اُچکنے پر ان کی نظر پڑتی دور ہی سے اپنے اسکوٹر کے میٹر کی سوئی کو لال نشان سے ٹکرا کر پھر اس
طرح اُچکتے جیسے سرکس کا کرتب باز جیپ یا موٹر بائیک کو ایک تختے پر سے دوسرے تختے پر فٹبال کی طرح اُچھالا
دیتا ہے۔ اور پھر کیا ہوا؟ چند مرتبہ فٹبال بننے کے بعد موصوف کو کئی دنوں تک آرتھوپیڈک ہسپتال کی میزبانی کا لطف
اُٹھانا پڑا۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ رفتار بڑھا کر ہوا میں معلق ہوجانے سے "جھٹکے" سے بچا جا سکتا ہے.....
پریئے یا ٹھک شری! (عزیز القدر قاری محترم) جب بھی آپ اپنی کار یا اسکوٹر ڈرائیو کرتے ہوئے یہ دیکھیں
کہ کوئی بھینس یا خاتون (خصوصاً دیہاتی خاتون) سڑک کراس کر رہی ہے تو "کرپیا" (براہ مہربانی) اُس کے عقب سے
ہرگز اپنی گاڑی نہ نکالیں کیوں؟ دوسری طرف سے طوفانی رفتار سے آتے ہوئے ٹرک یا بس کو دیکھ کر بچنے کے لیے
یکلخت اباؤٹ ٹرن (ABOUT TURN) ہوکر اپنے نقطۂ آغاز کی طرف دوڑ لگائے گی اور خواہی نہ خواہی آپ یکایک
اس کی چپیٹ میں آکر دو چار قلابازیاں کھانے پر مجبور ہوجائیں گے ..... اور سدا ان دو کالج "گرلوں" سے بھی ہشیار رہیے
جو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اونچی ایڑھی کی سینڈل پہنے مورنی کی چال سے ٹھمک ٹھمک کر سڑک عبور کیا کرتی ہیں ایسی
حالت میں جب وہ یہ دیکھیں گی کہ آپ تیزی سے اپنی کار دوڑاتے ہوئے چلے آرہے ہیں گھبرا کر ایک تو اپنی سہیلی کا ہاتھ
مضبوطی سے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی سڑک پار کرلینے کی فکر کرے گی۔ اور دوسری
اپنی خیر مناتے ہوئے سر پر آنے والی مصیبت سے بچنے "تو چل میں آیا" کی صورت اپنا ہاتھ چھڑا کر اسٹارٹنگ پوائنٹ
کی طرف لپکنے کے ارادے سے پلٹ پڑے گی۔ اور وہ جو سڑک پار کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے کہہ رہی ہوگی "جب تم
ہاتھ تھاما ہے تو پار اُتار کر ہی دم لوں گی۔ .... سڑک کے بیچوں بیچ اس کھینچا تانی کو دیکھ کر آپ یہ فیصلہ نہ کر پائیں گے
کہ اپنی کار اس پر دوڑاؤں یا اس کو دبوچوں؟ اس حیص بیص میں پھنس کر ہاتھ اسٹیئرنگ پر لرزنے لگیں گے اور کپکپاتے
ہوئے پیر کلچ و بریک کی تمیز کھو دیں گے کار زِگ زیگ (zig zag) ہونے لگے گی اور ادھر سڑک کے کنارے کھڑا
ہوا ٹرافک پولیس کا کانسٹبل ریفری کی مانند منہ میں سیٹی دبائے، آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھتے ہوئے اس انتظار
میں ہوگا، اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے۔
آج کل سیکل اپنی وقعت و اہمیت کھو چکی ہے پتلی سی جان، دھان پان ذرا سی جگہ میں سے بھی سبک روی سے
اپنے آپ کو نکال لیتی ہے پھر بھی ایک حد تک آپ اپنے آگے چلنے والی سیکل پر نظر رکھنا نہ بھولیں جب تک سوار سیٹ پر
بیٹھا ہے، بےضرر ہے لیکن جب سیٹ سے اُٹھ کر پیڈل مارتے ہوئے "سنپولیا" چال ہوجائے گا تو آپ نہ ادھر سے
آگے نکل پائیں گے اور نہ اُدھر سے اب یہ آپ کی مہارت اور تیزی پر منحصر ہے کہ سنپولیا لہراتا ہوا جب اُدھر ہوجائے
آپ "سٹ" سے اِدھر سے نکل جائیں..... اسٹاپ پر رکی ہوئی بس کے بازو سے گزرنے کا اتفاق ہو تو جس قدر ہو سکے
تیز گزریں ورنہ کسی کھڑکی میں سے آپ پر "عبیر و گلال" کا چھڑکاؤ بھی ہو سکتا ہے اس چھڑکاؤ کو روکنے کی ہر سعی ذرا

ہماری "پرمپرا" (روایت) کے خلاف ہے اس واسطے اعتراض کی گنجائش نہیں بس، چُپ دبی گھر چلے جائیں، منہ دھولیں لباس تبدیل کرلیں۔ . . .

ایک مرتبہ ہم اپنا اسکوٹر عاقبت نا اندیش رفتار سے چلا رہے تھے، برابر سے ایک "پاپا" گزرا اور گزرتے ہوئے پچکاری اُڑائی چہرے پر چھینٹیں پڑیں گٹکے اور قوام کا ملا جلا تیز اور ناگوار بھبکا ناک کے راستے دماغ تک چڑھ گیا غصہ آیا، ہم نے بھی ایکسلریٹر (ACCELERATOR) گھما کر رفتار بڑھائی اور تیر کی طرح پاپا سے آگے نکل اور اسکوٹر سے T بنا کر اس کے آگے کھڑے ہوگئے اور پوچھا، "مشکی یا عبیری"؟ . . . سٹپٹا گیا، بولا جی نہیں سمجھا صاحب! ہم نے کہا سمجھے گا بھی نہیں)۔ یہ بتا باغ و بہار چمن گٹکا تھا یا آندھی اور طوفان بہلا "دادا زردہ"؟ سمجھ کر کھسیانا ہوگیا، معافی چاہی۔ ہم نے بھی معاف کردیا اور رومال سے چہرہ صاف کرکے آگے بڑھ گئے . . .

اب ذرا آئیے سڑک پر اپنے ہم ردوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں کہ کیسے کیسوں سے سابقہ پڑتا ہے؟ یہ جو آپ کے آگے آگے پاپا پر ایک نوجوان جوڑا، "من تو شدم، تو من شدی من تن شدم، تو جان شدی: تاکس نہ گوید بعد ازیں. من دیگراں، تو دیگری" کی کیفیت میں گزر رہا ہے، یہ پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ "من دیگراں" کہاں ختم ہورہی ہے اور "تو دیگری" کہاں سے شروع ہورہا ہے؟ اس پاپا سے ہوشیار، بارود کا ڈھیر ہے اس پر رومیو جولیٹ سوار ہیں، جو لیڈیز اپنی باہیں رومیو کے گلے میں حمائل کئے ہوئے گارہی ہے، "ہوا میں اُڑتا جائے مرا لال دوپٹہ ململ کا، مرا لال دوپٹہ ململ کا۔ ہو جی، ہو جی۔ حالاں کہ جولیٹ بی بی کا وہ دوپٹہ کبھی کا اُڑ بھی چکا، اس کے اڑجانے کے بعد جو باقی بچا ہے سو اُسے لے کر وہ سارے بازار کی نگاہوں میں بڑی فیاضی سے بانٹتی پھر رہی ہیں جسے دیکھ کر بعض عفت مآب تو شرم سے اپنی نگاہیں فوراً جھکا لیتے ہیں اور بعض جھکا تو لیتے ہیں مگر ٹھہر ٹھہر کر کن انکھیوں سے دیکھتے بھی جاتے ہیں۔ اور بیشتر تو ایسا دیکھتے ہیں جیسے کھلی کتاب پڑھی جاتی ہے . . . . دوپٹہ چوں کہ گانے میں اڑ رہا ہے نہیں سکتا اسی لیے وہاں ابھی تک اٹکا ہوا ہے . . . . اور، ہو جی۔ ؟ یعنی رومیو اس وقت اپنے آپے میں نہیں ہے افلاک کی سیر میں مگن اور "نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" اس کے قرب سے اس طرح بچیئے جیسے دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں سے، ورنہ آپ کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے یہ رخشِ منہ زور جو اپنی مستی میں بگٹٹ اڑا جارہا ہے خدا جانے کہاں جاکر تھمے گا؟ جس قدر ممکن ہوسکے اسے اپنے قریب سے دور ہوجانے دیں ورنہ نتیجہ معلوم! . . .

اور اُدھر اسکوٹر کی پچھلی نشست پر نوجوان کے کاندھے پر ایک ہاتھ رکھے اور دوسرے میں کتابیں سنبھالی بیٹھی ہے کوئی اور نہیں اپنے دل میں میل نہ لائیں بہن ہوتی ہے۔ جیسے بھائی آدمیت کی رفتار سے کالج پہنچانے جارہے ہیں آپ اگر ذرا جلدی میں ہوں تو ان کا راستہ کاٹ سکتے ہیں برابر بھی چل سکتے ہیں یا آگے بھی بڑھ جاسکتے ہیں اس وقت "بچہ" مکمل شرافت کے نہائے میں ہے طیش میں ہرگز نہیں آئے گا . . . .

اب ذرا ان سے بھی متعارف ہوجائیں۔ پچھلی نشست پر سرتاپا سیاہ برقعے میں، سر آسمان کی طرف اٹھائے دنیا و مافیہا سے بے خبر، آدم بے زار، دونوں ہاتھ "قل" کے انداز میں گود میں رکھے "نہ چھیڑ اے نکہت یادِ بہاری" کا مرقع بنے بیٹھی ہیں۔ یہ "اماں جان" ہوتی ہیں تب ہی تو برخوردار احتیاط کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے مکمل انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا اسکوٹر ایسی رفتار سے چلا رہے ہیں کہ مبادا اس "آبگینے" کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔

"ماں اور اس کا دل تو ہونا ہی آبگینہ ہے۔ گھور کے دیکھو، رو دیا۔ پیار سے دیکھو،
بھر آیا۔ گرمی ہو یا برسات ندی کا کام تو بہنا ہی ہوا"

"یہ اماں جان یا امی جان سے تعارف تھا۔ بجائے ان کے "مم" یا "مماں" ہوتیں تو آپ کی نشست کا زاویہ تو دوسرا ہوتا ہی ساتھ ہی برقعے اور نقاب سے بے نیاز تیز اور چبھتے ہوئے رنگوں کی ساڑھی، گلے میں نولکھا ہار، کانوں میں ٹپ ٹاپ نئے فیشن کے جھومر، سر کے بال گھونٹ گھونٹ کر ڈائی (DYE) کئے ہوئے، کھلے ہوئے گلے کے بلاوز کی شوخ چشمی کا یہ عالم کہ بقول مشتاق احمد یوسفی کوئی شیر خوار بچہ دیکھ پائے تو ہمک کر مچل جائے . . .

اُدھر کا حال تو یہ تھا کہ "اماں جان یا امی جان" اپنے خیالوں میں گم تھم زبان پر تالا ڈالے ہوئے تھیں مگر اِدھر "مماں" کا معاملہ دوسرا ہوا زبان ہے کہ مسلسل گل افشانی گفتار سے تھکتی ہی نہیں۔ صاحبزادے کو ڈانٹتی پھٹکارتی ہوئی کہ "ٹنکو بیٹے"! اسکوٹر چلا رہے ہو؟ جیسے کینچوا رینگ رہا ہے۔ اُدھر پارٹی کا وقت نکلا جا رہا ہے اور تم ہو کہ رینگ رہے ہو۔ اگر تیز نہیں چلا سکتے تو روک کر مجھے اتار دو ٹیکسی لے کر چلی جاؤں گی . . . .

"بارے ڈاکٹر کمال کا بیاں ہو جائے"

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے تھوڑا سا مصطفےٰ کمال صاحب کے بارے میں بھی اپنی معلومات میں اضافہ کر لیجئے اگر اتفاق سے کبھی راستے میں سید صاحب کا ساتھ ہو جائے تو بے شک معظم جاہی مارکٹ کے آئی لینڈ تک تو مٹرگشتی کرتے ہوئے ساتھ دیا جا سکتا ہے اس کے بعد "سلام علیکم و علیکم سلام" ہی میں خیر ہے پیچھے ہو جائیں یا راستہ ہی بدل دیں۔ کیوں؟ آئی لینڈ سے آگے بڑھنے کے بعد سید صاحب جب اپنا سیدھا ہاتھ سگنل کی مانند اُٹھا کر ایک بار تیر کی طرح مجرد گاہ کا رُخ کرتے ہیں تو شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف چلنے والی ٹریفک پر سکتہ چھا جاتا ہے اور یہ اس کو چیرتے پھاڑتے ہوئے "شگوفہ" کے دفتر کے نیچے پہنچ کر ہی دم لیں گے اور ٹھا ہوا سگنل ڈاؤن ہو گا۔ مجال نہیں کہ کوئی منہ زور "بابا" ہو کوئی گائے کا باڑا، اور کوئی آر ٹی سی کا کھڑکھڑا آپ کا راستہ روک یا کاٹ لے . . . .

محترم قارئین! آپ کی سلامتی کی خاطر دلی خیر خواہی سے ہم رہ روی کے "خیلہ گر" آپ کی خدمت میں پیش کر کے اپنے اس خوش گوار فریضے سے سبکدوش ہوتے ہیں اس پرچہ ترکیب استعمال "کی تلاوت کرتے رہیے بھلا ہی بھلا ہو گا۔

نیک و بد دونوں کی باریکیاں "بہ انداز دگر" ہم نے حضور کو سمجھا دیں اب یہ حضور کا کام ہے کہ مانو فبہا نہ مانو "مرضیہا۔"

سلام علیکم! . . . . . .

□□

پروفیسر یداللہ مہدی

چائے کی چاس

دوسری قسط

چائے سے وائے تک

شاید یہ بات ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ چائے کوئی پھل فروٹ نہیں ہے کہ جسے تازہ بہ تازہ نو بہ نو شاخ سے توڑا، چوسا چبایا اور پھینک دیا یہ ایک ایسی نزاکت مآب نخرے والی شئے ہے جو ڈالی سے ٹوٹ کر پیالی تک پہنچنے میں کئی مرحلے سر کرتی ہے یعنی باغیچے سے نکل کر پہاڑیوں سے پھسل کر فیکٹریوں کی بھٹی میں جل کر نت نئے روپ بدل کر دیدہ زیب پیکٹوں میں ڈھل کر ان گنت ہاتھوں سے ہوتے ہوئے صہبا کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے۔ دست بہ دست پایہ تکمیل کو پہنچنے والے چائے کے سفر کا "شجرہ صورت" اس لحاظ سے قابلِ دید، قابلِ داد ہوتا ہے کہ بے شمار نازک نازک ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں نہایت احتیاط کے ساتھ ایک ایک پتی، ایک ایک بوٹے کو چن چن کر اس صفائی سے توڑتی ہیں کہ ٹہنیوں اور ٹہنیوں کو ذرا بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ چنانچہ اوٹی سے لے کر آسام تک، دارجلنگ سے نیلگری تک کسی بھی چائے باگان کا نظارہ کیجئے صرف خواتین ہی چائے کی پتی توڑنے کا نازک فریضہ انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خواتین عموماً کام کے اوقات میں مردوں کی طرح چائے نوشی یا سگریٹ نوشی میں اپنے کار وقت ضائع نہیں کرتیں، انہیں باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے سو وہ ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے بھی کی جاسکتی ہیں اور اس سے کام میں بالخصوص چائے کی پتی توڑنے کے کام میں بالکل خلل نہیں پڑتا۔ چائے کی پتی توڑنے کے نازک کام میں طاقت کا استعمال ساری محنت سارے کیے کرائے پر پانی پھیر سکتا ہے، اس لیے چائے کے باغات میں زورِ بازو کے مظاہرے کی قطعی اجازت نہیں دی جاتی کہ اس سے پتی کے ساتھ پتوں، پتوں کے ساتھ ڈالیوں اور ڈالیوں کے ساتھ خود سالم فصل کے جڑ پیڑ سے اکھڑ آنے کا خدشہ لاحق رہتا ہے، اس کام میں تو بس نفاست اور نزاکت شرطِ اول و آخر ہے۔ بلکہ ہمارا تو دعویٰ ہے کہ چائے کی پتی کو ڈالی سے الگ کرتے وقت ہاتھ تو ہاتھ سانس تک سنبھال کر لینا پڑتا ہے بقول شاعر ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

[illegible] ڈالتے چلیں، آج دنیا کی منڈی میں ہمہ اقسام کی چائے مختلف ناموں الگ الگ حیثیتوں کے ساتھ ہر چھوٹی بڑی دکان میں ٹھوک کے بھاؤ دستیاب ہے۔ چائے کی اس بہتات کا سبب ایک تو اس کی ہمہ گیر مقبولیت ہے۔ دوسرے اس میں شاید منافع کی شرح دوسری اشیائے مائحتاج کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ حرص و ہوس کی دوڑ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے یعنی اپنی چائے کو چائے اور دوسرے کی چائے کو [illegible] ثابت کرنے کے لیے یہ طرح طرح کی اشتہار بازی کو جائز اور واجب قرار دیتے ہیں۔ نتیجتاً ریڈیو، ٹی وی

بار، غرض ترسیل و ابلاغ کا ایک بھی ذریعہ ایسا نہیں جو مختلف برانڈ کی مہکتی چائے کے بارے میں چہکتا نہ ہو یہاں
ونتے کے طور پر صرف دو عدد اشتہاری فلموں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ظاہر ہے چائے کی پبلسٹی سے متعلق ہیں ایک
میں ایک استاد طبلہ نواز طبلے پر اپنے فن کا مختصر مظاہرہ کرنے کے بعد ایک مخصوص برانڈ کی چائے پر تبصرہ فرماتے
جس کا لب لباب ہماری ناقص سمجھ کے اعتبار سے یہ ہے کہ موسیقی کی دنیا میں طبلے کے استاد آپ ہیں تو چائے
، باب میں مذکورہ برانڈ کی چائے استاد کا درجہ رکھتی ہے، دوسری اشتہاری فلم میں ایک گرہست قسم کی خاتون
سکراتی ہوئی ایک جنرل اسٹور میں تشریف لاکر دکاندار سے ایک خاص برانڈ کی چائے طلب فرماتی ہیں۔ پھر مطلوبہ
ئے کا پیکٹ جیسے ہی ان کے ہاتھ لگتا ہے دوکاندار کو بجائے اس کی قیمت ادا کرنے کے، چائے کے تعلق سے
پر بلاکر ہنستے ہوئے وہاں سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ الغرض اشتہار چاہے دیدنی ہو کر شنیدنی چائے کے برانڈ اس
الگ الگ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن دعوے ایک جیسے گھسے پٹے ہوتے ہیں۔ یعنی اشتہار کی رو سے ہر چائے خوشبودار
لذت دار اور دم دار ہوتی ہے۔

ہم آپ کو چائے کے باغات کی سیر کرا چکے آیئے اب باغات سے باورچی خانے کی طرف چلتے ہیں، یعنی چائے بنانے
ے مروجہ طریقہ کار پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں ویسے چائے بنانے میں کوئی خاص تیر نہیں مارنا پڑتا بالفاظ دیگر نہ پاپڑ
بیلنے پڑتے ہیں، نہ ڈنڈ بیلنے پڑتے ہیں اس کے لیے پتی، شکر، دودھ اور دو ہاتھ درکار ہوتے ہیں۔ یہ چار چیزیں اگر
کجا ہو جائیں تو پھر منٹوں میں چائے تیار سمجھئے۔ چائے کے اجزائے ترکیبی میں ہم نے پانی کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا کیونکہ
لے ہی دودھ میں وافر مقدار میں ملا ہوتا ہے اب سے تیس چالیس سال پہلے کی بات اور ہے تب چائے کے محلول میں پانی
ملایا جاتا تھا کہ اس زمانے میں اصلی گھی کے علاوہ خالص دودھ بھی جگہ جگہ دستیاب ہوا کرتا تھا، جب کہ دورِ حاضر
المیہ یہ ہے کہ لاکھ ڈھونڈنے پر آدمی خالص نہیں ملتا، دودھ کہاں سے خالص ملے گا۔ یہ بات نہیں ہے کہ بنا دودھ کے
ئے نہیں بن سکتی، ضرور بن سکتی ہے، بلکہ بے شمار مفلوک الحال گھرانوں میں آئے دن بنتی ہے جہاں دودھ صرف عید کے
بد آتا ہے، شیر خرمے کے لیے تاہم بنا دودھ کی چائے کو چائے کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے اس لیے یار لوگ اسے انگریزی میں
کاشن" اور اردو میں کاڑھا، کہتے ہیں، اسے پینے کے لیے آدمی کا غریب یا بیمار ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح گھر میں اگر خدانخواستہ
شکر میسر نہ ہو اور پڑوسیوں سے بھی ادھار ملنے کی امید نہ ہو تو گڑ ملا کر بھی چائے بنائی جاسکتی ہے، جو کہلاتی تو چائے ہی ہے
گر بادل ناخواستہ۔ البتہ چائے کے اجزائے ترکیبی کے مواخرالذکر لاحقے یعنی دو ہاتھوں کے تعاون کے بغیر چائے بننا
دور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خوش قسمتی سے یہ ہاتھ زنانہ، مردانہ، درمیانہ، کسی بھی ڈیل کے ہو سکتے ہیں۔ کیوں
جھکی ہوئی ڈالیوں سے چائے کی پتی توڑنے کے لیے بے شک زنانہ ہاتھوں سے بہتر ہاتھ ابھی تک دریافت نہیں ہو
ن جہاں تک چائے بنانے کا تعلق ہے اس کے لیے جنس کی کوئی قید نہیں، گویا ہاتھ چاہے نرم نازک، خوبصورت ہوں یا
ھوڑا، درانتی اور کلہاڑی چھاپ ہر طرح کے ہاتھ بلا تکلف، چائے بنا سکتے ہیں اس کے لیے شرط صرف اتنی ہے کہ
کورہ ہاتھوں کو چائے بنانا آنا چاہیئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم بارہا حسین سبک، حنائی ہاتھوں کی بدمزہ اور تلخ چائے
ی زہر مار کر چکے ہیں۔ اور سخت کھردرے بدوضع ہاتھوں کی بنی خوش ذائقہ مزیدار چائے سے بھی لطف اندوز ہو چکے
یں نتیجتاً اس تلخ و شیریں ذاتی تجربے کے بعد سے کسی دانا کے اس قول کے دل سے قائل ہو چکے ہیں کہ چائے بنانا

ایک اچھا خاصا آرٹ بلکہ فائن آرٹ ہے اور اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے لیے مرد یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں اور پھر بقول شاعر ؂

محنت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں مردوں کا ایک بڑا طبقہ آج بھی امور خانہ داری کے معاملات کو محض خواتین سے منسوب کرکے انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھتا اسی لیے تو شوہروں کی اکثریت ایک حقیر پیائے کی پیالی کی خاطر بیویوں کے آگے دست طلب پھیلائے جو دے اس کا بھلا نہ دے اس کا بھی بھلا کا بھکاری راگ الاپتی دکھائی دیتی ہے۔ امور خانہ داری کے معاملات کو اپنے حق میں شجر ممنوعہ سمجھنے کا یہ تصور دراصل مردوں کے خلاف خواتین کی اس دور اندیش ٹولی کی کھلی سازش ہے جو مردوں کو ہمیشہ اپنا دست نگر دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ مغربی ممالک میں معاملہ یکسر مختلف ہے۔ وہاں امور خانہ داری کی عملی تربیت مردوں کے لیے بھی سنا ہے لازمی ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ امور خانہ داری کا مضمون اگر نصاب میں شامل نہ بھی ہوتا تب بھی اکثر مرد اس میں کما حقہٗ ٹریننگ ضرور حاصل کرتے وہ اس لیے کہ وہاں شادیاں دیرپا نہیں ہوتیں یعنی صبح کی اولین ساعتوں میں بیوی کی حیثیت سے مرد کی زندگی میں داخل ہونے والی عورت، شام ہوتے ہوتے ازدواجی زندگی سے واک آؤٹ کرجاتی ہے گویا صبح کی بھولی، شام کو اپنے گھر لوٹ جاتی ہے۔ میاں بیوی کے اس تیز رفتار چھوڑ پکڑ، عرف شادی و طلاق کے ماحول میں اگر مرد، امور خانہ داری کے باب میں خود مکتفی نہ ہو تو پھر بھوکوں مرجائے، سات سمندر پار ہو رہے اس تماشے کے مفصل بیان کی ضرورت یہاں اس لیے پیش آئی کہ مغرب کی اندھا دھند نقالی کے نتیجے میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ چٹ شادی پٹ طلاق کی لعنت اب ہمارے ہاں بھی تیزی سے پھیل رہی ہے، لہٰذا باڑھ آنے سے پہلے جس طرح بندھ باندھنا ضروری ہے اسی طرح امور خانہ داری سے بے بہرہ مردوں کی عافیت اسی میں ہے کہ اب وہ بھی پہلی فرصت میں مذکورہ امور میں مہارت حاصل کرلیں یوں بھی ہماری کھان پان عرف پکوان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جتنے بھی بڑے بڑے باورچی بھٹیارے اور خانساماں گزرے ہیں وہ سارے کے سارے یا تو مرد رہے ہیں یا پھر مخنث عرف زنخے۔ ثبوت کے لیے محمد شاہ رنگیلا کا باورچی خانہ ہمارا نازنینا کا رسوئی گھر یا سلطنت آصفیہ کے فرمانرواؤں کے شاہی مطبخ ملاحظہ فرمائیے وہاں صرف مرد یا زنخے ہی شاہی باورچی ہیڈ بھٹیارے یا مہتمم مطبخ کے اعلیٰ و ارفع اور جلیل القدر عہدوں پر متمکن دکھائی دیں گے !! (جاری) ▭▭

ظفر کمالی (سیوان)

غزلیں

حکمراں مستی اڑانے کے لیے ÷ ہے رعایا مار کھانے کے لیے
بن گئے چمچے کسی لیڈر کے ہم ÷ دھاک بستی میں جمانے کے لیے
دوستوں کو کتنے رس گلے کھلائیں ÷ اک غزل اپنی سنانے کے لیے
رسمِ خط سے بھی نہیں واقف، وہی ÷ آ گئے اردو پڑھانے کے لیے
دیس کی گردن گھٹالوں کی چھری ÷ کیا کہیں ہنسنے ہنسانے کے لیے
بات شادی کی ابھی پختہ نہیں ÷ چل پڑے ہیں شامیانے کے لیے
جوتیوں میں دال ساری بٹ گئی ÷ اب کہاں باقی پکانے کے لیے
بوڑھے شاعر کا ترنم بھی عجیب ÷ سر سے پا تک کپکپانے کے لیے
فکر کا تالاب پہلے ڈھونڈیئے ÷ شعر کی مچھلی پھنسانے کے لیے
ہم جسے کہتے ہیں نثری شاعری ÷ ہے ادب کا سر کھجانے کے لیے
کیا ہے تنقیدِ ادب بکری کو شیر ÷ شیر کو بکری بنانے کے لیے
یہ ریمی نار اور یہ سمپوزیم ÷ ہیں فقط پکنک منانے کے لیے
نام بس اک خوبصورت رکھ لیا ق دعوت کھانے کھلانے کے لیے
کیوں نہ اب دوزخ کو ہم جنت کہیں ÷ دل کو سمجھانے بجھانے کے لیے
خود تو ہیں کم ظرف لیکن آ گئے ÷ ظرف میرا آزمانے کے لیے
کیا زمانہ آ گیا حق بات پر ÷ لوگ دوڑیں کاٹ کھانے کے لیے
آ رہے ہیں آج گھر گھر صبح و شام ÷ ماسٹر ٹیوشن پڑھانے کے لیے
یعنی چل کر خود کنواں حسانے لگا ق پیاس پیاسوں کی بجھانے کے لیے

بن گئے نقاد ہم بھی اے ظفر
جہل کا دریا بہانے کے لیے

زعیم ذومرہ (حیدرآباد)

○

جب کبھی بیگم سے میری کرکری ہونے لگی ÷ یاد گلدان آ گیا اور تھرتھری ہونے لگی
لگ گئی بیگم کے ہاتھ اک روز جو میری بیاض ÷ نذرِ آتش میری ساری شاعری ہونے لگی
شاعری سے تنگ آ کر مجھ سے بیگم نے کہا ÷ چھوڑ دو اب شاعری چھوٹی بڑی ہونے لگی

رات کے دو بج رہے ہیں اب تو سو جاؤ زعیم
نیند سے اب شاعری بے کار سی ہونے لگی

یوسف امتیاز
ٹورانٹو (کینیڈا)

پھر چھڑی بات جوتوں کی

حضرتِ انسان نے محبت اور نفرت کے اظہار کے مختلف انداز تراش لیے ہیں۔ ایسے ہی اظہار کا ایک ذریعہ جوتے بھی ہیں ۔ جوتے بھی عجیب شے ہیں کہ کسی کو جوتے تو دور کی بات ہے ۔ پھٹی پرانی چپل بھی نصیب نہیں ہوتی ۔ فلپائین کے سابق صدر مارکوس کی بیوی امیلڈا کو قدرت نے جوتے اور سینڈلوں وغیرہ سے اتنا مالا مال کیا کہ یہ ان کے گھر میں دکان کی طرح سجے تھے ۔ جب پتہ کٹ گیا اور سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے کی نوبت آئی تو پاؤں میں جوتے ضرور تھے مگر تقریباً چار ہزار جوتوں کی جوڑیاں پیچھے رہ گئیں جو انقلاب کے بعد ملک کے میوزیم کا ایک حصہ بن گئے اور ساری قوم کی ہائے ہائے کا نشانہ بنے۔ کینیڈا کے سابق وزیر اعظم برائن ملرونی کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ان کے "گوچی شوز" کسٹم میڈ ہوتے ۔ جب تک یوں برسر اقتدار رہے لوگ گوچی شوز صاف کرنے ، پالش کرنے اور یہاں تک کہ چاٹنے تیار رہتے تھے پھر حالات نے پلٹا کھایا تو یہی جوتے مذاق اور طنز کا موضوع ہو گئے۔ جوتوں کے اوصاف میں یہ بھی ہے کہ اچھا جوتا وہی ہے جو پاؤں کاٹے اور نہ چلتے وقت آواز ـــــ شاعروں کا محبوب غالباً ننگے پاؤں ہوتا ہوگا جس کے قدموں کی چاپ اور آہٹ شاعر کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتی ہے یا پھر عام بازاری سستے جوتے محبوب کی آمد کی چغلی کھاتے ہوں گے ـــــ مگر کیا کیا جائے کہ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کب جوتا کاٹنے والا ہے۔

جوتے ویسے تو دیکھنے میں انسان کے قدموں میں رہنے کی وجہ سے سب سے نیچے جگہ پاتے ہیں لیکن دیدۂ بینا رکھنے والے ہی جوتوں کی قدر جانتے ہیں۔ ایک صاحب گرم موسم میں جوتوں پر ربر چڑھائے ہوئے آئے ۔ پوچھا گیا کہ بات کیا ہے کہیں باہر برف باری تو نہیں ہو رہی ہے ۔ جواب ملا نہیں مگر

میرے جوتے نئے ہیں اگر گھس جائیں تو ــــ مالی منفعت اور اقتدار کے لالچی ۔ سیڑھیاں چڑھنے کے آرزو مند جوتوں کی قدر و منزلت سے ماہرانہ طور پر اتنا واقف ہوتے ہیں کہ جوتوں کو سر آنکھوں پر رکھنے اور اس کا سُرمہ بنانے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے ــ ان جوتوں کو جب تک سر پر نہ بٹھاؤ بعض اوقات جُوں بھی نہیں رینگتی ۔ ہزار قیمتیں جوتے اُٹھانے والوں کے قدم چومنے لگتی ہیں اور ساتھ ہی نئے نئے چمچے بھی پیدا کر دیتی ہیں ــ دوسری طرف یہی جوتے گلے کا ہار بن گئے تو عزت اور وقار کی مٹی پلید ہو جاتی ہے ــ ہمارے سماج میں برہمی یا غصّے کا اظہار پُرانے جوتوں کا ہار پہنا کر کیا جاتا ہے ــ ایک عرصہ پہلے اُردو کے ایک بہت بڑے شاعر کو پیغمبر کی شان میں گستاخی کرنے پر نہ صرف جوتوں کا ہار پہنایا گیا بلکہ اُنہیں گدھے پر سوار کر کے جلوس کی شکل میں شہر کی سڑکوں پر گھمایا گیا ــ کسی زمانے میں لوگ اسٹیج پر آنے والے نیتاؤں، اداکاروں اور فنکاروں پر پُرانے جوتے چپل پھینک کر اظہارِ ناپسندیدگی کیا کرتے تھے ۔ مرزا غالبؔ کو محبوب کی گالیاں کھا کر بھی مزا آتا رہا مگر ماڈرن نیتا تو جوتے چپل، اس کے ہار ووٹوں کی خاطر بخوشی قبول کر لیتے ہیں ــ جب افراطِ زر نے سر اٹھایا تو پرانے جوتوں کے بجائے ٹماٹر، انڈوں اور بیگن نے اس کی جگہ لے لی ۔ غریب عوام کے پاس پہننے کے لیے چپل نہ ہو تو وہ جوتوں کو کیوں اسٹیج کی نذر کرنے لگے ۔ کنکر پتھر سے کام لیا جانے لگا ۔ بعض جانوروں کو نہ صرف "جوتے" عطا کئے گئے بلکہ ان جوتوں کو دیواروں پر آویزاں کیا جانے لگا ۔ چنانچہ گھوڑوں کی نعل قدر و منزلت کی سیڑھیاں طے کر کے اونچے مقام پر پہنچ گئی ــ بے چارے گدھے اور خچر اس توقیر سے محروم ہیں کہ نہ تو اُن کے جوتوں کی کسی کو پرواہ ہے اور نہ یہ اُن کو نصیب ہیں ــ سچ ہے اللہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت ــ سکھوں کے مذہب میں خطاؤں اور گناہوں کی توبہ کے لیے گردوارے میں آنے والے عقیدت مندوں کے جوتے دروازے پر صاف کر کے مکتی حاصل کی جاتی ہے ــ پنجاب کے ایک سابق چیف منسٹر کو بھی گردوارے کے پنچوں نے اپنے کرتوتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہی سزا دی تھی ۔

ہندوستان، پاکستان میں شادی بیاہ کی رسومات، جوتوں کی شراکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں ۔ دولہا کے جوتے چھپا کر اچھی خاصی رقم اینٹھ لی جاتی ہے ورنہ دولہا میاں کے پیروں میں جوتے نہ ہوں تو انھیں مجنوں کے خطاب سے نوازا جائے گا ۔ دولہا میاں تو کچھ روپے دے کر اپنے جوتے واپس حاصل کر لیتے ہیں لیکن نمازوں اور عیدین کے موقع پر تو لوگ اپنے خریدے ہوئے نئے جوتے پہن کر مسجد میں جا نہیں سکتے کہ چرائے ہوئے جوتے واپس نہیں آتے ــ کسی زمانے میں لوگ پرانے جوتے چھوڑ جاتے تھے اب تو وہ بھی قصۂ پارینہ بن چکے ہیں ۔ شکر ہے کہ ماتمی جلوس میں شریک ہونے والے اپنے جوتے پیچھے چھوڑ آتے ہیں ۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو پولیس لاٹھی چارج کی بھگدڑ میں جوتے بغل میں دبا کر بھاگ سکتے ہیں مگر قابلِ رحم ہیں وہ جو جوتے چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اُن کی صفائی کے لیئے سرکاری عملے کو کام پر لگانا پڑتا ہے پتہ نہیں، نیتاؤں کے خریدے ہوئے یہ ٹھوٹے نئے جوتوں اور چپلوں کا معاوضہ بھی طلب کر سکتے ہیں یا نہیں ــ !

ہر ملک کی پولس اور فوج کو جہاں صاف ستھرے استری کئے ہوئے یونیفارم پہننے کی تاکید کی جاتی ہے وہیں اُن کے جوتوں کی پالش کی اتنی اہمیت ہے کہ بغیر پالش کے جوتے پہننے پر انھیں سزا دی جاسکتی ہے ــــ کہتے ہیں جوتوں کی "ٹو" اتنی صاف اور چمکدار ہو کہ اس میں جھانکنے سے چہرہ صاف نظر آئے۔ بعض لوگ قابل نظر انداز مشوروں اور حکم تو درکنار مناسب اور قابل توجہ مشوروں کو بھی جوتے کی 'ٹو' پر رکھتے ہیں۔ اس زمرے میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو صاحب کی ناک کا بال بنے ہوتے ہیں اور جو اقتدار کی وجہ سے فرعون صفت بن جاتے ہیں۔

مغربی ممالک میں اپنی مادری زبان سے بے نیاز بچّے اُردو کے اس اظہار سے نابلد ہیں کہ ناپسندیدہ حرکت کا انجام جوتے کھانا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو خبردار کرتے ہیں کہ آئندہ ایسی حرکت کی تو جوتے کھاوگے ــــ ایک دفعہ ایک بچے نے اپنی ماں سے بڑے ہی معصومانہ انداز میں روتے ہوئے انگریزی میں شکوہ کیا کہ :

MUMMY, WHY DO YOU ALWAYS TELL ME THAT I WOULD BE EATING SHOES.

اس مشینی دور میں انسان روزگار کی تلاش اور آرزو میں دربدر کی خاک چھانتا ہے یہاں تک کہ جوتے کی ایڑیاں اور تلوے گھس جاتے ہیں اور سونے پر سہاگہ اکثر اوقات سوراخ بھی ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان پاکستان میں روزگار کی تلاش میں نہ جانے کتنے جوتے فیکٹریوں، دفتروں اور سڑکوں کی خاک چھاننے میں تباہ ہوجاتے ہیں ــــ روزگار تو ملتا نہیں مگر جوتا مُنہ کھول دیتا ہے۔ خریدنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالو تو چھید ہے ــــ چلتی دوڑتی بسوں کو پکڑنے کے چکّر میں کتنے ہی اپنی چپّلوں اور جوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں ــــ بس تو ملی مگر جوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ــــ مغربی ممالک میں کار کے جوتے گھس جائیں تو اس کو بدلوانے کے لیے آٹو میکانک کے نخرے، خوشامد، نظر کرم سب ہی کچھ سہنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے ــــ میکانکوں اور ڈاکٹروں کی یہ قوم اُس تسمہ پا کی طرح ہے جس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے ــــ

ایک زمانہ تھا ہندوستان میں باٹا کی دوکانوں پہ ہر جگہ یہ لکھا ملتا تھا کہ "آپ کا اطمینان ہماری کامیابی ہے"۔ حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اب یہ نعرہ کہیں بھی پڑھنے کو نہیں ملتا ــــ افراتفری کا یہ عالم ہے کہ ہر ایک بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کھینچ کر ہی مطمئن نظر آتا ہے۔ نہ بیچنے والے کو مطمئن کرنے کی پرواہ ہے اور نہ خریدنے والا مطمئن ہے۔ سب ہی ایک دوسرے کی ٹوپی دوسرے کے سر پہنانے کے چکر میں ہیں۔ کم خرچ اور بالانشینی کے نام پر ایسی ہوا چلی ہے کہ نئے جوتوں کی ڈوریاں تک غائب ہیں۔ ان کی جگہ اوپر سے چپکنے والے تسموں نے لے لی ہے۔ ہندوستان، پاکستان میں اکثر دوکاندار نئے جوتے ڈبوں میں بند کر دینے کی بجائے پولی تھین میں رکھ کر حوالے کر رہے ہیں۔ ٹی وی، اخبارات اور رسائل کے اشتہارات

کے مطابق جوتے بنانے والی کمپنیوں کی نئی ایجاد پمپ والے جوتے ہیں جن کو خریدنے جاؤ تو جوتوں کی ہوا تو دور کی بات ہے۔ خریدنے والے کی بھی ہوا نکل جاتی ہے۔ ٹی وی کے اشتہار میں ہر روز ہزار بار کپل دیو یہ بتاتے ہیں کہ جوتے بھی سانس لیتے ہیں! جب کہ ان جوتوں کے خریدنے میں ہماری سانس اکھڑ جاتی ہے۔

جوتوں کو سلامی دینا دنیا کا عام چلن ہے۔ جوتے یوں تو نمایاں نہیں ہوتے مگر سچ پوچھیے تو ہر جگہ راج سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے ہیں چاہے وہ امریکی ہوں — جاپانی یا ہندوستانی۔ بمبئی کے ایک پارک میں بچوں کے کھیل کود اور دل چسپی کیلئے ایک دیو قامت جوتا بنا ہوا ہے جس کے اندر۔ باہر جا کر بچے جوتوں کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر کوئی سفر طے نہیں ہوتا۔ ●●

بابو آر کے (راجل پور)

دشمنِ جاں... دیواروں کے کان

وہ زمانے لد گئے جب دیواریں گھروں کی چھتوں کا بوجھ اُٹھانے بھرتی تھیں۔ فی زمانہ یہ دیواریں بجائے تعمیر کے تخریبی کاموں میں زیادہ دلچسپی لینے لگی ہیں۔ دیواروں کو تخریبی کاموں کی تحریک دروازے کھڑکیاں یا روشندان نہیں دلاتے بلکہ ان کے کان دلاتے ہیں۔ ہم اپنے مشاہدے کی رو سے کہہ سکتے ہیں کہ آج کل گھروں کی دیواریں اپنے اندر الماریاں کھڑکیاں دروازے طاق اور روشندان بھلے ہی نہ رکھیں لیکن کان ضرور رکھتی ہیں۔ اسی لیے ہمسایوں کے بیچ لگائی بجھائی اور کہا سنی کی تہمتیں ان دیواروں کے سر مڑھی جاتی ہیں۔ گھر کی چھوٹی سے چھوٹی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں دیواروں کے یہ کان بڑے طاق ہوتے ہیں اور ہر راز کو طشت از بام کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مزید برآں اہلِ خانہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود دیواروں کے کان گھر کے رازوں کو افشا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ بات ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "رامار پلائی"... اگر مصنوعی پٹرول کی دریافت کا تجربہ (چاہے جھوٹا ہی سہی) بجائے جنگلوں کے اپنے گھر کی چہار دیواری میں کر رہا ہوتا تو... اس کا یہ نادر فارمولا دیواروں کے کانوں کے ذریعے سے ہمسایوں کے کانوں تک یقیناً پہنچ گیا ہوتا اور پھر پتہ نہیں کتنے ہی رامار پلائی وجود میں آگئے ہوتے اور سعودی عرب، عراق، ایران و کویت کے تیل کے کنوؤں کو [illegible] اسی طرح مشہور زمانہ صندل سمگلر "ویرپن" کی گرفتاری پر لاکھوں روپیوں کے انعامات کے باوجود بھی اگر وہ آزاد ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ جنگلوں میں زندگی گزارتا آیا ہے۔ اگر وہ بھی گھر چہار دیواری [illegible] ہوگیا ہوتا تو ہمارا دعویٰ ہے کہ دیواروں کے کان اُسے بہت پہلے گرفتار کروا چکے ہوتے۔

دیواروں کے عقب میں جو مخلوق رہتی بستی ہے اُسے عرفِ عام میں پڑوسی یا ہمسایہ کہا جاتا ہے اور موجودہ سماج کے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر یہ ضروری بھی نہیں کہ .... ہمسایہ کی ذات سے آپ کو سایہ ہی ملتا ہے بلکہ آج کل تو سایہ کم اور دھوپ زیادہ دینے والے کو ہی ہمسایہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ [illegible] چھیڑنا اور کن سوئیاں لینا ہمسائے کی فطرت ہوتی ہے اور یہ عمل کارگزاریاں وہ دیواروں کے کانوں کی بدولت ہی انجام دیتا آیا ہے۔ دیواروں کے یہ کان ہمسایوں کے مابین ہمیشہ ہی سرد جنگ کا ماحول بنائے رکھتے ہیں اور ناچاقی کی بنیاد رکھتے

دیواروں کے یہی کان تانے رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کے تعلقات اپنے ہمسائے سے خوشگوار
کے چل رہے ہوں اور ایسے حالات میں خدانخواستہ آپ بیمار ہو جاتے ہیں اور بخار کی تپش میں اعضاء
کے باعث آپ کراہتے ہونگے صرف ہاں ہوں بھی کر لیتے ہیں تو دیواروں کے یہ کان آپکے ہمسائے کو آپکی
کی میڈیکل بلیٹن دے کر رہیں گے اور نتیجتاً آپ کے ہمسائے کو آپ کے گھر میں بے دریغ آمد معہ اہل و
کا بہانہ ہاتھ آئے گا اور بعد ازاں صبح دوپہر شام کی مزاج پرسیوں کے پسِ پردہ چائے پان کی چھوٹی
ضیافتیں آپ کی گھریلو معیشت کو تہس نہس کر کے رکھ دے گی اور شاید دیواروں کے کانوں کی انہی
ظریفیوں نے غالب جیسے خوش مزاج سماجی پرانی کو بددل کر دیا تھا اور جب ایک عرصہ تک دیوارو
انہی کانوں کے ہاتھوں ان کا استحصال ہوا تب لا محالہ بہ حسرت و یاس وہ ایسے اشعار کہہ گئے ؎

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ دیواروں کے کانوں نے یقیناً آپ پر بھی ستم ڈھایا ہوگا لیکن افسوس
تے ہمارے پڑوسی کے تعاون سے ہم پہ جو قیامت ڈھائی ہے ذرا اس کا احوال بھی سُن لیجئے۔۔۔۔ایکدن
ہوا یہ کہ ہمارے گھر میں، اپنے باغیچہ کی سلامتی کے پیش نظر بیگم نے پڑوسن کی مرغی کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا
اور با آواز بلند اُسے کوسنے لگیں۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ دیکھو آہستہ بولو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں
اور پڑوسن کے کان تو دیواروں پہ ہی رہتے ہیں اس لیے ناحق لڑائی کیوں مول لیتی ہو۔۔۔ یہ سُن کر وہ طیش میں
آنے کے باوجود دھیمے لہجہ میں بولیں۔۔۔ میں کہتی ہوں پڑوسن کی مرغی کا تم کوئی بندوبست کروگے یا نہیں۔
خدا اسے غارت کرے بلی اُسے نوچ نوچ کر کھائے، میرے اچھے بھلے باغیچہ کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔
جب دیکھو تب باغیچہ میں گھسی چلی آتی ہے اور ننھے ننھے پودوں کو کرید کے رکھدیتی ہے۔ میں کہتی ہوں
آج ہی ایک آدھ شیر صفت بلی گھر میں لاؤ مرغی سے نجات دلاؤ، اور باغیچہ کو بچاؤ۔ بیگم ابھی اپنا جملہ
مکمل بھی نہ کر پائی تھیں کہ دیواروں نے اپنے کان کھڑے کر لیے۔ دیوار کے عقب سے پڑوسن ہمیں چیلنج
دیتے ہوئے بولیں، ہاں ہاں پالو پالو بلی پالو۔۔۔ مارو مارو مرغی مارو۔ ارے بلی سے ڈرتا کون ہے؟
بڑے آئے بلی پالنے والے، ارے تم میری مرغی کے لیے بلی پالوگے تو تمہاری بلی کے لیے میں نے بھی کتا نہ پالا
تو میرا نام نہیں۔۔۔۔ تو صاحب اپنے باغیچہ کو پڑوسن کی مرغی سے بچانے کے لیے ہم نے بلی پالی ہی تھی کہ اُدھر
ہماری پڑوسن نے جوابی کارروائی کے طور پر بلی کا جواب دینے کے لیے ایک عدد خونخوار کتا پال لیا۔ اب آپ
ہی کہیئے۔۔۔ کتے کے جواب میں ہم کوئی شیر تو پالنے سے رہے، اس لیے جناب اب حال یہ ہے کہ پڑوسن
کی مرغی اپنے خونخوار باڈی گارڈ کے ساتھ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہمارے باغیچہ میں آنے جانے لگی
ہے اور ہم دم بخود یہ سب برداشت کیئے جا رہے ہیں اور یہ سوچ سوچ کر گھلے جا رہے ہیں کہ سگ گزیدہ
ہونے کی صورت میں آج نہیں تو کل چودہ انجکشنوں کی افتاد ہمارے پیٹ کو چھلنی کرنے ہی والی ہے۔ چوں کہ
ہماری پڑوسن ذرا زیادہ ہی شکی مزاج اور جھگڑالو واقع ہوئی ہیں اس لیے ہماری خالص نجی اور گھریلو گفتگو

کانوٹس لینا بھی اس کے معمولات میں شامل ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اگر ہم اپنے گھر میں یہ کہیں کہ بیگم خدا کے واسطے ترکاری میں مرچ کم ڈالا کرو۔ مرچ بہت تیز ہے.... تو صاحب مرچ کا نام سنتے ہی ہماری پڑوسن کو مرچیں لگ جائیں گی اور وہ کہیں گی ... ہاں ہاں میں تیز ہوں ... میں مرچ ہوں! ... اور پھر دیواروں کے کانوں کی ملی بھگت سے ایک بے تعلق سی بات کے لیے وہ ہمارے خلاف ایک مدلل تقریر کرنے بیٹھ جائیں گی جس کے آغاز میں کوسے ہی کوسے اور اختتام میں گالیاں ہی گالیاں ہوں گی ... تو صاحب، دیواروں کے کان نہ تو ہمیں چائے میں شکر کی کمی زیادتی کا رونا رونے دیتے ہیں اور نہ ہی ترکاری میں مرچ نمک کا افراط و تفریط کا شکوہ کرنے دیتے ہیں اس لیے ہم پڑوسن کی بدمزاجی اور دیواروں کے کانوں کی بدولت اپنے ہی گھر میں گونگوں بہروں کی طرح اشاروں کنایوں میں گفتگو کرنے پہ مجبور ہیں۔ ویسے اس مجبوری کا حل ہم نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ یہ کہ مذکورہ پڑوسن کے گھر سے ملحق دیوار کی جسامت کو ہم روزانہ تھوڑی تھوڑی ضخیم و اونچی کئے جارہے ہیں تاکہ دیواروں کے کانوں کی سماعت ذرا کم ہو اور ہمیں راحت ملے۔ کیوں کہ ہمیں علم ہے کہ دیوار جتنی چھوٹی ہوگی اس کے کانوں کی سماعت اتنی ہی تیز ہوگی۔

الغرض، اپنی شریف النفسی کے پیش نظر ہم نے طے کرلیا ہے کہ چاہے ہمیں اپنے گھر میں دیوارِ چین ہی کیوں نا اٹھانی پڑے ... ہم اٹھالیں گے لیکن دیواروں کے کانوں سے نجات حاصل کرکے رہیں گے۔ اس ضمن میں ہم آپ کو بھی مشورہ دیں گے کہ ... آپ کے گھر کی دیواریں جسامت میں طویل و عریض نہیں ہیں اور آپ اپنے گھر میں شریفانہ زندگی گزارنے کے خواہشمند ہیں ... تو دیواروں کے کانوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ کو اپنی دیواریں فصیل نما بنانی ہونگی ورنہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دیواروں کے کان آپ کا ناطقہ بند کرکے رکھ دیں گے۔ ویسے اگر دیواروں کو دیوارِ چین یا فصیل میں بدل دینے کی آپ میں استطاعت نہیں ہے اور آپ اپنے ہمسائے سے بغیر تو تو میں میں کئے شرفاء کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمارا مشورہ ہے کہ اپنے گھر کے اندر زبان ہلانے سے قبل دیواروں کے کانوں کو دھیان میں رکھیئے ورنہ بصورتِ دیگر ہمسائے کے مقابل جنگ کے مورچے پر ڈٹ جائیے۔

□□

غزل

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

مرے اشعار مرے یار چرایا نہ کریں
ٹاٹ میں مخملی پیوند لگایا نہ کریں

چائے خانوں میں پڑھیں شوق سے اخبار مگر
چائے کی پیالی میں طوفان اٹھایا نہ کریں

اپنے ماموں کی اگر ہوں تو کوئی بات نہیں
بکریاں اور کے ماموں کی چرایا نہ کریں

یہ نفی میں ہے کہ اثبات میں کھلتا ہی نہیں
خاص انداز سے گردن وہ ہلایا نہ کریں

اپنی رسوائی سے ڈر آپ کو لگتا ہے اگر
چور کی طرح کبھی شور مچایا نہ کریں

شعر کے بل پہ ہنسائیں تو نوازش ہوگی
گدگدی کرکے ہمیں آپ ہنسایا نہ کریں

ہاشمی سے ہے گزارش کہ ادب کی خاطر
ردّیوں کے نئے انبار لگایا نہ کریں

ویزا

محمود شاہد
(احساء)

بدمزہ خشک نان ہے ویزا
مرغِ مردہ کی ران ہے ویزا

تن سے کپڑے اتار لیتا ہے
ایک ظالم پٹھان ہے ویزا

آرزو بوٹیوں کی بے معنی
ہڈیوں کی دکان ہے ویزا

مونڈ دیتا ہے سر سے بالوں کو
ہجرتوں کا لگان ہے ویزا

منہ سے مہماں کے چھین کھاتا ہے
لالچی میزبان ہے ویزا

سب کو بے خواب کرکے چھوڑا ہے
شب میں کتے کی تان ہے ویزا

خواہشوں کے حسین چہرے پر
کوڑھ جیسا نشان ہے ویزا

ذلتوں کے بھنور میں اے شاہد
اک پھٹا بادبان ہے ویزا

غزل

اسداللہ حسینی چکر
(امریکہ)

کیا بیاں ہو مجھ سے یارو "ڈاون فال" آرزو
اِک کھنڈر سا ہوگیا ہے "ٹاون ہال" آرزو

آرزوؤں کے جنازے اٹھ گئے عرصہ ہوا
صرف باقی رہ گیا دل میں ملالِ آرزو

منتیں مانیں کہ وہ دل سے نکل جائے مگر
ہوسکا ہرگز نہ بیکا ایک بالِ آرزو

مانگئے آکر دعائیں ان کی بخشش کے لیے
دفن ہیں سینے میں سب اہل و عیالِ آرزو

جب یہ دیکھا ہر طرف ہیں "ٹومینی" ناکامیاں
ہوگیا "گٹ آوٹ" دل ہی سے خیالِ آرزو

محمد باقر (تبوک)

غلطی

کہتے ہیں کہ انسان غلطیوں کا پُتلا ہے ویسے بھی اس دنیائے طمطراق کی ہماہمی اور رونق انسان کی غلطیوں سے قائم ہے حال ہی میں ہمارے ایک دوست کے گھر جب ہم ان کی زیارت کے لیے گئے تو ایک بہت ہی معصوم و بھولے بچے نے دروازہ کھول کر کہا "ابّا بولے ابّا گھر پہ نہیں ہیں" یہ سن کر ہم نے اس بچے کو قریب بلایا اس سے اس کا نام دریافت کیا اور پھر اپنے جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر اُسے دیا۔ اور پوچھا بیٹا اب بتلاؤ ابّا کیا کر رہے ہیں تو بولا ابّا کھانا پکا رہے ہیں۔ ہم اپنے دل میں لعنت و ملامت کرتے لوٹنے ہی والے تھے کہ پیچھے سے ہمارے کندھے پر ہمارے دوست نے ہاتھ رکھ کر معذرت چاہی اور ہمیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ہم نے اپنے دوست سے اس معصوم لڑکے کا مکمل تعارف چاہا تو دوست نے کہا کہ یہ میری آخری غلطی ہے۔ ہم نے دوست سے فوری استفسار کیا کہ کیا وہ واقعی کچن میں تھا۔ تو وہ شرمندہ ہوگیا نظریں نیچی کی اور کہنے لگا یار جب سے تم تبوک گئے ہو یہاں جدّہ میں پانی کی قلت ہوگئی ہے چنانچہ پانی سے متعلق تمام کاموں کو نل سے پانی کی آمد کے مطابق ترتیب دینا ضروری ہوگیا ہے ہم معاملہ کی سنگینی کو بھانپ گئے اور اپنے دوست کو غلطی در غلطی کرنے کے لیے چھوڑ کر فوری وہاں سے رخصت ہوئے۔ ہاں جہاں تک پکانے کا معاملہ ہے رہاں صاحب قبلہ کے حصول کے لیے کی گئی ہجرت نے خلیجی ممالک میں مرد اصحاب کو ماہر پکوان کا اعزاز عطا کیا ہے لیکن ہم گھر میں عورت کے موجود ہونے کے باوجود مرد کے پکانے کو تہذیب کے خلاف سنگین غلطی سمجھتے ہیں اس لیے ہم نے اپنے دوست سے صراحت طلب کی تھی کہ کیا وہ واقعی پکا رہا تھا۔

ابھی تبوک کی ایک نجی محفل میں جب ہم اجتماعی طور پر عشائیہ کی بات کر رہے تھے اور سب سے فرداً فرداً ان کی شرکت کا تیقن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو ہمیں ایک صاحب موصوف سے جواب ملا کہ "ابھی گھر میں بچوں کا سلسلہ جاری ہے" یہ سنتے ہی ساری محفل زعفران زار ہوگئی۔ سب نے انھیں دعائیں دیں کہ بھائی صاحب یہ سلسلہ جاری رکھیے لیکن اس طرح برسر محفل تشریح سے گریز کریں کیوں کہ اس سے کچھ لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے (محفل میں بوڑھے جوڑے بھی چونکہ موجود تھے) درحقیقت یہ سارا واقعہ ان کی مختصر بیانی یا زبان کی غلطی کا نتیجہ تھا اور موصوف

معذرت چاہتے ہوئے یہ کہنا چاہتے تھے کہ "گھر میں بچوں کی بیماری کا سلسلہ جاری ہے"۔

پچھلے دنوں ہم نے ایک سوپر مارکٹ میں دو خواتین کو آپس میں کچھ اس طرح گفتگو کرتے سنا ـــ وحیدہ "باجی ہماری شادی کی ویڈیو اور کلر تصویریں تو اللہ بس اللہ کیا بتاؤں"۔ وحیدہ باجی بولیں "نسرین ہمیں بھی دیکھنے کے لیے دو ہم دیکھتے ہی بلا تاخیر واپس کردیں گے"۔ نسرین۔ ہم ضرور ہماری ویڈیو کیسٹ اور تصویریں آپ کو دیں گے مگر آپ بھی تو اپنی شادی کی ویڈیو اور تصویریں ہمیں دیں۔ وحیدہ۔ اللہ ہماری شادی کی نہ مووی بنی اور نہ ہی کلرڈ تصویریں پندرہ سال پہلے مووی نہیں بنتی تھی اور نہ ہی کلرڈ تصویروں کا عام رواج تھا۔ نسرین۔ آپ نے اتنی جلدی شادی کی غلطی کیوں کی۔ باجی آپ کی شادی پندرہ سال قبل ہوگئی تھی اب آپ کی عمر کیا ہے بولیں پچیس سال۔

غلطی انسانی سرشت کا لازمی جز ہے اور ہر خاص و عام ہر کس و ناکس سے یہ سرزد ہوسکتی ہے دہلی میں منعقد ایک مشاعرہ کے لیے مصرعہ طرح کچھ اس طرح تھا۔

غم نہ کر تو کہ بڑے رنج کا خوگر میں ہوں۔

شعرائے کرام میں ایک شاعر ایسا موجود تھا جو بہت لہک لہک کر داد دے رہا تھا اور ہر شاعر کے کلام پر جھوم کر مصرعہ ختم ہونے سے پہلے زور سے "میں ہوں" کہہ کر مصرعہ مکمل کردیتا۔ ایک حاضر دماغ شاعر نے کہا حضرات غور طلب نازک بات ہے توجہ سے سنیئے اور مصرعہ پڑھا ؎

ناریل ہاتھ لگا جس کے وہ بندر . . . . . .

حسب معمول شاعر نے جھوم کر زور سے کہا "میں ہوں" اور ساری محفل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

غلطیاں ہزار طرح کی ہوتی ہیں اور ہر غلطی کا انداز بھی جُداگانہ ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر انفرادی غلطی سے اجتماعی نقصانات لاحق ہوتے ہیں۔

ایک لڑکا جو اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا بہت تیز ڈرائیونگ کرتا تھا ایک دن اپنے باپ سے کہنے لگا "ڈیڈی میں بذریعہ کار دہلی جارہا ہوں میرے صحیح سلامت پہنچنے کی دعا کرنا"۔ یہ سن کر باپ نے کہا "جاؤ بیٹا میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کرلو کہ میری دعاؤں کی رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب بات ڈرائیونگ کی چل نکلی ہے تو ہمیں ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک راہ گیر کو سیکل سوار نے ٹکر ماردی سائیکل سوار نے راہگیر کو اُٹھاتے ہوئے کہا "تم بہت خوش قسمت ہو"۔ راہگیر نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا "نامعقول ایک تو ٹکر ماردی اور دوسرے مذاق بھی کرتے ہو"۔ سائیکل سوار نے سنجیدگی سے کہا "بھئی مذاق نہیں کررہا ہوں دراصل میں ٹرک ڈرائیور ہوں اور تم اس لیے خوش قسمت ہو کہ اس وقت میں سائیکل چلا رہا ہوں"

میاں اور بیوی میں نوک جھونک زندگی کے مزے کو دوبالا کردیتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ نوک جھونک لڑائی کا رُخ بھی اختیار کرلیتی ہے ایسے ہی ایک موقع پر بیوی نے اتراتے ہوئے میاں سے یہ کہنے کی غلطی کی کہ لو سنبھالو اپنے بارہ بچوں کو میں اپنی ماں کے پاس جارہی ہوں۔ میاں نے کہا بڑے شوق سے جاؤ مگر جان لو کہ تمہاری امّاں بھی تمہارے ابا سے جھگڑا کرکے میکے چلی گئی ہیں اب تم کس کے گھر جاؤ گی۔ . . . ؟

حال ہی میں ہمارے ایک کلاس فیلو جن کا رنگ خاصا پکا ہے پہلی بار اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ملاقات کے لیے آئے۔ ہمیں پتہ تھا کہ محترمہ سے موصوف نے معاشقہ لڑا کر شادی کی تھی جب کہ محترمہ ہمارے کلاس فیلو کے برعکس گوری چٹی اچھی پرسنالیٹی کی مالک ہیں۔ محترمہ کو دیکھ کر ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے ان سے اِس شادی کی غلطی کی وجہ پوچھی انھوں نے کہا کہ ان کی شادی لوڈشیڈنگ کا نتیجہ ہے۔ یہ سنتے ہی ہمارے دماغ کے تمام تاریک گوشوں میں روشنی کے چراغ جل اُٹھے۔

آیئے اب کچھ سیاسی میدان کے سپوتوں کی بھی غلطیوں پر نظر ڈالیں۔ وی پی سنگھ نے "منو" کی غلطیوں کو اُجاگر کر کے تاریخ میں نام پیدا کیا اور سماجی انصاف کا معجون تیار کیا۔ اڈوانی مہاراج نے بابر کی غلطیوں کو اجاگر کر کے مندر مسجد کا جھگڑا کھڑا کیا اور دیش کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت کو بڑھاوا دیا۔ کانشی رام نے بابائے قوم کی غلطیوں کو اُجاگر کر کے دلتوں کی فوج منظم کی اور نچلی ذات والوں کو اونچی ذات کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ مسلمانوں نے بابری مسجد کی دو کمیٹیاں بنا کر ایسی غلطی کی کہ ایک عرصہ تک قومی سطح پر اُن کے کسی لیڈر کو قائد تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ نرسمہاراؤ نے بھی اپنے دورِ حکومت میں الوزیت کی غلطیوں کو اجاگر کر کے کرسی پر مسلسل براجمان رہنے میں کامیابی حاصل کی۔ سیتارام کیسری نے حکومت گرانے کی غلطی کر کے لوگوں کی نظروں میں گرنے کا اعزاز پایا۔

عام طور پر لوگ دوسروں کی غلطیاں تلاش کرتے ہیں اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں جب کہ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر کبھی نظر نہیں آتا۔ اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی کھٹک جاتا ہے! ▫▫

رؤف رحیم
حیدرآباد

غزلیں

ہو گئے سارے لیڈر بہت سرخرو
چوس کر ہم غریبوں کا تن سے لہو
عمر بھر یہ رہی ہے مری آرزو
اُن کی نظروں میں میں ہی رہوں خوبرو
جب بھی ہوتی ہے اُن سے مری گفتگو
اُن کو میں آپ کہتا ہوں وہ مجھ کو تُو
دیکھ کر تو تو میں میں کو ٹی وی میں اب
ساس کو گالیاں دے رہی ہے بہو
مفلسی کو اٹھائے یوں پھرتا ہوں میں
جیسے بچے کو لے کر پھرے کینگرو
میری غزلیں مرے سامنے پیش کیں
مرا شاگرد نکلا ہے میرا گرو
خوبصورت گلوبند باندھے ہوں میں
مجھ کو کہتے ہیں سب شاعرِ خوش گلو
چت بھی ان کی ہی ہے پٹ بھی ہے ان کی رحیم
اپنے لیڈر تو ہیں جس طرح گھو کھرو

ماہر کریم نگری

وہ دوانے ہیں ہمارے نام کے
ہم دوانے اور ہی گلفام کے
دل کدورت کے خزانے ہو گئے
ہم مسلماں رہ گئے ہیں نام کے
ہر غزل کے سینکڑوں اشعار میں
شعر اچھے دو ہی نکلے کام کے
کوئی لیڈر کوئی نیتا کیوں نہ ہو
سب ہیں ننگے ایک ہی حمام کے
چاپلوسی میں جو ماہر ہیں یہاں
مستحق ہیں بس وہی انعام کے

ٹی۔این۔راز
(ہریانہ)

چھیڑ غالب سے

گنجی بھی اب تو کرتی ہے سولہ سنگھار حیف!
اس کا بھی کوئی چاند ہوا دعویدار حیف!
دلبر کو اپنی دیکھئے اک شیخ لے اُڑا
ہم پھانکتے ہی رہ گئے گرد و غبار حیف!
آئے ہیں جیل کاٹ کے ہم سات سال کی
کرتے تھے چوڑیوں کا عجب کاروبار حیف!
کتے کی دم سے باندھ دو تم اپنے ووٹ کو
ہر پارٹی ہی ملک میں ہے داغدار حیف!
تفتیش نے کیا ہے عجب پوسٹ مارٹم
دھوتی بھی اب تو ہو رہی ہے تار تار حیف!
اک منتری کا بیٹا بھی اغوا میں تھا شریک
کیوں پیٹتی ہے مجھ کو پولس بار بار حیف!
رمضان کے مہینے میں روزوں کو کھا گیا
مولا کو منہ دکھائے گا کیا روزہ دار حیف!
دل جل گیا تھا راز کا کل جسم ہی کے ساتھ
اُن کا وہ راکھ چھیڑنا اب بار بار حیف!

انگریزی: نیلم بھاٹیا
ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علیخاں

ٹفن بولتے ہیں

چند دن پہلے میری ایک سہیلی نے اپنے ٹفن میں مجھے شریک کرلیا۔ ایک نوالہ منہ میں رکھتے ہی میں نے جان لیا کہ ضرور یہ صاحبہ اور ان کے افراد خاندان دل کے عارضہ میں مبتلا ہیں عارضہ سے مراد دل کا وہ درد نہیں جو میٹھا میٹھا ہوتا ہے اور جس کی ہر جوان شخص تمنا کرتا ہے کہ آج نہ سہی کل تو ضرور وہ اس درد سے آشنا ہوگا۔ دل کا یہ وہ موذی مرض ہے جو ہائی بلڈ پریشر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اور جب میں نے اپنی دوست سے اس ریسرچ کے بارے میں کہا تو مسکرائیں اور کہا "آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ مگر آپ نے یہ جانا کیسے"؟

"آپ کے سالن میں اس شئے کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ جس کو اگر ایک دفعہ ہی چکھ لیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جی حضور میں نے آپ کا نمک کھایا ہے"۔ میں نے جواب دیا:

تب سے یہ میری عادت سی ہوگئی ہے کہ جب میں دفتر کے ساتھیوں کے ٹفن میں جھانکتی ہوں تو ان کے اور ان کے افراد خاندان کے عادات و اطوار کے بارے میں صحیح اور آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتی ہوں اب تو اس جادوگری کا چرچہ عام ہو چلا ہے۔ اور میں اس بہانے مزیدار سالن اور چٹنیاں کھانے لگی ہوں۔ اور اکثر خود اپنا ٹفن قصداً گھر چھوڑ آتی ہوں۔

ہمارے احباب میں ایک صاحب ایسے نکلے جو میرے اس کمال کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ ایک روز دوپہر میں انھوں نے پلاسٹک کا ایک ٹفن میرے سامنے رکھا اور چیلنج کیا کہ "بولو۔ اس میں کیسے لوگ چھپے ہیں"؟ میں نے جب اس ٹفن کا ڈھکن کھولا تو کیا دیکھتی ہوں کہ سفید صاف ستھرے کپڑے میں چپاتیاں بندھی پڑی ہیں۔ چکن کی تلی ہوئی بوٹیاں سلیقے سے الومنیم فائل میں لپٹی گئی ہیں۔ اور ساتھ میں گاجر اور دیگر ترکاری کے صاف اور چھوٹے ٹکڑے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ چند بے معنیٰ سے جملے منتر کے طور پر پڑھے اور کہا "بچو! اس ٹفن کا مالک کوئی امیر آدمی ہے۔ اور اس کے گھر میں کم از کم ایک لڑکا ایسا ہے جو اسکول جاتا ہے۔ اور ایک ایسی شخصیت بھی اس گھر میں رہتی ہے جو دفتری یا کسی کاروباری دھندے سے بالکل فارغ ہے"۔ اس پر ایا شور مچا کہ میں اب ان سبھوں کے عقل کے تالے کھولوں۔

" الکار ... طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ چپاتیاں اخبار کے کاغذ میں لپیٹتے ہیں۔

اور چکن جیسے جھینگے اور مقوی غذا کے ٹکڑے ان کے ٹفن میں بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کبھار ملیں گے بھی تو سستے پولی تھین کی تھیلی میں! رہا اسکول جانے والے بچے کی موجودگی کا سوال تو ٹفن بکس میں DENNIS THE - MENACE کا چپکا ہوا STICKER اس طرف اشارہ کردیتا ہے۔ اچار کا اس بکس میں نہ پایا جانا ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ گھر میں کوئی ایسا بے کار شخص بیٹھا ہوا ہے جسے اتنی فرصت ہے کہ چین سے سلاد کے ٹکڑے اس ٹفن میں سجا دے۔"

میری شہرت اب، دور دور تک پھیلتی گئی۔ ایک دفعہ میں ٹورسٹ بس میں سفر کر رہی تھی۔ چند منچلے نوجوانوں نے میرے سامنے ایک ٹفن بکس لاکر رکھ دیا۔ اور میرے سر ہوگئے۔ "تبلایئے اس میں کیا کیا راز پوشیدہ ہیں"۔
میں نے کہا۔ "یہ ٹفن باکس کسی نوجوان خاتون کا ہے۔ اور وہ ایسے مکان یا فلیٹ میں رہتی ہے جہاں دوپہر کے وقت سورج اپنی نرم اور گرم روشنی کچھ زیادہ دیر تک ہی پھیلائے رہتا ہے۔ اس خاتون کے ساتھ ان کی ضعیف مگر صحت مند خوشدامن صاحبہ بھی قیام پذیر ہیں۔" اب ان کی وضاحت بھی میں کیے دیتی ہوں۔ جب کوئی نوجوان خاتون اپنے توشہ میں میتھی کے دستی پراٹھے لاتی ہے تو اس کا مطلب صاف یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے گھر کوئی خاتون ضرور ہے۔ جو اس موسم سرما کی گرم اور راحت بخش دھوپ میں فرصت سے بیٹھی میتھی کے چھوٹے چھوٹے پتے اس کی ٹہنیوں سے الگ کرنا اپنا محبوب مشغلہ سمجھتی ہے۔"

ان نوجوانوں نے جب اس حسین لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور میری اس "توشہ شناسی" پر اپنا سر ہلاتی رہی۔

ہمارے گروپ میں ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ہنس کی چال چلنے کی ٹھانی۔ ایک دن لنچ بریک میں وہ اپنے دوست "دلوک" کا ٹفن اٹھا لائے اور ہمارے بیچوں بیچ آکر بیٹھ گئے۔ دلوک ہمارے حلقۂ احباب میں چین و اطمینان کی شادی شدہ زندگی گزارنے اور مزیدار پکوان اپنے توشے میں ہر روز لانے کے لیے کافی مشہور ہیں۔ ان کی شریمتی جی کی حیثیت ہمارے ہاں ایک ماہر پکوان کی سی ہے۔ ٹفن بکس میز پر رکھتے ہوئے میرے ساتھی نے اعلان کیا۔ "آج میں نیلما کو شکست دینے جارہا ہوں یا کم از کم ان کی برابری کرنے والا ہوں۔ دیکھ لیں میں آپ کو یہ بتلا کر رہوں گا کہ آج دلوک کی شریمتی جی کا موڈ کیسا ہے؟"

انھوں نے ٹفن کھولا! اس کے اندر جھانکتے ہی کچھ دیر کے لیے ان پر سکتہ طاری ہوگیا جبکہ انھیں دلوک کے توشے میں مزیدار کھانوں کے بجائے ڈبل روٹی کے چند یتیم سوکھے ہوئے ٹکڑے دکھائی دیئے۔ میرے دوست نے اپنے آپ کو سنبھالا اور یوں گویا ہوئے۔

"شریمان و شریمتیو۔ آج میں آپ پر ایک بہت گہرا راز کھولنے جارہا ہوں۔ دلوک کی بیوی آج ان سے لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہے"۔ اور فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے لنچ روم کے باہر چلے گئے۔ ادھر دلوک نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
"احمق کہیں کا۔ میری شریمتی جی اطمینان سے پوری طرح میرے گھر میں موجود ہیں۔ ہاں! اب انھوں نے دوسری نوکری ڈھونڈ لی ہے۔ ان کا پہلا دفتر گھر سے بہت دور تھا اس لیے وہ صبح جلدی گھر سے نکل جایا کرتی تھیں۔ بغیر ناشتہ وغیرہ بنائے۔ ان دنوں کچن کی ساری ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی تھی۔ اب ان کا دفتر ہمارے مکان سے بالکل قریب ہے۔ اس لیے انھوں نے پھر سے کچن کا چارج لے لیا ہے۔"

طارق کفایت
(پٹیالہ)

مڈل مین

ہم کبھی بھی کسی عدد کے سعد یا نحس ہونے کے قائل نہیں رہے۔ کیا پہلا، کیا دوسرا یا پھر دسواں، پندرھواں یا کوئی اور کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم سوچتے تھے یہ اعداد حساب کے لیے ضروری ہوں گے اور حساب میں ہم ہمیشہ ہی پھسڈی رہے ہیں نہ کبھی حساب ہمارے بس میں آیا اور نہ کبھی ہم ہی حساب کے قابو میں آسکے عملی زندگی میں اعداد کی اہمیت یا کردار کو کبھی ہماری ناقص عقل محسوس نہ کر سکی۔ مگر ہمارے عزیز از جان دوست حکیم اسطو خودوس جنھیں علم طب کے ساتھ ساتھ علم الاعداد میں بھی مہارت کا دعویٰ ہے بلکہ موخرالذکر میں یہ دعویٰ زیادہ شدت لیے ہوئے ہے۔ ہم سے بالکل مخالفانہ رائے رکھتے ہیں۔ موصوف کے خیال میں ہر کام کی بنیاد کسی نہ کسی عدد پر ٹکی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی چھوٹا بڑا معاملہ ہو وہ اس کا رشتہ کسی نہ عدد سے دریافت کر کے رہیں گے اور اسی سے اس کی سعادت یا نحوست کا فیصلہ ہوگا۔ مثلاً اگر پوسٹ مین ڈاک لے کر آیا تو وہ لفافہ چاک کرنے سے پہلے پوسٹ مین کے ورود کا وقت نوٹ کریں گے تاکہ یہ حساب لگ سکے کہ اس خط کا پڑھنا ان کے لیے مفید ہوگا یا نہیں اور اگر جواب نفی میں برآمد ہوا تو وہ خط کو پڑھنے کا کام کسی اور نیک ساعت کے لیے موخر کر دیں گے۔ پہلے یہ حساب منٹوں تک ہی محدود ہوتا تھا مگر اب کوارٹز QUARTZ گھڑیوں نے ان کے کام کو کافی بڑھا دیا ہے اور ضرب تقسیم وغیرہ کا عمل کم از کم سکنڈ کے سوویں حصے تک تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح کسی کتاب کو اٹھاتے ہوئے مطالعے سے پہلے اس کے عنوان کے پیش نظر یہ حساب لگانا کبھی نہیں بھولتے کہ کس صفحے سے مطالعے کا آغاز ان کے ذاتی اعداد سے زیادہ ہم آہنگ ہوگا۔

کلّ نفس ذائقۃ الموت۔ موت کا آنا برحق ہے لیکن یہ بھی ہے کہ "آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں"۔ کسی کو اپنے آخری وقت کا نہ علم ہے اور نہ اس کے تعین کا اختیار۔ مگر کیا کیا جائے۔ حکیم صاحب موصوف کسی ایسے جنازے میں بھی شرکت سے اجتناب کرتے ہیں۔ جس کی موت ان کے خیال میں صحیح ساعت

میں واقع نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح کسی نا واقف کی شادی میں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر دوسروں کی غلطیوں کا بوجھ ہم کیونکر ڈھوتے پھریں۔

باوجود اس کے کہ ایک عالم حکیم صاحب کی عددی مہارت کا مدح خواں اور ان کی پیشین گوئیوں کا قدردان ہے لیکن ہماری بھرکم دلیلوں اور تاریخی شواہد پیش کر کے بھی وہ ہمیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی ازراہ لحاظ و مروت ہم نے کسی محفل میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دی ہو۔ ہم قائل بھی کیسے ہوتے۔ ہمارے پیش کیے ہوئے بیشتر ٹسٹ کیسز Test Cases میں ان کی پیش گوئیاں غلط ثابت ہوئی تھیں یا یہ کہیے کہ یہ کیسیں ان کے حساب میں فٹ نہیں ہو سکے تھے۔ نہ جانے کس مرحلے پر ان سے کچھ چوک ہو جاتی یا یہ کہیے "بس ایک آنچ کی کسر" رہ جاتی۔ مثلاً ہمارے حلقۂ احباب میں سے ایک صاحب کے نام کے حروف اور تاریخ پیدائش وغیرہ کی بنیاد پر حکیم صاحب نے اگلے سال ایک گاڑی (کار) کا مالک ہونے کا مژدہ سنایا۔ قائل نہ ہونے کے باوجود ہمارے دل میں گاڑی کی سواری کی امنگ نے سر اٹھایا اور لاشعوری طور پر ہم بھی اگلے سال کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگے۔ پھر ہوا یہ کہ سال بدلتے ہی وہ صاحب ایک حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں جا پڑے اور اپاہج ہونے کی وجہ سے ان کا پورا سال وھیل چیئر پر گزرا۔ سال پورا ہونے کو آیا تو ان کے ساتھ ہمیں بھی گاڑی پاؤں تلے سے نکلتی دکھائی دی اور ہم نے حکیم صاحب کو ان کی پیشین گوئی یاد دلائی وہ غور و فکر میں ڈوب گئے اور برآمد ہو کر گویا ہوئے۔ میرا حساب تو اب بھی یہی کہتا ہے۔ ہم نے کہا تو پھر گاڑی کہاں رک گئی۔ اچانک وہ وھیل چیئر کو گھورنے لگے اور پھر ان کی نظر (?) کے تعاقب میں ہم سب کی نظریں چیئر کے بڑے پہیوں سے ہوتی ہوئیں دو ننھے منے پہیوں پر جا ٹکیں۔ اوہ! یہی بات تھی جن چار پہیوں کی بنیاد پر انھوں نے کار کی امید دلائی تھی وہ وھیل چیئر کے نکلے۔

ایک روز ہم جو نکلے تو دیکھا کہ حکیم صاحب کے مطب کا بورڈ کچھ زیادہ ہی چمک دار لگ رہا ہے۔ ذرا دھیان سے دیکھا تو پتہ چلا کہ نیا بورڈ لکھوایا گیا ہے اور بورڈ کی عبارت بھی بدلی ہوئی ہے۔ لکھا ہے "ہکیم اسطوخودوس ....." ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان کے مطب میں گھس گئے اور پوچھا "ارے یار یہ حکیم میں حلوے کی "ح" کی جگہ ہیبت والی "ہ" [illegible] کی کیا تک ہے؟ حکیم صاحب نے جو مریضوں کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ ہمیں بیٹھنے اور صبر کرنے کا اشارہ کیا۔ ہمیں خود بھی اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ اس لیے غصے کو دبائے بیٹھے رہے۔ حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہوئے تو فرمانے لگے "تو کیا اب یہ حکیم کے علاوہ کچھ اور پڑھا جا رہا ہے؟" ہم نے کہا نہیں لیکن یہ ہے تو غلط ہی اور طبیعت پر گراں بھی گزرتا ہے۔ فرمانے لگے ایک بڑی غلطی کی اصلاح کے لیے ایک کمتر درجے کی غلطی کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کونسی غلطی؟ فرمایا "دراصل ح (حائے حطی) کے ساتھ لکھنے سے حکیم کے عدد ہوتے جو ۱۳ سے تقسیم ہوتا ہے وہ بھی ۶ سے۔ تم نہیں جانتے ۱۳ کتنا منحوس عدد ہے۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ اسی لیے کار پوریشن نے بھی چنڈی گڑھ کے تعمیری منصوبے میں سیکٹر

۱۳ رکھا ہی نہیں۔" ہم نے کہا "لیکن وہاں سیکٹر ۲۶ تو موجود ہے۔" کہنے لگے۔ "اس نے جہاں رکھا تھا اس کا منصوبہ تو پچیس سیکٹر پر ہی مکمل ہو گیا تھا۔ ناعاقبت اندیشوں نے خود ہی دوسرے سیکٹر بڑھا دیئے اور تم دیکھ رہے ہو اسی دن سے تنازعے کا سبب بنا ہوا ہے اسی لیے ہلیم لکھا کر اس کی نحوست ختم رکھی ہے۔"

خیر صاحب ہم تو حکیم صاحب کی عدد شناسی کی نہیں، ان کی محبت اور دوستی کے دلدادہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھار وقت گزاری کے لیے یا مروت میں علم الاعداد پر ان کا لیکچر بھی برداشت کر لیا کرتے تھے اور ازراہ تفنن ایک آدھ "کیس" بھی پیش کر دیا کرتے تھے اور بس۔ نہ کبھی ہم نے سنجیدگی سے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور نہ کبھی اس پر یقین کیا لیکن صاحب ایک دن تو اپنے اس حساب کے ذریعے حکیم صاحب وہ دور کی کوڑی لائے کہ خواہی نہ خواہی اس کا قائل ہوتے ہی بنی۔ ہوا یوں کہ ایک دن حسب معمول ہم وقت گزاری کے لیے ہماری طرح کے لوگوں کی پریشانیوں کا ذکر کرکے اس طبقے کا فرد ہونے پر خود کو کوسنے میں مشغول تھے۔ جو ہماری عادت بن چکا تھا۔ ایسا کرنے میں راحت سی محسوس ہوتی تھی۔ ادھر حکیم صاحب نے ایک مریض کی نبض پر ہاتھ رکھے رکھے ہم سے سوال کیا "آپ کس سنہ کی پیدائش ہیں؟" ہم نے کہا نصف صدی یعنی ۱۹۵۰ء" اور "تاریخ؟" ہم نے حافظے پر زور ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "۲ جولائی" اور وقت یقیناً بارہ بجے کا ہوگا۔ غالباً اماں یہی وقت بتایا کرتی تھیں۔" اتنا سننے کے بعد نجانے حکیم صاحب کے جی میں کیا آئی کہ نبض چھوڑ مریض کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا "میاں آپ کل آئیے ابھی آپ کی دوائی کھرل ہو رہی ہے" اور ہمہ تن ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے "ذرا پھر سے اپنی تاریخ پیدائش دہرائیے۔" ہم نے پھر بتا دی۔ اب تو حکیم صاحب کی حالت کچھ نہ پوچھیے۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہنے لگے۔ "ارے میاں تم پیدائشی نہیں ازلی وسطیے ہو" ہم نے استفہامیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا تو فرمانے لگے۔ تمہاری پیدائش صدی کے درمیانی سال، سال کے درمیانی دن اور دن کے درمیانی وقت میں ہوئی ہے۔ اب اس کو پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں متوسط طبقے میں رہنا آپ کا مقدر ہو چکا ہے اور عافیت اسی میں ہے کہ تم خود کو اسی تک محدود رکھو اگر کبھی اونچے لوگوں میں شامل ہوتے یا نچلے میں گھسنے کی کوشش کی تو بہت پچھتاؤ گے ...." حکیم صاحب کا لیکچر جاری تھا اور وہ اعداد کی تاثیر کے سلسلے میں اپنے بصیرت افروز نظریات کا اظہار فرما رہے تھے مگر ہمارا افسانہ طراز ذہن، کشف و وجدان کے پردل پہ سوار کرا کے ایک اور ہی عالم کی سیر کرانے کے لیے روانہ ہو چکا تھا ..... چشم تصور سے ہم نے دیکھا کہ ہم عالم ارواح میں ہیں اور دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجے جانے والوں کی فہرستیں تیار ہو رہی ہیں اور رول نمبر بٹ رہے ہیں اور سیٹیں الاٹ ہو رہی ہیں دیکھا کہ سیٹنگ ارینجمنٹ کے مطابق ہمارے حصے میں جو سیٹ آ رہی تھی وہ ہال کے عین بیچوں بیچ تھی۔ یہ دیکھ کر ہمارے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ادھر ادھر جھانکنے، کسی سے مدد لینے کا کوئی چانس نہیں۔ تھوڑی ہیرا پھیری کر کے خوشامدانہ لہجے میں قضا و قدر کے کلرکوں سے سیٹ بدلنے کی درخواست کی انھوں نے حسب معمول کلرکانہ بے رخی سے جواب دیا کہ ایک بار سیٹنگ پلان فائنل ہونے کے بعد تبدیل ہرگز نہیں کیا جاتا۔ ہم نے آنے والی دشواریوں کا ذکر کچھ اس دردناک انداز میں کیا کہ ہماری بے بسی پر ان کو بھی رحم آ گیا اور کچھ سمجھتے ہوئے انھوں نے کہا اگر کوئی اور تمہارے ساتھ اپنی سیٹ بدلنے کو تیار ہو تو تمہارا کام بن سکتا ہے۔ یکبارگی کچھ

امید بندھی تھی مگر اتنے ہجوم میں کون کسے پہچانتا تھا۔ کس سے کہتے بھیا ہماری مصیبت ذرا اپنے سر لے لو اور ہماری جگہ تم قربانی کا بکرا بن جاؤ۔ اپنی تنہائی و بے چارگی پر بے اختیار آنسو نکل پڑے اور نشیان قضا و قدر کی چالاکی پر غصہ بھی آیا اور اس بات پر افسوس بھی ہوا کہ "بات بھی کھوئی التجا کر کے" آسمانی کارندوں کو اس وقت تک دنیاوی ترقی کی ہوا ابھی نہ لگی تھی۔ رشوت جیسے مسبب الاسباب کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا بہمہ جہت استعمال و افادیت ان پر روشن ہوتی۔ اگر یہ ایجاد وہاں بھی گئی ہوتی تو نذر گزارنے کے لیے ہمارے پاس تھا بھی کیا۔ تن کے کپڑے تک تو تھے نہیں۔ معاملہ اس دنیا کا نہ ہو کر اس دنیا کا ہوتا تو شاید کوئی جگاڑ لڑ ہی جاتا۔

اس طرح انتہائی مایوس کن و صبر آزما حالات میں ہمارا ورود دنیا میں ہوا چشم ہوش کھلی تو معلوم ہوا کہ ہم اپنے والد کے منجھلے بیٹے ہیں اور ہمارے والد ہمارے دادا کی منجھلی اولاد اور ہمارے دادا اپنے باپ یعنی ہمارے پردادا کے درمیانی نور چشم۔ قرائن کی بنا پر ہمارا قیاس ہی نہیں یقین تھا کہ ہمارے جد امجد حضرت آدمؑ کے منجھلے بیٹے رہے ہوں گے گویا خلافت ارضی کی سینیارٹی لسٹ میں ہمارا مقام عین بیچوں بیچ تھا۔ ادھر اُدھر ہونے کا کوئی چانس تھا نہ حوصلہ۔ خیر صاحب یہ تو تھی اس عالم کی بات جہاں کے سپید و سیاہ میں ہمارا کچھ دخل نہ تھا لیکن اب اس دنیا کی سنیے

جہاں ہم پر مختاری کی تہمت لگی ہوئی تھی۔ ویسے تو ہمارا حادثہ پیدائش ہی کافی تھا۔ ہماری ناکردہ گناہی کی سزا کے لیے مگر ہمارا ... جو سانحات ہم پر گزرے ان کو بتانے اور سہنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔

اجمال اس تفصیل کی یہ ہے کہ پیدائش کے ... ہمارا ازلی درمیانہ پن ہم پر سوار تھا۔ ہماری ولادت کی خوشی میں کوئی شادیانے نہیں بجائے گئے، کوئی جشن نہیں منایا گیا۔ دوستوں عزیزوں کی دعوتیں نہیں ہوئیں، بچوں میں ریزگاری تقسیم نہیں ہوئی، غریبوں، مسکینوں پر کوئی احسان نہیں لادا گیا۔ وجہ ظاہر ہے سوائے ہمارے کسی کے لیے بھی یہ نیا تجربہ نہیں تھا جسے یادگاری شکل دینے کی ضرورت ہو۔ بس ایک معمول تھا جو آیا تھا اور گزر گیا۔ زندگی بغیر کسی تبدیلی کے حسب سابق رواں دواں رہی۔ در دنغ بر گردن راوی سننے میں آیا کہ اسی نوعیت کے اولین تجربے کو یادگار بنانے کے سلسلے میں جو بھاری رقمیں قرض لی گئی تھیں سال کے بقایا جات ابھی تک واجب الادا تھے اور ہماری آمد تک تقاضوں میں شدت اور تلخی کا رنگ غالب آنے لگا تھا۔ سابقہ تجربے سے سبق حاصل کرتے ہوئے کوئی بھی سابقہ غلطی کے اعادے کے لیے تیار نہ تھا۔" ارے کونسا پہلوٹی کا ہے۔ اللہ رکھے اب تو ایسے موقعے آتے ہی رہیں گے۔" ہم ع:

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

کہہ کر اپنے تئیں تسلی ہی دیتے تھے بلکہ یک گونہ احساس برتری کے گھوڑے پر بھی سوار تھے لیکن فلک کج رفتار کو اطمینان تسلی کی ہماری یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نقش سوم کے اہتمام نے نقش ثانی کا رنگ تفاخر بالکل پھیکا کر دیا۔ تھوڑا بہت بچا کھچا پیار، وہ شفقت، جس پر ابھی تک کسی قرض خواہ کا دعویٰ نہ تھا۔ اس نئے دعویدار نے ہمیں اس سے بھی محروم کر دیا۔ ہم عادت سے مجبور کوئی ضد کرتے تو سامنے کے

کسی کھلونے کی طرف دست درازی کرتے تو جھڑک دیئے جاتے کہ اب تم بچے نہیں رہے بڑے ہو گئے ہو
پھر اسی قول پر اعتبار کر کے جب ذرا زیادہ جیب خرچ کا مطالبہ کرتے تو سننا پڑتا :
"اے فاس کو بڑے بھائی کے برابر جیب چاہیے ۔ بالشت بھر کا لونڈا اور یہ چونچلے ۔ ۔ ۔ ۔" وہ تو حفظ ماتقدم کے طور پر ایسے مذاکرات ہم ذرا فاصلے سے ہی کرتے تھے ورنہ ایک آدھ چپت سے نوازے جانے کے بھی پورے موقع ہوتے تھے ۔

اسکول میں پورا زور لگانے پر بھی ہم کسی طرح سیکنڈ ڈویژن کو کراس نہ کر پائے ۔ امتحان کی سالانہ رپورٹ پر "سخت محنت درکار ہے" کے ریمارکس گویا ہمیشہ کے لیے چپک کر رہ گئے تھے ۔ سی وحشت میں ایک دن فیصلہ کیا کہ روز روز کے مرنے سے ایک ہی بار کی موت اچھی ہے ۔ کیوں نہ اب کے فیل ہو کے دیکھیں ۔ دو بار لگاتار ایسا ہو گا تو گھر والے خود ہی کسی کام دھندے سے لگا دیں گے ۔ کچھ نہیں ہوا تو نکڑ پر سائیکل پنکچر کا اڈہ جما لیں گے ۔ کوئی پنکچر والے کی کلاس یا ڈویژن نہیں پوچھتا ۔ یہ انقلابی فیصلہ کر کے اپنے تئیں ہم مطمئن ہو گئے اور امتحان کی تیاریوں سے بے نیاز، کتابوں میں چھپا کر جاسوسی ناولوں کا مطالعہ کرتے رہے ۔ اگر امتحان میں سوال ابن صفی یا قانون والا کے اسلوب نگارش پر ہوتا یا فریدی، حمیدی، عمران وغیرہ کے کرداروں یا کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا جاتا تو ہمیں پوری امید تھی کہ ہم ضرور فرسٹ ڈویژن لاتے ۔ بہر حال اپنی ناکامی کو سو فی صد یقینی بنانے کے لیے کسی بھی سوال کا جواب لکھنے کے بجائے پرچوں میں کارٹون بنا کر استاد صاحبان کے خط و خال کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتے رہے ۔ اب رسمی طور پر رزلٹ کا انتظار رہا اور فیل ہونے کی تقریب منعقد ہونے والی پریس کانفرنس میں دیئے جانے والے بیان کو ہم ترتیب دے چکے تھے اور مختلف سوالات کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے کہ ایک دن سو کر جو اٹھے تو خبر ملی کہ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے اسکول کے دو کمروں میں آگ لگ گئی اور بقول شاعر:

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اس "جو تھا" میں ہمارے امتحان کی کاپیاں بھی شامل تھیں ۔ ہنگامی صورت حال میں اسکول کمیٹی نے فیصلہ کیا، طلباء کو ان کی سابقہ کارکردگی کی بنا پر نمبر دے دیئے جائیں ۔ اس طرح فیل ہونے کا ہمارا منصوبہ بھی زمین پر آ رہا ۔ ہوائے قسمت ! :

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

تو صاحبو! اسی طرح گرتے پڑتے ہم کالج بھی پہنچ گئے اور سکنڈ و تھرڈ ڈویژنوں کے درمیان جھولتے جھولتے گریجویٹ بھی ہو گئے اور وہ بھی ہائی تھرڈ ڈیژن میں بی اے کی ڈگری کو مشعل راہ بنا کر ہم نے مختلف دفتروں کے چکر کاٹنے شروع کیے کہ کوئی ہمیں اپنی فرزندی میں قبول کر لے لیکن ہماری ساری اکڑ فوں ہوا ہو گئی پوچھے جانے پر ہم اپنی کوالیفکیشن پورے اعتماد اور رعب سے "بیچلر آف آرٹس" بتاتے ۔ ادھر سے سوال ہوتا "ڈویژن ؟" ہائی تھرڈ" تب تو مشکل ہے ۔ یہاں تو کتنے ہی فرسٹ ڈویژنوں کی عرضیاں پڑی

ہوئی ہیں" اتنا سنتے ہی ہماری شیخی کا کلف بھیگ کر ایک دم بیٹھ جاتا۔ تنگ آکر ہم نے انتظامیہ سے سبکدوش ہو کر تعلیم کی طرف قدم بڑھانے کا فیصلہ کیا اور بی۔ایڈ میں داخلہ لیا اور یہ معرکہ بخیر و خوبی سیکنڈ ڈویژن میں سر کرلیا۔ اب دفتروں کو خیر باد کہہ کر ہم نے صرف اسکولوں کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازنا شروع کیا۔ دفتر والوں کا تذکرہ اب ہم حقارت سے "بابو لوگ" کہہ کر کرتے تھے۔ بہت سی سفارشوں اور ایک معقول رقم لے کر ایک پرائیویٹ اسکول نے اس شرط پر ہمیں قبول کیا کہ پانسو روپے لے کر ڈھائی ہزار کے بل پر دستخط کر کے اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کو مالی تعاون دیں گے۔ عقل کو محو تماشائے لب بام چھوڑ کر جذبہ قربانی سے سرشار ہم تعمیر قوم کے مشن میں جٹ گئے۔ زندگی میں پہلی بار غریب نوازی کا موقع مل رہا تھا کیسے چھوڑ دیتے۔ اس بات پر بھی خوش تھے کہ اسکول والوں نے ہماری ڈھائی ہزاری حیثیت کو تسلیم تو کیا۔ روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے گلی محلے میں آتے جاتے جب دس پانچ بار ماسٹر صاحب سلام، ماسٹر صاحب سلام! سننے کو ملتا تو ہمارا قد کچھ بڑھا ہوا محسوس ہوتا۔ ہماری کوشش ہوتی کہ کلف لگی ہماری قمیص سرف الٹرا کا اشتہار نظر آئے۔ اس طرح اب ہمارا شمار شرفا یعنی متوسط طبقے کے باعزت افراد میں ہونے لگا۔۔۔۔۔ "اے میاں تم کس سوچ میں پڑ گئے کچھ بولو گے بھی۔۔۔" حکیم صاحب نے ہمیں وہیں پہنچا دیا۔ جہاں ہم تھے۔ سوچتے ہیں سنجیدگی سے دو چار دن حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر رہ کر اصلاح کے بارے میں تھوڑا بہت ہم بھی کچھ سیکھ لیں۔ آخر کو علم ہے اور چین جائے بغیر گھر بیٹھے مل رہا ہے۔

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

ٹھگ بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں

یوں تو ٹھگوں کی تاریخ قدیم اور طویل ہے لیکن لوگ کہتے ہیں اور ہم سنتے ہیں کہ مغلوں کے رنگین دور میں جب کہ کبوتر بازی، مرغ بازی، بیت بازی اور ایسی ہی بازیوں کے علاوہ رقص و سرود، مجرا الغرض سارے دل بستگی کے سامان شد و مد سے جاری و ساری ہو چکے تھے تب ٹھگ قوم کے ایک "با اثر" طبقہ کے طور پر نمایاں ہوئے۔ جن کے کارناموں کا شرفا و امرا کی محفلوں میں تشویش سے زیادہ دل چسپی سے ذکر ہوتا تھا۔ ہم اس کی تصدیق اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہمارا جنم اتفاق سے اس وقت ہوا جب آصف جاہی حکومت کے دور میں شاہی رکاب دار حلوا بیچا کرتا تھا اور ہمیں صرف اور صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا تاہم چونکہ واقعہ ٹھگوں ہی کی ذات برادری کا ہے لہذا یہاں ان کے نام کا واسطہ دینا لازمی قرار پاتا ہے۔
ہوا یوں کہ ایک مرتبہ سڑک پر خاصے دو تین کیلو چاول یوں پڑے ہوئے تھے کہ بظاہر ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایک محترمہ بڑے ناز و انداز سے چلتے چلتے رک کر انہیں بغور دیکھنے لگیں۔ سامنے ہی استری دار پتلون شرٹ سے مزین ایک نوجوان منہ میں سگریٹ دبائے کھڑا تھا۔ محترمہ کو اس چاول کے ذخیرہ کی طرف متوجہ دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور نہایت ادب سے سلام کر کے اس طرح گویا ہوا۔ "بی بی جی آپ دیکھ رہی ہیں نا کہ کتنے عمدہ چاول کس بے دردی سے سڑک جیسے مقام پر پھینک دیئے گئے ہیں۔ کیا بتاؤں کہ یہ مزدور لوگ کیسے لاپرواہ ہوتے ہیں یہ جو سامنے راشن کی دکان ہے اسی خاک سار کی ہے۔ پچیس روپے کیلو والے چاول کے تھیلے جب لاری سے دکان میں منتقل کیے جا رہے تھے۔ تب ایک تھیلے میں سوراخ پڑ گیا لیکن کوئی بات نہیں ہمارے ملک میں قدیم زمانے سے ایسا ہی اسراف ہوتا آ رہا ہے۔ اب دیکھیے نا کہ بنگال کے مصنوعی قحط میں جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے اور انگریز کو خدا سمجھے سینکڑوں ٹن اناج بوریوں میں بھر بھر کر گوداموں میں بھر رہا تھا اور جب اناج سڑ گل گیا اور کیڑے مکوڑوں کی نذر ہونے لگا تو کم بخت گوروں نے اسے سمندر میں نہایت بے دردی سے پھینک دیا"۔ جب وہ خاتون حیرت سے گزرے زمانے

کا یہ المناک واقعہ پوری توجہ سے سننے لگی تو اس شخص نے اپنی بات میں یوں اضافہ کیا کہ "خیر جانے دیجیے یہ بتلائیے کہ کیا آپ کو یہ چاول پسند ہیں۔ ہم ویسے پچیس روپے سے کم کسی کو نہیں دیتے لیکن چونکہ آپ کا معاملہ پڑوس کا ہے آپ کو بیس سے لگوا دیں گے"۔ یہ سنتے ہی بی بی جی کے چہرے پہ ایک جانی چمک سی آ گئی۔ بولیں "بھیا مہربانی کر کے ایک تھیلہ سامنے فلیٹ نمبر 5 پر پہنچا دیجیے"۔ شخص مذکور نے معنی خیز مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیر دی اور ایسے سر ہلایا جیسے بس حکم کا منتظر ہی تھا۔ خاتون کے اپنے فلیٹ میں پہنچ جانے کے کچھ ہی دیر بعد شخص مذکور مزدور کی پیٹھ پر ایک عدد تھیلہ چاول اٹھوائے وارد ہوا۔ خاتون بہت خوش ہوئی اور بار بار اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دو ہزار کی بھاری رقم اس کے ہاتھ میں تھما دی وقت کہاں تھمتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ گزرتا گیا حتیٰ کہ سنہری شام بھی رات میں تبدیل ہو گئی۔ بی بی صاحبہ نے اسی چاول کا لذیذ فرائیڈ رائس بنایا اور جیسے ہی صاحب گھر داخل ہوئے انھیں خوش خبری سنائی کہ اڑھائی ہزار کے چاول انھوں نے صرف دو ہزار میں خریدے ہیں"۔ میں نے اسی چاول کے فرائیڈ رائس بنائے ہیں۔ ذرا کھا کر تو دیکھیے کیسے عمدہ چاول ہیں"۔ دونوں میاں بیوی نے سیر ہو کر کھانا کھایا صاحب نے بھی چاول کی تعریف کے پل باندھ دیئے اور بیوی کی ذہانت کی دل کھول کر داد دی ابھی وہ محو گفتگو ہی تھے کہ فلیٹ گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا جیسے ہی بی بی نے دروازہ کھولا کیا دیکھتی ہیں کہ ایک عدد موٹا تازہ توند والا بنیا سامنے کھڑا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ادب سے نمستے کیا اور خلوص بھرے لہجے میں کہنے لگا کہ "بی بی جی آپ کے آدمی نے چاول تو پہنچا دیئے نا۔ بہت اچھا آدمی ہے کتنے پیار سے بات کرتا ہے۔ آپ نے کتنا اچھا ملازم رکھا ہے۔ آج کل ایسے بھروسے کے لوگ ملتے کہاں ہیں۔ اب رات ہو گئی ہے۔ ہم نے سوچا کہ بی بی جی سے دام مانگ لائیں"۔ یہ سنتے ہی بی بی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

بولیں "کیسے دام! وہ تو آپ کا سیٹھ پہلے ہی لے گیا"۔ بنیا بولا "بی بی جی سیٹھ تو ہم ہیں جی، وہ جو آپ کا آدمی تھا بولا کہ ہماری میم صاب نے سامنے فلیٹ نمبر 5 میں ایک کٹا چاول منگوائے ہیں پیسہ صاب آنے کے بعد بھیجنے کو کہا ہے سو ہم نے سوچا پڑوس کا معاملہ ہے پیسہ کہاں جائے گا۔ اب نہیں تو شام کو، شام کو نہیں تو کل بڑے لوگ یوں ڈبوتے تھوڑا ہی ہیں۔ بعد میں وصول کر لیں گے۔ اب دکان بند کرنی ہے جی۔ جلدی دے دیں بڑی کرپا ہو گی"۔ بی بی جی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولیں "بھیا اس وقت تو پیسہ نہیں ہے یا تو تمہارے چاول واپس لے جاؤ یا پھر چیک دیئے دیتی ہوں"۔ بنیا بولا "اجی بی بی جی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بھلا پڑوسیوں کو اناج جیسی چیز دے کر کوئی واپس لے جاتا ہے۔ کل آتے ہی پیسے صاحب جی سے مانگ کر رکھیو آپ ہٹے لوگوں پہ ہمیں پورا بھروسہ ہے کل ہی لے لیں گے"۔ ابھی یہ غیر متوقع گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ صاحب بھی وہاں آ دھمکے اور ماجرا دریافت کیا۔ بنیا اور بیوی دونوں نے اپنے فی البدیہہ کلمات سے صاحب کو نوازا۔ صاحب کے چہرے پر ایک تاؤ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ پہلے ہی بیچارے دفتر سے تھکے ماندے آئے تھے۔ کچھ توقف کر کے دوسرے دن شام میں رقم دینے کا وعدہ کر گئے۔ بنیا تو چلا گیا

ساتھ ہی فرائڈ رائیس کا مزہ بھی کافور ہوگیا۔ بڑی رات تک میاں بیوی میں ان بن رہی۔ اور اچھی خاصی تلخ کلامی بھی ہوتی رہی۔ دوسرے دن شام ہوتے ہی بنیا نمودار ہو گیا اور جب بی بی نے بادلِ ناخواستہ اسے دو ہزار دیئے تو ایک دم بگڑ گیا۔ کہنے لگا "ایک تو دو دن چکر لگواتی ہو دوجے تین ہزار کے چاول کو دو ہزار دیتی ہو۔ نکالو ایک ہزار اور۔" اب تو بی بی جی سٹپٹائیں۔ اور لگیں منت سماجت کرنے۔ لیکن بنیا تو بہرحال بنیا تھا جب وہ تین ہزار پر اڑ گیا تب صاحب بی بی دونوں نے اسی میں اپنی عافیت جانی کہ اتنی تنگ ودو سے حاصل شدہ چاول واپس ہی کر دیں۔ چنانچہ بنیا اپنے مزدور کو بلا لایا اور بڑبڑاتا ہوا چاول کا تھیلا اٹھوائے چلتا بنا۔ صاحب بی بی دونوں حسرت بھری نظروں سے کبھی جاتے ہوئے چاول کے تھیلے کو اور کبھی ایک دوسرے کے منہ کو تکتے رہ گئے

مذاق جھانسوی
(جھانسی)

مہمان

ایک دن اک یار جب مہمان بن کر آگیا
در حقیقت ناک تنگی کا مجھے پچوا گیا

میرے گھر پر تھا برابر چھ مہینے سے قیام
اور وہ لیتا نہ تھا ہرگز کبھی جانے کا نام

میں نے تب مجبور ہو کر ایک عصرانہ دیا
اور سب کے سامنے رو رو کے یوں شکوہ کیا

"یہ میرے مہمان مخلص دوست ہیں صد آفریں
غم یہ ہے مہمان بن کر اب یہ آئیں گے نہیں"

سُن کے مہمان نے کہا" دل کو نہ چھوٹا کیجئے
اور غلط فہمی نہ اپنے دل میں پیدا کیجئے

چھ مہینے سے ہوں مہماں آپ ہی کا سربسر
آپ چاہیں گے تو میں مہماں رہوں گا عمر بھر

یہ مرا وعدہ کہ جب اس شہر میں پھر آؤں گا
آپ ہی کے گھر رہوں گا، آپ ہی کا کھاؤں گا

بات یہ مہماں کی سُن کر بولا یوں خانہ خراب
آپ کا ارشاد تو بے شک بجا لیکن جناب

میرے مہماں پھر دوبارہ کس طرح بن پائیں گے
جب یہاں سے آپ جائیں گے تب ہی تو آئیں گے

○

غزلیں

ڈاکٹر ہادی منزہ
(نرمل)

گھر میں کچھ نہیں رکھا پھر بھی وضعداری ہے
بات یہ تمھاری ہے بات یہ ہماری ہے

فکر قوم کی کس کو جستجو ہے کرسی کی
ملک بیچ دیں گے وہ کرسی اتنی پیاری ہے

داخلے نہیں ملتے اب ہمارے بچوں کو
اُن کے بچے پڑھتے ہیں جن کی جیب بھاری ہے

ذات پوچھی جاتی ہے ہر قدم پہ اب دیکھو
ذات جتنی چھوٹی ہے بات اتنی بھاری ہے

آج کل کے انساں سے ہے پریشاں شیطاں بھی
حرکتوں سے انساں کی خوف اُس پہ طاری ہے

پیار نامناسب ہے بے وفا زمانے سے
آج ہم کو ٹھکرایا کل تمھاری باری ہے

ریش میں منزہ کی سینکڑوں ہی تنکے ہیں
لاکھ وہ چھپاتا ہو، کیا کوئی مداری ہے

شجاع الدین
عاطف (آسٹریلیا)

نذرِ غالب

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
میں جس کے رہا پیچھے وہ بھاگا مرے آگے

گو آنتوں میں اب دم نہیں معدے میں ورم ہے
رہنے دو ابھی مرچی و بھجیہ مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
میں سڑ سا گیا تو کہ ہے تازہ مرے آگے

تم سہل نہ جانو مرا سسری کا اُٹھانا
کتا مرے پیچھے ہے تو کتا مرے آگے

TANANT پہ میں جب بھی برستا ہوں تو عاطف
لا رکھتا ہے وہ پیپسی کا کولا مرے آگے

نذرِ فیض

پیسہ، مکان، ریس کی بازی پہ وار کے
لو جا رہا ہے وہ کوئی جُوئے میں ہار کے

سارا ہی بکرا ہضم تو کر لے تو کیا عجب
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے تیری ڈکار کے

نکلے گا یوں دیوالیہ اپنا بھی ایک دن
چلتے رہے جو سلسلے اس کی ادھار کے

بزنس میں ہم سے اچھا تو ہوگا نہ کوئی اور
ZERO بنا چکے ہیں پچھتر ہزار کے

ماں باپ سے سدھرنے نہ پائے جو نوجواں
رکھتی ہے بیوی ایک دن اس کو سدھار کے

بازار میں تو ملتے ہیں عاطف ہزار اچار
شیدا ہیں ہم تو اپنے ہی گھر کے اچار کے

محمود شریف محمود
(حیدرآباد)

حسینانِ دورِ نو

جب اپنے شہر کا بازار ہے پری خانہ
پھر اُن کو دیکھنے اُن کی گلی میں کیوں جانا

وہ جن کا حُسن نمونہ ہے فیض میک اپ کا
اُنہیں حسین جو سمجھے تو ہے وہ دیوانا

غلط یہ بات ہے دل پھینک ہیں فقط لڑکے
حنائی ہاتھوں میں ہوتا ہے دل کا نذرانا

حیا سے، شرم سے، لجّا سے اُن کو ہے نفرت
کہ ان کے پیشِ نظر ہے نظر میں کھب جانا

نہ آیا ہم کو تو سیکل چلانا بھی محمود
سواری ان کی ہے جاوا، لباس مردانہ

کے۔ ایس شفیق
(حیدرآباد)

ظرافت

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جامعہ عثمانیہ میں تھے تو استاذ فلسفہ لیکن شعروادب خوش خیالی و خوش گفتاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے آرٹس کالج کے کمرۂ اساتذہ میں لنچ انٹرول میں بہت سے پروفیسر جمع تھے جن میں ان کے علاوہ پروفیسر مظفر الدین قریشی صدر شعبۂ کیمیا اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبۂ معاشیات بھی تھے۔ ایک نو وارد نے آکر خلیفہ صاحب سے دریافت کیا کہ کیا میں قریشی صاحب سے مل سکتا ہوں تو خلیفہ صاحب نے کہا ہاں ہاں ضرور، آپ کس قریشی سے ملنا چاہیں گے۔ یہاں ابولہب بھی ہیں اور ابوجہل بھی۔

ایک محفل میں سر مرزا اسمٰعیل کے دور صدارت عظمیٰ میں حیدرآباد میں عمارتوں وغیرہ کی توڑ پھوڑ، سڑکوں کی کشادگی وغیرہ کا تذکرہ چل رہا تھا۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ فن تعمیرات کے ماہر اور شغف رکھنے والے کی خاصیت ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ پہلے توڑتا ہے پھر بناتا ہے اور یہ شعر اپنے دعوے کی تائید میں پڑھا کہ:

پختہ معماران چوں تعمیرے کنند اولاً مسمار بنیادے کنند

ایک اور محفل میں چند نام نہاد مذہبی قائدین کو ہدف تنقید و ملامت بنایا جا رہا تھا حاضرین کی اکثریت مخالفین کی تھی اور معدودے چند موافق۔ خلیفہ صاحب نے تلخی بحث کو ختم کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کارے دیگر می کنند

پروفیسر زینت ساجدہ اپنی شگفتہ بیانی، حاضر جوابی اور صاف گوئی کے لیے خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ کئی برس پہلے مشہور شاعر فیض احمد فیض کا اردو ہال میں تہنیتی جلسہ تھا اور مہمان خصوصی کے تعارف کا کام پروفیسر زینت ساجدہ کو سونپا گیا۔ فیض صاحب کی انگریزی بیوی کو ذہن میں رکھتے ہوئے فرمانے لگیں "فیض صاحب شاعری تو اردو میں کرتے ہیں لیکن عاشقی انگریزی میں"۔ بس سارا ہال بشمول جناب فیض قہقہوں سے گونج اٹھا۔

مجاز مرادآبادی بہت اچھے شاعر تھے اور انتہائی حاضر جواب و بے مثال ظریف، بہت کم علم لیکن کافی

شہرت پائی۔ مشہور شاعر فراق گورکھپوری کے بے تکلف دوستوں میں تھے ایک مرتبہ محفل مے نوشی کے دور
فراق صاحب نے پوچھا کہ "کیوں مجاز کچھ سرور آیا" تو مجاز کہنے لگے"۔ اجی ابھی کہاں، ابھی تو صرف آل احمد آئے
اشارہ مشہور ہم عصر شاعر آل احمد سرور کی طرف تھا۔

لیبر ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ایک لیبر فورم قائم ہوا تھا جس کا راقم الحروف ممبر سکریٹری تھا اور ہر ماہ جل
منعقد ہوا کرتے تھے جس میں مزدور مسائل پر ماہرین کی تقریر ہوتی تھی۔ مقالے پڑھے جاتے تھے اور بعد میں مبا
ایک دفعہ مشہور ادیب اور ٹریڈ یونین لیڈر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے "اچھی ٹریڈ یونین" کے عنوان پر تقریر کی اور
معمول اختتام جلسہ پر میں نے لفافے میں ۱۰۰/ رو بطور فیس ڈاکٹر گوڑ کی خدمت میں پیش کیے تو انھوں نے قبو
کرنے سے ادباً معذرت کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

تیرے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول
اور میں کم بخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

کئی سال قبل حیدرآباد کے سینئر عہدہ دار . . . . اور علمی اور ادبی تحریکوں کے روح
رواں ایل۔ این گپتا صاحب کی صدارت میں حیدرآباد کے بوٹ کلب میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ رات
وقت۔ بارش کا موسم۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مشاعرہ کا آغاز ہو چکا تھا اور نوجوا
شاعر ہادی القادری کلام سنا رہے تھے۔ دو ایک شعر سنا چکے تھے اور غزل کا ردیف قافیہ "ہوتی جاتی ہے" تھا
ایسے میں جوش ملیح آبادی جھومتے جھامتے۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے۔ سر کے بال الجھے ہوئے
ہاتھ میں بوتل لیے ہوئے شریک محفل ہوئے۔ شاعر کا ایک آدھ شعر سنا اور انھیں روک کر فرمایا کہ حاضرین
اسی بحر میں ایک شعر موزوں ہوا ہے۔ سماعت فرمائیے،

اور کہا کہ:

گھٹا چھائی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
"یہاں بوتل پہ بوتل جوش خالی ہوتی جاتی ہے"

اس موزوں دربرجستہ شاعرانہ مداخلت پر محفل میں جو داد و تحسین کی فضا برپا ہوئی ہوگی وہ دیکھنے سے
تعلق رکھتی تھی۔

توفیق انصاری احمد
(امریکہ)

خوامخواہ حیدرآبادی

انسان کا خمیر دنیا کے کسی ایک مقام سے اٹھتا ہے اور اس مقام کی آب و ہوا کا اثر اس کی شخصیت کا بنیادی و تعمیری عنصر ہوتا ہے مگر وقت اور انقلاباتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ دوسرے مقامات کا اثر بھی اس کی شخصیت کی صورت گری میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سماج میں کئی ایک ایسی شخصیتیں ابھر آتی ہیں جو دنیا کے مختلف مقامات کی ملی جلی مشترکہ تہذیب کی دین ہیں اور اس طرح دو چار مختلف تہذیبوں کے ملاپ سے دنیا کے پردے پر اک ایسی شخصیت ابھرتی ہے جس میں ایک متنوع تہذیبی امتزاج ہوتا ہے اور یہ امتزاج ان تہذیبوں کی مشترکہ نمائندگی کا ضامن ہوتا ہے۔

حیدرآباد دکن اور بمبئی کی ایک ایسی ہی مشترکہ تہذیبی تصویر جناب غوث محی الدین خوامخواہ حیدرآبادی کی شخصیت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ خوامخواہ صاحب حیدرآباد میں پلے بڑھے۔ طبیعت میں طنز و مزاح کے فطری عناصر موجود تھے اور جب ان عناصر کا غلبہ زیادہ ہوا تو شعر و ادب کی طرف توجہ کی اور اپنی تخلیقات کو نظم و نثر کا جامہ پہنانے لگے۔ سخن پروروں، سخن نوازوں اور سخن فہموں کی صحبتوں نے جناب خوامخواہ کے فن کو جلا بخشی اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ مقبولیت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ طبیعت کی شوخی اور ذہن کی براقی نے بہت جلد مزاح پسندوں کو اسیر کر لیا اور اردو کی عام سدھ بدھ رکھنے والا ہر شخص ان کا گرویدہ ہو گیا۔

حیدرآبادی دکنی کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص مقام ہے اور اس کو وہی شخص اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے جو اس زبان کی شیرینی کے لطف سے بخوبی واقف ہو۔ دکنی محاورات، دکنی کہاوتیں، دکنی چٹخارے اور دکنی بندشیں، دکنی زبا .... یا دکنی بولی کو اونچا اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں۔ دکنی میں جو یگانگی، جو پیار، جو خلوص اور جو مزہ ہے وہ کسی اور بولی میں مشکل ہی سے ملے گا۔ بیسویں صدی کے

وسط میں دکنی شاعری کو دکن میں بڑا فروغ ہوا۔ اس زمانے میں جن شعرا کو بڑی شہرت نصیب ہوئی ان میں دکنی وصوتی شاعری کے رحیم صاحب میاں اور دکنی شاعری کے نذیر دہقانی، اعجاز حسین کھٹا۔ علی صاحب میاں سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اور پھر ان کے بعد دکنی شاعری کے میدان میں آہستہ آہستہ کئی ایک شعرا کا اضافہ ہوا۔ خواہ مخواہ صاحب حیدرآباد کے افق پر طلوع ہوئے تو طنز و مزاح کے مشاعروں میں بڑی تیزی سے اپنا سکہ جمانے لگے۔ ... آرٹس اکیڈیمی اور حیدرآباد کے ممتاز اداروں سے ربط ضبط بڑھا مگر اسی دوران ملازمت کے سلسلے میں ان کو حیدرآباد چھوڑ کر ... بمبئی میں خواہ مخواہ ایک عرصہ مصروف کار رہے اور اسی زمانے میں ان کو بمبئی کی تیز نبض پر ہاتھ رکھنے کا موقع ملا۔ بمبئی کی رنگارنگ زندگی اور کاروباری بے مروتی کو اچھی طرح محسوس کرنے کے بعد خواہ مخواہ صاحب نے بمبئی میں مروت نام سے چھوٹا سا مکان بنا لیا یہ مکان نہ صرف خواہ مخواہ صاحب کا مسکن ہی تھا بلکہ اس کی بے لوث محبت کے دروازے عزیزوں اور رشتہ داروں کے علاوہ دوست احباب کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے۔

خواہ مخواہ صاحب کا یہ روایاتی خلوص، حیدرآباد سے بمبئی اور بمبئی سے حیدرآباد آنے جانے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ بمبئی میں کون کس کو پوچھتا ہے؟ ہوٹلوں میں تو رہ سکتے ہیں مگر اس میں وہ مزہ کہاں جو اک پرخلوص حیدرآبادی شاعر کی روایاتی صحبت میں ہے۔ بمبئی میں خواہ مخواہ سے مل کر نہ صرف ساری پریشانی دور ہو جاتی بلکہ ان کی ہشاش بشاش طبیعت دیکھ کر سفر کی ساری تکان بھی اتر جاتی۔

بمبئی کی مصروف زندگی میں یہ مہمان نوازی اور یہ عنایت و نوازشات کی مسلسل بارش ان کو میزبان کے درجہ سے اونچا کر کے محسن کے درجہ تک پہنچا دیتی۔ بمبئی کی زندگی سے خواہ مخواہ نے بہت کچھ سیکھا اور اسی کا عکس ان کی تحریرات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ روزنامہ انقلاب میں "خالی پیلی" کے عنوان سے وہ ایک مستقل مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ افسانوں، ڈراموں اور خاکوں پر توجہ دی .... اور فن کاری کے کئی ایک نمونے پیش کیے لیکن اس سے بڑھ کر انھوں نے آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر زندگی کے سچے تجربوں کو طنز و مزاح کا شعری لباس بھی پہنانا شروع کر دیا۔

ذوق طبع نے ان کی مدد کی، دکنی نے ان کا ساتھ دیا اور پھر برجستگی و تیز رفتاری نے ان کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں سے انفرادیت اور شہرت کے نئے دروازے کھلتے ہیں وقت کے ساتھ خواہ مخواہ کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ اور آج خواہ مخواہ صاحب طنز و مزاح کے منفرد شاعر کی حیثیت سے ہر بڑے کل ہند اور بین الاقوامی مشاعرے میں مدعو کیے جاتے ہیں۔

خواہ مخواہ نہ صرف ایک سیدھے سادے، خوش باش و خوش فکر انسان ہیں بلکہ وہ طنز و مزاح کے ایک عظیم شاعر بھی ہیں۔ وہ تصورات کی دنیا سے پرے حقیقتوں کے اس نمائندہ شہر میں رہتے ہیں جہاں زندگی کی تلخی اور شیرینی کو اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے اسی تلخ و تند کو مزاح کے قند و خمیر میں حلول کر کے انھوں نے شاعری کا ایک ایسا لازوال و قابل رشک مرکب تیار کیا ہے

جس کی تاثیر لاجواب ہے۔ غمگین چہروں پر مسکراہٹیں لانے اور رونے والوں کو ہنسانے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور نسخہ نہیں۔

خواہ مخواہ کی ایک کتاب "بہ فرضِ محال" منظرِ عام پر آچکی ہے اور دوسری کی تیاریاں تیزی سے جاری ہیں۔

خواہ مخواہ حیدرآبادی کی طنز و مزاح سے بھرپور شاعری ہمارا ادبی سرمایہ ہے اور یہ سرمایہ اس قابل ہے کہ نہ صرف ہم بلکہ ہماری آنے والی نسلیں اس پر بجا طور پر فخر کریں۔

غزلیں

تمیز پرواز
(مدھول)

پرچے میں میرے نام کی شائع ہو گئی — سو روپے میں جو لی تھی غزل شائع ہو گئی
جہاں ہیں اہلِ ذوق کہ کس بحر میں ہے یہ — اصلاح ہے نہ رد و بدل شائع ہو گئی
کہتا نہ تھا کہ دھوم مچائے گی یہ غزل — اب تو خدارا گھر سے نکل شائع ہو گئی
کی بازپرس ہم نے تو دھاڑا مدیر یوں — اب جاؤ اور بجاؤ بغل شائع ہو گئی
پرواز ہو گئے آج سے شعرا میں ہم شمار
اک نظم تھی "دماغی خلل" شائع ہو گئی

○

جستجو منزل کی ہو تو اندھا رہبر ساتھ رکھ — دوستی لیڈر سے ہو تو چار پتھر ساتھ رکھ
دل میں طمع ہو تو اپنے ہاتھ میں تسبیح لے — رات کو ملنا ہو زاہد سے تو ساغر ساتھ رکھ
تجھ کو آنا ہے اگر اول ہر اک مضمون میں — امتحاں کے وقت ہر پرچے میں ٹیچر ساتھ رکھ
ریل یا بس کا ریزرویشن ہو یا راشن کی تمنا — ہو جہاں لمبی قطاریں اپنا بستر ساتھ رکھ
قوت بازو پہ اترانا حماقت ہے میاں — ہر جگہ ہر موڑ پہ اپنا مقدر ساتھ رکھ
کیا پتہ کوئی تجھے دس کا پہاڑا پوچھ لے — گھر سے باہر جانا ہو تو کیلکولیٹر ساتھ رکھ
دوست ہے تو پھر اسے پرواز کیوں تکلیف دیں
پیٹھ بھی اپنی کہے گی اپنا خنجر ساتھ رکھ

محمد اسد اللہ
(ناگپور)

مراٹھی مزاحیہ کہانی

ہماری علاقائی زبانوں میں مراٹھی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے مختلف اصناف میں تخلیق پارے پیش کیے ہیں
...الی اور مراٹھی زبان میں لکھے گئے ڈرامے ملک بھر میں مشہور رہیں ان ڈراموں کے علاوہ مراٹھی کا ظریفانہ ادب بھی
...یاری اور لائق مطالعہ ہے۔ ہر چند رعایت لفظی اور ذومعنی فقروں کے ذریعہ ابتذال کی حد تک اتر جانے کا الزام
...ا اس کے سر ہے اس کے باوجود مراٹھی طنز و مزاح میں فنی اعتبار سے ایک قابل قدر ادبی سرمایہ موجود ہے۔

شری پادکر شن کولہٹکر (۱۸۷۱ - ۱۹۳۴) کو مراٹھی مزاح نگاری کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔
سداما چے پوہے" کی اشاعت کے ذریعہ مزاح نگاری کے ایک منفرد اسلوب کے ساتھ مراٹھی ادب میں جنم
- ان مضامین میں مراٹھی ڈراموں کی روایتی فقرے بازی اور لفظی بازی گری سے صورت واقعہ اور کہانی پن کی
طرف قدم بڑھایا۔ بقول و۔ل کلکرنی:

"کولہٹکر کو یہ احساس تھا کہ محض لفظی الٹ پھیر سے طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار قائم کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ
...ں نے اپنی تخلیقات میں روزمرہ کی زندگی میں پائی جانے والی مضحکہ خیزیوں کو سطح پر لانے کی غرض سے
...تا تیا' بنڈو نانا اور سداما جیسے کردار تخلیق کیے۔

صورت واقعہ کے ذریعہ ظرافت کی تخلیق کا انداز جسے کولہٹکر نے متعارف کروایا۔ مراٹھی مزاح نگاری
روایت بن گیا۔ اسی سلسلے کو رام نرلیش گڈکری (۱۸۸۵ - ۱۹۱۹ء) نے ... یناچا) کا مگیری میں آگے بڑھایا
...مانی تسلسل کے باوجود اس قسم کی مزاحیہ تحریریں مضامین ہی کے زمرے میں شامل کی گئیں۔ ظرافت نگاری کا
...نداز نئے دور کے مزاح نگاروں مثلاً پ۔ ل۔ دیشپانڈے تک اب بھی برقرار ہے۔ گڈکری کے ہم عصر
...و۔ جوشی (۱۸۹۲ - ۱۹۶۶) اور پ۔ک۔ اترے (۱۸۹۸ء - ۱۹۶۹ء) کے مضامین بھی کہانیوں کا سا
...زیے ہوئے اسی روایت کو نبھاتے رہے لیکن انھیں کہانی کے طور پر قبول نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں اترے کا مضمون پانیری

مانگے والا قابلِ ذکر ہے۔

گزشتہ ربع صدی کے دوران مراٹھی ادب میں مزاحیہ کہانی کے طور پر مخصوص قسم کی تحریریں منظرِ عام پر آئیں۔ طنز و مزاح کو عمداً کہانی کے فارم میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

ان کہانیوں میں تفریح کا پہلو نمایاں ہے۔ اولین مزاح نگاروں کے لیے ظرافت سماج سدھار کا ایک آلہ تھی، ان تحریروں کا مقصد محض تفریح طبع نہیں بلکہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کی نشان دہی کرنا اور انہیں طنز و استہزا کے ذریعے نیست و نابود کر دینا تھا۔

مع۔ دجوشی کے مزاحیہ مضامین میں مزاح اکثر صورت واقعہ کی پیداوار ہے اسی لیے ان کی تحریریں، مراٹھی مزاح نگاری میں ایک اہم موڑ قرار دی جا سکتی ہے۔ چ۔د۔جوشی کی تحریروں میں ظرافت کو واضح طور پر کہانی کے فارم کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

نئی مراٹھی مزاحیہ کہانی رسالہ "منوہن" کی اشاعت کے بعد اپنی انفرادی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ مراٹھی کی اولین مزاحیہ کہانیوں میں ہری نارائن آپٹے کی کہانی "ڈسپیپشیا" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مراٹھی مزاحیہ کہانی کا جنم محض انداز اور فارم کی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک واضح مقصد نمایاں تھا۔ بقول و۔ل کلکرنی قدروں کا تحفظ اور سمجھانے کے ساتھ دعوتِ فکر روایتی مزاح نگاری کا مقصد تھا اس کے برعکس مزاحیہ کہانی جسے قبولِ عام بھی حاصل ہوا محض تفریح کی غرض سے وجود میں آئی۔ اس طرح کی مزاحیہ کہانی میں ہمیں ایک نیا رجحان بھی ملتا ہے۔ جس میں دعوتِ فکر اور اصلاحِ معاشرہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ تفریحی مقاصد کی غرض سے لکھی گئی مراٹھی مزاحیہ کہانیوں نے ماڈگول کر کی گرامین کتھا سے جنم لیا۔ بعد میں د۔م۔میراسدار، شنکر پاٹل اور بسنت سبنس نے ان کہانیوں میں تنوع پیدا کیا۔

مراٹھی کی گرامین کتھا دیہی زندگی کا منظر نامہ ہے۔ ان کہانیوں میں "راوی" اپنی مقامی بولی علاقائی اور دیہاتی زندگی کی جو تصویر دکھاتا ہے وہ زندگی سے قریب تر اور اپنی مٹی کی مہک لیے ہوئے ہے اسی لیے اس کا "تاثر گہرا ہے۔ ساگر پارے لکھتے ہیں:

"مراٹھی کی گرامین کتھا میں ہمیں دو رجحانات ملتے ہیں ایک مقامی یا دیہی زندگی کی عکاسی اور دوسری شہری زندگی سے متاثر ہو کر بدلتی ہوئی قصباتی زندگی میں نمایاں ہونے والی تفاوت۔ ان کہانیوں میں علاقائی بدلتی ہوئی قدروں کا تضاد اور غیر ہم آہنگی سے فطری مزاح کی تخلیق ہوئی ہے"

گزشتہ ربع صدی کے دوران مراٹھی ادب میں مزاح کی تخلیق بیشتر کہانی ہی کے فارم میں ہوئی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں ناہمواریوں، عصری مسائل سماج میں پائے جانے والے مختلف رجحانات، گھریلو زندگی، دفتر شاہی، سیاست میں پائی جانے والی بوالعجبیاں اور انسانی عادات و مزاج کی مضحکہ خیزیاں طنز و مزاح کا ہدف ہیں۔

کہانی کے فارم کو ظرافت کے روپ میں پیش کرنے والے مرہٹی ادیبوں میں اول
مزاح نگاروں کے علاوہ پ۔ ل۔ دیشپانڈے، رمیش منتری کیشو لیمے، د۔ م۔ میراسد
شام راؤ اوک، و۔ ا۔ بوا، وسنت سبنیس، بال گاڈگل، جیونت دلوی، اندرا بنی ساوکا
د۔ پ کالے، بال سامنت، گنگا دھر گاڈگل اور سبھاش بھینڈے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صاف صاف

دال روٹی ہو گئی ہے زندگی
کتنی چھوٹی ہو گئی ہے زندگی

اصلیت ہے اب تو دنیا بے کا خواب
دل کی کھوٹی ہو گئی ہے زندگی

بال بچوں کے کھلونوں کی طرح
"بیر بوٹی" ہو گئی ہے زندگی

جسم کے سب پیرہن ہیں تار تار
اک لنگوٹی ہو گئی ہے زندگی

سخت مشکل ہے پرکھنا ان کی
کیا کسوٹی ہو گئی ہے زندگی

آدمی دبلے سے دبلا ہو گیا
اور موٹی ہو گئی ہے زندگی

گودا اندر اور اوپر سخت کھال
اخروٹی ہو گئی ہے زندگی

ٹکڑے ٹکڑے ہڈیاں ہیں اور ہم
بوٹی بوٹی ہو گئی ہے زندگی

آدمی آمادہ ہے بن باس پر
"چتر کوٹی" ہو گئی ہے زندگی

منہ پھیلے آبادی کھی جتنی ہوئی
اتنی چھوٹی ہو گئی ہے زندگی

ہو گئی ہے بھوک حاوی آپ پر
کیا پکے مرغا پلاؤ بھاپ پر

ساری اصلی چیز غائب ہو گئی
مال اب بکتا ہے نقلی چھاپ پر

تربیت کی ذمہ داری ماں پہ ہے
انگلیاں اٹھتی ہیں لیکن باپ پر

غور فرمائیں! وطن کے رہنما!!
بھیڑ کیوں لگتی ہے واٹن شاپ پر

سب کو ڈسکو نے نکما کر دیا
جھومتے والے کہاں اب جاپ پر

کیا ادب؟ کیسا ادب؟ کیسا ادب؟
اب تو لہراتی ہے دنیا تھاپ پر

آپ محفل میں ہیں منظورِ نظر
ہیں نگاہیں سب کی منہ پھٹ آپ پر

٥

[illegible]

دس کے خط (مراسلے)

جناب
مئی کا شگوفہ ملا ۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ غیر ممالک میں شگوفہ کا اتنا شاندار استقبال کیا جاتا ہے ۔ مبارک ہو ۔ مضامین کے علاوہ پرچے کی طباعت بھی بہت اچھی ہے اور تصاویر بھی ۔ دعا ہے کہ ہر شمارہ اتنا ہی حسین ہوا کرے ۔

شفیقہ فرحت ، بھوپال

مکرمی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب ۔

السلام علیکم ۔ میں آپ کے لیے ایک اجنبی ہوں لیکن آپ اپنے مایہ ناز منفرد رسالہ شگوفہ کے حوالہ سے میرے لیے اجنبی نہیں ہیں ۔

۱۹۵۸ء میں گریجویشن کے بعد میں نے کراچی ہجرت کی اور وہاں آگے کی تعلیم مکمل کر کے اب برائٹ فیوچر کالج حسن اسکوائر میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوں ہجرت کے بعد سے یہ دوسری مرتبہ حیدرآباد آنا ہوا ۔ شروع ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی ہے ۔ اس زمانے میں مجردگاہ بھی آنا جانا تھا ۔ سلیمان اریب ، وحید اختر ، عزیز قیسی وغیرہ سے بھی دوستانہ مراسم تھے ۔ شاہد صدیقی صاحب کے ساتھ چند مہینے سالار جنگ لائبریری کی فہرست کے کام میں بھی ان کا ہاتھ بٹا چکا ہوں ۔ میرے برادر نسبتی عبدالرؤف صاحب اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں ۔ کتابوں اور مختلف رسالوں کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم کر رکھا ہے ۔ میری دل بستگی کی خاطر انھوں نے دوران قیام کئی کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لیے دیں انہی میں آپ کے شگوفہ کی بھی پانچ چھ کاپیاں تھیں مجھے ۔ بید خوشی ہوئی کہ اپنی طرز کا ایک معیاری رسالہ حیدرآباد سے بیس پچیس سال سے شائع ہو رہا ہے ۔ اور ایک خاص حلقہ میں مقبول بھی ہے ۔ پسندیدگی سے پڑھا جاتا ہے ۔ اس زمانہ میں صبا ہی ایک رسالہ تھا جو سلیمان اریب کی ادارت میں نکلتا تھا اور وہ بھی یہ عجیب اتفاق ہے کہ مجردگاہ سے ہی نکلتا تھا ۔ فطری تقاضہ سے مجبور ہو کر سب سے پہلے میں نے شگوفہ ہی سے بسم اللہ کی ۔ مضامین کے معیار اور ترتیب سے کافی متاثر ہوا اور حیرت ہوئی کہ یہاں کے نامساعد حالات میں آپ کس طرح شگوفہ کا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں ۔ معاف فرمائیں میرا کچھ ایسا خیال تھا کہ یہاں شعر و ادب کے حوالہ سے معیار بہت پست ہو چکا ہے ۔ ہمارے لکھنے والوں کے مقابلہ میں ۔ تاہم اور رسالوں سے جب تقابلی مطالعہ کیا تو آپ کا رسالہ حسن سیرت کے لحاظ سے بہت اونچا معلوم ہوا ۔ یہ بات بھی باعث حیرت ہے کہ یہاں بھارت میں بلکہ حیدرآباد میں بہت اچھے اہل قلم ہیں ۔ اب تک یہ خیال تھا کہ ہمارے ادیبوں سے یہاں کے لکھنے والوں کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن یہ خیال شگوفہ کے پڑھنے کے بعد بدل گیا ۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ پاکستان میں اردو ادب کا معیار بہت بلند ہے ۔ بڑی حد تک صحیح بھی ہے ۔ وہاں سے میگزین اور اخبار بھی شاندار ہیں ۔ اور اہل قلم بھی مگر اس مرتبہ آپ کے رسالہ میں جب سید طالب حسین زیدی صاحب کے چشم و دل کشا بلکہ ذہن کشا اور خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑنے والا مضمون پڑھا تو اس حوالہ سے تسلیم کرنا پڑا کہ بلا خوف و تردید یہ کہہ سکتا ہوں اس معیار اور خوبصورت طرز ادا میں لکھنے والے ہمارے پاس بھی چند ہی نکلیں گے ۔ میں ان کے مدلل انداز بیان سے بہت متاثر ہوا جو بلا کا شوخی آمیز ہے ۔ اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک مقصد کے حوالہ سے قلم کو حرکت دیتے ہیں ۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بلا مقصد تحریر چاہے وہ مزاح کیوں نہ ہو بے روح ہوتی ہے ۔ مختصر یہ کہ صاحب موصوف قاری کو اپنا گرویدہ بنا لینے کے ماہر ہیں ۔ شاید نثری تغزل اسی کو کہتے ہیں ۔ آخر میں ایک ضروری بات معلوم نہیں آپ کی کونسی مجبوریاں ہیں شگوفہ جیسے معیاری رسالہ کو حسن صورت سے بھی آراستہ ہونا چاہیے اور اس کو آفسٹ پہ چھپنا چاہیے ۔ — **عبدالکریم** لیکچرر برائٹ فیوچر کالج حسن اسکوائر کراچی)

محترم جناب سیّد مصطفیٰ کمال صاحب!

اُمید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے آپ سے
تمنا سائی دیبرینہ ہے سلام خوشنویس جب یاقوت پورہ میں
رہتے تھے اسی وقت آپ بھی اُن کی زلفوں کے اسیر تھے اور
ابھی اب معلوم ہوا انھوں نے زلفوں کے ساتھ داڑھی بھی چھوڑ
دی ہے اب نہ جانے کون کون ان کے اسیر ہو رہے ہونگے۔

ہرماہ آپ کی جانب سے جو گلستان کھلتا ہے وہ دل
و دماغ کو معطر کرتا ہے خاص وہ شگوفہ جو جناب سیّد طالب حسین
زیدی پیش کرتے ہیں وہ بڑا غضب کا ہوتا ہے حالات حاضرہ
کا مسکراتا جائزہ اندرون خانہ مسکراہٹیں سماج و معاشرہ
پر دلفریب تبصرہ کیا نہیں ہوتا ہے سب ہی چیزیں اُس شگوفہ
کی پنکھڑیوں میں ملتی ہیں مگر مزاح برائے مزاح نہیں بلکہ مزاح
برائے اصلاح کا پہلو اس میں ملتا ہے میری جانب سے سیّد طالب حسین
زیدی کی خدمت میں مبارکباد پیش کیجئے اور میں اللہ کے سامنے
ان کے لیے دعا پیش کرتا ہوں اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

البتہ پرچوں کی متعدی اور مشترکہ بیماریوں سے آپ کا پرچہ بھی
خالی نہیں کتابت کی اغلاط، پرنٹنگ کی خامی وغیرہ وغیرہ۔

ایک ہی شگوفہ کھلتا ہے وہ اگر مرجھایا ہوا ہو اچھا نہیں
لگتا پھر بھی آپ کا دل گردہ ہے کہ اس پرچہ کو آپ مسلسل قائم
رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پرچہ کو صحت
و توانائی عطا فرمائے۔ **سیّد اکبر الدین قاسمی**
ناظم جامعۃ البنات۔ حیدرآباد۔

مکرمی!

ماہ مئی کا شمارہ دستیاب ہوا۔
نثر و منظومات دونوں پسند آئے۔ ریاض میں منعقدہ شام شگوفہ کی
تفصیلات شمارے کی اہم خاصیت ہے تصویریں جاذب نظر ہیں۔ عابد معز صاحب
کے خطبۂ استقبالیہ میں لطیفوں کی آمیزش بہتر طریقہ پر ادا ہوئی ہے
یہ بھی ایک فن ہے ہر شخص اسمیں طاق نہیں ہوسکتا۔ غوث خواہ مخواہ
صاحب کی منظومات نے خوب مزہ دیا۔ مجتبیٰ صاحب کا مضمون تھوڑا خشک ہے صحیح
لیکن بہت کام آماد کی چیز ہے۔ بقیہ نثریات بھی لائق تحسین ہیں طالب خوندمیری
نے سخن کے پردے میں بہت کچھ کہا ہے۔ طالب صاحب کا کوئی نیا
کلام ہوتا تو اور مزہ آتا۔ ادھر گزشتہ چند برسوں سے
آپ کے رسالے میں محدود حلقہ ہی حصّہ لے رہا ہے اور یہ
رسالہ بھی گروپ بندی کا شکار نظر آتا ہے (اسمیں میرا کوئی قصور نہیں)
اس روش کو ختم کرنے کی کوشش کیجئے۔ **انصاری میم الف** (ناگ)

اِدارِیَہ

دکن کے منفرد شاعر اشرف خوندمیری کا ۵ جولائی ۹۷ء
کو صبح انتقال ہوگیا۔ وہ پچھلے چند ماہ سے کینسر میں مبتلا
تھے۔ کوئی دو سال قبل وہ محکمہ صحت و طبابت سے
بہ حسن خدمت وظیفہ پر علٰحدہ ہوئے تھے۔ سیّد عبدالکریم
خوندمیری مرحوم کے فرزند اشرف خوندمیری کو بچپن سے ہی
شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ دکن کے طنز و مزاح نگار
شاعر کی حیثیت سے انھیں زندہ دلان حیدرآباد کے
مشاعروں کے ذریعہ بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اپنے
خاص جدید دکنی کے لب و لہجہ میں وہ شعر کہتے تھے ان
کی نظمیں دکنی تہذیب و معاشرت کی مُنہ بولتی تصویریں
ہیں، جس میں دکنی مٹی کی بوباس خاص فطری پن کے ساتھ
محسوس کی جاسکتی ہے۔ ہم عصر دکنی روزمرہ و محاورہ اور
فن شعر پر انھیں قدرت حاصل تھی ان کے کلام کے مطالعہ
سے جدید دکن کی تخلیقی توانائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس
ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہوسکا۔ دکنی زبان کے لسانی
ارتقا کو سمجھنے کے لیے بھی ان کے کلام کی اشاعت ضروری
ہے ـــ اشرف خوندمیری زندہ دل منکسرالمزاج، پرخلوص
اور درد مند انسان تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اور شگوفہ
سے ان کی وابستگی قدیم تھی۔ ان کا انتقال طنز و مزاح
اور خاص طور سے دکنی شاعری کا عظیم نقصان ہے۔
خدا سے دُعا ہے کہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔
اور ان کے بھائی طالب خوندمیری اور تمام ورثا کو صبرِ جمیل
عطا فرمائے۔ آمین۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

جلد ۳۰ شمارہ : ۸ اگست ۱۹۹۷ء

قیمت فی پرچہ	=	۱۰ روپے
زر سالانہ	=	۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے	=	۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۱

فون (آفس) 595716

فون (رہائش) 4576064

کتابت محمود سلیم محمد غالب محمد عبدالروف

طباعت دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد



اشرف خوندمیری

پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء — انتقال ۵ جولائی ۱۹۹۰ء

اقبال ہاشمی

آہ! اشرف خوندمیری

دکنی زبان بولنے والا چلا گیا — لفظوں کے موتی رولنے والا چلا گیا

طنز و مزاح کی ہے ترازو دھری ہوئی — جوہر کو اس میں تولنے والا چلا گیا

اپنی سماعتیں ہیں سلامت تو کیا ہوا — کانوں میں رس کو گھولنے والا چلا گیا

قالب پہ آکے رکتی ہے ہر شخص کی نظر — قلب و نظر ٹٹولنے والا چلا گیا

دامن میں اپنے لو لو و مرجان کی طرح — بھر پور داد رولنے والا چلا گیا

میٹھی زبان کے سحر سے اور انکسار سے — بے دام ہم کو مولنے والا چلا گیا

چاول کے ساتھ آتے ہیں کنکر بھی بے شمار — ان کنکروں کو ڈھولنے والا چلا گیا

سچ پوچھیے تو ہاشمی اشرف کے روپ میں — بے وقت راز کھولنے والا چلا گیا

زندہ دلان شکاگو کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید سلیمان جلیل کے اعزاز میں جلسہ



دائیں سے بائیں ۔ اعجاز نسرین ، غوثیہ سلطانہ ، ضمیہ جعفری ، ڈاکٹر یوسف اعظمی ، خواجہ عطش ، خالد عرفان (استادہ) عبدالوہاب کلیم ، عبدالملک سعیدی
خالد انور ، ڈاکٹر خورشید خضر اور عطرت حسین عطرت



دائیں سے بائیں ، ضمیہ جعفری ، خورشد خضر ، واجد ندیم ، ڈاکٹر یوسف اعظمی ، غوثیہ سلطانہ ، اعجاز نسرین ، رئیس وارثی ، حسن چشتی ، سرور جاوید





اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

شگوفہ

٢٥ سال کا انتخاب

٨ ستمبر کو شائع ہوگا

مشتاق احمد یوسفی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، کرشن چندر، احمد جمال پاشاہ، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، عطاء الحق قاسمی، کرنل محمد خاں، خامہ بگوش، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور، دلیپ سنگھ، رشید قریشی، وجاہت علی سندیلوی، نریندر لوتھر، مسیح انجم، ڈاکٹر رشید موسوی، پرویز یداللہ مہدی، شفیقہ فرحت، برق آشیانوی، عابد معز، فیاض احمد فیضی، رؤف پاریکھ، عاتق شاہ، بُرہان حسین، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شکیل اعجاز، حلیمہ فردوس، ڈاکٹر عباس متقی، بانو سرتاج اور دوسرے نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات۔

تنقیدی مضامین : ڈاکٹر عقیل ہاشمی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

آفسیٹ طباعت ○ قیمت : 20 روپے

○ مہمان مدیر : سکندر علی خاں

شفیع الدین ناکارہ

یادِ رفتگان

مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکّر

حلیم! خط ملا۔ جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔ کیونکہ مجھے سر کھجانے کا خیال کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ تم کو معلوم ہوگا کہ آغا محمد کامل ایم۔اے، پی، ایچ، ڈی ایک مہینہ ہوا ولایت سے تشریف لائے ہیں اور اب تم کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ وہ پچھلے ہفتے ہمارے مہمان تھے۔ ناخواندہ مہمان! مجھے کچھ دیوانے کتّے نے نہیں کاٹا تھا کہ آغا کو اپنے گھر بلاتا لیکن میری بدقسمتی کہ ذات شریف نے خود ہی لکھ بھیجا کہ میں ایک ہفتہ عشرہ کے لیے تمہارا مہمان رہوں گا۔ تم جانتے ہو، اس قماش کے آدمیوں کا ہفتہ عشرہ ہم لوگوں کے مہینے کے مساوی ہوتا ہے، اور پھر ایک "ولایت پلٹ" بزرگ کا نزول اجلال! میرے جی میں آیا کہ آغا کو لکھ دوں کہ یہاں آنے کا خیال بھی نہ کرو۔ ان دنوں حضرت طاعون حیدرآبادی مدظلہ العالی اپنے سالانہ دورہ پر رونق افروز ہیں، اور فی یوم اوسطاً تین سو جانوں کا خراج وصول کر رہے ہیں۔ اخباروں کی تازہ ترین اطلاع مظہر ہے کہ ہیضہ بھی پھوٹ پڑا ہے اور ایک نجومی نے پیش گوئی کی ہے کہ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر چیچک کی وبا بھی پھیلنے والی ہے، جس میں بے خصوصاً ولایت کے تعلیم یافتہ نوجوان بُری طرح مبتلا نظر آئیں گے وغیرہ۔ مگر بھلا کرے صدانی کا کہ اس نے آغا کا انگریزی خط دیکھ کر خوشی کی چیخ ماری۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے لال بھبوکا ہوگیا۔ اس کی باچھیں خطرناک حد تک کھل گئیں۔ پکار اٹھی "آغا بھائی آ رہے ہیں۔ کسے خبر تھی کہ وہ بے بلائے آئیں گے! انہیں لکھ دو کہ آؤ اور ضرور آؤ۔ ہم بے چینی سے منتظر ہیں۔

میں نے آغا کو خط لکھ دیا کہ غریب خانہ حاضر ہے (کاش مجھے اس وقت یہ مصرعہ یاد آتا ؏

غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے

جب چاہے آسکتے ہو، اور شوق سے بغیر اطلاع کے بھی آسکتے ہو (بشرطیکہ جلد واپس جانے کا نام نہ لو، میں یہ لکھنا چاہتا تھا، مگر بھول گیا) گھر تمہارا ہے، تم غیر تھوڑا ہی ہو! زہے نصیب! تم غریبوں کے جھونپڑے کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخشنا پسند کر رہے ہو، خواہ ایک ہفتہ عشرہ کے لیے کیوں نہ ہو! یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ محمد کامل آتا! ۔۔۔۔

مگر جلد [illegible] اور خون کے گھونٹ پیتا جاتا تھا۔

آغا بھائی کے استقبال کی تیاریاں بڑے زور و شور سے شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے مکان کی مرمت ہوئی، پھر ایک پاشی۔ دو بڑے کمرے اُن کے لیے خالی کردیئے گئے۔ وہ ردو بدل ہوا کہ گھر کا نقشہ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہوگئی۔ گڑبڑ کا یہ حال کہ اڑوس پڑوس کے لوگ سمجھے کہ ہمارے یہاں کوئی تقریب درپیش ہے۔ چوک سے مرغیاں آئیں۔ (جنھوں نے آتے ہی انڈے دینے شروع کیے۔) میوہ فروش کے ہاں سے بہترین فواکہہ، حلوائی کی دکان سے عمدہ مٹھائی اور شاہ مرزا کے ہاں سے کموڈ! خان صاحب نے اپنا پلنگ مستعار دیا اور ایک جنرل مرچنٹ نے چھری کانٹے قیمتاً! ـــــ کیوں نہ ہو صمدانی کے آغا بھائی کی آمد آمد ہے!

آغا بھائی آئے اور اپنے ساتھ سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، گرڈ بڑ جھنجھا اور قلبوں کے لیے انگریزی گالیاں لیتے آئے۔ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ کچھ موٹے بھی ہوگئے تھے۔ داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی غائب تھیں ؎

ہر ادا انگریزی سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

ہاتھ میں ایک قیمتی چھڑی تھی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بٹلر اور کتّے کو ساتھ نہیں لائے تھے!

مجھے دیکھتے ہی پکار اٹھے "ہلو شفاعت! اچھے تو ہو؟ صمدانی کیسی ہے؟ اسٹیشن آئی ہے؟ ـــــ ڈیم! کیوں ساتھ نہیں لائے؟"

"السلام علیکم" کا نعرہ مار کر میں معانقہ کے لیے بڑھا مگر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ اس زور سے کہ یہ خط لکھتے ہوئے درد محسوس ہو رہا ہے۔ ٹیکسی میں لد کر گھر چلے۔ راستہ تمام باتیں کرتے رہے۔ مجھے کچھ کہنے نہ دیا۔ انگریزی آمیز اُردو بولتے تھے۔ غالب کے اکثر اشعار کی طرح ان کے جملوں میں فقط ایک فعل اردو ہوتا تھا۔ اللہ اللہ! یہ وہی آغا ہیں جو ولایت جانے سے پہلے خود کو اردو کا سچا خادم کہتے تھے۔ میں ان کا چھیلا چھالا منہ تک رہا تھا اور وہ بغیر دم لیے چہچہا رہے تھے۔

اولڈ بوائے! کیا کہوں؟ میری لائف بالکل بے مزہ گزر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت چھوڑ کر دوزخ میں آگیا ہوں۔ یار! لنڈن کی بات بلڈی اس سٹی میں کہاں؟ بائی گاڈ میرا بس چلتا تو دو چار سال اور وہاں لائف لیڈ کرتا.. ..... صمدانی اچھی ہے؟ بچہ دے دیا اس نے؟ ڈیم! کیسے میاں ہو تم! ہاہاہا...... میں خواہ مخواہ تم کو تکلیف دے رہا ہوں مگر یاد رکھو تکلف نہ کرنا، اسپیشل انتظام کی ضرورت نہیں...... کیا کہا؟ نانسنس!...... یار اصل فیکٹ یہ ہے کہ میں اس ڈسٹرکٹ کی لائف سے بالکل "تنگ آگیا تھا۔ ہماری فیملی کے ممبر! ایک سے بڑھ کر ایک ہے سب کے سب دقیانوسی خیال کے ہیں مگر ہمارا اولڈ فیلو (والد ماجد کی شان میں) تو سب میں یار ہے۔ اسی لیے تو میں نے کہا کہ چلو سٹی میں صمدانی کے ہاں چند ڈیز گزار دوں۔ اوہ یار...... کیا خراب روڈ ہے! انگلینڈ کا کیا کہنا! یہاں تو مارے جھٹکوں کے دم نکل گیا ڈیم!..." (حلیم! تم حیران ہوگئے کہ میں نے صاحب بہادر کی بکواس کس طرح یاد رکھی اور یہاں حرف بحرف نقل کردی، اُس وقت کہیں شارٹ ہینڈ سے لکھتا تو نہیں گیا؟ مگر دوست! یہ تجارت کا راز ہے، جس کو ہر کس و ناکس نہیں جان سکتا!) گھر پہنچے۔ آغا باہر سے در و دیوار کو دیکھنے لگے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سونگھنے لگے۔ ہم دونوں میاں اور ڈرائیور، سامان اُٹھا کر اندر لے گئے۔ ٹیکسی کا کرایہ میں نے ادا کیا اور آغا اندر گھسے۔

صمدانی جھٹ اپنے [illegible] سے [illegible] کر آنے لگی [illegible] پکار اٹھے "آغا بھائی آگئے! اچھے تو ہیں؟

"صمدانی! ارے یہ صمدانی ہے، تُو تو بہت کچھ بدل گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ گاڈ! میں نہیں سمجھتا تھا، تو اتنی بیوٹی فُل ہو گی — شفاعت! لکی روگ" (خوش نصیب بدمعاش)

صمدانی نے ایک مرغی آغا کے اُتاری۔ ڈر کر یوں پیچھے ہٹے، جیسے مرغی کاٹ کھائے گی۔ بولے "ارے! یہ کیا ہے! پھینکو! اسے پھینکو! نانسنس!" میں ان کو اندر لے گیا۔ کمروں کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔ فرمایا "ناٹ بیڈ" کام چل جائے گا۔ صوفے نہیں ہیں؟ آل رائیٹ، آل رائیٹ! کوئی مضائقہ نہیں۔ باتھ روم کون سا ہے؟ میں ذرا نہا لوں، پھر فرصت سے ٹاک کریں گے"۔

میں اجازت لے کر دفتر بھاگا۔ دیر ہو گئی تھی، جانا ضروری تھا کیونکہ رخصت نہیں ملی تھی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ شام کو دفتر سے جلدی اٹھا۔ واپسی میں مربّہ اور کیک پیسٹری لے کر گھر پہنچا۔ معلوم ہوا، لباس تبدیل کر رہے ہیں، سیر کو جا رہے ہیں۔ میں گھبرا کر بھاگا۔ تھانے سے فون کیا کہ فوراً سے پیشتر ٹیکسی لے آؤ۔

واپس ہوا تو تیار بیٹھے تھے۔ چائے سے فارغ ہو چکے تھے۔ فرمایا "ایوننگ شفاعت! کار آئی؟ ..... جام کہاں سے لائے ہو؟ ویری بیڈ! دیسی معلوم ہوتا ہے۔ ٹی بھی بیکار! ایسا معلوم ہوتا ہے، ہاٹ واٹر پی رہے ہیں" ٹیکسی آئی اور آغا سیر کو گئے۔

حلیم! میاں نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی! مگر اس ناشکر گزار انسان کی حرکتوں سے میری امیدوں پر پانی پھر گیا اور پھر صمدانی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا کہ جو چیز لاتے ہو خراب، پیسہ خرچنے کو دم نکلتا ہے۔ مربّہ لائے تو اس صورت، چائے کی پتی لائے تو ایسی۔ چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے! لیجئے طویلے کی بلا بندر کے سر!

ایک اور مصیبت میری راہ دیکھ رہی تھی۔ ہمارے ہاں ایک جوان ماما آئی تھی۔ اس کو میں نے آغا کے ورود سے پہلے منہ مانگی تنخواہ پر رکھا تھا۔ تنہائی میں وہ مجھ سے کہنے لگی "سرکار۔ وہ مہمان جو آج آئے ہیں، وہ ..... دیکھیے ذرا آپ اُن سے ضرور کہہ دیجیے۔ نہیں تو میرا ایسی نوکری کو دور ہی سے سلام! اچھا! .... بڑے ہوں گے تو اپنے گھر کے۔ کیا غریبوں کی عزت و آبرو نہیں ہوتی؟ ..... ؟"

میں نے اسے بہت اطمینان دلایا کہ پھر کبھی ایسا نہیں ہو گا، تب کہیں جا کر اس کا پارہ اُترا۔

رات کا کھانا روز فرش پر سات بجے کھاتے تھے۔ آج میز پر ساڑھے آٹھ بجے کھانا پڑا۔ لکھنے کی میز نے آج کھانے کی میز کا کام دیا! آغا نے "کانٹے چھری دہان خود" پر عمل کیا۔ اور اپنے ولایتی کارنامے بیان فرماتے رہے۔ صمدانی ہمہ تن گوش تھی۔ بیچاری نے برابر کھایا بھی نہیں۔ ہر دم آغا بھائی کا دم بھر رہی تھی۔ کھانے کے بعد میں نے پان پیش کیا تو بولے "نو تھینک یو! میں پان نہیں کھاتا۔ میڈیکل پوائنٹ آف ویو سے پان بڑی مضر چیز ہے۔" اور پھر پان کے زہریلے اثرات، مسوڑھوں کی خرابی، دانتوں کے امراض، پائیوریا، دندان ساز کی ضرورت وغیرہ عنوانات پر ایک طویل تقریر فرمائی۔ میں سب کچھ بڑے صبر کے ساتھ سنتا رہا۔ جی تو بہت جلا اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا "تو آپ گوند چبا سکتے ہیں۔ انگریز گوند چباتے ہیں"۔ اور پھر گوند کے فوائد پر میں نے طنزاً ایک زوردار لکچر عرض کیا۔

اس کو مذاق سمجھ کر آغا بڑی دیر تک انگریزی میں ہنستے رہے۔ پھر بولے۔ سگریٹ پلاؤ یار! ... ڈیئر

تم سگریٹ نہیں پیتے ؟ ..... بس اب جلد منگواؤ۔ مگر قیمتی ہوں۔ یہ دیسی سگریٹ .... ارے بھئی ان میں گوبر ملاتے ہیں۔ تم کو نہیں معلوم۔ جلدی کرو، عبداللہ یا نیوی کٹ! .... میں عموماً سگریٹ نہیں پیتا، پائپ پیتا ہوں۔ جلدی میں بھول آیا۔ یار کل تم ایک عمدہ پائپ اور اچھا سا ٹوبیکو منگوا دو۔ میں اس کی پرائس دیدوں گا.....

گھر میں ایک مٹی کی چلم دھری ہے، کہئے تو حاضر کروں" یہ الفاظ میرے حلق تک آکر رک گئے۔ مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ پھر بھی زبان سے نکل گیا۔" تم حقہ کیوں نہیں پیتے آغا؟"

آغا ابھی جواب دینے نہیں پائے تھے کہ صمدانی داخل ہوئی۔ آغا کہنے لگے "کافی لے آئی؟ تھینکس! ــــ ہاں تو صمدانی میں نے تم سے وہ واقعہ بیان نہیں کیا۔ سنتی ہو؟ اس کے بعد انھوں نے پیرس کے ایک قمارخانے کا ذکر کیا، جہاں وہ ایک جواری سے لڑ پڑے تھے۔ اور ڈوئیل کی نوبت آگئی تھی۔ اس کے بعد اپنے دوسرے شرمناک کارناموں کا فخریہ ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ مجھ سے نہیں کہا، صمدانی اُن کی اصل مخاطب تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اُن کی گفتگو چوری سے سن رہا ہوں بلکہ میں تو یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری موجودگی بالکل غیر ضروری ہے۔ میں نے کھانس کر، کھنکار کر، سیٹی بجا کر، گنگنا کر اپنی موجودگی کا اعلان کیا مگر وہ دونوں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر معلوم ہو رہے تھے۔ کوئی شخص اُن کو اس طرح چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھتا تو اُسے کچھ اور گمان ہوتا اور مجھ سے ہمدردی!

میں نے غور سے اُن کی باتیں سنیں۔ آغا کی شادی کا تذکرہ تھا۔ حق تو یہ ہے کہ ان کا ولایت سے دُم چھلے کے بغیر واپس ہونا مجھے حیرت میں ڈالتا ہے۔ مگر میں نے باوثوق ذرائع سے سُنا ہے ــــ اور حلیم! اس کو یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ــــ کہ لندن میں آپ کی میم صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔ بوڑھے باپ کے ڈر سے اُسے ہمراہ نہیں لائے۔ آپ کو یقین کامل ہے کہ بڑے میاں اُسے دیکھتے ہی آپ کو کھڑے کھڑے عاق کر دیں گے اور لاکھوں کی جائداد سے محروم کر دیں گے میرے خیال میں آغا اپنے والد ماجد سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس جائداد کے جانے سے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے سُنا ہے کہ آغا نے یورپ میں شادی کر لی ہے۔ اور بعض ستم ظریف تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارا یہ ہندوستانی "پاپا" ولایتی "ماما" کے پاس اپنی دو نشانیاں بھی چھوڑ آیا ہے۔ ایک بچہ اور ایک بچی! خدا کرے کہ یہ سچ ہو!!

دفعتاً آغا نے مجھے پکارا۔ "ہے! شفاعت! ادھر آنا یار۔ ذرا میرے روم تک تکلیف کرو۔ میرا سوٹ کیس کھول کر ــــ فوٹوز کا البم رکھا ہوا ہے اس میں ــ ... ذرا اسے لیتے آنا۔ گڈ بائے!"

میں دانت پیستا اور ہونٹ چباتا چلا۔ نامعقول کی نظر میں میری حیثیت ملازم سے زیادہ نہ تھی۔ البم لے آیا تو آپ نے فرمایا "تھینکس"!

تصویریں ایک ایک کرکے صمدانی کو دکھلانے لگے۔ "دونوں دیکھتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے۔ مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ دیکھوں کس قسم کی تصویریں ہیں؟ دونوں اس طرح ہنس رہے تھے جیسے ہنسی کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ میں نے قریب جا کر اُن کے پیچھے سے دیکھا۔ آغا نہانے کا لباس پہنے ایک نیم عریاں حسین انگریز لڑکی کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑے تھے اور دونوں دانت نکالے ہنس رہے تھے۔ میں نے صمدانی کو دیکھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں حیرت، مسرت، اور حسرت تینوں باری باری سے رقص کر رہی تھیں!

میں نے مذاق سے پوچھا "آغا یہ تمہاری بیوی ہے؟"

ہنس کر بولے "وائف ہی سمجھو! ہے نا بیوٹی فل؟"

میں دوسری تصویریں دیکھنے لگا۔ بہت کم ایسی تھیں جس میں آغا تنہا نظر آئے۔ مالدار باپ کے بیٹے یور(پ) میں روپیہ یوں لٹاتے ہیں! تصویر بینی سے فراغت پاکر کہنے لگے "میں فیل کرتا ہوں کہ اب۔ ۔ ۔ ۔"

"فیل کاہے کو کرتے ہو؟" میں نے بات کاٹ کر کہا "شٹز کرد آغا شٹز!" بات یہ ہے کہ اب میں ان کی گنگا جمنی اردو کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ آغا جھینپ سے گئے، ہنسنے لگے، اور صمدانی ہنسی کہ وہ ہنسے اور میں ہن(سا) صمدانی ہنسی کہ وہ ہنسے! اس طرح ہنسی مرض متعدی بن گئی۔ آخر بولے بہت دیر ہوگئی۔ نیند آرہی ہے۔ اب میں بیڈ(؟) جاتا ہوں۔ ۔ ۔ کم آن شفاعت! ایک کام ہے تم سے۔ ذرا وہ البم اٹھا لینا، گڈ نائٹ صمدانی۔"

کمرے میں پہنچ کر البم سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اس کے نیچے چھپا ہوا ایک اور پلندہ تھا۔ آغا نے اسے با(ہر نکالا)

"وہ پکچرز تو دیکھ چکے، اب یہ دیکھو" یہ کہہ کر تصویریں مجھے دیں۔ میں نے دیکھا، اور دیکھنے کے بعد محسوس کیا کاش دیکھنے سے پہلے مرگیا ہوتا! مارے غیرت کے زمین میں گڑ جانے کو جی چاہتا تھا۔ حلیم! اب میں تم سے کیا کہ(وں) دل اور قلم دونوں کانپتے ہیں۔ ولایت کی حسین ذمیل پریوں کی عکسی تصاویر تھیں اور قدرت کے شاہکار "حشو و ز(وائد)" سے بالکل پاک تھے! بس یہ لکھنا بھی کافی سے زیادہ ہے کہ اس نوع کی تصویروں سے شاید جرمنی کے بر(ہنہ) کلب کی ننگی دیواریں آراستہ کی جاتی ہوں گی ـــ!

میں نے آغا کو ڈانٹا "دیکھو آغا ان فحش تصویروں کو جلا دو۔ ان کا رکھنا گناہ ہے نصیحت مان جاؤ، ا(بھی) ابھی جلا دو"۔

مگر انھوں نے تصویریں چھین کر کہا "واہ ان کو جلا دوں؟ پیرس کی تصویروں کو تم کہتے ہو جلا دو! ہوش میں آ(ؤ) ان کو آرٹسٹک پوائنٹ آف ویو سے دیکھو گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ آرٹ تم کیا جانو؟ ہم سے پوچھو اس کی قد(ر) قیمت! ناصح مشفق!"

حلیم! اب میں ایک زبردست انکشاف کرنے والا ہوں۔ جگر تھام لو اور سننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ آغا(نے)

میں نے بستر پر لیٹ کر آج کے دردناک واقعات پر نظر ڈالی تو بے اختیار رونا آیا۔ آہ! میرا ریکارڈ زیادہ قا(بل) تعریف نہ تھا۔ لیکن یہ تو ابتدا تھی۔ ہفتہ عشرہ کا صرف ایک روز گزرا تھا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! آغا کی خا(طر) مدارات کے لیے جو سودی قرضہ لیا تھا، اس کو پانی میں بہا چکا تھا اور کل پھر صمدانی کی چند چیزیں لے کر ساہوکار کے (د)ولت پر حاضر ہونا تھا کہ حاجت مند ہندوستانی شوہر کے لیے بیوی کا زیور ہی سب کچھ ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہے کہ اب زیور کی صورت دیکھنا نہ بدنصیب شوہر کو نصیب ہوتا ہے اور نہ مظلوم بیوی کو!

کوئی دو بجے آنکھ لگی۔ طرح طرح کے ڈراؤنے خواب دیکھنے میں آئے۔ بار بار بچوں کی طرح چونک پڑتا تھا۔ خدا کر کے صبح ہوئی اور میں اٹھا۔ سارے جسم میں درد ہو رہا تھا جیسے کسی نے خوب میری مرمت کی ہو ـــ حلیم! ا(ب) میں واقعہ کے دردناک ترین حصہ پر پہنچتا ہوں۔

اندر گیا تو معلوم ہوا کہ صاحب بہادر آرام فرما رہے ہیں لیکن صمدانی نے ایک دہشت ناک خبر سنائی۔ کہنے لگ(ی)

آغا بھائی کا شوز کمرے کے باہر رکھا ہوا ہے"۔

میں نے اپنے بڑے بڑے کان کھڑے کیے۔ اُفوہ! یہ شخص کس قدر مغربی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کہا "دیکھی آغا کی مغرب زدگی! اب اس میں اور انگریزوں میں کیا فرق رہا"۔

کہنے لگی "مگر اب جوتے کی پالش کون کرے؟ مصیبت تو یہ ہے کہ گھر میں نوکر نام کو نہیں۔ ہے سو ایک ماما وہ پہلے ہی کام کی زیادتی کی شکایت کرتی رہتی ہے۔ اس سے کہو کہ ذرا جوتے کی پالش کر دو، پھر دیکھو ایک منٹ بھی گھر میں نہیں ٹکے گی۔ برقعہ اوڑھ کر چلتی پھرتی نظر نہ آئے تو میرا ذمہ!"

میرے کان اور زیادہ کھڑے ہو گئے۔ میں نے مختصر طور پر پوچھا "تو پھر؟"

"تو پھر؟ تو پھر کسی نہ کسی کو جوتے کی پالش کرنی پڑے گی، نہیں تو آغا بھائی کیا سمجھیں گے؟"

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آغا کے جوتے کو پالش کرنا ضروری تھا، گھر میں کوئی ملازم نہیں، ماما یہ ذلیل کام نہیں کر سکتی، صمدانی خارج از بحث ہے! اب رہا میں! آہ! ــــ میں نے ملازم نہ رکھنے کی غلطی پہلی دفعہ محسوس کی اور اپنے آپ کو لعن طعن! لیکن بے پروائی ظاہر کر کے کہا "اب سوال یہ ہے کہ پالش کون کرے؟"

جواب ملا "اگر تم نہیں کرتے تو مجھے کرنی پڑے گی"۔

میں نے آواز کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ بولا "پھر کر دو نا! رشتہ کے بھائی کا شوز صاف کرنے میں شرم کی کیا بات ہے؟ بلکہ تم کو فخر کرنا چاہیے کہ یورپ کے تعلیم یافتہ بھائی کے جوتے پالش کرنے کی عزت حاصل کر رہی ہو۔ ایسے زرین موقعے بار بار تھوڑی آتے ہیں! ہر کس و ناکس کو ایسے اپ ٹو ڈیٹ اور فیشن ایبل بھائی ......"

اس نے مجھے آگے کہنے نہ دیا۔ میرے لہجہ میں طنز کافی نمایاں تھا، جس کو وہ برداشت نہ کر سکی، چلا اُٹھی "میں نہیں کرتی تم کرو۔ نہیں تو آغا بھائی سے کہہ دوں گی"۔

حلیم! میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مگر میں ہرگز ہرگز یہ رسوا کن خدمت انجام نہیں دوں گی جو بعض پیٹ کے مارے گریجویٹ سڑکوں پر آج کل انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ سالے اپنے بہنوئی کا جوتا مذاق مذاق میں چرا لے جاتے ہیں مگر اس کے معنے یہ کہاں ہوئے کہ بہنوئی اپنے سالے کے جوتے کو پالش کرے۔ یہ ہمارے ملک کے سارے بہنوئیوں کی سراسر توہین تھی۔ میں اور سالے کے جوتے کو پالش کروں! (حاشا وکلا میں نے لفظ "سالا" گالی کے مفہوم میں نہیں استعمال کیا ہے!) آفتاب شمال سے طلوع ہو سکتا ہے اور جنوب میں غروب لیکن شفاعت، مسٹر آغا کامل کے جوتے کو کبھی پالش نہیں کر سکتا"۔

لیکن صمدانی نے وہ اودھم مچایا کہ سارا گھر سر پر اُٹھا لیا، میں نے اس کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ "ارے چپ رہو جی، آغا سو رہے ہیں، کہیں ہوشیار نہ ہو جائیں...... استغفر اللہ! بات تو سنو۔ ہش ہش! پیاری تنہا! یہ دیکھو!..... خدا کے لیے!...... ارے توبہ!...... خدایا! اچھا میں کرتا ہوں"!

دوست! میں نے جورو کے ناجائز مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ پر لعنت بھیجو گے۔ مگر سچ کہو تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ منہ لٹکائے دبے پاؤں آغا کے کمرے کی طرف چلا اور چپکے سے شوز اٹھا لیا۔ کوئی مجھے اس وقت دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں آغا کا جوتا چرا رہا ہوں۔

آدھے گھنٹے کے بعد آغا کا قیمتی انگریزی شوز پالش کیا ہوا جوں کا توں کمرے کے باہر دھرا تھا اور میں حمام میں کلمہ کی انگلی سے سیاہی چھڑانے میں مصروف۔

آج جمعہ تھا۔ نہاتے ہوئے میں سوچتا رہا۔ سینہ میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ طرح طرح کی تدبیریں دماغ میں آئیں اور گئیں۔ مثلاً چند نقاب پوش بدمعاشوں کو ملعون کے پیچھے چھوڑنا کہ موقع پاکر اس پر حملہ کردیں اور جنگل میں پھینک آئیں۔ یا پولیس کو اطلاع دینا کہ بنگال سے ایک بم ساز جاسوس آیا ہوا ہے۔ اس کو گرفتار کریں ورنہ نقض امن اور ہندو مسلم فساد کا اندیشہ ہے۔ یا بعد نماز جمعہ محفل وعظ منعقد کرنا اور مولوی صاحب کو ہدایت کردینا کہ انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب اور انگریزی معاشرت کی فتنہ سامانیوں پر زہرہ گداز وعظ فرمائیں، خصوصاً چار ابروؤں کا صفایا کرنے، میز پر کانٹے چھری سے کھانے، فحش تصویریں رکھنے، شراب پینے اور میزبان کے ہاتھوں سے جوتوں پر پالش کرانے کے خلاف خوب زہر اگلیں۔

نہا کر نکلا تو معلوم ہوا ابھی استراحت فرما رہے ہیں۔ شدت کی بھوک لگی تھی۔ انتظار کیے بغیر ناشتہ کرلیا۔ لیکن صدانی ٹھہر گئی۔ بار بار جاکر دیکھ آتی کہ ابھی بیدار ہوئے یا نہیں۔ کوئی نو بجے خوابگاہ سے صدائیں بلند ہونی شروع ہوئیں۔ ماما چائے لے گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد بڑبڑاتی ہوئی آئی اور کہنے لگی سرکار وہ صاحب تو چائے پھینک کر خدا معلوم کیا کیا بولنے لگے کہ کیسے بدتمیز ہیں تم لوگ! ارے فقط چائے لاؤ۔ بغیر دودھ کی! تم لوگوں سے ناک میں دم ہے، جو کام کرتے ہو الٹا اور کیا اور کیا! —— بغیر دودھ کی چائے مانگ رہے ہیں۔ ہونھ!

آغا نے چائے پھینک دی! خیر یہ بھی سہی! ہم غریب تو کمینوں کے ظلم و ستم برداشت کرنے ہی کو پیدا ہوئے ہیں۔ دوبارہ کالی چائے بھجوائی گئی۔ غٹ غٹ پی گئے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ داڑھی مونچھ مونڈ رہے ہیں، پھر اطلاع آئی کہ غسل کر رہے ہیں اور انگریزی گیت گا رہے ہیں، پھر پرچہ لگا بن سنور رہے ہیں، پھر رپورٹ آئی، ناشتہ کمرے میں مانگ رہے ہیں اور ہم سے معافی چاہتے ہیں۔

گیارہ بجے کے قریب برآمد ہوئے۔ قمیص اور پتلون زیب تن کئے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی پکار اٹھے "مارننگ شفاعت! ہلو صدانی! مزاج تو اچھے ہیں بریک فسٹ کر چکے؟ ..... ارے یار! تمہارا بٹلر بڑا بدتمیز ہے! پالش تک کرنا نہیں آیا کمبخت کو۔ ڈیم!" تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن میں نے کہا "ہاں بڑا کام چور ہے آغا! آنے تو دو اسے، کھڑے کھڑے موقوف نہ کردوں تو میرا نام پلٹ کر رکھ دینا۔"

فرمایا "اچھا پیانو نہیں ہے تمہارے ہاں؟ بس بس کاہے کو ہوگا؟ ہوتا تو دل بہل جاتا۔ خوب بجاتا ہوں اور گاتا بھی ہوں۔ اہاہا!"

حلیم! اب اس مردود سے بالکل بیزار ہوچکا تھا۔ اُس کو جلد رفع کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ مسجد سے واپس ہوتے ہوئے ڈاک خانہ گیا۔ نارائن سے مشورہ کرنے کے بعد "تار" کا فارم لے کر گھر روانہ ہوا۔

رات کے آٹھ بجے میں تیزی سے کمرے میں گیا۔ ڈانس میں جانے کے لیے تیار ہورہے تھے۔ میں نے کہا "تار آیا ہے" آپ نے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں کی، فرمایا "پڑھو" میں نے کھول کر پڑھا۔ "والد علیل ہیں۔ حالت نازک ہے۔ فوراً روانہ ہوجاؤ۔"

میں نے پریشانی ظاہر کرکے کہا "تمہارا جانا ضروری ہے آغا۔"
مُسکرا کر فرمایا۔ "بڈھا آخر مر رہا ہے! جانا ہی چاہیئے۔ اسٹیٹ کے جھگڑے پڑیں گے۔"
میں نے ہولڈ آل اور سامان وغیرہ جھٹ پٹ باندھ کر رکھ دیا۔ شراب کے شیشے بھی سوٹ کیس میں ٹھونس دیئے۔ صمدانی بے حد رنجیدہ تھی کہ آغا بھائی اتنے جلدی واپس جانے پر مجبور ہو گئے لیکن امید تھی کہ والد کو صحت ہونے کے بعد وہ پھر ضرور تشریف لائیں گے!

پونے نو کی گاڑی سے آغا سدھارے! ـــ گاڑی چلنے لگی تو (میں) نے پکار کر کہا "جاتے ہی والد کی خیریت سے مطلع کرنا ـــ خدا حافظ۔

دوسرے روز میں نے خاں صاحب کا پلنگ اور شاہ مرزا کا کھٹولہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ تپھری، کانٹے موڈی خانے والے صندوق میں بند کر دیئے۔

حلیم! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا، کیوں کہ مشرقی فہم و فراست مغربی وحشت و بربریت پر غالب آ گئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ایسی مسرت اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

والسلام، و لفکار شفاعت
(صمدانی) □□

پرویز یداللہ مہدی

چائے کی چاس

ھو الشافی فقط اِک چائے ہے کافی: چائے نوشی، صحت کے لیے مضر ہے یا مفید، فائدہ مند ہے یا نقصان دہ، اس پر جب جب ہم نے غور و خوض کیا حاصل جواب یہی آیا کہ چائے اگر مضرِ صحت نہیں ہے تو مفید بھی نہیں، فائدہ مند نہیں ہے تو نقصان دہ بھی نہیں۔ بفرضِ محال چائے میں اگر خدانخواستہ پوشیدہ امراض کی طرح کچھ مضر اثرات پوشیدہ ہوں جو ظاہر کی آنکھ سے دکھائی نہ دیتے ہوں تو ان پر صرف اطباؑ و حکماہی روشنی ڈال سکتے ہیں کہ کسی بھی نشہ میں مخفی منفی اثرات اور ان کے نقصانات کی تفصیل بیان کر کے نفع کمانا محض انہی حضرات کا پیشہ ہے بلکہ نقصان کے بطن سے نفع پیدا کرنے میں ان حضرات کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ ہماری اس بات سے آپ یقیناً اتفاق کریں گے بشرطیکہ آپ بھی ہماری طرح ڈاکٹروں کے مشورے کے نتیجے میں مورننگ واک عرف سیرِ صبح گاہی کے بادلِ ناخواستہ عادی ہو چکے ہیں کہ چائے کی ایک عدد گرما گرم پیالی صبح کی روکھی پھیکی سیر کو پھول والوں کی سیر میں بدل دیتی ہے۔ چنانچہ چائے کے اس عالمِ رنگ و بو میں دخل در معقولات فرمانے سے قبل جو صبح کی سیر کا مارا انگڑائیاں لیتا ہوا گھر سے نکلتا اور جمائیاں لیتا ہوا لوٹتا تھا اب نہار پیٹ چائے کی چسکیوں کے توسط سے تازہ دم ہو کر صبح کی سیر کو نکلتا ہے اور پھر مختلف پارکوں اور میدانوں کی خاک چھاننے کے بعد گھر واپس لوٹ کر چائے کی پیالی کو اس طرح مکرر ہونٹوں سے لگاتا ہے جیسے ایک شاعر، مکرر ارشاد کی فرمائش پر پھر اپنا شعر دہراتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں آدمی کی صحت بنے نہ بنے ہوا خوری سے پہلے چائے خوری اور ہوا خوری کے بعد چائے خوری، ہوا خوری کے لطف کو ضرور دوبالا کر دیتی ہے۔

ویسے چائے خوری کے لیے صبح صبح کچی نیند سے بیدار ہو کر "مورننگ واک" کی علت میں مبتلا ہونا ضروری نہیں، ہوا خوری کے بغیر بھی آدمی، چائے خوری سے کما حقہٗ لطف اندوز ہو سکتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد اس کی بہترین مثال ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ محض چائے خوری کی علت انہیں تمام عمر، منہ اندھیرے اٹھاتی رہی۔ اور وہ سبزہ زاروں، چمن زاروں، مرغزاروں آبشاروں وغیرہ میں بنجاروں کی طرح بھٹکنے کے بجائے گھر بیٹھے تصنیف و تالیف کے خشک ریگزاروں میں مضامین نو کے انبار لگاتے رہے۔ مولانا موصوف کی چائے نوشی اپنے وقت میں اگرچہ مسلمہ تھی لیکن دورِ حاضر کی نئی نسل پر اس کی سچائی کو ثابت کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ ہے مولانا کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ تاہم اس کے لیے موصوف کی تمام کی تمام قلمی کاوشوں کے مطالعے کی قطعی ضرورت نہیں ہماری طرح بس مولانا کی حرفِ آخر کا درجہ رکھنے والی آخری تصنیف غبارِ خاطر کا سرسری مطالعہ ہی کافی

ہے بلکہ پوری کی پوری غبارِ خاطر کا مطالعہ بھی ضروری نہیں وہی ایک خط نما مضمون پڑھ لیجیے جو مولانا نے چنبیلی زادی کی تعریف و توصیف میں تحریر فرمایا ہے، اس ایک خط سے آپ پہ یہ عقدہ پوری طرح کھل جائے گا کہ یاسمین سفید عرف "گوری چنبیلی" برانڈ چائے مولانا آزاد کی دل پسند چائے تھی، خدانخواستہ یہ مخصوص برانڈ کی چائے اگر مولانا کی کمزوری نہ ہوتی تو پھر اردو ادب کا دامن غبارِ خاطر جیسی بیش بہا معرکۃ الآرا تصنیف سے خالی ہوتا۔ پس اس ایک مثال سے یہ ثابت ہوا کہ چائے نے بڑے لوگوں سے بھی بڑے بڑے کام کروائے ہیں البتہ غبارِ خاطر چونکہ چائے کے فنجان لنڈھاتے ہوئے لکھی گئی ہے اس لیے اس کے مطالعے کے دوران اور مطالعے کے بعد قاری کے لیے بار بار بیدار ہونے والی چائے کی طلب پر قابو پانا ممکن نہیں رہتا۔

گھر کی چائے دال برابر: کہاوت مشہور ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے (ہمارے خیال سے یہ مرغی کے ساتھ زیادتی ہے مذکورہ محاورے میں بھی مرغی کا حوالہ بطور تفنن طبع آ گیا ہے)۔
گھر کی مرغی کی طرح گھر کی چائے بھی اپنی یکسانیت اور اکہرے ذائقہ کے سبب دال برابر ہی ہوتی ہے، تب ہی تو شائقینِ چائے کی اکثریت منہ کا مزا بدلنے کے لیے گھروں سے نکل کر مختلف ہوٹلوں اور چائے خانوں کا رُخ کرتی ہے۔ کیوں کہ جہاں تک ہوٹلوں کا تعلق ہے، وہاں کے پکوان بلاشبہ ایک دوسرے کا آموختہ، ہر ڈش دوسری ڈش کا چربہ ہوتی ہے یعنی ہوٹل کا مٹن مسالہ یا مٹن فرائی، پسندہ ہو یا بھونا سب کا ذائقہ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن چائے بلا مبالغہ ہمہ اقسام کی دستیاب ہوتی ہے۔ جیسے کالی چائے، سفید چائے، لال چائے، پیلی چائے، مٹ میلی چائے، ہلکی چائے، بھاری چائے، تلخ چائے، کڑک چائے۔ یہاں تک کہ خبط الحواس چائے بھی کسی کسی ہوٹل میں طلب کرنے پر سپلائی کی جاتی ہے۔ ان مروجہ ناموں کے علاوہ کہیں کہیں چائے کو مخصوص مقامی اصطلاحات کی روشنی میں عجیب و غریب عرفیتوں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے بچپن میں حیدرآباد کے بعض مخصوص چائے خانوں میں خاص قسم کی چائے کو برقع پوش اور کھڑا چمچہ کے لقب سے طلب کیا جاتا تھا۔ ان نادر الوجود اصطلاحات سے بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے برقع پوش چائے سے صرف پردہ دار خواتین اور کھڑا چمچہ چائے سے ہوا کے گھوڑے پر سوار کھڑے کھڑے چائے نوش فرمانے والے شائقین ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جب کہ ایسی بات نہیں ہے نہ تو برقع پوش چائے پینے کے لیے برقع پہن کر ہوٹل میں جانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ نہ کھڑا چمچہ چائے نوش فرمانے کے لیے کھڑے پیر کا روزہ رکھنا ضروری ہوا کرتا تھا اصل میں یہ خصوصی اصطلاحات چائے کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے وضع کی گئی تھیں یعنی جس چائے کے اوپر بالائی کی دبیز تہہ ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر جمی ہوئی کائی کی طرح چھائی ہوتی اسے چائے کے طلبگار پیار سے برقع پوش کے لقب سے پکارتے اور جس چائے میں چمچے دو چمچے شکر کی جگہ پورے کا پورا مرتبان انڈیل دیا جاتا اسے کھڑا چمچہ کی عرفیت سے پکارا جاتا اور ثبوت کے لیے پیالی میں چمچے کو کھڑی حالت میں چھوڑ دیا جاتا تو جو شکر کی دبیز تہہ میں کسی سنتری کی طرح تادیر اٹنشن پوزیشن ATTENTION POSITION میں کھڑا رہتا۔ بہرحال پسند اپنی اپنی اور خیال اپنا اپنا کے مصداق، ملائی کے شوقین برقع پوش چائے سے اور میٹھے کے رسیا کھڑا چمچہ چائے سے اپنے اپنے شوق کی تسکین کیا کرتے تھے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو چائے محض بالائی کی خاطر پی جائے اس ملائی اور جو چائے فقط منہ میٹھا کرنے کے لیے نوش کی جائے اسے چاشنی کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

فی زمانہ چونکہ چائے کو چاشنی بناکر پینے والوں کی تعداد کم اور چائے کو چائے ہی کی شکل میں پسند کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے فرسٹ گریڈ سے لیکر تھرڈ گریڈ تک کی ہوٹلوں میں جو چائے ہمہ وقت دستیاب ہوتی ہے وہ اپنی مروجہ شکل ہی میں ملتی ہے البتہ گاہکوں کی پسند اور مانگ کی مناسبت سے اس کا رنگ روپ بدلتا ہے اور مٹھاس و مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

بمبئی کی ہوٹلوں، چائے خانوں ریلوے اسٹیشنوں، فٹ پاتھوں پر لگے ٹھیلوں پر ہمہ وقت ہمہ اقسام کی چائے دستیاب ہوتی ہے تاہم پانچ طرح کی چائے کا چلن یہاں ذرا زیادہ ہے، کٹنگ، مانک، پانی کم، پانی اور سلیمانی!

جب کسی بمبئی والے کو کڑکی کے عالم میں اچانک وارد ہونے والے بن بلائے مہمان کی زبردستی تواضع کرنی پڑتی ہے تو وہ اپنی بند مٹھی کو لاکھ کی ثابت کرنے کے لیے کٹنگ کا سہارا لیتا ہے جو اصل میں فل چائے کا پاکٹ اڈیشن ہوتی ہے اس طرح آدھی چائے میں پورے آدمی کا نبٹارا ہوجاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو کٹنگ کی اختراع کاروباری مصلحتوں کے پیش نظر ہی کی گئی ہے کیوں کہ فل چائے منگواکر فریقین کی آنکھوں کے سامنے اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا دھندے کے اصول کے سراسر منافی ہے، اس سے فریقین کی نظر میں میزبان کی پوزیشن مشکوک ہوجاتی ہے اس لیے آرڈر کی مناسبت سے فل چائے کی کٹنگ ہوٹل ہی میں سے کرواکے منگوائی جاتی ہے، اس سے مہمان نوازی کا بھرم بھی قائم رہتا ہے اور میزبان کی پوزیشن بھی بنی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کٹنگ سے جہاں میزبان کی جیب پر زائد آنچ نہیں آتی وہیں مہمان کی حیثیت اور وقعت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔

جو چائے، چائے نوش کے مزاج اور مطلب کے موافق ہوتی ہے اور بغیر کسی کاٹ کسر کے اپنی پوری مقدار میں دست بہ دست، دست طلب میں پہونچتی ہے، عرف عام میں مانک چائے کہلاتی ہے۔ جو لوگ دوسروں کو تو خوش خوش اپنے غم میں برابر کا شریک کرتے ہیں لیکن جہاں تک چائے کا معاملہ ہے دوسروں کا اپنی پیالی میں شریک ہونا قطعی برداشت نہیں کرتے وہ جب بھی چائے پیتے ہیں چاہے اپنی گانٹھ سے پیسہ خرچ کرکے پیئں یا دوسروں کے صرفے خرچے پر ہمیشہ مانک چائے ہی پیتے ہیں اس قبیل کے چائے نوشوں کا عام خیال یہ ہے کہ کٹنگ چائے پینے سے آدمی میں خواہ مخواہ احساس کمتری کا جذبہ جاگتا ہے جب کہ مانک چائے احساس برتری کے جذبے کو فروغ دیتا ہے!

جن چائے نوشوں کو چائے کی بہت زیادہ چاہ ہوتی ہے ان میں اور "چین اسموکرس" (CHAIN.SMOKERS) میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے کم از کم اس اعتبار سے کہ جس طرح چین اسموکرس ہر ختم ہوتی ہوئی سگریٹ سے نئی سگریٹ سلگاتے ہیں اسی طرح اس قبیل کے چائے نوش حضرات ہر ختم ہوتی ہوئی پیالی سے نئی پیالی کو کھنکاتے ہیں اور ہر آن پیالہ بدست نظر آتے ہیں، ان کی طبیعت نہ تو کٹنگ سے بہلتی ہے نہ مانک چائے سے ان کی سیری ہوتی ہے الٹا بدہضمی ہوجاتی ہے اس لیے ان کی مخصوص طلب کو دیکھتے ہوئے یار لوگوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد پانی کم چائے کی ایجاد و اختراع کی۔ بعض اصحاب کو پانی کم چائے اس لیے بھی مرغوب ہوتی ہے کہ اس کا عرصۂ حیات اس قدر قلیل ہوتا ہے کہ ہر پیالی اگلی پیالی کے لیے برقی ٹرین کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم خالی کردیتی ہے اور یوں پانی کم چائے کی چکیول "نان اسٹاپ" (NON.STOP) سلسلہ صبح سے رات تک "چکی در چکی" چلتا رہتا ہے! جیساکہ نام سے ظاہر ہے [illegible] نتیجتاً مقدار میں یہ مانک چائے بلکہ کٹنگ سے بھی کم ہوتی ہے لیکن اس کے

باوجود نارمل سائز کی پیالی میں پیش کی جاتی ہے۔ ہماری ناقص رائے میں اسے بجائے پیالیوں کے سائنسی تجربوں میں کام آنے والی کانچ کی نلکیوں میں پیش کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ پانی کم چائے کی سطح پیالی کی سطح مرتفع سے بالعموم اس قدر نیچے ہوتی ہے کہ اسے ہونٹوں سے پینے کی جگہ دوائی کے ڈراپس DROPS کی طرح براہِ راست حلق میں ٹپکانا پڑتا ہے۔ پانی کم چائے کی قلیل مقدار چونکہ بقدر اشک بلبل کے مماثل ہوتی ہے، اس لیے جن شائقین چائے کی پیاس، محض ایک عدد پانی کم چائے کی پیالی سے نہیں بجھ پاتی وہ ڈبل پانی کم کا سہارا لیتے ہیں!

آخر میں اتنا اور بتادیں کہ بمبئی میں پانی کم کی اصطلاح صرف چائے کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ اس مخصوص مخلوق کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے جس کا شمار نہ مردانے میں ہوتا ہے نہ زنانے میں تاہم پانی کم چائے پینے کے لیے چائے کے طلبگار کا ذاتی طور پر پانی کم ہونا ضروری نہیں!

لمبا پانی سلیمانی : لمبا پانی اور سلیمانی پر بظاہر دم کیے ہوئے پانی اور نقش سلیمانی کا گمان ہوتا ہے لیکن یقین مانیے ہر دو کا تعلق جھاڑ پھونک اور عملیات سے ہرگز نہیں ہے۔ اگرچہ ان کا شمار دم دی ہوئی اشیاء میں ضرور ہوتا ہے اس کے باوجود دافعِ بلیات قسم کے ٹونے ٹوٹکوں سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے، وہ اس لیے کہ انہیں منہ زبانی پھونکوں کے سہارے دم نہیں دیا جاتا بلکہ سچ مچ کی آنچ پر دم دیا جاتا ہے، ظاہر ہے حرارت کے بغیر چائے میں نہ رنگ آتا ہے نہ حلاوت، اور لمبا پانی وہ سلیمانی کا تعلق بھی چائے ہی کے قبیلے سے ہے!

بمبئی کی زبان میں لمبا پانی اُس چائے کو نہیں کہتے جسے پینے والے آدمی کا قد لمبا ہوتا ہو یا اسے پینے کے لیے آدمی کا پہلے ہی سے لمبا ہونا ضروری ہو یا پھر اسے نوش فرمانے کے لیے آدمی کے کسی لمبے سفر سے آنے یا جانے کی شرط ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ لمبا پانی دراصل وہ مجبور چائے نوش طلب کرتے ہیں جنہیں ڈاکٹر والے نے پانی اُبال کر پینے کی سختی سے تاکید کر رکھی ہو اور جنہیں بدقسمتی سے گھر میں یہ سہولت بلکہ گھر ہی میسر نہ ہو، ایسے مجبور ولاچار لوگ لمبا پانی کو گرم پانی کا نعم البدل سمجھ کر اسی پر گزارہ کرتے ہیں کہ اس میں یوں بھی چائے کم اور ابلا ہوا پانی زیادہ ہوتا ہے ایک عدد لمبا پانی چائے کے سہارے پورا ایک دن بہ آسانی کٹ جاتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ لمبا پانی چائے اس قدر طویل دیر پا ہوتی ہے کہ آدمی دن بھر بیٹھا چسکیاں لیتا رہے۔ چائے تو چسکیوں اور چٹکیوں میں ختم ہو جاتی ہے اس کے مضر اثرات کے زائل ہونے میں البتہ پورا دن لگ جاتا ہے۔!

جن چائے نوشوں کو دودھ سے الرجی ہوتی ہے یا پھر سرے سے جن کے دودھ کے دانت ہی نہیں ہوتے وہ صرف سلیمانی چائے پیتے ہیں کہ اس مخصوص چائے میں ہر قسم کی مروجہ کثافتیں تو کوٹ کوٹ کر شامل کی جاتی ہیں صرف دودھ کی اضافت نہیں ہوتی یعنی چائے کے نام پر خالص ڈی کاکشن کے ساتھ لیمو کی چند قاشیں الگ سے مہیا کی جاتی ہیں جنہیں چائے نوش حضرات کھٹنس کے عقن کا نعم البدل سمجھ کر پہلے ان کا رس دوہتے ہیں پھر جب یہ رس ڈکاکشن میں اچھی طرح گھل مل جاتا ہے تب اس تلخ جوشاندے کو ہوا لشافی یہ چائے ہے نہ کافی کا نعرہ لگاتے ہوئے غٹاغٹ چڑھا جاتے ہیں۔ سلیمانی کے رسیا چونکہ خود دندان شکن ہوتے ہیں اسی لیے دودھ کی چائے پینے والے ہر شخص کو دودھ پیتا بچہ سمجھتے ہیں!

بمبئی میں بالخصوص ناگپاڑے کی حدود میں سلیمانی کو بڑے چاؤ سے استنبولی بھی کہا جاتا ہے اس کی

وجہ تسمیہ ایک تو یہ ہے کہ اس علاقہ میں استنبول کے نام ہی کی ایک ہوٹل موجود ہے دوسرے بیشتر اہلیان ناگپاڑہ سلیمانی کی ایجاد و اختراع کا سہرا اہل استنبول کے سر باندھتے ہیں البتہ ملک ہندوستان بالخصوص شہر بمبئی میں اس کی شان نزول کے تعلق سے ہمارے ایک شناسا ایک روز سلیمانی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں قسم کھا کر انکشاف فرمایا۔ "خدا کی قسم اس وقت میرے سامنے مسجد کی جالی اور ہاتھ میں سلیمانی کی پیالی ہے اسی لیے جھوٹ نہیں بولوں گا ایک زمانہ تھا جب لوگ سلیمانی عرف استنبولی کی طلب میں کثیر زر مبادلہ عرف فارن ایکسچینج صرف کرکے استنبول کا سفر کیا کرتے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ایک حقیر چائے کا پیالہ ملکی معیشت کا دوالہ پٹوا دیتا، مقامی ہوٹل مالکوں نے ازراہ وطن پرستی و دیش بھکتی، استنبولی کا نسخہ اسمگل کرکے لے آئے اور اسے اپنے مینو کارڈ میں سلیمانی کی نئی عرفیت کے ساتھ شامل کرلیا، نتیجتاً اب یہ چائے اردو کے اکثر شعراء حضرات کی طرح بھنڈی بازار، ناگپاڑہ اور مغل مسجد کے زیر سایہ خرابات کی صورت آباد چائے خانوں میں ہر وقت دستیاب ہوتی ہے چنانچہ جب بھی میرا دل اچھی سلیمانی چائے اور بری شاعری سننے کو کرتا ہے میں ان مخصوص ہوٹلوں میں چلا آتا ہوں۔

موصوف کی زبانی استنبولی عرف سلیمانی کی انوکھی کہانی سن کر اس روز ہمیں اس چائے کی کم از کم ایک خوبی کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ اس مخصوص چائے کے پینے سے آدمی کی بھوک تو بند ہوجاتی ہے لیکن سوچ و فکر کی بے شمار کھڑکیاں کھل جاتی ہیں بلکہ دروازے بھی کھل جاتے ہیں جن کے کھلتے ہی اچھا خاصا آدمی یا تو فلسفی کی طرح پنجے جھاڑ کر دنیا کی بے ثباتی پر فلسفہ جھاڑنے لگتا ہے یا دامن جھاڑ کر جدھر سینگ سمائیں اُدھر نکال جاتا ہے۔ ☐☐

انور مسعود (راولپنڈی)

پدر تمام کند

بھینس رکھنے کا تکلف ہم سے ہو سکتا نہیں
ہم نے سوکھے دودھ کا ڈبا جو ہے رکھا ہوا
گھر میں رکھیں غیر محرم کو ملازم کس لیے
کام کرنے کے لیے ابا جو ہے رکھا ہوا

برصغیر کی سیاست

افسوس کہ کچھ اس کے سوا ہم نہیں سمجھے
دیکھے ہیں علاقے کی سیاست کے جو تیور
جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
والد کی جگہ لینے کو آجاتی ہے دُختر

ترکی بہ ترکی

اپنی زوجہ سے کہا اک مولوی نے نیک بخت
تیری تربت پر لکھیں تحریر کس مفہوم کی
اہلیہ بولی عبارت سب سے موزوں ہے یہی
دفن ہے بیوہ یہاں پر مولوی مرحوم کی

گرانی کی گونج

تیور دکان دار کے شعلے سے کم نہ تھے
لہجے میں گونجتی تھی گرانی غرور کی
گاہک سے کہہ رہا تھا ذرا آئینہ تو دیکھ
کس مُنہ سے دال مانگ رہا ہے مسور کی

جواب باصواب

اُستاد نے شاگرد سے اِک روز یہ پوچھا
ہے جمعہ مُبارک کی فضیلت کا تجھے علم
کہنے لگا شاگرد کہ معلوم ہے مجھ کو
ریلیز اسی روز تو ہوتی ہے نئی فلم

کہتا ہوں سچ ...

یہی تو ہے بڑی خوبی ہماری
کہیں اس مُلک میں رشوت نہیں ہے
اور اس سے بڑھ کے ہے اک اور خوبی
کسی کو جھوٹ کی عادت نہیں ہے

مضروب

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے تھی
ہر ضربِ کربناک پہ میں تلملا اٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بِل اتنے مِل گئے ہیں کہ مَیں بلبلا اٹھا

الحذر

ملتی نہیں نجات پھر اس سے تمام عمر
اچھی نہیں یہ چیز دہن میں دھنسی ہوئی
انگلش کی چُوسنی سے ضروری ہے اجتناب
"چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

مصطفیٰ علی بیگ
(حیدرآباد)

سڑک جو بن گئی

مجھے سڑکوں سے عشق تھا۔ کئی کئی گھنٹے لانبی لانبی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہتا۔ چاندنی راتوں میں جب یہ سڑکیں چمکتیں تو ان سڑکوں پر میرا عشق جنون کی حدوں کو چھو جاتا۔ بڑی منت مرادوں کے بعد ہماری گلی میں ایک سمنٹ کی سڑک بنی تھی محلے کے نوجوان جس پر اسکیٹنگ کرنے کے خواب دیکھا کرتے۔ لڑکیاں جس کو سوئیٹ کہتیں اور بوڑھے جس پر پُراعتماد گھوما کرتے۔ ایک سال بھی نہیں ہوا ہے۔ مجھے اس سڑک سے نفرت ہوگئی ہے۔ جی ہاں نفرت۔ شدید قسم کی نفرت۔ میں خدا سے روز دعا کرتا ہوں کہ اے خدا زمین کی کشش ثقل چھین لے تاکہ ہم ایسی سڑکوں سے نجات پاکر ہلکے پھلکے اُڑتے پھریں۔ پتہ نہیں دعا کب قبول ہوگی۔ کب چھٹکارا ملے گا اس سڑک سے جو محلے کے ماتھے پر کلنک بنی ہوئی ہے۔ جا بجا سے تڑخی ہوئی جس میں ہزاروں گڑھے پڑے ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا۔ اس سڑک کو پار کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے وہ یہ کہ اس پر ایک پل بنا دیا جائے۔ میں نے اب اس سڑک پر چلنا چھوڑ دیا ہے۔ سڑک کے متصل مٹی کا جو کچا راستہ ہے اس پر چلتا ہوا گھر آتا ہوں چاہے غلاظت اور کیچڑ سے جوتے اور پائینچے کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں لیکن اس طرح میں ہر حادثے سے محفوظ رہتا ہوں۔ جو آئے دن اس سڑک پر ہوتے رہتے ہیں۔ ڈرینج کا پائپ ڈالنے کے لیے کئی یا چار نالیاں سڑک کے آر پار کھود دی گئیں۔ پائپ کئی مہینے سڑک کے سینے پر مونگ دلتے رہے پھر جب دفن ہوئے تو آفت آگئی یعنی سمنٹ کے کھودے ہوئے حصے کو مضبوط بنایا نہیں گیا۔ محلے کا حسین ترین نوجوان جو فلمی دنیا میں ہمارے محلے کی نمائندگی کرنے والا تھا اس نالی سے ٹھوکر کھا کر سامنے کے سارے دانت تڑوا لیا۔ بیچارہ اب گھر سے باہر بھی نہیں نکلتا۔ سڑک کو سوئیٹ سوئیٹ کہنے والی وہ لڑکی پرسوں ہی اپنی تنگ سکرٹ کی وجہ سے اس نالی کو پار نہ کر سکی اور گھنٹوں شش و پنج میں گرفتار رہی۔ بالآخر محلے کے نوجوانوں نے نالی کے ایک حصے کو مٹی سے پاٹ کر اس لڑکی کو نالی کی

مہ میں آتی رہیں ۔ میں تو پہلے ہی سے کہتی تھی کہ سڑکوں پر اتنا اعتبار اچھا نہیں اپنی لکڑی ساتھ رکھا کرو۔ لن بلدیہ کو صرف اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ پیشتر ہی صاف صاف کہہ چکے تھے کہ وہ ہماری اچھائی یا بھلائی کے یے کچھ نہیں کرسکتے کیونکہ ان کی دانست میں ہماری گلی سے اُن کو پرانے نام و دوٹ ملے تھے۔

کنٹراکٹر سے جاکر ملے جس نے یہ سڑک بنائی تھی اس نے ہمیں اور سڑک کو پہچاننے سے اف انکار کردیا ۔ پھر کئی ایک سفارشوں کے بعد سڑک کی مرمت کا کام شروع ہوا۔ محلے والوں کے چہرے مسرت سے کھل اُٹھے ۔ وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے تیار تھے تاکہ روز روز کی ناگہانی آفتوں سے جات ملے ۔ سڑک کا ایک حصہ بہت خراب ہوجانے کی وجہ سے اکھاڑ دیا گیا مختلف گڑھوں کو مزید کھود یا ۔ تاکہ اس پر اچھی طرح سمنٹ کی استرکاری کی جاسکے ۔ سارا محلہ یہ کارروائی دیکھتا اور مطمئن ہوتا مل ن روز تک کام زور و شور سے چلتا رہا اور پھر ایک دن سنّاٹا سا ہوگیا ـــ۔۔۔ پتہ چلا کہ اس سال کا بٹ ختم ہوگیا ہے ۔ اب آئندہ سال بجٹ کی منظوری پر ہی کام شروع ہوگا ۔!

اب وہی بھیانک سنّاٹا طاری ہے ۔

وقفہ وقفہ سے دھماکوں اور چیخوں کی آواز آتی ہے ۔ کسی کی سیکل ٹوٹتی ہے تو کسی کی کمر ٹوٹتی ہے یا کسی ی رکشا کے پہیے بلینڈ ہوتے ہیں ۔ وہ بڑا گڑھا جس پر کا سلیب SLAB اکھاڑا گیا تھا عمروعیار ی زنبیل ہوگیا تھا ۔ سیکل سے لیکر لاری تک کے لیے وہ منہ کھولے تیار رہتا ہے اور جب بارش کا پانی ڑھے کی سطح کو سڑک کے برابر کر دیتا ہے تو احتیاط سے اور سنبھل کر چلنے والا بھی سیٹی بجاتا ہوا اطمینان سے اس گڑھے میں گرتا ہے ۔

ہمارے محلے کی سیکل ریپرنگ شاپ خوب چل نکلی ہے قریبی دواخانے میں بھی کافی مریض آرہے ہیں ـــ۔ لیکن لوگ اب ہماری گلی میں آنے سے گھبراتے ہیں ۔ رکشا والے کرایہ زیادہ مانگتے ہیں اور گلی کے نکڑ پر ہی آگے بڑھنے سے انکار کردیتے ہیں ۔ راتوں کو کوئی گھر سے نہیں نکلتا اور اگر نکلتا ہے تو ۔۔۔۔ میں تو یہی سوچتا ہوں کہ خدا بعض بندوں کو ان کے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی دے دیتا ہے تاکہ وہ اطمینان سے جنت میں داخل ہوسکیں ۔ ہر صبح یہی سوچ ایک نئی تازگی اور ایک نئی ہمت بخشتی ہے در میں ہر قسم کے حادثے کا مقابلہ کرنے تیار رہتا ہوں ۔!

م۔ش۔ غوری
(جدہ)

شیخ چاند

شیخ چاند ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے پیدائشی دوست ہیں شیخ چاند کی وجہ تسمیہ کافی دلچسپ ہے۔ شیخ چاند کے والد کا نام شیخ بدرالدین ہے۔ والدہ کا مہتاب بیگم۔ بڑی باجی کا قمر جہاں اور چھوٹی باجی کا نام ماہ منیر ہے یعنی ایں خانہ ہمہ مہتاب است۔ دو لڑکیوں کے بعد جب شیخ بدرالدین صاحب کے ہاں اولاد نرینہ کی ولادت باسعادت ہوئی تو لوگوں نے یوں بات پھیلائی کہ اس گھر کو پہلے ہی چار چاند لگے تھے اب پانچواں بھی چڑھ آیا"۔ یہ بات نہ صرف قبول خاص و عام ہوئی بلکہ زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھتے ہوئے اہل شیخ کے دل میں بھی گھر کر گئی۔ یوں نومولود شیخ چاند سے موسوم ہوا۔ بڑے شیخ صاحب کے کچھ بے تکلف دوستوں نے باپ بیٹے کو حسب مراتب "فل مون" اور "ہاف مون" کے خطاب سے نواز رکھا ہے تو محلے کے چند منچلی لڑکیوں نے انھیں "ٹوٹے کا چاند" مشہور کر رکھا ہے۔

یہ بات یقینی طور پر کوئی نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں چھوٹا کون ہے۔ شیخ چاند کی عمر حسب ضرورت چاند کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اُن کی والدہ کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے چھوٹے ہیں اور میری والدہ کا کہنا ہے کہ میں ان سے چھوٹا ہوں۔ اس انڈہ پہلے یا مرغی کے مخمصے کو یہیں رہنے دیجیے کیوں کہ ہماری پریشانی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ وقت بے وقت موقع بے موقع دن دھاڑے ہمارے گھر پر حملہ کرنا۔ رات کے کسی پہر شب خون مارنا اُن کی عادت بن چکی ہے۔ بچے چاند چاچا کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ بیگم اُن کی آمد پر ناک بھوں چڑھاتیں اور ہاتھ پیر جھٹک کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتیں۔ ہم بے بس اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بارہا سمجھایا کہ شریفوں کے آنے جانے کے کچھ اوقات و آداب ہوتے ہیں لیکن سب بے سود۔ چکنے اتنے کہ اچار کا گھڑا بھی مات کھا جائے۔ کسی بات کا کوئی اثر نہیں لیتے۔ ایک کان سے سُننا دوسرے سے اڑا دینا آپ کے لیے ایک محاورہ ہو گا لیکن یہ بات اُن پر صادق آتی ہے

اُن کا آنا جانا، دھمکنا دھمکانا سب کچھ گوارا مگر اس کا ہم کیا علاج کریں کہ وہ خود کو سقراط و بقراط سمجھتے ہیں ہر مسئلہ کا حل اور ہر مرض کا علاج منٹوں سیکنڈوں میں پیش کر دیں۔ ہر بات میں دخل دینا، بات بات پر بحث کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا اُن کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ دنیا کا ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر موصوف کامل دسترس نہ رکھتے ہوں۔ اردو زبان و ادب پر تو آپ کی خاص نظر عنایت ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف کا

اپنے آپ کو استاد کامل سمجھتے ہیں۔ عام گفتگو عمومی انداز میں کرتے ہیں لیکن اگر بات زبان و بیان پر ہو تو آپ کے منہ سے روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتوں کے موتی برسنے لگتے ہیں اور ذکر شعر و شاعری کا ہو تو اشعار کے دریا بہا دیں۔

کل ہی کی بات ہے بعد از تقریباً ۸ بجے ہوں گے۔ بیگم بچوں کی دھاچوکڑی سے تنگ آئی بیٹھی تھیں۔ ایک دو کی پیٹھ بھی سہلا چکی تھیں۔ تیور انتہائی خطرناک تھے باقی بچوں کے ساتھ ہم بھی جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتے ڈرائیننگ روم کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے تھے کہ کہیں اس کے بعد ہماری کوتاہیوں اور بچوں کی طرف سے لاپرواہیوں کے دفتر نہ کھل جائیں۔ ہماری بیگم کے جلال کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے کبھی کوئی بے تکلف سہیلی اُن سے پوچھ بیٹھتی کہ تمہاری چنگیز خانی پر تمہارے شوہر کچھ نہیں کہتے ؟ تو وہ مسکرا کر مجاز کے سے انداز میں جواب دیتیں "لوگوں کی بیویاں سعادت مند ہوتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے میرے شوہر سعادت مند ہیں"۔

ایسے خطرناک لمحات میں جب کہ لمحہ بہ لمحہ حرب و ضرب کے اندیشے بڑھ رہے تھے اچانک ہی شیخ چاند آموجود ہوئے حسب عادت انھوں نے اپنی آمد کا اعلان دروازہ پیٹ کر اور چائے کا مطالبہ گلا پھاڑ کر کیا جو کہ بیگم کو ہمیشہ سے ناپسندیدہ رہا ہے۔ اُن کی اس حرکت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

چاند بھائی ! چائے ختم ہوگئی۔ یہ تو بازار جاتے نہیں رات کا وقت ہے۔ بچوں کو کہاں بازار بھیجوں۔ صبح ہوگی تو چائے آئے گی۔ اب آپ صبح تک تو انتظار کرنے سے رہے"۔ لہجہ نیم چڑھے کریلے سے بھی کڑوا اور انداز کاٹ کھانے والا تھا۔

ہم ابھی تک اپنے دفاعی مورچے میں دبکے ہوئے تھے احتیاط کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ جب تک حالات امن اور صلح کا رخ نہ اختیار کرلیں ہمیں اپنا محاذ نہیں چھوڑنا چاہیے نہ جانے کس وقت حالات پلٹا کھائیں شیخ چاند کی آمد سے جنگ بندی کی امید کم ہوگئی بیگم کی بمباری اور شیخ چاند کی چاندماری کے اندیشے بڑھ گئے تھے۔

بیگم کی کسی بات کا نہ اس سے پہلے کبھی اُن پر اثر ہوا تھا نہ اب ہوا۔ اُن کی بات سن کر پہلے تو وہ مسکرائے پھر جیب سے چار عدد چائے کی تھیلیاں نکال کر بیگم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔

"لیجئے دو ابھی کام میں لائیے اور دو صبح کے لیے اٹھا رکھیے"! بیگم ہکا بکا کبھی شیخ چاند کو تو کبھی اُن کے ہاتھ میں جھولتی چائے کی تھیلیوں کو دیکھنے لگیں۔

ہم اپنے دفاعی مورچے میں دبکے اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ رہے تھے تاکہ بے اختیار نکلنے والے قہقہے کا راستہ روک سکیں۔

جب آپ کے پاس چائے موجود ہے تو پھر گھر سے پی کر کیوں نہیں آئے ؟ شرمندگی اور جھنجھلاہٹ کے باعث جب اُن سے کچھ نہ بن پڑا تو ایک عام سی بات کہہ ڈالی۔

"میں کھانا اپنے گھر کا اور چائے دوسرے کے گھر کی پسند ہے" وہ یہ بات ایک جھونک میں کہہ تو گئے پھر فوراً ہی سنبھالا لیتے ہوئے کہنے لگے۔

بات دراصل یہ ہے بھابی کہ آپ کے ہاتھ کی بنی چائے اتنی عمدہ اور لذیذ ہوتی ہے کہ بار بار پینے کو جی چاہتا ہے ۔ اللہ بخشے نانا مرحوم کہا کرتے تھے "میاں ! چائے پینے کا لطف تب ہی آتا ہے جب چائے لب ریز ہو ، لب دوز ہو اور لب سوز ہو ۔ اور یہ تینوں خوبیاں آپ کی چائے میں بخوبی پائی جاتی ہیں ۔

اس چکنے چپڑے مکھن میں تھڑے جواب کو سن کر ہم تصور ہی تصور میں بیگم کو آسمان غضب کی بلندیوں سے اتر کر بحر ستایش کی اتھاہ گہرائیوں میں تیرتا دیکھ رہے تھے ۔

وہ اپنی بات کو یوں جاری رکھے ہوئے تھے " بخدا اگر آپ کے ہاتھ کی بنی چائے کا مزہ اُردو ادب کے شعرائے متقدین و متاخرین نے چکھا ہوتا تو یقین کیجئے اُن کی شاعری سے چائے کا رنگ جھلکنے لگتا ۔ ولی دکھنی چائے کے مضمون پر شعر کہتے تو یوں کہتے ؛

اے ولی دردِ سر بھی دور رہے
گر ملے چائے ان کے ہاتھوں سے

میر تقی میر کہتے تو یوں کہتے ۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک چائے پی کر سو گیا ہے

چچا غالب کہتے تو یوں کہتے !

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جُز مرگ علاج
چائے ہر رنگ میں چلتی ہے سحر ہونے تک

مجاز کہتے تو یوں کہتے ۔

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ مجھ کو چھوڑ دے
چائے کا یہ وقت ہے کچھ چائے پینے دے مجھے

اور علامہ اقبال نے تو ساقی نامہ کے بجائے چائے نامہ لکھا ہوتا ۔

وہ چائے جس سے روشن ضمیرِ حیات　　　وہ چائے جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ چائے جس میں ہے سوز و سازِ ازل　　　وہ چائے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ ذرا اس چائے سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس سے پہلے کہ شعرائے کرام کی فہرست طویل ہو کر ایک عظیم الشان مشاعرے کی شکل اختیار کر لے ہم اپنی جگہ سے نکل آئے ۔ شیخ کو بازو سے پکڑا اور ڈرائینگ روم کی جانب کھینچتے چلے گئے اور بیگم اپنی تعریف میں سر چائے کی تھیلیوں کو دائیں بائیں ہلاتی باورچی خانے کی جانب چلی گئیں ۔

اسرار جامعی
(دہلی)

تخلیق اور تنقید

اک روز کہا میں نے مرے نقادِ زماں سے
تنقید تو تم کرتے ہو، تخلیق بھی کرتے!
وہ آئے قریب اور مرے کان میں بولے
تخلیق میں کرتا نہیں تنقید کے ڈر سے

ٹی۔ین۔ راز
(ہریانہ)

چھیڑ غالبؔ سے

پٹ گئے تھے کل یوں ہی بیوی سے گستاخانہ ہم
کس کو دکھلاتے بھلا یہ ہمتِ مردانہ ہم
رات اپنے گھر سے باہر دے رہے تھے گالیاں
شان سے دکھلا رہے تھے جراتِ رندانہ ہم
ہے یہ اپنے حال میں آدھی صدی سے دیکھ لو
اپنے دوڑ سے بھلے ہوں کتنے ہی بیگانہ ہم
خواب میں میں بڑبڑایا تھا کہ بیوی جل گئی
وہ اگر ہے شمع خانہ اُس کے ہیں پروانہ ہم
مسکراہٹ کی غریبی صورتوں سے ہے عیاں
قہقہہ ہے بھوک دنیا کی تو آب و دانہ ہم
رازؔ سنجیدہ زمینوں میں اُگے ہیں قہقہے
حضرتِ غالبؔ کو جا کے دیں گے یہ نذرانہ ہم

محمود شریف محمودؔ
(حیدرآباد)

شادی کے لیے

لڑکے کی شرطیں

گھر ہو رہنے کے لیے اور گھوڑا جوڑا چاہیئے
پھر سواری کے لئے بلٹ یا ہنڈا چاہیئے
میں ہوں کالا پر مجھے کالی نہیں بھاتی میاں
گوری بیوی چاہیئے اور قد بھی لانبا چاہیئے
میں تو چوتھی پاس ہوں بیوی مگر بی۔اے ملے
تھوڑی تھوڑی مجھ کو وہ انگلش سکھایا چاہیئے

لڑکی کا جواب

میں تری شرطوں پہ پوری تو اترتی ہوں مگر
شادی کر کے تجھ کو میرے گھر میں رہنا چاہیئے
ماں کو باوا کو بہن کو اُن کے گھر میں چھوڑ دے
میرے گھر میں مجھ کو شوہر ہی اکیلا چاہیئے
میرے نوکر گھر کے سارے کام کر دیں گے مگر
صبح اُٹھ کر تجھ کو بس کھانا پکانا چاہیئے
جو کہوں مرضی مری، جو کچھ کروں مرضی مری
تجھ کو ٹکٹک دیکھنا خاموش رہنا چاہیئے
میری شرطیں گر تجھے منظور ہیں تو پھر مجھے
بینڈ باجا چاہیئے، قاضی کا خطبہ چاہیئے

..★..

ڈاکٹر بانو سرتاج
(چندرا پور)

(ڈرامہ)

مجھے شکایت ہے

(پردہ اُٹھتا ہے۔ پورا اسٹیج اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ روشنی کا دائرہ حرکت کرتا ہوا راوی پر ٹھہر جاتا ہے)۔

راوی: محترم ناظرین! مجھے شکایت ہے... (توقف کرکے) جی ہاں! مجھے ہی نہیں... ہر بیوی کو شکایت ہے۔ اپنے اپنے شوہروں سے۔ ان شکایتوں کو ہم آج ایک خاص عدالت کے ذریعہ آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ اس عدالت میں فریاد کرنے والی خواتین کے نام اس طرح ہیں... ارے جانے دیجئے... چھوڑیئے بھی۔ نام میں کیا رکھا ہے؟ اس عدالت میں حصہ لے رہی ہیں بہت سی بیویاں... اور آپ (حاضرین کی طرف اشارہ کرکے) آپ... اور جی ہاں آپ بھی... اور وہ بھی جو آپ کے دائیں بائیں، پیچھے اور اس کونے میں بیٹھے ہیں۔ (راوی اسٹیج کے پیچھے چلی جاتی ہے... اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے۔ عدالت کا کمرہ نظر آتا ہے۔ درمیان میں جج صاحب کی کرسی ہے۔ ٹیبل پر ٹائپ رائٹر رکھا ہے ایک خاتون کلرک بیٹھی ٹائپ کر رہی ہے۔ جج کی کرسی کے پیچھے دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر ہے۔ بائیں طرف عدالت کا کٹہرہ ہے)۔

(خاتون چپراسی کرسی ٹیبل جھٹک رہی ہے۔ ایک مرتبہ رک کر جج کے چیمبر میں جاتا ہے پھر لوٹ کر ٹیبل پر رکھی گھنٹی بجاتی ہے کلرک کھڑی ہو جاتی ہے۔ خاتون جج کا داخلہ۔ کرسی پر بیٹھتی ہے کلرک بھی بیٹھتی ہے۔)

چپراسن: وکیل شریمتی قاضی صاحبہ... (دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد وکیل کا داخلہ)

وکیل: (جج سے) یور آنر۔ اگر اجازت ہو تو میں کورٹ نمبر تین کے جس کیس میں مصروف تھی اسے پہلے نپٹا لوں۔

جج:- جی نہیں یہاں کا کام بھی اتنا ہی اہم ہے۔ آج بہت سے مقدمات کی سماعت ہونی ہے۔ کارروائی شروع کی جائے۔ فریادی نمبر ایک کو بلایا جائے۔

چپراسن:- فریادی شریمتی نیلو حاضر ہوں...

(شریمتی نیلو آتی ہیں اور وکیل صاحبہ کے ہاتھوں میں ایک پرچہ تھما کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں)۔

وکیل:۔ یور آنر مسز نیلو کی شکایت ان کے شوہر کے خلاف ہے۔

جج:۔ مسز نیلو کے شوہر کو حاضر کیا جائے۔

چپراسن:۔ شری سُریش حاضر ہوں...

(سُریش بھلّہ آ کر کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں)

وکیل:۔ قسم کھائیے کہ آپ سچ کہیں گے۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہیں گے۔

سُریش بھلّہ:۔ میں آج تک سچ ہی کہتا رہا ہوں اور مستقبل میں

بھی سچ کہوں گا۔

وکیل :۔ آپ کی بیوی شریمتی نیلو کی شکایت ہے کہ آپ ہمیشہ انھیں اپنی شخصیت کے گرد گھمانا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ جب بھی گھر پہنچیں وہ دروازے میں کھڑی ہو کر آپ کا استقبال کریں۔ چھٹی کے روز تو آپ چاہتے ہیں کہ وہ پورا وقت آپ کے آگے پیچھے گھومتی رہیں یہ کہاں تک مناسب ہے شریمان! آج کے اس دور میں جب عورت مساوی حقوق مانگ رہی ہے ...

سُریش بھلّہ :۔ (قطع کلام کرکے) ایک منٹ پلیز! سب سے پہلے تو میں عرض کروں گا کہ مجھے بھی ایک وکیل دیا جائے شری قاضی یہاں موجود ہیں۔ میں انھیں اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتا ہوں۔

جج :۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ خواتین کی عدالت ہے۔ صرف خواتین کو وکیلوں کی سہولت مہیا کی گئی ہے۔

سُریش بھلّہ :۔ لیکن می لارڈ! خواتین تو ویسے ہی کافی بول لیتی ہیں انھیں وکیل کی کیا ضرورت؟ سونے پر سہاگہ، دو خواتین بولنے پہ آجائیں تو وہ ہمیں کب بولنے دیں گی؟

جج :۔ آرڈر! آرڈر! آپ کو عورت ذات کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

سُریش بھلّہ :۔ تو پھر کوئی خاتون وکیل ہی دے دیجیے۔

جج :۔ آپ کو وکیل نہیں دیا جاسکتا۔ آپ اپنا بچاؤ خود کریں۔

سُریش بھلّہ :۔ (ناامیدی سے سر ہلا کر) بس، پھر مل چکا انصاف۔ جج خاتون، وکیل خاتون اور سیر کو سوا سیر ہماری بیگم بھی خاتون ...

وکیل :۔ آپ شکایت کا جواب دیں۔

جج :۔ آپ کو حیدرپور ڈسٹرکٹ ویمینس ویلفر ایکٹ ۱۹۹۰ کے تحت انصاف ملے گا۔

سُریش بھلّہ :۔ میں کیا جواب دوں؟ یہ تو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے کہ دن بھر کی جان توڑ محنت کے بعد ہر شوہر یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی مسکرا کر اس کا استقبال کرے جس سے اس کی تمام تھکن کافور ہو جائے۔

وکیل :۔ مگر بیوی پر اس طرح کی پابندی تو نہیں لگائی جاسکتی ... اسے مجبور تو نہیں کیا جاسکتا۔ پھر آپ اس الزام کا کیا جواب دیں گے کہ چھٹی کے روز بھی آپ انھیں اپنے آگے پیچھے گھماتے ہیں۔

سریش بھلّہ :۔ وہ بات، دراصل یہ ہے کہ ... یعنی میں چاہتا ہوں ... میرا مطلب ہے ....

جج :۔ شری بھلّہ! آپ اپنا بچاؤ نہیں کرپائے جس کی وجہ سے آپ پر لگائے گئے الزام میں وزن نظر آتا ہے۔ عدالت فریادی کی شکایت اور ملزم کا بیان سننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ شریمتی نیلو پر ظلم ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی کی طرف قدم بڑھاتی عورت اب اور ظلم برداشت نہیں کرے گی۔ عدالت نے یہ بھی دیکھا ہے کہ شریمتی نیلو کی شکایت پر عدالت میں موجود خواتین کے چہرے خوشی سے کھل گئے ہیں کیوں کہ یہ شکایت ان سب ہی کی شکایت ہے۔ شریمتی نیلو نے شکایت میں پہل کرکے ان سب کی نمائندگی کی ہے .... شری بھلّہ! عدالت آپ کو یہ سزا دیتی ہے کہ اگلے تین اتوار، کلب کی خواتین آپ کے باغیچے میں پکنک منانے آئیں گی۔ شریمتی نیلو پورا وقت انھیں دیں گی اور اس کے بعد مزید تین اتوار شریمتی نیلو نہیں، آپ شریمتی نیلو کے آگے پیچھے گھومیں گے۔

(خواتین کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں وہ دونوں اسٹیج سے اُتر جاتے ہیں۔ جج صاحبہ دوسری فریادی کو بلانے کے لیے کہتی ہیں۔)

چپراسی :۔ فریادی نمبر (۲) ... شریمتی مندا کنی حاضر ہوں ......

(شریمتی مندا کنی اسٹیج پر آتی ہیں اور ایک پرچی وکیل صاحبہ کو دے کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں)۔

وکیل :۔ یور آنر ! ان کی شکایت ان کے شوہر شری جوگی کے خلاف ہے۔

جج :۔ شری جوگی کو حاضر کیا جائے۔

(چپراسن آواز لگاتی ہے۔ شری جوگی اسٹیج پر آتے ہیں)۔

وکیل :۔ شری جوگی! آپ کی بیوی شریمتی منداکنی کی شکایت ہے کہ آپ لڑکیوں کو خصوصاً خوبصورت لڑکیوں کو ہمیشہ گھورتے رہتے ہیں۔ جب بھی آپ کار میں سفر کرتے ہیں اور شریمتی منداکنی کی نظریں آپ کی نظروں کا پیچھا کرتی ہیں تو آپ کی نظر کے دائرہ میں کسی نہ کسی لڑکی کو پاتی ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے مسٹر جوگی؟ جب کہ شریمتی جوگی خود بلا کی حسین ہیں۔

شری جوگی :۔ صورت اچھی ہو تو کس کا دل دیکھنا نہ چاہے گا؟ خوبصورت چیزیں بنائی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ انھیں دیکھا جائے۔

وکیل :۔ یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ شریمتی مندا کنی بھی اس فلاسفی کو اپنا لیں تو؟

شری جوگی :۔ وہ عورت ہیں... عورت کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

وکیل :۔ آزادیٔ نسواں کے اس زمانے میں آپ کس زمانہ کی بات کر رہے ہیں؟ اگر آپ اپنے Behaviour کو صحیح سمجھتے ہیں تو آپ کو اپنی بیوی کو بھی یہ آزادی دینی چاہیے۔

شری جوگی :۔ ہرگز نہیں۔ میں اپنی عادتیں بدل سکتا ہوں مگر ...

وکیل :۔ آگئے نا اپنی مردوں والی ذہنیت پر۔ یور آنر! میرے سوالات ختم ہوئے۔

جج :۔ شریمتی مندا کنی کی شکایت اور شری جوگی کی صفائی سننے کے بعد عدالت نے شکایت کو صحیح پایا ہے۔ عدالت یہ تسلیم کرتی ہے کہ انسان حُسن کا دلدادہ ہے مگر کم از کم بیوی کی موجودگی کا خیال شوہر کو ضرور کرنا چاہیے۔ (توقف کرکے) شری جوگی، عدالت آپ کو یہ سزا دیتی ہے کہ آپ جب بھی شریمتی مندا کنی کے ساتھ سفر کریں اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ کوئی حسین چہرہ اچانک سامنے آجائے تو پہلے شریمتی جی سے اجازت لیں پھر اُس پر نگاہ ڈالیں۔

(شری اور شریمتی جوگی واپس جاتے ہیں)

جج :۔ فریادی نمبر تین[۳] کو حاضر کیا جائے۔

چپراسن :۔ شریمتی گریٹا حاضر ہوں...

(شریمتی گریٹا اسٹیج پر آتی ہیں۔ شکایت کی پرچی وکیل کو دے کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں۔)

وکیل : یور آنر! ان کی شکایت ان کے شوہر شری آنند کے خلاف ہے۔

جج :۔ شری آنند کو حاضر کیا جائے۔

(چپراسن پکارتی ہے۔ شری آنند آکر کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں۔)

وکیل : شری آنند! آپ صورت سے تو بڑے بھولے بھالے نظر آتے ہیں لیکن کام بڑے خطرناک کرتے ہیں۔

شری آنند :۔ آئی آبجکٹ یور آنر! وکیل صاحبہ کو میری بے عزتی کا کوئی حق نہیں ہے۔

وکیل :۔ شانتی! شانتی سے کام لیں آنند صاحب یہ میرے الفاظ نہیں ہیں یہ آپ کی بیوی کے الفاظ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ اکثر کسی کو لو لیٹر لکھتے ہیں۔ یہی نہیں آپ کے نام کسی کے محبت بھرے خطوط بھی آتے ہیں جنھیں آپ بزنس لیٹر کہہ کر اپنی بیوی سے چھپا لیتے ہیں۔

شری آنند :۔ (تیوریاں چڑھا کر) وہ بزنس لیٹر ہوتے ہیں۔

وکیل :۔ (لطف لیتے ہوئے) اچھا... اچھا بزنس لیٹر ہی سہی... لیکن کیا آپ اس کمپنی کا نام بتانا پسند کریں۔

جو آپ کو گلابی رنگ کے معطر زنانہ خط میں پتہ لکھ کر خطوط روانہ کرتی ہے۔

شری آنند :۔ کمپنی کا نام نہیں بتایا جا سکتا۔ کانفیڈنشل ہے

وکیل :۔ کمپنی کی مالکن ہی کا نام بتا دیجئے۔

(سب ہنستے ہیں)

وکیل :۔ یور آنر! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا ہے۔

جج :۔ شاردا، محبت کو کوئی پریم روگ نہیں مانتی یہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر شخص میں تھوڑا بہت ہونا ہی چاہئے . . . ہاں عدالت یہ ضرور کہے گی کہ محبت کی جائے مگر صرف اپنی شریکِ حیات سے۔ عدالت شریمتی گریٹیا کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے آپ کو یہ سزا دیتی ہے کہ اگلے دس دنوں تک آپ روزانہ شریمتی گریٹیا کو ایک لو لیٹر لکھیں . . . ساتھ ہی عدالت کو اس کی ایک نقل بھجوائیں۔ (شریمتی گریٹیا اور شری آنند جاتے ہیں)۔

جج :۔ فریادی نمبر چار کو حاضر کیا جائے۔

(چپراسن پکارتی ہے . . . شریمتی مالا حاضر ہوں . . . شریمتی مالا آتی ہیں اور وکیل کو شکایت کی پرچی دے کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں۔)

وکیل :۔ شریمتی مالا کی شکایت ان کے شوہر شری دبی بڑے کے خلاف ہے یور آنر انھیں بلایا جائے۔

شری دبی بڑے آکر کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں۔)

وکیل :۔ آپ سچ بولنے کا وعدہ کریں۔

شری دبی بڑے :۔ یہ وعدہ میں بچپن ہی میں اپنے والدین سے کر چکا ہوں۔

وکیل :۔ خیر . . خیر! آپ کی شریمتی جی نے ہماری عدالت میں شکایت کی ہے کہ آپ انھیں شادی کے بعد کہیں گھمانے نہیں لے گئے۔

شری دبی بڑے :۔ (شش و پنج میں پڑ کر) ایسا تو نہیں . . . ماہور، پنڈھرپور، شرڈی تو ہم گئے تھے۔

وکیل :۔ یور آنر! تیرتھ استھانوں کو یعنی زیارت کے مقاما[ت] کو شری دبی بڑے ہل اسٹیشن سمجھتے ہیں۔ آپ ایک بیتھ د[و] کا ج، والی [. . .] کر [. . .] ہیں۔ سیر و تفریح کے مقامات پر مقامات مقدسہ ہوں تو ان کی زیارت ضرور کی جاتی ہے مگر زیارت کے مقامات پر عقیدت کے جذبے سے جایا جاتا ہے۔ . . وہاں سیر سپاٹا تو نہیں کیا جا سکتا . . .

جج :۔ آپ پر لگائے گئے الزام سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں . . . ایک تو یہ کہ آپ اپنی شریکِ حیات کی خواہشات کا احترام نہیں کرتے . . . دوئم ملک کی بے کاری کے مسئلے کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ٹورازم ڈپارٹمنٹ روزی روٹی بھی فراہم کرتا ہے۔ یہی عدالت آپ کو حکم دیتی ہے کہ بچوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی آپ شریمتی مالا کو لے کر بھارت درشن کے لیے نکل پڑیں . . اپنی روانگی اور واپسی کی تاریخ کورٹ میں درج کرانا نہ بھولیں

(شری دبی بڑے خاموشی سے جاتے ہیں۔ شریمتی مالا ان کے پیچھے ہیں۔ جج صاحبہ اشارہ کرتی ہیں۔ چپراسی پکارا کرتی ہے۔

چپراسن :۔ شریمتی ہیرا گیتے حاضر ہوں . . . .

(شریمتی ہیرا آتی ہیں۔ شکایت کا پرچہ وکیل کے ہاتھ میں دیتی ہیں۔)

وکیل :۔ یور آنر! شری گیتے کو بلانے کی اجازت دی جائے۔

(جج صاحبہ اجازت دیتی ہیں۔ چپراسن پکارتی ہے۔ شری گیتے کٹہرے میں آکر کھڑے ہوتے ہیں۔)

وکیل :۔ (شری گیتے سے) آپ قسم کھائیں . . .

شری گیتے :۔ . . (جلدی سے) کھائی قسم! دن رات قسم ہی کھاتا رہتا ہوں کیوں کہ جب تک قسم نہ کھاؤں میری بیوی کو کسی بات پر یقین ہی نہیں آتا۔

وکیل :۔ حالانکہ شریمتی ہیرا کی شکایت تو یہ ہے کہ وہ

جب بھی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں آپ منہ میں پان بھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُن کی بات کا جواب نہیں دیتے۔
شری گپتے :۔ ان کی باتوں میں کوئی مطلب نہیں ہوتا اس لیے میں جواب نہیں دیتا۔
وکیل :۔ آبجکشن یور آنر! یہ میری موکلہ کی بے عزتی کر رہے ہیں۔
جج :۔ آبجکشن سسٹینڈ OBJECTION SUSTAINED
مسٹر گپتے، آپ میری عدالت میں ایک خاتون کی بے عزتی نہیں کر سکتے۔
شری گپتے :۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ . . .
وکیل :۔ بس بس قسم نہ کھائیے۔ بار بار کھائی جانے والی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔
(جج سے) یور آنر! اب آپ فیصلہ کریں۔
جج :۔ عدالت یہ تسلیم کرتی ہے کہ پان کھانا آپ کا پیدائشی حق ہے اور آپ کے اس حق کو سلب نہیں کیا جا سکتا. . . .
ہاں اس صورت میں کہ آپ اپنے اس حق کو اپنی شریکِ حیات کی توہین کرنے کا ہتھیار بناتے ہیں تو یہ سنگین جرم بن جاتا ہے۔
(کچھ رک رک کر) عدالت آپ کے لیے یہ سزا تجویز کرتی ہے کہ آپ جب بھی پان کھانا چاہیں تو پہلے شریمتی ہیرا سے پوچھ لیں کہ کہیں وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تو نہیں ہیں۔ یعنی آپ کو ان کی کسی بات کا جواب تو دینا نہیں ہے۔ جب تک آپ ان کا جواب نہ سن لیں، پان نہ کھائیں۔
(شری گپتے اور شریمتی ہیرا جاتے ہیں۔ شریمتی نمیتا بیل گم وار آتی ہیں۔ شکایت کی پرچی وکیل کو دیتی ہیں اور وکیل کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔)
وکیل :۔ یور آنر! شریمتی نمیتا تو اپنے پتی سے بہت زیادہ پریشان نظر آتی ہیں . . . فوراً بیل گم وار جی کو بلایا جائے
اُسی وقت شری بیل گم وار بڑبڑاتے ہوئے اسٹیج پر چڑھتے ہیں اور ایک ایک سے پوچھتے ہیں . . . آپ نے میری بیوی کو تو نہیں دیکھا؟ بہت دیر سے نظر نہیں آئی؟ نہ جانے کہاں چلی گئی؟
وکیل :۔ دیکھا آپ نے یور آنر! ملزم نے اپنے (رویّے) سے خود ثابت کر دیا ہے کہ اُن پر لگایا ہوا الزام صحیح ہے
شریمتی نمیتا کا کہنا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے شوہر کی نظروں سے دور ہوتی ہیں تو وہ دھوم مچا دیتے ہیں
ایک مرتبہ انھیں بتائے بغیر وہ پڑوس میں گھنٹہ بھر بیٹھ گئیں تو انھوں نے پولس اسٹیشن میں رپورٹ لکھا دی۔ اخباروں میں "تلاشِ گمشدہ" کا اشتہار شائع کرا دیا اور ٹی وی سنٹر پر ان کی تصویر دے کر جانے ہی والے تھے کہ وہ گھر پہنچ گئیں۔
شریمتی نمیتا کی جان پہچان والے ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔
جج :۔ مسٹر بیل گم وار کیا آپ اس الزام کو قبول کرتے ہیں کہ آپ اپنی پتنی کو پابندیوں میں یا قید میں رکھتے ہیں۔
شری بیل گم وار :۔ جی نہیں۔ میں الزام قبول نہیں کرتا — میں حقیقت میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں اس لیے ان کی جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔
وکیل :۔ سب ہی شوہر اپنی اپنی بیویوں سے پیار کرتے ہیں مگر وہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈالتے . . . .
لے محبت زندہ باد! کے نعرے لگا کر اپنی محبت کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹتے —
جج :۔ شری بیل گم وار! عدالت آپ کو وارننگ دیتی ہے کہ مستقبل میں اس طرح کا رویّہ اختیار کرنے پر آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی . . . . آپ کا معاملہ "استری مکتی سنگھٹنا" والوں کو ریفر کر دیا جائے گا . . . .
فی الحال آپ کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ آپ ایک سال تک ہر پیر کے روز گیارہ بجے کورٹ میں آ کر اپنے بہتر رویّے کی رپورٹ کریں۔ اس کے بعد ہی آپ کا کیس بند کیا جائے گا۔ (شری بیل گم وار اسٹیج سے اُتر کر جاتے ہیں مگر پلٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے ہیں کہ شریمتی نمیتا ان کے پیچھے آ رہی

ہیں یا نہیں)

جج :۔ ابھی اور کتنی شکایتیں باقی ہیں؟ جلدی جلدی نپٹاؤ۔

(چپراسن آواز دیتی ہے... شریمتی کویتا حاضر ہوں ... شریمتی کویتا آتی ہیں۔ شکایت کی پرچی دے کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔)

وکیل :۔ شری پیبراوار کو بلایا جائے۔

(چپراسن پکارتی ہے۔ شری پیبراوار آکر کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں۔)

وکیل :۔ وعدے کرکے مکر جانا، قسمیں کھاکر بھول جانا آپ کی عادت ہے پھر بھی قسم کھائیے۔

شری پیبراوار :۔ (غضب ناک ہوکر) ہاں ہاں کھالی قسم! یہ بتائیے کہ کون کہتا ہے کہ میں وعدہ کرکے مکر جاتا ہوں۔

وکیل :۔ آپ کی پتنی کہتی ہیں اور کون کہتا ہے؟ وہ کہتی ہیں کہ آپ روزانہ آفس سے جلدی گھر لوٹنے کا وعدہ کرتے ہیں مگر ایک دن بھی جلدی گھر نہیں لوٹتے۔

شری پیبراوار :۔ آفس میں کام ہی اتنا زیادہ ہوتا ہے..

جج :۔ مسٹر پیبراوار گویا آپ نے اقبال کرلیا .... کیا زندگی میں کام ہی سب کچھ ہے... بیوی کچھ نہیں یہ بڑی بُری بات ہے کہ آپ اپنی شریک حیات کا دل دکھاتے ہیں۔ بیوی، شوہر کی بہت بڑی طاقت ہے۔ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھئے... لوگوں نے شریک حیات کے لیے راج پاٹ چھوڑا ہے.... آپ ایک گھنٹہ پہلے آفس نہیں چھوڑ سکتے... (توقف کرکے) عدالت آپ کے لیے یہ سزا تجویز کرتی ہے کہ کل سے آپ باقاعدگی شام چھ بجے گھر لوٹ جایا کریں... اگر آپ نے اس سزا کا احترام نہ کیا تو مسز کویتا کو اختیار ہوگا کہ وہ آپ سے بطور ہرجانہ ہر مہینے سونے کا ایک ہار وصول کریں۔

(شری اور شریمتی پیبراوار جاتے ہیں)

جج :۔ اگلی فریادی کو بلائیے۔

(شریمتی منجل آتی ہیں۔ ان کے پیچھے ڈاکٹر دارولے کر آکر کٹہرے میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔)

ڈاکٹر دارولے کر :۔ جج صاحب دیکھئے میں خود حاضر ہوگیا ہوں کیوں کہ منجل کے تیور کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔ سمجھ لیجئے میں نے قسم بھی کھالی۔ اب جلدی سے بتائیے کہ میری بیوی کو مجھ سے کیا شکایت ہے... میں تو اُسے بہت پیار کرتا ہوں۔

وکیل :۔ بہت چالاک ہیں آپ... اس طرح شریمتی منجل کا فیور حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ویسے ان کی شکایت بڑی گمبھیر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ چائلڈ اسپیشلسٹ ہیں اس وجہ سے آپ کے کلینک میں خواتین کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آپ ان خواتین سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر دارولے کر :۔ (ہنس کر) واہ وکیل صاحب! یہ بھی کوئی الزام ہوا؟ بچے اپنی بیماری کے بارے میں خود تو نہیں بتاسکتے اس لیے ان کی ماؤں سے پوچھنا پڑتا ہے۔

وکیل :۔ تو ہنس ہنس کر کیوں پوچھتے ہیں؟ بیماری اور بچے کی تکلیف سے ماں تو پریشان رہتی ہوگی۔ آپ کو ہنسی کیسے آتی ہے؟

ڈاکٹر دارولے کر: (کھسیاکر) دیکھئے! یہ تو سراسر الزام ہے... میری دوا سے صحت یاب ہوکر بچے جب ہنسنے اور کھلکھلاتے ہیں تو.....

وکیل :۔ (جملہ پورا کرتے ہوئے) آپ بھی ان کی ماؤں کے ساتھ ہنسنے کھلکھلاتے ہیں...

(زور کے قہقہے گونجتے ہیں)

جج :۔ عدالت تسلیم کرتی ہے کہ بچوں کی بیماری جاننے کے لیے

بچوں کی ماؤں سے بات کرنا پڑتا ہے مگر یہ کیا ضروری ہے کہ یہ باتیں ہنس ہنس کر لوچھی جائیں۔ ایک عورت جب اپنے شوہر کو دوسری عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھتی ہے تو اس کے دل پر چھریاں چل جاتی ہیں — ہوسکتا ہے ڈاکٹر ہونے کے ناطے آپ کی نظر میں چھری چاقو کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن آپ یہ نہ بھولیں کہ آپ ایک شوہر بھی ہیں... مستقبل میں شرمیلی منجل کی دل آزاری سے بچیں۔ (توقف کرکے) عدالت آپ کو حکم دیتی ہے کہ کل ہی اپنے کلینک میں ایک بورڈ لگا دیں جس پر لکھا ہو.... "عورتوں کے لیے یہاں ہنسنا منع ہے۔ ہنسنے والیوں پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

(چپراسی گھنٹی بجاتی ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں جج صاحبہ اپنے چیمبر میں جاتی ہیں... خاتون راوی داخل ہوتا ہے)

راوی۔ کہیئے صاحبان! کیسی رہی یہ عدالت! شکایتیں آپ نے سُن لیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ یہ شکایتیں کیا حقیقتاً شکایتیں تھیں؟... جی ہاں، صحیح سوچ رہے ہیں آپ؟ شکایتیں سچی بھی تھیں، نہیں بھی تھیں کیوں کہ ہندوستانی عورت مثالی بیوی ہوتی ہے جو آج بھی یہی کہتی ہے۔

اُن کے ستم ہماری نظر میں ستم نہیں
شکوہ زباں پہ آئے کبھی ایسے ہم نہیں

لیکن آپ یہ بھی تو سوچیں کہ یہ بیویاں شکایتیں لے کر سامنے نہ آتیں تو ہمارا یہ پروگرام اتنا دلچسپ کیسے بنتا؟

اچھا تو اب شکریہ کے ساتھ اجازت دیں۔

(اسٹیج پر اندھیرا کم ہونے لگتا ہے... پردہ گرتا ہے)

غزل

محمود نشتر

کر عشق اور نہ پینے پلانے کی بات کر
حالات سے تو آنکھ لڑانے کی بات کر

مانا تھے باپ دادا ترے تیس مار خاں
اب کیا ہے تو نظر میں زمانے کی بات کر

ماہی و مرغ چوزہ و سبزی کو بھول جا
گھوڑے کی طرح گھاس چبانے کی بات کر

محلوں کے خواب آج کے لیڈر کو راس ہیں!
فٹ پاتھ کو گھر اپنا بنانے کی بات کر

گر چاہتا ہے تیری ترقی ہو نام ہو!
جھک کر سلام اور مسکہ لگانے کی بات کر

ہر روز اک پڑوسی کی ہانڈی میں ڈال کر
نشتر تو دال اپنی گلانے کی بات کر

بابو آر کے
(اچل پور سٹی)

میرا بھارت مہان

اپنے ملک ہندوستان جنت نشان میں کیا کچھ نہیں ہے ؟ بہت کچھ ہے اور بہت کچھ نہیں بھی ہے۔ ملک میں محبت کے امین خوب صورت تاج محل کے ہوتے ہوئے بھی محبت کا فقدان ہے۔ بلندیوں کے قدموں قطب مینار کے ہوتے ہوئے پستیوں میں اترے ہوئے انسان بھی ہیں۔ اجنتا ایلورا کی ہنرمندیوں کے باوجود، ہنر کی قدر اور ہنرمند کی پذیرائی کا جذبہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں مدراسی، مراٹھی، گجراتی، کشمیری، راجستھانی، پنجابی، بہاری، کنڑی اور حیدرآبادی تو ہیں ..... لیکن یہاں بھارتیہ کوئی نہیں ..... اس کے باوجود یہاں ہر کوئی "میرا بھارت مہان" کا راگ الاپ کر دیش کی عظمت اور اس کی شان میں چار چاند لگانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ چاند روٹی سے مشابہ ہے۔ اس لیے ہمیں یاد آیا کہ...... ہمارے ملک میں روٹی سے زیادہ رشوت کمیشن چغلی، گالی کوسنے اور جوتے ہماری مرغوب غذا کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایسی ہی چیزوں بسیار خوری کا نتیجہ ہے جو ملک میں شہر شہر گاؤں گاؤں محکمہ در محکمہ اور شعبہ در شعبہ جوتیوں میں دال بڑی فراوانی کے ساتھ بٹنے لگی۔ ویسے مہنگائی نے بے چاری دال کو عجیب و غریب صورت حال سے دوچار کر دیا ہے جو یہ ہانڈیوں میں پکنے کی بجائے جوتیوں میں بٹنے کو ترجیح دینے لگی ہے اور بجائے معدہ میں رہنے کے محاوروں میں پڑاؤ ڈال گئی ہے۔

جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اپنے ملک میں کیا نہیں ہے ؟ تو پتہ چلتا ہے کہ ملک میں بہت کچھ ہے ؛ یہاں تشدد ہے خون خرابہ بھی ہے اور دنگا فساد بھی لسانی امتیاز ہے غنڈہ گردی ہے اور دہشت گردی بھی۔ یہاں سوکھا گر ہے تو سیلاب بھی ہے۔ زلزلے ہیں طوفان ہیں۔ الغرض آسمانی آفات پر ہم بھارت واسی جہاں اپنی جانیں فدا کر رہے ہیں وہیں مہنگائی بھی سو جان سے ہم پہ فدا ہے اور آسمان کو چھو رہی ہے۔ ویسے آسمان کو چھونے والے مشہور جمبو جیٹ جہاز ہمارے پاس ہیں لیکن کیا کریں..... گزشتہ کئی دنوں سے ہمارے یہ جمبو جیٹ اڑنے سے زیادہ گرنے میں دل چسپی لینے

گئے ہیں۔ سیکولرزم کی اقدار اور غریب کے آنسوؤں کی طرح ٹپا ٹپ گرنے لگے ہیں۔ یوں تو ملک میں آمد و رفت کے لیے جہازوں کے علاوہ ریلوں کا ایک نظام بھی ہے۔ اس نظام کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ نظام ہمیشہ درہم برہم رہتا ہے جس کے باعث ہماری ریلیں گھنٹے ہی نہیں بلکہ کئی کئی دن لیٹ چلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے چارے مسافر:

"چلنے کی تمنا تھی پہنچنے کی نہیں تھی"

اس مقولہ کو ذہن میں رکھ کر آمادۂ سفر ہوتے ہیں۔ ہماری ان ریلوں میں محفوظ سفر کرنے کے لیے مسافر کے پاس رختِ سفر کے طور پر ایک پوری چاقو پہلے درکار ہوتا ہے اور ٹکٹ بعد میں۔ ان ریلوں میں سفر کے دوران مسافر کا سر و سامان جانا یقینی ہوا کرتا ہے۔ یعنی جگہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں مارا ماری کے نتیجہ میں سر پھوٹتا ہے تو سامان بھیڑ بھاڑ میں چوری چکاری کی نذر ہوا کرتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہے کہ ان دنوں ہماری ریلیں دنیاوی سفر سے زیادہ سفرِ آخرت کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ ریش کے دوران زندہ مسافروں کی جیبیں کٹوا کر یہ ریلیں جہاں انھیں کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا کرتی ہیں وہیں ایکسیڈنٹ کے بعد مردہ مسافروں کے ورثا کو یہ لکھ پتی بنا جاتی ہیں۔

اور ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی سڑکیں ہیں شاہراہیں ہیں لیکن ان سڑکوں پر انسان کے ساتھ آندولن جلوس جلسے اور مورچے زیادہ چلتے ہیں۔ دھرنے، ترافک پدیاترا دن اور ایکتا یاترا دن کا تانتا بھی انھیں سڑکوں پر بندھتا ہے۔ تعمیری کاموں کے لیے محکمہ P.W.D. ہمارے ملک میں نمایاں محکمے کا درجہ رکھتا ہے لیکن یہ اس محکمہ کی بدقسمتی ہے کہ جب جب بھی اس محکمہ نے عوامی کاموں کا بیڑا اٹھایا ہے عوام و خواص نے اس کی کارکردگی پر حرف اٹھایا ہے۔ تیشوں اور فرہادوں کے اس محکمہ نے جب کبھی شاہراہیں بنائی ہیں تب شاہراہوں نے ایک اچھی اور صحت مند شاہراہ بننے سے انکار کیا ہے۔ انجینیر کی مکاری، اوورسیر کی دلالی اور ٹھیکہ دار کی عیاری کی عوامی شکایات پر ارباب محکمہ ہمیشہ یہ کہتا ہوا پایا گیا ہے کہ "دیکھیے صاحب سڑکیں بنانے میں میٹیریل تو اعلیٰ درجہ کا استعمال ہوا ہے لیکن ہم کیا کریں ... اپنے دیش کی مٹی کا مزاج ہی بگڑا ہوا ہے۔" اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ ہماری کرکٹ پچوں کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں ...... اب دیکھیے نا، کرکٹ پچوں کی کتنی ہی دیکھ بھال، خاطر داری اور جی حضوری کی جائے پھر بھی یہ پچیں ٹوٹتی اور بکھرتی رہتی ہیں اس لیے ثابت یہ ہوا کہ سڑکوں کی غیر معیاری حالت کی ذمہ دار محکمہ کی ناقص کارکردگی نہیں بلکہ اس کے لیے اصل قصوروار تو دیش کی مٹی کا بگڑا ہوا مزاج ہے۔"

ہمارے ملک میں زلفِ یار کی طرح ندیاں بھی جا بجا بکھری پڑی ہیں اور آج کل زیادہ تر ندیاں اس بات کی پابند نہیں رہیں کہ وہ پانی سے سرشار ہوں، ویسے پانی کی قلت ان دنوں ہمارے ملک میں زوروں پر ہے پانی نہ تو ندیوں میں ہے کنوؤں میں اور نہ ہی چشمِ غم گسار میں۔ خیر ہماری ندیوں میں پانی بھلے ہی نہ ہو لیکن ان پر پل ضرور تعمیر ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے پلوں کی ایک خاص خوبی یہ ہوتی ہے

چلے ہے یہ کروڑوں روپیوں کی لاگت سے ہی کیوں نہ تعمیر ہوئے ہوں ان کے قریب ایک آہنی بورڈ آویزاں رہتا ہے جس پر بجائے پل کے تخمینہ اور اس کی تعمیر کے سن و سال کے ہمیشہ یہ درج ہوتا ہے کہ "خبردار! پل نادرست ہے آہستہ چلیے"۔

بعض مواقع پر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نئے تعمیر شدہ پل کا افتتاح بعد میں ہوتا ہے اور اس بورڈ کی رسم رونمائی پہلے انجام پاتی ہے۔ ملک میں محکمہ صحت عامہ کا بھی وجود ہے۔ جس کے تحت سرکاری اسپتالوں میں بظاہر تو علاج معالجہ کا بندوبست کیا گیا ہے لیکن عام طور پر ان اسپتالوں کی کارکردگی پر:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

والا طبی مصرعہ صادق آتا ہے اور نتیجہ کے طور پر مریض کو علاج کم اور بیماری زیادہ فراہم کی جاتی ہے۔ انہیں اسپتالوں میں سرجنوں کے ہاتھوں اکثر آپریشن وغیرہ کے کیس بھی سرزد ہو جایا کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان سرجنوں کے قریب قینچی رکھنے کی سب سے محفوظ جگہ مریض کا شکم گردانی گئی ہے اور مریض کے شکم کو طاق نسیاں سمجھ کر آپریشن کے اوزار اکثر یہیں رکھتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے ہمارے ملک میں عیب کو ہنر اور ہنر کو عیب کا درجہ دیا جا رہا ہے جس کے باعث ملک میں قومی انجمن پڑھے لکھے بے عیب نوجوان ہاتھوں میں ڈگریاں لیے بے کار پڑے ہیں اور معذور لنگڑے لولے امیدوار بآسانی سرکاری و نیم سرکاری آسامیاں ہتھیا رہے ہیں۔ معذور افراد کو نوازے جانے کا یہ سلسلہ یونہی عمل میں آتا رہا تو ہمیں خدشہ ہے کہ مستقبل قریب میں عمل پیدائش سے قبل نومولود کو معذور تولد کروانے کے لیے دعاؤں کے جلسے اور پرارتھنا سبھاؤں کے انعقاد گھر گھر ہونے لگیں گے۔

ہمارے ملک کی خاص خوبی یہ ہے کہ محکمہ تعلیم ہے لیکن تعلیم کا فقدان ہے۔ الکٹریسٹی کے بورڈ ہیں لیکن گلی کوچے اور گھر روشنی سے محروم ہیں۔ دیش کی مٹی سونا اگلتی ہے لیکن سرمایہ دار اسے اپنی تجوریوں میں چھپا لیتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کی ترقی، خوش حالی اور امن کے لیے دستور بنایا گیا ہے لیکن اس دستور پر عمل کرنے والوں کی کمی ہے صلح امن و آشتی کی باتیں ہزار ہیں اس پر عمل کا جذبہ نہیں ہے۔

ماضی میں ہمارے ملک میں ایک "خلیل خاں" ہوا کرتے تھے جو امن و آشتی کے پیکر تھے اور دن رات بے محابہ فاختائیں اڑا کر امن چین کی بنسی بجایا کرتے تھے۔ چونکہ اب ملک میں امن کے دلدادہ وہ خلیل خاں بھی نہیں ہیں۔ اور ان سے منسوب امن کی فاختاؤں کو بھی سنگھ پریوار نے اڑا دیا ہے اور شاید اسی لیے ملک میں شہر شہر دنگا فساد ہے اور گاؤں گاؤں بغض و عناد۔ ملک میں چھائی بدامنی کی روشنی میں ہم محکمۂ وزارت داخلہ کے ذمہ داران کو مشورہ دیں گے کہ وہ وزارت خارجہ کے سر جوڑ کر بیٹھیں اور جتنی جلد ہو سکے خلیل خاں اور ان کی فاختاؤں کو بہر صورت سمجھا منا کر ملک میں واپس لے آئیں تاکہ ملک میں ایک مرتبہ پھر سے امن و امان کی فضا قائم ہو سکے۔

●●

قلمی معاونین سے التماس

ہے کہ مسودات، پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

ابرار (ایم. اے)
(لندن)

"ادبی جلسے میں مسئلہ کرسی کا"

یہ بات تو ہم سب سمجھتے ہیں کہ ہر شاعر اپنے آپ کو بڑا شاعر تصور کرتا ہے اور جب کوئی غزل یا نظم لکھ لیتا ہے تو اپنی عظمت کی تصدیق کے لیے کلام سنانا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ با ذوق حضرات یا ادبی انجمنیں مشاعرے کے لیے یا تو کسی گھر میں شعری نشست کا اہتمام کرتے ہیں یا پھر کوئی ہال کرائے پر لے لیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی انجمن کے سامنے اب یہ مسئلہ آتا ہے کہ اس ادبی جلسے میں صدر اور مہمانِ خصوصی کی کرسیوں پر کون تشریف فرما ہوں تاکہ احترام کی فضاء قائم رہے۔ دیکھا گیا ہے کہ شاید مزاج کے حوالے سے شاعر ایک دوسرے سے الرجک ہیں اور فون پر پوچھا جاتا ہے کہ کون کون جلسے میں آرہے ہیں اور صدارت کس کی ہوگی۔ اگر اپنی طبع کو ناگوار ہوا تو کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتے ہیں اور اگر کرسی کا قرعۂ فال ان کے نام نکلا تو پھر خراب ترین موسم میں بھی سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے اس مقام تک پہنچیں گے (چاہے وہاں ہال میں پندرہ بیس سامعین کا مجمع ہو)۔

شاید اپنی جہالت تھی کہ جلسے میں صدارت کی کرسی کو ہم بہت معمولی سمجھتے رہے لیکن لندن میں ایک بڑے مشاعرے کی ذمہ داری جب ہم پر پڑی اور مالی امداد کے لیے اس وقت کے بڑے سرمایہ دار سورج پال کے پاس گئے! انھوں نے اپنے مخصوص کاروباری انداز میں پہلے طے کرلیا۔ "ہال کا کرایہ، پی۔ اے سسٹم، مہمانوں کی فرسٹ کلاس تواضع، سموسہ چائے پانی کا خرچہ ہمارا لیکن صدارت کی کرسی پر ہم بیٹھیں گے"۔ ہم نے حیرانی سے منظور کرلیا! اسی دن کے بعد ہمیں اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ پھر ہمارے دن جب پھرے اور مانچسٹر اور لندن میں ایسے ہی جلسوں کی لاٹری ہمارے نام نکلی تو مہمانِ خصوصی یا صدر بن کر بڑی بوریت کا تجربہ ہوا۔ سامنے سو ڈیڑھ سو جاندار سامعین بلاوجہ ہمیں گھور رہے ہیں۔ اب ہم اسٹیج پر بیٹھے کس طرح اپنے آپ کو مصروف رکھیں یا مصروف نظر آئیں۔ شاعر شعر سنا رہا ہے یا مقالہ نگار اپنی ریسرچ پڑھ رہا ہے (ہماری توجہ کہیں اور ہے) سامعین کہیں کہیں داد دے رہے ہیں۔ ہم نے جیب سے کاغذ نکالا اس پر کوئی اسکیچ بنا رہے ہیں، آخر کب تک آنکھیں گھما کر ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت احساس ہوا کہ فیض صاحب جلسے کی صدارت کے دوران کیوں بور ہوا کرتے تھے، وہ بیٹھے سگریٹ سے جی بہلاتے رہتے۔ اگر ہال میں سگریٹ نوشی کی ممانعت ہوتی۔ کچھ دیر برداشت کرتے پھر چپکے سے اٹھ کر باہر چلے جاتے۔ واپس آکر خالی چھت کو گھورتے رہتے۔ فیض صاحب یا مجید امجد جیسے شاعروں کو لکھنے سے سروکار رہا وہ جلسے کی صدارتوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑے۔

ہمارے وہ شاعر جو مال میکلوڈ بیڈنی روڈ پر ٹوٹی چپل سے پیدل چلتے مشاعروں میں پہنچتے تھے آج برطانیہ کے منتظمین جلسہ کے لیے مسئلہ بن جاتے ہیں۔ اپنے تئیں ہر "بڑا شاعر" کرسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ آپ کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ ادبی جلسے میں کرسی پر دو گھنٹے بیٹھے رہنے اور سامعین کی آنکھوں کا تارا بننے کے لیے شاعر ادیب لندن سے برمنگھم، مانچسٹر اور بریڈفورڈ سے لندن تک سفر بلکہ ڈنمارک اور اوسلو تک کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ ہمارا جوشیلا شاعر کالی عینکیں پہنے مرسیڈیز کار ڈرائیو کرتے ہوئے چھ آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد مشاعرہ گاہ کے سامنے اپنی چمکیلی کار سے برآمد ہوتا ہے لیکن بعض اوقات منتظمین کو شاید یاد نہیں رہتا اور کرسیوں کی ترتیب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ نغش لائلپوری بتاتے ہیں کہ لندن سے عاشور کاظمی، باقر نقوی اور رشید منظر کار میں اپنے نفیس لباس کے ساتھ صدر اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے بریڈفورڈ پہنچے۔ وہاں حضرت شاہ اور جاوید بیدی نے افتخار عارف کو مشاعرے کی صدارت پیش کر دی۔ چنانچہ تینوں کا موڈ خراب ہوا اور ایک سو نوے میل کا سفر کرتے برے موسم میں واپس پہنچے۔ ۱۹۹۱ء میں برمنگھم یونیورسٹی میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں پاکستان سے عطا قاسمی، خالد احمد، محمد اسلام امجد اور حسن رضوی شامل ہوئے۔ عاشور کاظمی اور باقر نقوی نے ان کے ٹکٹوں میں حصہ ڈالا تھا اس لیے انہیں اسٹیج پر اپنی کرسی کا یقین تھا۔ لندن سے جانے والوں کو علم نہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ وہاں صفی حسن نے صدارت افتخار عارف کو پیش کی اس پر غصے کی حالت میں ہمارے سامنے مشاعرے میں حصہ لیے بغیر عاشور کاظمی اور باقر نقوی واپس لوٹ آئے۔ ہمیں کچھ عجیب لگا کہ جوش صاحب کی صدارت میں ہم نے مجید امجد اور مصطفیٰ زیدی کو سامعین میں بیٹھے دیکھا۔ انہوں نے شوق سے کلام سنا اور سنایا۔ یوں جلسے کا احترام بھی قائم رہا۔

ادبی کرسی کے حوالے سے حال ہی کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لندن میں عبدالغفار عزم تحریک اردو کے جھنڈے تلے ماہانہ ادبی نشست کا اہتمام کرتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ممتاز ناقد اور شاعر پروفیسر مظفر حنفی کے اعزاز میں لندن یونیورسٹی میں جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت کا معاملہ شاید خفیہ رکھا گیا۔ اسٹیج پر زیڈیو خان O B E صدر اور مظفر حنفی مہمان خصوصی تھے۔ اسٹیج پر ساقی فاروقی بھی ایک کرسی پر بیٹھے تھے لیکن ان کی حیثیت نامعلوم رہی۔ ایک شاعر کا کہنا ہے وہ صدارت کے متمنی تھے اس لیے کروٹیں بدلتے رہے۔ نظامت گلوکار ہارون رشید کے سپرد تھی۔ جمشید مرزا نے افسانہ پڑھا۔ ارشاد عثمانی نے اقبال پر مقالہ پڑھا اس کے بعد اطہر راز نے تعارفی مضمون پڑھا جس میں بتایا کہ جناب مظفر حنفی ماہر اقبالیات شاعر، نقاد ہیں اور کئی کتب پر ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر متمکن ہیں اور ڈاکٹر محبوب راہی نے ان کے ادبی کام پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ ڈاکٹر عزم نے پروگرام کے حوالے سے فیصلہ سنایا کہ آج صرف مظفر حنفی اپنا کلام سنائیں گے۔ ساقی فاروقی تھوڑی دیر اسٹیج پر بیٹھے اس کے بعد چپکے سے اپنا بستہ سنبھال کر اٹھ کر چلے گئے۔ سامعین میں سے کسی نے کہا کہ ساقی یہ سمجھ کر آئے تھے کہ مظفر حنفی بلند پایہ نقاد ہیں اور شاعر تو نقاد کے آگے پیچھے پھرتا ہے، اس کے علاوہ جلسے کی صدارت ساقی کی ہوگی جو اتفاق سے زیڈیو خان کے حوالے کی گئی۔ شاعر کو اپنا درجہ کم محسوس ہوا اور وہ ہال سے باہر بارش میں آئے تھے بارش میں واپس گئے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر گلوبل کا کہنا ہے کہ اس مسئلے کا ایک حل یہ ہے کہ ادبی انجمنیں ایک سال کے شیڈول میں اعلان کر دیا کریں کہ فلاں فلاں جلسے کے صدر اور مہمان خصوصی فلاں فلاں شاعر ہوں گے، سب کو چانس ملے گا اپنی باری کے منتظر رہیں گے اور خوش رہیں گے مگر خودی منہ لٹکا کر ۔۔۔ اکثر شاعر ادیب کم ۔۔۔

زمانے میں خوش کرنا آسان نہیں رہا اور خوشحال شاعر کو تو خوش کرنا ناممکن سا ہوگیا ہے ۔

مظفر حنفی صاحب کی کچھ باتیں آپ بھی یاد رکھیں کہ اردو ادب میں صرف تین عظیم شاعر ہیں ۔ میر ، غالب اور اقبال ۔ علامہ اقبال کی تصویر کلکتہ اسمبلی کے ہال میں بہت اہم جگہ پر نصب ہے ، جب کہ ٹیگور کی تصویر ایک کونے میں ہے ۔ کلکتہ میں اہم موقعوں پر اقبال کا ترانہ پہلے پڑھا جاتا ہے ۔ اور آخر میں یہ کہ پاکستان کے مقابلے میں انفرادیات پر انڈیا میں زیادہ کام ہو رہا ہے کرسی پر بیٹھے وہ بھی تھکے تھکے سے لگ رہے تھے ۔

(رہنمائے دانشوران اندازہ سے)

مکرمہ :۔

ڈاکٹر محبوب راہی

بارسی ٹاکلی (اکولہ) مہاراشٹر (انڈیا)

□□

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

اشرف خوندمیری

[پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے یہ مضمون اشرف خوندمیری کے مجموعۂ کلام کے لیے بطور پیش لفظ لکھا تھا افسوس ہے کہ مجوزہ مجموعہ اب تک شائع نہ ہو سکا ——— ادارہ]

شعر و ادب میں طنز و مزاح کو گزشتہ دو تین دہوں سے کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ ادھر ہمارے شہر حیدرآباد میں خاص طور پر چند ایک نے غیر معمولی نام کمایا ہے، چند ایک نام کما رہے ہیں اور چند ایک اس خصوص میں سرگرداں ہیں۔ ان میں سے وہ جو سستے اور سطحی مزاح، بگاڑ کر زبان کے استعمال، بے ڈھنگے تلفظ اور اپنے گلے کے ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شستگی و شائستگی، تہذیبی اقدار، معاشرتی شعور اور زبان اور طرزِ ادا کے تقاضوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان سے اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ان کو جلد اور سستی شہرت ایسے نہ ملے لیکن طنز و مزاح کے ادب میں آئندہ بھی ان کا مقام رہے گا۔

اشرف خوندمیری، تقریباً تیس سال سے مزاحیہ شاعری کر رہے ہیں۔ ابتداً انھوں نے دکنی مزاحیہ شاعری سے کی اور اب کچھ عرصہ سے فارسی اور دکنی آمیز تلگو کے الفاظ اور محاوروں کے استعمال پر زیادہ زور دے رہے ہیں ——— میں ایک بات عرض کر دوں: دکنی شاعری کو بالعموم مزاحیہ شاعری متصور کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ طنز و مزاحیہ شاعری جس طرح عصری اردو میں ہوتی ہے دکنی اُردو میں بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ دکنی شاعری کو یہاں سے وہاں تک مزاحیہ شاعری قرار دینا قطعی نامناسب ہے۔ یہ غلط فہمی شاید اس لیے ہے کہ فی زمانہ بیشتر مزاحیہ شاعروں ہی نے دکنی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور پھر آج کل دکنی ہے کہاں؟ دکنی کی اپنی ایک حیثیت، حقیقت اور انفرادیت ہے۔ عصری اردو کو بگاڑ کر یا گھریلو زبان پڑھ لوگوں کی زبان کو دکنی کہہ دینا خلافِ واقعہ ہے۔ ہمارے بہت سے مزاحیہ شاعر اردو کو بگاڑ کر استعمال کر رہے ہیں۔ تلفظ اور املا کو مسخ کیا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ دکنی میں شاعری ہو رہی ہے ———

اشرف خوندمیری کی زبان بھی دکنی کم اور آج کی گھریلو اور عامی زبان زیادہ ہے۔ ہاں انھوں نے اس کو

سلیقے سے استعمال کیا ہے - اس میں کوئی شبہ نہیں - اس تعلق سے ان کے ہاں ہنرمندی "نزاکت" ندرت اور نکھار ہے - خاص طور پر انھوں نے ہمارے گھریلو اور عوامی محاوروں کو بڑی مشاقی اور مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ وہ بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں - اس زاویہ سے اشرف خوندمیری کو اپنے ہم عصر مزاحیہ شاعروں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے - اشرف خوندمیری کی بیشتر منظومات میں محاوروں کا دلکش استعمال ہے - مجھے ان کی شاعری کی یہی ادا بھاتی ہے -

شعر و ادب کے لگ بھگ سارے موضوعات طنز و مزاح نگاروں کے ہاں ملتے ہیں - اشرف خوندمیری کی شاعری بھی ان موضوعات کی حامل ہے - اشرف اپنے عوامی لہجہ میں عام آدمی تک اپنی آواز پہنچاتے ہیں - ہوسکتا ہے بعض حلقے ان کی شاعری کی سمت توجہ نہ دیں - اس کو درخور اعتنا تصور نہ کریں لیکن جو لوگ جو اپنی زبان اور اپنے لہجے میں کوئی بات سننا چاہتے ہیں وہ اشرف کی شاعری کو سنیں گے اور داد دیں گے - شاعر کو اطمینان قلب یوں بھی حاصل ہوتا ہے اور اچھی شاعری کی یہ بھی ایک پہچان ہے -

اشرف خوندمیری نے عام گھریلو موضوعات کو بھی اختیار کیا ہے اور قومی اور بین قومی موضوعات بھی ان کے یہاں ملتے ہیں - تاہم نئے نئے فیشنوں، نئی نسل کی بے راہ روی - تہذیب نو کی سطحیت، تعلیم سے بے پروائی، کھوکھلی سیاست، بزعم خود غلط سیاست، ظاہر پرستی اور مذہبی رہنماؤں کی دوغلی پالیسی پر اشرف خوندمیری نے خاص طور پر قلم اٹھایا ہے - "بلے دانی" "میاں کی بیڈی" "لوری" اور "چل کی چھوں پر بیٹے" اس خصوص میں لائق ذکر منظومات ہیں - جہاں تک گھریلو موضوعات کا تعلق ہے محبوبہ کا کردار ان کے ہاں کسی قدر ابھرتا ہے اور توقع ہے کہ آئندہ چل کر ان کا یہ کردار انفرادیت کا حامل ہوگا - "جھمک جھمکا" "اٹھا چماں" "گم ہوگئے سو فرد کا مرثیہ" اور "بائیں ہاتھ پہ لگا پسارہ" جیسی نظمیں پڑھتے ہوئے کچھ یہی احساس ہوتا ہے -

اشرف خوندمیری کو زبان اور طرز ادا پر قدرت ہے - عوامی بولی سے قطع نظر عصری اردو اور فارسی سے بھی ان کی دلچسپی ظاہر ہے اور ادھر تلگو سے بھی - چنانچہ انھوں نے جہاں فارسی کے الفاظ مع اور ترکیبیں وغیرہ بے تکان اور روانی کے ساتھ استعمال کی ہیں - تلگو الفاظ وغیرہ کے استعمال میں ان کی دسترس ظاہر ہے - طنز و مزاح کا پہلو تو وہ کسی طرح نکال ہی لیتے ہیں - اسی لیے ان کی خواہ کسی موضوع یا مسئلہ کا احاطہ کرتی ہوں - سامع کو متوجہ کر لیتی ہیں - "ڈسکو بڑا کتھا" "ڈسکو پیڈی" اور "دو گرگٹوں کے موں کو چنا لگا کو چھوڑیں" وغیرہ میں انھوں نے متعلقہ موضوعات پر طنز و مزاح کے نئے پہلو نکالے ہیں - زبان اور طرز ادا کے ساتھ فنی پہلوؤں پر بھی اشرف خوندمیری کی نگاہ گہری پائی جاتی ہے - یہی وجوہ ان کے ہاں مزاحیہ شاعری زبان و بیان کی توڑ پھوڑ اور عجز کے باعث نہیں بلکہ ان کو اس زاویہ سے استادانہ کام میں لانے کا نام ہے - بلاشبہ یہ پہلو ان کے کلام میں اور نکھرتا اور نکھرتا رہے گا -

اشرف خوندمیری نے شخصیات پر بھی نظمیں لکھی ہیں - یوں ہی یا کسی تقریب پر اس نوع کی نظمیں اسی وقت وقیع اور بھرپور ہوتی ہیں جب کہ متعلقہ شخصیات کا فن کار نے باریک بینی سے جائزہ لیا

ان کے مزاج میں جا نکلا ہو۔ اشرف کی ایسی منظومات میں پرویز یداللہ مہدی کی تصنیف "پھیر چھاڑ" کے رسم اجرا پر لکھی گئی نظم "اعلیٰ کا جھاڑ" اور سید مکتر شاہ کی شخصیت پر نظم "ذاتِ شریف" متاثر کرتی ہیں۔

اشرف خوندمیری نے قطعات بھی کہے ہیں جن میں بہت اچھے ہیں مثلاً رویتِ ہلال اور کرکٹ کے بارے میں قطعات۔

مجھے توقع ہے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے مثبت عناصر اشرف خوندمیری کی شاعری میں اور راہ پائیں گے، اپنی جگہ بنائیں گے۔ وہ یقیناً اس امر کو ملحوظ رکھیں گے کہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا مقصد لوگوں کو صرف ہنسانا ہی نہیں بلکہ سننے والوں کو غور و فکر پر آمادہ کرنا اور ان کی روح کو بیدار کرنا بھی ہوتا ہے اور جو شاعر اس منصب سے عہدہ برآ ہوتے ہیں انہی کی شاعری مشاعروں کی لمحاتی ستائش اور واہ واہ سے ہٹ کر وقیع اور پائیدار رہتی ہے۔

میں نے اشرف خوندمیری کے اشعار کا انتخاب دینے سے عمداً گریز کیا ہے کہ آپ خود اس مجموعۂ کلام کی سیر کریں اور اپنے طور پر محظوظ ہوں ——

اشرف خوندمیری

جھمک جھکا

سُن گے بُوبُو، سُن گے آپا، سُن گے رانی ، بدلوں جھمک جھکّا کھیلی تھی سو اپنی کہانی بولوں
ہنس کے بولوں یا آنکھیاں میں لا کو پانی بولوں میری اُن کی ہوتی تھی سو آنکھ مچانی بولوں
بیتے باتاں یاد آریئں تو دل ہورائے موچکّا
ہائے اللہ میں کیسکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

سیلیاں سیلیاں مل کو اِک دن موسیٰ ندی آئے ٹھنڈی، ٹھنڈی پھنوں میں جھمک جھکّا کھیل رچائے
میں من ماری دُور کھڑی تھی منڈی کو لٹکائے کلثم پوچھی کیوں گے بنّو تو کیسکو شرمائے
کلثم کے باتاں میں آکو کھا گئی کیسا جھیکا!
ہائے اللہ میں کیسکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

اللہ میاں، کِسی پو بی ایسے گھڑیاں نہ لائے کلثم کے ہاتھاں چھُٹ گئے، ہم دونوں دھکّیاں کھائے
ڈھکّی کھا کو دُور گِری، پاواں میں موچاں آئے گرتے گرتے میرے انکھیاں لڑ گئے ان سے ہائے
چندا سا مکھڑا دیکھی تو رہ گئی ہکّا بکّا
ہائے اللہ میں کیسکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

طوفاناں کے باراں کے موتواں کو موڑ کو نہائے رستے میں جو بی چیزاں تھے اُن کو توڑ کو نہائے
کھڈوں میں گرتے پڑتے بس گھٹنے پھوڑ کو نہائے منجے گرتا دیک کو اپنے چپلاں چھوڑ کو نہائے
کوئی بی نئیں تھا اُن کے سر یکا دل کا چور اُچکّا
ہائے اللہ میں کیسکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

بولے سیّاں اب تو گوری روز ملتے رہیں گے اپنے دل میں اُلفت کے پھولاں بی کھلتے رہیں گے
ڈرنا نئیں لوگاں تو ہم پو بھوت کلتے رہیں گے سر پو لاکھوں طوفاناں کے ڈھیراں پلتے رہیں گے
پھر بی اپنے پیار پو گوری چھٹیں گا سب کا چھکّا
ہائے اللہ میں کیسکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

چدر گھاٹ کے مخدوم[1] کے ہر میلے پو ہم ملتے مخدوم صاحب کے چیا کنے کے ٹھیلے پو ہم ملتے
عبدالّاری[2] سالے کے طبیلے پو ہم ملتے عنبر پیٹ کے گاریاں کے کمیلے پو ہم ملتے
ہم بی چھائیں چپّہ چپّہ پیار کی ہر سڑک کا
ہائے اللہ میں کیسکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

۱۔ محی الدین ۲۔ عبداللہ رسالہ

دنیا کے نظراں سے بچ کو ہوتے تھے سوب گھاتاں　　دن عیداں تھے ہور راتاں ہوتے تھے شب براتاں
ہلّو ہلّو ہنستے ہنستے، بیتے کیسوں راتاں　　میری ان کی بیت پلی ہاتاں میں دے کو ہاتاں
دونوں کے دل کی ہنڈی میں ڈھیش جمتا تھا چکّا
ہائے اللہ میں کیٹکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا
ماٹھی میسلے طوفاناں نہ جانے کاں سے آئے　　گوداں میں بھر کو غم کے شیطاتوں کو بی لائے
خالی پیلی رُس کو سیّاں بیت مری ٹھکرائے　　رامی دھوبن کے زلفاں میں دل اپنا اٹکائے
مُنجے نئیں مالوم تھا میرے دل کو لگیں گا دھکّا
ہائے اللہ میں کیٹکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

(تین بند)

گھس گھس کو ایلوے کا چِچ پٹا کو چھوڑیں　　تالو سلا سلا کو ڈچّہ گھما کو چھوڑیں!
اُوپر سے ہلّو ہلّو ڈوبّہ پینا کو چھوڑیں　　نیچّے سے ہلّو ہلّو گنگا بہا کو چھوڑیں!
بیٹھے بٹھائے سب کا کونپہ ڈبا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں
بس ہو لے شولے کاماں، اُن کا ہے کارنامہ　　"اِلّو نا کشنا کشنا"، اِلّو نا راما راما"
باتاں بنا بنا کو، ہاتاں نچا نچا کو　　ڈئیلاگ بی گھما کو کرنے لگیں ڈراما!
ہولوں پو ایکٹنگ کا سکّہ جما کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں
چنّا اِنوں بی ڈل رئیں اُتّا اُنوں بی ڈل رئیں　　مکھنا ہتی کے بھاپاں بن بن کو دونوں جھل رئیں!
گھایاں دِکھا دِکھا کو باڑاں اُنوں دلاریں　　باڑوں میں اُن کے آ کو دونوں بی خوب پھل رئیں
دونوں کو پمپ ماریں، پُھگّا بنا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

●

جنور کی چھوں پڑیئے

صورت کی باسی اڈلی پو سانبر کی چھوں پڑیئے قسمت پو مقدر کے سکندر کی چھوں پڑیئے
اماں بی سمج ریئں مجے بس چاند کا ٹکڑا جب سے کلر پو ذرّی سی ڈانبر کی چھوں پڑیئے
قسمت پو اپنی ہستائے سو بندر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

آکو مرے نصیب سے لڑگئی بُری چڑی کیٹکو کی میرے پچھے بی پڑگئی بُری چڑی
جب میں بی تیسرا تیزی کو پیدا ہوئوں کتے آکو پلنگ کنے بی اُجڑ گئی بُری چڑی
غلطی سے میری چھوں پو دلندر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

ڈر ڈر کو زندگی کی یوں بنڈی ہکال رئوں گھر بھر کو پھر بی بچوں کے مندے کو پال رئوں
کیا کیا کی کرکو لوگاں تو آنے سے روک رئیں میں آنے والے منّے کے رُکنے کو ٹال رئوں
منجے مرے پڑوس کے دھنگر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

ہندوں کو دِکھا توں رَ رَستہ ہکل کو میں کھڈّے کو بولتوں کھ کھ کھڈّا ہکل کو یئں
جب بی نہ نہ نہ نزلے کا جمائے عقل پو دھیئں کرتوں شہ شاعری بی ذ ذرّا ہکل کو یئں
منجے ہ ہ ہکلتے وے شاعر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

میں روز روز رنگ بدل رئوں ہوا کے نات مُوں اپنا موڑ موڑ کو چل رئوں ہوا کے نات
میں بی آتا نا پڑ کو یوں آپلے سے بھار ہوں پُھٹ پُھٹ کو روز بھار نکل رئوں ہوا کے نات
جب سے میرے بی ٹیوب کو پنکچر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

چپٹی چڑا کو، باتاں بی کرتوں میں کوڈ میں میرا شمار ہونے لگائے وقف بوڈ میں
ہر روز مُوں ہندیرے سے لے کو یوں شام تک سارے غموں کو بھُل کو جو رہتوں میں لوڈ میں
میرے پو بی ایکسائز منسٹر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

یں ڈنک مار مار کو لہوسوب کا چوس رؤں   اِک لت پڑیئے منجے بی تو لہو سوب کا چوس رؤں
چانول کے، تیل کے کبی شکر کے، گوڑ کے   بھاواں بڑا بڑا کو جو لہو سوب کا چوس رؤں
کھٹمل کی چھوں پڑیئے کبی مچھر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

میرے ملک یں سوب کا یوں لونتہ اُداس ہے   ارماں لہو لہواں، بلکتی وی آس ہے
یہ کیسی جھال مار یئے مرے خاندان کو   پانی کی نئیں ہے بھائیوں کو لہو کی پیاس ہے
گٹکنٹ لو میرے پیاسے سمندر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

بھر بھر کو پیالے میٹھے، زہر کے یں باٹ رؤں   دِنک کے نات اپنے ملک کو یں چاٹ رؤں
ہنسا کا راگ گا کو اہنسا کے نام پو   کنولے سروں کے مولکے نفرت سے کاٹ رؤں
اشرف منجے بی بجلیچے لیڈر کی چھوں پڑیئے
آدمی ہوں پن کی منجے بی جنور کی چھوں پڑیئے

●

چٹ لگیئے اچار کی

اُس کی ہراک بات فقط پیار کی مٹار کی   راگنی ہمیشہ اُنے چھیڑ تیئے ملہار کی
شادی کر کو جب سے یں بی زلفوں کا قیدی بنوں   میری انٹری سٹر کو منجے لت پڑیئے ڈکار کی
یں پلنگ کی پٹی بنوں چاک اُنے نوار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ[1] لگیئے اچار کی

سب کے دھن[2] مڑیاں تو کب کی کٹ کو فراغت ہوئیں   میرے دھن مڑیوں یں آبی کتے کی فصلاں کھڑیئں
کتے کی لوگوں کی آرزوؤں پو راشن لگائے   نکو بولے تو بی میرے گھر یں پلٹناں[3] لگیئں
میری چھاونی یں بی اک فوج ہے ڈھگار[4] کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

جھنجھنا بنا کو مری ہڈی پسلی توڑ کو!   گلگلہ سمج کو منجے چو طرف جھنجھوڑ کو
پلپلہ بنا کو رکھ دی ڈھولویں لیمبو کے نات   چنڈی چنڈی کر کو چھوڑی زندگی نچوڑ کو
یں چپک کو چمبو بنوں، بھینس اُنے برار کی
پھر بی مری سنولی بی کو چٹ لگیئے اچار کی

▲▲

[1] چاٹ [2] دھان کی کیاریاں [3] پلٹن کی جمع [4] ڈھیر ساری

ڈاکٹر نیساء صدیقی
جنرل سکریٹری زندہ دلان
(شکاگو)

شکاگو میں مشاعرۂ طنز و مزاح

ڈاکٹر سید سلیمان جلیل کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جلسۂ تحسین اور مشاعرہ ۲۸ جون ۱۹۹۷ء کو بمقام انڈو امریکن کمیونٹی سنٹر دیوان پر منعقد ہوا محبت خلوص اور عقیدت بھری اس شام کو محترمہ غوثیہ سلطانہ نے سارے یونائیٹڈ اسٹیٹ سے شعرائے کرام کو جمع کرکے ایک اچھا اور نیا کام یہ کیا کہ اس میں ایک مقصد بھی رکھا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر جلیل کی چھ ماہی طویل علالت اور ان کی اہلیہ کی صحت کی نازک گھڑیوں میں کیسہ زر پیش کرنے کی ٹھانی۔ اسٹیٹس میں شاید یہ پہلا مقصدی مشاعرہ تھا۔ محترم سید ضمیر جعفری (نیویارک) جعفر رضوی، عطرت حسین (بالٹی مور واشنگٹن) عبدالوہاب کلیم (اوہائے او) صفوت علی، (کنیکٹیکٹ) ٹی وی پاکستان کے مسرور جاوید اور خالد عرفان (جو ابھی ابھی پاکستان سے یو ایس اے کے آسمان ادب پر براجمان ہوئے ہیں اور ہیوسٹن) اس منفرد محفل میں شرکت کی مہمان خصوصی ضمیر جعفری صاحب نے چار چاند لگادیئے پروگرام قرأت اور نعت سے شروع ہوا ابتداء میں محترمہ غوثیہ سلطانہ معتمد عمومی زندہ دلان نے کہا کہ ہمیں ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور کاوشوں کو سراہنا چاہیئے۔ شاعر یا فن کار کو اس کی زندگی میں وہ خراج پانا چاہیئے جس کا وہ مستحق ہے۔ ہمیں مردہ پرستی چھوڑ دینی چاہیئے۔ ہم ایک ایسے ترقی یافتہ ملک میں سانس لے رہے ہیں جہاں آنے والے دور کی باتیں اور پیشن گوئیاں کی جاتی ہیں۔ کیسہ زر ایک پرانی اور اچھی روایت ہے جسے زندہ دلان نے دہرا کر ایک اچھے کام کی داغ بیل ڈالی ہے۔ انھوں نے کہا مٹھی بھر کمیونٹی کے لوگ صرف ایک دوسرے پر انگلیاں اُٹھاتے ہیں اسی لیے دنیا میں نفرت کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو ان مٹھی بھر لوگوں کی ایک مثالی کمیونٹی بن سکتی ہے۔ اسلام اور اخلاق کی بنیاد پر ایک بے مثال نمونہ قائم ہو سکتا ہے۔ محبت خلوص کی اس محفل میں خود ڈاکٹر جلیل شامل ہو سکتے تو محفل کا صحیح لطف حاصل ہوتا۔ لیکن ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہم وقت پر انسان کی اہمیت کو نہیں محسوس کرتے۔

احسن قریشی اور زین العابدین نے ہندوستان سے آئے ہوئے اکابرین کے پیغامات کے اقتباسات پڑھ کر سُنائے جو زندہ دلانِ شکاگو کے لیے یقیناً باعثِ افتخار اور ہمت بندھانے والے ہیں۔ جناب مجتبیٰ حسین جناب زاہد علیخان ایڈیٹر سیاست، جناب محمد حمایت اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور جناب مظفر مجاز کے پیامات کو سوونیر میں بطور دستاویز محفوظ کرتے ہوئے ادارہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے۔ ان پیغامات سے اخلاص کی نعمت

پا کر پڑھنے والے اس بات کے قائل ہو گئے کہ حیدرآباد نہ صرف اردو ادب کا گہوارہ رہا ہے بلکہ تہذیب و تمدن انسانیت پسندی کا مخزن بھی ہے۔

تقاریر کی ابتداء ڈاکٹر جلیل کے ہم محلہ جناب واحد ندیم کے تاثرات سے کی گئی جس میں انھوں نے اپنے دوست کی ادبی خدمات کے علاوہ بزلہ سنجی اور برجستگی اور مزاج کی شگفتگی پر روشنی ڈالی اور صحت کی دعا کی۔ جناب عبدالملک سعیدی نے پر خلوص انداز میں ڈاکٹر جلیل کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر توفیق احمد دکنی نے انھیں "سوچ کے راستے کا سربست" کہا اور صحت کی دعا کی۔ ڈاکٹر مظفر فاروقی نے اپنی مختصر تقریر میں ڈاکٹر جلیل کی نثر نگاری کو سراہا اور زندہ دلان شکاگو کی اس کوشش اور مقصدی کام پر مبارکباد دی —— ڈاکٹر خورشید خضر کا اپنے بچپن کے ساتھی کی علالت کا غم ان کی جذباتی تقریر سے ظاہر تھا انھوں نے کہا کہ خدا کرے اگلی بار وہ ہمارے ساتھ بیٹھے مشاعرہ سن رہے ہوں۔ ڈاکٹر جلیل کی نظم پر رات پڑھی ؎

یہ رات اگر دن کے حوادث کو بھلا دے ۃ زلفوں کی گھنی چھاؤں میں کچھ دیر سلادے

اس کے بعد ناظم مشاعرہ محترمہ غوثیہ سلطانہ نے جناب خلیل الزماں خاں کو دعوت دی۔ انھوں نے دو قطعات سنائے پہلا قطعہ ڈاکٹر جلیل کے لیے یوں ہے

دل کے اک اک تار کو چھوتی ہوئی وہ تیری بات ۃ گفتگو کا وہ تیرا انداز وہ تیرا حسن
پیش کرتا ہے ادب تجھ کو عقیدت کا خراج ۃ اے سلیمان زمانہ اے جلیل نیک فن

دوسرا قطعہ غوثیہ سلطانہ کے لیے کہا۔

وہ جن کے نام سے ہے زندہ یہاں اردو زباں ۃ یاد رکھیں گے انھیں اہل زبان اہل چمن
اے شکاگو فخر کر تجھ میں ہے زندہ نشاں ۃ غوثیہ سلطانہ جنکی ذات ہے اک انجمن

ڈاکٹر یوسف اعظمی نے سماج اور شاعر کے عنوان پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادیب سماج کا ضمیر ہوتا ہے بزرگ شاعر نیاز گلبرگوی نے غوثیہ سلطانہ کو زندہ دلان شکاگو کی ایک شمع درخشاں کہتے ہوئے ان کی کاوش کو سراہا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ زندہ دلان شکاگو نے ایک ،اور نئی سجھائیے انداز سے سجائی ہے۔ خدا کرے یہ چھوٹا سا دیا روشن رہے۔ فکر رسا اور تخیل فلک پیما رکھنے والے خواجہ ریاض الدین عطش نے اس فنڈ ریزنگ اجتماع کو جراٴت مندانہ قدم قرار دیا۔

آخر میں اس نشست کے صدر ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے سماں باندھنے والی مختصر تقریر فرمائی جب کہ ان پر ناظم مشاعرہ نے وہ قانون لاگو نہیں کیا تھا۔ آپ نے غوثیہ سلطانہ کی محنت اور جذبۂ انسانیت کو سراہا اور کہا کہ کیسۂ زر اچھی روایت ہے اور آج کل تو کیسۂ زر کا پیرہن بھی کاغذی ہوتا ہے۔ ہم سب کو اس سلسلہ میں کوششیں جاری رکھنی چاہئیں اور آئندہ ایسی محفلیں منعقد ہوتی رہیں جس کی داغ بیل زندہ دلان نے ڈالی ہے۔

دوسری نشست کے صدر جناب عطرت حسین عطرت کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ عطرت حسین فرماتے ہیں ؎

جب تیری بزم کا دستور یہ ٹھہرا ساقی
زہر پی لوں گا تیرے ہاتھ سے صہبا کیا

اس تقریبی نشست کے آخر میں ڈاکٹر جلیل کی والدہ صغرا بیگم اور اہلیہ فرحت جلیل کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتے ہوئے حسن چشتی صاحب کی جانب سے ذکیہ زماں خاں نے انھیں شالیں پیش کیں ــــ لیجیے صاحب اس کے بعد وہ گھڑی آ پہنچی جس کا سبھی کو انتظار تھا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ سید ضمیر جعفری کی موجودگی اس محفل کا افتخار تھا۔ جو خاص کر نیویارک سے اس محفل کے لیے تشریف لائے اور زندہ دلان شکاگو کے اس مقصدی پروگرام میں شامل ہوئے۔ آپ کا تعارف شکاگو کی جانی مانی محترمہ اعجاز نسرین نے کرایا جو سید ضمیر ہی کے گھرانے سے دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ سید ضمیر جعفری باوجود ناسازئ مزاج کے تشریف لائے زندہ دلان کی معتمد عمومی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس خاتون کا نام رضیہ سلطانہ ہونا چاہیے اور کہا وہ کونسا غم ستا رہا ہے جس کی وجہ سے آپ لوگ مزاح کی طرف راغب ہوئے ہیں۔

ناظم مشاعرہ نے کہا کہ جناب جعفر رضوی واشنگٹن ڈی سی سے خاص طور پر اس محفل کے لیے تشریف لائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ؛ ڈالر ہوں پاس پھر تو سارا جہاں ہمارا

نیویارک میں نووارد مگر جنھیں ادب کا عرفان حاصل ہے۔ خالد عرفان کہتے ہیں۔

جیب پر قینچی چلا دیتا ہے یہ زلفوں کے ساتھ ؛ سب سے دولت مند تو حجام امریکہ میں ہے

ایک اور نوجوان شاعر زین وارثی (نیویارک) کے بعد عبدالوہاب کلیم نے دکنی چٹخاروں کے ساتھ کلام سنایا۔ سردرہ جاوید (پاکستانی ٹیلی ویژن نیویارک) اور صفوت علی (کنیکٹکٹ) نے خاص طور پر اس پروگرام میں حصہ لیا میزبان شعراء کا کلام شکاگو میں قدر دوام رکھتا ہے۔ جناب شاہد اسحٰق نے کہا

یہ کہاں لا کو پٹخیا رے کیا ملک ہے ؛ ارے وہ مقدر تو کیسا کھڑک ہے

ڈاکٹر رفیق سیٹھی نے وطن کی باتیں وہ دھوبی کا گھاٹ، وہ بچپن کی یادیں سنا کر خوب داد حاصل کی۔ ڈاکٹر خورشید خضر ڈاکٹر فخری نے کلام سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ تابش خانزادہ کالم نگار پاکستان لنک نے خاص طور پر اپنا کلام کیلی فورنیا سے فیکس کیا تھا وہ کہتے ہیں ؎

یار کے کان میں جو بالی ہے۔ وہ کریڈٹ پہ لے کے ڈالی ہے

ایک ہی ہاتھ سے یہ بجتی ہے۔ گال میرا ہے اسکی تالی ہے۔

رات تین بجے محفل کا اختتام عمل میں آیا راقم نیساں صدیقی جنرل سکریٹری زندہ دلان شکاگو نے سامعین اور کرم فرما کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرداً فرداً نام لیا۔ جن کی بدولت محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ محترمہ غوثیہ سلطانہ کی ادارت میں جناب نیاز گلبرگوی ڈاکٹر یوسف اعظمی، خواجہ طارق، نیساں صدیقی، سیدہ ناصرہ اور نعمان دلوان پرنٹرز کے اشتراک سے سوونیر منظر عام پر آسکا۔ اردو کتابت کی ہمیں وہ سہولتیں میسر نہیں ہیں جو ہندوپاک میں ہوتی ہیں پھر بھی جنون کی حد تک کوشش کی گئی ہے۔

بال کی کھال

تبصرہ

حیدر بیابانی کی ننھی منّی باتیں

یوسف ناظم

مجھے ایسا خیال پڑتا ہے کہ کبھی میں نے ایک شعر ڑھا تھا جس کا دوسرا مصرعہ کچھ اس طرح کا تھا کہ "مجنون ے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے"..... ایک شاعر کا شورہ کئی لوگوں کو ناگوار گزرا۔ اُن لوگوں میں سے ایک ارے حیدر بیابانی بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی لمی صلاحیتوں کو بہت اچھی طرح پروان چڑھانے کی اطر بیابان کی رہایش اختیار کی تھی وہ بھی جزوقتی یعنی بان میں رہتے نہیں تھے صرف وقت کاٹنے جاتے تھے یسے لوگ گھر کے مسایل سے بچنے کے لیے کسی پارک میں چلے تے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ حیدر بیابانی ہ جنگل کے حالات کا وہاں کے ماحول کا اور وہاں ہونے والے تعات کا گہری نظر سے اتنا مطالعہ کیا ہے کہ انھوں نے اس ضوع پر ایک کتاب لکھ ڈالی کتاب کا نام رکھا "بے زبانوں دنیا" یہ کتاب اتنی اچھی ثابت ہوئی کہ ہمارے دلی ہ ترقی اردو بیورو کو بھی پسند آگئی اور ان لوگوں نے سے بڑے اہتمام سے شائع کیا ۱۲۸ صفحوں کی یہ کتاب ابت طباعت، نفاست ظرافت کا عمدہ نمونہ ہے۔ ظرافت کا اس لیے کہ کتاب میں چوہے میاں کی شادی ھسے کی نوکری اور جانوروں کا الکشن جیسی نظمیں شامل ں۔ اس کتاب میں ۶۰ نظمیں ہیں جو ساری کی ساری در بیابانی کی لکھی ہوئی ہیں لوگوں کا خیال ہے کہ شاعر ے یہ نظمیں اچل پور شہر کے قریب کے جنگل میں بیٹھ کر لکھی ہیں۔ شاعر کا مقام نشست پیپل کا ایک درخت ھا اور شاعر اس درخت کے نیچے صرف اُس وقت بیٹھتا تھا جب اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اب درخت پر کوئی پرندہ موجود نہیں ہے (شاعر کو اندازہ تھا کہ پرندوں کا معدہ کمزور ہوتا ہے)

"بے زبانوں کی دنیا" تو خیر اچھی کتاب ہے ہی لیکن خود بیابانی کا خیال ہے کہ ان کا رنگ اصل میں "ننھی منّی باتیں" کی نظموں میں ابھرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا خیال صحیح ہے (شاعر بھی سچ بولا کرتے ہیں) میں اس وقت اُن کی ننھی منّی باتوں یعنی حصہ سوم کی بات کر رہا ہوں کتاب نرالی دنیا پبلی کیشنز نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا مالی تعاون بھی اس میں بولتا نظر آ رہا ہے۔ اتنا عمدہ کاغذ بھی ہمارے یہاں دستیاب ہوتا ہے اس کا علم بھی اس کتاب کے ذریعہ مجھے ہوا۔ کاغذ خاصا دبیز ہے (کاش ہمارے یہاں دودھ بھی اسی دبازت کا ہوتا دودھ تو اب اتنا پتلا ہوتا جا رہا ہے کہ پینے والوں کی حالت پتلی ہو جاتی ہے بس اس کی قیمت ہی موٹی ہوتی جا رہی ہے) کتاب کا سرورق دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے سرورق پر تین بچوں کی تصویریں ہیں۔ ایک کمسن بچہ جو کھیل رہا ہے دوسرا ذرا بڑا طالب علم معلوم ہوتا ہے اور تیسرا سند یافتہ۔ رنگ میں نے گنے نہیں لیکن شاید پانچ رنگ ہیں۔ کتابت بھی عمدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کاتب نے دل لگا کر کتابت کی ہے ورنہ آج کل کاتبوں کا، جو بھی دل ہوتا ہے وہ کہیں اور لگا ہوتا ہے۔ رہیں نظمیں تو ظاہر ہے حیدر بیابانی کی کہی ہونے کی وجہ سے عمدہ ہیں۔

کتاب کے ۴۴ صفحوں پر نظمیں ہی نظمیں بکھری ہوئی ہیں

میں شاعر کے حالاتِ زندگی سے واقف نہیں ہوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان کا اسماعیل میرٹھی سے یقیناً ادبی رشتہ ہوگا۔ اسماعیل میرٹھی نے شاید اتنی نظمیں نہ کہی ہوں جتنی کہ حیدر بیابانی نے کہی ہیں اور مزید کہنے کا ارادہ کر چکے ہیں (اسماعیل میرٹھی شاید کچھ دوسرا کام بھی کرتے ہوں گے)

حیدر بیابانی کی کتابوں پر اب کسی تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے (پہلے بھی نہیں تھی) انھوں نے تو نئی نسل پر قبضہ کر لیا ہے وہ اب راستہ بھی چلتے ہوں گے تو بچے ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوں گے۔ یہ مقام ادب کے ہر راہ رو کو نہیں ملا کرتا اور شتی یہ خصوصیات بھی ہیں اور اوصاف بھی۔ حیدر بیابانی دونوں میں استاد کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ان کی شعر گوئی کے تعلق سے اتنے لوگوں نے تبصرے کئے ہیں کہ اب انھیں مزید کسی تبصرے کا انتظار نہ ہوگا نہ ہی ان تبصروں کو سنبھال کر رکھنے کی جگہ ہوگی۔ میں نے شاعر کی نظموں کے علاوہ ماہرین ادبِ اطفال کے تبصروں اور رائے دہندگان کی رایوں کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ساری رائیں سچی ہیں اور ان میں مبالغے کا ذرا سا بھی عنصر شامل نہیں ہے۔ حیدر بیابانی واقعی بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہیں۔ پختہ عمر کو پہنچنے کے لئے اپنے ذہن و دماغ کو بازیچۂ اطفال بنانا ایسا ہی ہے جیسے از سرِ نو اپنی بسم اللہ کی تقریب منانا اور موتی چور کے لڈو ہاتھوں میں لے کر اپنی تصویر کھنچوانا۔ اپنی نظم جی کرتا ہے میں وہ کہتے ہیں۔

جی کرتا ہے کب سے میرا میں بھی پڑھنے لکھنے جاؤں
علم و دانش کی دولت کو اپنے دامن میں بھر لاؤں

تو کس نے منع کیا ہے آپ کو حیدر بیابانی صاحب) لیکن پوری نظم پڑھنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ ارے یہ نظم تو ایسے بچے کی طرف سے کہی گئی ہے جو پڑھنے لکھنے کی خواہش دل میں رکھتا ہے۔ ان کی نظم "دیکھ کے چلنا" بھی مجھے بہت پسند آئی اس لیے کہ لوگوں کی عمر سڑک پر چلتے چلتے سڑک کی طرح لمبی ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی انھیں چلنا نہیں آتا کم سے کم راستہ تو دیکھ کے چلنا چاہیئے۔ جنگل بیابان کی بات اور ہے حیدر بیابانی تو جب وہاں بھی جاتے تو آنکھیں کھول کر راستہ چلتے تھے حالانکہ بیابان میں ٹریفک کا کیا مسئلہ لیکن احتیاط بڑی چیز ہے اور یہ ہر جگہ کام آتی ہے خاص طور پر راہ ادب میں۔

حیدر بیابانی سے بچوں کے والدین خوش ہیں یا نہ انھیں پرواہ بھی نہیں ہوگی بچے تو بہر حال خوش ہیں میری بھی بوجھی رائے یہ ہے کہ حیدر بیابانی نے بچوں کی نفسیات سے اتنی واقفیت حاصل کر لی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو نومولود بچوں کے لیے ہی نہیں نامولود بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی صحت کے تعلق سے سنا ہے کہ ماشاء اللہ وہ اچھی صحت اور مضبوط جسم کے مالک ہیں یہ سب بچوں کی دعاؤں کا طفیل ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ایک بچے کی خفیف سی مسکراہٹ بھی ایک دعا ہوتی ہے

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس: 8/25/8-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد اے پی

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسائی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں 1۔ غربت ہٹاؤ اسکیم 2۔ خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 مارچ 97ء تک 68421 افراد میں 2115.89 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 8975.60 لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1937 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 217.21 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 586.67 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشن، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔

٥ خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد احمد شریف
یم کام یل یل بی
صدر نشین

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

۲۵ سالہ نثری انتخاب

جلد ۳۰   شمارہ : ۹   ستمبر ۱۹۹۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال   مہمان مدیر : سکندر علی خان

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی :

حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
محمود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمن سلیم (ریاض)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس مشاورت :

نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم۔ اے باسط۔ آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
حمایت اللہ

کمپوزنگ سان SAN کمپیوٹرز چنچل گوڑہ

طباعت اسپیڈ پرنٹس برائے
دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

مجلس ادارت :

منتظر ممتاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

قیمت فی پرچہ	=	۲۰ روپے
زر سالانہ	=	۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے	=	۳۰ ڈالر

سرورق شعیب ربانی

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ۔
۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۱

فون (آفس) 595716
فون (رہائش) 4576064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

الفلاح
کمپنی (رجسٹرڈ)

کی طرح منفرد

کی طرح مستحکم

نظر اٹھائیے دیکھئے الفلاح کی جانب
رواں دواں ہیں بلا سودی کاروبار یہاں

تاج محل کی طرح منفرد اور چار مینار کی طرح مستحکم

بلا سودی کاروبار کے ذریعہ اطمینان بخش کمیشن فراہم کرنے والا منفرد ادارہ

اپنی رقم مشغول کرکے ہر ماہ گھر بیٹھے کمیشن حاصل کرتے رہیئے!!

آپ کے روپے کی حفاظت کا یقین دلاتی ہے

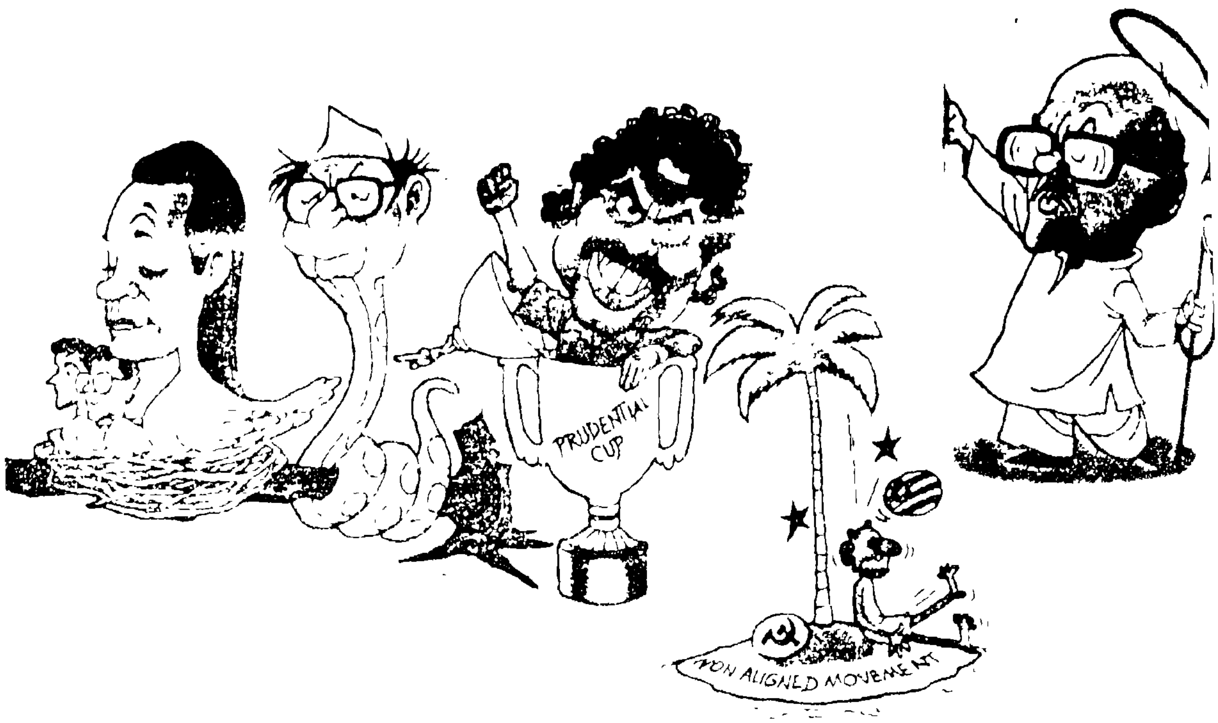
اس میں سرمایہ مشغول کرکے اپنے خاندان

کی طمانیت حاصل کیجئے

الفلاح کمپنی رجسٹرڈ



AL FALAH COMPANY
POLICE COMMISSIONER OFFICE ROAD
PURANI HAVELI HYD PHONE
PIN 500 002 FAX 040 4565844


PRUDENTIAL CUP
NON ALIGNED MOVEMENT

آندھراپردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس: 8/825-1-4 سکنڈ فلور، لکشمی اسٹیٹ، عابد روڈ، حیدرآباد، ای - پی

حکومت آندھراپردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسائی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔ ا۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش اگر بتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی لاگت کے کاروبار کے لیے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6.5% پر دیا جاتا ہے کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31/ مارچ 97 تک 68421 افراد میں 2115 89 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 8975.60 لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1937 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 21 217 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 67 586 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93 سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائیٹنگ وغیرہ میں ٹرینڈ کرایا گیا ہے۔ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں

خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد احمد شریف
یم۔کام، یل۔یل۔بی
صدر نشین

شوکت تھانوی

تعزیت



نام ** محمد عمر

تاریخی نام ** تسخیر احمد

قلمی نام ** شوکت تھانوی

پیدائش ** ۲ فروری ۱۹۰۴ء

مقام پیدائش ** تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر

پہلا مزاحیہ مضمون ** "میٹھے چاول"

تصانیف ** بے شمار (نثری و شعری)

وفات ** ۴ مئی ۱۹۶۳ء

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرماکر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟

ماشاء اللہ ایک سو یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔ لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے، دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ ہوتا تھا اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے۔ لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولاد کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا۔ لیکن سوال ہے کہ ریاض بے چارے اپنے لئے والد کا انتظام کیونکر کرتے۔ ان کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے اس لئے کہ وہ غریب ان ہی حضرات کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں۔ اور ان کو ان ہی کے ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا۔ لہٰذا ان کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے ان سے جدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لئے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا ہی لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لئے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لئے جانا تھا ان سے اظہار ہمدردی کرنا تھا۔ جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔

بہرحال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے اس لئے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لئے آچکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگرچہ کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لئے کہ خود ہم نے بہ نفس نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا، جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ لہذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادہ کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دے کر یکجا کرنے شروع کر دیئے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارا ہے صبر کیجیے جس کی چیز تھی اس نے لے لی دنیا کا یہی دستور ہے مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے کیا علیل ہوئے تھے ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے آج وہ کل ہماری باری ہے خدا بخشے عجیب انسان تھے دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد مگر صبر کیجیے اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہر ایک پر دن آنے والا ہے دنیا سرائے فانی ہے کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش کبھی نماز قضا نہیں گئی خدا نعم البدل دے گا۔ اپنے سینے کو سنبھالئے.. صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن الٰہی عاقبت محمود گرداں چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کر نہ لے اس کے لئے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا۔ لہذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "اکسپرٹ" ہو گئے۔ تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے، گویا یونیورسٹی کے امتحان میں بیٹھنے کے لئے جا رہے ہیں راستے بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہو گئی۔

مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی واللہ دل کو یقین نہیں آتا عجیب سانحہ ہے، عجیب حادثہ ہے خداوند کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجیے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، آپ کی قسمت میں غم لکھا تھا حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جس کی چیز تھی اس نے لے لی "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے روحیں آزاد نہ ہوں جسم جو برباد نہ ہوں ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن مریں گے تو سانچے میں ڈھل جائیں گے، وہ جنت کا اک پھول تھے .. حوروں کی، گود میں ہوں گے، نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے لائق، پڑھے لکھے، فخر خاندان مختصر یہ کہ خدا آپ کا غم غلط کرے۔ مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا مٹی دینے میں شرکت کرتا۔ نماز جنازہ میں شریک ہو جاتا مگر افسوس کہ "آج وہ کل ہماری باری ہے چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔

ریاض کے دروازہ پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خط لے جائیے" کی آواز دیں۔ لیکن یاد آگیا کہ موقع غم کا ہے۔ فوراً اپنا چہرہ اداس بنالیا اور مری ہوئی آواز سے پکارا "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا۔ اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔ "السلام علیکم"

انہوں نے اس کے جواب میں "والے کم اس سالام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کیا ہمارا بھی دل بھر آیا۔ لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا۔ ہم تعزیت کے لئے آئے تھے۔ لہذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھا۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر

ہرانا شروع کی لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جارہے تھے۔ لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش ر رہے تھے۔ لیکن اس کی ہربچکی خیالات منتشر کردیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے جب اسی میں بڑی دیر ہوگئی تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بری بات ہے کہ وہ تو روتے روتے جان دیئے دیتا ہو اور ہم چپ بیٹھے ہیں، مجبوراً ہم نے طے کرلیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہوگا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے ہیں بس بات شروع ہونے کی دیر تھی، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں۔ چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آکر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا لاحول ولاقوۃ یہ بھی کوئی بات کہ تعزیت کے لئے آئے ہیں۔ اور آدھ گھنٹے سے بت بنے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سرنو یاد کیا۔ اور آنکھیں بند کرکے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ کے والد " پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آگیا تو عرض کیا۔

آپ کے والد "ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا۔ مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ ۔

"آپ کے والد آپ کے والد آپ کے والد خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے کمبخت گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا۔ لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو۔ لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ، اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر میں نے ہی سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہوگیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی زندگی بھر روزے رکھتے رہے۔ آپ کے والد مرحوم، مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ صبر کیجیے۔ اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد آپ کے والد آپ کے والد جس پر گذری ہو یہ وہی جانے مگر اب نہ روئیے جانے بھی دیجئے بنائیے بھی اس قصہ کو آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہوگیا تھا اور گردن جھکائے بیٹھا خاموشی کے ساتھ میرے مناظر رہا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھاکر میرے منھ کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

"باپ بھی دنیا میں عجیب نعمت ہے۔ بہت سے بے چارے اس ارمان میں مرے جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے"

ریاض برابر میرا منھ دیکھے جارہا تھا، لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا اور اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جمادیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو آنہیں سکتے، مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے، ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچانا، یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے، مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرض محال یعنی کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی۔ نماز جنازہ تو ضرور ہوئی ہوگی۔" ریاض نے

مخنی آواز میں جواب دیا۔
جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔
میں۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دے گا۔ اور قبر کا کیا ہوا ہوگا۔
ریاض۔ عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی۔
میں۔ ہاں واقعی اور تم بے چارے کیا کرتے، تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہوں گے، دنیا سرائے فانی ہے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا اور بیماری کیا تھی؟
ریاض، ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے۔
میں۔ ہاں بڑی مہلک بیماری ہے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔
ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا کم بخت اب تو عالم گیر ہوتی جاتی ہے، غم کا پہاڑ پھٹ پڑا۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی۔
ریاض۔ ایک تو میں ہوں۔
میں (جلدی سے) تم تو خیر ہو ہی مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں ارے ہاں کیا تعجب ہے؟
ریاض۔ جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔
میں۔ وہی مطلب ہے میرا۔ اور ان کی بیوہ کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟
ریاض۔ جی ہاں۔ میری والدہ تو عرصہ ہوا، یعنی میری پیدائش کے وقت ہی انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں۔ جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔
میں۔ ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا۔ مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ، صبر کیجئے اور آپ کے والد ماجد کی ماشاء اللہ کیا عمر تھی؟
ریاض۔ سو سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے۔
میں۔ افسوس صد افسوس ؎ حسرت ان غنچوں پہ ہے۔
ریاض نے مجھ کو کچھ اس طرح دیکھا، جیسے میں دنیاداری کر رہا ہوں اور یہ سب صنع ہے مگر میں نے موثر انداز میں کہا۔
"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے۔
ریاض۔ جی ہاں ان کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا
میں۔ ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے، ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن خدا جانے کس کی نظر کھا گئی تو سب سے بڑے آپ ہیں؟
ریاض۔ جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔
میں۔ گھبرائیے نہیں جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے، وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ عجیب ذات شریف تھے۔ مرحوم نے کبھی نماز قضا نہیں کی خود ان ہی کی قضا آ گئی۔

؎ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے، دنیا سرائے فانی ہے، ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟

ریاض ۔ جی ابھی تو نہیں ہوئی

میں ۔ (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ ۔

ریاض ۔ اس کا یہ کون سا موقع ہے بھلا ۔

میں ۔ تو اب اور کون سا موقع آئے گا ۔

ریاض ۔ اب خوش ہونے والا کون ہے جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی ۔

میں ۔ ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں ۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے جس کی چیز تھی اس نے لے لی ۔ مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو ۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں

اگر پدر نتواند پسر تمام کند ا

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ؎

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں ۔ اب دیکھو نہ چچا میاں مرحوم بے چارے آخر کیا بیمار تھے یہی نا کہ بس قضا آگئی ۔ ورنہ کہیں مرنے والے تھے ؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مرجائیں گے ؟ مگر خدا کی مصلحت اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے، اب تم کو کون اس طرح چاہے گا ۔ ... شفقت کرنے والا اٹھ گیا، تم یتیم ہوگئے ۔ تم پر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا ؎

13

دل سا منے اولاد سے انصاف طلب ہے ۔

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں، تمام الفاظ ختم ہو چکے، کیا ان ہی کو پھر شروع کر دوں لیکن اگر انہوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا ۔ آخر کار دل نے کہا کہ بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا ۔ مگر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑ لہذا ہم نے کہا ۔

"بھائی رونے کے لئے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاءاللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہوگے ۔ مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیے ۔

ریاض کی ہچکیاں، سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں، تو میں نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اچھا بھائی اب اجازت دو ۔ "

ریاض کے یہاں سے آکر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیئے تعزیت کے لئے روز چلا جایا کروں ۔

(مطبوعہ دیڑھ ماہی شگوفہ ، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۹ء)

کنھیالال کپور

اور ابلیس نے کہا



پیدائش ** ۲۷ / جون ۱۹۱۰ء
مقام پیدائش ** چک، ضلع لائل پور (پاکستان)
تعلیم ** ایم۔ اے (انگریزی)
ملازمت ** لکچرر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور، ۱۹۴۷ء کے بعد پرنسپل ڈی، ایم کالج موگا (پنجاب)
کتابیں ** سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، نوک نشتر، بال و پر، نرم و گرم، گرد کارواں، گستاخیاں وغیرہ
انتقال ** ۵ / مئی ۱۹۸۰ء

اور وہ ایک اونچے چبوترے پر کھڑا ہوگیا اور اس نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "میں خدا کا دوست ہوں نہ اس کا بیٹا۔ میں خدا کا اوتار بھی نہیں۔ میں تو اس کا دشمن ہوں۔ میں خدا کی رحمت سے مایوس ہوں۔ لیکن انسان کی شفقت سے کبھی محروم نہ رہا۔

خدا نے مجھے دھتکارا۔ انسان نے سرآنکھوں پر بٹھایا۔ مجھے فخر ہے کہ انسان نے ہمیشہ میرے پیغام کو پیغمبروں کے فرمان پر ترجیح دی۔ تم میرا وعظ سنو۔

میں کہتا ہوں خوش قسمت ہیں امیر کہ زمین کی بادشاہت ان کی ہے۔ سچ پوچھو تو آسمان کی بادشاہت بھی انہی کی ہے۔ کیونکہ کسی نہ کسی چور دروازہ سے وہ بہشت میں ضرور داخل ہو جائیں گے۔

خوش نصیب ہیں امیر کہ انھیں اس دنیا میں حور و غلماں دستیاب ہیں۔ اور وہ فرانسیسی وہسکی کے جام لنڈھاتے ہیں۔ غربا کی طرح تاڑی اور ٹھرا نہیں پیتے۔

قابل رشک ہیں امیر کہ وہ روپے سے ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں۔ چاہے وہ چیز کسی رہنما کا ضمیر ہو یا کسی خاتون کی عصمت۔

نہایت دانشمند ہیں امیر کہ غرباء پر لعنت بھیجتے ہیں اور بڑے سادہ لوح ہیں غریب کہ سمجھتے ہیں ان کی زبوں حالی کے لئے امیر ذمہ دار نہیں۔

قابل مذمت ہیں غریب کہ جن کے خیال میں سب سے دولت صبر۔ سب سے بڑا آسرا قسمت اور سب سے بڑی عیاشی فٹ پاتھ پر سونا ہے۔

بہت چالاک ہیں سرمایہ دار کہ اشتراکیت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پرولتاریوں کی حکومت میں ان کی دال نہیں گلے گی۔

بڑے عجیب ہیں غریب کہ جنھیں دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر ستاتی ہے۔

اور تم سے کہا گیا خدا تمہارا آسمانی باپ ہے اس کی اطاعت قبول کرو۔ لیکن آفرین کہ تم گمراہ نہیں ہوئے اور تم نے روپے کو ہی آسمانی باپ سمجھا۔

اور تمہیں یہ سبق پڑھایا گیا اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ رسید کرے تو اسے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ لیکن تم نے اس قسم کی فراخدلی دکھانے کی کبھی غلطی نہیں کی۔ تم نے اس کے گال پر زناٹے سے دو تھپڑ رسید کئے اور آئندہ اس کی جرات نہیں ہوئی کہ تم پر ہاتھ اٹھا سکے۔

اور تمہیں بتایا گیا۔ خون کا بدلہ خون نہیں، آگ سے آگ بجھائی نہیں جا سکتی۔ لیکن میں کہتا ہوں جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ خون اور آگ سے ڈرتے ہیں۔ تم ان کی باتوں میں مت آؤ۔

اور تمہیں بار بار یہ تلقین کی گئی تم اپنے نفس امارہ کو مارنے کی کوشش کرو لیکن تم نے دیکھا ایسا کرنا کتنا مشکل ہے پس اسے زندہ مارنے کے بجائے زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔

اور تمہیں سمجھایا گیا گناہوں سے توبہ کرو نہیں تو خدا کو کیا منھ دکھاؤ گے۔ تو تم ان سے کہو اول تو ہم خدا کو منھ نہیں دکھائیں گے اور اگر دکھانا پڑا تو منھ پر نقاب ڈال لیں گے۔

اور تمہیں آگاہ کیا گیا امیر کے لئے بہشت میں داخل ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ایک اونٹ کے لئے سوئی کے ناکے میں سے گزرنا۔ تم ان سے کہو بہشت کا دروازہ اتنا تنگ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو بھی تو رضوان کی مٹھی گرم کی جا سکتی ہے۔

اور تمہیں بتایا گیا کہ کسی پر تنقید مت کرو تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے۔ لیکن میں کہتا ہوں محض اس ڈر سے کہ کوئی تم پر تنقید کرے گا۔ اس دلچسپ شغل کو ترک مت کرو۔ البتہ جب تم پر کوئی تنقید کرے تو ایسا دندان شکن جواب دو کہ وہ بغلیں جھانکنے لگے

تم سے اکثر کہا گیا بری بات مت دیکھو، مت سنو، مت کہو۔ یعنی آنکھیں، کان اور زبان رکھتے ہوئے بھی تم اندھے، بہرے اور گونگے بن جاؤ تم خود ہی سوچو یہ مشورہ کتنا مضحکہ خیز ہے 15

اور تمہیں بار بار اپدیش دیا گیا۔ کام، کرودھ، لوبھ، موہ اور اہنکار تمہارے دشمن ہیں۔ ان سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ لیکن تم نے کبھی سوچا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا۔ پتھر کی مورتی یا سنگ مرمر کا مجسمہ بن جاتا ہے

اور تم سے کہا گیا ہمسایوں سے محبت کرو لیکن اگر ہمسائے لڑاکا، جھگڑالو اور بدطینت ہوں تو تم ان سے کس طرح محبت کر سکتے ہو۔

اور تمہیں نصیحت کی گئی بزرگوں کا احترام کرو لیکن جب بزرگ ضرورت سے زیادہ باتونی، بدمزاج اور دقیانوس ہوں تو ان کی عزت کون کر سکتا ہے۔

اور تم نے پڑھا۔ جہاں عورتوں کی پوجا کی جاتی ہے وہاں دیوتا بستے ہیں۔ اگر وہاں دیوتا بستے ہیں تو زن مرید خاوند کہاں جاتے ہیں

اور تمہیں بتایا گیا جب تم پر مصیبت آئے خدا کو پکارو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے اور تم نے خدا کو بار بار پکارا۔ یہاں تک کہ تمہارا گلا بیٹھ گیا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ پس آئندہ خدا کو پکارنا بند کرو۔ اور نزدیک ترین پولس اسٹیشن یا یتیم خانے کو اطلاع دو۔

اور تم مدت سے سن رہے ہو اہنسا سب سے بڑا دھرم ہے۔ لیکن جب تک قصاب اس مقولے پر ایمان نہ لائے۔ بکرے کی ماں

کب تک خیر منا سکتی ہے۔

اور یہ کہا گیا کہ انسان کو صرف روٹی ہی تو نہیں چاہئے۔ یقیناً یہ قول اس شخص کا معلوم ہوتا ہے۔ جسے کھانے کو صرف سوکھے ٹکڑے ملتے ہیں۔

اور تمہیں ہدایت کی گئی جھوٹ مت بولو۔ لیکن تجربے نے تمہیں بتایا اگر سچ بولو گے تو بیوی ناراض ہو جائے گی، محبوبہ روٹھ جائے گی، دوست دشمن بن جائیں گے۔ اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اتنے خطرے مول لینے کے بجائے، سچ بولنا چھوڑ دیا۔

اور تمہیں مطلع کیا گیا، ہمیشہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جس قسم کے سلوک کی تم ان سے توقع کرتے ہو۔ لیکن چونکہ تم دوسروں کے باطن کا حال نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیسے کر سکتے تھے۔

اور تم سے کہا گیا، خدا کی عبادت کرو۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد اور مریضوں اور غریبوں کی خدمت کرو ظاہر ہے یہ تمام کام تم بیک وقت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے تم نے کوئی کام بھی نہیں کیا۔

اور یہ دعویٰ کیا گیا جیو اور جینے دو۔ ایک سنہرا اصول ہے۔ لیکن تم جانتے تھے اگر تم نے دوسروں کو جینے دیا تو کچھ عرصہ بعد وہ تمہیں جینے نہیں دیں گے۔ اس لئے تم نے انہیں جینے کا موقع ہی نہیں دیا۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حقیقت کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور جو انسان کو انسان نہیں بلکہ ایک نہایت مکار اور خونخوار جانور سمجھتے ہیں۔

16

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کا عقیدہ ہے کہ بندر، گھوڑے اور ریچھ کو سدھایا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان کو نہیں

پس تم مجھ پر ایمان لاؤ۔ میں تمہیں نجات تو نہیں البتہ بے پناہ دولت خوبصورت عورتیں اور شراب دونگا۔

یاد رکھو مجھ سے پہلے اور میرے بعد کئی پیغمبر آئے لیکن انسان کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ لا سکے۔ کیوں کہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ استرے کی تیز دھار پر چلنا۔ لیکن جس راستے پر چلنے کی میں تمہیں ترغیب دے رہا ہوں۔ اس پر چلنا اتنا ہی آسان ہے جتنا فرش مخمل یا پھولوں کے تختوں پر چلنا۔ تم کہو گے یہ راستہ ہمیں جہنم کے دروازے تک لے جائیگا۔ میں کہوں گا تم خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہو۔ اول تو جہنم کس نے دیکھا ہے۔ اور بالفرض اگر واقعی جہنم کا وجود ہے تو وہ اس جہنم سے قطعاً مختلف ہوگا جس کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ آخر خدا اتنا سنگدل نہیں ہو سکتا کہ ایک بار تمہیں جہنم میں جھونکنے کے بعد پھر تمہاری سدھ بدھ ہی نہ لے۔

اس لئے مجھ پر بھروسہ رکھو اور کھلے بندوں میری امامت قبول کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یقیناً ریاکار کہلاؤ گے۔ کیوں کہ تم ایمان تو پیغمبروں پر لاتے ہو لیکن دراصل دم میرا بھرتے ہو۔

(مطبوعہ شگوفہ ڈیڑھ سالہ نمبر ۱۹۷۰ء)

کرشن چندر

دل ہے پرائی بس میں



نام ** کرشن چندر

قلمی نام ** حبیب ضیاء (ابتدا میں حبیب توفیق)

پیدائش ** ۲۶ نومبر ۱۹۱۴ء

مقام پیدائش ** گجرانوالہ (پاکستان)

تعلیم ** یم اے (انگریزی ادب) ۱۹۳۴ء، یل یل بی (۱۹۳۶ء)

پہلا طنزیہ مضمون ** "پروفیسر بلاقی بلیکی"

تصانیف ** ہوائی قلعے اور گھونگھٹ میں گوری جلے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)، طلسم خیال، شکست، فلمی قاعدہ، ناون پتے، کے علاوہ دیگر (۵۵) تصانیف

تاریخ وفات ** ۸ مارچ ۱۹۷۷ء

اپنے اپنے شہر کا قاعدہ ہے۔ دہلی شہر کی بس کا کیو بڑی ترتیب سے کھڑا رہتا ہے مگر بس کے آتے ہی کیو میں کھڑا ہوا ہر فرد کیو کی رسی تڑاکر بس کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے۔ عورتیں پستی ہیں، بچے کچلے جاتے ہیں کمزور اور بڈھے گر جاتے ہیں ناتوان اپنی بانہہ یا ٹانگ کا فریکچر کروا کر ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں اور جو لوگ اس کے بعد بس میں داخل ہو جاتے ہیں ان کا داخلہ بہ آسانی دارا سنگھ کے شاگردوں میں لیا جاسکتا ہے۔

بمبئی کی بس کا کیو بے حد مہذب بلکہ مودب نظر آتا ہے۔ گھنٹوں بس کی آمد کی متوقع مسرت میں آنکھوں کی بصارت اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ کچھ لوگ آتی ہوئی بس کو دو میل سے دیکھ لیتے ہیں ایسی بصارت کو بس کی مناسبت سے بسارت کہا جائے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے املا نامہ میں اصلاح کرلیں اور اس بسارت کے لئے مجھے معاف کردیں۔

بمبئی میں بس کا دیدار کسی طرح محبوب کے دیدار سے کم نہیں ہوتا۔ بس کو آتے دیکھ کر ہر شخص چوکنا ہو جاتا ہے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ سانس کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ دل میں امنگ آنکھوں میں چمک ہاتھوں میں کپکپی سب کچھ وہی ہوتا ہے جو محبوب کی آمد پر ہوتا ہے۔ بس اک لغزش مستانہ سے چلی آتی ہے ایک جھٹکا دیکر کھڑی ہو جاتی ہے شوق وصال میں کیو اس طرح آگے بڑھتا ہے جیسے سانپ بل میں گھستا ہے۔ انڈکٹر کے گھنٹی بجانے پر بس جو آگے بڑھنے لگتی ہے تو کیو کا آخری ریلا بس کے پائدان پر تقریباً سجدہ کرتا نظر آتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ ایک ہاتھ دعا کے لئے فضاء میں معلق ہے۔ دوسرے ہاتھ سے کسی دوسرے مسافر کا بازو پکڑ رکھا ہے۔ یا بس کے ہینڈل میں اٹکا رکھا ہے۔ ایک پاؤں ہوا میں جھول رہا ہے دوسرا پاؤں اپنے جوتے کی ایڑی کے ایک بٹا ہزار انچ سے پائدان پر خطرناک ڈھلک سے ٹکا رکھا ہے۔

بمبئی میں جتنی خوبصورت لڑکیاں ہیں، بس کے کیو میں پائی جاتی ہیں یہ وجہ؟ ...... بس کے طویل انتظار میں بدن کی ساری فالتو چربی پگھل جاتی ہے۔ بدن چھریرا ہو جاتا ہے، کمر کا خم واضح ہو

جاتا ہے، اور فلر بیوٹی کمپی ٹیشن کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ایک روز میں بس نمبر ۲۸ کے انتظار میں کیو میں کھڑا تھا۔ اسی اسٹینڈ پر بس نمبر دو سو چوالیس بھی آتی تھی۔ اور میرے پیچھے ایک ایسی حور شمائل کھڑی تھی کہ جی چاہا اپنے کیو کی جگہ اسے دیدوں سیدھی مانگ کے سیاہ بالوں سے گھرا ہوا گول بیضوی چہرہ عجب چمپئی سی بہار دکھا رہا تھا اور کس کر باندھی ہوئی اودی پھول دار ساڑی میں اس کے چھلکے ہوئے بدن کا ہر فتنہ دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا میں نے اور ایک بار کوشش کی کہ اسے اپنے سے آگے کی جگہ دے دوں اور خود اس کے پیچھے کھڑا ہو جاؤں، رعب حسن سے نہیں بلکہ اس نیت سے کہ اگر وہ آگے کھڑی ہوگی تو جس بس میں وہ جائے گی اس بس میں میں بھی چلا جاؤں گا چاہے وہ میری منزل کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔

دو ایک بار میں نے آنکھ اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھنے کا موقع دیا مگر وہ کافر ادا اپنی جگہ پر سے نہیں ہلی پیچھے کھڑی مسکراتی رہی اور اپنا گلابی بیگ جھلاتی رہی پھر بس نمبر دو سو چوالیس آگئی اور میں نے پیچھے مڑ کر اسکی طرف دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ کیو میں کھڑے ہوئے آدھے مردوں کی نگاہیں بس کے بجائے اس نازک بدن پر جھکی تھیں غالباً ان لوگوں نے بھی یہی سوچ لیا تھا کہ جدھر بس جائے گی ادھر نہیں بلکہ جدھر وہ حسینہ جائے گی ادھر وہ بھی جائیں گے۔ 18

بس نمبر دو سو چوالیس چلی گئی تو مجھے اطمینان سا ہوا اب یہ ضرور بس نمبر ۲۸۰ میں جائے گی۔ کیوں کہ اور کوئی بس اس اسٹینڈ پر نہیں آتی تھی دس پندرہ منٹ اس بس کے انتظار میں گذر گئے۔ دو تین شوقین مزاج کاڑی والوں نے اپنی گاڑی لال کراتے لفٹ دینا چاہی مگر ہماری حسینہ نے کسی کو لفٹ نہیں دی شریف گھرانوں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بس میں چلی جائیں گی پون گھنٹہ بس کے انتظار میں کھڑی رہیں گی مگر کسی ایرے غیرے سے لفٹ نہیں لیں گی جی ہاں پھر میری بس آگئی بس نمبر ۲۸۰۔ میں نے ایک نگاہ واپس اس پر ڈالی وہ اپنی جگہ سے کھسک کر میرے ساتھ ساتھ اسی بس میں سوار ہونے کے لیے آرہی تھی تقریباً ساتھ ساتھ ہم دونوں اس بس پر سوار ہوئے سوار ہوتے ہوتے میرا بدن اس کے بدن سے مس ہو گیا اور میری روح کے سارے تار جھنجھنا اٹھے میں نے کوشش تو ضرور کی کہ وہیں بیٹھ جاؤں جسمیں وہ بیٹھنے والی تھی مگر شومئی قسمت سے کہیں پر دو سیٹیں اکٹھی خالی نہ تھیں اسلئے وہ ایک جگہ بیٹھ گئی میں دو فاصلے پر دوسری جگہ کنڈکٹر آیا اس لڑکی نے اپنا گلابی بیگ کھول کر ایک روپیہ نکالا بس کا ٹکٹ لیا میں نے کان لگائے مگر نہ سن سکا کہاں کا لیا ہے کوئی بات نہیں ہم آخری منزل تک ٹکٹ لے لیں گے اور جہاں وہ اترے گی وہیں اتر جائیں گے۔

ٹکٹ لینے کے لئے جیب میں جو ہاتھ ڈالا تو بٹوا غائب یا مظہر العجائب ..... یہ کیا ہوا، کس نے کاٹی؟ .... بٹوے میں ساڑھے تین سو روپے تھے جو اپنی بوڑھی ماں کو منی آرڈر کرنے جا رہا تھا بٹوا بس میں چڑھنے تک میری جیب میں محفوظ تھا۔ کیو میں بھی محفوظ تھا کیونکہ کو نگاہیں اسی پری چہرہ پر تھیں مگر ہاتھ بٹوے پر تھا یہ بمبئی ہے ... یہاں اسی طرح چوکس رہنا پڑتا ہے مگر اب کیا ہو .... پسینہ آیا چہرہ اتر گیا سو اتر گیا۔ کیا اب بس سے بھی اترنا پڑیگا ایک اگلے اسٹاپ پر وہ حسینہ بھی جلدی سے بس سے نکل کر اترنے لگی اتنے میں کنڈکٹر نے گھنٹی دی وہ گرتے گرتے بچی اس کا گلابی بیگ کھل کر سڑک پر آرہا اس گلابی بیگ سے میرا بٹوا اچھل کر سامنے آرہا۔ میں تو پہلے ہی اس حسینہ کے ساتھ اترنے کا سوچ چکا تھا دوسرے لمحے میں خود سڑک پر تھا اور میرا ہاتھ اس نازنین کے ہاتھ پر تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی میں نے ایک ہاتھ سے اسے پکڑے رکھا دوسرے ہاتھ سے اپنا بٹوہ قابو میں کیا اور اسے قریب کے ایک ریستوران میں لے گیا جب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے اس سے پوچھا " اگر سب سچ سچ بتادو گی تو پولیس اسٹیشن نہیں لے جاؤں گا " " یہ تو مجھے معلوم ہے " وہ کامل اطمینان سے بولی۔

" ایں؟ تمہیں کیسے معلوم ہے " میں نے اس سے پوچھا۔

اس سے پہلے بھی دو تین بار میرے ساتھ یہ قصہ ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا کمپیکٹ کھول کر اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے بولی "کچھ ... تو میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے چھوڑ دیا اور کچھ لوگوں نے ......" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی

ہاں ہاں کچھ لوگوں نے کیا کیا" ؟

"مجھے ہوٹل لے جانے کی کوشش کی

پھر تم نے کیا کیا ؟"

میں نے شور مچا دیا یہ آدمی میرے ساتھ زبردستی کرنا چاہتا ہے میری عزت لوٹنا چاہتا ہے۔ دو ایک ... سے پٹوا چکی ہوں ... میری طرف دیکھ کے بولی اگر یقین نہ آئے تو ابھی تمہیں پٹوا کر دکھاؤں ؟

... کا واسطہ" تم یہ دھندا کیوں کرتی ہو"

... میں اس سے بہتر دھندا اور کوئی ہے نہیں ... اس شہر میں جسے دیکھو کسی نہ کسی کا ہات ... نہ کسی دوسرے کے جیب ... ہے پیشے مختلف ہیں دھندا سب کا ایک ہی ہے ہم چھ لڑکیاں ہیں روز صبح نکل جاتی ہیں۔ رات کو اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اب ہم سب ... اپنی کاڑیاں ہیں مگر روزی بس ہی سے ملتی ہے جو کچھ ملتا ہے سب اکٹھا کر کے بانٹ لیتی ہیں۔ زندگی بڑے مزے میں گزرتی ... مہینے میں کتنا کما لیتے ہو ؟"

... چھ سات سو کچھ پراویڈنٹ فنڈ کٹ جاتا ہے کچھ ......

ہے بیچارا" وہ مجھ پر ترس کھا کے بولی "سات سو تو اکثر ایک دن میں ہی کما لیتی ہوں "

... نے کہا "کال گرل کا دھندا کرو تو دن میں اس سے تگنا کماؤ" اس نے زور کا ایک چانٹا میرے رخسار پر جڑ دیا بولی" اے ... میں ایک جیب کتری ہوں کال گرل نہیں ہوں سنبھل کر بات کرو"

لوگ ہماری میز کی طرف دیکھنے لگے اب اس کا پلہ بھاری تھا اب وہ مجھے پٹوا بھی سکتی تھی۔ اس کا چہرہ غصہ سے لال تھا۔ ... مجھے سخت بھائی چنانچہ میں نے اٹھ کر اسے دو تماچے رسید کئے اور تیسرا کرنے ہی والا تھا کہ لوگ اٹھ کر ہماری طرف بھاگے مگر ... نے اسے چٹیا سے پکڑ لیا۔

... ارے یہ کیا کرتے ہو ؟ ... یہ کیا کرتے ہو ؟"

... نے کہا "تم بولنے والے کون ہوتے ہو یہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے "

... لوگوں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا وہ نظریں جھکا کر سسکنے لگی لوگ واپس چلے گئے

... اس کی ادا مجھے پسند آئی تو میری ادا اسے پسند آئی اس کے بعد دھیرے دھیرے ہماری ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔

... وہ میری بیوی ہے مگر اس نے اپنا دھندا نہیں چھوڑا۔ اب بھی وہ ہر روز میری جیب کاٹتی ہے۔

میں خوش قسمت ہوں کہ بس میں مجھے میری بیوی کی اکثر لوگوں کو جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے ملتے ہیں یا ایسے جھکی جو حالات ... پر تبصرہ کرتے ہوئے آخری منزل تک بور کرتے جاتے ہیں۔ یا ایسے گیانی جو بس ہی میں یوگ آسن جما کر دو سیٹ پر قبضہ کر کے ... سیٹ کا کرایہ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا ایسے سیانے جو ایک ٹین کا ڈبہ ہات میں لے کر اسے کھنکھناتے ہوئے کسی فرضی ... کی مدد کے لئے آپ سے خیرات لے کر پورے ڈبے کی رقم ہضم کر جاتے ہیں۔

بمبئی بہت بڑا شہر ہے اور ان میں ہزاروں بسیں چلتی ہیں۔ اس لئے یہ لوگ کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بسوں

کے کاروبار نے سینکڑوں ضمنی کاروبار پیدا کر دیے ہیں اور اب تو بسوں کے بڑھتے ہوئے کاروبار کو دیکھ کر میں نے بسوں سے متعلق ایک تکنیکی لغت تیار کی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بس ..... یہ لفظ ایک منزلہ بس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

بس بس ..... دو منزلہ بس کو کہتے ہیں۔

بسن ..... جو بس شہر میں چلتی ہے۔

بسیرا ..... وہ مقام جہاں بسیں رات کو رکتی ہیں۔

بسیسٹ : لمبی بس کو کہتے ہیں۔

بے بس : جب جیب میں بس کے پیسے نہ ہوں

رابطہ بابس : کھٹارا بس کے لئے استعمال ہوتا ہے

بساوٹ اس خوشبو کے لئے جب کوئی مہکتی لڑکی بس کے اندر آکر آپ کے پہلو میں بیٹھ جائے ...... اور بس کے چلے جانے کے بعد آپ کی جو حالت ہوتی ہے اسے "بسورنا" کہتے ہیں۔

بساند بس کے اندر جلی بیڑیوں، مونگ پھلی کے چھلکوں اور بچوں کے پیشاب کی ملی جلی بو۔

بسنت پھولوں سے لدی پھندی وہ بس جس میں دولہا اور اس کے باراتی ایک مقام سے دوسرے مقام تک تبادلہ لے جاتے ہیں۔

اب کچھ محاوروں پر بھی نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ اس وقت کہا جاتا ہے جب دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد بھی بس سڑک پر برآمد نہ ہو۔

بس کہ میسر نہیں آدمی کو بھی انسان ہونا ..... اس وقت بولا جاتا ہے جب دہلی کی کسی بس کا طاقتور ہجوم آپ کو بس اسٹینڈ پر بری حالت میں چھوڑ کر چلا جائے۔

دل ہے پرائے بس میں ..... پرانے زمانے میں بولا جاتا تھا، آج کل کہتے ہیں، دل ہے پرائی بس میں، اور اس وقت کہتے ہیں جب آپ کی محبوبہ آپ کے سامنے کسی دوسری بس میں بیٹھ کر چلی جائے۔

گھر میں آگ لگا جمالو دور کھڑی ..... پرانا محاورہ ہے۔

آج کل کہتے ہیں: بس میں آگ لگا جمالو دور کھڑی۔

(اس لغت میں مزید اضافوں کے لئے قارئین شگوفہ کو دعوت دی جاتی ہے .... کرشن چندر)

(جنوری ۱۹۰۲)

فکر تونسوی

ہیلو ہیلو



نام ** رام نارائن
قلمی نام ** فکر تونسوی
تاریخ پیدائش ** ۷ / اکتوبر ۱۹۱۸ء
مقام پیدائش ** شجاع اباد، ضلع ملتان (پاکستان)
ادب میں داخلہ ** بذریعہ شعر گوئی، بعد میں کالم نگاری
تصانیف ** فکریات (طنزیہ کالموں کا انتخاب)
چھٹا دریا
پیاز کے چھلکے (طنزیہ کالموں کا انتخاب)
بدنام کتاب
خدوخال اور دیگر تصانیف
سن وفات ** اکتوبر ۱۹۸۷ء

جب میرا جنازہ اٹھنے لگا۔ حتیٰ کہ میری بیوی بھی سیاپے کے لئے بھی سر نکال کر سامعین سے داد لے چکی تو ایک صاحب مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے نمودار ہوئے اور ۔۔۔ فلموں کے پولیس انسپکٹر کے لہجے میں کہنے لگے۔ "روک لو یہ جنازہ نہیں اٹھے گا سرکاری آرڈر ہے۔"

ماتم گسار سہم گئے۔ ممکن ہے، سرکار نے اب جنازہ پر بھی پابندی لگادی ہو کہ مرحوم پورا انکم ٹیکس ادا کرکے جارہا ہے یا نہیں سرکاری قرضے کی کوئی قسط تو واجب الادا نہیں، دریا میں ڈوب کر مرا یا چلو بھر پانی میں

ہاں، ماتم گسار سہم گئے بلکہ کئی ایک تو موقع پاکر کھسک بھی گئے میری بیوی نے آگے بڑھ کر کہا "سرا ہمارے پاس ڈیتھ سرٹیفکیٹ موجود ہے جو جنازے کے ساتھ نتھی ہے۔ لے کیوں نہیں جاسکتے۔"

وہ بولا "نہیں لے جاسکتے کیونکہ ان کا ٹیلی فون کنکشن منظور ہوگیا ہے

پندرہ سال پہلے میں نے ٹیلی فون کے لئے درخواست دی تھی اور رواج کے مطابق دروغ بیانی کی تھی کہ میں دل کا مریض ہوں مجھے فوراً کنکشن دیا جائے اگرچہ یہ کچھ اتنی دروغ بیانی بھی نہیں تھی کیونکہ میں ان دنوں ایک حسینہ سے عشق بھی کر رہا تھا جس سے ہر لمحہ ہارٹ اٹیک کا خطرہ رہتا تھا۔ کئی برس تک جب مجھے ٹیلی فون نہیں ملا تو حسینہ نے کسی اور سے شادی کر لی آخر کب تک انتظار کرتی اور یوں بھی ہر عشق کا یہی انجام ہوتا ہے خودکشی یا شادی بہر کیف اس کی شادی سے میرے ہارٹ اٹیک کا خطرہ ٹل گیا لیکن اب جو پندرہ سال بعد میرا جنازہ اٹھنے لگا تو کنکشن منظور ہو کر آگیا اور میں جیسے ڈائیل ٹون کی طرح بج اٹھا اور بیوی سے کہا "ڈارلنگ! کیا تمہیں یوں نہیں لگتا کہ سرکار میرے جنازہ اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ بولی "میں تو پہلے ہی کہتی تھی مگر آپ مانتے ہی نہیں تھے اگر جنازہ دو چار سال پہلے اٹھ جاتا تو کنکشن دو چار سال پہلے مل جاتا

میں نے ٹیلی فون کی رسم افتتاح اپنی سابقہ محبوبہ سے کی اور نمبر ملا کر کہا۔ "ہیلو! جانِ من!"

جواب آیا "شٹ اپ!"

میں نے کہا "شٹ اپ سے نہیں، مسز پربھاکر سے ملا دیجئے۔"

جواب آیا "وہ جہنم میں گئی ہے۔"

پوچھا "ان کا جہنم کا ٹیلی فون نمبر"

"ڈائرکٹری میں دیکھ لو اے سن آف اے بچ!"

یعنی ٹیلی فون کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ محبوبہ کا ترجمہ شٹ اپ ملا۔ سوچا۔ دراصل ٹیلی فون ہی غلط وقت پر منظور ہوا۔ جب محبوبہ ہی جنت سدھار گئی تھی تو محکمہ ٹیلی فون کو کنکشن منظور کرنے کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ غصے میں آکر ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ کو ٹیلی فون کیا اور کہا "جناب! کم از کم آپ پہلے تصدیق تو کرلیتے کہ میری محبوبہ اس دنیا میں نہیں رہی اور یہ ٹیلی فون کنکشن مجھے صرف اس سے گفتگوے عشق کے لئے مطلوب تھا!

جواب آیا "رانگ نمبر! یہ دفتر زراعت ہے۔ ہمارا دفتر عشق سے ڈیل نہیں کرتا۔ آپ کلچرل اور سوشیل ویلفیر دونوں سے رجوع کیجئے

گویا حالت کافی دگرگوں تھی۔ یہ اچھا ٹیلی فون لگوایا ہے، رانگ نمبروں سے ہی ڈیل کر رہا ہے۔ محبوبہ سے ملاؤ تو جہنم سے بات ہے، ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ سے ملاو، تو زراعت سے جاملتا ہے۔ تیسری مرتبہ ایک ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا جو میرے نروس سسٹم کا علاج کرتا تھا مگر وہ ڈاکٹر کی جائے دفتر کی کسی خاتون سے جاملا جو شاید اپنے خاوند کو جھڑک رہی تھی اور کہہ رہی تھی "بچہ رو رہا ہے تو میں کیا کروں، لوری کا ریکارڈ لگادو! چپ ہو جائے گا۔"

اور شوہر کہہ رہا تھا "ریکارڈ مل نہیں رہا۔ تم ٹیلی فون پر اسے لوری سنادو؟"

خاتون چڑکر بولی۔ "دفتر کی فائلوں میں لوری کی موسیقی ڈھونڈتے ہو۔ میں لوری نہیں دے سکتی۔ لیکن سنو! تم خود لوری کیوں نہیں دے دیتے، پل بھر کے لئے تم ہی ممی بن جاؤ"

وہ بولا "ہائے! میں تو ڈیڈی بننے سے ہی کتراتا تھا اور تم ممی بننے کا حکم دے رہی ہو۔ چونکہ میں خاوند ہوں یہ حکم نہیں مانوں گا اور اس کے ساتھ خاوند کے لوری دینے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چیخ کر ٹوکا "اجی بند کیجئے یہ لوری شوری مجھے لوری نہیں وٹامن بی کامپلکس چاہیئے۔"

چنانچہ میں نے پہلے ہی دن گھر والوں کو وارننگ دے دی۔ "خبردار! اس ٹیلی فون کو کوئی ہاتھ مت لگائے"۔

میری بیوی کہنے لگی "مگر میرے انکل جیارام ہسپتال میں اڈمٹ ہوئے ہیں۔ ان کی خیر و عافیت پوچھنے کے لئے ہسپتال ٹیلی فون ضرور کرنا ہے۔

میں نے کہا "سوچ لو، ہسپتال سے ملاؤگی تو شمشان گھاٹ کی گھنٹی بج اٹھے گی اور کوئی بول اٹھے گا۔ "سوری! ارتھی لکڑیوں کے بغیر قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ آج کل لکڑیوں کی سخت قلت چل رہی ہے۔ مرحوم کو لکڑیوں سمیت لائیے تو تجہیز و تکفین کے لیے حاضر ہیں، ورنہ سوری!"

مگر میں نے بیوی سے یہ فقرے نہیں کہے، دل ہی میں کہے حالانکہ ان کے انکل کی عمر چوراسی برس تک پہنچ چکی تھی۔ اور شمشان

گھاٹ کے لئے یہ بے حد موزوں عمر تھی اور پھر ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ شمشان گھاٹ سے ہمارا رابطہ قائم ہوجاتا اور یہ ہمارے ٹیلی فون کا پہلا نمبر ہوتا جو صحیح مقام سے جاملتا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے محلے میں ابھی صرف دو ٹیلی فون ہی لگے تھے۔ ایک چرنجی لال سوداگر چوب کے گھر، ٹیلی فون لگنے سے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو ان کا نام بگڑ گیا یعنی چرنجی لال سے شری چرنجی لال جی ہوگیا اور دوسرے لکڑیوں کے بھاؤ چڑھ گئے۔

دوسرا ٹیلی فون ایک حکیم صاحب کے چوبی کھوکھے میں تھا۔ وہ ٹیلی فون کرنے کے آٹھ آنے چارج کرتے تھے سرکاری ریٹ چار آنے تھا۔ ان کی طبی پریکٹس کم چلتی تھی، ٹیلی فون زیادہ چلتا تھا۔ وہ ٹیلی فون کال کو بنفشے کی پڑیا سمجھتے تھے شکایت کیا کرتے تھے۔

ارے صاحب! سالی ایلوپیتھی کا زور ہے، بنفشہ بکتا ہی نہیں۔'

بہرکیف سیٹھ چرنجی لال کی لکڑیاں بکتی تھیں اور حکیم صاحب کی ٹیلی فون کالیں۔ ملکہ ایک مرتبہ مارکیٹ میں فل بنفشا کا ریٹ بڑھ گیا تو حکیم صاحب نے بھی کال کا ریٹ بڑھا کر دس آنے کر دیا چنانچہ میرے ہاں بھی ٹیلی فون لگا تو مجھے لوگ آتے جاتے سلام کرنے لگے مندر کا پجاری، میری بیوی کو دوسروں سے زیادہ پرساد دینے لگا۔ سکول کے پرنسپل نے میرے نالائق بیٹے کو کلاس کا مانیٹر بنا دیا پرنسپل صاحب نے یہ ناشائستہ حرکت اس لئے کی کیونکہ وہ میرے بیٹے کے اندر ہیلو ہیلو کی صدائیں سن لیتا تھا۔ مگر میں ہرا نہا

لوگ جب سلام کرتے تو میں عرض کرتا" فرمائیے۔"

وہ کہتے" مبارک باد قبول فرمائیے کہ اس محلے میں پہلی بار ایک بھلے آدمی کو بھلا تسلیم کیا گیا۔

سلام کرنے والوں میں ایسے حضرات بھی شامل تھے جو کل تک میرے پہلو سے یوں نکل جاتے تھے جیسے کوئی کار، بائیسکل پر دھول اڑاتے ہوئے گذر جائے لیکن میں ایک بھلا آدمی ٹیلی فون لگنے کے باوجود ابھی تک بائیسکل پر سوار تھا یعنی ہر ایک سے عجز و انکسار سے پیش آتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلام کرتی ہوئی میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آواز آئی۔

' جناب! میں رگھبیر سنگھ قلفی فروش بول رہا ہوں۔ آپ مجھے مانتے ہیں نا!'

میں رگھبیر سنگھ سے زیادہ اس کی قلفی کو جانتا تھا کہ ایک بار کھائی تھی تو زبردست متلی ہوگئی تھی۔ اور پورا رگھبیر قلفی سمیت بہہ گیا تھا۔ عرض کیا" اجی آپ شرمندہ کر رہے ہیں، ارشاد فرمائیے تعمیل ہوگی۔"

وہ بولا" آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ ذرا میرے گھر، سی۔ پچاسی سڑ چھ، تک جاکر معلوم کیجئے کہ صبح ہماری بھینس گھر سے بھاگ گئی تھی وہ لوٹی کہ نہیں؟"

میں پانچ سات منٹ بعد معلومات حاصل کر کے لوٹا تو اسے بتایا کہ آپ کے گھر میں نہ صرف بھینس غائب ہے بلکہ بیوی بھی۔

اور پھر یونہی ہوتا رہا۔ دن میں پانچ سات مرتبہ گھنٹی بج اٹھتی۔ کوئی کہتا۔ میرے گھر اطلاع دے دیجئے کہ آج رات کو لیٹ آؤں **گا** میرے گھر میں ٹیلی فون لگتے ہی محلہ کے لوگ رات کو لیٹ بھی آنے لگے تھے۔ کوئی کہتا۔ میری ماں سے کہیئے کہ ڈاکٹر سے اپنے پوتے کے دوائی لے آئے اور میں بڑھیا سے جاکر یہ کہتا کہ ساتھ ہی اپنے دمے کی دوائی بھی لیتے آئیے گا۔ کوئی ٹیلی فون پر حکم دیتا کہ میری بیوی کو جاکر پیام دے آئیے کہ آج پھر گوبھی کی سبزی مت پکائے۔ کیونکہ کل مجھے اس سے کھانسی ہوگئی تھی۔ شکر ہے کسی نے یہ حکم نہیں دیا کہ بازار سے گوبھی خرید کر میرے گھر دے آئیے۔

ایک مرتبہ ٹیلی فون پر آواز آئی" ہیلو! جناب کی صحت کیسی ہے؟"

میں نے کہا" میری بیوی کو زکام ہے، مجھے ہونے والا ہے۔"

وہ بولے "ذرا احتیاط کیجئے، پوچھنا صرف آپ سے یہ تھا کہ کیا وہاں بارش ہو رہی ہے؟"

عرض کیا "دو بار ہو چکی ہے۔ تیسری بار ہونے والی ہے اب کے شاید اولے پڑیں۔"

کہنے لگے "بس مجھے یہی خطرہ تھا۔ کیا ذرا آپ میرے غریب خانے تک قدم رنجہ فرمائیں گے؟" میں نے کہا "فرماؤں گا۔"

وہ بولے "بس اتنا دیکھ آئیے کہ کہیں ہمارے مکان کی چھت تو نہیں گر گئی۔ دیکھئے جی۔ آپ کے ہاں ٹیلی فون لگ گیا تو کتنی سہولت ہو گئی آپ کے پاس چھاتہ تو ہوگا ہی، بارش ہو رہی ہے نا!"

میں نے کہا "صبح آپ کی بیوی مانگ کر لے گئی تھی۔ ابھی تک لوٹایا نہیں۔"

بولے "آہ میری بیوی بھی کتنی نالائق ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا۔ نالائق نہ ہوتی تو کیا آپ سے شادی کرتی۔ لیکن یہ ایک بوسیدہ فقرہ تھا متروک قرار دے دیا اور کہا "ابھی جاکر چھت کی خبر لاتا ہوں۔ پلیز، ہولڈ آن!" واپس آکر انہیں اطلاع دی کہ آپ کی چھت اور میرے چھاتے کے علاوہ گھر میں سب خیریت ہے۔

المختصر سامعین کرام! جب میں رانگ نمبروں، خدمت خلق اور علاقے کے ٹیلی فون میکینک کی مٹھی گرم کرتے کرتے تنگ آگیا تو میں نے مکان اور ٹیلی فون دونوں ایک اور لکڑی کے سوداگر کے ہاتھ بیچ دیئے اور خود دوسرے محلے میں کرائے کے مکان میں منتقل ہو گیا۔

دوسرے مہینے ایک پبلک کال سے اپنے پرانے گھر میں ٹیلی فون کیا اور پوچھا

"ہیلو! کیا میں فکر تونسوی سے مل سکتا ہوں؟"

جواب آیا۔ "رانگ نمبر"

میں بڑا حیران ہوا کہ میرا ٹیلی فون نمبر ابھی تک رانگ نمبروں سے ڈائل کئے جا رہا ہے۔

پوچھا "مگر فکر صاحب پہلے تو اسی نمبر پر رہتے تھے۔"

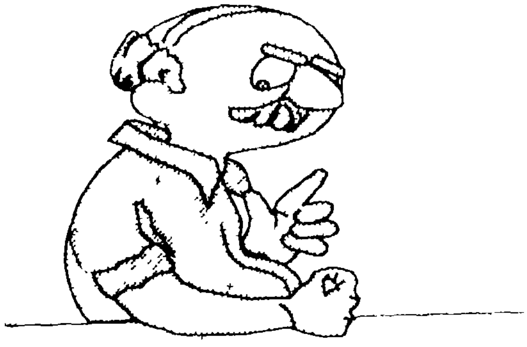
جواب آیا "رہتے ہوں گے۔ جہنم رسید ہوئے۔"

میں نے پوچھا "جنازہ کب اٹھا۔"

بولے "پچھلے مہینے۔"

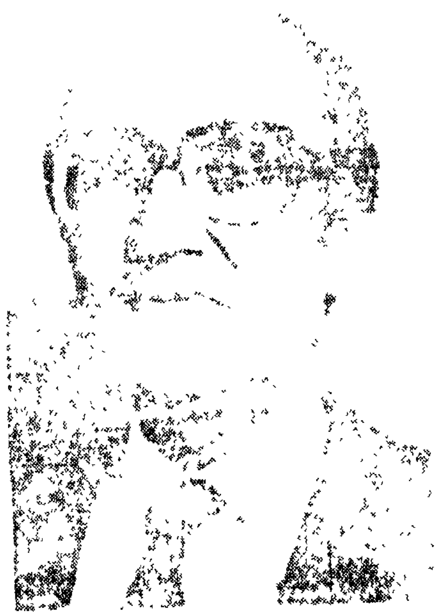
میرے منہ سے نکل گیا۔ "اب صحیح وقت پر نکلا ان کا جنازہ!"

(شگوفہ، جنوری ۱۹۸۰ء)



مشتاق احمد یوسفی

اور آنا گھر میں مرغیوں کا



نام ** مشتاق احمد یوسفی
مقام پیدائش ** ستواسنا، ٹونک، راجستھان
تعلیم ** ایم۔ اے، معاشیات
تصانیف ** چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آبِ گم
رہائش ** کراچی، پاکستان

عرض کیا: "کچھ بھی ہو، میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید "

"اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے پتیلی کا اور اضافہ کر لیجئے۔" انہوں نے بات کاٹی۔

پھر عرض کیا۔ "اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مرغی عمر طبعی کو نہیں پہنچ پاتی (اسی طرح سرزمین چین میں کوئی جانور فطری موت نہیں مرتا) آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔"

فرمایا۔ "یہ صحیح ہے کہ انسان روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا اسے مرغ مسلم کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے مرغی کو محض انسان کے کھانے کے لئے پیدا کیا تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ صاحب! مرغی تو درکنار، میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھائیے۔ گندے ہو جائیں تو ڈراموں اور سیاسی جلسوں کے لئے دگنے داموں بیچئے۔ یوں تو اس میں میرا مطلب ہے تازہ انڈے میں۔

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پھوہڑ سے پھوہڑ عورت کسی طرح بھی پکائے یقیناً مزے دار پکے گا۔ آملیٹ، نیم برشت، تلا ہوا، خاگینہ، بلوا "

اس کے بعد انہوں نے ایک نہایت پیچیدہ اور گنجلک تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ آملیٹ اور خاگینہ وغیرہ بگاڑنے کے لئے غیر معمولی سلیقہ اور صلاحیت درکار ہے جو فی زمانہ مفقود ہے۔

اختلاف کی گنجائش نظر نہ آئی تو میں نے پہلو بچا کر وار کیا۔ "یہ سب درست! لیکن اگر مرغیاں کھانے پر اتر آئے تو ایک ہی مہینے میں ڈربے کے ڈربے صاف ہو جائیں گے۔"

کہنے لگے۔ "یہ نسل مٹائے نہیں مٹتی۔ جہاں تک اس جنس کا تعلق ہے دو اور دو چار نہیں بلکہ چالیس ہوتے ہیں۔ یقین نہ آئے

تو خود حساب کر کے دیکھ لیجئے۔ فرض کیجئے کہ آپ دس مرغیوں سے مرغبانی کی ابتدا کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ نسل کی مرغی سال میں اوسطاً سو سے ڈھائی سو تک انڈے دیتی ہے۔ لیکن آپ چونکہ فطرتاً قنوطی واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ مانے لیتے ہیں کہ آپ کی مرغی صرف ڈیڑھ سو انڈے دے گی۔"

میں نے ٹوکا۔ "مگر میری قنوطیت کا مرغی کی انڈے دینے کی صلاحیت سے کیا تعلق؟"

بولے۔ "بھئی آپ تو قدم قدم پر الجھتے ہیں قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لئے بنائی ہیں۔ خیر، اس کو جانے دیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حساب سے پہلے سال میں ڈیڑھ ہزار انڈے ہونگے اور دوسرے سال ان انڈوں سے جو مرغیاں نکلیں گی وہ دو لاکھ پچیس ہزار انڈے دیں گی، جن سے تیسرے سال اسی محتاط اندازے کے مطابق، تین کروڑ سینتیس لاکھ پچاس ہزار چوزے نکلیں گے۔ بالکل سیدھا سا حساب ہے۔"

"مگر یہ سب کھائیں گے کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

ارشاد ہوا۔ "مرغ اور ملا کے رزق کی فکر تو اللہ میاں کو بھی نہیں ہوتی! اس کی خوبی یہ ہے کہ اپنا رزق آپ تلاش کرتا ہے۔ آپ پال کر تو دیکھئے۔ دانہ دنکا، کیڑے مکوڑے، کنکر پتھر چگ کے اپنا پیٹ بھر لیں گے۔"

پوچھا۔ اگر مرغیاں پالنا اس قدر آسان اور نفع بخش ہے تو آپ اپنی مرغیاں مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں۔"

فرمایا۔ "یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ ناحق ردوقدح کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا مکان پہلے ہی کس قدر مختصر ہے۔ آدھے میں ہم رہتے ہیں اور آدھے میں مرغیاں۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ کل کچھ سسرالی عزیز چھٹیاں گزارنے آرہے ہیں۔ اس لئے اور دوسرے دن ان کے نصف مکان میں سسرالی عزیز اور ہمارے گھر میں مرغیاں آگئیں۔

اب میری سادہ لوحی کہئے یا خلوص نیت کہ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ انسان محبت کا بھوکا ہے اور جانور اس واسطے ہے کہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کا حکم بجالائے۔ گھوڑا اپنے سوار کا آسن اور ہاتھی اپنے مہاوت کا آنکس پہچانتا ہے۔ کتا اپنے مالک کو دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے جس سے مالک کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔ سانپ بھی سنپیرے سے ہل جاتا ہے لیکن مرغیاں؟ میں نے آج تک کوئی مرغی ایسی نہیں دیکھی۔ جو مرغ کے سوا کسی اور کو پہچانے اور نہ ایسا مرغ نظر سے گزرا جس کو اپنے پرائے کی تمیز ہو۔ مہینوں ان کی برداشت اور سنبھال کیجئے برسوں ہتھیلیوں پر چگائیے۔ لیکن کیا مجال جو آپ سے ذرا بھی مانوس ہو جائیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مرغ سرکس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دیں گے یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کتے کی طرح لوٹیں گے، اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے "سپردم بتو مایہ خویش را" کہتی ہوئی مجھے سونپ کر الٹے قدموں واپس چلی جائیں گی تاہم پالتو جانور سے خواہ وہ شرعاً حلال ہی کیوں نہ ہو، یہ توقع نہیں کی جاتی، کہ وہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو چھری سمجھ کر بدکنے لگے اور مہینوں کی پرورش و پرداخت کے باوجود محض اپنے جبلی تعصب کی بنا پر ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا تصور کرے۔

انہیں مانوس کرنے کے خیال سے بچوں نے ہر ایک مرغ کا علحدہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ اکثر کے نام سابق لیڈروں اور خاندان کے بزرگوں پر رکھے گئے۔ گو ان بزرگوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ کا کہنا تھا کہ یہ بے چارے مرغوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے لیکن ان ناموں کے باوصف مجھے ایک ہی نسل کے مرغوں میں آج تک کوئی ایسی خصوصیت نظر نہ آئی، جو ایک مرغ کو دوسرے سے ممیز کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سب مرغ، نوزائیدہ بچے اور اور سکھ ایک جیسی شکل کے نظر آتے ہیں اور انہیں دیکھ کر اپنی بینائی اور حافظہ پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی شناخت و تشخیص کے لئے خاص مہارت و ملکہ درکار ہو، جس کی خود

میں تاب نہ پاکر اپنے حواس خمسہ سے مایوس ہو جاتا ہوں۔

ایک عام خوش فہمی جس میں تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم اور اردو شعرا بالخصوص عرصے سے مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مرغ اور ملا صرف صبح اذاں دیتے ہیں۔ اٹھارہ مہینے اپنے عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یا تو میں جان بوجھ کر عین اس وقت سوتا ہوں جو قدرت نے مرغ کے اذان دینے کے لئے مقرر کیا۔ یا یہ ادبدا کر اس وقت اذاں دیتا ہے۔ جب خدا کے گنہگار بندے خواب غفلت میں پڑے ہوں۔ بہر صورت ہمارے محبوب ترین اوقات اتوار کی صبح اور سہ پہر ہیں۔ اج بھی چھوٹے قصبوں میں کثرت سے ایسے خوش عقیدہ حضرات مل جائیں گے جن کا ایمان ہے کہ مرغ بانگ نہ دے تو پو نہیں پھوٹتی۔ لہذا کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کی بجائے مرغ پال لیتے ہیں تاکہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں قدرت نے وہ سحر حلال عطا کیا ہے کہ نیند کے ماتے تو ایک طرف رہے، ان لوگوں کی بانگ سن کر ایک دفعہ تو مردہ بھی کفن پھاڑ کر اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی اواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اب یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر مرغ اذاں کیوں دیتا ہے۔ ہم پرندوں کی نفسیات کے ماہر نہیں۔ البتہ معتبر بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ صبح دم چڑیوں کا چہچہانا اور مرغ کی اذان دراصل عبادت ہے۔ لہذا جب مرزا عبدالودود بیگ نے ہم سے پوچھا کہ مرغ اذاں کیوں دیتا ہے؟ تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتا ہے۔

کہنے لگے۔ "صاحب! اگر یہ جانور واقعی اتنا عبادت گزار ہے تو مولوی اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟"

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھکا ماندہ بارش میں شرابور گھر پہنچا تو دیکھا تین مرغے میرے پلنگ پر باجماعت اذان دے رہے ہیں۔ سفید چادر پر جابجا پنجوں کے تازہ نشان تھے۔ البتہ میری قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جہاں خالی رہ گئی، وہاں تشفیہ دھبے نہایت بد نما معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ذرا درشتی سے سوال کیا۔ "آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں؟"

بولیں۔ "آپ تو خواہ مخواہ الرجک (Allergic) ہو گئے ہیں۔ یہ بچارے چونچ بھی کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑا رہے ہیں"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دل نے کہا۔ بس بہت ہو چکا۔ آؤ آج دو ٹوک فیصلہ ہو جائے۔ "اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں" میں نے بپھر کر کہا

ان کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے۔ ہراساں ہو کر کہنے لگیں۔ "مینہ برسے میں آپ کہاں جائیں گے"

اس جنس کے بارے میں ایک مایوس کن انکشاف یہ بھی ہوا کہ خواہ آپ موتی چگائیں۔ خواہ سونے کا نوالہ کھلائیں، مگر اس کیڑے، مکوڑے، جھینگر، بھنگے، چیونٹے اور کیچوے کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے اور میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اس کا اثر انڈے میں نہ ہو۔ پھر موپساں کے ایک افسانے کا ہیرو اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ زردی کی بو سے یہ بتا سکتا ہے کہ مرغی نے کیا کھایا تھا تو اچنبھے کی بات نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے ایسے لائق قیافہ شناس دال روٹی پر جی رہے ہیں جو ذرا سی بو چکھ کر نہ صرف بکری کے چارے بلکہ چال چلن کا بھی مفصل حال بتا سکتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کھلی اور بھوسے کی خاصیت اور چوپایوں کی خصلت کے پیش نظر بعض نفاست پسند والیان ریاست اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ جن بھینسوں کے دودھ کی بالائی ان کے دسترخوان پر آئے، ان کو صبح و شام بادام اور پستے کھلائے جائیں تاکہ اس کا اصل ذائقہ اور مہک بدل جائے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دودھ کی خوبی یہ تھی

اسے پی کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ دودھ ہے۔

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص و عوام مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہ عام کے لئے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں یہ ہے کہ مرغیاں ڈربے اور ماپے میں رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مرغیاں ڈربے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں۔ وہاں اپنے ورود و نزول کا ناقابل تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے انڈے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مرغی اور ڈربے سے شیو کی پیالی برآمد ہونا روزمرہ معمول ہوگیا۔ اور یوں بھی ہوا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مگر میرے ہیلو کہنے سے پیشتر ہی مرغ نے [illegible] ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہوکر اذاں دی اور حسن صاحب نے از راہ تلطف مجھے یاد فرمایا تھا۔ انہوں نے "سوری، رونگ، نمبر" [illegible] جھٹ فون بند کردیا

پھر ایک اتوار کی ایک دوپہر کو شور سے آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہوں کہ بچے اصیل مرغ کو مار مار کر بیضوی پیپر ویٹ [illegible] ہیں۔ مانتا ہوں کہ اس دفعہ مرغ بے قصور تھا، لیکن دوسرے دن اتفاقاً دفتر سے ذرا جلد واپس آگیا تو دیکھا کہ محلے بھر کے بچے [illegible] ان کے سروں پر چیل کوے منڈلا رہے ہیں۔ ذرا نزدیک گیا تو پتہ چلا کہ میرے نئے کیرم بورڈ پر لنگڑے مرغ کا جنازہ بڑی دھوم سے نکل رہا ہے۔ سب بچے اپنے قد کے مطابق چار چار کی ٹولیوں میں بٹ گئے اور باری باری کندھا دے رہے تھے۔ غور سے [illegible] جلوس کے آخر میں کچھ ایسے شرکا بھی نظر آئے جو گھٹنیوں چل رہے تھے اور اس بات پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے کہ انہیں کندھے کا موقع کیوں نہیں دیا جاتا

اور اس کے کچھ دن بعد [illegible] حیران [illegible] دیکھا کہ ہمسایوں میں شیرینی تقسیم ہو رہی [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] پہلی بار اذاں دی ہے۔ میں نے اس فضول خرچی پر [illegible] کرنے کی خاطر [illegible] طلب کیا کہ [illegible] مسودہ اور اسناد کا پلندہ (جو بقول اس [illegible]) ردی والے کو [illegible] مختصر چند ہی مہینوں میں اس [illegible] ہوتی [illegible] دیکھ [illegible] میں، حنا پری نے حاتم طائی کو [illegible] تھا

[illegible]

[illegible]

اب گھر ایسا خاصا پولٹری فارم (مرغی خانہ) معلوم ہوتا تھا فرق صرف اتنا تھا [illegible] رہنے کی اجازت نہیں ہوتی

جو حضرات آلام دنیوی سے عاجز و پریشان رہتے ہوں، ان کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مرغیاں پال [illegible] غیب سے کچھ ایسے نئے مسائل اور فتنے خود بخود اٹھ کھڑے ہوں گے کہ انہیں اپنی گذشتہ زندگی جنت کا نمونہ معلوم ہوگی

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ادھر ایک تشویشناک صورت رونما ہوگی کہ ایک مرغ کٹ کھنا ہوگیا پہلے تو یہ ہوا کہ [illegible] بچوں کو تماشا دیکھنا منظور ہوتا تو دو مرغوں کے منہ پر توے کی کالونس لگا کر کھانے کی میز پر چھوڑ دیتے اور لڑائی کے بعد [illegible] دھبے ربر سے مٹانے کی کوشش کرتے۔ لیکن اب کسی اہتمام کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ دن بھر پڑوسیوں کے مرغوں سے [illegible] اللہ لڑتا اور شام کو مجھے لڑاتا تھا۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہ ہو کہ مرغ کے مشاغل و فرائض منصبی کے بارے میں میرا اب بھی [illegible]

مرغا وہ مرغیوں میں جو کھیلے
نہ کہ مرغیوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

... ہم بنا ... تک ہی رہتا تو غنیمت تھا لیکن اب تو یہ ظالم مرغیوں سے زیادہ آنے جانے والوں پر نظر رکھنے لگا ... مرزا
... سے میں نے ایک بار تذکرہ کیا۔ کہنے لگے کیا بات ہے، ہم پر تو ذرا نہیں لپکتا ان کے جانے کے بعد راقم الحروف قد آدم
... کھڑا رہا لیکن عکس میں اظہار کوئی ایسی بات ... نہ آئی جسے دیکھتے ہی ... جانور کی آنکھوں میں خون ا...
... کی شکایتیں بڑھیں تو ایک مشہور مرغ باز سے رجوع کیا۔ اس نے کہا کہ قدرت نے اس پرند کو ہر لحاظ سے
... مرغ غالباً اس لئے کٹ کھنا ہو گیا کہ آپ نے اسے ... چاچھا گوشت کھلا دیا۔ میں نے گھر پہونچ کر ... سے آگاہ کیا تو

... اتنے برسے بھی کہیں کہ ہمارا جھوٹا کھا کے اس ... کا یہ حال ہو جائے!
... سے میں گوشہ نشین واقع ہوا ہوں۔ اور اگر مرغیاں نہ ہوتیں تو محلے میں مجھے کوئی نہ جانتا۔ ان دنوں ڈربے والا
... دو تین مینار کی حیثیت رکھتا تھا جس کے حوالے سے ہمسائے اپنی گمنام کوٹھیوں کا پتہ بتاتے تھے۔ انہی کے
... اور تعلق ہوا اور انہی کی بدولت بہت سی دور رس اور ... رنجشوں کی بنیاد پڑی۔ شمعون صاحب سے
... مرغی ... کی ... اور ہارون صاحب سے اس واسطے بگاڑ ہوا کہ ان کا کتا اس مرغی کو کھا گیا۔
... تھا کہ دونوں حضرات اس قضیہ ... میں بالا ہی بالا طے کر لیتے
... ایک ... مرغ کہیں سے لے آئے تو ہمارے ڈربوں میں گویا ہلچل سی مچ گئی
... خود خلیل صاحب ... سماتے حالانکہ میری ناقص
... مرغیوں کو چھوڑتا ... اپنے سے بہت اصل کا جانور
... سوال ہے ... سے مجھے فی الحال ... رہا تھا کہ ...
... نظر آئے۔ آخر ایک دن ... ہماری بکاولی (... کی مرغی) کی آنکھ
... خلیل صاحب کو ... وقت میں پہونچا تو وہ اپنی ہتھیلی
... تھے جیسے وہ ان کی ذاتی محنت اور ... کا پھل ہو ... ملاقات کی روداد درج

... نے کہا ... والے مکان میں رہتا ہوں ... بولے ... کوئی مرغ نہیں۔
... میری مرغی کی ... پھوڑ دی۔
... اس پاس ...
... کیا ... اس سے کیا فرق پڑتا ہے ... میں نے جھنجھلا کر کہا۔
... ایک ... میں کوئی ... نہیں ہوتا۔
... بات ہے ... میں نے اصل واقعہ کی طرف توجہ دلائی۔

جی ہاں! صریحاً غلط بات ہے۔ اس لئے کہ آپ کی مرغی دو غلی ہے، اور "
اور آپ کا مرغا راج ہنس ہے!" میں نے بات کاٹی۔
تڑپ کو بولے۔ آپ مجھے برا بھلا کہہ لیجئے۔ مرغ تک کیوں جاتے ہیں۔"
(ذرا دم لے کر) لیکن قبلہ اگر وہ راج ہنس نہیں ہے تو آپ کی مرغی یہاں کیوں آئی؟"
آخر جانور ہی تو ہے۔ انسان تو نہیں جو منہ باندھے پڑا رہے۔" میں نے سمجھایا۔
"ارشاد ہوا۔ "آپ اپنی پدمنی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتے تو میں بھی اس کی چونچ پر غلاف چڑھانے سے رہا۔"
غرض کہ ظلم و زیادتی کے خلاف جب بھی آواز اٹھائی، اسی طرح اپنی رہی سہی اوقات خراب کرائی۔
اگرچہ بار بار رانی کھیت کی وبا آئی اور آن کی آن میں ڈربے کے ڈربے صاف کر گئی۔ لیکن اللہ کی رحمت سے ہماری مرغیاں ہر دفعہ محفوظ رہیں۔ مگر آئے دن کی رقابتیں اور رنجشیں رانی کھیت سے کہیں زیادہ جان لیوا ثابت ہوئیں اور یہ قضیہ رفتہ رفتہ یوں طے ہوا کہ کچھ مرغیاں پڑوسیوں کے کتے کھاگئے اور جو ان سے بچ رہیں، ان کو پڑوسی خود کھاگئے اللہ بس باقی ہوس

(ڈیڑھ ماہی شگوفہ، دسمبر ۶۸ جنوری ۶۹)

مجتبیٰ حسین

مرزا کی یادیں



نام ★★ مجتبیٰ حسین
تاریخ پیدائش ★★ ۱۵ / جولائی ۱۹۳۶ء
مقام پیدائش ★★ گلبرگہ
تعلیم ★★ بی۔اے
ادبی زندگی کا آغاز ★★ کالم نگاری (روزنامہ سیاست)
پہلا مزاحیہ مضمون ★★ "ہم طرف دار ہیں غالب کے"
تصانیف ★★ تکلف برطرف ، قطع کلام ، قصہ مختصر ، بہر حال ، بالآخر ، آدمی نامہ (شخصی خاکے) الغرض ، جاپان چلو ، جاپان چلو (سفر نامہ) سفر لخت لخت (سفر نامہ) چہرہ بہ چہرہ (شخصی خاکے)

مرزا تیس سال تک سرکاری ملازمت سے وابستہ رہنے کے بعد پرسوں ریٹائر ہوگئے ۔ میں ان سے ملنے گیا تو گلے سے لگ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں نے کہا "مرزا بھلا یہ بھی کوئی رونے کا موقع ہے ۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ۳۰ سال تک عملاً کوئی کام کئے بغیر تم نے سرکاری ملازمت بحسن و خوبی انجام دی اس میں رونا کیسا ۔"

وہ بولے "یار! تم ایک سرکاری ملازم کے دل کا درد کیا جانو تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ دنیا کے سارے افراد زندگی میں صرف ایک بار مرتے ہیں لیکن سرکاری ملازم تین مرتبہ مرتا ہے ۔"

میں نے پوچھا ۔ وہ کیسے ؟

وہ بولے جب وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پہلی موت واقع ہوتی ہے اور جب وہ وظیفہ پر علحدہ ہوتا ہے تو اس کی دوسری موت واقع ہوجاتی ہے اور تیسری موت تو طبعی موت ہوتی ہے ۔

میں نے کہا "مگر مرزا مر مر کے جئے جانا بھی تو ایک فن ہے ۔

وہ بولے "فن تو خیر ہے ۔" لیکن یہ بھی تو سوچو کہ لوح تربت پر وفات کی کتنی تاریخیں کندہ کروانی پڑتی ہیں ۔ گویا لوح تربت نہ ہوئی ایک اچھی خاصی فائیل ہوگئی ۔ میں نے مرزا کو تسلی دی اور واپس چلا آیا ۔

مرزا کا شمار ان سرکاری ملازمین میں ہوتا تھا جو ہر کام کو پنڈنگ (Pending) میں رکھتے ہیں ۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ پیدائشی سرکاری ملازم تھے ۔ کیونکہ بچپن ہی سے وہ ہر کام کو پنڈنگ (Pending) رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے ۔ جب طالب علم تھے تو نہ صرف ان کا ہوم ورک پنڈنگ رہتا تھا بلکہ اسکول کی فیس بھی پنڈنگ رہا کرتی تھی ۔ سوائے شادی کے انہوں نے اپنی زندگی کا ہر کام پنڈنگ رکھا ۔ ان کے ہاں ہر کام "تھرو پراپر چینل" ہوا کرتا تھا ۔ اس تھرو پراپر چینل پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا کہ مرزا نے ایک بار اپنے دفتر میں ایک مزاحیہ ادبی محفل آراستہ کی ۔ اور مجھ سے ایک مزاحیہ مضمون پڑھنے کو کہا مرزا کا معاملہ تھا سو میں چلا گیا ۔

اب جو میں نے مضمون پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ سامعین بالاقساط ہنس رہے ہیں ۔ کبھی کچھ لوگ ہنستے ہیں ۔ تو کبھی کچھ ۔ کبھی اس گوشہ سے ہنسی کی آواز آتی ہے ۔ تو کبھی اس گوشہ سے ۔ جیسے ہی میں نے مضمون ختم کیا مرزا سے شکایت کی کہ میرے مضمون پر تمہارے دفتر کے لوگوں نے یوں بالاقساط ہنسنے کی سازش کیوں کی ؟ اس پر مرزا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ۔ یار تم کیا جانو کہ دفتری قواعد کیا ہوتے ہیں ۔ ہم تو بس تھرو پراپر چینل ہنس رہے تھے ۔ تمہارے مضمون پر پہلے ہمارے سکریٹری صاحب ہنستے تھے اس کے بعد ڈپٹی سکریٹری کے ہنسنے کی باری آتی تھی ۔ پھر اسسٹنٹ سکریٹریز ہنستے تھے اور تب کہیں یہ ہنسی سپرنٹنڈنس تک پہنچتی تھی اور تم تو جانتے ہو کہ سپرنٹنڈنس کسی بھی معاملہ کو دبا دینے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں ۔ اگر منتظمین خوش قسمتی سے ہنس لیتے تو ہم کلرکوں کی باری آتی تھی
میں نے کہا "مگر یار ! ہنسی تو ایک بے ساختہ عمل ہے ۔ یہ تو برٹش چینل کو بھی عبور کر سکتی ہے ۔ تھرو پراپر چینل کی کیا اہمیت ہے ۔"

وہ بولے " تمہیں کیا معلوم کہ دفتری قواعد کی رو سے آدمی برٹش چینل کو تو بہ آسانی عبور کر سکتا ہے لیکن تھرو پراپر چینل کو نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ "

مرزا زندگی بھر تھرو پراپر چینل کے چکر میں پھنسے رہے ۔ اور اس حد تک پھنسے رہے کہ اگر گھر میں ان کا سب سے چھوٹا بچہ شرارت کرتا تو اسے تھرو پراپر چینل مارنے کے لئے وہ پہلے اپنی بیوی کو پیٹتے پھر بڑے لڑکے کو اور علی الترتیب اپنی ساری اولادوں کے گالوں پر طمانچے رسید کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بچہ کے گال تک پہونچتے تھے ۔

مرزا یہ سمجھتے تھے کہ دنیا کا ہر کام " روٹین کورس " میں ہوتا ہے ان کے سامنے دنیا کا کوئی بھی مسئلہ پیش ہوتا تو اسے " روٹین کورس " کے حوالے کر کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے ۔ اسی روٹین کورس میں مرزا نے گیارہ بچے پیدا کئے ۔ اسی روٹین کورس میں وہ اپنی بیوی سے مسلسل (۲۵) سال تک لڑتے جھگڑتے رہے ۔ اسی روٹین کورس میں وہ دس ہزار کے مقروض ہوگئے ۔ غرض مرزا تیس سال تک ہر روز ایک ہی قسم کا کام انجام دیتے ہوئے خود ایک روٹین کورس میں تبدیل ہوگئے تھے ۔ مرزا کا سب سے بڑا سرکاری فریضہ یہ تھا کہ ہر روز رجسٹر حاضری میں دستخط کریں ۔ رجسٹر حاضری میں دستخط کرنے سے پہلے مرزا کی حالت بالکل وہی ہوتی تھی ۔ جو انڈا دینے سے پہلے مرغی کی ہوا کرتی ہے ۔ رجسٹر حاضری میں دستخط کر دینے کے بعد مرزا یوں سمجھتے تھے جیسے وہ دن بھر کے سارے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو چکے ہوں ۔

میں نے ایک دن ان سے پوچھا بھئی جب تک تم کوئی کام کرتے ہی نہیں ہو تو پھر رجسٹر حاضری میں دستخط کرنے کا تکلف کیوں کرتے ہو

وہ بولے " یار میں کام کرنے کے لئے رجسٹر حاضری میں دستخط نہیں کرتا بلکہ دستخط کرنے کو ہی سب سے بڑا کام سمجھتا ہوں ۔ میں تو رجسٹر میں دستخط صرف اس لئے کرتا ہوں کہ اس طرح اس دنیا میں میرے موجود رہنے کا کوئی ثبوت تو باقی رہے ۔ ورنہ تاریخ کے اتنے بڑے دھارے میں اور اتنی بڑی کائینات میں کون یہ دیکھتا ہے کہ مجھ جیسا ادنیٰ کلرک زندہ بھی ہے یا مر گیا ۔ میں تو صرف اپنے زندہ رہنے کی حاضری ڈلواتا ہوں یوں بھی حکومت جو تنخواہ مجھے دیتی ہے اس میں آدمی صرف دستخط ہی کر سکتا ہے ۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کا معاوضہ الگ ہوتا ہے جو حکومت مجھے نہیں دیتی ۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں ۔ "

رجسٹر حاضری میں دستخط کرنے کے بعد مرزا کو ہمیشہ بڑی شدت سے چائے کی طلب ہوا کرتی تھی ۔ لہذا وہ کسی ایسے شخص کی تلاش کرتے جو انہیں چائے پلا سکے ۔ جب بارہ بجے وہ اپنی سیٹ پر پہنچتے تو انہیں لنچ کا خیال آنے لگتا تھا ۔ درمیانی عرصہ میں وہ اپنی فائیلوں

پر سے گرد جھاڑتے اور انہیں سونگھ سونگھ کر پھر اپنی جگہ پر رکھ دیتے تھے۔ مرزا کے پاس فائلیں اتنے طویل عرصہ تک رہا کرتی تھیں کہ کوئی اصل بو تو کہیں غائب ہو جاتی تھی اور ان میں سے مرزا کی بو آنے لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صرف فائلوں کو سونگھ کر یہ پتہ چلا لیتے تھے کہ کونسی فائل مرزا کی ہے۔ اور کونسی نہیں۔ فائلوں کے گرد جھاڑنے سے فرصت ملتی تو وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے تھے کہ اس عمل سے بھی ان کی کرسی صاف ہو جایا کرتی تھی۔ کرسی کے صاف ہونے تک لنچ کا وقت آجاتا تھا اور مرزا اپنی ٹوپی میز پر چھوڑ کر لنچ کے لئے نکل جاتے تھے۔

میں مرزا سے ملنے جب بھی ان کے دفتر جاتا تو ہمیشہ ان کی ٹوپی سے ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ میں اکثر اس ٹوپی کو اٹھا کر دیکھ لیتا کہ شاید مرزا ٹوپی کے نیچے موجود ہوں۔ مگر مجھے ہمیشہ ٹوپی ہی ملی۔

میں ان سے شکایت کرتا۔ مرزا سچ بتاؤ کہ تم نوکری کرتے ہو یا تمہاری ٹوپی۔ یہ تم اپنی ٹوپی میز پر چھوڑ کر کہاں غائب ہو جاتے ہو۔ بھلا یہ بھی ملازمت کرنے کا کوئی طریقہ ہے۔

اس پر مرزا تر کی بہ ترکی جواب دیتے "میاں! تم کیا جانو میری غیر حاضری میں میری ٹوپی ایک آفیسر کا کام انجام دیا کرتی ہے"

مرزا کی ایسی ہی باتوں سے مجھے بڑا غصہ آتا اور جی چاہتا کہ ایک ضخیم سی فائل اٹھا کر ان کے سر پر دے ماروں۔

مرزا کا لنچ دنیا کا طویل ترین لنچ ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ مرزا لنچ میں دو سے زیادہ چپاتیاں نہیں کھاتے تھے بلکہ اکثر اوقات تو وہ اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے خالی پیٹ ہی ان ہی لا لا کرتے تھے

میں ان سے پوچھتا مرزا دو چپاتیاں کھانے کے لئے تمہیں تین گھنٹے کیوں درکار ہوتے ہیں۔ اس پر وہ کہتے بھئی دو چپاتیاں تو میں دس منٹ میں کھا لیتا ہوں لیکن بعد کے سارے وقت میں خلال کرتا رہتا ہوں۔ آخر غذا کو ہضم کرنے کے لئے بھی تو کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ وقت میں کہاں سے لاؤں۔

مرزا کے لنچ سے واپس آنے تک چار بج جایا کرتے تھے۔ اور یہ وقت عموماً حالات حاضرہ پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے بہت موزوں ہوتا ہے اور پھر مرزا کو گھر واپس جانے کی تیاری بھی تو کرنی پڑتی تھی۔ ان کی نظر ہمیشہ گھڑی پر لگی رہتی۔ دن کے کسی بھی عرصہ میں اگر کوئی ان سے وقت پوچھتا تو مرزا اپنی گھڑی کی طرف دیکھے بغیر نہایت وثوق سے کہتے ابھی وقت کیا پوچھتے ہو دفتر کے برخواست ہونے میں ابھی تو پورے چار گھنٹے پچیس منٹ باقی ہیں۔ مرزا نے ساری زندگی اسی طرح گذاری۔ دفتر کے برخواست ہونے کا وقت دیکھ دیکھ کر جس انہوں نے کبھی اپنی گھڑی میں جھانک کر یہ نہ دیکھا کہ ایک دن وہ خود دفتر سے برخواست ہونے والے ہیں۔

مرزا کی میز پر بھانت بھانت کی فائیلیں رکھی رہتی تھیں اور ان کا بیان تھا کہ فائیلوں کے اس انبار سے ان کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ فائلیں ان کے یہاں آنے سے پہلے ہی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کہا کرتے کہ اپنے بزرگوں کی نشانیوں کو جوں کا توں برقرار رکھنا ہر شخص کا اولین فرض ہے۔ دفتر میں کوئی بھی فائل کہیں گم ہو جاتی تو وہ بالآخر مرزا کی میز پر مل جاتی تھی۔ وہ کہتے کہ وہ دفتر کی گمشدہ فائیلوں کے انچارج ہیں۔ ان کی میز پر فائیلوں کا اتنا انبار تھا کہ ایک دن جب انہوں نے ان فائیلوں کو محافظ خانہ میں بھجوانے کی تجویز پیش کی تو محافظ خانے کے انچارج نے انہیں منع کرتے ہوئے لکھا۔ آپ اپنی فائیلیں محافظ خانہ میں بھجوانے کا تکلف کیوں کرتے ہیں۔ میں خود اپنا محافظ خانہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ وہ جب کبھی ان فائیلوں کے انبار میں بیٹھ جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کسی خندق میں گر کر باہر نکلنے کی ساری کوششوں میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مرزا زندگی بھر اسی خندق میں گھرے رہے اور کبھی باہر نہ نکل سکے۔

مرزا رخصت اتفاقی لینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یوں بھی وہ ہمیشہ بیمار رہا کرتے تھے۔ اور چونکہ بیماری بڑھ کر ان کے لئے

اس بات کے اعلان کی حیثیت رکھتی تھی کہ وہ گزیٹیڈ بن گیا ہے ۔ مرزا بھی زندگی بھر گزیٹیڈ آفیسرس کے ٹائیلٹ روم سے استفادہ کرنے کی حسرت اپنے دل میں پالتے رہے ۔ لیکن بالآخران کے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کا وقت آگیا ۔ جس روز وہ وظیفہ پر علحدہ ہوئے اس روز انہوں نے سارے دفتر میں گھوم کر سارے عہدیداروں سے ملاقات کی ۔ حتی کہ اپنے سکریٹری کے کمرہ میں بھی چلے گئے ۔ لیکن جب وہ سب سے رخصت ہوکر دفتر سے نکلنے لگے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے گزیٹیڈ آفیسرس کے ٹائیلٹ روم کے سامنے کھڑے ہوگئے ۔ اچانک ان کی آنکھوں سے ایک جھیل سی بہہ نکلی ۔ ٹائیلٹ روم پر ایک مغموم سی نگاہ ڈالی اور ایک طویل و عریض آہ بھر کر کہا ۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد

(ڈیڑھ سالہ سالگرہ نمبر ۔ جولائی ، اگسٹ ۱۹۷۰ء) 3 6

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

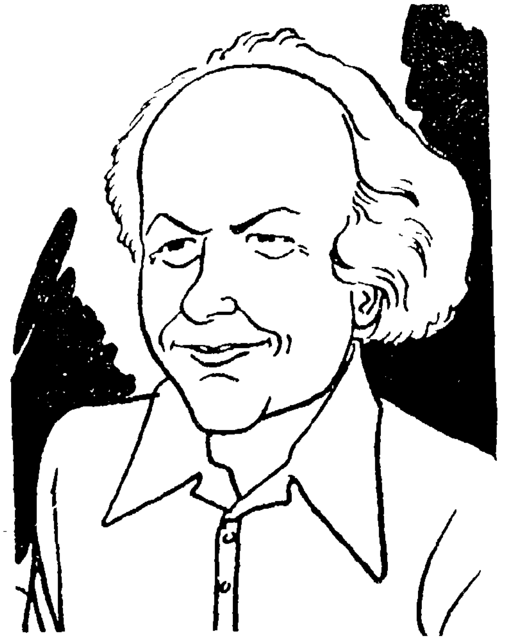
شگوفہ کی اشاعت کا تمام حلقوں اور " بیرون حلقوں " میں خیر مقدم کیا گیا ۔ اپنے پرائے ، دوست ، دشمن سب نے اسے سراہا ، تعریف سن سن کر ہم اپنا وزن بڑھاتے رہے ۔ لیکن برا ہو اس کتب فروش کا جس نے ، ہم سے دوسرے شمارے کی تاریخ اشاعت پوچھ لی ۔ تعریف و تحسین کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ۔ اب پتہ چلا کہ اظہار تحسین میں اپنوں کے ساتھ غیر کیوں شریک تھے ۔ تعریف کے پل باندھے گئے اور جب ، ہم ان پلوں پر سے گزر گئے اور مڑ کر دیکھا تو ان پلوں کا پتہ نہ تھا ۔ اپنے و پرائے دونوں تماشہ بین ، دوربین لگائے نظارہ کر رہے تھے کہ دیکھئے یہ کیا کر تب دکھاتے ہیں ؟ پلوں کے ٹوٹ جانے پر ، ہم پل بھر کے لئے گھبرائے ۔ پھر سوچا اب لوٹنے کی تو کوئی سبیل نہیں ۔ کیوں نہ دوسرا شمارہ نکالنے کی کوشش کریں ! چنانچہ ادیبوں اور شاعروں کو کھٹکھٹایا ۔ کسی کے سرہانے کچھ نکلا اور کسی کی جیب میں کچھ ۔ تب بھی رسالہ کا پیٹ نہ بھر سکا ۔ کچھ نئے عنوانات ڈھونڈھے ۔ لطیفے اور کارٹون شامل کئے اور کاپیاں بغل میں داب پریس کی جانب چلے ، آپ تو جانتے ہیں کہ پریس کا سنگی و آہنی پیٹ کتنا ہلکا ہوتا ہے ۔ منٹوں میں خبر پھیل گئی ۔ اغیار نے حیرت کا اظہار کیا " خبر " کے تو وہ منتظر تھے ہی ۔ لیکن اس لفظ کے ایک حرف میں فرق پڑ گیا اور پھر اس سے پہلے کہ دوسرا شمارہ بک اسٹالوں پر آتا ، ہم نے دیکھا سارے ٹوٹے ہوئے پل پھر سے باندھ دئے گئے ہیں "

ان ہی پلوں پر سے گزر کر جب ، ہم ۶۹ء کی پہلی شب بستر میں پہنچے تھے کہ ایک برہمن نے خواب میں آکر پوچھا " کمال اچھا ہے " ۔ ہمیں برہمن کے لہجے پر کر سچین کا شبہ ہوا ۔ آنکھیں بند کر کے (کیونکہ خواب میں آنکھیں کھولنے کی اجازت نہیں) ہم نے غور سے دیکھا ۔ لیکن وہ برہمن ہی نکلے ہم نے جواب میں رونی صورت بنائی تو چپکے سے موصوف نے کہا ۔ رومت " یہ سال اچھا ہے "

اداریہ (شگوفہ دسمبر ۶۸ ، جنوری ۶۹)

یوسف ناظم

ایک پردیسی کا سفرنامہ



نام ** سید محمد یوسف، ناظم تخلص
پیدائش ** نومبر ۱۹۲۱
وطن ** جالنہ (اورنگ آباد)
تعلیم ** یم اے، اردو (جامعہ عثمانیہ)
ملازمت ** محکمہ لیبر (۱۹۷۶ء میں وظیفہ)
ادبی مصروفیت ** ۱۹۴۴ء سے مزاح لکھ رہے ہیں
تصانیف ** کیف و کم، فٹ نوٹ، دیواریے، زیر غور، سائے ہمسائے، فقط، البتہ، ذکر خیر، بالکلیات، منجملہ، امریکہ میری عینک سے، فی البدیہہ، فی زمانہ، فی الحقیقت، فی الفور، فی الحال، اور بچوں کے لئے کتابیں و تراجم

بمبئی شہر کی جیسی تعریف سنی تھی اسے ویسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ جب ہم یہاں پہونچے تو سارا شہر پسینے میں تر تھا۔ یہاں مئی اور جون میں اتنی گرمی نہیں ہوتی ہے جتنی اکتوبر میں ہوتی ہے لیکن سنا ہے خود مئی اور جون میں یہاں اتنی گرمی تو ہو ہی جاتی ہے کہ آٹا گوندھ کر چھاؤں میں بھی رکھ دو تو خود بخود بریڈ بن جائے (بریڈ کو بمبئی میں پاؤ بولتے ہیں، بمبئی میں ہر شخص صبح اٹھتے ہی پاؤ ضرور کھاتا ہے۔ کہتے ہیں جو شخص یہاں پاؤ نہیں کھاتا لاغر ہو جاتا ہے) اکتوبر کی دھوپ میں چلتا پھرتا زندہ مرغ۔ تندوری مرغ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اسے فوراً ہوٹلوں میں منتقل کرنا پڑتا ہے (تندوری مرغ کے تفصیلی حالات ہم آئندہ کبھی بیان کریں گے، یہ یہاں کا بہت مشہور پرندہ ہے)۔ بمبئی میں دو ہی موسم ہوتے ہیں۔ گرمی اور بارش۔ بارش کے دنوں میں یہاں کا سمندر چاروں طرف سے بارش کے پانی سے گھر جاتا ہے پورے ہندوستان میں بمبئی ہی ایسا شہر ہے جہاں ہر شخص تیرنا جانتا ہے۔ تیرنا نہ جانے تو گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر نہ پہنچ پائے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ تیرتی رہتی ہیں (ڈوبتے تو صرف مرد ہیں) یہاں عورتوں کی آبادی ---- آبادی نہ سہی ان کی چہل پہل ہمیں زیادہ نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں عورتیں ہر میدان میں مردوں سے آگے ہیں۔ یہاں کی ٹرینوں اور بسوں میں اگر روزانہ دو چار جیبیں نہ کٹیں تو شہر سونا سونا نظر آتا ہے اور چلتی ٹرین سے ہاتھوں کی گھڑیاں، گلے کی زنجیریں اور کانوں کے بندے کھینچ لئے جانے کی سو سوا سو وارداتیں نہ ہوں تو پولیس پریشان ہو جاتی ہے۔ ان سب معاملات میں بھی عورتیں، مردوں کے شانہ بشانہ رہتی ہیں بلکہ یہ سب کام تنہا اپنی ذمہ داری پر انجام دیتی ہیں۔ بمبئی میں پہلے مسافر ٹیکسی چلانے والوں سے سہمے رہتے تھے اب مسافر انہیں لوٹ لینے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ سمندر کے کنارے یا پارکوں میں اور میدانوں میں تفریح کرنے والے جوڑوں کا پہلے پٹ جانا اور اس کے فوراً بعد لٹ جانا ایسا ہی ہے جیسے پرندوں کا ہوا میں اڑنا۔ ایسی باتوں پر اگر کوئی شخص یہاں تعجب کرتا ہے تو اسے ڈانٹ سننی پڑتی ہے   شہر ہمیں پسند آیا۔

بمبئی اور دلی میں ایک نمایاں فرق یہ دکھائی دیا کہ دلی میں سڑکیں خالی پڑی رہتی ہیں ۔ بمبئی میں کوئی سڑک، کوئی گلی، کوئی کوچہ ایسا نظر نہیں آیا جہاں آدمی رک کر اپنی سانس ٹھیک کر سکے ۔ آدمی نہ چلتے ہوں تو کم سے کم جانور سڑکوں پر ضرور چلیں گے ۔ شاہراہوں کے دونوں طرف " ضرورت مند " عوام الناس مصروف گل کاری نظر آئیں گے وقت کی کوئی قید نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ صبح کے اوقات میں اس قسم کا مجمع ذرا زیادہ ہوگا ۔ کام سب ایک ہی کریں گے لیکن اس طرح کہ " کسے راز کسے کارے نباشد

زندگی یوں ہمیں دلی میں بھی نظر آئی لیکن زندگی وہاں لیٹی رہتی ہے ۔ یہاں ملکھا سنگھ کی رفتار سے بھاگتی ہے (سنا ہے ملکھا سنگھ ہندوستان کا سب سے تیز رفتار شخص تھا، جب بھاگتا تھا تو بھاگتا ہی رہتا تھا)

زندگی کی تیز رفتاری کی وجہ سے یہاں آدمی کو آتش زیر پا لار ہنا پڑتا ہے ۔ صبح اٹھ کر اگر آدمی تین منٹ میں نہالے دو منٹ میں شیو کر لے اور چار منٹ میں تیار ہو کر گھر سے باہر نکل جائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ بڑے آرام کی زندگی گذار رہا ہے جو لوگ اس سے کم ارام میں ہیں وہ یہ سارے کام رات ہی میں کر لیتے ہیں ۔ بمبئی میں یوں بھی دن رات کے ڈیڑھ بجے ختم ہوتا ہے اور پونے دو بجے صبح شروع ہو جاتی ہے ۔ جو بچے اور والدین ایک ہی گھر میں رہتے ہیں ہفتے میں ایک دن ضرور ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں ۔ اس طرح رشتہ برقرار رہتا ہے ۔

بمبئی میں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ ہر شخص مخالف سمت میں بھاگتا ہے ۔ یعنی شہر سے ۴۰ میل دور رہتا ہے تو نوکری یا کاروبار کے لئے شہر آتا ہے اور جو شخص شہر میں رہتا ہے اپنے گھر سے ۳۵ میل دور مضافات میں جا کر کام کرتا ہے کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جن کے گھر اور دفتر یا مکان یا دکان نزدیک نزدیک ہیں لیکن ایسے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ۔ بمبئی میں رہ کر اگر آدمی روزانہ ساٹھ ستر میل کا سفر نہ کرے تو وہ شہری کب ہوا ۔

دلی میں الکٹرک ٹرینیں بھی نظر نہ آئیں ۔ بمبئی میں ہمیں پورا شہر اور پورے مضافات ان ٹرینوں سے گھرے ہوئے دکھائی دیئے ان ٹرینوں کی چھتیں بھی کافی آرام دہ بنائی گئی ہیں اور کتنے ہی مسافر ان چھتوں پر چڑھ کر سفر کرتے ہیں ۔ اس میں ریلوے کا فائدہ یہ ہے کہ چھتوں پر پنکھے نہیں لگانے پڑتے ۔ ٹرینوں میں سفر کرنے والے لوگ جیب میں اور کچھ رکھیں یا نہ رکھیں ایک کنگھا ضرور رکھتے ہیں اور پلیٹ فارم پر اتر کر سب سے پہلے بالوں میں کنگھا کرتے ہیں ۔ کنگھا کرنے کے بعد انگلیوں کی مدد سے صاف کر کے، بال ہوا میں اڑا دیتے ہیں (پھونک مارنی پڑتی ہے، از دہا ز دچلنے والے لوگ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں)

بمبئی کا ہر ادمی زیادہ ذہین ہوتا ہے اور ہر چیز کا مصرف جانتا ہے مثلاً یہ کہ دلی میں بھی لوگ بنیان پہنتے ہیں لیکن اس سے کوئی کام نہیں لیتے بمبئی کا ادمی اس میں اپنا فاؤنٹن پن لگاتا ہے بلکہ وہ بنیان پہنتا ہی اس لئے ہے کہ اگر نہ پہنے تو فاؤنٹن پن کہاں رکھے ۔ ہم نے بہتوں کو تو کتابیں اور فائلیں تک بنیان میں رکھے دیکھا ۔ بمبئی میں جگہ کی بڑی قلت ہے

دلی میں سارے لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں، ان میں کوئی رشتہ نہیں جبکہ بمبئی میں ہر شخص ایک دوسرے کا سالا نظر آیا ۔ ہمیں اتنی قرابت داری کہیں اور نظر نہ آئی لیکن بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ قرابت داری کا معاملہ نہیں، طرز گفتگو کا ہے ۔

ایسا لگتا ہے کہ اس شہر میں ہمارا دل بہت لگے گا ۔

شہر بمبئی میں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ہر آدمی کا دن ایک عدد " پاؤ " کھانے سے شروع ہوتا ہے ۔ پاؤ کئی قسم کے ہوتے ہیں گول، استوانہ نما، مخروطی، مستطیل، مربع، سخت، میڈیم سخت، نرم، بے حد نرم، ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی پسند کے نمونے کے بریڈ کھائے ۔ بچے عام طور پر ڈبہ نما بریڈ استعمال کرتے ہیں اور اس کے ایک طرف کا دروازہ کھول کے اس کے اندر سے گودا نکال کر کھا لیتے

ہیں ۔ گوداکھالینے کے بعد جو چیز بچ جاتی ہے اس سے تین دیواروں والے کمرے کا کام لیا جاسکتا ہے بچے اس میں اپنی اسٹیشنری رکھتے ہیں ۔ دو دن کے بعد، اس کمرے کی بریڈ پڈنگ بن سکتی ہے جو اتوار کے دن آنے والے مہمانوں کی خدمت میں پیش کی جاسکتی ہے ۔ اس میں شکر کم سے کم ڈالنی چاہیے تاکہ یہ زیادہ بدمزہ رہے ۔ اس پاؤ اور بریڈ کے علاوہ یہاں کی اور بھی کئی ڈشیں ایسی ہیں جو عوام الناس ہی میں نہیں محل نشیاں اور امپالا نشیں لوگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں ۔ گرم مونگ پھلی، چنے، نمک کے پانی میں ابالے ہوئے سینگدانے، پانی پوری، رگڑا اور بھیل پوری یہ چیزیں اگر حلق سے ٹھیک طور سے نہ اتریں تو لیموں پانی یا گنے کے رس کی مدد لی جاسکتی ہے ۔ لیموں پانی میں کبھی کبھی لیموں کا عرق بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ گنے کے رس میں کبھی کبھی ایک آدھ چھپکلی بھی پس کر آجاتی ہے (اس میں رعایت یہ ہے کہ چھپکلی کی قیمت الگ سے ادا نہیں کرنی پڑتی) جن گلاسوں میں رس پیش کیا جاتا ہے انہیں دھویا بھی جاتا ہے ۔ گلاسوں کو کس پانی سے دھویا جاتا ہے اس پر غور نہیں کرنا چاہیے ۔ بڑے شہروں میں اگر ایسی باتوں پر وقت برباد کیا جائے تو پھر آدمی کام کب کرے گا؟ ہمیں ان ساری ڈشوں میں بھیل پوری بہت پسند آئی ۔ بھیل پوری میں طرح طرح کی چیزیں ملائی جاتی ہیں ۔ بھیا جب ان تمام چیزوں کو یکجا کر کے اپنے دست نازک سے ان کا مرکب تیار کرتا ہے تو اس کے ہاتھ کی صفائی پر رشک آنے لگتا ہے ۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ جو کچھ کماتا ہے، وہ اس کے پسینے کی کمائی ہے ۔ بمبئی میں ہر شخص دن میں ایک بھیل پوری ضرور کھاتا ہے نہ کھائے تو اس سے بزنس میں ہزاروں غلطیاں ہو جائیں ۔ ٹرین اور بس چھوٹ جائے اور وہ منیم سے سیٹھ کے درجے پر کبھی نہ پہنچ سکے ۔ بمبئی میں ان لوگوں کو پسند نہیں کیا جاتا جو سڑک پر چلتے وقت کوئی چیز نہ کھاتے ہوں ۔ یہاں سڑک پر چلتے وقت، ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا چاہیے ۔ آدمی معزز دکھائی دیتا ہے ورنہ لوگ سمجھتے ہیں یہ شخص فاقہ کشی میں مبتلا ہے بچے بھی سبق حاصل کرتے ہیں ۔ ان فواکہات کے علاوہ یہاں قدم قدم پر کھانے کے لئے قدرتی اشیا بھی ملتی ہیں ۔ یعنی کیلے، امرود، سپوٹے اور کھیرے ۔ امرود کے ساتھ سرخ مرچ میں ملا ہوا نمک مفت ملتا ہے ۔ یہی کیفیت کھیروں کی ہے نمک بونس کی شکل میں تقسیم ہوتا ہے ۔ کیلے اور چیکو کھانے والوں کو یہ نعمتیں نہیں ملتیں لیکن چیکو بیچنے والے البتہ اتنی سوشیل سروس ضرور کرتے ہیں کہ زائد رقم لئے بغیر چیکو کو ہر طرف سے چھیل کر آپ کے حوالے کر سکتے ہیں ۔ ان میں کئی وٹامنوں کا اضافہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک چوتھائی چیکو چھلکے کے ساتھ چلا جاتا ہے ۔ اس لئے اکثر لوگ چیکو بھی چھلکے کے ساتھ ہی کھاتے ہیں اور یہ یقین کر لیتے کہ ایک وٹامن بھی ضائع نہیں ہونے پایا ۔ (یہاں ابھی ناریل کو چھلکے کے ساتھ کھانے کا سسٹم شروع نہیں ہوا ہے) ہاں یہاں ناریل کا پانی بکثرت پیا جاتا ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہی ایک پانی ہوتا ہے جس میں میونسپل کارپوریشن کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ ہر ناریل میں سے ایک گھونٹ پانی ضرور برآمد ہوتا ہے ۔ ناریل کی منہ مانگی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے (ہر ناریل فروش کے پاس ایک چاقو ہوتا ہے) استعمال شدہ ناریل کے خول سے آپ کچھ دیر فٹ بال کھیل سکتے ہیں ۔ اس کا کوئی معاوضہ ادا کرنا نہیں پڑتا ۔ پینے کی چیزوں میں یہاں نیرا بھی مقبول عام مشروب ہے لیکن یہ صرف صبح کے اوقات میں ملتا ہے بہت عجلت میں پینا پڑتا ہے ۔ اس طرح اس کے نقائص ظاہر نہیں ہونے پاتے ۔ ہر ریلوے پلیٹ فارم پر نیرے کا ایک اسٹال ضرور ہوتا ہے جس پر بعد میں وہ لوگ سو سکتے ہیں جنہیں بنچوں پر سونے کے لئے جگہ نہ ملی ہو ۔ ریلوے پلیٹ فارم پر جتنے بھی بنچ ہوتے ہیں ۔ برسوں سے چند خاص لوگوں کی رہائش کے لئے ریزرو ہو چکے ہیں ۔ خود پلیٹ فارم اور بالائی پلوں پر بھی قیام و طعام کی اجازت ہے ۔ جو لوگ یہاں مستقل طور پر رہنا نہ چاہیں وہ چار چھ گھنٹوں کے لئے اپنی دکان لگا سکتے ہیں ۔ بظاہر اس کا کوئی کرایہ نہیں ہے ۔ ریلوے پلیٹ فارم پر نیرے کے علاوہ چائے بھی ملتی ہے اور اس چائے کے تعلق سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی چائے کہیں اور مل ہی نہیں سکتی (یہ بات شاید ہم آپ سے کہہ چکے ہیں)

بمبئی میں پانی کم پیا جاتا ہے بلکہ صرف چائے پی جاتی ہے اور اس میں تعاون عمل وغیرہ سبھی قسم کی تحریکوں کا دخل ہوتا ہے ایک

پیالی چائے میں جس میں چائے کئی قطرے ہوتے ہیں ۔ کم سے کم دو آدمی چائے پیتے ہیں ۔ طشتری میں جس میں پہلے ہی سے تھوڑا سا گدلا پانی موجود رہتا ہے ، مہمان کو چائے پیش کی جاتی ہے ، اس طرح چائے کی مقدار اور مہمان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے ۔

شہر بمبئی میں ٹریفک کا بہت انتظام ہے (یوں ام مارل ٹریفک کا بھی بہت اچھا انتظام ہے ۔ ام مارل ٹریفک کو نفس امارہ کے ذریعہ قابو میں لایا جاتا ہے) جگہ جگہ ٹریفک آئی لینڈ بنے ہوئے ہیں ۔ فٹ پاتھ پر سمنٹ کی ریلنگ لگی ہوئی ہے ۔ ٹریفک سگنل قدم قدم پر ہیں ۔ یہ ٹریفک سگنل خود کار ہیں ، جب ان کی خودی ختم ہو جاتی ہے یا جواب دے دیتی ہے تو بے خود کانسٹبل یہ کام سنبھال لیتے ہیں ٹریفک سنگل پر امبر ، ہری اور لال روشنی بتاتی ہے کہ اب آپ کو کیا کرنا ہے ۔ لال بتی نظر آئے تو گاڑی اس طرح روک دینی چاہئے کہ بریک لگانے کی آواز دور دور تک سنائی دے ۔ امبر روشنی نظر آئے تو گاڑی چلانے کی تیاری کرنی چاہیے اور سبز روشنی نظر آتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دینی چاہیے یہ جھٹکہ زلزلے سے ملتا جلتا ہونا چاہیے ۔ پیدل چلنے والوں کے لئے سگنل کے اندر ہی آدمی کی تصویر بنا دی گئی ہے ۔ یہ آدمی مرد ہے لیکن جب یہ نظر آئے تو عورتیں بھی چل سکتی ہیں ۔ پورے شہر میں ٹریفک سگنل کی تصویر والا مرد ہی وہ تنہا مرد ہے جس کے اشارے پر عورتیں چلتی ہیں فٹ پاتھ پر لگی ہوئی ریلنگ میں جگہ جگہ سے ایک ستون توڑ دیا گیا ہے تاکہ لوگ اس میں آسانی سے گذر سکیں ۔ یہ راستے بہت ضروری ہیں کیوں کہ ہر شخص تو ریلنگ پر سے پھلانگ نہیں سکتا پھر بھی ہر شخص کو تھوڑی بہت بائی جمپ آنی ہی چاہیے ۔ راستہ چلنے والوں کے لئے سڑکوں پر سطریں بھی بنا دی گئی ہیں ۔ ان سطروں میں بین السطور صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ٹھیلے سے کوئی راہ گیر ٹکرا کر گر پڑے ۔ ٹھیلہ یہاں اس سواری کو کہتے ہیں جس پر اتنا بوجھ لاد دیا جائے کہ اسے ڈھکیلنے والا خود کھینچتا چلا جائے ۔ بمبئی میں پورے شہر کا آدھا بزنس ، انہیں ٹھیلوں کے ذریعہ ہوتا ہے ۔ ہمارے ایک شاعر نے ہمیں بتایا کہ بمبئی میں ہاتھ گاڑی چلانے والے ایک دن میں جتنا پیدل چل لیتے ہیں اتنا ملٹری والے دو مہینوں میں نہیں چل سکتے بس فرق یہ ہے کہ ان کے پاس بندوق نہیں ہوتی صرف زبان ہوتی ہے لیکن یہ زبان کام بندوق ہی کا کرتی ہے ۔

بمبئی میں ٹریفک کے سلسلے میں ایک لفظ بہت عام ہے جگہ جگہ سننے میں آتا ہے ٹریفک " جام " ہو گئی ۔ بہت دن تک تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹریفک جام میں کیسے منتقل ہو سکتی ہے ۔ جب کبھی یہاں ٹریفک جام ہوتی ہے تو ہر موٹر یہ بتاتی ہے کہ میں بھی ایک ہارن رکھتی ہوں ۔ ہارن کا ایسا کورس ، ہم نے کہیں اور نہیں سنا ۔ جب پانچ سات سو ہارن ایک ساتھ بجتے ہیں تو کئی کانسٹبل ادھر ادھر سے جمع ہو کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں جی بھر کر سیٹیاں بجاتے ہیں اور چند گھنٹوں میں حالات پر قابو پالیتے ہیں ۔ حالات پر قابو پانے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اگر آپ شمال کی طرف جا رہی ہوں تو آپ کو مشرق میں روانہ کر دیا جائے ۔ اور جو گاڑی مغرب میں جا رہی ہے تو اسے جنوب کی طرف بھیج دیا جائے ۔

بمبئی میں سیکلیں اتنی تو نہیں جتنی دلی میں نظر آئیں ۔ لیکن پھر بھی کافی ہیں ۔ سیکلیں عام طور پر ٹریفک کے قاعدہ قانون سے مستثنیٰ ہیں دوسری سواریوں کو جگہ جگہ رکنا چاہیے ۔ سیکلوں پر صرف اتنی پابندی کہ یہ کہیں نہ رکیں ۔ موٹروں کے ٹھہرانے کے معاملے میں بھی لوگ دو دو دن پریشان رہتے ہیں اور اس دن ان کی دکان بند رہتی ہے ۔ کہتے ہیں موٹر نشین لوگ بعض وقت صرف پارکنگ کرنے کے لئے میلوں موٹریں دوڑاتے رہتے ہیں ۔ جن محلوں میں دکانیں ہیں اگر دکاندار ، سورج نکلنے سے پہلے وہاں نہ پہونچیں تو وہ گاڑی سے اتر ہی نہیں سکتے ۔ کھڑے کھڑے گاڑی بیچ دینی پڑتی ہے ۔ بعض لوگ دکان ہی بیچ دیتے ہیں ۔ پارکنگ ایک فن ہے اور موٹر چلانے کا لائسنس بھی یہاں صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو دو فٹ کی جگہ میں موٹر پارک کر کے دکھا دیں ۔

یہاں پر کسی کے ہاں گیاریج نہیں ہوتا اس لئے رات کے وقت موٹریں اپنے اپنے مکان سے دو چار میل دور سڑکوں پر کھڑی

کر دی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ہر موٹر، ہر مہینے میں ایک مرتبہ چرن جاتی ہے۔ بعد میں ۲۰، ۲۵ میل کے فاصلے پر یہ موٹر دستیاب ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نوجوان کو اپنی محبوبہ کے لئے یہ کار درکار تھی۔ ایسی کار کو یہاں کار خیر کہا جاتا ہے۔

بمبئی چونکہ بڑا شہر ہے اس لئے یہاں کی ہر چیز بڑی ہوتی ہے، بڑے بڑے پرندے بھی ہمیں یہیں نظر آتے ہیں یا ممکن ہے ان پرندوں کا موسم ہی صرف کرسمس کا موسم ہو، کرسمس کے موقع پر یہاں ہر شخص ٹرکی کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹرکی کھانے کا ہمیں موقعہ نہیں ملا لیکن سنا ہے ٹرکی کھانے میں فائدہ یہ ہے کہ کھانے کے ساتھ ساتھ ورزش بھی ہو جاتی ہے زندہ ٹرکی ہمیں کئی جگہ نظر آئے (کہتے ہیں یہ مرغ کی ایک قسم ہوتی ہے، وہ مرغ نہیں جو اردو شاعری میں پایا جاتا ہے) اس مرغ کے آباواجداد ترکی میں پیدا ہوئے تھے اور پھر ان کی نسل شمالی امریکہ لے جائی گئی کیونکہ یہ پرندہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ان کی پرورش کا انتظام اہل ترکی سے نہ ممکن نہ تھا۔ شمالی امریکہ میں یہ نسل خوب پھلی پھولی (جمہوریت کا یہی فائدہ ہے۔ مرغوں کو بھی ترقی کرنے کی اجازت ہوتی ہے) اصل مرغ تو ہم نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے لیکن ٹرکی کے دیدار سے تو جی خوش ہو گیا۔ مرغ اسے کہتے ہیں اور مرغ کو اتنا ہی ضخیم اور شاندار ہونا چاہیے۔ ٹرکی کو عام مرغوں اور معمولی مرغیوں کی طرح ڈربے میں نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ ہر ٹرکی اپنے لئے ایک علحدہ کمرہ چاہتا ہے تاکہ اسے مکمل پرائیویسی حاصل ہو، ٹرکی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا اپنا الگ تمدن ہوتا ہے اور یہ ان حرکتوں سے احتراز کرتا ہے (کم سے کم پبلک میں، جو روزمرہ کے مرغوں کو بہت بھاتی ہیں) اس کی صحت کا راز بھی یہی ہے۔ بظاہر یہ تجرد کی زندگی گذارتا ہے۔ ٹرکی کے سر پر کلغی تو ہوتی ہے لیکن پر نہیں ہوتے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی دم پروں سے لبریز ہوتی ہے۔ جب دم پر اتنے خرچ ہو جائیں گے تو سر کے لئے کہاں سے آئیں گے۔ کرسمس کے موقع پر ٹرکی کے گوشت کا کھایا جانا۔ وقار کی علامت ہے کچھ نہیں تو ایک تولہ گوشت کھانا ہی چاہیے یہ صرف (۲۵) روپے کلو بکتا ہے۔

بمبئی میں انڈے بھی سائز میں اودل میدان کے مانند ہوتے ہیں۔ ان کا نام ہی جمبو بیضہ ہے۔ جمبو انڈے میں ایک نہیں دو زردیاں ہوتی ہیں۔ یہ انڈا وہ لوگ کھاتے ہیں۔ جنہیں ڈاکٹر دن میں صرف ایک بار کھانا کھانے کی ہدایت کرتے ہیں یہ جڑواں، زردیاں سائز، رنگ، ساخت اور خواص میں ایک ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں ان کا ذائقہ بھی ایک سا ہوتا ہے۔ جمبو انڈوں کے بارے میں بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ انڈے مرغیاں نہیں پیدا کرتیں۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ مرغیاں کیا نہیں کر سکتیں۔ بطخوں کو اپنے دئے ہوئے انڈوں کی جسامت پر بڑا ناز تھا۔ اب ان کا سر پر غرور جھک گیا ہے۔ (ہر غرور کا یہی انجام ہوتا ہے)۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا لیکن سنا ہے یہاں چند خاص دنوں میں بکرے بھی اتنے بڑے بڑے آتے ہیں کہ دو آنکھوں میں سماسکتے ہیں۔ ہمیں کسی نے بتایا کہ ایک مرتبہ تو ایک بکرے کی تصویر بھی اخبار میں چھپی تھی۔ اور جس اخبار میں یہ تصویر چھپی تھی وہ خود بلیک میں بکا تھا (بلیک بکنا خاص محاورہ ہے) ان بکروں کو خشک میوہ کھلا کر پالا جاتا ہے۔ ایسے بکروں کا گوشت، پیر کے دن کھایا جائے تو بدھ یا جمعرات تک ضرور ہضم ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی ٹرکی کے گوشت کے ہضم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہاں کے کولڈ اسٹوریج میں مینڈکوں کے دست بازو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دست بازو بھی کافی تندرست و توانا تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ باہر کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں مینڈک کا گوشت جو بھی کھالیتا ہے اسے عمر بھر زکام نہیں ہوتا۔ کیوں کہ خود مینڈک کو زکام نہیں ہوا کرتا یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی۔ مینڈک کی دوسری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ تنہا جانور ہے جو پانی میں بھی زندہ رہتا ہے اور خشکی پر بھی، اس کی پیدائش البتہ پانی میں ہوتی ہے اور اسی لئے بڑا ہو کر جب یہ خشکی پر آجاتا ہے تو صرف مخصوص ضروریات کے

لئے پانی میں واپس جاتا ہے ۔ اس کے پیر اس لئے برآمد کئے جاتے ہیں کہ مینڈک میں صرف ہوتے ہی پیر ہیں ۔ باقی جو کچھ بھی ہوتا ہے بھرتی کے شعر کی طرح ہوتا ہے ۔

ترکاریوں میں یہاں بینگن کی پرورش پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اسے بہت سمجھا بجھا کر پالا پوسا جاتا ہے جمبو کا لقب چونکہ انڈوں کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس لئے انہیں جمبو بینگن نہیں کہا جا سکتا لیکن ہوتے یہ جمبو بینگن ہی ہیں ۔ صرف ایک عدد بینگن کا سالن تیار کر لیا جائے تو پورے محلے کے افراد کے لئے کافی ہو جاتا ہے اسے پکانے کے لئے البتہ الگ سے چولہا تعمیر کرنا پڑتا ہے ۔ خاص دیگ بھی بنوانی پڑتی ہے لیکن بینگن کھانے ہیں تو یہ سب کرنا ہی پڑے گا ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اگر اچھے بینگن کھانے ہیں تو حیدر آباد جانا چاہیے یہ بھی کہا گیا کہ وہاں لوگ شیخی نہیں بگھارتے صرف بینگن بگھارتے ہیں ۔

پھلوں میں کافی بڑے سائز کے کیلے بھی نظر آئے پہلے تو ہم سمجھے یہ کیلے ناپ کر بیچے جاتے ہوں گے لیکن یہ بھی عدد کے حساب سے بکتے ہیں ۔ یہ کیلے یہاں نہیں پیدا ہوتے ۔ ہندوستان میں ایک مقام ہے کیرالا ۔ یہ کیلے وہیں سے آتے ہیں ۔ کیرالا کا ایک کیلا عام سائز کے چھ کیلوں سے کچھ بڑا ہی ہوتا ہے اور وہاں سے بمبئی پہنچتے پہنچتے موم کی طرح نرم ہو جاتا ہے لیکن اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی لوگ اسے سو روپے درجن خرید کر خوش ہوتے ہیں کہ سستے مل گئے

بمبئی میں بڑی چیزوں میں سب سے اہم چیز یہاں کی بڑی بڑی باتیں ہیں

ہندوستان یعنی دلی میں نیا سال جمی کارٹر کے آنے سے شروع ہوا ۔ پہلے تو ہمیں افسوس ہوا کہ اس موقع پر ہم دلی میں نہیں بمبئی میں تھے لیکن جب بمبئی میں ٹیلی ویژن پر ہم نے جمی کارٹر کے استقبال کی کارروائی دیکھی تو خوشی ہوئی کہ ہم دلی سے ۱۲ یا ۱۳ سو کیلو میٹر دور تھے ۔ انہیں وہاں میونسپل کارپوریشن کی طرف سے رام لیلا میدان میں ایک استقبالیہ دیا گیا تھا ۔ استقبالیہ کی کارروائی ہندی میں تھی باہر سے آنے والے سربراہان ملک پر یہ پابندی ہے کہ اپنے استقبالیے کی تقریب کے دوران وہ مسلسل مسکراتے رہیں خواہ وہ کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں جمی کارٹر کو یوں بھی مسکرانے کی کچھ عادت سی ہے ۔ (معلوم نہیں وہ کس کھیت کی مونگ پھلی کھایا کرتے ہیں) اس لئے انہیں اس محفل میں کبھی مسکرانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ان کی مسکراہٹ اس وقت غائب ہو گئی جب وہ خود تقریر کرنے کھڑے ہوئے ۔ انہیں اپنی تقریر کے ہر جملے کے بعد مائک سے ہٹ جانا پڑتا تھا کیونکہ ایک مہاشے ان کی تقریر کا ہندی میں ترجمہ کر رہے تھے ۔ کہتے ہیں ایسا ترجمہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی ہوا تھا نہ کبھی ہوا ہے ۔ اس ترجمے کی خوبی یہ تھی کہ اس کا جمی کارٹر کی تقریر سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ لیکن چونکہ یہ ان کے شانہ بشانہ کھڑے رہ کر کیا گیا تھا ۔ اس لئے سمجھنا چاہیے کہ یہ انہیں کی تقریر کا ترجمہ تھا ۔ اس پروگرام کو اور زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا تھا ۔ انہیں مترجم صاحب سے کہا جاتا کہ ہندی تقریروں کا انگریزی ترجمہ بھی سناؤ تو ہماری فارن پالیسی پر کافی اچھا اثر پڑتا ۔ انگریزی زبان میں بھی کچھ اضافے ہوتے ۔

جمی کارٹر کے یہاں سے جانے کے فوراً بعد ہی برطانیہ کے وزیر اعظم کیلہن یہاں آگئے ۔ کیلہن بھی اپنے دورے کے درمیان کافی مسکرائے ۔ انہوں نے بھی بچوں کو گود میں اٹھایا اور ثابت کر دیا کہ بچوں کو گود میں اٹھانے کا قاعدہ صرف وہائٹ ہاؤس ہی میں نہیں ڈاوننگ اسٹریٹ نمبر دس میں بھی ہے ۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ یہاں مقابلہ بہت ہوتا ہے ۔ ہر چیز میں مقابلہ چاہے وہ ادب ہو یا فیشن ، تجارت ہو یا سیاست ، کھیل ہو یا تقریب اب یہ دونوں حضرات یہاں آکر واپس ہوئے تو یہ مقابلہ ہو رہا ہے کہ کس کا دورہ زیادہ کامیاب رہا ۔ گویا یہ بھی کوئی مشاعرہ تھا ، جس میں یہ طے کیا جائے کہ کون شاعر زیادہ کامیاب رہا ۔ اور کسے کم داد ملی (غنیمت ہے کہ سربراہان ملک کے ، دوروں کے موقع پر ونس مور کے نعرے کا طریقہ رائج نہیں ہے) اب تو ہندوستان میں مرن برت کے بھی مقابلے

ہونے لگے ہیں ۔ ایک سوشیل ورکر کہتا ہے کہ میں نے ۱۹۷۰ء میں ۲۲ دن کا مرن برت رکھا تھا تو دوسرا کہتا ہے کہ ۲۲ دن مرن برت بھی کوئی برت ہوا، میں تو ۱۹۷۱ء میں ۳۴ دن تک مرن برت رکھتا رہا اور میرا کچھ نہیں بگڑا (مرن برت یہاں ہمیشہ ایسے برت کو کہا جاتا ہے کہ جس میں برت رکھنے والے کا کچھ نہ بگڑے)

بمبئی میں تو ہم نے قوالی کے مقابلے بھی دیکھے، قوالی ہماری زیادہ سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہمیں وہ شور بہت پسند آتا ہے ۔ جو قوالی میں ہوا کرتا ہے ۔ شروع شروع میں تو ہم یہ سمجھتے رہے کہ یہ شور ہی قوالی ہے لیکن پھر ہمیں سمجھایا گیا کہ نہیں بیچ بیچ میں گانے کی طرح جو چیز ہوتی ہے وہ قوالی ہے، ہمیں اپنی کم فہمی پر کافی ندامت ہوئی قوالی کے مقابلوں میں ہمیں دوسری چیز جو بہت پسند آئی وہ سامعین کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرنے کا طریقہ ہے ۔ یہ خراج عقیدت رقم کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ دور سے یعنی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اسٹیج پر روپے پیسے پھینکے جاسکتے ہیں ۔ لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جگہ سے اٹھے اور پورا راستہ طے کرکے نہایت ادب کے ساتھ روپے قوال کی خدمت میں پیش کرے ۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ وہ شخص قابل تعریف سمجھا جاتا ہے جو اپنی جگہ سے جھومتا ہوا اٹھے اور ناچتا ہوا اسٹیج کی طرف جائے، اسٹیج کے قریب پہنچ کر کم سے کم تین منٹ بھارت ناٹیم دکھلائے اور پھر نذر پیش کرے (حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ اس شخص کو اس کے ناچ کے سلسلے میں اسٹیج پر بیٹھنے والوں کی طرف سے نذرانہ پیش کیا جانا چاہیے ۔ لیکن کہتے ہیں کہ گنگا الٹی بہا کرتی ہے)

قوالی میں تیسری چیز جو ہمیں بہت پسند آئی وہ مردوں اور عورتوں کا مقابلہ ہے ۔ یہی ایک میدان نظر آیا جس میں مرد، عورتوں کا مقابلہ کرنے میں خوف محسوس نہیں کرتے ۔ ان کی آواز یہاں کافی اونچی ہوتی ہے اور باجے کے شور میں بھی سنائی دیتی ہے ۔

بمبئی میں پچھلے دو ہفتوں سے سردی بھی شروع ہو گئی ہے ۔ اور سڑکوں پر جوڑے اور زیادہ قریب ہو کر چلنے لگے ہیں ان کے بیچ میں پہلے اتنا فاصلہ رہتا تھا کہ ہوا گزر سکے ۔ اب اس کی اجازت نہیں ہے ۔ بمبئی کی سردیاں ہوتی ہی اتنی مختصر ہیں کہ ان کا ذرا سا بھی حصہ ضائع ہونے نہیں دیا جاسکتا ۔

بمبئی میں ہماری اچھی خاصی گزر رہی تھی ۔ بڑے بڑے سیاحوں سے ہم نے سنا تھا کہ نیویارک کے بعد اگر کوئی معقول شہر ہے تو وہ بمبئی ہے ۔ سیاحوں کی باتوں پر ہم نے کبھی یقین نہیں کیا ۔ جہاں تک مبالغے کا تعلق ہے شاعروں اور سیاحوں میں یہ فرق ہے کہ سیاح بازی مار لیتے ہیں ۔ لیکن ان کی اس بات پر ہم اس لئے ایمان لے آئے کہ اول تو ہم نے نیویارک دیکھا نہیں اور دوسرے اس لئے کہ اگر نیویارک بمبئی جیسا ہی ہے تو پھر کیوں اتنے پیسے خرچ کئے جائیں سیاحت ہمیشہ غریب ملکوں کی کرنی چاہیے ۔ ہندوستان میں اسی لئے سیاحوں کی بہتات ہے کابل میں بھی سنا ہے باہر کے لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں ۔ تھوڑے سے روپے میں زیادہ سے زیادہ عیش کی دولت ایسی ہی جگہوں پر ہوتی ہے خیر ہمیں ان مصلحتوں سے کیا کرنا ہے ۔

جی تو بہت چاہا کہ بمبئی میں کچھ دن اور گزارے جائیں لیکن ہمارے گھر یعنی پرشین گلف سے خبر آئی کہ اسمگلنگ کا کاروبار دوبارہ شروع ہونے والا ہے اور یہ کہ ہمیں فوراً واپس ہونا چاہیے ہم نے سوچا کہ ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے کم سے کم تاج محل تو دیکھ لیا جائے ۔

آگرہ شہر ہمارے جی کو نہیں لگا ۔ اس شہر کو بھی خوبصورت بنایا جاسکتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے ۔ یہاں کے لوگوں کو پیٹھے کی مٹھائی کھانے ہی سے فرصت نہیں ہے ۔ پیٹھا اصل میں ایک پھل ہوتا ہے ۔ جو تربوز کی طرح گول ہوتا ہے ۔ ہر تربوز میں ایک کیلو گرام چھلکا اور ایک سیر پانی ضرور ہوتا ہے ۔ پیٹھے میں صرف گودا ہوتا ہے اس گودے کی مٹھائی بنتی ہے اور اتنی کثیر مقدار میں بکتی ہے کہ کیا اناج بکے گا

ہماری رائے میں تو پیٹھے کو تو پھل کی بجائے ترکاری کہنا چاہیے ۔ لیکن جب انگریز ٹماٹر کو فروٹ کہتے ہیں تو اگر ہندوستان میں پیٹھے کو پھل کہا جاتا ہے تو اس میں ادب یا زبان کا کونسا ایسا نقصان ہے جو سہا نہیں جاسکتا ۔

آگرے کی آدھی آبادی کو ہم نے پیٹھے کی مٹھائی کی تجارت میں مشغول پایا ۔ آگرہ کی دال موٹ بھی کھانے میں آئی یہ بھی کافی مشہور غذا ہے اور جو شخص دال موٹ نہیں کھاتا لوگ اس کے بارے میں مشکوک ہو جاتے ہیں ۔ ہندوستان میں جتنے بھی شہر ہیں وہ سب کسی نہ کسی ڈش کی وجہ سے مشہور ہیں مثلاً دلی کے اطراف واکناف میں ایک شہر ہے جس کا نام متھرا ہے متھرا کے پیڑے مشہور ہیں ۔ متھرا جاکر اگر آپ وہاں کے پیڑے نہ خریدیں تو لوگ مارتے ہیں ۔ کانپور کے جوتے مشہور ہیں (لیکن جوتے ڈش کی تعریف میں نہیں آتے) علی گڑھ کے تالے ، میرٹھ کی قینچیاں اور جونپور کے قاضی مشہور ہیں (لیکن یہ چیزیں بھی ڈش کی تعریف میں نہیں آتیں) ہندوستان میں جگہ جگہ کراچی کا حلوہ بھی ملتا ہے ، ہم سمجھتے تھے یہ کراچی سے بن کر آتا ہے ۔ لیکن یہاں آکر ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تو جاپان ، امریکہ ، جرمنی اور برطانیہ سب ہی جگہ کا سامان بنتا ہے ۔

تاج محل کی عمارت دیکھ کر ہماری انکھیں کھل گئیں ۔ ہمیں شبہ ہے کہ یہ عمارت روزانہ دودھ سے دھوئی جاتی ہے اس عمارت کو تو زمین اور آسمان کے بیچ کہیں ہونا چاہیے تھا ۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ عمارت آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے ۔ لیکن تاریخ میں سبھی باتیں سچ تھوڑے ہی لکھی جاتی ہیں ۔ ہمیں یہ سن کر تعجب ہوا کہ تاج محل میں خودکشی کی وارداتیں کم ہوتی ہیں ۔ اتنے خوبصورت مقام پر تو آدمی بلا کسی وجہ کے بھی مرجائے ۔ تاج محل ، آگرہ کی بجائے ، جاپان وغیرہ میں ہوتا تو کم سے کم دس ایسی وارداتیں تو روزانہ ہوا کرتیں ۔ دلی میں قطب مینار کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ یہاں اس قسم کی عمارتوں پر نگرانی بہت ہوتی ہے ۔ قطب مینار پر تو کسی آدمی کو تنہا چڑھنے بھی نہیں دیا جاتا ۔ ایک چشم دید گواہ ساتھ بھیجا جاتا ہے ۔ سنا ہے جب دو آدمی ایک ساتھ اوپر جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں کہ دوسرا کہیں مجھ سے پہلے نہ کود پڑے ۔

آگرے سے رخصت ہوتے وقت ہمارے آنسو نکل پڑے ۔ (غنیمت دو ہی تھے) ہمیں اگر کبھی دوبارہ کہیں جانے کا موقع ملا تو ہم تاج محل ہی دیکھنے آئیں گے ۔

ہمیں واپس ہونے کی جلدی تھی ورنہ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم حیدرآباد اور لکھنو میں زیادہ ٹھہرتے کیونکہ ایک دو ہفتے تو "پہلے آپ" "پہلے آپ" میں خرچ ہو جاتے ہیں ۔ یہ بات ، ہم ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ۔ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کی بہت تعریف سنی تھی ۔ کہتے ہیں اکیلے ایک شخص نے نوادارت کا اتنا ذخیرہ جمع کر لیا تھا جو بڑی بڑی حکومتوں ہی سے ممکن ہو سکتا ہے ۔ ہندوستان میں پہلے ہاتھیوں ، گھوڑوں ، بیلوں اور بھینسوں کو بھی چاندی سونے کے زیورات پہنائے جاتے تھے ۔ یہ زیور بھی اس میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں ۔ لیکن جب ہم یہ میوزیم دیکھ ہی نہیں سکے ۔ تو سنی سنائی باتیں کیوں لکھیں ۔ یہ دو جملے بھی جو ہم نے لکھ دئے ہیں اپنی حسرت کے اظہار کے لئے لکھے ہیں ۔

ہندوستان کے شہروں میں سے بنارس جانے کی بھی خواہش تھی ۔ ہندوستان کا یہ تنہا شہر جو یہاں تین ناموں سے مخاطب کیا جاتا ہے ۔ ہمارے ایک دوست ، جنہیں اردو کے شاعروں اور شاعری سے بڑی دلچسپی ہے اور جنہوں نے اپنا کافی وقت ہمیں اردو شاعری سمجھانے پر ضائع کیا ۔ ہمیں بتا رہے تھے کہ اردو کے بڑے شاعر یا ادیب کو ہندوستان کے کسی نہ کسی شہر سے عشق تھا اردو کے دو بڑے شاعر میر تقی میر اور ذوق کو دلی بہت پسند تھی ۔ غالب کو کلکتہ بہت بھاتا تھا اور وہ اس کی یاد میں شعر کہا کرتے تھے ۔ شبلی صاحب کو بمبئی سے عشق تھا ۔ معلوم نہیں ، ہمارے ان ادب نواز دوست کو یہ ساری باتیں کہاں سے معلوم ہو گئی تھیں ۔ وہ تو اپنے بیان کے ثبوت میں

ں ـب شاعروں کے اشعار بھی سنایا کرتے تھے جو کبھی ہمارے پلے نہیں پڑے ۔ انہیں ی زبانی معلوم ہوا کہ اگر ہندوستان میں صبح یکھنی ہے تو، صبح بنارس، دیکھنی چاہیے ۔ لیکن ہمارے بہت پوچھنے پر بھی وہ یہ نہ بتاسکے کہ، صبح بنارس کس شاعر کی ایجاد تھی ۔ انہوں ے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہاں کے شاعروں نے راتیں، شامیں اور صبحیں اسی طرح مختلف شہروں کے نام لکھ دی ہیں ۔ شام کے بارے میں ید انہوں نے بتایا تھا کہ یہ صرف اودھ میں ہوا کرتی ہے (وہ اودھ کے کھانوں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے) رات کے لئے انہوں نے الوے، کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ رات میں جاگنا ہو یا سونا، دونوں کاموں کے لئے شب مالوہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے ۔ یہ بات بھی ہم ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ۔

ہم اصل میں یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ بنارس تین ناموں سے پہچانا جاتا ہے ۔ آم، پان اور ساڑیوں کے ۔ بنارس مشہور ہے ۔ یہ تینوں چیزیں سارے ہندوستان میں کھائی اور پہنی جاتی ہیں ۔ بنارسی ساڑی کے بغیر تو عورت کا دلہن ہی بننا ممکن نہیں ہے ۔ ہر شخص موں کے موسم میں بنارسی لنگڑا ضرور کھاتا ہے اور جسے بھی سڑک پر تھوکنا ہوتا ہے ۔ وہ بنارسی پان کھا کر ہی تھوکتا ہے ۔ مندروں کا ذکر اے گا تو یہی شہر کاشی کہلائے گا ۔ تیرتھ یاترا کو جانے والے لوگ بنارس کبھی نہیں جاتے کاشی ہی جایا کرتے ہیں اور ریل جاتی ہے تو صرف وارانسی جاتی ہے ۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں نہ بنارس ہے نہ کاشی صرف وارانسی ہے بلکہ ٹرین کا لقب ہی وارانسی اکسپریس ہے ۔ وس ہے کہ ہم ایسے دلچسپ شہر کی زیارت نہیں کر سکے ۔

ہم ایک مرتبہ ہندوستان اور آئیں گے اور اب کی بار آئے تو واپس نہیں جائیں گے

(فبروری ۱۹۷۹ء)

خامہ بگوش

نیا افسانہ، علامت کی تجرید

نام ** مشفق خواجہ
قلمی نام ** خامہ بگوش
قیام ** کراچی

خامہ بگوش سے ہمارا زبانی معاہدہ تھا کہ ان کا اصل نام اور زندگی کے حالات کبھی شائع نہیں کریں گے ایک بار غلطی سے ہم خامہ بگوش کی بجائے ان کا مضمون مشفق خواجہ کے نام سے شائع کر چکے ہیں ۔ معاہدہ کی جب خلاف ورزی ہو ہی چکی تو اصل نام کی اشاعت میں اب کوئی قباحت نہیں رہی

مدیر

ہمارے ایک کرم فرما ایم اے (اردو) کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے ، انہوں نے ہم سے فرمائش کی کہ اصناف ادب کے بارے میں ایک ایسا نوٹ لکھ دیا جائے جو امتحانی نقطہ نظر سے مفید ہو ۔ہمیں ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پروفیسر مجتبیٰ حسین کی طرح نصابی تنقید لکھنے کا تجربہ نہیں ہے تاہم ہم نے اردو ادب کی تمام تر مروجہ اصناف کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ اگر ہماری اس کوشش کو پسند کیا گیا تو ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی کوشش بھی کریں گے ۔

غزل ۔ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں ہر وہ شخص طبع آزمائی کر سکتا ہے جو افتاد طبع کے اعتبار سے افتادۂ طبع ہو یعنی اس کے پاس وقت لا محدود ، ذخیرہ الفاظ محدود اور ذخیرہ خیالات محدود تر ہو ہر کام انجام دینے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ کام انجام دینے والا ضروری صلاحیت رکھتا ہو ۔ لیکن غزل کا کام انجام دینے یا تمام کرنے کے لئے اس قسم کی کسی شرط کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے ۔ ہر وہ شخص بآسانی غزل کہہ سکتا ہے جو غزل کہنے کی خواہش رکھتا ہو ۔ پرانے شاعروں نے اس صنف میں اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ نئے شاعر بغیر کسی دقت کے بہت کم وقت میں صاحب دیوان بن سکتے ہیں پرانی غزل کو سامنے رکھ کر نئی غزل ، نئی غزل کو سامنے رکھ کر جدید غزل اور جدید غزل کو سامنے رکھ کر جدید تر غزل کہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا الیکٹرونک کیمرے سے تصویر کھینچنا ۔ تصویر کھینچنے والے کو صرف بٹن دبانا پڑتا ہے ، غزل کہنے والے کو اتنی محنت بھی نہیں کرنی پڑتی غزل کو شاعروں کی بہت سی قسمیں ہیں ۔ ان میں سے دو اہم ہیں ۔ ایک قسم مشاعروں میں پیدا ہوتی ہے اور وہیں کام آجاتی ہے دوسری رسالوں کے ذریعہ منظر عام پر آتی ہے ، نقادوں کے ذریعہ پروان چڑھتی ہے اور وقت کے ہاتھوں گلدستۂ طاق نسیاں بن جاتی ہے ۔

جس طرح غزل گوئی آسان ہے اسی طرح غزل کی تنقید بھی کار آسان ہے اگر یقین نہ آئے تو وہ مضامین دیکھ لیجئے جو ایک مدرس نقاد نے اس ستم رسیدہ صنف کے بارے میں پے درپے لکھے ہیں

اس سلسلہ کی آخری کڑی وہ مضمون ہے جو پچھلے دنوں اکیڈمی آف ...یٹرز کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں نقاد کو اکیڈمی کی طرف سے تا برخواست اجلاس جسمانی تحفظ فراہم کیا گیا تھا

افسانہ — غزل کی طرح افسانہ بھی ان لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے جنہیں لکھنے کے لئے سوائے کاغذ اور قلم کے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی پرانے زمانے میں افسانے کے لئے بنیادی شرط یہ تھی کہ اس میں کوئی کہانی بیان کی گئی ہو اب افسانہ نگار اور تو سب کچھ بیان کر دیتا ہے، کہانی سے اجتناب کرتا ہے اس صورت حال کے نتیجے میں، تجریدی اور علامتی افسانہ وجود میں آیا جسے علامتی افسانہ بھی کہا جاتا ہے۔ آج کل جو افسانہ لکھا جا رہا ہے وہ بیک وقت علامت کی تجرید اور تجریدیت کی علامت ہے اسی لئے افسانہ لکھنے والا خود ہی اس سے وسیع پیمانے پر محفوظ ہوتا رہتا ہے۔ آج کل کے بعض افسانے نثری نظم کا روپ دھار لیتے ہیں جن کی ہر سطر دوسری سطر سے بے تعلق اور ہر لفظ اپنے دائیں بائیں کے الفاظ سے کشیدہ خاطر نظر آتا ہے

ناول — ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جسے عموماً عورتوں کے نام سے مرد لکھتے ہیں اور عورتوں سے زیادہ مرد ہی پڑھتے ہیں مرد اگر اپنے نام سے ناول لکھیں تو وہ ناول نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے جیسے انتظار حسین نے بستی کو ناول بنانا چاہا اور اب وہ طویل مختصر افسانہ بن گیا جس میں طوالت زیادہ ہے اور باقی سب کچھ ... کم

ناول لکھنے کے لئے مطالعہ یا مشاہدہ سے کہیں زیادہ صبر و ہمت کی ضرورت ہوتی ہے لکھنے والا مسلسل لکھتا رہتا ہے اور کئی کئی رم کاغذ سیاہ کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کے ناول عموماً قسط وار لکھے جاتے ہیں اور پھر انہیں ٹی وی کے ڈرامائی سلسلوں میں پیش کیا جاتا ہے

ہمارے ہاں اچھے ناول نگار بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں وہ ... بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانے سے کمائی ہوئی شہرت ناول پر لگا دیتے ہیں۔ جس میں ناول اور شہرت دونوں کے ... کا امکان رہتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ناولوں پر افسانوی مجموعوں کا گمان ہوتا ہے۔ ناول کے ایک باب کا دوسرے باب سے وہی تعلق ہوتا ہے جو کسی مصنف کے ایک افسانے کا دوسرے افسانے سے۔

کہا جاتا ہے کہ اب تک اردو میں اول درجے کا کوئی ناول نہیں لکھا گیا۔ انور سجاد اور انیس ناگی نے اس دعویٰ کو غلط ثابت کر دکھایا ہے اور وہ بھی اس خوبصورتی سے کہ اب اردو میں اول درجے کے تو کیا چوتھے اور پانچویں درجے کے ناول بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

انشائیہ — انشائیہ وہ صنف ادب ہے جس کی ایجاد بارود کی ایجاد سے بھی زیادہ "دھماکہ خیز" ثابت ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے یہی بحث ختم ہونے میں نہیں آتی کہ انشائیہ کسے کہتے ہیں اور اس کا بانی کون ہے۔ ہم پر بھی یہ نکتہ راز ابھی تک فاش نہیں ہو سکا کہ انشائیہ کسے کہتے ہیں اور اس فساد کا اصل بانی کون ہے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس صنف کو سرگودھا کی سرزمین اسی طرح راس آئی ہے جس طرح آزاد قبائل کے بعض علاقوں کو افیون کی کاشت راس آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ افیون اسمگل ہو کر ادھر ادھر بھی جاتی ہے لیکن انشائیہ کی ساری فصل سرگودھا والے اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرگودھا سے باہر انشائیہ لکھا ہی نہیں جا سکتا کیوں کہ اس کے لئے خاص قسم کی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ اس خیال کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ انور سدید کو جب انشائیہ لکھنا ہوتا ہے تو چھٹی لے کر کوٹ ادو سے سرگودھا چلے آتے ہیں اور اگر اس دوران میں کوئی کام کی چیز لکھنی ہوتی ہے تو چھٹی منسوخ کرا کے واپس کوٹ ادو چلے جاتے ہیں۔ نظیر صدیقی اپنے مزاحیہ مضامین کو اور مشکور حسین یاد اپنے تفریحی مضامین کو انشائیہ قرار دیتے ہیں اور انشائیہ نگار ہونے کا

دعویٰ کرتے ہیں۔ ان دونوں کے یہ دعوے بھی مزاح اور تفریح کی عمدہ مثال ہیں۔

نثری نظم - یہ صنف ان لوگوں کے استعمال کے لئے ہے جو صرف نظم یا صرف نثر لکھنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ جو لوگ نثر اور نظم دونوں کے لکھنے پر قادر نہ ہوں، وہ نثری نظم آسانی بلکہ روانی اور فراوانی سے لکھ لیتے ہیں۔ پہلے زمانے میں بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا تھا۔ اب عام آدمی بھی بگڑ جائے تو نثری نظم کے نقار خانے میں طوطی کی طرح چہچہانے لگتا ہے ایک نقاد کا ارشاد ہے کہ نثری نظم کے ذریعہ ابھی تک کوئی بڑا تخلیقی کام منظر عام پر نہیں آیا۔ ہماری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ ابھی تک کوئی چھوٹا کام بھی سامنے نہیں آیا فی الحال یہ صنف ادب نیک تمناؤں اور مستحق دعاؤں کے حصار میں ہے۔

سفرنامہ - پرانے زمانے میں لوگ سفر کرتے تھے تو سفرنامے بھی لکھ دیتے تھے۔ اب سفرنامہ لکھنے کے لئے سفر کرنے کی شرط اڑادی گئی ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ سفر کرنے کے بعد ہی سفرنامے لکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے سفرنامے طوالت میں اس کے سفر سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ پرانے لوگ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھتے تھے۔ آج کل سفرنامہ میں عموماً وہ واقعات درج کئے جاتے ہیں جو لکھنے والے کے تصورات میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً عشق و عاشقی کے معاملات سفرناموں میں فلموں سے زیادہ ملتے ہیں۔ ان واقعات کا ہیرو خود سفرنامہ نگار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل سفرنامے نے افسانے کی جگہ لے لی ہے۔ یہ خیال درست نہیں کیوں کہ افسانے میں تھوڑا بہت سچ بھی مل جاتا ہے۔

بعض سفرنامہ نگار اپنے سفرناموں کو تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں کا نعم البدل بنادیتے ہیں لیکن اکثریت ایسے لکھنے والوں کی ہے جن کے سفرناموں سے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے کب اور کہاں کا سفر کیا تھا

خاکہ نگاری - خاکہ نگاری اس صنف ادب کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بقول شخصے زندوں سے ڈرنے اور مردوں پر شیر ہونے کی مشق کی جاتی ہے۔ ایک اچھے خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ذات کو اس طرح نمایاں کرے کہ وہ شخصیت صرف عنوان کی حد تک نظر آئے جس کا خاکہ لکھنا مقصود ہو۔ اسی لئے بعض لوگ اپنے فضائل بیان کرنے کے لئے اس صنف کا سہارا لیتے ہیں۔

تنقید - تنقید ایک ایسی صنف ادب ہے جس کا مقصد اور نتیجہ کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ نقاد اپنی پسند کے ادبی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہیں اور ناپسندیدہ گھوڑوں کے آگے رکاوٹیں کھڑی کردیتے ہیں۔ تخلیقی تحریریں پڑھ کر لوگ محظوظ ہوتے ہیں اور تنقیدی تحریریں پڑھ کر حیران بلکہ پریشان ہوتے ہیں۔ لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے نقادوں نے کئی طریقے ایجاد کر رکھے ہیں، جن میں سب سے بڑا طریقہ یہ ہے کہ وہ دس شعروں کی غزل پر دس صفحات کا مقالہ ہی نہیں لکھ دیتے بلکہ کسی شاعر کے بارے میں اس کے حجم سے زیادہ حجم کی کتاب بھی تصنیف فرمادیتے ہیں۔

نقادوں کا مقبول ترین طبقہ وہ ہے جو کتابوں کی تقریبات رونمائی میں مصنفوں اور ان کی تصانیف میں ایسی خوبیاں تلاش کرلیتا ہے جن کے موجود ہونے کا مستقبل بعید میں بھی امکان نہیں ہوتا۔

تحقیق - تحقیق ادبی مقبروں کی مجاوری اور شکستہ قبروں پر کتبے لگانے کا کام ہے۔ محقق اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہوکر ماضی کے مزاروں اور کھنڈروں میں اس حد تک منہمک رہتا ہے کہ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کسی مصنف کی تاریخ وفات معلوم کرتے کرتے وہ خود اپنے یوم وفات کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اصل مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا۔ کرم خوردہ آب رسیدہ اور سرد گرم زمانہ چشیدہ کتابوں سے اتنی دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ کسی نئی کتاب پر نظر ڈالنے کو اپنی شان تحقیق کے منافی سمجھتا ہے۔ یہی سلوک اس کا

اپنے عہد کے مصنفوں سے ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ماضی کا رے درجے کا شاعر زمانہ حال کے درجہ اول کے شاعر سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی محقق نے اپنے کسی ہمعصر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ جب تک کسی ادیب کو مرے ہوئے کم از کم سو سال نہ ہو جائیں محقق اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ادیب بیچارے قابل رحم ہیں کہ نقادوں کی وجہ سے ان کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے اور مرنے کے بعد محققوں کے ہاتھ ان کا مردہ خراب ہوتا ہے۔

زمانہ حال کے ایک محقق کا دعویٰ ہے کہ موجودہ عہد کے صرف ایک فیصد ادیب اپنی تخلیقات کی وجہ سے زندہ رہیں گے، باقی ساوے فیصد ادیبوں کو اس وقت تک، کوئی نہیں جانے گا جب تک ان پر تحقیق نہیں کی جائے گی۔ ہمیں اس دعویٰ سے اختلاف ہے یوں کہ ایک فیصد ادیبوں کا بھی تخلیقات کی وجہ سے زندہ رہ جانا محال معلوم ہوتا ہے۔

(نومبر ۱۹۸۲ء)

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفر نامہ	۵۰ روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰ روپے
آئی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	"	۱۰۰ روپے
بہ فرض محال	خواہ مخواہ	"	۷۵ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	"	۵۰ روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	"	۶۵ روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسین	سفر نامہ	۴۵ روپے
درگت	ٹی ین راز	کلام	۷۰ روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	۵۰ روپے
الف تماشہ	نریندر لوتھر		۳۰ روپے

احمد جمال پاشا

تکیہ شاہ



نام ** آغا محمد نزہت پاشا ولد آغا شجاعت پاشا

پیدائش ** ۱۹۳۲ء بمقام الہ آباد

تعلیم ** ایم۔ اے (علی گڑھ)

ملازمت ** صحافی و استاد اردو

تصانیف ** اندیشہ، ستم ایجاد، غالب سے معذرت کے ساتھ، اردو کے چار مزاحیہ شاعر اور طنز و مزاح پر تنقیدی کتابیں

انتقال ** ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء

ہمارے دوست مسٹر بک بک شاہ بات چیت کے دوران اتنے زیادہ تکیہ کلام استعمال کرتے ہیں۔ جتنے کہ دوسرے تمام لوگ شاید مل کر بھی نہ استعمال کر پاتے ہوں۔ تکیہ کلام کی اس بھرمار سے عاجز آکر احباب نے ان کا نام ہی تکیہ شاہ رکھ دیا ہے۔

تکیہ شاہ کا ایک تکیہ کلام ہے۔ "اچھا تو پھر" جیسے ہی آپ کی بات ختم ہوگی یہ کھٹ سے سوال کر دیں گے اچھا تو پھر؟"

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست نے ایک لطیفہ سنایا کسی مشاعرے کے آخری میں ایک صاحب نے تعریف کرتے ہوئے کہا "آج تو آپ نے لاجواب غزل سنائی، تعریف کے الفاظ نہیں ملتے!" شاعر صاحب نے پریشان ہو کر کہا "آپ کو صرف الفاظ نہیں ملتے اور مجھے اپنے جوتے نہیں مل رہے ہیں اور سکریٹری صاحب بھی نہیں مل رہے ہیں۔ جن سے ابھی معاوضہ لے کر مجھے گھر جانا ہے۔

لطیفہ سن کر سب ہنس دیے مگر تکیہ شاہ نے پوچھا "اچھا تو پھر؟"

ان کا ایک اور تکیہ کلام ہے "آخر کیوں؟"

ادھر کسی نے کہا "اچھا بھئی چلیں؟"

"اچھا آخر کیوں؟"

"بھوک لگی ہے!"

"ضرور لگی ہوگی۔ آخر کیوں؟"

"کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"جائیے ضرور کھائیے آخر کیوں؟"

"اچھا بھئی چلے!"

"اچھا خدا حافظ آخر کیوں؟"

ایک زمانے میں یہ بات بات پہ کہتے تھے

"کھلاؤ مٹھائی اسی بات پہ"

ایک صاحب اداس چلے آرہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ "ان کی نوکری چھوٹ گئی" یہ سن کر لپک کر بولے

[illegible] چھوٹ گئی۔ کھاؤ کھائی اسی بات پر [illegible]

[illegible] آگیا [illegible] مٹھائی [illegible] کی کھائے

[illegible] ہوتے ہیں تو ان کا تکیہ کلام [illegible] صاحب [illegible] بلکہ [illegible] ہو جاتا ہے

[illegible] صاحب [illegible] رہا تھا۔ صاحب [illegible] دیکھا کہ صاحب وہ بھی چلے آرہے ہیں [illegible] کیا کرتا [illegible]

[illegible] وہ کیا مجھے صاحب [illegible] صاحب صاحب میں ان کی بات [illegible]

[illegible] چڑھا ہوا تھا ایک پڑوسی نے ان کی [illegible] پڑوسی نے ایک دن اپنے

[illegible]

[illegible] یونیورسٹی میں تو اس نے [illegible] انہوں نے

[illegible] اور [illegible] اپنے لیے فرسٹ کلاس [illegible] باپ نے کہہ [illegible]

[illegible] ان سے [illegible] انہوں نے

[illegible]

[illegible] ان کا تکیہ کلام [illegible] کھیلنے [illegible] چلے جا رہے تھے [illegible] راستے میں [illegible]

[illegible] دیکھا

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو گیا آپ کے منہ میں [illegible] ہو گیا آپ [illegible] میں

[illegible] آپ کے منہ میں [illegible] کھیلنے جاؤں گا آپ کے منہ میں۔ اچھا اب میں چلا۔ آپ کے منہ میں [illegible]

ابھی [illegible] اسی بات پر [illegible] دن بعد [illegible] جانے والا

[illegible] اسی بات پر [illegible] مٹھائی [illegible] میں چلے

[illegible] انتقال کی [illegible] واپس آئے تھے [illegible] ان کے [illegible] کی خبر ملی اور [illegible] ان سے

[illegible]

ان سے والد کے انتقال کی خبر سن کر [illegible] ان سے [illegible] اور کہنے لگے [illegible]

تمہارے والد کا انتقال ہو گیا اسی بات پر [illegible] مٹھائی

ایک زمانے میں ان کا تکیہ کلام تھا کھاؤ قسم۔ ابھی بات پوری نہیں ہوئی [illegible] کی طرف سے [illegible]

[illegible] ایک [illegible] دعوت [illegible] کے بعد انہیں [illegible] کی تعریف [illegible] انہوں نے [illegible]

[illegible] وہ صاحب [illegible] ابھی [illegible] نہیں [illegible]

ایک زمانے میں ان کا تکیہ کلام تھا [illegible] دیتے تھے [illegible] جب بھی کوئی [illegible] کہتے تو

[illegible] آتا کہ [illegible] سننے والے [illegible] مطلب نکالنا مشکل ہو جاتا اگر کسی نے

[illegible] تو [illegible] نہیں [illegible] اور [illegible]

ایک تکیہ کلام تو شاید زنانے میں ان کے منہ پر چڑھا اور مردانے میں اترا تھا ۔ جہاں کسی صاحب نے کوئی بات ختم کی اور یہ بولے "واہ تو کہیئے بہن ان کے دل میں نیکی تھی " ۔ لفظ "بہن " سن کر مخاطب اس طرح چونکا گویا ۔ بچھو نے ڈنک مار دیا ہو جس کے بعد ان کا تکیہ کلام اور زہریلا ہو گیا ۔ زہر نشتریت میں نہیں بلکہ اس کی طوالت میں تھا ۔ ان کا یہ نیا تکیہ کلام شاید دنیا کا طویل ترین تکیہ کلام بلکہ پورا تکیہ تھا جو کلام سے بھرا ہوا تھا ۔ جہاں کسی نے کچھ کہا اور یہ بولے ۔ " نا بھئی نا ۔ بھئی نا ۔ نہ نہ بات کہی ۔ نہیں مجھے آپ سمجھے آپ ارے واہ ۔ یعنی بھئی ۔ یعنی کہ ارے بھئی ، برا کیوں ملنتے ہیں ۔ تو میں نے کہا میرے منہ میں خاک آپ کے منہ میں خاک ! " اس تکیہ کلام کی بدولت پہلے لوگ عاجز ہوئے اور پھر یہ لوگوں سے عاجز ہو گئے پھر اس کی جگہ گھٹ کر ایک بالکل تازہ ترین تکیہ کلام نے لے لی ۔ د ایسا تھا " وہ کیا کہتے ہیں ۔ جو ہے سو ہے ۔ سو ہے تو ہے ۔ جو ہے تو ہے "

ایک دفعہ کسی لطیفے کے جواب میں یہ شروع ہی ہوئے تھے کہ " وہ ایسا تھا وہ . . وہ کیا کہتے ہیں ابھی یہ اپنے تکیہ کلام کی ہے سو ہے ۔ سو ہے تو ہے کی منزل تک ہی پہنچے تھے کہ کسی دل جلے نے اتار کر جوتا " جو ہے سو ہے جو ہے سو ہے " کہکر جو بے بھاؤ کی شروع کیں تو یہ بھاگتے جاتے تھے اور اپنا تکیہ کلام مکمل کرتے جاتے تھے " تو ہے جو ہے تو ہے . . . تو ہے ، جو ہے تو ہے ۔ "

کچھ دن بعد ان کا تکیہ کلام غالباً پاپوشی کے اثر سے زائل ہو کر " خدا کا شکر ہے ۔ چلئے چھٹی ہوئی ا . . ہو گیا چنانچہ جب ان کی نئی موٹر سائیکل چوری ہوئی تو یہ بار بار آنسو پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ۔ خدا کا شکر ہے چلئے چھٹی ہوئی "

جب یہ بمبئی سے لوٹ کر آئے تو اپنے ساتھ ایک تکیہ کلام بھی لائے جو تھا " کاہکو ۔ ا "

ادھر کسی نے پوچھا ۔

چائے پیجیئے گا آپ یا کافی پسند کریں گے ۔ " اور یہ خالص بمبئیا اسٹائل سے لہراتے ہوئے جواب دیتے ۔ " کاہے کو چائے پیئے گا کافی کاہکو پیئے گا ۔ ا "

اگر دوبارہ پوچھا جاتا تو یہ کہتے ۔

" کہہ تو دیا بابا کاہے کو کافی پیئے گا ۔ " نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کافی کی خواہش کے باوجود منہ دیکھتے رہ جاتے اور سوائے ان کے سب کافی پی لیتے ۔

آج کل تکیہ شاہ کا تازہ ترین تکیہ کلام ہے

بھئی کمال ہے ۔ " بھئی کمال ہے کہ آپ کو ٹکٹ نہیں ملا ۔ " بھئی کمال ہے کہ آپ نہیں جاسکے ۔ " بھئی کمال ہے کہ آپ کا نقصان ہو گیا ۔ "

حضرت تکیہ شاہ کا کمال یہ ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب کون سا تکیہ کلام شروع کر دیں اور کون سا ختم کر دیں اور کب کسی کو اپنے کلام کا تکیہ بنا لیں یا خود تکیہ کا کلام ہو جائیں ۔

(فروری ۱۹۷۴ء)

* *
* * * * * * * * * * * * * * * * *

کرنل محمد خاں

انگلستان شہر اچھے کہ بن

دوسرے دن ولٹ شائر کی لائبریری دیکھنے گئے ۔ صحن چمن میں داخل ہوئے تو دو چاک گریبانوں اور بے باک سینوں والی نوجوان لڑکیاں ، گلے میں رنگ برنگے منکوں کے ہار ڈالے اور شانوں پر بال پریشان کئے نظر آئیں ۔ ہم سمجھے کسی سپیرے کی فیملی پھر رہی ہے ۔ قریب پہنچے تو انہوں نے ہمیں اجنبی پاکر استفسارانہ دیکھا ۔ ہم نے پوچھا ۔

" یہ لائبریری ہے ؟ "

بولیں وہ صاف لکھا ہوا ہے ، کاونٹی لائبریری ، ولٹ شائر آپ کو شک کیوں ہو رہا ہے ؟

کہا ۔ " سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر شک ہوا ۔ میں سمجھا یہ کوئی کیمپنگ سائٹ ہے یا یہاں کوئی (Gypsy) خانہ بدوش قبیلہ آباد ہے ۔

دونوں ہنس کر بولیں ۔ یقین کریں ، نہ یہ کیمپنگ ہے اور نہ ہم جپسی ہیں ۔ ہم دونوں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں ۔ "

اس حلیہ کی لائبریرین دیکھ کر حیرت ہوئی ۔ کہا

" اگر آپ سچ مچ لائبریرین ہیں تو کیا مجھے چیف لائبریرین مسٹر آرنلڈ کا کمرہ دکھا سکیں گی ؟ "

" یقیناً ۔ وہ دیکھیں ۔ دائیں ہاتھ کو آخری دروازہ ۔ "

ہم دائیں ہاتھ کو چل پڑے اور آخری دروازے پر جاکر دستک دی ۔ ہم دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر محترمات اسسٹنٹ لائبریرین کا حلیہ یہ ہے تو دروازہ کھلنے پر محترم چیف لائبریرین صاحب سر پر لال رومال باندھے ، کانوں میں بالے ڈالے ، میز پر سانپ نکالے ، بین بجاتے نظر آئیں گے ۔ لیکن دروازہ کھلا تو ہمارے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے لائبریرین سپیرا نہ تھا بلکہ ایک عام فہم انگریز جیسے کبھی ہوا کرتے تھے ۔ بال کٹے ہوئے ، بٹن لگے ہوئے اور منہ دھلا ہوا ، ہم سے کچھ لالتو تپاک سے ملا وہ اس لیے کہ کبھی میجر تھا اور پنڈی میں رہ چکا تھا ۔ چنانچہ جہاں ہماری ذاتی خیریت کے متعلق پوچھا ، وہاں چک لالہ ، ویسٹرج اور لال کڑتی کی غائبانہ مزاج پرسی بھی کی ۔

نام * * محمد خاں
تصانیف * * بہ جنگ آمد بہ سلامت روی ، تنہائیاں

آپ نے پچھلے چند سالوں سے سن رکھا تھا کہ ہم ایک نئی بستی بنام ۔ ازلیما بیڈ بھی بسا رہے ہیں اور یہ کہ وہ بڑی حسین و جمیل بستی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" ہم نے انہیں تسلی دی کہ بے شک اس نئی بستی کا حسن انتہائی قیامت خیز ہے جیسی ان کی شنید ہے ۔ صرف نام وہ نہیں جو انہوں نے سن رکھا ہے بلکہ اسلام آباد ہے ۔ پھر آپ نے ہمیں لائبریرین کی سیر کرائی اور اسٹاف سے تعارف کرایا۔

نام کالسن ۔ ایڈم افسر موٹا اور خوش طبع ۔ پاکستانی ہونے کا دعویدار کہ آج سے پچاس سال قبل کراچی میں پیدا ہوا تھا ، پلا بڑھا تھا ۔ ہم سے اردو میں علیک سلیک کی اور ہمیں دیکھ کر اس کی کراچی کے گلی کوچوں کی یادیں تازہ ہونے لگیں ۔ گویا پوچھتا ہو کہ بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں " او دیس سے آنے والے بتا ۔ ہرچند کہ ان پنگھٹوں کے موجودہ استعمال کا ہمیں علم تاہم ہم نے کسی قدر وثوق سے کہہ دیا کہ اب وہاں چوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کی منڈی ہے اور دل میں سوچا کہ منڈی نہیں تو راشن اڈا ہوگا اور دونوں صورتوں میں مسز کالسن کو ایک جیسی لگیں گی

پھر مسز بالم سے تعارف ہوا ۔ جوانی سے کچھ آگے نکل چکی تھیں مگر اب بھی لالہ رخ اور سمن بر تھیں پیشے کے لحاظ سے ا ۔ لنب کی ماہرہ لیکن تاثیر کے اعتبار سے تالیف قلوب کی ساحرہ تھیں ۔ ہم سے دو باتیں کیں اور دل کے قریب جا پہنچیں ۔ فلمی شاعر نے لیا کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے " لیکن شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ یہ لوگ اگر مان جائیں یا سرے سے روٹھیں ہی نہیں تو دلارے لگتے ہیں ۔ مسز بالم اس دوسرے گروہ میں سے تھیں اس قدر سویٹ اور متواضع کہ اگر بیٹھنے کے لئے کرسی نہ ہوتی تو کہہ دیتیں ۔ ایسے لوگ پیارے نہ لگیں تو کیا لگیں ۔

اگلے کمرے میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی دو سدر سپیریاں جنہیں اسسٹنٹ لائبریرین ہونے کا شرف حاصل تھا ۔ ۔ ۔ پر دلماں ہیں لیکن تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ تو بچی ہیں اور بڑی معتبر قسم کی ۔ یعنی اپنے کھلے سر کی ۔ ۔ ۔ اور زلفوں کی گھٹاؤں کے باوجود ارنلڈ نے ان سے تعارف کرایا تو اس احترام سے ساتھ اور واضح جسمانی ۔ ۔ ۔ سے اس طرح قطع کرتے ہوئے جیسے پردہ نشینوں سے تعارف کرا رہا ہو ۔ اور جیسے ہمارا اشتباہ محض واہمہ ہو ورنہ خواتین سے گویا بند گلے کے جمپر پہن رکھے ہوں ۔ بہرحال ارنلڈ کو مغالطہ کا یارا ہو تو ہو ، ہمیں نہ تھا ۔ چنانچہ مس نیما ہیمنڈ اور مس ۔ ۔ ۔ ہیگی کنگ ۔ ۔ ۔ دیکر ہمیں تربوز جتنے بڑے ۔ ۔ ۔ کے گولے نگلنے پڑے ۔ ۔ ۔ معلوم ہوا کہ برطانیہ نے قدیم وضعداروں کا ۔ ۔ ۔ محض قبول کرنے پر نہیں بلکہ ان کی نوشامد پر ہے ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم برطانوی مظلوموں پر اپنی ہمدردی ۔ ۔ ۔ وطن عزیز یاد آیا ۔ ۔ ۔ کا ہماری ہمدردیوں پر پہلا حق تھا کہ عریاں ۔ ۔ ۔ نوں اور کوتاہ آستینوں کی اس ارتکاز ۔ ۔ ۔ میں بھی ۔ ۔ ۔ بھی جسمانی جیومیٹری قمیصوں اور چولیوں پر اسی قسم کا اشتعال انگیز دباؤ ڈال رہی ہے جیسے برطانوی ملاوزوں پر پڑ رہا ہے ۔ ۔ ۔ جملہ معترضہ تھا کہنا یہ تھا کہ ارنلڈ نے اپنے ماتحتوں سے تعارف کرایا جنہیں مل کر ہمیں مختلف قسم کی ۔ ۔ ۔ کچھ فوری طور پر باقی بعد میں ۔ ہمیں وہاں چار پانچ روز رہنا تھا ۔ ارنلڈ نے ہمیں ایک ایک روز کے لئے کالسن ، مسز بالم ، نیما اور ہیگی کو الاٹ کر دیا پہلے دن کی میزبانی کا شرف اپنے لئے محفوظ رکھا ۔ چنانچہ دوپہر تک تو اپنی کاؤنٹی کی لائبریریوں کے اسرار اور رموز بیان کرتا رہا ۔ ۔ ۔ سن کر ہم کچھ زیادہ بور نہ ہوئے کہ اس موضوع پر ہم مزید بور نہیں کئے جا سکتے تھے ۔ کینٹ ہی سے تر بتر لوٹے تھے ، البتہ پچھلے پہر کا ۔ ۔ ۔ کاؤنٹی کے دیہات اور دیہاتی لائبریریوں کی سیر کو نکلے تو ہمیں خاص سرور آنے لگا ۔ برطانیہ کے سبزہ زاروں میں وہ سحر ہے جو اس شہروں میں نہیں اور ہو بھی کیسے ۔ بن خدا نے بنائے ہیں اور شہر انسان نے اور ظاہر ہے کہ بحیثیت خالق خدا سے ہمسری عبث ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے کوہ و دمن کے جال سے مسحور ہونا بجائے خود عبادت ہے کہ خالق کی شان میں سب سے بڑی تسبیح اس کی تخلیق کو ۔ ۔ ۔

۔۔ ۔۔۔ ت چنانچہ اس شام ہم نے جی بھر کر عبادت کی اور بے حساب دولت جو ڑ ۔۔۔ جمع کی

بام او بسو میرے من میں اور سٹون ہنج دیکھو دوسرے روز ہمیں مسز بالم سے سیر کیا گیا یعنی اس خاتون کے ۔۔ ذہن میں قدرت سے تمہد و تفکر کی سلسبیل رکھ دی تھی مسز بالم نے بھی قبل دوپہر تک ہمیں انتخاب کتب کے رموز پر ۔۔ ان رموز سے تو ہم پہلے ہی آشنا تھے ۔ یہ سبق ہمارے لئے آسان ہو نا چاہیے تھا ۔ لیکن اس حادثہ ۔۔ بالم کی تقریر کی لذت کا یہ ۔۔ سب سال سے پہلے ۔۔ فراموشی کی منزل تک پہنچ گئے اور جب اس وقت ہوئی جب مسز بالم نے درس ختم کر کے ہمیں دعوت ۔۔ ۔۔ سے فارغ ہوئے تو مسز بالم نے بھی ارتقا کی طرف ہمیں سیر مسافات کو لے جانا چاہا اور ہمارے لئے بھی مسز بالم کی صحبت ۔۔ ۔۔ سے ۔۔۔ اور ان کی صحبت سے گوارا تر کوئی چیز نہ تھی آج ہم دونوں صحبتیں میسر ہو رہی تھیں ۔ چنانچہ جب مسز بالم ۔۔ کار کے پہلو میں بٹھا کر ہم نے نکلیں تو یوں محسوس ہوا جیسے دونوں جہاں جیسے آج ہمارے اختیار میں ۔۔ کار سبزہ گل کے ہجوم کو ۔۔ ۔۔ ۔ گویا ہوں لگا جیسے فطرت نے ہمیں کار سے نکال کر اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور ہمارے ہاتھ میں شراب جودی کا ساغر ۔۔ ہے ہمیں پتہ نہ اس کے کہ ہم اٹھا کر ساغر لبوں تک لائے ، اچانک آواز آئی ۔

۔۔ جان ، دیکھو ہم سٹون ہنج (Stone Henge) پہنچ گئے ہیں

ہم چونک کر جہان کے خودی سے کار کی دنیا میں لوٹ آئے ۔ یہ آواز مسز بالم کی تھی جو آہستہ آہستہ کار روک رہی تھی سامنے کوئی ۔۔ موٹے موٹے بھدے کالے کالے پتھر نظر آئے جو سبزے کے مخملیں فرش پر اس بے ترتیبی اور بے ادبی سے بکھرے پڑے تھے ۔۔ ۔۔ کی لاشیں پڑی ہوں یہ غیر متحرک پتھر کہاں سے آئے تھے یہ اس زمین کا حصہ تو نہ لگتے تھے ۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ۔۔ ۔۔ اور ان خبیثوں کی کھری شکل کی ہو اور یہ بے ڈول ، دو پیکر کنکر کر کر بکھر گئے ہوں ۔ ہم نے دل میں کہا

یا یہی سٹون ہنج ہے جس کے دیکھنے کی مس پارس تائید کر رہی تھی اور جس کا ہر انگریزی گائیڈ بک میں قصیدہ لکھا ہے ؟ ہمیں ۔۔ کی بد مذاقی پر رحم اور رونا آیا ۔ کیا انہیں سامنے سے وہ شاداب سبزہ زار نظر نہیں آتے جو ان بے روح پتھروں ، ان بد وضع ۔۔ کے ارد گرد حد نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں ؟ کیا وہ جیسے تیسے جامد پتھر دیکھ سکتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ دہکتا ہوا آتش گل سے ۔۔ ہم نے مسز بالم سے کہا ۔

اگر یہی سٹون ہنج ہے تو براہ کرم اس کی صرف ایک خوبی بتائیں جس کے لئے آپ سمجھ رہی ہیں ؟

مسز بالم نے ذرا چونک کر ہمیں دیکھا اور لاپروائی سے کہا ۔

کیا یہ کافی نہیں کہ یہ سٹون ہنج ہے ۔

میری پیاری مسز بالم ۔ یہ بہت ناکافی ہے ہم نے فی البدیہہ جواب دیا ۔

اب مسز بالم نے اپنی شرابی آنکھوں کے علاوہ اپنے قاتل سینے کا بھرپور رخ بھی ہماری طرف موڑا اور اپنے لہجے کی شیرینی میں ۔۔ حیرت شامل کرتے ہوئے بولی ۔

تو پھر کیا چاہیے آپ کو ؟ "

" بس ، کچھ سبزہ بیگانہ ، کچھ گل ہائے تر ، لیکن پتھر نہیں چاہئیں کہ میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے ۔ "

میں آپ کی بات نہیں سمجھی ۔

ہمارے پاس اس کے سوا کچھ جواب نہ تھا کہ چچا غالب کا مشہور شعر الاپنا شروع کر دیتے اور الاپنے لگے ۔

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مسز بالم کہ انگریزی شاعری کی رسیا تھی، شعر کے ترجمے کا مطالبہ کرنے لگی۔ ہم نے بخوشی لیکن بمشکل اس کی انگریزی بنائی۔ لیکن جوں ہی چچا کا مطلب مسز بالم پر کھلا ہمیں چھوڑ کر چچا پر فدا ہونے لگی اور مزید اشعار کا مطالبہ کیا۔ ہمیں اس غزل کے چند شعر یاد تھے پڑھتے گئے۔ لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ اسی غزل میں چچا نے ایک شعر سٹون ہنج پر بھی کہا ہے جو بالکل ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے تو بھی یہ شعر لاشعور سے ابھر کر ہماری زبان سے نکلا، ہم دم بخود رہ گئے۔ شعر تھا۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

مسز بالم نے معنی سنے تو کار چلا کر سٹون ہنج سے بھاگ نکلی اور کہنے لگی
ہم سے شاید یہ سنگ ہائے راہ تو نہ ہٹ سکیں۔ لیکن ہم تو اس راہ سے ہٹ سکتے ہیں۔"

ہم نے مسز بالم کو سخن شناسی اور ہمنوائی پر مبارک باد دی اور جب دیکھا کہ چچا کے غائبانہ ہاتھ پر پوری طرح بیعت ہو گئی ہے تو اسے مرتبہ غالب کے کلام کا چغتائی ایڈیشن بھجنے کا وعدہ کیا۔

موٹی محبوبہ ایک طرح کا بونس ہے۔ اگلے اور آخری دن کے لئے ہمیں کراچی نژاد ٹام کالسن آفیسر انتظامیہ کے ساتھ نتھی کیا گیا۔ ٹام خلاف توقع نیتنا اور پتلی کی ضد تھا۔ نہ صرف جنس کے لحاظ سے بلکہ مزاج کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک جنس کا تعلق ہے اگر وہ ہلکی پھلکی لڑکیاں جنس لطیف کا دلربانہ نمونہ تھیں تو یہ ٹوٹ بٹوٹ بھینسا صنف کثیف کا بڑا دلخراش نمائندہ تھا۔ یعنی مرد اور موٹا ہونے کے علاوہ اور موٹا تھا۔ گردن یوں تو اصلی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا گلے میں ٹائر پہن رکھا ہے۔ اگر یہ شخص وزن کرنے کی مشین پر ایک پاؤں رکھتا تو یقیناً دوسرا پاؤں رکھنے سے پہلے مشین کا دم ہمیشہ کے لئے گھٹ جاتا۔ باتیں کرتے ہوئے بازو بلند کرتا تو معلوم ہوتا، دونوں ہاتھوں سے کیلے کے گچھے لہرا رہا ہے۔ شکل وصورت کے اس برتے پر آپ کی عاشق مزاجی کے تتے پانی کا یہ عالم تھا کہ ہمیں حسن انتظام کے رموز سمجھاتے سمجھاتے حسن خوباں کی گتھیاں سلجھانے پر اتر آیا۔ حالانکہ خوباں اور ٹام کے درمیان وہی رشتہ تھا جو گلاب کی کلی اور کیلے کی پھلی میں رہتا ہے۔ بے شک اس کی پیدائش اور پرورش میں کراچی کا ہاتھ تھا تاہم اس تن و توش کے ساتھ اس بات کا امکان نہ تھا کہ ٹام کو کسی ذاتی رومان میں حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ کچھ دیر تو اس کی عاشقانہ موشگافیاں سنتے رہے لیکن ایک جگہ روک کر کہا۔

مسٹر کالسن۔ آپ کا مزاج بڑا عاشقانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بتائیں کہ آپ کی بناوٹ آپ کو عملی عشق کی اجازت بھی دیتی ہے؟"

ٹھٹک کر بولا۔ "عملی عشق سے آپ کی کیا مراد ہے شادی؟"

"شادی تو عشق کا خاتمہ ہے۔ عملی عشق سے مراد وہ مرحلے ہیں جو شادی پر جا ختم ہوتے ہیں۔"

"مثلاً"

"مثلاً حسینوں کے پیچھے بھاگنا، ان کے آگے ہاتھ جوڑنا، ان کے ستم سہنا حتی کہ ایک دن کہہ دیں۔ منظور ہے!"

"ہاتھ تو میں جوڑ سکتا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے ستم بھی سہہ سکتا ہوں لیکن اٹھ کر پیچھے بھاگنا ذرا پرابلم ہے۔"

"گویا آپ صرف اسی صورت میں عشق کر سکتے ہیں کہ کوئی عشق کرانے کو حاضر خدمت ہو۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بڑا باوقار طریقہ ہے۔"

"تو بتائیں اس باوقار طریقہ سے آج تک آپ کے کان میں کبھی "منظور" کی آواز بھی آئی ہے؟"

"ایک دفعہ آئی تو تھی مگر میں نے ارادہ بدل لیا۔"

"کیوں؟"

"وہ مجھ سے بھی موٹی تھی۔"

جو خاتون ٹام کو بھی موٹی نظر آسکتی ہو اس کے حجم میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ بہرحال، ہم نے دل میں محترمہ کی مہم جوئی کی داد دی کہ ایک تو اس نے راہ عشق میں بھاگنا پرابلم نہ سمجھا اور دوسرے ٹام کو دیکھ لینے کے بعد اسے قبول کرنے کا حوصلہ بھی دکھایا۔

ٹام سے گفتگو جاری تھی۔ پوچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟

"اس کے بعد آج تک کچھ نہیں ہوا لیکن دنیا بہ امید قائم۔"

ہمیں ٹام سے ہمدردی پیدا ہونے لگی کہ اس متلاطم چربی کی تہ میں ایک محروم النسا انسان بھی تھا اور جس امید پر غریب کی دنیا قائم تھی اس کے بر آنے کے آثار ناپید تھے کہ اسے پتلی میسر نہ تھی اور موٹی موافق نہ تھی۔ اب خدا جانے قارئین کا اس ضمن میں کیا خیال ہے لیکن ہمارے یار آغا کی فلاسفی یہ ہے کہ بہت موٹے آدمی کے لئے بہت موٹی محبوبہ بھی ایک بونس ہے بلکہ ایک خدائی عطیہ ہے جسے ورن کئے بغیر قبول کرلینا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ رحمت خداوندی کا اشارہ نہ پہچان سکا اور نتیجہ یہ کہ اب اسے ایک مستقل ازدواجی فاقے کا سامنا تھا جس کی ناکام تلافی کبھی ذکر دلبراں سے کرتا اور کبھی امید مہ رخاں سے۔ خدا جانے اس کی سمجھ میں یہ بنیادی بات کیوں نہیں آتی کہ پتلی کی امید کی نسبت موٹی کی موجودگی کہیں زیادہ نفع بخش ہے ورنہ اس چار دن کی زندگی کا وہی حشر ہوتا ہے کہ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔

ٹام سے ملاقات کے بعد ہماری ولٹ شائر کی آخری مصروفیت آرنلڈ اور اس کی خوبصورت بیوی کے ساتھ لنچ تھا۔ اس کھانے پر آرنلڈ نے اپنے بانکے اور کنوارے ہمسایے جیک کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ کھانا لذیذ تھا بس ... نے ہر لقمے پر اقرار کیا۔ ہم نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ سب آرنلڈ کی ہمسائیگی کا فیض تھا، جیک سے کہا۔

"جیک۔ داناؤں کا قول ہے کہ اچھا ہمسایہ بہت بڑی نعمت ہے۔"

جیک بولا۔ "بے شک اور ہمسایے کی بیوی بھی۔"

اور ساتھ ہی کم بخت نے مسز آرنلڈ کی طرف کانی آنکھ سے دیکھا اگر آرنلڈ کی جگہ لالہ محراب گل خان ہوتا تو جیک کی آنکھ نکال لیتا لیکن مہذب آرنلڈ فقط یہ کہہ کر رہ گیا۔

"شریر کہیں کا!"

(مئی ۱۹۸۱ء)



بھارت چند کھنہ

حیدرآباد۔ امریکہ۔ حیدرآباد



نام ** بھارت چند کھنہ
پیدائش ** ۱۹۱۴ء کشمیر
تعلیم ** بی اے، پنجاب، ایم اے [illegible]
[illegible]
مشغلے ** اردو مضمون نگاری اور [illegible]
[illegible] بی اے ایس، زندہ دلان حیدرآباد کے
[illegible]
تصانیف ** مسکراتے آنسو (افسانوں کا مجموعہ)، مصیبتیں (مضامین)، ٹھنڈی جلیبیاں، (مضامین)، تیر نیم کش (مضامین اور ڈرامے) کیا نام نہ ہوگا (مضامین ۱۹۷۷)

۱۸ اپریل ۱۹۷۵ء کی صبح کو میں اور میری شریک [illegible] نے گھر کے دروازوں کو گودریج کے بڑے بڑے نوتال نامی [illegible] لگا دیئے۔ پھر اپنے چہیتے کتے جیکی اور گھر کی دیکھ بھال کے لئے [illegible] ملازمین کو [illegible] ہدایات دیں۔ مطلب یہ کہ ان سے درخواست کی کہ کم از کم ہماری غیر موجودگی میں کتے کا خیال ہم سے بہتر [illegible] چوروں کی نظر بد سے بچانے کے لئے خود گھر میں [illegible] طرح [illegible] رہیں اور گھر کے سامنے کی مختصر سی جگہ [illegible] درخت اور پھول وغیرہ لگائے ہوئے ہیں، ان کو پانی دیتے رہیں۔ [illegible] ہوائی اڈے [illegible] ہلکی ورلی سوٹ کیس [illegible] اور [illegible] ورلی [illegible] گلے میں لٹکائے [illegible] دوستوں [illegible] کو ساتھ لیے ہوائی جہاز کی طرف بڑھے۔ ابھی ہوائی [illegible] کا ہمارا [illegible] بھی طے نہ ہوا تھا کہ میرے گلے میں [illegible] بیگ لوق طالی [illegible] کر میرے قدموں میں آگرا اور میں اس [illegible] کی [illegible] کو چوم رہا تھا [illegible] رہی تھیں، بغیر [illegible] سنبھل [illegible] ناچ کود رہا تھا مجھے [illegible] جاری تھی [illegible] نارے ناچ [illegible] اور ناک اور ٹھوڑی [illegible] STRIPE [illegible] نمودار ہونے لگے تھے [illegible] خوبصورت اور خوب قیمت [illegible] بیگ کا [illegible] دوستوں [illegible] اور بیگ بنچے والے کے اس یقین دلانے کے باوجود [illegible] بہتر اور [illegible] بیگ ابھی تک ہندوستان میں نہیں [illegible] نہایت کمزور ثابت ہوا تھا۔ خیر میں نے بیگ کو بچے کی طرح [illegible] اٹھایا اور گود میں لے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ہمارے پیچھے ایک اور جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ شوہر بہت نحیف اور مریل قسم کے بزرگ تھے مگر بیوی جن کے جسم کا [illegible] حصہ بہت ٹھوس اور چوڑا تھا، بری طرح سیٹ میں پھنس گئی تھی ان کا شاید ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا پہلا موقع تھا

[illegible] نے شوہر سے کہا کہ [illegible] پرواز [illegible] کے لئے [illegible] ہر جگہ [illegible] دیتا اور
[illegible] ابتدائی گھڑگھڑاہٹ اور جھکولوں کے بعد ہوائی جہاز پرواز کرنے لگا تو پچھلی سمت میں پھنسی ہوئی [illegible] نے تشویش ظاہر کی کہ جہاز
[illegible] یکلخت رک کیوں گیا ہے جب ان کو کھڑکی میں سے باہر [illegible] دکھا کر شوہر نے [illegible] کہا تو بیوی نے یہ تبصرہ فرمایا کہ یہ تو
[illegible] طرح رینگ رہا ہے!

اس رات [illegible] سات بجے ہم [illegible] شاہ جہاں میں سوار ہوئے [illegible] ۲۵ [illegible] تھے جہاں
[illegible] جگہ ملی [illegible] کی [illegible] سے [illegible] سامان کو ہاتھوں
[illegible] جاتے [illegible] اندھیری [illegible] رات [illegible]
[illegible] گھڑی [illegible] اور [illegible] تھیں [illegible]
[illegible] آنکھوں [illegible]

[illegible] باتھ روم تھے [illegible] چار بجے [illegible] ان کا استعمال
[illegible] فرسٹ کلاس [illegible] روم [illegible] ہوائی
[illegible] وقت سے اجازت [illegible] ہم
[illegible] باتھ روم [illegible]

[illegible] جہاں [illegible] کینیڈی ہوائی اڈے پر [illegible] آخری منزل بھی [illegible]
[illegible] سامان [illegible] وہاں سامان کھول کر دیکھا گیا [illegible]
[illegible] چیزوں کی [illegible] اور [illegible] آنے سے روکنے کے لئے چھان بین ہوئی [illegible] بھی
[illegible] بیماریوں کی روک تھام [illegible] چلنے سے پہلے [illegible] تھے [illegible]
[illegible] جاتی ہے

[illegible] کے پوچھنے پر [illegible] بات کا یقین دلایا کہ ہم [illegible] ملازمت کی [illegible] وہاں نہیں
[illegible] کوشش [illegible] توقع [illegible]
[illegible]
[illegible] تھے

[illegible] ۹۵ [illegible]
[illegible] وہاں [illegible]

اس وقت رات کے [illegible] بجے تھے [illegible]
[illegible] سب چلے [illegible]
[illegible] تین تین [illegible]
[illegible] اور [illegible]
ہر جگہ [illegible] شخص اپنا کام [illegible] چوبیس گھنٹے [illegible] ملازمین [illegible]

سے بھی کم ہوگی ۔ وہاں اپنے کسی قسم کے کام کرنے کو عیب نہیں سمجھا جاتا ۔ اور اگر کام مشکل قسم کا ہو تو ہمسائے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے اس کی ایک دیوار کا رنگ ذرا مدہم پڑ گیا تھا ۔ جب اس کی اطلاع ان اپارٹمنٹس کے سوپر وائزر کو کی گئی تو وقت مقرر کرکے ایک دوپہر کو ایک شخص رنگ، برش، ایک میلا سا قالین اور سیڑھی لے کر آیا ۔ پہلے اس نے رنگ کئے جانے والی دیوار کے آس پاس کا فرنیچر ہٹا کر دور رکھا ۔ فرش پر قالین بچھایا اور پہلے رنگ کو کھرچ کر نیا رنگ کرنا شروع کردیا میں نے اس سے پوچھا کہ اسے اس کام کی کیا اجرت ملے گی ۔ جواب میں وہ شخص مسکرادیا اور اس نے مجھے بتلایا کہ وہ ان تیس پینتیس فلیٹس کا مالک تھا امریکہ میں غیر فنی اور معمولی کام کی اجرت تین ڈالر فی گھنٹہ ہے ۔

چونکہ میری لڑکی اور اس کا شوہر دونوں ڈاکٹر ہیں اور وہ دونوں صبح ساڑھے آٹھ بجے کام پر جاکر شام کو ساڑھے پانچ کے قریب گھر لوٹتے تھے، ہم دونوں گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے ۔ بیوی کھانا پکاتی بچے کو نہلاتی کھلاتی اور صاف رکھتی تھیں اور خاکسار ویکیم کلینر سے گھر کے فرش صاف کرتا، مشین میں کپڑے دھوتا گھر کے کچرے کو جمع کرکے، سمیٹ کر کچرے کی کنڈی میں رکھدیتا تھا ۔ کچرے کی نکاسی کی جو آسان ترکیب ہمارے ملک میں رائج ہے وہ نیکی کر اور دریا میں ڈال کے اصول پر ہے جھاڑو دے اور کچرا پڑوسی کے گھر ڈال امریکہ میں ہر گھر کے باہر زمین کے اندر ایک گڑھا سیمنٹ کا بنا کر اس میں اسی سائیز کی ایک بڑی بالٹی رکھی ہوتی ہے اور اوپر آہنی ڈھکنا ہوتا ہے ۔

امریکہ بڑا خوبصورت ملک ہے ۔ صاف ستھرا، بڑے بڑے پہاڑ، درختوں اور سبزے سے لدے ہوئے چوڑی شفاف سڑکیں جن پر بڑی بڑی خوبصورت موٹریں تیر کی تیزی سے پھسلتی ہوئی چلی جاتی ہیں، راستے میں کوئی رکاوٹیں نہیں ہوتیں ۔ موٹر کا ہارن بجاکر کسی شخص کو اس کی غلطی کی طرف توجہ دلانا، بے حرمتی کے لئے بہت بڑی توہین کا باعث سمجھا جاتا ہے، سڑکوں پر کتے، بلیاں، گدھے، بھینسیں اور انسان چہل قدمی کرتے نظر نہیں آتے ۔

سڑکوں پر پیشاب کرنے یا غلاظت ڈالنے کا جرمانہ پانچ سو ڈالر ہے ۔ کاش کہ ہمارے ملک میں اس جرم کی پاداش میں پانچ روپے ہی جرمانہ کیا جائے ۔ اگر ایسا کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یا تو اس لعنت سے ملک صاف اور بدبو سے بچ جائے گا یا پھر ریاستوں کے خزانوں میں اسراف کی کیفیت باقی نہیں رہیگی ۔

امریکہ کے اکثر و بیشتر لوگ موٹر نشین ہیں ۔ مثلاً ہمارے گھر جو ڈاکیہ چٹھیاں پہنچاتا تھا وہ ایک محلہ میں کام سے فارغ ہوکر اپنی موٹر میں بیٹھ کر دوسرے محلے چلا جاتا تھا ۔ اور موٹر بھی ایسی جس میں ہمارے ملک کے گورنر یا بڑے رئیس لوگ ہی سواری کرتے ہیں ڈاک کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکیہ نہ صرف آپ کی ڈاک ہی پہنچاتا ہے بلکہ اگر خط لکھ کر دروازے سے لگا دیا جائے تو اسے ڈاک کے ڈبے میں بھی ڈال دیتا ہے ۔

امریکہ کے لوگ بڑے محنتی ہیں ۔ ہفتے میں پانچ دن جی توڑ کر کام کرتے ہیں اور ہفتہ و اتوار کو جی کھول کر رنگ رلیاں مناتے ہیں ۔ بہت سے لوگ تو جمعہ کی شام کو ہی سیر و پک نک کے لئے بال بچوں کو لیکر نکل جاتے ہیں اور اتوار کی شام کو گھر لوٹتے ہیں ۔ مطلب یہ کہ یا تو وہ کام کرتے ہیں یا زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں ۔ بیکار وقت گزارنا ان کے لئے حرام ہے ۔

گو امریکہ جرائم کے لئے بھی مشہور ہے مگر جرم کرنے والے جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ صرف ایسے لوگ ہیں جن کو چرس، گانجہ وغیرہ جیسی قیمتی منشیات کی لت پڑ گئی ہو ایسے لوگ نشہ پورا کرنے کے لئے کسی بھی جرم کا ارتکاب کردیتے ہیں ۔ ان سے ہٹ کر دیکھا جائے تو امریکن بڑے دیانتدار لوگ ہیں ۔ اس خیال کے ثبوت میں ایک واقعہ جو ہمیں پیش آیا آپ کی خدمت میں عرض کر دیتا ہوں ۔ ہم لوگ ایک شام ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گئے اور موٹر کو ہوٹل سے کچھ دور پارک کرنے کی جگہ پر چھوڑ گئے ۔ کھانا کھاکر واپس

ہوئے تو موٹر کے سامنے کے شیشہ پر وائپر میں ایک کاغذ کا پرزہ ٹنگا ہوا تھا جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اپنی گاڑی نکالتے وقت غلطی سے ہماری گاڑی کو خراشیں آگئی تھیں جس کے لئے وہ بے حد نادم تھی۔ اور ان خراشوں کو درست کرنے کے لئے جو اخراجات ہم کو برداشت کرنے ہوں گے انہیں وہ بخوشی ادا کرے گی۔ ٹیلی فون نمبر جس پر راقم سے ربط پیدا کیا جا سکتا تھا اس چٹ پر درج تھا۔ الغرض ہم نے ان خراشوں کو دور کرنے کی اجرت دریافت کر کے (جو تقریباً ایک سو ڈالر تھی) ٹیلی فون پر بتلائی تو محترمہ نے دوسرے دن ایک سو ڈالر کا چیک بھیج دیا۔ دیانتداری کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس واقعہ سے اس امر کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ امریکہ میں موٹر کی مرمت بے حد مہنگی پڑتی ہے۔ اس لئے لوگ حادثہ ہونے پر گاڑی کی مرمت نہیں کراتے بلکہ اسی طرح چلاتے رہتے ہیں اور جیسے ہی ممکن ہو نئی گاڑی خرید لیتے ہیں۔

امریکہ میں کھانے کی چیزیں مختلف قسم کی بڑی کثرت سے اسٹورز میں ملتی ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ البتہ قیمتیں وہاں بھی بڑھ رہی ہیں اور شاید آئندہ اور بھی بڑھیں، مگر تر و تازہ سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں کو دیکھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کی ترکاری اور ہر قسم کا پھل وہاں ملتا ہے۔ صرف سیتاپھل ہی ایک ایسا میوہ ہے جو مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ امریکی دنیا کے اچھا اور پیٹ بھر کر کھانے والے لوگوں میں ہیں۔ آئس کریم کے وہ بڑے شائق ہیں۔ گوشتوں میں بیف یعنی گائے کا گوشت ان کا پسندیدہ ہے۔ بیف کے ہیم برگرز اور فرینک فرٹرز ان کے خاص قومی کھانے ہیں۔ گوشتوں میں بیف سب سے مہنگا۔ دوسرے درجہ پر پورک (سور کا گوشت) اور بھیڑوں کا گوشت اور سب سے کم قیمت مرغ ہے۔ کوئی پندرہ بیس قسم کی ڈبل روٹی اور اتنی ہی قسم کے پنیر دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کوئی کی چیزاں میں [illegible] میں بند اور بیلے پائے ذرد میرہ تخ لئے ہوئے مرے میں حمائے نیا ملتے ہیں جن کو صرف [illegible] در میں [illegible]

وہاں کے لوگ بلی اور کتوں کے بڑے دلدادہ ہیں [illegible] اور [illegible] کا خاص [illegible] پاؤں ڈبوں میں بند اسی طرح ملتے ہیں جس طرح دودھ پیتے انسان کے بچوں کے لئے ڈبوں میں بند کھانے۔

دعوت دیتے وقت کھانا تیار کرنے میں اتنی تکلیف محسوس نہیں کی جاتی جتنی ہوتی ہے [illegible] خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر کھانا کھا کر مہمانوں میں مرد برتن صاف کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو [illegible] کی پلیٹیں استعمال کرتے ہیں اور جو کھانے کے بعد تکلیف سے مکمل نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ پلاسٹک کی پلیٹیں چمچے چھری کانٹے گلاس وغیرہ استعمال کر کے ان کو کچرے میں پھینک دیتے ہیں۔

سلے سلائے کپڑے وہاں بہت سستے ملتے ہیں مثلاً چھ ڈالر میں اچھی قمیض اور اسی قیمت کی اچھی پتلون مل جاتی ہے، مگر انہی کپڑوں کی قمیض پتلون اگر ناپ دے کر سلوائی جائے تو اس کی قیمت کم از کم دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جوتے مہنگے ملتے ہیں ان کی تقریباً وہی قیمت ہے جو یہاں ہے مگر ڈالروں میں۔

وہاں کے اخبار بہت ضخیم اور یہاں سے کچھ بڑے سائز کے کاغذوں پر شائع ہوتے ہیں۔ اتوار کے اخبار اور خصوصاً نیویارک ٹائمز کا اتوار کا اڈیشن ایک سو صفحات سے زیادہ ہوتا ہے۔ ان اخباروں کو اگر جلدی جلدی نکال نہ دیا جائے تو شاید گھر میں ان کے رکھنے کی جگہ نہ رہے۔ سارے امریکہ کے اخباروں کی کسی ایک اتوار کی ردی اگر کسی طرح مجھے یہاں پہنچادی جائے تو میں اس کو بیچ کر لکھ پتی بن سکتا ہوں۔ مگر ہندوستان کے متعلق ان اخباروں میں مطلق کوئی خبر شائع نہیں ہوتی۔ ساڑھے پانچ مہینوں میں جب تک میں وہاں رہا صرف دو یا تین مرتبہ ہندوستان کی خبر چھپی ہوگی۔ ایک ہندوستان کے تاثرات شیخ مجیب الرحمن اور اس کے خاندان کے قتل پر، دوسری

ایمرجنسی کے نفاذ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور تیسری خبر میں ان قوانین کی تفصیل بتائی گئی تھی جنکے تحت پرائم منسٹر اور دیگر عہدداروں
۔یاد کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کی جاسکتی

امریکہ کے بارے میں کوئی بھی مضمون مکمل نہیں ہوسکتا جب تک اس ملک کے ٹیلی ویژن کا ذکر نہ کیا جائے کوئی پچیس [illegible] مختلف چانلی ادارے [illegible] پروگرام تمام دن اور تمام رات ٹیلی وائز کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر پروگرام رنگین اور بے حد دلچسپ ہوتے ہیں کوئی ایسا شعبہ زندگی نہیں جس کے متعلق پروگرام نہ ہو خبریں ٹیلی وائز کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ خبر کے ساتھ ساتھ وہ واقعہ [illegible] بتایا جاتا ہے جس کی خبر دی جاتی ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں واقع ہوا ہو۔ اکثر پروگرام رنگین ہوتے ہیں اور اگر اچانک کسی [illegible] کا پروگرام انسان سے [illegible] جائے تو کیا مجال [illegible] تک وہ ختم نہ ہوجائے اسے بدلا جاسکے۔ امریکہ کا [illegible] ٹیلی ویژن کا دلدادہ [illegible] اکثر [illegible] ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے [illegible] ہے کر یز کرجاتا تھا جو [illegible] سے [illegible] تو نیس کر دیتے تھے [illegible] جب وہ [illegible] کر مجھے ٹیلی ویژن کے سامنے سے اٹھانے کی کوشش کرتی تھیں اور میں [illegible] نہیں ہوتا تھا تو [illegible] آکر اپنی خشمگیں نگاہوں سے چنگاریاں برساتے، میری آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ ہلاتی [illegible] شانے ہلا کر اپنی [illegible] اظہار کرتی تھیں میری عمر کے لوگوں کو بعض دفعہ [illegible] ہوجاتا ہے مگر دوستو میرے [illegible] کے بارے میں [illegible] تشخیص کی [illegible] سے پتہ چلا کہ امریکہ میں مجھے ٹی۔ وی ہوگیا تھا

(جنوری ۱۹۷۶)

رشید قریشی

گھوڑا جوڑا

رشید قریشی تاریخ پیدائش ★★ ۲۸ / جون ۱۹۲۰ء
تعلیم ★★ ایم اے (عثمانیہ
ملازمت ★★ ڈپٹی سکریٹری حکومت آندھرا پردیش
تصانیف ★★ مزاح شریف (مضامین)، محبوب (ڈراما)
انتقال ★★ ۲۱ / نومبر ۱۹۹۲ء

خادم کے والد چاہتے تھے کہ [illegible] ڈاکٹر بنے۔ ادھر وہ پہاڑ شا کا جلیہ تھے اور ادھر [illegible] مزاحمت [illegible] کے ساتھ کمپاؤنڈ اسٹڈی میں جت گیا [illegible] اس کا [illegible] خادم کے [illegible] الجوار میں مبتلا ہو گئے اور خادم [illegible] اس ہاتھ لڑکی سے اور اس ہاتھ ڈاکٹری [illegible] ناکامی سے خادم کی امیدوں کا [illegible] ان کا دعوی [illegible] سے بچ نا کر [illegible] خادم [illegible] میں داخلہ دلوا دیا اور جب خادم [illegible] میں کامیاب ہو گیا [illegible] ماں باپ [illegible] شادی [illegible] نقشے سانے لگے [illegible] دباؤ کارفرما [illegible] ہوتا [illegible] اصطلاح [illegible] موزوں نظر نہیں [illegible] کا [illegible] دوں نے ماں باپ اور شادی کا خادم [illegible] آپ کو جانتے ہوں [illegible] اس [illegible] لڑکوں کو [illegible] میں [illegible] لاتے ہیں اور جب [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] دی [illegible] ہے

شادی کے بارے [illegible] ڈاکٹر [illegible] جب ڈاکٹر حیوانات کا بھی ہو تو [illegible] ماؤں اور [illegible] جاتا ہے بلکہ حیوان ہو لیکن ڈاکٹر [illegible] اور ایک بڑی [illegible] میں خادم سے زیادہ اس کے والد [illegible] خادم [illegible] سعادت مند اور احسان مند بنا تھا [illegible] اس لئے کہ والد کی طرف سے کسی بات کی [illegible] تھی [illegible] اس لئے کہ اس کی والدہ کے انتقال [illegible] شادی کا [illegible] نہیں کیا تھا جہاں بھی [illegible] وہ اپنے [illegible] دوستوں ہم [illegible] اور محلے کی [illegible] کے موذن صاحب کو لازمی طور پر [illegible] مسلک رکھتے۔ لیکن [illegible] کا لمانا

کہیں شام کی چائے ، کہیں عشائیہ اور ہر مقام سے اس نعرہ کے ساتھ اٹھتے ، ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے اپنا ۔
ایک پیام تو ایسا للچانے والا آیا کہ والد صاحب نے خادم کو پس پشت ڈال کر خود آگے بڑھ جانے کی ٹھان لی ۔ لیکن ان کے حق میں لڑکی والوں نے جہیز کی رقم نصف گھٹادی تو وہ پیچھے ہٹ آئے اور خادم پر ایک اور احسان کر گئے ۔ یہ نسبت سمنٹ کے سیٹھ دولت خاں کی بیٹی کی تھی ۔ گھوڑے جوڑے کی رقم بیس ہزار ، چالیس ہزار کا مکان پچاس ہزار کا زیور ، دھوم دھام کی شادی ، جس میں کسی نہ کسی وزیر کی شرکت یقینی ، لڑکی کی وجاہت کے تعلق سے یہ معماتی اشارہ دیا گیا کہ وہ سو فیصد آدم زاد ہے اور شجرہ کی کسی شاخ پر بھی کسی دوسری جنس کا گھونسلا نہیں ہے ۔ لڑکی کو دیکھنے کی بات پیش ہوئی تو کہا گیا کہ لڑکی کوئی دم دار ستارہ نہیں اور یہ کہ دیکھنے ہی پر اصرار ہو تو جہیز میں مکان نہیں دیا جائے گا ۔ خادم کے والد نے لڑکی کو دیکھنے کی تجویز واپس لے لی مگر مکان کے معائنہ پر اڑ گئے ۔

خادم حیوانات کا ڈاکٹر سہی لیکن اس کا انسانی جمالیاتی ذوق پری دشوں کی تشخیص کرتا تھا ۔ اپنی شریک زندگی کے تعلق سے اس کا خانگی نظریہ حسن یہ تھا کہ وہ مدھو بالا کا انداز قد رکھے ، گیتا بالی کی طرح غنچہ دہن ہو ، نینا کی سنجیدہ نزاکت کا جواب ہو ۔ لیکن خادم کے والد کا مشورہ تھا یہ وہ کچھ نہیں ، تم حیوانات کے آدمی ہو ، تم کو تو ایسا سراپا سوچنا چاہیئے ، ریگستان کی رانی کا قد ، گلہری کا دہن بیمار بلی کی سنجیدہ نزاکت اور دولت خاں کی بلکہ دولت کی بیٹی

خادم کی یہ بد قسمتی تھی کہ اس کے والد نے اس کی خیالی دنیا میں کبھی جھانک کر نہیں دیکھا ۔ ان کے قدم زمین پر تھے اور ان کی نظریں بھی زمین پیما تھیں ۔ زمین کہاں سونا اگلتی ہے ، کہاں بنگلوں کو سر بلند کرتی ہے ، کہاں موٹروں کو گھماتی ہے　　اور ایسی زمین ان کو سیٹھ دولت خاں کے قبضہ میں مل گئی ۔ انہوں نے سیٹھ دولت خاں کی بیٹی سے خادم کا رشتہ طے کر دیا ۔ گھوڑے جوڑے کی رقم وصول کر لی ۔ اب شادی کی تاریخ سے ان کو دلچسپی نہ تھی ۔ لیکن سیٹھ دولت خاں نے بذریعہ فرمان خسروی دوسرے ہی ہفتے کے دوسرے دن شادی مقرر کر دی ۔ برات کے تعلق سے خادم کے ایک دوست نے شاعرانہ نازک خیالی کو ایڑ لگائی ۔ مشورہ تھا کہ گھوڑے جوڑے کی رقم گھوڑے پر سوار ہونے سے حلال ہوتی ہے اور حیوانات کا ڈاکٹر ہونے کے ناطے خادم کے لئے گھوڑے سے زیادہ نسبتی سواری کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی ۔

خادم نے سہم کر اپنے والد کی طرف دیکھا ۔ گھوڑے کا علاج کرنا اور چیز ہے　گھوڑے پر سوار ہونا اور ۔ خادم نے بچاؤ کا یہ پہلو نکالا کہ موٹر میں بھی گھوڑے کی طاقت ہوتی ہے ، اور امپالا میں تو اڑن گھوڑوں کی طاقت پرواز حتی ہوتی ہے ۔ لیکن اس دوست نے خادم کے والد کو سمجھایا کہ موٹر کی سجاوٹ اور پٹرول پر کم از کم دو سو روپیوں کا خرچ بیٹھے گا　　اور گھوڑا　　وہ مفت مہیا کر سکتا ہے ۔ خادم کے والد نے حکم صادر فرمایا کہ دولھا گھوڑے پر برات کا سپہ سالار ہو گا　　اور خادم کے دوست کو ہدایت ہوئی کہ وہ اسی گھوڑے کو ڈھونڈھ نکالے جس پر وہ خادم کی والدہ کو بیاہنے نکلے تھے ۔ اس بے چارے کو وہ تاریخی گھوڑا تو نہ مل سکا البتہ منگل ہاٹ میں ایک کمہار کا ٹٹو مل گیا ۔ ہر چار پیر والا جانور گھوڑا نہیں ہوتا لیکن ہر ٹٹو گھوڑے کا بھتیجہ ہوتا ہے ۔ خادم کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوا ۔ کرسی منگوائی گئی کرسی پر اسٹول رکھا گیا اور خادم کو خطہ ارض سے کرسی پر اور کرسی سے اسٹول پر پہنچادیا گیا　　اس بلندی سے ٹٹو پست قد تھا ۔ اس لئے خادم کو صرف قدم رنجہ ہونا تھا　　ڈرم دھم بولا ۔ اور کاروں منڈل بینڈ حرکت میں آگیا ۔ اودے رنگ کے جودھپوری کوٹ پر پیلا شملہ باندھے بیانڈ کی مخلوق مریخ کے تازہ واردوں کی ہیبت میں تھی لیکن ڈرم بجانے والا اسی دنیا کا تھا ۔ کیوں کہ اس غریب کے جسم پر کوٹ نہیں تھا ، صرف بنیان تھا ۔ بیانڈ بجنے لگا برات رینگنے لگی ۔ ٹٹو بھی براتیوں کے ریلے میں پیروں کو جنبش دیئے بغیر آگے بڑھنے لگا ۔ بیانڈ نے اپنی مہارت کی چیز چھیڑ دی ۔ غم دیئے مستقل　کتنا نازک ہے دل ۔ ہائے ظالم ۔ کے ساتھ ڈرم بجانے والے کی آستین پھٹ کر اس کی

نالی میں اتر آئی ۔ اور وہ آستین چڑھانے کے لیے رک گیا ۔ اسی میں دولھا کا ننھو اس کے پاس پہونچ گیا ۔ ڈرم بجانے والے نے آستین کا ڈرم پر نکالا اور اس دھماکہ کی ضرب لگائی کہ ننھو مراقبہ سے پلٹا ۔ خادم کے ہاتھ کی سرح دستی سے خنجر ازا ۔ وہ تو کہیے خیر ہوئی، خادم نے ہوا سے کام لیا اور ننھو کے گلے کا ہار بن گیا ۔ ورنہ عقد کی کارروائی ہسپتال میں انجام پاتی

دلھن کا گھر چاند تاروں کا میلہ تھا، موٹروں کا اڈہ تھا، مہمانوں کا چھتہ تھا ۔ جب بارات پہونچی تو سب کی نظریں خادم کی طرف تھیں لیکن اسی وقت سیٹھ دولت خاں کے اشارہ پر گھنگھر بالا نے رقص شروع کر دیا ۔ سب مہمان اس کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ خادم چاول پھنکوائی کے لئے بلایا گیا تو ایک لحیم شحیم بلند پر لیٹری رشتہ دار نے خادم کو ننھو کی پیٹھ پر سے اپنی گود میں اتار لیا لیکن دوسرے ہی لمحہ پر وہ خادم پر ڈھیر ہو گئے خادم کی والد نے اسے بلند پر لیٹر کے دباپے سے کشاں کشاں آزاد کیا اور دلھن کی طرف ڈھکیل دیا خادم چیست چالاک دلھن کی طرف بڑھنے لگا ۔ کسی نے پکارا ادھر نہیں ادھر ہے دلھن اور خادم کو ایک خوبصورت جوان مہمان لڑکی سے صرف دو قدم دور رک جانا پڑا ۔ پینترا بدل کر جب وہ اپنی حقیقی دلھن کے مقابل جا کھڑا ہوا ۔ اس کا چاول پھینکنے والا ہاتھ لرزنے لگا خادم کے والد اس کے نزدیک پہونچ گئے ۔ گھبراؤ نہیں بیٹا ۔ شہسوار ہی لرزتے ہیں گاما پہلوان بھی لرز رہے تھے ۔ چلو پھینکو چاول دیوانے مت بنو ۔ گھر میں چھ ان بیاہی بہنیں بیٹھی ہیں اور جب خادم دولھا کی مسند پر آ بیٹھا، اس کے جبڑے بج رہے تھے اور آنکھوں سے حزن سا گر چھلک رہا تھا ۔

قاضی صاحب نے فیس لے لی، مصری بادام سے اپنی ہتھیلی بھر لی اور ایجاب و قبول کا مرحلہ آ گیا ۔ خادم نے ایک عالم بے بسی میں ماہ پارہ بنت دولت خاں کو بعوض ڈھائی لاکھ مہر موجل اپنے عقد نکاح میں تین بار قبول کر لیا مبارکبادیوں کا ہنگامہ شروع ہو گیا سیٹھ دولت خاں اس وقت دنیا کا سب سے سبکدوش سیماب شادماں باپ تھا لیکن ابھی رخصتی باقی تھی حلوے کی تیاری میں ڈاکٹر فریدہ فردوس پیش پیش تھیں، کیوں کہ ان کے کالج کو سیٹھ دولت خاں کی طرف سے گرانٹ ملا کرتی تھی ۔ اور اس شادی کے لئے کالج میں دورانہ دعا، پر پر اور پرار تھنا ہوا کرتی تھی ۔ سیٹھ دولت خاں خادم کو لے کر زنانے میں گئے ۔ ایک مہمان خاتون نے سرگوشی کی دولھا تو گھوڑے کی شکل کا ہے ۔ ڈاکٹر فریدہ فردوس نے خاموشی کی انگلی دکھائی شش ۔ حیوانات کا ڈاکٹر گھوڑا جوڑا سرگوشی سماعت ہو گئی لیکن روشنی کا فیوز اڑ گیا اندھیرے کی کھلبلی مچی بجلی کے کارپرداز اپنے کام پر لگ گئے ۔ بچے بلبلانے لگے لیکن روشن اندھے کی بینائی کی طرح روٹھی رہی ۔ سیٹھ دولت خاں نے پٹرومکس منگوائے ۔ لیکن انکو پٹرومکس کا انتظار گوارا نہیں ہوا ۔ مبارک گھڑی کو اندھیرے اجالے سے سروکار نہیں ہوتا اس لئے آرسی مصحف کی رسم اندھیرے ہی میں شروع کروادی گئی دولت خاں کی رنگ کا منٹری کے ساتھ دیکھو جو ستارہ چمک رہا ہے وہ پیشانی کا ٹیکہ ہے دس ہزار کا ۔ اور غور سے دیکھو جو گردن کے پاس اجالا ہے وہ چمپاکلی ہے چالیس ہزار کی خادم نے ایک سفید چمکتی حملہ آور چیز بھی دیکھی جو ٹیکے اور چمپاکلی کے درمیان واقع تھی ۔ خادم خوف زدہ اٹھ گیا سیٹھ دولت خاں نے اپنی بیٹی کو بھی اٹھا دیا ۔ جاؤ خوش رہو، لے جاؤ خوش رہو ۔ واپسی کے لیے خادم کو ننھو سے چھٹکارا مل گیا ۔ وہ موقع پا کر ڈرم پر دولتیاں جھاڑ کر قلعے کی طرف بھاگ نکلا تھا بینڈ والے بھی اسے نہ ملے ۔ ان کو چادر گھاٹ سے دولھا کے آگے چلنا تھا اور سیکل پر ڈبل سواری کے جرم میں پولس والوں نے سبھوں کو دھر لیا تھا ۔ دلھن کی موٹر شادی کا بارن بجاتی خادم کو اس کے گھر لے آئی خادم کے والد وہیں دولت خاں کے بنگلے میں رک گئے ۔ اس دن لاری والوں نے ہڑتال کر رکھی تھی اس لئے جہیز کے ساماں کی فوری منتقلی ممکن نہ تھی وہ دولھا کے باپ تھے اس لئے شادی کی رات کہیں بھی بسر کر سکتے تھے ۔ وہ ایک آنکھ سوتے ایک آنکھ جاگتے صوفے پر دراز رہے اور جہیز کا سامان جیسے ان کی ہتھیلی پر جما رہا ۔ دوسرے دن صبح خادم کے دوست مبارکباد دینے اس کے گھر پہنچے کسی کے ساتھ تحفہ تھا کوئی پھولوں کے

مار رہا تھا۔ خادم نے مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ جب چائے آئی تو سبھوں نے ایک زبان ہو کر نعرہ بلند کیا دلھن بھابی کے ہاتھ کی چائے پی جائے گی۔ خادم ٹالتا رہا لیکن دوستوں کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ اس اصرار کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ خادم کے انتخاب کا نظارہ چاہتے تھے۔ وہ اس کی بینائی سے واقف تھے۔ اور ان کو یقین تھا، خادم کی جستجو میں خوب اور خوب تر کو چھوڑ کر آخر کار خوب ترین پر ٹوٹی ہوگی۔ اور دوستی کی بنا پر ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ دلہن بھابی کے درشن مانگیں۔ دوست دولھا کی قسمت پر رشک کریں۔

خادم بادل ناخواستہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔ آنکھیں جلوہ جو بیا۔ دلوں کی دھڑکن تیز۔ توقعاتی انتظار کی سنسنی۔ اب کوئی دم میں قیامت سے۔ کوتا ہالی کی عیجہ دہنی پر مسکراتا۔ نیساکی سجیدہ نزاکت کو کشیدہ ابرو پر تولتا۔ ایا آیا۔ چشم براہ--- نگاہوں سے دو دو ہی سے لے تا۔ لہ دروازہ دھڑ کا پردہ کو جنبش ہوئی۔ تہنیتی ترانہ چھڑ گیا

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب
مہکیں تیری عارض کے گلاب

اور خادم کے پیچھے سمٹی، سکڑاتی اس کی دلہن نمودار ہوئی۔ شراب سوکھ گئی، گلاب بکھر گئے۔ ایک دوست نے آگے جھک کر دوسرے سے بار بار سانا۔ دولھامیاں کو انکھوں کا عطیہ دینا ہوگا۔ خادم نے اپنا سر تھام لیا۔ ایک اور دوست نے عینک درست کی، ہونٹوں کو بھینچ کے بولا کبھی کے دو دانت دکھانے کے ہوتے ہیں اور کھانے کے اور، یہ چار دانت باہر ہیں۔ خادم کا سر کچھ اس طرح جھٹکے کھانے لگا جیسے برقی رو چھو رہی ہو۔ کسی نے آواز اٹھائی، دیکھو کلے میں جھریوں کے ہار بھی ہیں۔ خادم اب تک خاموش بیٹھا یہ تعزیتی تبصرے سن رہا تھا۔ آخری جملہ پر تند طرح بھڑک اٹھا۔ ارے زور سے بات کرو رے۔ بھابی بہری بھی ہیں۔

دلہن نے مبہوت ماحول کی تڑپتی، تلملاتی مایوسی کو محسوس کیا اور پلٹ کر خادم کی طرف دیکھا۔ تبدیلی فضا کے لئے ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے دانتوں پر چمک گئی۔ سفید خربوزے پر لاری کا پہیہ گزر گیا۔ جیسے، بغیر باپ پیدا ہونے والے انڈے کو خود اس نے پیدا ہوتے ہی پھوڑ دیا ہو جیسے۔ خادم چونک گیا۔ یہ مسکراہٹ اس سے پوچھ رہی تھی -- نہیں جانتے تھے بھکاری کو لڑکے کا حق نہیں۔

(اپریل ۱۹۸۳ء)

پیارے شگوفہ باز

اس مرتبہ آپ کے خط میں عشق اپنی حد مقدار سے کچھ زیادہ تھا اس لئے ایک نہایت ہی ہلکی پھلکی چیز بھیج رہا ہوں جس میں خطرہ یہ ہے کہ فکر تونسوی اس میں سے کم جھلکے کا ہلکا پن زیادہ اب لکھنے سے ادب چکا ہوں صرف کبھی کبھی تقاضائے دوستاں پورے کر لیتا ہوں ورنہ وہ شخص تو مر گیا جس کا نام فکر تونسوی تھا۔

فکر تونسوی، نئی دہلی

ہندر لوتھر

کوڈاں



ہندر لوتھر ولد میاارام
١٩٢٣ ، قام
اے انر (
گیلوما
ندن)
ئی اے الیں (ریٹائرڈ) مختلف اہم
رہے ۔ زندہ دلان حیدرآباد کے برسوں صدر رہے
صدر ، ورلڈ ہیومر کانفرنس (١٩٨٥ء)
لندن ، فرانس ، مغربی جرمنی ، ڈنمارک
سوئزرلینڈ ، اٹلی ، ترکی ، اسرائیل
بلغاریہ وغیرہ ۔
تصانیف ** بند کواڑ (افسانے) مزاح پرسی (مزاحیہ
مضامین) الف تماشہ (مزاحیہ مضامین) ہوائی کولمبس
سفرنامہ ، مزاحیہ) ، مزاح اور حیدرآباد کی تاریخ
کتابیں شائع ہو چکی ہیں

[illegible]

رات کا سین چاہیے جس میں ہیرو پہاڑ کی چوٹی پر سے سمندر میں چھلانگ مارتا ہے۔ اب وہ سین ہر ہیرو کو چاہیے، وہ راجیش کھنہ ہو یا امیتابھ بچن یا دلیپ کمار فٹ ہو جائے گا۔ کیوں کہ اصلی چھلانگ مارنے والا بیچارہ سٹنٹ مین ہے جس کو اس سین کے لیے مبلغ پچاس روپے نقد دیے گئے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ لوڈ سسٹم کو ابھی اور بھی بڑے پیمانہ پر ہماری روز مرہ زندگی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زندگی آسان ہو سکتی ہے اور روز مرہ کے کئی فضول قسم کے جملے اور تکلفات ترک کیے جا سکتے ہیں۔

مثلاً آپ جب بھی کسی دوست سے ملتے ہیں ہمیشہ یہی سوال پوچھتے ہیں "کیا بھی، کیا حال ہے؟"

اس کا جواب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ پھر وہ آپ سے وہی سوال پوچھتا ہے اور پھر آپ وہی جواب دیتے ہیں پھر چونکہ اور کوئی بات کرنی نہیں ہوتی اس لیے تھوڑی دیر کے بعد آپ ذرا اوب کر پوچھتے ہیں۔

"اچھا اور کیا حال ہے"

اس کا جواب ہوتا ہے "اچھا اور بھی ٹھیک ٹھاک ہے"۔

اس قسم کے سوال جواب کچھ اتنے بندھے ٹکے ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص سخت بیمار ہو اور آپ اس سے اس کا حال پوچھیں تو بھی وہ یہی جواب دیگا کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ہمیں آج تک صرف ایک ہی شخص ایسا ملا جس کا جواب ذرا مختلف تھا۔ وہ بیچارہ کینسر کا مریض تھا اور اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ایک دن ہم اس سے ملنے گئے اور پوچھا "اب طبیعت کیسی ہے"

اس نے جواب دیا "بہتر ہے" اور پھر کچھ رک کر وضاحت کی "میرا مطلب ہے پہلے سے تو بدتر ہے، لیکن آنے والے کل سے بہتر ہے۔"

آپ گھبرایئے مت اور خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیے۔ یہ رسمی گفتگو صرف ہندوستان میں ہی نہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی ہوتی ہے۔ ہم نے بیشتر ممالک میں دیکھا ہے کہ دستوری گفتگو ایسے ہی ہوتی ہے۔ ایک سال ہوا ہمیں عرب ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہمیشہ ہر ملاقات پر گفتگو مندرجہ ذیل جملوں سے شروع ہوتی ہے۔

زید : "صبح خیر"

بکر : "صبح خیر"

زید : "کیا حال ہے؟"

بکر : "ٹھیک ہے۔ شکر ہے خدا کا۔ تمہارا کیا حال ہے"۔

زید : "ٹھیک ہے۔ شکر ہے خدا کا ...."

اس سے زیادہ عربی ہمیں آتی نہیں ...... شکر ہے خدا کا۔

انگریزی اور امریکن لوگ تو اور بھی کمال کرتے ہیں۔ سوال کا جواب سوال سے دیتے ہیں۔ مثلاً وہ کسی سے پہلی بار ملتے ہیں گفتگو یوں شروع ہوتی ہے۔

ٹام : "آپ کا کیا حال ہے؟"

جیم : "آپ کا کیا حال ہے؟"

شروع شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ ہم اصرار کرتا ہے کہ پہلے تم اپنا حال بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا۔ میں پہلے کیوں بتاؤں؟ اور ہمیں ڈر سا تھا کہ ابھی ان کی لڑائی ہوگی۔ یا لکھنؤ کے نوابوں کی طرح پہلے آپ پہلے آپ میں گاڑی چھوٹ جائے گی۔ لیکن صدیاں بیت گئیں۔ نہ تب نہ ٹام نے اور نہ جم نے اپنا حال بتایا ہے۔ اور ان کی نسلیں ابھی تک ایک دوسرے کو کرید رہی ہیں۔

اب اگر ہم "آپ کا کیا حال ہے؟" کو کوڈ نمبر ایک اور "میرا حال ٹھیک ہے شکریہ" کو کوڈ نمبر دو دے دیں تو ملاقات کے وقت گفتگو کچھ ایسے ہوگی:

زید : "ایک"

بکر : "دو ایک"

زید : "دو"

آپ خود ہی سوچیے، اس طرح کتنا وقت بچے گا۔ ہم نے سنا ہے کہ امریکہ میں روزمرہ کے کلمات کو کوڈ میں بدلنے کا تجربہ ہو رہا ہے۔ وہاں کی ایک جیل میں جہاں عمر قیدی رہتے ہیں یہ تجربہ کیا گیا ہے۔ وہ قیدی سارے دن کام کرتے اور پرانے لطیفے سنا کے ہی اپنی ہنسی ہنستے۔ وہاں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر لطیفے کو ایک کوڈ نمبر دے دیا جائے اور کسی کو کبھی جب لطیفہ سنانا ہو تو وہ صرف اس کا کوڈ نمبر بتا دیتا ہے، اور سننے والے اس کو سن کر اور اس کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر مناسب انداز میں ہنس دیتے ہیں۔ ایک دن وہاں ایک نیا قیدی آیا۔ شام کو جب معمول کے مطابق محفل جمی تو ہر قیدی نے اپنی پسند کا لطیفہ سنایا

لطیفہ نمبر پانچ:

ہا ہا ہا ہا

لطیفہ نمبر سترہ:

ہی ہی ہی ہی "

اس لطیفے کو سن کر کچھ قیدی تھوڑا سا ہنسے۔ لیکن ایک قیدی بہت ہنسا اور جب سب نے ہنسنا بند کر دیا تو بھی وہ ہنستا رہا۔ نئے قیدی نے جیلر سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ باقی سب قیدیوں نے یہ لطیفہ بہت بار سن لیا تھا اس قیدی نے پہلی بار سنا ہے اس لئے وہ زیادہ ہنس رہا ہے۔

اس کے بعد نئے قیدی نے بھی ایک لطیفہ سنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اجازت ملنے پر اس نے کہا

لطیفہ نمبر تیرہ:

اس کو سن کر کوئی بھی نہ ہنسا۔

نئے قیدی نے قدرے خفت سے جیلر سے پوچھا کہ میرے لطیفے پر لوگ کیوں نہیں ہنسے، حالانکہ بڑا زوردار لطیفہ تھا۔ جیلر نے اسے سمجھایا کہ لطیفہ تو اچھا تھا، لیکن لطیفے کی کامیابی اس کے سنانے کے انداز میں چھپی ہوتی ہے۔ تمہارا سنانے کا انداز ذرا ڈھیلا تھا۔

ہمیں سیکڑوں جلسوں محفلوں اور مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ کئی حیثیتوں سے ایسی محفلوں میں جانے کا موقع ملا ہے اس لیے ہم نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے، ہر جلسے کے لئے کچھ کیریکٹر لازمی ہیں۔ سب سے پہلے کنوینر جو سارے فساد کی جڑ ہوتا ہے۔ اس کے کئی نام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے آرگنائزر یا سکریٹری وغیرہ۔ نام کچھ بھی ہو، اس جنس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کا چنا ہوا یا خود

ساتھ [illegible] وہی بھی ہو خصلت ایک ہی ہوتی ہے۔ ان صاحب میں اپنی آپ نمائش کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس [illegible] والے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور مشہور لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے لوگوں کو [illegible] سے اشتیاق انگریزی میں ایسے شخص کو سکانڈل مانگر کہا جاسکتا ہے۔

جلسے کے لئے جس دوسرے کیریکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پریذیڈنٹ یا چیئرمین یا صاحب صدر کہا جاتا ہے [illegible] زمانے میں صرف صاحب صدر کا ہونا کافی تھا۔ لیکن اب آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے بیروزگاری بڑھ گئی ہے۔ اسلئے جلسوں [illegible] ایک اور پوسٹ تخلیق کی گئی ہے۔ اس پوسٹ کو چیف گیسٹ یا مہمان خصوصی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ [illegible] دو وی آئی پیز کو [illegible] بنایا جا سکے۔ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صاحب صدر اور مہمان خصوصی میں سے کون سا [illegible] [illegible] دونوں صاحبان کو یہی مغالطہ رہتا ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ اہم [illegible] سے دو چار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو جلسے میں صرف اس لئے آتے ہیں کہ صاحب صدر یا مہمان خصوصی [illegible] [illegible] انہیں آداب عرض کرنے کا موقع مل جائے۔

چلئے [illegible] طور پر آپ کو ایک جلسے میں لے جائیں۔۔۔۔۔۔۔۔

محفل [illegible] کی ہے جناب صدر اور مہمان کے ناموں کا ڈھنڈورا پٹ چکا ہے۔ اشتہاروں میں لوگوں کے وقت [illegible] [illegible] وقت ہو چکا ہے۔ آرٹسٹ لوگ تیار بیٹھے ہیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ نظریں بے تابی سے صاحب [illegible] [illegible] ادا کر کے وہ آتے ہیں۔ آدھ گھنٹے لیٹ۔ لیکن صاحب صدر اور مہمان خصوصی ان کے آنے کے [illegible] [illegible] زیادہ اہم ہوتا ہے وہ زیادہ دیر سے آتا ہے۔

[illegible] محفل کا آغاز ہوتا ہے۔ کمپیئر صاحب صاحب صدر کی [illegible] کرتے ہیں۔ حاضرین تالیاں بجاتے ہیں [illegible] مہمان خصوصی کی [illegible] کرتے ہیں۔ اس بار حاضرین کم تالیاں بجاتے ہیں۔ لیکن صاحب صدر اور مہمان خصوصی خوب [illegible] [illegible] مہمان خصوصی [illegible] کی [illegible] کرتے ہیں اب سب لوگ مل کر تالیاں بجاتے ہیں۔

[illegible] تھوڑا [illegible] صاحب صدر کی [illegible] اور صاحب صدر کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] معلومات [illegible] [illegible] کا ذکر ہوتا ہے [illegible] سے باہر اور لال کوٹھی تک [illegible] ان کی قوم [illegible] [illegible] کوشش کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تمام معلومات صاحب صدر نے [illegible] [illegible] سے لکھ کر کمپیئر صاحب کو پہلے سے ارسال کی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت ان تفصیلات کو [illegible] سمجھتے ہیں کو یا کوئی [illegible] ان کے ماضی کے بارے میں کچھ بتا رہا ہو۔

بالآخر کمپیئر جلدی سے ایک بار پھر صاحب صدر کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی [illegible] [illegible] کے باوجود اپنی [illegible] میں سے قیمتی وقت نکال کر یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی۔

پھر انہیں الفاظ میں یہی رسم ایک اور چمچہ جسے مہمان خصوصی کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ان کے تعلق سے [illegible] [illegible] صاحب صدر کی تعریف میں باندھے ہوئے پلوں پر سے وہ مہمان خصوصی کی شان میں بنی ہوئی ولشا میں چلاتا ہے۔ ان رکشاؤں کا [illegible] [illegible] ہو جاتی ہے کہ حاضرین میں سے کئی منچلے سیٹیاں بجا کر ٹریفک کانسٹیبل کا رول ادا کرتے ہیں۔

اس کے بعد صدر صاحب سے انجمن اور آرٹسٹوں کے بارے میں چند الفاظ کہنے کی گزارش کی جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نئی تقریر کے ہوتے ہیں۔ پہلے تو صدر صاحب نیا اعلاء سب لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہ چند الفاظ دو حصوں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ تو ایک معمولی انسان ہیں اور ان کا کوئی کام ایسا نہیں جو ہر لحاظ اس عزت کا مستحق نہیں تھا۔ جو آپ لوگوں نے مجھے بخشی ہے وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ میرے متعلق جو کچھ بتایا گیا ہے وہ مبالغہ آمیزی ہے۔ چونکہ سامعین کو یہ سننے کی عادت نہیں ہوتی اس سے وہ اس کو سچ سمجھتے ہیں اور صدر کی کسر نفسی سمجھتے ہیں۔

اس مغالطے کا فائدہ اٹھا کر اب صدر صاحب اپنے چند الفاظ کا دوسرا حصہ شروع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہاں تقریر کرنے تو نہیں آنا تھا وہ تو مجھے ابھی ابھی پتہ چلا کہ مجھے تقریر بھی کرنا ہے۔ میرا یہاں آنے کا مدعا تو یہ تھا کہ میں آرٹسٹ سے لطف اندوز ہو سکوں۔ سنگیت اور آرٹ سے مجھے بچپن ہی سے لگاؤ ہے۔ ... اس وقت پیدا ہوا جب میں ... ویسے سیپیان کر کے اپنا پیٹ پالا کرتا تھا ... ہوں کہ یہاں تقریر ... محفل کا لطف اٹھائیں۔ ... میں درخواست کروں گا کہ زیادہ وقت گفتگو پر صرف کرنے کے بجائے پروگرام کا آغاز کیا جائے۔ ... کا اور ... کا ایک بار پھر شکریہ تہہ دل سے ادا کرتا ہوں۔

ان کا یہ دوبارہ شکریہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ جو شکریہ ... چند الفاظ ... ادا کیا تھا وہ تہہ دل سے نہیں تھا ... دل تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔ خاص کر اگر صاحب صدر ... قسم کے شخص ہوں (اور عام طور پر صدر صاحب ... اندام ہی ہوتے ہیں) اس کے صدر صاحب ... دل تک ... ایک ہی تقریر سننا پڑتی ہے

لیکن ابھی پروگرام کا آغاز کہاں؟ آپ مہمان خصوصی کو تو بھول گئے۔ صاحب صدر سے ... کے بعد مہمان خصوصی کی ... ہے اور پھر ان کے تعلق سے پوری کارروائی ... دہرائی جاتی ہے۔

اس اثناء میں بے چارہ یا بے چاری آرٹسٹ پیچ و تاب کھانا شروع کرتا یا کرتی ہے اور ... ہو جاتا ہے۔ اگر آرٹسٹوں ... ایک عورت ہو تو پھر ظاہر ہے کہ وہ بھری محفل میں اٹھ کر ... نہیں سکتے ... ہوتی ہے تو حاضرین تالیاں بجا بجا کر سوتے ہوئے آرٹسٹوں کو جگاتے ہیں۔ اس کے بعد اصل محفل کا آغاز ہوتا ہے۔ ... سے جانے کا اور صدر اور مہمان خصوصی کے سونے کا وقت شروع ہوتا ہے

اگر آپ کو چار پانچ جلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو اب تک یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ صدر اور مہمان خصوصی کے چند ... اظہار تشکر کی تقریروں کے سٹنڈرڈ اصطلاحیں اور محاورات زبانی یاد ہو گئے ہوں کہ ہمیں تو اس موضوع پر اب اتنی مہارت ... ہے۔ ہم کسی بھی جلسہ میں بیٹھے ہوئے پڑھتے اشعار کے مصرعہ ثانی کی طرح صدر اور مہمان خصوصی کی تقریروں کے جملے پورے کر ... لیکن افسوس کہ آداب محفل اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔

ایک بار کسی وی۔ آئی۔ پی کو ایک مشہور سکول کے سب سے بزرگ استاد کے ریٹائر ہونے پر منعقدہ جلسے میں بلایا گیا ... سب ... اور استادوں کی طرف سے انہیں خراج تحسین پیش کیا جا چکا تو وی۔ آئی۔ پی سے چند الفاظ کہنے کی درخواست کی ... وی۔ آئی۔ پی نے کہا کہ مسٹر حسین کی زندگی ایک مثالی استاد کی زندگی ہے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی آنے والی نسلوں کی خدمت

میں گزار دی ہے۔ انہوں نے پڑھانے کو صرف ذریعہ معاش نہیں بلکہ اپنی زندگی کا واحد مشن سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طالب علموں سے عقیدت پائی۔ آج جب سکولوں میں ٹریڈیونین کا اثر بڑھ رہا ہے پڑھنا پڑھانا بھی گویا کہ ایک انڈسٹری بن گیا ہے۔ ایسے ماحول میں حسین صاحب جیسے استاد کی موجودگی گویا ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کے لئے ہمارے سکولوں کو سیکڑوں اور ہزاروں حسینوں کی ضرورت ہے اس کے بغیر ہماری ترقی ناممکن ہے۔

اس طرح وہ تقریباً ایک گھنٹہ حسین صاحب کی حقیقی اور خیالی خوبیوں پر بولتے رہے۔ بیچ میں ہیڈماسٹر نے کئی بار ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ وی آئی۔ پی کی تقریر تھی کہ ایک چشمہ جو بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔ بالآخر جب تقریر ختم ہونے کو آئی تو ہیڈماسٹر نے ہمت کر کے وی۔ آئی۔ پی کو سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔

اس پر وی۔ آئی۔ پی صاحب ذرا چونک پڑے۔ ایک لمحے کے لئے وہ رکے اور پھر گویا ہوئے۔ "ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے۔ یہ جلسہ حسین صاحب کے لئے نہیں بلکہ پرساد صاحب کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی حسین صاحب کے تعلق سے کہا ہے وہ مناسب ردوبدل کے ساتھ پرساد صاحب پر بھی لاگو ہوتا ہے۔"

ہمارے جلسوں کی رسمی کارروائیوں اور گھسی پٹی اصطلاحوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی موقع پر بلاخوف و خطر استعمال کی جاسکتی ہیں۔ گویا ایک جامہ ہے جو ہر کسی کو زیب دیتا ہے۔ یہ رسمیں اور کھوکھلے تکلفات ہماری روزمرہ زندگی کا اتنا اہم جز بن گئے ہیں کہ ہم ہمیشہ رسموں کے جنگل میں اصلی درخت کو کھو دیتے ہیں۔ یہ سب تکلف اور رکھ رکھاؤ تضیع اوقات ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ صاحب صدر، مہمان خصوصی اور منتظمین جلسہ حاضرین کے ساتھ ایک قسم کا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔ اس لئے ہم نے تقریباً دو ہزار جلسوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد پچھلے سال یہ تجویز پیش کی تھی کہ تمام خیر مقدی تقاریر، اظہار تشکر اور دوسرے تکلفاتی جملوں اور گھسے پٹے محاوروں کو کوڈ نمبر دے دیا جائے اور اپنی تقریروں کے ان رسمی حصوں کو مقررین کوڈ میں پڑھیں۔ صرف اصلی مواد کو پورے طور پر پڑھیں۔ اردو میں حروف ابجد کا کوڈ تو پہلے سے ہی موجود ہے اس کو اب توسیع دے کر الفاظ اور محاورات ابجد کا کوڈ بنا دیا جائے۔ ہر جلسے میں اس کوڈ اور اس کی چابی کی کاپیاں تمام حاضرین میں پہلے ہی سے تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ مجوزہ کوڈ میں صاحب صدر کے لئے نمبر ایک، مہمان خصوصی کے لئے نمبر دو اور حاضرین کے لئے صفر استعمال کیا جائے گا۔ حاضرین کے لئے صفر کا ہندسہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ حاضرین جلسہ خود صفر ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ جس ہندسے کے ساتھ بھی لگ جائیں اس کی قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس طرح صاحب صدر کی قیمت حاضرین کی موجودگی سے ہی بڑھتی ہے۔

اگر یہ کوڈ منظور کر لیا جائے تو نمونے کے طور پر خیر مقدی تقریر کچھ یوں ہوگی:

ایک، دو، صفر و،

سات دو دو۔ چار بٹا پانچ۔ دو ضرب تین۔ چار۔ پچیس سو پچھتر۔ سترہ۔ نوے۔ بائیس۔ شکریہ۔

اس کا حل یہ ہوگا۔

معزز صاحب صدر، مہمان خصوصی اور حاضرین۔

آج بہت مبارک دن ہے کہ ہم سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ صاحب صدر یہاں کی کلچرل زندگی کی روح رواں ہیں اور اس جلسہ کی صدارت کے لئے ان سے بہتر شخص کا انتخاب مشکل تھا۔ ان کی خدمات سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں ان کا بہت شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگون مصروفیات کے باوجود یہاں آنے کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا ہے ....

وغیرہ وغیرہ۔

مہمان خصوصی کے تعلق سے :

تین سو چار۔ سات بٹا نو۔ چالیس۔

یعنی جو کچھ صاحب صدر کے بارے میں کہا گیا وہ ہمارے مہمان خصوصی پر بھی لاگو ہوتا ہے

اس طرح جناب صدر اور مہمان خصوصی بھی ایک آدھ منٹ میں کوڈ کے ذریعہ اپنے تکلفات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

ہم نے بڑے فخر سے یہ تجویز چند اہم اداروں، لیڈروں اور اخباروں نویسوں کے سامنے رکھی۔ عام طور پر اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ بیشتر اداروں کی طرف سے ہمیں تعریفی خطوط بھی آئے۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ اس تجویز پر ایک آل انڈیا کانفرنس میں غور کیا جائے۔ اس کانفرنس میں ہمیں مدعو کیا گیا اور وہاں ہم نے اپنی تجویز کی تفصیلی طور پر وضاحت کی۔ اس پر بہت بحث ہوئی۔ اس کی شدید ترین مخالفت لیڈروں اور جنتا کی طرف سے ہوئی۔ اور بالآخر تجویز کو بھاری اکثریت سے رد کر دیا گیا۔ اس کی دو اہم وجوہات دی گئیں۔ وہ یہ کہ تقریروں میں سے رسمی اور رواجی لوازمات اور تکلفات کو نکال دیا جائے تو پھر مقررین کو اپنی تقریروں میں ٹھوس مواد ڈالنا پڑے گا۔ اس کے لئے انہیں غور و فکر کرنا پڑے گا جس سے ان کے دماغوں پر بوجھ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ جو ایک خطرناک امر ہوگا۔ اس طرح حاضرین کو بھی خواہ مخواہ سوچنا پڑے گا۔

ہندوستان میں آج ہر چیز پر ٹیکس لگ چکا ہے۔ صرف انسانی دماغ پر ہی نہیں لگا۔ یہ تجویز دماغ پر ٹیکس لگانے کے مترادف ہے۔ جنتا ہرگز ایسی تجویز قبول نہیں کرے گی۔ جس سے اس کو اپنا دماغ کریدنا پڑے۔ جس کو اس نے صدیوں سے محفوظ اسی قسم کے ٹیکس سے بچا کر رکھا ہوا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس تجویز پر عمل کرنے سے لوگوں کا بہت سا وقت بچ جائے گا پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایسے بچائے ہوئے وقت میں لوگ کیا کریں گے۔ تنبیہ کی گئی کہ ہمارا ملک اس وقت ایک نہایت نازک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے بے شمار مسئلے ہیں۔ ایسے بحرانی دور میں ہمارا یہ فرض ہے کہ ایک سچے ہندوستانی ہونے کے ناطے ہم موجودہ مسئلوں کو حل کریں نہ کہ نئے مسئلے پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کئی لوگوں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ تجویز شرانگیز ہے اور ہم امن میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہم نے اس اپیل پر غور کیا۔ یہ دلیلیں واقعی ٹھوس ہیں۔ اتنی ٹھوس کہ ایسی بے وقت تجویز پر ہم نے انتہائی ندامت کا اظہار کیا اور اسے واپس لے لیا۔

صاحبان اب آپ بھی اس تجویز کو بھول جائیں۔

(شگوفہ جنوری ۱۹۸۵)

مسیح انجم

بونتہ



نام ** محمد مسیح الدین ولد ** محمد عظیم الدین
قلمی نام ** مسیح انجم
تاریخ پیدائش ** ۶ / اکتوبر ۱۹۳۳ء
مقام پیدائش ** ویلکٹور، تعلقہ سدی پیٹ، ضلع میدک
تعلیم ** بی۔ اے، بی۔ ایڈ
پیشہ ** درس و تدریس، اکتوبر ۱۹۹۱ کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے
موجودہ مصروفیت ** روزنامہ "رہنمائے دکن" حیدرآباد کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج
تصانیف ** سائیڈ سے چلیے (سن اشاعت ۱۹۷۲ء)
در پردہ (سن اشاعت ۱۹۷۶ء)
چناں چہ (سن اشاعت ۱۹۸۳ء)
طرفہ تماشہ (سن اشاعت ۱۹۹۳ء)

بونتہ!
میرا بونتہ!!
اباجان کا بونتہ!
پنڈلوم ساڑی کا بونتہ!
بونتہ، بونتہ، ایک اور بونتہ!!!

میں بورئیے پر لیٹا مسلسل بڑبڑائے جارہا تھا۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ میرا جسم کپکپا رہا تھا۔ میری بیوی مجھ پر اڑھانے کے لیے گھر کے سارے افراد کے بونتے اکٹھا کر رہی تھی۔ میرے دوست صمدانی قریب ہی کرسی پر بیٹھے، آنکھیں بند کیے، اس طرح لطف اندوز ہو رہے تھے جیسے ریکارڈر سے مہدی حسن کی گائی ہوئی کوئی غزل سماعت فرما رہے ہوں۔ جب بیوی سارے بونتے سمیٹ چکیں اور اڑھانے کیلئے میری جانب بڑھیں تو صمدانی نے فرائض زوجہ کے درمیان حائل ہو کر کہا۔ "بھابی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں! انہیں ڈسٹرب (Disturb) مت کیجئے۔ ان پر شعر کا نزول ہو رہا ہے۔ اگر آپ بونتے اڑھائیں گی تو جو آمد کی کیفیت ہے، ختم ہو جائے گی اور کل کے روز نقاد کہیں گے کہ اس نظم میں "آمد" نہیں "آورد" ہے!"

بیوی نے ڈھیر سارے بونتے اڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں اتنی بھی جاہل نہیں ہوں کہ شاعری اور بحرانی کیفیت میں تمیز نہ کر سکوں۔ دراصل ان پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا ہے اور کپکپی کی وجہ سے بونتے اڑھانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

صمدانی نے شرارتاً کہا۔ "نہیں بھابی! ان پر ملیریا کا نہیں بلکہ جدید شاعری کا حملہ ہوا ہے۔ آپ سن رہی ہیں نا! وزن اور بحر پامالی اور لرزے کی کیفیت یہ سندیسہ دے رہی ہے کہ ان سے ضرور ایک "کھردری نظم" سرزد ہوگی۔!"

بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا شعر کہتے وقت شاعر کو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ اس پر کپکپی بھی طاری ہو جاتی ہے اور دانت بجنے لگتے ہیں؟"

صمدانی نے سمجھایا۔ "ہاں بھابی! اس سے کہیں زیادہ

۔۔ شاعر تو اس قدر بدحواس ہو جاتا ہے کہ تخلیقی کرب کے تحت کبھی لیٹ جاتا ہے اور کبھی اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے البتہ صرف ۔۔ ہاسپٹل نہیں لے جایا جاتا۔"

بیوی نے بھولپن سے سوال کیا۔ "کل تک تو یہ شاعر نہیں تھے۔ یہ ایک دن میں کایاپلٹ کیسے ہو گئی؟"

سمدانی نے میرے خلاف ورغلانے کے لئے کہا۔ "بھابی! کسی کا کیا بھروسہ، انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی اور شاعری میں تو انسان بہت جلد بگڑ جاتا ہے۔ کل سے آپ دیکھیں گی، یہ مشاعرے پڑھنا شروع کر دیں گے ایک ادھ آل انڈیا مشاعرہ پڑھتے ہی اپنے آپ کو قومی امانت کہلوانا پسند کریں گے"

بیوی نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ کا بھی جواب نہیں۔ آپ میری امانت قوم کو دے رہے ہیں۔ اگر واقعی میری امانت شاعری کے چکر میں پڑ کر ہاتھ سے نکل جائے تو قوم انہیں کیا دے گی؟"

سمدانی نے برجستہ کہا "آپ بونتہ اوڑھا دیجئے اور قوم ایک شال سے ان کا ۔۔ کرے گی۔"

میں جو بڑی دیر سے بخار کی بھٹی میں پھنے اور ڈھیر سارے بونتوں کے نیچے کپکپا رہا تھا، بیوی اور بھائی کے مکالمے سن رہا تھا، ۔۔ لرزتا، کراہتے ہوئے بولا۔ "سمدانی! میں تمہاری ساری باتیں سن رہا ہوں، تم میری بیوی کو میرے خلاف ورغلا رہے ہو اور میری بڑبڑاہٹ کو جدید شاعری سے تعبیر کر رہے ہو کیا جدید شاعری بڑبڑاہٹ کا دوسرا نام ہے؟"

وہ بولے۔ "بخار کی حالت میں تم نے جو کچھ "عرض کیا ہے" اس میں کم از کم ایک قسم کا ردھم اور بحر تو ہے، جدید شاعری میں یہ بھی نہیں اگر ثبوت چاہتے ہو تو رسائل پیش کر سکتا ہوں۔"

میں نے زچ ہو کر کہا۔ "تم ٹھیرے ہر لفظ کے معنی لغت میں دیکھنے والے۔ یہ جدید شاعری تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اکیسویں صدی کی نسل بڑی آسانی سے سمجھ لے گی۔"

سمدانی نے طنز کیا۔ "یہ تو ٹھیک ہے لیکن اکیسویں صدی کی نسل کے لئے جدید شاعر کو بیسویں صدی کی اسٹیشنری (Stationary) اور نیوز پرنٹ ضائع کرنے کا کیا حق ہے؟"

میں نے کہا "یار! جب تک تم ابہام کو نہ سمجھ پاؤ گے، جدید شاعری تمہاری سمجھ میں نہ آئے گی۔ اگر میں معنی پہنانے بیٹھوں تو میں نے اس حالت میں جو کچھ "عرض کیا ہے" وہ بھی ایک نظم ہے اور "بونتہ" غریبی کی علامت ہے۔"

سمدانی نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا "تو پھر رضائی امیری کی علامت ہوئی"

میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "بہت خوب! اگر اسی طرح تم روزانہ اسی طرح زاویے سے ادب پڑھنے لگو گے تو دو چار دنوں میں جدید شاعری کو پوری طرح سمجھ پاؤ گے۔ فی الحال مجھ پر یہ کرم کرو کہ کسی میڈیکل شاپ سے ملیریا کے ٹیبلیٹس (Tablets) ۔۔

سمدانی دوا لانے کے لئے چلے گئے۔ مجھ پر پھر کپکپی طاری ہو گئی اور میں پھر بڑبڑانے لگا۔

بونتہ! بونتہ اوڑھاؤ بونتہ!"

غالباً آپ نے بونتہ ضرور دیکھا ہو گا۔ نہیں دیکھا ہے تو جانے دیجئے۔ شاید آپ کا تعلق رضائی، یا "لحاف" سے ہے۔ خیر ہم بتائے دیتے ہیں۔ ساڑی جب وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ کر دی جاتی ہے تو سگھڑ خواتین اسے بونتہ کا روپ دے دیتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ پچپن سالہ مدت ملازمت کو بڑھا کر اٹھاون سالہ کر دیا گیا ہو۔ لیکن اس کے لئے ساڑی پر زور مطالبہ نہیں کرتی! بونتہ کیا ہے؟ یہ جانئے پیاچ ورک (Patch Work) کا نام بونتہ ہے اس کی تیاری میں گھر کے سارے افراد کے پرانے کپڑے استعمال میں

لائے جاتے ہیں ۔ منا کی چڈی ، منی کی فراک ، والد کی لنگی ، بہن کا جمپر ، بیٹے کا پاجامہ ، بھائی کا بشرٹ ، بھابی کا پیٹی کوٹ اور شیر خوار ی پھالیاں ۔ جب یہ ساری فہرست سلیقہ سے ترتیب دی جاتی ہے تو اس پر ساڑی کو اڑھا کر بونتہ سی لیا جاتا ہے یہ بونتہ کہاں ہوا؟ یہ تو ایک ایسا ناول ہوا جس پر ایک خوب صورت مائٹیل کور (Title Cover) چڑھا دیا گیا ہو ۔ یوں بھی بونتہ ایک ایسے ناول کے مماثل ہوتا ہے جس کے محاسن بھی ہوں اور معائب بھی ۔ اس بونتے کا ہر پیاچ (Patch) ناول کا ایک مکمل کردار ہوتا ہے اور ہر کردار ی ایک جیتی جاگتی کہانی بونتے میں سانس لیتی رہتی ہے ۔ مگر سوشیل ریفارمرس (Social Reformers) کو اتنی توفیق کہاں کہ وہ اس ناول کو پڑھیں اور سمجھیں ۔

صوتی اعتبار سے 'بونتہ' کانوں کو بھلا نہیں لگتا ۔ یہ لفظ سنتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے کسی نے آپ کے کانوں کے قریب تاشے کو زور سے بجا کر آپ کی قوت سماعت کو چیلنج کیا ہو ، دیکھنے میں بھی 'بونتہ' بڑے واہیات قسم کا لگتا ہے ۔ "بونتہ" بولتے ہوئے شرم کا احساس دامن گیر رہتا ہے ۔ غریبی نے ہی تو ایسی چیز اگر جناب بونتہ بڑے کام کی چیز ہے ۔ پتھر پر پٹکئے پھٹے گا نہیں ۔ دھوپ میں سکھائیے اس کا رنگ اور نکھر آئے گا ۔ پانی میں بھگوئیے ، وہ ہیوی ویٹ چیمپئین بن جائے گا ۔ بونتے کو دیکھتے ہی دھوبی کا دم نکل جاتا ہے وہ ہاتھ جوڑ کر یہی کہے گا "میں تو باز آیا بونتہ دھونے سے!" جب بونتہ ایسا ہو تو اندازہ لگائیے کہ بونتے کے پروردہ کتنے جفاکش اور محنتی نہ ہوتے ہوں گے!

جہاں تک رضائی کا تعلق ہے ، وہ بالکل چھوئی موئی قسم کی ہوتی ہے ۔ پانی میں بھگوئیے پھیل کر گولہ بن جائے گی ۔ دھوپ میں سکھائیے ، اس کا کلر (Colour) فیڈ (Fade) ہو جائے گا ۔ مختصر یہ کہ رضائی کو بہت جتن کر کر رکھنا پڑتا ہے ۔

ہمارے ملک میں شمال والے 'بونتہ' کو 'گدڑی' کہتے ہیں اور اندھرا کے علاقے والے 'بونتہ' نام بدلنے سے غریبی نہیں بدلتی ۔ اے غریبی تیرے کئی نام!

ایک زمانے سے 'بونتہ' میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا ۔ معاف کیجئے! غلط بیانی سے کام لیا ۔ بچپن ہی سے "بونتہ" میرے تحت الشعور میں چھپا بیٹھا تھا ۔ میں نے بونتے پر آنکھیں کھولیں ۔ ہوش سنبھالا بھی تو بونتہ برابر میرے ساتھ تھا ۔ بونتہ بچھاؤ ، بونتہ اوڑھو ، گھر میں بونتہ ، باہر بونتہ حد ہو گئی اسکول میں بھی بونتہ ، مجھے وہ انگلش کے ٹیچر اکثر یاد آتے ہیں ۔ جو اردو زبان میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور لڑکوں کو مارنے کے لئے بہانے کے متلاشی رہتے تھے ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ اچانک ہم سے اینگلو اردو (Anglo Urdu) میں سوال کیا ۔ "بتاؤ (Yesterday) کسے کہتے ہیں؟"

ہم نے سہل ممتنع میں جواب دیا ۔ "میں کل نہیں آیا تھا"

تو Yesterday کے معنی ۔ میں کل نہیں آیا تھا؟" ٹیچر نے "تھا" پر بہت زور دیتے ہوئے پوچھا ۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی ۔ "سر! حقیقت میں میں کل نہیں آیا تھا"

غصہ سے پوچھا ۔ "کیوں نہیں آئے تھے؟"

"سر! کل بارش ہوئی تھی!" ہم نے قدرت کا سہارا لیا ۔

انہوں نے مادی جواز پیش کیا "چھتری لگا کر آنا تھا!"

"سر! چھتری نہیں ہے!"

"تو کمبل اوڑھ کر آنا تھا!"

کمبل بھی نہیں ہے!"

پیٹھ پر ایک زبردست گھونسہ جڑتے ہوئے فرمایا "ارے کمبخت! تو پھر بونٹہ اوڑھ کر آنا تھا!"

اس حادثہ کے بعد تو مجھے بونٹے سے ایک چڑ سی پیدا ہو گئی چنانچہ میں نے اسی روز اپنی ماں سے شکایت کی "ماں! مجھ سے یہ بونٹہ نہیں جاتا۔ آخر یہ بونٹہ کب تک؟ مجھے تو رضائی چاہیے رضائی!"

وہ اداس ہو کر بولی "بیٹا! میں کب بونٹے کو پسند کرتی ہوں؟ میں تو شادی کے وقت اپنے ساتھ رضائی لائی تھی لیکن بونٹہ میرا مقدر بنا دیا گیا۔ اب تو میرے پاس بونٹے کا ڈپلوما (Diploma) ہے۔ صرف میں ہی کیا، بھارت کی ہر عورت شادی کے وقت اپنے ساتھ رضائی لاتی ہے لیکن مرد اسے بونٹے کی اہل بنا کر رکھ دیتے ہیں!" اور پھر ماں نے بونٹے کے سلسلہ نسب کو خاندان در خاندان اور نسل در نسل گزارتے ہوئے بالآخر دجال سے ملا دیا۔ اور بولی "عنقریب دجال بونٹہ اوڑھ کر آنے والا ہے۔ وہ ابھی بونٹہ سی رہا ہے جیسے ہی وہ بونٹہ سی لے گا، نمودار ہو گا پھر دجال کا فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ خدا نہ دکھائے دجال کے فتنے کو" اور پھر ماں دجال کے فتنے کو دیکھے بغیر "بونٹہ" ہمارے حوالے کر گئی کہ "سنبھالو، یہ پرکھوں کی امانت!"

اسی طرح یہ "بونٹہ" نئی نسل میں منتقل کر دیا گیا! اور ایک دن ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کی پہلی شب ہم نے دلہن سے دریافت کیا "آپ کی کوالیفکیشن Qualification کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ ماں سے بولوں گی۔"

"ارے بھئی! میرا مطلب ہے۔ آپ کہاں تک پڑھی ہیں؟"

وہ بولی۔ "مجھے سینا پرونا آتا ہے اور میں بونٹہ سینا جانتی ہوں، بونٹہ سیوں گی۔ بونٹہ اوڑھاؤں گی۔!"

اس قسم کی کوالیفکیشن رکھنے والی لڑکیوں کی ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہ لڑکیاں خلیجی راستوں کو برآمد کر دی جاتی ہیں۔ وہاں ان کی بڑی مانگ ہے اور یہاں جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم کی مانگ ہے۔

جب بھی میں ایک ہی خاندان کے سارے افراد کو بونٹے اوڑھے سوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بڑی الجھن کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے لیے حماقتوں کا ایک طوفان اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہماری شادی کو ہوئے چند ہی دن گزر رہے تھے شاید دوسری یا تیسری جمعگی تھی۔ ہم سسرال میں موج منا رہے تھے۔ ایک دن "بونٹہ" کے مسئلہ پر بیوی سے تھوڑی سی ناچاقی ہو گئی اور یہ بات سسرال والوں کو بڑی ناگوار گزری۔ سسرال کے سارے افراد ہم سے ناراض ہو گئے۔ اس رات بیوی نے یہی مناسب سمجھا کہ ہم تحمل کیفیت سے گزریں اور تارے گنیں

جب رات کے بارہ بج چکے تو ہمارے پلنگ کے قریب بلی کی آواز سنائی دی رات کے وقت بلی کی آواز ہماری کمزوری رہی ہے ہم نے سوچا کہ بلی سے ڈرتے ڈرتے صبح کرنے کے بجائے خوشامد کر کے بیوی کو منا لینا چاہیے۔ ہم ہمت کر کے دبے پاؤں دالان میں پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہاں کا نقشہ ہی کچھ بدلا ہوا ہے گھر کے سارے افراد بونٹے اوڑھے سو رہے تھے۔ ہمیں یوں لگا جیسے سارے افراد رنگ رنگی ساڑیاں اوڑھے سو رہے ہیں۔ ہم ایک عجیب طرح کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ ہمیں اپنی بیوی کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم میں اتنی قوت شامہ تو ہے نہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے تربیت یافتہ بلڈ ہاؤنڈ کی طرح بو، سونگھ سونگھ کر پتہ لگاتے کہ کس بونٹے کے نیچے ہماری نصف بہتر محو خواب ہے۔ کھٹمل یا مچھر بن کر جگانے سے تو رہے۔ بالآخر اٹکل کو اپنا قطب نما بنایا اور ایک گٹھری نما چیز کو آہستہ سے ہلا کر کہا۔ "اجی اٹھو!"

کٹھری میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور ایک دھیمی آواز سنائی دی "کون؟"

لہجہ پر پہچان گئے کہ وہ ہماری نصف بہتر نہیں بلکہ ان کی والدہ محترمہ ہیں۔ چنانچہ ممناتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم ہم میں ا...
آپ کا غلام ... دامادی کا شرف بخشا گیا ہے۔

وہ کسی قدر تیز لہجہ میں بولیں "اتنی رات گئے کیا کام؟"

ہم نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا "قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا تھا۔ کل کی رنجش کی معافی چاہتا ہوں۔"

انہوں نے مربیانہ لہجہ میں جواب دیا "صبح میں بھی تو حاضر ہو سکتے تھے" ہم نے تڑ سے وہ شعر پڑھ دیا جو زمانہ طالب علمی میں ... مجھے بیت بازی کے مقابلوں میں اکثر سنایا کرتے تھے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

شعر سنتے ہی، مکرر ارشاد کی بجائے "اچھا جاؤ معاف کیا" کے جواب سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔

بونتہ میں اکیلا ہی نہیں اوڑھتا۔ بھارت کے نوے فیصد آبادی بونتہ اوڑھتی ہے۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر، قریہ قریہ، بونتہ والی ہے اور ... کے ساتھ تخلص کی طرح بونتہ لگا ہوا ہے۔ بونتہ، بھومبا، بونتہ برہان الدین، بونتہ رام ریڈی، بونتہ کرشنما، ... بونتہ ... سکیم۔ چنانچہ الیکشن کے زمانے میں ہمارے لیڈر اسی بونتہ کو بنیاد بنا کر ووٹ مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ بعض ... لیڈر اس طرح اوڑھ لیتے ہیں کہ ان کی صورت تک دکھائی نہیں دیتی اور وہ مجسم بونتہ بن جاتے ہیں۔ میں اس قسم کے لیڈر کو ... دیکھتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں کیونکہ اس بونتہ کے اندر دجال چھپا ہوتا ہے۔ لیکن عوام اس کو پہچان نہیں پاتے لہذا وہ اس کا ... دیتے ہیں۔ دجال کا قافلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جلوس نکلتے ہیں۔ نعرہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔

جیتے گا بھئی جیتے گا بونتے والا جیتے گا

اور پھر دجال الیکشن جیت جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اقتدار پر آجاتا ہے فوراً بونتہ کو جھٹک دیتا ہے اور رضائی اوڑھ لیتا ہے۔ "تخت ... بونتہ ... نارائینا کی جائے گی ستیہ نارائینا کی نیم پلیٹ (Name Plate) لگاتا ہے۔ اب اس کو عوام سے کٹے ہوئے ... نہیں رہتے ... کی بات ہوئی۔ عوام کی سیدھی سادی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی مادری زبان کو بھول جاتا ہے اور اقتدار کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے۔ یہیں سے ترسیل کا المیہ شروع ہو جاتا ہے۔ عوام اپنی مادری زبان سیدھی سادی اردو زبان میں اپنا حق مانگتے ہیں ... روٹی، کپڑا اور مکان

وہ اقتدار کی زبان میں جواب دیتا ہے

اپڑی تپڑی، پوتی کا پان

یہ زبان عوام کی سمجھ میں نہیں آتی ... صحافت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے یہ گرہ لگاتی ہے۔

پکڑو اپنے لیڈر کے کان

اس طرح اصناف سخن میں تین مصرعوں والی نظم "تپائی" کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

روٹی کپڑا اور مکان
اپڑی تپڑی پوتی کا پان
پکڑو اپنے لیڈر کے کان

پکڑو اپنے لیڈر کے کان

عوام اس "تپائی" کو اپنا نعرہ بنا کر لیڈر کی طرف لپکتے ہیں جس کے نتیجہ میں مڈٹرم الیکشن (Mid Term Election) ہو جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر وہ لیڈر بونتے والوں کی صف میں آکھڑا ہوتا ہے اور پھر بونتہ کا یا عمل میں آتا ہے۔ اس وقت تک سوجھ بوجھ کافی اچھی ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی پریس رپورٹر اس سے پوچھے کہ بتائیے اس دنیا میں عارضی کیا ہے

لیڈر کا جواب ہو گا۔ رضائی!"

Permanent

ہو دے گا بونتہ

بونتہ زندہ باد!

بونتہ پائندہ باد!







شفیقہ فرحت

مختصر مختصر خط



تاریخِ پیدائش ** ۲۶ / اگست ۱۹۳۱
مقامِ پیدائش ** ناگپور، مہاراشٹر
والد کا نام ** محمد رستم خاں
تعلیم ** ایم۔اے (اردو) ایم۔اے (فارسی)
ڈپلوما ان جرنلزم، پی۔ایچ۔ڈی
ملازمت ** یکم ستمبر ۱۹۹۱ء کو بحیثیت پروفیسر و صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ حمیدیہ کالج، بھوپال سے ملازمت سے سبکدوشی
تخلیقات ** لو آج ہم بھی ۱۹۸۱، رانگ نمبر ۱۹۸۶
گول مال ۱۹۸۸، بچوں کے نظیر آبادی، چوں چوں بیگم (بچوں کے لئے کہانیاں) نظیر اکبر آبادی، شخصیت اور شاعری (ہندی)

اے میری یعنی ڈیش ڈیش۔ محبوب!

مجھے آپ کی شادی خانہ بربادی کی زرین و منقش اطلاع۔ کوئی خاص غم نہیں ہوا کیونکہ آپ ایکس یعنی "واحد غایب (X" تو ہو ہی چکی تھیں۔

سچ تو ہے میں بھلا کب تک انتظار کرتا۔ برادرم مجنون بھی دو سال میں دیوانے ہوگئے تھے۔ اور برادرم فرہاد سلمہ، تو بالکل بودے نکلے چند مہینے بھی ہجر کی سختیاں نہ برداشت کر سکے اور ا۔ جھوٹی خبر کو دانستہ موت کا بہانہ بنالیا۔۔

تو میرا خیال ہے کہ عاشقی کی اس پوری تاریخ میں بلکہ تا سے پہلے والی تاریخ میں بھی اس سے زیادہ طویل انتظار کا ذکر چ اور دوربین اور خوردبین سب کچھ لے لے کر ڈھونڈنے کے باد کہیں نہیں ملتا۔

اور چونکہ عاشقی کی تاریخ عرف اتہاس شاعری کے علاوہ کہیں ملتی اور بے چارے شاعر حساب کتاب کیا جانیں۔ شب ہجر کے بارہ گھنٹوں کو تو وہ ناپ نہیں سکتے۔ پھر بھلا باقاعدہ ATE (WISE انتظار کی ان سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے اور یور وہ اس سلسلے میں بڑے عجیب و غریب سرکاری و غیر سرکاری بیا دیا کرتے ہیں۔ سند کے طور پر لیڈر آف دی ہاؤس یعنی شاعر مرزا غالب کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

(کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب

تو ثابت ہوا کہ عاشقی اور انتظار کا دم بھرنے وا سارے کے سارے شاعر اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں کی وجہ سے کوالیفائیڈ ہو جاتے ہیں۔ اور اس تنگ و تاریک میدان' خاکسار اکیلا ہی ڈٹا رہتا ہے۔ لہٰذا میں ہی (خود اپنی رائے اور خو فیصلہ کے مطابق) ریکارڈ ہولڈر ہوں۔ (ویسے اب ہولڈر وں بیل گاڑی اور مال گاڑی میں لد کے کوچ کر چکا ہے اور اب پن اور بال پن کی حکمرانی ہے!) میرا یہ انتظار یقیناً دنیا کا سب طویل انتظار ہے۔!!!

نوکری کے لئے درخواست دیجئے سال، دو سال جوا بآئے تو آٹومیٹک ریجکشن مان لیا جاتا ہے راشن کے کیو میں کھڑے ہو جائیے سات آٹھ گھنٹے بعد "مال ختم" کی تختی طلوع ہو کر آپ کو غروب ہو جانے کی بشارت دے دیتی ہے۔

امتحان دیجئے۔۔ سال چھ مہینے میں بھلا برا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل ہی آتا ہے! بلکہ اس طویل عرصہ میں تو سرکاری فائلیں تک اپنی اپنی منزل کی طرف رینگنا شروع کر دیتی ہیں۔!! اور آپ ہیں کہ سرِ نازک کو نہ مشرق سے مغرب کی جانب جنبش دیتی ہیں نہ شمال سے جنوب کی جانب!!

تو پھر آخر میں کب تک آپ کی ویٹنگ لسٹ میں منتظر رہتا!!!

یہ کوئی پبلک اسکول یا کار کا رجسٹریشن تو تھا نہیں کہ جہاں بچے کے پیدا ہوتے ہی نمبر لگا دیا جاتا ہے اور اس کی نوکری کے پانچ سال بعد اسے کار نصیب ہو جائے اور اسے نہ ہی اس کے بچے کو ہی اس شہرت یافتہ اسکول میں داخلہ مل جائے!!

اس عشق و عاشقی جیسے غیر ضروری اور قبل مسیح یا PRE HISTORIC AGE والے کاموں پر تو لوگ کم سے کم وقت صرف کرتے ہیں۔ سو اس اعتبار سے مجھے اور کچھ نہیں تو صبر کا پھل تو ملنا ہی چاہیئے۔!!

اور صاحب سنتے ہیں کہ بارہ برس میں تو گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں سو اس خوف سے کہ لوگ باگ مجھے گھورا نہ سمجھ لیں میں نے ہوش و حواس کے ساتھ اور بغیر کسی زور زبردستی کے خود اپنی مرضی سے گیارہ برس گیارہ مہینے اور گیارہ دن بعد آپ کی محبت سے دستبردار ہو گیا۔!

حضرت ذہین ذلیش صاحب اب اس خیالِ خام سے خوش ہونے کی ناکام کوشش نہ کیجئے کہ مجھے ان گیارہ سال اور گیارہ مہینوں اور دنوں کے ضائع ہونے کا افسوس ہو رہا ہے۔ کم از کم میں کوئی عقل کا اتنا کورا تھوڑا ہی ہوں جتنا نظر آتا ہوں تو ایک بڑھنے سے پہلے اور بعد از اسلام کے بزرگوں کا ایک نکتہ پلو میں باندھ لیجئے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں (چودہ کیرٹ کا بھی نہیں) اور ہر احمق دکھائی دینے والا بے وقوف نہیں۔!

تو غرض یہ تھا کہ میں عقل کا کورا نہیں لہذا انتظار کے اس عرصے کے ایک ایک لمحے کو کام، دفتر، سیر تفریح، پکچر دیکھنے اور راشن کی لائن میں کھڑے ہونے سے بچ رہا تھا۔ اس ہر لمحے کو میں نے اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اگر بابائے گنیس بک کو خبر لگ جائے تو وہ اس خاکسار کو اپنا اعزازی چیئرمین بنالیں۔!!

سو وہ کونسا کام ہے جو اس طویل عرصے میں، میں نے نہیں کیا۔ آپ کو سنانے کی خاطر ڈھیروں اچھے برے شعر یاد کیے جنہیں آپ نے تو کبھی سننے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ لیکن جس کی بدولت میں ہر محفل کی روحِ رواں (درجہ دوم) تسلیم کیا جانے لگا میری رسائی بڑے بڑے لوگوں تک ہو گئی۔ کیوں کہ میرے پاس ہر موقع کے لئے بے موقع شعر موجود تھے۔ بڑی ریاضت اور محنت سے اچھی اچھی ناولیں اور سنجیدہ ثقیل ادبی کتابیں پڑھیں بلکہ لغت تک حفظ کر لی تاکہ آپ پر میری قابلیت کا سکہ جم سکے۔ وہ تو مجھے وقت پر عقل آگئی ورنہ اب تک پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی لی ہوتی!! آپ کو لاتعداد خط لکھ لکھ کر نہ صرف میری ہینڈ رائیٹنگ خوبصورت ہو گئی بلکہ فرصت کے اوقات میں خوشنویسی کرکے چار چھ روپے کمانے لگا بلکہ آڑے ترچھے افسانے بھی لکھنے لگا جنھیں سارے ادبی اور غیر ادبی رسالے بڑے ذوق شوق سے چھاپنے لگے۔ الغرض کہاں تک گنواؤں۔۔ ابتدائے عشق میں رونے دھونے کے جانے (کہ رونے کے سبب آنسو تھا نہ نل میں پانی۔۔!) میں نے فرنچ کاڑ پلوما لے لیا۔ کیوں کہ ان دنوں آپ فرنچ پڑھنے جایا کرتی تھیں۔! اور پھر یہ ہوا کہ اپنی بالکونی میں بیٹھ کر آپ کی راہ تکتے تکتے (گو کہ یہ نہ کوچہ رقیب تھا نہ گذر گاہ خیال۔۔!) میں نے ستار سیکھنا

شروع کر دیا چار پانچ سال اس میں نکل گئے۔ پھر پینٹنگ کرنے لگا اور اپنے چہیتے بلے کی دم کو رنگ میں ڈبو ڈبو کر وہ وہ شاہکار بنا
کہ سارے جدید آرٹسٹ دنگ رہ گئے۔ بلکہ بعضوں نے تو خود کشی کے بھی خوبصورت پروگرام بنا ڈالے۔۔ آپ کی خاطر میں
کہ جیسے اسٹو جلانے بلکہ بجھانے تک کی تمیز نہ تھی نہایت اعلیٰ درجہ کی کافی عرف دیسی اسپرلیسو اور بے انتہا لذیذ اور خستہ اور ہر
کباب بنانے لگا اور شکر ہے کہ اسی کے طفیل لندن میں دو سال عیش سے گذر گئے۔۔

جی ہاں حضور! بندے نے خاص شہر لندن میں کباب پراٹھوں کا خوانچہ لگایا تھا۔۔!

تو گھاٹا تو اس عشق میں مجھے کسی قسم کا ہوا نہیں بلکہ دو چار پوائنٹس (POINTS) اپنے ہی فیور (FAVOUR) میں
ہیں۔۔ پھر رنج کیا اور کہاں کا نوحہ۔۔ اور یہ تو مجھ پر روز اول سے ہی روشن تھا کہ حضور کی شادی میرے بجائے کہیں اور ہوگی
مجھے شکایت کیوں ہو۔۔ مگر اے میرے ڈیش ڈیش۔ محبوب مجھے شکایت اس بات کی نہیں کہ تو نے شادی کر لی (انداز تخاطب میں
کری کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔۔!) نہ اس بات کا شکوہ کہ کہیں اور کر لی۔۔ ویسے اس سلسلے میں ایک فی البدیہہ اور حد درجہ جدید نظم
ہے ملاحظہ فرمایئے۔ اور ذرا دل کھول کے داد دیجئے۔۔!

اے میری محبوب
میں یہ تو نہیں کہتا تجھ سے
کہیں اور ملا کر مجھ سے
کیونکہ۔؟
تو ملتی ہی کب تھی مجھ سے۔!
اے میری محبوب
میں یہ تو نہیں کہتا تجھ سے
کہ تو شادی کرتی مجھ سے
کیونکہ۔۔!
تو پیار کرتی ہی کب تھی مجھ سے۔!!

ہاں تو شکایت صرف اتنی ہے، کہ جہاں تو نے تیرہ سال گذارے تھے وہاں چار دن اور انتظار کر لیا ہوتا (میرا نہیں اپنے ہونے والے کا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے اپنے بارہ اور تیرے تیرہ سالوں کا کوئی غم نہیں۔ ان بارہ تیرہ برسوں کے ڈبل ٹرپل سبھی کھاتوں
تو نفع ہی نفع ہے۔۔ اتنا نفع کہ ڈر ہے کہیں ٹیکس نہ لگ جائے۔ اگر ہائے یہ چار دن۔۔!

قسمت کی خوبی دیکھیئے، ٹوٹی کمند کہاں۔۔

ہائے کیا تیرے لئے موسم سرما کے یہ چھوٹے چھوٹے چار دن، ہمالین رینج کی چوٹیوں کی طرح ناقابل عبور تھے۔ تو نے میرا نہیں
اپنا ہی خیال کیا ہوتا اے ناداں تو ہی سوچ اس ستائیس (۲۷) تاریخ کو ہم تجھے شایان شان تحفہ دینے کے لئے پیسے کہاں سے لائیں۔۔!!

تنخواہ ملنے میں پہاڑ جیسے پورے چار دن! بنک میں مبلغ بارہ (۱۲) روپے پینتالس (۴۵) پیسے۔۔۔! اور لین دین اور ادھار
کھاتے کا یہ عالم کہ ممکن ہوتا تو بازار سے برقع اوڑھ کر گذرتے۔!

پھر فرمایئے۔۔ یہ میری آن اور آپ کے سال کا نقصان ہے کہ نہیں۔۔۔ خیر آئندہ احتیاط برتیئے گا۔۔

پرویز یداللہ مہدی

چہ خوب



نام ** سید یداللہ مہدی حسینی
قلمی نام ** پرویز یداللہ مہدی
تاریخ پیدائش ** ۲۱ / جون ۱۹۴۳ء
مقام پیدائش ** حیدرآباد ، دکن
پیشہ ** فری لانس جرنلسٹ (فلم رائٹر)
تصانیف ** (۱) چھیڑچھاڑ (مزاحیہ مضامین)
(۲) چوڑی کے غلام (مزاحیہ مضامین)
(۳) تو تو میں میں (مزاحیہ ڈرامے)
(۴) مائیں مائیں فش (مزاحیہ مضامین)
(۵) کچوکے (مزاحیہ مضامین)

" کتے ' سے ، ہشیار ، بلکہ خبردار "

کسی بدنصیب کے " سیاہ بخت " کی طرح " ڈالی تختی پر سیاہی مائل اجلے " جلی حرفوں " میں منہ چڑاتی بلکہ بندوق کی گولی کی طرح سنسناتی اس " وارننگ " سے ہم پر ایسا لرزہ طاری کیا کہ جب ، عقب سے کسی نے اچانک یہ ہانک لگائی

کون ہیں بابو صاحب آپ "؟"

تو ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا " سا " !!

" جی ی ی " جواب میں اس شخص نے کتے کی طرح اپنی لمبی سی جیب باہر نکالی " " دو قدم پیچھے ہٹکر ایسی تشویشناک نظروں سے ہمیں گھورنے لگا جیسے اگلے کسی پل ، ہم سے بھونکنے بلکہ کاٹنے کی حرکت بھی سرزد ہو سکتی

نووارد ، اپنی ہیئت ، حلیۓ اور ہاتھ میں لٹکے سبزی کے جھولے سے گھریلو ملازم معلوم ہوتا تھا قبل اس کے کہ ہمارا کتا چھاپہ مکالمہ ، اسے سر پر ، پیر رکھ کر بھاگنے کی صلاح دیتا ہم نے حرف مدعا بیان کیا یہاں نواب اکبر الدین جلالی پنج ہزاری ، کہاں رہتے ہیں "؟"

یہ جو داہنے ہاتھ کو نیلا بنگلہ نظر آرہا ہے ، انہی کا ہے " اس نے ایک بنگلے کی سمت اشارہ کیا۔

شکریہ اب ذرا اتنی بات اور بتانا ، کیا نواب صاحب کے ہاں بھی کتا نام کی خطرناک ، چیز پائی جاتی ہے ' ہمارے اس استفسار پر شخص مذکور کی باچھیں کھل گئیں ۔ اپنی میلی بتیسی کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے بڑی رازداری سے فرمایا

" یہ جو تختی آپ دیکھ رہے ہیں ، اسے اصل میں نواب صاحب کے پھاٹک پر ہونا چاہیئے تختی والا کتا انہی کے ہاں تو پڑا رہتا ہے دن رات

ارے باپ رے " ہم جھرجھری لے کر رہ گئے ، پھر مزید معلومات کے لئے پوچھا " میاں یہ تختی والا کتا صرف تختہ ہے ۔ میرا مطلب ہے صرف بھونکتا ہے یا کاٹتا بھی ہے "؟"

"ارے سرکار کتا اگر بھونکے نہیں، کاٹے نہیں تو پھر کتا کیوں کہلائے ۔ ا"

"ایک آخری سوال اس کتے نے اب تک جن جن کو کاٹا ہے، وہ تمام بدنصیب کیا ابھی تک زندہ ہیں ؟"

ہمارے اس سوال کا جواب بڑا انوکھا ملا ۔ ملازم بہاشے ہنستے ہوئے سامنے والے پھاٹک میں داخل ہوگئے انہیں ہما... ہماری صحیح الدماغی پر کچھ شبہ ہو چلا تھا ۔

ہم دل ہی دل میں جوش کی ایک پرجوش رباعی کی " بے حواس و ہوش " پیروڈی کرتے ہوئے " نیلے بنگلے " کی طرف قدم بڑھا... لگے ۔

سو بار جہنم میں جلانا یا رب
منظور ہو ، سولی پہ چڑھانا یا رب
اک دو نہیں ، لگتے ہیں انجکشن چودہ
نا چیز کو کتے سے بچانا یا رب

پھاٹک کھلا ہوا تھا

راہداری اور سامنے والے سرسبز و شاداب " باغیچے " میں دور، دور تک نہ کتا تھا نہ اس کا سایہ، پھر بھی ہم نے پھونک پھونک... قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے تک کا فاصلہ طئے کیا۔ دروازے پر پہنچ کر ،قدم اٹھانے کا سلسلہ تو رک گیا لیکن پھونکنے کا سلسلہ کچھ د... چلتا رہا ۔ اس " پھونک " کا تعلق قدموں کی " اٹھک بیٹھک " سے نہیں بلکہ " جھاڑ پھونک " سے تھا ۔ اپنی دانست میں ہم نے "... کے ہمارے " سگ رسیدہ " آفات و بلیات کی حد بندی کر دی تھی

" اطلاعی گھنٹی " پر انگلی کا دباؤ پڑتے ہی ، کہیں دور گھنٹی کی آواز کے ساتھ " کتے " کی غراہٹ بھی گونج اٹھی ۔ یوں لگا جیسے "... دوسرا سرا کتے کی آواز کے " ٹیپ " سے ملا ہوا تھا ۔ بٹن دباتے ہی چالو ہو گیا لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی ، وہ کتے کی آواز کا ٹیپ نہیں بلک... اصلی اور ہٹے کٹے ، کتے کی بہ نفس نفیس غراہٹ تھی ، جو اب ہمارے روبرو " نتھنے پھلائے ، جبڑے کھولے کھڑا ، اوسان کے پردے "... ہمارا بہت کچھ " قطع " کیے دے رہا تھا ۔

ویسے بھی ہمیں ہر کتا بلکہ ہر پلہ ، شیر کا ہم پلہ نظر آتا ہے ، چاہے اپنی گلی کو ہو یا دوسری گلی کا برخلاف اس کے " چڑیا گھر "... غراتا بلکہ دہاڑتا ہوا شیر بھی " مٹی کا شیر " نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ جو زبردست " جبڑوں " والا " چوپایہ " اس " دوپائے " کے روبرو کھڑا " انتظار... نظم " سنا رہا تھا وہ " شیر " بلکہ " سوا شیر " نظر آتا تھا ۔ جب کہ ہماری حیثیت اس کے سامنے سوا سیر بلکہ " سیر " بھی نہیں تھی ۔

وہ تو اپنے فرشتے " آن ڈیوٹی " تھے جو فوراً یہ بات ذہن رسا میں آگئی کہ اگر کوئی کتا مقابل میں ڈٹ کر بھونکنے لگے خود بھونکنے... بھاگنے کی کوشش کبھی مت کرنا ۔ چنانچہ کتا بھونکتا رہا ، ہم نے بھول سے بھی بھونکنے یا بھاگنے کی کوشش نہیں کی اس سے پہلے کہ چار پاؤں... اور ایک ٹیڑھی دم والا ۔ یہ " بادل " گرجنا ملتوی کر کے ہمارے جسم کے کسی حصے پر اچانک برس پڑتا ، ایک مترنم آواز سماعت سے ٹکرائی

" کم بیک سوئی " (Come Back Sweety) " ا "

آواز اس قدر میٹھی اور سریلی تھی کہ ہمارا جی چاہا ، آواز کی سمت بے تحاشہ بڑھ جائیں لیکن اس مقابلہ میں بھی کتا ہی ، ہم سے بازی لے گیا ۔ یعنی دم ہلاتا ہوا اندر غائب ہو گیا ۔ اور ہم محض ہاتھ بھر کی " دم " کے نہ ہونے سے کتے جیسی حقیر مخلوق سے مات کھا گئے ، کاش ڈارون کی تھیوری ، کے مطابق انسان جو پہلے " بندر " تھا آج بھی بندر ہوتا ۔ اپنی اس شکست کا غم بھلانے کے لئے ہم اس ترنم ریز آوا...

ے متعلق سوچنے لگے جس کی لہروں پر ڈولتا، کچے دھاگے سے ۔ ھاکتا، کشاں کشاں اندر تک ہو لیا تھا۔

آواز تھی یا فروٹ سلاد، رس ملائی، قلاقند، گل فردوس وغیرہ وغیرہ کا چٹخارہ ۔ سنا تھا کہ میٹھی مترنم آوازیں صرف کانوں میں رس گھولتی ہیں، مگر آج پہلی بار محسوس ہوا کہ کچھ آوازوں میں چٹخارے دار "ذائقہ" بھی ہوتا ہے

کون ہے باہر ۔ ؟" جل ترنگ، بلبل ترنگ، قاش ترنگ، پتہ نہیں اور کون کون سے ترنگ پھر بج اٹھے ۔ آواز کی اس ترنگ" نے آنکھوں میں دیدار اور دل میں پیار کی "امنگ" کو ہولے سے جگادیا ۔ تار پھر جھنجھنائے ۔ "کیا چاہیئے "

ی آپ ۔ ا" دل کی "امنگ" فضا میں "پتنگ" کی طرح بے ساختہ زبان پر لہرا گئی ۔ ا

کیا کہا ۔ ؟" اس بار لہجے کی مٹھاس میں ہلکی سی ترشی بھی شامل تھی ۔ ہم پر کتے کی ہیبت اس ۔ طاری تھی کہ کچھ کا کچھ بک رہے تھے ۔ اس سے پہلے کہ یہ سلسلہ سوال و جواب کسی خطرناک موڑ کی طرف مڑتا، ایک عدد "ڈاڑھی زدہ" مسمی صورت نظر آئی

ماہیے کس سے ملنا ہے ۔ "؟"

۔۔۔ وں کی ملکہ سے ، جس کی آواز میں شہد کی گھلاوٹ، لہلہاتے سبزہ زاروں کی نمی، معطر ہواؤں کی خوشبو، ساحل سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی کنواری موجوں کا "دھیما دھیما" شور، خوش الحان پرندوں کی سرگوشیاں ۔ اور ۔ اور "

احساسات کی خاموش زبان نے اچھا خاصہ "بھاشن" دے دیا، لیکن سامنے والی پارٹی، بالکل کوری، نکلی ۔ بلکہ نو وارد موصوف تو اپنی ڈاڑھی سمیت ہمیں کچھ ایسی متذبذب نظروں سے گھور رہے تھے جیسے اگلے کسی بھی پل ہماری دماغی حالت مشتبہ قرار دے کر اپنی دکان بڑھالے جائیں گے ۔ ہم نے حالات کو یوں بگڑتا دیکھ کر دل کے "جزیرے" کی کابینہ میں فوراً رد و بدل کرکے وزیر احساسات سے "آرزوؤں اور تمناؤں" کا قلمدان چھین لیا ۔ اور پھر اصل موضوع کی طرف لوٹ آئے ۔ یعنی لہجے میں پورا انکسار پیدا کر کے کہا ۔ "نواب صاحب قبلہ سے شرف ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ "

"آئیے تشریف لائیے ۔ قدم رنجہ فرمائیے ۔ "

ہمیں ایسے ترکی بہ ترکی بلکہ "ترکی بہ ترکا" جواب کی توقع نہیں تھی ۔ بڑے میاں کا طمطراق اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ موصوف یقیناً نواب صاحب قبلہ کے "منہ چڑھے ناک کے بال" ہیں ۔ "

ملازم مہاشے ہمیں جس سجے سجائے کمرہ میں چھوڑ گئے تھے وہ یقیناً ڈرائنگ روم" تھا اس اعتبار سے کہ دیواروں پر چاروں طرف ڈرائنگ " کے ایسے " نمونے " ٹنگے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر ہماری "مانگیں" لرزنے لگیں ۔ ماقبل تاریخ سے مابعد تاریخ تک کے ہیبت ناک و عبرتناک مناظر کا اس قدر بھرپور احاطہ ایک محدود حدود اربعہ میں پہلی مرتبہ نظر سے گزرا ۔ "آرٹ" کے پردہ میں "جہنم کی آگ" کی لپیٹیں محسوس کرکے کسی بھی شریف آدمی کی عاقبت خطرے میں پڑ سکتی ہے ۔ پھر یہاں تو آرٹسٹوں کے یہ کارہائے نمایاں" پیشہ ور واعظ حضرات کی تقاریر سے کہیں زیادہ تاثیر کے حامل نظر آتے تھے ۔ لگتا تھا، مولانا ہیبت عالم ادیب کامل، منشی فاضل فارغ التحصیل، جامعہ خطابیہ کی "قیامتی تقریروں" نے "تصویروں" کا روپ لے لیا ہو ۔ ہر "فریم" سے مولانا جھانکتے نظر آئے ہونٹوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ کا زہر تھا آنکھوں میں وہی حقارت کے تیر جنہیں گنہگار بندوں پر برسا کر موصوف "ثواب دارین" لوٹا کرتے ہیں

مولانا ہیبت کے تصور ہی نے ہم پر ہیبت طاری کرائی تھی اور پھر جب اچانک عقب سے مولانا کی بھاری بھرکم آواز بھی سنائی دی ۔ تو ہم مشینی انداز میں پلٹے، ویسے ارادہ تو بہ یک بینی دو، گوش لپکنے کا تھا ۔ لیکن روبرو، مولانا ہیبت عالم کے بجائے کسی اور کو دیکھ کر جان میں جان آئی ۔

نووارد حبثہ کے اعتبار سے یقیناً مولانا کے ہم پلہ تھے فرق صرف ڈاڑھی کا تھا، یعنی وہاں ڈاڑھی کی کھیتی باڑی تھی اور یہاں میدان ایک دم صاف نظر آیا ۔

غالباً اس وقت ہمارے سامنے، نواب صاحب قبلہ و کعبہ کھڑے تھے، بھاری بھرکم لحیم شحیم قدآور شخصیت، بھاری بھرکم آنکھوں پر بھاری بھرکم شیشوں والا چشمہ، بھاری بھرکم ہونٹوں میں دبا ہوا بھاری بھرکم پائپ، بھاری بھرکم ہاتھ میں بھاری بھرکم کتاب (شاید الفاظ شماری کا بھاری بھرکم نسخہ تھا) اس پر آواز بھی بھاری بھرکم ۔

"جناب کی چہ، خوب ؟"

"جی .... ی ۔ ی ۔ ااا" ہم گڑبڑائے، بات ہمارے پلے بالکل نہیں پڑی ۔

"چہ خوب، یعنی تعریف جناب کی تعریف" نواب صاحب نے وضاحت کی ۔ لیکن ڈھیر ساری بھاری بھرکم چیزوں کو ایک ہی وجود میں یکجا دیکھ کر ہم پر اس قدر بوکھلاہٹ طاری ہو چکی تھی کہ جواب میں ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ والد صاحب قبلہ کا دیا ہوا سیل بند لفافہ جیب میں سے نکالا اور اس پھرتی سے ان کے حوالے کر دیا جیسے لفافہ نہ ہو "سانپ" ہو ۔

"جی یہ میری تعریف"

"چہ خوب" اس بار بھاری بھرکم لہجے میں بھاری بھرکم حیرت بھی شامل تھی "تو یہ لفافہ جناب کی چہ خوب ہے ۔"

"جی ہاں جی نہیں بلکہ یہ لفافہ دراصل آپ کی، میرا مطلب ہے اس لفافے میں جو تعریف ہے وہ" ہمارا جملہ پھر ادھورا رہ گیا ہماری بوکھلاہٹ پورے شباب پر تھی موصوف نے پائپ کو چباتے ہوئے پہلے تو ہمیں گھورا پھر لفافے کو یوں گھورنے لگے جیسے "لفافہ بم" ہو کھولتے ہی پھٹ پڑے گا ۔ پھر کٹکھنے لہجے میں بولے "تشریف رکھو چہ خوب ۔"

ہم یوں صوفے کے ایک سرے پر ٹک گئے کہ سارا وزن ٹانگوں ہی پر تھا ۔ اسی پل وہی خونخوار سگ لیلیٰ یعنی لیلیٰ کا سگا جس نے کچھ دیر پہلے غرا کر ہمارا استقبال کیا تھا، نہ صرف دوبارہ نمودار ہوا بلکہ نتھنے پھلا کر "سنگیت سمیلن" کے دوسرے دور کی تیاری بھی شروع کر دی ۔

اس دوران میں، قبلہ چہ خوب لفافہ چاک کر چکے تھے اور اب ان کی بھاری بھرکم نظریں تحریر پر جمی ہوئی تھیں ادھر کتے کا الاپ "مدھم" سروں سے "پنچم" کی طرف بڑھ رہا تھا، ادھر "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد شریف تیز ہوا تھا کہ اچانک ایک "خونخوار قہقہہ" بلند ہوا، جو کسی صورت کتے کا نہیں ہو سکتا تھا، قبلہ چہ خوب کے اس زندہ دل بلکہ "درندہ دل قہقہے" نے ہمیں پھر سے کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا پائپ کو چبانے اور چوسنے کے ملے جلے عمل کو دہراتے ہوئے ۔ موصوف ہمیں یوں متحیر انداز سے گھور رہے تھے جیسے اچانک ہماری "جنس" تبدیل ہو گئی ہو ۔ ہم نے گھبرا کر پہلے اپنے چہرے پھر سینے پر ہاتھ پھیرا کہ واقعی کہیں کوئی "گھپلا" تو نہیں ہو گیا اور ابھی اس ذہنی جھٹکے سے نجات بھی نہیں ملی تھی کہ موصوف نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے ہمارے کندھے پکڑے اور شروع ہو گئے "گدھے، نالائق، پاجی، بدتمیز، چہ خوب اٹھائی گیرے گیٹ آؤٹ ۔"

دراصل ہمارے کان بج رہے تھے، ورنہ حقیقت اس کے برعکس تھی قبلہ چہ خوب نے تو ہمیں کندھوں سے پکڑ کر اس زور سے اپنے سینے سے بھینچا کہ یوں محسوس ہوا جیسے ہمیں اپنے آپ میں "ضم" کر لینا چاہتے ہوں بھاری بھرکم زبان مبارک بھی برابر چل رہی تھی "اماں کل ہی کی بات، اتنے سے تھے تم اور اب چہ خوب، اپنے باپ کے بھی کان کاٹتے ہو گے، خدا بد نظر سے بچائے ۔"

موصوف نے ہمیں بمشکل اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے ایک زوردار دہاڑ لگائی... "شمو ذرا ادھر تو آنا، دیکھو چہ خوب

اے ہیں۔

ابھی آئی ابو " جواب میں پھروہی، فروٹ سلاد، رس ۔ گی قلاقند، گل فردوس کا ملا جلا چٹخارہ

ہم نیم مردہ حالت میں صوفے کے کونے پر ٹک کر لمبی سانسیں لینے لگے بلکہ ہچکی سانسیں گننے لگے

کچھ توقف کے بعد پردہ ہٹا اور ایک دراز قد چنچل شریر آفتابی، ماہتابی، پھلجڑی، مسکراتی جو یقیناً مسٹر اینڈ مسز چچہ خوب کی ۔ ۔ کی مشق سخن کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ مطلع سے مقطع تک ہر شعر لاجواب تھا۔ اس " حاصل مشاعرہ " بلکہ " مشاعرہ لوٹ " غزل کو ۔ ۔ پاسبان عقل اور ۔ کاروان دل " کے مابین حسب عادت کھینچا تانی شروع ہو گئی، پاسبان عقل کی وہی گھسی پٹی نصیحتیں اور ۔ ۔ دل کا وہی باغی انداز۔

" بھئی شبو، یہ ہیں تمہارے پرویز انکل کے چچہ خوب شہزاد سلمان " قبلہ چچہ خوب نے یک طرفہ تعارفی کارروائی مکمل کی اور ۔ ۔ ری طرف کا آغاز کیا۔

اور برخوردار، یہ ہیں، ہماری چچہ خوب شاذیہ شبنم عرف شبو " شاذیہ شبنم عرف شبو نے مسکراتی شریر آنکھوں سے سلام کیا ۔ ہم نے بوکھلاہٹ میں کر تک جھک کر قبول کیا، اور پھر جیسے ہی اپنی اس بوکھلائی ہوئی حرکت کا احساس ہوا کچھ اور جھک کر بوتے کا ۔ نہ جانے کیا سمجھ کھول کر دوبارہ باندھنے لگے

" ام بتایا، شہزاد مسلمان " شبو کی رسیلی آواز میں اس بار شرارت کا نمک کچھ زیادہ ہی تھا

جی نہیں، مسلمان نہیں " ہم گھبرا کر سیدھے ہو گئے۔

یعنی آپ مسلمان نہیں ہیں " شوخ لہجے کی شرارت کچھ اور بڑھ گئی۔

" جی " ہماری بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔

اپ ہی نے تو فرمایا کہ آپ مسلمان نہیں ہیں منہ بنا کر کہہ گیا،

نو شرارت شبو " قبلہ چچہ خوب نے پیار بھری ڈانٹ پلائی پھر ہم سے مخاطب ہوئے ۔ برخوردار ا شبو کی باتوں کا برا مت ماننا تمہیں چچہ خوب سمجھ کر مذاق کر رہی ہیں " پھر شبو کو مخاطب کیا " شہزاد میاں کے لئے اوپر والا کمرہ چچہ خوب کر ۔ اد ۔ "

او کے ابو " شبو نے سر کو ہلکے سے خم کیا اور پھر ہماری طرف مسکراہٹ کی بجلی گرا کر فرمایا " تشریف لائیے جناب والا۔

یہ رہی آخری آرام گاہ "

" جی ی ی " ہمارے ہونٹ مارے حیرت کے اور آنکھیں مارے دہشت کے پھٹ گئیں۔

میرا مطلب ہے آپ کی آرام گاہ " چنچل رسیلے ہونٹوں کی شریر مسکراہٹ کچھ اور دبیز ہو گئی " باتھ روم اور لیٹرن ساتھ میں ۔ ۔ (Attached) ہے "

شبو کے پیچھے ہم بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن اندر قدم رکھتے ہی قوالی کے اس مصرع کی تفسیر بن گئے

قدم لرزیدہ لرزیدہ، نظر پتھریلی، پتھریلی

ہم نے سوچا اگر آج کی رات اس عجوبہ روزگار، کمرے میں گزارنی پڑی تو بقول شبو یہ کمرہ واقعی ہماری آخری آرام گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دیواروں پر چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بھانت بھانت کے اصلی اور جنگلی جانوروں بلکہ آدم خوروں کے سر، ۔ نگے ہوئے تھے ان میں نمایاں، سر، شیر، چیتا، ببر اور بھالو کے تھے، منہ پھاڑے خطرناک پتھرائی ہوئی آنکھوں سے گھورتے، جیسے

دیکھنے والے کو کچا چبا جائیں گے

کیا واقعی آپ کا نام "شہزاد مسلمان ہے" پھر وہی بے تکا سوال پتہ نہیں شبو کو ہمارے نام سے اتنی چڑ کیوں ہو گئی تھی یا پھر ہو سکتا ہے اس بات کو ہماری ہی چڑ بنانا چاہتی ہوں ہم نے اس گورکھ دھندے سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہاتھ جوڑ کر کہا "خاکسار کا نام ویسے شہزاد تحسین مہدی ہے دوست احباب شہزاد سلمان کہتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ نام پسند نہیں تو فرمائیے میں نام بدلنے کے لئے بھی تیار ہوں"

چھوڑیئے بھی نام بدلنے سے شخصیت تھوڑے ہی بدل جاتی ہے" شبو کا انداز کسی قدر فلسفیانہ ہو گیا بیشتر نام دھوکے کی ٹٹی ہوتے ہیں، مثال کے طور پر میرا ہی نام دیکھئیے شبنم نام ہی سے یاسیت بلکہ "دیوداسیت" ٹپکتی ہے جب کہ میں بالکل اس کی الٹ ہوں

اس میں کیا شک ہے ہم نے فوراً لقمہ دیا "آپ کا نام تو بے حد چلبلا چنچل شریر اور دھوم دھڑاکے دار ہونا چاہیے تھا جیسے پھلجھڑی بانو، پٹاخہ بیگم، دھماکہ خانم وغیرہ"

بہت اچھے مجھے آپ کی یہ بے تکلفی بے حد پسند آئی"

شکریہ ہم نے فخر سے سر اٹھایا ہی تھا کہ سنگ یاد آیا۔ یعنی شیر کے خطرناک سر سے نظر ٹکرائی۔ نتیجتاً ہماری گھگھی بندھ گئی ادھر سے توجہ ہٹانے کے لئے پوچھا "معلوم ہوتا ہے نواب صاحب قبلہ کو شکاریات سے بہت دلچسپی ہے" "صرف دلچسپی

"ارے حضور جنون کہیئے جنون، یہاں تو عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" شبو کا لہجہ فخریہ ہو گیا، سر کچھ اور بلند ہو گیا حسین آنکھوں میں چیتے کی سی چمک لہرانے لگی، دراز زلفیں، ناگن کی طرح، ڈولنے لگیں اور ہم اس سہمے ہوئے "قربانی کے جانور" کی طرح تڑپنے لگے جسے شیر کی خدمت میں "تر نوالے" کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اگرچہ ہم اس جانور کی طرح کسی کھونٹے سے بندھے نہیں تھے کہ رسی تڑا کر بھاگ نہیں سکتے ہمارے لئے تو سارے دروازے کھلے تھے لیکن شبو کے روپ میں نظر کے سامنے ایک ایسا حسین مقناطیس فوارہ ابل رہا تھا جس کی زد میں آکر ہم ساری چوکڑیاں بھول چکے تھے اس وقت ہماری حیثیت کم و بیش اس "بارہ سنگھے" کی سی تھی جو شکاری کتوں کے ڈر سے جھاڑیوں میں جا چھپا تھا، لیکن بھوک کے مارے خود ہی ان جھاڑیوں کو کھا گیا اور اپنی موت کو آپ دعوت دے دی

ابا جیز کا بھی پسندیدہ مشغلہ یہی ہے "ہلالی ابروؤں پر بل ڈال کر متناسب جسم کی شبابی کمان کو اور کس کر ایک ایسا تیر چھوڑا کہ ہائے ہائے، بلکہ مرے پہ سو درے کے مصداق آگے اور ستم ڈھایا یعنی مزید فرمایا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، اردو والے کو فارسی کیا، وہ جو شیر کا سر دیکھ رہے ہیں آپ، اسے انہی ہاتھوں نے کیفر کردار کو پہنچایا ہے"

اس خونخوار اطلاع نے ہمارے بچے کچے ہوش و حواس بھی معطل کر دیئے۔

عالی جناب کو بھی کچھ دلچسپی ہے شکار سے؟" شکاری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا گیا

"صرف دلچسپی؟" ہم نے شبو کے لہجے کی ہو بہو نقل کرتے ہوئے کہا "ارے صاحب یہاں تو یہ حال ہے کہ بغیر شکار کے کھانا ہضم نہیں ہوتا" پتہ نہیں کیوں ہم نے اتنا بڑا جھوٹ کہدیا، شاید اپنی مردانگی کی لاج رکھنے کے لئے اور پھر ایک مرد کی فطرت بھی یہی ہے، اگر وہ واقعی مرد ہے تو کبھی جنس مخالف کو کسی بھی میدان میں اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیتا

"کس کا شکار زیادہ پسند ہے آپ کو"

شبو نے بڑی پرشوق مگر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے اگلا تیر چھوڑا "شیر کا یا چیتے کا؟ دونوں کا" ہم نے متانت سے جواب دیا حالانکہ ہماری تاریخ شکاریات آج تک مکھیوں، مچھروں، کھٹملوں کے شکار سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکی ہے لیکن ہماری فطری ضد "جو کبھی کھیل بگاڑتی ہے تو کبھی بناتی ہے، درمیان میں آگئی۔ چنانچہ پھکیم پھاک کے سلسلے کو مزید آگے بڑھایا "ہمیں تو دونوں کا شکار بے حد مرغوب ہے کیا شکار کرتے ہیں دونوں، خاص طور سے چیتا تو چھپ کر بے خبری میں حملہ کرتا ہے، پیچھے سے وار اپنے شکار کو دبوچتا ہے"

"کیا فرما رہے ہیں آپ، چیتا شکار کرتا ہے، یا آپ اس کا شکار کرتے ہیں" شبو کی بر وقت مداخلت نے ہماری اول فول بکواس پر بریک لگادیا اور ہم نے بگڑی بات بنانے کی کوشش کی "میرا مطلب ہے دونوں شکار کرتے ہیں۔

کبھی شیر اور چیتا ہمارا اور کبھی ہم ان کا" "گویا مقابلہ برابر کا ہوتا ہے"

جی ہاں بندے کی نظر میں جانور اور انسان کی کوئی تخصیص نہیں۔"

اپنا تو یہ اصول ہے کہ حریف کو ہمیشہ برابر کا موقع دو، تاکہ اپنی بہادری پر کبھی حرف نہ آئے

اس سے پہلے کہ ہماری یہ بے سر و پا بکواس، ہماری پول کھولتی شبو نے گھڑی دیکھتے ہوئے یہ کہہ کر اس سلسلے کو ختم کر دیا "شام ہونے کا وقت ہو گیا ہے آپ تازہ دم ہو کر آدھ گھنٹے میں 'لان' پر پہنچ جائیے۔" اور پھر ایسی فاتحانہ چال چلتی ہوئی کمرے سے رخصت ہوئیں جیسے، مردہ جانوروں کے اس "میوزیم" میں ابھی ابھی اپنے ہاتھوں شکار کئے گئے ایک 'انسانی سر' کا اضافہ کر گئی ہوں

بھاگو بھیا شہزاد اور نہ ان میر شکاریوں بلکہ شکار کے 'میر تقی میروں' کے ہاتھوں ناحق شہید ہو جاؤ گے "پاسبان عقل نے نہایت معقول صلاح دی، لیکن حضرت دل کی نیت، کسی پر چونکہ ڈانوا ڈول ہو چکی تھی اس لئے ہم نے صرف باتھ روم تک بھاگنے پر اکتفا کی"

(مارچ ۱۹۷۶ء)

دلیپ سنگھ

ادب اور معاوضہ



نام ** دلیپ سنگھ

پیدائش ** ۱۹۳۲ء

مقام پیدائش ** ضلع گوجرانوالہ (پاکستان)

ملازمت ** وزارت خارجہ حکومت ہند

تصانیف ** سارے جہاں کا درد، گوشے میں قفس کے (مضامین) آوارگی کا آشنا (سفر نامہ)، موم کی گڑیا (ڈرامہ)، دل دریا (ناول)، جنم کی تلاش (ہندی مضامین)

انتقال ** ۱۸ اگست ۱۹۹۶ء

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے اپنا پہلا طنزیہ مضمون ۱۹۵۴ میں لکھا تھا۔ یہ مضمون دلی کے ایک موقر رسالے میں شائع ہو گیا۔ شائع ہونے کے دس دن بعد میں اپنے مضمون کا معاوضہ لینے کے لیے رسالے کے دفتر میں جا پہنچا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوا تو وہاں مدیر سمیت چھ سات آدمی موجود تھے۔ جوں ہی میں نے معاوضے کی درخواست کی، دفتر میں موجود لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ لگایا تو انہیں سات آدمیوں نے، لیکن مجھے یوں لگا جیسے قہقہے میں ساٹھ ستر آدمی شامل ہوں۔ ہنسی جب ذرا تھمی تو مدیر نے مجھے بتایا کہ اردو میں معاوضے کا رواج نہیں ہے۔ مجھے یہ حیرانی ہوئی کہ رواجوں سے بھرپور اس دیش میں یہ رواج ہونے سے کیسے رہ گیا۔ میں نے نہایت سادگی سے پوچھا کہ لوگ لکھتے کیوں ہیں، تو کہنے لگے کہ شہرت کی خاطر

یوں تو مجھے شہرت حاصل کرنے سے کوئی شکایت نہ تھی لیکن اس سے زیادہ مجھے اس وقت روٹی کی ضرورت تھی۔ پھر میں نے سوچا، شہرت تو حاصل کرو۔ ہو سکتا ہے، جب مشہور ہو جاؤں تو لوگ روٹی بھی کھلانے لگیں۔ اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ امیر لوگ شہرت یافتہ لوگوں کو دسترخوان سجانے کے لیے بلاتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر اس رسالے کے دفتر سے نیچے اترا کہ شاید مجھے دیکھتے ہی قارئین کرام آنکھوں پر بٹھا لیں۔ رسالہ جس میں میرا مضمون چھپا تھا میری بغل میں تھا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو آنکھوں پر بٹھانا تو درکنار مجھے کوئی رکشا میں مفت بٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ میں نے ہر وہ حرکت کی جس سے لوگوں کو احساس ہو کہ میں ادیب ہوں۔ لیکن کسی نے اثر قبول نہ کیا مجبوراً مجھے باقاعدہ اعلان کرنا پڑا کہ میں ادیب ہوں۔ جس کے جواب میں کسی منچلے نے کہا، آپ جیسے سینکڑوں ادیب اس بازار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ میں جوتیاں چٹخاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ بعد میں میں نے غور و خوص کیا تو پتہ چلا کہ اردو کے رسائل کے پڑھے جانے کا یہ ہے کہ اکثر انہیں وہی حضرات پڑھتے ہیں، جو ان میں لکھتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی اپنا مضمون پڑھنے کے بعد

[illegible] کر رکھ دیے ہیں، کیوں کہ زیادہ ورق گردانی کرنے سے [illegible] لے کے پھٹ جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اور ایسی حالت میں یہ سند نہیں رہتا [illegible] وقت ضرورت کام نہیں آتا۔

ادب کا مسئلہ کچھ اسی طرح کا ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اور چسکا تو آپ جانتے ہیں خطرناک عادت کا دوسرا نام ہے [illegible] عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگر بات چھپا رکھیں تو ان کے پیٹ میں درد اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں [illegible] ادیب کے پاس لکھنے کو کچھ ہو اور نہ لکھے تو اس کے سارے جسم میں تناؤ سا آ جاتا ہے۔ گردن اکڑ جاتی ہے ماتھے کا رنگ بدلتا ہے کہ [illegible] آنکھوں کی حالت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ دیکھ بھی رہی ہوں تو لگتا ہے کہ نہیں دیکھ رہی ہیں۔ ہاتھوں میں ایک عجیب سا [illegible] پیدا ہو جاتا ہے۔ ادیب چاہتا ہے کہ کسی طرح اس مواد کو نکالے جو اس کے اندر پنپ رہا ہے تاکہ [illegible] پرزوں میں ہر سے تناؤ [illegible] کچھ لوگ تو اس مواد کو باہر نکالنے کے لیے چائے یا شراب کا سہارا بھی لیتے ہیں جب یہ مواد نکلتا ہے تو ادیب دوڑتا ہے [illegible] دوستوں کو بتانے کے لیے کہ بھائی مواد باہر نکل آیا ہے۔

[illegible] بتانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک زبانی اور دوسری تحریری۔ زبانی میں مشکل یہ ہے کہ سننے والے بڑے کامیاب ہوتے ہیں [illegible] [illegible] تجربت ہے آج کل کوئی ایک شعر تک سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایک غزل کو سنانے میں کئی بار دو دو سو روپے گھل جاتے ہیں [illegible] سنانا تو اور بھی مہنگا پڑتا ہے، خاص طور پر اگر تجریدی ہو تو خرچہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ سننے والوں کی تواضع سامان خورد و نوش کی [illegible] اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اپنی تخلیقات کی تشہیر کرنے کے لیے دوسرا طریقہ پسند کرتے ہیں جسے تحریری طریقہ [illegible] [illegible] مضمون یا نظم کو کسی رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ اب آپ ہی بتائیے رسالے کا مدیر اسے معاوضہ کیوں دے [illegible] [illegible] ہے کہ ادیب کے پاس چھپنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کیونکہ زبانی سننا کسی کو گوارہ ہی نہیں

میری تقریر کو یہاں تک پڑھنے کے بعد شاید آپ کو خیال گزرا ہو کہ رسالوں کے مدیر ادیبوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں [illegible] [illegible] کوٹھیاں بن رہی ہیں اور ادیب بیچارے بھوکے مر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے حضور ان کی کوٹھیاں بن نہیں رہیں، بک رہی ہیں۔ کسی [illegible] والد بزرگوار کوئی مکان چھوڑ گئے اور مدیر صاحب نے اسے رسالے پر لگا دیا۔ آپ کو شاید نظر نہ آئے۔ لیکن مجھے تو رسالے کی ورق [illegible] کرتے ہوئے اکثر مدیر محترم کی اہلیہ محترمہ کی بلی یا گروی رکھی ہوئی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ پریس والے مالکوں کے [illegible] اور اجرت مانگنے والے کاتبوں کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

[illegible] پوچھیں گے کہ اگر صورت حال یہ ہے تو وہ رسالہ نکالتے کیوں ہیں۔ جیسے دوردرشن اور ریڈیو پر ہم کے [illegible] [illegible] آپ نے بہت ہی اچھا سوال کیا ہے۔ مختصر سا جواب تو اس کا یہ ہے کہ جس طرح ادیب کو لکھنے کا چسکا پڑ جاتا ہے ایسے ہی مدیر کو [illegible] نکالنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ وہ اگر رسالہ نہ نکالے تو اس کے جسم کے کل پرزوں میں وہی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جو ادیب کے مواد [illegible] سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے شاعر اپنی غزل کے اوپر (یا کن صورتوں میں کسی دوسرے کی غزل کے اوپر بھی) اپنا نام چھپا دیکھ کر ایک [illegible] کی راحت محسوس کرتا ہے۔ تقریباً وہی راحت مدیر رسالے کے اوپر اپنا نام دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ [illegible] ہے کہ ادیب [illegible] دو چار چھینٹے لگا کر مصرعے جوڑ دیتے۔ لیکن مدیر نے تو رسالے ورق کے جوڑنے میں [illegible] کی روٹیاں داؤ پر لگا دیں

اگر رسالہ بک رہا ہو تو مدیر محترم اپنے رسالہ میں بار بار یہ اعلان کیوں شائع کریں کہ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے [illegible] رسالے کے لیے گاہک فراہم کریں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے چندہ لے کر ہمیں بھجوائیں۔ یہ اعلان پڑھ کر مجھے اکثر محسوس [illegible] ہے کہ میں ایک امیر گھر کی لڑکی ہوں، جس کی شادی ایک غریب سسر کے بیٹے کے ساتھ ہوئی ہے۔ اب سسر صاحب مجھے بار بار

مشورہ دیتے ہیں کہ بیٹی تیرا فرض بنتا ہے کہ تو اپنے رشتہ داروں میں جو امیر گھروں کی لڑکیاں ہیں، ان کو پھانس کر میرے گھر لا تاکہ ہمارے یہاں دال روٹی چلتی رہے۔

ایک ایسے ہی مدیر ایک بار مجھے ملنے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی مجھے کہنے لگے میں نے ایک رسالہ نکالا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کا پانچ سال کا چندہ اس تھیلی میں ڈال دیں۔ میں نے کہا کیوں ڈالوں؟ کہنے لگے اس لئے کہ یہ ادب کی خدمت ہے۔ میں نے خود آج صبح میں اس تھیلی میں پانچ سو ڈالے ہیں۔ میں نے کہا حضور یہ تو بالکل ایسے ہے کہ کوئی ڈاکو آکر مجھے کہے کہ بھائی تمہارے پاس جو زیور اور نقدی ہے وہ میرے اس جھولے میں ڈال دو کیونکہ میں نے خود اپنے زیور اور نقدی اس تھیلے میں ڈال دی ہے۔

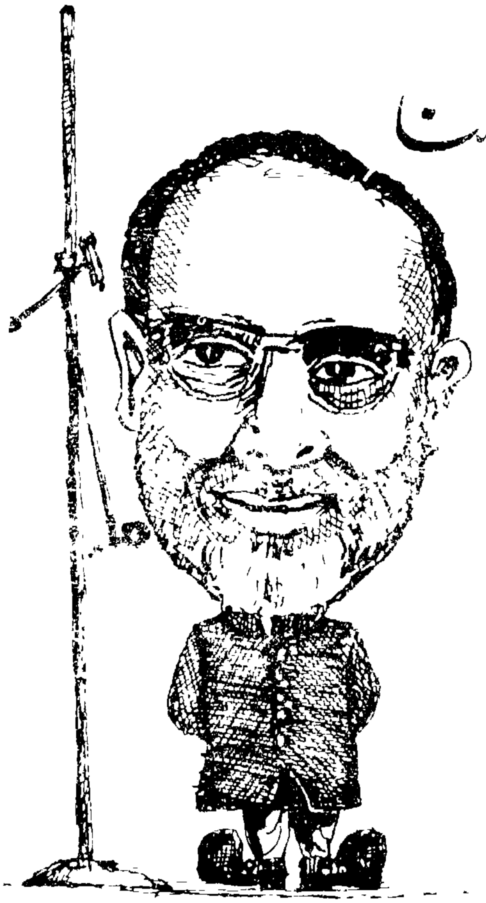
میں نے ایک بار اپنے ایک مدیر دوست سے پوچھا تھا کہ آپ لوگ رسالہ نکال کر گھر پھونک کر تماشہ دیکھنے کا شغل کیوں کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اور کوئی شغل ہمیں آتا نہیں تو کریں کیا۔

اس کی بات سن کر مجھے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک کھلے میدان میں ایک فقیر کی برسی کے دن ہر سال میلہ لگا کرتا تھا۔ یہاں اس علاقے کے لوگ [illegible] عورتیں اور بچے اکٹھے ہوتے تھے۔ جھولے لگے ہوتے تھے۔ [illegible] دوکانیں سجی تھیں جہاں جلیبیاں اور بوندی کے لڈو [illegible] بکتے تھے۔ اس میلے میں طوائفیں گانے سنا کر اور بھانڈ تماشے دکھا کر لوگوں سے داد اور پیسے وصول کرتے تھے۔ بچے کھلونوں کی دوکانوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس میلے میں میں نے اپنے گاؤں کے ایک [illegible] کو دیکھا جو بوری میں اوزار ڈالے آواز لگا رہا تھا کہ جوتے پلنگ [illegible] مرمت کروالو۔ میں نے اس کے پاس جاکر پوچھا [illegible] اس میلے میں عیش و عشرت کے لیے آتے ہیں یہاں جوتے پلنگ کا بخرا لیکر کون آیا ہوگا جو اسے مرمت کروائے گا۔ وہ کہنے لگا میں [illegible] تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن مجھے جو کام آتا ہے میں وہی کروں گا نا۔ اگرچہ ادیب ہونے کے ناطے مجھے مدیروں سے شکایت ہونی چاہیے کہ مجھے میری تخلیقات کا معاوضہ نہیں دیتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ [illegible] میں نے روٹی کمانے کے لئے کئی اور آسان نسخے ڈھونڈ لئے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ میرا ادبی چسکہ پورا کرنے میں میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ البتہ ایک شکایت مجھے ہے اور وہ اس اعلان سے ہے جو وہ اکثر اپنے رسائل میں شائع کرتے ہیں جس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ [illegible] درخواست ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف خوش خط لکھا کریں۔ دو لائنوں کے بیچ خالی جگہ چھوڑا کریں۔ مضمون پہلے کہیں شائع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر مضمون ہمارے معیار پر پورا نہیں اترے گا تو واپس کر دیا جائے گا۔ اگر مضمون واپس چاہیے تو ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ وغیرہ [illegible] مفت کا سودا خریدا اور اس پر اتنے نخرے۔ اس بار مجھے خیال ہوا ہے کہ مدیر کو ساتھ لیکر کسی ساڑیوں کی دوکان پر لے جاؤں، وہاں ان سے یہ جملے کہلواؤں کہ صاحب مجھے اپنی بیوی کے لیے ساڑھی درکار ہے۔ ساڑھی کا ڈیزائن ایسا ہونا چاہیے جو پہلے کسی کے [illegible] ہو۔ کپڑا مضبوط اور رنگ پکا ہونا چاہیے۔ اگر میری بیوی کو ساڑھی پسند نہ آئی تو آپ کو اپنا آدمی بھیج کر جسے سکوٹر رکشا کا کرایہ آپ کو دینا ہوگا [illegible] ساڑھی واپس منگوانی ہوگی اور ساڑھی پسند آجانے کی صورت میں اس کے دام ہرگز نہیں دوں گا۔ اس تقریر کے بعد میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ دوکاندار مدیر صاحب کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ میں اس سلوک کو اپنی ادبی تخلیقات کا معاوضہ سمجھ کر خوش ہو جاؤں گا۔

****
****

برق آشیانوی

مانگنا



یک پرانی کہاوت ہے "رنج کروں تو موٹا آوے ۔ کاٹھ
کھاوں تو ہیتے ۔ دادو رام جی یوں کر بولے مانگ کھائے سو جیئے ۔"
پتہ نہیں یہ دادو رام جی کون بزرگ تھے ۔ لیکن بہت بڑی پکی کہہ گئے
ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے آکر کہا، گروجی ۔ اگر
تجارت کرتا ہوں تو اس میں نقصان کا اندیشہ ہے اور اگر چوری کرتا
ہوں تو سزا کا خوف لگا رہتا ہے اب آپ ہی بتایئے کہ کیا کروں ۔ تو
دادو رام جی نے بڑے حلیمانہ انداز میں جواب دیا ۔ "بیٹا مانگ کھاو
اور سو برس جیو" ۔ چائے کے اشتہار میں ہم نے پڑھا تھا کہ
"چائے پیو سو برس جیو" پھر ایک سگریٹ کا اشتہار بھی نظر سے
گزرا تھا جس میں لکھا تھا ۔ سگریٹ پیو اور سو برس جیو ۔ لیکن
... چائے پینے والے سو برس جیتے ہیں اور نہ
سگریٹ پینے والے ... ڈاکٹر سے لے کر مریض تک اس بات پر
متفق ہیں کہ "مانگ کھاؤ اور سو برس جیو"

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مانگ کھانے والے بڑے مزے
میں رہتے ہیں ۔ کسی کے نوکر نہ چاکر، نہ غلام نہ تابعدار بلکہ ہر ایک
کے سر پر سوار ۔ مانگ کھانے کی اس عام قسم پر تو بہت کچھ لکھا جاچکا
ہے جسکو گداگری کہتے ہیں ۔ ترقی یافتہ ممالک میں فن گداگری کو
آرٹ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔ البتہ ہمارے ملک میں ابھی اس
کو آرٹ کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی اس لئے ہمارے یہاں اس
آرٹ کے نہ سند یافتہ بیچلر ملتے ہیں نہ ماسٹر ۔ لیکن عملی طور پر اس فن
کے ایسے ایسے ماہرین ہمارے دیس میں موجود ہیں کہ بیچلر یا ماسٹر تو
کجا پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری بھی دی جائے تو کم ہے ۔ ہم مانگنے کی ان
اقسام اور پھر اقسام کے مختلف طریقوں کا ذکر کریں گے جن کو
سوسائٹی میں مانگنا یا یوں کہیئے کہ بھیک مانگنا نہیں کہا جاتا ۔ اور نہ
اس طرح مانگنے میں کسی کو شرم یا عار محسوس ہوتی ہے ۔ برخلاف اس
کے بڑے ٹھاٹھ سے مانگا جاتا ہے ۔ حکومت سے مانگا جاتا ہے ۔ بلکہ جبر
و قہر سے بھی مانگا جاتا ہے ۔ لیکن ہوتا ہے یہ سب مانگنا ہی ۔

نام ** سید موسیٰ کلیم
قلمی نام ** برق آشیانوی
پیدائش ** ۱۸/ اپریل ۱۹۱۸
مقام پیدائش ** سکندرآباد
ملازمت ** محکمہ جیل
تصانیف ** یہ ایک تبسم (مضامین) مکرر ارشاد (مزاحیہ شعری مجموعہ) جو نہ کر ناتھا (ناول) ہنستے ہنستے، پتے کی بات
ورق ورق
انتقال ** ۱۴/ اگست ۱۹۸۶ء

سب سے پہلے ہم کتاب مانگنے کو گئے ہیں۔ اس کے بارے میں ایک پرانی کہاوت ہے۔ "کتاب دینے والا بے وقوف ہوتا ہے اور کتاب لے کر واپس دینے والا اس سے بڑا بیوقوف ہوتا ہے۔"

اس سلسلے میں ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک بادشاہ نے اپنے وزیر کو بے وقوفوں کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا۔ وزیر نے فہرست تیار کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کر دی۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ سرفہرست خود بادشاہ جہاں پناہ کا نام لکھا ہے۔ عالم پناہ بہت غضب ناک ہوئے لیکن ضبط سے کام لے کر پوچھا۔ "تم نے ہمارا نام ہی سرفہرست لکھدیا؟" وزیر نے جواب دیا۔ "عالم پناہ نے شہر کے قاضی کو کتب خانہ شاہی سے ایک کتاب عنایت فرمائی ہے۔ چونکہ کسی کو کتاب دینے والا دنیا میں سب سے بڑا بے وقوف ہوتا ہے اس لئے میں نے عالم پناہ کا نام سرفہرست لکھ دیا ہے"۔ عالم پناہ نے دریافت فرمایا اگر قاضی نے ہمیں کتاب لوٹا دی تو۔ "وزیر نے جواب دیا۔" تو پھر عالم پناہ کے نام کے اوپر قاضی کا نام لکھ دیا جائے گا۔ "غرض اس قصہ میں واقعیت ہے یا نہیں لیکن اس قول میں اتنی صداقت ہے کہ اس پر ہر کتاب دینے والا اور کتاب لے کر واپس دینے والا صدق دل سے ایمان لاتا ہے۔ یہ بات تو اس زمانے کی ہے جب کہ صرف "کتاب" وجود میں آئی تھی، "اخباروں" نے جنم نہیں لیا تھا اور "رسالے" پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اب جب کہ اخبارات اور رسالوں نے بھی جنم لینا شروع کر دیا ہے اور اس زور و شور سے جنم لے رہے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کچھ عرصہ بعد اخبارات اور رسایل کی پیدائش کی روک تھام کے لئے ایک خاص قسم کی پلاننگ بھی جنم لے گی جو فیملی پلاننگ کے عین مطابق ہوگی اور جس کی رو سے اخبارات اور رسایل کی پیدائش کے خلاف بھی کچھ اس قسم کا نعرہ لگانا پڑے "اگلا اخبار ابھی نہیں۔ دو کے بعد کبھی نہیں" جب ہماری یہ بات، ہمارے ایک دوست نے سنی تو فرمایا۔ "بھائی صاحب آپ کا خیال غلط ہے۔ اخبارات اور رسایل کے سلسلہ میں ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ جس رفتار سے ان کی پیدائش ہو رہی ہے اس سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ انسانوں کی پیداوار ہو رہی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اتنے اخبارات و رسایل نکلنے کے باوجود کئی اخباروں یا کئی رسالوں کی ایک ایک کاپی کو سو سو دو دو سو آدمی پڑھتے ہیں"۔ یہ بات آسانی سے ہماری سمجھ میں آگئی۔ اس لئے کہ کل ہی ہمارے اخبار کے ایجنٹ نے ہمیں اخبار دینا چاہا تو ہمارے پڑوسی نے جو ہم سے باتیں کرتے کھڑے تھے ہاتھ بڑھا کر خود اخبار لے لیا اور اس طرح پڑھنا شروع کر دیا کہ ہم کو اپنا وجود اور عدم دونوں برابر نظر آنے لگے۔ جب ہم نے اخبار مانگا" تو انہوں نے ہمیں گھور کے دیکھا اور کہا۔ "ابھی میں نے پڑھا ہی نہیں اور آپ" مانگ "رہے ہیں۔ "لیجئے صاحب" مانگنے "کا الزام ہم پر ہی آگیا۔ اس کے بعد تیزی سے وہ اخبار لیئے اپنے گھر میں چلے گئے۔ اور ہمیں منہ دیکھتے کھڑے رہنے کا موقع بھی حاصل نہ رہا اس لئے ہم اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ دفتر جا کر واپس آنے کے بعد اخبار منگوایا تو بتایا گیا کہ ان کے پڑوسی کے پاس ہے۔ پھر جو پڑوسی در پڑوسی کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ تیسویں نمبر کے پڑوسی کے پاس ہمارا اخبار پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ جب ان تیس مار خان سے اخبار منگوایا گیا تو جواب ملا۔ "اخبار پڑھنا ہے تو خرید کر پڑھا کریں۔ مانگ کر پڑھنے کی عادت اچھی نہیں"۔

یہ ایک مثال تو ہم نے اخبار کی دے دی۔ یہی حال رسایل کا بھی ہے۔ چنانچہ کوئی رسالہ گھر میں آتا ہے تو ایک بار نظر آتا ہے دوسری بار نظر نہیں آتا اور ہم یہ کہتے رہ جاتے ہیں۔

"ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے"۔

غرض یہ پتہ نہیں چلتا کہ رسالہ کہاں گیا اور کب گیا۔ اگر کبھی پتہ چل گیا اور اپنا رسالہ ہم واپس "مانگتے" ہیں تو جواب ملتا ہے کہ مانگ کر پڑھنے کی عادت اچھی نہیں۔ خرید کر پڑھا کریں۔ "چنانچہ ہم نے اب خرید کر پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور مانگ کر پڑھنے لگے ہیں اور لوگوں کو نہایت سختی بلکہ بے رحمی کے ساتھ کہنے لگے ہیں کہ خرید کر پڑھا کریں۔

مانگنے کے بارے میں ایک اور مثل مشہور ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بغیر مانگے نہیں ملتی۔ ماں اپنے بچے کو مانگے بغیر دودھ نہیں دیتی باپ اپنے بچے کو بغیر مانگے کی فیس نہیں دیتا۔ شوہر اپنی بیوی کو بغیر مانگے اپنی تنخواہ کا حساب نہیں دیتا اور بیوی اپنے شوہر کو بغیر مانگے بس کا کرایہ نہیں دیتی۔ لیڈر کو ووٹر بغیر مانگے ووٹ نہیں دیتا۔ مریض بغیر مانگے ڈاکٹر کو فیس نہیں دیتا۔ بنیا گاہک کو بغیر مانگے ادھار نہیں دیتا۔ اور گاہک بنئے کو بغیر مانگے قرض ادا نہیں کرتا۔ مزدور کو بغیر مانگے مزدوری نہیں ملتی۔ دفتر سے بغیر مانگے رخصت نہیں ملتی۔ خدا میاں بغیر مانگے بندوں کو جنت اور حوریں نہیں دیتے اور بندے بھی خدا کو بغیر مانگے اپنے گناہوں کا حساب نہیں دیتے۔ غالباً یہی بات مرزا غالب نے اپنے شعر میں کہی ہے۔

آتا ہے مجھکو داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ "مانگ"

انسان کی اپنی سماجی زندگی میں اور کئی مواقع "مانگنے" کے آتے ہیں۔ کسی نوجوان لڑکے کو بغیر مانگے لڑکی نہیں ملتی۔ معاف کیجئے یہ بات اب غلط بلکہ الٹی ہو گئی ہے۔ اور اب یوں کہنا چاہیئے کہ کسی لڑکی کو بغیر مانگے لڑکا نہیں ملتا اور لڑکے کو بغیر مانگے جوڑے کی ہزاروں روپے رقم نہیں ملتی۔

آج کل "مانگنے" کا سلسلہ اتنا ترقی پر ہے کہ مانگنا زندگی کا جزو لازم بن گیا ہے۔ اخبارات میں روزانہ ایک نہ ایک خبر "مانگنے" کی پڑھنے میں آتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اب "مانگنے" کے لفظ کو ایک سنہری غلاف چڑھا کر اس کا نام "مطالبہ" یا "مطالبات" کر دیا گیا ہے۔ ویسے "مانگوں" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر بہت کم۔ چنانچہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ اخبار میں کسی نہ کسی قسم کی مانگ یا مطالبے کی خبر درج نہ ہو۔

مانگنے کے طریقے بھی نئے نئے وجود میں آگئے ہیں، کہیں گھیراؤ کر کے مانگا جاتا ہے کہیں پتھراؤ کر کے مانگا جاتا ہے، کہیں توڑ پھوڑ سے مانگا جارہا ہے، کہیں آگ لگا کر مانگا جارہا ہے، کہیں اسکولوں سے غیر حاضر رہ کر مانگا جارہا ہے، کہیں ہتھیار رکھ کر مانگا جارہا ہے کہیں ہتھیار اٹھا کر مانگا جارہا ہے۔ کہیں عجز و انکسار سے مانگا جارہا ہے، کہیں جبر و اختیار سے مانگا جارہا ہے۔ کوئی ان سب مانگنے والوں کی مانگیں پوری کرنے کا وعدہ کر کے ان سے ووٹ مانگ رہا ہے۔ اور جب وہ اپنے حلقے سے منتخب ہو کر ان کی مانگیں پوری نہیں کرتا تو ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگ لیتا ہے۔

ابھی اور بہت ساری قسمیں مانگنے کی ہیں جن کا ذکر اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی قسمیں ہم نے مانگنے کی بیان کی ہیں۔ ان میں ہر ایک ایسی ہے کہ اس پر علحدہ علحدہ ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ آخر میں ہم مانگنے کی ایک دلچسپ قسم کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہے "چندہ مانگنا"۔ مانگنے کی یہ قسم اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ لوگوں کو چندہ کے نام سے نفرت ہونے لگی ہے۔ چندہ مانگنے والے چند خاص خاص لوگ ہی ہوتے ہیں۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فن بھیک مانگنے سے زیادہ مشکل ہے۔ چندہ مانگنے والے شخص سے لوگ پناہ مانگتے ہیں۔ ایک ماہر فن اس انداز سے چندہ مانگ لیتا ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ چنانچہ وہ کئی سانپ مار لیتا ہے لیکن اس کی لاٹھی نہیں ٹوٹتی۔

(شگوفہ مئی ۱۹۷۴ء)

ڈاکٹر رشید موسوی

کُتّے



نام ** رشید النساء
قلمی نام ** ڈاکٹر رشید موسوی
پیدائش ** ۱۹۳۵، حیدرآباد
تعلیم ** ایم۔اے، اردو، پی ایچ ڈی
ملازمت ** صدر شعبہ اردو، آر بی وی آر آر ویمنس کالج، حیدرآباد (موظف)
تصانیف ** دکن میں مرثیہ اور عزاداری (تنقید)، کاغذی ہے پیرہن (مزاحیہ مضامین) ۱۹۸۶ء

ایک عجیب و غریب واقعہ اس مضمون کا محرک ہوا۔۔۔۔۔

میں کھڑکی سے سڑک کا نظارہ کر رہی تھی کہ ایک لنگڑا فقیر کہیں سے آموجود ہوا۔ اس کی معذوری پر مجھے ترس آیا اور میں اس کی مدد کے تعلق سے سوچنے ہی لگی تھی کہ ایک کتا اس فقیر پر بھونکتا ہوا لپکا۔ فقیر کو مجھ سے کچھ آس بندھ گئی تھی۔ اس لئے اس نے کتے کی طرف توجہ نہ کی۔ کتے نے بھونکتے بھونکتے ایک جست لگائی۔ اور اس کی لنگڑی ٹانگ پر دانت جڑ دیئے۔ فقیر نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی ٹانگ چھڑائی اور میری پھٹی پھٹی آنکھوں کو پلٹ کر دیکھے بغیر دونوں پاؤں دوڑتا نکل گیا۔ میں نے کتے پر نظر ڈالی تو وہ دم ہلاتا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا ہی پڑا، "کتے، تم مجھ سے اچھے! تمہاری بصیرت مجھ سے زیادہ تیز تم مجھ سے زیادہ مردم شناس"۔۔۔۔۔ میں کھڑکی سے ہٹ آئی اور ماماجی کے اصرار پر ان کے داماد کو چٹھی لکھنے بیٹھی تو اس مضمون کا عنوان کاغذ پر اتر آیا ۔۔۔ کتے، ماماجی نے پوچھا کیا لکھیں بی بی؟۔۔۔۔۔ میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ کتے۔ ماماجی چٹ چٹ میری بلائیں لے کر چلتی بنیں اور میں لکھنے میں جت گئی۔

کتوں کی کئی قسمیں ہیں۔۔۔۔۔ شجرہ دار، مجہول النسب، بری، بحری، للی پٹ، گلبور، چھلے ہوئے، بال دار، غرض اتنی گوناگوں قسمیں ہیں ان کتوں کی کہ میں تفصیل میں جاؤں تو شبہ ہوگا کہ انسانوں کی قسمیں گنانے لگی ہوں۔ اس لئے میں کتوں کو ان کی شہریت کے منطقوں میں تقسیم کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔ مثلاً ریلوے اسٹیشن کے کتے، دواخانوں کے کتے، مارکٹ کے کتے، دھوبی گھاٹ کے کتے اور چند خاص کتے۔ ہر کتا اپنے منطقہ کا شیر ہوتا ہے اور کسی دوسرے منطقہ کے کتے کو اپنی عملداری میں گھسنے نہیں دیتا۔ اور نہ ہی خود اسے اس قسم کی مداخلت بے جا بہ منطقہ دیگر کی ہمت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے منطقے میں جو انصاف وہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے، اسے یاد رہتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے کتے نہ جانے یہ کتے کس سفر پر نکلے ہیں اور انھیں کس ٹرین کا انتظار رہتا ہے کہ پلیٹ فارم پر ہی پڑے رہتے ہیں۔ ریل کی پٹریوں پر سو رہے ہیں۔ مسافروں کے توشہ دانوں کو سونگھ رہے ہیں۔ قلیوں کے ٹھوکر کھا رہے ہیں لیکن ٹرین کا انتظار ہے۔ پلیٹ فارم پر ٹہلائی ہوتی رہتی ہے۔ اس ٹہلائی میں کوئی ریل کے پہیوں کی زد میں بھی آجاتا ہے۔ بچ گیا تو لنگڑاتا پھرے گا مر گیا تو مسافر ملک عدم۔ سنا ہے کہ ٹوکیو کے ایک اسٹیشن پر ایک کتے کی قبر ہے، لیکن وہ کتا پلیٹ فارم کا باشندہ تھا۔ وہ اپنے مالک کو گھر پہنچانے کے لئے اسٹیشن آتا تھا۔ اتفاق سے اس کا مالک اس کالج میں مر گیا، جہاں وہ پڑھانے جاتا تھا اور اب گھر واپس نہیں ہوا لیکن یہ کتا مرتے دم تک وقت مقررہ پر اسٹیشن پہنچ جاتا اور ایک دن پلیٹ فارم پر ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ ۔۔۔ یہ بات جاپان کی ہے ہمارے یہاں پلیٹ فارم کے کتے توشہ چور اور پیرو لی خور ہوتے ہیں۔ بعض مسافر تو ٹرین کے وقت پر آنے ۔۔۔ ہیں اس لئے بھی ما نگتے ۔۔۔ کتوں سے پیچھا چھوٹے۔ لیکن یہ کتے بہت مسکین اور بے بھونک ہوتے ہیں۔ یہ آپس میں گتھم گتھا تو ہوں گے لیکن اگر غلطی سے کسی مسافر سے ٹکرا جائیں تو نہایت ادب سے دم دبا کر معافی چاہ لیں گے۔ ایک دو دیدہ دلیر ایسے بھی نمایاں ہوتے ہیں جو کسی اونگھتے مسافر کا توشہ لے کر چمپت ہو جاتے ہیں۔ مسافر اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور ٹرین چھٹ جاتی ہوئی نکل ۔۔۔

دواخانے کے کتے یہ کتے رات کے راجہ ہوتے ہیں۔ دن بھر درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ۔۔۔ رہتے ہیں اور رات کو نرسوں اور ڈاکٹروں کی NIGHT DUTY کے ساتھ ان کی ڈیوٹی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ یہ نہایت ہوشیاری سے مریض کا ۔۔۔ اور ڈبل روٹی چٹ کر جائیں۔ اس لئے مریض ۔۔۔ قریب المرگ اور کتے ۔۔۔ اور بعد الاگ ہو ۔۔۔ ریلوے ۔۔۔ کتوں کی طرح یہ بھی بہت کم سخن ہوتے ہیں ۔۔۔ اگر دن سے پہلے دوا کی ۔۔۔ پہنچ جائے تو ۔۔۔ بھی نہیں ۔۔۔ مریضوں کے آرام اور نیند کا اتنا خیال ان کو ہوتا ہے

مارکٹ کے کتے ان کتوں کا حقیقی وطن گوشت اور مچھلی کی دکان ہے۔ کبھی یہ ترکاری کی دوکانوں کی طرف چہل قدمی کے لئے نکل ۔۔۔ اور ترکاریوں کو تر و تازہ رکھنے کے لئے پا بر داشتہ آب پاشی کی بھی ۔۔۔ کرتے ہیں۔ ان کتوں میں ہپی (HIPPY) ۔۔۔ کی ۔۔۔ قناعت کی شان ہوتی ہے۔ جو کچھ قصائی کی عنایت سے مل گیا، اس سے پیٹ بھر لیا اور ایک کونے میں پڑ رہے ۔۔۔ دھتکار ۔۔۔ ۔۔۔ دیں تو ان کی مہربانی۔ معلوم نہیں مارکیٹ کی خوراک کا کونسا جزافیون کی تاثیر کا حامل ہوتا ہے ۔۔۔ ۔۔۔ مستانہ ڈھلک آجاتی ہے اور چال میں موسی ندی بہتی ہے۔

دھوبی گھاٹ کے کتے دھوبی گھاٹ کے گدھے مشہور ہیں۔ لیکن یہاں کتے بھی پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ بہت پسند ۔۔۔ اور ۔۔۔ اپنے مالکوں کی سنگت کے لئے گھاٹ تک آتے ہیں، اس لئے تذکروں میں ان کو جگہ نہ مل سکی۔ یہ کتے اپنے مالک کے گدھوں کو ۔۔۔ ۔۔۔ گدھوں کی دم کو دانتوں کی صفائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کپڑوں کی حفاظت کا ۔۔۔ بھی انجام دیتے ہیں ۔۔۔ بچے ان کتوں کی دموں کو پٹاخوں کی لڑیوں سے سجاتے ہیں اور پٹاخوں کی پھٹ پھٹ ۔۔۔ کتوں کی کیں کیں ایک دلچسپ ۔۔۔ کرتی ہے۔

محلوں کے کتے ایک سرسری اعداد و شمار کے لحاظ سے ان کتوں کی تعداد دنیا کے جملہ کتوں کا ۷۵ فیصد ہے کتوں کو محلوں سے جو ۔۔۔ ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ کسی کتے پر رحم کھا کر اسے اپنے گھر میں پناہ دینا چاہیں تو وہ پہلے موقع پر بھاگ نکلے گا ۔۔۔ دوبارہ ۔۔۔ اسے گلی میں گھومتا دیکھیں گے تو وہ آپ کی نظر بچا کر کسی دوسری گلی میں گھس جائے گا اور فضا میں ایک گونج سنائی دے گی ۔۔۔ ہم

کو ہیں پیاری ہماری گلیاں" ۔ ان گلی کے کتوں کو لڑائی جھگڑا کرنے کی خاص مشق ہوتی ہے ۔ جب کوئی ہم سخن نہ ملے تو یہ کسی گھر کی پالتو مرغی یا درخت کی گلہری سے ہی جھگڑا مول لیتے ہیں ۔ زمانے سے بھی ان کو شکایت رہتی ہے ، کیوں کہ اکثر راتوں میں وہ پوری قوت سے نالہ کناں ہوتے ہیں ۔ جیسے انسان سے زیادہ وہی مظلوم ہیں ۔ ان کتوں سے بلدیہ کو خاص نسبت شہری ہے اور یہ منظر تو ہمارا دیکھا ہوا ہے کہ ان کتوں کی گرفتاری کے لئے جو گاڑی نکلتی ہے اس کو دیکھتے ہی یہ کتے اپنا سارا کتا پن بھول جاتے ہیں اور رسی کے پھندے میں بہ بہانہ گردن ڈال دیتے ہیں ۔ ورنہ یہی کتے ہوتے ہیں جو بیچارے سیکل سے اڑنے والوں کی ٹانگ کو آسمان سے ٹپکی ہوئی ہڈی سمجھ کر جھپٹتے ہیں ۔ ان کتوں کی افزائش ایک تخلیقی معمہ ہے ۔ ایک کتا دفع ہوتا ہے ، دو کتے آموجود ہوتے ہیں ۔ اور گلی کبھی سنسان نہیں ہونے پاتی ان ہی کتوں سے خارشی کتے اور دیوانے کتے اٹھتے ہیں جن سے اس قوم کا ڈنکا بجتا ہے

دربان کتے بعض گھروں پر تختیاں آویزاں رہتی ہیں ، کتوں سے خبردار ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندر خوفناک کتے ہیں ۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کتوں سے زیادہ گھر والے درندہ صفت ہوتے ہیں اور دراصل ان ہی سے خبردار رہنا چاہیئے ۔ یہ کتے صرف اپنی ہیبت میں خوفناک ہوتے ہیں ، اکثر اپنے ہی مالکوں کو گھر میں گھسنے نہیں دیتے ۔ خطوط رسانوں سے البتہ ان کو خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے ۔ آپ اگر کسی کی پتلون کے پائینچے پھٹے ہوئے دیکھیں اور تحقیق کریں تو وہ ڈاکیہ ہی نکلے گا ، مجھے یقین ہے ۔

گود کے کتے یہ کتے ، سگ پرستوں کے پروردہ ہوتے ہیں ۔ کبھی یہ بلیوں کی جسامت کے ہوتے ہیں ۔ پوچھنا پڑتا ہے ، کتے تم بلی ہو اور کبھی گائے کے بچھڑے کا ڈیل ڈول ہوتا ہے ۔ اور دم اگر ٹیڑھی نہ ہو تو گائے کی ممتا دھوکا ہی کھا جائے ۔ ہر دو کی زندگی عیش کے جھولے میں گذرتی ہے ۔ ان کا کوئی مقصد حیات نہیں ہوتا ۔ اچھا اچھا کھانا ، گودوں میں پھلنا پھولنا اور بس ۔ ۔ ۔ ہماری ایک جان پہچان کی خاتون ہیں ۔ وہ دلی سے واپس آئیں تو میں نے پوچھا ، سیر تو خوب ہوئی ؟ کہنے لگیں ۔ ۔ نہیں منے اسیر ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ بھاگ آنا پڑا میں نے کہا ۔ جی ہاں آپ کے ہزبنڈ کا مزاج ناساز تھا ۔ آپ کے جاتے وقت ۔ ۔ انھوں نے اپنے چہرہ پر رنج کی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا وہ تو خیر بیمار تھے ہی شیرو کی علالت کی خبر سن کر کھڑی کھڑی چلی آئی ۔ میں نے معصومیت سے پوچھا ، کیا عمر ہے آپ کے بچے کی ؟ کہنے لگیں بچہ نہیں جی میرا کتا ، میرا شیرو ۔ ۔ ۔ ان کتوں کا علحدہ باورچی اور ڈاکٹروں کا منظورہ پکوان ہوتا ہے ۔ ایک کتے کے مالک کو میں نے یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے ، اب مجھے اجازت دیجیئے ریزر کو شام کی ٹہلائی کے لئے لے جانا ہے ۔ یہ کتے ہر مہمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں اور شوق دست بوسی میں دوپایہ بیتاب رہتے ہیں ۔ ان کتوں کا شوق بڑا مہنگا ہوتا ہے ۔ ہم نے خفیہ طور پر گھر کی ماما سے یہ بات معلوم کی ہے کہ ان کتوں کے مالک زیادہ سے زیادہ کھانے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے پاس کھاتے ہیں اور ان کی نسل کو تحفتاً فروخت کر کے اپنے باورچی خانے سے دھواں اٹھاتے ہیں ۔

ایک جدید قسم پولس کے کتوں کی اخباروں کے ذریعہ متعارف ہوئی ہے اور سرکاری آؤ بھگت کے مزے اڑاتی ہے چوری کی وارداتوں میں ان سے کام لیا جاتا ہے اور اکثر صورتوں میں ان کی سراغ رسانی جس مقام پر رکتی ہے وہ ایک ناکردہ گناہ کا ٹھکانا ہوتا ہے ۔ ہمارے ملازم غفور کا کہنا ہے کہ اس بھیس میں خود انسان جاسوس چھپے ہوتے ہیں ۔ اور یہ بات کچھ زیادہ مبالغہ پر مبنی نہیں ۔ کیونکہ انسان میں کتوں کے خصائل سب جانوروں سے زیادہ دریافت ہوئے ہیں ۔ ویسے اس اشرف المخلوقات کے اندر دنیا کے ہر درندے اور چوپایہ کی مناسب نمایندگی کا انتظام ہے ۔ ایک صاحب ازراہ اعتراف حقیقت اپنے پیٹ ہی کو کتا بتاتے ہیں کہ اس پیٹ کی خاطر انسان وہ سب کچھ کرتا ہے جو کچھ کتا کر سکتا ہے اور جو کچھ کتا کر نہیں سکتا ۔

اب جگر تھامیئے کہ خاص کتوں کی باری ہے۔ سب سے پہلے اصحاب کہف کا کتا ہے۔ انسانوں نے ان بزرگوں کا ساتھ نہیں دیا، ل کتے نے دیا۔ اور اپنی عادت کے خلاف ہزاروں راتیں ان کے ساتھ ہم خواب ہو کر حق رفاقت ادا کیا۔ اس زمرے میں لیلیٰ کا کتا بھی مل ہے۔ لیکن وہ صرف مجنوں کی نظر میں، لیلیٰ یا اس کے مشابہ تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ وہ کتا کالا ہو گا۔ سب سے زیادہ مشہور تو لئیکا ہے ، خلا کی سیر کو نکلی اور یقیناً چاند پر بھونک آئی۔ وہ دن دور نہیں جب دنیا کے سارے کتے چاند میں پہنچ جائیں گے اور دنیا چین کی نیند ، ئے۔ اور آوا سیلون کا وہ کتا جو اپنے مالک کی گولی کا نشانہ بنا اور اس مالک کا رحم دل پڑوسی اپنی بیوی اور پانچ بچوں کو زندہ درگور چھوڑ س کتے کی خاطر خودکشی کر بیٹھا۔

ان خاص کتوں کے ساتھ وہ کرتب دکھانے والے کتے بھی ہیں جو ٹھوکریں کھانے والے انسانوں ۔ سامنے سامنے قندیل منہ ں تھامے چلتے ہیں یا پھر سرکس کے گھوڑوں پر سوار رہتے ہیں۔ ریاضی کے سوال حل کرتے ہیں۔ ان کتوں کی دم کاٹ دیں اور دونوں یاں پر کھڑا کر دیں تو ان سے مصافحہ کرتے وقت بیگانگی محسوس نہ ہو۔ اور ہاں وہ بھی تو خاص ہی کتے ہیں جو شیر افگن کہلاتے ہیں اور ل میں رہتے ہیں۔ کتے عام ہوں یا خاص، ان کی قطار اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ ہر ایک ان کے لئے پتھر تلاش کرے گا اور الزام مجھ پر آئے گا ۔ میں نے خوامخواہ اتنی بھیڑ جمع کی۔ اس لئے اجازت ہو تو ہز ماسٹرس وائس کا ایک ریکارڈ بجاتے ہوئے ان کتوں کو خلیج بنگال کے راستے ر نکالا جائے

(دیڑھ ماہی شگوفہ، نومبر دسمبر ١٩٦٨ء)

ڈاکٹر عابد معز

پاشو باہر سے آیا



نام ** سید خواجہ معزالدین
قلمی نام ** عابد معز
سنہ پیدائش ** ۱۹۵۵ء
تعلیم ** ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، ایم۔ ایس۔ سی (تغذیہ)
وطن ** حیدرآباد، دکن
ملازمت ** منسٹری آف ہیلت، ریاض، سعودی عرب میں برسرِ خدمت
دیگر سرگرمیاں ** ماہنامہ "شگوفہ" کے ایڈیٹر اوورسیز
تصانیف ** (۱) واہ حیدرآباد (سن اشاعت ۱۹۹۴ء)
(۲) سگ گزیدہ (سن اشاعت ۱۹۹۵ء)

انسان روزگار کی تلاش میں دربدر بھٹکتا ہے۔ دور دراز مقامات کا سفر کرتا ہے۔ مصیبتیں اٹھاتا ہے۔ اور خطرات سے کھیلتا ہے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں جا بستا ہے۔ بھلا ہو سائینسی ترقی کا جس نے کئی مسئلے حل کر دیئے۔ ہزار ہا میلوں کے فاصلے کو گھنٹوں میں طے کر دیا۔ سات سمندر پار رشتہ داروں سے گھر بیٹھے بات کر لیجیے۔ ضرورت اور سہولت کے زیر اثر حیدرآبادی شہری روزگار کی تلاش میں جہاں بھی سینگ سمائے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں حیدرآبادی شہری شیروانی پہن کر آپ کی تواضع پان سے کرتے ہوئے ملیں گے۔ حیدرآبادی شہریوں کے غول کے غول مشرق وسطیٰ کوچ کر گئے۔ ادنیٰ مزدور سے لیکر دانش ور اور تاجر تک سب نے مشرق وسطیٰ کا رخ کیا۔ اب آپ سے کیا بتائیں ہمارے شہر سے اتنے فن داں اور کاری گر باہر گئے کہ انہیں شہر میں ان کا کال پڑا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک بڑھئی ضرورت درپیش تھی۔ بہت تلاش کی لیکن کوئی بڑھئی ہاتھ نہ آیا تب ہمارے ایک بزرگ نے ہمیں پر خلوص مشورہ دیا۔ "میاں دوبئی چلے جاؤ وہاں تمہیں کئی حیدرآبادی بڑھئی مل جائیں گے"۔

باہر کی ہوا کھا کر آنے والا حیدرآبادی شہری آسانی سے پہچانا جاتا ہے دور ہی سے وہ اپنی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر آپ کی ناک سینٹ کی تیز خوشبو سونگھنے لگے تو یقین کر لیجیے کہ باہر سے آنے والا شہری کہیں آس پاس ہی ہے۔ اپنے شہر میں ہم سینٹ کی خوشبو کو "اپنائیت کی بو" قرار دیتے ہیں۔ دور سے سینٹ کی خوشبو سے اپنی آمد کا پتہ دینے کے علاوہ باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہری کا منفرد حلیہ ہوتا ہے۔ جو چیخ چیخ کر اعلان کرتا ہے، میں باہر سے آیا ہوں، سفاری سوٹ جو موٹے جسم پر منڈھ جاتا ہے۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے جس میں سے سونے کی زنجیر جھانکتی رہتی ہے۔ کلائی پر ڈھیلی ڈھالی جھولتی ہوئی گھڑا نما گھڑی، انگلیوں میں انگوٹھیاں، ایک ہاتھ میں باہر کی سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر دوسرے ہاتھ میں سینٹ میں تر بتر دستی اور پیروں میں اونچی ایڑی کی چپل یا جوتا۔۔۔ اس حلیہ میں کوئی آپ کو نظر آئے تو ایمان لے آئیے کہ یہ شخص یقیناً باہر سے آیا ہے۔

باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہری کا استقبال دھوم دھام سے کیا جاتا ہے۔ دوست احباب اور رشتہ دار جمع ہوتے ہیں۔ ایر پورٹ جاتے ہیں۔ بینڈ باجے کا انتظام ہوتا ہے۔ آنے والے شہری سے گلے ملتے ہیں۔ لیکن نظریں لگیج کا طواف کرتی رہتی ہیں۔ خیریت دریافت کرنا چھوڑ کر سوالات کرتے ہیں۔ "جی امی میرے لیے سونے کا بسکٹ لائے ہو نا" "بیٹا میرے لیے بلڈ پریشر کا پتہ لائے ہو" "بھیا میرا ایک اپ کا سامان" "بھائی جان میری سیکو گھڑی" "ڈیڈی بولتی گڑیا کہاں ہے" "انکل اسکوٹر بک کرنے کے لیے ڈرافٹ اس بار تو نہیں بھولے" "بار میرا ویزا"۔ آنے والا حیدرآبادی شہری ان سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ اور جب اسے سانس لینے کی فرصت ملتی ہے تو وہ اپنے دوستوں کی خیریت دریافت کرنے لگتا ہے۔ "ماموں کا انتقال کیوں کر ہوا" "ابو آپ دوائیں پابندی سے کھا رہے ہیں یا نہیں" "دادی ماں آپ کے لیے زیتون کا تیل بھجوایا تھا۔ اور اب بادام لایا ہوں، حریرہ بنا کر استعمال کیجیے" "اچھا منی کا یہ پہلا لڑکا ہے" "بڑی بی ابھی بقید حیات ہیں۔" اور یہ سوال کرنا کوئی حیدرآبادی شہری بھولتا ہی نہیں کہ "شہر کے حالات کیسے ہیں؟"

باہر کے آب و دانہ میں معلوم نہیں کیا تاثیر ہے۔ جو شہری باہر جانے سے پہلے سوکھے ساکھے تھے واپس ترو تازہ بن کر آتے ہیں جو موٹے تھے وہ مزید پھول جاتے ہیں۔ ایسے کہ جسم جگہ جگہ سے پھول کر غبارہ ہو جاتا ہے۔ رنگ نکھر جاتا ہے۔ چہرہ پرکشش ہو جاتا ہے۔ جب حیدرآباد میں خزاں تھی اور باہر بہار آئی ہوئی ہے۔ ہئیت بدل جانے کے علاوہ ایک طویل عرصہ تک باہر رہنے کی وجہ سے پہچان مشکل ہوتی ہے۔ گھر واپس آنے کے بعد رشتہ داری کی تجدید کرنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات دلچسپ واقعات بھی ہوتے ہیں۔ ایک کمسن لڑکی نے اپنی سہیلی کو بتلایا" پرانے ڈیڈی میرے لیے کار لائے تھے اور اب نئے ڈیڈی اڑنے والا جہاز لائے ہیں۔"

باہر سے آنے والوں کے لئے لازمی ہوتا ہےکہ ہم وطنوں کے لیے کچھ نہ کچھ تبرک لائیں۔ رشتہ دار سامان کھلنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ لگیج کے اطراف گھر والے بیٹھ جاتے ہیں اور باہر سے آنے والا شہری اپنے سامان میں سے ایک ایک چیز نکال کر تقسیم کرنے لگتا ہے۔ "تمہارے لیے ٹو ان ون" "آپ کے لیے شیروانی کا کپڑا" "بیٹی آپ کے لیے بات کرنے والی گڑیا" یہ منظر ہمیں اسکول میں دکھائے جانے والے "میجک شو" کی یاد دلاتا ہے۔ جادوگر اپنے تھیلے میں سے مطلوبہ اشیاء نکال کر بچوں کو دیتا ہے۔ اور بچے تالیاں بجاتے ہیں۔ باہر سے آنے والا جادوگر عام طور پر سینٹ اور سگریٹ اندر والوں کے لیے تحفتاً پیش کرتا ہے۔ باہر سے کم از کم سینٹ اور سگریٹ نہ لانا بڑی معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ "باہر سے اپنوں کے لیے سینٹ اور سگریٹ بھی نہ لاسکے تو باہر گئے ہی کیوں ابہیں رہتے اچھا تھا"

خلوص سینٹ اور سگریٹ سے آگے بڑھتا ہے تو ملبوسات، دستی گھڑی، کیمرہ، ٹو ان ون سے نوازا جاتا ہے۔ اکثر بھائیوں کو اپنی بہنوں کے لیے باہر سے جہیز لانا اور دولھا بھائی کو باہر لے جانا پڑتا ہے۔ لیکن جناب بعض نوجوان ایسے بھی ہیں جو باہر سے ہمارے شہری لڑکیوں کے لیے عرب کا بڈھا تحفہ میں لے آتے ہیں۔۔۔ باہر سے آئے ہوئے ایک حیدرآبادی نوجوان نے ایک بڈھے کھوسٹ عرب کا ہم سے تعارف کروایا۔ "آپ میرے آجر ہیں۔ حیدرآباد کا نمکین حسن انہیں یہاں کھینچ لایا ہے"۔

اب آپ سے کیا بتلائیں صاحب باہر سے لائے ہوئے اس بوڑھے جوان کو کئی حضرات فرزندی میں لینے کے لیے دوڑ پڑے۔

باہر جاکر آنے والے شہریوں کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں دنیا دیکھنے کے بعد ان پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ کہ خاموشی بہتر ہے اکثر سوالات کے جوابات میں صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ دھونس جمانے کے لیے چند عربی اور انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عربی دانی "کیف حالک" "مبروک اور شکراً" پر مشتمل ہوتی ہے۔ انگریزی میں قابلیت "سوری" اور "پلیزیز" تک محدود رہتی ہے۔ عربی دانی مبروک اور شکراً سے بڑھ کر "حبیبی" پر ختم ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی باہر سے آئے ہوئے صاحب کی مڈبھیڑ ایک ٹھیٹھ حیدرآبادی سے ہوئی تو انھوں نے کہا "اوے حیدرآبادی عرب! ہمیں شکراً اور مبروک سے آگے بھی

عربی آتی ہے ۔ لاحول اور آیت الکرسی پڑھوں گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے ۔

باہر جاکر آنے والے شہری عربی سیکھ لیتے ہیں یا نہیں، لیکن ان کی اردو بہتر ضرور ہو جاتی ہے ۔ اردو شعر سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے ۔ اردو کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھتے ہیں ۔ ہمارے شہر سے اردو اخبار منگوا کر خلیجی ممالک میں پڑھتے ہیں ۔ اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں ۔ غزلوں کے کیسٹ خرید کر سر دھنتے ہیں ۔ ایک صاحب نے ہم سے کہا بے چارے کریں بھی کیا ۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجرد زندگی گزار رہے ہیں ۔ ایسے میں اردو شاعری ہی ان کا واحد سہارا ہے ۔ جو عشق و عاشقی کے افسانوں سے بھری پڑی ہے ۔

ان کی باتوں سے ہمیں وصل و فراق کی اہمیت کا اندازہ ہوا ۔ اردو بہتر ہونے کے علاوہ بعض اصحاب خلیجی ممالک پہنچ کر شاعر، افسانہ نگار بھی بن جاتے ہیں ۔ جن کی تخلیقات یہاں اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں ۔

باہر رہنے والے شہری اپنے ہم وطن فن کاروں کی دیار غیر میں ہمت افزائی کرتے ہیں ۔ مقامی فن کاروں کو باہر بلا کر نوازتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں جلسے کرتے ہیں ۔ گلپوشی کی جاتی ہے ۔ اور ان کے فن کی تشہیر کی جاتی ہے اور اپنے وطن میں وہ ان ہی فن کاروں سے کترا کر نکل جاتے ہیں ۔ باہر سے واپس ہوتے وقت حیدرآبادی شہری اپنے ساتھ ڈھیر سارے کیسٹ اور اسٹریوفونک اور ہمہ قسم کے باجے لاتے ہیں ۔ گھر میں دن تمام باجہ بجتا رہتا ہے ۔ قوالیاں غزلیں فلمی گانے ڈرامے، مشاعرے، مزاحیہ پروگرام وغیرہ وغیرہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ اگر آپ کو کسی گھر سے شہنشاہ غزل مہدی حسن کی غزلیں سنائی دیں تو یقین کیجئے اس گھر کا کوئی نہ کوئی باہر ہے ۔

باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہریوں سے دوست احباب مخصوص قسم کے سوالات کرتے ہیں ۔ "ہم وطنوں کو آج تک بھی اتنے لوگوں کے باہر کوچ کرنے کے باوجود تشفی بخش جوابات نہ مل سکے ۔ کہتے ہیں عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی نہیں پوچھنا چاہئے باہر سے آنے والے شہریوں سے ان کی آمدنی پوچھی جاسکتی ہے انہیں آمدنی بتلانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن خدارا ان سے پیشہ اور کام کی نوعیت کے بارے میں دریافت مت کیجیے ۔ شاید ہی صحیح جواب ملے ۔ باہر جانے والے حیدرآبادی شہری کوئی بھی کام کو عیب نہیں سمجھتے ہیں وہاں انجینیر معمار کا کام کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر کمپونڈر بن جاتے ہیں ۔ میٹرک کامیاب لوگ وہاں انجینیر بنے بیٹھے ہیں یہاں باہر سے آنے والے ایک صاحب نے ہم سے کہا" وہ یہاں کام کرنے سے کتراتا تھا ۔ گھر میں نوکروں پر حکم چلاتا تھا محنت کرنا خلاف شان سمجھتا تھا ۔ لیکن وہاں شیخ کے اشاروں پر ناچتا ہے ۔ "

ہمارے شہر میں ہر دم آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مہنگائی کے لیے باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہریوں کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے ۔ گوشت ترکاری کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے لے کر منہ مانگے گھوڑے جوڑے کی رقم تک کے لیے باہر کا پیسہ ذمہ دار ہے ۔ اور مکانوں کے دام تو پوچھیے مت ہمارے ایک ساتھی کا خیال ہے کہ وطن میں ایمان داری سے رہتے ہوئے کوئی مکان تو کجا آخری آرام گاہ کے لیے دو گز زمین کا بھی انتظام نہیں کرسکتا ۔ ہم ایک گزیٹڈ آفیسر سے واقف ہیں جو وظیفہ کے قریب بھی کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں لیکن انہیں کی سرکاری کار کا ڈرائیور باہر جاکر صاحب جائیداد بن گیا ہے ۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لیے آج ہر حیدرآبادی شہری باہر جانے کا خواہشمند ہے ۔ باہر سے حیدرآبادی شہری گھر لوٹتے ہی اس کے اطراف باہر جانے کے خواہشمند نوجوان بھنبھنانے لگتے ہیں ۔ اس کی دلجوئی اور خدمت کرتے ہیں ۔ بڑے بوڑھے لوگ اپنے بچوں کے لے سفارش کرتے ہیں ۔ "بیٹا اسے کہیں ملازمت دلوادو تمہارا احسان ہوگا یہاں پر تو یہ کسی قابل نہیں ہے ۔ گھر پر پڑا روٹیاں توڑتا ہے ۔ باہر جائے گا تو چار پیسے کما کر لائے گا بہنوں کی شادیاں کرے گا ۔ باہر والے صاحب ہر کسی سے فوٹو کاپیاں "کوشش کروں گا" کی طمانیت کے ساتھ وصول کرتے ہیں ۔ فوٹو کا

موصوف کے جانے کے بعد ردی کی نذر ہو جاتی ہیں۔

خلیجی ممالک میں ملازمت کرنے والے حیدرآبادی شہریوں اور ان کے اہل وعیال کے طرز زندگی میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ پرانے گھر کی جگہ نیا گھر بنتا ہے۔ آرام و آسائش کی چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ بیمار ماں باپ، ڈاکٹر سے کہتے ہیں "ڈاکٹر صاحب آپ باہر کی دوائیں لکھیے ہمارا بچہ باہر ہے وہ بھجوائے گا۔" بچوں کو شہرت یافتہ انگلش میڈیم اسکول میں منہ مانگی رقم بہ شکل چندہ دیکر داخل کیا جاتا ہے۔ اسکول جانے آنے کے لیے سواری مقرر ہوتی ہے۔ آیا ساتھ جاتی ہے گھر پر ٹیوشن رکھے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بچہ کی قابلیت بے بی، کڈ مارننگ اور ٹاٹا سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔

باہر سے آنے والے حیدرآبادی شہری دوسرے سامان کے ساتھ بچوں کے لیے ہمہ اقسام کے الکٹرانک سامان لاتے ہیں۔ ریموٹ کنٹرول، کھلونا کہیں ہے اور صاحب کھلونا کہیں بیٹھا اسے کنٹرول کر رہا ہے۔ کھلونوں کو دیکھ کر بچوں سے زیادہ بڑے خوش ہوتے ہیں اور ملیا جاتا ہے۔ اور ان کھلونوں سے کھیلنے لگتے ہیں۔ ہم نے ایک گھر میں دیکھا، ماں باپ کھلونوں کی موٹر گاڑی ریس میں محو تھے جبکہ بچے اسٹیریو ٹیپ ریکارڈر اور کیمرہ سے کھیلنے سے زیادہ ان کی تربیت بنا رہے تھے۔

باہر مقیم حیدرآبادی شہری سال یا دو سال میں ایک مرتبہ پندرہ دن یا مہینہ بھر اپنے وطن میں قیام کرنے آتے ہیں۔ یہاں پر انھیں ڈھیر سارے کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ ساتھ لائے ہوئے خطوط اور پیامات کو پہنچانا، ساتھیوں کی خیریت کی اطلاع دینا، رشتہ داروں سے ملاقات کرنا ان کی دعوتیں قبول کرنا، اپنا پیٹ خراب کرلینا، جائیداد خریدنا، اپنی یا بھائی بہن کی شادی کرنا یا خود اپنی طرف سے دوست احباب کی شاندار دعوت کرنا۔ غیر مقیم حیدرآبادیوں کی وجہ سے ہی ہمارے شہر کی دعوتوں کا معیار اتنا بلند ہوا ہے۔ کہ ہم جیسے شہری صرف دعوتوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسی دعوت کا اہتمام نہیں کرسکتے۔ باہر سے آنے والے شہریوں کو اس تھوڑے سے وقفہ میں پھر واپس جانے کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ساتھیوں کے گھروں سے خطوط، اچار اور کباب کے ڈبے جمع کرنا پڑتا ہے۔ گھر والوں کے مسئلے حل کرنا، باہر جانے کے خواہشمند نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا پڑتا ہے۔ دوست احباب کی فرمائشوں کی فہرست بھی ساتھ رکھنا اہم کام ہوتا ہے۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد باہر سے آنے والے شہری کے واپس جانے کا دن آجاتا ہے۔ پھر ایکبار تمام دوست احباب جمع ہو جاتے ہیں پھول پہنائے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق کوئی گھڑی اتار لیتا ہے۔ تو کوئی انگوٹھیاں چھین لیتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے صرف ایک، دو جوڑے اور اچار اور کباب سے پر ایر بیگ کے ساتھ مگر مچھ کے آنسو آنکھوں سے بہاتے وداع کیا جاتا ہے واپسی کے دوسرے دن سے ڈرافٹ، کیسٹ، لیٹر اور خود موصوف کے واپس آنے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ غرض مایا جال کا یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔

(شگوفہ، جولائی ۱۹۸۵ء)

ڈاکٹر حبیب ضیا

بچّہ باہر گیا ہے



نام ** حبیب النساء

قلمی نام ** حبیب ضیاء (ابتدا میں حبیب توفیق)

پیدائش ** یکم نومبر ۱۹۳۵ء

تعلیم ** یم اے، پی ایچ ڈی (عثمانیہ)

ملازمت ** پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ (موظف)

تصانیف ** گویم مشکل، انیس بیس (مزاحیہ مضامین) دکنی زبان کی قواعد، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، حیات اور کارنامے، شاد اور نیاز

انعام یافتہ ** اندرا گاندھی نیشنل فونڈیشن ایوارڈ بہترین "مزاح نگار ادیب" ۱۹۹۵ء

اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور صدر خاندان کے ہاتھ میں چار مینار سگریٹ کی بجائے "ڈن ہل" کی قیمتی ڈبیا دیکھیں تو کھلے سے یقین کر لیجئے کہ اس گھر کا کم از کم ایک بچہ ضرور باہر گیا ہے۔ یہ تو صرف پہلی علامت ہے۔ دوسری اور بہت سی علامتیں ہیں جن سے اس متعدی مرض کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ ایک جگہ ہم کافی عرصہ کے بعد ملاقات کے لئے گئے۔ دروازہ کھولنے جو لڑکی آئی وہ زمانہ گذشتہ میں چھینٹ کا کرتا اور سفید پاجامہ پہنا کرتی تھی اب جو دیکھا تو چمک والی میکسی زیب تن کئے ہاتھ میں "ٹو ان ون" لئے کھڑی تھی رونا لیلیٰ کی ٹیپ کی ہوئی غزل کا کباڑہ کرتے ہوئے خود بھی بے سری آواز میں ساتھ گا رہی تھی۔ آئیے کہتے ہوئے اس نے ہمیں اندر سے جا کر صاف ستھرے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے ایک رنگین تصویر تھما دی جو اتفاق سے ہماری ہی تھی اور اسی وقت لی گئی تھی۔ وضاحت طلب کرنے پر جواب ملا "جی! یہ آٹو میٹک کیمرے کا کمال ہے۔ میرے چھوٹے بھائی دہران سے لائے ہیں۔"

ابھی ہم آٹو میٹک کیمرے کے کمالات کو دیکھ کر دنگ ہونے والے ہی تھے کہ صاحب خانہ میلے بلاؤز پر اجلی چائنا سلک کی ساڑی تھپنے برآمد ہوئیں۔ جو انہوں نے اسی وقت تبدیل کی تھی ہم سے چند منٹ گفتگو کر کے وہ بچی کو اشاراتی زبان میں کچھ کہتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی لڑکی دوسرے کمرے میں گئی اور اٹھلاتی ہوئی گرائنڈر لے کر واپس ہوئی۔ ہم نے پوچھا "اسے کیا کہتے ہیں؟" لڑکی تعجب سے بولی "آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم! یہ مسالہ پیسنے کی مشین ہے۔ بڑے بھائی دوبئی سے لائے ہیں۔" اتنے میں ماں نے پکارا "بیٹی! گرائینڈر جلدی سے لے کر آؤ، مجھے دو الائچیاں پیسنی ہیں۔" ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دو الائچیاں گرائنڈر کے منہ میں ڈالیں اور ایک منٹ میں الائچی کا پاوڈر ہتھیلی میں ڈال کر ہمیں دکھانے لگیں "دیکھئے! کس قدر باریک ہو گیا ہے۔" الائچی پاوڈر واقعی بہت باریک تھا.. ہمیں نظر ہی نہ آیا!

ایک جگہ ہمیں کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ جاتے ہی حسب عادت، ہم باورچی خانے میں گھس گئے۔ سل بٹے کے پاس خلاف توقع

سرکی پچی کے بجائے میڈان جاپان" کی نقلی مہر لگی وولی ساڑی پہنے یک کافر ادا ماما مسالہ پیس رہی تھی۔ قریب جاکر دیکھا تو مسالہ ایک دم سفید تھا۔ ہم نے مالکن کو رائے دی کہ پھلی ٹھیک سے بھونی نہیں گئی۔ بگھارے بیگن کا سالن لذیذ نہ ہوگا۔ اس پر وہ پہلے تو صرف مسکرائیں، پھر ہماری پیٹھ پر پوری طاقت سے مارتے ہوئے بڑی سائز کا قہقہہ لگایا، پان کی پیک ہمارے کپڑوں پر اچھالی۔ جب اطمینان ہوگیا کہ کافی چھینٹے پڑ چکے ہیں تب قہقہہ کو بریک لگاکر انہوں نے حقارت سے ہماری طرف دیکھا اور بولیں

نادان! یہ پھلی نہیں بادام ہیں بادام امیرے منجھلے لڑکے نے جدہ سے بھیجے ہیں۔" بگھارے بیگن میں بادام سن کر ہم ان کی قسمت پر رشک اور اپنی آنکھوں میں اشک لاکر سوچنے لگے۔

اللہ اللہ! کیا" انتر ہے" ہمارے اور ان کے معیار زندگی میں یہاں بیگن کو بادام کا پرہیز ہونے کے باوجود اس کے پیٹ میں لپٹے ہوئے بادام ٹھونس ٹھونس کر بھرے جارہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ڈاکٹر کی سختی سے تاکید پر بھی بادام کھانے کی بجائے بادام کا "ایسنس" دیکھا کرتے ہیں

غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں آپ نے کبھی نہ کبھی سنا ہوگا کہ جب کوئی دیار غیر میں مرجاتا ہے تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ ہم بھی اس اصطلاح سے واقف ہیں لیکن " غائبانہ ختنہ کے پھول " یا " غائبانہ چھلہ چھٹی " کا دعوت نامہ دیکھ کر ہم انگشت بہ دندان رہ گئے۔ ریاض میں نواسے کی ختنہ ہوئی، حیدرآباد میں ارمان نکالے گئے۔ نانا پھول پہنے حریرہ روٹی کھاتے ہوئے روپے سمیٹ رہے تھے۔

کویت میں کسی کے گھر لڑکا ہوا، حیدرآباد میں دھوم سے کھیر چٹائی کی گئی۔ دادا لپٹے کھیر چاٹ رہے تھے۔ باہر جاکر آنے والوں کو دکاندار بھی خوب پہچاننے لگے ہیں۔ وہ ان کی دولت کی افراط اور خرچ کرنے کے ڈھنگ کو اچھی طرح پرکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ لاڈ بازار کے کڑے والے اور گلزار حوض کے جوہری ان لوگوں کو عربی میں سلام کرنا اور خوش آمدید کہنا سیکھ گئے ہیں۔ ایک دن ہم کڑے لینے کے لئے لاڈ بازار کی ایک دکان پر گئے۔ باہر سے آنے والا ایک خاندان چار سو روپے کے کڑے آٹھ سو روپیوں میں خرید کر واپس ہو رہا تھا۔ جگمگاتے خوبصورت کڑے شوکیس کے اوپر ہی رکھے ہوئے تھے۔ جوں ہی ہم نے کڑے دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دکاندار نے جھپٹ کر وہ اٹھالئے اور شوکیس میں رکھ کر دوسرے معمولی کڑے ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں اصلی نگوں کے کڑے چاہئیں۔ وہ حقارت سے بولا۔ " آپ نے اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں؟" ہم نے کہا" ابھی دیکھ کر تو نکلے ہیں" اتنے میں کڑے والے کی پچی جو زبان پہنانے والی نے ہمیں دھکا دے کر سیڑھیوں سے نیچے اتارتے ہوئے کہا" جاؤ اماں آگے جاؤ یہ بیوپار کا وقت ہے"

بچے باہر جارہے ہیں، شیخوں کی طرح خوب کمارہے ہیں، خود کھارہے ہیں، ماں باپ، بہن بھائیوں کا سہارا بن گئے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن مشکل ہے کہ بعض بچے شیخوں کی سی عادتوں میں مبتلا ہوگئے ہیں یعنی وہی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنا، ٹی وی کی طرح بیوی ذرا پرانی ہوئی اسے پھینک دینا اور پھر خوب سے خوب تر مال کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔ ایک صاحب، خیر سے ایک بیوی کے شوہر اور ڈھائی بچوں کے باپ ہیں۔ اچانک انہوں نے اعلان کر دیا۔ " میں دو شادیاں اور کروں گا۔ اس اعلان پر ابتداء میں تو ماں باپ بیوی بچے، اڑوس پڑوس سبھی ہنسنے لگے کہ بیوی پر جان چھڑکنے والا اور بچوں سے والہانہ پیار کرنے والا یہ آدمی مذاق کر رہا ہے۔ لیکن جب اس مرض کے پورے آثار نمودار ہوگئے تو کسی نے ان سے پوچھا" یہ ادھیڑ عمر میں آپ کو دوسری شادی کی کیا سوجھی؟" جواب ملا" میرے پاس روپیہ بہت ہوگیا ہے۔ ایک بیوی اور اس کے گنتی کے چند بچے اس دولت کو خرچ نہیں کر سکتے۔" چالیس سال کی عمر میں انہوں نے دوسری مرتبہ سہرا باندھا، دھوم سے دوسری شادی رچائی۔ پرانی بیوی کو حیدرآباد میں چھوڑ

کر نئی نویلی دلہن کو لے کر سعودی عرب چلے گئے۔ چند دن اس نے فرماں برداری کا ثبوت دیا۔ پھر وہاں کے شیخوں کی دولت پر جو نظر پڑی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ خود ساختہ شیخ اس کی نظروں سے اتر گئے۔ سابقہ بیوی بچوں کی مکمل "ہائے ہائے" لگ گئی۔ ایک بعد اطلاع آئی کہ نئی بیوی رسی تڑواکر جو بھاگی تو پھر اصلی شیخ کے پاس جاکر ہی اس نے دم لیا۔

لیکن ایسے واقعات شاذ و نادر ہی سننے میں آتے ہیں۔ عموماً بے شمار خاندان آسودہ حال ہوگئے ہیں۔ ماں، باپ، بیوی، بچوں سکون کے سوا انہیں سب کچھ میسر ہے۔ کالی کلوٹی، نکٹی چپٹی، بہت موٹی، بہت دبلی، غرض کہ ہر قسم کی بہنوں کے لئے منہ مانگے دام ہو خرید نے کے قابل ہوگئے ہیں جن گھروں میں بکر عید میں مرغی بھی نہیں کٹتی تھی وہاں اب نام بہ نام بشمول نوکرانی چھ بکرے جارہے ہیں۔ لوگ یوں بھی کاج کرنے کا حیلہ ڈھونڈنے لگے ہیں چھوٹے موٹے کاج بھی ہوں تو گھر کی ایک پاشی کی جاتی ہے، گھر کے لگے رنگ برنگی برقی قمقمے جھلمل کرتے ہیں گویا سڑک پر سے گزرنے والوں کو اپنی زبان میں چلا چلا کر کہہ رہے ہیں۔

"دیکھو تو یہ شان! اس گھر کا ایک بچہ باہر گیا ہے۔

باہر کے یہ کرشمے دیکھ کر ہمارے بھی منہ میں پانی بھر آیا ہمارا تیرہ سالہ لڑکا جو ابھی تک ہمارے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے اس سے ہم نے کہا" بیٹا! تو کب باہر جائے گا، لاکھوں کمائے گا، مماں بابا کے لئے بانڈ بھیجے گا ہماری بات کاٹتے ہوئے اس نے مکر کے میں کہا" زیادہ گڑبڑ نہیں کرنا مماں۔ باہر بھجوانے کا نام سے تو آج سے اسکول جانا بند۔ لائیے نوالہ" نوالہ پورا کر کے وہ خدا حافظ کہہ ہوا باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ہمارے کچھ رشتہ دار سعودی عرب سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھ پوچھا" آپ کا بچہ کہاں ہے۔" ہم نے سر اونچا کر کے فخریہ انداز میں کہا

"بچہ باہر گیا ہے　　گلی ڈنڈا کھیلنے!!"

(نومبر ۱۹۷۹ء)

فیاض احمد فیضی

پھلوں میں رنگ بھرے



نام ** فیاض احمد فیضی
تعلیم ** ایم اے (اردو)
وطن ** بہار، مستقل قیام بمبئی
ملازمت ** بنک منیجر
تصانیف ** قند و زقند (مزاحیہ مضامین) کے علاوہ شیر مارکٹ پر مضامین کا سلسلہ

اچھے آدمی اور اچھے پھل دونوں کی کسوٹی مٹھاس ہے۔ اچھے پھل کی پہچان غالب کے الفاظ میں یہ ہے کہ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ اچھے آدمی کی شناخت یہ کہ بہت میٹھا نہ ہو، ورنہ اس پر سیاسی لیڈر، منافق، عاشق سیلز مین یا بیمہ ایجنٹ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اچھے آدمیوں کی تعداد بھی سماج میں کم سے کم ہونی چاہیئے ورنہ زندگی بے مزہ اور دنیا بے رونق ہو جائے گی لیکن اچھے پھل کا میٹھا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اچھے کریلے کا نیم چڑھا ہونا۔ ایک میٹھا پھل، کھٹے پھلوں سے بہتر ہوتا ہے بشرطیکہ اس میٹھے پھل پر آپ کا نام لکھا ہو، ورنہ پڑوسی کے باغ میں لگے تمام پھل کھٹے ہی ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کھٹے انگور والی کہاوت نہیں سنی؟

سنگترہ ۔ لیکن سنگترہ ایک ایسا پھل ہے جو اس کہاوت اور کلیے سے بالکل بے نیاز ہے۔ سنگترہ اس وقت تک ذائقہ دار نہیں کہلاتا جب تک اس کی مٹھاس میں ہلکی سی ترشی موجود نہ ہو۔ اس لیے پھلوں کے بیوپاری احتیاطاً کھٹے اور میٹھے سنگتروں کو بڑے اہتمام سے ملا کر بیچتے ہیں تاکہ اگر آپ اچھی کوالٹی کے ایک درجن سنگترے خریدیں تو ان میں تین یا چار میٹھے سنگترے شرطیہ آپ کو مل جائیں۔ عام طور پر ایک عدد اچھے سنگترے کی قیمت آدھے آم، دو چیکو یا تین کیلے کے برابر ہوتی ہے۔ سنگترے کے مستقل خریدار یہ فارمولا ہمیشہ یاد رکھتے ہیں تاکہ نئی جگہ کوئی انھیں ٹھگ نہ لے۔

سنگترہ تمام پھلوں میں سب سے خوش رنگ اور خوبصورت (انگریزی میں ہینڈسم) پھل مانا جاتا ہے اور حیرت انگیز طور پر اچھی صورت والے سنگتروں کی سیرت بھی اچھی ہوتی ہے۔ بدصورت لیکن عورتوں کو سنگتروں سے سبق لینا چاہیئے۔ مٹی کے بنے ہوئے بے روح اور بے مزہ سنگترے اصلی سنگتروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور کارآمد ہوتے ہیں اور عمر بھر ساتھ نبھاتے ہیں۔ جو لوگ اصلی سنگترہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ مٹی کے بنے ہوئے سنگترے خرید کر شوکیس میں سجالیتے ہیں اور بچوں کے سیانے ہونے تک انھیں بہلائے رکھتے ہیں اور خود بھی بہلتے رہتے ہیں۔

سنگترے کا چھلکا جو بظاہر بڑا بے ضرر معلوم ہوتا ہے، بہت مفید چیز ہے۔ اگر اس کا استعمال سلیقے سے کیا جائے تو کسی کے بھی ہوش ٹھکانے لگائے جاسکتے ہیں۔ سنگترے کے چھلکے کو راستے میں اس طرح پھینکنا کہ اس پر سے دشمن کا پیر پھسل جائے بڑی مہارت کا کام ہے۔ سنگترے کے چھلکے سے ایک عرق نکلتا ہے۔ اگر اس عرق کو دشمن کی آنکھوں میں ٹپکا دیا جائے تو وہ قدموں میں لوٹنے لگتا ہے۔ یہ شغل دوست کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے شوق سے بدرجہا بہتر ہے اور اس سے خیرسگالی کے جذبے کو فروغ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو سنگترے کی قاشوں میں معشوق کے لب لعلیں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ میٹھی اور ترش چیزوں کا موازنہ نمکین اشیا سے کرنا مناسب نہیں، دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کو سنگترے سے بہت پیار تھا اور وہ اسے پیار سے رنگترہ پکارنے پر بضد تھا۔ اس نے جس آسانی کے ساتھ کوہ نور ہیرا نادر شاہ کے حوالے کر دیا اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اسے سنگترہ کوہ نور سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ محمد شاہ رنگیلے کو جب بھی وقت (اور وقت کی اس کے پاس کوئی کمی نہ تھی) وہ اعلیٰ قسم کے سنگترے منگوا کر ان کا گودا نکلوا کر اسے قند کے شربت میں چند گھنٹے بھگنے کے لیے رکھ دیتا تھا اور پھر تنہا یا پلاؤ کے ساتھ ہضم کر جاتا تھا۔ اس ڈش کا نام اس نے راحت جان رکھ چھوڑا تھا۔ محمد شاہ نے جتنی دلچسپی سنگتروں اور ان سے ملتی جلتی چیزوں میں لی، اگر اتنی دلچسپی وہ حکومت کے کاموں میں لیتا تو تاریخ میں اسکا نام اتنا مشہور نہ ہوا ہوتا۔ وہ بے چارہ گم نامی کی موت مرجاتا۔ سنگترہ سستی اور مہنگی دونوں قسم کی شہرت حاصل کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتا ہے۔ بھوک ہڑتال کرنے والے لیڈر ہمیشہ اپنے ساتھ سنگترے کا جوس کا گلاس تیار رکھتے ہیں کہ پتہ نہیں کب کوئی وزیر باتدبیر آکر ان کی مانگوں پر غور کرنے کا وعدہ کرے اور انھیں سنگترہ کا رس اپنے دست مبارک سے پیش کرے

ایک معصوم سنگترے پر اگر ظلم و ستم کی انتہا کر دی جائے تو وہ احتجاجاً آدھے گلاس آرینج جوس میں تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن دودھ والے بڑی آسانی سے ایک سنگترے سے چار گلاس جوس تیار کر لیتے ہیں کہا جاتا ہے اس کی ترکیب برسوں پہلے کسی گوالے نے انھیں بتائی تھی تب سے آج تک یہ ان کا خاندانی راز ہے جسے وہ کسی کو نہیں بتاتے جب کسی بیمار کو کوئی بھی غذا نرس کے ہاتھوں بھی ہضم نہ ہونے لگے تو اسے سنگترے کا رس پلایا جاتا ہے جن حضرات نے محض بدہضمی کی وجہ سے شاعری کا پیشہ اختیار کیا ہوا ہے انھیں اور ان کی شاعری کو سنگترے کے رس سے افاقہ ہو سکتا ہے۔ سنگترہ مقوی قلب و جگر بھی ہوتا ہے خصوصاً ناکام عاشقوں کو وقت پر سنگترہ کھلایا جائے تو وہ راہ راست پر آجاتے ہیں اور عشق و عاشقی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لیتے ہیں بعض تو اتنے پشیمان ہوتے ہیں کہ فوراً والدین کی پسند سے شادی کر لیتے ہیں۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سنگترہ کھانے کے بعد دل بہت اداس ہو جاتا ہے اور طبیعت کرکٹ کھیلنے یا گانا گانے کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب تماشائی کرکٹ اسٹیڈیم میں خراب کھیل کھیلنے پر کھلاڑیوں کا استقبال سنگتروں سے کرتے ہیں یا ہال میں سامعین اکتا دینے والی گائیکی کی تعریف سنگترہ پھینک کر کرتے ہیں جس سے کبھی کبھی بے قصور طبلچی کو خاصی چوٹ بھی آجاتی ہے۔ یوں بھی عام طور پر سنگترے کی ساخت کرکٹ کی گیند جیسی اور اس کا سائز پکا راگ گاتے ہوئے استاد کے کھلے ہوئے منہ کے برابر ہوتا ہے۔

سنگترہ پڑھے لکھے، نفاست پسند اور کلچرڈ لوگوں کا پھل ہے اسی لیے امیر گھرانے کے لوگ اپنے ڈائننگ ٹیبل پر سنگترے بڑے اہتمام سے سجا کر رکھتے ہیں تاکہ اگر بھولے سے کوئی ایسا مہمان آجائے جسے ڈاکٹر نے گرم مشروبات استعمال کرنے کی ممانعت کر رکھی ہو اسے سنگترے سے بہلایا جائے۔ ایسے مریض مہمانوں کا انتظار کرتے کرتے جب سنگترے سوکھ جاتے ہیں تو انھیں بڑی دریادلی کے ساتھ

...دوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور کھانے کی میز پر تازہ سنگترے چن دیئے جاتے ہیں۔

...ریاست بہار کی دو چیزیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں ایک خود بہاری اور دوسرے لیچی۔ بہاری لوگوں کی تعریف الفاظ میں ممکن نہیں ہے، اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، آزمائش شرط ہے۔ ہندوستان میں سب سے عمدہ لیچیاں مظفر پور، بہار میں پائی ...۔ ملک پوچھیئے تو مظفر پور میں سوائے لیچیوں کے کچھ اور ملتا ہی نہیں۔ ریزگاری اور چھوٹے نوٹوں کی قلت کے زمانے میں وہاں ... لیچی ہی کو کرنسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہاں جہیز میں لیچی کے باغات کی فرمائش کی جاتی ہے۔ بنا لیچی سسرال پہنچ جانے ... کو عمر بھر طعنے سننے پڑتے ہیں۔ رشوت کے طور پر لیچی کے بکس افسروں کے گھروں پر پہنچائے جاتے ہیں۔

لیچی ان گنے چنے پھلوں میں سے ہے جنہیں کچی حالت میں نہ تو ترکاری کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اچار ڈالا جاسکتا ... لوگوں نے آج تک لیچی کی شکل نہیں دیکھی ہے اور صرف نام سنا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لیچی کسی چینی اداکارہ کا نام ہے۔ لیکن جن ... نے کسی چینی اداکارہ یاد آنے کی لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا ہے وہ لیچی کھانا ہی پسند کرتے ہیں۔ لیچی مونث ہے یہ بات بچہ بچہ جانتا ہے لیکن ... مطلب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کے نام کا آخری حرف ی ہو وہ مونث ہوتی ہے، دہی کی مثال ہمارے سامنے ہے اور یہ بھی ... نہیں کہ جو بات بچے بچے کو معلوم ہو وہ صحیح ہی ہو۔ آج کل جتنی غلط باتیں بزرگوں کے علم میں ہیں، اس سے کئی گنا زیادہ بچوں کو ... ہیں۔

...لوگوں کا خیال ہے کہ لیچی گول ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لیچی گول ہوتے ہوئے بھی گول نہیں ہوتی جو لوگ پھل کھانے ... پہلے پھل کی شکل و صورت پر غور کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں لیچی کا رنگ سیاہی مائل گہرا سرخ ... بعض لیچیاں زرد رنگ کی بھی ہوتی ہیں تاہم خون کی کمی یا اپنے انجام کے خوف کی زیادتی سے ان کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ مگر ... تبدیلی کا لیچی کے مزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کسی بھی رنگ کی لیچی میٹھی، کھٹ میٹھی یا پھیکی ہو سکتی ہے۔ اگر کردار بھی کوئی چیز ... ہے۔

لیچی کا چھلکا ذرا سخت ہوتا ہے جسے اتارنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس کا گودا تو بہت زیادہ نرم ہوتا ہے اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ عموماً باہر سے سخت دکھائی دینے والے لوگ اندر سے بہت نرم دل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پتھر کے مجسمے بھی طبیعت کے بہت ... ہوتے ہیں۔ راستوں پر کھڑے مجسموں کے سر پر بیٹھ کر کوے کتنی شیطانیاں کرتے ہیں مگر یہ اف تک نہیں کرتے۔ مسلسل خلاء میں ... رہتے ہیں۔ ڈپارٹمنٹل اسٹورز میں نصب مجسموں کو کوئی چھیڑ دے تو وہ حسین بت ناراض نہیں ہوتے، بس مسکراتے رہتے ہیں ... کے چھلکوں کو مزید سخت بنانے کے لئے قدرت نے اس پر نوکیلے دانے بنا دیئے ہیں۔ اس کی وجہ سے لیچی کو اگر دوسرے سے چھیننے کی کوشش کی جائے تو ہلکی سی سزا اسی وقت مل جاتی ہے۔ وہ لوگ جو ٹیلی ویژن کے اشتہاروں میں دکھائے جانے والے بلیڈ سے ڈاڑھی ... ہیں، کچھ عرصہ بعد ان کی ڈاڑھی، خصوصاً تھوڑی کا حصہ لیچی کے چھلکے کی طرح خطرناک ہو جاتا ہے ایک اندازے کے مطابق ایک لیچی کے چھلکے پر تقریباً ڈھائی سو نوکیلے دانے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس تعداد سے اختلاف ہے انھیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ لیچی کھائیں، لیچی ... یا اس کے چھلکے کے دانے نہ گنیں لیچی کی طرح کٹھل میں بھی اسی طرح کے نوکدار دانے ہوتے ہیں لیکن لیچی اور کٹھل کا موازنہ کرنا ... ہی بات ہے جیسے ممولے کو شہباز سے لڑا دینا۔ علامہ اقبال کے بعد اس طرح کے مقابلے کا اہتمام کسی نے نہیں کیا۔ بہر حال لیچی اور کٹھل میں فرق یہ ہے کہ اگر پچاس (۵۰) فٹ کی بلندی سے کوئی لیچی آپ کے سر پر گرے تو لیچی اور آپ کا سر دونوں ہی محفوظ رہیں گے ... کٹھل اگر محض پچیس فٹ کی اونچائی سے کسی پر گر جائے تو کٹھل پر قتل کا مقدمہ باسانی دائر کیا جاسکتا ہے

اچھی لیچی کی پہچان یہ ہے کہ اس کو دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھی لیچی کا چھلکا اتارتے ہی اس کے خوشہ رس کی دھاریوں بہتی ہے جیسے شیمپیئن کی بوتل کھل گئی ہو۔ جب لیچی سڑنے لگتی ہے تو اس کی رنگت آہستہ آہستہ مظلوم افریقیوں ... ہونے لگتی ہے۔ ان لیچیوں کو جوس سینٹرز کے مالک بڑے چاؤ سے خرید کر لے جاتے ہیں اور ان کے رس میں اصلی دودھ اور ... ملاوٹ کر کے لیچی ملک شیک کا لیبل لگا کر اونچے دام وصول کرتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ لیچی بیمار ہونے کے بعد بھی قوم کی بھلائی کا خیال رکھتی ہے۔ وہ رہنماؤں کی طرح نہیں کہ ذرا زکام ہوا اور قوم کے غم کو بھول کر فائیو اسٹار اسپتال میں چیک اپ کے لیے داخل ہو گئے۔

مظفر پور اور بمبئی دونوں ہی جگہ لیچی وزن سے نہیں بکتی اور نہ ہی درجن کے حساب سے ملتی ہے بلکہ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ کی تعداد میں ایک ساتھ ملتی ہے۔ یہ سعادت کسی اور پھل کو حاصل نہیں ہے۔ ان لیچیوں کو دکان دار گچھوں کی شکل میں باندھ کر رکھتے ہیں اسی لیے ان کی خریداری میں بہت چوکس رہنا پڑتا ہے ورنہ دکان دار سے گنتی میں غلطی ہو جاتی ہے اور ... پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ آج کتنی لیچیوں کی چپت پڑی۔ بیوی بچوں کی ڈانٹ پھٹکار الگ سننی پڑتی ہے اور منہ لیچی کی طرح لٹک جاتا ہے ... میں البتہ لیچی وزن سے بکتی ہے اس لیے کہ دلی والے چھوٹی موٹی بے ایمانیوں پر یقین نہیں رکھتے۔

لیچی حالاں کہ سب سے چھوٹے پھلوں میں سے ایک ہے لیکن پھر بھی یہ غریبوں کا پھل نہیں ہے اس لئے نہیں کہ لیچی مہنگی ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں پیٹ بھرنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت کیلے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے ... ہندوستان کے کسی بھی اسٹیشن پر اتر جایئے وہاں پلیٹ فارم ہو نہ ہو، کیلا ضرور دستیاب ہو گا۔ اس قدر متضاد صلاحیتوں کی مالک ... کے باوجود لیچی اور کیلے میں بہت دوستی ہے۔ چنانچہ پیلے رنگ کے ننھے منے کیلے کو لیچی کیلے، کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے ... چھوٹے قد کے آدمیوں کو بھی لیچی کا خطاب دیا جاسکتا ہے مگر خدشہ اس بات کا ہے کہ لیچیاں کہیں برا نہ مان جائیں۔

اردو شاعروں نے لیچی کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ وہ چاہتے تو اس قدر لذیذ اور خوب صورت پھل پر دیوان کے دیوان لکھکر اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع کروا سکتے تھے مگر ہمارے شاعروں کے اعصاب پر دوسرے پھل (مثلاً آم) کچھ اس طرح ... رہے کہ لیچی کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ غالب نے سپاری کی مدح سرائی میں کتنے اشعار لکھ دیئے جب کہ لیچی سپاری کی ہی ساخت ... اور سپاری سے کہیں زیادہ خوش نما اور دلفریب چیز ہے۔ اگر غالب کو آموں کی طرح لیچیاں میسر ہو جاتیں تو سماج میں آج لیچیوں کا مرتبہ ... اور ہی ہوتا۔

سیب - برنارڈ شا، شیکسپیر، گوئٹے، موپاساں، میکسم گورکی، آسکر وائلڈ، فرانز ... کسی اور مفکر کا قول ہے کہ جو شخص روزانہ ... سیب کھالیتا ہے اس کے گھر ڈاکٹر کبھی نہیں آتا۔ مشہور و معروف مفکرین کے بہت سے دوسرے اقوال کی طرح یہ قول بھی ... معلوم ہوتا ہے۔ آخر ڈاکٹروں کی بیویاں بھی روزانہ سیب کھاتی ہیں مگر ان کے شوہر تو بلاناغہ رات کے دو بجے گھر پہنچ ہی جاتے ہیں ... لیڈی ڈاکٹر ہیں جو ہر روز کئی کئی سیب چٹ کر جاتی ہیں پھر بھی ان کے گھر کئی کئی ڈاکٹر روز ملنے آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر ڈاکٹر بھی انہیں مریضوں کے گھر جانا پسند فرماتے ہیں جو روزانہ نہ صرف سیب بلکہ دنیا بھر کی مقوی اشیاء کھاتے رہتے ہیں اور مزید کھانے کی استطاعت اور تمنا رکھتے ہیں۔ دراصل سیب اور ڈاکٹر کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ آپ نے دیکھا تو ہو گا ہر اسپتال اور نرسنگ ہوم کے باہر پھلوں کی ایک چھوٹی سی دوکان ہوتی ہے جس میں دوسرے پھلوں کے ساتھ سیب بھی سجے ہوتے ہیں دوسرے پھل ممکن ہے مریضوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہوں لیکن سیب زیادہ تر ڈاکٹروں اور ان کی بدولت خوب صورت نرسوں کے بھی کام آتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں سب سے مشہور سیب وہ ہے جو نیوٹن کے سر پر گرا تھا اور جسے دیکھ کر اسے کشش ثقل کا خیال آیا تھا ...

ارشمیدس کو نہانے کے ٹب سے پانی چھلکتے دیکھ کر وہ نادر اصول سمجھ میں آیا تھا جو آج طالب علموں کو بار بار سمجھانے پر بھی یاد نہیں ہوتا۔ وہ زمانے لد گئے جب لوگ پانی کے چھلکنے اور سیب کے ٹپکنے سے سائنسی انکشافات کیا کرتے تھے۔ آج پانی کے چھلکنے کا منظر دیکھ کر لوگوں کو میونسپلٹی کے زکام زدہ نل کی یاد آجاتی ہے اور پھلوں کو دیکھ کر سوئی ہوئی بھوک جاگنے لگتی ہے۔ سیب کا نام زمانہ قدیم سے بطور علامت استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن اب وہ وقت آیا ہے کہ اس علامت کے معنی سستے ہو گئے ہیں، علامت مہنگی ہو گئی ہے۔

ہمارے ملک میں ہر قسم کے لوگوں کے لیے الگ الگ قسم کے سیب دستیاب ہیں۔ اونچی اونچی عمارتوں کے پیچھے ریلوے لائن کے اس پار، فٹ پاتھوں کے اوپر اور غریبی کی لائن سے نیچے رہنے والے عوام کے لیے سڑے گلے سیب مناسب دام پر اور کبھی کبھی مفت مل جاتے ہیں۔ ادھ کچے اور پھیکے سیب غریب لوگ تہواروں کے موقع پر یا گھر میں کسی کے سخت بیمار ہونے پر خریدتے ہیں یا پھر دل کے درد والے سیٹھ انسانیت نوازی کے جذبے سے سرشار ہو کر کبھی کبھی اس قسم کے سیب اسپتالوں میں فوٹو گرافر کی موجودگی میں تقسیم کرتے ہیں۔ تیسری قسم کے سیب، دوسرے کی بیوی کی طرح خوب صورت اور دور کے ڈھول کی طرح سہانے ہوتے ہیں مگر ان میں سے [illegible] جانے بھوسہ نکلتا ہے۔ یہ بھوسہ دار سیب ذرا سستے ہوتے ہیں اس لیے یہ ہمارے ملک کے سب سے مظلوم یعنی متوسط طبقے کے تنخواہ دار والے ملازمت پیشہ حضرات کے ٹفن کی زینت بنتے ہیں یا پھر اول درجے کے ریستورانوں میں فروٹ سلاد کا حصہ بن جاتے ہیں۔ سب سے اول درجے کے میٹھے، رس دار، خوش رنگ، کشمیری سیب جو دیکھنے میں کشمیری لڑکیوں سے ذرا کم سرخ اور کم حسین ہوتے ہیں۔ کشمیری سیبوں کا مزہ جاننے کے لیے کشمیر نژاد ہونا ضروری نہیں ہے مگر ان کے دام اتنے ہوتے ہیں کہ ڈاکٹروں کے علاوہ [illegible] ٹیکس بچانے والے [illegible] ہندوستانی ڈرائیور اور کلرک اور سماج اور عیش [illegible] ہوئے غیر ملکی بوڑھے ہی خرید سکتے ہیں [illegible] دانت اور دل میں سیب کھانے کی لگن ہو۔

ممبئی میں ملکہ وکٹوریہ کے نام سے موسوم ایک ریلوے ٹرمینس ہے۔ اس اسٹیشن کے باہر بہت سے پھل والے خوانچہ لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بے چارے بہت خدا ترس اور رحم دل ہوتے ہیں اس لیے یہ بہت سستے داموں اچھی قسم کے سیب صرف [illegible] کو فروخت کرتے ہیں۔ ان سے اگر آپ ایک کلو سیب خریدنے کے بعد اپنے کسی شناسا دکاندار سے سیب کو دوبارہ تلوائیں تو ہر مرتبہ ٹھیک ساڑھے سات سو گرام سیب نکلتے ہیں، کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

سیب وہ واحد پھل ہے جس سے آگ بھی لگائی جا سکتی ہے اور گرم کمرے کو ٹھنڈا بھی کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ سیب میں فاسفورس اور لوہا دونوں ہی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ فاسفورس جو ماچس بنانے کے کام آتا ہے اور لوہے سے ایرکنڈیشنر بنتے ہیں۔ سیب کے چھلکے میں بھی کافی وٹامن پائے جاتے ہیں اس لیے اسے اتار کر پھینکنا نہیں چاہیے بلکہ وٹامن کی کمی رکھنے والوں کو تحفتاً پیش کر دینا چاہیے۔ محتاط لوگ تو سیب کو محض اس ڈر سے نہیں دھوتے کہ کہیں وٹامن پانی میں حل کر ضائع ہو جائیں۔ ویسے سیب کھانے کا سب سے رومانٹک طریقہ یہ ہے کہ براہ راست درخت سے توڑ کر دانتوں سے کاٹ کر کھایا جائے۔ اس سلسلے میں کسی کی بھی [illegible] سے سیب کا مزہ خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

سیب بہترین دماغی اور جسمانی غذا ہے لیکن اس کے لیے دماغ یا جسم کا ہونا بہت ضروری ہے چنانچہ وہ لوگ جو عقل سے بالکل پیدل ہیں یا جن کا حلیہ سائنسی لیباریٹری میں رکھے انسانی ڈھانچوں سے ذرا سا بہتر ہے، ایسے لوگوں کو اگر سیب کا پورا باغ بھی کھلا دیا جائے تو ان پر وہی اثر ہو گا جو کتے کی دم کو سات برس تک زمین میں گاڑنے کا ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ لوگ جو محض شہر بھر کی فکر میں دبلے ہیں بھلے وہ قاضی ہوں یا نہ ہوں، اگر انھیں روزانہ چار پانچ سیب کھلا کر ایک سیر دودھ پلا دیا جائے تو چند ہفتوں میں کایا پلٹ ہو جاتی

ہے۔ گال سرخ ہو جاتے ہیں اور آدمی سوشیل ورکنگ سے بالکل کنارہ کش ہو جاتا ہے لیکن بعد میں قرض خواہوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دماغی کام کرنے والوں کا تعلق ہے، وہ عمر بھر بھی اگر دماغی محنت کرتے رہیں تب بھی جی بھر کر سیب نہیں کھا سکتے۔ ہاں وہ اگر رشوت لینا شروع کر دیں تو بات اور ہے لیکن ہر شخص رشوت کا حقدار بھی تو نہیں ہوا کرتا۔ ایمان دار افسروں کی اکثریت آج صرف اس لیے ایمان دار ہے کہ انھیں بے ایمانی کے مواقع فراہم ہی نہیں کیے گئے۔

اس لیے، آئیے ان بیماریوں کی بات کریں جو عموماً صرف دولت مندوں کے گھر تشریف لاتی ہیں اور جن کا علاج سیب سے کیا جا سکتا ہے۔ حکما کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کو سوتے میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے انہیں چاہیئے کہ رات کو نیند کی حالت میں گھر سے نکلنے سے پہلے آدھ درجن عمدہ قسم کے سیب پانی میں بھیگنے کے لیے رکھ دیں اور اسی نیند کی حالت میں چہل قدمی کرنے نکل جائیں صبح سویرے اپنے گھر کا پتہ پولس والوں سے معلوم کر کے گھر لوٹیں اور رات بھر بھیگے ہوئے سیبوں کا رس نکال کر نوش فرمائیں۔ انشاء اللہ بہت جلد شفا ہوگی اور فیملی ڈاکٹر اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ حکمت کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ عادی شرابی کو دن میں کئی بار، جوش کیا ہوا سیب کھلائیں تو چند ہفتوں میں ہی شراب کی لت چھوٹ جاتی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے یہ تو مرحوم و مغفور حکما ہی جانیں، ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس علاج میں قباحت یہ ہے کہ اول تو شرابیوں کو پھلوں سے خصوصاً تازہ پھلوں سے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ہم نے آج تک کوئی بھی ایسا شرابی نہیں دیکھا جو شراب چھوڑنا چاہتا ہو۔ اگر زبردستی سے کسی شرابی کو سیب کھلا کھلا کر شراب چھڑا بھی دی جائے تو پھر اسے سیبوں کی لت لگ جائے گی اور وہ سیب خریدنے کے لیے بیوی کے نقلی زیور تک بیچ دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

(شگوفہ، جنوری ۱۹۸۹ء)

خواجہ عبدالغفور

بمبئی کی بارش



نام ** خواجہ عبدالغفور
** خواجہ نصیر الدین
تعلیم ** بی ایس سی، ایچ سی ایس، پی ایچ ڈی
ملازمت ** ایڈیشنل چیف سکریٹری حکومت مہاراشٹرا
بانی سکریٹری مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی
تصانیف ** قہقہ زار، شگوفہ زار، لالہ زار، گل و گلزار،
چمن زار اور طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ
وفات ** ۲۶ اپریل ۱۹۸۴

بمبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں کے رہنے والے سمجھتے ہیں کہ جب وہ اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں تو ان میں سے جو گناہ گار اور بدکار ہیں وہ تو خدا کی بنائی ہوئی جنت میں جاتے ہیں اور جو نیک اور اچھے لوگ ہیں وہ مرنے پر بھی اسی بمبئی میں رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کو یہ جنت سے بھی زیادہ اچھی جگہ لگتی ہے۔

معمولی طور پر تو بے شک یہ شہر بمبئی جنت نظیر ہے ہی یہاں کی گہما گہمی، دن رات کی رونق بالخصوص رات کی جگمگاہٹ اس عروس البلاد کے سوا اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ یہاں کے موسم بھی ایسے ہیں کہ گرما اور سرما کا تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ایک موسم ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہو گیا۔ البتہ بارش کا موسم تو بڑے دھوم دھام سے آتا ہے اس کی آمد آمد کی نشانیاں بڑی واضح ہیں سب سے پہلے تو چوپاٹی کی قلفی چاٹ اور دوسری ساری دکانوں کے اوپر ایک اور بہت بڑا چھت پڑ جاتا ہے کہ جیسے ایک بڑا ملک دوسرے چھوٹے ملک کے اوپر نیوکلیر چھتری چڑھا دیتا ہے۔ چھتری تو پھر ہر جگہ نظر آنے لگتی ہے۔ سب سے پہلے تو دکانوں میں بلکہ دکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر اور اسٹالوں اور پھر اس کے بعد ایک دم سے ہر آدمی کے ہاتھ میں اور سر پر بلکہ کبھی کبھی لوگوں کی آنکھوں میں۔ اسی لئے تو جب یہاں پر کسی کو سب سے زیادہ تعظیم والقاب کے ساتھ پکارنا ہوتا ہے تو اس کو چھتر پتی کا لقب دیا جاتا ہے۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ بیویاں اپنے پتی کو زیادہ بڑا سمجھتی ہیں یا چھتر پتی کو یعنی جس کو چھتری کہتے ہیں وہ حفاظت اور مدافعت دونوں کے کام آتی ہے چنانچہ شہر بمبئی میں جیسے ہی بارش کے موسم کے آثار کا وقت قریب آتا ہے۔ لوگ چھتری سے لیس ہو کر نکلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ایک دوست کو تو اسی سج دھج سے نکلتے دیکھا ہے کہ ہاتھ میں دو دو چھتریاں ہوتی ہیں۔ اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کہ ہو لے بارش، دیکھتے ہیں۔ ہم بھی کہ ہمارا کیا بگاڑ لے گی۔ بال بیکا ہونا تو بڑی بات ہے ایک بال بھی بھیگ جائے تو جب بار مان لیں ان کو اسی حال میں کئی بار دیکھ کر ہمت سے ہم نے ایک بار پوچھ ہی لیا بھائی صاحب یہ دو دو چھتریاں کس لئے؟ کیا ایک چھتری سے آپ کا

چاؤ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اپنی مسکراہٹ میں پنہاں بجلیوں کو اسی طرح گراتے ہوئے کہ جس طرح بارش میں بادلوں کی ٹکر سے آسمان پر بجلی کوند جاتی ہے جواب دیا" مجھے ایک بری عادت ہے اکثر جگہ اپنی چھتری رکھ کر بھول جاتا ہوں۔

اور جب بارش ہوتی ہے تو نہتا پکڑا جاتا ہوں۔ اس لئے احتیاطاً دو چھتریاں ساتھ میں رکھتا ہوں" ۔ بات معقول لگی اور ہم نے ان کی اس بات کو سراہا بھی۔ کچھ دن بعد اچانک ان سے فلورا فونٹن کے پاس لب سڑک مدبھیڑ ہوئی تو ان کو بارش میں شرابور دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ ہاتھ میں ایک چھتری بھی ہے دریافت کرنے پر کہ ماجرا کیا ہے وہ چمک کر بولے "ایک چھتری تو ہم کہیں بھول بیٹھے اور یہ دوسری چھتری ارے یہ تو ہم کھولنا ہی بھول گئے" ۔ تو یہ ہے بمبئی کی بارش کہ جو نہ صرف زمین آسمان جسم اور لباس پر چھاجاتی ہے بلکہ دماغ پر بھی اب آپ نے تو جان لیا کہ چھتری اور بارش کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے کہ بغیر چھتری کے آپ ایک بھی قدم گھر کے باہر نہیں نکال سکتے۔ ایک اور دوست کا ہمارا ساتھ سینما میں ہوا۔ پکچر ختم ہونے پر باہر نکلنے لگے تو وہ بڑی یاد سے مینجر کے کمرے میں گئے اور اپنی رکھائی ہوئی چھتری کا ٹکٹ بتاکر چھتری حاصل کی اور اس آدمی کو ایک روپیہ بخشش میں دیا۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ " بھئی یہ اتنی فیاضی کی ضرورت تھی کہ ایک روپیہ عطا کیا" تو انھوں نے اس طرح پھر ہمیں جواب دیا کہ جیسے کسی بڑے احمق کو عقل سکھارہے ہیں۔ "دیکھتے نہیں کہ اس نے کتنی بڑھیا اور کیسی نئی چھتری ہم کو دی ہے" ؟

یہ تو رہی بارش اور چھتری کی بات، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ انسان کو اپنی جان چاہے جتنی عزیز ہو اس سے کہیں زیادہ اپنے تن کے کپڑے عزیز ہوتے ہیں۔ چھتری پر ہی کیوں اکتفا کیا جائے۔ صاحب عقل لوگوں نے مزید حفاظت کی غرض سے برساتی یعنی واٹر پروف کوٹ بھی ایجاد کر رکھا ہے۔ جس کو بڑے اہتمام سے پہن لیا جاتا ہے اور اپنے کپڑوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ کچھ پلاسٹک کے ہلکے پھلکے واٹر پروف سے پہلے ربر کے موٹے موٹے لبادے پہنے جاتے تھے۔ جس سے آپ چاہے آسمانی بارش سے بچ جائیں لیکن جسم سے ابلتے ہوئے پسینے کے فواروں سے تو نہیں بچ سکتے تھے اور جتنا اوپر سے بچ جاتے اتنا ہی اندر سے بھیگ جاتے تھے۔ دیکھنے میں تو یہ معقول پہناوا ہے لیکن ہم نے بمبئی میں دیکھا ہے کہ لوگ اس کو اس طرح الٹ کر بھی پہنتے ہیں کہ اس کے بٹن سامنے کی بجائے پیٹھ کر طرف لگے ہوتے ہیں یہ کوٹ خاص قسم کا واٹر پروف نہیں ہوتا بلکہ معمولاً استعمال میں آنے والے کو ہی اس طرح پہنایا جاتا ہے کہ دیکھنے والا پریشان ہو جائے کہ اپ آگے کو آرہے ہیں یا پیچھے جارہے ہیں۔ لیکن اصل معاملہ یہ ہوتا ہے کہ سیکل یا موٹر سیکل پر سوار ہونے والے اس کو طرح پر پہن لیتے ہیں کہ بارش کا رخ تیز رفتار سواری میں آپ کو محفوظ رکھے۔

ایک بار، ہم نے ایک صاحب کو دیکھا جو دفتر کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد بڑی متانت سے اپنی پتلون اتارنے لگے وقت بہت سارے لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن معاملہ صرف یہ تھا کہ ان کی پتلون بھی واٹر پروف تھی جو انھوں نے اپنی پتلون کے اوپر پہن رکھی تھی۔

بمبئی کی بارش میں ایک اور حفاظتی اہتمام ہوتا ہے جس کو گم بوٹ کہتے ہیں۔ اس کو جوتوں کے اوپر سے پہن لیا جاتا ہے۔ تاکہ شریر بچوں کی طرح جنہیں نالوں، کھڈوں اور پانی کے ڈبروں میں سے چل کر جانے میں مزہ آتا ہے۔ آپ بھی اطمینان سے گذر سکیں بارش آپ کو تنگ نہ کر پائے۔

اب تصور کیجئے کہ اس بارش کا جو اور جگہوں پر بڑے سلیقے سے برستی ہے۔ ایک رخ قائم رہتا ہے اور وہ اس طرح کہ خاص زاویہ کو سنبھال کر آپ چلیں تو آپ کو چھو نہ سکے۔ پرانے زمانے کا قصہ ہے جب لوگ شمشیر زنی یعنی تلوار کے ہاتھ چلانے سیکھتے تھے۔ اور کبھی بغیر اپنی تلوار کے کبھی میان سے نہیں نکالا کرتے ایک بار اسی طرح کی مشق کو بارش نے آگھیرا۔ نہ کہیں بچاؤ کی صورت

اور نہ ان کو بھیگنے کا شوق تھا۔ فوراً ہی انہوں نے تلوار کو اس طرح گھمانا شروع کیا کہ بارش کا ایک بھی قطرہ ان کے جسم کو چھو نہ سکا۔ اور یہ بحفاظت تمام اپنے گھر پہونچ گئے۔

ہاں چھتریوں کی بات پر ایک اور واقعہ یاد آیا۔ قسمت کے مارے نزاکت مآب ثقہ آداب و مراتب کا لحاظ رکھنے والے لیکن وقت کے ستائے ہوئے ایک دوست نے اپنے نوکر کو بڑا سجھا سجھا کر رکھا تھا کہ وہ مہمانوں کی موجودگی میں جب بھی اس کو حکم دیں کہ شربت لائے تو وہ نوکر ضرور پوچھ لے "سرکار کون سا شربت لاؤں شربت بنفشہ، لیموں کا رس، موسمی کا رس، یا آرنج سوسیو یا، کوکاکولا حاضر وں کرد" گھر میں چاہے لیموں کے رس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ مگر یہ سوالات ضروری تھے۔ یا پھر یہ کہیں۔ "اماں چمن خاں ہمارے دیوان کا مسودہ تو لانا" اور وہ نوکر پوچھتا "سرکار کون سا مسودہ لاؤں پہلے دیوان کا دوسرے کا کہ تیسرے کا؟"

ایک بار یہ بارش کے موسم میں اسی طرح لڑک کر بولے۔ "چمن وہ جو ہمارے ابا جان کی چھتری رکھی ہے، اٹھالانا، نوکر نے ترنگ میں کچھ اس طرح پوچھ ڈالا۔ "سرکار آپ کے کون سے ابا جان کی چھتری لاؤں۔

چونکہ بمبئی کی بارش اور چھتری کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک واقعہ اور بھی آپ کے گوش گذار کر دوں۔ ہمارے گھر دعوت میں ایک دوست چھتری لے کر آئے اور جاتے ہوئے ایک صاحب اپنی چھتری بھول گئے دو چار روز بعد یہ تشریف لائے اور اپنی چھتری واپس مانگنے لگے۔ ہم نے پوچھا "بھئی کیسی چھتری کس رنگ کی چھتری" وہ بولے۔ "ارے صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں کوئی سی بھی کسی بھی دے دیجئے۔ اب ہمیں آپ سے جھگڑا کرنا ہے؟"

چھتری بھولنے اور کھو دینے کی بات تو اکثر ہوتی ہے لیکن ہمارے غائب دماغ پروفیسر دوست کو کیا کہئے کہ وہ چھتری ہاتھ میں لئے ٹہلنے جا رہے تھے۔ ہم نے سوال کیا۔ "یہ آپ بھیگ رہے ہیں اور چھتری ساتھ میں ہے" وہ چونک کر بولے۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میرے پاس چھتری بھی ہے۔"

(دیڑھ ماہی شگوفہ، اگست، ستمبر ۱۹۷۰ء)



ڈاکٹر سید عباس متقی

کچرا

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے کہ میں دفتر سے تھکا ماندا گھر میں داخل ہوا
میری بیوی اپنے تمام بچوں کو اس بری طرح پیٹ رہی تھی کہ
انسان کے بچے نہ ہوں، بیل کے بچے ہوں، میں خود بھی اپنے بچوں کو
پیٹنے سے گریز کرتا ہوں اور ان کی ماں یعنی اپنی بیگم سے بھی
التماس کرتا ہوں کہ پیٹنا ان کو چاہیے جن کے پیٹ بھرے ہوں
ایک متوسط خاندان بلکہ نیم متوسط خاندان کے معصوم چشم و چراغ
ہیں غربت و افلاس نے انہیں ایسا پیٹا ہے کہ مزید کسی کے پیٹنے کی
ضرورت نہیں لیکن ماں اگر اپنے بچوں کو پیٹ نہ سکے تو اس کی
ماں ہونے میں شاید خود اس کو شبہ ہونے لگتا ہے میری بیوی بہر حال
ایک مطلق العنان ماں ہے۔ چنانچہ اپنے بچوں کو نہایت دلی
پیٹا کرتی ہے۔ غرض وہ پیٹ رہی تھی بچے خوشی خوشی مار کھا رہے
تھے گویا وہ مار نہ ہو، نرم و لذیذ کیلے ہوں۔ میں نے ڈانٹ کر جوں
سے دریافت کیا کہ آخر تم لوگ اس طرح پٹ کیوں رہے ہو۔
انداز گفتگو کہ سوال ظالم سے نہ ہو بلکہ مظلوم سے ہو، میں نے خالق
کونین سے سیکھا ہے بہ روز حشر خداوند عالم زندہ در گور کر دیئے
جانے والی معصوم بچی سے پوچھے گا **بای ذنب قتلت** تجھے کس
جرم کی پاداش میں زندہ دفن کر دیا گیا ہے۔ یہ تیور نہایت
ناکی اور از حد برہمی کی علامت ہے۔ یقیناً پدر ظالم دختر مظلوم کے
آگے شرم سار ہوگا اور عین ممکن ہے کہ جہیز کے لئے نذر آتش کی
جانے والی دلہنوں سے بھی اللہ میاں کچھ ایسا ہی غضب ناک
کریں سوال تو ہمارا بچوں سے تھا لیکن بچوں کی ماں نے فرمایا
اور اعلان تینوں کو ملا جلا کر لکچر پلایا۔ تین دن سے کچرا
کوئی بچہ کچرا پھینکنے راضی نہیں۔ اچانک گھر میں کوئی مہماں چلا آئے
تو گھر کو گھوڑ خیال کرے۔ بڑے سے چھوٹے تک سب کچرا
ہیں اور کچرا پھینکنے سے روتے ہیں۔ چیختے چیختے گلا بیٹھا جا رہا ہے
مجال جو کوئی بچہ میری بات مانے" میں نے کہا نیک بخت دور بدل
گیا ہے، کچرا کرنا اور ہے، کچرا پھینکنا اور۔ کچرا کرنا اس دنیا کا دستور
ہے بچوں کا کیا گلہ۔ اور رہا کچرا دور کرنا، جب ملک و ملت اپنے
کچرے سے بے نیاز ہو اور اسے دور کرنے کی کوئی سعی نہ کرے

نام ** سید عباس متقی
تاریخ پیدائش ** ۱۷/ جنوری ۱۹۵۳ء
ولد ** سید محمد
تعلیم ** یم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی
ملازمت ** درس و تدریس
تصانیف ** دکھتی رگیں، چھٹی انگلی، میری بلا سے (مزاحیہ مضامین) اور کئی نثری و شعری مجموعے

[illegible] افلاطون نہیں کہ کچرے کی عفونت اور اس کے [illegible] ات سے باخبر بھی ہوں [illegible] کچرا [illegible] اسے اٹھا کر پھینک آتا ہوں

کچرا واقعی کچھ زیادہ تھا۔ کامل ایک نوکرا، حالانکہ اس میں پھلوں کے چھلکے ہرگز نہیں تھے [illegible] کچرے میں پھلوں کے [illegible] [illegible] وہ معیاری کچرا ہوتا ہے۔ میرے گھر کے ایسے کہاں نصیب کہ کچرے میں سیب اور بادام کے چھلکے ہوں۔ میرے گھر کا کچرا [illegible] [illegible] مشتمل ہوتا ہے۔ مرغ و ماہی کے بال و پر میرے کچرے میں کہاں۔ کوئی اس حقیقت [illegible] خیال [illegible] کہ میں اپنے [illegible] کا کچرا کر رہا ہوں۔ کچرے کا بھی کہیں کچرا کیا جاتا ہے، اسی لئے تو ہم محکمۂ بلدیہ کو برا بھلا کہنے کے قائل [illegible] البتہ ہم [illegible] کے مشورے سے گریز نہیں کرتے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جن دروازوں سے دعائیں درجہ مقبولیت [illegible] [illegible] حالات سے گزر رہا ہے اس کا ایک ہی علاج ہے یا تو سب کے سب انسان بن جائیں یا کم از کم سب [illegible] [illegible] خیالات کو لئے کچرے کا نوکرا اٹھالیا اور والہانہ انداز سے خارج از خانہ ہوئے۔

کچرا بھی کیا چیز ہے جب تک منتشر رہتا ہے کسی کو پھینکنے کی نہیں سوجھتی اور جب [illegible] [illegible] کچرے کو [illegible] برا کہے مگر کبھی کچرے کو برا نہیں کہتا [illegible] [illegible] ہوتا ہے۔ چاول کے بھوسے [illegible] کچرا [illegible] جاتا تو چاول کے [illegible] نہ بکتا۔ سیب کا پوست [illegible] [illegible] کے فروخت ہو سکتے ہیں [illegible] کاغذ کے [illegible] اپنے [illegible] کے بغیر [illegible] [illegible] ہوتی ہے۔ جب تک وہ اپنی [illegible] رہتی ہے، کچرا کہلائی نہیں جاتی [illegible] [illegible] جب کوئی چیز اپنی اصل سے [illegible] ہوتی ہے تو کچرا کہلاتی ہے۔

بشنو از [illegible] حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

[illegible] تک بال سر پر رہتے ہیں، سر کا حسن کہلاتے ہیں ان میں تیل ڈالا جاتا ہے کنگھی کی جاتی ہے [illegible] [illegible] ہیں اور جب یہی بال تراش خراش کی منزل سے گزرتے ہیں انہیں چھونا تک گوارا [illegible] [illegible] تو نہیں لیکن نہیں یہ خود غرضی نہیں ہے۔ یہ تو عین انصاف ہے۔ ناکارہ بلب [illegible] کچرا ہے [illegible] منقطع شدہ ناخن پر پینٹ لگائے۔ ان کا ٹھکانہ کچرا ہے۔ شکستہ آئینہ میں [illegible] کچھ ایسے ہی [illegible]

شاید مدتوں بعد کنڈی کے درشن ہوئے تھے۔ کنڈی کچرے سے ابل رہی تھی، جیسے [illegible] [illegible] میں کھوپڑیوں سے زہر اور قلوب سے تعصب ابلتا ہو وہاں گٹر سے گندگی اور کنڈیوں [illegible] [illegible] نہیں۔ دور دور تک کچرا ہی کچرا بکھرا ہوا تھا اور ہم کچرے کے کنارے کھڑے کچرے میں [illegible] [illegible] سے پھینکا جائے تو تہذیب و تمدن کا کچرا نہ ہو اس معاملہ میں ترقی پسند اور ترقی یافتہ ممالک [illegible] [illegible] کچرا ہی معیاری نہیں ہوتا بلکہ کچرے کی نکاسی کا عمل بھی معیاری ہوتا ہے۔ سنا گیا کہ لندن کے کچرے میں [illegible] [illegible] میں بیڈ رومس ملا کرتے ہیں۔ دوسری بات سے ہمیں اتفاق نہیں ممکن ہے راوی نے کچرے میں بیڈ روم [illegible] [illegible] ہے کہ بیڈ رومس میں کچرا دیکھا ہو۔ اخلاق اور اقدار کے اعتبار سے بھی چیزیں تمثیلی [illegible]

انسانوں کی آنکھیں محض اشکال متخیلہ سے دھوکہ کھاتی ہیں ورنہ جو کچھ ہے نظر آہی جاتا ہے۔ سعودیہ سے آنے والوں کا بیان ہے، دروغ برگردن راوی کہ وہاں کچرے میں موٹر کاریں تک نظر آتی ہیں۔ کاش ہم بھی سعودیہ میں ہوتے تو کچرانشین یعنی موٹر نشین ضرور ہوتے جب سے بے روزگاروں کا تبادلہ زور و شور سے ہو رہا ہے سنتے ہیں کہ وہاں بھی کچرے کا معیار مسلسل گرتا جا رہا ہے۔ کچرا کوئی ریال نہیں کہ جس کا معیار عام مائل بہ اوج رہے۔ گھڑ (گھورے) پر دور کہیں جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ تعجب ہوا کہ کچرے میں بھی جھگڑے۔ آوازیں، کچھ انسانی کچھ حیوانی تھیں۔ گھوم کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو چار کتے ایک انسان سے لڑ رہے ہیں اور انسان کتوں پر فتح پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج کا انسان جنگل کے شیروں پر تو فتح پا سکتا ہے لیکن شہر کے کتوں پر فتح پانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ کالے اور سفید دونوں کتوں نے شہر کے شہر خراب کر رکھے ہیں۔ غرض وہ کسی پر تکلّف اور پر اصراف دعوت کی بچی ہوئی بریانی تھی جس پر کتوں کے ساتھ انسان نے ہلہ بول دیا تھا۔ اس دور میں کسے اولیت حاصل ہے اس سے بحث کہاں، کسے سیاسی زور حاصل ہے، ایمان دارانہ بحث کا موضوع ہے۔ اب یہی دیکھیے رزق کو رزّق کہنے والے جامعات میں برسرِ روزگار ہیں اور اپنی بغلوں میں ید بیضا کی طرح اپنی تصانیف دبائے رزق کے مارے بال جبرئیل کی بجائے دو کا پہاڑہ یاد دلاتے ہیں۔ غرض گھڑ (گھورے) پر آدمی اور کتوں میں لڑائی جاری تھی ایک آدمی چار کتوں سے کہاں جیت سکتا۔ وہ بیچارہ کاندھے سے تھیلہ اتار کر بیٹھ گیا اور پلاسٹک چننے لگا اور کتے باآواز بلند بریانی کھانے لگے۔ ہمیں بہت عبرت آئی۔ دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ہم پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ کچرا انہیں چن رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے بعد کیا کریں گے یہ کہہ نہیں سکتے۔ ہندوستان جنت نشان ہے۔ حکومت کسی کو کسی کام سے نہیں روکتی بس کام تعزیرات ہند کی زد میں نہ آنا چاہیے۔

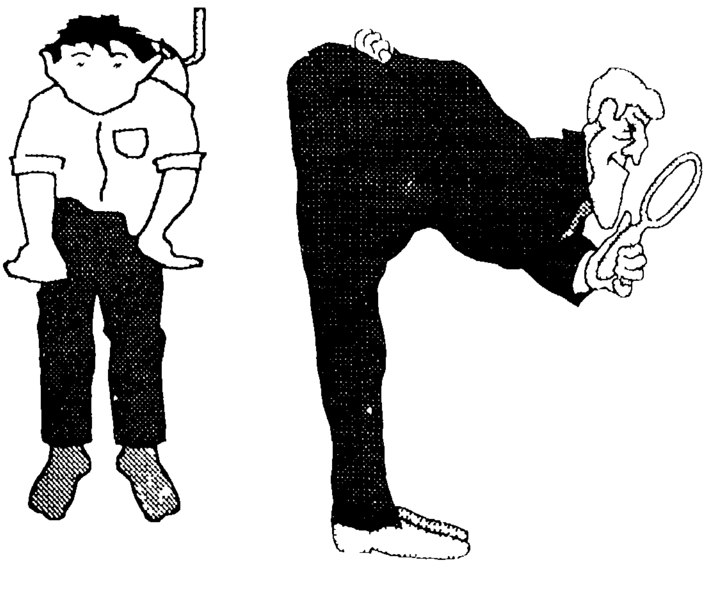
کچرے کی کنڈی پر میں ہی ایک شریف زادہ نہیں تھا اور بھی دو ایک صاحبین کچرا پھینکنے تشریف لائے تھے۔ شاید ان کی اولاد بھی ناخلف تھی۔ اولاد کا ناخلف ہونا آج کا فیشن بلکہ آج کی تہذیب کا مشن ہو گیا ہے۔ اگر اولاد نافرمان نہ ہو تو اس کے تعلیم یافتہ ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ ایک ضعیف آدمی سے میں نے دریافت کیا کہ حضرت آپ نے یہ کچرا پھینکنے کی زحمت کیوں گوارا کی۔ حضرت نے اپنے پوپلے منہ سے جواب دیا۔ میرے دو لڑکے ہیں، ایک ڈاکٹر ہے، دوسرا انجینیر، کچرا باپ نہیں پھینکے گا تو کون پھینکے گا، میں نے مکرر سوال کیا، کوئی نوکر چاکر؟ کہنے لگے دونوں بے روزگار ہیں۔ مجھے یک بارگی خیال گزرا کہ یا دونوں کچرا ہیں۔ کچرے کو کچرا پھینکنے میں عار کیسے، لیکن کیا کیجئے شہر کی حالت ہی ایسی ہے۔ کوئی اپنی حیثیت پہچاننے راضی ہے نہ صورت۔ بڑے میاں چلے گئے تو ہم نے دوسرے ضعیف العمر شخص سے خطاب کیا جو کچرے سے جوتوں کی ڈوریاں چن رہے تھے۔ جو غلطی سے کچرے میں آگئی تھیں۔ میں بہت حیران ہوا کہ کیا کچرا بھی تلاشا جاتا ہے۔ مگر فوری خیال آیا، اس مشاہدہ کا میں تنہا شاہد نہیں غالباً مرزا غالب بھی اس تجربے سے گزرے تھے تبھی تو انہوں نے کہا تھا

"کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے"

بڑے حضرت بڑے فریس تھے یوں گویا ہوئے "بچے جب جھاڑو دیتے ہیں تو کام کی چیزوں کو بھی کچرا سمجھتے ہیں۔ یہ دیکھئے جوتے کی ڈوریاں اور یہ چھوٹے سرمائی موزے، وقت پڑنے پر ان چیزوں کی اس شدت سے تلاش ہوتی ہے کہ اس جاں فشانی سے بے روزگاروں کو روزگار کی تلاش بھی نہیں ہوتی، بوڑھا بڑبڑا رہا تھا۔ بے چارے کی بڑبڑاہٹ ہذیان ہرگز نہیں تھی۔ اس میں معنی و مفہوم کے دریا موجزن تھے۔ "دنیا ہم بوڑھوں کو کچرا سمجھتی ہے، ناکارہ خیال کرتی ہے۔ بوجھ تصور کرتی ہے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو سینہ تان کر چلنے والے کہاں سے آتے۔ خدا ہماری ضعیفی پر رحم کھا کر جوانوں کو رزق دیتا ہے اور جوان ہم ضعیفوں کو کچرا سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے اس ضعیف آدمی کی اولاد پیش رو سے زیادہ لائق رہی ہو کہ وہ زیادہ دکھی لگ رہا تھا۔ بوڑھا کچرا پھینک کر جانے لگا۔ میں نے اسے غور سے

ں کے ہاتھوں میں رعشہ کے علاوہ ایک نوکرا، دو ڈوربان اور دو چھوٹے سرمائی موزے تھے۔
کچرے کی کنڈی میں کچرا پھینک کر جب میں نے بھی ان لوگوں کی راہ لینے کی ٹھان اور دو قدم چلا ہی تھا کہ میرے کانوں میں ایک
ٹھہر ذرا او جانے والے' میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم یک بارگی رک گئے، ماحول نے قدرے ملول کر دیا تھا۔ یہ آواز کیسی، یہ
صدا تھی یا صدائے بازگشت، لیکن محلے سے دور کچرے کی کنڈی کے پاس کون تھا۔ کوئی نہیں۔ میں کچرے کے تعفن سے فرار کی
رہا تھا۔ کنڈی کی ہر سمت و ہر جہت سے ابل رہی تھی۔ سڑاند سے ناک کے کیڑے جھڑ رہے تھے۔ لیکن میرے کان برابر اس آواز کا
رہے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کچرے کے انبار میں شیاطین ہوتے ہیں۔ سارے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ذرا ہمیں
ی کنڈی ہوں، اگر انسان کچرے کی کنڈی سے بھی ڈرنے لگے تو وہ گدھے سے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ گدھے کس شان دل ربائی
کاغذ چرتے ہیں، کنڈی گویا تھی "ذرا میرے اندر جھانکو، سارے محلے کی غلاظت کا بوجھ لیے کتنی خاموش کھڑی ہوں۔ لوگ مجھ
کنڈی کی لاد دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جو لایق تدفین ہوتی ہے۔ میں ہمہ تن گوش تھا بلکہ ہمہ سر ہوتی تھا۔ ادھر دیکھو اترا ہوا کھانا
ار میں پھینکا گیا ہے۔ کیا یہ سائلین و مساکین کا حق نہیں تھا۔ لوگ خساست کے طفیل دوسروں کو نہیں دیتے اور جب کھانا نہیں
اور چیزیں اتر جاتی ہیں تو میرے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان مال داروں کا ہے جو زندہ رہنے تک کسی کو نہیں دیتے اور جب
ملے ہیں تو کچھ اپنے ساتھ لے بھی نہیں جاتے، کچرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کس قدر تعفن ہے۔ ہم نے دستی نکال کر ناک پر
لیکن کان کھلے تھے آواز برابر آرہی تھی "یہاں دیکھو بہتر غذاؤں کے خراب نتیجے۔ نہیں معلوم آدمی کے معدے میں کیا ہوتا ہے جو
ار چیزوں کو متعفن چیزوں سے بدل دیتا ہے۔ آدمی اپنی صحبت کے مآل پر غور کرے ہوس مال میں گرفتار نہ ہو بلکہ قلت طعام کے
رمز پر غور کرتا رہے ایک رات کی صحبت نے قیمتی چیزوں کی قیمت ختم کر دی۔ "میں کچرے کی کنڈی سے بھاگنے کی کوشش کرے
میری آواز آئی "کیوں بیزار ہو گئے۔ تھوڑی دیر میری صحبت میں نہیں رہ سکتے۔ میں بدصورت و بدہیت کچرے کی کنڈی ہوں۔ اس
رہو گئے۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ کی طرح نہایت عالی شان اور خوب صورت نہیں ہوں نا۔ اب تو میرے کانوں میں کنڈی کے
سائی دینے لگے میں اس کی تلخ نوائی سے کچھ پریشان سا ہو گیا اور کچرے کا ٹوکرا لئے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔ دور کہیں پرانی فلم ہوٹ
کا گانا چل رہا تھا۔ ٹھہر ذرا او جانے والے بابو مسٹر گورے کالے، کب سے بیٹھے آس لگائے ہم متوالے پالش والے۔ ہم متوالے

(۲۰ نوری ۱۹۹۲ء)



عوض سعید

نعیم زبیری



نام ** عوض بن سعید

پیدائش ** دسمبر ۱۹۳۳ء حیدر آباد

تصانیف ** سائے کا سفر، تیسرا مجسمہ، رات والا اجنبی، کوہ ندا، خاکے، بے نام موسموں کا نوحہ، کنواں، آدمی اور سمندر

وفات ** جولائی ۱۹۹۵ء

میری زندگی میں حادثوں کا ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے نعیم زبیری کی دوستی بھی ان ہی حادثوں میں سے ایک ہے۔ پہلی ملاقات پر جب میں نے اسے چائے پیش کی تو وہ طشتری پھوڑ بیٹھا۔ دوسری دفعہ کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا۔ عجیب بور آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت مراسلہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی ہیں۔ اور آئے دن کپ اور پھوڑنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

اب مجھے موصوف کے حدود اربعہ کو سمجھنے میں آسانی ہو
ایک دن وہ عجیب و غریب انداز میں میرے پاس آیا۔ اس وقت سر تا پا ایک پر اسرار آدمی لگ رہا تھا۔

"میں نے ایک ادبی انجمن قائم کی ہے۔" ارتقائے اد

"اچھا تو پھر "

پھر کیا۔ چندہ تمہیں بھی آنا ہوگا۔
اس بے تکلفی سے کہہ گیا کہ میں اس کے چہ (Adjective) کو حیرت سے تکتا ہی رہ گیا۔ پھر اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ان شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوائے جو میرے حافظہ میں دور دور تک نہ تھے۔

"یہ کون لوگ ہیں۔" میں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی نیت سے پوچھا۔

"یہی اپنے سمیع اللہ قریشی، محمود الحسن اور مرزا طغرل بیگ اور کون؟"

"تب تو تمہاری انجمن میں شریک ہونا ہی پڑے گا"

میرے اس جواب پر اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ظاہر ہے۔"

اور میں بڑی دیر تک اس "ظاہر ہے" کے مزے لوٹتا رہا

ارتقائے ادب کے دو چار جلسے میں نے بھی اٹنڈ کئے کچھ نہیں تو میں نے وہاں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ایک صاحب کونے میں بیٹھے ہمیشہ "نے" کی غلطی نکالا کرتے تھے جن کا تعلق یوپی سے تھا۔ اور وہ شاید غلطی سے دکن میں پیدا ہوگئے تھے۔

ان کی پیدائش کے اس گھپلے سے فائدہ اٹھاکر وقتاً فوقتاً ہم نے بھی اپنی گرامر کچھ درست کرلی لیکن یہ علاحدہ بات ہے کہ وہ ہمیں دامد سکھاتے سکھاتے خود اپنی زبان بھول بیٹھے اور اس طرح ثواب جاریہ کا یہ سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔

اپنی انجمن کا دیوالیہ نکالنے کے بعد وہ مدتوں خوش خوش اس طرح پھرتا رہا جیسے دو جہاں کی نعمتیں اسے اچانک میسر آگئی ہوں۔

بہرحال نعیم اپنی ساری حماقتوں کے باوجود مجھے عزیز تھا اور آج بھی اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت وہ میرا سب سے قریبی یار ہے۔

شروع شروع میں، میں نے اسے ایک یونہی سا افسانہ نگار سمجھ رکھا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک کسی نے کہا کہ وہ عوامی مصنفین کے جلسے میں اپنی تازہ کہانی سنا رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ وہ بھی اور افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح ریل کا بیڑہ ضرور جام کرے گا۔ ۵۳ ۔ ۵۴ تک ادب کا کچھ یہی عالم تھا۔ لیکن جب اس نے ہانپتے کانپتے اپنی کہانی ، بیئرمسٹر 26 ... سنائی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ ... آگے چل کر بہت سوں کا بیڑہ غرق کردے گا۔ لیکن نعیم کی یہ شرافت تھی کہ اس نے اپنا ہی بیڑہ غرق کرلیا۔ اور رفتہ رفتہ لوگ بھول گئے کہ نعیم زبیری نام کا کوئی افسانہ نگار بھی کبھی حیدر آباد میں ہوا کرتا تھا۔

وہ کہانی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ... لڑی میں شائع ہوئی تھی وہ مدتوں ... لڑی کا پرچہ ہاتھ میں تھامے ... سڑکوں پر گھومتا رہا لیکن پھر بھی لوگ یہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہوئے کہ وہ کہانی نام کی کوئی چیز بھی ہے پھر کچھ ایسا ہوا کہ اس نے ... ہلکی پھلکی فارمولا ٹائپ کہانیاں بھی لکھ دیں جو مقامی روزناموں اور گمنام پرچوں میں چھپتی رہیں۔

نعیم کا خیال ہے کوئی پرچہ خراب نہیں ہوتا لکھنے والا خراب یا اچھا ہو سکتا ہے چنانچہ اس کے لکھنے اور چھپنے کا ایک طویل دور اس استدلال کو صحیح ثابت کرنے ہی میں گذر گیا نعیم پھر ایک بار گمنامی کے غار میں جا چھپا اور صرف مقامی ادیب بن کر رہ گیا ... ملنے سے خواہ مخواہ یہ احساس ابھرتا ہے کہ وہ کبھی شہرت کا حامل بھی رہا ہو۔ شہرت سے تو وہ ہمیشہ کوسوں دور رہا ہے نعیم نے ... ہی سے اگر معیاری پرچوں کی طرف توجہ دی ہوتی تو اس نے آج گمنامی کی برکتوں کو یوں دونوں ہاتھوں لوٹا نہ ہوتا۔

ایک دن میرے اصرار پر اس نے اپنی کہانی شکست "ادب لطیف" کو بھجوائی۔ مرزا ادیب نے لکھا کہ شکست ایک اعلیٰ درجہ کی کہانی ہے لیکن یہ لکھ کر انہوں نے ادب لطیف کی ادارت ہی چھوڑ دی۔ اور ادب لطیف دوسروں کے قبضے میں چلا گیا اور اس طرح نعیم پھر ایک بار مارا گیا۔ اور شکست کی اشاعت کسی معیاری پرچے کی بجائے ایک معمولی سے پرچے میں ہوگئی

شکست کی اشاعت کے بعد اس کے ایک قاری نے باغ عامہ سے گذرتے ہوئے نعیم کو دیکھ کر ایک ہانک لگائی۔ "نعیم بھائی، کہانی پسند آئی۔"

پتہ نہیں اپنے اس اکلوتے قاری کی تعریف سے وہ آج تک کیوں شرمندہ ہے۔ کبھی کبھی وہ پر لطف انداز میں یہ بھی کہتا ہے یار مانہ آگیا ہے۔ نعیم بھائی کہانی پسند آگئی کہہ کر سیکل سے الٹے منہ گر جانے والا قاری بھی اب ڈھونڈو نہیں ملتا۔

پھر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد میں نے اسے ورغلایا کہ "اوراق" کے لئے وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ایک کہانی داغ دے۔ پہلے تو ٹال مٹول کرتا رہا۔ پھر جب میرا اصرار بڑھا تو اس نے کہانی بھجوادی۔ اور جب وزیر آغا نے مہینوں گذر جانے کے بعد بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ نہ مایوس ہی ہوا اور نہ اداس۔

لیکن ایک دن اچانک میرے پاس "اوراق" کا افسانہ نمبر آیا تو اس میں اس کی کہانی بھی شامل تھی۔ ایک دن ملاقات ہونے پر میں نے جب اس سے پوچھا۔ "نعیم کیا تمہارے پاس بھی اوراق آیا ہے؟"

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اوراق تو نہیں معین فاروقی کاانگارے ضرور آیا ہے۔"
کیااس میں بھی تمہاری کہانی شامل ہے؟" میں شرارت سے پوچھا۔
میری شرارت کو بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔ "مذاق چھوڑو۔ پہلے یہ بتاؤ اوراق میں میری کہانی شامل بھی ہے یا نہیں۔"
پھر میں نے جب گھر پہنچ کر اسے اوراق کاافسانہ نمبر دکھایا تو وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ میں نے پہلی بار نعیم کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک دیکھی۔
"مردود وہ پرچہ مجھے دے دو۔"
کافی ستانے کے بعد میں نے اس کے ہاتھ میں اوراق تھمادیا۔ جس میں میری بھی کہانی شامل تھی۔ لیکن شاید بعد میں نعیم بھائی. کہانی پسند آئی کہنے والے قاری نے اسے ہتیالیا اور کسی کباڑیئے کے ہاں اسے فروخت کر دیا۔
مجھے حبیب نگر والا تنگ اور تاریک کمرہ آج بھی یاد ہے۔ جہاں اسے میں نے کئی بار خون اگلتے دیکھا تھا۔ اسے دق تھی اور وہ دق کے تیسرے اسٹیج پر بھی اس طرح مطمئن تھا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اب تو وہ کچھ اتنا بھلا چنگا ہو گیا ہے کہ آپ اس سے بہ آسانی ہاتھا پائی کر سکتے ہیں۔

دوستی کے باب میں اس کے سوچنے کاانداز اور رویہ عام شرفاء سے بالکل جدا ہے۔ مہینوں بعد بھی اگر آپ اس سے ملیں تو آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم اب تک کہاں روپوش تھے۔ اس کی اس سرد مہری سے اکتاکر اگر اس کا کوئی ساتھی خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ بڑھادے تو وہ فوراً اسے خداحافظ کہہ دے گا۔ خواہ وہ شخص اس کا محسن ہی کیوں نہ ہو۔
اس کے قریبی دوست یدماراؤ کو بھی اس سے یہی شکایت ہے کہ خداحافظ کہنے پر وہ مروتاً بھی کبھی یہ نہیں کہے گا۔ "ابھی تو آپ آئے ہیں، کچھ دیر رک جائیے۔ ایسے وقت اس کالمبا ہاتھ اور لمبا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے ساتھی کو رخصت کرتے ہوئے انگلیوں کی بجائے کہنی سے بھی کام لیتا ہے، اور اپنے اس عمل کو اس نے "اضطراری کیفیت" کانام دے رکھا ہے۔
اس کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی ہیں اور ان پڑھ بھی۔ شریف بھی ہیں اور حد درجہ بدمعاش بھی نعیم دوستی کے معاملہ میں کچھ اتنا چالاک ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس قماش کے ساتھی کو زیادہ عزیز رکھتا ہے۔
وہ ریس نہیں کھیلتا شراب نہیں پیتا۔ عشق نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ پان تک نہیں کھاتا۔ ہاں سپاری ضرور کھاتا ہے۔ بلکہ پھانکتا ہے۔ اگر آپ پلیٹ بھر سپاری بھی اس کے سامنے رکھ دیں تو اسے "گرین پیس" سمجھ کر کھاجائے گا۔ وہ ایسے ہی گھر میں زیادہ دیر بیٹھتا ہے جہاں اچھی چائے کے ساتھ سپاری بھی اسے کھانے کو ملے۔

چائے بھی اس کی کمزوری ہے۔ کھانے سے اسے کوئی خاص رغبت نہیں۔ اچھی پتی کی بنی ہوئی چائے کا وہ دیوانہ ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ اگر اسے یہ علم ہو جائے کہ ناگپور میں کسی چائے ڈیلر کے پاس ایک نئی اور قیمتی پتی آئی ہے تو وہ بے اختیار وہاں بھی پہنچ جائے گا۔ خواہ اسے قرض ہی لینا کیوں نہ پڑے۔
وہ لائف انشورنس کی افادیت کا بھی قائل ہے۔ اپنی پالیسی کو "Mature" ہونے کی منزل تک پہونچانے سے پہلے ہی ایک گمبھیر سانس کے ساتھ چپکے سے چٹ فنڈ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور ہراج کے موقع پر بولی دینے والوں میں سب سے اونچی اسی کی آواز ہوتی ہے۔ ان تمام الجھنوں کے باوصف اس کے ہاں اسکوٹر بھی ہے۔ وہ ایسے ساتھیوں کو ضرور لفٹ دیتا ہے جن کے ہاں کن وینس نہ ہو۔ وہ تو اس معاملہ میں اتنا شریف ہے کہ راستے میں اپنے دھوبی کو پیدل جاتا دیکھ کر بھی وہ لفٹ دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ خواہ اس

کپڑوں کا انبار ہی کیوں نہ ہو۔

بیکاری کے دنوں میں کبھی وہ صحافت سے بھی وابستہ رہا۔ ایک ہفتہ وار پرچے کی ادارت بھی کی۔ پبلشر کا بیڑہ غرق کرنے کے بعد صحافت سے اچانک ناطہ توڑ لیا۔ نئی کتابیں خریدنا اور "عالم کڑکی" میں انہیں پڑھ کر فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے کسی بھی کباڑیے کو اونے پونے داموں بیچ دینا اس کا ایک خاص مشغلہ ہے۔ اس لئے اس کے بک شلف میں آئے دن کتابیں گھٹتی رہتی ہیں۔ نعیم کتابوں کے سلسلے میں حد درجہ غیر ذمہ دار ہے۔ اس لئے اگر وہ کبھی آپ سے کوئی کتاب مانگے اسے ہرگز مت دیجئے۔ اگر مانگی ہوئی کتاب پر ڈسٹ کور ہو تو اس کی بدصورتی کو ڈھانکنے کیلئے وہ کوئی خوبصورت سا کور چڑھا دے گا تو آپ خوش ہو جائیں گے کہ نعیم کتنا معقول آدمی ہے۔ اس کے بعد اس کے بک شلف میں وہ کتاب نہ ہوگی۔ پوچھنے پر وہ اطمینان سے کہے گا۔ تمہاری کتاب مرزا صاحب لے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بیشتر صورتوں میں تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کے شلف سے کون کتاب اٹھا لے گیا ہے ورنہ ویسے وہ بڑا ایماندار واقع ہوا ہے۔ وہ آپ سے اپنی کسی بھی کتاب کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ خواہ آپ اس کتاب کو ردی ہی میں کیوں نہ بیچ دیں۔ بہرحال نعیم ایک ٹیپکل آدمی ہے۔

ڈریسنگ کے باب میں نعیم بڑا قدامت پسند واقع ہوا ہے جیسے فیشن کی دنیا نے اسے چھوا تک نہ ہو۔ لیکن صفائی کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ پتلون اور شرٹ کی جگہ وہ کوئی چیتھڑا ہی پہنا ہوا کیوں نہ ہو۔ کسی وقت ٹینوپال کا اشتہار معلوم ہوتا تھا۔ اب اس نے اپنی بدل دی ہے۔ وہ بھانت بھانت کے عجیب و غریب کپڑے اپنے جسم سے لپٹائے ہوئے سڑکوں پر نظر آتا ہے تو لوگ اسے ٹورسٹ سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

صحت کے سلسلے میں وہ بڑا کومیٹیڈ ہے اس لئے شدید مایوسی کے عالم میں بھی وہ گرتے پڑتے اندھیرے کو بھی اجالا ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاید اس لئے میں نے کبھی اسے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نہیں پایا۔ مشورہ دئے بغیر وہ ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے ملنے والوں میں بعض بھلے مانس ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ مخالف سمت سے سڑک پار کر بھی رہا ہو تو چیختے ہوئے کہیں گے "نعیم بھائی آپ سے کچھ کنسلٹ کرنا ہے۔" ایسے وقت وہ اپنے اسکوٹر کی رفتار کو تیز کرنے کی بجائے بریک لگا دیتا ہے اور اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے۔

وہ دواؤں اور پرہیز کے باوجود اکثر بیمار رہتا ہے۔ ایسے وقت اگر اس کا کوئی قریبی یار اس سے مشورہ کے لئے اچانک گھر آ جائے تو اس کی بیماری آنا فانا جاتی رہتی ہے۔

بحیثیت افسانہ نگار وہ ادبی حلقوں میں کم جانا پہچانا جاتا ہے جس کا اظہار اس نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں بڑے تیکھے انداز میں کیا ہے۔ کبھی کبھی بعض سخن گسترانہ باتیں بھی ایک خاص تناظر میں آ گئی ہیں۔ جو نعیم کی جدید ادب سے بے خبری کی غماز ہیں اس کے باوجود وہ کئی مشہور افسانہ نگاروں پر بھاری پڑتا ہے۔

نعیم بیک وقت ایک اچھا افسانہ نگار بھی ہے اور ایک بہت بڑا یونین لیڈر بھی۔ بحیثیت یونین لیڈر وہ دن ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔ آج مدراس میں رہتا ہے تو کل دلی میں۔ یونین اس سے چمٹی ہوئی ہے یا وہ اس کا اسیر ہے اس راز تک پہنچنے کی کبھی کسی نے کوشش نہیں کی۔

نعیم کی شخصیت کی سب سے بڑی اور ہولناک خرابی یہی ہے کہ وہ سچ کے پل صراط پر بھی بغیر ڈگمگائے گذر جاتا ہے۔ وہ اپنے اس وصف کے باعث اپنے ساتھیوں میں معتوب بھی ہے اور عزیز بھی۔

،حیدرآباد

اپنی بے شمار خامیوں اور خوبیوں سمیت مجھے نعیم بہت عزیز ہے اور نعیم کوئی آج کا دوست بھی نہیں ہے۔ ربع صدی سے ا۔
عاقب کر رہا ہے۔ زیادہ صحیح تو یہ بات ہے کہ میں ہی اس کی دلفریب، عجیب و غریب شخصیت کا اسیر ہوں۔ نعیم سے ملنے اور اسے
مخواہ گالیاں دینے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے اور کبھی کبھی جب وہ آپ جناب پر آجاتا ہے تو مجھے کوئی دوسرا ہی نعیم زبیری لگتا ہے اور اس
ملنے اور بات کرنے میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے اس خول سے باہر آجاتا ہے۔ دراصل یہی وہ نعیم زبیری ہ
یرا برسوں کا یار ہے ‎"‎ (جنوری ۱۹۸۲ء)

نعیم زبیری



محمد برہان حسین

اور آنا لندن سے ماہر ٹریفک کا



نام ** محمد برہان حسین
پیدائش ** ۱۹۳۶ء، حیدرآباد
تعلیم ** بی ایس سی (عثمانیہ)
ملازمت ** سائنٹسٹ (موظف)
تصانیف ** چند کلیاں نشاط کی (مزاحیہ مضامین)
رہنماور رہبر (کالموں کا انتخاب مطبوعہ رہنمائے دکن

لندن سے ایک ماہر ٹرافک کو شہر حیدرآباد کی ٹرافک کے مسائل حل کرنے کے لئے بلایا گیا وہ پہلی شام تھی ہم اس کو عابد روڈ کے چوراہے پر کھڑا کئے ہوئے تھے اس نے تھوڑی دیر ٹرافک کا نظارہ کرنے کے بعد کہا "ول مسٹر ایہاں کی ٹرافک کا کیا مسئلہ ہے مجھے تو کچھ خاص بات نہیں نظر آتی

ہم نے کہا "جی ایہ جو سامنے آپ کو بلڈنگ نظر آرہی ہے وہ پیالس ٹاکیز ہے۔ یہ یہاں سے پورے دو کلومیٹر دور ہے۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا "کیا آپ پوری طرح سنجیدہ ہیں

ہم نے کہا مسٹر وہاں جانے کے لئے آپ کو پہلے اس سے ایک کلومیٹر دور جانا پڑے گا پھر دوڑ کر واپس آنا پڑے گا۔

وہ کیوں

اس لئے کہ یہ ون وے ہے۔

اوہ ہاؤ فنی۔

ہم نے کہا یس ویری فنی۔"

ہم اس کو چارمینار لے گئے اس نے چار مینار کو دیکھنے کی بجائے سامنے بیچ سڑک پر بیٹھے ہوئے بیل کو دیکھا اس کی ہر طرف سے تصاویر لیں پھر پوچھا "یہ بیل اصلی ہے۔

ہم نے سینہ پھلا کر کہا۔ جی ہاں۔ بالکل اصلی ہے

اب ہم گولکنڈہ کی طرف اسکوٹر پر جارہے تھے شام ہو چکی تھی سڑک سیاہ تھی اور اندھیرا تھا دفعتاً اسکوٹر الٹ ا ری معلوم ہوا کہ اسپیڈ بریکر تھا منہ کے بل گرنے سے دانتوں سے خون ٹپکنے لگا تھا۔ لوگوں نے ہمیں اٹھا کر سامنے ہوٹل پہنچایا پانی منہ دھویا گیا۔ چائے پلائی گئی پان والے نے ہمیں فرسٹ ایڈ کے طور پر مفت پان پیش کیا ہم نے منہ میں رکھ کر چبایا اور ہماری چیخ نکل گئی۔

"ارے میاں پان میں پتھر ہے۔

پان والے نے اطمینان سے کہا۔ "دانت ہو گا صاحب دانت۔"

ہم نے پان اگلا تو واقعی دانت نکلا۔

پان والے نے کہا "ہوتا صاحب، آپ کا اسپیڈ بریکر کا کیس ہے نا؟"

ہم نے چیخ کر کہا "اسپیڈ بریکر اس طرح بنایا جاتا ہے۔؟"

پان والا بولا "دیوار ہے صاحب نظر نہ آنے والی دیوار۔ صاحب اگر تاناشاہ قلعہ کے اطراف تین تین فصیلیں بنوانے کے بجائے ایسے "گیٹ" اسپیڈ بریکر بنا دیتا تو اورنگ زیب کی فوج کے گھوڑے ٹھوکریں کھا کھا کے اوندھے گرتے اور آدھی فوج تو یہیں ختم ہو جاتی۔

لندن والے نے کہا "ہمارے یہاں تو اسپیڈ بریکر صرف اسکولوں اور دواخانوں کے آگے بنائے جاتے ہیں ان پر نمایاں پٹیاں ڈالی جاتی ہیں اور رات میں تیز روشنیوں کے مخصوص سگنل ہوتے ہیں۔

ہم نے کہا۔ یہاں الٹا ہے یہاں اسکولوں کے علاقہ گن فونڈری میں کوئی اسپیڈ بریکر نہیں۔ البتہ ہر گلی کوچہ میں موجود ہیں ان کو سڑک کی سیاہی میں چھپا دیا جاتا ہے۔ بھئی کلائمکس اگر معلوم ہو جائے تو پھر مزہ کیا۔ اس جگہ سے روشنیاں ہٹا دی جاتی ہیں گویا یہاں سے گاڑیاں نہیں گذریں گی بلکہ سہاگ رات منائی جائے گی۔"

لندن والے نے کہا "مگر ایسے اسپیڈ بریکر سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا ہاں شادی سے پہلے فائدے اور شادی کے بعد نقصانات ہوتے ہیں۔"

وہ حیران ہو کر بولا "یہ کیا بات ہوئی سمجھاؤ تمہارا مطلب۔"

ہم نے کہا "اب آپ سوچئے ایک آٹو رکشا میں ایک میل اور فیمیل کزن سوار ہیں۔ دونوں قربت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ہمت نہیں ہوتی۔ اتنے میں آٹو رکشا ایک اسپیڈ بریکر پر سے اچھلا۔ فیمیل کزن۔ میل کزن پر آگرتی ہے۔ میل کزن اسے تھام کر آٹو والے کو دکھاتا ہے۔ "آٹو والا کرکٹ کے امپائر کی طرح سگنل دیدیتا ہے۔

"اٹ از یور وکٹ سر۔"

"لندن والا ہنسا اور بولا اور شادی کے بعد؟"

ہم نے کہا ایک میاں بیوی ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔ بیوی کے گھر والے اس بات سے بے زار ہو چکے تھے۔ ایک دن اتفاق سے میاں کو کچھ رقم بطور رشوت مل گئی۔ اس نے اس خوشی میں بیوی کو بہت سے روپئے دیئے کہ وہ اچھے کپڑے اور چیزیں خرید لے۔ بیوی نے کہا "ہم کپڑے اور چیزیں خرید کر ذرا امی کے پاس بھی ہو آئیں گے۔"

شوہر نے کہا "ضرور چلی جانا"

بیوی نے خوب خریدی کرلی پھر آٹو میں سامان کی گٹھریاں اور ڈبے رکھے اور چلی۔ راستہ میں ایک اسپیڈ بریکر پر سے آٹو اچھلا اور بیوی سڑک پر گر پڑی۔ پیشانی پر زخم لگا اور خون نکلنے لگا۔ لوگوں نے زخم پر پٹی باندھی اور دوبارہ اسے مع سامان آٹو میں بٹھا دیا۔

اب جو امی کے گھر آٹو پہنچا تو بیوی یوں اتری کہ سر پر کے زخم سے خون رس رہا ہے۔ سامان کی گٹھریاں اور ڈبے ساتھ ہیں۔ بیوی کے بھائی نے جو یہ دیکھا تو سمجھا کہ بہنوئی نے اسے مار کر سامان کے ساتھ گھر سے نکال دیا ہے بس وہ چپکے سے پچھلے دروازہ سے نکلا اور بہنوئی کو چھرا گھونپ دیا۔"

دوسرے دن کی گفتگو کچھ اس طرح ہوئی۔

اس نے کہا "ول مسٹر آپ کا شہر کا دو حصہ ہے ندی کے دو طرف، ایک پرانا شہر دوسرا کم پرانا شہر۔

ہم اس کم پرانے شہر کی جسارت پر اچھل پڑے ۔ ۔ اس نے کہا "آپ کا مطلب پرانا اور نیا شہر ہے ۔"

وہ بولا "نو نو، ہم اس کو نیا نہیں کہہ سکتا آپ کے پرانے شہر کی ٹرافک قابل دید ہے اور کم پرانے شہر کی ٹرافک کم قابل دید" ہم نے کہا "ارے یار تم تو الفاظ کا استعمال اس قدر احتیاط سے کر رہے ہو جیسے وصیت لکھا رہے ہو ۔"

اس نے کہا "بھئی ایک بات تو بتاؤ ۔ یہ تیرے گاندھی کو فیملی پلاننگ کی کیوں سوجھی ۔ وہ یہ مسئلہ تو یہاں کی ٹرافک پر چھوڑ دیتا تھا بس تم لوگ ایک ہفتے کے لئے ٹرافک پولیس کو ہٹادو ۔ پھر دیکھو ۔ ٹکرا ٹکرا کر آدھی آبادی صاف ہو جائے گی اچھا میں چند تجاویز پیش کرتا ہوں ۔"

پہلی تجویز یہ ہے کہ آپ شہر کو ڈبل اسٹوری بنالیجئے ۔ جیسے ہم نے یورپ میں بنایا ہے ۔ آپ دوکانیں، سینما، ریلیں، زمین کے نیچے کر دیجئے اور سڑکیں اوپر ۔

ہم نے کہا "نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ یہاں سمنٹ اصلی نہیں ملتی اور نقلی سمنٹ بھی کنٹراکٹر کم مقدار میں ڈالتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین کے نیچے جو بھی جائے گا وہ اوپر کبھی نہ آئے گا ۔"

وہ بولا "او ۔ کے ۔ آپ رکشے بند کر دیجئے کیوں کہ یہ سڑک کے بڑے حصے کو بڑی دیر تک گھیرے رہتے ہیں ۔"

ہم نے کہا "یہ بھی نہیں ہو سکتا ۔ اس شہر میں ہر گھنٹہ میں ایک درجن بچے پیدا ہوتے ہیں ۔ ان میں سے آدھے رکشا چلاتے اور آدھے اس پر سواری کرتے ہیں ۔"

اس نے کہا "اوہو ۔ تو آپ کم از کم سیکلیں بند کر دیجئے"

ہم نے "ارے بھائی سیکلیں بند ہوئیں تو یہاں تلنگانہ ایجی ٹیشن شروع ہو جائے گا ۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ۔" اس نے پوچھا ۔

"دیکھو میاں انگریز! اس شہر کے لوگ سیکل کی بدولت ہر غم سے دور ہیں ۔ نئے شہر کا آدمی دس پیسے دے کر دونوں پہیوں میں ہوا بھراتا ہے ۔ اور پرانے شہر کا ایک چکر لگاتا ہے اور پرانے شہر کا آدمی خود ہوا بھر لیتا ہے اور پمپ والے کو پانچ پیسے دیدیتا ہے ۔ پھر وہ ہے اور اس کی سیکل ۔"

وہ پوچھ بیٹھا "کم پرانے شہر والا "ادھر پرانے شہر کو کیوں جاتا ہے ۔"

ہم نے کہا "مجبوری ہے میاں مجبوری ۔ اگر وہ نئے شہر میں پاجامہ کا کپڑا خرید کر سلا بھی لے تو ناڑا خریدنے اسے مدینہ بلڈنگ جانا ہی پڑتا ہے ۔ تم کو ناڑے ناڑے کی آواز تو یاد ہوگی ۔

وہ چونک کر بولا "اوہو ہو ۔ یس ۔ وہ آواز ادھر کم پرانے شہر میں نہیں آئی ۔

وہ بولا "اچھا تو پھر آپ اسپیڈ بریکر کو نکال ہی دیجئے اس سے ٹرافک کی رفتار کم ہو جاتی ہے ۔

ہم نے کہا "ہر اسپیڈ بریکر ایک میموریل ہے ۔"

"میموریل؟ کاہے کا؟"

"ارے صاحب جس طرح انگریز لوگ جنگ میں مرنے والوں کے میموریل بناتے ہیں نا ۔ اسی طرح یہاں ٹرافک کے حادثہ میں جب کوئی مرتا ہے تو میونسپل کارپوریشن وہاں اس کی یادگار اسپیڈ بریکر بنادیتی ہے ۔"

وہ غصے سے بولا "پھر یہاں کی ٹرافک پولیس کیا کرتی ہے ۔"

ہم نے کہا" وہ صرف پرسنل ٹیکس وصول کرتی ہے۔"

اس سے پوچھا" پرسنل ٹیکس کسے کہتے ہیں۔"

" وہ رقم جو سرکاری خزانے میں داخل نہیں کی جاتی۔"

اس نے کہا" اچھا آخر میں۔ کم از کم آپ جانوروں کو تو سڑک پر سے ہٹا دیجئے آپ لوگ اتنی بھینسوں کا کیا کرتے ہیں۔ بھئی امریکہ والوں نے بغیر بھینس کے ایک پورے صوبے کا نام بفالو رکھ لیا ہے حالانکہ یہ نام تو صد فیصد حیدرآباد کا حق ہے۔"

ہم نے کہا" بھئی افسوس یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہاں جانوروں اور انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھئے بنڈی میں بیل لگا ہے اور رکشا میں آدمی۔ اگر ہم آدمی کو تو رکشا چلانے دیں اور بیل کو ہٹا دیں تو یہ بیل سے ناانصافی ہوگی اور پاپ الگ لگے گا

اس انگریز نے یہ سن کر ہمیں گلے سے لگایا اور آنکھوں میں آنسو لاکر کہا" یہ مسائل ٹرافک یہ تیرا بیان غالب"

ہم نے کہا" ماہر ٹرافک لندن۔ تمہاری تجاویز ہمارے لئے قابل عمل نہیں ہیں اور ان پر نہ تم کو اپنا ہارس پاور خرچ کرنے کی ضرورت ہے نہ ہی ہمیں" اس نے بگڑ کر کہا" واہ تو پھر مجھے اس گرم ملک میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔"

ہم نے کہا" صرف اس لئے کہ ہماری ٹرافک پولس کے سالانہ بجٹ میں رقم بچ گئی تھی اور سال ختم ہو رہا تھا۔ اب آئندہ سال اس بجٹ میں میں تم سے انہی مسائل پر مشورہ کرنے لندن آؤں گا گڈ بائی، خوش رہو اور ویٹ کرو"

وہ بولا" او کے۔ ضرور آؤ لیکن واپس ضرور جانا۔"

(اپریل ۱۹۸۳ء)

حلیمہ فردوس

پیشے ہی پیشے



نام** حلیمہ فردوس
بیدر کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔
سیاسیات سے بی۔ اے اور اردو سے ایم۔ اے و پی ایچ ڈی
کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بنگلور کے ایک گرلز کالج میں لکچرر
ہیں۔ مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "ماشاءاللہ" شائع ہوچکا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اختر شماری، مردم شماری اور پیشہ شماری کرنے لگیں تو سب پر بے زاری چھاجائے۔ جب سے شماری کا سلسلہ کمپیوٹر اور کیالکولیٹر سے جوڑا گیا ہے انسان کسی شمار میں نہیں رہا پھر بھی چند ایسی "شماریاں" ضرور ہیں جن کے لئے صرف عقل انسانی کی ضرورت ہے۔

پچھلے زمانے کا انسان ملا کی طرح صرف مسجد کا رخ جانتا تھا۔ اس لئے کہ دنیا بہت محدود تھی۔ آہستہ آہستہ جب وہ رخ بدلنے لگا علم و ادب، صنعت و حرفت کی راہیں وا ہوئیں تو بے شمار پیشوں نے اسے پس و پیش میں ڈال دیا۔ پیشے آبائی، اعزازی، سرکاری، غیرسرکاری غرض ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ آبائی پیشے باعث افتخار ہوتے ہیں تو اعزازی پیشے وقت گزاری کا بہترین ذریعہ۔ آبائی پیشہ وروں کو اپنی عزت یعنی پیشہ کا بڑا پاس ہوتا ہے ورنہ غالب اپنے آبائی پیشے پر یوں نہ فخر کرتے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اعزازی پیشہ ور بیکاری سے بیگاری بھلی کے فارمولے پر کاربند رہتے ہیں۔ مثلاً فرشتوں کا دن رات تسبیح و تہلیل کرنا، آدم کا ہر لمحہ خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا رہنا اور شیطان کا بہکانا سب اعزازی پیشے ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آج کل بیشتر نوجوان برسر روزگار نہ ہونے کی بدولت اعزازی پیشوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ "کوئلہ کی دلالی میں ہاتھ کالے" یہ محاورہ تو صرف اعزازی پیشہ وروں کے لئے موزوں ہے۔ بوڑھا ہو یا بچہ پیشے کو حاصل کرنے میں پیش پیش رہتا ہے۔ آج کا نونہال جو کل کا شہری بنتا ہے اسے بھی یہی فکر رہتی ہے۔

پیشے سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

سرکاری پیشہ ور سرکار کے غلام ہوتے ہیں تو غیرسرکاری پیشہ ور بادشاہ۔ سرکار بھی بدل گئی اور پیشے بھی بدل گئے۔ موجودہ دور میں کوئی سررشتہ دار، عہدیدار، منصب دار،

جمعدار نہ رہا آج کا ہر فرد تو اکاؤنٹنٹ ، سپرنٹنڈنٹ، کمشنر بنا بیٹھا ہے اور انھیں دیکھ کر یہ آسانی اندازا لگایا جا سکتا ہے کہ ہر پیشہ ، ہنرور نہیں ہو سکتا کوئی دولت کے سہارے ڈگری لے کر ڈاکٹر بن بیٹھا ہے تو کوئی سرکاری رشتے کے ناطے (شیڈولڈ کاسٹ ٹرائب سرکاری رشتہ دار ہی تو ہیں) بہت بڑے عہدوں پر براجمان ہوتا ہے ۔ ایسے دور میں دو ہی پیشے قابل اطمینان ہیں ۔ ایک پی اے دوسرا چپراسی یہی دو افراد ہیں جن کی رسائی صاحب کے حجرے سے لے کر گھر تک ہوتی ہے ۔ یہ دونوں حضرات آفس اور گھر کی کنجیوں پیسوں کے مالک ہوتے ہیں یہ نصف بہتر ہوتے ہیں ۔

پیشوں کے بغیر نہ ہم جی سکتے ہیں نہ پیشہ ور کے بغیر ہماری زندگی ہمارا سماج مکمل کہلاتا ہے۔ غیر سرکاری پیشوں کا حساب نہیں ۔ لحد سے مہد تک کی ضروریات ان سے ہی پوری ہوتی ہیں ۔ دھوبی ، نائی ، چمار ، بھنگی ، گوالا ، کسان ، قصاب ، جلاہا ، کمہار لوہار ، معمار ، بڑھائی ، مزدور ، بھکاری ۔ ان سب کے پیشے غیر سرکاری بھی ہیں اور غیر مہذب بھی معزز اور مہذب پیشہ وروں میں قاضی ، وکیل ، ڈاکٹر ، انجینیر ، واعظ ، شاعر کا شمار ہوتا ہے ۔ ان کے بغیر آپ مہذب زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ استاد نہ ہوں تو آپ بے علم اور بے عمل رہ جایں گے ۔ (یہ اور بات ہے کہ موجودہ دور میں طالب علم استادوں سے علم حاصل کر کے بھی بے علم ہی رہتا ہے) قاضی جی نہ ہوں تو ساری دنیا کنواری رہ جائے گی۔ وکیل نہ ہو تو آپ جھوٹ بولنے سے محروم رہ جائیں گے۔ واعظ نہ ہو زندگی لے ظاہر و باطن کا فرق مٹ جائے گا۔ شاعر نہ ہو تو خیالی دنیا سے واسطہ ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ ہم غیر پیشہ وروں کی مدد سے مہذب بنتے ہیں ۔ تن ڈھانکنے کپڑا ، پیٹ بھرنے اناج، رہنے کے لئے گھر نازک تلوؤں کو محفوظ رکھنے کے لئے چپل، جانوروں اور انسانوں میں تمیز برقرار رکھنے کے لئے بالوں کی تراش خراش کپڑوں کی صفائی، گھروں کی غلاظت دور کرنا سب ان ہی کے ذمے ہوتا ہے ۔ گاؤں یہ غیر مہذب پیشے شہروں کی رنگین فضا میں کچھ عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ شہر میں ڈھونڈے سے بھی کہیں جلاہا ۔ چمار ، نائی، دھوبی نہ ملے گا۔ البتہ بڑے بڑے کپڑے بنانے والی ملوں کے شوروم میں مصنوعی مسکراہٹ والے جلاہے ضرور ملیں گے ۔ جو اپنی مل کا اشتہار بنے ہر آنے جانے والوں کا استقبال کرینگے۔ چمار کا آبائی پیشہ تو اب باٹا اور کرونا کے ذمہ ہو گیا ہے ۔ نائی اور دھوبی کا پیشہ بھی آبائی نہیں رہا کیوں کہ یہ پیشہ شہروں میں بڑے سلیقے سے نبھایا جاتا ہے ۔ آپ کسی پیشے میں خواہ کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں وہ پیشہ اس وقت تک مفید ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے لوازمات کا خیال نہ رکھا جائے ۔ شہر میں کسی پیشے کو مقبول بنانے کے لیے شہر کے مرکزی حصے میں بڑی دکان کا حاصل کرنا ضروری ہے ۔ اس اول شرط کے ساتھ دوسری اہم شرطیں بھی ہوتی ہیں اس کی ایک condition یہ بھی ہے کہ دکان Air condition ہو ۔ دوسری شرط اسمیں حسین لڑکیاں اور قبول صورت لڑکے دست فروشی کے لئے رکھے جائیں جو ایر انڈیا کا مونو گرام بنے گاہکوں کا استقبال کرتے رہیں ۔ اور جب گاہک نہ آئیں تو ایک دوسرے کی دلجمعی کا سامان بنے رہیں ۔ شہر میں وسیع و کشادہ سڑکوں کے کنارے ہیر ڈریسنگ سیلون اور ڈرائی کلینرز کی دوکانیں اپنی بانہیں واکئے ہوتی ہیں ۔ ان دکانوں خاص اصلاح خانوں کی فضا بڑی طلسماتی ہوتی ہے ۔ جیسے ہی دوکان میں قدم رکھیں جل ترنگ بجنے لگتے ہیں اور" ہر طرف میں ہی میں ہوں" نظارہ دکھائی دیتا ہے ۔ ایسی سحر انگیز فضاء میں انسان پانچ پیسے کی اصلاح کے لئے پانچ روپے ہی کیا پچیس روپے بھی دینے کے لئے تیار ہوجاتا ہے ۔ آج کل پیشے اور موسیقی کا رشتہ بہت مستحکم ہوگیا ہے ۔ کپڑوں کی دکان میں موسیقی اصلاح خانے میں موسیقی غرض یہ شیطانی آواز ہر جگہ سنائی دیتی ہے حتیٰ کہ کسی اچھے ٹراولرس کوچ میں بیٹھ کر سفر کیجئے تو رات بھر یہ گانے دماغ پر ہتوڑے کی طرح برستے رہیں گے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہے کہ کوئی ماہر ہو یا نہ ہو اگر دکان میں موسیقی کا انتظام کر دے تو پیشہ خود بخود چل نکلے گا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو پیشہ ضرورت کا باپ۔ پہلے پہل رشتے وعدوں اور باتوں پر ہوا کرتے تھے اور ان وعدوں کے وفا ہونے تک کئی عدد چپل گھس جاتے تھے۔ آج کل اس کام کے لیے بھی دفاتر کھول دیے گئے ہیں جہاں ایک عدد چپل گھسے بنا ہی ریڈی میڈ دلہا دلہن مل جاتے ہیں (البتہ امپورٹیڈ دلہوں کی زیادہ مانگ ہوتی ہے) اور چٹ منگنی پٹ شادی ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور کے فائدہ مند پیشوں میں یہ بھی ایک فائدہ مند پیشہ ہے۔ بچوں کے بیٹھک خانے (Baby Sitting Homes) موجودہ دور کا ترقی یافتہ پیشہ ہے ہر گھر میں بچہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک انا ہوتی تھی۔ اب ایک انا اپنے گھر پر سو بچوں کی نگرانی کرتی ہے اس لیے وہ خود بھی وہ عورت انا نہیں کہلاتی کیونکہ یہ انا کے پیشے کی طرف پھر لوٹ آئی ہے۔ عورتوں کے لیے … کم پیشے موزوں و مناسب ہوتے ہیں لیکن وہ آج کل ایسے پیشوں کو اپنانے لگی ہے جس سے اس کی نسوانیت ختم ہو گئی ہے۔ شاپ راشر کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنا، ان پر سرگوشیاں کرنا اور ہر اجنبی پر مسکراہٹ کے پھول نچھاور کرنا اس کا پسندیدہ پیشہ ہے اور آج کے نوجوان جن کے اعصاب پر عورت سوار ہے وہ یا تو کپڑوں کی دکان یا پھر نقلی زیورات کی دکان لگا کے بیٹھے ہیں۔ کیوں کہ شہر کی ساری حسیناؤں کا ہجوم ان کی دکان پر رہتا ہے۔ کچھ تو بہانہ بہر ملاقات چاہیے۔ موجودہ دور میں کوڑا کرکٹ سمیٹنا بھی ایک پیشہ بن گیا ہے۔ یہ کوڑے پر پڑی ہوئی چیزوں کی … تو اور بھی فائدہ مند پیشہ ہے۔ ہم نے کبھی گاؤں کی گلیوں میں بوڑھی عورتوں کو گوبر سمیٹتے دیکھا تھا۔ جو اپلیاں بنا کر روزی کماتی تھیں۔ پر آج تو نالیوں اور کچرے کی کنڈی میں پڑے کاغذ، پلاسٹک کے ٹکڑے، بالوں کے گچھے جمع کرنا مسٹنڈوں کا پیشہ بن گیا ہے … بیچارے دن بھر گھوم کر کوڑا جمع کرنے والے اس قدر نفع نہیں پاتے جس قدر اس کے بیوپاری حضرات حاصل کرتے ہیں

ہمارے ملک میں خود سرکاری و غیر سرکاری، آبائی و غیر آبائی، مہذب و غیر مہذب پیشے اس قدر ہیں کہ دوسرے ممالک … میں سوچنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آج کل گلی گلی جاری ہوائی کشش ہر ہندوستانی کے قدم ڈگمگا رہی ہے … پیشہ وروں کی قدر افزائی سے ان کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ یہاں کے نوجوان کلینر، ڈرائیور بننے کے لیے جاتے ہیں تو کسی قسمت سے … روئی یا لورلن بن جاتے ہیں صحرا کی سخت زمین کھودتے کھودتے اس میں خود دفن ہو جاتے ہیں۔ البتہ ان کی لاش بڑے اہتمام سے بذریعہ … بھجوائی جاتی ہے یا پھر سابقین و لاحقین نعش کے نہ حاصل کرنے پر اپنے آپ کو یوں تسلی دیتے ہیں کہ ایسا مقدس مقام بھلا کسے … ہو سکتا ہے۔ اور بارہا کوششوں کے باوجود جو پیشہ ور ناکام رہ جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو یوں مطمئن کرتے ہیں کہ پرائے … کی ساری روٹی سے اپنے شہر کی آدھی روٹی بھلی۔

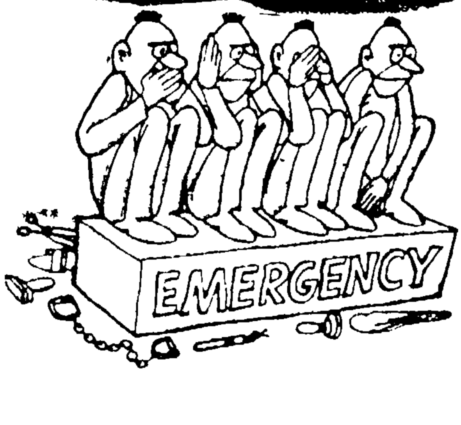
پیشہ پر شوشہ ہر زمانے میں لگایا جاتا ہے۔ کوئی پیشہ برا نہیں ہوتا۔ البتہ دیکھنے والوں کی نظریں ضرور بری ہوتی ہیں ایسے پیشے بھی ہیں جن کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ طوائف، بھنگی، مے فروش، جلاد ایسے ہی نفرت زدہ پیشے ہیں دراصل یہ ہمارے سماج کے پاکیزہ کردار ہیں۔ انسانیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ایک عورت جو ماں ہے بغیر ماں کا پیار دیا جانتی ہے … کسی کا قصور اپنے ذمہ لے سکتی ہے جو بیٹی بن کر گھر کی عزت بڑھانا چاہتی ہے۔ ہم اس کو صرف طوائف زادی رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چوڑیوں کی کھنک، پازیب کی جھنکار میں اس کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ صد افسوس اس کے پیشہ کا جنازہ نہیں اٹھ سکتا۔ گاؤں کی غلاظت دور کرنے والا محلوں، سڑکوں، گھروں کو پاکیزہ رکھنے والا خود گندہ اور بدنام تصور کیا جاتا ہے اگر وہ اپنے پیشے کو خیرباد کہہ دے تو … یہ خود گندگی کا ڈھیر بن جائے گی۔ مے فروش اس سماج میں کمتر درجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کنول کیچڑ میں رہ کر بھی پاکیزہ ہوتا ہے۔ جلاد کا نام سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ روح فنا ہونے لگتی ہے۔ ہر جلاد قاتل ہو سکتا ہے لیکن ہر قاتل

جلاد نہیں ہو سکتا ۔ جلاد ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہوتا ہے جسے پہلے قدم پر اپنے آپ کو قتل کرنا پڑتا ہے ۔ اس کا دل اس کا دماغ اس خونخوار تلوار اور تختۂ دار تلے دب جاتے ہیں ۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی روح کھینچ سکتا ہے ۔ رنگا اور بلا کی جان لے سکتا ہے لیکن خود اپنی روح کھینچنے کی ہمت اس میں نہیں ہوتی ۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ذمہ داری ، بیوی کی پاک محبت اسے زندگی کی آخری سانس تک جلاد رہنے پر مجبور کرتی ہے ۔

پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام

ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میرؔ بھی تھا







ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

گزشتہ ربع صدی کا طنز و مزاح

(نثر کا جائزہ 'شگوفہ' کی روشنی میں)



نام ** سلیمان اطہر جاوید
پیدائش ** ۱۹۳۶ء، حیدرآباد
تعلیم ** ایم اے، پی ایچ ڈی (اردو)
مصروفیت ** وزیٹنگ پروفیسر، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
تصانیف ** رشید احمد صدیقی، ادب میں ابہام اور اس کے مسائل، چہرہ چہرہ داستان، اردو شاعری میں اشاریت، عزیز احمد کی ناول نگاری، اقبال ماورائے دیر و حرم، غالب کے چند نقاد

۱۹۶۹ء کی آمد آمد تھی کہ ۱۵/ نومبر ۱۹۶۸ء کے لگ بھگ دیڑ ماہی "شگوفہ" کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ یہ کوئی تحیرزا واقعہ نہیں تھا..... ایسا نہیں کہ قبل ازیں ہماری زبان میں طنز و مزاح کے رسائل اور جرائد شائع نہیں ہوئے تھے۔ اور کئی۔ سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہنامے وغیرہ لیکن "شگوفہ" کی بات ہی اور تھی۔ اول تو اس کا وقفہ اشاعت دیڑ ماہی، پھر اس کے عنوانات کی ندرت...... فہرست کو "اس تھیلی کے چٹے بٹے" قرار دینا اور پھر انشائیوں کے لئے "مال مفت" خاکوں / مرقعوں کے لئے "اڑیں گے پرزے"، ڈائجسٹ کے لئے "مال مسروقہ" رپورتاژ کے لئے "قاضی جی دبلے" تبصروں کے لئے "جانچ پڑتال" اور منظومات کے لئے، چورن" وغیرہ....... ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کی ابتداء سے سعی رہی، انہوں نے کسی سیاسی تو کجا، ادبی گروہ یا ازم سے خود کو وابستہ نہیں رکھا۔ طنز و مزاح کی ممکنہ حد تک شستہ و شائستہ نگارشات کی پیش کشی ان کی حکمت عملی رہی اور بس........

جیسا کہ آج بھی ہے "شگوفہ" کے اجراء کے وقت بھی طنز و مزاح میں دو میلانات قوی تھے۔ ایک وہ جو زبان و بیان اور اسلوب سے، الفاظ کے الٹ پھیر، جملوں کے دروبست اور بات میں بات پیدا کرکے مزاح پیدا کرتا تھا اور دوسرا واقعات، موضوعات اور لطیفوں وغیرہ سے طنز و مزاح کی کشید کرتا تھا۔ اول الذکر کی نمائندگی کرتے تھے رشید احمد صدیقی اور موخرالذکر کے نمائندہ تھے پطرس!۔ .... پطرس کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہو چکا تھا۔ رشید صاحب ہرچند کہ اس وقت حیات تھے (انتقال: ۱۵/ جنوری ۱۹۷۷ء) لیکن طنز و مزاح کی طرف ان کی توجہ کم بلکہ برائے نام تھی ونیز ان کے ہمعصر مزاح نگاروں میں شوکت تھانوی نے مئی ۱۹۶۳ء میں انتقال کیا۔ فرقت کاکوروی جن کا انتقال تو ہوتا ہے جنوری ۱۹۷۲ء میں، بس اپنے آپ کو دہرا رہے تھے اور مشاعروں کے لئے وقف ہو چکے تھے۔ ابراہیم جلیس سیاست اور صحافت میں سرگرم تھے (انتقال: اکتوبر ۱۹۷۷ء)........ ان سے قطع نظر جو نام نمایاں تھے ان میں کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، احمد جمال پاشاہ مشتاق احمد

کرنل محمد خان اور یوسف ناظم وغیرہ اہمیت رکھتے تھے۔ " شگوفہ " کو ان سب کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ خصوصاً " شگوفہ " کے سالناموں کی زیب و زینت بڑھانے میں ان فنکاروں کا حصہ رہا ہے۔ کنہیا لال کپور کو (انتقال : ۵ / مئی ۱۹۸۰ء) " چینی شاعری " سنانے کا مرض " اور غالب : جدید شعراء کی ایک مجلس میں " جیسے مضامین سے شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ کپور کا نشانہ دراصل جدید شاعری میں ہونے والی " بے راہ روی " تھی۔ انھوں نے آزاد اور معریٰ نظم کو نشانہ بنایا۔ ان کی زد میں ترقی پسند بھی آگئے اور حلقۂ ارباب ذوق کے فنکار بھی۔ فیض، راشد، میرا جی، تصدق حسین خالد، راجہ مہدی علی خاں اور کئی۔ ظاہر ہے یہ سب کپور کے حلقہ احباب میں تھے لیکن کپور نے تکلف برطرف انداز سے کام لیا۔ یہ سچ ہے ان کے ہاں فکر اور ایسی گہرائی نہیں ملتی لیکن ان کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کپور کا زندگی اور معاشرہ کا مطالعہ خاصا ہے اور وہ غیر معمولی عصری حسیت کے مالک بھی ہیں۔ یہی سب چیزیں ان کی تحریروں کو پڑھنے پر مائل کرتی ہیں ذیل کے اقتباس کے مطالعہ سے قبل یہ بات خاطر نشین رہے کہ کپور کی یہ تحریر آج سے تقریباً (۴۰) (۴۵) سال قبل کی ہوگی لیکن اس دور کے بلکہ یہی دو ایک سال کے واقعات، سیاسی مناظر اور ہمارے سیاستدانوں کے کردار کی روشنی میں بھی اس کی معنویت برقرار بلکہ افزوں ہے۔ لگتا ہے کپور نے ۱۹۹۶ء۔ ۱۹۹۷ء کے قومی منظر نامہ کی تصویر کشی کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

" میں ترنگے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ باپو کے بلیدان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ لیکن باپو کے بتائے ہوئے اصولوں پر کبھی عمل نہیں کروں گا۔ میں بات بات میں گاندھی جی کی دہائی دوں گا لیکن مجھے گاندھی جی کی دہائی دی جائے گی تو میں اس کی بالکل پروا نہیں کروں گا۔ ایک سچے دیش بھگت کی طرح دیش کا روپیہ اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک کہ دیش کا دیوالیہ نہیں پٹ جاتا۔ اندھا یا بہرا ہو جانے کے بعد چاہے مجھے لاٹھی کے سہارے یا اسٹریچر پر سوار ہو کر آنا پڑے میں ریٹائر ہو نا پسند نہیں کروں گا اور تب تک گدی سے چپٹا رہوں گا جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ "

(آزادی کی قسم)

فکر تونسوی نے لکھا اور بہت لکھا بلکہ بہت کچھ خوب بھی لکھا لیکن صحافت سے قربت اور تا دم آخر انسلاک اور زود نویسی نے ان کے فن پاروں میں وہ گہرائی اور وقار پیدا نہیں کیا جو کہ ہونا چاہئے تھا۔ فکر تونسوی نے ایک مدت تک " پیاز کے چھلکے " کے بعنوان مزاحیہ کالم لکھا اور پیاز ہی کی طرح چھلکے اتارتے جایئے ان کی تحریروں میں آخر کار مزاح کبھی ملتا کبھی نہیں۔ ویسے فکر نے روزانہ زندگی اور ہمارے آس پاس کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے قلم میں روانی بھی غضب کی ہے، پیرایۂ تحریر دلکش بھی لیکن وہی، زود نویسی نے بات بننے نہیں دی۔ ایک اقتباس دیکھیے :۔

" یہ اچھا ٹیلی فون لگوایا ہے۔ رانگ نمبروں سے ہی ڈیل کر رہا ہے۔ محبوبہ سے ملاؤ جہنم سے جا ملتا ہے۔ ٹیلی وژن ڈپارٹمنٹ سے ملاؤ تو زراعت سے جا ملتا ہے۔ تیسری مرتبہ ایک ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا جو میرے نروس سسٹم کا علاج کر رہا تھا مگر وہ ڈاکٹر کی بجائے دفتر کی کسی خاتون سے جا ملا جو اپنے خاوند کو جھڑک رہی تھی اور کہہ رہی تھی : بچہ رویا تو میں کیا کروں۔ لوری کا ریکارڈ لگا دو، چپ ہو جائے گا۔

(ہیلو ہیلو)

احمد جمال پاشا کا انتقال ۲۸ / ستمبر ۱۹۸۷ء کو ہوا۔ " شگوفہ " سے ان کو نسبت خاص رہی۔ وہ اپنی اور صلاحیتوں کے علاوہ طنز و مزاح میں بھی اچھوتا انداز رکھتے تھے۔ انھوں نے روزانہ زندگی کے عام کاروبار کو نشانہ بنایا لیکن بطور خاص پیروڈی نگاری میں انھیں کمال حاصل ہے۔ پیروڈیاں تو انھوں نے کئی لکھیں اور کئی ایک نے بھی پیروڈیاں لکھیں۔ لیکن احمد جمال پاشا کی پیروڈیاں آج بھی اس مقام پر ہیں جہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ ان کی منزل ان کی منزل ہے۔ " شگوفہ " کے پیروڈی نمبر (ستمبر ۱۹۷۶ء) میں شامل احمد جمال پاشا کی

پیروڈیاں پڑھئے۔ مزہ دے جائیں گی۔ رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، عبادت بریلوی اور قاضی عبدالودود کی تنقیدی تحریروں کی پیروڈی کرتے ہوئے احمد جمال پاشاہ نے ان فنکاروں کے اسلوب کا یوں خاکہ اڑایا ہے کہ منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے تنقیدی اسلوب کو ذہن میں رکھئے اور ملاحظہ کیجئے احمد جمال پاشا کی یہ پیروڈی:۔

"مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا۔ غالب، اقبال، اور کپور۔ غالب اور اقبال کی خطا اس وقت معاف کیجئے اور کپور کی بات کیجئے۔ جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہمراز اور دمساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا۔ خود جل کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا۔ زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا اس لئے طنز نگار خود زمانہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیشہ بھول جانی چاہئے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یہاں پر وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کی گئی ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ خون زیادہ خرابہ کم۔ ایسے ہی مضامین پر میں سر دھنا کرتا ہوں۔ یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا۔ طنزیات مضحکات میں طنز کا یہ "تصوف دوام" مبارک سمجھا جائے یا نہیں حیرت انگیز ضرور ہے۔ انہوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کر سکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کپور ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔ کپور، دو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو مجھے گوارا ہے"۔ (کپور، ایک تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

یقیناً رشید صاحب نے بھی اس پیروڈی کے مطالعہ کے بعد دادا دی ہوگی۔

رشید صاحب کی شخصیت تھی ہی منفرد، وہ صاحب طرز انشاء پرداز تھے اپنے اسلوب کے آپ مالک، موضوعات کے انتخاب میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں اور پھر کیا اسلوب اور کیا مواد؟ ہر دو ترشے ترشائے، مہذب، علمی، شستہ اور پاکیزہ کہ لگا ہوں کو سرور اور دل کو ٹھنڈک حاصل ہو۔ رشید صاحب کے طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لئے اونچے علمی، ادبی اور تہذیبی ذوق و ذہن کی ضرورت ہے۔ رشید صاحب اردو ادب کی ایک معتبر اور موقر روایت ہیں اور اس روایت کو اپنانے اور آگے بڑھانے کی سعی تو کئی نے کی لیکن کوئی کہاں رہ گیا کوئی کہاں رہ گیا۔ مشتاق احمد یوسفی اسی روایت کے امین ہیں بلکہ انہوں نے اس روایت کی توسیع بھی کی ہے۔ یوسفی کے فن سے محظوظ ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، اردو کے قدیم و جدید ادب کے گہرے مطالعہ، اردو کی تہذیبی اقدار سے کماحقہ واقفیت، ہمارے اسالیب سے شناسائی اور زبان و بیان کی نزاکتوں پر خاطر خواہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی میں رشید صاحب کی طرح مشتاق احمد یوسفی کے فن سے بھی لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ یوسفی، لطیفوں، سستے واقعات، زبان کے توڑ موڑ اور جنس کے ذریعہ طنز و مزاح پیدا نہیں کرتے۔ یوسفی کو ایک مدت تک مغرب میں رہنے کا موقع ملا۔ مغرب کی بظاہر چکا چوند اور بباطن کھوکھلی اور گلی سڑی زندگی بھی ان کے سامنے رہی۔ انہوں نے اس زندگی کے نشیب و فراز کی ترجمانی بھی نہایت ہنرمندی سے کی ہے۔ خواہ طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھیں خواہ خود نوشت ان کی فنکاری عروج پر رہتی ہے اس میں کوئی دورائیں نہیں کہ وہ طنز و مزاح کے اس دور کے سب سے بڑے فنکار ہیں۔ اس سے کوئی دوسرے درجہ کا طنز و مزاح نگار ہی اختلاف کر سکتا ہے۔

یوسفی کی تحریروں سے کئی اقتباسات دیئے جاسکتے ہیں لیکن یہاں صرف ایک ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا "، اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکرائے فرمایا" وہ نابالغ شاعر ہے "۔ میں سمجھا شاید

Minor Poet کا یہی مطلب سمجھتے ہیں ۔ میری حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرمادی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا بچہ ٹافی مانگ رہا ہے ۔ اس پر میں نے اپنے ایک محبوب شاعر کا نام لیکر کہا بے چارے ہوش ملیح آبادی نے کیا خطا کی ہے ؟ ان کے مجموعے بھی نظر نہیں آتے ۔ " ارشاد ہوا کہ اس ظالم کے تقاضائے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی کابلی پٹھان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے ۔ کہا ، مگر وہ زبان کے شاعر ہیں ۔ بولے ٹھیک کہتے ہو ۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے اور وہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں ، عاجز ہوکر میں نے کہا ۔ اچھا یوں ہی سہی ، مگر فانی بدایونی کیوں غائب ہیں ؟ فرمایا ۔ ہُش ، وہ نرے مصور غم ہیں ! میں نے کہا ۔ بجا ، مگر مہدی الافادی تو کامل انشاء پرداز ہیں ۔ بولے چھوڑو بھی ، فانی مصور غم ہیں تو مہدی مصور بت صنم ! واللہ ، وہ انشائیہ نہیں نسائیہ لکھتے ہیں "۔

(صحیفے اینڈ سنز)

پاکستان کے لکھنے والوں میں مشتاق احمد یوسفی کے بعد کرنل محمدؐ خاں کا نام آنا ضروری ہے ۔ کرنل محمدؐ خاں کے پاس طنز و مزاح ہے لیکن ہلکا پھلکا ، موج تہہ نشیں کی طرح ؛ دراصل وہ صرف انشائیہ کے آدمی ہیں ۔ خوش گوار ، دلنواز ، دلنشین اور حلاوت آمیز انشائیہ لکھنے والے لیکن یہاں وہاں پنجابی فقرے اور پنجابی اشعار سے ان کی تحریر کی روانی متاثر ہوتی ہے ۔ اور طنز و مزاح صرف اردو جاننے والے قاری کو پوری طرح اپنے اثر میں نہیں لیتا ۔ زبان کی یہ پنجابیت (طنز و مزاح کی زبان ہی میں کہہ لیجئے) کرنل محمدؐ خاں کی مقبولیت کی راہ میں Speed Breaker بن جاتی ہے ۔ یہ بات بھی ہے کہ وہ جہاں تہاں اپنے قلم پر سنجیدگی طاری کرلیتے ہیں ، فلسفیانہ اور ثقہ موضوعات چھیڑ دیتے ہیں اور ایسا ہی پیرایۂ بیان ؛ یہی وجہ ہیکہ ان کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو مشتاق احمد یوسفی کے حصہ میں آئی ۔ مضامین ہوں یا سفر نامے ، ہر جگہ اس چیز کو محسوس کیا جاسکتا ہے ۔ ان کے ہاں خوش طبعی زیادہ نکھر نہیں پاتی ۔ ایسے اقتباسات بھی ان کے ہاں کم ہی ملیں گے ۔

" سوزن نے مصافحہ کے لئے ہماری طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک تبسم میں لپٹا ہوا مزاج پرسی کا کلمہ کہا ۔ ہم نے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لیتے ہوئے تبسم کے جواب میں تو تبسم کیا مگر کلمے کے جواب میں زبان گنگ پائی ۔ ہمیں انگریزی ہمیشہ دو موقعوں پر بھول جاتی ہے ۔ انگریزوں کے سامنے اور حسینوں کے سامنے اور سوزن تو دوآتشہ تھی کہ انگریز بھی تھی اور حسین بھی "۔

(سلامت روی)

عطاالحق قاسمی بھی ہیں جن کے قلم کی شگفتگی اور بے ساختگی ہمارے طنز نگاروں میں انہیں نمایاں کرتی ہے ۔ کرشن چندر نے افسانے اور ناول لکھے اور اس حیثیت سے ناموری حاصل کی ۔ ترقی پسندی کے دور میں ان کا طوطی بول رہا تھا آج بھی انکا اپنا مقام ہے ۔ کرشن چندر دراصل اسلوب کے فنکار ہیں ۔ ان کا رواں دواں ، شیریں سبک ، اجلا اجلا حلاوت لیا ہوا اسلوب ؛ ان کی تحریریں پڑھتے کشمیر کے مناظر کی یاد آتی ہے ۔ اور کشمیر کے مناظر سامنے ہوں تو لگتا ہے ہم کرشن چندر کی تحریریں پڑھ رہے ہیں ۔ قلب و نظر کو زندگی دینے والا اسلوب ، کرشن چندر کے ناولوں اور افسانوں میں جو طنز و مزاح ہے خصوصاً طنز ، وہ تو بعض جگہوں پر معرکہ آراء ہے ۔ ایک گدھے کی سرگذشت اور گدھا فلمی دنیا میں وغیرہ کہنے کو تو ان کے طنزیہ و مزاحیہ ناول ہیں اور بعض حلقوں میں شاید کبھی مقبول بھی رہے لیکن نہ تو کرشن چندر کے معیار کے ہیں اور نہ اردو طنز و مزاح کے اوسط معیار سے آگے بڑھتے ہیں ۔ ان سے اقتباسات لینے سے گریز کرتے ہوئے ۔ ایک دوسرا اقتباس پیش کرتا ہوں ۔ بات کتنی لطیف زاویے سے پیش کی گئی ہے : ۔

" کانتا ، چمپا اور میناکشی ، بڑی خوبصورت لڑکیاں ہیں "۔

" یہ کیا کرتی ہیں "۔

" خوب صورت لڑکیوں نے آج تک کچھ کیا ہے، جو یہ کریں گی!" شاتا نے مجھ سے پوچھا پھر خود ہی ہنس کر بولی : " خوبصورت لڑکیاں خود کچھ نہیں کرتیں ۔ لوگ ان کے کرتے ہیں، عشق، پریم، اور محبت وغیرہ ...."

جیلانی بانو کے افسانے ہوں یا ناول، ان کی تو بات ہی اور ہے لیکن انکے انشائیے بھی نہایت دلچسپ ہوتے ہیں ۔ دھیما، خنک اور ہلکا پھلکا پیرایہ بیان ۔ کہیں یوں ہی مزہ دے جانے والے جملے، کہیں مزاح، کہیں طنز ۔ یہاں دیکھئے شمس الرحمن فاروقی کیسے نشانہ بنتے ہیں " بعض بیکار فلسفیوں کا مشغلہ ہوتا ہے وہ مختلف چیزوں کا اثر زندگی کے مختلف واقعات میں ڈھونڈتے ہیں جیسے ڈاکٹر کا اثر اردو تنقید پر .... لتا منگیشکر کا اثر اردو شاعری پر، شمس الرحمن فاروقی کا اثر اردو افسانے پر .... وغیرہ وغیرہ ۔

(کچھ چائے کے بارے میں)

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مباحث بیکار ہیں ۔ کسی زبان میں اور کسی علاقہ میں کوئی ادب ایسا نہیں رہا جو صرف برائے ادب رہا ہو اور زندگی سے اس کا تعلق نہیں ہو .... اس عہد میں زندگی کا رنگ روغن کچھ اور تھا یہ علحدہ بات ہے ۔ زندگی کے آداب، طور طریقے، لین دین، رہن سہن، تجربے اور تقاضے جداگانہ تھے ان سے بحث نہیں ۔ فنکاروں نے زندگی کو کسی اور نظریہ اور زاویہ سے دیکھا یہ اپنی جگہ تاہم یہ طے ہیکہ کسی بھی دور کے ادب میں اس دور کے شب و روز جھانکتے ہیں ۔ ان شب و روز کا معیار پست رہا ہو یا بلند، وہ زندگی بری ہو کہ بھلی ان نظریوں اور زاویوں سے آپ اتفاق کریں یا نہیں ۔ وہ آداب و اطوار ہموار ہوں کہ ناہموار، گوارا ہوں کہ ناگوار .... ہم لکھنو کے شعر و ادب کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہتے ۔ یہ ادب خواہ کیسا ہی ہو لیکن یہ اس ادب کا قصور نہیں ۔ لکھنو کی زندگی اور تہذیب اوراس دور کے آئین حیات ویسے ہی تھے ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے ظاہر ہے ان کی عکاسی کردی ہے ۔ وہ ایسا کیوں نہیں کرتے، وہ اور کیا کرتے ؟ .... طنز و مزاح نگاروں کے ہاں یہ رجحان اور زیادہ ملتا ہے ۔ وہ زندگی، معاشرے اور معاشرت سے اور زیادہ گتھے ہوئے ہیں انہیں ایک اور سہولت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ طنز و مزاح کے کیپسول میں کڑوی کسیلی کو بھی میٹھی اور ذائقہ دار بنادیتے ہیں ۔ طنز و مزاح کی کیفیت اور اسلوب کی دلاویزی کچھ ایسے ہوتی ہے کہ اور تو اور، وہ خود بھی جو نشانہ بنتے ہیں لطف محسوس کرتے ہیں ۔ خود ان کے منہ سے واہ نکل جاتی ہے ۔ کرجاے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے، اچھے طنز و مزاح کا یہی کردار ہوتا ہے

یوسف ناظم اسٹیج کے آدمی نہیں ہیں لیکن عصری طنز و مزاح میں ان کا قدبغایت اونچا ہے۔ طنز و مزاح کے ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ محترم رہے گا ۔ بنیادی طور پر ان کا رشتہ رشید صدیقی اسکول سے ہے لیکن فکری عنصر کی آمیزش سے انہوں نے اپنی شناخت بنالی ہے ۔ انکے ہاں زبان کا نہایت طرحدار اور تہہ دار استعمال ملتا ہے ۔ ان کے اسلوب میں ایک چاشنی ہے ایک خوشگوار کیفیت جوان کے ہمعصروں میں صرف انہی سے مخصوص ہے ۔ یوسف ناظم چھوٹے چھوٹے فقروں سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں اور پھر توسین کا استعمال بھی انکے ہاں ایک بانکپن پیدا کردیتا ہے ۔ ان کے ہاں مزاح بھی خوب ہے لیکن طنز کا پلہ بھاری ہے ۔ یوسف ناظم نے خواہ مرقع نگاری کی ہو خواہ انشائیے لکھے ہوں وہ نہایت اپنائیت کے ساتھ قاری کو اپنے ہمراہ لئے چلتے ہیں، ہنستے ہیں ہنساتے ہیں اور چلتے چلتے چٹکیاں بھی لیتے ہیں کہ قاری چونک جاتا ہے ۔ ٹھٹھک جاتا ہے۔ پہلے یہ اقتباس ملاحظہ ہو : ۔

" روپیہ کو اب آثار قدیمہ کا درجہ بھی دیاجاسکتا ہے اس لئے کہ کسی زمانے میں اس کی واقعی کوئی قیمت تھی ۔ اب قیمت کا لفظ اسے زیب نہیں دیتا ۔ روپیہ ان دنوں انسانوں کے خون اور عورت کی ناموس کی طرح بلاقیمت استعمال میں ہے " ۔ (وجود زر سے)

اور اب چند فقرے بھی، جنہیں قول محال کہیے کہ معلوم ہو طنز کیا چیز ہے مزاح کیا ہے :

" ٹیلی وژن کی محفل میں مکمل خاموشی رہتی ہے ۔ عورتوں تک کو چپ لگ جاتی ہے" ۔ (ٹیلی وژن ہمارا معلم ہے)

"روپیہ کمانے سے پہلے دینیات اور اخلاقیات کی کتابیں پڑھنی ترک کر دینی چاہیئے ان کے مطالعے سے آمدنی متاثر ہوتی ہے"۔

"تجریدی آرٹ کے یوں تو کئی رخ ہوتے ہیں لیکن اس کے دو رخ اہم ہیں اسے دور سے دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور نزدیک سے دیکھ کر رونا آتا ہے۔ ایک ہی آرٹ سے دو قسم کی کیفیتیں پیدا کرنا معمولی کام نہیں"۔ (تجریدی آرٹ)

خواجہ عبدالغفور کے مضامین دراصل لطیفوں کا مجموعہ ہوتے ہیں بلکہ مترجمہ لطیفوں کا مجموعہ کہیئے۔ ہاں انہوں نے ان لطیفوں کو جہاں تہاں ہندوستانی ماحول میں پیش کر دیا۔ ویسے طنز و مزاح کے سلسلے میں ان کا کام تخلیقی نوعیت کا نہ سہی اہمیت رکھتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کو اپنے ہم عصروں میں کئی وجوہ سے نسبتاً زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے موضوعات عام زندگی اور عام دلچسپی لئے ہوتے ہیں اور ان موضوعات کا حق وہ نہایت خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ وہ قاری / سامع کے مزاج و مذاق کا بھی پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر نہایت سادہ لیکن بڑا دلکش ہوتا ہے۔ انہوں نے مقامی علاقائی قومی اور بین قومی ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور عمدگی کے ساتھ۔ ان کے مشاہدے کی وسعت اور نظر کی گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پہلے بین قومی پس منظر میں یہ اقتباس دیکھیں:

"مرزا چاند میں جانے پر اٹل ہیں ہم نے کہا میاں مرزا چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں کہ تم چاند میں چلے جاؤ مگر تم اپنے گھر سے دفتر تک بھی بڑی مشکل سے آتے ہو۔ تمہاری بیوی جب تمہیں گھر سے داغتی ہے تو تم اپنے مختلف مرحلوں کو اسکولوں میں چھوڑتے ہوئے بہ دقت تمام اپنے دفتر پہنچتے ہو۔ کہاں چاند کے سفر کی بات کرتے ہو۔

بولے۔"میاں ..... جب انسان بیوی بچوں کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے تو چاند تو کیا مریخ میں بھی جاسکتا ہے"۔ ہم نے پوچھا "تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ امریکہ بھی اپنے بیوی بچوں سے تنگ آکر چاند میں جارہا ہے؟" فرمایا: "بالکل درست یہ ویٹ نام اور کیوبا امریکہ کے بیوی بچے نہیں تو اور کیا ہیں"۔ (چاند اور آدمی)

اور یہ حیدرآباد کے مقامی پس منظر میں ملاحظہ ہو:

"تیسرے مینار نے دوسرے مینار کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا: تم آج سے میری جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ میرا رخ صدیوں سے پرانے شہر کی طرف ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے اس علاقہ میں غربت اور افلاس کا ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے میں تنگ آگیا ہوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ نئے شہر اور بنجارہ ہلز کے امیروں کے کیا چونچلے ہیں......"

پہلے مینار نے کہا۔"نہیں بھیا! اپنی جگہ نہ بدلو۔ ورنہ مینار اور آج کے سیاسی لیڈر میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے گا۔"

(چار مینار اور چار سو برس)

دلیپ سنگھ کی طنز و مزاح نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن ان کی اٹھان غضب کی تھی اور انہوں نے جلد ترقی کی بلندیوں کو چھو لیا انہوں نے قومی ہی نہیں بین قومی سطح پر بھی زندگی اور زمانے کو دیکھا۔ معاشرے اور معاشرت کے مختلف پہلو اور نشیب و فراز ان کی نگاہ میں رہے۔ تجزیہ کرنے کے فن پر ان کو قابو رہا۔ زبان و بیان پر بھی انکی خاصی گرفت رہی پھر یہ کہ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا انہیں آتا اور سلیقہ سے آتا تھا۔ یہ اقتباس دیکھئے کتنا تیکھا، کاری اور راست طنز ہے۔

چرانجی لال جب کہتا کہ میں چرانجی لال ہوں تو لوگ پوچھتے۔ "کون چرانجی لال"۔ جب وہ کہتا کہ جنگ آزادی کا سپاہی تو لوگ پوچھتے "کونسی جنگ آزادی" جب وہ کہتا کہ وہ آزادی جو ہم لے کر آئے تھے تو لوگ پوچھتے کہ اگر لے کر آئے تھے تو پھر چلی کہاں گئی۔"

(دودھ کی مکھی)

دلیپ سنگھ کے ذیل کے اقتباس میں مزاحیہ شاعری پر چوٹ کی ہے بلا شبہ مزاحیہ نثر پر بھی یہ بات اتنی ہی صادق آتی ہے۔

اگر مزاحیہ نثر کے تعلق سے آپ پڑھنا چاہتے ہیں تو جہاں شاعری' شعر لکھا ہے وہاں نثر لکھ دیجئے اور بس انہوں نے لکھا:

"اردو میں عام طور پر دو قسم کے لوگ مزاحیہ شاعری کر رہے ہیں۔ ایک وہ جنہیں شعر لکھنا نہیں آتا اور دوسرے وہ جنہیں مزاح لکھنا نہیں آتا"۔ (شاعر طنز و مزاح کو سلام)

طنز و مزاح کا منظر ہر دور میں مہکتا مہکتا رہتا ہے۔ خاص طنز و مزاح نگاروں سے قطع نظر شائد ہی ایسے قلمکار ہوں گے جن کے ہاں کم کم ہی سہی طنز و مزاح نہ پایا جاتا ہو۔ امیر خسرو اور محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک۔۔۔۔۔۔۔ لیکن فی زمانہ طنز و مزاح کو جو زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس کے اپنے معاشرتی اسباب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مزاح بے تکی باتوں میں تک کی بات پیدا کرنا ہے۔ اور آج بے تکا پن کہاں نہیں ہے۔ ہر سمت بے تکی ہے ہر کیفیت بے تکی ہے۔ اقبال نے یونہی نہیں کہا دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی۔ واقعی حالات آج بھی دگرگوں ہیں، صورت حال زار و زبوں ہے اخلاقی اقدار روبہ زوال ہو چکی ہیں خوب و خراب، حرام و حلال اور نیک و بد کی تمیز ہی نہیں۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ذرائع اچھے ہیں یا برے۔ ہم صرف دولت کمانا اور دولت مند ہونا چاہتے ہیں۔ دھوکہ دہی، فریب، لوٹ مار، غبن، رشوت ستانی ذخیرہ اندوزی منافع خوری اور اپنوں کے حقوق کو غصب کرنا عام ہے۔ جو لوگ یہ نہیں کرسکتے وہ لاٹری کا ٹکٹ خرید لیتے ہیں کہ آن واحد میں خزانہ مل جائے۔ سیاست غنڈہ گردی ہو چکی ہے۔ سیاستدانوں کا کردار ملک و قوم کے لئے باعث ننگ ہے۔ چند ایک کو چھوڑ کر کون سیاستداں ہے جو کسی اسکام یا اسکینڈل میں ملوث نہیں۔ جمہوریت ایک مذاق بن چکی ہے۔ عوام کی خدمت ڈھکوسلہ ہے۔ دولت و اقتدار کی ہوس میں سب مرے جا رہے ہیں۔ ہر کسی کو صرف گدی عزیز ہے اور اس پر براجمان رہنے اور نہ ہوں تو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جوڑ توڑ سازشیں، ریشہ دوانیاں اور بد معاشیاں نہیں کی جاتیں۔ دل بدل عام ہے۔ وفا داریاں (اگر ان کو وفا داریاں کہا جائے تو) تبدیل کرنا سیاستدانوں کا خمیر بن چکا ہے۔ گاندھی جی کے نام کی مالا جپتے ہیں لیکن صرف ہونٹ ہلتے ہیں اور کچھ نہیں۔ سیاستدانوں کا یہ کردار دیکھ کر کیا عجب گاندھی جی کی آتما تڑپ رہی ہو اور کیا پتہ اپنے نام لیواؤں کے کرتوت دیکھ کر گاندھی جی کے مجسمے کبھی تڑخ جائیں، شق ہو جائیں۔ ملک و قوم کی کسی کو چنداں فکر نہیں، معیشت برباد ہو رہی ہے۔ کساد بازاری نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں گرانی روز افزوں ہے ملاوٹ عام ہے۔ صحت اور تعلیم وہ ادارے ہیں جو عوام کے لئے کھلے ہونے چاہئیں۔ ان کا تعلق پبلک سیکٹر سے ضروری ہے لیکن خاص طور پر ان ہی اداروں کو سرکار پرائیوٹ سیکٹر کے حوالے کرتی جا رہی ہے۔ اعلیٰ کے ماسوا، نچلے، متوسط بلکہ اعلیٰ متوسط طبقہ کی بھی ان تک رسائی دشوار ترین ہو چکی ہے۔ صحت اور تعلیم تجارتی ادارے بن گئے ہیں۔ عوام جائیں تو جائیں کہاں؟ علاقائی سیاسی جماعتیں قائم ہو رہی ہیں، ہر ایک اپنی ڈفلی بجا رہا ہے انہیں تقویت بھی حاصل ہو رہی ہے بلکہ یہ تو بادشاہ گر بنتی جا رہی ہیں۔ آیا علاقائیت کا یہ رجحان خطرناک نہیں؟ ملک خدا نہ کرے ایسے چوراہے پر پہنچ جائے جہاں ہر راہ مسدود ہو، ہر طرف ایک سوالیہ نشان۔۔۔۔۔۔۔۔ معلق پارلیمان اور معلق ریاستی اسمبلیاں۔۔۔۔۔۔۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ اور مذہب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مذہب سیاست بن چکا ہے۔ مذہب کو تطہیر نفس کا ذریعہ ہونا چاہیے لیکن مذہب سے آلودگیاں پھیلانے کا کام لیا جا رہا ہے۔ ہم اپنے مذہب پر کاربند کہاں؟ ہم تو دوسرے مذہب کے پیروؤں کو نابود کرنا چاہتے ہیں۔ مندر، مسجد اب اسی لئے رہ گئے ہیں کہ ان کے نام پر جھگڑے اور فساد ہوں۔

بین الاقوامی صورت حال اس دوران اور خراب و خستہ رہی۔ مصر، ایران اور کئی افریشیائی اور لاطینی امریکی ممالک میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ کیسے کیسے بت گر گئے۔ مشرقی پاکستان کی علحدگی، بنگلہ دیش کا قیام عراق، ایران جنگ افغانستان پر روس کی بالا دستی اور پھر سوویت روس کا پارہ پارہ ہو جانا، کمیونزم کی پسپائی، کویت، عراق تنازعہ اور امریکہ کی مداخلت، بش ہو کہ کلنٹن، دنیا کو اپنے اشاروں پر نچانے کا

جنون، فلسطین، کیوبا اور کوریا وغیرہ کے ہنگامے، نیوکلیر ہتھیار اور اقوام متحدہ کی خاموش تماشائی کی حیثیت؛

غرض قومی ہو کہ بین قومی، یہاں سے وہاں تک سارا منظر نامہ، مکدر آلودہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے قلمکاروں نے اس سمت توجہ کم دی۔ انہوں نے اپنے قلم کو معاشرتی مسائل سے زیادہ وابستہ رکھا۔ قلت آب، ہلمٹ، انتخابات، مشاعرے، قرض، اکیسویں صدی، بیماریاں، کھٹمل، چائے، وظیفہ یاب زندگی، بیوی، ملازمہ، ایڈیٹر، لیڈر، رکشا والا، مولوی، اسکوٹر والا، پروفیسر اور جن موضوعات پر بے تکان لکھا اور تقریباً ہر کسی نے لکھا وہ ہیں کرکٹ کتے اور مکان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مسیح انجم کا فن بھی زیادہ تر عام گھریلو مسائل اور دوست احباب کے گرد گھومتا ہے۔ ادھر دکن کی ریت رسم و رواج اور کھیلوں وغیرہ پر انہوں نے خوب لکھا ہے۔ وہ مزاح کی ایک فضاء پیدا کر دیتے ہیں کہ طنز پر بھی مزاح حاوی رہتا ہے۔ یہاں پر وہ مکان گزیدہ ہیں اقتباس:

چنانچہ ایک دن ہمارے بچپن کے ساتھی سے ایک طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو اس نے تعجب سے پوچھا "ارے یار تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے۔ کیا تم کسی موذی مرض میں مبتلا ہوگئے ہو۔ ہم نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا، نہیں یار، میں کسی مرض ورض میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ میں مشترکہ کرائے کے مکان میں رہتا ہوں"۔ (مشترکہ مکان)

رشید قریشی کے ہاں موضوعات بھی بھلے ہیں اور زبان کا استعمال بھی شستہ، لیکن ہے یہ کہ ان کے ہاں مزاح پر سنجیدگی کا خول سالما ہے کہ مزاح نکھر نہیں پاتا۔ چند سال قبل حیدآباد میں پانی کی قلت رہی، کارٹونسٹوں اور مزاح نگاروں کو ایک اچھا عنوان ہاتھ لگا۔ رشید قریشی نے بھی قلت آب پر قلم اٹھایا۔ دیکھئے اس کے نتیجے میں کیا کچھ ہوجاتا ہے؛

"اتنے میں ایک دودھ کا کاروبار کرنے والا آیا۔ کہنے لگا۔ حضور پانی کی قلت سے ہمارا ہی دھندا ڈوبا ہے۔ اب ہمیں خالص دودھ بیچنا پڑرہا ہے"۔ (پانی، پانی!! پانی...)

برق آشیانوی نے ہرچند کہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں طنز و مزاح نگاری ترک کردی تھی لیکن انہوں نے جب تک لکھا زیادہ تر قابل توجہ، موضوعات خواہ کیسے ہی ہوں وہ ہلکے پھلکے طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں۔ زبان کی شگفتگی سے ان کے مزاح میں ایک وقار پیدا ہوجاتا ہے پھر ادبی شخصیات پس منظر میں ہوں تو ان کی دلآویزی اور دیدنی ہوتی ہے۔ یہاں دیکھئے تشریح کلام غالب کے سلسلے میں غالب کی شخصیت کس حال کو پہنچتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"شام کے چار بجے مرزا صاحب گھر سے نکلے تھے اور رات دیر گئے تک نہیں لوٹے تو بیگم نے خیال کیا کہ کہیں محفل مشاعرہ یا بزم "مشاربہ" ہوگی لیکن جب صبح بھی مرزا صاحب گھر نہیں آئے تو بیگم پریشان ہوئیں کہ:

یا الہیٰ یہ ماجرا کیا ہے
آخر اس شخص کو ہوا کیا ہے

دن چڑھے پر مرزا صاحب کے خاص خاص دوستوں کے گھر دریافت کروایا کہ کسی کے گھر "نوشہ" بنے تو نہیں پڑے ہیں۔ چند ایک کے پاس سے جواب آیا کہ گذشتہ شام کو انہوں نے مرزا صاحب کو ٹھنڈی سڑک اور خاص بازار میں سے دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا لیکن کسی کو یہ علم نہ تھا کہ وہ گئے کہاں ہیں۔ شام تک پورے شہر میں کھلبلی مچ گئی کہ مرزا "گم" ہیں لیکن حضرت ذوق نے فرمایا کہ گم نہیں ہیں بلکہ اپنی بے معنی شاعری سے شرمندہ ہو کر روپوش ہوگئے ہیں۔ (تشریح کلام غالب)

بھارت چند کھنہ نے بھی جب تک لکھا دو ٹوک انداز ۔ ان کے ہاں طنز کا وار کبھی کبھی کاری بھی ہوجاتا ہے ۔ ایک مختصر سا اقتباس :

" دراصل غریبی ہٹانے کا جو اعلان کیا گیا تھا اس کا منشاء صرف یہ تھا کہ ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کی کبھی نہ ختم ہونے والی غربت کو ہٹایا جائے " (غریبی ہٹاؤ)

نریندر لوتھر کے ہاں خوش مزاجی اور شگفتگی ہے ۔ انہوں نے جو بھی لکھا ہو اور جیسا بھی لکھا ہو ان کے فن کا نقطۂ عروج ہے حیدرآباد کا تغرافیہ " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مضمون میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی لیکن ایسے بے تکلف انداز میں کہ محسوس ہی نہیں ہوتا ۔ پورے مضمون میں ایک آمد کی کیفیت ہے ۔ لہجہ نہایت آہستگی لئے ہوئے ۔ بس دو اقتباسات پہلے ہی پیراگراف سے ملاحظہ ہو :

" طویل عرصہ سے حیدرآباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جارہی تھی ۔ یہ مضمون اس امید کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ کمی اور شدت سے محسوس کی جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ایک اور اقتباس سے محظوظ ہوں : " حیدرآباد کا محل وقوع بہت ہی عمدہ ہے ۔ ایک طرف شمال ، دوسری طرف مشرق ، تیسری طرف مغرب اور چوتھی طرف جنوب ہے ۔ سب سے زیادہ جنوب ہے اس لئے بھی اسے دکن کہا جاتا ہے ۔ " وقوع " کے مقابلہ میں یہاں محل زیادہ ہیں ۔ محلات شاہی میں چار محل ، چومحلہ اور فلک نما محل زیادہ مشہور ہیں ۔ عموماً شہر دریا کے کنارے واقع ہوتے ہیں ۔ اس روایت کو پیش نظر رکھ کر اس شہر کے کنارے ایک دریا بنانے کی کوشش کی گئی تھی ۔ اس کو موسیٰ ندی کہا جاتا ہے ۔ یہ دریا ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہوا ۔ اس میں پانی برائے نام ہے اور چٹانوں کائی اور گھاس کی بھر مار ہے ۔ چٹانوں کو توڑنے کا ٹھیکہ دھوبیوں کو دیا ہے جو انہیں کپڑوں سے توڑتے ہیں ۔ کپڑے سکھانے کی سہولت کے لئے دریا پر جا بجا پل بنائے گئے ہیں ۔ ایک پل پر صرف چادریں سکھائی جاتی ہیں اس کا نام چادر گھاٹ پل ہے ۔ اسی طرح پرانے پل پر پرانے کپڑے سکھائے جاتے ہیں اور نئے پل پر نئی لین کے نئے کپڑے ۔ مسلم جنگ پل پر ایکس سروس مین مسلمان سکھائے جاتے ہیں " ۔

رشید احمد صدیقی کی علیگڑھ سے محبت تو ایک روایت ہو چکی ہے عابد معز بھی حیدرآباد سے کچھ کم انسیت نہیں رکھتے ۔ ان کے مضامین میں حیدرآباد کی سوندھی مٹی کی خوشبو ہے ۔ اور تو اور انکے مضامین کے ایک مجموعہ کا نام ہی " واہ حیدرآباد " ہے لیکن ان کا زاویہ نریندر لوتھر کے زاویہ سے جدا ہے ۔ حیدرآباد کی عمارتوں ، افواہوں ، لباس مشرق و سطیٰ جانے والوں کے ذوق و شوق سڑکوں فٹ پاتھوں ، نل ، آٹو رکشا ، دفاتر ، چائے خانوں ، دواخانوں ، انتخابات کرفیو اور فسادات وغیرہ پر انہوں نے نہایت پرلطف انشائیے تحریر کئے ہیں جس سے طنز و مزاح کے پھول کھلا دیئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیدرآباد ہی کیا؟ ملک کے کسی بھی شہر جائیے آٹو رکشا والوں کا رویہ یہی ہے ۔ مسافروں سے زیادہ سے زیادہ کرایہ وصول کرنا میٹر میں اونچ نیچ کر دینا گھما پھرا کر منزل تک لے جانا ، کرایہ زیادہ بتانا ، باقی رقم واپس نہ دینا وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آٹو رکشا وقت پر ملتا ہی کب ہے عابد معز کی زبانی سماعت فرمائیں : " بعض مرتبہ آٹو رکشا حاصل کرنے کا دلچسپ مرحلہ خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے ۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں حادثہ ہوجاتا ہے ۔ ایک مرتبہ بیگم کو میٹر نٹی ہاسپٹل لے جانے کے لئے ہم نے آٹو رکشا کی تلاش شروع کی ۔ لمحوں سے منٹ بنے اور منٹوں سے گھنٹے ۔ قریب تھا کہ دن بھی ختم ہوجاتا بیوی نے آکر ڈھارس بندھائی ۔ آٹو رکشا نہیں ملا ۔ کوئی بات نہیں آپ کو لڑکا ہوا ہے ۔ اب اسے ہی آٹو رکشا لانے لے لئے بھیجیں گے ۔

پرویز یداللہ مہدی نے اور موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے ۔ لیکن بمبئی کی معاشرتی ، معاشی ، ادبی ، سیاسی اور بالخصوص فلمی دنیا کو اپنا نشانہ بنایا ہے ۔ قدرے ٹھہراؤ سے کام لیں تو ان کے ہاں اور نکھار اور وزن و وقار آئے ۔ ان کی تحریروں کی طوالت بھی ان کی

دلچسپی کو متاثر کرتی ہے لیکن مزاح میں بمبئی کی زندگی کا تجربہ کرنے میں انکو کمال حاصل ہے ۔ انداز بیان بھی خوب ۔ اس اقتباس سے اندازہ ہو گا ۔

" جن فلمی ستاروں کی اپنی " ذات بلکہ " باپ " کا بھی پتہ نہیں ہوتا وہ کتوں کی ذات اور ان کی ہڈی کی چھان بین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے کیونکہ آگے چل کر کتے کی ذات ہی ان سوپر اسٹاروں کی ذات کی پہچان کا ذریعہ ٹھہرتی ہے ۔ اس انتخاب میں اگر ذرا سی بھول ہوجائے تو نہ صرف انکا کیریر Career متاثر ہوتا ہے بلکہ ان کی " ذات پات " کا پول بھی کھل جاتا ہے " ۔ (فلمی کتے)

فیاض احمد فیضی کا مزاح ابھی نکھر رہا ہے معاشرہ کی نبض پر ان کا ہاتھ ہے ۔ استحصال کرنے والوں اور جن کا استحصال ہو رہا ہے ان ہر دو کے کردار اور حالات کا ان کا مشاہدہ گہرا ہے وہ تجزیہ بھی خوب کرتے ہیں ۔ ادھر ملاحظہ ہو ٹیچر اور کلرک کے بارے میں ان کا انداز نگارش :

" کچھ مسلمین سے جانوروں کا خیال چھوڑ دیجئے اور بستی میں چلے آیئے تو پتہ چلے گا کہ ہمارے یہاں سب سے مظلوم اور مضحکہ خیز دکھائی دینے والی دو ہی مخلوق ہیں ۔ ایک ٹیچر دوسری کلرک " ۔ (ہوئے کلرک بن کے رسوا)

طنز و مزاح ہو یا کچھ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعض لوگ ادب کی بہتر خدمت یوں کر سکتے ہیں کہ کم لکھیں (یا بعض تو بالکل نہ لکھیں) اور بعض ایسے ہیں جن کو لکھنے پر توجہ دینی چاہئے ۔ رشید موسوی موخرالذکر قلمکاروں میں ہیں ۔ ان کے ہاں طنز و مزاح نہایت لطف نہایت تہذیب یافتہ، نہایت شستہ اور نہایت معتبر ہوتا ہے ۔ انہوں نے شائع بھی کیا تو کہیں جا کر اپنے مضامین کا ایک مجموعہ اور وہ خاموشی " شگوفہ " کے صفحات ہی پر سہی وہ اپنی خموشی توڑ سکتی ہیں ۔ انہیں پڑھیں، آپ بھی متاثر ہوں گے ۔ نئی شاعری کا کچا چٹھا :

" نئی شاعری میں غزل سے زیادہ نظمیں ملتی ہیں جس کے کچھ مصرعے کبھی قدیم عمارتوں کے میناروں کی طرح طول طویل ہوتے ہیں اور کبھی نئی عمارتوں میں بنائے گئے کمن کی طرح مختصر ۔ ان طول طویل مصرعوں میں وہی اداسی نظر آتی ہے جو آپ کو قطب شاہی گنبدوں میں ملے گی نئی شاعری اور قدیم عمارتوں میں سب سے نمایاں اور مشترک صفت مایوسی کی فضاء ہے مقبروں کی طرح جدید شاعری میں زندگی کے نشان ناپید ہوتے ہیں اور اداسی طاری ہوتی ہے ۔ نئے شاعر کی آواز گنبد میں کھڑے کسی انسان کی آواز ہے جو لوٹ کر صرف اسی کو سنائی دیتی ہے " ۔ (کاغذی پیرہن)

ہمارے ہاں طنز و مزاح لکھنے والی اور خواتین میں شفیقہ فرحت، حبیب ضیاء، بانو سرتاج اور حلیمہ فردوس بھی ہیں ۔ طنز و مزاح میں آمد ہونی چاہیے ۔ آورد کی کیفیت طنز و مزاح کے کیف و کم کو مدھم کر دیتی ہے ۔ بانو سرتاج کے مضامین میں آمد کی کیفیت ہے انہوں نے زیادہ تر اطراف و اکناف اور گھریلو مسائل کو عنوان بنایا ہے اور اچھے پیرایہ میں یہاں دیکھئے ۔ ملازمہ کی سلور جوبلی :

" ہماری ایک سہیلی کے مدعو کرنے پر ہم اس کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی ملازمہ کی سلور جوبلی منا رہی ہے ۔ ہم نے نہایت اشتیاق سے پوچھا کیا اس کی ملازمہ کو اس کے یہاں کام کرتے ہوئے ۲۵ برس ہوگئے بولی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں یہ ہماری پچیسویں ملازمہ ہے " (ملازمہ بیرن بھئی)

عاتق شاہ کے انشائیے خالص انشائیے ہوتے ہیں ۔ طنز و مزاح کی آمیزش کم کم ہی ہوتی ہے اور جہاں بھی ہو، نہایت ہلکا پھلکا سیدھا سادا اور زود ہضم ، ہاں ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ضرور ہے ۔ اسلوب کی یک سانیت کے باوجود بات میں بات پیدا کرتے ہوئے قاری کی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں ۔ یہاں ذکر ہے جھاڑو کا :

" لیکن اس جھاڑو کا کوئی جواب نہیں ہوتا جو محبوبہ کے ریشمی بالوں کی طرح انتہائی ملائم ہوتی ہے ۔ آنکھ بند کر کے اگر اس پر ہاتھ پھیرا جائے

؛ معسوم ہوگا جیسے اردو غزل کا محبوب ہاتھ آگیا ہے ویسے جھاڑو اور ۔ دبہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا دونوں صفائی کا کام کرتے ہیں ۔ ایک گھر کی صافائی کرتی ہے دوسری جیب کی " ۔ (جھاڑ)

کتاب کے رسم اجراء کی تقریب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو اپنے ہاتھوں آپ دلہا بننا ہےاور لوگ بگ ہیں کہ اپنے ہاتھوں آپ دلہا بنتے ہیں داے ، درمے اور سخنے ، اپنے تماشے میں آپ مصروف اور حاصل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ برہان حسین نے رسم اجراء کی تقریب کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے ۔ برہان حسین نے اپنے ایک انشائیہ میں رسم اجراء کے تعلق سے دلچسپ نقشہ کھینچا ہے ۔ کہیں آورد ، تصنع یاایسا ویسا محسوس نہیں ہوتا ۔ لگتا ہے جو کچھ ہوا ہے ہورہا ہے یا ہوگابس انہوں نے وہ سب صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے " ۔ آنکھوں دیکھا حال ملاحظہ ہو ۔

شگوفومیاں کو لاکھ منع کیاگیا کہ وہ اپنی کتاب کی رسم اجراء پر بے لاگ اور کڑی تنقید کرنے والے نقادوں کو نہ بلائیں چونکہ اس قسم کی تقریب میں تو چن چن کر ایسے لوگوں کو بلایا جاتاہے جو اگر اپنی تحریروں کے مداح نہ ہوں تب بھی کم از کم اپنے کرایہ دار یاقرض دار رہ چکے ہوں ویسے اس قسم کی تقریب کی ضرورت ہی نہیں ہے چونکہ رسم اجراء کیجیے یا مینا بازار لگایے لوگ اردو کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے " ۔

(فن تنقید میں نئے تجربے)

مبالغہ اپنی جگہ لیکن باتیں بھی کیسے پتے کی ہیں کہ داد دیئے بغیر چارہ نہیں ۔ " شگوفہ " کے متعلقہ شمارہ ہی کا نہیں یہ مضمون ... سال کے منتخب مضامین میں شمار ہو گا ۔ برہان حسین کی بے ساختگی و بانکپن کا جواب نہیں ۔

ڈاکٹر عباس متقی اب اس منزل کی طرف رواں دواں ہیں جہاں وہ اپنی شناخت بنالیں گے ۔ ان کے ہاں طنزو مزاح کا خوش گوار امکان ہے ۔ زبان پر انہیں خاصا قابو ہے اور طنزو مزاح کے موقع و محل کے وہ آشنا ہیں ۔ خاکہ نگاری میں بھی ان کا فن نکھر آیا ہے اور ... دن میں بھی وہ کہیں کی بات کہیں پہنچا دیتے ہیں ۔ اب یہی دواخانہ عثمانیہ کا باب الداخلہ کدھر اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" اب (دواخانہ) عثمانیہ کاباب الداخلہ بند کر دیاگیا ہے ، ورنہ اس عمارت کاحسن نمایاں تھا ۔ لوگ دواخانہ کے پچھلے راستہ کو آمدو رفت کے لیے استعمال کررہے ہیں ۔ زمانے میں جس تیزی سے سامنے کے راستے بند ہورہے ہیں اسی تیزی سے پچھلے راستے کھل رہے ہیں "

(مردوں کا انتقال)

رؤف خوشتر کے پاس بھی گہرائی ہے اور کچھ نہ کچھ کہہ کر بہت کچھ کہہ دینے کا ہنر ۔ تھوڑی سی ریاضت ہوجائے تو کیا کہنے ۔ موضوع ... یا نہیں لیکن رؤف خوشتر نے اس کو نیاز اویہ دیدیا ۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

" ہمارے پڑوسی دوست امیر احمد (جو اپنا تعارف " غریب کو امیر کہتے ہیں کہہ کر کرواتے ہیں) گرانی الونس کی قسط ملتے ہی ... گراموفون خرید لائے ۔ ہم نےلاکھ سے کچھ زیادہ مرتبہ منع کیاکہ بھائی جان کے ہوتے ہوئے آخر آپ کو کیسے پڑے گرام فون کی ضرورت ... محسوس ہوئی ۔ ان کا جواب تھاکہ گراموفون کو جب چاہے خاموش تو کراسکتا ہوں " ۔ (چاندنی چوک)

جدید فیشن پر رؤف خوشتر کایہ اقتباس بھی بڑا دلچسپ ہے :

برا ہو اس جدید فیشن کا جس نے مردو زن میں سارافرق مٹادیا ہے اور مساوات کی لہر خواتین کے علاوہ اب مردوں کے شانوں پر ... کی صورت میں لہرا رہی ہے " ۔ (نیم گرل)

امجد علی فیض نے کچھ ایسازیادہ نہ لکھا ہو لیکن ان کے ہاں ایک کھنک ہے ۔ وہ نہایت فنکاری سے کام لیتے ہیں اور نفاست کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے ہیں ۔ آپ کو اپنے شہر کی مقامی بسوں کا تجربہ یقینا ہوا ہوگا آیئے اس کی یاد تازہ کرلیں ۔

جب دوسری بس آئی تو جان میں جان آئی اس بار ہم ہاتھ پیر مارتے ہوئے سیدھے بس کے اندر داخل ہوئے (سینگ ہوتے تو اور بھی آسانی ہوتی) اور سکون کی سانس لینی چاہی لیکن سمجھ میں نہیں آیا کون کس کی سانس لے رہا ہے کیونکہ ہجوم میں ایک دوسرے کی ناکیں یوں بغل گیر ہو رہی تھیں گویا عید کی مبارکباد دے رہے ہوں۔ ہم نے ناک کھڑکی کی جانب کرلی تاکہ کچھ آکسیجن بھی مہیا ہوسکے۔

(کفایت شعاری زندہ باد)

اور جب بس کے لئے سڑک پر آہی چکے ہیں تو ظاہر ہے اسکوٹر ہوتی تو ہیلمٹ کی ضرورت پیش آتی۔ فرحت کمال نے ہیلمٹ کے معنی و مفہوم تک جو رسائی حاصل کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے :

"ایک روز ہم نے ایک اردو تنقید نگار سے ہلمیٹ کی وضاحت طلب کی تو پتہ چلا کہ ہیل HELL جہنم اور MET پانا ہے۔ مجموعی طور پر یہ خود جہنم سے ملانے والا ایک ذریعہ ہے۔ اگر آپ اپنے کسی بدترین دشمن کو اس دنیا میں ہی جہنم کا مزہ چکھوانا چاہتے ہوں تو اسے ہلمیٹ پہننے کا مشورہ دیں"۔ (سیکل حادثہ اور ہیلمٹ)

ان سے قطع نظر وجاہت علی سندیلوی، جاوید لطیفی، مظہر الزماں خاں، روف پاریکھ، یوسف امتیاز، شکیل اعجاز، سلمیٰ صدیقی، نعیم زبیری، فیروز حیدر، قاسم ندیم، فرید سحر، سید طالب حسین زیدی، ایم۔ اے۔ نعیم، فضل جاوید، فرحت قمر، شہناز کنول، رفیق جعفر، رفیعہ منظور الامین، عبید سیفی، ایم۔ اے۔ حنان، شکیل اختر، ارشد علی خان، ایس۔ جے صادق، سید نصرت، مختار یونس، شاہ فیاض عالم، مونس سعید، نظام الدین نظام، خالد رحیم، اقبال شیدائی، شکیل شاہ جہاں، منظور الامین، رشید الدین، لئیق صلاح، دلشاد رضوی، صفدر حسین اور ....

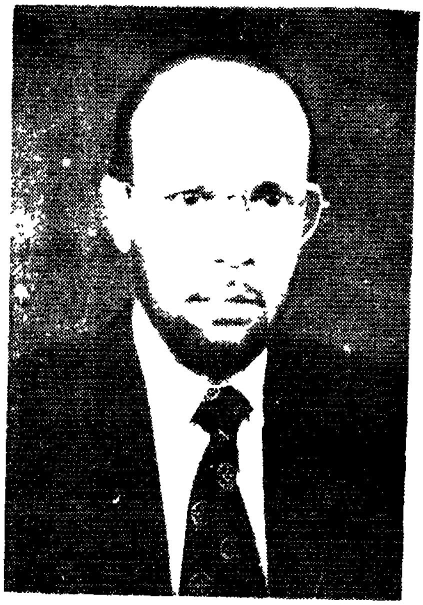
یہاں فہرست سازی مقصود نہیں لیکن نہ جانے اور ایسے کتنے قلمکار ہیں جنھوں نے گزشتہ ربع صدی میں طنز و مزاح کے افق کو سجانے سنوارنے، روشن و تابندہ کرنے، رنگین و دلکش بنانے میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا اور مجموعی طور پر طنز و مزاح کا سرمایہ وقیع ہوا.....

.. ہاں ہمارے طنز و مزاح نگاروں کی مساعی یہ ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ زندگی کی نبض پر ہاتھ رکھیں، زمانے کے قلب کی دھڑکنوں کو پہچانیں، اپنے آس پاس جو ہو رہا ہے اس کا اور گہرائی سے مطالعہ کریں۔ صرف بصارت سے کام نہ لیں، بصیرت کو بھی کام میں لائیں۔ طنز و مزاح کا مقصد (جیسا کہ آج کل بیشتر فنکاروں کے نزدیک) صرف ہنسانا اور قاری یا سامع کا وقت گزارنا ہے تو اس اس سے ادنی اد اسفل کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا۔ یہ تو سرکس کے مسخرے بھی کر لیتے ہیں۔ اچھے طنز و مزاح نگاروں کا فرض تو معاشرے کی خامیوں کجروں، کوتاہیوں، کمزوریوں، اس کی سطحیت، لایعنیت، بے معنویت، اس کے کھوکھلے پن، برخود غلط انداز، انتشار و اختلال اور فرسودہ پہلوؤں پر خوشگوار اور ہمدردانہ انداز میں متوجہ کرانا ہے کہ قاری ہو یا سامع، مشتعل ہوئے بغیر خوشدلی کے ساتھ فکر اور غور پر آمادہ ہوجائے۔ فنکار مصلح نہیں لیکن مصلحین کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ ان معنوں میں وہ رہنماؤں کا رہنما ہوتا ہے۔ اگر فنکار یہ نہیں کر سکتا تو وہ فن کار نہیں، وہ اور کیا کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

اُردو میں ظرافت نگاری

(اجمالی جائزہ)



انسان کو "حیوان ظریف" بھی کہا گیا شاید اس لیے کہ اس کی بے تکی حرکتوں نے ہنسنے ہنسانے کے سامان مہیا کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہنسی اور وہ بھی قہقہہ نواز ہنسی انسانی حیات کو خوشگوار لمحات سے دوچار کردیتی ہے، لیکن زندگی میں حقیقی خوشی و مسرت کا گذر کم کم ہی ہوتا ہے۔ یہاں میں فلسفہ حیات کے بارے میں گفتگو کروں گا اور نہ ہی فلسفہ غم و خوشی کا اظہار مگر اردو میں ظرافت نگاری سے متعلق کچھ کہنا چاہوں گا اس کے لئے میں ماند کیا گیا ہوں۔ ہمارے شہر حیدرآباد سے نکلنے والے باغ و بہار ماہنامہ "شگوفہ" (ملک اور بیرون ملک کے زندہ دلان کا واحد ترجمان) کا ... سالہ یادگار خاص نمبر جو نکلنے والا ہے ... اس کو کیا کیجئے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال بھی بڑے کمالی بزرگ ہیں ... آج وہ کسی کو جانتے ہوں ... بھی موصوف سے یہ حکم نافذ ہو گیا ... اس نمبر کے لئے اردو میں ظرافت نگاری کا اجمالی جائزہ تحریر کروں ... یہاں یہ میں واضح کر دوں کہ اپنی افتاد طبع سے میں کبھی بھی ظرافت ... سے قریب نہ رہا۔ مگر کوئی شخص اس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ اس طرح کے جذبات و احساسات سے عاری ہے ... وہ ہنسنا نہیں چاہتا در اصل ہنسنا اور رونا (خوشی و غم) اس کی جبلت اس کی سرشت کا ایک حصہ ہے یہ کسی صورت مفقود ہوگا اور نہ اس سے مفر ممکن ہے یہ وہ جذبات ہیں جو انسان کے مافی الضمیر کی نہ صرف عکاسی کرتے ہیں بلکہ زندگی کو رنگا رنگ کیفیات سے ہم آہنگ بھی کرتے ہیں۔

ظرافت نگاری ادب کی کوئی صنف نہیں لیکن اس طرز و اسلوب نے دنیا کے کم و بیش ہر ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے اس کی بنیادی وجہ جبلت یا فطرت انسانی کا وہ پہلو ہے جو خندہ، مزاح اور طنز کے جذبات سے مملو ہے مجموعی طور پر جب یہ جذبے اصول اخلاق کے ساتھ میل کھاتے ہیں یا ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو کمال ندرت سے اپنا رنگ دکھاتے ہیں یہ کسی بھی ملک و قوم کی تہذیبی معاشرتی نیز سیاسی حالات کے فکر کا آئینہ ہیں اس میں ثقافتی اقدار کی شکل اس کا کردار بھی صاف جھلکتا ہے، ظریفانہ ادب خاص طور پر قوم و سماج کے مزاج اور اس کے رویہ کی نشاندہی کرتا ہے . . .

نام ** ڈاکٹر عقیل ہاشمی
مصروفیت ** ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
تصانیف ** حضرت وطن، حیات اور کارنامے، پیغمبران حق (سوانحی مضامین) کلیات نقد علی خاں لعاد، مصباح تصوف اور شعری مجموعے حرف وصوت، موج نظر، ظہور قدسی، پہلی خط، فراز نو اور آیات پیغمبر نور اللہ

اس کے ذریعے تفریحی مذاق، کے پردے میں حقائق کا اظہار کیا جاسکتا ہے تاریخی لحاظ سے مشرق و مغرب میں، زمانہ قدیم سے ادب کی یہ قسم مختلف انداز و طریق سے اپنا اثر و نفوذ جمائے ہوئے ہے، ظرافت نگاری سے متعلق اس کی نفسیات اس کی قدر و قیمت کے تعین میں اہل مغرب نے خوب، خوب تحقیق کی جس کی رو سے ظرافت محض ہنسی دلگی یا دماغی تفریح کا نام نہیں بلکہ خیالات و احساسات کی شعوری رو کو حقیقت سے دوچار کرنے کا منہاج ہے۔

اردو میں ظرافت نگاری کا آغاز کسی حادثاتی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ قدیم روایات قصہ کہانی کی صورت جیسے الف لیلیٰ یا داستان امیر حمزہ کی طلسماتی افسانوی طرز میں دانستہ کچھ احمقانہ یا ظریفانہ کرداروں کے ذریعہ سامنے آئے ان میں عمر عیار، شیخ چلی جیسے نام صاف پڑھے جاسکتے ہیں۔ شاعری کے مقابل، نثر نگاری میں ظرافت کا رنگ و آہنگ نسبتاً کمزور ہوتا ہے اس کی وجہ شاعری کی ایمائیت رمزیت اختصار لفظی اور جامعیت ہے اور نثر نگاری میں وضاحت تفصیل اور اس کا استدلالی پہلو ہے۔ ہندوستان میں خصوصاً اردو شاعری میں نظیر اکبرابادی کے بعد اکبر الہ آبادی کی شاعری ظرافت کی خوبیوں کی اچھی مثالیں پیش کرتی ہے۔ اس میں معاشرتی تہذیبی رسم و روایتوں کی ابیاری ان پر طنز و تنقید کا طرز حاوی رہا جب کہ دیگر سنجیدہ طبع شاعروں جن میں حالی، شبلی اور اقبال اور بعد میں ظفر علی خاں اور عبد الماجد دریابادی وغیرہم شامل ہیں اس طرز و منہاج سے دامن کش نہ ہوسکے۔ مولانا حالی نے مزاح کی تعریف کچھ یوں کی ہے وہ کہتے ہیں

> "مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ایک سہانی
> خوشبو کی لپیٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہوجاتے ہیں ایسا مزاح فلاسفر و حکماء بلکہ
> اولیاء و انبیاء نے بھی کیا ہے اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں۔"

ظرافت کے تعلق سے رشید احمد صدیقی نے بتلایا کہ اہل یونان کے ہاں بھی ظرافت کا استعمال تھا گویا عہد قدیم سے ظرافت اپنا وجود رکھتی ہے جیسے کہ انسان غم و اندوہ سے وابستہ ہے انسانی معاشرہ میں ظرافت کی اپنی ایک اہمیت ہے یہ اصل میں آپسی تعلقات یا ریشہ دوانیوں کے سبب بھی پیدا ہوجاتی ہے اس میں خوشگواری شوخی طبع ذہانت اور مبالغہ کا بھی دخل ہوگا، اور شاعری سے کہیں کم نثر نگاری میں اس کے اثرات دکھائی دیں گے مگر الفاظ کی دروبست اسلوب کا انوکھا پن نثر میں بھی ظرافت کا حسن بڑھاتا ہے چنانچہ مولانا حالی نے ظرافت میں الفاظ اور اسلوب سے زیادہ اس کے اثر پر زور دیا ہے۔ اور محمد حسین آزاد، زبان کی چاشنی اسلوب کی دلآویزی کے طریق کو اہمیت دیتے ہیں اب اگر اس میں شائستگی نفاست نکتہ سنجی مشاہدہ اور ادراک کی تیزی نہ ہوتو، شاید وہ اپنے مقصد سے دور ہوجائے گی اس کی سب سے بڑی خوبی موثر اور تیز مطالعہ حیات ہے مگر اس میں جذبہ تضحیک تحقیر، تنفر ابتذال اور سستا پن نہ ہو کیونکہ ظرافت خصوصاً ادبی ظرافت میں لذت مسرت اور ظریفانہ جہتیں بات میں بات پیدا کرنے کا وصف ہی طبیعت میں فرحت و شادمانی کے ساماں پیدا کرتا ہے ورنہ یہ ساری باتیں تفریح و تفنن سے دور ہوجائیں گی اور یہ لعنت ملامت، شتم، ظرافت کے خلاف اس کے معائب ہیں۔ بہر حال ادبی ظرافت انسانی مسائل اس کے اردگرد ماحول کی عکاسی لطف و شادابی سے عبارت ہے اس کا تعلق اصناف ادب کے لحاظ سے ہر صنف سے ہوگا اور افسانہ نگاری، تمثیل نگاری ناول، سفر نامہ، مضمون اور انشائیہ کی صورتیں واضح ہونگی۔

اردو میں ظرافت نگاری کی ابتدا کے بارے میں ہمارے مفکرین کی رائے ہے کہ اس کا آغاز اصلاً مغلیہ حکومت کے انحطاطی دور سے ہوتا ہے۔ ہمارے ایک معروف مزاح نگار یوسف ناظم کے خیال میں

"زندگی اور تہذیب سے راست تعلق رکھنے والی ظرافت پر بحث کا آغاز مرزا غالب کے رقعات سے

کیا جانا مناسب ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ حسن نثر کی شروعات کی وہ ان سے پہلے مفقود تھی برجستگی بے تکلفی روانی سلاست اور ان سب سے زیادہ مراسلہ کو مکالمہ بنادینے والی کیفیت بجائے خود غیر معمولی ہے اس پر طرفہ تماشا ظرافت کی چاشنی مزاح کی رنگینی اور کہیں کہیں طنز کی ترشی، غالب کے مزاج مرتبہ جودت طبع، سرشت خیال کو دوچند کر دیتا ہے ان کے خطوط کا مزاحیہ و طربیہ پہلو ظرافت کا نیا انداز اور اولین طرز ثابت ہوا۔ قدرت نے بھی غالب کو ظریف طبیعت عطا کی تھی ان کے خطوط بسا اوقات تفریح طبع سے زیادہ فکر انگیزی کی جانب مائل کرتے ہیں اس طرز تحریر کے وہ خود موجد تھے اور وہی خاتم بھی ٹھہرے ان کے بعد نہ یہ اسلوب یا روش کسی نے اپنائی اور نہ ہی کسی کو ان کا انداز نصیب ہوا ہے۔

مرزا غالب کی مکتوب نگاری کا یہ وصف اضافی ظرافت ہی تو ٹھہرا مرزا کے بعد دیکھا جائے تو طنزیات اور مضحکات کا عنوان صحافت سے اجاگر ہوا۔ اور وہ بھی اخبار اودھ پنچ لکھنو کی صورت میں اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے اپنے اخبار کے ذریعے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی وہ ناقابل فراموش ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس اخبار کے لئے کئی اور لکھنے والوں کی جماعت تیار کی ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، جوالا پرشاد برق، عبدالغفور شہباز، ابوالکلام آزاد، منشی احمد علی شوق وغیرہ کے نام سرفہرست ہو گئے۔ منشی سجاد حسین طبعاً خوش مزاج تھے۔ بذلہ سنجی اور شوخی کو ان کی فطرت ثانیہ سمجھنا چاہیئے زبان و بیان کے لحاظ سے ان کی عبارتیں صاف ستھری ظریفانہ انداز سے مملو ہوتیں اردو میں ان کے دو ناول "حاجی بغلول اور احمق الذی" خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، منشی صاحب کے کردار حاجی بغلول کو چارلس ڈکنس (Charles Dickens) کے کردار پک وک ابراڈ کا ناقص چربہ بتاتے ہیں مگر اردو ظرافت نگاری میں اس منفرد کردار کا ہنوز جواب نہیں ملتا، اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین کے علاوہ رتن ناتھ سرشار نواب سید محمد خاں آزاد مولوی عبدالغفور شہباز کی طنز و ظرافت اپنی آپ مثال ہے۔ سجاد حسین کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ظرافت نگاری کی اہمیت غیر معمولی ہوگی، سرشار کی رنگین بیانی کا کمال ان کی تصنیف فسانہ آزاد سے مترشح ہے ان کی تحریر، زندہ دلی اور شوخی کا منبع ہے ان کے بارے میں متضاد آرا ملتی ہیں بعض کہتے ہیں کہ ان کی فسانہ نویسی میں غور و فکر کا کوئی رجحان نہیں ملتا، اکثروں کا خیال ہے کہ سرشار جس طرح زندگی کی دلکش تصویروں کو پیش کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے وہ معمولی معمولی فقروں سے شوخیوں و پرلطف تماثیل کی صورت گری کرتے ہیں مکالموں کے ذریعہ ترکی بہ ترکی سوال و جواب کا اظہار ان کی تحریروں کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے اسی طرح سرشار کے ہمعصروں میں نواب سید محمد نواب، سلطان حیدر جوش اور ان کے بعد خواجہ حسن نظامی کے ہاں ظرافت نگاری کا طور طریق انوکھا اور دلچسپی سے خالی نہیں خواجہ حسن نظامی خود اپنی ظرافت نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "مری طبیعت کی افتاد شوخی اور ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے مگر جناب اکبر الہ آبادی کی ہم نشینی اور اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج پڑے مجھ کو بھی شوق ہوا کہ اردو کے اس میدان میں طبع آزمائی کروں ہنسی مذاق مرا کام نہ تھا مگر میں نے محض زبان اردو کی خاطر اس میں دخل دیا اور کچھ لکھا"

اس اقتباس کی روشنی میں خواجہ صاحب کی طبیعت اور انداز بیان سے متعلق معلومات کے باوصف ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے اردو ظرافت نگاری کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ان کی تحریروں میں جہاں معاشرتی اصلاح کا پہلو نکلتا ہے وہاں سیاسیات اور کبھی کبھی مذہب سے متعلق حقیقت حال پر تبصرہ ملتا ہے رعایت لفظی استعاروں اور تلمیحات کے تحت وہ اپنی بات کو

منضبط و مستحکم کرتے ہیں اسی طرح ہمارے ابتدائی ظرافت نگاروں میں راشد الخیری کا نام بھی جوڑ لیتے ہیں حالانکہ راشد الخیری کا لقب ہی مصور غم ہے تاہم ان کے دل میں عورتوں کے بارے میں جو نفسیاتی الجھنیں اور ان کے حل کی کشمکش دکھائی دیتی ہے اسی میں کہیں کہیں محض ذائقہ کی تبدیلی کے لئے مزاح کا رنگ جھلک اٹھتا ہے جب کہ وہ طبعاً ظرافت کے فطری جذبہ سے دور نظر آتے ہیں ۔ یہی کچھ حال ملا رموزی کا بھی ہے رشید احمد صدیقی کے خیال میں ملا رموزی کی ظرافت ظرافت نہیں شخصیتوں کے بارے میں ذہنی اور ذاتی طعن و تشنیع ہے جب کہ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے سرے سے ملا رموزی کو ظرافت نگار ماننے سے انکار کیا ہے ۔ عظیم بیگ چغتائی کی ظرافت اور شوکتیات کے بارے میں کچھ کہنا ظرافت نگاری میں محاسن اور خوبیوں کے زمروں کی خانہ پری کرنا ہے ان دونوں مزاح نگاروں نے اردو ادب میں ظرافت نگاری کی امکانی وسعت کو افق تا افق پھیلا دیا، اور انسانی خوش طبعی بے تکلفی اور جذبات کی بے ساختگی کو زندگی کا جزو بنا دیا ۔ اسی میدان عمل میں جب نیاز فتحپوری داخل ہوئے تو ان کی تحریروں کا رنگ ڈھنگ ہی سب سے جداگانہ رہا نیاز بیک وقت مدیر نقاد، افسانہ نگار مترجم انشا پرداز کیا نہیں تھے ان کے مضامین بلکہ ان کے خطوط میں طبع کی شوخی ظرافت کی چاشنی چھپائے نہیں چھپی ۔ ان کا ذہن رسا نکتہ آفرینی باریک بینی میں ایسے ایسے دل خوش کن فقرے جملے جو ادبی نفسیات کی گرہیں کھولتے ہوئے قاری کو کبھی زیر لب تبسم سے اور کبھی طنز و تیر و نشتر سے واقف کرا دیتے اور طبیعت پر گرانی بھی نہیں ہوتی ان کا مزاح اپنا ایک خاص مزاح رکھتا تھا جو اپنی لحاظ سے منفرد اور سلیقگی کا آئینہ دار ہوتا تھا کم و بیش یہی حال اس دور کے ایک اور لکھنے والے مدیر اخبار پیام حیدرآباد کے قاضی عبد الغفار کا تھا یوں تو قاضی صاحب کا تعلق لکھنؤ سے تھا ۔ محمد علی جوہر کی ایما پر اولاً دہلی کے اخبار ہمدرد سے اپنی صحافتی زندگی شروع کی ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر اظہار خیال کرتے تھے جس میں طنز کی کاٹ مزاح کا دلچسپ وصف مضمر ہوتا ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار ظرافت نگاری کے پہلو سے ہی اجاگر ہوا وہ کوئی بات راست کہنے کی بجائے صاف و شستہ طریقہ پر مزاح کو استعمال کرتے اس کے تحریر کی دلآویزی کی لئے لیلی کے خطوط کافی ہیں ۔

اس زمانہ میں شمال میں رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی شوکت تھانوی، ہمایوں کے فلک پیما مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس جاری لکھ رہے تھے ایک صاحب ناکارہ حیدرآبادی ہوا کرتے تھے ان کے مضامین ہندوستان کے موقر رسالوں میں شائع ہوتے تھے ان کی تحریر میں ظرافت کا واضح پہلو ہوتا زبان صاف ستھری اور شگفتہ ہوتی ان کی ظرافت نگاری کا دائرہ عموماً معاشرت ہوتا اور کبھی کبھی ادبی اور سیاسی ہنگاموں کی بازگشت بھی سنائی دیتی تھی اس طرح بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی تک ہماری زبان میں ظرافت کے جوہر بڑے طمطراق انداز میں اپنی تابناکی ظاہر کر چکے تھے سیاسی نوعیت سے ملک بھر میں بے اطمینانی جنگ آزادی کی بازگشت معاشی تنگی تعلیمی معیار کی بے یقینی حالت پارٹیوں، گروہوں اور طبقوں کی صف بندی ادب میں ترقی پسند تحریک کے معرکے اور عجیب و غریب ماحول کے درمیان ہی ایک ظرافت نگاری تھی جس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے شگفتہ چھیڑ چھاڑ کے مواقع فراہم کئے دردمندی کو تلخی اور تیر بیت کے ہمراہ پیش کیا اس زمانے میں جن لکھنے والوں کی فہرست سامنے آئی ان میں ظفر علی خاں اور ان کے تلامذہ، شورش کاشمیری، حاجی لق لق سندباد جہازی، عبد المجید سالک، امتیاز علی تاج، کنہیا لال کپور، ایم اسلم وغیرہ کے نام ملتے ہیں اور پھر تقسیم ہند کا جانکاہ ہنگامہ ہماری تہذیبی تاریخ کے لئے ایک بھیانک حادثہ ثابت ہوا اس پورے ہولناک عرصہ میں ادب کی زنبیل میں آہ و بکا کے ساتھ طنز و مزاح ہی تو رہ گیا تھا دکن کے ابراہیم جلیس اسی خمیر سے اٹھے، کنہیا لال کپور کے بعد شاید کرشن چندر ہی وہ عظیم لکھنے والے تھے جنہوں نے اردو ادب کی دنیا میں اپنے منفرد لب و لہجہ طنزیہ انداز شگفتہ تحریر سے ایک عالم کو متاثر کیا اور شاید یہی انوکھا طرز گفتگو تھا جس نے منٹو کو سیاہ حاشیے لکھنے پر آمادہ کیا ۔ ظرافت نگاری کی اس منزل میں فکر تونسوی، مشتاق احمد یوسفی، انتظار حسین، ابن انشا،

کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، احمد جمال پاشاہ، رضا نقوی واہی کے ن بدولت حیدرآباد میں تمکین کاظمی، اعجاز حسین کھٹا، مرزا شکور بیگ، یوسف ناظم وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہولناک واقعہ آزادی نے حیدرآباد کی ادبی فضاء کو بھی متاثر کیا تھا۔ اور پھر جلد ہی یعنی ۴۸ء میں حیدرآباد کی حکومت ہی نہیں بدلی بلکہ تہذیب و معاشرت ادب و صحافت اور تعلیم پر ایک ضرب کاری لگی جس نے اس بدلتے ہوئے ماحول میں طنز و مزاح کے لئے کئی نئے راستے وا کیے اطراف و اکناف کی بدلتی قدریں بگڑتے حالات سنورتے معاملے ثبات و تغیر کی خوب و زشت کی کیفیات نے انسان خصوصاً ادیب و شاعر کو اکسایا خوش و ناخوش کی کہانی فرقہ وارانہ فسادات، لسانی تضادات سیاسی استحصال، بنتے بگڑتے معاملات، زبان اردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ معاشی ابتری نہ جانے کتنے ہی موضوعات اپنی اپنی زبان حال سے فسانہ زندگی سنا رہے تھے ایسے ہی وقتوں میں احیاپسندی، مذہبی حسیت معاشرتی اصلاح تعلیمی سرگرمیاں عروج پر نظر آتی ہیں اخلاقی اور روحانی قدروں کی شکست و ریخت روبہ انحطاط ماحول اور معاشرہ طنز و مزاح کے امکانات اور رجحانات کو مواد فراہم کرتا ہے چنانچہ حیدرآباد میں ظرافت نگاری کا انداز گہرائی و گیرائی کے ساتھ پھیلتا گیا اس میں عامیانہ انداز بھی در آیا پھکڑ بازی آپسی رقابت کے نتیجہ میں تخصیصی طعن و تشنیع اور راست اہانت آمیزی کا پہلو بھی ہاتھ سے جانے نہ پایا مگر اس دوران ہمارے لکھنے والوں میں فنی معیارات کا پیدا ہوجانا غیر واضح نہیں رہا بلکہ اس صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں حیدرآباد میں طنز و مزاح کا ماحول بڑی حد تک صاف ستھرا رہا جب اہل حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں اولین مقام رکھنے والوں میں اکبر وفاقانی، میر حسن، مخدوم محی الدین اور ان کے بعد عاتق شاہ، رشید قریشی، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، خواجہ عبدالغفور، یوسف ناظم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے نمائندہ مزاح نگار مجتبیٰ حسین، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، برق آشیانوی، ڈاکٹر رشید موسوی وغیرہ کے نام ابھرتے ہیں۔ اور یہ دین محض زندہ دلان حیدرآباد کی نہیں تھی مگر اس انجمن کی فعالیت سے انکار بھی ممکن نہیں شاید یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شگوفہ کی اجرائی نے ان تمام لکھنے والوں کو پلیٹ فارم مہیا کیا، خصوصیت سے شاعروں کے مقابل نثر نگاروں کو کسی رسالہ کی ضرورت تھی، گو اس سے پہلے حیدرآباد سے نکلنے والے دو تین رسائل جن میں "سب رس"، "صبا" کا اپنا ایک مزاج مرتبہ اہمیت و وقعت تھی مگر کاملتاً مزاح نگاری کی کمک یا پشتی کے لئے ایسا کوئی ماہنامہ نہ تھا جس کے ذریعے ظرافت نگاری کو بڑھاوا مل سکے۔ اب تو شگوفہ کی رسائی خلیجی ممالک ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ مغربی دنیا میں لندن، امریکہ، کینیڈا میں بھی اس کی پذیرائی ہے۔ جہاں شعر و ادب کے دلدادگاں خصوصاً ظرافت نگاری کے عاشق محض تسکین و تحسین کی خاطر نہیں بلکہ وہاں پر موجود انسانی مسائل اور ان کے حل کے لئے طنز و مزاح کا سہارا لے کر حقائق کی پردہ دری میں مصروف ہیں خصوصیت سے ... شکاگو، جدہ، ریاض، دوبئی اور دیگر خلیجی شہروں میں کتنے ہی لکھنے والے شامل ہیں اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ حیدرآباد کے مزاح نگاروں کا مشاہدہ مطالعہ اور پیش کشی کا انداز انوکھا، شاندار اور حقیقت پسندانہ ہے جو صرف ہنسی مذاق کی حد تک محدود نہیں۔ ماضی قریب کے ہمارے چند ایک مزاح نگاروں کے مضامین اس بات کی ضمانت ہیں جیسے آج بھی رشید قریشی کے مضامین پڑھیے تو ان کی تازگی اور برجستگی موضوع کے اعتبار سے متاثر کن ہے یہ صحیح ہے کہ رشید قریشی نے محض شادی بیاہ، جہیز لین دین کی لعنت اور اس کے اسباب پر قلم اٹھایا جن کی عالمگیر حقیقت سے انکار ممکن نہیں رشید قریشی کے ہاں زبان و بیان کی شائستگی، شگفتگی صاف نظر آتی ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا اظہار واقعات کی ترتیب فنکار کی چابکدستی پر دلالت کرتی ہے، اس کا لب لہجہ متین شگفتہ اور چلبلا رہا رشید قریشی کے علاوہ بھارت چند کھنہ اور نریندر لوتھر کا طرز تحریر اچھوتا دلنواز اور دلچسپی سے خالی نہیں بقول ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔

"نریندر لوتھر اگر کچھ نہ لکھتے 'حیدرآباد کا تغرافیہ' ہی لکھے ہوتے تو ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں بھی ہوتا اور جغرافیہ میں بھی۔"

نریندر لوتھر کا انداز بیان اپنے زاویہ نظر کا ترجمان ہے اپنی وابستگی میں انہوں نے کہیں بھی غلطی نہیں کی وہ طنز و مزاح کے استعمال سے واقف اس کو بروئے کار لانے کے ماہر ہیں لوتھر صاحب نے مزاح نگاری کو محض شگفتگی اور پھلجھڑی جیسی کیفیت سے دوچار نہیں کیا اس کو ایک اچھوتا نرالا طور دیا اس کے نئے نئے تیور بھی دکھلائیے۔

ان دنوں ادب میں ظرافت نگاری کی موجودہ روش کے اعتبار سے یوں تو کئی ایک لکھنے والے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان میں دو ایک نام ایسے ہونگے جن سے نظر ملانے کا یارا ہے اور نہ ہی نظر ہٹانے کی ہمت وہ اہم نام یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے ہیں۔ یوسف ناظم کی تحریروں میں لطف و شادمانی قدم قدم پر متاثر کر لی ہے وہ طنز و مزاح کے مختلف جہتوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں ان کی جہاں بینی خود بینی سے یکسر مختلف ہے، ہمہ دانی کے دعوی کی جائے وہ معمولی معمولی فقرہ میں بھی دعوت فکر سے دوچار کرتے ہیں وہ کسی موقعہ پر بھی سبک روی سے کام نہیں لیتے ان کے پاس آورد کا گذر نہیں صرف آمد ہی آمد ہے فنی لحاظ سے اپنے مضامین میں تہہ داری معنویت کے ساتھ یوسف ناظم حسن مزاح کو تیز تر کر دیتے ہیں، یوسف ناظم کی زود نویسی مثالی تو نہیں کہی جا سکتی مگر اس سے صرف نظر بھی نہیں کیا جا سکتا یہی ان کی انفرادیت ہے

اور اب ایئے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں کچھ عرض کروں، مجتبیٰ حسین ہمارے عصر کے وہ مزاح نگار ہیں جن کی ژرف نگاہی نے ایک عالم کو حیران و ششدر کر دیا وہ متوازن و معتدل مزاج کے حامل اپنے اطراف و اکناف سے آگاہ و باخبر ہیں کم و بیش اپنی تحریر سے اپنے قاری یا سامع کو برانگیختہ کر دیتے ہیں ان کے ہر فقرہ ہر جملے میں جہاں جدت طرازی کی جھلک ہوگی وہیں ندرت و کمال کی آشکارا ہوگا مجتبیٰ حسین نے آج تک جن جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ بظاہر زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن مجتبیٰ حسین کی فنکاری کا اصلی جوہر انسانی حیات کی یہی دلکش رنگیں ہیں جن کا اظہار بھی اوروں کے لئے ممکن نہیں انہوں نے مزاح کو طنز کی ڈھال نہیں بنایا اور نہ ہی مزاح کے حیف سے خیف جزو کو ضائع کیا ان کے طرز تحریر کی ایک خوبی بھی ہے کہ وہ نازک ترین جملوں کی لطافت و شگفتگی کو مجروح کئے بغیر طنز نشتریت کو تلخی سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں اس ضمن میں انہوں نے سیر و سیاحت سے بھی راست استفادہ کیا۔ سفر ناموں کے ذریعہ مختلف سطح کی معلومات کے بنیادی وصف کے ہمراہ وہ علاقوں شہروں ان کے رہنے بسنے والوں کی نفسیات رسم و رواج روایتوں اقدار کے درمیان واقعات کی شادابی اور فطری شوخی کی تخلیق کرتے ہیں عام طور پر مجتبیٰ حسین خود کلامی سے کام لیتے ہیں اور بڑی چابکدستی سے اس منظر میں خود کو بھی شامل کرتے ہیں یہ ان کا وصف خاص ہے بلکہ ان کی شناخت بن گئی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں اپنائیت، یگانگت، ہمدردی و بے لوثی کا جذبہ بھی ملے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ شخصیت نگاری (مرقع یا خاکہ نگاری) کا پرتو بھی اپنے پورے حسن و جمال سے دلآویزی بکھیرتا ہے، مجتبیٰ حسین کا قلم ہنوز تازہ دم، باغ و بہار اور معنی آفرینی و صداقتوں کا امین ہے انہوں نے مزاح کو برائے مزاح نہیں لکھا ان کے مطمح نظر مزاح نگاری کا ایک مقصد ہے، مجتبیٰ حسین کے ساتھ حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں مسیح انجم، پرویز ید اللہ مہدی، سید نصرت، برہان حسین کے علاوہ تازہ واردوں میں چند نام ایسے ملیں گے جن سے مستقبل میں توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ میدان ظرافت میں نئے نئے گل بوٹے کھلائیں گے صورت دیگر خندہ طنز اور مزاح کا یہ مثلث جس کے ابعاد میں ظرافت نگاری کی ایک دنیا آباد ہے سرابی کیفیت کا شکار ہو جائے گی۔ ان نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر عباس متقی، طارق غازی اور ڈاکٹر عابد معز کے نام لیے جا سکتے ہیں

مسیح انجم کی ظرافت نگاری کا واضح پہلو غالباً اصلاح سے عبارت ہے، مسیح انجم ہمارے ایسے مزاح نگار ہیں جس نے مزاح کی حسیت کو طنز میں آہستہ آہستہ گھول دیا ہے انہوں نے اپنے بیشتر مضامین میں عمومی کرداروں اور ان کے بھولے اور شاطرانہ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے

طنز و مزاح کو خوشگوار بنانے کی سعی و کاوش میں انہوں نے کہیں کہیں معاشرتی صورت حال کو معمولی سطح تک پہنچا دیا، ان کا طرز تحریر، زیادہ تر مضمون نویسی کا سا ہے البتہ زندگی کے بعض اہم واقعات کے اندراج میں وہ پس و پیش کے شکار نہیں ہوئے یہی ان کی فنکاری کا حادو ہے جو موضوع سے قاری کو باندھے رکھتا ہے ظرافت نگاری میں شاید یہی کمال ہوگا کہ فنکار ہر دم قہقہے لٹاتا رہے اور واقعات کا سیل رواں بھی جاری رہے۔

پرویز ید اللہ مہدی، بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہیں لیکن کند ہمجنس با ہمجنس پرواز" کے مصداق مزاح کی جانب بھی توجہ کی۔ ان کی تحریروں کے بارے میں صاف طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے پہلو میں ایک دردمند دل اور صحت مند دماغ رکھتے ہیں ان کے ہاں بات لینے کا فن بھی ہے اور انہوں نے شستہ اور مہذب طور سے مذاق کو مذاق بنا کر پیش کیا جہاں کہیں طنز کی ضرورت محسوس کی تو اس کا اظہار کیا اور خوب کیا ہے نیز معاشرتی اصلاح کا پہلو بھی اجاگر کیا، ظاہر ہے، ہماری جیتی جاگتی دنیا میں سیاست کا بھی ایک مزاح ہے اس پر پرویز نے بڑے اچھوتے انداز میں اشارے کئے ہیں۔ اسی طرح برہان حسین جن کا موضوع عام طور پر سائنس کے اردگرد گھومتا ہے مزاح کو طنز کو اور کبھی کبھی ان دونوں کے حسین امتزاج کو اپنے مضامین میں یکجا کیا ہے ان کے ہاں اسٹائل یا طرز و اسلوب کا تعین نہیں ملتا البتہ واقعات کی ترتیب میں وہ موضوع کے لحاظ سے کامیاب نظر آتے ہیں مگر مزاح کا رنگ پھیکا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عباس متقی کی شخصیت ہمہ جہت، ہمہ رنگ نظر آتی ہے وہ بیک وقت شاعر، واعظ، انشائیہ نگار مترجم اور مزاح نگار ہیں ان کے اندر کا مزاح نگار قدرے قوی معلوم ہوتا ہے اس بات کو اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ مزاح نگار پہلے ہیں اور بعد میں ان کی دوسری صورتیں کیونکہ عباس متقی نے زمانہ کے سرد و گرم اونچ نیچ ناآسودگی اور ناہمواری، معاشرتی عدم توازن، انتشار و اخلاقی گراوٹ، مذہبی اقدار کو پڑھنے کی دانستہ و شعوری کوشش کی انہوں نے شاعری سے زیادہ نثر نگاری خصوصاً مزاح نگاری کے ذریعہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جو شاید ہمارے روبرو ہوتے ہوئے بھی، ہم سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان کے پاس زبان و بیان کا سلیقہ ملتا ہے۔ ماحول کو حمق اور خوشگوار بنانا جانتے ہیں ان کے ہاں دردمندی انسان دوستی کی روایت بھی ملتی ہے اور یہ ساری چیزیں محض انشائیہ نگاری کے توسط سے طنز و مزاح کا دامن تھامے دئے ہے، ہمارے ایک اور نئے مزاح نگار جو حسن اتفاق سے خلیجی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی ڈاکٹر عابد معز، ان کے متعلق یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ روزگار کی فراہمی یا خلیجی دنیا کے مسائل کے درمیان حیدرآباد میں "دل و دماغ" رکھنا بڑی انوکھی چیز ہے ڈاکٹر عابد معز کی کتاب "واہ حیدرآباد" اس کی جیتی جاگتی مثال ہے ڈاکٹر صاحب کے پاس دوررس نتائج اخذ کرنے والا دماغ اور باریک بینی کی روشن آنکھ کے ساتھ ساتھ مضبوط قلم بھی ہے جس کے ذریعہ وہ حقیقت پر پڑے دبیز پردوں کو چاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے ہاں مزاح کی چاشنی ہے البتہ طنز کی نشتریت اچٹتی محسوس ہوتی ہے فقروں میں برجستگی کی کمی کی وجہ سے کہیں کہیں وہ اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ تلمیحات اور استعارات کے لئے مطالعہ کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور پھر ظرافت نگاری کے باب میں ان کی اپنی اہمیت مسلمہ ہے۔ خواتین میں شفیقہ فرحت کے بعد ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر لئیق صلاح، ڈاکٹر بانو سرتاج اور ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے تدریس اور تحقیق کی مصروفیات کے ساتھ مزاح کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بہرحال اردو میں طنز و مزاح کا میدان آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں کچھ اس قدر وسیع ہے کہ اس کا شہسوار اپنے اشہب قلم کو تاوقتیکہ مہمیز نہ دے وہ اپنی سمت و رفتار مقرر نہیں کر سکتا اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو خوشیوں و مسرتوں سے، ہم آہنگ نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

"شگوفہ" کی سلور جوبلی کے موقع پر یہ طے کیا گیا تھا کہ رسالہ کی پچیس سال کی فائلوں سے نثر و نظم کی تخلیقات منتخب کی جائیں اور دو علحدہ خصوصی اشاعتوں کی صورت میں انہیں شائع کیا جائے۔ چنانچہ ۲۵ سالہ شعری انتخاب تو شائع ہو گیا لیکن نثری انتخاب کی اشاعت کا کام ٹلتا رہا۔ ادب دوست شخصیت برادرم نواب سکندر علی خاں صاحب نے اس پروجیکٹ کی تکمیل میں دلچسپی ظاہر کی۔ ڈاکٹر عابد معز ایڈیٹر اودرسیز کی تحریک پر ہم نے ان سے مہمان مدیر کا اعزاز قبول کرنے کی درخواست کی۔ شگوفہ کے دیرینہ مستقل خریدار اور مزاح کا شستہ اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے دیرینہ قاری ہیں لیکن ۲۵ سالہ نثری انتخاب کے مہمان مدیر کی حیثیت سے انہوں نے پھر ایک بار شگوفہ کے تمام شماروں کا بہ نظر غائر جائزہ لیا اور اپنے مطالعہ کا حاصل پیش کیا۔ اس طرح یہ شمارہ بندھے ٹکے اصولوں پر کام کرنے والے کسی روایتی محقق و نقاد کا انتخاب نہیں بلکہ ایک سچے اور کھرے قاری کا انتخاب ہے جو کسی ادبی تحریک کے اثر یا ذہنی تحفظ کے بغیر محض پسندیدگی کی ادبی کسوٹی کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔

ہماری کوشش یہ تھی کہ اس خصوصی شمارہ کی ضخامت (۱۵۰) صفحات سے متجاوز نہ ہو۔ تاکہ بروقت ترسیل اور خاص طور سے بیرون ملک ترسیل میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور مشترکہ شمارہ شائع کرنے کی بھی نوبت نہ آئے۔ لیکن ۲۵ سال کے مختلف شماروں میں پھیلے ہوئے مواد کو سمیٹنا اور اس کا نچوڑ پیش کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ نثری انتخاب دو قسطوں میں شائع ہو۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب نومبر ۱۹۹۷ء میں منعقد ہوں گی اس موقع پر سوونیر شائع ہو گا۔ جنوری ۹۸ء میں سالنامہ چھپے گا۔ جس کے بعد نثری انتخاب کا دوسرا حصہ شائع ہو سکے گا۔ ہمیں احساس ہے کہ زیر نظر انتخاب میں بعض اہم طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات شامل نہیں ہو سکی ہیں۔ ڈرامہ بھی انتخاب میں شریک نہیں ہے۔ لیکن ایسی تمام نمائندہ تخلیقات نثری انتخاب کے دوسرے حصہ میں شامل کر لی جائیں گی۔ تاہم اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف ذیلی عنوانات کے تحت شائع کی گئیں نثری تخلیقات کا بہترین انتخاب اس شمارہ میں شامل ہو۔

شگوفہ کو روز اول سے ہی ملک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ اس اعتبار سے شگوفہ کا یہ پچیس سالہ نثری انتخاب دراصل پچھلی ربع صدی کے طنز و مزاح کا آئینہ ہے۔ اس ۲۵ سالہ نثری انتخاب کے ذریعہ اردو طنز و مزاح کے مزاج اور ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم نے خاص طور سے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی سے فرمائش کی تھی کہ اپنی تحریروں کے ذریعہ اس عہد کے نثری طنزیہ و مزاحیہ ادب کا جائزہ لیں۔ ہم ان حضرات کے گراں قدر قلمی تعاون کے لئے ممنون ہیں شگوفہ کی اس منفرد، خصوصی اشاعت کو ممتاز کارٹونسٹ شعیب ربانی نے اپنے سرورق ڈیزائن اور طالب خوندمیری نے کیری کیچر سے سنوارا ہے۔ جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ خاص طور پر مہمان مدیر جناب سکندر علی خاں کے سپاس گذار ہیں، جن کے تعاون کے بغیر اس خصوصی شمارہ کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ **شگوفہ** حیدرآباد

جلد ۳۰ —— شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی

حسن چشتی ... (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ .. (امریکہ)
محمد باقر ... (جدّہ)
مسعود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمٰن سلیم .. (ریاض)
غلام نجم الدین .. (ریاض)

مجلس ادارت :

مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیّر
رحیم الدین توفیق

مجلس مشاورت :

نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
حمایت اللہ

کتابت : محمود سلیم ۔ محمد غالب ۔ محمد عبدالرؤف

طباعت : دائرہ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد ـ ۲

قیمت فی پرچہ ۱۰ روپے
زر سالانہ ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

۳۱ ـ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

فون : آفس 595716
رہائش 4576064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن !

رجسٹرڈ آفس 8/825-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد اے پی

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جینی اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (1) غربت ہٹاؤ اسکیم۔ (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے ـــ

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپس، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6.5% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 جنوری 97ء تک 68421 افراد میں 2115.89 لاکھ روپیے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 8975.60 لاکھ روپے ہوتی ہے اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1937 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 217.21 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت، 586.67 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپیے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔

خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

قادر علی خاں
اے اے ایچ ڈی سی
مینجنگ ڈائرکٹر

یوسف ناظم

معمّر شہری [سینئر سٹیزن]

یہ قدرت کا قانون ہے کہ جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے وہ 'شہری' کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کا پیدائشی اور موروثی حق ہے۔ شہری ہونے کی ایک ہی شرط ہے کہ کوشش کر کے پیدا ہو جائے۔ شہری ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آدمی کسی شہر ہی میں پیدا ہو۔ یہ ہر شخص کے لیے ممکن بھی نہیں اور یہ شہر تو بہت بعد میں بنے ہیں جب کہ آدمی روزِ ازل سے بلا تکلف پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔ دنیا کے حالات اور خاص طور پر اہلِ دنیا کے اخلاق اب ویسے نہیں رہے جیسے کہ پہلے تھے اور فرق یہ ہو گیا ہے کہ آدمی کی رفتارِ پیدائش سے وہ لوگ ہراساں اور پریشان ہیں جو خود بعجلت ممکنہ پیدا ہو چکے اور پیشرو کہلانے لگے ہیں۔ ان کی پریشانی یہ ہے کہ نئے آنے والے ان کے عیش و آرام میں مخل ہو رہے ہیں۔ آدمیوں کی یہ خصلت رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو خواہ وہ آپس میں عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں مطلق برداشت نہیں کر سکتے۔ حد یہ ہو گئی ہے کہ آدمی اب اس آدمی کا بھی دشمن ہو گیا ہے جو غریب ابھی پیدا ہی نہیں ہو سکا ہے اور اس کے نہ پیدا ہونے کی تدبیر سوچی جا رہی ہیں۔ (ان ترکیبوں کا نام بہبودئ خاندان ہے)۔ ایسی صورت میں جب انسان دشمنی اور مردم بیزاری کا عالم یہ ہو، دنیا میں امن کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ وہ سارے عالمی ادارے جو انسان دوستی اور فلاح و بہبود کے کاموں پر مامور ہیں یک لخت سوخت کر دیئے جائیں یعنی انھیں بینک کی زبان میں 'فریز' کر دیا جائے۔ ان اداروں کے منجمد ہونے کے بعد شاید بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو تو ہو۔ کاش یہ مسئلہ سریع الحرکت پولس فورس کے دائرۂ عمل میں شامل ہوتا اور وہ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہ رہتی ـــــ (ضمناً ہم اپنے اس خیال کا اظہار یہاں کر دیں کہ یہ سریع الحرکت پولس فورس ہمیں بہت پسند ہے اسے ہم نے فلیگ مارچ کرتے دیکھا ہے اور بہت متاثر ہوئے ہیں) اس فورس کے مقابلے میں وہ خفیف الحرکت پولس فورس کتنی عجیب و غریب دکھائی دیتی ہے جو ٹانگ پر ٹانگ لٹکائے لیٹی رہتی ہے اور صرف 'انکاؤنٹر' میں دلچسپی لیتی ہے۔

ہمارا خیال ہے اصلی شہری تو سبھی ہوتے ہیں لیکن بڑے شہروں میں" خاص طور پر وہاں کے دواخانوں میں پیدا ہونے والے شہری اپنے اصلی والدین کے حوالے نہیں کیے جاتے۔ ان میں یقیناً کچھ خرد برد ہو جاتی ہے اور یہ کہنا کہ میٹرنٹی ہوم میں بچے بدل گئے تھے غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ نومولود بچے جب تقسیم کیے گئے تو والدین بدل گئے۔ کسی بھی خاندان کے جملہ افراد ایک ہی 'بلڈ گروپ' کے تابع نہیں ہوتے۔ اس اختلاف کی دوسری وجہیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن ایک وجہ میٹرنٹی ہوم کی واردات بھی ہے جس کا کوئی حل ہے نہ علاج۔ شہروں میں والدین اور بچوں میں اختلاف رائے کی بنیاد بھی نظریاتی ہو۔ نظریاتی اختلاف

کی جڑیں جیسے والدین، بغاوت اور بیجے شجاعت کہتے ہیں، دُور دُور تک پھیلی ہوتی ہیں یعنی کہیں اور ہوتی ہیں جس بچے کو کسی سائنس داں کے گھر میں پرورش پانا چاہیئے تھا وہ ایک ایسے شخص کے گھر پہنچ جاتا ہے جس نے کبھی قلم ہاتھ میں نہیں پکڑا تھا لیکن حالات اُسے ایک قلمدان کا سربراہ بنادیتے ہیں۔ یہ قلمدان، قلمدانِ وزارت ہوتا ہے۔ شہریت کے ان مسائل کی شہرت اِس لیے نہیں ہوتی کہ اِن کے ذمے دار خود شہری ہوتے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے (اگر آپ کے ذہن میں ہے تو اِسے خارج از بحر کردیجیے) کہ وہ شہری جو مقاماتِ آہ و فغاں کی تبدیلی کا شکار رہتا تھا حسب نسب کے معاملے میں مُشتبہ ہے۔ اس کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ سارے شہری صحیح النسب ہیں بس صحیح المکانہ نہیں ہیں۔

اس لیے ہم نے اکثر ڈاکٹروں کو دیکھا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی پرورش ایک ماہر سرجن کے گھر میں ہوئی، وہ جب بھی آپریشن تھیٹر میں اپنی سرجری کا کمال دکھانے جاتے ہیں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں جو چھوٹے بچے نرسری میں کرتے ہیں۔ ایک استاد کو بھی ہم نے دیکھا ہے وہ سب کچھ کرسکتے ہیں بس پڑھا نہیں سکتے۔ حالات نے اگر انہیں صحیح مقام پر پہنچنے دیا ہوتا تو آج وہ بہترین کاشت کار ہوتے پھلوں کی کلوننگ کرتے پائے جاتے۔ خربوز اور امرود کو ایک دوسرے میں ضم یا مدغم کرکے خمرود نام کا پھل فروخت کرتے۔ اِن واقعات کو دلدوز کہا جائے یا دلچسپ۔ یہ آپ کے حسنِ اخلاق پر منحصر ہے۔ ایک وارداتوں سے آدمی کے شہری حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن چونکہ ہمارے یہاں ہر معاملے میں درجہ بندی کا مہذب طریقہ رائج ہے اِس لیے یہ ہر شخص کی قسمت پر منحصر ہے کہ وہ کس قماش کا اور کس حیثیت کا شہری بنتا ہے اسی لیے ہمارے یہاں دوسرے درجے کے شہریوں کی بہتات اور پسماندہ شہریوں کی افراط ہے۔ جو کمی رہ جاتی ہے اُسے نیم خواندہ خواتین و حضرات کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جب کسی ملک میں شہریوں کو یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ ہمارے ملک کو ایک اعلا درجے کے معزز شہری کی ضرورت ہے تو ہُو از ہُو (WHO IS WHO) کون کیا ہے اور مختلف ملکوں کے اخبارات پڑھ کر دنیا کے چند متمول لوگوں کی فہرست مرتب کی جاتی ہے اور اُن میں کسی معقول ترین شخص کو اپنے ملک کا شہری بننے پر رضامند کیا جاتا ہے۔ اِس شخص کا لقب اعزازی شہری ہوتا ہے۔ اِس شخص کی بُردباری کی داد دینی چاہیئے کہ بلا تحقیق کئے ہوئے کہ جس ملک کا اُس نے اعزازی شہری بننے کی حامی بھرلی ہے وہاں کے اندرونی حالات کیا ہیں۔ انتشار اور خلفشار کی کیفیت کیا ہے وہ وہاں کی شہریت قبول کرلیتا ہے۔ اِس حرکت کا جواز آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ بعض ملکوں میں تو غیر لوگوں کو (جن کے ہاتھ پاؤں ظاہر ہے بیرونی ہوتے ہیں) اپنے کسی شہر کی کنجی بھی پیش کردی جاتی ہے شہرت ہوا بنیک کا لاکر ہوگیا۔ کیا کسی بھی کنجی سے کوئی شہر کھلا ہے۔ شہروں کے بند ہونے کے 'جدید' اور مابعد جدید واقعات تو ہم نے سُنے، دیکھے بلکہ بھگتے ہیں لیکن کسی دوسرے ملک کے مہمان شہری نے ہمارے یہاں قدم رنجہ فرما کر ہمارے ترچھے بانکے شہر کو ہماری کنجی سے کھولا ہو، ہم نے نہ سنا نہ دیکھا۔ کلیدی خطبے کی بات اور ہوتی ہے اور یہی ایک خطبہ ہوتا ہے جسے سامعین نہیں سُنتے۔ یہ اُن کے سروں پر سے گزر جاتا ہے اور کافی تیزی کے ساتھ۔ کلیدی خطبے دراصل ہُما نامی پرندے ہوتے ہیں کسی بھی سامع کا سر انھیں پسند نہیں آتا۔ یہ پرندے اب اس لیے بھی عنقا ہوگئے ہیں کہ 'بادشاہت' عام ہوگئی ہے۔ ڈنڈ پیلنے سے آدمی حاکم اعلا بن سکتا ہے تو اسے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت ہے۔ اول درجے کے شہری بے حد با صلاحیت ہوتے ہیں اور ہر وہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جسے آج کل انگریزی زبان میں 'اِسکام' (SCAM) کہا جاتا ہے۔ یہ کام چونکہ ہماری تنقید (جو خاصی تحقیر آمیز ہوتی ہے) کی طرح باہر سے آیا ہے اِس لیے اِسکام کا اردو ترجمہ اب تک نہیں ہوا ہے۔ ویسے کام بہت ہوا ہے جس کی شہرت یہاں سے

باہر گئی ہے۔ یہ آمد و رفت بحسن و خوبی جاری ہے۔ ترجمے کے تعلق سے یہ بات اہم ہے کہ اردو کی مشکل یہ ہے کہ جب بھی ہم اس زبان کا نام لیتے ہیں، ادبیت پہلے ذہن میں آتی ہے ورنہ ترجمے تو ہوتے ہیں مثلاً گھوٹالہ، گھپلا۔ یہ بھی کوئی ترجمے ہیں؟ ان ترجموں میں نہ کوئی شہریت ہے نہ شعریت۔ اسکام (SCAM) جیسے خوبصورت لفظ کے علاوہ یہ تو کام کی بھی بے حرمتی ہے۔

اول درجے کے شہریوں کی کئی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ان کے گھروں میں تہہ خانے ضرور ہوتے ہیں اور جو چھتیں ہوتی ہیں ان میں تہہ داری ہوتی ہے یعنی پرت در پرت۔ جن کے گھروں میں تہہ خانے نہیں ہوتے وہ لوگ اپنی رہائش گاہ سے کچھ فاصلہ پر فارم ہاؤز بنوالیتے ہیں۔ فارم ہاؤز میں کاشت کاری کم اور نشاط کاری زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ جب بھی کسی اعلا عہدے کا چارج لیتے ہیں چند ہی دنوں میں یہ چارج شیٹ تک پہنچ جاتی لیکن وہیں رکی رہتی ہے اور اس سے پہلے کہ عدلیہ حرکت میں آئے انتظامیہ کا حلیہ بدل جاتا ہے۔ نیا انتظامیہ کوئی طنبورہ نہیں بجاتا صرف بغلیں بجاتا ہے، آرکسٹرا میں بغلیں بجانے والے فن کار حال حال میں شامل کئے گئے ہیں۔ اس ساکھ پر خرچ کچھ نہیں ہوتا۔ آنکھیں بند کرکے بغلیں بجاتے رہو تنخواہ اور ترقی دونوں ملے ہیں۔

شہریوں کے یوں تو اور بھی درجے ہیں لیکن چوں کہ ان کی حیثیت عوام کی ہے اس لیے دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے شہریوں کے کوئی خاص حقوق نہیں ہوتے تاہم انھیں پیدائشی اور بنیادی حقوق کا نام دیا جاتا ہے اسے شاعری کی زبان میں لف و نشر کہتے ہیں اور لف و نشر بھی اب کوئی چیز ہے جس کی پرواہ کی جائے۔

شہریوں میں چند سال ہوئے ایک نئی قسم کے شہریوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ لوگ معمر شہری کہلاتے ہیں یعنی سینئر سٹیزن۔ انھیں ان کے ناکارہ اور ازکار رفتہ ہونے کا احساس دلانے کی غرض سے سرکار نے ان کے لیے چند مراعات مقرر کردیے ہیں۔ سینئر سٹیزن جب ریلوں میں سفر کرتے ہیں تو ان سے پورا کرایہ نہیں وصول کیا جاتا تہواروں کے موقع پر جس طرح دکان دار اپنا مال ۲۰ فی صد رعایتی داموں پر فروخت کرتے ہیں اسی طرح محکمہ ریلوے نے سینئر سٹیزن کے لیے مستقلاً ۲۰ فی صد کی رعایت جاری کردی ہے اس میں احتیاط البتہ یہ کی گئی ہے کہ یہ رعایت صرف سکنڈ کلاس میں سفر کرنے کی حد تک محدود ہے۔ اس سے اوپر کے درجوں میں سفر کرنے کا شوق ہے تو پورا پورا کرایہ ادا کرو۔ سینئر سٹیزن کے لیے ریلوے اسٹیشنوں پر خصوصی کاؤنٹر قائم کئے گئے ہیں اور باضابطہ کوشش کی جاتی ہے کہ کھڑکیوں پر ٹکٹ فراہم کرنے والے بھی تقریباً سینئر سٹیزن ہوں۔ یہ لوگ حرکتیں ویسی ہی کرتے ہیں جو صرف معمر شہریوں کے لیے جائز مانی گئی ہیں۔ صرف اس وقت مسکراتے ہیں جب مسافر کو صرف ٹکٹ دیتے ہیں باقی کے پیسے نہیں دیتے۔ اس سینئر سٹیزن نے تو اپنے جونیئر سٹیزن کے زمانے میں بھی کسی مسکراہٹ کی قیمت ادا نہیں کی تھی۔

بسوں میں سفر کرتے وقت سینئر سٹیزن کو بس میں داخل ہونے کے لیے سامنے کی طرف کا دروازہ استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ رعایت کی انتہا ہے اور جب یہ معمر شخص اس رخ سے بھی داخل ہوتا ہے تو اس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ بس میں داخل ہونے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کتنی تنگ ہے اور گول تو بالکل نہیں ہے۔ اس کی ملاقات بس کنڈکٹر سے اس وقت ہوتی ہے جب اس کی منزل مقصود کئی کلومیٹر پیچھے رہ جاتی ہے۔ وہ اپنی منزل پر صرف اس لیے نہیں اترتا کہ کہیں کوئی انسپکٹر شکار کے انتظار میں وہاں کھڑا نہ ہو۔ بسوں میں اب، معذور مسافروں اور خواتین

کے لیے علاحدہ نشستیں مقرر کردی گئی ہیں جن پر بالعموم کوئی پہلوان اور چند شرپسند آرام کرتے نظر آتے ہیں۔ پہلوانی اکھاڑے کے باہر بھی بہت کام آتی ہے بلکہ زیادہ کام آتی ہے۔ پچھاڑے جانے کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہوتا۔ بسوں میں معمر شہریوں کے لیے کرایے کی حد تک کوئی رعایت نہیں ہے۔ ٹھیک ہی ہے۔ اگر انھیں کرایے میں کسی رعایت کا مستحق قرار دے دیا گیا تو یہ لوگ گھروں میں ٹکیں گے ہی نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ معمر شہریوں کو گھر کے باہر رہنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ کوئی پارک اور گارڈن ان کے دستبرد سے محفوظ نہیں ہے۔ بچوں کے پارکوں میں بھی رونق انہی کی وجہ سے رہتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں یہ اپنے پوتوں یا نواسوں کی سرپرستی کے سلسلے میں آئے ہوں گے لیکن اعتراض کوئی نہیں کرتا کیوں کہ وہ خود بھی تو بغیر بچوں کے آئے ہیں اور یہ اُن کا کرم ہے کہ پارک میں صرف بیٹھے رہتے ہیں جھولا نہیں جھولتے۔

ہوائی جہاز کے سفر میں ان شہریوں کے ساتھ جو رعایت ہوتی ہے وہ تو کسی "سیل" میں بھی نہیں ہوتی۔ جو لوگ اور کپڑوں کے سیل کے جو اشتہار چھپتے ہیں ان میں ۵ سے ۵۰ فی صد تک کی رعایت کا اعلان ہوتا ہے جب کہ سینئر سٹیزن پورے پچاس فی صد منافع کے ساتھ سفر کرسکتے ہیں اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریل کے سفر میں تو یہ بالعموم تنہا ہی ہوتے ہیں لیکن ہوائی سفر میں بیوی ضرور ان کے ساتھ ہوتی ہے اور اس سفر کے دوران ان کے تعلقات کافی خوشگوار رہتے ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میاں کی توجہ بٹی ہوئی رہتی ہے۔ بیوی کو البتہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ میاں کا لہجہ اتنا نرم کیسے ہوگیا اور اس کی وجہ اس کی سمجھ میں اُس وقت آتی ہے جب ایک کشتی میں سامان خورد و نوش اس کے سامنے لایا جاتا ہے — ہر سینئر سٹیزن عمر رسیدہ تھوڑے سے ہی ہوتا ہے اور عمر رسیدہ ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ قدرت نے ہر کسی کو ایسی آنکھیں دی ہیں جن میں دم تا دم آخر برقرار رہتا ہے۔ آدمی پیر ہو جائے لیکن اس کی مریدی جاتی نہیں ہے۔

یہ بات بہر حال یاد رکھے جانے کے لائق ہے کہ آدمی کو شہری بننے کے لیے مطلق وقت نہیں لگتا لیکن سینئر سٹیزن بننے کے لیے برسوں لگ جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بچوں کو ٹیکوں کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ ان کے والدین کو ٹیکوں کی۔ بچے کا نام نہ رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اسے پولیو کا ٹیکہ تو لگوانا ہی پڑے گا ورنہ اس کا حقہ پانی بند کروایا جاسکتا ہے کوئی بھی سینئر سٹیزن پارک میں گھاس پر نہیں بیٹھتا۔ بنچ پر ٹیک لگا کر بیٹھتا ہے۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ گرد صرف پائجامے کو نہیں لگتی شرٹ پر بھی لگتی ہے۔ کپڑے دھونے کا آدھے سے زیادہ پاؤڈر تو یہ معمر شہری ہی خرچ کروا دیتے ہیں۔

ایک خبر البتہ یہ اچھی آئی ہے کہ سٹیزن نام کی گھڑی بنانے والی کمپنی نے سینئر سٹیزن نام کی گھڑیاں بنانے کا بھی منصوبہ بنا لیا ہے۔ معمر شہری اب اس گھڑی کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں۔ ▭▭

واجد ندیم (شکاگو)

امریکہ کی دریافت

عرصے سے یہ سنتے آرہے ہیں کہ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا ہے۔ ہم بھی خوش تھے کہ امریکہ کی دریافت کا سہرا اپنے کسی بھائی کے سر نہیں ہے اور اب قیامت میں کولمبس کی گردن ناپی جائے گی اور اس سے بازپرس ہوگی کہ اے کولمبس تجھے کیا پڑی تھی کہ ایک ایسے ملک کو دریافت کرنا جہاں ایسی بے حیائی اور ایسی عریانی ہے کہ اچھے اچھے باریش ہستیوں کا تقوی خطرے میں پڑ جائے۔ اب ہم آپ سے کیا بتائیں کل ہمارے نئے پڑوسی کے والد بزرگوار سے ملاقات ہوئی تو وہ فرمانے لگے کہ امریکہ کو ان کے ہونہار فرزند دلبند نے دریافت کیا ہے اور ہم حیران و پریشان، حیرت بدنداں ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ قبلہ عالم آپ یہ تاج کولمبس کے سر سے اتار کر اپنے سپوت کے سر پر رکھ رہے ہیں۔ یہ تو کولمبس کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اس پر انھوں نے اپنی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہم پر لٹانا شروع کر دیا۔ کہنے لگے تاج تو لبرٹی کے مجسمے کے سر پر ابھی موجود ہے۔ جسے وہ نیویارک میں دیکھ کر آرہے تھے پھر انھوں نے مزید کہا کہ ان کا بڑا لڑکا نیویارک میں ۲۵ سال سے ہے بلکہ دو اور لڑکے، ان کی بیویاں اور بچے اور ان کی تمام لڑکیاں، داماد اور ان کے بچے اور ان کے محلے کے کئی نوجوان یہاں موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس تمام کارنامے کا سہرا ان کے اسی سپوت کے سر ہے جس نے امریکہ دریافت کیا ہے (کم از کم ان کے لیے) اب تو میں بھی قائل ہوتا جا رہا تھا کہ بے چارہ کولمبس مفت میں بدنام ہوا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ قبلہ کیا سبھی لوگ آگئے ہیں یا کچھ اور آنا باقی ہیں۔ تو کہنے لگے ابھی دو مہینے پہلے چھوٹو اور منو آئے۔ جانی میاں کو بھی ویزا ملنے کی اطلاع آئی ہے۔ جانی میاں کی بھینسوں کے لیے بھی ویزا کی کوشش جاری ہے۔ اللہ نے چاہا تو دو چار مہینوں میں وہ بھی آجائیں گی۔

دراصل ہر سال امریکہ دریافت ہوتا ہے اور ہر سال کھو جاتا ہے۔ اپریل مئی میں اس کی دریافت ہوتی ہے اور پھر نومبر دسمبر میں یہ کھو جاتا ہے بے رونق و بے جان ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی پرندہ پر مارتا ہے اور نہ کوا کائیں کائیں کرتا ہے درختوں سے پھول غائب۔ پتے لاپتہ۔ سڑکوں پر نہ آدم نہ آدم زاد۔ کوئی اکا دکا اگر نظر بھی آجائے تو ایسا لگتا ہے جیسے چوری کر کے نکلا ہو۔ گھر کے باہر نکلو تو گلی کوچوں میں ہو کا عالم۔ جدھر نظر دوڑاؤ ایسے موٹریں ہی موٹریں۔ جیسے شہر میں آدمی نہیں موٹریں بستی ہوں۔ میں خود بھی گھر سے نکل کر دوڑتے ہوئے موٹر میں ایسے بیٹھتا ہوں جیسے پولس کو میری تلاش ہو۔ بازاروں میں نہ کوئی رونق نہ چہل پہل۔ چاروں طرف ایک مردنی سی چھائی رہتی ہے حتی کہ دن پہ بھی رات کا گمان

ہونے لگتا ہے۔ بھلا بتایئے یہ بھی کوئی دن ہوا کہ صبح آٹھ بجے سورج نکلے اور ۴ بجے غائب ہو جائے جیسے یہ بھی ۸ گھنٹے کی شفٹ ڈیوٹی پر ہو۔ لوگ اس انتظار میں سرما گزار دیتے ہیں کہ موسم بہار اور گرمیوں کے دن آنے والے ہیں اور جب گرمیاں آجاتی ہیں تو اس فکر میں دن گزار دیتے ہیں کہ موسم خزاں اور سرما آنے والے ہیں۔

گزشتہ دسمبر میں ہمارے ایک دوست یہاں آئے۔ موسم بے حد خراب تھا۔ خوب جی بھر کے کولمبس کو گالیاں دیں کہ کم بخت نہ یہ ملک دریافت کرتا اور نہ آج ان کو یہ دن دیکھنا پڑتا باہر نکلنے کے لیے جب میں نے کپڑوں پر کپڑے چڑھانے شروع کیے تو مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔ میں نے انھیں بھی سمجھا منا کے اسی طرح تیار کیا اور جب ان کی ٹوپی کانوں پر اُتاری اور گلے میں مفلر ڈال کر ٹاپ کوٹ کے کالر اونچے کیے تو آئینہ دیکھ کر کہنے لگے میں تمہارے ساتھ ڈاکہ ڈالنے نہیں آؤں گا۔ اور پھر کپکپاتے ہوئے جب کار میں بیٹھے تو کہنے لگے "کار تو تم بعد میں اسٹارٹ کرنا پہلے ہیٹر چالو کر دو"۔ بڑی مشکل سے انھوں نے دسمبر گزارا۔ جب جنوری میں موسم اور خراب ہو گیا تو واپس جانے کے لیے پر تولنے لگے۔ میں نے انھیں سمجھایا اور کہا کہ "ابھی تو تم ڈیڈ امریکہ (DEAD AMERICA) میں ہو اور جب اپریل مئی میں امریکہ دریافت ہو گا تو تم سے جانے کو کہو بھی تو تم نہیں جاؤ گے اور تمہیں نکالنے کے لیے امیگریشن والوں کی مدد لینی پڑے گی" کہنے لگے بھلا یہ بھی کوئی ملک ہے۔ واہیات۔ اپنے ملک کی بات بھلا کہاں آسکتی ہے۔ کسی بھی شہر میں چلے جایئے دن اور رات ایسی چہل پہل اور رونق اور ایسی رنگا رنگی کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ راتوں کو بھی نہیں سوتے۔ سڑکوں پر نکل جایئے ہر ایک کو آزادی اور مساویانہ حق۔ اس ملک کی طرح نہیں کہ ہری اور لال لائٹ کے غلام۔ لال پر رک جاؤ اور ہری پر چل پڑو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سواری اپنی، پیٹرول اپنا پھر بھی بے جان لائٹوں کے بس میں۔ اجی ہمارے ہاں تو ٹریفک کے سپاہی کی بھی کوئی نہ سنے۔ کیوں سنیں۔ آخر آزاد ملک کے آزاد باشندے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم نے جانوروں کو بھی سڑکوں پر مساویانہ حقوق سے استفادہ کرتے دیکھا ہے۔ بھلا بتایئے ہے کوئی ایسی مثال آپ کے ہاں۔ آپ کبھی ہندوستان گھومے ہیں؟ دِلّی چلے جایئے رکشا والے پکارتے سنائی دیں گے "ایک سواری نظام الدین ۲۰ روپے، چاندنی چوک ۱۵ روپے۔ لکھنؤ کے حضرت گنج میں تانگے والے دندناتے گزرتے ہیں اور چلاتے ہیں "مہربان دیکھ کے" "بی بی جی بغل میں آنا" کلکتہ میں ہوڑہ برج جایئے، چورنگی یا دھرم تلہ، تل دھرنے کو جگہ نہ ملے۔ بمبئی میں میرین ڈرائیو سے ملا بار ہل، بھینڈی بازار سے محمد علی روڈ ایسی رونق اور گہما گہمی کہ اس کا جواب نہیں۔ حیدرآباد میں چار مینار سے عابد روڈ تک کسی بھی چوراہے سے گزریئے پان کھا دو کانوں پر نوجوان پان کا بیڑہ منہ میں دبائے چار مینار سگریٹ کا دھواں اڑاتے بے فکری سے سیٹیاں بجاتے نظر آئیں گے۔ آپ کے ملک کی طرح نہیں کہ اندھیرے ہی سے خاکی بیگ (BAG) ہاتھ میں پکڑے چوروں کی طرح نکل رہے ہیں۔ پوچھو کہ بھئی کدھر تو نہایت مری ہوئی آواز میں کہتے ہیں جاب پر جا رہا ہوں اور پھر اندھیرے ہی میں واپسی۔ تھکے تھکائے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں پوچھا کہ کیوں بھئی آج کچھ زیادہ ہی تھکے نظر آتے ہو۔ کہنے لگے پاس والی کمپنی پر امیگریشن والوں کا دھاوا ہوا تھا ہیبت سے آدھی جان نکل گئی۔

ہاں تو بڑی مشکل سے ہم نے اپنے دوست کو روکا اور کہا اپریل مئی تک رک جاؤ اور امریکہ کو دریافت ہوتا ہوا دیکھ کر جانا۔ اپریل کی ابتداء کے ساتھ ہی سوکھی ٹہنیوں پر کونپلیں پھوٹنے لگیں، زمینیں ہری ہونے لگیں اور لوگ آہستہ آہستہ اپنے "ڈربوں" سے نکلنے لگے۔ ہم نے بھی اپنی کھڑکیوں کے پردے اٹھا دیئے اور جب باہر رونق نظر

آنے لگی تو ہمارے دوست بھی گھر سے باہر نکلنے لگے جب لوگ گھروں کے باہر ہوتے ہوتے جاڑے سے بھی باہر نظر آنے لگے تو پھر ہمارے دوست کا یہ عالم ہوا کہ گھر کے اندر کم رہتے اور باہر زیادہ۔ اور پھر روز لیک مشگن پر چلنے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ ایک دن کہنے لگے "یار جی میں آتا ہے کہ زندگی کے باقی دن یادِ خدا میں لیک (LAKE) کے کنارے گزاروں۔"

ایک دن کہنے لگے کہ بھئی تم تو کہتے تھے کہ شادی پر یہاں باجے واجے نہیں بجائے جاتے لیکن ہم نے باجوں کے ساتھ برات جاتے دیکھا ہے۔ لیکن لگتا ہے لوگ بڑے کنجوس ہیں موٹر کے ہارن ہی سے باجے کا کام لے لیتے ہیں۔ موصوف کو نیا نیا لائسنس ملا تھا ہم سے کہنے لگے تمہیں گھماتے ہیں۔ چنانچہ گھومتے گھماتے ایک چوراستے پر پہنچے جہاں NO LEFT TURN بائیں مڑنا منع ہے کی تختی لگی تھی اور یہ بائیں مڑنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ لوگوں نے انھیں خبردار کرنے کے لیے ہارن بجانے شروع کر دیئے۔ میں نے پوچھا "بھئی کیا بات ہے"۔ کہنے لگے "کوئی بارات جارہی ہوگی" خیر کسی طرح بائیں گھوم کر ذرا سا آگے بڑھے ہی تھے کہ پیچھے سے لائٹ چمکنا شروع ہوگئی میں نے کہا "تم نے صحیح کہا تھا یہ بارات تمہاری ہی ہے باجے تو ابھی بج چکے ہیں لائٹ کی کسر پولیس نے پوری کر دی اب COP (پولیس والا) آکر تمہاری گلپوشی کرے گا"۔ جولائی اور اگسٹ میں شکاگو میں کافی گرمی پڑتی ہے ایک دفعہ انھیں موصوف کے ساتھ ایرپورٹ جانے کا اتفاق ہوا کیا دیکھتے ہیں کہ ایک محترمہ سوئمنگ کاسٹیوم پہنے چلی آرہی ہیں۔ ہمارے دوست یہ دیکھ کر کہنے لگے کہ واقعی امریکہ نے کافی ترقی کرلی ہے یہاں عورتیں ہوا میں بھی تیرنے لگی ہیں۔

کولمبس کی دریافت کے بعد سے امریکہ مسلسل دریافت ہوتا رہا۔ مختلف قوموں نے اسے مختلف زمانوں میں دریافت کیا اور اس پر اپنا حق جتایا۔ مشرق سے قومیں آئیں مشرق وسطیٰ سے یورپ اور ایشیاء سے اور پڑوسی ممالک کیوبا، میکسکو وغیرہ سے اور شاید سب سے آخر میں ہند و پاک سے۔ میرے ایک پڑوسی میکسیکن ہیں۔ ان کو ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے بڑی چڑھ ہے۔ ذاتی طور پر وہ کسی کے دشمن نہیں لیکن ان کو اس بات پر بے حد غصہ ہے کہ وہ جتنے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو جانتے ہیں وہ یا تو ڈاکٹر ہیں یا انجینئر۔ ایک دن کہنے لگے کہ ان کے ملک میں بھی بہت انجینئر ہیں چنانچہ وہ خود بھی اپنے آپ کو SOIL ENGINEER بتاتے تھے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ کسی کمپنی میں JANITOR ہیں۔

امریکہ کو بہت سوں نے دریافت کیا لیکن یہ ضروری ہے کہ امریکہ بھی انھیں دریافت کرے۔ میرا مطلب امیگریشن سے ہے۔ کسی ایسے ہی آدمی سے ملیئے جس کی ابھی "دریافت" نہیں ہوئی ہے تو اسے آپ نہایت ہی مفکر المزاج پائیں گے۔ چہرے سے غربت ٹپکتی ہوئی۔ حال پوچھئے تو کہے گا "بس جی رہے ہیں"۔ بے حد مری ہوئی آواز میں زمانے کا گلہ کرے گا — امیگریشن والوں کی سختی کا رونا روئے گا اور کہے گا کسی طرح "ہرا پتہ" مل جائے اور اس کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ جیسے ہی "ہرا پتہ" ملے پھر ان کا رنگ دیکھئے۔ چہرے سے بشاشت ٹپکتی ہوئی۔ ٹائی ہمیشہ گلے کا ہار بنی ہوئی بات بے بات پر ہنسی ہے کہ نکلی جارہی ہے ہر ایک سے ملاقاتیں اور تعارف ہو رہا ہے۔ گھر پر آنے کی دعوت دی جارہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کو بے طلب مشورے دیئے جارہے ہیں اور جب ان سے کسی کے پکڑے جانے کا ذکر کرو تو کہیں گے "لوگوں نے امریکہ کو سسرال سمجھ رکھا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے آجاتے ہیں۔ دیزٹ پر آکر دو دو جاب بھی حد ہوگئی۔ زمانہ بے حد خراب ہے کچھ تو لوگوں کو احتیاط سے کام لینا چاہیئے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں آکر پتہ چلا کہ واقعی ہم نے ایک نئے امریکہ کو دریافت کیا ہے۔ اب تک امریکہ کے بارے میں جو سنتے

آئے تھے وہ سب غلط ثابت ہوا نہ اخلاق وہ نہ تہذیب وہ اور نہ وہ انگریزی زبان پہلے پہل جب ہم نے I DON'T KNOW NOTHING سُنا تو ہم نے سمجھا کہ HE KNOWS SOME-THING۔ گرامر کا ایک سیدھا سادھا اصول کہ دو NEGATIVES مِل کر POSITIVE بن جاتے ہیں غلط ثابت ہوا۔ پہلی بار ایک کمپنی میں ہماری بھرتی ہوئی تو سپروائزر (HEY GUY) "ہے گائے" کہہ کر ہم سے مخاطب ہوا تو ہم نے سمجھا کہ ہم سے دل لگی کر رہا ہے اور ہم انجان ہو گئے۔ دوسرے دن بھی ہم طرح دے گئے اور ہم نے سمجھا کہ ہمیں بہت کم بات کرتے دیکھ کر وہ ہمیں گائے سے تشبیہ دے رہا ہے۔ اب ہم زیادہ بات کرتے بھی کیا۔ نہ ہماری بات وہ سمجھے اور نہ اس کی ہمیں سمجھ میں آئے۔ دوستوں نے OK اور رائٹ کہنا بتا دیا تھا۔ اس لیے وہ کچھ کہتا ہم بڑے ہی سمجھدارانہ انداز میں کبھی "او کے" کہتے اور کبھی "رائٹ"۔ لیکن دو چار دن تک بھی وہ ہمیں "گائے" کہنے سے باز نہیں آیا تو ہم نے اس سے کہدیا کہ "تم گائے" نہیں "بیل" ہیں۔ جاب کی تلاش میں ہم نے جگہ جگہ کی خاک چھانی اور ہر کمپنی میں جھانکا۔ تمام ڈگریاں بتائیں۔ بعد میں یار دوستوں نے گر بتایا کہ ہائی اسکول سے آگے ایک لفظ بھی نہ لکھنا تب ہمیں اکبر الہ آبادی والے اس مصرعہ کی تفسیر سمجھ میں آئی کہ " نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر" آپ نے کسی کشتی میں سفر کرنے والے حکیم، انجینیر اور فلاسفر کا قصہ تو سنا ہی ہوگا جنھوں نے ملاح سے اپنے اپنے فن کے بارے میں پوچھا اور ملاح نے اقرار کیا کہ وہ نہیں جانتا۔ ان تینوں نے اس سے کہا کہ اس نے تین چوتھائی عمر ضائع کر دی۔ کچھ دیر کے بعد طوفان آگیا اور کشتی جھکولے کھانے لگی تو ملاح نے ان تینوں سے پوچھا کہ کیا وہ تیرنا جانتے ہیں تینوں نے انکار میں سر ہلایا تو ملاح نے یہ کہہ کر دریا میں چھلانگ لگادی کہ افسوس تم لوگوں نے ساری عمر ضائع کر دی۔ یہی حال ہمارا ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے بھی ساری عمر یونہی ضائع کر دی۔ نہ پکانا جانتے ہیں نہ جھاڑو لگانا۔ نہ کوئی مشین چلانا جانتے ہیں۔ اور نہ کوئی فن۔ خیر کسی طرح جھوٹ سچ کہہ کر ہندوستان و پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کی (جن کا انھیں کوئی علم نہیں) بڑی بڑی کمپنیوں اور بڑے بڑے کارخانوں کا تجربہ دکھا کر ایک چھوٹی سی کمپنی میں ایک معمولی مشین پر ہم نے کام حاصل کر لیا اور اپنی کامیابی پر اترانے لگے۔ ہم نے مشین پر کام شروع کر دیا۔ تین گھنٹوں میں ہم نے اپنا کام ختم کیا اور سستانے لگے۔ ہمیں بیکار دیکھ کر ہمارے سپروائزر نے اور کام لاکر رکھدیا۔ اور اب تو یہ ہونے لگا کہ ہمارے کام ختم کرنے سے پہلے ہی وہ اور کام لے آتا اور ہمیں ایک منٹ کے لیے بھی آرام کا موقع نہ دیتا۔ یعنی ۸ گھنٹے گزرنے کے بعد ہمارا یہ حال ہو جاتا جیسے ہمارا جسم بھی مشین بن گیا ہو اور ہمارے ہاتھ پیر مسلسل چلتے رہتے۔ ان ہی دنوں ہمارے ایک دوست نے خط لکھ کر ہماری خیریت دریافت کی۔ ہم نے انھیں لکھ دیا کہ ہمارے پردادا کا جن ان کا بدلہ ہم سے لے رہا ہے۔ سُنتے ہیں کہ ہمارے پردادا کے قبضے میں ایک جن تھا۔ بخشو جن کا نام تھا۔ اسے وہ ہمیشہ کام میں لگائے رکھتے ایک منٹ کی بھی فرصت اسے نہ دیتے ایک کام ختم ہوا کہ دوسرا ختم ہوا تو تیسرا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی کام نہ ہوتا تو دال میں چاول ملا کر بکھیلا دیتے اور کہتے "بخشو دال، چاول الگ الگ کر دے"۔ اب یہی بخشو ہمارے پردادا کا بدلہ ہم سے لے رہا ہے۔

باوجود اس کے کہ امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے اور ہائی اسکول تک تعلیم لازمی ہے پھر بھی یہاں کے

لوگ مشرقی ممالک کے بارے میں بہت ہی کم جانتے ہیں اور ہمارے ملکوں کو بہت ہی پس ماندہ ملک سمجھتے ہیں۔ ایک دن ہمارے سپروائزر نے کہا "سنا کہ تمہارے ملک میں لوگ درختوں پر رہتے ہیں" اب ہم اس کا کیا جواب دیتے۔ اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی اور وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا "آخر تم لوگ چڑھتے اترتے کس طرح ہو" ہم نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ اس کے لیے ہم نے ایلو یٹر، ELEVATER لگوا لیا ہے۔

یہاں پہلے اور آخری نام کا بھی کچھ ایسا چکّر ہے کہ ہمارا درمیانی نام جو کہ ہمارا اصل نام ہے وہ صرف ایک حرف کی شکل میں رہ گیا اور آہستہ آہستہ وہ بھی غائب ہو گیا۔ اس لیے یہاں کئی محمّد خان اور سید حسین ملیں گے۔ کرسمس کا زمانہ تھا ہماری کمپنی نے بھی ایک کرسمس پارٹی دی اور ہم کو اپنے ساتھ ایک دوست کو بھی لانے کی اجازت دی۔ ہم اپنے دوست اور ان کی بیگم کو لیے ہوئے پارٹی میں پہنچے۔ آگے آگے ہمارے دوست کی بیگم تھیں اور پیچھے ہمارے دوست کار پارک کر کے آ رہے تھے۔ ہم نے اپنے سپروائزر سے تعارف کروایا کہ مسز نسیم سلطانہ ہیں اور اس سے پہلے کہ ہم اسے اپنے دوست سے ملاتے اس نے چلّا کر کہا "ہائے مسٹر سلطانہ" اور نہایت گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملانے لگا۔

یہ تو پھر بھی امریکن تھا ہمارے اپنے لوگ بھی بننے لگے ہیں اور اپنی زبان اپنا کلچر اور طور طریقہ بھولنے لگے ہیں یا پھر بھولنے کی ایکٹنگ کرتے ہیں ایسے ہی ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو میں انگریزی سے نیچے اُترتے نہیں تھے اور رک رک کر کوئی بات انگریزی میں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور بڑی ہی دشواری سے دو چار تھے۔ آخر کیا کرتے بے چارے نہ تو وہ ان کی مادری زبان تھی اور نہ پدری۔ ہم تو کسی طرح انھیں برداشت کرتے رہے لیکن ہمارے ایک اور دوست سے ان کا یہ تماشہ دیکھا نہ گیا انھوں نے بے تکلفی سے ان سے کہدیا کہ "بھائی بہتر ہے اپنی زبان میں آجائیے۔ آپ کو بولنے میں دشواری ہو رہی اور ہمیں سمجھنے میں"

اس امریکہ نے تو اچھے اچھوں کے مزاج درست کردیئے۔ لوگوں نے یہاں کیا کیا نہ کیا اور کیا کیا نہیں کر رہے ہیں جس کا اپنے ملکوں میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو اس ملک کے بارے میں کہتے ہیں کہ LAND OF OPPORTUNITY ہے۔ یعنی حالات اور مواقع میسّر ہیں اگر کوئی کچھ کرنا چاہے اور لوگوں نے کیا اور کر رہے ہیں۔ ہم سے کوئی پوچھتا ہے کہ کسی کا کیا پروفیشن اور کیا لائن ہے تو ہم کہتے ہیں جو کچھ بھی وہ کر رہا ہے وہی اس کی لائن ہے وہی اس کا پروفیشن ہے انجینیرس، بزنس مین بن گئے۔ اکاؤنٹنٹ، کنڈکٹر ہو گئے بینکرز کیٹرنگ کرنے لگے۔ اگر کسی نے کچھ نہیں سیکھا تو ماہر بکواس ضرور ہو گیا۔ ہم کبھی ہانڈی بھونتے ہیں تو کولمبس کو گالیاں دیتے ہیں اور اگر کہیں وہ ہمیں مل جائے تو اس کا کان پکڑ کر ٹھنڈے ٹھنڈے ہندوستان پہنچا دیں کمبخت بھی اپنی قسمت کو روتا رہے کہ یہ تھا وہ ملک جس کی تلاش میں نکلا تھا اور غلطی سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

□□

سید تقی عابدی
(نیویارک)

مشاعرہ

جیسا دل چاہے جس کو پڑھا دیجئے ، شاعروں کو بُلا کر لڑا دیجئے
جب وہ آپس میں دست و گریباں ہوں ، اُن کو شرمندہ کرکے چھڑا دیجئے
داد دیتے رہیں جو فقط آپ کو ، اُن کو محفل میں آگے بٹھا دیجئے
مطلعے سُن سُن کے متلی سی ہونے لگے ، کچھ کھٹائی غزل کی چکھا دیجئے
ناگری خط سے جو دیو قامت بنے ، ان کو اُردو کا املا سکھا دیجئے
چار اشعار کب تک سنائیں گے آپ ، ایک تازہ غزل تو سُنا دیجئے
ہم تو ہیں ناظمِ بزم کے ہاتھ میں ، اب گرا دیجئے یا اُٹھا دیجئے
ہر مقامی کا ہے آپ اپنا مقام ، کیا مقام آپ کا ہے بتا دیجئے
کوئی شاعر بھی ترتیب سے خوش نہیں ، رسم ترتیب کو اب اُٹھا دیجئے
شعر کے فن میں ہیں سورما گر جناب ، ایک مصرعہ تو سیدھا اُٹھا دیجئے
شاعری کی دوکاں پر ہے پیرِ مغاں ، آیئے کھوٹا سکّہ چلا دیجئے
شاعرِ عصر کو کرکے مہمان گھر ، اپنی تعریف میں کچھ لکھا دیجئے
تبصرہ شاعروں پہ کریں جب کبھی ، میر و غالب سے آگے بڑھا دیجئے
جن کو اعظم کے ہجّے بھی آتے نہیں ، اُن کو شاعرِ اعظم بنا دیجئے
بزم شعرا تھی جو مرکز علم و فن ، اُس کو جُہلا کا دنگل بنا دیجئے

بات حق کی ہے کڑوی اگرچہ تقی
سُنیے اور دوسروں کو سنا دیجئے

مصطفےٰ شہاب
(لندن)

غزل

کوئی کیلے کا چھلکا پھینک کر پھسلے تو ہنستا ہوں ، خود اپنے ہی لطیفے پر کوئی ہنس دے تو ہنستا ہوں
دُکھی ہوتا ہوں جب کم زور طاقت ور سے دبتا ہے ، پہلوانوں کے آگے بھُس بھسا اکڑے تو ہنستا ہوں
جو شوہر رات دن بیوی کے آگے گڑگڑاتا ہے ، اسی بہنوئی سے ڈرتے ہیں جب سالے تو ہنستا ہوں
کوئی گبرو اگر بیباک دوشیزاؤں کے آگے ، گھنی مونچھوں کو دے کر تاؤ شرمائے تو ہنستا ہوں

شہاب اب لوگ کہتے ہیں کہ اپنی آدھی پنشن پر
پریشانی میں خود بھی ہو گئے آدھے تو ہنستا ہوں

پرویز یداللہ مہدی (بمبئی)

چڑھنا ہمارا دوردرشن کے دار پہ

"دور درشن" والوں کی بلاواسطہ ستم ظریفیاں، بوالعجبیاں، مختلف کاریہ کرموں، اور ان میں حصہ لینے والے بھانت بھانت کے اسامیوں کی شکل میں گھر بیٹھے بھگت ہی رہے تھے کہ ایک دن دوردرشن کیندر کے بہت قریب سے درشن کرنے کا اتفاق بھی ہوگیا اور یوں ہم اپنی بصارت و بصیرت دونوں کی خامی درگت بنوا کر لوٹے۔ آبیل مجھے مار والے اس تماشے میں خدا گواہ ہے ہماری کسی خواہش کا دخل نہیں بلکہ ہماری شامت کو دعوت دینے میں ہماری نصف بہتر، بلکہ یوں بہتر، کا ہاتھ تھا۔ اصل میں ٹی وی نے جس دن سے ہمارے غریب خانے میں نزول فرمایا تھا، بیگم کے دل میں یہ فضول سی خواہش سر ابھارنے لگی تھی کہ اخبارات اور رسالوں میں مع تصویر کے اپنے مضامین چھپوانے کی جگہ ہم بہ نفس نفیس ٹی وی کے کسی کاریہ کرم میں نمودار ہو کر کم سے کم ان اہالیانِ کالونی کو زک پہنچائیں جو ہمارے ادبی قدوقامت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اب آپ سے کیا چھپانا بیگم کو بڑے زمانے سے اس بات قلق تھا کہ برسوں سے اردو ادب کے میدان میں پاپڑ بیلنے کے باوجود نہ تو ہمارے بیلے ہوئے پاپڑوں کو وہ درجہ حاصل ہو سکا نہ ہمیں ہی وہ مقام مل سکا جس کے ہر "دوآیٹم" (ITEM) ان کی نظر میں مستحق تھے۔ بیگم کی سخن فہمی کو آپ طرفداری پر محمول کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دہی والی اپنے کھٹے دہی کو میٹھا ہی کہتی ہے تاہم اس سچائی کو مان لینے میں آپ کو کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہم واقعی طنز و مزاح کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں پنج وقتہ سجدوں میں مصروف ہیں البتہ پہلی صف میں شامل ہونے کا دعویٰ ہمیں بھی نہیں آخری صف میں یقیناً شامل ہیں "محمود" کے درجے پر فائز نہ سہی ایازوں کی قطار میں ضرور لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ جس بستی میں ہم رہتے ہیں وہاں اردو زبان اور اس کا ادب بخدا ہمارے توسط سے پہنچا جاتا ہے کیوں کہ اتفاق سے ہم بستی کے واحد اردو ادیب ہیں چنانچہ اردو زبان اور اس کا ادب ہماری ذات اور غریب خانے سے شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود جہاں تک شہرت کا معاملہ ہے اہالیانِ بستی ہم سے زیادہ ہمارے پڑوسی مشتاق بھائی سے واقف ہیں جو شیئر بازار کے نامی گرامی دلال ہیں بلکہ نامی گرامی کے قافیہ میں جتنے بھی ہم قافیہ لفظ آتے ہیں ان پر صادق آتے ہیں ان کے علاوہ خاجی خفقان بھی ہم سے زیادہ مشہور ہیں کیونکہ شہر کے تقریباً تمام غیر سماجی عناصر اور دو نمبر کا کاروبار کرنے والے تاجر پیشہ حضرات سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ سچ پوچھئے تو اردو پڑوسی ہمیں عزت کی نظر سے زیادہ ہمدردی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ہمیں پچھلے دنوں ہوا۔

ایک روز بیگم حسبِ معمول کسی پڑوسن کے ہاں سے دکھ درد بٹا کر لوٹیں تو یہ دردناک ماجرا سنایا کہ پڑوسن نے جب

پنے شوہر نامدار سے ان کا تعارف کرواتے ہوئے ہمارے حوالے سے انہیں ایک اردو ادیب کی گھر والی بتلایا تو پڑوسن کے شوہر نے سے تاکید فرمائی کہ تم اپنی ملنے جلنے والیوں کو صرف چائے بسکٹ پر ٹرخا دیتی ہو لیکن بھابی جی کو کھانا کھلائے بغیر مت بھیجنا کیوں کہ مقدس کتابوں اور شاستروں میں لکھا ہے کہ ادیبوں، شاعروں اور ناداروں کے بال بچوں کی مدد کرنا ثواب میں داخل ہے۔ بیگم کی زبانی ماجرے کی تفصیل سن کر ہم نے توصیفی لہجے میں کہا "خدا رکھے آپ کی پڑوسن کے شوہر تو بڑے خدا ترس اور رحم دل انسان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت و توقیر ہے"۔

بیگم جھنجھلا کر بولیں۔ آپ اسے عزت افزائی سمجھ رہے ہیں۔ یہ تو سراسر بے عزتی ہے، ایسا سلوک تو آدمی گداگروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا، اگر اس بے عزتی کا بدلہ نہیں لیا تو میرا نام بدل دینا۔"

چنانچہ بیگم بدلہ لینے کی ترکیب ڈھونڈنے لگیں جو چٹکی بجاتے ہوئے ان کے ہاتھ آگئی بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ اس گداگرانہ سلوک کا جواب ساری بستی میں ہمارے نام کے ڈنکے بجوا کر ہی دیا جا سکتا ہے اور یہ ڈنکے صرف اسی صورت میں بج سکتے تھے جب ہم ٹی وی کے روشن اسکرین پر کسی دن اپنے ادب کے ساتھ دھڑلے سے نمودار ہو جائیں!

اتفاق سے ان ہی دنوں جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے ہمارے وہ پڑوسی جن کی ساری ادبی لیاقت و علمیت ہماری مختصر سی لائبریری کی مرہون منت تھی پتہ نہیں کس طرح دوردرشن والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک پروگرام میں جلوہ گر ہونے میں کامیاب ہو گئے ــــــ

پھر کیا تھا جنگل کی آگ کی طرح ساری بستی میں ان کے نام کے چرچے ہونے لگے چنانچہ اب بیگم بھی ہمیں شہرت کی اس آگ میں جھونکنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں لڑانے لگیں اور بالآخر ایک دن یہ خوش خبری لے آئیں کہ ان کی کسی سہیلی کی سوتیلی نند کے منہ بولے دیور جو دوردرشن کیندر میں فلور منیجر (FLOOR MANAGER) کے عہدے پر ٹی وی سینٹر کے روز آغاز سے تاحال فائز ہیں اگلی اتوار کو ہم سے ملنے کو راضی ہو گئے ہیں۔

جس لمحے کا ہمیں اور ہم سے زیادہ ہماری بیگم صاحبہ کو انتظار تھا بالآخر وہ آپہنچا اتوار کے روز حسب وعدہ ٹی وی سینٹر کے فلور منیجر صاحب تشریف لے آئے لیکن پچھلے دنوں چونکہ اپنی فلور منیجری کی سلور جوبلی منا چکے تھے لہٰذا دوران گفتگو ہم میں کم سے کم اور ہمارے ڈرائنگ روم کے فلور (FLOOR) میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی دکھاتے رہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ خود کو آدمی کم اور فلور منیجر زیادہ سمجھتے ہیں، اور کیوں نہ ہو جو آدمی مسلسل پچیس سال سے فلور منیجری کرتا آیا ہو وہ خود کو فلور سے الگ نہیں کر سکتا بلکہ زندگی کے باقیماندہ سال بھی فلور ہی سے جڑا رہتا ہے اور بالآخر فلور ہی میں رل جاتا ہے یعنی ترقی معکوس کر کے گراؤنڈ فلور سے ایک دن انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے پہلے کہ فلور منیجر صاحب انڈر گراؤنڈ ہونے کے لیے ہمارے فلور کا انتخاب فرمائیں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے بیگم نے ان کی توجہ اصل غرض و غایت کی طرف مبذول فرمائی بولیں۔ "بھائی صاحب! ان کے اب تک چار چار مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں اردو کا کوئی رسالہ کوئی اخبار ایسا نہیں ہے جس میں ان کے مزاحیہ مضامین نہ چھپے ہوں لیکن افسوس اتنا لکھنے اور چھپنے کے باوجود یہ اپنی ہی کالونی والوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ٹی وی کے کسی پروگرام میں انہیں بھی موقع دیا جائے گھر گھر ان کے نام کا طوطی بولے، اب ان کی مشہوری آپ کے ہاتھ میں ہے بھائی صاحب! کچھ بھی کر کے انہیں ایک بار ٹی وی پر لے آیئے۔!!"

فلور منیجر صاحب بدستور فلور کی جانب دیکھتے ہوئے بولے "میں آپ کی ذہنی حالت کو سمجھتا ہوں بھابی جی! لیکن

پہلی مشکل یہ ہے کہ آپ کے میاں اردو میں لکھتے ہیں اور اردو کو خود بڑی مشکل سے دوردرشن کے پروگراموں میں وقت دیا جاتا ہے، دوسری مشکل یہ ہے کہ آپ کے میاں ایک لیکھک یعنی میرا مطلب ہے ادیب ہیں، شاعر نہیں!"

بیگم فوراً ان کی بات کاٹ کر ہم سے بولیں "سن لیا آپ نے! میں شروع سے کہتی آئی ہوں کہ یہ فضول مضامین لکھنے کی جگہ شاعری کرو، غزلیں، نظمیں لکھو لیکن آپ کی تو وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہوتی تھی نا، اگر میری بات پر عمل کرتے تو آج دوردرشن کے مشاعرے پڑھتے، چار پیسے کی آمدنی ہوتی، ہمارا بھی معیار زندگی اونچا ہوتا، بچے کی زبان پر آپ کا نام ہوتا!" کیوں بھائی صاحب میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔؟"

فلور منیجر صاحب نے فوراً بیگم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا۔ "بالکل بھابی جی شاعروں کو دوردرشن میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے کیوں کہ شاعر لوگ ایک تو اپنا کلام گاکر سناتے ہیں دوسرے مشکل اردو الفاظ کو اشاروں اور تاؤ بھاؤ کی مدد سے درشکوں کے بھیجے میں اتار دیتے ہیں کیا آپ کے میاں اپنا کوئی مضمون ترنم سے سنا سکتے ہیں گاکر طبلے اور سارنگی کے ساتھ۔

فلور منیجر صاحب کے اس انوکھے سوال پر ہمارا اور ہم سے زیادہ بیگم کا منہ فق ہوگیا۔ وہ جو کہاوت ہے کہ بندر کی بلا طبلے کے سر، تو بیگم نے فلور منیجر صاحب کے سوال کے جواب میں ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے تعلق سے برسوں سے میرا جو خیال تھا وہ آج پختہ ہوگیا کہ دور اندیشی تمہیں چھو کر بھی نہیں گئی شاعری جیسا منفعت بخش پیشہ اپنانے کے بجائے تم نے ادیب بننے کا جو گھاٹے کا سودا کیا ہے، اس نے آج بھائی صاحب کے سامنے میرا سر شرم سے جھکا دیا۔ ان کے جیسا با رسوخ آدمی بھی ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتا، یہ تمہارے لیے اور تم سے زیادہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے!!

فلور منیجر صاحب ہڑبڑا کر بولے۔ "ارے رے رے بھابی جی ایسا مت بولیے میں کوئی نہ کوئی چکر چلاتا ہوں آپ نراش مت ہوئیے مجھے چونکہ آپ کے فلیٹ کا فلور بے حد پسند آیا ہے میں آپ کے میاں کو کسی نہ کسی طرح دوردرشن کے فلور پر پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ آپ بھی تب تک کسی طبلے پیٹا والے کو پکڑ کر ان کے کسی مضمون کی دھن فٹ کروانے کی کوشش کیجیے"۔

بیگم نے چہک کر کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی صاحب! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایک مہینے کے اندر اندر ان کے مضمون کی ایسی دھن بنواؤں گی کہ لوگ سر دھنتے رہ جائیں گے۔!!

ہم نے سٹپٹا کر کہا۔ "بیگم یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کہیں مضمون کی بھی دھن بنائی جا سکتی ہے کس سے فٹ کرواؤ گی دھن؟ نوشاد سے؟ یا آر ڈی برمن سے؟"

فوراً بولیں۔ "نہ نوشاد سے نہ برمن سے میری ایک سہیلی کے نندوئی ہیں داؤد بھائی ڈھول ڈفلی والے، ان ہی سے بنواؤں گی"۔

ہم حیرت سے بولے "داؤد بھائی ڈھول ڈفلی والا؟ وہی تو نہیں جو پیچھے جھونپڑی میں رہتے ہیں اور بستی کی اکثر شادی بیاہ کی تقاریب میں اپنا بینڈ باجا لے کر پہنچ جاتے ہیں جن کی چیخ پکار سن کر عورتیں بے ہوش، اور بچے شور مچانے لگتے ہیں"۔ اس سے پہلے کہ بیگم ہماری بات کا کوئی جواب دیتیں فلور منیجر صاحب کھڑے ہوگئے۔ انھیں چونکہ بیگم کے نیتی، اردو زبان اس کے ادب اور ہماری ادبی حیثیت سے زیادہ غریب خانے کا فلور پسند آیا تھا لہٰذا ازراہ فلور نوازی اگلے ہی مہینے دوردرشن کے اردو پروگرام "محفل سوگواراں" میں ہمیں فٹ کرنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگئے۔

(جاری)

پیسہ ہے تو سب کچھ ہے

پیار محبت، دل اور دلبر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
ڈی ایس پی ہو، چاہے کلکٹر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
مہر درخشاں، ماہ منوّر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
قسمیں وسمیں، پیماں ویماں پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
کیسی بہن، کہاں کا بھائی؟ کیسا باپ، کہاں کی مائی
باجے گاجے دھوم دھڑاکا، شادی ہو یا منگنی ہو
پیسہ ہو تو دنیا بھر کے عیب، خوبیاں بنتے ہیں
اندھوں کی آنکھیں پیسہ ہے کان ہے بہروں کے پیسہ
پیسے بسائے شہر بھی ورنہ ویرانے سے لگتے ہیں
بہرہ سننے لگتا ہے اور گونگا بولنے لگتا ہے

شادی، بیوی، بچے، شوہر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
گھر کی مرغی دال برابر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
جگ مگ جگ مگ سارا منظر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
عاشق واشق دلبر ولبر پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
رشتے ناطے، دوست برادر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
کپڑے لتّے، گہنے زیور، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
موتی ہیرے، کنکر پتھر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
رنگ و نغمہ کا ہر منظر پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
کلکتہ ہو یا جالندھر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے
لنگڑا دکھلاتا ہے چل کر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے

پیسہ اگر نہ ہو تو چاروں جانب کے رستے مسدود
رستے، منزل، راہی، رہبر، پیسہ ہے تو سب کچھ ہے

ڈاکٹر محبوب راہی
بارسی ٹاکلی - اکولہ (ایم پی)

منسٹر سے نہیں پٹتی

عجب بیوی ہے جس کی اپنے شوہر سے نہیں پٹتی
منافق ہیں، گلے احباب کی مانند ملتے ہیں
شب تنہائی پیہم جسم میں کانٹے چبھوتا ہے
یہ امریکہ نہیں ہے اپنا ہندوستان ہے پیارے
کہو اُس سے کہ شوق عاشقی سے باز آجائے
کبھی تو کھڑکیاں پردے اُلجھنے لگتے ہیں باہم
ہمارے دل کا چکنا چور ہو جانا یقینی تھا
میں اس کے گھر کبھی سودا سلف لا کر نہیں دیتا
خس و خاشاک پر یلغار سیلاب حوادث کی
تو پھر ہم کام لیتے ہیں سیاست سے تدبّر سے
تبھی تو مبتلائے گردش افلاس رہتا ہے

تعجب ہے، مگرمچھ کی سمندر سے نہیں پٹتی
مگر سچ تو یہ ہے دونوں کی اندر سے نہیں پٹتی
شب تنہائی اپنی اپنے بستر سے نہیں پٹتی
یہاں ہر دوسرے کی پہلے لیڈر سے نہیں پٹتی
اگر اُس کی کسی بھولے ستمگر سے نہیں پٹتی
کبھی دیوار کی دہلیز اور در سے نہیں پٹتی
ہمیں معلوم تھا شیشے کی پتھر سے نہیں پٹتی
اسی پر میری میرے اعلیٰ افسر سے نہیں پٹتی
تماشہ ہے کہ لاکھوں کی بہتّر سے نہیں پٹتی
اگر اپنی کبھی اپنے مقدّر سے نہیں پٹتی
کہ اُس کی اپنے حلقے کے منسٹر سے نہیں پٹتی

کھچا تا رہتا ہے ہر ایک لمبی ناک والے سے
عجب راہی ہے جس کی ہر تونگر سے نہیں پٹتی

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

سگریٹ فوبیا (پہلی قسط)

CIGARETTE PHOBIA

سگریٹ فی زمانہ زیادہ خطرناک اور ڈراؤنی شئے جس کا نام لے کر اس طرح ڈرایا جا رہا ہے جیسے چھوٹے بچوں کو رونے اور ضد سے باز رکھنے کے لیے "ہوّا" "بڈھے" اور "اللہ میاں کی نیکی" سے ڈرایا جاتا ہے، دنیا میں اس سے بڑھ کر اب کوئی چیز قابل نفرین نہیں رہی۔ دق کا پیش خیمہ ۔؟ سگریٹ، سرطان کا جز تو ہے ۔؟ سگریٹ اور پرلے درجے کا موذی ۔؟ سو وہ بھی سگریٹ ..... ایک ڈاکٹر نے مقررہ وقت کے بعد آنے والے مریض سے پوچھا، جناب آپ آدھ گھنٹہ تاخیر سے آئے ہیں، وجہ ۔؟ جی میری اسکوٹر کا ٹائیر پنکچر ہوگیا تھا اس لیے وقت پر نہ آسکا۔ "ہوں" ٹائیر پنکچر ہوگیا تھا اچھا آ تو معلوم ہوا آپ سگریٹ نوشی فرماتے ہیں ... لیجئے، ٹائیر کیلے یا کانٹے ہی سے نہیں سگریٹ نوشی سے بھی پنکچر ہو جاتا ہے .....

سوسائٹی میں تو اب سگریٹ پینے والے کو نہایت گری ہوئی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے ویسے ہی جیسے کبھی "بینڈ باز" اور شرابی کبابی کو دیکھا کرتے تھے ستم بالائے ستم یہ کہ اس نامراد کے طفیل لڑکوں کو رشتہ ملنے میں بھی گرہ پڑ رہی ہے۔

لڑکی والوں نے پیام لانے والوں سے پوچھا، لڑکا کسی بری "لت" میں تو مبتلا نہیں ۔؟ نہیں حضور! ایسی کوئی بری عادت بچے میں نہیں نہایت ہونہار اور معصوم ہے، ہاں کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ بار چلا جاتا ہے اور بیر (BEER) کے ایک دو گلاس پی لیتا ہے۔ یہ سن کر ریٹائرڈ کپتان، لڑکی کے پھوپا نے "زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے" اپنے پوپلے منہ سے کہا، خیر یہ کوئی ایسی عادت نہیں جسے بری کہا جائے! بیر تو دراصل ایک قسم کی عمدہ ٹانک ہوتی ہے، "جو کا ست" اس ملاوٹ کے زمانے میں جب کہ کھانے پینے کی کوئی چیز بھی خالص نہیں رہی حتیٰ کہ طاقت کی دواؤں پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ایسے میں بیر کے ایک، دو گلاس اور وہسکی کا ایک آدھ پیگ پی لینا (پھر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے) اپنی صحت بنائے رکھنے کی خاطر ضروری ہوا ..... اور پھر فرمایا، اس صدی کی تیسری دہائی میں تو اڈولف ہٹلر نے سارے جرمنی کو "قومی مشروب" بیر پلا پلا کر اس قدر تندرست و توانا کر دیا تھا کہ اس کی فوجوں نے چوتھی دہائی میں دنیا کی تین تین بڑی طاقتوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ روس کا ڈکٹیٹر "جوزف° وی اسٹالن" کہ جس کی "یہ بلبی موچھیں جو ہمیشہ

° جیسے خوش گمانی میں مبتلا ہو کر "اپنا ہی بچھڑا ہوا بھائی" سمجھتے ہوئے ہمارے اخبار "یوسف وی اسٹالن" اور وزیر خارجہ جیکب ملک کو یعقوب ملک لکھا کرتے تھے۔

سوا نو بجایا کرتی تھیں، آٹھ بج کر بیس منٹ بجانے پر مجبور ہوگئیں۔ اور ادھر ونسٹن چرچل، وار کبنٹ (WAR ـ CABINET) کی مشاورتی میٹنگ سے فارغ ہو کے نمبر دس ڈاؤننگ اسٹریٹ کی چھت پر رات کے وقت گھپ اندھیرے میں غور و فکر میں غرق، ٹہلتے ہوئے اپنے منھ کے برابر موٹے سگار کو بجائے ادھر سے اُدھر سے سُلگانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہاں وہائیٹ ہاؤس میں پریسیڈنٹ روزویلٹ اپنی وہیل چیئر سے سراسیمگی کے عالم میں اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوا کئی مرتبہ اٹھا اور گرا ثم گرا اور اُٹھا.....

بیئر کے علاوہ کوئی دوسری عادت ؟ جی چائے اور سگریٹ بس ان کے سوا کوئی اور بری عادت نہیں.

سگریٹ ـ ؟.... یعنی تمہارے حساب سے اس کے علاوہ بھی کوئی دوسری بری عادت دنیا میں موجود ہے۔ ؟... لعنت ہے، دِق اور سرطان کے پٹارے سے کون رشتہ جوڑے۔ ؟ خدا حافظ، تشریف لے جائیے... کوئی دوسرا گھر دیکھئے......

دیکھا آپ نے۔ ؟ سگریٹ، جڑتے ہوئے رشتوں کو توڑنے کا باعث بھی ہوا...

عوام کو اس طاعون کے چوہے سے بچانے کی فکر میں سب سے زیادہ "اپنی جنتا" کو جی جان سے چاہنے والی "سرکار" کی نیند اُڑی جارہی ہے، اگر فی الحقیقت یہ بازار میں ملنے والے اناج، دودھ، دہی، دال، لون نمک، سبزی اور گوشت سے بھی زیادہ مسموم ہے تو پھر کیوں اس کی گردن نہیں اڑادی جاتی۔ ؟ ندیوں کے سیلاب کو پشتہ بنا کر روک دیتے ہیں، صرف ڈھنڈوری نہیں پیٹتے کہ "دوڑو دوڑو، بھیڑیا آیا، بھیڑیا آیا" "غریب کی جورو سب کی بھابی" سو سارا الزام اس کے سر تھوپ کر بے فکری سے کیوں بیٹھے ہو۔ ؟ اس بے بضاعت کی گردن مروڑ دینا ایسا کہاں کا پہاڑ کھودنا ہوا۔ ؟ کہ حکومت اور حکومت کا سارا "طویلہ" ہی جنتا پیاری کی فکر میں دُبلا ہوا جارہا ہے۔ "قاضی جی دبلے کیوں۔ ؟ شہر کا اندیشہ بہت ؟".....

ہم کو، ایک دن کا اختیار دے دیجئے، دوسرے ہی دن دنیا کو دکھلا دیں گے کہ اس بے برگ و نوا کے لاشے کو اس کے فدائی اپنے کندھوں پر اُٹھائے "کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"، نہایت دل سوزی سے کورس میں پڑھتے ہوئے شمشان گھاٹ لیے جارہے ہیں۔ اس بھیانک سیلاب کو بھی بند باندھ کر رد کیئے، اے پیاری اور جنتا پر جان چھڑکنے والی سرکار اور تجھے ہنسانے والے "ڈھونگی" صلاح کار ذرا جواب تو دیں تمہیں ڈر کس کا ہے۔ ؟

تمباکو کی کاشت کو افیون اور گانجے کی طرح بہ یک جنبش قلم سختی سے غیر قانونی قرار دے دیا جائے یہ تو ہوئی ایک بات اور دوسری یہ کہ سگریٹ سازی کارخانوں سے کروڑوں میں حاصل ہونے والی اکسائیز ڈیوٹی اور اُس پر کی خوب "دل دار" "بالائی" کو قربان کر کے اُن کے لائیسنس ہی منسوخ کر دیں اور کارخانوں پر علی گڈھ کا "یہ موٹا" تالا ڈال دیں، اب خدارا کوئی ہمیں بتلائے جب یہ دو دو بانس ہی نہ رہیں گے تو پھر بنسری بجے گی کیسے۔ ؟ مگر پیار میں سچائی، نیت میں صفائی، خلوص

- جرمنوں کے ہوائی حملوں سے بچنے کی خاطر سارا لندن تاریکی (BLACK OUT) میں ڈوبا رہتا تھا.
- جڑوں میں زہر اور پتوں پر زہر ہلاہل کا چھڑکاؤ، جس کے باعث نئی نئی بیماریاں پھیل رہی ہیں.

میں سچی محبت کی کارفرمائی ہو تو نا۔؟ صرف ٹیکس بڑھا کر (تا کہ اپنی آمدنی میں اضافہ ہو) اور پیکٹ پر "Cigarette smoking is injurious to health" کا "ڈھکوسلہ" لکھ کر پرلے درجے کی کائیاں سرکار یہ سمجھتی ہے کہ "ہم تو گنگا نہا لیے" اور "سارو جینک چھپتر میں لوک کلیان" ہو گیا۔ بڑا تیر مارا صاحب آپ نے، یہ تو وہی بات ہوئی، بلّی کے آگے چھیچھڑے ڈال کر ڈانٹ بتائیں، خبردار، نظر نہ اُٹھانا۔ . . . مگر میر صاحب تمہیں کچھ ہیں جانتے ہیں

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے !!!
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

اب آئیے ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیں۔ سگریٹ کی فتنہ سامانیوں کا رونا تو عام ہے لیکن، ذکرِ فیضانِ سگریٹ عام نہیں، منہ پر تالے پڑ جاتے ہیں، تصنع، بناوٹ، ملاوٹ اور منافقت کی اس دنیا میں تھوڑا سا احساس راحت تھکے ہوئے ذہنوں اور بوجھل لمحوں کو کچھ سکون اور آسودگیاں دینے والا اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہو تو خدارا ہمیں بھی بتا وہ کون ہے۔ ؟ کہاں ہے۔ ؟

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

پھر ذرا اس "پاؤن تولے پاؤ رتی" والے نکتے کو بھی ذہن میں رکھیئے کہ کیسی کیسی قد آور شخصیتیں اس کی زلف گرہ گیر کی اسیر رہی ہیں اور اس کی شان میں مدح سرائیوں کے دفتر کے دفتر لکھ چھوڑ گئی ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں اپنے مولانا آزاد ہی کو یاد کر لیجیے جن کی ہمالیائی "اَنا" نے چائے اور سگریٹ کے باب میں "اچھے اچھوں" کو بھی خاطر میں لانا گوارا نہیں فرمایا اور ان کی دل کش انانیت نے اپنی طرحدار انفرادیت کے اظہار کے لیے سگریٹ کو بھی افتخار بخشا۔ ان ہی کی انا پسندی کے بارے میں ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی صاحب نے بڑے مزے کی "چٹکی" لی ہے لکھتے ہیں: "مولانا آزاد اپنی انا کے قتیل تھے، اسلام میں اگر انسان کو سجدہ روا ہوتا تو وہ اپنے آپ کو سجدہ کرتے" اس چھیڑ خوباں سے چلی جانے والی چٹکی سے مزا تو خوب آیا لیکن یوسفی صاحب نے صرف ایک ہی سجدے پر اکتفا کر لیا، ہم کہ مولانا کی "مولانائی" کو ذرا زیادہ اندر سے جانتے ہیں، اگر یہی بات ہمارے قلم سے نکلی ہوتی تو وہ کچھ یوں ہوتی،

"سجدے پہ سجدہ، سجدے پہ سجدہ مار مار کے ہانپنے لگتے"۔ . . . .

مشتاق احمد یوسفی صاحب "ٹونک وی" ثمہ "کراچوی" اور کرنل محمد خاں صاحب "بل کسر وی" ثمہ "پنڈی وی"[٥] یہ وہ عظیم، قابل احترام، مایۂ ناز اور بے مثل مزاح نگار ادیب جو علم کے "دریاؤ" ہیں بظاہر مولانا کی انا پہ چاہے کتنا ہی کھائیں مگر ہم کہ دلوں میں چھپے چور کو پلک جھپکتے میں پکڑنے کے اُستاد ہیں صاف نظر آ رہا ہے کہ آپ دونوں بھی ہماری طرح اس طرحدار، پُرشکوہ اَنا پہ سو جان سے فدا اور فریفتہ ہیں (کرنل صاحب والی چٹکی کا ذکر ذرا بعد میں)۔

---

٥. راولپنڈی والے اپنے شہر کو پیار سے "پنڈی" بولتے ہیں، جیسے دلّی اور یوپی کے لوگ اپنے صاحبزادے "مُنّے" کو پیار سے . . . . . . اب جانے دیجیے ہمارے حیدرآباد "سرکار عالی" میں اس نیل کے شمار ... نہیں ہے۔

مولانا اپنے ذوقِ چائے نوشی کے آگے پنڈت نہرو تک کو خاطر میں نہیں لاتے فرماتے ہیں "جواہر لال بھی خواصِ مغرب کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی ضرور پیتے ہیں لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہِ عام سے قدم باہر نہیں نکال سکتے اور اپنی "لپچو" "دیچیو" ہی قسموں پر قانع ہیں"۔ مولانا کی مرغوب اور پسندیدہ چائے چین کی سب سے اعلیٰ قسم "وہائٹ جیسمین" (white jasmine) تھی جسے انھوں نے بڑے "دلار سے" "یاسمین سفید" اور اردو میں "گوری چنبیلی" نام دیا تھا۔ ذرا اس گوری چنبیلی کے حسنِ گلوسوز کی داستان اور رسوائے زمانہ سگریٹ سے اُس کے وصال کا احوال بھی مولانا ہی کی زبانی سنیئے، فرماتے ہیں "میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں یوں سمجھیئے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں...... شاید آپ کو معلوم نہیں چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں، میں نے چائے کی لطافت اور شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لونگا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا، مقدار کے حسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ اِدھر فنجان آخری جُرعہ سے خالی ہوا اُدھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشیدہ تک پہنچ کر دم لیا۔"

ہا! یہاں مولانا نے بجائے "تمباکوئے آتش زدہ" کے سیدھے سیدھے اگر سگریٹ ہی لکھ دیا ہوتا تو حشر بپا نہ ہوجاتا۔؟ اور "مولانائی" کے قطب مناری گراف میں معتدبہ گراوٹ نہ آجاتی۔؟....

قارئین! منہ دیکھی نہیں خدا لگتی کہیئے وہ کون ایسا بدذوق ہوگا جو اس "حکایتِ بادہ و تریاک" کو پڑھنے کے بعد خود بھی اپنی "لپٹن و یپٹن" سلیمانی چائے کا "کسالا" گھونٹ لیتے ہوئے "متصلاً" سگریٹ کا بھی ایک کش لینے کی تمنا کی کروٹ اپنے اندرونِ دل محسوس نہ کرے۔؟

ہم نے بھی اپنی یہ "زور" کروٹ لیتی ہوئی تمنا بڑے اہتمام اور ذوق وشوق سے پوری کی مگر وائے ناکامی ذوق وشوق بجائے "انضباط" کے فقدانِ انضباط ملاحظہ ہو کہ پورا حساب کتاب ذہن میں رکھنے کے باوجود کبھی فنجان (اپنا اسٹین لیس اسٹیل والا مگ) میں چائے کا آخری جرعہ پہلے ختم ہوا تو کبھی "تمباکوئے آتش زدہ" سگریٹ کے آخری خطِ کشیدہ پر پہنچ کر انگلیوں کو جلانے لگا۔ اور دونوں نامرادوں کو کبھی "قِرانُ السّعدین" نصیب نہ ہوا۔ بعض "قاضی جیئوں" کو شدت سے یہ فکر اور غم کھائے جا رہا ہے کہ "غبارِ خاطر چائے کی وجہ سے مشہور ہوئی یا چائے غبارِ خاطر کے باعث۔؟"

ہماری دانست میں یہ رازِ سربستہ اب بڑی حد تک کھل گیا۔

کہیئے یوسفی صاحب! "اب تو ٹھنڈک پڑی نا۔؟"

اب مولانا کے مجرد ذوقِ سگریٹ نوشی کا احوال بھی خود اُن ہی کی زبانی سنیئے (اور یہی ہمارے اس مضمون کا وہ "طوطا" ہے جس میں اُس کی جان قید ہے) تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں (تفصیل کو حذف کر کے صرف مطلب کی بات ہی "اُچک" لی گئی ہے)۔

"سرگزشت کا اصل واقعہ اب سنئے، جس دن علی الصبح مجھے رہا کیا گیا تو زندخانے کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور ازراہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا، یقین کیجئے جس درجے کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا اُتنے ہی درجے کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول بھی کرلی نہ ترک ہی دیر لگی اور نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی، نہ محرومی پر ماتم ہوا نہ حصول پر نشاط ہوا ترک کی تلخ کامی نے جو مزا دیا تھا وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا۔"....

قارئین کرام!

حلاوتِ مزید حاصل کرنے کے لیے مولانا کے ذوقِ چائے نوشی پر اب مخدومی کرنل محمد خاں صاحب کی گُل افشانیٔ گفتار کا مزا بھی لیجیے کہ اپنی ملائم انگلیوں سے کیسی "کسک دار" چٹکی لیتے ہیں کہ جس کی میٹھی میٹھی کسک کی حلاوت سے مسحور ہو کر بے اختیار منہ سے نکل جائے۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر!

ہم خندۂ دنداں نما کے نہیں، تبسم زیرِ لب کے قائل و قتیل ہیں اور کرنل صاحب کی نغز گوئی یہ جنس گراں مایہ اپنی فیکٹری میں وافر مقدار میں مینوفیکچر کرتی ہے۔ (جاری)

مذاق جالنوی

چاند پر انٹرویو

چاند کی دوشیزہ نے دھرتی پہ بھیجا اشتہار
ہے ضرورت مجھ کو شوہر کی مگر ہو نامدار

اس کو رہنا ہی پڑے گا ساتھ میرے مستقل
چاند کی دھرتی کو میں چھوڑوں یہ ہے امر محال

منتخب ہوگا حقیقت میں ایک ایسا خوش نصیب
جسکی صورت ہو ہیبکل اور طبیعت ہو عجیب

الغرض جس جس نے دھرتی پر پڑھا یہ اشتہار
اسکے سر پہ ہو گیا اک بھوت شادی کا سوار

چین ہندوستان بنگلہ دیش پاکستان سے
روس امریکہ عرب برطانیہ ایران سے

چاند پر ہر ملک سے بھیجے گئے امیدوار
چاند کی دوشیزہ اک اور چاہنے والے ہزار

میں نے بھی درخواست لکھ کر بھیج دی تھی مون پر
ہو گئی قسمت سے وہ منظور ٹیلیفون پر

طے کیا میں نے کہ راکٹ سے کراؤں سیٹ بک
ریل یا موٹر سے جانے کی ملاتا کیسے تک

الغرض القصہ یارو الوداع المختصر
چاند کی جانب کیا میں نے محبت سے سفر

میرا راکٹ جب اچانک چاند پر جا کر رکا
اپنی ہی دنیا پہ مجھ کو چاند کا دھوکا ہوا

سب سے پہلا تھا وہاں ایران کا امیدوار
سب سے پیچھے میں کھڑا تھا ایک لمبی تھی قطار

اس نے کنڈم کر دیا دو لفظوں میں ایران کو
پھر عرب جاپان بنگلہ دیش پاکستان کو

چاند کی دوشیزہ امریکن سے بولی بھائی اے
اک مصیبت ہے تمہارے ملک کی سی۔آئی۔اے

تم کو جاسوسی کبھی کرنے نہ دوں گی چاند پر
چاند کی بہبودی اوّل ہے میرے پیش نظر

اس نے روسی کو بھی یہ کہہ کر بھگایا ماسکو
ساری دنیا جانتی ہے روس کے خنّاس کو

ہم کسی روسی کو بھی ہونے نہ دیں گے کامیاب
ورنہ وہ اس چاند پر لائے گا کوئی انقلاب

پھر نظر اس کی پڑی اک چین کے فرزند پر
کھا رہا تھا گولیاں افیون کی جو بیٹھ کر

منہ بنایا اس نے چینی کو دکھا کر آئینہ
اور کہا صورت کبھی دیکھو اٹھا کر آئینہ

نکٹی چپٹی شکل لے کر آ گئے تم چاند پر
بھاگ جاؤ لوٹ کر واپس نہ آنا پھر ادھر

پھر ہوئی مجھ سے مخاطب تم کہاں سے آئے ہو
ساتھ اپنے ملک کا جغرافیہ بھی لائے ہو

اور پھر مجھ سے یہ پوچھا آپ کی کیا ہے زباں
کہہ دیا کہ لڑ رہا ہے آج تک ہندوستاں

اسنے پھر پوچھا کسی سے آپ کو الفت ہوئی
ہاں مرا اک دوست ہے اس نام کا الفت علی

کیا تمہیں درکار ہے لڑکی کے والد سے جہیز
دھرتی والوں کو بہت ہے چاند کی یہ گول میز

کی ابھی تک آپ نے پھر کس لیے شادی نہیں
میں جہاں رہتا ہوں ویرانہ ہے آبادی نہیں

الغرض سن سن کے اپنی بات کا مجھ سے جواب
ہنس کے بولی ہو گئے تم امتحاں میں کامیاب

وصل کی شب چاند سے رشتہ زمیں کا جڑ گیا
نیند جب ٹوٹی تو سپنوں کا پرندہ اڑ گیا

قاضی مشتاق احمد
(پونہ) ۴۱۱۰۰۷

سب بھول گئے

(پروفیسر آغا اور پروفیسر غفران آپس میں بحث کرتے ہوئے اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں)

غفران:۔ بھئی آغا صاحب! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے آج آپ نے روٹری کلب میں غالب کی شاعری پر تقریر کرنے کی بجائے جغرافیہ پڑھانا شروع کر دیا۔

آغا:۔ تھوڑا کنفیوژن (CONFUSION) ہو گیا۔ غلطی کلب والوں کی بھی ہے آخر انھوں نے کالج کے کلاس روم میں یہ فنکشن کیوں رکھا؟

غفران:۔ اور آپ نے حاضرین سے سوالات بھی پوچھنے شروع کر دیئے بلکہ روٹری کلب کے چیرمن کو ہال سے باہر چلے جانے کے لیے کہہ دیا۔

آغا:۔ وہ میرے سوال کا ٹھیک سے جواب نہ دے سکا۔

غفران:۔ جناب! وہ جغرافیہ کا پیریڈ اٹینڈ کرنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

آغا:۔ لیکن سوال تو بہت آسان تھا۔

غفران:۔ اللہ رحم کرے۔ آپ اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں۔

آغا:۔ کونسی غلطی؟

غفران:۔ ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔ کل آپ نے کالج کے پرنسپل کو چپراسی سمجھ کر ڈانٹ دیا۔

آغا:۔ اب چپراسی اور پرنسپل کی صورت ایک جیسی ہو تو میں کیا کروں؟

غفران:۔ یعنی یہاں بھی آپ غلط نہیں تھے۔ اور وہ مس شہناز کو فون کرنے کی کیا تک تھی؟ آپ نے اُسے فون کر دیا کہ آپ اس کے یہاں ڈنر کے لیے جا رہے ہیں۔

آغا:۔ لوگ ایک قسم کے نام کیوں رکھ لیتے ہیں! جیسا کہ آپ جانتے ہیں میری بیوی کا نام مہناز ہے۔

غفران: یہ کوئی معمولی غلطی ہے؟ آپ اپنی اسٹوڈنٹ کو اپنی بیوی سمجھ کر فون کرنے لگے؟ وہ بیچاری سر... سر کہتی رہی اور آپ غصّے سے اُسے ڈانٹتے رہے "میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔ کھانے میں مرچ کم ہونی چاہیئے" "گرم مصالحہ کا استعمال کم کرو" وغیرہ وغیرہ۔

آغا:۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ میری بیوی سے شکایت کرے؟ معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ میری بیوی جھگڑا کر کے میکے چلی گئی۔

غفران: اور وہاں شہناز کی ماں کا روتے روتے

بُرا حال ہے کہ اُس کا آپ کے ساتھ کوئی معاملہ تو نہیں؟

آغا:۔ میں اس کی ماں کو فون کردوں گا۔

غفران: اب یہ ستم مت کیجئے۔

آغا:۔ کیوں؟

غفران: کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کی ماں کو اپنی پُرانی محبوبہ سمجھ کر فون پر اناپ شناپ گفتگو شروع کردیں۔

آغا:۔ میں ایسا کیوں کروں گا؟

غفران: اس لیے کہ اس کی ماں کا نام بھی فردوس ہے۔

آغا:۔ بہت پُرانے قسم کا نام ہے۔

غفران: لیکن آپ کی محبوبہ کا بھی یہی نام تھا۔

آغا:۔ اچھا! مجھے تو لگتا ہے اس کا نام جنّت بی تھا۔

غفران: غضب خُدا کا! جس نام کی دن رات مالا جپتے تھے وہ نام بھی بھول گئے۔

آغا:۔ ریحان! ...

غفران: میرا نام غفران ہے۔

آغا:۔ لوگ اتنے مشکل نام کیوں رکھ لیتے ہیں۔

غفران: اب کیا آپ کی سہولت کے لیے اپنا نام بھی بدل لوں؟

آغا:۔ میرا تو یہی مشورہ ہے۔ تم کوئی آسان سا نام رکھ لو۔ احمد۔ جمن۔ فقیرا۔

غفران: اس کی کیا گیارنٹی ہے کہ یہ آسان نام بھی آپ کو یاد رہے گا۔

آغا:۔ اس سے کیا فرق پڑجاتا ہے؟ شیکسپیئر نے کہا ہے "نام میں کیا رکھا ہے"؟

غفران: حد ہوگئی۔ آغا صاحب! آپ کی بھول جانے کی عادت اب بیماری میں تبدیل ہوگئی ہے میرا تو یہ مشورہ ہے کہ آپ کسی ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

آغا:۔ دو۔ تین بار ڈاکٹر کے یہاں گیا ضرور تھا۔

غفران: کیا کہا ڈاکٹر نے؟

آغا:۔ یہ تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ میں ڈاکٹر کے یہاں جاکر یہ بھول گیا کہ میں وہاں کیوں گیا تھا؟

غفران: آغا صاحب! آپ ہر بات ڈائری میں نوٹ کرنے کی عادت ڈالئے۔ ہر صبح ڈائری میں لکھ کر رکھیں کہ آپ کو آج کیا کیا کرنا ہے؟

آغا:۔ اور اگر میں ڈائری میں لکھنا بھول گیا تو؟

غفران: کیسے بھولیں گے؟ ڈائری ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھیے اور اسے بار بار دیکھتے رہیے۔

آغا:۔ میرے دوست عرفان!

غفران: جناب! میرا نام غفران ہے۔

آغا:۔ کم از کم تم تو تعاون کرو یار! جانتے ہو مجھے بھول جانے کی عادت ہے۔

غفران: اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے چاہیں جس نام سے پکاریں؟

آغا:۔ اچھا بھائی کامران!

غفران: کامران نہیں غفران۔

آغا:۔ ہاں ہاں وہی — فرقان

غفران: اگر میں اور پانچ منٹ رُکا تو شاید اپنا نام میں خود بھول جاؤں گا۔

آغا:۔ غصّہ کیوں کرتے ہو یار! ... یہ تو میری مجبوری ہے۔ اب تم نے یاد رکھنے کا جو طریقہ بتایا ہے اسی پر عمل کرتا ہوں — (میز سے ڈائری اٹھاتے ہیں) یہ دیکھو — میں نے ڈائری میں تمہارا نام لکھ لیا — ارمان۔

غفران: بسم اللہ ہی غلط کردی۔ جناب! میرا نام غفران ہے۔

آغا:۔ اچھا بھئی غفران !۔۔۔

غفران: شکریہ ہے پہلی بار آپ نے مجھے صحیح نام سے پکارا ۔۔۔ ورنہ ایک بار آپ نے تو مجھے پہلوان کے نام سے بھی پکارا تھا۔

آغا:۔ اب یہ غلطی نہیں ہوگی (ڈائری دیکھتے ہوئے) غفران! تم نے مجھ پر کیا ہے احسان۔ تم نے مجھے اپنی بھول جانے کی عادت پر قابو پانے کا طریقہ دکھا دیا ۔۔۔ تھینک یو (ڈائری دیکھتے ہیں) تھینک یو ۔۔۔ غفران!

غفران: اچھا اب اجازت دیجئے۔

آغا:۔ اوہ معاف کرنا۔ میں نے تمہیں چائے کیلئے تک نہیں پوچھا۔

غفران: رہنے دیجئے۔ بھابی گھر پر نہیں ہے۔ ہاں ممکن ہو تو کچھ ٹھنڈا پلائیے۔

آغا:۔ میں ابھی ایک منٹ میں فریج سے لیکر آتا ہوں۔ (آغا اندر جاتے ہیں اور فوراً واپس آجاتے ہیں)۔

آغا:۔ (غفران سے) بھائی! مجھے یہ بتائیے کہ میں اندر کیوں گیا تھا۔

غفران: آپ فریج سے سافٹ ڈرنک کی بوتل لینے گئے تھے۔

آغا:۔ اوہ معاف کرنا۔۔۔۔

غفران: کتنی بار معافی مانگو گے؟ میں نے یاد رکھنے کا طریقہ بتا دیا ہے نا آپ کو!

آغا:۔ کیا طریقہ بتایا ہے؟

غفران: یہ ڈائری آپ کے ہاتھ میں کیوں ہے؟

آغا:۔ کیوں ہے؟

غفران: اس لیے کہ اس میں آپ کو لکھنا ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔

آغا:۔ یاد آیا! ۔۔۔ چلئے اب آپ کے سامنے تجربہ (ڈائری میں لکھتے ہیں) فریج سے بوتل لانی ہے (اندر جاکر ایک بوتل لے کر آتے ہیں)

غفران: (بوتل دیکھ کر) یہ کیا لے آئے آپ؟ یہ تو پیٹ صاف کرنے کی دوا کی بوتل ہے کیا یہ آپ مجھے پلانے والے تھے؟

آغا:۔ ڈائری میں تو یہی لکھا ہے۔۔" فریج سے بوتل لانی ہے"۔

غفران: کیا فریج میں زہر کی بوتل ہوتی تو وہ بھی آپ لے آتے؟

آغا:۔ وہ کیوں لاتا؟

غفران: کیوں کہ آپ کی ڈائری میں لکھا ہے" فریج سے بوتل لانی ہے" آپ کو یہ لکھنا چاہئے تھا" فریج سے ٹھنڈے مشروب کی بوتل لانی ہے"۔ پہلے یہ بوتل اندر فریج میں رکھ دیجئے۔

(آغا اندر جاتے ہیں اور واپس آتے ہیں)

(دروازے سے آواز "تار والا" آغا صاحب دروازہ پر جاکر تار لے آتے ہیں)۔

آغا: (تار پڑھتے ہیں) پیر کے دن بمبئی پہنچ رہا ہوں مسعود۔

غفران: کس کا تار ہے؟

آغا:۔ مسعود کا۔

غفران: کون ہے یہ مسعود؟

آغا:۔ پتہ نہیں کون ہے؟

غفران: جناب! یاد کیجئے۔ کوئی کسی کو بلا وجہ تار نہیں بھیجتا۔ کیا یہ آپ کے کسی دوست کا تار ہے؟

آغا:۔ میرے تو جتنے دوست تھے سب دشمن بن گئے۔

غفران۔ آپ کا کوئی رشتہ دار ؟ یہ تار کو لہاپور سے آیا ہے۔ وہاں تو آپ کا سسرال ہے۔

آغا۔ اچھا! یاد آیا۔ مسعود یہ میرا سالا ہے۔

غفران۔ بھابی نے یقیناً شہناز والے معاملے کی شکایت کر دی ہوگی۔ وہ آپ سے جواب طلبی کے لیے آرہا ہے۔

آغا۔ اب میں کیا کروں ؟

غفران: آپ صبر و سکون سے کام لیجیے مسعود کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف کھینچ لیجیے۔

آغا۔ کون مسعود ؟

غفران: آپ کا سالا۔

آغا۔ اچھا وہ کولہاپور والا۔

غفران: آپ کو اپنا سالا تو یاد ہے نا!

آغا۔ یاد ہے۔

غفران: اس کی صورت یاد ہے ؟

آغا: بالکل۔ جب ہماری شادی ہوئی وہ اس کی اماں کی گود میں تھا۔

غفران: دودھ پیتا بچہ ہے ؟

آغا۔ اس وقت تھا۔

غفران: اب تو بڑا ہو گیا ہوگا۔

آغا۔ شاید۔ . . . بالکل بڑا ہو گیا ہوگا۔

غفران: بڑا ہونے کے بعد آپ نے اسے دیکھا تک نہیں۔

آغا۔ نہیں۔

غفران: کیوں ؟

آغا: اُسے ۱۴ سال کی سزا ہو گئی تھی۔

غفران: کیا کیا تھا اُس نے ؟

آغا۔ بینک لوٹا تھا۔

غفران: تب تو بڑا خطرناک آدمی ہوگا۔ آپ اُس سے سنبھل کر بات کیجیے۔

آغا۔ اور اگر اس نے کوئی غلط حرکت کر دی تو ؟

غفران: وہ غلط حرکت نہیں کرے گا۔

آغا۔ مگر کیوں ؟

غفران: وہ آپ کا سالا ہے۔ معاملہ سلجھانے کے لیے آرہا ہوگا۔

آغا۔ ہاں ہاں . . . یہ تو ہے۔

غفران: آپ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ اس سے خیریت پوچھیے۔ بیوی بچوں کے بارے میں پوچھیے۔ اس کی خاطر مدارت کیجیے اُسے یقین دلانے کی کوشش کریں کہ آپ کا شہناز سے کوئی تعلق نہیں۔

آغا۔ میں یہ باتیں ڈائری میں نوٹ کر لیتا ہوں۔ (آغا ڈائری میں لکھتے ہیں۔) میٹھی میٹھی باتیں ـــ خیریت پوچھنا ـــ بیوی بچوں کے بارے میں ـ خاطر مدارت ـ شہناز سے تعلق نہیں یقین دلانا۔ خاطر مدارت قبول کرنے میں انکار کرے تو زبردستی کرنا۔ . . .

غفران: اچھا تو اب اجازت چاہوں گا۔ پھر ملیں گے۔

آغا۔ اگر زندہ بچ گئے تو ـــ

غفران: فکر مت کرو۔ ہمت سے کام لو۔ خدا حافظ۔

آغا۔ خدا حافظ!

(غفران چلے جاتا ہے۔ پروفیسر آغا ڈائری دیکھ کر یاد کرتے ہیں "میٹھی میٹھی باتیں . . . خیریت پوچھنا ـــ بیوی بچوں کے بارے میں ـــ خاطر مدارت ۔ شہناز سے تعلق نہیں یقین دلانا)۔

(دروازے پر دستک)

آغا۔ کون ہے بھئی۔ دروازہ کھلا ہے۔

(ایک لاپرواہ سا نوجوان اندر داخل ہوتا ہے)

آغا:۔ آیئے ... آیئے ... میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ (ڈائری دیکھتے ہوئے) فرمایئے کیسے ہیں آپ؟

نوجوان: اچھا ہوں۔

آغا:۔ آپ کی امّی؟

نوجوان: وہ بھی اچھی ہیں۔

آغا:۔ آپ کی بیوی؟

نوجوان: میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔

آغا:۔ (ساری توجہ ڈائری کی طرف ہے) اور بال بچے؟

نوجوان: آپ مذاق کر رہے ہیں؟

آغا:۔ سالے!

نوجوان: آپ نے مجھے گالی دی۔

آغا:۔ تمہاری بہن کے حوالے سے۔ آخر آپ کی بہن ہماری بیوی جو ہے۔

نوجوان: اچھا؟ تو آپ نے شادی بھی کر لی؟

آغا:۔ عرصہ ہوا۔ خیر یہ تمہیں کیا یاد ہوگا؟ اس وقت تو آپ بچے تھے۔

نوجوان: تو آپ یہ قبول کر رہے ہیں کہ آپ نے شہناز سے شادی کر لی۔

آغا:۔ شہناز سے نہیں مہناز سے ...

نوجوان:۔ لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری بہن آپ کی بیوی ہے۔

آغا:۔ میں اس بات سے کب انکار کر رہا ہوں۔

نوجوان:۔ پھر آپ نے یہ شادی چھپا کر کیوں رکھی؟

آغا:۔ تم سے چھپائی ہوگی۔ تم اس وقت جیل میں تھے۔

نوجوان: میں؟ میں کب جیل میں تھا؟

آغا:۔ جھوٹ بولتے ہو۔ تم تو ۱۴ برس جیل میں تھے۔

نوجوان: آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔

آغا:۔ اپنا سالا۔

نوجوان: آپ کی اتنی ہمت کہ آپ مجھے سالا کہیں۔

آغا:۔ اور نہیں تو کیا خسر کہوں؟ کیا تم مہناز کے بھائی نہیں؟

نوجوان: اچھا تو آپ نے شہناز کا نام بھی تبدیل کر دیا۔ مہناز۔

آغا:۔ کون شہناز؟

نوجوان: میری بہن۔

آغا:۔ اچھا! تو تم شہناز کے بھائی ہو! معاف کرنا مجھے غلط فہمی ہوگئی۔

نوجوان: غلط فہمی تو ہمیں ہوگئی ہے۔ ہم آپ کو شریف آدمی سمجھ رہے تھے۔

آغا:۔ دیکھو بھائی! میں سو فیصدی شریف آدمی ہوں یہ صحیح ہے کہ کسی زمانے میں میں محبت کرتا تھا۔

نوجوان: کس سے؟

آغا:۔ فردوس سے۔

نوجوان: یعنی امّی جان سے؟

آغا:۔ کون امّی جان؟

نوجوان: فردوس میری امی جان کا نام ہے۔

آغا:۔ اب تم یہ بھی کہو گے کہ اس حساب سے تم میرے بیٹے ہوئے۔

نوجوان: کیا فرمایا آپ نے؟ کیا آپ کے امی جان سے اس حد تک تعلقات تھے؟

آغا:۔ اوہو ــــ تم غلط سمجھ رہے ہو ــــ اگر فردوس وہی ہے جسے میں چاہتا تھا تو یقین کرو میں اس سے زندگی میں ایک بار بھی نہیں ملا۔

نوجوان: اور آپ اس سے محبت کرتے تھے۔

آغا:۔ پاکیزہ محبت۔

نوجوان: کیا مطلب؟

آغا:۔ اس زمانے کی محبت ایسی تھی کہ ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

نوجوان: آپ تو بہت پہنچے ہوئے نکلے۔ جناب! میں آپ کو وارننگ دینے آیا ہوں اگر آپ نے دوبارہ میری بہن کو فون کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

آغا:۔ اب تمہاری بہن کو تو کیا اپنی بیوی تک کو فون نہیں کروں گا ـــ اور میرے یہاں فون ہی کہاں ہے؟ یہ فون تو پرنسپل کی آفس سے کرتا ہوں جب وہ پیریڈ لینے کے لیے کلاس روم میں جاتے ہیں۔

نوجوان: میری بات یاد رکھنا۔

آغا:۔ یاد رکھوں گا بھئی! دیکھو ابھی ڈائری میں لکھ لیتا ہوں ـــ اور ہاں! تمہاری اماں کو ہماری طرف سے پیار کہنا۔

نوجوان: میری اماں کو پیار!

آغا:۔ اوہو ـــ کیا غضب کرتے ہو میں نے ایسا کیا کہا۔ میرا مطلب تھا۔ تمہارے بچوں کو پیار

نوجوان: لیکن میرے بچے ہیں کہاں؟

آغا:۔ جہاں بھی ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ میں تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔

نوجوان: میرا گھر کیا میری گلی کا بھی رُخ مت کرنا۔

آغا: عجیب انسان ہے۔ اچھا بھئی! نہیں آؤں گا ـــ تمہاری اماں کو ـــ

نوجوان: کیا؟ (غصے سے)

آغا:۔ سلام کہنا۔

(نوجوان باہر چلا جاتا ہے)

آغا:۔ جان بچی اور لاکھوں پائے ـــ یہ مہناز کا بھائی ابھی تک نہیں آیا ـــ کیا نام ہے کمبخت کا۔ (تار دیکھ کر) اچھا ـ مسعود؟

(دروازے پر دستک)

(ایک ڈرپوک سا نوجوان اندر آتا ہے)

آغا:۔ تمہارا نام مقصود ہے؟

نوجوان: جی نہیں ـــ مسعود۔

آغا:۔ تم تمہاری بہن کے بھائی ہو؟

نوجوان: جی ہاں۔

آغا:۔ تم ہی نے ٹیلیگرام کیا تھا؟

نوجوان: بالکل۔

آغا:۔ تم مجھ سے ملنے آئے ہو؟

نوجوان: جی ہاں۔

آغا:۔ تو آؤ ـــ گلے ملو۔ (گلے ملتے ہیں)

(آغا ڈائری دیکھتے ہیں) اب میں تم سے میٹھی میٹھی باتیں کروں گا۔

نوجوان: کیجئے۔

آغا:۔ مٹھائیوں میں تمہیں کیا پسند ہے؟

نوجوان: کچھ بھی نہیں۔

آغا:۔ کیا تمہارے بلڈ میں شکر بڑھ گئی ہے۔

نوجوان: جی ہاں۔

آغا:۔ یعنی میٹھی باتوں کا کوئی چانس نہیں۔ اب لکھا ہے تمہاری خیریت پوچھنا۔

نوجوان: کہاں لکھا ہے؟

آغا: دل کی کتاب میں (ہنستے ہیں) کیسے ہو؟

نوجوان: خیریت ہے۔

آغا: تمہاری اماں کیسی ہیں؟

نوجوان: اچھی ہیں۔

آغا:۔ اُن کا نام فردوس تو نہیں؟

نوجوان : جی نہیں۔
آغا۔ تمہاری بہن کا نام شہناز تو نہیں ؟
نوجوان : جی نہیں۔ میری بہن کا نام مہناز ہے۔
آغا۔ تب تم سو فیصدی میرے سالے ہو سالے!
نوجوان : بہنوائی۔
آغا۔ (چپکے سے ڈائری دیکھتے ہوئے) اب میں تمہاری خاطر مدارت کروں گا۔ (اندر فریج میں سے ٹھنڈی بوتل لے کر آتے ہیں۔ ایک گلاس میں انڈیل کر نوجوان کو دیتے ہیں)
لو بھئی، پی لو۔
نوجوان : (ایک گھونٹ پی کر) اس کا مزہ
آغا۔ اچھا ہے نا؟ ایک سانس میں پی لو۔
نوجوان : یہ کیا ہے؟
آغا۔ ٹھنڈا مشروب۔ ارے بھئی! فریج سے لایا ہوں (چپکے سے ڈائری دیکھ کر)
اگر تکلف کرے تو زبردستی کرنا۔۔۔۔۔۔
(نوجوان سے) پی لو۔
نوجوان : جی نہیں۔
آغا : کیوں ؟
نوجوان : اس کا مزہ۔۔۔۔
آغا : لکھا ہے زبردستی کر کے پلانا (زبردستی پلاتے ہیں۔)
نوجوان : اس کا مزہ۔۔۔۔
آغا۔ مزے کو کہاں لے کر بیٹھ گئے! جو لکھا ہے وہی کر رہا ہوں۔
نوجوان : کہاں لکھا ہے؟
آغا۔ تمہاری پیشانی پر۔۔۔
نوجوان۔ مذاق!
آغا : (ہنستے ہوئے) مذاق!

نوجوان : باتھ روم کہاں ہے!
آغا : کیوں ؟
نوجوان : لوگ باتھ روم کیوں جاتے ہیں؟
آغا : لیکن ابھی تو مجھے تمہیں یہ یقین دلانا ہے کہ میرا شہناز سے۔۔۔۔
(نوجوان ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگتا ہے)
آغا۔ عجیب انسان ہے! میرے گھر کو کیا GENERAL TOILET سمجھ رکھا ہے۔
سلیم شوچا لیہ۔ اس نے تو بات بھی پوری نہیں کی تھی لنک ٹوٹ گیا۔ اب پھر اتنا اسے گلے ملاؤ۔۔۔ خیریت پوچھو۔۔۔ اور پھر خاطر مدارت۔ پھر شہناز
(نوجوان اندر سے آتا ہے)
آغا : ہاتھ دھو لیے۔۔۔ صابن سے!
نوجوان : جی ہاں۔
آغا : اب ہاتھ ملاؤ۔۔۔ گلے ملو۔۔۔ (گلے ملتے ہیں)۔ کیسے ہو؟
نوجوان : میری حالت بہت خراب ہے۔
آغا : اب خاطر مدارت۔
(نوجوان اُٹھ کر بھاگتا ہے۔ آغا پکڑ لیتے ہیں)
آغا : کہاں بھاگ رہے ہو۔ ابھی تمہاری خاطر مدارت باقی ہے۔
نوجوان : مجھ پر رحم کیجئے۔
آغا : میں وہی کروں گا جو لکھا ہے۔۔۔
نوجوان : کہاں لکھا ہے؟
آغا : یہ راز کی بات ہے۔ (بوتل سے مشروب نکالتے ہیں اور گلاس میں انڈیلتے ہیں)۔ لو پی لو۔۔۔
نوجوان : میں پی چکا ہوں۔ بہت کڑوا ہے۔
آغا : اب تمہارے لیے میٹھا مشروب کہاں سے لاؤں؟ سیدھی طرح پی لو۔ (زبردستی پلاتے ہیں)۔

نوجوان : میں ابھی آتا ہوں۔

آغا:۔ ابھی تمہیں یہ یقین دلانا باقی ہے کہ شہناز سے ۔ ۔ ۔ ۔

(نوجوان ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگتا ہے)

آغا:۔ پتہ نہیں کیا کیا کھا کر آجاتے ہیں؟ میرے گھر کو اس شخص نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ اب اس کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرا شہناز سے کوئی تعلق نہیں۔

(نوجوان باہر آتا ہے۔ تھکا ہوا سا)

آغا:۔ اب غور سے سنو۔ میرا شہناز سے کوئی تعلق نہیں۔

نوجوان : کون شہناز۔؟

آغا:۔ ارے وہی جسے میں نے مہناز سمجھ کر فون کیا تھا

نوجوان :۔ تو کیا ہوا!

آغا:۔ تمہاری بہن روٹھ کر میکے چلی گئی۔

نوجوان :۔ کون مہناز آپا۔ تو میرے ساتھ آئی ہیں۔

آغا:۔ کہاں ہے؟

نوجوان : باہر بیٹھی ہے۔ کہتی تھی جب آپ بلانے آئیں گے آجاؤں گی۔ (آغا باہر لپکتے ہیں اور نوجوان باتھ روم کی طرف بھاگتا ہے)۔

(آغا بیگم کے ساتھ اندر آتے ہیں)۔

آغا:۔ اب تمہیں کیسے یقین دلاؤں شہناز سے میرا تعلق نہیں۔ وہ میری اسٹوڈنٹ ہے۔ کیا میں اتنا کمینہ ہوں کہ اپنی اسٹوڈنٹ سے عشق کروں گا۔

بیگم :۔ اگر شہناز سے نہیں تو آپ کا کس سے معاملہ ہے؟

آغا:۔ فردوس سے ـــ میرا مطلب ہے تھا۔

بیگم:۔ کون فردوس؟

آغا:۔ وہ جس سے میں نے کبھی پیار کیا تھا۔

بیگم:۔ اچھا تو یہ بات ہے؟ لے آیئے فردوس کو اور رہیئے آرام سے میں جا رہی ہوں۔

(نوجوان تھکا ہوا اندر سے باہر آتا ہے)

بیگم:۔ مسعود! تم اندر کیا کر رہے تھے؟

آغا:۔ بہت گندا آدمی ہے تمہارا بھائی۔

بیگم :۔ (میز سے بوتل اٹھا کر) اور یہ پیٹ صاف کرنے کی دوا یہاں کیوں پڑی ہے۔

آغا:۔ تمہارا بھائی پی رہا تھا۔

مسعود : نہیں باجی انہوں نے مجھے زبردستی پلائی۔

بیگم :۔ کیوں جی؟ کیوں پلائی۔

آغا:۔ ایسا لکھا تھا۔

بیگم :۔ کہاں لکھا تھا؟ اور کس نے لکھ دیا؟ فردوس نے

آغا:۔ فردوس نے نہیں ـــ وہ کیا نام ہے اس کا اس نے لکھ دیا۔

بیگم :۔ اچھا تو اب محبوباؤں کی فہرست اتنی طویل ہو گئی کہ ان کے نام تک بھول گئے۔

آغا:۔ دیکھو شہناز!

بیگم :۔ کون شہناز؟ وہی کلموہی۔ اور آپ تو کہہ رہے تھے شہناز سے آپ کا تعلق نہیں

آغا:۔ ارے میں تو مہناز کہہ رہا تھا۔ منہ سے شہناز نکل گیا۔

بیگم :۔ کیوں کیا شہناز حلق میں اٹکا ہوا نوالہ تھا جو اچانک نکل گیا ـــ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہوں گی۔ مسعود! چلو یہاں سے۔

مسعود :۔ مجھ میں تو اب اتنی بھی طاقت نہیں کہ باتھ روم تک جاؤں۔

بیگم : تم جاؤ جہنم میں ـــ میں تو چلی۔

آغا:۔ بیگم ۔ ۔ ۔ ۔ بیگم ۔ ۔ ۔ ۔ یقین کرو ـــ میرا شہناز سے کوئی تعلق نہیں۔

(پردہ دھیرے دھیرے گرتا جاتا ہے)

□□

اقبال شانہ

مُنہ

لگتا ہے دیکھنے میں تو اچھا بھلا سا مُنہ — پھر کیوں بنا رہی ہو مری جاں بُرا سا مُنہ
معشوق بھی عجیب مرا کارٹون ہے — چھوٹے سے ہاتھ پاؤں ہیں اُس کے بڑا سا مُنہ
نوٹس دیجئے بنا جو وہ آئے ہمارے گھر — حیرت سے رہ گیا ہے ہمارا کھُلا سا مُنہ
معشوق کی فراق میں صورت تو دیکھیے — بیگن کی طرح ڈال سے لٹکا ہوا سا مُنہ
بے شک تمہارے عشق نے اندھا بنا دیا — لگتا ہے چاند مجھ کو تمہارا کھُلا سا مُنہ
آتی ہے آئینے کو بھی بے ساختہ ہنسی — وہ جب بھی دیکھتا ہے ترا جُلبلا سا مُنہ
اپنی زباں کو آپ ذرا دیجیے لگام — اتنی سی جان آپ کی، اتنا بڑا سا مُنہ

زلفیں بڑھائیں کان میں جھُمکا پہن لیا
شانہ لگے ہے اب ترا خواجہ سرا سا مُنہ

بھوت

سر چڑھ کے بولتا ہے مری عاشقی کا بھوت — دل میں سما گیا ہے مرے "اک پری" کا بھوت
کمبخت سے نہ جانے مجھے کب ملے نجات — پیچھے پڑا ہوا ہے مرے شاعری کا بھوت
میرے خدا بچا مجھے اُس نامراد سے — سائے کی طرح ساتھ ہے اک سرپھری کا بھوت
لگتا ہے کھائے گا تو مگر جیل کی ہوا — سر پر جو چڑھ گیا ہے ترے لیڈری کا بھوت
"ڈش" کا ہمارا شہر ہے مرکز بنا ہوا — چھت پر ہر اک مکان کے "ڈش اینٹنی" کا بھوت
ہم تو بہت ہنسائیں گے دن رات دوستو — جب تک سوار سر پہ ہے زندہ دلی کا بھوت

اک انڈین نے ہم سے یہ پردیس میں کہا
شانہ تو لگ رہا ہے مری کنٹری[1] کا بھوت

1 COUNTRY

غزل

ادائیں جانِ من کی شوخیانہ — مرا انداز لیکن فدویانہ
اُٹھی جب وہ نگاہ عاشقانہ — خوشی کا بج اُٹھا ہے شادیانہ
غضب کا گھاگھرا یہ ہے تمہارا — کوئی سرکس کا جیسے شامیانہ
نئی بیگم کے کپڑے دھوتے دھوتے — بنی حالت میاں کی "دھوبیانہ"
تمہیں کیسے کریں "اڈجسٹ" جاناں — ہماری زندگی ہے عامیانہ
ہمارے دل کو لگتا ہے مسلسل — تمہاری عاشقی کا تازیانہ
ہماری جان لے کر ہی رہے گا — تمہارا یہ تبسم شوخیانہ

کم از کم بعد مرنے کے تو شانہ
ہماری شاعری کو قومیانہ

جھانپٹر ناگپوری

نعتِ پاک

ہوئی فُل کتنی آج نائٹ ہے ، ہر طرف نور حق کی لائٹ ہے
چل رہی ہے ہوائے عشقِ نبیؐ اب بلندی یہ دل کی کائٹ ہے
کاٹ سکتا نہیں کوئی شیطاں مدحِ سرکار کی وہ کائٹ ہے
گر کے کعبے میں بولے لات و ہبل آج حُلیہ ہمارا ٹائٹ ہے
بھیجنا آپؐ پر درود و سلام رانگ بالکل نہیں ہے رائٹ ہے
دشمنانِ رسولؐ کا دیکھو دل ہے کالا تو خون وائٹ ہے
پوچھو قرآنِ پاک سے لوگو اُن کے رُتبے کی کتنی ہائٹ ہے

لاج جھانپٹر کی رکھنا اے مولا
مُنکرِ دیں سے اس کی فائٹ ہے

اقبالؔ کا وطن

نثارؔ عباسی
الہ آباد

(احساسِ کرب کے ساتھ)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
دُنیائے مفلسی میں ہے اپنا بول بالا
زاغ و زغن نے اس کو ہر طرح نوچ ڈالا
ہے بلبلِ چمن بھی کس درجہ بھولا بھالا
ہے ملک میں کرپشن کیسا بلند و بالا
اب سر اُٹھا کے اس کو دیکھے ہے خود ہمالا
کہنا نہیں ہے کچھ بھی سمجھیں اگر اشارا
رہزن نے جس کو چھوڑا اُسے راہبر نے مارا
گم کردہ راہ خود ہے رہبر ہے جو ہمارا
بہنے لگی ہو جیسے گنگا کی اُلٹی دھارا
اس ملک کا ہمارے اب کیا ہے ہونے والا
ہر سمت کوئی گڑبڑ ہر جا کوئی گھٹالا
کیوں کر کہیں نثارؔ اب ، کیا حال ہے ہمارا
منجدھار میں ہے کشتی ملتا نہیں کنارا
"بوفور" کوئی "فوڈر" کوئی "راؤ" کوئی "سوامی"
کن کن مصیبتوں سے اپنا پڑا ہے پالا
غدّار ہیں وطن کے جمہوریت کے دشمن
سمجھا جنھیں محافظ ڈاکہ اُنھیں نے ڈالا
مقروض ہو گئے ہیں غیروں کے اس طرح ہم
جیسے نکل گیا ہو جمہور کا "دِوالا"
یہ قرض ہے ہمارا اس درجہ روز افزوں
ہم روز کھا رہے ہیں اک قرض کا نوالہ
شکوہ کریں تو کس سے کس کس کا رونا روئیں
غیروں کے ہاتھ ہم کو اپنوں نے بیچ ڈالا
احساس ہو زیاں کا اپنا ضمیر جاگے
اے کاش حاموں کا اپنی کریں ازالہ
ہم گائیں پھر ترانہ اقبالؔ مندیوں کا
اقبالؔ کے وطن کا پھر سے ہو بول بالا
وہ دن نثارؔ آئے جب فخر سے کہیں ہم
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

یوسف امتیاز۔ ٹورانٹو (کینیڈا)

قصہ سوٹ کا

ہر روز صبح اور شام میں کسی اہتمام کے بغیر اپنے کپڑے پہن کر تیار ہوجاتا ہوں، جن کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر دیر تک قمیص کے کالر کی نوک پلک درست کرنے کی توفیق ہوئی اور نہ سوٹ یا جیکٹ کے لیے ڈریس سے میل کھاتی ہوئی ٹائی کا انتخاب کرنے، ٹائی لگانے اور اس کی گرہ کو احتیاط سے درست کرنے کی کوشش کی۔ جوتوں کی باقاعدہ پالش تو دور کی بات ہے ہر روز برش یا کپڑے سے صاف کرنے کی کبھی زحمت نہ کی۔ چاہے اس کو کوئی نام دے۔ کاہلی، سستی، لاابالی پن۔ پتہ نہیں وہ لوگ کونسی دنیا کے ہیں جو ہر وقت گھر کے اندر اور باہر ڈریسنگ کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے پاؤں سے بھی ان کی نفاست اور ذوق کی چغلی کھاتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ جیب سے رومال یا کاغذی نیپکین NAPKIN نکال کر نہ صرف نشست صاف کرتے ہیں بلکہ بڑی نزاکت اور طرحداری کے ساتھ یہ کام کرتے ہیں ذرا سا دھبا بھی نہ ان کے کپڑوں پر آتا ہے اور نہ پتلون کی سیدھی لائن بھی ٹوٹنے پاتی ہے۔ کھاتے وقت ملحوظ احتیاط کے کیا کہنے کہ ہیمبرگر HAMBURGER اور ہاٹ ڈاگ HOT DOG کے سارے ذیلی لوازمات کا ایک چھینٹا بھی جسم پر نہیں گرتا۔ اٹالین کھانے کھاتے ہوئے مجال ہے جو اسپاگیٹی SPAGETTI سے ٹپکتا ہوا ٹماٹے کا رس ان کے پاک جسم پر گرنے کی جرأت بھی کرے۔ جتنی توجہ اور احتیاط کے ساتھ کھانا کھایا جاتا ہے اگر وہ یہی وقت کھانے کے ایماندارانہ ذائقہ سے لطف اندوز ہونے میں لگا دیتے تو شائد پکوان چکھنے FOOD TASTING کے ماہر ہوجاتے اور کئی بین الاقوامی مقابلوں میں یہ طور جج بلائے جاتے۔ پتہ نہیں خوش پوشی کے ضروری لوازمات ہیں یا تہذیب کا ایک حصہ مگر مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے والد کو کسی نے کبھی گھر سے باہر ستھرے کپڑے اور شیروانی کے بغیر نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ ہر روز صبح اور شام جب دوست احباب جمع ہوجاتے اور والد دیوان خانے میں بیٹھے حقے کے کش کا مزا لیتے ہوئے محفل کی صدارت کر رہے ہوتے تو شیروانی اور ٹوپی پہنے ہوتے۔ لوگوں نے کبھی جج صاحب کو نہ قمیص پاجامے میں گھر کے باہر دیکھا اور نہ تنگ موری کے پاجاموں کے علاوہ کسی اور وضع کو ترجیح دی۔ ٹھیٹ دلی والے جو ٹھہرے۔ اگر لوگ انہیں کسی اور وضع قطع میں دیکھ لیتے تو نہ جانے کتنی چہ مگوئیاں ہوتیں۔ والد اپنے بیٹے کے تغافل عارفانہ دیکھنے کے لیے حیات نہیں رہے اور نہ بیٹے کو ان کی ڈانٹ، یا کپڑے پہننے کے بارے میں نصیحت اور ہدایات

سُننے کا موقعہ مِلا۔

قدیم ہندوستان کی تہذیب میں نفیس شیروانی اور صاف ستھرے کپڑے عزت، آداب اور وقار کی نشانی تھے۔ کہتے ہیں کھانا اپنی پسند سے اور لباس دوسرے کی پسند سے۔ جتنی لاپرواہی اور بے رخی سے ڈریسنگ ہوگی اتنی ہی لاپرواہی سے آؤ بھگت ہوگی۔ اس کی پرواہ نہیں کہ اوپر شیروانی ہے اور اندر پریشانی۔ انسان کو پہچاننے کا ایک ذریعہ اس کا لباس بھی تو ہے۔ مغربی دنیا میں ڈی جے DJ کو چھوڑ کر اگر کسی نے کالا سوٹ پہن لیا تو لوگ سوچتے ہیں کہ نہ جانے کس کے آخری سفر میں دعا اور شرکت کی تیاری ہے۔ ویسے لندن کی اور بات ہے یہاں کے موسم کی وجہ سے لوگ اکثر کالا سوٹ پہنے نظر آتے ہیں۔ لوگ بڑی ہی سنجیدگی سے راست یا بالواسطہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کس غمگین محفل میں شرکت کی تیاری ہے۔ آپ بھی ذرا کالا سوٹ کالی ٹائی، ٹائی کلپ "TIE CLIP" بروچ (BROGUES)، سفید قمیض زیب تن کر کے کسی عام دن میں آزمائیں پھر دیکھیے کہ آپ کی کیا درگت بنتی ہے۔ روزانہ ہنسی مذاق کرنے والے کتنے لوگ مسکراہٹ سے گریز کرتے ہیں اور غمگین صورت بنائے آپ کے سامنے ہوتے ہیں۔

میں سوٹ صرف اس لیے پہنتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً ایک باوقار، معتبر اور باعزّت آدمی نظر آؤں۔ اس کا مجھے احساس ہی نہیں ہوتا کہ میرا سوٹ پہننا میری روزانہ کی زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ کر کچھ وقت کے لیے نئی کروٹ لے لیتا ہے۔ کتنے ہی لوگ مختلف ریمارکس کرنے سے نہیں چوکتے "کہاں کی تیاری ہے مہاشے"۔ "کس کے قتل کی تیاریاں ہیں"۔ "آج تو بہت اسمارٹ لگ رہے ہو"۔ یہ سوٹ یہ ٹائی یہ شرٹ چمکدار جوتے سب ہی کچھ بڑھیا ہیں اگر اس پر تھوڑا سا پرفیوم بھی لگا لیتے تو چار چاند لگ جاتے بعض لوگ آگے بڑھ کر نوک پلک درست کرنے لگتے ہیں۔ اور تو اور کام کے قریب والے گریسی اسپون GREASY SPOON کے رسٹورانٹ کا ویٹر WAITER بھی چونک جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی ہے۔ جیسے وہ آپ سے پوچھ رہا ہو کہ آج آپ ہاٹ ڈاگ HOT DOG یا ہمبرگر HAMBURGER اور سوپ آف دی ڈے SOUP OF THE DAY کے بجائے کیا مینو آلاکارت MENU ALA CARTE سے کچھ انتخاب کرنا پسند کریں گے۔ ساتھ کام کرنے والے، گھر کی مالکن یا دوست آپ سے بِلا جھجک یہ کہیں گے "آج تو تم ٹھیٹ بزنس مین بنے ہوئے ہو۔ یا کہیں ڈیٹ کی تیاری تو نہیں ہے"۔ آپ یکایک ہر روز کے درگزر کیے جانے والے ہمسائے اور فری لانس ادیب و شاعر نہیں رہتے۔

سوٹ زیب تن کرتے کے ساتھ ہی ایک با اعتماد فضا کا ماحول بن جاتا ہے اور انسان مختلف انداز میں چلنے لگتا ہے۔ ان ہی لمحوں میں اسپاگٹی SPAGETTI کھاتے ہوئے ٹماٹے کا رس ٹائی پر گر جاتا ہے اور واش روم WASH ROOM کا راستہ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کام کی جگہ پر ساتھ کام کرنے والے اس روز آپ کا روز مرّہ کا نام RUMPLED فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ میرا سوٹ ہی تو ہے جس نے میرے گلے میں سوپر ہیرو SUPER HERO کی تختی لٹکا دی ہے۔ اور یہ احساس تیزی کے ساتھ سارے جسم میں سرایت کر جاتا ہے کہ ایک سوٹ پہننے سے میری زندگی ایک نئے راستے پر نکل گئی ہے۔ لوگ بے تکلفاً نام لینے کی بجائے نام کے ساتھ مسٹر، جناب، صاحب، شری کے شوشے لگا کر بلانے لگے ہیں۔ اس خطاب سے نہ تو میری تنخواہ میں اضافہ ہوا نہ ترقی ملی اور نہ گھر کے

رہن سہن میں کوئی فرق آیا صرف گردن ذرا اکڑ گئی ۔ باہر سے جنٹلمین ضرور بن گیا مگر اندر سے چھا لوکا چھالو ہی رہا۔

اسی سوٹ نے مجھے اُٹھنے بیٹھنے اور سوٹ کی تہذیب سے بھی آشنا کروایا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُٹھتے وقت اکڑ کر اٹھو اور جیکٹ کے بٹن لگا لو اور جب بیٹھو تو بٹن کھول دو ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بیٹھتے وقت ہلکے سے پتلون کو اونچا کر لو۔ کسی چیز کو اٹھانے سے پہلے ٹائی کو ایک ہاتھ سے تھامے رہو۔ گرمیوں میں ہلکے وزن جیسے لینن کا سوٹ پہنو اور سردیوں میں اون کا ـــ اپنی آمدنی کا ایک خاصہ حصّہ ڈرائی کلیننگ کے لیے علاحدہ رکھ دو۔

اس نئے انداز آداب اور تہذیب نے مجھے آداب و اطوار کی نئی اُلجھنوں اور پگڈنڈیوں پر چھوڑ دیا ہے ۔ ہزار اچھا سوٹ سہی مگر بے موقعہ اور بے وقت پہننے سے عزّت بھی جاتی رہی اعتبار بھی گیا۔ کنا پھوسی اور ہنسی مذاق کا موضوع بھی بن گئے ۔ یہاں تک کہ بے موقعہ اور غلط ڈریسنگ کے ساتھ انٹرویو دینے گئے تو پتہ چلا کہ نوکری ہاتھ سے گئی۔ گو کہ وقت کی پابندی کی ۔ فٹافٹ صحیح جوابات بھی دیئے سبق ملا کہ اچھا سوٹ پہننے کی اتنی ہی آرزو ہے تو سوٹ پہن کر عرضی فیکس FAX کردیں مگر صحیح وقت پر صحیح لباس ضرور پہنیں ۔ سوٹ نے مجھے ایک نیا انسان بنایا ۔ نئی زندگی دی۔ نیا موڑ دیا ہے مگر میں وہ سوٹ نہیں چاہتا جو مجھے نیا جنم دے ۔ مجھے ایسے سوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں جو زندگی کی الجھنوں اور ذہنی کشمکش سے دو چار کرے ۔ یہ دباو میرے لیے بہت زیادہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی سوٹ میری روزانہ کی زندگی میں حائل ہے ۔ روزانہ کی ورزش ہو، بائی سیکل چلا رہے ہوں۔ پکوان کر رہے ہوں۔ فرصت کے چار دلوں میں یار کو ہمان کرتے ہوئے رومانس کے پرسکوں لمحات میں تو ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر دی جاتی ہے اور جیکٹ کو دُور پھینک دیا جاتا ہے۔۔ سیاست داں سب ہی سوٹ میں ملبوس رہتے ہیں۔ پیئر ٹروڈو PIERE TRUDEAU ایک بار سینڈل اور چمڑے کا جیکٹ پہنے ہوئے پارلیمنٹ پہنچ گئے تھے' ان کی اخبارات، ٹیلی ویژن اور ایوان میں اتنی لے دے ہوئی کہ انہیں وعدہ کرنا پڑا کہ وہ پھر کبھی اس لباس میں پارلیمنٹ میں نظر نہیں آئیں گے ۔۔ سوٹ کو صرف سوٹ کے ساتھ لٹکایا جاتا ہے۔ سوٹ کے دوسرے کپڑوں کے ساتھ کوئی مشترکہ تعلقات نہیں قائم کیئے جاسکتے۔ سیاست اور سوٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ سیاست داں عوام سے ہاتھ ملا رہے ہوں اور سارے کیمرے ان کے آگے ہوں تو سوٹ کی شان اور وقار کے کیا کہنے ۔ یہ سوٹ ہی تو ہے جو سیاست دالوں کو باوقار، معتبر بنا دیتا ہے ایک نیا یقین اور بھروسہ عطا کرتا ہے ۔ جتنا اچھا سوٹ ہوگا اتنے اعتماد کے ساتھ سیاست داں کا مصافحہ بھی۔

سوٹ پہننے پر مجھے تعریفی کلمات ملے ۔ خوب پذیرائی ہوئی ۔ مسکراہٹیں ملیں ۔ اعتماد وقار اور عزت ملی جو مجھے ایک دوراہے پر چھوڑ گئی ہے ۔ کیا واقعی میں اسمارٹ لگتا ہوں کیا واقعی سارے جتن میرے ہی لیے ہیں یا میرے سوٹ کے لیے۔ کیا واقعی شادی کے کیک پر آئسنگ ICING ہے یا پھر جیسے پیتل پر سونے کا ملمع ۔۔ دھوکہ ہے خوش نمائی ہے ۔ سراب ہے۔ کیا سوٹ کے سب غلام ہیں ۔ کیا لوگ کسی سیاست داں کو باکسر شارٹس اور رنگین ٹی شرٹ میں دیکھ کر ووٹ دیں گے میں نے ابھی تک اس راز کو نہ جانا ہے اور نہ پایا ہے۔ مجھے سوٹ کی طاقت جاننا ہے ۔ پہچاننا ہے ــ آخر یہ آؤ بھگت' استقبال، مُسکراہٹ، پھولوں کے گجرے، پھولوں کے ہار کس کے لیے ہیں ۔۔ کس کے لیے ؟ ▫▫

اشرف خوندمیری

اُٹھّا پَٹھّاں

گھنٹوں سے گھر کی ڈِڈّی پو انکھیاں چپکا کو رکھیوں ، کب سے تیری آس میں دِل کی بتّی سُلگا کو بیٹھیوں
رِکتّا ہوندا چِتّا پڑکو اپنے خابوں کی رِسل پو اُلفت کے کوٹلے سے اُٹھّے چُمّے کے چیرے کھیچوں
پیار کے دس بارہ پھینچے پلّو میں بن کو ملّاں
ارمانوں کے پیش میں آجا کھیلیں گے اُٹھّا چمّاں

رستہ تکتے تکتے تھک ہار کو انکھیاں بی سُج گیئں پیار کے جھٹکے پیاسے انتڑیاں حلق میں آکو تُج گیئں
چلتے چلتے رُک گیئں جب ٹھنڈی سانسوں کے بھرّاٹے بجلی چمکی فیوز اُڑیا، ہور رستے کے لیٹاں بُج گیئں
گھپ ہندیرے میں خوشیوں کی سلگا لے کو توشماں
ارمانوں کے پیش میں آجا کھیلیں گے اُٹھّا چمّاں

مُشکل سے اک جونک لگیئے اپنی قسمت کے پتھّر میں ایسے موقعے پو نکّو پڑ اِن کے اُن کے چکّر میں !
چُپ چُپ کے یُوں نکّو ڈر تو اب کس کا بی ڈر نیں ہے گھر خالی بھنڈار پڑلئے ہور تمیج اکیلا ہوں گھر میں
اَبّا بچّر کو ہور پھلتے کی دعوت میں گیئں امّاں
ارمانوں کے پیش میں آجا کھیلیں گے اُٹھّا چمّاں

ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے یُوں نکّو برسا برساں خالی پیلی کیکو تمنا، رونے بِلانے میں راتاں
مُسکا مُسکا گھانس چرا کو آس کی اُنچی گرِیوں سے پیار کے منٹّے سِلگا دِیوں میں سیک لے تو اپنے ہاتھاں
ٹھنکالے میں نکّو جا کیئں ہو جائینگا غم کا دماں
ارمانوں کے پیش میں آجا کھیلیں گے اُٹھّا چمّاں

میرے سچّے پیار کے موں پو مار کو نفرت کے تھپیڑے بُھل گئی کیتا کو آگے بیٹی تھی سو اُلفت کے دھپڑے
اب پچھتا دے کی منڈی کو دال کو اپنے گھٹنوں میں رہ رہ کو تُو سوچتی ہونگی کاں کی مصیبت میں پڑے
چھوڑ کو اپنے سارے گلابی لاڈوں کا یہ بتکماں
ارمانوں کے پیش میں آجا کھیلیں گے اُٹھّا چمّاں

کانے گورے چھوٹے بڑے سب آجائیں اک لیول میں بھُل کو بی اب نکّو پڑ تُو کِنتو میں ہور کیول میں
پیار کے دیوتا کے پاؤں پو آکو رکھ دے اپنے پھولاں بھید بھاؤ کچ بی نئیں ہے سب آسکیں اِس دیول میں
وڈّر، موچی، بھوئی، ہریجن، ریڈی، بومن ہور کماں
ارمانوں کے پیش میں آجا کھیلیں گے اُٹھّا چمّاں

فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

مُشَاعرہ یا.....؟

دورِ جدید کے کیا کہنے، پُرانی تہذیب کا دامن تار تار ہوگیا۔ پہلے مشاعرے کس طرح ہوتے تھے یہ بتانا ضروری نہیں لیکن اب مشاعرے کس طرح منعقد ہو رہے ہیں ہم اس سلسلے میں اپنے مشاہدے کو قارئین تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں۔

سب سے پہلے شہ نشین پر نظر ڈالیئے جہاں مشاعرہ کے مقررہ وقت کے کافی دیر بعد کچھ نفوس مائیک کے تاروں میں الجھے نظر آتے ہیں۔ کچھ دیر بعد سنسناہٹ جیسی آواز اور پھر ایک تیز تر سیٹی، جس سے کانوں کے پردے میں سوزش اور جسم میں ارتعاش محسوس ہوتا ہے اور پھر ایک دم خاموشی چھا جاتی ہے ـــــ جیسے تیسے شہ نشین پر کچھ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہونے لگتا ہے۔ کچھ منتظمین لڑکے تخت پر سے نیچے گرے ہوئے تکیوں کو مہمانوں کی "پیٹھ پیچھے" رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ وضعداریوں کی پاسدار کئی شیروانیاں شہ نشین پر جلوہ گر ہوتی جاتی ہیں۔ لمبی آستینوں والے کُرتے، پاجامے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مغربیت کے علمبردار پتلون اور ٹی شرٹ، یا سوٹ بھی نظر آتے ہیں لیجئے صاحب شہ نشین پر شاعر حضرات براجمان ہوگئے۔ انتظارِ صدرِ مشاعرہ کے لمحات طویل ہونے لگے تو بے ارادہ مشاعرہ گاہ میں گھس پڑنے والے "ماڈرن سامعین" نے سیٹیوں میں "بیت بازی" شروع کردی۔ ایک صاحب جن کا چہرہ لمبی زلفوں سے ڈھک گیا تھا زلفیں چہرے سے ہٹاتے ہوئے مائیک کے پاس آجاتے ہیں اور "شعر" کی طرح عرض کرتے ہیں معزز سامعین! (حالانکہ وہ سامعین اپنی حرکتوں سے قطعی معزز نہیں معلوم ہوتے) ابھی مشاعرہ کا آغاز ہونے والا ہے آپ سے گزارش کی جاتی ہے کہ توجہ فرمائیے..... پھر اعلان ہوتا ہے کہ صدرِ مشاعرہ تشریف لا چکے ہیں پھر اعلان ہوتا ہے کہ مہمانِ خصوصی کے طور پر آنے والے دو مہمان شاعر ایئر پورٹ پہنچ چکے ہیں اور اب ادھر آ ہی رہے ہیں۔ سامعین اس کا منظر کو نظر انداز کرتے ہوئے سرگوشیوں اور تبصروں میں مصروف ہو جاتے ہیں کوئی "ماڈرن فرہاد" ہنک اٹھتا ہے کہ انتہا ہوگئی انتظار کی.......
بہر حال معتمدِ مشاعرہ اپنی وضعداری کا اظہار کرتے ہوئے پان کی گلوری منہ میں رکھے خیر مقدمی تقریر (برائے نام مختصر) شروع کر دیتے ہیں۔ تقریر دس غزلوں اور پندرہ نظموں سے زیادہ طویل ہے اس دوران سامعین کے لیے فراہم کی گئیں کرسیاں بھر جاتی ہیں کئی کرسیوں کے پائے چھوٹے بڑے لگتے ہیں غیر مسطح زمین پر کرسیاں بے قاعدگی سے رکھدی جاتی ہیں بائیں طرف موٹی موٹی رسیوں سے احاطہ کی گئی جگہ میں کچھ خواتین بیٹھی نظر آتی ہیں۔ سامعین کی نظر شہ نشین پر کم اور اس گوشہ نیم تاریک پر

زیادہ مرکوز رہتی ہے۔ ہجوم بڑھتا جاتا ہے خواتین اور حضرات کی کثیر تعداد اور پھر شورِ مسلسل ..... اسی دوران کسی شاعر نے مشاعرہ کا آغاز اپنے کلام سے کر دیا ... لیکن داد ندارد .... لوگ بے زبان بنے بیٹھے رہے ... چند اور میزبان شعرا نے اپنا کلام سنایا اور داد وصول کئے بغیر ڈائس پر دوبارہ جا بیٹھے۔ ایک مہمان شاعر نے تان لگائی ... لیکے آیا ہوں .... واہ واہ .... واہ واہ .... اندھیرے میں چراغوں کا سماں لیکے آیا ہوں ... اسی دوران مشاعرہ گاہ کی بجلی چلی گئی واقعتاً اندھیرا چھا گیا ... چند منٹوں میں روشنی ہوگئی ایک اور شاعر کی ترنم ریزیاں محرومیوں میں ڈھلنے لگیں ... ؎ مقامِ شوق سے گزرے .... واہ واہ واہ .... پہلے مصرعہ کا آدھا ٹکڑا سامعین کی نذر ہوگیا واہ واہ کا شور ہی اتنا تھا آدھا مصرعہ مجبوراً شاعر کو نگلنا پڑا دوسرے مصرعہ کا آدھا ٹکڑا جو حلق میں پھنس رہا تھا بڑی مشکل سے نکل پایا ؎ تمہاری راہِ اُلفت میں .... واہ واہ واہ .... آدھا مصرعہ داد وصول کر رہا تھا شاعر کا یہ حال کہ شعر نہ اُگلے بنے نہ نگلے بنے .... عرق عرق پیشانی لئے مزید چند ٹکڑے سنا کر شاعر صاحب بیٹھ گئے۔ ایک اور مہمان شاعر نے اپنی شخصیت میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھر لی اور ساڑھے چھ فیٹ قد ایک سو دس کیلو وزن لئے مائیک پر آئے اور سامعین کو للکارنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا ؎

زمانہ تیرا تھا پہلے، ہمارا ہوگیا اب تو
ہمارے واسطے طوفان، کنارا ہوگیا اب تو

بند کرو بکواس! ہمارا ہے زمانہ تمہارا نہیں غیر شائستہ نوجوان بے قابو ہوگئے اور لگے پتھراؤ کرنے .... "نہیں" نوجوانوں کے نعرے .... تمہارا تھا نہیں پہلے .... مگر قد آور شخصیت نے میدان نہیں چھوڑا ؎ تمہارا تھا نہیں پہلے تمہارا ہوگیا اب تو۔ ... اس شاعرانہ توبہ پر سامعین کا شور کم ہوا، مہذب حضرات خجل سے نظر آئے ان کے شہر کی تہذیب سر بہ گریباں ..... اچانک خاموشی چھاگئی، کسی شاعر کی طبیعت خراب ہوگئی انہیں نشین سے ہٹا لیا گیا اور کسی غیر معمولی واقعہ کی اطلاع کے بغیر مشاعرہ "چالو" ہوگیا (چابی والے کھلونے کی طرح) کسی بزرگ شاعر کے لرزیدہ قدم مائیک کی طرف بڑھنے لگے سامعین کا احتجاج شروع ہوگیا، سیٹیوں پر سیٹیاں بجنے لگیں بے چارے کلام سنائے بغیر لوٹ گئے قیس کے ہمزاد شاعر نے اپنا کلام شروع کیا ؎ جنوں میں سیرِ گلستاں آگئے ہم ۔ اے صحرا نوردی کہاں آگئے ہم

کیوں آئے ہو؟ مجنوں کے نانا ... نوجوانوں کے نعرے بدتمیزی کی انتہا پر تھے پھر ایک نوجوان شاعر کو دعوتِ سخن دی گئی تاکہ ماحول بدلے ... اور ماحول بدل گیا ... ؎ نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے .... سماں بندھ گیا سامعین جھوم رہے تھے غزل ختم ہوئی نوجوان شاعر حکمراں سامعین کے آگے کورنش بجا لایا .... خواتین میں ہلچل ہوئی کچھ آوازیں سنائی دیں یہ تو غالب کی غزل ہے .... ہاں ہاں یہ چچا غالب کی غزل ہے یہ تو چوری ہے چوری ..... یہ تو ڈاکہ ہے سراسر ڈاکہ ... قریب سے ایک آواز آئی یہ مشاعرے کا خاکہ ہے خاکہ .... ▭▭

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ اپنی تخلیقات صفحہ کے ایک جانب صاف اور خوش خط لکھیں۔ اپنا پتہ بھی ضرور لکھیں۔

کوثر صدیقی (بھوپال)

عالمِ برزخ سے
مُلّا رموزی کا خط
دادا خیریت کے نام

چارا

دادا خیریت بھوپالی کی خدمت میں مُلّا رموزی سلام عرض کرتا ہے۔
کیا پوچھوں آپ کا حال کیوں کہ میں جانتا ہوں آپ کی چال، وہی بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہوگی۔ ویسے جہاں آپ
ہیں خطۂ ہندوستان، جسے شہنشاہ شاہجہاں نے کہا جنّت نشان، آج کل ہے حال سے بے حال۔ عالمِ برزخ میں
واردین سے وہاں کے حال سن کر ہوں پریشان اور انگشت بدندان۔ بتاتے ہیں جہاں زعفران مہکتی تھی اب بارود
مہکتی ہے۔ جہاں نینوں کے کٹار چلتے تھے وہاں ہاتھوں کے کٹار چلتے ہیں۔ گنگا جمنا کی تھی سہیلی، لوگوں نے دونوں کے
ساتھ ایسی کیچڑ کی ہولی کھیلی کہ دونوں ہوگئیں میلی۔ اب گنگا میں نہاؤ اور باہر نکل کر بدن کھجاؤ، پھر ڈاکٹر کے پاس جاؤ،
پیسے اُدھار لے کر علاج کراؤ۔ ہاں تو دادا خیریت، میں یہ سب سن کر ہوں سراپا محوِ حیرت۔ حیرانی بھی ہے اور پریشانی
بھی۔ چونکہ انگشت بدندان ہوں اس لیے زبان ہوتے ہوئے بھی بے زبان ہوں۔ کیونکہ سوائے صبر کے اب کوئی چارہ
نہیں۔ ویسے ہندوستان میں ہے ہر طرف چارا ہی چارا مگر کچھ چارہ گروں اور چارہ سازوں کو چھوڑ کر ہر ہندوستانی
ہے بے چارہ۔ پہلے ہندوستان کا تھا جتنا چارہ، اُسے حضرت عیسےٰ کے گدھوں نے ڈکارا۔ جب تک چارا تھا، چرچر
کے دُبلے تھے جب چارا ہوا ہضم تو کھیل بھی ہوا ختم۔ سب گدھے اور ان کے رشتہ دار، ایسے موٹے ہوگئے جیسے
زمیندار۔ جب اس چراگاہ میں کچھ بچا نہیں تو حضرت عیسےٰ نے کیا چراگاہ کو آزاد اور گوشالہ والوں کو کر دیا دان
اک نئے چرواہوں کا ہو ور دان۔ گوشالہ کے چرواہان بن گئے خود ہی مویشیان، ہر وقت کھانے میں سرگرم یہ
مویشیانِ سفید حرم۔ کھا گئے خود ہی مویشیوں کا سارا چارا۔ گوشالہ کے جو تھے مویشی اُن غریبوں پہ کون جانے
کیا بیتی۔ موت کا ایک دن معین ہے اور مرنے کو چاہیے بہانہ بھی۔ کیا فرق پڑتا ہے زیادہ کھا کے پیٹ پھٹنے
سے مریئے یا بھوک سے "نیند کیوں نہیں آتی" شبِ زندگی کی سحر ہونے سے پہلے ہی اندھیرے میں چپ چاپ
عالمِ برزخ کے سفر کے لیے دوسروں کے کاندھے پر سفر شروع کر دیجیے۔
اب اس چراگاہ میں دُور دُور تک نہیں چارا اگر زندہ رہنے کے لیے (زندہ ہے ووٹر بیچارہ۔ اس لیے نیاہ

مانگتا ہوں میں اُن قائدانِ ملکِ عظیم سے اور چارہ خوارانِ چراگاہِ قدیم سے جو بیچتے بیچتے تیل، قدرت کا دیکھو کھیل، بن گئے چارہ خوار سے چارہ ساز۔ ہمارے زمانے میں بھی ہوا کرتے تھے مہربان باغبان جو دکھاتے تھے سبز باغ اور قبرستان، مگر آج کے قائدان دکھاتے ہیں ریگستان، جہاں باغ کا تو اتا پتہ نہیں لیکن تاحد نظر پھیلا ہے چٹیل میدان، مولانا اسمٰعیل نے کہا ہے جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا۔ وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا۔ یہ مولانا کے زمانے کی بات ہے۔ آج کے دور میں تو جہاں کل چٹیل میدان تھا وہاں آج بھی چٹیل میدان ہے اور بہ منشائے قائدین کرام کل بھی رہے گا۔ نہ یہاں جانور پھدکیں گے نہ مٹی کے پر نکلیں گے۔ ہاں تو مہربان گوشالہ کے یہ چارہ سازان کرام دکھانے ہیں اس ریگستان اور چٹیل میدان میں ایسی لہلہاتی ہری گھاس کہ صرف مویشیوں کے ہی منہ میں پانی نہیں آتا بلکہ شیر کو بھی ہے گھاس کھانے کے لیے للچاتا۔ اس ریگستانِ سراب نشان کی ایسی ہے گھاس، جسے کھانے کی نہیں ضرورت کیوں کہ بنا کھائے ہی مٹ جاتی ہے بھوک اور پیاس ۔۔ اے میرے مویشیان! دیکھو گھاس ابھی موجود نہیں ہے تو کیا ہرا گھاس کا تصور کتنا حسین اور دلفریب ہے۔ ریگستان ہے تو کیا اور لق و دق بیابان ہے تو کیا۔ گھاس اُگے گی ضرور اُگے گی۔ ہمیں گھاس اُگانے کی تکنیک معلوم ہے۔ ہماری تکنیک کارگر نہ ہوگی تو ہم اسرائیل سے سمجھوتہ کر کے جدید ترین تکنیک امپورٹ کریں گے اور گھاس کے ساتھ کھجور بھی پیدا کریں گے۔ آسمان سے نقلی بارش ہوگی۔ ہیلی کوپٹر سے تخم ریزی کی جائے گی۔ جب فرہادِ نامراد جیسا عاشقِ زارِ تنہا پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لا سکتا ہے تو کیا ہم ریگستاں کی کوکھ سے پانی کے چشمے نہیں نکال سکتے ہیں۔ ضرور نکال سکتے ہیں، یہ سب ہو سکتا ہے، یہ سب ہوتا ہے یہ سب ہوگا۔ اب آپ کہیں گے کہ ہم چارا اُگانے کے ہی پیچھے کیوں ہاتھ دھوکے پڑے ہیں۔ تو سنئے مہربان قدر دان میں گنواتا ہوں آپ کو گھاس کے فائدے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے گدھوں گھوڑوں اور دوسرے مویشیوں کی صحت کے راز پر۔ انسان اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہے مگر وہ جانوروں جیسی صحت اور قوت حاصل نہیں کر پاتا ہے۔ اچھے سے اچھا پہلوان اور کڑیل جوان معمولی گدھے کی دولتی کھا کے چاروں خانے چت گر جاتا ہے۔ اس صحت کا راز جس پر ہے مویشیوں کو ناز، وہ ہے گھاس صرف گھاس۔ سب مویشی کھاتے ہیں دن بھر گھاس جو ہے وٹامنوں سے بھرپور اور پروٹین کا خزانہ۔ ہاضمہ درست رکھتا ہے۔ بدہضمی دور کرتا ہے۔ دن بھر کھائیے، بھوک بڑھائیے۔ تھوڑی سی جگالی کیجئے سب ہضم۔ عطا کرتا ہے تندرستی ختم کرتا ہے تنگدستی۔ کیوں کہ یہ ملتا ہے مفت کے بھاؤ۔۔ چاہے کماؤ چاہے مت کماؤ۔ تھوڑا سا اِدھر اُدھر جا کر منہ مار آؤ۔ نہ مہمان کی فکر نہ خاندان کی چنتا۔ چمگادڑ کے مہمان بھی جس طرح میزبان کے گھر اُلٹے لٹک جاتے ہیں اُسی طرح آپ بھی مہمانوں کو اپنے ساتھ چراؤ۔۔ بھائیو گھاس ہی وہ واحد چیز ہے جو کرتا ہے کمر کو مضبوط اور چمڑی کو موٹا تاکہ رہے اُن پر سوار روز کوئی گھڑ سوار۔ اور کھا کے سوار کے چابک کی مار اور گالیاں۔ نہ چمڑی خراب ہو نہ منہ کا ذائقہ۔ گھاس ہی وہ واحد چیز ہے جسے مویشی عمر بھر کھاتا ہے مگر جی نہیں گھبراتا ہے۔ اور ہل من مزید کی رٹ لگاتا ہے۔ گھاس کے فائدے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اِس کے پیدا کرنے میں نہ صرف ملک بلکہ عالمی غذائی مسئلہ کا حل پوشیدہ ہے۔ گھاس ہی ایسی چیز ہے جس کے پکنے، کھلیان کرنے، چکی میں پیسنے سے لے کر روٹی بنانے اور حلق کے نیچے اتارنے کے لیے نہ سالن کی ضرورت نہ انتظار اور صبر کی۔ گھاس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اُگتے ہی اُسے کھایا جا سکتا ہے۔ ہم ماہ تک فصل کی نگرانی اور اس کے پکنے کے صبر آزما مراحل سے نہیں گزرنا

پڑتا۔ آندھی، پانی طوفان سے نقصان نہیں ہوتا ۔ سیدھا چراگاہ میں بھی کھایا جاسکتا ہے۔ اور وہیں گنجی میں رکھ کر بھی کھایا کھلایا جاسکتا ہے۔ نہ رکھنے کے لیے گودام کی ضرورت نہ پینے کے لیے رمضان میں چکی کی مشقت نہ پکانے کھانے کیلئے برتن کی حاجت۔ ہاں تو مہربان قدردان گھاس کے فائدے) فوائد ہیں۔ اگر ہمارے جدامجد جنت میں صرف گھاس ہی چرتے رہتے تو یہ بُرے دن دُنیا میں آکر کیوں دیکھنا پڑتے۔ نہ رمضان کے روزوں کی مصیبت ہوتی نہ چکی کی مشقت۔ نہ گناہ نہ ثواب۔ نہ قبر ہوتی نہ قبر کا عذاب۔ نہ روزِ محشر کا حساب۔ نہ مرحومین کے پسماندگان کو سودی قرض لے کر پلاؤ اور فاتحہ کا کرنا پڑتا انتظام۔ اب دیکھئے چارے کے فوائد اور کیجئے فیصلہ۔ دیجئے گھاس کے حق میں اپنا ووٹ۔ چارے کی اِس اِسکیم پر خرچ ہوں گے قریب ایک ہزار کروڑ جس کی کی جائے گی جوڑ توڑ ۔ کچھ پیسہ آپ لگائیں گے کچھ ورلڈ بنک سے لائیں گے لیکن پروجیکٹ چلائیں گے۔ دیس سے بھکمری مٹائیں گے۔ مت ڈریئے چارہ گھوٹالے سے وہ تو ہوتے آئے ہیں ہوتے جائیں گے۔ گھوٹالوں سے ڈر جائینگے تو پروجیکٹ کیسے چل پائیں گے۔ اِس لیے مہربان قدردان مت ڈریئے چارے سے۔ غور کیجئے اُس کے فوائد پر بدل دیجئے اطوارِ خورد و نوش ... تجربہ کیجئے۔ ہمیں دیکھئے ہم برسوں سے چارہ خوری کر رہے ہیں۔ اب کسی کو اعتراض ہے تو ہوا کرے، پیٹ تو بھر رہے ہیں۔ ▭●

سید ضمیر جعفری

(رپورتاژ)

شکاگو میں حیدرآباد (دکن)

تقریب کے قرینے سلیقے، چاؤ سبھاؤ، رکھ رکھاؤ بلکہ سامعین کے چہروں تک سے یوں لگا جیسے ہم شکاگو (امریکہ) میں نہیں بلکہ حیدرآباد دکن میں عثمان ساگر کی سمت میں واقع کسی "سماعت خانے" میں آ بیٹھے ہوں جو سانولے سلونے سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ آس پاس کے ماحول میں بھی "معظم جاہی مارکٹ" والی گھما گھمی تھی۔ یہ تاثر کچھ غلط نہ تھا کہ اس تقریب کا اہتمام انجمن زندہ دلان حیدرآباد نے کیا تھا جس نے اپنے آپ کو مزاحیہ و طنزیہ ادب کی ترویج کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور جس کی سرگرمیوں کا دائرہ اب دنیا بھر میں وہاں وہاں تک پھیل چکا ہے جہاں جہاں اردو بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے حوالے سے شکاگو میں محترمہ غوثیہ سلطانہ اس تقریب کی "فرسٹ لیڈی" یعنی روح رواں تھیں۔ اور خود یہ تقریب حیدرآباد ہی کے ایک معروف دانشور اور شاعر جناب ڈاکٹر سلیمان جلیل کے نام سے منسوب تھی۔ جو شکاگو میں مقیم ہیں اور ایک عرصہ سے علیل ہیں تقریب کا مقصود اُن کی خدمات جلیلہ کی پذیرائی بھی تھا اور ان کی اعانت بھی۔ جو یقیناً ایک خوش آئند اور صحت مند اقدام تھا۔ بلکہ غالباً ایک نئی روایت کا آغاز۔

نیویارک میں ہمیں اس تقریب کی دعوت چند روز قبل جدید لہجے کی بانکی غزل کہنے والے "سدا نوجوان" شاعر اور نیویارک کی ادبی مہمات کے "خانِ خاناں" رئیس وارثی کی معرفت مل چکی تھی۔ تو ہم فوراً چلنے پر تیار ہو گئے۔ حالانکہ آپریشن کے بعد ہماری ایک ٹانگ تقریباً ہاتھی کے دکھانے والے دانتوں کی طرح ہے۔ ایک تو یہ ایک کارِ خیر کا بلاوا تھا۔ دوسرے شکاگو کئی حوالوں سے ہمارے دل کے بہت قریب بھی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے مزدوروں نے اپنے خون سے تاریخ کا ایک نیا باب لکھا (بلکہ کھولا)۔ یہ جناب عبداللہ نمازی، ڈاکٹر معظم الدین فاروقی، محترمہ رضیہ فصیح احمد، جناب ریاض الدین عطش کا شہر ہے جن کے علم و فضل اور علمی و ادبی تخلیقات کی میرے دل میں بڑی قدر ہے اور میں ان سے ملنے کا ہمیشہ مشتاق رہتا ہوں۔ میرے پیارے دوست (پاکستان کے مقبول شاعر، نڈر صحافی اور تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن اور روزنامہ "عوام" فیصل آباد کے بانی) خلیق قریشی مرحوم کا بیٹا (طرحدار شاعر) افتی اور بیٹی نسرین اعجاز بھی وہیں ہوتے ہیں اور اب تو اردو کے عہد ساز ادبی رسالے "ادب لطیف" لاہور کی مدیرہ اور بین الاقوامی شہرت کے مصور اور پنجاب کے سابق

گورنر حنیف رامے کی بہن محترمہ صدیقہ بیگم (انھیں "بارے ادب" کہنا چاہیئے) وہیں جابسی ہیں اور خود میری ایک بھتیجی عزیزہ عابدہ سید بھی اسی شہر میں ہے، جناب عبداللہ غازی کی شخصیت بالخصوص روشنی کا ایک مینار ہے۔ ان کے والد گرامی مرحوم کے اخبار "مدینہ" بجنور نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری میں جو حصہ لیا ہے اس کو برصغیر ہند کی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ نواب بہادر یار جنگ کے بعد ان کے سے ادبی خوبیوں سے مالامال مربوط و مدلل اور دلوں میں اتر جانے والی زبان بولنے والے خطیب آج کم کم نظر آئیں گے۔ یہ شخص بظاہر "کھدر" معلوم ہوتا ہے بولتا ہے تو "ریشم" بولتا ہے۔ رئیس وارثی کے پیغام کے دو ایک روز بعد خود محترمہ غوثیہ سلطانہ کی کال بھی آگئی ہمارا یہ محترمہ سے پہلا مکالمہ تھا ان کی آواز میں ذہنی کرب کا تاثر تھا۔ پاکستان کی نامور "ناولسٹ" ممتاز سیاست دان اور شعلہ نوا خطیبہ "بلبلِ پاکستان" محترمہ بشریٰ رحمٰن کی آواز میں گونجتا ہے۔ نیویارک سے شکاگو تک کا "ہوائی سفر" رئیس وارثی اور صفوت علی صفوت کی ہمسفری میں چٹکیوں میں اڑ گیا۔ لاہور کے رہنے والے صفوت علی صفوت ممتاز سائنس داں ہیں۔ ایک عرصہ تک سائنسی کارگاہ NASA میں ان کا ہاتھ چاند ستاروں کی نبض پر رہا۔ اب کچھ عرصہ سے شاعری کے چاند ستاروں سے کھیل رہے ہیں اور ماشاءاللہ خوب کھیل رہے ہیں۔ لیبارٹری میں ہوتے ہیں تو شاعر معلوم نہیں ہوتے اور شاعری کرتے ہیں تو "سائنس دان" معلوم نہیں ہوتے۔ شکاگو ایرپورٹ پر اترے تو سرور جاوید مل گئے اور اس سدا مسکراتے ہوئے شخص سے مل کر سرور کی لہر دوچند ہوگئی۔ ان کی پرواز نیویارک سے یہی کوئی دس منٹ پہلے شکاگو میں اتری تھی۔ ایک نہ ایک طیارہ ہر منٹ میں اس طیران گاہ پر اترتا چڑھتا ہے۔ میدان میں کھڑے طیاروں کی کثرت سے یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے ہاں "مویشیوں کی منڈی" لگ رہی ہو۔

سماعت گاہ (بیس ڈالر ٹکٹ کے باوجود) سامعین سے اٹا اٹ بھری ہوئی تھی۔ سامعین کو مشاعرہ کے علاوہ کھانا بھی کھلایا گیا۔ جو سادگی میں میر عثمان علیخان تھا اور لذت میں پرنس معظم جاہ۔ سامعین کا ادبی ذوق کہ اتنے لذیذ کھانے کے باوجود مشاعرہ بپا ہوگیا۔

تقریب دو حصوں میں منقسم تھی۔ پہلی نشست نثری تھی دوسری شعری۔ پہلی نشست کی صدارت جناب عبداللہ غازی نے فرمائی۔ جب کہ مشاعرہ کے صدر جناب عزت حسین تھے۔ اور مہمان خصوصی کا اعزاز ازراہِ مسافر نوازی اس فقیر کو دیا گیا۔ پہلی نشست کی ابتداء چند پیغامات سے کی گئی جو بھارت سے چند اکابرین نے ارسال کئے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اکابرین میں کوئی وزیر یا گورنر وغیرہ نہیں تھا۔ بلکہ سبھی اپنے "قلم قبیلے" کے سرکردگان تھے۔ مثلاً جناب مجتبیٰ حسین، جو بھارت میں اردو مزاح نگاری کے "لال قلعے" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ — جناب زاہد علیخان جو اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے اہم ترین اخبار روزنامہ "سیاست" کے مدیر ہیں اور ایک جلیل القدر ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ اور جریدہ "شگوفہ" کے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال اور جناب حمایت اللہ۔ روزنامہ "سیاست" (دکن) کے حوالے سے ہمیں سید حبیب کا روزنامہ 'سیاست' یاد آگیا جو لاہور سے نکلتا تھا اور اسی صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں اس وقت کے شمالی ہندوستان میں مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ "زمیندار" کے بعد سب سے بڑا اخبار تھا۔

پہلی نشست میں، جو مشاعرے سے زیادہ طویل رہی کہ ادب میں یہ نثر کا جمہوری حق تھا۔ اظہار خیال

کرنے والوں میں صدر محفل کے علاوہ ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی، جناب ریاض الدین عطش، ڈاکٹر یوسف اعظمی ڈاکٹر خورشید خضر، حامد امروہی، محمد ثانی، نیساں صدیقی، عبدالوحید فخری شامل تھے۔ ڈاکٹر فاروقی کا مقالہ (حسب توقع) ایک بلیغ و لطیف ادبی دستاویز تھا۔ جناب ریاض الدین عطش اب ماشاءاللہ اُس مقام پر ہیں جہاں منہ سے جو لفظ نکلے فلسفہ بن جائے۔ اب تو وہ دیکھنے میں بھی کچھ کچھ ابوریحان البیرونی سے جا ملے ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان جلیل کے لنگوٹیے دوست اور محلے دار جناب واجد ندیم نے بچپن کی یادداشتوں پر مشتمل ایک ایسا دل نشین مرقع پیش کیا حیدرآباد (دکن) کی وہ زندگی آنکھوں کے سامنے آگئی جو اب اس کی گلی کوچوں میں شاید لوٹ کر نہ آئے۔ ان تاثرات کی روشنی میں جب ہم پر جناب ڈاکٹر سلیمان جلیل کی شخصیت کے چند پہلو روشن ہوئے تو اندازہ ہوا کہ لوگ ان کو "قرض" نہیں دے رہے تھے، بلکہ ڈاکٹر صاحب لوگوں سے اپنا "قرض" واپس لے رہے تھے۔ ساری تقریب کی مؤثر ترین دستک دلوں پر اُس وقت وارد ہوئی جب ڈاکٹر سلیمان جلیل صاحب کی والدہ مکرمہ محترمہ صغریٰ بیگم صاحبہ اور بیگم محترمہ فرحت جلیل صاحبہ کی خدمت میں خوبصورت اور قیمتی "شالوں" کی سوغات پیش کی گئی! یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تقریب کو، مشاعرے سمیت، جناب عبداللہ غازی کی نثر نے لوٹا۔ مسلمانوں کی لغت میں "فاتحین" کو غازی ہی تو کہا جاتا ہے۔

مناسب ہوگا کہ "فاتحین" کی صف میں محترمہ غوثیہ سلطانہ کا ذکر بھی یہیں ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس تقریب کی کامیابی کا "سہرا" کئی مرد رفقائے کار کے سر اور کامیابی کا "کنگن" کئی خاتون سہیلیوں کی کلائی پر باندھا جاسکتا تھا، مثلاً (مشتے از خروارے) نیساں صدیقی۔ وغیرہ مگر جس طرح نپولین کی عسکری فتوحات میں مرکزی شخصیت نپولین ہی کی ہوتی تھی، اسی طرح اس "معرکے" میں بھی "فیصلہ کن" کردار غوثیہ سلطانہ ہی نے ادا کیا۔ جن کو اس تقریب کی "خاتونِ اوّل" کہنا چاہیے۔ انتظامی دروبست کی ایک ایک مشق پر ان کی نگاہ اُسی طرح مرکوز تھی جس طرح باورچی خانے میں چولہے پر چڑھی ہانڈی پر۔۔۔ بندوبستی صلاحیتوں کے علاوہ ان کی نظامت میں خطابت کی ادیبانہ شان بھی حیرت انگیز تھی۔ بحرانات کے درمیان بھی اس بی بی کا لہجہ بشاش اور پر اعتماد رہا۔ ورنہ بعض مواقع پر تقریب بالخصوص مشاعرہ "آکسیجن ٹینٹ" میں بھی DAND کرسکتا تھا۔

ایک علیل شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے "مزاحیہ مشاعرے" کا انعقاد تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ مقصود زندگی اور زندہ دلی کی نفسیاتی فضا کو برقرار رکھنا تھا۔۔۔ مگر صرف "امریکہ کے سہارے" پر امریکہ میں اردو کا مزاحیہ و طنزیہ مشاعرہ کا انعقاد خاصہ مشکل مرحلہ ہے۔ کیوں کہ امریکہ کے ایسے اردو شعراء کی تعداد کو اگر ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جائے تو (میرے اندازے کے مطابق) ایک، دو انگلیاں فارغ رہ جائیں۔ پھر اسی مشاعرے میں شاید مزاح کی بھرپور نمائندگی ممکن نہ رہی ہو کہ بے چاری غوثیہ سلطانہ ؎

زمانے بھر کو ہنسانے کہاں سے لاتی

تاہم "کمک" پر آئے ہوئے اچھے شعراء نے یہ بات بھی ثابت کردی کہ "اچھا شاعر" کسی صنف میں بند نہیں ہوتا۔ مشاعرے کی یہ نشست، پاکستان کے نوجوان مزاح گو شاعر خالد عرفان کے ہاتھ رہی، جن کے کراچی سے نیویارک میں منتقل ہونے سے، امریکہ میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی نہایت خوش گوار لہر دوڑ گئی ہے۔ ورنہ یہاں

اکیلے (میرٹھ لینڈ کے) "بابائے ظرافت" جناب، مظفر رضوی ہی اوڑھنے بچھانے کے لیے تھے۔

ہمارے لیے ذاتی طور پر نازک ترین مرحلہ وہ تھا جب غوثیہ سلطانہ نے ہمارے تواردں کے سبب مسزرین اعجاز کو آواز دی۔ وہ اٹھی تو ہمارا دل اس اندیشے سے بیٹھ گیا کہ مسزرین بیٹی اگر ہماری بات کرنے کرتے اپنے باپ کے گلے سے جالپٹی تو خود بھی روئے گی اور ہمیں بھی رُلائے گی۔ دو چار کلمات کے بعد وہ اسی "کلائمکس" کی طرف بڑھ رہی تھی مگر پھر آنسو چھلکنے سے پہلے "سنگدل باپ" کی یہ "بہادر بیٹی" اپنے کاغذات سمیٹ کر "ڈائس" سے اُتر آئی۔

تین بجے رات (بلکہ صبح) جب محفل اختتام کو پہنچی تو لوگوں کے چہروں سے صاف عیاں تھا کہ سامعین نے ایک خوش گوار شام گزاری تھی۔ اور آخر میں (ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے) تابش خانزادہ کے دو شعر سن لیجیے۔

یار کے کان میں جو بالی ہے
یہ "کریڈٹ" پہ لے کے ڈالی ہے
ایک ہی ہاتھ سے یہ بجتی ہے
"کمال" میرا ہے اُن کی تالی ہے

ہم تو خانزادہ کو "اردو لنک" کے ایک چمکدار کالم نگار ہی کی حیثیت سے جانتے تھے وہ تو شعر بھی بہت تابدار کہتے ہیں!! □□

مہمان مدیر: سکندر علی خاں

انگریزی: یس پی نائیڈو
ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی خاں
(حیدرآباد)

کوڈی کنال

پہلے اور اب

مجھے ہر دم حالتِ سفر میں رہنا پسند تھا...... جب میں جوان تھا...... اب تو کمر کا درد اور پرانی کھانسی کے مرض نے زیادہ تر گھر کا ہی بنا دیا ہے۔ ان سارے پہاڑی مقامات میں جہاں میں اکثر موسم سرما گزارا کرتا تھا کوڈی کنال کی حیثیت میرے ہاں باغ جنت کی سی ہے۔ پہلی مرتبہ میں وہاں ۱۹۷۱ء میں گیا تھا۔ اب پچپن سال کی عمر میں میری شریمتی جی نے وہاں جانے کا پھر پروگرام بنایا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ نظروں کے سامنے وہی ہری بھری پہاڑیاں اور ان کے نشیب میں سرخ چھتوں والے خوب صورت بنگلے گھومنے لگے۔ اور سب سے بڑھ کر وہاں کے تالاب میں کشتی رانی اور جھیلوں میں پیمائی سے لطف اندوز ہونا یاد آتا رہا۔ ہم اس بار اتنے خوش تھے کہ ہوائی جہاز سے وہاں جانے کی ٹھان لی اور جب [ہوائی] اڈہ پر اترے تو بجائے عام بس کے ہم نے ٹیکسی کرایہ پر لے لی۔

جب ہم ریل اسٹیشن کے چوراہے پر پہنچے تو لوگوں کی بھیڑ بھاڑ، سواریوں کی کثرت، موٹروں کے ہارن اور دکانوں، ہوٹلوں سے نکلی ہوئی بے ہنگم آوازوں نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آیا ہم ناگپور کے "سیتا بلدی" SITABULDI بازار یا بمبئی کے کرافورڈ مارکٹ تو نہیں پہنچ گئے ہیں۔ ماضی کا سکون اور مسرت انگیز خاموشی کا حسن اب نام کو نہیں تھا۔ بعد میں مجھے جب معلوم ہوا کہ ہر سال یہاں سیلانیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ چکی ہے تو پتہ نہیں مجھے خوشی ہوئی کہ افسوس۔

چونکہ ہم وہاں ایک دن پہلے پہنچ چکے تھے اس لیے اس ہوٹل میں ہم مقیم نہیں ہو سکے جہاں ہم نے کمرہ محفوظ کروایا تھا۔ قریب ہی دوسری چھوٹی ہوٹل میں جگہ ملی اور ہم نے رات وہیں بتانے کی ٹھان لی —— صبح تڑکے ہی ہمیں جگا دیا گیا اور کمرہ خالی کرنے کی ہدایت ملی۔ چونکہ یو پی کی ایک ٹولی جس نے یہ کمرہ اور قریبی

ہمارے محفوظ کرائے تھے۔ آنکھ کھلی تھی۔ جب کھڑکی سے جھانکا تو ایک ٹورسٹ کھڑی تھی۔ اور لوگ بس سے اتر رہے تھے۔ اپنے اپنے بیگ تھیلے پکوان کا سامان، گیس اسٹو اور راشن سے بھرے تھیلے لیے ہوئے۔ کچھ ہی دیر میں ساری ہوٹل یو۔پی کی ہندی زبان سے گونجنے لگی اور ان لوگوں نے دری بچھالی اور میرے کمرے کے سامنے براجمان ہوگئے۔ مجبوراً جلد ہی ہمیں ان کے لیے جگہ بنانی پڑی۔ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے لباسِ شب خوابی ہی میں ہم کمرے سے باہر نکل پڑے۔

اپنی ہوٹل میں آنے کے بعد ہم نے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور گھومنے نکل پڑے۔ سب سے پہلے ہم نے اس تالاب تک جانے کی ٹھانی جہاں کشتی رانی ہوتی ہے۔ اس تالاب کے اطراف ماضی میں ہم نے کئی سنہرے دن اور سرمئی شامیں گزاری تھیں۔ وہ سب پرانی یادیں تازہ ہونے لگیں اور وہ چٹکلے بھی یاد آئے جو ہم دونوں سے اس جوانی میں سرزد ہوئے تھے مگر افسوس اس یادگار جگہ میں وہ سب گندی نالیاں بھی دیکھنی پڑیں جو اس پہاڑی مقام کے مکانات اور ہوٹلوں سے آتی ہوئی اس تالاب میں گرتی ہیں اور اس کے تقدس کو پامال کردیتی ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ اس جمِ غفیر کے سروں اور ٹانگوں نے اس تالاب کے نیلگوں پانی کی آبروریزی کو دیکھنے کا ہمیں موقع فراہم نہیں کیا۔

اس حوصلہ شکن حادثہ کے باوجود ہم نے کشتی رانی کی ٹھانی۔ دھکے کھاتے، دھکے لگاتے جیسے ہم بمبئی کے کسی گنجان علاقے سے گزر رہے ہوں۔ بالآخر ٹکٹ گھر تک پہنچ گئے۔ کیو میں گھنٹہ بھر ٹھیرنا اور دیگر اذیت ناکیوں سے گزرنا، ہمیں وہ دن یاد دلایا جب ہم "ہم آپ کے ہیں کون" دیکھنے سینما گھر گئے تھے۔ ادھر ہم کھڑے کھڑے بور ہو رہے تھے۔ تو ادھر نوجوانوں کے ہاتھ ٹکٹ گھر کی کھڑکی میں بزورِ طاقت اور دھکم پیل پہنچ رہے تھے اور وہ ہم سے پہلے ہی فارغ ہو رہے تھے ـــــ خیر ـــــ کشتی میں سوار ہوئے تو ہماری نگاہیں اوپر ہی اٹھی رہیں۔ اور وہی مخملی سبزے سے ڈھکی پہاڑیاں، ان کی گود میں ننھے ننھے گھروندے اور ان کی سرخ چھتیں ہمیں سکھ و شانتی کا درس دیتی ہیں۔ مگر ہم میں ہمت نہیں ہوئی کہ تالاب کے اس پانی میں جھانکیں جو کبھی بلوریں ہوا کرتا تھا۔ اور اب ہم سیلانیوں اور وہاں کے باسیوں کے جسموں سے، ان کے کچن اور باتھ روم سے نکلی ہوئی گندگی کو یوں سمیٹ لیتا ہے جیسے محبت کی ماری ماں اپنے صاف ستھرے کپڑوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے ڈھائی سالہ بچے کو اپنے آغوش میں بھینچ لیتی ہے جو کسی غلیظ گڑھے میں گر کر اس کی کیچڑ میں لت پت ہوا روتا ہوا آتا ہے ـــ

بعد میں ہم BYKAATS PARK دیکھنے گئے جہاں کی نرم گھانس پر ہم گھنٹوں لیٹا کرتے تھے۔ پارک تو ویسا ہی حسین اور خوب صورت تھا۔ وہی خوش رنگ پھولوں کی کیاریاں، ہری بھری گھانس کے چھوٹے چھوٹے قطعے بلکہ اب تو اس میں نئی بدیشی قسم کی پھول پتیاں اور چھوٹے سے پودوں کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا مگر ـــ مگر سیلانیوں کی تعداد اس باغ کے سارے پھولوں کی تعداد سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کئی دفعہ میں نے اپنی بیوی کی تصویر لینی چاہی مگر کوئی نہ کوئی سیلانی درمیان میں آجاتا۔

دوسرے دن بھاگے بھاگے ہم SILVER CASCADE پہونچے جہاں کا چھوٹا سا آبشار ہماری یادداشت میں کھلے گلاب کی طرح تر و تازہ تھا اس کے نیچے ہم لوگ کبھی نہایا کرتے تو کبھی اس کی پھوار سے نکلتی ہوئی بوندوں کی لڑیوں سے اپنے لباس و جسم کو خشک کر لیتے مگر اب تو یہاں نہانے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ پہلا اپنا نہانا تو کجا اس کی ٹھنڈی پھوار بھی ہم تک نہ پہونچ سکی بے نیل و مرام ہم ہوٹل واپس ہو گئے۔

صبح ہوئی تو چائے کے ساتھ تازہ اخبار بھی ہاتھ آیا۔ جب اس کی ایک سرخی پر نظریں پڑیں تو سر چکرا گیا۔ لکھا تھا۔

"ہم ٹورسٹ صاحبان کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ وہ اب کبھی SILVER CASCADE کے آبشار کے پانی سے غسل نہ کریں کیونکہ ہل اسٹیشن کی سب سے بڑی گندے پانی کی موری اس آبشار کے منبع سے آن ملی ہے"

●●

غزلیں

محبوب مانجھومی
(بلاسپور)

دل کا ہوں میں مریض ڈرایا نہ کیجئے
بیک آپ بغیر خوابوں میں آیا نہ کیجئے

کیجے بجٹ کو پیش ہر اک سال شوق سے
گھاٹا ہر ایک مد میں دکھایا نہ کیجئے

حامی اگر ہیں آپ نشہ بندی کے تو پھر
یوں محفلوں میں جام اُڑایا نہ کیجئے

بچوں کو اپنے دیجئے تعلیم مغربی
"اُردو زبان" صرف پڑھایا نہ کیجئے

چوری مری بیاض سے کیجے غزل مگر
میری غزل مجھی کو سنایا نہ کیجئے

اِن لیڈرانِ قوم کی سُن لیجئے، مگر
باتوں پہ اِن کی کوئی بھروسا نہ کیجئے

…وب اِتنی "اردو" کی نازک نہیں ہے شاخ
…ں آشیانہ اِس پہ بنایا نہ کیجئے

محمود شریف محمود
(حیدرآباد)

ہے عورت دورِ نو کی اِسکو شرمانا نہیں آتا
حیا سے لاج سے اِسکو سمٹ جانا نہیں آتا

یہ مردوں کو دیا کرتی ہے ٹکر بھیڑ میں اکثر
اسے ہٹنا نہیں آتا سُکڑ جانا نہیں آتا

جوانی کی حدوں سے جب ذرا یہ پار ہوتی ہے
کمر بن جاتی ہے کمرہ ستو بل کھانا نہیں آتا

جو ڈھونڈو تو نہیں ملتی یہاں بیوی کوئی جسکو
ذرا سی بات پہ شوہر کا سر کھانا نہیں آتا

بڑی مشکل سے ملتی ہے کوئی اب شاعرہ ایسی
جسے اندازِ مجرا میں غزل گانا نہیں آتا

مَیں اک محمود شاعر ہوں نہیں لیڈر سیاست کا
کسی بھی بات کو کہہ کر مُکر جانا نہیں آتا

نامور طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات کا

اعـــــــــتراف

دورِ جدید میں طنز و مزاح کی اہمیت ، دوبئی میں

جشنِ مجتبیٰ حسین کا انعقاد

نئی دہلی ۔ ڈاکٹر اظہر زیدی کے اِدارہ آرٹس پروموشن بیورو کے زیرِ اہتمام پانچواں بین الاقوامی مشاعرہ زندہ دلان اِس مرتبہ نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں ۱۱ ستمبر کو دوبئی میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر زیدی ۱۹۸۸ء سے مسلسل ہر سال بین الاقوامی مزاحیہ مشاعرہ کسی شاعر کے اعزاز میں منعقد کرتے ہیں۔ اس بار پہلی مرتبہ ایک نثر نگار کے اعزاز میں اس منفرد مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جو بے حد کامیاب رہا۔ اس جشن میں جو ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کی تقریبات کے سلسلے میں منایا گیا ہندوستان اور پاکستان کے متعدد مزاح نگاروں نے بھی شرکت کی جن میں دلاور فگار، انور مسعود، پروفیسر عنایت علی خاں، راغب مُراد آبادی، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، خالد مسعود، فاخرہ بتول، گلزیب زیبا وغیرہ پاکستان سے اور ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی، پاگل عادل آبادی، مختار یوسفی، مسٹر لکھنوی وغیرہ ہندوستان سے اور خلیجی ممالک سے شریک ہونے والوں میں کمال اظہر، ڈاکٹر زبیر فاروق اور ڈاکٹر محبوب الدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جشنِ مجتبیٰ حسین کی تقریب دوبئی کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل "رائل ابجار" میں منعقد کی گئی جس کی صدارت پاکستانی قونصل جنرل میر بادشاہ نے کی۔ اس موقع پر ایک ضخیم یادگار مجلّہ بھی شائع کیا گیا جس میں مجتبیٰ حسین کے فن اور شخصیت پر ممتاز ادیبوں کے علاوہ خود مجتبیٰ حسین کے مضامین کا انتخاب بھی شامل ہے ۔ آرٹس پروموشن بیورو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اظہر علی زیدی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اردو میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے مجتبیٰ حسین کی گراں قدر خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ادبی کاوشوں کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا اور کہا کہ دوبئی میں اب تک طنز و مزاح کے تعلق سے شعراء کے جشن تو منائے جا چکے ہیں لیکن یہ پہلا موقع ہے جب ایک صاحبِ طرز مزاحیہ نثر نگار کا جشن منایا جا رہا ہے۔ خلیج ٹائمز دوبئی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر نجم الحسن رضوی اور مزاح نگار کبیر خاں نے مجتبیٰ حسین کے فن پر مضامین پڑھے ۔ مجتبیٰ حسین نے خود اپنے جشن کے بارے میں ایک دلچسپ تحریر پیش کرنے کے علاوہ اپنا ایک انشائیہ بھی سُنایا جس کے ہر جملہ پر اس طرح داد ملی جیسے مشاعروں میں شعر پر داد ملتی ہو۔ مسکراہٹوں، قہقہوں اور مسرتوں سے بھری ہوئی یہ تقریب لگاتار پانچ گھنٹوں تک جاری رہی۔ دوبئی کے ادب نواز حلقوں کی رائے تھی کہ دوبئی میں جشنِ مجتبیٰ حسین سے زیادہ کامیاب جشن کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ڈاکٹر اظہر زیدی کی شکریہ کی تحریک پر تقریب کا اختتام ہوا۔ اس تقریب میں صرف متحدہ عرب امارات میں مقیم اردو نواز افراد ہی شریک نہیں ہوئے بلکہ متعدد دیگر خلیجی ممالک سے بھی سیکڑوں لوگ مجتبیٰ حسین کو دیکھنے اور سُننے کے لیے آئے تھے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سووینیر شگوفہ حیدرآباد

تقاریب زندہ دلانِ حیدرآباد

آزادئ ہند کی ۵۰ ویں سالگرہ کے نام ـــ

جلد ۳۰ ـــــ ـــــ شمارہ ۱۱ ـــــ ـــــ نومبر ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز (ریاض)
اوورسیز کمیٹی :
حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
محمود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)
غلام نجم الدین (دبئی)

سرورق : طالب خوندمیری
کتابت :
محمود سلیم، محمد غالب، محمد عبدالرؤف ۔
طباعت :
دائرہ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد ۔

مجلس مشاورت :
نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
حمایت اللہ

مجلس ادارت :
مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

قیمت فی پرچہ : ۱۲ روپے
زرِ سالانہ : ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۱۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱

فون (آفس) 595716
فون (رہائش) 4576064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرستؒ)

مالِ مُفت (انشایئے)

قسط وار مضامین

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

قاضی جی دُبلے (رپورٹ)

بال کی کھال (تبصرہ)

پچوُرن (منظوماتؒ)

زندہ دلان حیدرآباد کی تقاریب بہ سلسلہ گولڈن جوبلی آزادی ہند

۷ اور ۸ نومبر ۱۹۹۷ء

زندہ دلان حیدرآباد

سرپرست - نواب شاہ عالم خاں صاحب

صدر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

نائب صدور - جناب کے وی رمنا چاری (آئی اے ایس)

معتمد عمومی - طالب خوندمیری

نائب معتمدین -

(۱) رشید الدین

(۲) رؤف رحیم

خازن - ڈاکٹر وہاب قیصر

ارکان - ○ محمد حمایت اللہ

○ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

○ مرزا مصطفیٰ علی بیگ

○ مسیح انجم

○ ڈاکٹر حبیب ضیاء

○ عباس متقی

○ محمد سلیمان

○ اسلم فرشوری

○ حبیب احمد خاں

نثری اجلاس

افتتاح، ۷/ نومبر ۱۹۹۷ء ۶ بجے شام بمقام نمائش کلب

بدست - جناب بشیر الدین بابو خاں عزت ماب وزیر بھاری مصنوعات حکومت آندھرا پردیش

مقالہ - اردو میں طنز و مزاح، آزادی کے بعد ۔ از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

صدارت - ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

مزاح نگار -- ○ یوسف ناظم (بمبئی) ○ نریندر لوتھر ○ مسیح انجم ○ ڈاکٹر حبیب ضیاء ○ عباس متقی ○ فیروز حیدر ○ سید نصرت آرکیٹکٹ (ابو ظہبی) ○ مختار احمد منو (گلبرگہ)

محفل لطیفہ

۸/ نومبر ۱۹۹۷ء ساڑھے دس بجے صبح بمقام نمائش کلب

صدارت - جناب تجمل حسین

لطیفہ گو - ○ مسرس نریندر لوتھر ○ ڈاکٹر احمد اللہ ○ غلام یزدانی ○ ڈاکٹر رام پرشاد ○ اظہر افسر ○ شنکر داس ○ حمایت اللہ ○ مصطفیٰ علی بیگ ○ طالب خوندمیری ○ اسلم فرشوری ○ مسیح انجم ○ قیسی قمر نگری ○ صبغت اللہ بمباٹ ○ دولت رام ○ منور علی مختصر ○ خاں اطہر ○ کلیم صدیقی ○ شبیر خاں ○ مسعود ○ حامد علی مرزا ○ اختر پرویز ○ غوثیہ سلطانہ اور ارمان حسین فرشوری

کنوینر - افشاں جبیں

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

۸/ نومبر ۱۹۹۷ء ساڑھے آٹھ بجے شب بمقام نمائش کلب

صدارت - نواب شاہ عالم خاں صاحب

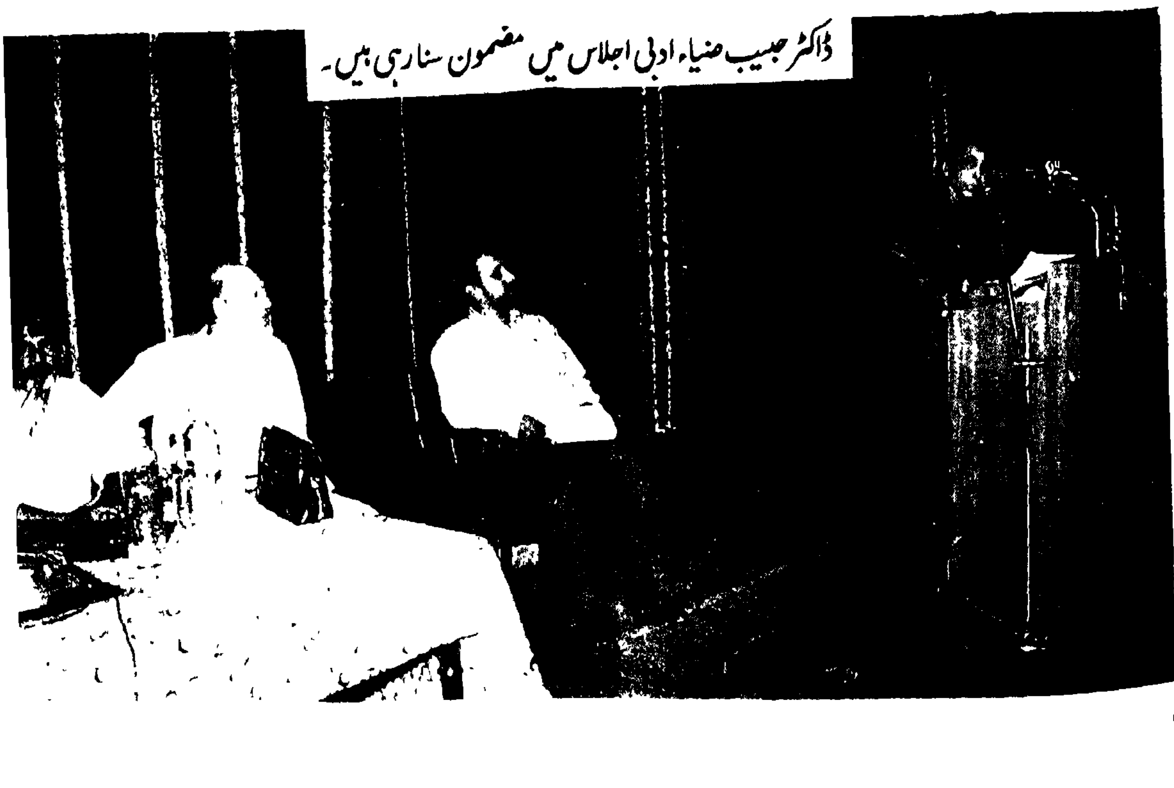
شعراء - ○ مسرس بازغ بہاری (کلکتہ) ○ فرید انجم (عادل آباد) ○ پاگل عادل آبادی ○ عظمت بھلاواں (ناندیڑ) ○ قیسی قمر نگری (کرنول) ○ سراج نرملی (نرمل) ○ روشن علی کرنل (کریم نگر) ○ حمایت اللہ ○ طالب خوندمیری ○ مصطفیٰ علی بیگ ○ صبغت اللہ بمباٹ ○ وینو گوپال بھٹڈ ○ نریند رائے ○ رؤف رحیم ○ اقبال ہاشمی ○ محمود نشتر ○ درگادت پانڈے ○ اجیت گپتا ○ منور علی مختصر ○ معین امر بمبو ○ وحید پاشاہ قادری اور جناب شاہد عدیل

کنوینر - مصطفیٰ علی بیگ

حیدرآباد کی سالانہ تقاریب



صدر مشاعرہ نواب شاہ عالم خان صاحب
سامعین سے مخاطب ہیں۔



ڈاکٹر حبیب ضیاء ادبی اجلاس میں مضمون سنا رہی ہیں۔



محفل لطیفہ گوئی (دائیں سے بائیں) خواہ مخواہ، دلیپ سنگھ، مجتبیٰ حسین، فیاض احمد فیضی، اور مائک پر صدر زندہ دلان حیدرآباد ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔



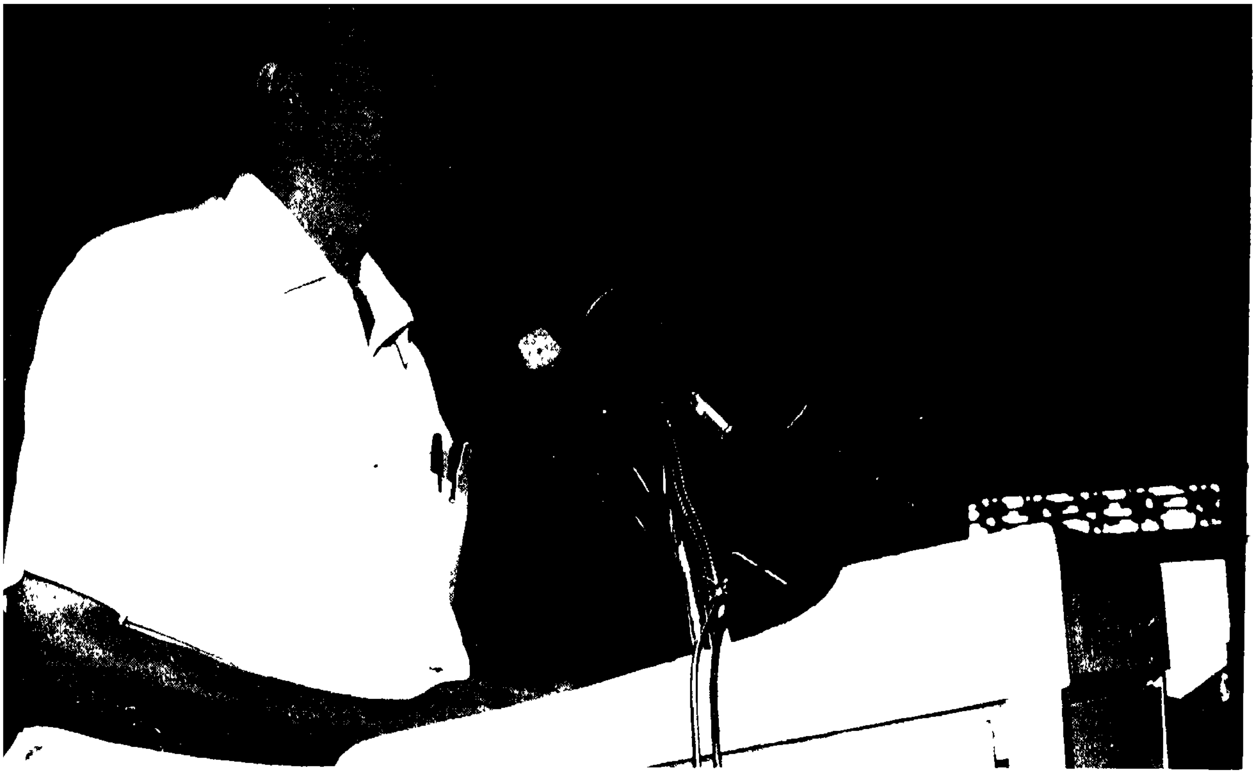
محفل لطیفہ میں (دائیں سے بائیں) خواہ مخواہ، دلیپ سنگھ، مجتبیٰ حسین، فیاض فیضی اور مائک پر کنوینر افشاں جبیں



محترم محبوب حسین جگر صاحب مرحوم، جناب طارق غازی مینیجنگ ڈائرکٹر سعودی گزٹ جدہ۔ کے اعزاز میں منعقدہ جلسے کو مخاطب کررہے ہیں (دائیں سے بائیں) بیگم طارق غازی، جناب طارق غازی، جناب نریندر لوتھر، جناب مرزا شکور بیگ، اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال۔



ادبی اجلاس کے موقع پر لیا گیا گروپ فوٹو۔ (دائیں سے بائیں) فاروق نشتر، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر حبیب ضیاء۔ فیاض احمد فیضی۔ (استادہ) ڈاکٹر مصطفےٰ کمال، محمد علی رفعت، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، مسیح انجم، ڈاکٹر وہاب قیصر، فیروز حیدر، حمایت اللہ، پرویز یداللہ مہدی، اعجاز قریشی، ڈاکٹر عباس متقی، منور علی مختصر۔



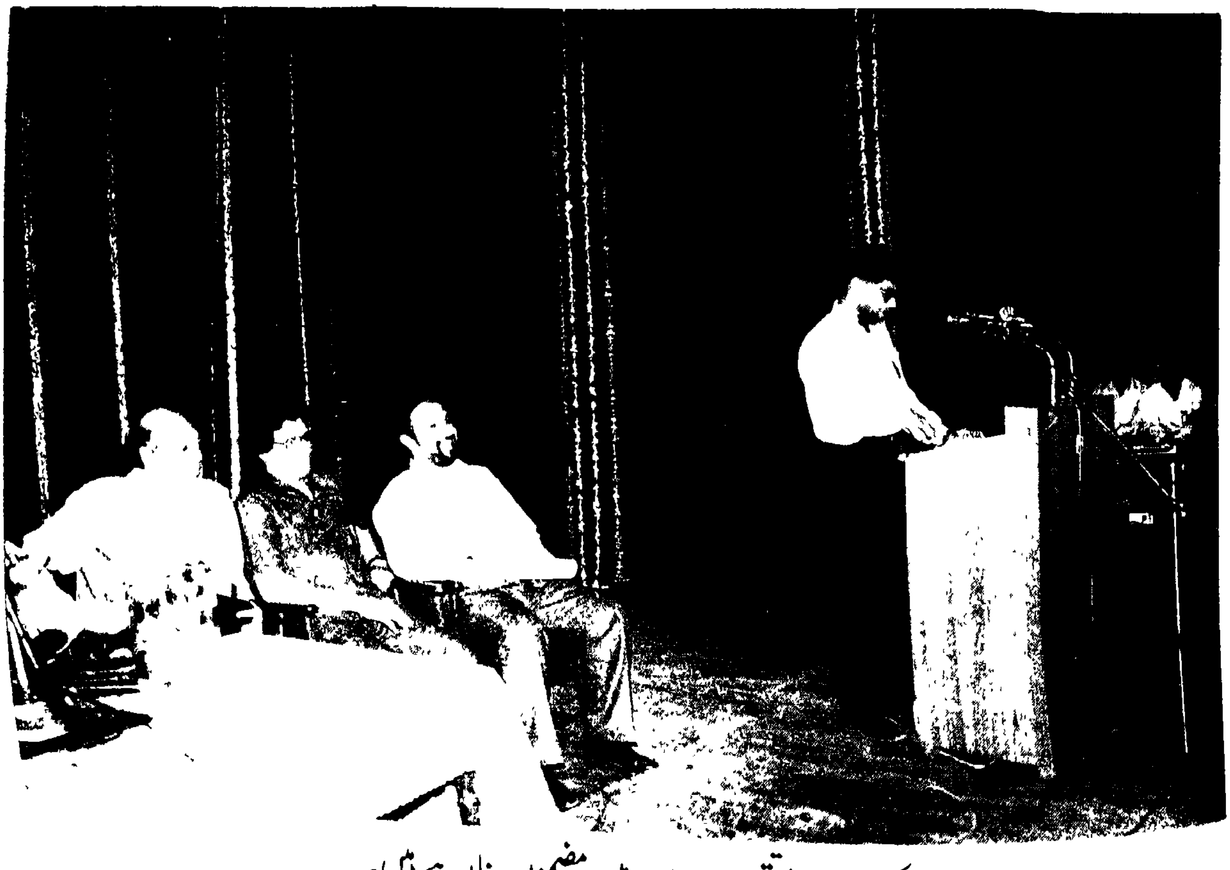
جناب حمایت اللہ لطیفے سنا رہے ہیں۔



جناب مسیح انجم



نامور طنز و مزاح نگار دلیپ سنگھ کی گلپوشی بدست نواب شاہ عالم خاں صاحب سرپرست زندہ دلان حیدر آباد۔



ڈاکٹر عباس متقی ادبی اجلاس میں مضمون سنا رہے ہیں۔

دیمک

طالب خوندمیری

گئے تھے لائبریری ہم مطالعہ کرنے
دماغ و دل کے دریچوں کو اپنے وا کرنے
جو کھولی " بانگ درا " ذوق کی جلا کرنے
تھیں اس میں دیمکیں اپنا بھی حق ادا کرنے

کٹے پڑے تھے جدھر ناولوں کے کچھ انبار
بڑی بری طرح گھائل تھے ان کے سب کردار
کسی کی ناک کٹی تھی ، کسی کے کان پہ وار
کسی کا چٹ کیا دیمک نے صرف اک رخسار

اب ان کی بھوک کا ایک اک ورق نشانہ تھا
جو پہلے چٹ ہوا " اقبال کا ترانہ " تھا

بڑی تمیز سے دیمک کو کھانا آتا ہے
کہ ناولوں کو فسانے بنانا آتا ہے

پڑا تھا کونے میں اردو کتب کا جو ملبہ
وہ لگ رہا تھا کئی دیمکوں کا پس خوردہ
بکھر چکا تھا ہزاروں کتب کا شیرازہ
ادھر ادھر جو بچی تھیں ، انہیں بھی تھا خطرہ

جہاں فنون لطیفہ کا ایک شعبہ تھا
وہاں بھی لشکر دیمک کا سخت حملہ تھا
مصوری کے نمونوں کا حال ایسا تھا
کہ نقش اصل سے کچھ اور نقش ابھرا تھا

انہیں کے ساتھ جو رکھے ہوئے رسالے تھے
وہ سب کے سب اسی دیمک کے تر نوالے تھے

نہ جانے کیسا ہنر دیمکوں نے دکھایا
کہ نقش رفتہ سے تجریدی فن نکل آیا

تھیں فلسفہ کی کتابیں ، نہ مذہبی باقی
بچی نہ سائنس ، نہ تاریخ ہی رہی باقی
نہ کلیات ہی پوری تھی میر کی باقی
رہی نہ حضرت غالب کی شاعری باقی

تھی ہر طرف ہی انہیں دیمکوں کی گل کاری
عمل یہ شعبۂ تاریخ میں بھی تھا جاری
یہاں جو رکھی تھی نادر کتب کی الماری
وہ ہوگئی تھی برادے کا ڈھیر بے چاری

تمام ورثۂ ادراک کھاگئی دیمک
ہمارے حصہ کی خوراک کھاگئی دیمک

ہمارے پاس جو ماضی بچا تھا مشکل سے
اسے بھی کھالیا دیمک نے کیا کھلے دل سے

[redacted]

اینگلو اردو غزل



مرزا مصطفیٰ علی بیگ

وز پہ جو شئے پڑی ہے ڈاؤٹ فل
س کے کارن زندگی ہے ڈاؤٹ فل

وصل کے وعدے میں کنفیوژن بھی ہے
ہوپ فل ہے تو کبھی ہے ڈاؤٹ فل

دیکھ کر آئینہ مجھ کو یوں لگا
آج کل ہر آدمی ہے ڈاؤٹ فل

انتظار ان کا تھا آدھی رات تک
باقی آدھی کٹ رہی ہے ڈاؤٹ فل

طنز تھا ہونٹوں پہ ان کے یا خوشی
کیا کہوں ان کی ہنسی ہے ڈاؤٹ فل

وہ جو منہ دھونے سے کترانے لگے
ان کی بیوٹی ہوگئی ہے ڈاؤٹ فل

ہنس کے بولے وہ غزل سن کر میری
دھن تو اچھی شاعری ہے ڈاؤٹ فل

گھر میں آتے ہی تھمادی گرم چائے
مہربانی وائف کی ہے ڈاؤٹ فل

ب نمازوں میں بھی دنیا کا خیال
گویا میری بندگی ہے ڈاؤٹ فل

عید ہے کوئی یا کوئی ہے فساد
شہر میں کچھ کھلبلی ہے ڈاؤٹ فل

ہورہے ہیں مجھ سے وہ جوں جوں قریب
دل کی حالت ہورہی ہے ڈاؤٹ فل



غزل

رؤف رحیم، حیدرآباد

میں نے محفل میں جب بھی پڑھی ہے غزل — کوئی کہتا نہیں یہ مری ہے غزل
جب سے شاگرد اک ہوگئی ہے غزل — آگے پیچھے مرے گھومتی ہے غزل
اس سے بڑھ کر مری کیا ہو توہین اب — پوچھتے ہیں وہ کیا آپ کی ہے غزل
ہوبہو تھی غزل تو وہ کہنے لگے — یونہی استاد سے لڑگئی ہے غزل
دیکھ کر شوق جدت کی بے باکیاں — آپ اپنے میں خود رو رہی ہے غزل
بیس برسوں سے اب تک سناتا ہوں میں — ساری غزلوں میں یہ چل پڑی ہے غزل
کیا پڑھوں لے کے آیا تھا میں مارکر — نہ جانے جاکر کہاں کھو گئی ہے غزل
میں ہوں چوٹی کا شاعر مرے دوستو — کیونکہ چوٹی پہ میں نے لکھی ہے غزل
چھاؤں میں جس کی شاہوں کو راحت ملی — جھونپڑی ہے تو وہ جھونپڑی ہے غزل
اب تو شاگرد استاد لڑنے لگے — یہ مری ہے غزل یہ مری ہے غزل
ہوگیا ہے خراب ان کے منہ کا مزا — جو بھی کہتے ہیں باسی لگی ہے غزل
للو پنجو بھی غزلیں سنانے لگے — اپنی درگت پہ اب چیختی ہے غزل
کیسے کیسوں کی ہے اس پہ مشق ستم — لٹ رہی ہے غزل پٹ رہی ہے غزل

کیا کوئی سرپھری روبرو تھی رحیم
کس لیے آپ کی بے تکی ہے غزل

یُوسُف نَاظِم

۱۵ اگست اور شمس الزماں خاں کا ناشتہ

ہم پچھلے چند دنوں سے بہت اچھے موڈ میں تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ آزادی کے پچاس ویں سال میں بھی خوش نہیں رہیں گے تو کب خوش رہیں گے۔ مانا کہ اس موقع پر ہم نے کئی تلخ۔ مضامین بھی پڑھے غلط سلط کالم بھی نظر سے گزرے کچھ شکوے شکایتیں بھی سننے میں آئیں لیکن ہم نے ان ساری باتوں کو بکمال ہشیاری ٹال دیا۔ یہ تو دُنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ کتنے لوگوں نے ہم سے کہا کہ دیکھئے۔ فلاں کا نام آزادی کے سپاہیوں میں نہیں لیا جا رہا ہے اور فلاں کو تو بالکل نظر انداز کر دیا جا رہا ہے لیکن ہم نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی اور ہم تن خوش رہے اور ہمارے دوست شمس الزماں خاں نے تو خوش رہنے کے کئی ریکارڈ توڑ دیئے۔ جشن آزادی منانے کی غرض سے انھوں نے خاص طور پر نئے کپڑے سلوائے اور درزی کی دُکان پر صبح و شام حاضری دے کر ۱۴ اگست ہی کو اپنا نیا پٹھانی سوٹ گھر لے آئے۔ موزے جوتے تو پہلے ہی خرید رکھے تھے۔ یہ بھی پچاس فیصد رعایتی قیمت پر مل رہے تھے۔ اس دن انھوں نے یہ سوٹ پہنا تو بالکل شہزادے لگ رہے تھے۔ نہایت قیمتی را سلک خریدا تھا انھوں نے رنگ سنہرا۔ (یہ لفظ را، ہمیں ہمیشہ سے ناپسند رہا ہے۔ کسی خفیہ ادارے کا مخفف نام ہے۔ سلک کے ساتھ کتنا بُرا لگتا ہے اس لیے ہم تو اسے خام ریشم ہی کہتے ہیں)۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ شمس الزماں خاں نے اس طلائی جشن کے موقع پر سنہرے رنگ کا سوٹ ہی زیب تن نہیں کیا بلکہ اس موقع کی مناسبت سے اپنے دانتوں کا ایک نیا سیٹ بھی بنوا لیا جس میں سات طلائی دانت نصب کروالئے۔ سات اس لیے کہ اپنی عمر کی ہر دہائی کے لیے ایک سونے کا دانت۔ مَیں نے ان سے کہا بھی کہ بھائی شمس اس سے تو بہتر تھا کہ آپ ہاتھی دانت ہی لگوا لیتے۔ سن کر ہنسے اور بولے "واہ کیا سنہری بات کہی ہے۔ اپنے جانے کی کلغی پر بھی انھوں نے اس دن بہت محنت کی تھی۔ وہ کلف دار طرۂ پیچ دار، ان کے سر پر سج بھی بہت رہا تھا۔ اور وہ مجمع میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ہمارے خوشگوار موڈ پر بس اوس پڑی تو صرف اس وجہ سے پڑی کہ ہمیں کسی نے یہ خبر سنائی کہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ سے جو عنقریب اپنی سابقہ مملکت یعنی ہندوستان آنے والی ہیں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر انھیں امرتسر آنا ہی ہے تو پہلے معافی مانگیں اور اعتراف کریں کہ جنرل ڈائر نے جلیان والا باغ میں گولی چلا کر بڑا ظلم کیا تھا اس کے علاوہ ہمارا کوہِ نور ہیرا بھی جو پچھلے ڈیڑھ سو سال سے اُن کے تاج کی زینت بنا ہوا ہے اُسے بھی اپنے ساتھ لیتی آئیں اور یہیں چھوڑ جائیں۔ ان دونوں مطالبات کے تمام پہلوؤں پر ہم نے غور نہیں کیا اور نہ اس بات پر دھیان دیا کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے لیکن ہمارا موڈ بہر حال یوں سمجھیے

شکستہ ہوگیا۔ معذرت، ہمیں پسند ہے اور یہ فقرہ کہ "قطع کلام معاف" یا یہ جملہ کہ "معافی چاہتا ہوں لیکن عرض یہ ہے" ہمارے جی کو لگتا ہے اور ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ واہ کتنی شائستہ اور مہذب گفتگو ہو رہی ہے بلکہ بعض وقت تو کسی کی زبان سے صرف "ساری" کا لفظ سن کر ہماری باچھیں کھل جاتی ہیں اور ہم بھول جاتے ہیں کہ اس شخص نے کتنی زور سے ہمیں ابھی ابھی دھکا دیا تھا۔ اور ہم گرتے گرتے بچے تھے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معذرت ہمیں بہت پسند ہے لیکن جسارت معاف ہمارا معروضہ یہ ہے کہ اگر معذرت کے معاملے پر دستوری نقطۂ نظر سے غور کیا جائے یعنی مملکت برطانیہ کے دستور کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے فاضل وکلا صاحبان خاص طور پر وہ جو سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں پیشگی ضمانتوں کی خصوصی پریکٹس کرتے ہیں، اس نتیجے پر پہنچیں کہ برطانوی سرکار کی کسی بھی حرکت کی ذمہ داری وہاں کے سربراہ کے سر نہیں ڈالی جا سکتی خواہ وہ سربراہ ہو، بادشاہ ہو یا ملکہ۔ جارج ہوں یا وکٹوریہ، ہنری ہوں یا الزبتھ۔ ہاں اگر برطانیہ کے وزیر اعظم اگر اس موقع پر ہندوستان آنے والے ہوں تو ان سے بہر حال یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ نہ آئیں اور جب آئیں تو ایک معذرت نامہ ضرور ساتھ لائیں۔ برطانیہ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے کابینہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ بادشاہ اور ملکہ کے دامن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور یوں بھی موجودہ ملکہ برطانیہ جو ضعیف ہونے کے علاوہ اپنے نجی مسائل کی وجہ سے کافی پریشان ہیں۔ ان کے سب سے بڑے فرزند نے جو باقاعدہ ولی عہد ہیں اور ان کی بہو نے (جو دستوری حساب سے ملکہ بننے کے موقف میں تھیں) خود ملکہ کو اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اہل ملک کو کافی پریشان کر رکھا ہے۔ اس لیے ہم شخصی طور پر چاہیں گے کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ رفع دفع ہو جائے۔ ہمارے خان صاحب جو بنیادی طور پر فوج کے آدمی رہے ہیں، یہ خبر پڑھ کر ایکدم بھڑک اٹھے اور بولے "یہ بھی کوئی موقع ہے ہیرا مانگنے کا"۔ ہمیں پتا ہے ان کا موڈ اکثر و بیشتر جارحانہ ہو جاتا ہے اور وہ پینترا بدل کر اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے وہ کسی بڑی جنگ کے محاذ پر کھڑے ہوں۔ ہمیں یاد ہے کہ آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر بھی ان کا چال چلن ایسا ہی تھا۔ اُن کا نظریہ ہے کہ خوشی منانا ہے تو دل کھول کر مناؤ۔ چیں چاں مت کرو۔ وہ ایک لحاظ سے سادہ دل بندے ہیں، ہم سے عمر میں زیادہ ہیں، شاید عقل میں بھی ہوں۔ ہم ان سے ہمیشہ متفق رہا کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ انہیں بار بار یہ یاد نہ آئے کہ وہ ایک زمانے میں فوج میں تھے۔

کوہِ نور کا معاملہ چونکہ اہم تھا اس لیے ہم نے ایک دن باتوں باتوں میں ان سے پوچھ لیا کہ خان صاحب، کوہ نور کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں۔ (ویسے ہم جانتے تھے کہ اس طرح کے موقع پر ان کے خیالات زریں ہی ہوں گے)۔ ہمارے اس سوال پر وہ چونکے اور پھر سوچنے لگے حالانکہ سوچنے کی بری عادت کبھی انہیں تھی ہی نہیں۔ انہیں سوچتا دیکھ کر ہمیں بھی چونکنا پڑا، لیکن اس دن شاید انھوں نے ٹھیک سے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ خان صاحب کے ناشتے کی دور دور تک شہرت ہے اور کچھ لوگ تو انھیں ناشتہ کرتے ہوئے دیکھنے کی خاطر ان کے گھر کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے پر خان صاحب زیادہ زور نہیں دیتے۔ یوں سمجھیے وہ انھیں اصل کھانا مانتے ہی نہیں۔ صرف ضمیمہ سمجھتے ہیں لیکن ناشتہ ان کی جان ہے۔ ناشتے کا دسترخوان بچھتا ہے تو بچھتا ہی چلا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے سرخ باناٹ بچھائی جا رہی ہے۔ ناشتے پر ہوتے تو وہ تنہا ہی ہیں لیکن دسترخوان، اس سرد سامان کے لیے ہوتا ہے جس سے وہ تن تنہا نبرد آزما اور بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے پوتے کو بھی ساتھ بٹھا لیتے ہیں جو انھیں حیرت سے دیکھتا رہتا ہے۔ خان صاحب ناشتے میں ہر وہ چیز نوش جان فرماتے ہیں جو ان کی عمر کے لوگوں کے لیے منع ہیں۔ پر

پراٹھوں نے گھی (گھر میں تیار کیا ہوا گھی) ٹپکتا رہتا ہے تر تر کہہ لیجئے۔ موٹی کم سے کم ۴ ا نچ موٹی تہہ والی بالائی انھیں مرغوب ہے (بشرطیکہ مقدار میں زیادہ یعنی کثیر المقدار ہو) اپنے ناشتے کا دوران انھوں نے ڈیڑھ گھنٹہ مقرر کر رکھا ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی اس دن یعنی جس دن ہم نے کوہ نور ہیرے سے متعلق ان سے ان کی رائے پوچھی تھی وہ کسی اندرونی تاثر کی بنا پر ناشتے کے لیے پورا ڈیڑھ گھنٹہ نہیں دے سکے تھے۔ اس لیے پانچ منٹ جو ناشتے کے وقت میں سے بچ گئے تھے وہ سوچ میں غرق رہے اور پھر ٹھہر ٹھہر کر فرمایا کہ میاں نجم الدین یہ کوہ نور ہمارے بس کا مسئلہ نہیں ہے بوفورس توپ یا کلاشنکوف کے بارے میں ہم سے کچھ پوچھتے تو ہم فوراً تمہاری الجھن دور کر دیتے لیکن اس مسئلے پر ہمیں کچھ دیر اور سوچنا پڑے گا۔ ہم نے کہا کب تک آپ سوچ لیں گے۔ بولے بس یہی کوئی دس سال کے اندر اندر۔ یہ سن کر فرطِ مسرت میں ہم ان کے گلے سے لگ گئے اور ان کے گلے سے لگتے ہی لگتے ہم نے کہا "خاں صاحب دس سال کی کیا بات ہے یوں پلک جھپکتے گزر جائیں گے ـــــ ہم نے رخصت کی اجازت چاہی تو بولے ٹھہرو تھوڑا سا ناشتہ باقی رہ گیا تھا۔ تم سے باتیں کرتے ہوئے میری بھوک لوٹ آئی ہے۔ آؤ تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ میرا پوتا تو ابھی سو رہا ہے ـــــ خاں صاحب نے یہ کہہ کر از سرِ نو ناشتے کا آغاز کیا اور کوئی پون گھنٹے تک خود کو زحمتِ طعام دیتے رہے ـــــ لیکن ان کی داد دیجئے۔ اس پندرہ اگست کو انھوں نے سرے سے ناشتہ کیا ہی نہیں۔ سنہرے رنگ کا پٹھانی سوٹ پہنے اور صافہ سر پر جمائے، ٹی وی کا پروگرام دیکھتے رہے۔

خاں صاحب اخبار وغیرہ کبھی نہیں پڑھتے ہیں ٹی وی ضرور دیکھتے ہیں لیکن خبروں سے جہاں تک ممکن ہے بچتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ صحت کے لیے مضر ہوتی ہیں ان کا خیال ہے کہ اتنی جانیں تو میدانِ جنگ میں ضائع نہیں ہوتی تھیں جتنی روز آنہ بڑے شہروں کی وارداتوں ہوتی ہیں۔ پولس کی مڈبھیڑ کی وارداتوں پر البتہ وہ کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ۱۵ اگسٹ کے چند دنوں بعد وہ خود ہی ایک دن میرے یہاں چلے آئے صرف یہ بتانے کے لیے کہ انھیں خوشی ہے کہ کوئین سے معذرت نامہ حاصل کرنے کا معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا جانے کی امید بندھ گئی ہے اسی خوشی کے اظہار کے لیے انھوں نے اپنا شملہ بڑے ٹھاٹ سے باندھ رکھا تھا۔ جانتے ہیں میں کم خوراک ہوں اس لیے کہہ گئے ہیں کہ جب بھی میرا جی چاہے ناشتے کے لیے ان کے گھر پہنچ جاؤں ـــــ میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ جاؤں گا ضرور لیکن معذرت نامے کی بات ختم ہونے کے بعد۔ □□

آزادی

ہے اُنھیں پیٹنے کی آزادی
اور ہمیں چیخنے کی آزادی

جب سے شادی ہوئی ہے بیگم کو
مِل گئی ڈانٹنے کی آزادی

کیسی دعوت ہے یہ بخیلوں کی
ہے فقط سونگھنے کی آزادی

بھونکنے کا بھی حق نہیں ہم کو
ہے اُنھیں کاٹنے کی آزادی

کیا ہو شاعر کا، سامعین کو اگر
ہو گلا گھونٹنے کی آزادی

انگلیوں پر نچایئے بے شک
دیں مگر ناچنے کی آزادی

باندھ کر پیٹتے ہیں وہ ہم کو
چھین کر بھاگنے کی آزادی

لیڈروں کو تو مل گئی شانہ
دیش کو لُوٹنے کی آزادی

اقبال شانہ

ہتھیلی

تمھاری چاند سی گوری ہتھیلی
ہماری سانولی میلی ہتھیلی

لگائی تھی حِنا ہاتھوں میں اس نے
میں سمجھا ہوگئی زخمی ہتھیلی

طمانچہ پھول سا لگتا ہے یارو
مرے دلبر کی نازک سی ہتھیلی

مری نیندوں میں تیری انگلیاں ہیں
مرے خوابوں میں ہے تیری ہتھیلی

تمھاری شخصیت مشکوک ہوگی
بجایا مت کرو اپنی ہتھیلی

ہتھیلی پر جو تم نے جان رکھ دی
تو ہم نے جان پر رکھ دی ہتھیلی

میں ٹھکرا دوں جہاں کو گر ہو جاناں
ہتھیلی پر مری تیری ہتھیلی

زمانہ تم کو سمجھے گا بھکاری
نہ پھیلایا کرو اپنی ہتھیلی

نجومی نے کہا اقبال شانہ
بہت منحوس ہے تیری ہتھیلی

فیاض احمد فیضی
(ممبئی) ★

ممبئی دوردرشن کی حمایت میں

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب دوردرشن نے اردو میں خبریں نشر کرنے کا احسان اردو دانوں پر نہیں کیا تھا۔ ہم اپنے ایک شناسا سے ملنے، ممبئی کے مضافات میں واقع ان کے گھر پہلی مرتبہ پہنچے حسبِ دستور انہوں نے تمام افرادِ خانہ سے ہمارا تعارف کرانا شروع کیا۔

"یہ ہماری بیگم ہیں (ماشاءاللہ!) کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔ یہ ہمارا چھوٹا بیٹا ہے لیکن نالائق نہیں ہے۔ اپنے ہمیشہ فرسٹ کلاس میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہمارا بڑا بیٹا دوسرے کمرے میں ہے، وہ پیدائش سے ہی گونگا ہے۔"

ہم نے اظہارِ افسوس کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈے، اور ناکام ہو گئے۔ وہ کہنے لگے "اس سے ملتے وقت دو باتوں کا خیال رکھیئے گا۔ پہلی یہ کہ اسے رحم بھری نگاہوں سے نہ دیکھیں، اسے بہت صدمہ پہنچتا ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکے تو ہم نے سوچا کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے برادرانِ قوم کو نہ صرف دوسروں کی ہمدردی کا طلبگار پایا ہے بلکہ انہیں ہمیشہ خود رحمی کے شغلے میں بھی مبتلا دیکھا ہے۔

"دوسری بات یہ کہ ہمارے گونگے بیٹے سے اشاروں میں بات نہ کریں بلکہ عام آدمیوں کی طرح اور ذرا بلند آواز سے گفتگو کریں وہ آپ کے ہونٹوں کی جنبش سے آپ کی بات بخوبی سمجھ جائے گا۔" ہمارے دوست نے ہمیں سمجھایا۔ خیر اشاروں میں بات کرنا تو ہماری تہذیب کے خلاف اور چیخ کر بات کرنا ہماری سرشت میں داخل ہے۔ جب ہم کسی کے مکان پر جاتے ہیں تو نیچے سے ہی با آوازِ بلند پکارتے ہیں اور اس وقت تک پکارتے رہتے ہیں جب تک سارے محلے کو ہماری آمد کی خبر نہیں ہو جاتی۔ سامنے کے مکان میں رہنے والوں سے ان کی خیریت اپنی کھڑکی سے ہی پوچھ پوچھ کر ماحول کی صوتی کثافت میں خوشگوار اضافہ کرتی ہیں۔ فلیٹ میں رہنے کے باوجود وہ دروازہ کھول کر رہیں سے اپنے سارے پڑوسیوں کو گھر میں آنے والے ہر نئے سامان کی بحسن وخوبی بیان کر دیتی ہیں۔

بہرحال ہمارا تعارف ہوا اور ہم نے اپنے دوست کی مدد سے ان کے گونگے بیٹے سے گفتگو شروع کی۔ اس نے ہم سے "انکل آپ کیا کرتے ہیں؟" ہم نے کہا "بیٹے ہم اخبار میں لکھتے ہیں۔" اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا اور پوچھا "انکل آپ کس زبان میں لکھتے ہیں؟" ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اردو"۔

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے رحم جھلکنے لگا اور وہ جلدی جلدی [illegible] غوں غاں کی آوازیں نکا

ہم نے اپنے دوست سے دریافت کیا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟" ہمارے دوست ہمیں جواب دینے کی بجائے اپنے بیٹے سے کہنے لگے "نہیں بیٹے ایسا نہیں کہتے" ہم نے اصرار کیا تو وہ ہم سے کہنے لگے "آپ بُرا نہ مانیں۔ ہمارا بیٹا کہہ رہا ہے کہ آپ کی حالت تو ہم گونگوں سے بھی بدتر ہے۔ ٹیلی ویژن پر گونگوں کے لیے تو خصوصی خبریں نشر ہوتی ہیں لیکن اردو والوں کو تو اس کے لائق بھی نہیں سمجھا گیا ہے۔"

خیر صاحب، خدا خدا کر کے ہوا کا رُخ ذرا سا بدلا اور اردو سے نابلد نیوز ریڈرز نے دوردرشن پر اردو خبریں پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ خبریں پڑھنے کا انداز بھی اتنا دل نشین ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ان کے سامنے بندوق تانے کھڑا ہے کہ نہیں پڑھو گے تو موت کے گھاٹ اتار دیئے جاؤ گے یا ممبئی دوردرشن پر اُردو پروگرام کے انچارج بنا دیئے جاؤ گے۔ اس کے برعکس پاکستان ٹیلی ویژن کی نیوز ریڈرز کو ہر لمحہ یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ ان کے سر سے آنچل نہ گر جائے اور ان کی نوکری خطرے میں پڑ جائے۔

لیکن جہاں تک ٹیلی ویژن پروگراموں کا تعلق ہے، ہم ایسے اردو کے شیدائی اکثر پاکستان ٹیلی ویژن کو آزماتے رہتے ہیں حالانکہ ممبئی دوردرشن کا خیال ہے کہ ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ایک مہینے میں آدھے گھنٹے کا پروگرام ہی کافی ہوتا ہے اور وہ بھی بھری دوپہر میں جب آدمی دفتر میں ہوتا ہے، کھانے کی میز پر ہوتا ہے یا حسرت موہانی کے معشوق کی طرح ننگے پاؤں مکان کی چھت پر کسی کو بلانے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر قوالی، غزل، مشاعرہ یا ادبی مباحثہ کی کہکشاں دیکھنے اور سننے مل جائے تو پھر مہینہ بھر ٹی وی دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بجلی کی خاصی بچت ہو جاتی ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ پاکستان جیسا ملک جو گلے گلے تک، بلکہ ... اوپر یعنی پیشانی تک بیرونی قرضوں اور اندرونی کرپشن میں ڈوبا ہوا ہے اپنے اردو پروگراموں پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اردو کے پروگرام دیکھیں اور حکومت کے خرچ پر محظوظ ہوں جب کہ دوردرشن کا نصب العین یہ ہے کہ اردو والے نقص کے ناخن لیں اور ایک مرتبہ اردو پروگرام دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی تمنا نہ کریں۔ پاکستانی ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام نشر ہوتا ہے جس کا نام "بنتِ حوا کے نام" ہے اور جس میں عورتوں کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے ملک کے نامور وکلاء، جج، سماجی کارکن، صحافی، دانشوروں اور ادیبوں کو بلایا جاتا ہے۔ سنا ہے جس وقت یہ پروگرام نشر ہوتا ہے پاکستان کی تمام خواتین باورچی خانے کو مقفل کر کے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ جہاں آزادیٔ نسواں کے مخالف ان کے بھائی، شوہر یا والد پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے پروگرام کے بنانے پر کثیر روپیہ خرچ ہو جاتا ہے، دوم یہ کہ پروگرام جتنی دیر نشر ہوتا ہے عوام اپنا کام ترک کر دیتے ہیں اور ملک کی ترقی بھی رک جاتی ہے چنانچہ دوردرشن ایسے غیر سماجی پروگرام کو اردو والوں سے دور رکھ کر اپنی اور دونوں کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ایک اور دلچسپ ادبی پروگرام پاکستان ٹیلی ویژن پر مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ پیش کرتے ہیں جس میں وہ کسی ادبی موضوع پر سامعین کی موجودگی میں ملک کے صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں سے گفتگو کرتے ہیں اور اپنے دلچسپ سوالوں سے شرکاء اور ناظرین دونوں کو پابند کر رکھتے ہیں جب کہ ممبئی دوردرشن ناظرین کو کھلا چھوڑ دینے کا قائل ہے اس لیے وہ ایسے ادبی پروگرام پیش کرتا ہے جس کے دوران ہم اطمینان سے کھانا بھی تناول فرما سکتے ہیں، شیو بھی بنا سکتے ہیں اور ٹیلی فون پر غیر ضروری گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوردرشن کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ممبئی ایسے شہر میں صفِ اول کے مشہور و مقبول شاعر، ادیب اور دانشور موجود ہی نہیں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا پتہ اسے معلوم نہیں ہے اور اگر پتہ مل بھی جائے تو انہیں بلانے میں کافی رقم ضائع ہو جاتی ہے۔

اس لیے یہ وہ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے ہم ایسے گمنام اور غیر معروف ادیبوں اور شاعروں کو پروگرام میں شریک کر کے اسے حتی المقدور غیر دلچسپ بنانے میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن والوں کی ناسمجھی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اردو پروگرام میں انٹر کالج تقریری مقابلے ادبیت بازی کے مقابلے بھی منعقد کرتے ہیں اور یونیورسٹی میں ہونے والے وضو عاتی ریاضیوں کو بھی شروع سے آخر تک بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تعلیمی پروگرام میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اردو کلاسیکی غزلوں کی انتہائی آسان زبان میں تشریح بھی بیان کرتے ہیں۔ ان پروگراموں کو ممکن ہے وہاں کے نوجوان طلبہ شوق سے دیکھتے ہوں اور قیاس ہے کہ کچھ فیض بھی اٹھاتے ہوں لیکن ممبئی دوردرشن بخوبی جانتا ہے کہ اردو والوں کے لیے تعلیمی اور تدریسی پروگرام بالکل غیر ضروری ہیں۔ ان کا کام تو غزل اور قوالی سے ہی چل جاتا ہے۔ ہیں تو پاکستان ٹیلی ویژن والوں کی عقل پر کبھی کبھی ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے چینل پر باقاعدہ ایک سائنسی پروگرام بھی نشر کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور معاشیات، جیسے خشک اور غیر مفید موضوع کو بھی دل نشین اور آسان زبان میں پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیے گل و بلبل کی شاعری پر سر دھننے والے اردو ناظرین کا سائنس ٹیکنالوجی اور معاشیات سے کیا تعلق ہے اور ان پر عوام سے حاصل کیا ہوا روپیہ کیوں ضائع کیا جائے غالباً ان ہی پروگراموں کی وجہ سے آج پاکستان سائنسی اور معاشی دوڑ میں ہم سے اس قدر پیچھے ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں ممبئی دوردرشن کے ارباب مجاز جنھوں نے اردو پروگرام کو قوالی، غزل، مشاعرہ اور ادبی مباحثہ کے چار کھونٹوں سے اور اتنے ہی فن کاروں سے مضبوطی کے ساتھ باندھ رکھا ہے تاکہ دوسری زبانوں کے شائقین تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ اردو والے ابھی تک اسی صدی میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ممبئی دوردرشن کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے کیمرے کو بھی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور اس سے کہہ دیا ہے کہ رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ یہی وجہ ہے کہ ممبئی دوردرشن کے اردو پروگرام اسٹوڈیو ہی میں فلم بند کیے جاتے ہیں اور کیمرہ باہر کی دنیا کا اجالا کبھی نہیں دیکھ پاتا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن اپنے ماہرین کا ایک وفد ہندوستان بھیجے اور وہ ممبئی دوردرشن کے لائق افسران سے ملاقات کر کے ان سے تبادلۂ خیال کرے اور ان سے یہ سیکھے کہ کم سے کم خرچ میں اردو والوں کے لیے معیاری پروگرام کس طرح بنائے جاسکتے ہیں۔ کیا ممبئی دوردرشن اس پاکستانی وفد کی مہمان نوازی کے لیے تیار ہے؟ کیا ممبئی دوردرشن تک ہماری آواز پہنچ رہی ہے؟

◻◻

غزلیں

پاگل عادل آبادی

گنجے سر پر بال اُگانا اپنے بس کی بات نہیں
پھر سے جوانی واپس لانا اپنے بس کی بات نہیں

بولو تو میں بنوادوں گا تاج محل اک سونے کا
لیکن راشن کارڈ بنانا اپنے بس کی بات نہیں

پولیس کیا ہے فوج بلالو لیکن اتنا یاد رہے
قرضہ لے کر پھر لوٹانا اپنے بس کی بات نہیں

نیتاؤں کے کاٹے کا تو منتر ہے نا انجکشن
سانپوں کو پھر دودھ پلانا اپنے بس کی بات نہیں

ریل منسٹر اُن کا سالا جیل منسٹر ہے سسرا
چوروں کو اب جیل بھجانا اپنے بس کی بات نہیں

اُن کی میری ایج میں یارو فرق ہے کچھ ہی منٹوں کا
آنٹی کہہ کر ان کو بُلانا اپنے بس کی بات نہیں

کُتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی سیدھی کبھی بھی ہو پچ نیئں
مولانا کو راہ پہ لانا اپنے بس کی بات نہیں

اپنے دیش کی روکھی سوکھی روٹی کھاکر خوش ہوں میں
دوبئی جاکر اونٹ چرانا اپنے بس کی بات نہیں

میں بھی دس بچوں کا باوا وہ بھی اماں بارہ کی
پول پہ چڑھ کے فیوز اڑانا اپنے بس کی بات نہیں

○

محمود نشتر (حیدرآباد)

مرغ اور مچھلی اگر مہنگے ہیں کیوں ترسا کریں
اُن کی تصویروں کو لے کر ہاتھ میں چاٹا کریں

کیا مِلا مجنوں کو ناحق مرگیا فرہاد بھی
عشق کے چکر میں اپنی لائف کیوں کچرا کریں

حُسن بے پردہ ہے لیکن عشق شرمیلا تو ہے
کیوں نہ معشوقوں سے عاشق آپ ہی پردہ کریں

پیٹ جن کا شام تک محنت سے بھی بھرتا نہیں
مفت میں لاکھوں ملیں ایسا کوئی دھندا کریں

ہوتے ہی بی۔اے مقدر تو دیکھئے بن گیا
فال نکلا ہے سند کی روز ہم پوجا کریں

میں سُناؤں گا غزل اپنی مجھے کیا عذر ہے
داد ایسی ہو کہ چھت اُڑ جائے آپ اتنا کریں

کس لیے ڈرتے ہو نشتر پیار ہے چوری نہیں
بے خطر بڑھتے ہی جاؤ لوگ چِلّایا کریں

○

مرزا کھونچ (بہار)

آپ تو صاحبِ گفتار ہوئے جاتے ہیں
رہنمائی کے بھی حقدار ہوئے جاتے ہیں

ہائے کیا رنگِ زمانہ ہے کہ بوڑھے ماں باپ
اپنی اولاد پہ بھی بار ہوئے جاتے ہیں

جس کا پیشہ ہے یہی، راہ زنی قتل وخون
آج وہ قوم کے سردار ہوئے جاتے ہیں

دیکھئے کیسے کمیشن کا نوالہ کھاکر
قوم کے غم میں وہ بیمار ہوئے جاتے ہیں

غیر تو غیر ہیں شاگرد بھی اپنے مرزا
میرے اشعار سے بیزار ہوئے جاتے ہیں

☆

پرویز یداللہ مہدی

(دوسری قسط)

چڑھنا ہمارا دوردرشن کے دار پہ

خدا خدا کرکے وہ تاریخ ساز گھڑی آگئی جس میں دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ ہم نے دور درشن کیندر کے فلور پر قدم رنجہ فرمایا، فلور منیجر صاحب نے بانہیں پھیلا کر اور دیگر عملے نے آنکھیں پھاڑ کر ہمارا استقبال کیا۔ فلور منیجر صاحب نے ہمیں میک اپ روم میں دھکیل دیا۔ میک اپ روم میں پہلے سے موجود ایک ہمدرد ذی روح کے حلیے بشرے اور جثے نے ہماری روح قبض کرلی، موصوف کے چہرے کی سختی و کرختگی صاف اس بات کی چغلی کھارہی تھی کہ ماضی قریب میں ضرور جنگلی جانوروں کو بزور شمشیر سدھانے کے کام پر مامور رہے ہیں موصوف کی ہیئت کذائی نے ہم پر ہیبت طاری کردی اور عالم یہ تھا کہ ہمارے لیے نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن، وہ تو فلور منیجر صاحب کا خدا بھلا کرے یہ کہہ کر ہمارے جاتے ہوئے ہوش و حواس کو لوٹا لائے۔ ہمارے کیندر کے میک اپ روم انچارج ہیں اور ان کے ہاتھوں کا کمال یہ ہے کہ جن چہروں کو معمولی اسٹل کیمرہ (STILL CAMERA) بھی ایک ہی جھٹکے میں ریجکٹ (REJECT) کردیتا ہے انھیں اس خوبی سے سجاتے سنوارتے ہیں کہ دوردرشن کا ظالم کیمرہ بھی انہیں ہنستے ہنستے قبول کرلیتا ہے، آپ کی معلومات کے لیے یہاں میں صرف ایک ہی مثال پیش کرتا ہوں اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر بھڑکس بادہ بنگی کو آپ نے دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ کئے جانے والے تقریباً ہر مشاعرے میں دیکھا ہوگا، اللہ معاف کرے موصوف کی صورت شکل تو خیر جیسی بھی ہے اسے مزید بگاڑنے میں قدرت کا کم اور خود موصوف کا ہاتھ زیادہ ہے سچ کہتا ہوں آدمی اگر انھیں خواب میں بھی دیکھ لے تو مارے ڈر کے بیدار ہوجائے لیکن ہمارے میک اپ روم انچارج کی باکمال انگلیوں نے جب جب ان کے چہرے کو چھوا ہے ان کا حلیہ ہی بدل دیا ہے درشک انھیں دیکھتے ہیں تو بس دیکھتے رہ جاتے ہیں جہاں ان کا کلام نہیں چلتا چہرہ چل جاتا ہے!۔۔۔ میک اپ روم انچارج نے یوں ہمیں اپنی تحویل میں لے لیا جیسے ہم آدمی کا بچہ نہیں، مال غنیمت کی پوٹلی ہوں اور سلوک بھی ظاہر ہے ویسا ہی کیا جیسا کہ مال غنیمت کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی پوری قوت کے ساتھ ہم پر ٹوٹ پڑے۔ سب سے پہلے ہمارے سر پر بالوں کے نام پر بطور نمونے کے بچے رہنے والے "باقیات الصالحات" کو بھونڈے خیز ملنگ سنوارا یعنی جو بال زلفوں کی شکل میں کسی درخت کے تنے سے لپٹی ہوئی بیل کی طرح گردن سے چپٹے ہوئے تھے انھیں کنگھے کی مدد سے الٹا کھینچ کر تالو کے بے آب و گیاہ صحرا پر اس طرح پھیلا دیا کہ اس پر کسی نخلستان کا گمان ہونے لگا، جو چند بال پیشانی سے ذرا اوپر سایہ کیے ہوئے تھے انھیں کسی سائبان کی صورت کھڑا کردیا، پھر ہر زاویے سے ہمارے سر کا جائزہ لیا شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی بال تو چھپا رہ نہیں گیا، جب اس طرف سے اطمینان کلی حاصل ہوگیا تو چہرے کی طرف توجہ فرمائی اور چہرے کا بغور مطالعہ

، بعد گویا ہوئے تعجب ہے آپ کے چہرے میں چہرا کم اور آؤٹ لائن زیادہ ہے چہرے کے تین چوتھائی حصے کا داڑھی مونچھوں نے گھیراؤ کر رکھا ہے اور داڑھی مونچھ بھی ایک دوسرے میں اس قدر گڈمڈ ہیں کہ داڑھی کو مونچھوں سے مونچھوں کو داڑھی سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ اس عجیب و غریب وضاحت کے بعد چہرے پر لالی یا ڈر کی تہہ جمائی۔ ہمارے لباس پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے فرمایا: "آپ کا لباس کسی مردے کے کفن سے زیادہ اُجلا اور بے داغ ہے، تو آپ کا کفن دفن کی دکان ہے یا پھر آپ ضرور کوئی لانڈری چلاتے ہیں، خیر مجھے آپ کے پیشہ سے کیا لینا دینا شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ٹی وی کے اسکرین کو سفید رنگ سے خدا واسطے کا بیر ہے، اچھا خاصہ لباس پوش آدمی خواہ مخواہ بے لباس نظر آنے لگتا ہے۔

اس تشریح کے بعد موصوف نے میلے کپڑوں کی ایک گٹھری کھول کر اس میں سے ایک عدد شطرنجی نما شال برآمد ل جو اس قدر میلی کچیلی تھی کہ اس کا اصل رنگ، قریب قریب اپنی پہچان کھو چکا تھا پھر بڑی مہارت سے اس کو کھینچ و پھیلا کر شال کا ایک عدد خیمہ بنایا اور ہمیں اس میں داخل ہونے کی ہدایت فرمائی ہم بڑبڑا کر خیمہ نما شال میں گھس گئے۔

دوردرشن کیندر کے میک اپ روم میں ہمارے چہرے، شرٹ اور حلیے پر نقش و نگار کا سلسلہ جب پورا ہو چکا تو فلور منیجر نے میک اپ روم سے شوٹنگ فلور تک ہماری رہنمائی فرمائی جہاں دیگر شرکائے پروگرام پہلے سے موجود تھے ہمیں منٹ ے جس پروگرام میں ہمیں حصہ لینا تھا وہ اصل میں ایک مباحثہ تھا جس کا موضوع تھا اردو ادب میں طنز و مزاح کا آغاز و ارتقا ہمارے علاوہ اس بحث میں حصہ لینے والے دیگر حضرات تھے علامہ نچوڑ ہمدانی، جو اپنے فکر انگیز بلکہ فتنہ انگیز مقالوں و مضامین میں اردو ادب کی ہر صنف کو اس قدر نچوڑ چکے ہیں کہ اس کا رس بلکہ رس کس یہاں تک کہ بھر کس نکال چکے ہیں۔

علامہ نچوڑ کے ساتھ اردو ادب کے پیر تسمہ پا نقادِ وقت و نباضِ دوراں ڈاکٹر مس۔ جی۔ سنگساری اور شیطان کی طرح مشہور شاعر و دانشور جناب دلدار سامری بھی شریکِ بحث تھے۔ ان دیو قامت ادبی شخصیتوں کے بیچ ہماری حیثیت پِدّی بلکہ پِدّی کے شوربے کے مترادف تھی۔

سچ کہتے ہیں۔ اگر پہلے سے اس بات کا علم ہوتا کہ ہمیں ان قد آور شخصیتوں کے نرغے میں تن تنہا چھوڑا جا رہا ہے تو بخدا ہم دوردرشن کیندر کا رُخ بھی نہیں کرتے۔ ہمیں ان حضرات کے پہلو بہ پہلو پروگرام میں پیش کرکے غالباً اربابِ دوردرشن یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دوردرشن وہ تاریخی گھاٹ ہے جہاں شیر اور بکری کو ایک ساتھ پانی پلایا جاتا ہے۔ ہم چونکہ دوردرشن کے اربابِ حل و عقد کی چال میں بُری طرح پھنس چکے تھے لہٰذا سوائے مسکرانے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان تینوں جغادری حضرات سے ہماری پہلے سے صاحب سلامت تھی لیکن میک اپ کی تہوں اور جسم کے گرد لپٹی ہوئی خیمہ نما شال نے ہمیں شاید کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا دیا تھا۔ اس لیے کوئی بھی ہمیں پہچان نہیں پایا۔ چنانچہ ہمیں ایک بار پھر اپنا مکمل و مفصل تعارف کروانا پڑا۔ علامہ نچوڑ حیرت سے بولے: "بھئی برخوردار، یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔"

ڈاکٹر سنگساری نے فقرہ کسا "بہتیرے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو شال اوڑھے دیکھا ہے لیکن خدا کی قسم اس طرح گلے گلے شال میں ڈوبے ہوئے کسی ادیب کو پہلی بار دیکھا ہے!"

جناب دلدار سامری فقرے بازی میں بھلا کیوں پیچھے رہتے بولے دوردرشن والے آج کی سنجیدہ بحث کو مزاحیہ ٹچ دینے کے لیے مشرقِ وسطیٰ سے کسی شیخ کو پکڑ لائے ہیں کہیں سے!

قصہ مختصر یہ کہ اس وقت جتنے منہ اتنی باتیں والا محاورہ پوری طرح صادق آیا اور منہ چونکہ صرف تین عدد تھے اس لیے فقرے بازی کا سلسلہ دراز نہیں ہو پایا اور ہمارے نشستیں سنبھالتے ہی ٹی وی کیمرہ حرکت میں آ گیا!

کنوینر جناب دلدار سامری نے حسبِ عادت اپنی لمبی لمبی زلفوں میں بڑے اسٹائل سے اپنی پتلی پتلی انگلیاں گھماتے ہوئے بحث کا آغاز کیا۔

"جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں آج کی بحث کا موضوع ہے اردو ادب میں طنز و مزاح کا آغاز و ارتقاء" جناب سامری نے اتنا ہی کہا تھا کہ علامہ نچوڑ ہمدانی نے حسبِ عادت اپنی ٹانگ اڑائی۔ "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں! آج کی بحث کا موضوع بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے لیکن اصل میں یہ تین الگ الگ موضوع ہیں اور تین یوں کہ پہلا موضوع ہے اردو، دوسرا ادب اور تیسرا طنز و مزاح گویا تین موضوعات کو ایک موضوع میں سمو کر کوزے میں دریا کو سمو دیا گیا ہے۔"

ڈاکٹر سنگساری نے جھٹ سے علامہ کی بات کی تائید فرمائی "بالکل درست فرمایا آپ نے، دراصل ہمارے عزیز دوست دلدار سامری صاحب کے منتخب کردہ مباحثوں اور ایک ہی چھت کے نیچے مختلف اشیاء بیچنے والے ڈپارٹمنٹل اسٹورس میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے جہاں گاہک کا ایک بار داخل ہونا شرط ہے پھر بلا ضرورت کچھ نہ کچھ خریدے بنا واپس آ ہی نہیں سکتا بہرحال علامہ موصوف نے ایک عدد موضوع میں سے تین عدد موضوعات ڈھونڈ نکالے ہیں۔ میرے ناقص خیال سے اس میں ایک عدد چوتھا موضوع بھی ہے!" علامہ نے حیرت سے مداخلت فرمائی "چوتھا موضوع؟ یہ بھلا میرے ذہن کی گرفت سے کیسے بچ گیا! آخر یہ چوتھا موضوع کون سا ہے؟" ڈاکٹر سنگساری مسکرا کر بولے "موضوع بحث کے عنوان کا آخری ٹکڑا یعنی آغاز و ارتقاء"

دلدار سامری گڑبڑا کر بولے "آغاز و ارتقاء؟" ڈاکٹر سنگساری شاعرانہ لہجے میں بولے جی۔ آغاز و ارتقاء بلکہ یہ بھی اپنے آپ میں دو موضوع ہیں۔ ایک آغاز، اور دوسرا ارتقاء"

علامہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے "گویا آج ہم جس موضوع پر بحث کر رہے ہیں وہ کسی طرح سرکار کے پنج سالہ منصوبے سے کم نہیں ہے" ڈاکٹر سنگساری فوراً بات اُچک کر بولے "بالکل اسی لیے میری حقیر رائے میں پہلے اردو کے موضوع پر کچھ گفت و شنید ہونی چاہیے، پھر ادب پر، پھر طنز و مزاح پر اور اس کے بعد آغاز و ارتقاء پر"

علامہ نچوڑ ہمدانی اور ڈاکٹر سنگساری کو موضوع گفتگو سے زیادہ موضوع کے عنوان کی بال کی کھال نکالنے پر آمادہ دیکھ کر جناب دلدار سامری نے سٹپٹا کر گزارش کی۔ "میں آپ حضرات کی اس خیال آرائی سے صد فیصد متفق ہوں لیکن تنگیٔ وقت کو دیکھتے ہوئے ہم اگر صرف طنز و مزاح کے موضوع پر بحث و مباحثہ کریں تو مناسب ہوگا۔"

اتنا کہہ کر جناب سامری نے ہماری طرف دیکھا، ان کا دیکھنا ہی تھا کہ ہمیں احساس ہوا کہ ہم یہاں خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ بحث میں حصہ لینے کے لیے آئے ہیں۔

علامہ نچوڑ ہمدانی اور ڈاکٹر جی۔ جی۔ سنگساری چونکہ موضوع بحث کے لاتعداد حصے بخرے بالکہ ٹکڑے ٹکڑے کر چکے تھے لہٰذا ہر دو حضرات کے آپریشن چیر پھاڑ سے گھبرا کے کنوینر بحث جناب دلدار سامری ناچیز کی طرف رجوع ہوئے اور پہلا میزائل داغا "اردو کے بعض اعلیٰ درجے کے نقاد و دانشور حضرات طنز و مزاح کو دوسرے درجہ کا ادب کہتے ہیں! کیا آپ اس سے متفق ہیں؟"

ہم نے اپنی تمام تر ہمت سمیٹ کر جواب میں منہ کھولا ہی تھا کہ ایک عدد مکھی کسی بمبار طیارے کی طرح ہمارے کھلے ہوئے دہن میں لینڈ (LAND) کرنے کے ارادے سے پتہ نہیں کدھر سے بھنبھناتی ہوئی نمودار ہوئی۔ مکھی کی اس اچانک یلغار پر یاد آیا کہ

دور درشن کے اکثر پروگراموں بالخصوص مباحثوں میں شرکا حضرات سے زیادہ تعداد مکھیوں کی ہوتی ہے نتیجتاً شرکائے پروگرام کی زیادہ تر توجہ موضوع و بحث کے بجائے مکھیوں اور ان کی حرکات و سکنات پر مرکوز ہوتی ہے بلکہ بعض شرکا تو [illegible] اور ہڑبڑاہٹ [illegible] مکھیاں مارنا شروع کر دیتے ہیں (محاورتاً نہیں حقیقتاً) ظاہر ہے جو مکھیاں دور درشن کے [illegible] بخشی ہوئی ان کی نظر میں تو وادی [illegible] بساط کی بھلا کیا بساط! ان مکھیوں کی وجہ سے دور درشن کے عملے سے [illegible] سرزد ہوتی رہتی ہیں یا کوئی غلطی کسی لطیفے کو جنم دیتی ہے تو کوئی کثیفے کو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ایک [illegible] خاتون نیوز ریڈر کو ایک عدد مکھی نے اس بری طرح زچ کیا کہ ایک اہم سرخی کی ادائیگی میں موصوفہ سے [illegible] سرخی تھی ۔۔۔ "گن تنتر دیوس کے اوسر پر پردھان منتری کا دیش واسیوں کے نام لال قلعے سے کھلا پیغام" [illegible] اور یہ بے پیر دار سے پریشان خاتون نیوز ریڈر نے مذکورہ سرخی کچھ اس طرح پڑھی! "گن تنتر دیوس کے اوسر پر پردھان [illegible] دیش واسیوں کے نام لال قلعے سے کھلا پیغام"!

اس لطیفہ نما واقعہ کا یاد آنا تھا کہ نظروں کے سامنے بھنبھناتی ہوئی ایک مکھی ہمیں اسکاڈ میزائل [illegible] ہم پلہ دکھائی دینے لگی، چنانچہ ہم نے اپنا کھلا ہوا منہ فوراً بند کر لیا، ہماری اس حرکت کو جناب ساحری نے پسند نہیں کیا [illegible] علامہ بچوڑ نے غالباً اسے ہماری مصلحت پر محمول کیا لہٰذا خود مورچہ سنبھال کر شروع ہو گئے۔ جو لوگ طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب کہتے ہیں، ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے سے پہلے ادب میں خود ان کے درجے کا تعین ضروری ہے یعنی اردو ادب [illegible] کا درجہ اگر مسلم ہے تو ان کی رائے سو فیصدی صحیح ہے اور اگر ادب میں ان کا مقام مشکوک ہے تو ان کی مذکورہ رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کیوں ڈاکٹر سنگساری! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں: ڈاکٹر سنگساری نے فی الفور جواب دیا، ہرگز نہیں۔ آپ کی بات [illegible] سچ پوچھئے تو ادب میں درجہ بندی کی لعنت نے پچھلے چند برسوں میں زور پکڑا ہے۔ ورنہ اب سے پہلے ادب [illegible] تھا یہ تو حالیہ عرصے میں چند بے ادبوں نے ادب کو بھی مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے جیسے ادب برائے پروپیگنڈہ [illegible] ادب برائے عبادت، ادب برائے غیبت وغیرہ وغیرہ!" ڈاکٹر سنگساری نے جیسے ہی اپنی بات ختم کی، [illegible] ساحری نے طنزیہ [illegible] فقرہ کسا "گویا آپ حضرات ادب میں درجہ بندی کے قائل نہیں ہیں!"

ڈاکٹر سنگساری نے برجستگی سے جواب دیا "بالکل نہیں شاید علامہ صاحب بھی میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ جو لوگ ادب کو مختلف خانوں میں الگ الگ درجوں میں تقسیم کرتے ہیں وہ اس نظر تنگ لنظر کوتاہ ذہن ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں ادب دراصل "زچگی خانے" سے شروع ہو کر "مردہ خانے" میں دم توڑ دیتا ہے!!

اپنی بات پوری کر کے ڈاکٹر صاحب دیگر شرکائے بحث، یہاں تک کہ پروگرام میں دخل در معقولات کرنے والی مکھی کو بھی نظر انداز کر کے راست کیمرے کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اور یوں جس بات کی وجہ سے موصوف ساری اردو دنیا میں بدنامی کی حد تک مشہور تھے، اس پر مہر تصدیق ثبت کر [illegible] یعنی موصوف کے تعلق سے عام خیال یہ ہے کہ ٹی وی کے ہر پروگرام میں ریکارڈنگ کے دوران میں آنجناب دیگر شرکائے محفل کی [illegible] کم سے کم اور کیمرے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں۔ ٹی وی کیمرے کی طرف موصوف کی خصوصی توجہ کے تعلق [illegible] ہمارا خیال یہ ہے کہ ان کی نظر بظاہر کیمرے کی طرف ہوتی ہے لیکن اصل میں کیمرے کے اس پار [illegible] [illegible] متوقع ناظرین ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ متوقع ناظرین سے ہماری مراد ان ناظرین سے ہے جن کا شمار [illegible]

کے وقت "غائبین" میں اور ٹیلی کاسٹ کے وقت حاضرین میں ہو۔ ہے یعنی پروگرام کے ٹیلی کاسٹ کے وقت یہ ناظرین بشمول پردہ نشین خواتین اپنے اپنے ٹی وی سیٹ کے روبرو، دو زانو بیٹھ کر پورے سے پورے پروگرام کو بغور دیکھتے ہیں تاکہ پروگرام کے ایک ایک لفظ کو پوری توجہ کے ساتھ سننے اور بعد ازاں یک در یرے کے سر دھنتے ہیں۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے متوقع ناظرین کی تعداد ہمیشہ کثیر ہوتی ہے قلیل کبھی نہیں ہوتی حالانکہ خود اردو اب محض اقلیتوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے لیکن ڈاکٹر سنگساری کی دور رس نظروں کا کمال یہ ہے کہ وہ اقلیت میں اکثریت کے جلوے دیکھتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف متوقع ناظرین سے یکجہتی ربط قائم کرنے میں اس قدر محو ہوئے کہ سرتاپا جگر مرادآبادی کے اس شعر میں ڈھل گئے۔ ؎

دُنیا کے ستم یاد نہ ان کی ہی جفا یاد ؎ اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد (جاری)■

غزلیں

کوثر صدیقی
(بھوپال)

ایک چھپّر بھی نہیں ہے سر چھپانے کے لیئے
چلئے اب فٹ پاتھ پر بستر بچھانے کے لیئے

دیکھتا تنھا چاند تارے توڑ کر لانے کا خواب
چند جگنو ہی ملے گھر کو سجانے کے لیئے

لے کے آتا ہوں ابھی گیسو سکھانے کی مشین
ابر میں چھت پر نہ جا گیسو سکھانے کے لیئے

آج تو بونس ملا ہے آج تو راجہ ہوں میں
آج تو ہوٹل چلیں گے کھانا کھانے کے لیئے

یوجنا کی خالی ہانڈی ٹھنڈے چولہے پر نہ رکھ
بنں گے بھوکے لوگوں کو اُلّو بنانے کے لیئے

کوثرؔ اُن کے سارے عاشق اُن سے باغی ہوگئے
ایک ہم ہی رہ گئے نخرے اُٹھانے کے لیئے

○

سراؔج نرملی

گوکل کا شام ہو یا کہ رادھا کا شیام ہو
میرے ہی جیسا، جورو کا وہ بھی غلام ہو

فٹ پاتھ پر ہو صبح تو تھیٹر میں شام ہو
آوارہ زندگی کا یوں ہی اختتام ہو

کنٹراکٹر کا بل نہ ہو اِن کیاش جب تلک
تب تک گرے نہ اتنا تو مضبوط ڈیام ہو

ہوں گے مصلّیان میاں! رفتہ رفتہ کم
مسجد کا پیش امام اگر شیخ امام ہو

رحمٰی و رحم کے واسطے دے گا نہ قرض وہ
ممکن نہیں کٹھور، دیا رام، رام ہو

سکسیس رہے گا تیرا ہنی مون اے سراؔج
گر واپسی میں دونوں کو سردی زکام ہو

○

محمد روشن علی کرنلؔ
(کریم نگر)

اُن کی ہاں میں ہاں ملانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی
روٹھتی ہیں تو منانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی

نوکری ہے اُن کا پیشہ گھر کے رکھوالے ہیں ہم
کوئی آئے غرغرانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی

اُن کے گانے پر فدا ہوکر کیا اُن سے نکاح
گائیں وہ، طبلہ بجانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی

ہم تو شوفر ہی رہے پر وہ منسٹر بن گیئں
اُن کو آفس چھوڑ آنا، اپنی ڈیوٹی ہے یہی

ہم بنیں لیڈر منسٹر یا ہوں نیتا دیش کے
اِک گھوٹالہ کر دکھانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی

شاعروں نے کیا کہا پلّے تو کچھ پڑتا نہیں
واہ واہ نعرے لگانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی

شاعروں کی صف میں کرنلؔ آکے روشن ہوگئے
غم کے ماروں کو ہنسانا اپنی ڈیوٹی ہے یہی

فیروز حیدر (حیدرآباد)

کانا دجّال

اور ہم بُری طرح بوکھلا اُٹھے جب ایک دن مرزا نے یہ کہا کہ "دجّال آچکا ہے"۔ یہ سنتے ہی ہماری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا پیروں تلے زمین کھسکنے لگی۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک کرخت آواز ہمارے کان کے پردے پھاڑ گئی۔ غور کیا تو پتہ چلا کہ جس کو ہم زندگی کی آخری گڑگڑاہٹ سمجھ بیٹھے تھے وہ تو کسی ٹرک کے ہارن کی آواز اور اُس کے بیمار انجن کی گڑگڑاہٹ تھی۔

اور جب ہمارے زائل ہوتے ہوئے ہوش و حواس یکجا ہونے لگے تو مرزا نے پھر کہنا شروع کیا "اس سے منسوب ساری فتنہ انگیزیاں پوری ہو رہی ہیں اور پھر بھی ہم سب غفلت میں پڑے ہیں"۔

ہم نے کہا۔ "یار مرزا پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ صاف صاف کہو کیا واقعی کانا دجال آگیا ہے؟ کیا وہ ہمارے ملک میں ہے؟ کیا وہ ہمارے ہی شہر میں ہے؟ کیا تم اُسے جانتے ہو۔ کیا وہ ہمارے فلمی ولینوں کی طرح ہے؟ کیا وہ ہمارے لیڈروں کی طرح ہے"؟

جہاں ہماری بے چینی سوالیہ جملوں کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی وہیں اُس سے زیادہ ڈر اور خوف سے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر بعد سانسیں تتر بتر ہونے لگی تھیں۔

ذہن ایک طرف کانا دجال کون ہے کی فکر میں تھا ساتھ ہی اپنے اور دنیا کے آخری وقت کے تصور سے طبیعت لرز رہی تھی۔ یکبارگی جی کڑا کر کے ہم نے سوچا کہ ڈرنے سے کیا فائدہ۔ ایک روز سب کو فنا ہونا ہی ہے۔ شاید یہی وقت ہے کہ ڈرنے کی بجائے اپنے اعمال پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔ اور اعمال کی چھٹنی لے کر پہلے اعمال صالحہ اور غیر صالحہ کو جدا کیا جائے۔ پھر غیر کو صالحہ سے دور کیا جائے۔ شیطان نے اس وقت بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ لفظ صالحہ کے ساتھ ہی کالج کی دوست صالحہ کا چہرہ آنکھوں میں پھر گیا۔ نہ جانے وہ اِس وقت کہاں ہو گی؟

اپنے پریشان کن خیالات کو پرے ہٹا کر ہم نے مرزا کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ ایسا لگا مرزا ان باتوں سے قطعی پریشان نہیں ہیں۔ گویا انہوں نے اعمال نامہ کو "نوٹری" (NOTARY) سے تصدیق کروالیا ہو۔ آخر ہماری عادت جو ہے کہ جن امور کی صداقت سے خود مطمئن نہ ہوں اُسے دوسروں سے تصدیق کرواتے ہیں۔

مرزا ابھی ہمارے چہرہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ پھر مرزا نے کہا "تم اس سے انجان نہیں ہو۔ تم اُسے

ـ اچھی طرح جانتے ہو۔" یہ سُن کر ہماری آنکھوں کے سامنے سارے دوستوں کے چہرے یکے بعد دیگرے گھومنے لگے۔ نہیں نہیں
نوں میں نہیں ہو سکتا۔ ان سب کی تو دونوں آنکھیں اچھی خاصی ہیں۔

ہمیں اسی کشمکش و پیچ میں دیکھ کر مرزا نے پھر کہا۔ چلو تمہاری مشکل کچھ آسان کرتا ہوں۔ وہ دجّال تمہارے گھر میں ہے۔
مرزا کے یہ الفاظ ہم پر بجلی کی طرح گرے۔ ایسا لگا کہ ہم تو کسی بارود کی سرنگ پر زندگی گزارتے آئے ہیں۔ اکلوتی بیوی اور
بچوں کے چہرے نظروں میں جم گئے۔ یہ کیا اس وقت تو گھر کا ہر فرد یک چشم نظر آ رہا تھا۔

ہماری حالت غیر ہونے لگی۔ مرزا کو شاید اُس وقت ہم پر کچھ رحم آیا۔ اور کہنے لگے۔ اور سنو۔ وہ تمہارے گھر کی ایک اہم شئے ہے۔
ن کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہتے۔ صبح سے رات دیر گئے تک اُس کی زبان چلتی رہتی ہے۔ پھر بھی تمہیں عزیز ہے۔ گھر کے سارے
جب سو جاتے ہیں تب اُسے آرام نصیب ہوتا ہے۔ اب تو بتاؤ بھلا کون ہے وہ ؟

مرزا کی بیان کردہ ساری صفات پر غور کیا تو ذہن میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ہم نے کپکپاتی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
تو کیا۔ بیوی ـــــــــ مرزا کے منہ سے ایک زوردار قہقہہ اُبل پڑا۔ اور کہنے لگے نہیں یار بیوی نہیں۔ ٹی وی۔ ٹی وی۔
اور قبل اس کے کہ ہم اپنا کھسیانا پن دور کرتے مرزا اپنے قول کی تائید میں کہنے لگے۔" تم ہی کہو۔ کیا ٹی وی دیکھ کر تمہیں اُس کا
رین سیاہ پیشانی پر چپکی ہوئی ایک آنکھ کی طرح نظر نہیں آتا۔ اور کیا یہی وہ ایک چشم نہیں جو غیب کی خبریں پہنچاتا ہے لوگوں
ہنسنے اور رونے پر مجبور کرتا ہے۔ کیا یہی وہ یک چشم نہیں جو اپنے پروگرام میں مشغول رکھ کر بھلائی سے روکتا ہے۔ کیا یہی وہ یک چشم
جس سے نشر ہونے والی موسیقی سے لوگ نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے رنج والم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

مرزا بلا تکان کہے جا رہے تھے،

ہم نے بہت کوشش کی کہ مرزا کے سامنے ٹی وی کی افادیت اس کے مثبت پہلوؤں اور اہمیت پر ایک زوردار
تقریر کریں لیکن کچھ نہ کہہ سکے۔

ہم نے مرزا کے اس بیان پر غور کیا تو احساس ہوا کہ اس میں مبالغہ ضرور ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج ہر شخص ٹی وی
ی کے جنون میں مبتلا ہے۔ البتہ مرزا جن فتنوں کو بے جان ٹی وی کے سر ڈال رہے تھے اُن فتنوں کی جڑ ٹی وی نہیں۔ بلکہ اسٹار
وی اور ڈش انٹینا کے ذریعہ نشر ہونے والے واہی تباہی پروگرام والے چینل ہیں۔

ایک روز مرزا نے ایک واقعہ سنایا کہ جب وہ اپنے کسی دوست کے گھر پر تھے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے لڑکے کو بلا کر کہا۔
بیٹے انکل کو abcd سناؤ۔ لڑکا فوری لپک لپک کر گاتے ہوئے سنانے لگا۔ A FOR ASIA TV B FOR BBC
C FOR CITI CABLE اور D FOR DOOR DARSHAN اتنا کہہ کر لڑکا خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔
ر والد بزرگوار کے چہرے پر پھیلی فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ کر مرزا کو ایسا لگا کہ وہ اپنے لڑکے کی چینل خوانی پر اسی طرح خوش
ہو رہے ہیں جیسے پہلے کوئی باپ اپنے لڑکے کی تسمیہ خوانی پر خوش ہوتا تھا۔

ٹی وی بینی کے ہم بالکل خلاف نہیں ہیں لیکن ہم اس بات کے قائل ہیں کہ تفریح کو بطور تفریح اور بقدر تفریح کی
حد تک رکھا جائے۔ ہر وقت ٹی وی دیکھتے رہنے سے لاشعوری طور پر ٹی وی کے پروگرام اور ان کے عنوان ذہن پر
نقش ہو جاتے ہیں۔ اور جو بات جیسے کا بھی جُزبن جاتے ہیں۔

ایک وقت یہ مرزا کو ... کے گھر گئے کال بیل بجانے پر ایک کم عمر لڑکی نے دروازہ کھولا جو شاید جیونگم

چل رہی تھی۔ مرزا نے لڑکی سے پوچھا "ابا گھر پر ہیں؟"۔ منی نے کہا "زبان سنبھال کے" اور چیونگم کا تھوک نگل کر جملے کو پورا کیا "دیکھ رہے ہیں ٹی وی پر" ـــــ مرزا نے کہا جاؤ ابا سے کہو مرزا انکل آئے ہیں۔

لڑکی نے کہا۔ آپ کمرشیل بریک میں آیئے۔ کیوں کہ ابا ٹی وی کے سامنے سے صرف اُس وقت ہی اُٹھتے ہیں۔

مرزا نے کہا تم جاکر ابا سے کہو کہ بہت ضروری کام ہے۔ لڑکی نے کہا "تو تو میں میں" اور چیونگم کا بچا کچا تھوک نگل کر کہنے لگی۔ "ہو جائیگی۔ امی کے ساتھ"۔ ہماری امی ٹی وی دیکھنے کے دوران خلل برداشت نہیں کرتیں۔ تب تو روز ہوتی ہوگی مہابھارت" مرزا نے شرارت سے کہا لڑکی بولی "مہا بھارت نہیں صرف تو تو میں میں"۔ وہ بھی ہفتہ میں دو بار پیر اور جمعرات کو رات آٹھ بجے"۔

مرزا نے کہا پھر باقی دنوں میں کیا ہوتا ہے"؟

کہنے لگی ایک دن "تانک جھانک"۔ وہ بھی صرف پڑوسن کے گھر۔ مرزا نے پوچھا کون کرتا ہے "تانک جھانک"؟

کہنے لگی۔ "ہم پانچ" ـــــ مرزا نے کہا تم تو صرف چار بھائی بہن ہو ـــــ لڑکی نے کہا کہنے میں کیا حرج ہے۔ چار سے پانچ تو ہم اسی طرح ہو جائیں گے جس طرح ہم ایک سے چار ہوئے"۔

لڑکی کی پروگرام دانی پر مرزا حیران ہوگئے اور وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئے ـــــ بچوں پر ہی کیا منحصر ہے۔ بعض بزرگ حضرات بھی ٹی وی کے جنون میں اسی طرح مبتلا رہتے ہیں۔ اور ضعیف العمری کی پرواہ کئے بغیر اس جوش و خروش سے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں کہ ـــ

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے۔

خواتین بھی اس ٹی وی کے چنگل سے آزاد نہیں ہیں۔ اور اپنے پسندیدہ پروگرام نہ صرف پابندی سے دیکھتی ہیں بلکہ [illegible] بھی کرتی ہیں۔ اور انداز کچھ ایسا ہوتا ہے گویا کہہ رہی ہوں کہ "الحمد للہ سیریل شروع ہونے سے آج تک ایک بھی قسط قضا نہیں ہوئی"۔

ٹی وی کے ذریعہ ہی ہر کس و ناکس کرکٹ کا شوقین اور دیوانہ ہو چلا ہے بعض اہم میچ کے دن تو ایسا بھی دیکھا گیا کہ شہر کی سڑکیں سنسان اور بازار ویران ہوگئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے کرفیو لگ گیا ہو۔ سچ ہے کہ جب انسان کو کسی چیز کا چسکہ لگ جائے تو بغیر اس کے رہا نہیں جاتا۔ چاہے وہ چسکہ ٹی وی بینی کا ہو یا کرکٹ کا۔ بالکل اس مصرعہ کے مصداق کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

ادھر جب سے ڈے اینڈ نائٹ کرکٹ میچوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے لوگ دعوتوں اور بریانی کی بھی پرواہ کئے بغیر ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور ادھر بے چارہ میزبان میچ کے ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھا رہ جاتا ہے ـــ ایسی ہی سچویشن سے پریشان ہوکر ایک صاحب نے دعوت نامہ پر جلی حرفوں میں چھپوا دیا کہ دعوت میں ٹی وی کا معقول انتظام ہے۔

انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص ما دے ہر شے سے کچھ نہ کچھ توقع ضرور رکھتا ہے۔ اور ہر وقت یہ توقع رکھتا ہے کہ اس شئے سے ہمیشہ اسکا متوقع نتیجہ برآمد ہوگا۔۔ جیسے پچھلے دنوں کے بیچ پاکستان میں اسلامی قوانین پر سختی اور شدت سے عمل آوری ہونے لگی۔ ان دنوں ٹی وی سے سارے غیر شرعی پروگرام بند کر دیئے گئے۔ اکثر و بیشتر مذہبی تقاریر اور وعظ گوئی کے پروگرام ہی نشر کیئے جانے لگے۔ ایک دیہاتی جس کو ان باتوں کا پتہ نہیں تھا۔ اور جو رنگین پروگرام دیکھنے کا عادی ہو چلا تھا یہ سمجھ بیٹھا کہ اسکا ٹی وی خراب ہو گیا ہے۔ مکینک کے پاس جاکر کہنے لگا۔ او ئے مکینک۔ میرا ٹی وی درست کر دے۔ یار اس میں تو کوئی ملا گھس گیا ہے"۔ بہر حال مرزا کے دجال والے نظریہ سے ہم متفق ہوں یا نہ ہوں مگر ایسا نہ ہو جائے کہ ٹی وی بینی کے جنون میں ہم سب اسی طرح مبتلا رہیں اور دجال اچانک ظاہر ہو جائے۔ شاید اس وقت ہمیں سوچنے کا بھی موقع نہ ملے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ■ □

سید طالب حسین زیدی
(حیدر آباد)

(آخری قسط)

سگریٹ فوبیا

Cigarette Phobia,

دوسری عالمگیر جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد برما کے احوال میں کرنل صاحب رقم طراز ہیں :۔
"وہ لاشیو[٭] میں ایک چینی رئیس کے ہاں دعوت چائے کہ جس کی لطافت ... تمام تر غبار خاطر دھو ڈالا اور وہ کیف و سرور بخشا کہ قلعہ احمد نگر[٭] کے اسیروں کو بھی رشک آ جائے"
یاد آیا، کرنل صاحب کی ملائم چٹکیوں میں درد کی ٹیس نہیں بلکہ میٹھی میٹھی کسک کی حلاوت ہے۔ آپ کا یہی تو کمال ہے کہ ان کا ذہین قاری ... برہم نہیں ہوتا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی کلیاں کھل اٹھتی ہیں۔ یہ دونوں ... اور "اردو بیاری" کے مایۂ صد افتخار ادیب ... کتنا ہی مولانا کے چٹکی لیں مگر ان چٹکیوں کے پردے میں یہاں ان کی ... سے والہانہ چاہت اور عقیدت ... خوشبو آرہی ہے اور صاف دکھائی دے رہا ہے کہ یہ کبھی "غبار خاطر" اور "تذکرہ" ... سے پہلے "متصلاً" ایک سگریٹ بھی ضرور سلگا لیتے ہیں اور کش لینے کے بعد ہی صفحہ الٹتے ہیں ......
برسوں پہلے کی بات ہے "الہلال" کے دور میں مولانا کی قطب مناری بلند نامتی سے مرعوب ان کے ہم عصر ... ان کے پاشنے لگتے تھے، خوب ان کے منہ آیا کئے مگر منہ کی کھا کے رہ گئے اور انہیں منہ کی کھلانے میں بسا اوقات مولانا ... "... شاہی" سے بھی خوب کام لیا ہے۔[٭]
فتح پور کی ایک بلی نے تو قطب صاحب کی اس لاٹ کو کھمبا سمجھ کر خوب نوچا بھی تھا، مگر نتیجہ ...؟ اپنے ہی ناخن ... بیٹھی اور قطب از جا نمی جنبد'........
سگریٹ کے باب میں برصغیر نے دوسرا صاحب ذوق اور اسٹائلش اسموکر جو پیدا کیا ہے وہ ہے ہندوستانی ... کا البیلا، چھیل چھبیلا، طرحدار ویلن "پران"، ادھر وہ اس کا "بانکا" جیسا ٹھاٹھ دیمپ کی کمر میں ہاتھ کا سہارا دے کر اوئے میری "چھمک چھلو" کہتے ہوئے اپنے روبرو ٹھایا اور ایک ادائے بانکپنانہ سے سگریٹ کے کش لے کر مسلسل ... کے چھلے بنا بنا کر اس کے چہرے پر اڑاتا اور بند ہوتی ... بل کھا کر ذرا ہوتا اور ادھر اس ... نظر حسرت بھری نظر ...

٭ لاشیو برما کے کسی شہر کا نام۔ ٭ یہاں مولانا آزاد، پنڈت ... اور دیگر قائدین ... سالہا سال ... اور ... کی ذاتی ... "غبار خاطر" (خطوط کا مجموعہ) تصنیف ... ٭ تفصیل ... کسی اور موقع پر اٹھا رکھئے۔

ہوئی ہیروئین کا دل ڈانواں ڈول ہو جانا اور اس تمنا کا دل میں کروٹ لینا، کاش! یہ ہیرو ہوتا..... ہال میں اگلی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی پبلک کا بے خود ہو جانا اور منہ میں اُنگلیاں دے کر دلوانہ وار "ٹی ی ی" سیٹیاں بجا کر پیران کی اتباع میں دھوئیں کے چھلے اُڑانا، اُن کا فضا میں تیرنا اور سارے ہال کا دھوئیں سے بھر کر ہماری آنکھوں کو جلانا...... ہائے! بھلا ہو اپنی یاد کا، وہ قصہ ہے دور ماقبلِ تاریخ کا کہ جب آتش جوان تھا، اُسے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دیکھ کر والہانہ بولا جاتا "اُلّا"! سگریٹ بھی مرد کی شخصیت میں کس قدر کشش اور جاذبیت پیدا کرتا ہے "لائیے! ہم سُلگا دیں.؟" اور آج کی محرومی و بے چارگی کا یہ عالم ہوا کہ "اے لوج! یوں لگتا ہے جیسے کریانے کی دکان کا منشی گھسا ہوا پنسل منہ میں دبائے چوس رہا ہو..... کُجا آں شوری شوری کُجا ایں بے نمکی،

ماہرینِ سگریٹیات (بروزنِ نمابیات) نے بعد از "ریسرچ بسیار" اس کی طبع کی ملاوتوں، نزاکتوں کو پانچ پانچ کیفیتوں میں تقسیم کیا ہے، نتیجۂ فکر ملاحظہ ہو اور اس پر ہماری مہرِ تصدیق بھی پیشِ نظر ہے۔ جن پانچ حالتوں میں سگریٹ، اپنے کیف و سرور کی حلاوتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اُس کی طبع نازک مکدر ہو جاتی ہے وہ یہ ہیں!

دھوپ میں۔ بھوک میں۔ آندھی میں۔ ہوا میں اور اندھیرے میں۔

اور وہ پانچ کیفیتیں جن میں اس کا توسن کیف و سُرور مدہوشانہ ہوا پیمائیاں کرتا ہے، اُن کی تفصیل!

سو کے۔ منہ دھو کے۔ نہا کے۔ کھا کے اور اُجالے میں۔

سگریٹ کے رُسوائے زمانہ شیدائی اس "پرچۂ ترکیبِ استعمال" کو آزما دیکھیں اور محققین با تمکین کے حق میں دُعائے خیر کریں (آمین)

ایک وقت وہ بھی تھا کہ فوج میں سگریٹ، رینک (RANK) کی شناخت ہوا کرتا تھا، عام سپاہیوں کو قینچی چھاپ سگریٹ اور کمشنڈ افسروں یعنی "نیم لفٹینوں"، سالم لفٹینوں اور کپتان بہادر کے درجے تک ولز، گولڈ فلیک، پلیئرس وغیرہ راشن میں ملا کرتے تھے اور کرنیل و جرنیل رینک کے افسرانِ اعلیٰ اپنے ہاتھوں میں اسٹیٹ ایکسپریس (ذرا بہ اندازِ عربی) "خمسہ میاۃ خمسہ خمسین" یعنی ۵۵۵، تھری کیسلس، بلیک اینڈ وہائیٹ اور کریون اے کے ٹن لئے کلبوں اور میسوں کی غلام گردشوں میں بہ اندازِ تفاخر گھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔

دوسری جنگ عالمگیر کہ فوج کے حق میں تو یہ اللہ دے اور بندہ لے والا تابناک دور تھا، عام رعایا دانے دانے کو ترس رہی تھی، یہاں تک کہ لندن میں چرچل کی، ولولہ انگیز "دی فار وکٹری" کے بعد یہ اپیل کہ ایثار کے جذبے سے کام لے کر قوم شکر کا استعمال ترک کر دے، کے جواب میں "حوصلہ مند انگریز" نے لبیک کہتے ہوئے اُسی دم اپنے گھر میں رکھی ہوئی چھٹانک بھر شکر بھی حکومت کے حوالے کر دی تھی حتیٰ کہ بکنگھم پیلس کے داروغۂ مطبخ نے بھی شکر کا سارا ذخیرہ سرکاری گودام میں داخل کر دیا تھا اور شاہ جارج ششم بغیر شکر کی چائے پینے لگے تھے۔ اِدھر فوج اپنے میسوں اور کینٹینوں میں دنیا کی ہر نعمت اپنی دسترس میں دیکھ کر آسودگی سے لمبی لمبی ڈکاریں لے رہی تھی۔ گویا، بہ طفیلِ ہٹلر یہ سارا کارخانۂ عیش فقط "تجمل حسین خاں ہی کے لیے بنا تھا".......

اب اگر کبھی کسی کرنیل صاحب کا "ہم نشین" اس جاں فزا زمانے کے اُمنگوں کی راتیں اور بہاروں کے دن کا ذکر چھیڑ دیتا ہوگا تو "اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے" والا معاملہ تڑپا تڑپا دیتا ہوگا۔ خدا جانے اس دور تو یہ شکن میں عشاء کے وضو

- اور ۔ نے اس "دی فار وکٹری" کے ولولہ انگیز جذبے اور رُوح کو کس قدر بے وقعت بنا کر کیسی مٹی پلید کر رکھی ہے۔

سے فجر کی نمازیں پڑھنے والے عابد شب زندہ دار" کرنیل صاحبان" کے نزدیک اپنے اُن راشن کے سگریٹوں کا کیا مصرف تھا جو اُن کی جیبوں (jeeps) کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے" صاحب ذوق"، فلسطینی بچوں کی صدائے بھیک، "سگارہ، رفیق، واحد سگارہ" پر سگریٹ کی ڈبیہ از راہِ منصبی اُن کی طرف اُچھال دینے کے بعد بھی کیمپ میں وافر مقدار میں بچ رہتے ہوں گے......

اس کہانی کو یہاں تک "رُو کی جھونک میں" پوری راست بازی سے بیان کر دینے کے بعد کرنیل صاحب کی "قومی شہ رگ" بڑے زور سے پھڑکی اور" اکبر غیرت قومی" سے گڑ گیا، مگر ذرا دم لے کر اپنے ساتھ ہمیں بھی بہلاتے ہوئے بولا، اور کیا بولا. "یہ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کے تاثرات ہیں، فلسطینی فدائین کے موجودہ جذبۂ جاں نثاری اور وطن پرستی کو "اکبر" سلام کرتا ہے"........

بھولے کرنیل [illegible] ذرا "مثلث بہانے" ہمارے ساتھ آئیے، آپ پر پورے چودہ طبق روشن کرنے کے لیے ہم آپ کو دکھائیں گے [illegible] بڑے ہو کر رہت کے ٹیلوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے ظہیر الدین محمد بابر شہنشاہِ ہند دکابل کے سارے قیمتی مشوروں میں سے لے دے کے صرف ایک ہی کو مضبوطی سے اپنی گانٹھ میں باندھے نہایت اطمینان اور بے فکری کے عالم میں [illegible] بیٹھے ہیں۔ لیے ہوئے سگریٹوں کا دھوئیں کے مرغولے فضا میں اڑاتے ہوئے "عیش کوشیوں" میں منہمک و مصروف ہیں۔ [illegible] کو نہایت حیرت کی نظروں سے دیکھ کر [illegible] کسی شاعر نے تلملا کر پوچھا!

نالۂ حزینت کو آہ آتشینت کو ؟
لافِ عشق بازی چند عشق را نشانہا ست

اور یہ سُن کر ہمارے لکھنؤ کے "مرزا رفیع السودا" کیسے چُپ رہتے. وہ بڑے زور سے گرجے،

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

قارئین کرام!

[illegible] اس تمام تر "لاف و گزاف" کا [illegible] سگریٹ کی وکالت [illegible] اصلاح [illegible] حق [illegible] ہے کہ بے شک یہ ایک علت ہے اور وہ بھی نا در جام، ہماری غایت اصلی تو [illegible] کی چال بازیوں، ہفل تسلیوں اور ڈھونگ بازیوں کا پردہ فاش کر کے [illegible] واسطے بے حد و نہایت [illegible] عافیت مضمر ہے [illegible] سینہ [illegible] کینسر کا داعی ہے [illegible] نہیں۔ وسط ایشیاء کے مرد اور عورتیں اپنی زندگی [illegible] ڈیڑھ سو برس کی عمر پاتے ہیں اور گھوڑے [illegible] سوار ہو کر [illegible] کرتے ہیں یا یہ نامراد ان کا بال بھی "بانکا" نہ کر سکا، کیوں ؟

٥ بانکا [illegible]

اُن کی ہوا ہر طرح کی آلودگیوں سے اُن کی غذا ملاوٹ اور پانی زہر کی آمیزش سے پاک و صاف ہے۔ سامنے والی بات جو ہے سو یہ ہے اس کے عادی کی زبان ذائقے کے احساس سے محروم ہو جاتی ہے جو لذت کھانوں میں ایک غیر اسموکر کے کام و دہن کو حاصل ہوگی وہ اسموکر کو نہیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ سرے سے اشتہاء ہی کافور ہو جاتی ہے۔ سگریٹ کی لت کا ختم ہو جانا ناممکنات سے نہیں ہے اگر "سرکار" کے ارادے میں واقعی خلوص اور "جنتا" سے حقیقی محبت کی کار فرمائی ہو...

کہیئے مُصطفٰے کمال صاحب! پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑے ہوئے تھے، اب تو کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔؟ "جگندر" نے تو آپ کی "پتے" کی بات برملا بیان کر دی، شروع ہی سے اُسے پتے پتے کی باتیں کھوجنے کا جنون ہے کبھی "ذوالفقار علی خاں" کے موٹر کا احوال کھوج کر علامہؒ کو جا سُناتا ہے تو کبھی "حکومت پیاری" کی بیماریوں کا بھانڈا عین چوراہے پر پھوڑتا ہے، اس کی باتوں سے لوگوں کو اکثر جھونجھل لگتی ہے، لگا کرے، وہ غریب بھی تو پڑی ہوئی عادت سے لاچار ہے ویسے آدمی کام کا ہے پہ بدنام بہت ہے "وہ بولے گا تو بولو گے بولتا ہے"۔ ٥ ذرا بہ گوشِ ہوش سُنیئے جواب میں کیا خوب فرماتا ہے!

"مے۔ ری۔۔۔ ٥ ۔۔۔ مرضی" ٥

ہا! ..... اور اس بے نُقط بولنے کے "کارن" حاصل ہونے والی "خستگی" پر بے چارے کو جن سے داد پانے کی توقع ہوئی تھی والئے بدنصیبی کہ وہ بہت دور "پنڈی کے جِک لالے" میں اُس سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے ..... □□

---

٥ فلمی گانے کا بول۔ ٥ فلمی گانے کا ٹکڑا۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس (بنگلور)
(صدر شعبۂ اردو جے محل کالج) ★

تالیاں

تالیوں کا نشہ جب سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے تو کچھ اچھا دکھائی نہیں دیتا۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، سوتے جاگتے غرض ہر پل تالیاں پیٹنے کی آواز ہی سنائی دیتی ہے۔ شہرت کی بانس پر چڑھنے کے لیے تالیاں بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ کان پیارے تو بالیاں پیاری۔ بیوی پیاری تو سالیاں پیاری، شہرت پیاری تو تالیاں پیاری۔ دراصل تالیاں ہمارا جمہوری حق ہے۔ آزادی کے ان پچاس سالوں میں ہم نے صرف تالیاں بجانی سیکھی ہیں۔ مداری بندر کا ناچ نچاتا ہے۔ جس کے حکم پر بندر اور جمورے کو تالی بجانی پڑتی ہے۔ پھر جمورا اپنی حرکتوں سے ناظرین کو تالی بجانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شہروں کی سڑکیں سواریوں سے کھچی رہتی ہیں اس لیے مداری اور جمورے، فٹ پاتھ پر چلنے والوں کا حق چھیننا نہیں چاہتے دراصل انھوں نے پارلیمان اور اسمبلیوں پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ [illegible] مداری کا ناچ نچاتے ہیں [illegible] تالیاں پیٹتے رہتے ہیں۔ سیاسی تالیوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان کی تالی تو ایک ہاتھ سے بھی بجتی ہے۔ بجتی ہیں وہ طوفانِ بدتمیزی کھڑا کرتی ہے جس کے شور شرابے میں سارے گھٹالے گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ [illegible] وہ ہر کام تالیوں کے لیے کرتا ہے [illegible] تالیاں [illegible] اختیار کرتی ہیں وہ اپنی جیبیں بھرنے لگتا ہے [illegible] تالیاں گندے انڈے اور ٹماٹر کی شکل میں اس کا استقبال کرتی ہیں۔ دراصل تالیوں اور گالیوں میں بڑا نازک فرق ہوتا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں [illegible] النفس انسان کی ٹانگ کھینچی جاتی ہے اور ٹانگ کھینچنے والا اپنی فتح پر تالیاں بجاتا رہتا ہے۔ [illegible] اپنی شرافت کا ثبوت دیتا ہے جو آج کے ٹکسال میں کھوٹے سکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ [illegible] تن کی چھاؤں ہے پر خونِ جگر اور سعیٔ پیہم سے جو شہرت ملتی ہے [illegible] ہوتا ہے۔

سیاسی میدان میں تالی بجانے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ [illegible] تو تالی بجانے والے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ بعض اصحاب اس قدر معصومیت سے تالی بجاتے [illegible] ہو جاتے ہیں اور انھیں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اُن ماہر استادوں کا کہنا ہی کیا [illegible] کی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ کبھی تو ایک تالی کے عوض [illegible] یہاں تک کہ منتری جی کی کرسی بھی ہڑپ لیتے ہیں۔

یہ تو رہیں سیاسی تالیاں۔ ان سے ہٹ کر آپ ثقافتی، سماجی اور ادبی محفلوں کی تالیوں پر نظر ڈالیے تو آپ بہ آسانی اس فرق کو سمجھ لیں گے۔ ان تالیوں سے تو بیزاری کی بو آتی ہے۔ جب آپ ان محفلوں کا رنگ دیکھیں گے تو بس تالیاں پیٹتے رہ جائیں گے۔ کوئی محفل منعقد کرنی ہے تو پہلے اسٹیج کے رنگ و روغن اور پھر سامعین کے لیے چائے پانی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہال میں تالیاں پیٹنے کے لیے مخصوص مجمع کی امید بندھ سکتی ہے۔ کیونکہ جلسے کی کامیابی کا دار و مدار ان تالیوں کی گونج ہی پر ہوتا ہے۔ اِدھر جلسہ شروع ہوا اور اُدھر سامعین کی بے چینی شروع۔ انہیں انتظار تو بس چائے اور بسکٹ کا ہوتا ہے۔ چاہے مہمانِ خصوصی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے کیوں نہ ملائے جائیں سبھی اس قدر خاموش رہتے ہیں کہ ان پر سانپ سونگھنے کا گمان ہوتا ہے۔ آخر تھک ہار کر منتظمین تالی بجانے لگتے ہیں۔ ہال میں دم توڑتی ان تالیوں کا ساتھ دینے کے لیے سامعین کی دو چار بے ہنگم تالیوں کی گونج یوں سنائی دیتی ہے جیسے نو سیکھیے اونچی اور پست آواز میں کورس گا رہے ہوں۔ بعض سادہ لوح مہمانِ خصوصی اپنی عزت افزائی پر پھولوں کا ہار لینے کے بعد خود ہی تالی بجاتے ہیں۔ تاکہ یہ تالی سامعین کی رگِ حمیت پر تازیانے کا کام کر جائے۔ اور اپنے زریں خیالات پر چھائی خاموشی کی فضا کو بدلنے کے لیے منتظمین کو تالی بجانے کا حکم دیتے ہیں۔ مہمانِ خصوصی کا تالیوں کی زبان سمجھنا بہت ضروری ہے۔ تقریر کے اختتام پر جو تالی بجائی جاتی ہے اس کا مقصد صرف تعریف ہوتا ہے۔ ہر دو منٹ کے وقفے سے بجائی جانے والی تالی زبان بند کر لینے کے لیے ہوتی ہے جو تالے کا کام کرتی ہے۔

کھیل کے میدان میں تالی ہمت بندھانے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ اپنے اپنے فریقین کو کامیابی دلانے کے لیے ناظرین اس قدر تالیاں پیٹتے ہیں کہ کبھی کبھی کھلاڑی اپنے کھیل سے زیادہ ان نازنینوں کی بجائی ہوئی تالیوں پر دھیان دے کر اپنی ساکھ گنوا بیٹھتے ہیں۔ تالیوں کا شاندار مظاہرہ ٹینس و بیڈمنٹن میں ہی نظر آتا ہے۔ کرکٹ کھیل میں ناظرین تالیوں سے مطمئن نہیں ہوتے تو وہ ناچتے، جھومتے، سیٹی بجاتے اور اوچھی حرکتیں کرنے پر اتر آتے ہیں۔

تالی بجانا صحت کے لیے بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے شریانوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ چاہے خون کی نالیاں سو فیصد بند کیوں نہ ہو جائیں تالی بجانے سے اوپن ہارٹ سرجری کے بغیر خون کی نالیاں کھل جاتی ہیں۔ تالی اشارے کی زبان بھی ہے۔ ببلو کی ممی پڑوس گھر سے نکل گئی ہوں تو اُن کے بعد شوہر بیوی کو تالی کی آواز دے کر بلاتے ہیں۔ پاپا ڈھیر سارے چاکلیٹوں اور آئس کریم کے پیکٹ کو دیکھ کر ببلو خوشی سے تالی بجاتا ہے اور پھر ممی کی ساڑی کی تعریف کرتے ہوئے دو چار تالیاں مزید پیٹتے ہوئے ممی کی خوشامد کرتا ہے تھکی ہاری ممی بھی خوش اور ببلو بھی خوش گویا تالی رام کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے۔

شاہی دربار میں تالیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ بادشاہ کے فرمان پر مرحبا یا آفریں جیسے کلمات ادا کرنا درباریوں کا فرض ہوتا تھا۔ البتہ حجلہ میں بادشاہ اور شہزادی تخلیہ کا حکم صادر کرتے تو ان کی تنہائی میں مخل ہونے کی کسی پایا رازی کی مجال نہیں ہوتی۔ البتہ جب تالی بجاتے تو باندیاں سر جھکائے خدمت کے لیے حاضر ہو جاتیں۔ بیچاری ڈائنا شہزادی تو تھی لیکن انگلستان زمانے نے انہیں یہ حق کہاں دیا تھا۔ تالیاں کبھی صنفِ نازک کا وصف تھیں۔ شہزادیاں تال کٹورے میں دودھ اور گلاب کیوڑا نہاتے وقت سطح آب پر آ کر تالیاں بجاتیں اور پانی میں غوطہ لگا کر چھپ جاتیں اور ان تالیوں کی آنکھ مچولی سے اپنے شباب کو آگ سا بھڑکاتیں۔ آج تالیاں دوشیزاؤں کی حرکتوں پر بجائی جاتی ہیں۔ فیشن شو میں ان کی بلی کی چال (CAT WALK).

پر ناظرین تالیاں بجاتے ہیں۔ جو صرف اور صرف ۔ زنونی کا ثبوت ہے۔ حیرت عالم کا مقابلہ کبھی اعزر باڑی نقل ہے اور اس موقع پر بجائی جانے والی تالیاں بھی نقلی ہیں۔ یہ نوالہ ہے جسے اگلا جاسکتا ہے نہ نگلا جاسکتا ہے۔

تالیاں کبھی مجبوری سے اور کبھی بطور مفاد بجائی جاتی ہیں۔ صرف خوشی سے بجائی جانے والی تالی بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ پہلی تالی آدم اور حوا کے جنت سے نکالے جانے پر شیطان نے بجائی ہوگی۔ اس سرزمین پر کو پانے کے بعد آدم کے بیٹے نے پہلی تالی بجائی ہوگی۔ گویا ازل سے تالیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ جو ابد تک جاری رہے گا۔ تالیاں بجتی رہیں گی، ڈھول پٹتے رہیں گے۔ باجے بجتے رہیں گے اور کاروبارِ نشاطِ زندگی چلتا رہیگا۔

حکیم الدین توفیق (حیدرآباد)

"وظیفۂ حسنِ خدمت"

[illegible] ہوتے ہیں [illegible] والے ادا کئے جانے والے [illegible] کئے جانے والے [illegible] وظیفہ کا ذکر [illegible] ایک قسم ہے جسے "وظیفہ حسن خدمت" کہتے ہیں جس کا حقدار ہر وہ شخص ہوتا ہے جس نے بڑی چالاکی سے اپنا الو سیدھا کرتے ہوئے کسی سرکاری محکمہ میں اپنی عمر کے اٹھاون سال [illegible] گزار دیئے اور اس جھنجھٹ سے کامیاب نکل آیا۔ ریٹائر ہوتے ہی اس پر ایمانداری محنت [illegible] جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اس نے کیسی اور کتنی خدمت کی۔ خدمت کی بھی یا نہیں اور کی بھی تو اس میں کیا حسن [illegible] سرکاری افسروں کا [illegible] کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سرکاری ملازمین کا ایک بڑا طبقہ "وظیفہ حسن [illegible]" پر سبکدوش ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب پچپن سال کی عمر میں سبکدوش کر دیا جاتا تھا لیکن سائنس کی ترقی نے انسان کی اوسط عمر میں [illegible] سبکدوشی کی عمر اٹھاون سال کر دی گئی۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر ساٹھ یا سٹھ سال ہو جائے۔ یوں بھی پچپن [illegible] تو ایسی عمر ہے کہ بندہ اگر صحت مند اور با ہمت ہے تو سر پر سہرا نہیں تو کم از کم گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے قاضی کا سامنا کر سکتا ہے۔ اس عمر میں بہت سے مسائل حل طلب ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ مسائل ساٹھ کے ریٹائرمنٹ پر بھی جوں [illegible] رہیں گے۔ ہم صرف مہلت مانگتے ہیں مسائل حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اکثر حضرات [illegible] اور [illegible] ادھیڑ عمر تک بچے پیدا کرتے ہیں نتیجہ جب وہ ریٹائر ہوتے ہیں تو دو بچے مڈل اسکول اور ایک دو ہائی اسکول اور [illegible] کالج میں رہتے ہیں۔ ایک دو لڑکیاں شادی کی عمر کی طرف رواں دواں ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری ذمہ داری [illegible] کے کندھوں پر پڑتی ہے اور وہ سعادت مند اپنی آدھی جوانی کولہو کے بیل کی طرح پس کر ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

ریٹائر ہونے پر آدمی کو صدمہ ہوتا ہے کہ اب وہ ناکارہ ہو گیا ہے مگر بھلا ہو دانشوروں کا جو ڈھارس [illegible] [illegible] لیے سبکدوش نہیں کیا گیا کہ آپ ناکارہ ہو گئے بلکہ نیا خون داخل کرنے اور نئی نسل کو موقع [illegible] [illegible] ذمہ داری سونپی جا رہی ہے۔

سبکدوشی ایک حقیقت ہے بالکل اسی طرح جس طرح پیدا ہونے والے کا مرنا آنے والے کا جانا۔ جو [illegible]

(۲)

لگا وہ ایک دن اس سے آگے بھی ہوگا ہم بھی ریٹائر ہو گئے۔ جب ہم نے اپنی عمر کے پچپن سال مکمل کر لیے تو ہر طرف ہماری بربادی یعنی سبکدوشی کے چرچے ہونے لگے۔ سوالات کی بوچھار ہونے لگی "سنا ہے آپ ریٹائر ہونے والے ہیں؟ یقین نہیں آتا۔" "آپ کے ریٹائرمنٹ میں کتنے سال باقی ہیں؟" ہم تمام سوالات کے جوابات دل گرفتہ لیکن خندہ پیشانی سے دیتے مگر لوگ جان بوجھ کر دل جلانے وقتاً فوقتاً وہی سوالات گھما پھرا کر مختلف انداز سے پوچھتے معلوم نہیں وہ اپنے کون سے جذبے کی تسکین چاہتے تھے۔ ہم نے کبھی کسی سے یہ سوال نہیں کیا کہیں وہ برا نہ مان جائے کہ ہم بڑھاپے کا احساس دلا رہے ہیں۔ ہم تو بوڑھوں کو بھی بوڑھے نہیں کہتے۔ ایک صاحب کو ہمارے ریٹائرمنٹ سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہر ملاقات میں سب سے پہلے وہ یہی سوال کرتے۔ اب آپ کے ریٹائرمنٹ کو کتنے سال ہیں؟ ایک بار جب انھوں نے یہی سوال دہرایا تو ہم نے کہا ہمیں ریٹائر ہوئے چھ مہینے ہو گئے۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر کبھی انھوں نے وہ سوال نہیں کیا مگر ان کی کیفیت بتانی کردہ شکل سے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس دن ہم ریٹائر ہوئے مٹھائی لے کر [illegible] اور کہا آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے پہلے منہ میٹھا کیجیے۔ منہ میٹھا کر کے وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ہم نے کہا مبارک ہو ہم آج ریٹائر ہو گئے۔ یہ سن کر انھوں نے ایسا منہ بنایا جیسے ان کے منہ میں مٹھائی نہیں [illegible]

اکثر احباب ہمارے ریٹائرمنٹ پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ پوچھا جاتا والنٹری ریٹائرمنٹ تو نہیں لے لیا؟ [illegible] بعض لوگ سوال کرتے ہیں آپ کس ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں؟ ایسی باتوں سے [illegible] ایک دعوت میں ہماری میز پر بشمول ہمارے چھ بوڑھے اور دو نوجوان بیٹھے تھے۔ [illegible] پر سفید داڑھی لیکن جھریوں سے عاری، عناصر میں اعتدال ہنوز روزِ اول کی طرح، ہوش و حواس [illegible] ہوئے بڑی تندہی سے کھانے سے انصاف کر رہے تھے خصوصاً مرغ کے ساتھ کچھ زیادتی [illegible] آج کی بہت ہی مرغوب ڈش ہے جو ہم پر آپ کے قریب کم اور دوسروں کے قریب زیادہ [illegible] تین بار یہ ڈش انھیں پیش کی تیسری بار جب وہ [illegible] ہوئے تو ان کی توجہ ہماری طرف مبذول ہو گئی اور ازراہِ عنایت فرمانے لگے آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ ہم نے انکساری سے کہا کہ "پیٹ بھر کھا لیا"۔ اس پر انھوں نے بڑے پیار سے کہا اب یہ حالت ہے تو ہماری عمر میں کیا ہوگا۔ برسوں ہو گئے تھے ایسا جملہ سنے ہوئے [illegible] تھے اس جملے نے ہمارے حواس پر مرغن غذاؤں سے زیادہ سرور طاری کر دیا پھر انھوں نے کہا "جانتے ہو میری عمر کیا ہے؟ بانوے سال" پھر دو بوڑھوں کو بتا کر کہا یہ میرے سامنے کے بچے ہیں۔ ہم نے دل سے دعا دی اللہ آپ کو [illegible] سال سلامت رکھے طبیعت خوش کر دی لیکن بعض مرتبہ اس طرح کی باتوں سے طبیعت بڑی مکدر ہو جاتی ہے بنک میں ایک معمر اور بہت ہی مہذب خاتون ہمارے قریب آئیں اور عاجزی سے کہا بیٹا یہ فارم ذرا بھر دو پہلے ہم نے سوچا [illegible] انھوں نے وہی کہا جو ہم نے سنا۔ اور جب یقین آ گیا تو بڑی شرمندگی ہوئی ہم نے جلدی سے فارم ان کے ہاتھ سے لیا [illegible] چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اس مذاق سے کوئی لطف اندوز تو نہیں ہو رہا [illegible]

دو ایک کے ہاتھ میں روپیہ اٹھنی تھما کر آگے بڑھے تو باقی نے راستہ [illegible] پایا ہے میں اور ہر مہینہ بیس پچیس روپے خیرات کی عیاشی نہیں کر سکتے [illegible] یہی تو اصل وقت ہے خیرات کرنے کا۔ اب بھی نہیں کرو گے تو کب کرو گے۔ یہ خیرات [illegible]

ہماری زبان گنگ ہوگئی۔ جمہوریت کا دور ہے ہر ایک کو تحریر اور اظہار کی آزادی ہے یہ سوشلزم کی برکت ہے کہ فقیر خیرات کو حق سمجھنے لگے ہیں ادھر ہمارے نیتاؤں نے حق کو خیرات کی سطح پر لاکر ساری قوم کو مانگنے کی لت میں مبتلا کردیا ہے۔

لوگ وظیفہ یاب کی عزت نہیں کرتے اسے کچرا سمجھ کر نظر انداز کرتے اور کتراتے ہیں لیکن اس کے متعلقین کے پاس اس کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو ایک برسرِ خدمت آدمی کی۔ ایک صاحب نے ہمیں ایک واقعہ سنایا۔ ایک عورت جو اپنے وظیفہ یاب باپ کے زیرِ پرورش تھی ہمیشہ دعا مانگا کرتی۔ اللہ میاں ہمارے ابا کی عمر لمبی کر دو مر گئے تو وظیفہ بند ہو جائے گا اس وقت تو ہم بہت محظوظ ہوئے لیکن بعد میں اس دعا کے پیچھے چھپے ہوئے کرب کا احساس ہوا تو ہماری روح تھرا گئی۔ بنک میں ہمارے قریب دو کسٹمر بیٹھے تھے اور آپس میں کچھ یوں گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک نے کہا "ایک دن میرے آفس میں ہمارے ریٹائرڈ ڈائریکٹر صاحب آئے۔ جوں ہی میری نظر پڑی میں نے اٹھ کر بڑے ادب سے انھیں سلام کیا۔ ڈائریکٹر صاحب نے نرمی سے کہا میاں میں تو ریٹائر ہو چکا ہوں اب یہ تکلف کس لیے۔ میں نے کہا نہیں صاحب آپ اب بھی ہمارے صاحب ہیں" یہ سنا کر غالباً وہ اپنی وضعداری اور اعلیٰ ظرف کا ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے ایک بڑے عہدے سے سبکدوش ہونے والے کے ذہنی کرب کی عکاسی بھی ہو رہی تھی۔ جب کرسی کھسک جاتی ہے تو انسان کتنا مسکین اور منکسر المزاج ہو جاتا ہے۔ کیسا عبرت کا مقام ہے۔

ریٹائر ہونے والا ہر شخص ایماندار، محنتی، دیانت دار اور اپنے کام کا ماہر ہوتا ہے جو خلا یہ پیدا کرتا ہے وہ کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ اس کی یہ خوبیاں اس کے وداعی جلسے میں آشکار ہوتی ہیں۔ ہمیں ایک انتہائی بے ایمان اور کام چور آدمی کے وداعی جلسے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ محکمہ کے صدر نے اس کی بیحد تعریف کی اور وہ خوبیاں بھی بیان کر دیں جو اس میں تھیں ہی نہیں۔ وہ شخص بھی مسکرا مسکرا کر اس کی تصدیق کر رہا تھا۔ جلسے کے اختتام پر ہم نے صدر صاحب سے کہا یہ کیا دوغلی پالیسی ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے آپ اس سے نالاں تھے۔ انھوں نے کہا جس طرح مرنے والے کی برائی نہیں کی جاتی اسی طرح وداع ہونے والے کی بھی برائی نہیں کرنی چاہیے اگرچہ اس سے کسی کی بخشش تو نہیں ہوتی مگر اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ ضرور ہو جاتا ہے آخر ہم کو بھی تو ایک دن ریٹائر ہونا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد عام طور پر دو سوالوں کا سامنا ہوتا ہے آپ کی مصروفیت کیا ہے اور صحت کیسی ہے۔ مصروفیت سے مراد روپیہ کمانے والی مصروفیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ مصروفیت تو رہی نہیں۔ لیکن باقی مصروفیات جوں کی توں رہتی ہیں بلکہ کچھ بڑھ جاتی ہیں جیسے پوتے پوتیوں کو تفریح کرانا۔ صبح چہل قدمی سے واپس آتے وقت دودھ لانا وغیرہ۔ ایسا نہیں ہے کہ ریٹائر ہوتے ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ عمر تو اپنے حساب سے بڑھتی ہوئی حقیقی ریٹائرمنٹ کی طرف لیجاتی ہے۔ وقت تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے پھر وہ وقت آتا ہے جب صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے آپ کی صحت کیسی ہے؟ چند خوش قسمت آخر عمر تک صحت مند اور چاق و چوبند رہتے ہیں ورنہ جوں جوں بڑھاپا اپنا شکنجہ کستا ہے اس کے لوازمات ہلّہ بول دیتے ہیں۔ آخر وہ وقت آجاتا ہے جب دوست احباب اور رشتہ داروں کی محبت اور ہمدردیاں ان کے ہونٹوں پر دعا بن کر آتی ہیں اللہ ان کی مشکل آسان کر دے۔ پھر مشکل آسان ہو جاتی ہے عمر ختم ہو جاتی ہے وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور رشتہ داروں اور احباب کی زبان پر حسن خدمت کا تذکرہ رہ جاتا ہے۔۔۔

□□

ظفر کمالی (سیوان)

مُناجاتِ مقبولؔ

(پیروڈی)

ترا نام ہے پاک پروردگار　　تری رحمتوں کا ہوں اُمیدوار
چڑھے سر پہ ڈالر کا ایسا بخار　　نگاہوں میں چھائے اُسی کا خمار
کروں میں بھی قارون کی ہمسری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

اُتاروں نہ سر سے جہالت کا تاج　　رہے آسماں پر ہمیشہ مزاج
وصولوں جو دادا گری کا خراج　　کہے ساری دنیا اسے رام راج
ہو کس کی رہے فصل ہر دم ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

کہوں اسپِ تازی کو میں گورِ خر　　کریں اس کی تائید سارے بشر
اصولوں کو رکھوں اٹھا طاق پر　　خدایا عنایت کی ہو وہ نظر
کہ کھوٹی چونّی کو کردے کھری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

کسی سے جو لینے چلوں کوئی کام　　رکھوں چاپلوسی کا گاڑھا قوام
جمع میں کروں گرچہ مالِ حرام　　نہ لے حشر میں تو مگر انتقام
ہو مجھ پر بھی تیری کرم گستری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

پڑے کان میں جب صدائے اذاں　　تو ہو خوابِ غفلت کا دریا رواں
گناہوں پہ ٹوکے اگر کوئی یار　　مری منطقوں سے ہو وہ نیم جاں
رہے پیٹتی سر کو دانش وری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

رعایا کو آئے نہ عقلِ سلیم　　کہے منحنی کو سدا مستقیم
چلے بادِ صرصر تو سمجھے نسیم　　"کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم"
کسی طرح چمکے مری لیڈری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

سد ۴۶ پر

کھلے ہوں جہاں پر محبت کے پھول — اگاؤں وہاں ایک پل میں ببول
الکشن کا ہو ملک میں جب نزول — خدایا دعا ہو یہ میری قبول
وزارت کی آئے نکل لاٹری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

ترقی کا مچتا رہے خوب شور — بلا سے معیشت کی کھد جائے گور
رہے ہر طرف یونہی رشوت کا زور — ملازم سلامت رہیں کام چور
ٹپک جائے پاکٹ میں اک نوکری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

قلم ہاتھ میں لے کے انصاف کا — حمایت کروں ظالموں کی سدا
جو پورا کرے میرا ہر مدعا — اسی کے موافق لکھوں فیصلہ
قلم کو میں اپنے بناؤں چھری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

جوے کی ہوئے نذر سب زیورات — بکے گھر میں برتن جو تھے پانچ سات
سمجھتی ہے دنیا مجھے واہیات — سہارا ہے بس ایک بیگم کی ذات
انھیں بھی ملے حصۂ دختری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

ڈویژن سدا تھرڈ لایا ہوں میں — نہ پلٹی کبھی جو وہ کایا ہوں میں
حکومت کی خاطر پرایا ہوں میں — دوا کس مرض کی خدایا ہوں میں
ہوئی جاہلوں کو عطا افسری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

○

معین احمد ممّبو

چوّے

کون یہاں اُردو کی خاطر مردِ مجاہد لڑتا ہے
جس کو دیکھو وہ تو بس سرکار کے پاؤں پڑتا ہے
اردو والو اتنا سمجھ لو بات پتے کی کہتا ہوں
مانگنے سے جب حق نہ ملے تو چھین کے لینا پڑتا ہے

(پھولن دیوی ممبر پارلیمنٹ بننے کے بعد)

تھا شوق روشنی کا اندھیروں میں آگئی
پھولن بیچاری کیسے بکھیڑوں میں آگئی
ممبر وہ پارلیمنٹ کی بنی فرق کیا پڑا
نکلی تھی ڈاکوؤں سے لٹیروں میں آگئی

طارق کفایت (پنجاب)

ناک

معروف مفکر پاسکل کا خیال ہے کہ اگر ملکہ قلوپطرہ کی ناک ذرا سی بھی پیلی ہوتی تو دنیا کا نقشہ بدل گیا ہوتا قلوپطرہ کی ناک کے سبب دنیا کے نقشے میں کوئی تبدیلی ہوتی یا نہ، یہ بات غور طلب ہے مگر ایک بات بالکل صاف ہے کہ چہرے پر ناک نہ ہوتی تو دنیا پر زندگی نہ ہوتی۔ حیوان ہو یا انسان اس کے دل کے ساتھ یا سیانِ عقل ہو یا نہ ہو مگر ایک عدد ناک کا ہونا لازمی ہے، کیوں کہ دل کے دھڑکنے یا چلتے رہنے کے لیے جس ہوا کی ضرورت ہوتی ہے وہ ناک ہی کے ذریعے فراہم ہوتی ہے گویا دل اور ناک کا ایک ناگزیر تعلق ہے مگر جہاں دل کے ذکر اور اس کی تعریف و توصیف میں دفتر کے دفتر موجود ہیں، دواوین دل کے معاملات سے بھرے پڑے ہیں شاید ہی کوئی نظم کوئی افسانہ کوئی ناول کوئی مضمون ایسا ہو جس میں دل کا تذکرہ بالواسطہ یا بلاواسطہ موجود نہ ہو لیکن ناک کو آج تک قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک زلف، جبیں، ابرو، مژگان، گوش، آنکھ، رخسار، عارض، لب، دندان، زبان، دہن، زنخداں، ذقن، گردن، شانہ، ساعد دست، انگشت، ساق، زانو، کمر، پائے نازک حتیٰ کہ ناخن تک کو شعرا نے موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن ناک کو سب نے نظرانداز کیا ہے۔ وجہ؟ شاید یہ ہے کہ ناک نہایت بے لوثی اور بے زبانی سے خدمت میں مصروف ہے اور آج کے زمانے میں بے غرض خدمت بے وقوفی کے مترادف ہے جب تک کوئی خود اپنے کام کا ڈھول نہ پیٹے کوئی نہیں پوچھتا۔ اب بے چاری ناک! خوشبو، بدبو کے امتیاز کے علاوہ دل کو صاف ستھری آکسیجن مہیا کرانے کی تنہا ذمہ داری اس کے نازک کندھوں پر ہے۔ گویا انسدادِ آلودگی (ANTI POLLUTION) کا پورا کا پورا محکمہ تنہا سنبھالے ہوئے ہے۔ [illegible] کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ ہر عضو کبھی نہ کبھی ٹک لیتا ہوگا، دم بھر کے لیے ہی سہی بس ایک دل ہے اور ایک ناک کہ ان کا چھٹکارہ مرنے سے پہلے ممکن نہیں۔ ایک راز کی بات! رات میں کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ صرف دل اور ناک ہی جاگتے ہیں۔ چاہیں تو گھنٹوں راز و نیاز چلتے رہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور حسنِ اتفاق سے دونوں باہم جنسِ مخالف ہیں لیکن حضرت دل ہیں کہ ناک کی طرف منہ کرنا بھی ان کو گوارا نہیں۔ خدا کسی کو اس قدر مغرور بھی نہ بنائے۔ دوسروں کے کام آنا ناک کی سرشت میں داخل ہے اب دیکھیے زاویہ نظر درست رکھنے کے لیے آنکھ کو چشمے کی ضرورت ہوتی ہے تو جبکہ [illegible] بھی چاہے چشمے کے بیٹھنے کے لیے ناک کی کرسی حاضر ہے حالانکہ لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ناک اپنے اوپر مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتی۔ کوئی ان سے پوچھے کیا آپ کو اپنے اوپر مکھیوں کا بیٹھنا پسند ہے؟ ہم [illegible] الزام دیا۔

ناک کو ازلی طور پر معصوم اور معصیت سے پاک پیدا کیا گیا ہے غور فرمایئے۔ زبان بدگوئی و غیبت کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ آنکھ بد نظری میں ملوث ہو سکتی ہے۔ کان غیبت اور فحاشی میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کی حرکت معصیت و گناہ گاری کا سبب ہو سکتی ہیں۔ ابرو بھی اشارے بازی میں مددگار ہو سکتے ہیں مگر ایک ناک ہے جسے کسی بھی طور انسانی جرائم کا شریک کار نہیں بنایا جا سکتا۔

کہنے کو دو عدد نتھنے درمیان میں ایک بانسا اور سامنے ایک پھننگی سے مل کر ناک بنتی ہے اور کوئی سی بھی ناک ہو انہی اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے نہ کم نہ زیادہ، حتیٰ کہ حیوانات کی ناک میں بھی کم و بیش یہی چیزیں موجود ہوتی ہیں اور کچھ حد تک پرندوں میں بھی۔ سانس لینے کے لیے انہی کی ضرورت بھی ہوتی ہے بلکہ ایک نتھنا تو فاضل ہی ہوتا ہے گویا اسٹپنی کا کام کرتا ہے ورنہ کام تو ایک سے بھی چلتا ہی ہے مگر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سبھی ناکوں میں یہ چیزیں موجود ہوتے ہوئے اور یکساں طور پر کارآمد ہوتے ہوئے بھی ناک اور ناک میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ ناکوں کی قسمیں بنائی جاتی ہیں اور کسی قسم کو کسی خاص انسانی نسل کی پہچان بتا کر نفرت اور فساد کا بیج بویا جاتا ہے۔ مثلاً اگر پھننگی ذرا سی کم رہ گئی تو اس ناک کو چپٹی اور پہیہ پھری اور نجانے کیا کچھ کہا جاتا ہے اور خدانخواستہ ایسی ناک اگر کسی لڑکی کے حصے میں آ گئی تو سمجھئے غضب ہو گیا۔ اس سے بھی زیادہ غضب اس کے والدین پر ہو گیا اگرچہ اس ناک کی تشکیل میں ان بیچاروں کا براہِ راست کوئی رول نہیں۔ اس کی شادی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ ہر طرح کی چل جاتی ہے حتیٰ کہ آبرو باختہ بھی قبول ہے مگر چپٹی ناک والی توبہ توبہ۔ چلیے کسی چیز کے چھوٹے ہونے میں تو اس کا عیب سمجھ میں آتا ہے مگر اس کو کیا کہیئے کہ نتھنے ذرا سے بڑے ہو گئے تو بھی ستم۔ اب وہ ناک ناک نہ رہی ناک رطہ ہو گئی۔ کسی کو دور کی سوجھی تو "پکوڑہ ناک" کا خطاب عطا کر دیا۔ اگرچہ پکوڑوں پر رال ٹپکانے والوں میں سے کسی کو ہم نے کسی پکوڑہ ناک پر دانت چلاتے نہیں سنا! اچھی ناک کا معیار یہ بنایا جاتا ہے کہ خوب لمبی اور کھڑی ہو پھننگی نوک دار ہو۔ حق تو یہ ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے تب سے برابر قلم اور پنسل وغیرہ کو لکیر لگانے کے لیے، چھری، چاقو کو کاٹنے کے اور سوئی کو سینے پرونے اور سوراخ کرنے کے لیے نوکدار ہوتے دیکھتے آئے ہیں ان کاموں کے لیے کھڑی تیکھی ناک سے استفادہ کرتے ہوئے آج تک کسی کو دیکھا نہ سنا۔ چلیے یہ بھی تسلیم کہ ستواں کھڑی ناک ہی کسی کو خوبرو بناتی ہے تو قاعدے کے مطابق زیادہ کھڑی ناک والا شخص غیر معمولی خوبصورت ہو مگر یہاں بھی الٹا معاملہ ہے زیادہ کھڑی ناک والے کو "نکو" کہہ کر ناک سکوڑی جاتی ہے۔ اور فلر (THOMAS FULLER) کے مطابق "بیچارہ نکو ہمیشہ اس ذہنی عذاب میں گرفتار رہتا ہے کہ سب لوگ اسی کی ناک پر ہنس رہے ہیں"۔

یہ تو بات تھی سامنے نظر آنے والی ناک کی مگر ایک ناک غیر مرئی یا تصوراتی بھی ہے اور اس کا مسئلہ اس ناک سے بھی ٹیڑھا ہے۔ اس کی اونچائی انچوں سے نہیں بلکہ کسی شخص کے سماجی مرتبے یا پھر اس کے روپے پیسے سے ناپی جاتی ہے اس کا سیدھا رہنا بہت ضروری ہے اگر یہ ناک اونچی ہے تو اصلی ناک خواہ کتنی چپٹی ہی کیوں نہ ہو کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا اسی طرح کسی کی ستواں ناک کتنی ہی کھڑی کیوں نہ ہو اگر اس کی جیب خالی ہے تو کوئی بھی اس کی ناک کو کھڑی ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ اس [illegible] خود بیچاری ہر وقت کٹنے کو تیار رہتی ہے گویا جذبہ شہادت سے سرشار ذرا سا کچھ ہوا اور یہ کٹی۔ البتہ کوئی ہمت کرے اگر [illegible] پا لے تو گویا سب نکٹوں سے نجات مل گئی پھر کوئی مسئلہ، مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے "نکٹے [illegible] سو اگر [illegible] بڑی" ویسے یہ بات [illegible] ہے کہ ہم نے بہت تلاش کیا مگر کسی کی ناک کو کٹا ہوا نہ پایا۔ [illegible]

کسی کی کٹی ہوئی ناک مل جاتی تو اپنی ناک سے جوڑ کر ہم اپنی ناک ذرا اور اونچی کر لیتے)۔

ناکوں کا ایک زمرہ اور بھی سننے میں آیا ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے پہلے بیان کی گئی ناکوں میں سے کس میں شامل کیا جائے۔ ویسے ناکوں کی یہ قسم کوئی اچھی قسم نہیں ہے چونکہ جتنی ناکیں بھی اس میں شامل ہیں ان سے عموماً ڈر لگتا ہے یا خطرہ محسوس ہوتا ہے یا انھیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے یا درد سے دو چار ہونا پڑتا یا پھر غم اُٹھانا پڑتا ہے۔ جی کچھ ایسی ہیں یہ ناکیں جن کے نام 'خوف ناک' 'خطرناک'، 'افسوس ناک'، 'درد ناک'، 'غم ناک' وغیرہ ہیں۔

کوئی مانے یا نہ مانے ناک ہے بڑے کام کی چیز۔ بہت سے فائدے ہیں اس کے، کہاں تک گنائیں۔ مثال کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ پانی کی قلت کا مسئلہ، ناک کی بدولت کافی حد تک حل ہو سکتا ہے۔ ڈوبنے کے لیے منوں پانی درکار ہوتا ہے مگر ناک ہو تو چلو بھر ہی سے کام ہو جاتا ہے۔ ناک کے ہوتے ہوئے آپ کو قطب نما اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں دن ہو یا رات بس ناک کو گائیڈ بنائیے یعنی ناک کی سیدھ میں چلتے جائیے دنیا گول ہے تو کبھی نہ کبھی آپ منزل مقصود پر پہنچ ہی جائیں گے ضمناً دنیا کے گول ہونے کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ کسی کے تئیں اپنی نفرت، حقارت جتانا چاہتے ہوں تو زبان کا استعمال کر کے جواب دینے کی ضرورت نہیں، ناک کی پھنگی کو ذرا سا اوپر کی طرف اُٹھا دیجیے، غصے کا اظہار مقصود ہے تو نتھنوں کو پھلا دینا کافی ہے۔

شاید آپ نہیں جانتے کہ ناک ایک راڈار کا کام بھی کرتی ہے اگر آپ سمجھتے ہیں یہ خوشبو بدبو یا قورمہ، شامی کی طرف اشارہ کر رہا تو غلط ہے۔ کتنی ہی ناکیں ہیں جو سونگھنے کے علاوہ محسوس کرنے میں بھی طاق ہیں۔ میرا مقصد انگریزی محاورے کے مطابق پڑوسیوں کے باورچی خانے میں پکنے والی ڈشوں کی تفصیل کو محسوس کرنے سے بھی نہیں۔ کتوں کی ناک ہی کو لے لیجیے، تربیت یافتہ کتوں کو چھوڑیے یہ عام گلی محلے کے آوارہ کتوں کی بات کرتے ہیں، اپنے محلے کے مکینوں یا معمول کے گزرنے والوں کو بظاہر وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے بس ایک شان بے نیازی سے پڑے رہتے ہیں گویا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اور جہاں کسی اجنبی نے ان کی "مملکت" میں قدم رکھا ان کا راڈار فوراً ان کو خبر کر دیتا ہے اور وہ بھونکنا شروع کر دیتے ہیں اصل میں چلتے پھرتے، لیٹے دُم ہلاتے ایک کمپیوٹر ہے جو ہر وقت آن رہتا ہے اور جس میں جان پہچان والوں کے کوائف کا اندراج خودکار سسٹم کے تحت چلتا رہتا ہے اور جہاں کوئی ایسی شخصیت ان کے ایریا میں داخل ہوئی جس کا اندراج ان کے کمپیوٹر میں نہیں ہے ان کا راڈار فوراً الارم کرتا ہے۔ انسانی کمپیوٹر میں بھی کچھ وقت اندراجات کو ملانے میں لگتا ہوگا لیکن یہاں ایک سیکنڈ کے سوویں حصے میں ان کے راڈار کی سوئی حرکت میں آجاتی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ خدمت بغیر کسی فیس، معاوضے یا غرض کے چلتی رہتی ہے! اس سے اچھا راڈار اور کونسا ہوگا۔

انگریزی والوں کے مطابق جب تک آپ کی ناک کسی اور کی ناک سے نہ ٹکرائے وہ آپ کا علاقہ ہے۔

دُنیا کو الٹا دینے کا دعویٰ کتنے ہی لوگوں نے کیا اور کتنے ہی اس حسرت کو لے کر قبر میں جا سوئے کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ کرشمہ تو آپ کی ناک بھی دکھا سکتی ہے۔ زکام تو کیا ناک تو پوری کائنات کو اُلٹا کر رکھ دیتی ہے اور آپ کو "اک جہانِ دیگر" کی سیر کرا دیتی ہے۔ آپ بغیر کسی تربیت اور مشق کے ایک نئی زبان بولنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ اچھا چھوڑیے یہ بتائیے یہ شعر آپ کو کیسا لگا:

ڈپی ڈیٹ کش ناک شدڈ بڈ دانشا ہرنی
خبوشی گفتگو ہے بے زباڈی ہے زباںیری

چکرا گئے نہ؟ اصل میں ناک ہی کی بدولت کبھی آپ کی تمام نشریات ایک نئی فریکوئنسی FREQUENCY پر نشر ہونے لگتی ہیں جسے ڈی کوڈ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور ڈی کوڈ کیے بغیر آپ اس شعر سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتے چلیے آپ بھی کیا یاد کریں گے یہ کوڈ آپ کو بتائے دیتے ہیں آپ کو بس کرنا یہ ہے کہ حسبِ مذاق ڈ کو ن اور ب کو م سے بدل بدل اور کبھی کبھار "ں" کا اضافہ کرتے چلیں۔ ناک کے اسٹور میں صرف ایک ہی فریکوئنسی نہیں ہے۔ ایک تیز والیوم والی فریکوئنسی تو وہی ہے جو عام طور پر رات کو نشر ہوتی ہے جسے "خراٹا فری کوئنسی" بھی کہا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ مستقلاً ایک مختلف فریکوئنسی اختیار کیے رہتے ہیں جس میں نون غنہ کی آمیزش بکثرت سنائی دیتی ہے۔ شاید اسی لیے اس فریکوئنسی والوں کو لوگ غنہ کہتے ہیں ویسے خود ان کو بہت کم معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نشریات کی سوئی نارمل سے غنہ فریکوئنسی پر چلی گئی ہے۔ آپ نے کچھ لوگوں کو لسنوار استعمال کرتے بھی دیکھا ہوگا یہ بھی دراصل اسی غنہ فری کوئنسی کا لو ہائی والیوم ڈیوائس LOW HIGH VOLUME DEVICE ہے۔

ناک اور نکیل کا چولی دامن کا ساتھ ہے بڑا سے بڑا، خطرناک سے خطرناک اور منہ زور جانور جو اپنی ناک پر مکھی بھی بٹھانے کو تیار نہیں ہوتا نکیل کی بدولت ایک چھوٹے سے بچے کے پیچھے بھیگی بلی بنا چلا آتا ہے۔ یہی نکیل ہی اس کا اسٹیرنگ وھیل بھی ہے اور گیئر بکس بھی دائیں بائیں جدھر بھی ذرا سا کھینچو، جیسی رفتار سے چاہو لے چلو۔ نکیل ڈالنا البتہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ نکیل اور نتھنی میں بظاہر بہت مماثلت ہے سوائے اس کے کہ نتھنی کے ساتھ کھینچنے کے لیے رسّی نہیں ہوتی اور جہاں نکیل ڈالنے کے لیے خوب زور زبردستی کرنی پڑتی ہے وہیں نتھنی کے لیے ناک بیندھنے کو خواتین کی ایک مخلوق خود بخود پیش کرتی ہے اور ناک میں سوراخ ہو جانے کی خوشی بھی مناتی ہے اور خود ہی اس سوراخ کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ لیکن اس سے مرد حضرات کو خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ نتھنی کے ذریعے صنفِ نازک کی نکیل ان کے ہاتھ میں آ گئی ہے بلکہ معاملہ عملی طور پر اس کے بالکل برعکس ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بغیر کسی نکیل بازی کے صنفِ نازک صنفِ قوی کو قابو کرنے اور بھالو کی طرح جیسا چاہے اسے نچانے کا گُر بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ □□

محمد اسد اللہ
(ناگپور)

کاتب کی کرشمہ سازیاں

دُنیا کے عجیب و غریب تماشے دیکھ کر ہم حیران ہیں۔ ان عجائبات کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کاتبِ تقدیر کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ قدرت کی ستم ظریفیوں کے مظاہر یہ دُنیا کے تماشے ہوں یا ان پر شاعروں اور ادیبوں کی حاشیہ آرائیاں لکھنے والا تو بہرحال کاتب ہے! اسی کے دم سے کتابیں، اسی کے قلم سے رسائل و اخبارات ہیں۔ یہ کاتب جو عرف عام میں خوش نویس کہلاتا ہے لکھنے اور پڑھنے والوں کے بیچ SANDWICH بنا ہوا ہے۔ ان دونوں پاٹوں کے درمیان کچھ نقطے اور شوشے چھوڑ کر وہ ثابت باہر نکل آتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم کاتبوں کی کرشمہ سازیوں پر لب کشائی کریں کیوں نہ اس کی تعریف بیان کر دیں۔ کوئی سر پھرا شاعر یا ادیب [illegible] درجنوں [illegible] لگتا ہے اعتراض کر سکتا ہے کہ حضرتِ کاتب نے آخر کون سا کارنامہ انجام دیا ہے جو اس کی تعریف کی جا رہی ہے! اس بات سے قطع نظر کہ مصنفین کاتبوں کے لکھے پر بگڑتے ہیں اور کبھی اپنے قلم کی لغزشیں بھی ان کے کھاتے میں ڈال کر صاف بچ نکلتے ہیں، یہ گتھی بہرحال سلجھنی چاہیے کہ لکھنے کا کام ایک شاعر بھی کرتا ہے اور ایک کاتب بھی، آخر دونوں میں فرق کیا ہے۔ یہی سوال ہم نے مطلع کے ایڈیٹر سے پوچھا تو فرمانے لگے "کاتب سیاہی سے لکھتا ہے اور شاعر خونِ جگر سے۔ الفاظ و بیان کا خونِ ناحق کاتب کے سر ہے اور کاتب کی سیاہ کاریاں ادیبوں اور شاعروں کے نام لکھی جاتی ہیں۔ اس شاعرانہ تعلّی کے علاوہ بھی کوئی فرق ہے ہم نے پوچھا۔

کہنے لگے "ہاں۔ جب کوئی فنکار لکھتا ہے تو بقول غالب

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔

لیکن ہم اس سے متفق نہیں ہمارے خیال میں غیب سے مضامین درآمد کرنے کے معاملے میں کاتب مصنفین سے دو چار ہاتھ آگے ہے۔ لفظوں اور جملوں کا پوسٹ مارٹم وہ اس بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ کرتا ہے کہ تنقید نگار بھی اس سے پناہ مانگتے ہیں اور [illegible] کے معاملے میں تو اس نے ہمارے مزاح نگاروں کو بھی مات دے رکھی ہے۔

[illegible] اخبار میں ایک [illegible] کا اشتہار چھپا تھا [illegible] ضمیر الدین کتب فروش اور کاتب نے لکھ مارا کتب الدین ضمیر فروش

اسی طرح ایک سویاں فروش پہلوان نے اشتہار دیا۔ تصویر کے نیچے لکھوایا "پہلوان چھاپ سویاں" خوش نویس نے اسے سجایا اس طرح سے۔ "سویاں چھاپ پہلوان"

کاتبوں کے اسی اختراعی عمل کے سبب قدیم شعراء کے کلام سے نہ صرف نئے نئے معنی بلکہ نئے نئے الفاظ بھی برآمد ہونے لگے ہیں۔ اقبال کے مشہور مصرعہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی میں کاتب نے پہلے حرف "ع" کو "ح" میں بدل دیا۔ کسی کی مجال ہے جو کہہ دے کہ تم نے غلط لکھا۔ ایک مشہور شعر میں کاتب نے لفظ ماضی کو قاضی لکھ کر ایک نیا مفہوم پیدا کیا ہے۔ یہ شعر بن وحن قاضی صاحبان کی نذر ہے۔

یادِ قاضی عذاب ہے یارب ؛ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

لگتا ہے اس شعر میں شادی کے دردناک سانحہ کا بیان ہے یا پھر حضرتِ کاتب کے مانگنے سے پہلے ہی یہ دعا قبول ہو گئی اسی لیے وہ لفظ ماضی کو بھلا بیٹھے۔

کسی جدید شعر میں یہ مصرع تھا۔ سانسیں گنوا رہا ہوں گیسوں کے درمیاں

کاتب نے لکھا ــــــــ "سانسیں گنوا رہا ہوں کمیوں کے درمیاں"

ایک اور مصرع تھا۔ صراحی کی تہہ سے حباب اٹھ رہے ہیں

اب اس میں کاتب کی نکتہ آفرینی ملاحظہ فرمائیے۔ "صراحی کی تہہ سے جناب اٹھ رہے ہیں"

چند مصرعے بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔

ذرا کم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وہ آئے ہمارے سر خدا کی قدرت ہے

ہم ہی غالب پیس کر بیٹھے تھے دستی ایک دن

کاتب نہ صرف شاعروں کے کلام کو تختۂ مشق بناتا ہے بلکہ نامور شاعروں اور ادیبوں کے نام کے ساتھ بھی دیسی سلوک روا رکھتا ہے۔ اسے مرزا جالب اور افتخار غالب لکھتے ہوئے کسی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ چاہے تو جوش ملیح آبادی کو جوس ملیح آبادی بنا دے، اقبال کو فٹبال بنا کر کھیلے مجاز کو بخار لکھے اور فراق گورکھپوری کو قزاق گورکھپوری، میر درد کو میز زرد لکھے اور چاہے تو زردہ بنا دے۔ خلیل جبران کو خلیل حیران لکھنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں، مظہر جانِ جاناں کو منظر جانِ جاناں بنانا اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے؛ اگر کاتب بائیں ہاتھ سے لکھنے کا عادی نہ ہو۔

کتابت کے بعد ایک اہم مرحلہ ہوا کرتا ہے پروف ریڈنگ، اسے بالفاظِ دیگر کاتب کی پردہ پوشی کہا جا سکتا ہے۔ اگر اس کے بغیر کتابیں شائع ہونے لگیں تو ایک وقت وہ آئے گا کہ زبان و بیان کے تمام قوانین کھلا سکھے ہوئے پٹرول کی طرح اڑ جائیں گے۔ رسائل اخبارات اور کتابیں پروف ریڈنگ کی چھلنی سے چھن کر نہ آئیں تو ہمارے ادبی ذوق کا ہاضمہ بگڑ جائے۔ تحریروں میں عجیب غریب قسم کے مزے اور بدمزگیاں بیک وقت پیدا ہونے لگیں گی۔

گزشتہ دنوں ایک اخبار اور چند کتابوں کے پروف دیکھنے کے بعد ہمیں یہ محسوس ہوا کہ لکھنے کے معاملہ میں جو آزادی کاتب کو حاصل ہے وہ دنیا کے کسی قلمکار کو حاصل نہیں۔

وہ چاہے تو طائف کو طوائف بنا دے، شہرت کو شہوت قرار دے خلیل کو ذلیل کر دے۔ مرحوم کو مرحوم لکھے، مونس کو مونث اور چاندی کو باندی بنا دے، رات کو لات کہے، جام کو دام اور دام کو دم لکھے۔ بے دام کو بے دم اور کمنام کو گلفام سمجھے قبر کو خبر اور تقریب کو تخریب سمجھے۔ کسی کو کس کر دے اور رسی کو رس۔ کاتب کو محاوروں پر بھی عبور حاصل

منہ میں گھنگنیاں ڈالنے کے بجائے وہ چاہے تو گٹھلیاں ڈال دے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

اخباری خبروں میں کتابت کی غلطیوں کے عجیب و غریب نمونے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک رپورٹ میں یہ بتایا گیا تھا کہ فلاں صاحب ہماری پارٹی کے نامزد امیدوار ہیں۔ لکھنے والے نے لفظ نامزد میں "ز" کا نقطہ اڑا کر ایک نیا نکتہ پیدا کیا۔ ایک خط میں لکھا تھا ہم آپ کے ممنون ہیں۔ کاتب نے لکھا — ہم آپ کے [illegible] ہیں۔ اسی طرح ہم آپ کے لیے دست بہ دعا ہیں کو لکھا "ہم آپ کے لیے دست بدعا ہیں۔ ایک جملہ تھا "یہ آپ کی دھرتی ہے" کاتب نے لکھا "یہ آپ کا دھوکا ہے"۔ بعض لفظوں کی ساخت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس سے مضحکہ خیز معنی پیدا ہوتے ہیں [illegible] کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مثلاً اس نے واضح طور پر لکھا سور کا بیان لیکن حروف "ر" کی پہلے لفظ سے قربت کی وجہ سے آپ اسے ہی با اور کا بیان پڑھ لیتے ہیں [illegible] جو سر کا نام ہے زبیدہ بم آپ [illegible] اور والا [illegible] ہم ہے۔ اسی طرح کتابت کو ہم اپنی [illegible] مرتبہ تکے کا بچہ [illegible]

[illegible] دونوں [illegible] ڈھونڈتے ہیں ایک [illegible] کا دلچسپ واقعہ [illegible]۔ ایک گاؤں میں پرنٹنگ کی سہولت نہیں تھی [illegible] میں تھا البتہ [illegible] کاتب کہیں سے آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک پہلوان صاحب نیست [illegible] وہ بھی اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ اپنی بیٹی کے نکاح کا دعوت نامہ لکھنے کے لیے کاتب کے سپرد کیا لیکن شادی سے تین چار دن پہلے [illegible] دعوت نامہ کی کتابت [illegible] ہوئی تو بلوا [illegible] آکر [illegible] کو اس احتیاط کے ساتھ دو تین گھنٹیاں دیں کہ ہاتھ سلامت رہیں۔ آخر جبراً کتابت [illegible] کاتب [illegible] لکھا گیا اور پہلوان صاحب کو تھما کر راتوں رات گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دو دن بعد جب دعوت نامے چھپ کر آئے تو [illegible] جگہ جگہ گل کھلے ہوئے تھے۔

بتقریب عقد سعید کی جگہ لکھا تھا بتخریب حقد شہید۔ پہلوان صاحب کی بیٹی کا نام عزیزہ دردانہ خاتون کی جگہ کنیزہ دو آنہ خاتون اور نوشہ میاں کا نام عزیزی سلطان بیگ کے بجائے تحریری شیطان بیگ لکھا تھا اسی طرح نکاح کا وقت بوقت : بعد نماز عصر کی جگہ بوقت، بعد نماز کسر لکھا تھا۔

مجلس عقد میں شرکت کے متمنی لوگوں کے ناموں میں بھی تصرف کیا گیا تھا۔ خلیل میمٹھ کو ذلیل میمٹھ، شارق ٹیلر کو سارق ٹیلر لکھا تھا۔

یہ تو تھا کاتب کا انتقام لیکن مجموعی طور پر کاتب معصوم ہوا کرتا ہے اس لحاظ سے [illegible] غلطیاں بے خیالی میں اس سے سرزد ہوا کرتی ہیں یہی بے خیالی، بے نیازی، بے فکری اور کاہلی کا ہیولا ہے [illegible] جس مسودہ کی کتابت [illegible] [illegible] ہوتا ہے جو ایک [illegible] [illegible] اس کی تحریر اولاد معنوی سے کم نہیں۔ کاتب کا رول سوتیلی ماں کا بھی نہیں ہوتا جو بے پیٹی سے [illegible] اظہار کرتی ہے جب بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوں تو وہ [illegible] [illegible] تو [illegible] لولی ماں کی طرح ہے [illegible] اس کے پاس رہے یا جائے [illegible] پڑے پڑے مخلوط میں بدل جائے۔ اس صوفی [illegible] کوئی خلل [illegible] نہیں ہوتا۔ ▭▭

خامہ بگوش

مزاحیہ کسرِ نفسی

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ظفر اقبال شاعر بڑے ہیں یا کالم نگار۔ جنھوں نے ان کی شاعری پڑھی ہے وہ ان کی کالم نگاری کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جن اوقات میں ظفر اقبال بہترین شاعری کر سکتے تھے، ان اوقات میں انہوں نے کالم نگاری کر کے اپنی بہترین شاعری کو منصۂ شہود پر آنے سے روک دیا۔ جن لوگوں نے ان کے کالم پڑھے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ جس کھٹو نے یہ کالم لکھے ہیں، وہ شاعری کیا کرے گا کہ شاعری کے لیے نرم دلی و نرم خوئی بنیادی شرطیں ہیں۔ جنھوں نے ظفر اقبال کی شاعری اور کالم نگاری دونوں سے استفادہ کیا ہے، ان میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ پہلے گروہ کی یہ رائے ہے کہ وہ کوئی تیسرا کام کیوں نہیں کرتے۔ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ وہ صفِ اول کے شاعر ہی نہیں، اسی صف کے کالم نگار بھی ہیں۔ ہمارا تعلق اسی گروہ سے ہے اور ہم ان کی نظم و نثر کے اس حد تک مداح ہیں کہ ان کی ان تحریروں کو بھی ادبِ عالیہ میں شمار کرتے ہیں جو ابھی لکھی نہیں گئیں، کیوں کہ ہمارے نزدیک ادب کی سب سے بڑی خدمت لکھنا نہیں، نہ لکھنا ہے۔

ہم جب ظفر اقبال کی شاعری پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے، ان سے پہلے ان جیسا شاعر نہیں گزرا اور جب ان کے کالم پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلی مرتبہ کوئی ڈھنگ کی چیز پڑھ رہے ہوں۔ ممکن ہے ظفر اقبال کے بدخواہ ہمارے اس بیان کو ہماری کم نظری پر محمول کریں، لیکن ہمیں اس کی پروا نہیں ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ ہمارا شمار ظفر اقبال کے مداحوں میں ہوتا ہے۔ بدخواہوں کی خدمت میں ہم مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

اک شخص کی "الفت" تو بڑی کم نظری ہے ؎ کس میں ہے مگر اہلیتِ کم نظری بھی

لفظِ "الفت" ہم نے واوین میں اس لیے لکھا ہے کہ اسے "مدح" کے معنوں میں لیا جائے اور کسی قسم کی کوئی دہری غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

یگانہ نے کہا تھا:

تو آپ اپنی ہے شمشیر، آپ اپنی سپر ؎ یگانہ! ہاگ اٹھا، اپنے بل پر کٹتا جا

یگانہ کی شاعری اس کی سپر بھی تھی اور شمشیر بھی، لیکن ظفر اقبال نے شاعری سے بیک وقت دو کام نہیں لیے اس سے انھوں نے صرف سپر کا کام لیا ہے۔ شمشیر کا کام وہ کالم نگاری سے لیتے ہیں۔ شاعری سپر اس لیے ہے کہ وہ ان کی

شخصیت کے جمال کو دُنیا کی آلائشوں سے بچائے رکھتی ہے۔ کالم نگاری سے ان کی شخصیت کے جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ شمشیر اندھے کی لاٹھی کی طرح چلتی ہے جو گناہ گار اور بے گناہ میں امتیاز نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ظفر اقبال سے لوگ محبت کرتے ہیں جب کہ کالم نگار ظفر اقبال سے ڈرتے ہیں۔ ڈرنے والے صرف اسلام آباد، لاہور اور ان شہروں کے مضافات میں پائے جاتے ہیں کہ ان کے کالم انھیں علاقوں میں پڑھے جاتے ہیں، لیکن ظفر اقبال سے محبت کرنے والے ہر اس جگہ نظر آتے ہیں جہاں اردو زبان کا چلن ہے۔ ان کی شاعری کو دنیائے ادب میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے۔

پُرانے زمانے میں شاہی سکوں پر شعر لکھے جاتے تھے، مگر ظفر اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شعروں کو سکوں میں ڈھال دیا۔ پاکستانی سکے کی قیمت آئے دن گرتی رہتی ہے، مگر ظفر اقبال کی ادبی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکوں کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں ہے جب ڈالر کے مقابلے پر ہمارے پاس یہی سکہ رہ جائے گا۔ اسٹیٹ بینک بھی چھوٹے نوٹوں کی جگہ ظفر اقبال کے شعر جاری کیا کرے گا، بڑے نوٹوں کی جگہ اس لیے نہیں کہ آخر غالب صاحب کے نغموں سے بھی تو کوئی کام لینا ہوگا۔

بلاشبہ ظفر اقبال پاکستان میں خاصے مقبول ہیں، مگر مشاعروں میں شرکت کرتے رہنے کی وجہ سے مشاعروں کے باہر ان کی شاعری کی اتنی قدر نہیں ہوتی جتنی کہ ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں انھوں نے کبھی کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا، اس لیے ان کی قدر دانی کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہاں ان کی پرستش کی جاتی ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ پاکستان کے دو ہی شاعر وہاں مقبول ہیں، ایک علامہ اقبال اور دوسرے ظفر اقبال۔ بعض لوگ فرطِ عقیدت سے دونوں کا نام ایک ہی سانس میں لیتے ہیں تو دونوں ناموں کو ملا کر "علامہ ظفر اقبال" کہتے ہیں۔ ایک پاکستان ہے کہ جہاں اقبال اکیڈمی کا نام بھی صرف اقبال اکیڈمی ہے، حالانکہ اس کے کاموں کا معیار ایسا اعلیٰ ہے کہ اگر اسے ظفر اقبال اکیڈمی کہا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ہندوستان میں جدید ادب کے بارے میں جہاں کہیں گفتگو ہوتی ہے ظفر اقبال کا حوالہ ضرور آتا ہے۔ ہندوستانی نقادوں نے جتنے مضمون ظفر اقبال پر لکھے ہیں، اتنے پاکستانی نقادوں نے نہیں لکھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں نقاد دوا کے طور پر بھی دستیاب نہیں جب کہ ہندوستان میں ہر مرض کی دوا بلکہ سبھی نقاد ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے نقاد شمس الرحمان فاروقی ہمارے ممدوح کے سب سے بڑے مداح ہیں اور یہ تو سب کو معلوم ہے فاروقی جس شاعر کی تعریف کر دیں، اس کی دُنیا تو کیا عاقبت بھی سنور جاتی ہے، یعنی وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ فاروقی نے "شعر شور انگیز" کے نام سے میر کی جو شرح لکھی ہے اس میں جگہ جگہ ظفر اقبال کے شعر میر کے شعروں کے مقابل پیش کیے گئے ہیں۔ اگر یہ شرح میر کی زندگی میں لکھی جاتی تو یہ ان کی زندگی کا دوسرا صدمہ ہوتا۔ پہلا صدمہ دلی کا اجڑنا تھا جسے وہ برداشت کر گئے، مگر دوسرا صدمہ آخری صدمہ بن جاتا کہ اپنے شعروں کے بالمقابل ظفر اقبال کے شعر دیکھنا قیامت سے کم نہ ہوتا۔

"شعر شور انگیز" میں ذکر میر کے ساتھ اپنا ذکر دیکھ کر ظفر اقبال اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے سرخوشی کے عالم میں شمس الرحمان فاروقی کو ایک خط لکھا جو مکتوب الیہ نے مزید خوشی کے اظہار کے طور پر اپنے رسالے "شب خون" میں شائع کر دیا۔ اس خط میں ظفر اقبال لکھتے ہیں: جا بجا اپنا تذکرہ دیکھ کر یقین ہوا کہ اقربا پروری کی روایت پوری طرح جاری و ساری ہے۔ اس خط کے چھپنے پر "شب خون" کے ایک قاری نے فاروقی کو خط لکھا کہ آخر کار اردو تنقید میں اقربا پروری کی روایت کا اعتراف (؟) شخص نے کر ہی لیا جس کی وجہ سے یہ روایت پروان چڑھ رہی ہے۔ فاروقی نے یہ خط بھی چھاپ دیا اور ہاتھ کے ہاتھ جواب دیا:

"جنابِ عالی کو ظفر اقبال کی عبارت سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ انھوں نے مزاح المومنین سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ تم نے جو اپنی کتاب میں جگہ جگہ میرا ذکر کیا ہے تو وہ بر بنائے محبت و مودت ہے یعنی انھوں نے مزاحیہ کسرِ نفسی کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا اور آپ سمجھ بیٹھے کہ ظفر اقبال واقعی خود کو نا اہل سمجھتے ہیں اور واقعی مجھے دوست نوازی کا مورد ٹھہرا رہے ہیں۔"

ہم اس خط و کتابت پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ بہر حال یہ شمس الرحمان فاروقی نے ظفر اقبال کے خط کے مطالب کی اس عمدگی سے شرح کر دی ہے کہ مزاح المومنین یا مزاحیہ کسرِ نفسی سے مزید کام لینے کی گنجائش نہیں رہی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ظفر اقبال کی عام نثر بھی شرح کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ان کی عام نثر تو اتنی مزیدار ہوتی ہے کہ پڑھنے والا پہلے انگلیوں کو چاٹتا ہے اور پھر کاٹتا ہے۔ مزیدار ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس بھی اتنی ہوتی ہے کہ لفظوں سے پہلے ان کے معانی ذہن میں آجاتے ہیں۔ ان کی نثر میں اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں، مگر فی الحال ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں سارے راز ایک ہی بار نہیں اگل دیتے چاہییں۔ آئندہ بھی تو ظفر اقبال پر ہمیں کالم لکھتے ہوں گے کچھ نکتے ان کے لیے بھی محفوظ رہیں تو اچھا ہے۔

ظفر اقبال کی خوبصورت نثر کا تازہ ترین مجموعہ "خشت زعفران" ہے۔ یہ لاہور کے روزنامہ "پاکستان" میں ۱۹۹۳ء میں چھپنے والے کالموں کا انتخاب ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سیاسی موضوعات پر لکھے گئے کالم سیاست سے بھی زیادہ بے مزہ ہوتے ہیں، لیکن ظفر اقبال کا کمال یہ ہے کہ وہ بے مزہ طرحی مصرعوں پر بھی شاندار غزلیں لکھ دیتے ہیں، سیاسی موضوعات پر لکھنے میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ خبروں کی طرح کالموں کی بہار جاں فزا ایک ہی دن کے لیے ہوتی ہے بلکہ بیش تر کالم تو ان غنچوں کی طرح ہوتے ہیں جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ مگر ظفر اقبال صرف آج ہی کے قاری کے لیے نہیں لکھتے ان کی نظر میں آنے والے کل کا قاری بھی ہوتا ہے۔ یہ اہتمام ان کے کالموں کو صحافت کی بجائے ادب کا حصہ بنا دیتا ہے۔ اس بات کی وضاحت ایک دو مثالوں سے ہوگی۔

پاکستان میں نام نہاد جمہوری حکومتوں نے آئین سے جو کھلواڑ روا رکھی ہے، اس پر لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھا ہے مگر ظفر اقبال نے اس معاملہ میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ سب سے مختلف ہے۔

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ جلسے جلوس نکالنا اور نعرے بازی اپوزیشن کا آئینی حق ہے لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان بھی آئین کو گھسیٹ لانا کوئی اچھی روایت نہیں ہے۔ اس سے آئین کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ پھر یہ ہے کہ ایک قوم کو آئین وغیرہ کا اس حد تک پابند اور غلام بنا دینا بھی قابلِ رشک صورتِ حال نہیں ہے، جب کہ آئین کو محفوظ کرنا بجائے خود ایک آئینی تقاضا ہے نہ کہ کثرتِ استعمال سے یہ دستاویز گھس گھسا کر ویسے ہی غائب ہو جائے۔"

پاکستان کے عوام اور اہلِ اقتدار کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے یہ "نوٹس" بڑی مدد کرتا ہے۔

> "ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جہاں ظلم وہاں نواز شریف پروگرام کے دوران وزیراعظم صاحب سے گلے ملنے والے بزرگ اگر خوشبو لگا کر نہیں آ سکتے تو کم از کم دھلے ہوئے کپڑے پہن کر تو آیا کریں۔ نیز گلے ملتے وقت زیادہ دبا کر ملنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ عید کا موقع نہیں ہوتا بلکہ وزیراعظم صاحب کے ساتھ عید بھی اتنا دبا کر ملنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ چوں کہ میلے کچیلے لوگوں کے بغل گیر ہونے سے وزیراعظم صاحب کو جوئیں پڑنے کا خدشہ بھی پیدا ہو گیا ہے اس لیے غریب غربا کی سہولت کیلئے

ہر دور نے پر رسمی دامن کی ٹنکیاں بھی آ ... ہم کیا کیا کریں گی؟

پاکستانی سیاست دان یوں تو مارشل لا کے خلاف ہیں لیکن "جمہوری" دور میں جب وہ خود اقتدار میں نہ ہوں تو مختلف حیلوں بہانوں سے مارشل لا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مارشل لا کا ہماری سیاست اور سیاست دانوں سے جو تعلق ہے اسے بزبان مارشل لا ظفر اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

"جب میں قضائے الٰہی سے آ گیا تو سب لوگ جو میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں اور مجھے ایک دوسرے کے خلاف ہوا اور ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، سجدۂ شکر بجا لائیں گے اور حسب معمول صوبوں کے ہار لے کر میرے استقبال کے لیے چوراہوں پر کھڑے ہوں گے اور حسب معمول طور پر مجھے ہی قوم و ملک کا نجات دہندہ قرار دے رہے ہوں گے، دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گے اور ہر طرح سے میرے سامنے اپنا اپنا دستِ تعاون دراز کرنے کو باعثِ فخر خیال کریں گے اور ظاہر ہے کہ اپنا کام چلانے کے لیے مجھے ان حضرات کا تعاون کسی حد تک مطلوب بھی ہوگا جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا اور ہماری درخشندہ تاریخ اس کی گواہ بھی چلی آ رہی ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہیے کہ حکومت چلانا اہلِ سیاست ہی کا کام ہے، مارشل لا اس میں کسی قسم کی بھی مداخلت کرنا پسند نہیں کرے گا کیوں کہ پیشہ وارانہ مصروفیات کو سب پر اولیت حاصل ہے۔ کم از کم ہمارا سرکاری موقف یہی ہے۔"

ویسے تو اردو کی ہر کتاب گوناگوں نقائص کا مجموعہ ہوتی ہے مگر ظفر اقبال کو "خشتِ زعفران" میں از راہ انکسار صرف دو نقص نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اگر اس مجموعے میں دو نقص نہ رہ گئے ہوتے تو یہ ایک بہتر کتاب ہو سکتی تھی یعنی ایک تو کالموں کا انتخاب میں نے خود کیا ہے اور دوسرے اس کا مصنف بھی میں ہوں۔"

جہاں تک پہلے نقص کا تعلق ہے اس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ کوئی دوسرا شخص ان کالموں کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اس کام کے لیے سینکڑوں کالموں کو پڑھنا پڑتا اور پھر بھی اس کا امکان رہتا کہ درِ مقصود ہاتھ نہ آتا۔ پڑھنا ایک مشکل کام ہے اور مشکل کاموں سے لوگ بچتے ہیں اور خوش قسمتی سے بچ جاتے ہیں۔ ظفر اقبال خود ہی اس ہفت خواں کو خوش دلی و خوش اسلوبی سے طے کر سکتے تھے کیوں کہ ہر لکھنے والے کو اپنی تحریروں میں اپنے عیب دکھائی نہیں دیتے جب کہ دوسروں کے نظر آ جاتے ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسروں کی تحریروں کا انتخاب کرتے وقت لوگ تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہزاروں صفحات میں سے دس، بیس صفحات ہی ان کی نظر میں لائقِ انتخاب ٹھہرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب کوئی ادیب خود اپنی تحریروں کا انتخاب کرتا ہے تو فراخ دلی سے کام لیتا ہے۔ فراخ دلی کسی بھی ادیب کا بنیادی وصف ہے۔ جو اس سے محروم ہوگا، اس کے لیے اعلیٰ ادب تخلیق کرنا تو کیا اعلیٰ ادب کا انتخاب کرنا بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

ظفر اقبال نے اپنی کتاب کا جو دوسرا نقص بتایا ہے، اسے بآسانی دور کیا جا سکتا تھا یعنی کتاب میں شامل کالم کسی بہتر شخص سے لکھوائے جا سکتے تھے۔ اب تو ظفر اقبال ایک بڑے علمی ادارے کے سربراہ ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے ادارے میں کالم نگار کی ایک اسامی پیدا کر کے کسی اچھے کالم نگار کا تقرر کر سکتے ہیں۔

علمی اداروں میں یہی کچھ ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے کہ کام کوئی کرتا ہے نام کسی کا ہوتا ہے، مگر ہمیں معلوم ہے ظفر اقبال اس تجویز پر عمل نہیں کریں گے۔ کیوں کہ وہ ہر وقت اس تحریر پر اپنا نام دیکھنا پسند کرتے ہیں جو انھوں نے خود لکھی ہو۔ ظاہر ہے اس صورت میں کتاب کا دوسرا نقص بھی دور نہیں ہو سکتا۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ کتاب کو اس کے دونوں نقائص کے ساتھ قبول کر لیا جائے اور باقی نقائص کی ذمہ داری کا تعین قارئین پر چھوڑ دیا جائے۔ □□

امریکہ سے "سخن ور (حصہ سوم)" کی اشاعت

لاس اینجلس (امریکہ) میں مقیم اردو کی ممتاز شاعرہ، ادیبہ اور صحافی سلطانہ مہر کی ترتیب دی ہوئی کتاب "سخن ور (حصہ دوم)" شائع ہو چکی ہے جس میں بیرون پاکستان بسنے والے ۸۸ شعرا و شاعرات کا تعارف، کلام اور تصاویر شامل ہیں۔ حصہ دوم کی پُرجوش پذیرائی کے بعد سلطانہ مہر "سخن ور (حصہ سوم)" کی تیاری کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں حسن چشتی، جنرل سکریٹری، بزم اردو نے دنیا کے کسی بھی حصہ میں مقیم شعرا اور شاعرات، جو حصہ دوم میں شریک نہیں ہیں، خواہش کی ہے وہ اپنا تعارف دو تصاویر ایک پورٹریٹ اور ایک گروپ فوٹو — (شعرا کے ساتھ یا فیملی گروپ)، اپنا کلام — غزل، گیت، رباعی یا قطعہ اور سیاہ بال پوائنٹ پن سے اپنا کوئی ایک شعر رقم کر کے، دستخط اور تاریخ کے ساتھ حسبِ ذیل پتہ پر جلد سے جلد روانہ فرمائیں:

SULTANA MEHER
20873 EAST WALNUT
CANYON ROAD. WALNUT
CALIFORNIA 91789, U.S.A

Ph: (909)444-0065

FAX: (909) 444-0077

"سخن ور (حصہ اول)" میں ہندوستان، پاکستان، یورپ اور امریکہ کے ساٹھ شعراء کا تذکرہ شامل ہے۔

حیدرآباد دکن کے تمام شعرا اور شاعرات کے لیے "شگوفہ" کے توسط سے

دلشاد رضوی (حیدرآباد)

★

ایکٹریس کی موت پر احسان میاں کا ماتم

مجنوں نے لیلیٰ سے محبت کی تھی۔ فرہاد نے شیریں سے اور رومیو نے جولیٹ سے لیکن ان کے ساتھ یہ
میں وہ ہیجانی کیفیت نہیں تھی، بلکہ درپردہ عشق فرمایا کرتے تھے۔ ... پھر زمانے کی قدریں بدل گئیں اب تو یہ لیلیٰ
مجنوں کی محبت کا شمار بھی آثارِ قدیمہ میں ہونے لگا ہے۔ اب ہمارے نوجوان ایکٹریس کی زلفوں ... میں گرفتار ہونے
لگے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے دوست احسان میاں کی "لو اسٹوری" ملاحظہ فرمایئے ... احسان میاں کو مایہ ناز ایکٹریس
دلویا بھارتی سے بے پناہ قسم کی محبت ہو گئی تھی۔ محبت بھی ایسی کہ اگر آج رومیو زندہ ہوتا تو ... زندہ رہتا
اور مجنوں اور فرہاد پر تو سکتہ طاری ہو جاتا۔ ویسے تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ احسان میاں ... دلویا بھارتی
کی ہر فلم نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ روزِ اول ہی دیکھ لیتے ہیں اور پھر اس کے بعد مسلسل دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں
بلکہ اُن کے خاص الخاص البم میں اگر کوئی بسا ہے تو وہ صرف اور صرف فلم ایکٹریس دیویا جی ہے حتیٰ کہ ان کے ڈرائنگ
روم میں بھی جو کیلنڈر لگا ہوا ہے اس پر دلویا جی ہی کی تصویر ہے۔

احسان میاں کے عشق کی انتہا کا انکشاف ہم پر اس روز ہوا جب اُنھوں نے ہمیں ایک دن کھانے پر مدعو کیا
اور اصرار کیا کہ ہم کسی طرح اُن کی یہ بات نہ ٹالیں کیوں کہ ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں دلویا بھارتی کا پکچر "نجا گ
گیا ساجن" بھی شہر کی ایک ٹاکیز میں بتانے والے تھے۔ تاکہ پکچر دیکھنے کے بعد ہم اُن کی پسند پر داد دیں اور "کمنٹ" کر سکیں۔
لیکن افسوس کہ ہماری دعوت پر پانی پھر گیا۔ ہوا یوں کہ ہم نے مقررہ تاریخ پر جو صبح اخبار کھولا تو بڑی غمناک بلکہ سنسنی خیز
خبر پڑھنے کو ملی کہ دلویا بھارتی پرلوک سدھار گئی ہیں۔ یہ خبر یقیناً بڑی افسوسناک تھی چنانچہ ہمیں بھی بہت افسوس ہوا۔
لیکن دلویا بھارتی کے غم سے کہیں زیادہ ہمیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ کہیں ہمارا ڈنر ملتوی نہ ہو۔ اور پکچر کا پروگرام بھی۔
احسان میاں کے ہاں جانا اور اُنہی کے ساتھ ان کی چہیتی ایکٹریس دلویا بھارتی کا پکچر بھی دیکھنا بہرحال ضروری تھا۔ ساتھ
ہی احسان میاں کی دلجوئی و غمگساری بھی اب لازم ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم ہر طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر ان کے فلیٹ پر
پہنچ ہی گئے۔ جیسے ہی کال بیل پر ہاتھ رکھا احسان میاں کی بیوی نے فوراً ہی دروازہ کھولا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں
نہایت خاموشی سے اندر آنے کے لیے کہا اب جو ہم نے دیکھا تو احسان میاں لنگی اور بنیان میں ملبوس پلنگ پر بیٹھے زار و قطار
رو رہے ہیں ہمیں دیکھتے ہی چارپائی سے کچھ اس انداز سے اُٹھے جیسے کوئی بھوکا شیر اپنے شکار پر چھلانگ لگاتا ہے۔

ہمیں سینے سے دبوچ لیا اور زور زور سے چلّانے لگے "بھیّا اچھا ہوا تم آ گئے اِس غم کی گھڑی میں کون ساتھ دیتا ہے بھیا! قسم سے لو خود دلو باجی کی اگر میں نے اُن کی کوئی بھی پکچر چھوڑی ہو پرانی فلم "بھاگو دوڑو" سے لیکر تازہ ترین فلم "آئی دلہن گئے براتی" تک ساری کی ساری دیکھ ڈالیں۔ ہائے کیا اداکارہ تھی بھیا یقین مانو وہ اداکارہ نہیں، ساحرہ تھی تم نے تو یقیناً وہ فلم "دل ہمارا ارمان پرائے" دیکھی ہوگی۔ کیا غضب کی ایکٹنگ تھی اور وہ جو پکچر تھی "بندریا کہتی ہے" وہ تو سوپر ہٹ ہی صرف اس لیے ہوئی تھی کہ اس پر دلو باجی چھائی ہوئی تھیں۔ بھیّا اس حسینہ کی موت بھی کیا دردناک موت ہے اتنے آج تک ایسے کوئی اداکارہ مری ہے تم ہی کہو ایسا مرنا بھی کوئی مرنا ہے ہم نے اور بھی ایکٹریسوں کو مرتے دم توڑتے سُنا ہے۔ مینا کماری سے لے کر نوتن، نرگس سب کے سب کس سکون سے اپنے اپنے بستروں اور چارپائیوں پر لیٹے لیٹے اس جہانِ فانی سے ایسے سدھارے جیسے سچ مچ وہ ایکٹنگ کر رہے ہوں بھلا ایسے بھی کوئی مرتا ہے کہ تین منزلہ عمارت سے جو گریں تو بس مر ہی گئیں۔ اور گریں بھی ایسی کہ چاروں شانے چت۔ لاش دیکھ کر سڑک پر میلا سا لگ گیا ہوگا جس نے دیکھا ہوگا کلیجہ پکڑ کر رہ گیا ہوگا اس وقت، اس کے ہم جیسے چاہنے والوں کا بھلا کیا حال ہوا ہوگا ہائے دلو باجی!" یہ کہتے کہتے احسان میاں کی حالت غیر ہونے لگی ہم نے سنبھالا دیا "احسان میاں غم نہ کرو یہاں کون ہمیشہ رہا ہے آج ان کی تو کل ہماری باری ہے" احسان میاں نے ہماری بات ان سنی کر دی "ارے ۱۹واں سال ہی تو لگا تھا اُسے یہ بھی کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے مگر بھیا یقین مانو اگر وہ ۹۱ سال کی بھی ہو کر مرتی تو ہمارے غم میں کہاں کمی ہونے والی تھی اداکارہ تو سدا اداکارہ ہی رہتی ہے"۔ اتنے میں احسان میاں کا بچہ دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا "ابا ببلو کہتا ہے کہ اُس کے ابا نے عید پر کپڑے بنا دیئے مجھے بھی جلدی سے کپڑے سلوا دیجئے نا" احسان میاں نے اپنی بیوی کو آواز دی اور چیخ کر بولے "بیگم ذرا اس بدتمیز کے کان مروڑو اس بے وقوف کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے ہائے دلو باجی مر جائیں اور ہم اور ہمارے بیوی بچے عید پر نئے کپڑے پہنیں۔ خبردار جو اس بار کسی نے نئے کپڑوں کا نام بھی لیا" بچہ معصوم صورت لیئے ڈرا ڈرا سا باہر بھاگ گیا وقت کافی ہو چکا تھا ہمیں بڑی زوردار قسم کی بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن وہاں کھانے کے کوئی آثار ہی نہیں تھے۔ ہماری بے چینی بھانپ کر احسان میاں کی بیوی کہنے لگیں "بھیّا میں نیچے ہوٹل سے آپ کے لیے کچھ لاتی ہوں کیوں کہ ہمارے میاں نے آج دلو باجی کے غم میں صبح سے کچھ کھایا ہے نہ ہی مجھے رسوئی میں جانے دیا ہے"! احسان میاں چِلّائے "بیگم تمہیں کیا ہو گیا ہے آخر سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میری دلو باجی اس دنیا سے چلی گئی اور تم مجھے کھانا زہر مار کرنے کو کہتی ہو۔ ارے پڑوس والے سنیں گے تو کیا کہیں گے یہ بھی کوئی بات ہے کہ ابھی دلو باجی کی ارتھی بھی نہیں اُٹھی اور تم ہمیں کھانے کو کہتی ہو" پھر وہ ہماری طرف پلٹے "تم ہی کہو بھیّا، جب دلو باجی ہمارے بیچ سے ابھی ابھی گئی ہیں تو سوچو کہ کھانا حلق سے اُترے گا بھی تو کیسے"؟ ہم غور سے احسان میاں کا بلبلانا اور ان کے بیٹے کی فرمائش وغیرہ کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ احسان میاں بول اُٹھے "بھیّا میں نے حسبِ پروگرام دلو باجی کی تازہ فلم "کھو گیا جہاں میرا" کے دو ٹکٹ منگوا رکھے ہیں آج کہاں کا کھانا کیسا پانی چلو اُن کے کچھ دلکش پوز ہی دیکھ آئیں کچھ تو تسلی ہوگی ہائے دلو باجی" یہ کہہ کر وہ سسکیاں بھرنے لگے۔ چوں کہ ہمارا دم اس احمقانہ ماحول میں حلق میں اٹک گیا تھا ہم نے معذرت چاہی اور کسی طرح وہاں سے چھٹکارہ پا ہی لیا۔ سیدھے قریب کی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ پیٹ بھر کھانا کھایا اور آ کر یوں بیٹھ کر بڑبڑاتے رہے کہ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"!

رضوان احمد صدیقی
(دہلی)

(رپورتاژ)

دوبئی میں جشن مجتبیٰ حسین

اس ہنگامہ خیز دور میں زندگی ہر دم ہل چل کی شکار رہتی ہے۔ کبھی کبھار ہی سکون و اطمینان کے لمحے بھولے بھٹکے میسر آجاتے ہیں۔ اور پھر اچانک کافور ہو جاتے ہیں۔ ان ابتر حالات میں پچھلے دنوں ایک خوش خبری ملی کہ دوبئی میں دورِ حاضر کے نامور طنز و مزاح نگار اور نقاد مجتبیٰ حسین کا جشن منایا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک سمینار اور مزاحیہ بین الاقوامی مشاعرہ بھی ہوگا۔ مجھے بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے۔ خط پڑھ کر تا دیر یقین نہیں آیا کہ ہمارے یہاں جشن، افتتاح، صدارت اور مہمان خصوصی ایسے اعزاز بدعنوان اور بے ایمان وزیروں اور سیاست دانوں کے لیے وقف ہیں جو کسی سے تقریر لکھا کر لے جاتے ہیں اور جلسے لوٹ لیتے ہیں۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین، اور ساغر خیامی کو فون کر کے مزید تصدیق کی، انھوں نے بتایا کہ کئی ہندوستانی شعراء پاپولر میرٹھی، ساغر لکھنوی، بازغ بہاری، اور مختار یوسفی بھی مشاعرے میں شرکت کے لیے دوبئی جا رہے ہیں۔

۱۷ ستمبر کو ہم سب اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر ایک دوسرے کا انتظار کرتے کرتے یکجا ہو گئے۔ پھر رسمی کارروائیوں کے بعد ہوائی جہاز میں جا بیٹھے جو صرف کراچی تک کے لیے تھا۔ جہاں سات گھنٹے قیام کے بعد دوبئی کے لیے دوسرے طیارے کے ذریعے روانگی تھی۔ کراچی میں ہمارا بڑا روکھا پھیکا استقبال ہوا، ہاتھوں کے اشاروں سے ہمیں بتایا گیا کہ کراچی کے ہوائی اڈے کے باہر ہمیں نہیں جانے دیا جائے گا، کیوں کہ ٹرانزٹ اگر آٹھ گھنٹوں کا ہے تو قیام کے لیے ہوٹل مہیا کیا جاتا ہے بصورتِ دیگر یہاں فرش یا صوفوں پر جہاں بھی جگہ ملے مکھیاں مارنے کی کھلی چھوٹ ہے۔ مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی یہ درگت ہرگز برداشت نہ ہوئی اور میں حفاظتی عملے کو یہ بتانے پر مجبور ہو گیا کہ جن لوگوں کو آپ بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا رہے ہیں وہ ہندوستان میں بہت اہم لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور ہر جگہ ان کی عزت و احترام کے ساتھ پذیرائی ہوتی ہے۔ حکام افسروں کے باہمی صلاح و مشورے کے بعد ہمیں باہر جانے اور رسمی کارروائیوں کے بعد ہوٹل عطا کرنے کا مژدہ سنایا گیا۔ ایک ذمہ دار شخص کو ہمارے ساتھ روانہ کیا گیا جسے ہدایت کی گئی کہ ہوٹل کے جو بہترین کمرے ہیں، ہمارے لیے کھول دیے جائیں۔

ہوٹل پہنچ کر آرام کرنے کی کوشش کی، لیکن تھکن کے باوجود ایر کنڈیشن کمرے میں کوئی پل چین نہ ملا۔ دل کراچی کے عزیزوں

نف: ڈاکٹر سید داؤد اشرف

تبصرہ نگار: ڈاکٹر حسن الدین احمد

قدردانِ حیدرآباد

"قدرداں حیدرآباد" تیرہ تحقیقی مضامین کا مجموعہ
ہے جن کو لائق محقق ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے آندھرا پردیش
سٹیٹ آرکائیوز کے دستاویزات سے اخذ کردہ مواد
کی بنیاد پر لکھا ہے۔ دستاویزات کی چھان بین کا کام عرق
ریزی کا کام ہے۔ جہاں تک ان دستاویزات کا معاملہ
ہے انھیں یورپ یا امریکہ کی کسی لائبریری میں مائیکروفلم کے
ذریعہ دیکھنا نہیں ہے بلکہ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز
کے گرد سے اٹے لاتعداد دستاویزات میں سے اپنے کام
کا مواد تلاش کرنا ہے اور صرف دستاویزات کی گرد کو صاف
کرنا نہیں ہے بلکہ اپنی مہارت اور بالغ نظری سے تاریخ
کے چہرے پر جو گرد جمی ہے اُس کو بھی صاف کرنا ہے۔ اس
کام کو ڈاکٹر داؤد اشرف نے جس مہارت سے انجام دیا
ہے وہ زیرِ نظر کتاب کے ہر مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔
ڈاکٹر داؤد اشرف کے تحقیقی مضامین کثیرالاشاعت اخبار
روزنامہ سیاست میں شائع ہوتے رہے پھر ان مضامین
کے یکے بعد دیگرے تین مجموعے شائع ہوئے۔ زیرِ نظر
کتاب چوتھا مجموعہ ہے۔ نہ صرف مضامین کا علمی اور تحقیقی
معیار اونچا ہے بلکہ موضوعات کا انتخاب ایسا ہے کہ داد
دینے کو جی چاہتا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر
ہے ڈاکٹر داؤد اشرف نے حکومت حیدرآباد کی علمی
سرپرستی اور اہلِ علم کی قدردانی کو موضوع بنایا ہے
اور بتایا ہے کہ حکومت حیدرآباد کی دولت کا ایک حصہ
علم کی ترویج پر صرف ہوتا تھا۔ حکومت حیدرآباد نے جن
جن علمی کارناموں کی جس جس طریقے پر سرپرستی کی ا...
کی قابلِ اعتماد تفصیل ہمیں صرف اور صرف داؤد اشرف
کے مضامین سے ملتی ہے۔

قدرداں حیدرآباد میں نصف سے زیادہ مضامین علمی
اداروں کی اِمداد سے متعلق ہیں جن میں برطانیہ اور ہالینڈ
کے علمی اداروں اور لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز
کی امداد سے متعلق مضامین شامل ہیں نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء
انجمن ترقی اردو اور ادارہ ادبیات اردو کی امداد سے
متعلق بھی قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہیں، مایہ ناز انگریزی
مترجم قرآن مجید محمد مارماڈیوک پکتھال کو جو سہولتیں حکومتِ
آصفیہ نے فراہم کیں اور جو مالی امداد دی ان کی تفصیلات بھی
ایک مضمون میں دی گئی ہیں جس کو زیرِ نظر مجموعہ کا حاصل سمجھا
جا سکتا ہے۔ داؤد اشرف ریسرچ کا کام جس خوبی سے انجام
دے رہے ہیں اس کے لیے وہ عوامی شکریے کے مستحق
ہیں۔ قومی اور ریاستی سطح پر ان کی علمی خدمات کا شایانِ
شان اعتراف نہیں کیا گیا تو یہ بات تاریخ میں ثبت
ہو جائے گی اور مستقبل کے داؤد اشرف یہ بتائیں گے کہ
جمہوری دَور میں ایک محقق کی ویسی پذیرائی نہیں ہوئی جیسی
کہ شخصی حکمرانی کے دَور میں اہلِ علم اور محققین کی ہوتی رہی۔

شگوفہ پبلی کیشنز اور اس کے سربراہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
اس کتاب کی اشاعت کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔
انھوں نے ایسی کتاب کو جو معنوی خوبیوں کی حامل تھی ظاہری
خوبیوں سے آراستہ کر دیا۔ امید کہ اہلِ علم اس کتاب کو قدر
کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

کتاب کی قیمت : ۱۰۰ روپے

کتاب ملنے کے پتے:

(۱). سیل کاؤنٹر روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد
(۲). دفتر ماہنامہ شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۰ شمارہ ۱۲ ڈسمبر ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت: محمود سلیم۔ محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد

قیمت: ۱۰ روپے
زرسالانہ: ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱
فون (آفس) 595716 فون رہائش 4576064

'شگوفہ' کا آئندہ شمارہ

سالنامہ

۸ / جنوری ۱۹۹۸ء کو شائع ہوگا

* تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات
* طنز و مزاح نگاروں کی تصاویر
* کارٹون، لطیفے اور دیگر دلچسپیاں

انشائیوں، ڈراموں، افسانوں اور شاعری کا دلچسپ مرقع

صفحات : ایک سو سے زائد

سہ رنگی سرورق ★ قیمت ۱۵ روپے

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

قسط وار مضمون

مالِ مفت (انشایئے)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

نثری پیروڈی

حق تو یہ ہے کہ (ترجمہ)

بال کی کھال تبصرہ

چوُرن (منظومات)

آندھراپردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن!

رجسٹرڈ آفس 8/825 - 1 - 4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد اے پی

حکومت آندھراپردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد سلمان، سکھ، عیسائی، پارسائی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱). غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم ۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000/- روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50.000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6.5% پر دیا جاتا ہے کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 مارچ 97ء تک 68421 افراد میں 2115.89 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 8975.60 لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1937 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 217.21 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 586.67 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائیٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹر پر بھی کام کررہی ہیں۔

خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

قادر علیخان
ایم اے ایچ ڈی سی
مینجنگ ڈائرکٹر

مُجتبیٰ حُسین (دہلی)

قدیر زماں کا رشوت نامہ

قدیر زماں ہمارے لگ بھگ نصف صدی پرانے دوست ہیں۔ 1953ء میں ہمارے دوست ڈاکٹر عندلیب نے کچھ احباب کے ساتھ مل کر کاچی گوڑہ میں ایک گلبرگہ کاٹیج قائم کیا تھا جہاں گلبرگہ سے آنے والے طلبہ امداد باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس کاٹیج کو چلایا کرتے تھے۔ اس امداد باہمی میں ہمارا حصہ "امداد" میں کم اور "باہمی" میں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کاٹیج میں سبھی گلبرگہ کے طلبہ رہتے تھے لیکن قدیر زماں غالباً اکیلے ایسے طالب علم تھے جن کا تعلق کریم نگر سے تھا۔ گلبرگہ میں کریم نگری اس ملاوٹ کے خلاف جب ہم احتجاج کرتے تھے تو ڈاکٹر عندلیب اپنی روشن خیالی اور وسیع المشربی کو ثابت کرنے کے لیے اقلیتوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے مسئلہ پر ایک لمبا چوڑا لکچر دیا کرتے تھے۔ گلبرگہ کے طلبہ کی اکثریت کے درمیان وہ قدیر زماں کریم نگری کو اقلیت سمجھتے تھے اور جی جان سے ان کا تحفظ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیر زماں شروع سے ہم سے بدکتے رہے ہیں اور ماشاءاللہ اتنی پرانی دوستی کے باوجود آج بھی بدکتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو ان کا شمار ہمارے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے جن کی تعداد اب دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ اسی لیے وہ ہمیں عزیز بھی ہیں۔ ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک شعر ہے ؎

وہ بُرے ہوں کہ بھلے جو بھی ہیں پیارے ہیں ؏ اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

کسی پتھر پر پانی کے قطروں کے گرنے کا عمل لگاتار جاری رہے تو پتھر بھی گھسنے لگ جاتا ہے۔ اس مثال میں ہماری حیثیت پتھر کی سی اور قدیر زماں کی پانی کے قطروں کی سی۔ غرض قدیر زماں سے اپنے دیرینہ مراسم کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے اور اس دفتر کو ہم پھر کبھی کھولیں گے۔ یوں بھی پنڈورا کے باکس کو کھولنا کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آج ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہمیں اس لیے پیش آئی کہ پچھلے دنوں ہمیں ان کی لکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب ملی ہے جس کا عنوان "BRIBERY" ہے۔ اس کتاب کو پاکر ہمیں سب سے پہلی خوشی تو یہ حاصل ہوئی کہ قدیر زماں اب اردو کی بجائے انگریزی میں لکھنے لگے ہیں۔ ماشاءاللہ وہ تو اتنی اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں کہ وہ انگریزی ادب کے "شمس العلماء" اور "لسان العصر" وغیرہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ یہ تو ان کا کرم ہے کہ اتنی اچھی انگریزی جاننے کے باوجود اتنے برس تک خواہ مخواہ ہی اردو جیسی پسماندہ زبان میں اپنا وقت برباد کرتے رہے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو کب کے اردو سے جاچکے ہوتے اور اردو والے ہمیں صدائیں دیتے رہ جاتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ انگریز اپنے آپ ہی اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر نہ گئے ہوتے تو قدیر زماں کی انگریزی کو پڑھ کر ضرور چلے جاتے کہ میاں اب اس ملک میں ہمارا کیا کام۔

سنبھالو ہماری زبان اور اپنا راج پاٹ۔ غرض قدیر زماں کو چونکہ اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعت چاہیے تھی تو وہ انگریزی ادب میں چلے گئے۔ یوں بھی زبان تو اظہار کا ایک ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ قدیر زماں کی خوبی یہ ہے کہ سماج میں جب بھی کوئی برائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف آواز ضرور اٹھاتے ہیں اور اس وقت تک آواز اٹھاتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ خود اس برائی کا حصہ نہ بن جائیں۔ چنانچہ ان کی زیرِ نظر کتاب اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ قدیر زماں نے اس کتاب میں "رشوت ستانی" کے خلاف بڑے زور و شور سے آواز اٹھائی ہے اور ان رشوتوں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف موقعوں پر مختلف افراد کو دیں بلکہ یہ تک تسلیم کیا ہے کہ آج وہ جو کچھ ہیں رشوت دینے کی وجہ سے ہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں کلکٹر کریم نگر کے دفتر میں ایک عہدیدار کو پچاس روپے کی رشوت دینے کی وجہ سے ہی ان کا تقرر بحیثیت ٹائپسٹ عمل میں آیا تھا اور یہی پچاس روپے ان کی آنے والی زندگی کی عمارت میں سنگِ بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں جب وہ کوآپریٹیو انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل کے باوقار عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو انہیں اپنے وظیفہ کے بھاری بقایاجات کو حاصل کرنے کے لیے پھر موٹی رقم بطور رشوت دینی پڑی۔ گویا جس رشوت کی مدد سے اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز کیا تھا اسی رشوت کے ذریعہ اپنی ملازمت کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونکی۔ پہلی رشوت اور آخری رشوت کے درمیان بھی انھیں اپنے کئی کاموں کے سلسلہ میں بار بار رشوت دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ انھوں نے ان رشوتوں کا بھی اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ہزاروں رشوتیں ایسی کہ ہر رشوت پہ دم نکلے۔

یوں لگتا ہے جیسے وہ سرکاری فرائض کم انجام دیتے رہے اور رشوت دینے کی "جین ڈائری" زیادہ مرتب کرتے رہے۔ بہر حال جب وہ باعزت طور پر ریٹائر ہو گئے تو ان کے ضمیر نے جاگنا شروع کر دیا۔ یوں بھی ہمارے ہاں ضمیر اسی وقت جاگتا ہے جب خود آدمی کو نیند آنے لگتی ہے۔ ان کے ضمیر نے جب انہیں جھنجھوڑنا شروع کیا تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کتاب کے ذریعہ ساری قوم کو جھنجھوڑا جائے۔ گویا ضمیر قدیر زماں کو جھنجھوڑ رہا ہے اور جواباً قدیر زماں قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ کریم نگر کے اس عہدہ دار کو جس نے ۱۹۵۱ء میں قدیر زماں کو ملازمت دینے کے عوض ان سے پچاس روپے کی رشوت لی تھی اگر یہ پتہ چل جاتا کہ وہ بعد میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھیں گے تو بخدا وہ قدیر زماں کو الٹا رشوت دیتا کہ بھیا میں تمہیں اچھی سے اچھی ملازمت دیتا ہوں مگر وعدہ کرو کہ تم کوئی کتاب نہیں لکھو گے۔ ہمیں اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک کنجوس مکھی چوس شخص مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا اور جنت کے داروغہ سے ملتمس ہوا کہ اسے جنت میں جانے کی اجازت دی جائے۔ داروغہ جنت نے پوچھا "اگر تم نے نیچے کی دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہو تو بتاؤ تاکہ اس کی بنیاد پر تمہیں جنت میں بھیجا جا سکے"۔ کنجوس آدمی نے دماغ پر بہت زور دیا مگر اسے کوئی نیک کام یاد نہیں آیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب اسے اپنا ایک نیک کام یاد آیا تو خوشی خوشی بولا "ایک بار ایک بڑھیا بھوک سے تڑپ رہی تھی تو میں نے اسے ایک چونی دی تھی"۔ اس پر جنت کے داروغہ نے جنت کے چوکیداروں سے کہا "میاں! اس کی چونی واپس کرو اور اسے لیجا کر دوزخ میں ڈال دو"۔ خدارا یہ نہ سمجھیے کہ قدیر زماں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ہے۔ وہ کوئی برا کام تو کر ہی نہیں سکتے (کتاب لکھنے کے سوائے)۔ ان کا ایک نیک کام یہی کیا کم ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہمارے دوست بنے ہوئے ہیں جب کہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جسے ہم جیسا دوست رہے اسے کسی دشمن کی حاجت نہیں ہوتی۔ ہزار بات کی ایک بات یہ کہ قدیر زماں اصل میں ایک سادہ لوح اور

معصوم آدمی ہیں۔ وہ تو اتنے سادہ لوح ہیں کہ ایک بار ہم نے مذاق میں اپنی آواز بدل کر انھیں بی بی سی کے انگریزی لہجہ میں فون کیا اور کہا I AM JOHN MAJOR FROM LONDON I WANT TO TALK TO KADEER ZAMA (ان دنوں جان میجر برطانیہ کے وزیر اعظم تھے) قدیر زماں نے کسی قدر جھجک کر پوچھا "معاف کیجیے۔ آپ کون بول رہے ہیں؟"

ہم نے جب جان میجر کا حوالہ دیا تو نہایت ادب کے ساتھ اپنی مخصوص انگریزی میں GOOD MORNING YOUR EXCELLENCY وغیرہ کہا۔ تب ہم نے اپنے اسی لہجہ اور اعتماد کے ساتھ کہا "مسٹر قدیر زماں ہم ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کو بہتر کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے"۔ اس پر قدیر زماں نے بے ساختہ YOUR EXCELLENCY! MY HUMBLE SERVICES ARE ALWAYS AT YOUR DISPOSAL کہا

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ دیا۔

شام میں وہ ہمیں ملے تو حسب معمول ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا۔ تنک کر بولے آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ جس آدمی کے پاس جان میجر کے فون آتے ہوں وہاں آپ کی کیا حیثیت ہے۔ اب ہم اپنی حیثیت پر لاکھ افسوس کرتے رہ گئے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال یہ ان کی سادہ لوحی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس ملک میں [illegible] ہو رہے ہوں، جہاں جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے لیڈروں کو رشوت دینے کا معاملہ درپیش ہو، جہاں چارہ گھوٹالے میں کروڑوں روپیوں کے وارے نیارے ہوئے ہوں وہاں ان کے پچاس روپیوں اور ہزار ڈیڑھ ہزار روپیوں کی رشوتوں کو کون پوچھتا ہے۔ بھلا نقار خانہ میں کسی نے طوطی کی آواز سنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدیر زماں خود اپنی ذات میں ایک ایسا طوطی ہیں جس میں ہر دم ایک سالم نقار خانہ گونجتا رہتا ہے۔ ان کی ابتدائی رشوت کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے۔ ۵۱ [illegible] ایک دن وہ اپنے چچا کی نئی نویلی سائیکل کو لے کر غفلت میں کاچی گوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تھے جہاں ریلوے پولیس کے ایک داروغہ نے ان کی سائیکل ضبط کر لی اور اس کی رہائی کے لیے دو روپے رشوت دینے کا طلب گار رہا۔ ان کے پاس اس وقت دو روپے بھی نہیں تھے۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر کار انھوں نے ضمانت کے طور پر اپنی شیروانی داروغہ کے پاس رکھوائی اور گھر جا کر دو روپے لے آئے۔ تب کہیں جا کر اپنے چچا کی سائیکل اور اپنی شیروانی واپس حاصل کی۔ رشوت کے اس واقعہ کو انھوں نے ایسے کرب اور اذیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ لگتا ہے ان کا قلم اب ٹوٹا کہ تب ٹوٹا۔ تاہم اس ناخوشگوار واقعہ کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ قدیر زماں نے بعد میں شیروانی پہننا ہی ترک کر دیا۔ بش شرٹ اور شرٹ پہننے لگے [illegible] ان کی جگہ ہم ہوتے تو سرے سے لباس پہننا ہی ترک کر دیتے۔ اس کتاب میں [illegible] رشوت دینے کے نت نئے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدیر زماں نے [illegible] رشوت دینے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ اس عہدہ دار کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف ہو جاتے تھے اور جان بوجھ کر اس وقت تک ہارتے رہتے تھے جب تک کہ رشوت کی مطلوبہ رقم قدیر زماں کی جیب میں سے [illegible] کی جیب میں منتقل نہیں ہو جاتی تھی۔ ایسی رشوتیں تو ہم نے بھی اپنی سرکاری ملازمت میں بہت سی دی ہیں۔ [illegible] بالاشان تھے اور جب بھی وہ ہمیں شعر سناتے تھے تو ہم اس پر کچھ اس طرح داد دیتے تھے کہ گویا رشوت دے [illegible] ہمارے سے

ہند بیدار مایاں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ اس دنیا میں ان سے بڑا شاعر اور سب سے بڑا سخن فہم پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگرچہ قدیر زماں
کی یہ کتاب رشوت ستانی کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر شائع کی گئی ہے۔ لیکن دیدہ بینا رکھنے والے اصحاب
اس کو بطور "ہدایت نامہ رشوت ستانی" کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

آخر میں یہ عرض کرتے چلیں کہ اس کتاب کو لکھتے وقت قدیر زماں کی نیت بالکل صاف رہی ہے انھوں
نے وہی لکھا ہے جو ان کے ضمیر نے لکھوایا ہے مانا کہ انھوں نے جو رشوت دی ہے اس کی رقم بوفورس اسکنڈل
وغیرہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن قدیر زماں کوئی سیاستداں تو نہیں ہیں کہ بھاری رشوتیں لیتے اور دیتے رہیں
فوٹوگرافی میں ایک طریقہ تصویروں کو انلارج (ENLARGE) کرنے کا بھی ہوتا ہے آپ اس کتاب کو اپنے
ذہن میں انلارج کرلیں تو آپ پر حقیقت آشکار ہوگی۔

تو حضرات ہمارے تھوڑا لکھے کو بہت جانیے اور آج ہی سے رشوت دینا اور لینا بند کر دیجیے۔
یہ اتنی بری لعنت ہے کہ قدیر زماں جیسے ادیب کو کتاب لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چھی چھی چھی۔ اس کام
کے عوض میں ہم قدیر زماں سے کچھ نہیں چاہتے بس اتنی سی گزارش ہے کہ جب بھی ہم حیدرآباد آئیں تو اپنی موٹر
میں ہماری سیر کرا دیں۔ یوں بھی ہم ان کی موٹر میں اکثر گھومتے رہتے ہیں۔ نعوذ باللہ یہ نہ سمجھیے کہ قدیر زماں ہمیں
اپنی موٹر میں گھما کر ہمیں رشوت دے رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیوں کہ ان کا ضمیر تو اب جاگ گیا ہے! ■

دلیپ سنگھ

آنجہانی دلیپ سنگھ اور علیل شجاع خاور

شجاع خاور سے میری پہلی ملاقات ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۹ء میں ہوئی۔ اُس دن بلراج کومل کے بیٹے کی شادی تھی
اُن دنوں اردو کے شہرۂ آفاق ناول امراؤ جان ادا پر مبنی میرا ایک ڈرامہ دلی میں اسٹیج ہو رہا تھا جس کی سارے شہر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے دلی کے ادبی حلقوں میں میرا ذکر خاصا ہو رہا تھا۔ اِس وجہ سے اُن دنوں میں گھوڑے پر سوار رہتا تھا۔ ویسے جہاں تک مجھے یاد ہے میں گھوڑے سے کم ہی اترتا ہوں۔ جونہی میں دعوت میں پہنچا بلراج کومل نے کچھ نئے دوستوں سے میرا تعارف کرایا جن میں ایک شجاع خاور بھی تھے۔ کومل نے بتایا کہ شجاع خاور شاعروں میں ایک نئی آواز ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اِنڈین پولیس سروس میں ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت میں اُن کی شاعری سے زیادہ اُن کی ملازمت سے مرعوب ہوا کیوں کہ ان کا شعر تو میں نے تب تک نہ سُنا تھا نہ دیکھا تھا۔

دورانِ گفتگو میں نے انہیں بڑا ہی دلچسپ آدمی پایا۔ چنانچہ اس دن پارٹی میں میرا زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزرا ـــــ اس ملاقات کے کچھ مہینوں بعد میری تبدیلی آسٹریا ہوگئی۔ اور میرا رشتہ شجاع خاور سے ہی نہیں، اردو سے بھی ٹوٹ گیا۔ ۱۹۸۴ء میں جب میں لوٹا تو ماہانہ ادبی رسالہ "آج کل" دیکھ رہا تھا کہ اچانک غزل کے ایک شعر پر نظر پڑی جسے پڑھتے ہی میرے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ بڑی بلا کی کاٹ تھی شعر میں۔

یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں رسائل میں غزلوں کے ڈھیر کو اس طرح دیکھتا ہوں جیسے کوئی لوفر آوارہ چکلے میں بالکنی سے جھانکتی ہوئی رنڈیوں کو دیکھتا ہے۔ ایک نظر دیکھا اور آگے نکل گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے سبھی رنڈیاں ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ ایک جیسے تھکے ہارے چہرے۔ ڈھیروں میک اپ اور ایک ہی طرح کا بھڑکیلا لباس۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ ان چہروں میں کوئی ایسا چہرہ نظر آجائے جس پر سے نظر نہ ہٹے۔ چنانچہ اُس دن بھی میں اپنی عادت کے مطابق غزلوں کو ایک نظر دیکھتا ہوا نکل رہا تھا کہ شجاع خاور کی غزل نے راہ روک لی۔ اِسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ بالکل نئی آواز ہے۔ سوچ نئی، لفظوں کی ترتیب نئی اور کہنے کا انداز نیا۔ میں نے دوبارہ غزل پڑھی۔ شاعر کا نام دیکھا اور پھر نوا کے پتے پر اُسے خط لکھ دیا جس میں یہ بھی لکھا کہ آپ وہی تو نہیں ہیں جن سے بلراج کومل کے بیٹے کی شادی پر ملاقات ہوئی تھی۔

شجاع خاور وہی تھے، لیکن میرا یہ کہنا شاید انھیں اچھا نہ لگا کہ اُن کا شعر پڑھ کر مجھے ہنسی آئی تھی۔ جواب میں انھوں نے

تھا کہ شعر میں انھوں نے طنز کیا تھا لیکن مجھے ہنسی کیوں آئی۔ میں انھیں کیا بتاتا کہ طنز بھی ہنسی بھی ایک طرح کی ہنسی ہوتی ہے اور یہ پولیس کی اجازت کے بغیر بھی چہرے پر کھل سکتی ہے۔

میری اگلی ملاقات ان کی پہلی کتاب کی ریلیز کے موقع پر ہوئی۔ یہ تقریب غالب اکیڈمی میں منعقد ہوئی تھی۔ میں وہاں وقت پر پہنچ گیا لیکن اردو والے اپنی روش کے مطابق مقررہ وقت کے بعد چلے آ رہے تھے۔ شاید اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسٹیج سے اعلان ہوا کہ پہلے چائے کا دور ہوگا۔ اس کے بعد جلسہ شروع ہوگا۔ میں نے بلراج کومل سے کہا کہ چائے کی دعوت تو دی جا رہی ہے لیکن چائے کا بندوبست کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کہنے لگا "پولیس والے ہیں، ابھی جا کر کسی دوکاندار کے بسکٹ اٹھا لائیں گے، کسی کی برفی کا تھال اٹھا لائیں گے اور کسی کی چائے۔ انھیں انتظام کرنے میں وقت ہی کیا لگے گا۔"

میں اس واقعہ کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ ابھی تک لوگ شاعر شجاع خاور کو پولیس افسر شجاع خاور سے الگ نہیں کر پائے تھے۔

میری ایک اور ملاقات شجاع خاور سے ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی جہاں انھیں اپنا کلام سنانا تھا اور مجھے ایک مزاحیہ مضمون پڑھنا تھا۔ ہم لوگ ریڈیو کے وی آئی پی روم میں بیٹھے تھے کہ شجاع آئے اور پروڈیوسر سے پوچھا کہ پروگرام میں کیا کیا آئیٹم ہیں۔ اس نے بتایا کہ آپ کی غزلوں کے بعد ایک مزاحیہ مضمون ریکارڈ کیا جائے گا۔ کہنے لگے میری غزلیں ریکارڈ کرلو۔ مزاح آج کل لکھا کہاں جا رہا ہے۔ میرا جی چاہا کہ کہہ دوں کہ غزلیں جو لکھی جا رہی ہیں وہ کیا ہیں۔ پروڈیوسر کو جب میں نے اپنے ارادے کی خبر دی تو کہنے لگا کہ آپ نے کہہ دینا تھا۔ میں نے کہا یار میں ڈر گیا کہ پولیس کا آدمی ہے پتہ نہیں میرے گھر میں افیون رکھوا دے۔ پروڈیوسر کو میری بات بُری لگی۔ کہنے لگا "جناب! شجاع خاور ایک آرٹسٹ ہے۔ ایسا کبھی نہیں کرے گا کہ آپ کے گھر میں افیون رکھوا کر آپ کو اندر کروا دے۔" میں نے کہا "اندر تو شاید نہ کروائے لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ مجھے اس افیون کا چسکہ پڑ جائے اور میں بربادی کی راہ پر چل نکلوں۔"

بعد میں میں نے جب اس ملاقات کے بارے میں سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ شجاع خاور کی چھیڑ چھاڑ میں دوستی کی مہک بھی تھی۔ مجھے تو اس بات سے کبھی انکار نہیں تھا کہ شجاع خاور اردو غزل میں ایک نئی آواز ہے لیکن اس دن مجھے احساس ہوا کہ شجاع کے دل میں میرے لیے محبت کا ایک گوشہ ہے۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ ملتے تو ان کے شعروں کا ذکر ہوتا جواب مجھے یاد رہنے لگے تھے اور ان شرارتوں کا ذکر ہوتا جو وہ اردو کے ماضی کے ساتھ چھیڑتے ہوئے نقادوں سے کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھے بڑے بھائی کی سی عزت بھی دیتے لیکن دوستانہ چھیڑ چھاڑ سے بھی نوازتے۔ اس دور میں مجھے کبھی یاد بھی نہ آیا کہ ان کا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے۔ میری دوستی صرف ایک ایسے شجاع خاور سے تھی جو اردو کا ایک البیلا شاعر تھا۔

لیکن ایک دن پھر مجھے انھیں ان کے محکمے سے جوڑنا پڑا۔ میرے محلے کے کچھ امیر بزنس مین صبح تال کٹورا باغ میں سیر کے لیے جاتے ہیں۔ اُن کی کوشش رہتی ہے کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں حالانکہ میں آسانی سے ان کے قابو میں نہیں آتا۔ وہاں جا کر سیر تو وہ کرتے ہی ہیں لیکن مجھے مرعوب کرنے کے لیے کبھی کسی ریٹائرڈ جج، کبھی جیل کی انسپکٹر جنرل اور کبھی کسی سکریٹری سے ملاتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں سے ملاتے ہوئے وہ میرا عہدہ بھی ذرا سا اونچا کر دیتے ہیں تاکہ ججوں اور سکریٹریوں کو یوں نہ لگے کہ اُن لوگوں کی دوستی چھوٹے آدمیوں سے بھی ہے۔ میرا جی چاہتا

کہ میں بھی کبھی انھیں اپنے کسی اونچے عہدے والے دوست سے ملاؤں لیکن کیا کرتا کہ میرا ایسا کوئی دوست اس طرف سیر کرنے نہیں آتا۔ ایک دن اچانک شجاع نظر آ گئے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے ساتھیوں سے ان کا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ ہمارے دوست ہیں اور پولیس میں سینئر ڈی آئی جی ہیں۔ ایک بڑے آدمی سے میری دوستی کا رعب اچھی طرح جما بھی نہیں تھا کہ شجاع نے اعلان کیا "ویسے میں نے پولیس سے استعفیٰ دے دیا ہے"۔ دل ہی دل میں میں نے سوچا کہ بھائی شجاع خاور سچ بولنے کا یہ کون سا موقع تھا۔

ان لوگوں کے ساتھ واپس آتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ استعفیٰ کی بات تو شجاع نے یونہی کر دی۔ اس نے استعفیٰ نہیں دیا۔ یونہی کہہ رہا تھا۔ ان سے کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔ ان میں سے ایک بولا "کیا وہ واقعی پولیس افسر ہیں"۔ میں نے کہا "بالکل"۔ کہنے لگا "لگتے نہیں ہیں"۔ اب اس کا میں کیا جواب دیتا۔ اس سلسلے میں میں بڑا بدبخت واقع ہوا ہوں کہ میرے پڑھے لکھے دوست پڑھے لکھے نہیں لگتے۔ فارن ریٹرنڈ، فارن ریٹرنڈ نہیں لگتے، پارلیمنٹ کے ممبر، پارلیمنٹ کے ممبر نہیں لگتے اور جو سرکاری افسر ہیں وہ سرکاری افسر نہیں لگتے۔ اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ دیکھیے نا چہرے پر داڑھی، منہ میں پان، پولیس کے افسر کیا ایسے ہوتے ہیں۔ ایک عام پولیس افسر کی بجائے وہ نقلی پولیس افسر زیادہ لگ رہے تھے جو بھیس بدل کر مجرموں کو پکڑتے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد جب اخباروں میں خبر چھپی کہ شجاع خاور ملازمت سے آزاد ہو گئے ہیں تو میں خوش تھا کہ کم از کم میرے سیر کے ساتھیوں کو اتنا یقین تو ہوا کہ وہ باقاعدہ پولیس میں افسر تھے۔

میں ہمیشہ شجاع خاور سے کہتا رہا ہوں کہ وہ اپنی باغی صلاحیتوں کو غزل میں ایک نئی آواز تک محدود رکھنے کی بجائے کھل کھیلنے کا موقع دیں۔ بغاوت ہی کرنا ہے تو پھر صرف شعر کی دنیا میں ہی کیوں۔ سوسائٹی کے اور بھی تو کئی شعبے ہیں جو اصلاح طلب ہیں۔

اب جب انھوں نے غلامی یا ظاہری عزت کا طوق اتار کر رکھ دیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اب وہ میرے دیئے ہوئے مشورے پر عمل پیرا ہوں گے۔ شجاع جیسے لوگ بہت کچھ کرنے کے اہل ہوتے ہیں کہ ان کے پاؤں زمین پر ہوتے ہیں اور نگاہیں آسمان پر۔ اپنی افسری کے دوران انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پدرم سلطان بود یا میں اورنگ زیب روڈ کی کوٹھی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ تو اپنے محلے کوچہ رودگراں کا ذکر اس فخر سے کرتے ہیں گویا بڑے آدمی صرف انہی کوچوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایسا آدمی چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ ●●

امریکی قطعات

خالد عرفان

پناہ گاہ

آخر پناہ مل گئی مغرب کے ٹینٹ میں
شلوار پوش بھی نظر آتے ہیں پینٹ میں
ویزا ونزٹ کا مانگ کے لائے تھے تین ماہ
"سب وے" میں ایک کٹ گیا، دو بیس مینٹ میں

گرین کارڈ

جناب شیخ کی گوری سے ہوگئی شادی
بہت حسین نظارہ دکھائی دیتا ہے
جو پٹ رہا ہے شب و روز اپنی بیوی سے
گرین کارڈ کا مارا دکھائی دیتا ہے

گریباں

گرمی ہے اس قدر کہ میامی کے بیچ پر
اس کو خیالِ نیکر و بنیان ہی نہیں
میں نے کہا کہ اپنا گریباں تو جھانک لے
کہنے لگی کہ میرا گریبان ہی نہیں

ایڈ

گوروں کی دوستی نہ کبھی کام آسکی
دیکھا ہے اپنی قوم نے کردار 'ادکلی'
اپنے وجود پر جو کیا ہم نے انحصار
ظالم نے "ایڈز" بھیج دیا "ایڈ" روک لی

خود انحصاری

جب بھی کیا ہے ہم نے درِ ادکلی کو پُش
ہم پر کرم ہوا ہے نہ چشمِ جنابِ بُش
خود انحصاریوں کی تمنّا کے بعد جب
مانگی جو ہم نے ایڈ تو کہنے لگے کہ "ہٹش"

انٹرنیٹ

بات ہوتی ہے پسِ چکوال انٹرنیٹ پر
نازیہ سلجھا رہی ہے بال انٹرنیٹ پر
میں نے بس اتنا ہی لکھا آئی لو یو اور پھر
اُس نے آگے کر دیا تھا گال انٹرنیٹ پر

پرویز یداللہ مہدی (بمبئی)

چڑھنا ہمارا دوردرشن کے دار پہ

اِس سے پہلے کہ ڈاکٹر ص. ض سنگساری ٹی وی کیمرے کے توسط سے متوقع ناظرین کے ساتھ اس قدر آگے نکل جاتے کہ ان کی واپسی ناممکن ہو جاتی، انہیں ذہنی طور پر پروگرام میں واپس لانا ضروری تھا تاہم احتیاط لازمی تھی کیوں کہ ریکارڈنگ جاری تھی کوئی اور موقع ہوتا تو موصوف کے بازو میں زوردار چٹکی کاٹ کر انہیں تصور خوش آئند یعنی فلاش فارورڈ (FLASH FORWORD) سے حال میں کھینچ لاتے لیکن موقع کی نزاکت اس بات کی ہرگز متقاضی نہیں تھی، لہٰذا بن بلائے مہمان کی صورت پروگرام میں شرکت فرمانے والی مکھی کو مددگار بنانے کی ٹھانی، یعنی پروگرام کی شروعات میں جس مکھی نے پہلے تو ہمارے ذہن ناہنجار میں لینڈ کرنے کی کوشش کی تھی اور اب ہماری ناک کو طیران گاہ سمجھ کر بڑے اطمینان سے چہل قدمی فرما رہی تھی، اسے بطور ہتھیار کے استعمال کیا، پہلے تو اپنے پھیپھڑوں پر پورا زور ڈال کر اسے پوری قوت سے پھونک ماری اور جب اس غیر متوقع حملے سے گھبرا کر اس نے آناً فاناً ہماری ناک سے "ایمرجنسی ٹیک آف" کیا تب اس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھا کر دوسری پھونک مار کے اسے ڈاکٹر سنگساری کی طرف ہنکا دیا، تیر سیدھا نشانے پر بیٹھا، مکھی نے بھنبھناتے ہوئے جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کے چہرے کا طواف کرنا شروع کیا، متوقع ناظرین کی کثیر تعداد سے اچانک ان کا رابطہ ٹوٹ گیا اور وہ ناظرین کو بھول کر حاضرین میں لوٹ آئے کنوینر پروگرام جناب دلدار ساحری نے موصوف کو مخاطب کیا۔ ڈاکٹر صاحب طنز و مزاح کے تعلق سے اردو والوں میں عجیب عجیب مفروضات عام ہیں، ایک طبقہ اسے ادب کی ایک مستقل صنف تسلیم کرتا ہے تو دوسرے کی نظر میں اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی کہ ہندوستانی کھانوں میں چٹنی اچار اور مربّہ کی اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر صاحب مکھی سے جھوجھتے ہوئے بولے "طنز و مزاح نہ اچار ہے نہ مربّہ ہے نہ چٹنی بلکہ مکھی ہے ایک جیتی جاگتی مکھی!"

موصوف کو مکھی کے بھِن بھِن راگ نے اس قدر بوکھلا دیا کہ کچھ کا کچھ بول گئے، جناب دلدار ساحری غیر یقینی لہجے میں بولے "طنز و مزاح ایک مکھی ہے، تعجب ہے"؟

ڈاکٹر سنگساری اپنے چہرے کو مکھی کی مسلسل یلغار سے بچاتے ہوئے بولے۔ "اس میں تعجب کی کیا بات ہے!"

اِتنا کہہ کر موصوف نے مکھی کا نشانہ لے کر اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں اس طرح گھمایا جیسے مدمقابل مکھی نہیں، مشہور عالم باکسر مائک ٹائسن (MIKE TYSON) ہو، مکھی نے اس جوابی یلغار سے گھبرا کے سیدھے علامہ نچوڑ ہمدانی کا رُخ کیا

لیکن علامہ بھی شاطر ٹھہرے۔ فوراً اپنے ہاتھ کے مورچھل سے اسے دلدار سامری کی طرف بھگاتے ہوئے بولے "ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا طنز و مزاح یقیناً ایک مکھی ہے مگر معمولی مکھی نہیں بلکہ شہد کی مکھی، طنز کو اس کا زہریلا ڈنک سمجھئے اور مزاح کو شہد، چنانچہ طنز کے زہر کو اگر مزاح کے شہد میں لپیٹ کر پیش کیا جائے تو وہ بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے"!!

ادھر دلدار سامری صاحب کچھ دیر تک تو مکھی کے ناز نخرے برداشت کرتے رہے پھر اسے ہماری طرف "ری ڈائرکٹ" کرتے ہوئے ڈائرکٹ ہم سے مخاطب ہوئے کیا آپ ہر دو حضرات کی اس عجیب و غریب رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟ کیا طنز و مزاح واقعی ایک مکھی ہے؟"

علامہ نے پھٹاک سے تصحیح فرمائی۔ "شہد کی مکھی۔"!!

اگرچہ ہر دو حضرات کی اوٹ پٹانگ رائے کو بہ یک جنبش زبان رد کرنے کا ہمارے پاس منہ توڑ جواب بھی تھا اور جواز بھی لیکن اس وقت چونکہ موضوع بحث کے اصل موضوع یعنی طنز و مزاح پر جیتی جاگتی مکھی نہ صرف حاوی ہو چکی تھی بلکہ ہم پر دوبارہ دھاوا بولنے کو پر تول رہی تھی لہٰذا دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو ڈھال بنا کر، جناب سامری کے سوال کو ان سنا کر کے ایک بار پھر مکھی کے ساتھ معرکہ آرائی میں مصروف ہو گئے۔ علامہ نچوڑ نے ہماری اس حرکت کو غالباً پھر ہماری کسی مصلحت پر محمول کیا، چنانچہ بڑی رعونت کے ساتھ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" والے لہجے میں کنوینر بحث کو مخاطب کیا۔ "ہماری رائے کو رد کرنے کے لیے فولاد کا کلیجہ اور کمپیوٹر کا دماغ چاہیئے! طنز و مزاح کو جس مکھی سے ہم نے تشبیہ دی ہے، وہ کوئی دودھ میں کی مکھی یا تہہ میں پھنسا گھی نہیں ہے کہ ذرا سی انگلی ٹیڑھی کرنے پر باہر نکل آئے اس کے لیے غالب کی طرح انگلیاں فگار اور خامہ خونچکاں کرنا پڑتا ہے!

موضوع بحث میں غیر متعلقہ امور کو گھس بیٹھ کرتا دیکھ کر کنوینر بحث جناب دلدار سامری نے گڑبڑا کر مداخلت کی۔ "حضرات معاف کیجئے آپ دونوں اس وقت غلط ٹریک پر جا رہے ہیں، ہماری گفتگو کا موضوع دودھ گھی اور مکھی نہیں بلکہ اردو ادب میں طنز و مزاح کا آغاز و ارتقاء ہے، میری آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنے زریں خیالات کو صرف اصل موضوع تک ہی محدود رکھیں!"

کنوینر بحث کے اس کھلے طنز کے جواب میں علامہ نچوڑ نے ترکی بہ ترکی لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے دانشور دوست دلدار سامری صاحب کو شاید ذرا سی غلط فہمی ہو گئی ہمارے خیالات بظاہر موضوع بحث سے بے تعلق معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی گہرائی و گیرائی پر اگر غور کیا جائے تو موضوعِ گفتگو سے ان کا ربط واضح ہو جائے گا، اصل میں طنز و مزاح سفلی عمل کا دوسرا نام ہے، جس طرح سفلی عمل میں دار الٹا پڑ جانے پر خود عامل کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اسی طرح طنز و مزاح کے پل صراط پر سے صرف وہی ادیب کامیابی سے گزرتا ہے جو دودھ میں سے گھی اور گھی میں سے مکھی کو وہ بھی زندہ نکالنے پر قدرت رکھتا ہو! اپنی بات ختم کر کے علامہ بھی ڈاکٹر سنگساری کے نقشِ قدم پر کیمرے کے توسط سے متوقع ناظرین کی تلاش میں ذہنی طور پر نکل کھڑے ہوئے!!

ہم دوردرشن کیندر کی پالتو مکھی کے ساتھ مجادلے میں اور علامہ نچوڑ ہمدانی ٹی۔وی کیمرے کی وساطت سے متوقع ناظرین کے مطالعے بلکہ فرداً فرداً ان سے مصافحے و معانقے میں مشغول تھے لہٰذا کنوینر پروگرام جناب دلدار سامری، ڈاکٹر حسن سنگساری سے ہم کلام ہوئے۔ "ڈاکٹر صاحب ساری اردو دنیا جانتی ہے کہ آپ برصغیر کے مانے ہوئے ماہر لسانیات ہیں! کیوں نہ آپ کی

اس خصوصیت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ میں نے اکثر یہ دیکھا ہے سنا ہے کہ مزاح کے تلفظ کے معاملے میں بیشتر لوگ فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ کوئی اسے مِزاح کہتا ہے تو کچھ لوگ اسے مَزاح کہتے ہیں۔ اور کوئی کوئی مُزاح تک کہہ جاتا ہے۔ آپ یہ فرمائیے کہ اس میں صحیح تلفظ کون سا ہے؟

"تینوں صحیح ہیں!" فاضل ڈاکٹر نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا، پھر آگے فرمایا۔ "ایک غلط العام ہے دوسرا غلط العوام اور تیسرا غلط العوام الناس۔!!!"

دلدار سامری صاحب سٹپٹا کر بولے۔ "آپ نے تو مسئلہ کو اور الجھا دیا۔!"

ڈاکٹر صاحب تبسم فرما کر بولے۔ "گھبرائیے مت۔ مسئلہ کو الجھانے اور سلجھانے ہی کی تو روٹی کھاتے ہیں ہم۔ جہاں تک مزاح کے تینوں مروجہ تلفظ کا سوال ہے ان کا انحصار کسی مخصوص علاقے کی آب و ہوا، بول چال اور تہذیب و ثقافت پر نہیں بلکہ مزاح کے مزاج اور معیار پر ہوتا ہے مثلاً جس مزاحیہ تخلیق میں زبان و بیان کی شائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہو وہ مِزاح ہے جس میں سنجیدگی اور علمیت کی بھرمار ہو وہ مَزاح ہے اور جس میں پھکڑپن، ابتذال اور ہجو کا رنگ بدرجہ اتم موجود ہو وہ "مُزاح" ہے۔!!"

دلدار سامری صاحب نے ایک بار پھر ہمیں مخاطب کیا۔ "آپ پچھلے بیس برسوں سے طنز و مزاح لکھ رہے ہیں، کیا آپ ڈاکٹر صاحب کی اس عالمانہ رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟" موصوف کے سوال نے ہمیں بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا، کیوں کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ رائے پوری توجہ کے ساتھ نہیں سن سکے تھے، اس دوران ہیں مکھیوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ گویا پروگرام کی ابتداء میں جس ایک عدد مکھی نے بڑی آن بان اور شان کے ساتھ نزول فرمایا تھا۔ اس نے بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ صرف خربوزے کو دیکھ کر تربوزہ ہی رنگ نہیں پکڑتا، بلکہ مکھیاں بھی رنگ پکڑنے میں خربوزے سے پیچھے نہیں۔ ہم پوری تندہی کے ساتھ مکھیوں سے نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دوردرشن کیندر میں مکھیوں کی افزائش نسل اور ان کی پرورش و پرداخت پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی ہے تاکہ جن ناپسندیدہ پروگراموں کو بادل ناخواستہ پیش کرنا پڑتا ہے ان میں افراتفری مچائی جا سکے۔ چنانچہ ارباب دوردرشن کی پالتو مکھیوں کی فوج اس وقت ہماری خیمہ نما شال کو پانی پت کا پاکٹ اڈیشن سمجھ کر صف آراء ہو چکی تھی بالفاظ دیگر قومیائے ہوئے بینکوں کی طرح مکھیوں نے بھی ہمارے وجود کو قومیا بلکہ مکھیا لیا تھا۔ ادھر دلدار سامری صاحب ہمارے جواب کے منتظر تھے لہٰذا ہم نے بھی آئیں بائیں شائیں ہانک دیا۔ "مجھے ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ رائے سے مکھی برابر اختلاف نہیں ہے!!"

ہم نے اتنا ہی کہا تھا کہ مکھیوں کا ہراول دستہ میدان جنگ سے اڑ کر ہمارے چہرے پر حملہ آور ہو گیا، ہم ان سے ڈوئیل لڑنے میں مصروف ہو گئے اور ہماری اس مکھی مار جنگ سے فائدہ اٹھا کر علامہ نچوڑ نے ایکبار پھر مورچہ سنبھال لیا، فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس ٹھوس علمی رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اگر چاہیں تو اپنی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتے، حالانکہ موصوف اس معاملے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں کہ ایک جگہ دی ہوئی اپنی رائے سے دوسری جگہ کھلم کھلا پھر جاتے ہیں۔ خیر یہاں میں ڈاکٹر صاحب کی ناقدانہ رائے میں اتنا اضافہ ضرور کرنا چاہوں گا کہ جس طرح موصوف نے مزاح کے تین زمرے بتائے ہیں اسی طرح میری رائے میں طنز کی بھی تین قسمیں ہیں، ایک تو ہے "طَنز" دوسرا طِنز اور تیسرا طُنز۔ جب کوئی بات غالب کے تیر نیم کش کے مانند پوری طرح جگر کے پار نہیں ہوتی تو وہ طَنز کہلاتی ہے اور جب کسی طنز نگار کا وار اوچھا پڑتا ہے تب وہ "طِنز" کہلاتا ہے، البتہ جب تیر بالکل ہی خطا کر جاتا ہے جب یہ ناکام عمل "طُنز" کہلاتا ہے۔!! اس عجیب و غریب تشریح پر لغو نیز بحث دلدار سامری نے طنزاً کہا۔
"آپ حضرات کی عالمانہ و ناقدانہ تشریح سے یہ ثابت ہوا کہ طنز و مزاح صرف طنز و مزاح ہی نہیں، طنزِ مزاح بھی ہے اور طنزد

مُزاح" جس) گویا اردو طنز و مزاح محض زیر، زبر اور پیش کا گورکھ دھندہ ہے۔ پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں!

اب پانی بھی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور مکھیاں بھی اس لیے ہم اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں چلاتے ہوئے جھنجھلا کر بولے۔ "میں ہر دو حضرات کی ہر بات، ہر رائے سے یکسر اختلاف کرتا ہوں۔ طنز و مزاح کا موضوع ایک سنجیدہ اور علمی بحث کا متقاضی ہے اور آپ حضرات کبھی شغلی عمل اور کبھی مکھی سے اس کا موازنہ کر کے گستاخی معاف اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ طنز و مزاح میری نظر میں نہ تو زیر، زبر اور پیش کا تانا بانا ہے اور نہ مکھی پر مکھی بٹھانے کی شعبدہ گری، بلکہ یہ وہ خطرناک صنف ادب ہے جس میں مکھی پر ہاتھی کو بٹھایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس احتیاط اور چابکدستی کے ساتھ کہ نہ ہاتھی کو کوئی گزند پہنچے نہ مکھی کو۔۔۔!! ہمارے اس احتجاجی لہجے اور جارحانہ حرکات و سکنات کا ردعمل یہ ہوا کہ ہمارے تن ناتواں کے اطراف لپٹے ہوئے "پانی پت" کے میدان میں کھلبلی مچ گئی۔ جس کے نتیجے میں مکھیوں کی فوج ظفر موج نے ایسی طوائف الملوکی مچائی کہ اس مرتبہ ان کی زد میں دیگر شرکائے بحث بھی آ گئے، چنانچہ مکھیوں کی اس ہٹلری یلغار سے بوکھلا کر کنوینر بحث جناب دلدار سامری نے شرکائے بحث کا شکریہ ادا کئے بغیر ہی پروگرام کے اختتام کا اعلان کر دیا۔!!!

موضوع بحث کے "مقطع" میں ہم نے جس جارحانہ انداز میں "سخن گسترانہ" بات کہی تھی، اس کا فی الفور ردعمل یوں ظاہر ہوا کہ دیگر شرکائے پروگرام یعنی علامہ نچوڑ ہمدانی، ڈاکٹر مس جن سنگساری، یہاں تک کہ کنوینر پروگرام دلدار سامری نے بھی ہم سے رخصتی مصافحہ کرنا گوارا نہیں کیا، اور اس طرح وہاں سے رخصت ہوئے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہ ہوں۔ اصل میں ہمارے نام نہاد دانشور و ناقد حضرات، اپنی ہاں میں ہاں سننے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ علمی بنیادوں پر ان سے مثبت انداز میں بھی اختلاف کرنے والے کو ایک پل کے لیے برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے اس غیر ادبی رویے سے ملول اور دل برداشتہ ہم جیسے ہی فلور سے باہر نکلے، میک اپ روم انچارج نے بلی کی طرح راستہ کاٹا، اور فوراً اپنی شال اتروالی۔ انہیں غالباً خدشہ تھا کہ ہم دوردرشن کیندر کی شال لے کر چمپت ہو جائیں گے۔ حالانکہ جس شال نے ہمارا حال معتوب اور مستقبل مشکوک کر دیا تھا، وہ اگر خلعت فاخرہ کی صورت ہماری نذر کی جاتی تب بھی ہم اسے ہرگز قبول نہ کرتے۔ ایک بات جو اس شال کے تعلق سے ہمارے ذہن میں بڑی دیر سے کھٹک رہی تھی ان سے کہہ ڈالی۔ "لگتا ہے دوردرشن کیندر کی پالتو مکھیوں کو اس شال سے بڑا لگاؤ ہے۔!" وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے "اب آپ سے کیا پردہ! پچھلے گھنٹے آدھ گھنٹے تک آپ اسے بھگت چکے ہیں ہم لوگ بھی ان مکھیوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ انہی کی وجہ سے اب لوگ ٹی۔ وی سنٹر کو "مکھی سنٹر" کہنے لگے ہیں، کسی زہر کسی دوا، کسی پیسٹ کنٹرول (PEST CONTROL) کا ان پر اثر ہی نہیں ہوتا، ہماری انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ منسٹری سے زیادہ سخت جان ہیں یہ مکھیاں۔ ٹی۔ وی سنٹر کے افتتاح سے لے کر آج کی تاریخ تک کتنے ہی سوچنا منسٹری آئے اور چلے گئے لیکن ٹی۔ وی سنٹر کی مکھیوں کی آبادی میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ اس نے تو فیملی پلاننگ کے سارے ہی پروگراموں کی کھٹیا کھڑی کر دی۔ چنانچہ مجبور ہو کر ان مکھیوں کی نقل و حرکت کو محدود رکھنے کے لیے ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے، یعنی پروگرام میں حصہ لینے والوں میں سے کسی ایک کو یہ کراماتی شال اڑھا دیتے ہیں۔"!

ہم نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔ "اور لوگ بھی تو اس پروگرام میں شریک تھے، صرف میرا ہی انتخاب کس لیے کیا گیا؟" شاطرانہ لہجے میں بولے۔ "آپ کے دوسرے ساتھیوں پر یہ شال کئی بار ڈالی جا چکی ہے۔ ان کو اس کا سیکریٹ SECRET معلوم

ہے چنانچہ اب یہ شال صرف انہی لوگوں کو اڑھائی جاتی ہے جو پہلی بار ہمارے کیندر تشریف لاتے ہیں ۔!

آخر میں مذکورہ پروگرام کا حشر بھی ملاحظہ فرمایئے۔ بیگم چونکہ ہفتوں پہلے ہی ہمارے ٹی۔ وی پروگرام میں حصہ لینے کا ڈھنڈورا پیٹ چکی تھیں لہٰذا جس روز یہ پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونے والا تھا، ہمارا محلہ غریب خانے میں سمایا ہوا تھا لیکن وائے رے بدنصیبی، دوردرشن والوں نے اپنی عادت کے مطابق عین وقت پر ہمارے پروگرام کی جگہ پرندوں کی بولیاں بولنے والی ایک غیر ملکی ٹولی کا پروگرام پیش کر کے بیگم کو کاٹنے اور ہمیں بھونکنے پر مجبور کر دیا اور سارے مہمان اپنی اپنی خاص بولیاں بولتے ہوئے ہمارے چائے، بسکٹ پر اپنا اپنا غصہ اتار کر رخصت ہو گئے ۔!

اگلی مرتبہ جب مذکورہ پروگرام کا نمبر لگنے والا تھا ایک مشہور نیتا اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے جو انتخابات کے وقت اردو کی حمایت میں اور الیکشن جیتنے کے بعد اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے مرتے مرتے بھی اردو دشمنی نبھا کر یہ ثابت کر گئے کہ ؎ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں عرف اردو والوں پر ۔!

البتہ تیسری مرتبہ اربابِ دوردرشن ہمارا پروگرام نہ چاہتے ہوئے بھی ٹیلی کاسٹ کرنے کو مجبور ہو گئے لیکن اب ہم سوچتے ہیں کاش یہ پروگرام ٹیلی کاسٹ نہ ہوا ہوتا، کیوں کہ اسے دیکھنے کے بعد بیگم کے سارے منصوبوں پر جھاڑو پھر گئی، بلکہ شال، پھر گئی، اس لیے کہ سارے پروگرام میں ہم کم سے کم اور دوردرشن کیندر کی شال زیادہ سے زیادہ دکھائی گئی معہ مکھیوں کی فوج کے۔ شال کے کلوز اپ CLOSE UP سے ہٹ کر جتنی مرتبہ بھی ہمارا سراپا دکھلایا گیا، اس میں بطورِ خاص اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ہم بولتے ہوئے نہ دکھائی دیں، چنانچہ ہمارا سراپا جب بھی نظر آیا، یا تو ہماری حیثیت ایک خاموش تماشائی کی سی تھی یا پھر ہم بڑے ہی انہماک کے ساتھ مکھیاں مار رہے تھے۔ مایوسی اور ندامت کے اس غلبے کے باوجود ہم اخیر تک پروگرام کے کلائمکس والی اپنی مختصر مگر جامع تقریر کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے رہے لیکن افسوس پروگرام کا کلائمکس ہی گول کر دیا گیا تھا اور یہ ایڈیٹنگ ظاہر ہے پروگرام کے دیگر نامور شرکاء کے اشارے پر ہوئی تھی اور یوں ہمارے دانشور و نقاد حضرات نے بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ ان کی پہونچ بہت دور تک ہے۔

بیگم چونکہ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی اس توڑ جوڑ والی سیاست سے ناواقف تھیں لہٰذا پروگرام کے اختتام پر واویلا مچاتے ہوئے بولیں۔ اگر تمہیں شال اوڑھ کر صرف مکھیاں ہی مارنے کا اتنا شوق تھا تو میری کشمیری شال اوڑھ کر مکھیاں مارتے اس طرح کم سے کم میری شال کی پبلسٹی تو ہو جاتی ۔!

(نوٹ) :۔ دوردرشن کی اس روداد کے کردار، واقعات، مقامات، تمام فرضی ہیں، صرف راقم الحروف شال اور مکھیاں اصل ہیں۔ !!)

ڈاکٹر محبوب راہی
بارسی ٹاکلی

بھنگوٹے ہو تم

کھرے کہاں ہو، کھوٹے ہو تم
بے پیندے کے لوٹے ہو تم
ہم کو کیا لینا دینا ہے
دُبلے ہو یا موٹے ہو تم
بڑی بڑی باتیں کرتے ہو
اسی لیے تو چھوٹے ہو تم
مُنہ کیا کوئی تمہیں لگائے
کالے اور کلوٹے ہو تم
پان مسالے کے گٹکے ہو
تمباکو کے گھوٹے ہو تم
پیروں میں لپٹے رہتے ہو
پیٹی کوٹ کے گوٹے ہو تم
بھن بھن بھن کرتے رہتے ہو
شاعر نہیں بھنگوٹے ہو تم
بچوں پر چڑتے رہتے ہو
بالکل بانجھ بجوٹے ہو تم
بیساکھیاں ہٹا کر دیکھو
ناٹے ہو تم، چھوٹے ہو تم
کبھی انوپ ہے نام تمہارا
یا پھر کبھی جلوٹے ہو تم
میری لنگوٹی لے بھاگے ہو
کیسے یار لنگوٹے ہو تم
مطلب کیا تہذیب سے تم کو
بالکل جنگلی تروٹے ہو تم
مُنہ نہ بڑوں کے آؤ راہی
شاعر چھوٹے موٹے ہو تم

اقبال ہاشمی
حیدرآباد

غزل

جنھیں اپنا ڈھنڈورا آپ پٹوانا نہیں آتا
اُنھیں دنیا میں، کچھ بھی کر کے دکھلانا نہیں آتا
گلے کے زور پر محفل پہ چھا جانا نہیں آتا
غزل کہنا تو آتا ہے، غزل گانا نہیں آتا
تمہیں بیداد ہو جانے پہ اترانا مُبارک ہو
ہمیں تو داد ملنے پر بھی اِترانا نہیں آتا
اُدھر دستر پہ ہیں کچھ خاص مہماں اور اِدھر ہم ہیں
اُدھر جاتا تو سب کچھ ہے اِدھر دانہ نہیں آتا
نجانے کیسے کھاتے ہیں وہ کیسے ہضم کرتے ہیں
ہمیں ملتا تو ہے "چارہ" مگر کھانا نہیں آتا
ہمیں میٹھے مرض نے کر دیا میٹھے کا دیوانہ
ہمیں کھٹے پھلوں پر رال ٹپکانا نہیں آتا
نظر احوال دنیا پر ہمیں رکھنا تو آتا ہے
مگر دانشوروں سا غور فرمانا نہیں آتا
اسی باعث اُلجھ کر رہ گئے دنیا کی گتھی میں
ہمیں اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا نہیں آتا
گوالوں کے حوالے ہم نے کر دیں، دودھ کی نہریں
ہمیں فرہاد جیسا زور دکھلانا نہیں آتا
ابھی ہم ہاشمی مشکل سے کچھ کچھ عرض کرتے ہیں
ہمیں استاد کرنا اور فرمانا نہیں آتا

ڈاکٹر محمد اسد اللہ
(ناگپور)

نقلِ مکانی اور ہم

ہم اپنی نقلِ مکانی کا تذکرہ کیوں نہ اس واقعہ سے شروع کریں جو ہمارے دوست مسٹر ربانی نے ہمارے حق میں کی۔ ہوا یوں کہ ہم نے انھیں یہ اطلاع دی کہ ہماری خانہ بدوشی کا سلسلہ اب بھی قائم ہے اور ہم پھر ایک نئے مکان میں منتقل ہوگئے ہیں تو انھوں نے چونک کر پوچھا "کیا نیا مکان خرید لیا ہے"؟ "بھئی ہم ایسے خوش نصیب کہاں!" ہم نے جواباً کہا۔ "بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس بار پھر ایک نئے مالکِ مکان نے ہمیں خرید لیا ہے"۔

(کرایہ کے مکان میں رہتے ہوئے ہمیں تو ہر بار یہی محسوس ہوتا رہا ہے)

ہمیں پتہ تھا اب یہ پوچھا جائے گا کہ مکان چھوڑنے کی وجہ کیا تھی لہٰذا خود ہی بتا دیا کہ اس مکان کی پریشانیاں تھیں۔

"اُفوہ! خیر کوئی بات نہیں خدا کرے آپ کسی کرائے کے مکان میں چین سے نہ رہیں" ہم حیرت سے ربانی کا منہ تکنے لگے۔ انھیں تو چاہیے تھا کہ ہمارے ایک مکان سے دوسرے میں انتقال کر جانے پر کوئی رسمی سا تعزیتی جملہ ادا کرتے، مالکِ مکان کی چنگیزیت پر بلیغ سا تبصرہ کرتے اور پڑوسی کرایہ دار کی ایذارسانی پر ہمیں تسلی دیتے۔ ان کی یہ بددعا سن کر ہم سے نہ رہا گیا۔

"یار، ربانی زخموں پر نمک چھڑکنے کے کچھ شریفانہ طریقے بھی ہمارے سماج میں رائج ہیں اور صاف گوئی کا دعویٰ کرنے والے بھی اس ہتھیار کو اسی وقت استعمال کرتے ہیں جب انھیں جھوٹ بولنا ہو۔ بھلا تمہیں کیا ہوا جو کھلے لفظوں میں مجھ سے دشمنی کا اظہار کر رہے ہو۔" اس پر وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولے۔ "ڈاکٹر صاحب یہ بات نہیں ہے میں نے جو یہ کہا کہ آپ کسی کرایے کے مکان میں خوش نہ رہیں تو اس کا مطلب بس اتنا ہے کہ میں چاہتا ہوں اب آپ اپنا ذاتی مکان بنانا شروع کر دیں کیوں کہ کسی کرائے کے مکان میں آپ چین سے رہنے لگے تو پھر ہمیشہ وہیں کے ہو رہیں گے۔"

کاش مکان بنانا اس قدر آسان ہوتا کہ کرایہ کے مکان میں رہ کر پیش آنے والے عبرت آموز تجربات سے عبرت حاصل کی اور مکان بنا لیا۔ مکان بنانے کے لیے عبرت کی نہیں دولت کی ضرورت ہے۔

یہ سچ ہے کہ کرائے کے مکانوں کو بھگتنے والا سوائے مکان بنانے کے کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا البتہ کچھ لوگ تو کرایہ ادا کرنے کے بعد اس قابل نہیں رہ جاتے کہ کچھ سوچ سکیں۔ مثلاً میرا ایک دوست ہے سلیم۔ درجن بھر کرائے کے مکانوں میں رہ چکا ہے۔ مالی حالت کے پیش نظر اسے یقین ہے کہ وہ زندگی بھر مکان نہیں بنا پائے گا میری طرح وہ بھی مکان مالکوں کا ستایا ہوا ہے چنانچہ اب وہ بجائے مکان بنانے کے ٹائم بم بنانے کا منصوبہ بنا رہا ہے کہ کرایہ کا مکان چھوڑتے وقت اسے کسی کونے کھدرے میں چھوڑ کر چلا جائے ـــــ

مکان بنانے کے لیے ایک عدد پلاٹ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یوں تو ہمارے پاس کئی پلاٹ پڑے ہیں جن پر ہم کئی افسانے اور ناول تعمیر بھی کر چکے ہیں جن کے زیادہ تر ہیرو ہماری طرح کرایہ دار ہیں۔ ویلن اور ویمپ کے رول مالکانِ مکان کو دیئے ہیں اس کار خیر کیلئے کہیں کہیں پڑوسیوں کو بھی زحمت دی گئی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہر سال کیلنڈر کی طرح مکان بدلنے کا عادی ہو گیا ہوں یہ رائے صحیح نہیں ہے کیوں کہ کیلنڈر تو سال میں صرف ایک مرتبہ بدلا جاتا ہے اور مکان کا معاملہ یہ ہے کہ اسے کپڑوں اور سیاسی جماعتوں کی طرح جب جی چاہے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نقلِ مکانی کے مرتکب ہوئے ہیں تو اس سوال کا جواب دینے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیئے کہ ـــــ

"آخر وہ مکان کیوں چھوڑ دیا؟" پوچھنے والے کا انداز اکثر ایسا ہوا کرتا ہے گویا وہ آپ کے کردار کے تعلق سے شک و شبہ میں مبتلا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ انتہائی فضول قسم کا سوال ہے۔ فضول ان معنوں میں کہ اس کا جواب ایک یا دو جملوں میں دیا ہی نہیں جا سکتا اس کے لیے ایک نئی داستان الف لیلیٰ سنانی پڑے گی۔ تاہم لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے آپ جوابات گھڑ لیتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ مکان بہت چھوٹا تھا اور کمرے بہت تنگ تھے۔ حالانکہ آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مالکِ مکان کا دل اس قدر چھوٹا تھا کہ اس میں کسی ایسے آدمی کے لیے بالکل جگہ نہ تھی جو اسے کرایہ نہ ادا کرتا ہو یا اس کا دماغ اتنا تنگ تھا کہ جمعہ کے دن ریڈیو پر آپ کا قوالیاں سننا تک اسے پسند نہ تھا۔

آپ نے مکان کیوں چھوڑا اس کی وجہ مالکِ مکان اور پڑوسی کرائے دار بھی نہیں جانتے بس یہ کہ ان کی حرکات و سکنات میں ایسی ڈرامائی تبدیلی رونما ہوتی ہے کہ اس کے کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے آپ اپنے آپ کو ایک نئے مکان میں پاتے ہیں۔

کیلنڈر کا تبدیل ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے مگر مکان کی تبدیلی یہ بتاتی ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ بدل گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مالکِ مکان یا پڑوسی کرایہ دار کے جن بچوں کو آپ ازراہِ خلوص مفت پڑھایا کرتے تھے آپ بالغ ہو گئے ہیں اور اب ان کے والدین کو آپ سے برسرِ پیکار ہونے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

آپ کی نقلِ مکانی اشارہ ہے اس طرف کہ ایڈوانس قبول کرتے وقت مالکِ مکان کے چہرے پر پھول کی طرح کھلی ہوئی مسکراہٹ سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح جھڑ گئی ہے اور اس کی مہربان نگاہیں خار دا

ہو گئی ہیں کیوں کہ گزشتہ ماہ کسی شخص نے ان آپ کے کرائے سے دو سو روپے زیادہ کا آفر دے دیا ہے جاتے جاتے وہ بھلا آدمی یہ بھی کہہ گیا کہ "آپ کے موجودہ کرایہ دار آپ کے مکان کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے میرا تو یہاں سے آٹھ دس سال نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے"۔

آپ کرایہ کا مکان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں یہ علامت ہے اس بات کی کہ آپ میں اپنے اعلیٰ افسران کو خوش رکھنے کی صلاحیت اب گھٹنے لگی ہے۔ اسی لیے تو آپ پر مالکِ مکان کا عتاب نازل ہوا کیوں کہ اس مخلوق کو کرایہ داروں کی نہیں رعایا کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ایسی رعایا جو خود پر بھونکتی ہوئی کُتیا کی بھی تعریف کرے اور کہے "ہاؤ سویٹ" یہ کتنا پیارا بھونکتی ہے اس کے بھونکنے میں کتنی [illegible]ت ہے"۔

آپ کا کرایہ کے مکان سے نکل جانا ثبوت ہے اس بات کا کہ آپ میں قوتِ برداشت کی کمی واقع ہونے لگی ہے پڑوسی کے بچوں کا کرکٹ بال سے شیشہ توڑ دینا، مچھروں کا بھنبھنانا اور بجلی کے بل کا تین گنا بڑھ جانا آپ کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یا آنگن کی گندگی، پڑوسیوں کی ڈرندگی اور مالکِ مکان کی کرختگی سے بیزار ہو کر آپ نقلِ مکانی پر اتر آئے ہیں۔

اس دنیا میں خدا نے کرائے دار شاید اسی لیے بنائے ہیں تا کہ دنیا انھیں دیکھے اور وہ دنیا کو دیکھیں اور دونوں کو دنیا کی بے ثباتی کا یقین ہو جائے۔ کرائے دار خواہ چاپلوسی کے ہمالیہ پہاڑ پر کیوں نہ چڑھ جائے، کرایہ وقت پر کیوں نہ ادا کرے، مالکِ مکان کے چشم و ابرو کے اشارے پر کیوں نہ ناچے مگر کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہو جاتا ہے کہ اسے نقلِ مکانی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ عام طور پر تین چار برسوں کے بعد صاحبِ خانہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کرایہ دار کے روپ میں ایک پودا اس کے مکان میں جڑیں پکڑنے لگا ہے لہٰذا وہ بیخ کنی پر اتر آتا ہے وہی مالکِ مکان جو آپ کے قدموں کی آہٹ پا کر سلام کرنے کے لیے باہر آ جایا کرتا تھا اب دروازہ بند کر لیتا ہے کہ کہیں وعلیکم السلام نہ کہنا پڑے اور کسی نیک ساعت میں یہ دُعا قبول ہو گئی تو کرایہ دار دس بیس سال سلامتی کے ساتھ گزار کر دعویٰ کر بیٹھے گا کہ یہ مکان میرا ہے"۔

یوں تو نقلِ مکانی ہر اس شخص کا مقدر ہے جس کا ذاتی مکان نہ ہو ذاتی مکان ہونے کے باوجود جو لوگ نئے مکان کی جستجو کرتے ہیں گویا وہ ایک ہی مقام پر رہتے ہوئے اکتا گئے ہیں ایک صاحب اپنے کرائے دار سے اس قدر پریشان ہوئے کہ خود کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے اور اپنی جگہ کسی پہلوان کو کرائے پر مکان دے دیا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ہمارے پڑوسی شیخ صاحب کا بمبئی ٹرانسفر ہوا تو اپنا مکان کرایہ پر اٹھا دیا اب دو سال بعد پھر لوٹ کر وطن آ گئے ہیں اور کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور ہر ماہ کرایہ دار کی منت سماجت کرتے ہیں کہ بھائی خدا کے لیے مکان خالی کر دے۔

جہاں اہلِ مکان کی نقلِ مکانی سیر و تفریح اور آوارگی ہے وہیں بے مکانوں کی نقلِ مکانی ضرورت ہے ایک قسم ان لوگوں کی بھی جو مکان کی ضرورت کے پیشِ نظر نقلِ مکانی کے درجنوں تجربات سے گزر چکے ہیں ان کی ضرورت اب ان کے لیے دلچسپ مشغلہ بن گئی ہے۔ انھیں مکان ڈھونڈتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی فنکار اپنے شاہکار کی تکمیل میں مصروف ہو۔ انھیں جب کوئی ڈھنگ کا مکان مل جاتا ہے تو لگتا ہے گویا

ندگی میں کسی چیز کی کمی واقع ہوگئی ہے غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مکان ڈھونڈنے کی لذت سے محروم ہوگئے ہیں پھر سوچتے ہیں اس مکان میں کیا کمی ہے معلوم ہوا کہ پہلے جس مکان میں رہتے تھے وہ گراؤنڈ فلور پر تھا وہاں سیلزمین ملنے جلنے والے، فقیر چندہ مانگنے والے اور پتہ پوچھنے والے ناک میں دم کئے رہتے تھے اب تھرڈ فلور پر نیا مکان ملا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگا گویا دنیا سے سنیاس لے لیا ہے۔ چنانچہ پھر ایسے مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں جہاں ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہے۔ اور اس تلاش مکان کے دوران یہ مصرع وردِ زبان رہتا ہے۔

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ کم ہو۔

وحید اشرف (دبئی)

آناً فاناً

روز مرہ زندگی میں آناً فاناً وقوع پذیر ہونے والے حادثات و واقعات سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہ اتنے اچانک اور آناً فاناً ہوتے ہیں کہ ہم ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ یہاں قبل از اطلاع کے لیے چھٹی حس کبھی بے حس ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ہم اپنے آفس کے دریچہ سے حسب معمول صبح صبح بچوں کو اسکول چھوڑنے آئی خواتین کو دیکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان کو بھی دیکھا جو اپنی داہنی جانب گردن موڑے وہی دیکھ رہا تھا جو ہم اور نہ جانے کتنی نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ پھر اچانک ایک برقی کھمبا اس کی راہ میں حائل ہو گیا یا یہ برقی کے کھمبے سے بڑی زور سے ٹکرا گیا اس نے اسی لمحہ اپنی پیشانی کی سطح پر ہاتھ پھیر کر اندازہ لگا لیا کہ پیشانی پر اسپیڈ بریکر نمودار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ بس آناً فاناً ہو گیا۔

بچپن کا وہ واقعہ بھی ہم اب تک بھول نہیں سکے ہیں۔ چند شرارتی لڑکے ہمارے کلاس ٹیچر کے ساتھ اکثر چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے کبھی کرسی پر گوند لیپ دیا تو کبھی چیونگم رکھ دیا ایک دفعہ کرسی کی مخملی گدی کے نیچے ایک لڑکے نے پانی سے بھری کلیہ رکھ دی ایک شریف لڑکے نے منع بھی کیا۔ معترض لڑکے نے گدی کے نیچے سے وہ کلیہ نکالی اور ہاتھ میں لے کر جوں ہی پلٹا کیا دیکھتا ہے کہ ماسٹر صاحب کمر پر ہاتھ رکھے خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ گویا یہ غریب رنگے ہاتھوں بمعہ ثبوت پکڑا گیا تھا۔ وہ اب یہ کیسے سمجھائے کہ میں کلیہ رکھ نہیں رہا تھا بلکہ نکال رہا تھا تاکہ کلیہ کا پانی دریا میں ڈال کر نیکی کما سکوں۔ کلیہ نکالنے کے ساتھ ہی ٹیچر کا آجانا یہ سب کچھ بس آناً فاناً ہو گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ بس بید جنون لے کر بے چارہ کو اس وقت تک پیٹتے رہے جب تک کہ بید مجنون کی طرح لرز نہیں گیا۔ ایسا ہی آناً فاناً وقوع پذیر ہونے والا واقعہ فلمی تاریخ کی شروعات سے لے کر اب تک ہر نئی فلم میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لاش خون میں تر و تازہ بے یار و مددگار پڑی ہے اور جس کے سینہ میں ایک خنجر دستہ تک پیوست ہے۔ گنجان آبادی والے شہر میں اس لاش کے آس پاس کوئی پرندہ بھی نہیں اور اگر کسی گھر میں پڑی ہو تو اس وقت گھر میں بھی کوئی نہیں۔ فلمی ستارے کے ستارے اس کو گردش کراتے ہوئے اس لاش کے قریب لے آتے ہیں وہ حیرت سے لاش کو دیکھتا جو اس کی محبوبہ کے بھائی کی ہے۔ اس لاش کی کمر کے دونوں طرف گھٹنوں کے بل بیٹھ کے دونوں ہاتھوں سے جوں ہی خنجر کو کھینچ کر باہر نکالتا ہے بس اسی وقت آناً فاناً پولیس اس کی محبوبہ کے ساتھ موقع واردات پر پہنچتی ہے۔ آلۂ قتل کے ساتھ خون میں رنگے ہاتھوں اس غریب کو

دھر لیتی ہے اور ناظرین اس منظر سے۔ جائے رُکا جانے کہ اس اچانک واقعہ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اوپر والے سے دعا کرتے ہیں کہ ہیرو جلد از جلد الزام ہنسوبہ سے بری ہو جائے۔

اگر کوئی بہت ہی مخلص اور ملنسار دوست خصوصاً کسی شادی کی تقریب میں کافی عرصہ بعد آپ کو آناً فاناً مل جائے تو ذرا احتیاط کرنا ہو سکے تو چل دے کر بھاگ جانا چاہیے۔ ایسے دوستوں سے پُر شور ٹرافک میں اور کام کے اوقات میں ملاقات ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایک پر خلوص اور ملنسار دوست سے چادر گھاٹ پل پر حیل رفتاری کے دوران ملاقات ہوگئی۔ بڑی تفصیل سے بات ہوئی انھوں نے اپنے بچپن سے لے کر پوترے کی پیدائش تک کے اہم اہم واقعات کا ذکر کر دیا۔ ہم نے شکوہ کیا کہ اپنے بیٹے کی شادی پر ہمیں بھول گئے تو بڑی انکساری سے وضاحت کی کہ ارے بھئی کیا بتاؤں لڑکا مختصر چھٹی پر سعودی عرب سے آیا ہوا تھا بس آناً فاناً شادی ہو گئی اور ہم نے لقمہ دیا "اور آناً فاناً آپ دادا بھی بن گئے"۔

تقریباً بتیس بائیس سال بعد ایک شادی کی تقریب میں ہمارے ایک نہایت ہی بے تکلف دوست آناً فاناً ہمارے سامنے آ گئے۔ انہیں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ہمارے حواس گم ہو گئے کیوں کہ یہ جب بھی، جہاں جس حالت میں ہوں ہم سے ٹوٹ کر بلکہ ہم پر لوٹ کر اور ہم کو توڑ توڑ کر ملتے ہیں ملاقات یار کی تڑپ نے انھیں ایسا تڑپایا کہ محفل میں سجی کرسیوں کو پھلانگتے ہوئے پلک جھپکتے آناً فاناً ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے خوشی کے اظہار کے طور پر پہلے اپنے دانت دکھائے۔ اور ہم تھے کہ مارے وحشت کے انھیں دیدہ حسرت سے دیکھ رہے تھے انھوں نے ہماری کیفیت کو دیکھ کر یہ تجزیہ کیا ہوگا کہ ہماری دحشت وحشت نہیں بلکہ کافی عرصہ بعد ملنے پر حیرت کی نشاندہی کر رہی ہے اور انھیں ہمارا دیدہ حسرت دیدۂ حیرت نظر آیا "ارے کہاں تھے تم اتنے دن سے"! ہم نے مری مری سی آواز میں جواب دیا۔ "میں یہیں تو ہوں"۔

"بے وفا بے درد بے حس سنا ہے دبئی چلے گئے ہو۔ ہم بائیس سال بعد ملے ہیں لکھ پلو تیار ہو جاؤ ملتے ہیں"۔ اور انھوں نے تمام اُدھار ملاقاتوں کو بے باق کرنا شروع کر دیا۔ بھری محفل میں ہمارا لباس فاخرہ تار تار ہونا شروع ہو گیا بھرے مجمع میں اس طرح کی ملاقات سے ہمیں بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ پہلے مصافحہ سے شروعات ہوئی ہاتھ اتنی شدت سے دبایا کہ ہمارے پنجہ کی چار انگلیاں چٹ چٹا کر جڑ سے ہٹ گئیں۔ ہاتھ کو ایک آخری جھٹکہ مارا تو پنجہ کا کلائی سے اندرونی رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ آناً فاناً ہاتھ چھوڑتے ہی سینہ کو دبوچ لیا اور ایسا دبایا کہ ہم نے ہاتھوں کے ساتھ پاؤں بھی ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ ان کے پیچھے دیکھا تو ہم سے مصافحہ اور معانقہ کے لیے لائن بنتی جا رہی تھی۔ آپ نے شادی کی دعوتوں میں دیکھا ہوگا کہ دولھے سے برائے نام گلے مل کر مبارکباد دینے کے بعد مہمان دولھے کے والد، ماموؤں، چچاؤں اور برادران کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ہم پر تکلف کپڑوں میں ملبوس تھے اور ہمارے دوست بڑی گرم جوشی کے ساتھ لپٹ لپٹ کر گلے مل رہے تھے۔ مہمانوں نے یہ منظر دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ یہ ضرور دولھے کے چچا تو ہوں گے ہی جو باپ کے برابر ہوتا ہے۔ جیسے ہی ان کی باہوں سے چھوٹے تو دوسرے منتظر مہمان نے ہمیں اپنی باہوں میں بھر لیا۔ ہماری حالت قابل رحم ہوتی جا رہی تھی۔ لوگوں نے اپنے مونڈھوں سے ہمارے مونڈھوں کو مار کر اور سینہ کو دبا دبا کر ہمارا بُرا حال کر دیا تھا۔ بعض دل جلوں نے تو اپنے جوتے کی ایڑیوں سے ہمارے پاؤں بھی کوٹ کوٹ کر چپٹے کر دیئے ——

آہستہ آہستہ لوگ گلے ملنے کے بعد ہم کو دوسروں نے گلے ڈالنے لگے ایک صاحب نے تو غیر متوقع طور پر نہایت شائستگی سے مصافحہ کیا اور آرام سے گلے مل لیے اس کے بعد انھوں نے پہلے تو خالص عربی انداز میں ناک سے ناک رگڑی اور جوں ہی ڈراکیولائی انداز میں مسکرا کر اپنے منہ کو ہماری گردن کے داہنی جانب بڑھا کر ایرانی تہذیب کے مطابق وہاں بوسہ بھی لے لیا تب ہمیں ہوش آیا۔ تو دبئی میں ہمارے پڑوسی تھے ہارڈویر انجنیئر نعمت اللہ خاں عثمان زئی جو نہایت نرم گفتار اور مہذب و بااخلاق ساتھی ہیں۔ موقع غنیمت جان کر ہم بڑے ہی ہوا ونت انداز دلربائی و ادائے نسائی کے ساتھ ان کی گردن میں اپنی بانہیں ڈال کر جھول گئے اور انھیں اپنے ساتھ لے کر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔

ہم نے نہایت کمزور آواز میں شکریہ ادا کیا کہ اچھا ہوا آپ آناً فاناً آ گئے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا یہ نہیں میں تو دوسرا ملاقاتی ہوتا۔ دیکھا کہ آپ سے گلے ملنے کے لیے لائن بنتی جا رہی ہے تو آرام سے بیٹھ گیا۔ میں آخری ملاقاتی ہوں۔"

غزلیں

رؤف رحیم
(حیدرآباد)

کھپلے، گھٹالے اور مشاغل نئے نئے
مقتل پرانا اور ہیں قاتل نئے نئے

ہر سو ہیں آج رنگِ محافل نئے نئے
ہر شخص کا نظھنے لگا غافل نئے نئے

ہم ایک دل کی چاہ میں مٹی میں مل گئے
مٹی کے پیکروں کو ملے دل نئے نئے

ٹی وی کے اشتہاروں کا ایسا اثر ہوا
آنے لگے ہیں گھر مرے بل نئے نئے

پہلے حسین بلا نے مرا دل چرا لیا
اب جیب کاٹنے لگے عامل نئے نئے

پنچھی پرانے جال اڑا لے گئے تو کیا؟
صیّاد پھانس لے گا عنادل نئے نئے

اس واسطے میں جاتا نہیں اُن کے روبرو
رکھتے ہیں میرے آگے مسائل نئے نئے

ملتی ہے کوئی داد تو مانگے ہے کوئی ووٹ
ہیں اپنے دیش میں کئی سائل نئے نئے

اب محفلوں میں آکے ہمیں سوچنا پڑا
شاعر نئے نئے ہیں کہ جاہل نئے نئے

تم بھی رحیم خوب سی دولت بٹور لو
لیڈر کے واسطے ہیں مسائل نئے نئے

رشید عارف
(پٹنہ)

●

میں نے لگایا لاکھ بٹر بولتے نہیں
بگڑے ہوئے ہیں اُن کے پدر بولتے نہیں

پہلے گرجتے رہتے تھے ہر خاص و عام پر
ٹوٹی ہے جب سے ان کی کمر بولتے نہیں

اماں بگڑ کے پوچھ رہی ہیں کہاں تھے کل
ابا میاں نشے میں ہیں، ڈر بولتے نہیں

جب ہوگیا ہے چاروں طرف الوؤں کا راج
بلبل تو کیا کہ شیر ببر بولتے نہیں

نقلی غذائیں کھا کے ہوا یہ اثر کہ بس
"پر جھاڑتے ہیں مرغ سحر بولتے نہیں"

پنڈت ہوں، مولوی ہوں کہ نیتا ہوں آج کے
جب تک ملے نہ لقمۂ تر بولتے نہیں

شوہر کو اپنے، بیوی نے زندہ جلا دیا
کس نے اڑائی الٹی خبر بولتے نہیں

غنڈوں کا اتنا خوف ہے عارف کہ آج ہم
رکھتے تو ہیں زبان مگر بولتے نہیں

قطعات

احمد علوی
(میرٹھ)

ہم نے کل جب کہا بیگم سے یہ ڈرتے ڈرتے
عشرتِ زوجہ ہے شوہر میں فنا ہوجانا
اس نے فرمایا یونہی ٹانگیں دباتے رہیے
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

برطانیہ میں آپ ہیں، بیگم فرانس میں
بچہ ہوا یہ کس طرح بیگم میں کھوٹ ہے
کہنے لگے جناب، ہے اکیسویں صدی
بیگم ہماری نیک ہیں ہم پہ ریموٹ ہے

م بشیر غوری (جدّہ)

"جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس"

رامش اور دانش دونوں بہن بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے کہ اچانک، داخلی دروازہ دھڑ دھڑانے کھڑکی کھڑکیاں جھنجھنانے اور دیواریں لرزنے لگیں۔

رامش کہنے لگی "لو بھائی! لقمانِ زمانہ انکل چاند تشریف لے آئے ہیں۔ اب تمہارا مسئلہ یوں چٹکی بجاتے حل ہو جائے گا۔"

دانش دوڑتا ہوا گیا اور دروازہ کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

"انکل چاند! آپ کو دیکھ کر آج واقعی ہماری عید ہو گئی۔ بڑے ہی موقع سے آگئے ہیں آپ"۔ دانش کے لہجے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تو گویا جناب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم بے موقع بھی آیا اور نکلا کرتے ہیں۔؟" شیخ چاند نے دانش کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں! یہ بات نہیں ہے — دراصل مجھے آپ کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔" دانش گھبرا گیا کہ کہیں انکل چاند اس کی بات کا بُرا نہ مان جائیں۔ "یہ گھبراہٹ، یہ بے چینی، یہ انتظار۔ لگتا ہے بھتیجے کسی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو۔" شیخ چاند نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! آپ کی محبوبۂ دل نواز آنسہ اردو کی گیسوؤں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ جنھیں سلجھاتے سلجھاتے آپ کے اس بھتیجے کی انگلیاں فگار ہو گئیں۔"

اس دوران رامش اپنی کتابیں سمیٹ کر جانے لگی تو شیخ چاند نے روکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کہاں چلیں — بنت اولیٰ!" شیخ چاند جب بھی موڈ میں ہوتے رامش کو اسی طرح مخاطب کیا کرتے تھے۔

"انکل! میرا کام ختم ہو گیا۔ کچن میں امی کا ہاتھ بٹانے اور آپ کے لیے چائے اور سموسے بنانے جا رہی ہوں۔"

"جائیے جائیے۔ کارِ خیر میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ثوابِ دارین حاصل کرنے کے مواقع بار بار نہیں آتے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے سموسوں کا پیٹ اچھی طرح بھرنا تاکہ ہمارا پیٹ بھر سکے۔"

رامش گردن ہلا کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

"تو جناب کا خیال ہے کہ ہم اصلاحِ گیسو کا کام کرتے ہیں —؟" وہ دانش کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

"اصلاحِ گیسو" کی ترکیب دانش کے سر سے گزر گئی۔ وہ کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

یہ جو شعر شاعری ہے نا انکل! ـــ یہ اتنی سیدھی نہیں ہے جتنی کہ بظاہر نظر آتی ہے۔ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اشعار کا سمجھنا ان کے معنی و مطالب بیان کرنا۔ اور تشریح کرنا تو پہاڑ ہے پہاڑ۔ اب یہی دیکھ لیجیے، علامہ اکبال کا ایک شعر ہے'
"..............."

"کس بال کا شعر ہے ـــ؟" شیخ چاند نے دانش کی بات کو کاٹتے ہوئے متعجب لہجے میں پوچھا۔
"شاعرِ مشرق علامہ اکبال" دانش نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دہرایا۔
"تم ان کی بات تو نہیں کر رہے ہو جن کے مجموعۂ کلام بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ..... وغیرہ ہیں۔"
"جی ہاں! ہم اُن ہی کی بات کر رہے ہیں۔" رامش پُر اعتماد لہجے میں بولا۔
"تمہارے تلفظ میں اعراب کی ذرا سی چوک علامہ اقبال کو دین سے بے دین کر رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم تم سے علامہ اقبال کا شعر سنیں، تم ہم سے ایک قطعہ سنو۔"
"آپ کا اپنا ہے ـــ؟"
"کچھ اپنا اور کچھ دلاور فگار کا ہے۔"
"یہ تو ملاوٹ ہوئی۔ اور ملاوٹ میں ملوث ہونا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"
"یار بھتیجے! شعر و شاعری میں سب چلتا ہے۔"
"یعنی سرقہ بالجبر!" دانش متعجب ہو کر پوچھا۔
"آج کل یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ زمین کسی کی مواد کسی کا، عمارت پر تختی اپنے نام کی۔ ویسے ہماری اس حرکت کو صنفِ شاعری میں پیروڈی، تحریف، تضمین اور تصرف سے کام لینا بھی کہتے ہیں۔"
"ارشاد فرمایئے اپنا تجرباتی قطعہ۔ ہم ہمہ تن گوش بر آواز ہیں۔"
"عرض کیا ہے ؏

طالبانِ علم کی نالج کو کیا کہیے حضور
قلب کو پڑھتے ہیں کلب، قمر کو کہتے ہیں کمر
اِک معلم نے اظہارِ لیاقت یوں کیا
قلقلِ مینا کے معنی لکھ دیے مینا کے انجر پنجر"

"انکل پلیز! آپ املا اور تلفظ کے بجائے میرے ذاتی مسئلہ پر توجہ دیں ورنہ کل جو شرمندگی مجھے اپنے ہم جماعتوں کے سامنے اٹھانی پڑے گی اُس کا آپ کو اندازہ نہیں ہے۔" دانش کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔
"وہ کس لیے ـــ؟" شیخ چاند نے دانش کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
"وہ اِس لیے کہ کل ہمارے اِسکول میں اشعار کا بین الجماعتی تشریح مقابلہ ہونے والا ہے۔ سب سے اچھی تشریح کرنے والے طالبِ علم کو تعریفی سند اور انعام بھی ملے گا۔ اس مقابلے کے لیے جو شعر مجھے دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانا۔

"واہ! بھتیجے واہ! لطف آگیا۔ پہلے مصرع نے دوسرے کو زبان دے دی اور پورا شعر معنی خیز ہوگیا ہے بہو گرم رکھنے کا بالکل صحیح بہانا تلاش کیا ہے آپ نے۔ میری یہ بات لکھ رکھو کہ بڑے ہوکر تم ایک بہت اچھے پیروڈی نگار بن سکتے ہو"۔

"نہیں انکل! مجھے نہیں بننا پیروڈی نگار ___ میں تو وکیل بنوں گا وکیل۔ سُنا ہے جدوجہد آزادی کے بڑے بڑے رہنا پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے۔ میں بھی ان کی طرح ایک عظیم لیڈر نہ سہی بڑا وکیل ضرور بنوں گا"۔ دانش پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"اماں رہنے دو! وہ زمانہ لدگیا جب وکیلوں کا ایک مقام ہوتا تھا اور معاشرے میں اُنھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اب کیا رکھا ہے وکالت میں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ پھرتے ہیں وکیل خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ سُنا نہیں تم نے"۔

"دو وکیلوں کی مڈبھیڑ ایک سڑک پر ہوگئی، دراز قد وکیل نے پوچھا۔ آج کل دھندا کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت بُرا۔ ۔ ۔ ۔" پستہ قد وکیل نے جواب دیا "وکلا حضرات ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوگئے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے ایک ایمبولینس سائرن بجاتی جنرل ہسپتال کی طرف اُڑی جارہی تھی میں نے بارہ میل تک ایمبولینس کا اپنی موٹر سیکل پر تعاقب کیا۔ ایمبولینس ہسپتال کے سامنے رُکی تو پتہ چلا کہ اندر زخمی شخص کے ساتھ پہلے ہی ایک وکیل بیٹھا ہوا تھا"۔

شیخ چاند کی باتیں سُن کر دانش کچھ فکرمند سا ہوگیا۔ اور بے خیالی میں سر کھجانے لگا۔

"یہ کیا کررہے ہو ___" شیخ چاند نے ٹوکا۔

"کھجا رہا ہوں ___ انکل!"

"اِس طرح نہ کھجایا کرو ___ بھتیجے!"

"کیوں انکل؟ ___ اِس طرح کھجانے سے کیا ہوتا ہے؟"

"شوکت تھانوی مرحوم کہا کرتے تھے۔ اس طرح کھجانے سے ڈارون کے نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے"۔

ایک تو آپ نے میرے مستقبل کا سارا پلان تباہ وبرباد کردیا۔ دوسرے مذاق بھی اُڑا رہے ہیں۔ خیر چھوڑیئے اِن باتوں کو، آپ بتائیں کہ بڑا ہوکر مجھے کیا بننا چاہیئے ___؟"

"تمہارے لیے میرا بہترین مشورہ ہے کہ تم فوج میں بھرتی ہوجاؤ"۔

"یعنی فوجی بن جاؤں!" دانش نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں فوجی!" شیخ چاند نے دانش کی حیرانگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اور ترقی کرتے کرتے اوپر تک پہنچ جاؤ"۔

"پھر انکل ___؟" دانش نے اشتیاق بھرے تجسس لہجے میں پوچھا۔

"پھر کیا۔ بھتیجے!۔ پھر وہی جو ہمارے یہاں ہوتا آیا ہے۔ ۱۰/۱۲ سال آرام سے نکال جاؤ گے۔ اِس سے پہلے کوئی اُتارے گا نہیں"۔

"انکل چاند! انکل سام والی چال مت چلیے۔ میں نہیں آنے والا آپ کی ان چالوں میں۔ کندھا میرا۔ بندوق آپ کی۔ اور قتلِ جمہوریت کا ۔۔۔ واہ واہ ۔۔۔ واہ! کیا بہترین مشورہ دیا ہے آپ نے اپنے بھتیجے کو۔" دانش کے لہجے سے طنز نمایاں تھا۔

"جمہوریت ۔۔۔ کونسی جمہوریت ۔۔۔؟ وہ جو ذات، برادری، فرقوں اور قبائل کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ یا وہ جو وڈیروں، سرداروں اور سرمایہ داروں کے در کی غلام ہے۔ بھتیجے ۔۔۔! یہاں نہ جمہوریت ہے نہ نظامِ جمہوریت۔ یہاں تو بس جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس والا معاملہ ہے۔ یعنی دولت کی لاٹھی سے جتنی بھینسیں جس طرف چاہو ہانک لیجاؤ۔ اور اگر اللہ توفیق دے تو پورا باڑا ہی خرید لو۔"

"بس ۔۔۔ بس ۔۔۔ بس انکل!" دانش دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاتے ہوئے زچ ہو کر بولا۔ "میں نے تو آپ سے ایک شعر کی تشریح کی فرمائش کی تھی۔ آپ نے تو پوری حکومت کی تشریح کر کے رکھ دی، جس کا میرے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے شعر کی تشریح لکھا دیں یا کہہ دیں کہ آپ نہیں جانتے" دانش کے لہجے سے بیزاری اور اُکتاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ "رہنے دو بھتیجے۔ ہمیں طیش نہ دلاؤ۔ ہم پہلے ہی بہت طیش کھائے بیٹھے ہیں۔" وہ دانش کے لہجے میں مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

"پہلے تم صحیح شعر تو سن لو پھر تشریح بھی ہو جائے گی۔" ؏

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا

"اچھا، تم بتاؤ کہ تم اس شعر کا کیا مطلب سمجھتے ہو ۔۔۔؟"

"میں سمجھ پاتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔ البتہ آپ کے آنے سے پہلے رامش باجی بتا رہی تھیں کہ یہ شعر علامہ اقبال کی نظم شاہین سے لیا گیا ہے۔ اور شاہین کی فطرت بیان کی گئی ہے ۔۔۔"

شیخ چاند کو موضوع کی طرف پلٹتے دیکھ کر دانش کو کچھ اُمید سی ہو چلی تھی۔

"یہ سب پُرانی و دقیانوسی باتیں ہیں جب شاہین پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کیا کرتا تھا۔ اب تو وہ قصرِ شاہی کی گنبد کے اندر رہتا ہے۔ شاہوں اور شیخوں کے ہاتھ کا طوطا اور حکمرانوں کا غلام بنا ہوا ہے۔ آج کل کا شاہین اگر جھپٹنا پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا بھی ہے تو وہ اپنے لیے نہیں ۔۔۔"

"پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" دانش شیخ چاند کی بات کو کاٹتے ہوئے بولا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھا خاصا رامش باجی سمجھا رہی تھیں کہ آپ آگئے۔ آپ تو ایران طوران کی لے بیٹھے۔" دانش بڑبڑاتا ہوا اپنی کتابیں سمیٹنے لگا۔

"اماں! کہاں چلے ۔۔۔ بیٹھو بیٹھو ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ناراض ہو کر جاتے ہوئے دانش کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور پھر نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسے شعر کا مطلب سمجھانے لگے۔ جیسے جیسے دانش پر شعر کا مطلب واضح ہوتا گیا اُس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ اب وہ بہت خوش اور مسرور نظر آ رہا تھا۔

"یہ بات ہوئی نا انکل! اب مزا آئے گا مقابلے کا۔ مگر انکل ۔۔۔ ایک شعر کی اس قدر تشریح!" دانش کے لہجے میں مسرت کے ساتھ حیرت شامل تھی۔

نظر برنی
دہلی

کام تمام کیا

بطرز میرؔ

ہم نے طوافِ کوچۂ جاناں صبح کیا اور شام کیا
ساری "پراپرٹی" کو ہم نے بڑھ کر نذرِ جام کیا
دن بھر کورٹ "کچہری" جھانکی رات کو پھر آرام کیا
"اُلٹی ہوگیئں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا"

نیتاؤں نے خوبی پائی "ہٹلر" اور "تاناری" کی
کام کئے ہیں اُلٹے سیدھے تہمت ہے سرکاری کی
"جنتا راج" میں "جنتا" کی ہی حالت ہے لاچاری کی
"ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم عبث بدنام کیا"

"کلجگ" کے نیتاؤں کا کیا خوب نظریہ کہنا ہے
سب کی خاطر کیوں مٹ جایئں اپنی خاطر مٹنا ہے
دیش میں روز نیا ہنگامہ روز نیا اک فتنہ ہے
"یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا"

ہم نے پڑھی تھی ایک کہاوت "ویسا کاٹو جیسا بو"
اب پچھتائے ہو وت کیا ہے اب رونے کو لاکھ تو رو
یہ تو ہے دستور پرانا اپنا سمے نہ رو کر کھو
"میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا"

مُنہ پھٹ ناگپوری

مشاعرے

ہوتے رہیں جو سنڈے کے سنڈے مشاعرے
پڑ جائیں اپنے آپ ہی ٹھنڈے مشاعرے

جاہل ہیں سامعین تو شاعر ہیں بے شعور
اک دن چلانے والے ہیں ڈنڈے مشاعرے

اک بار بھی جو گلف میں پڑھ آئے شان سے
اس کے لیے ہیں سونے کے انڈے مشاعرے

پہلی سی اِن کی قدر نہیں ہند و پاک میں
یورپ میں گاڑ آئے ہیں جھنڈے مشاعرے

شعراء و شاعرات کی تعداد دیکھ کر
مُنہ پھٹ نہیں ہیں خوب یہ ونڈے مشاعرے

دو شعر

لیڈری ہے منفعت کا راستہ
زندگی بیکار مت برباد کر
روک دے بڑھتی ہوئی مہنگائی کو
ایسا ہتھکنڈہ کوئی ایجاد کر

★

قومی اتحاد
مجاہدینِ آزادی کو خراجِ عقیدت



ہندوستان کی آزادی
کی 50 ویں سالگرہ

نعیم جاوید (جدہ)

"میٹھے لوگ"

شکر کی بیماری نے اچھے اچھے کاہلوں کو فعال بنایا ہے کیوں کہ ان کے خفیہ معالجوں نے جب ملفوف شیشیوں میں طبی شکر ریختیاں پائیں تو فوراً دھمکی دے دی کہ شیشی بدست تہمت اٹھانے سے بچنا چاہتے ہو تو "کام" کیا کرو۔ اب وقت کام و دہن کی آزمائش کا نہیں بلکہ جان و بدن کی آزمائش کا ہے۔ اور یہ حکم کسی کاہل کے لیے آزمائش سے زیادہ جوکھم کا ہوتا ہے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا کی بنیاد پر میٹھے لوگوں نے حصولِ صحت کے لیے خود اپنے خلاف سازش کر دی وہ بھی اپنے ہی محلے کے چورستے پر اپنی کاہل شخصیت کے پتلے جلا کر۔ جیسے کوئی سیاسی عمل ہو۔

ایک ترش لہجہ مریضِ شکر نے ہم سے کہا کہ ڈاکٹروں نے انھیں رزق کا ملامتی کوٹہ الاٹ کیا اور باقیماندہ زندگی کی تقسیم "کار" کی بنیاد پر کر دی اور ذکٹ لونڈے میں گویا عمر کو محنتِ مزید سے مشروط کر دیا۔ لو گفتگو۔ چن چن دا کھاؤ۔ اور جگ جگ جیو۔ ایک منفرد "کاہل" جس کی سکہ بند "کاہلی" اور دور تک پھیلی ہوئی عزیمت منداں نہ کاہلی کے پیش نظر ہم انھیں "بحرالکاہل" کہہ سکتے ہیں جن کی زندگی شیشی کا ٹھٹا جن جب باہر آیا تو ہم نے انھیں اس قدر فعال پایا کہ ان کی زندگی عمل پیہم سے عبارت ہو گئی بلکہ جہاں ضرورت نہ ہو وہاں بھی کچھ گل کھلاتے نظر آتے ہیں۔ بالکل اس FIREMAN کی طرح جو کسی گودام میں لگی خوف ناک آگ پر قابو پانے کے لیے آگ میں گاڑی سمیت گھس پڑتا ہے۔ اور بڑی محنت سے آگ پر قابو پا کر گودام کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ گودام کا مالک خوش ہو کر پچاس ہزار روپے کا نقد انعام دیتا ہے۔ موقعۂ واردات پر موجود صحافی سوال کرتا ہے کہ "اے جانباز فائر مین [illegible] انعام کی رقم کا کیا کرو گے"۔ وہ جواب دیتا ہے کہ سب سے پہلے اپنی گاڑی کا بریک بناؤں گا۔ [illegible]

عیبوں سے ہنر سرزد ہوتے ہیں۔

ہم اپنے بچپن میں دعوتِ نفس کی ہر تحریک [illegible] قصے بند ہماری [illegible] کا ترنگ ہمیشہ اوند کی داڑھی میں نظر آتا تھا۔ حیدرآباد [illegible] [illegible] کچھ تو [illegible] لیکن ہم اُن کی دکنی نصیحت کو اردو کا غیر معتبر نصیحہ [illegible] لسانی عصبیتوں نے ہمیشہ سے حکمتوں کو پامال کیا ہے۔ سو وہ ہم نے کیا۔

ہم نے سنا ہے کہ انسانی بدن میں یہ میٹھا [illegible] ایک وجہ [illegible] نہ ہونے والی

بے عملی بھی ہے لیکن بلا دئے بھیج بھیج کر دعوت دینے والی اشتعال انگیز وجہ مفت خوری کے علاوہ پُرخوری، تادیر خوری بھی ہے — اور کھاتے ہی ڈھیر ہو کر ملت کی موجودہ تقدیر کی طرح سو جانا بھی ہے —

اس بیماری کی خوش بختی ہے کہ اس کے نام میں شیرینی اور حلاوت ہے جو خود بیمار کو زندگی بخش دیتا ہے جیسے کسی بدشکل عورت کا کوئی خوبصورت نام شکر کی بیماری کا اپنا نصیبہ ہے ورنہ دیگر بیماریوں کے نام دیکھیں کبھی انھیں منہ لگانے کو جی نہیں کرتا۔ جیسے لقوہ، دمہ، دِق، کھجلی، ہرنیا، پیچش وغیرہ۔

ھمارے پڑوسی کے ننھے فرشتے جیسے بچوں نے ہمیں یہ راز میں پیغام دیا کہ آج کل ان کے ابّو اچھے بچوں کی طرح اپنا کام خود کرنے لگے ہیں۔ جیسے اپنا پانی کا گلاس بھر لینا۔ اور پینے کے بعد خود اپنا منہ پونچھ لینا۔ حمام کو یاد سے پانی لے جانا۔ جب کہ پہلے یہ سارے کام ہماری تربیت کے لیے ہمیں ہی انجام دینا پڑتا تھا۔ لیکن ہم نے پڑوسی خبر رساں ایجنسی یعنی ان بچوں کی اماں سے پوچھا تو بولیں کہ اتنی خوشگوار تبدیلی کبھی دیکھی نہ سُنی۔ جب — ان کے شوہر کو شوگر ہوئی ہے۔ وہ خوب کام کرنے لگے ہیں پہلے پہل تو ان کے ڈاکٹر نے انھیں مشورہ دیا کہ کسی طرح اپنی ہی شخصیت کے بہرے فائدہ اٹھاؤ اور اس میٹھی بیماری کو زہر دو لیکن اپنا زہر کافی نہیں رہا۔ وہ خاتون اس موذی بیماری کے خیر و برکات کا شمار کرنے لگیں۔ کہ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ کی رحمت نے ان کے شوہر کو بڑھاپے میں تاکا ہے ورنہ ساری عمر سو سو کر کاٹی۔ آج کل تو اپنی فرض نمازیں خود پڑھنے لگے ہیں ... مسجد کی کمیٹی کے مسائل انھیں عالمی مسائل سے زیادہ اہم نظر آنے لگے ہیں۔

جب کہ ایک زمانہ تھا جب فقہی اختلاف کو بہانہ بنا کر نماز نہیں پڑھتے تھے۔ گویا علماء کا آپسی اختلاف پوری زندگی کو گمراہی کی راہوں پر لگا دینے کا آخری سہارا تھا۔

مریضانِ شوگر کا قافلہ صحت، بیان حفظانِ صحت کے سنہری اصولوں کو کتابوں میں کیڑوں کے لیے نیا ضیافت نامہ چھوڑ دیتا ہے۔ اور طبی اصولوں میں انھیں مغربی تہذیب کی بو آتی ہے۔ مشرقی روایت پسند طبیعت جو غزل سے آشنا ہے اس کو ایسی باتوں میں تغزل نظر نہیں آتا۔ نتیجتہً پوری شخصیت بحر سے خارج ہو جاتی ہے۔ دورانِ خون میں سکتہ آجاتا ہے۔ اور نہ معلوم کیا کچھ عروضی اغلاط نامہ بنا کر شخصیت کی تہہ سے نئے نئے گوشے اُبھر آتے ہیں۔

"لبلبہ" کی شوخیاں بدن کی سنجیدہ طبی اسکیم کو ناکام کر دیتی ہیں۔ جس کی دھاندلیوں کے نتیجے میں جسم کے دیگر صحت مند اعضاء کی ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہیں — اسے ہم لبلبہ اسکام کہہ سکتے ہیں۔ جرائم کو فن بنانے کے لیے معتبر اصولوں سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ بقول حفیظ میرٹھی کے —

اپنے ذرّوں کے بھی نام ماہ و اختر رکھنا
اس سے ذہنوں کی بلندی کا پتہ چلتا ہے

جب "لبلبہ" کی نہایت بدعملی کے شاخسانے پورے بدن کو ڈھونے پڑتے ہیں اور ڈاکٹر بس منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں — لیکن کچھ نہیں کر پاتے نہ معلوم خدائی اسکیم میں افراد کا منہ زور طبیعتیں کتنے روڑے اٹکائی ہوں گی لیکن ملّت کی فضا میں ایسے شکروں کی کمی نہیں جو اپنے حسنِ عمل سے مسائلِ زندگی کو اپنے مقصدِ حیات سے شیر و شکر ہونے دیتے بلکہ شکر کے پہاڑوں سے جست لگا کر بھی "سالم شاکر" رہتے ہیں اور "عبدالشکور" بن کر پوری زندگی گزار دیتے ہیں!

الیاس صدیقی (مالیگاؤں)

اصغر نما

(خاکہ)

"اصغر نما" قدامت نامہ ہے یا نہیں یہ فیصلہ تو آپ کریں۔ چوں کہ ہم نے اصغر جمیل کو ٹھیک طرح سے دیکھا نہیں ہے۔ اس لیے ان کی صحت، صورت، تن، و نقوش وغیرہ کی تفصیلات سے ہم آگاہ نہیں۔ اندازاً کہہ دیتے ہیں کہ اُن کا قد قدِ آدم کے برابر اور بدن ابنِ آدم کی طرح ہونا چاہیے۔ آنکھیں، ہاتھ، پیر، انسانوں کی مانند ہوں گے۔ اور مونچھیں؟ جانے دیجئے، یہ بھی کوئی تبصرہ کرنے کی چیز ہے؟

اصغر جمیل کے پہلے خط سے زیادہ دلچسپ خط ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ جس طرح پہلی نظر کا عشق بے اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح پہلے خط نے ہی ہمیں اصغر نما لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ سچ ہے محبت دوسری نظر کا انتظار نہیں کرتی۔ اور عقیدت دوسری سطر کا۔ انھوں نے لکھا کہ ایک پروگرام ہندو مسلم اسٹوڈنٹس ویلفیئر آرگنائزیشن کی جانب سے منعقد ہو رہا ہے ٹھہریئے! اس فساد زدہ ہندوستان میں "ہندو مسلم" دونوں کو یکجا دیکھنے کی تمنا دل میں جاگ پڑی ہے۔ [illegible] کر دیکھنا چاہتے منظر کیسا ہوتا ہے [illegible] کو جن کے [illegible] ہستیاں ہیں

دوسری کشش جو ان خطوط میں محسوس ہوئی وہ یہ کہ ہندوستان و پاکستان کی نمائندہ شاعری کا انتخاب بھی شائع ہو رہا ہے۔ یہاں بھی [illegible] کیفیت اشتیاق اور [illegible]۔ جن قوموں کو ان کے رہنماؤں نے جھگڑے، فساد اور جنگ کے لیے تخلیق کیا تھا۔ اصغر جمیل ان کو بھی ایک [illegible] ہیں۔ لیکن اس سے بڑا سوال ہمارے سامنے یہ تھا کہ نمائندہ شاعری کا انتخاب چہ معنی دارد؟ ہماری کمزوری یہ ہے کہ [illegible] معنی سمجھنے [illegible] لفظوں سے آگے نہیں جاتے۔ کہاں لکھا تھا کہ کلام کا انتخاب ہوگا [illegible] شاعر [illegible] اصغر جمیل کو اس شاعری کے انتخاب کا حق کس نے دیا؟ وہ نمائندہ شاعر [illegible] جتنا چاہتے ہیں؟ ایسا کرنے کی بنیاد کیا [illegible] کی خراش خراش۔ آواز [illegible] شانوں [illegible] کچھ اور؟ ایسا [illegible] اگر اپنے بزرگوں [illegible] تو نہ ڈریں، مگر ان کو اس مجبوری کا تو خیال کریں جو اس وقت گھر کے کسی کونے میں بیٹھی سوچ رہی ہوگی۔ [illegible] حالات زمانہ خرابی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ [illegible] اصغر جمیل کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ خط میں [illegible] لکھ [illegible] ابھی عمل میں آ ہے۔ اگر کتابوں سے ان کی مراد کوئی کتاب ہے تب تو ٹھیک ہے [illegible] بہت سے [illegible] وغیرہ [illegible] معنی جو

تی ہے جس کی تفصیل میں جانا خطرے سے خالی نہیں۔
اُسی حکم نامہ میں یہ بھی تحریر تھا کہ "اس تقریب میں مجھ پر آپ ایک مقالہ پڑھیں"۔ مقالے کا نام آتے ہی ہمیں چکر آگیا۔ بچپن سے ہی ہمیں اس لفظ سے الرجی ہے۔ دراصل ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مقالہ وہ مضمون ہوتا ہے جس میں بھاری بھرکم مانوس اور ایسے الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے جو لغتوں میں بھی نہیں ملتے۔ یہ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا ہے۔ اور اس صرف ایک شخص سمجھ سکتا ہے۔ خود اس کا لکھنے والا! (اس کی بھی کیا گیارنٹی ہے؟) اس لیے ہمارا چکرا جانا غیر فطری نہیں تھا۔ رے منہ سے ایک سرد آہ اور ایک لفظ مقالہ ایک ساتھ بے ساختگی میں ادا ہو گئے۔ آپ نے مچھلی کا شکار تو کیا ہوگا۔ مچھلی ڑنے کے لیے نائلون کی ڈوری میں ایک کانٹا باندھا جاتا ہے۔ (ہماری طرف اسے گل کہتے ہیں) اس کانٹے کی شکل اور قالہ کے تمام حروف کی شکلوں کا موازنہ کر کے دیکھیے مثلاً م۔ل۔ق۔ وغیرہ۔ یہ شکلیں اُس کانٹے سے کتنی ملتی جلتی ہیں۔ قالہ حلق میں نہیں پھنسے گا تو اور کہاں پھنسے گا؟ اس کو حلق سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ مقالہ لکھا جائے چاہے انجام بھی ہو۔ ثابت ہوا کہ مقالہ لکھنا ہمارا شوق نہیں مجبوری ہے۔

کتنی بھرپور آشنائی ہے :-

اپنی نصف صدی کی عمر میں اصغر جمیل سے ہماری ملاقات کا وقفہ ایک گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ گزشتہ دسمبر میں کامٹی سے مالیگاؤں لوٹتے ہوئے ہمارے س چھ گھنٹے بچ رہے تھے۔ سوچا ان اوقات کو ناگپور کی چند قابلِ احترام شخصیتوں سے نیاز حاصل کرنے میں صرف کریں۔ خدا شکر ہے کہ ہم شارق جمال، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، جلیل ساز، غلام رسول اشرف اور انصاری اصغر جمیل بھی صاحبان خیریت دریافت کرنے میں کامیاب رہے۔ ایک گھنٹہ ہم نے صالحہ بک ٹریڈرس پر بھی گزارا۔ اس ایک گھنٹے کی تفصیل ہے کہ ہماری غلام رسول اشرف صاحب سے نوک جھونک چلتی رہی اور اصغر جمیل سر جھکائے نئی آنے والی کتابوں پر سکّہ اتے رہے۔ گاہکوں سے نپٹتے رہے، ہوں ہاں کرتے رہے۔ کافی پلاتے رہے۔ لیکن جوں ہی ہم نے ٹکٹ رزویشن بات چھیڑی، دوڑ کر پڑوسی کی دوکان پر گئے اور ایک لڑکے کو ہماری مدد کے لیے بلا لائے۔ ہم نے حیرت سے ان کی ف دیکھا۔ اور سوچا۔ ان صاحب کو ہمیں گھر بھیجنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ بعد میں غور کیا تو معلوم ہوا اصغر جمیل ہندستانی یاست دانوں کے برخلاف عملی آدمی ہیں۔ بات کم کام زیادہ۔ حیرانی صرف اس بات کی ہے کہ اتنے پریکٹیکل اور مفید آدمی جشن منانے کے لیے اہلِ ناگپور بیس سال انتظار کیوں کرتے رہے؟

ویسے ہم انہیں ۱۹۷۷ء سے پڑھ رہے ہیں۔ اصغر جمیل ہمارے بعد پیدا ہونے کے لیے دس سال انتظار کرتے رہے کہ ان کے اختیار کی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن نثر نگاری کے لیے ہمارے بعد دو سال بھی انتظار نہیں کیا یہ ہمارے غائبانہ تعارف ابتداء تھی۔ یہ بنیادیں ۱۹۸۴ء یعنی مزاح نامہ کے اجراء کے بعد مزید مضبوط ہوئیں جب انھوں نے رسالے کی مجلسِ مشاورت ہمارا نام شامل کر دیا۔ نقشہ یہ تھا کہ ادھر اصغر جمیل اپنی دانست میں اہلِ وفا کے نام لکھ رہے تھے اور ادھر ہم مجرم کی طرح نہ گار بنے کھڑے تھے۔ صرف نام کے نہیں سچ مچ کے گنہ گار۔ آئیے یہ راز بھی آج کھول دیں۔ مزاح نامہ کے بند ہونے میں ہمارا تھ بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں اصغر جمیل کو تہذیب و شرافت چھو کر نہیں گزری۔ (چونکیے مت۔ ہم اردو والے بہت جلد چونک اتے ہیں بات تو پوری ہونے دیجیے) ہاں تو ہم کہہ رہے تھے تہذیب و شرافت اصغر جمیل کو چھو کر نہیں گزری۔ ان کے اندر گھس ر بیٹھ گئی ہے۔ انھوں نے ہمارا نام مجلسِ مشاورت میں غالباً اس لیے شامل کیا تھا کہ ہم اپنے شہر میں مزاح نامہ کی توسیع و اشاعت

میں ہاتھ بٹائیں گے لیکن مجبوریاں دیکھیے! ایک تو خود ان کا تعلق مومن انصاری برادری سے ٹھہرا، دوسرے ہماری بستی جو برادری کی نمائندہ ہی نہیں، نمونہ بھی ہے یعنی خود اپنے تخلیق کاروں اور فنکاروں کی پذیرائیوں سے ناآشنا اور تنقیم تنقید کے جوہر گراں بہا سے آراستہ۔ ہم سے کوئی مدد نہ ہو سکی۔ پھر اصغر جمیل سے بھی ایک غلطی ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف رسالہ کا سائز چھوٹا رکھا بلکہ قیمت بھی فی شمارہ دو روپے کی بجائے دو سو پیسے لکھ دی۔ جو دیکھتا یہی کہتا: اتنا سا رسالہ اور قیمت دو سو پیسے؟ بہت مہنگا ہے۔ غرض برادری کو نہ خریدنے کا بہانہ چاہیے تھا سو اسے اصغر جمیل نے مہیا کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ رسالے میں چھپے ہوئے ترسیل زر کے پتے کو استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بہرحال بہت دنوں تک ہم اور اصغر ایک عجیب قسم کی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ ادھر ہم سینہ پھلاتے رہے کہ مزاح نامہ کی مجلس مشاورت میں ہمارا نام ڈاکٹر مدحت الاختر، ڈاکٹر شرف الدین ساحل اور بانو سرتاج جیسے اہل علم و فن کے ساتھ شامل ہے اس لیے ہم بھی یقیناً بڑے تخلیق کار ہیں۔ اُدھر اصغر جمیل مونچھوں پر تاؤ دیتے رہے کہ ایک معمولی فنکار کو مجلس مشاورت میں شامل کر کے انہوں نے ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔ آج بھی لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ حق پر کون تھا؟ ہم بلا روک ٹوک جواب دیتے ہیں۔ انور یا انصاری اصغر جمیل۔

نام میں کیا رکھا ہے:- لوگ کہتے ہیں نام میں کیا رکھا ہے؟ ہم کہتے ہیں نام ہی میں تو سب کچھ ہے۔ ہر بچہ اپنے ماں کی نظر میں اصغر ہوتا ہے۔ وہ چاہے جتنا بڑا ہو جائے اور جمیل ہوتا ہے خواہ کتنا ہی نا دید ہو۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو اصغر جمیل کے والدین کا شمار دنیا کے ذہین ترین والدین میں ہوگا۔ غالباً پیدا ہونے کے وقت بچے کو دیکھ کر انھوں نے اصغر نام رکھ دیا ہوگا بعد میں جب بچے کو بڑا ہوتے اور حسن و جمال کھوتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اصغر کے ساتھ جمیل کا پیوند لگا کر اس کے حسن کو کم از کم اپنی زبان پر برقرار رکھنے کی جدوجہد کی ہوگی اس بات کی سچائی سے وہ لوگ زیادہ واقف ہوں گے جو اصغر جمیل کی صورت کو برسوں تک دیکھ دیکھ کر بور ہو چکے ہوں گے۔ ہم تو صاحب! ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

والدین کی ذہانت کا ایک اور پہلو ہے۔ دنیا میں ایسے بیٹوں کی کمی نہیں جو ذرا سی ترقی کرنے، ذرا سا لکھ پڑھ لینے، معمولی سا عہدہ پا لینے اور تھوڑی سی دولت کما لینے کے بعد ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔ اور خود کو اپنے والدین اور بزرگوں سے بڑا سمجھنے لگتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے انھیں کے لیے کہا تھا۔ ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں : کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اصغر جمیل چاہے جتنی کتابوں کا اجرا کروا لے، چاہے جتنے مضامین لکھ لے، چاہے جتنے مشاعرے منعقد کر لے، کا آسمان چھو لے یا دولت کے انبار پا لے، اگر یہ نام "اصغر" اسے احساس دلاتا رہے کہ وہ اپنے والدین، حقیقی اور معنوی بزرگوں اور رب اکبر کے سامنے، جن کے طفیل اسے یہ زندگی، قلم پکڑنے کی صلاحیت اور ترقی و عروج نصیب ہوا ہے، اصغر ہے اور اصغر رہے گا، تب ماننا چاہیے نام میں بہت کچھ ہے کون کہتا ہے نام میں کیا رکھا ہے۔ جہاں تک جمیل کا تعلق ہے جب تک اصغر کے اندر خلوص و محبت کا جمال ہے۔ وہ جمیل ہے۔ میری دعا ہے خدا اسے اصغر بھی رکھے اور جمیل بھی ــــ!

اصغر جمیل جیسا برق رفتار جواب خط لکھنے والا ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ادھر خط آیا اُدھر جواب آیا

...ب کے لیے انہوں نے ہمیں پانچ خطوط بھیجے ہیں۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہر خط کے ساتھ وہ تین کنگن ضرور
...ہے اصلی نہیں بلکہ علامتی یعنی چھپے ہوئے۔ دو لفظ پڑے ایک لفافے پر۔ اس طرح وہ اب تک پندرہ کنگن
...ے ہیں۔ تاریخ کی قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ عورتیں بہادروں کو غیرت دلانے کے لیے چوڑیاں بھیجا کرتی تھیں
بزدلی کا ثبوت [illegible]۔ اور دلیرانہ کارنامے انجام دے کر سربلند رہیں۔ ہمارا دور جدید شاعری اور علامت نگاری
ہے۔ غالباً اصغر جمیل وہی کام چھپے ہوئے کنگنوں سے لینا چاہتے ہیں [illegible] نے بھی ان کے اس علامتی انداز کا
...ب سمجھا۔ اور اسپ قلم لے کر بحر قرطاس میں کود کر مضمون کا معرکہ آخر سر کر ہی لیا۔ اصلی چوڑیاں شاید وہ مزہ نہ
...جو ان چھپے ہوئے کنگنوں نے دیا ہے۔
انعام کے طور پر ہمیں، اب اُس "کنگن" کا انتظار ہے جس کی رسم اجراء کے لیے یہ دو روزہ تقریبات منعقد ہوئی۔

...ڑ شوہر:- انصاری اصغر جمیل یوں تو ہندوستان کی آزادی سے تقریباً آٹھ برس کے فاصلے پر
پیدا ہوئے لیکن ہندوستان سے اپنی محبت کے طفیل اگست کے مہینے میں ہی دنیا میں جلوہ
...نا پسند فرمایا۔ غالباً وہ پہلا جشنِ آزادی جھولے میں منانا چاہتے تھے۔ اللہ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کی
...ے پہلے ہی سن لی۔ ہم نہیں جانتے کہ قطرے سے گہر ہونے تک ان پہ کیا کیا گزری [illegible] اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جوان
...ڑا غضب ڈھایا کہتے ہیں ابھی انکی شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ شوہر ہو گئے (بہت سے لوگوں کو اٹل بہاری
...ی کا یہ قول یاد آ گیا ہوگا کہ غیر شادی شدہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کنوارا ہو) مسز عائشہ اصغر کسی
...مبتلا ہوں۔ شوہر ناگپوری اصغر جمیل کا تخلص تھا۔ اکثر بیویاں شادی کے بعد شوہر پاتی ہیں۔ انہیں تو خوش
...یے کہ ان کے حصے میں [illegible] بڑی میڈ شوہر آیا۔ چونکہ شوہر محض ان کا تخلص تھا اس لیے پریشانی کی کوئی بات بھی نہیں
تھیں با آسانی "شوہر صاحب" کہہ کر پکار سکتی تھیں۔ پریشان تو وہ بی بی تھیں جن کی شادی "آبا" تخلص
...ے ایک شاعر [illegible] ہوئی تھی۔ وہ بے چاری اپنے شوہر کو "آبا" کہہ کر پکارنے پر مجبور تھیں — یہ
...ب ایک سال بعد دور ہوئی جب وہ [illegible] کہہ کر پکارنے کے قابل ہو سکیں۔
...صغر جمیل نے لکھا ہے "کچھ دنوں تک شوہر ناگپوری کے نام سے مزاحیہ کلام لکھا۔ پھر جب اپنی غلطی
...ہوا تو فوراً نثر نگاری کی طرف راغب ہوا" — اصغر صاحب! آپ تو فرضی شوہر تھے اس لیے غلطی
ہونے پر نجات پانے میں کامیاب رہے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان اصلی شوہروں کو آپ کا کیا مشورہ ہے
...احساس ہو جانے کے باوجود گزارا کرنے پر مجبور ہیں۔

دل لگی :- انصاری اصغر جمیل کے مجموعۂ مضامین "لگی" پر تبصرہ کرنا کوئی دل لگی نہیں ہے۔
یہ کام وہ بہتر طور پر کر سکتا ہے جسے تھوڑی سی لگی ہو۔ بات دراصل یوں شروع
...ان کی شادی ۱۹۸۲ میں لگی، پھر اسی سال وہ بھی گئے، کہ کیا ان کی طبیعت لگی یا نہیں لگی ہم نہیں
...اندر کی بات ہے۔ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ سماج کی بے راہ روی ان کو بری لگی، معاشرے کی
...دل پذیر بن کر لگی۔ ان سب کے بارے میں سوچتے سوچتے انہیں کئی رات نیند نہیں لگی معاشرے کی
...ذا اٹھایا تو مزاحیہ شاعری سے طبیعت نہیں لگی، مزاح نگاری اچھی لگی اس لیے اختیار کر لی۔ بات

اچھے ڈھنگ سے کہی گئی تھی اس لیے اچھے لوگوں کے دل کو لگی۔ کچھ دنوں کو گردی لگی [illegible] ساحل کے اصرار پر کتاب چھپی تو نام رکھا گیا "لگی"۔ اہل نظر کو یہ کتاب پُراز [illegible] بدقسمتی سے بہوں کو سوکن لگی، خدا کا شکر ہے کہ اس کو کسی کی نظر نہیں لگی، اور اب دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آرہا ہے اگرچہ دیر لگی۔ یہ رسم اجراء ہمیں ناگپور والوں کی سمجھ داری لگی، اجراء عمل میں آجکا تب جا کر اصغر جمیل کی آنکھ لگی۔ مبارک ہو!

کنگن کی تعریف میں:۔ یہاں ہم ان کنگنوں کی تعریف بیان کرنے نہیں جا رہے ہیں جو خوبصورت ہاتھوں کو مزید خوبصورت بناتے ہیں۔ ہم تو اس کتاب کی بات کر رہے ہیں جس میں اصغر جمیل نے "شاعرات" کے کلام اکٹھا کیے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کنگن میں اصلی ہیرے جڑے جاتے تھے۔ اب تو صاحب! امی ٹیشن کا زمانہ ہے۔ ہیروں کی جگہ کانچ کے رنگین ٹکڑوں نے لے لی ہے۔ اصغر جمیل کو شکایت ہے کہ انہوں نے ان تمام شاعرات کو خطوط لکھے تھے جن کے پتے دستیاب ہو سکے۔ لیکن پندرہ بیس شاعرات کے کلام ہی حاصل ہوئے۔ برادر محترم کا غالباً یہ خیال ہے کہ وہ خواتین جو مشاعروں میں اپنی خوبصورت آواز، خوش نما لباس، قاتل اداؤں اور ذو معنی مکالموں کا جادو جگاتی ہیں انھیں کا نام "شاعرات" ہے۔ کلام دستیاب نہ ہونے پر تو انہیں یقین آگیا ہوگا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا اور مشاعرے پڑھنے والی ہر خاتون شاعرہ نہیں ہوتی۔ ویسے یہ کلیہ صرف خواتین کے لیے مخصوص نہیں۔ ہمارا بھروسہ تو بہت سارے مرد شاعرہ شعراء پر سے بھی اٹھ چکا ہے۔ چند گنتی کے رہ گئے ہیں جو اردو شاعری کی حقیقی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔ باقی انہیں شمعوں کی روشنی میں اپنے آپ کو چمکا رہے ہیں اور منبع نور ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ بلا سوچے سمجھے واہ واہ کیے جا رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔

حسین کون ہے یارب:۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے عجیب ہے اسے وہی قلم کار اختیار کرتا ہے جسے شہر میں اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ منظور ہو یا پھر وہ چاہتا ہو کہ اس کی ذات بابرکت کمال پر چڑھے ہوئے [illegible] کے لیے ایکسرے کی آنکھ اور خوردبین کی نظر چاہیے۔ لیکن بعض فن کار اپنی ایکسرے کی صلاحیت [illegible] تک جھانکنے لگتے ہیں اور اپنی خوردبینی نظر سے اشیاء و واقعات کو اتنا انلارج کرتے ہیں کہ [illegible] شنیدنی کو نا شنیدنی کے دائرے میں کھینچ لاتے ہیں۔ اس طرح اپنی عافیت اور عاقبت دونوں کو [illegible] بیٹھتے ہیں۔ آج تک ہم نے نہیں دیکھا کہ جس کا خاکہ لکھا گیا ہو وہ خاکہ نگار سے خوش ہو۔

پہلی بار سن رہے ہیں کہ ناگپور میں اصغر جمیل کے تحریر کردہ خاکوں کی دھوم ہے۔ دراصل خاکے دھوم مچانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ [illegible] کے لیے عموماً مشہور و ممتاز شخصیتوں کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے۔ اصغر نے بھی شہر کی مشہور ادبی اور علمی شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں۔ اسے کرشمہ ہی سمجھیے کہ وہ سارے لوگ نہ صرف خوش ہیں بلکہ دوسرے بھی اپنے خاکے [illegible] تو تسلیم کر لینا چاہیے کہ گالیاں دینے والے کے سب شہر میں ہیں۔ [illegible] اصغر جمیل اپنی [illegible] خاکہ نگاری سے کامیاب گزرے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ فیصدی نہیں ہوتا کہ ان شخصیتوں [illegible] تنگ آیا ہے یا پھر خاکوں کی وجہ سے ان معزز شخصیتوں کا قد بلند ہوا ہے اس کیفیت کو فراق گورکھپوری نے بڑے جاندار طریقے

...ے بیان کیا ہے۔ ؎

حسین کون ہے یا رب سخن کہ جانِ سخن ؛ رہے کہ بتلا کی جوانی کہ گالی داس کا فن

...ی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا :---

کہتے ہیں یہ جشن اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ اصغر جمیل کے ذریعے منعقد شدہ آل انڈیا مشاعروں کی تعداد گزشتہ ...سمبر میں پچیس ہوگئی۔ حیرت ہے۔ یہ جشن کا مقام ہے یا ماتم کی جگہ ؟ اگر فی مشاعرہ پچیس شعراء اور فی شاعر ...رہ اشعار بھی فرض کرلیے جائیں تو اصغر جمیل کی گردن پر سوا چھ سو شعراء اور نو ہزار تین سو پچھتر اشعار سنوانے ... الزام عائد ہوتا ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ناگپور میں نہیں رہتے۔ اس ہوش اڑا دینے والی تعداد ... دیکھ کر ہمیں اہلِ ناگپور کی حالت پر ترس تو آتا ہی ہے۔ ان کے صبر اور قوتِ برداشت کی تعریف بھی کرنی ...تی ہے۔ گنیز بک آف ریکارڈس میں آج تک صرف انفرادی حضرات کے نام ہی درج ہوئے ہیں۔ اس ...ر نامے پر ناگپور کی پوری اردو آبادی کا اندراج ہونا چاہیے۔ یا کم از کم ایک اجتماعی نوبل پرائز تو ملنا ہی چاہیے۔

نو ہزار سے اوپر مصیبتیں اٹھا کر جو لوگ "قاتل" کا جشن منانے اور مزید ایک مشاعرے میں سوا ...ہ سو اشعار سننے کی ہمت بھی رکھتے ہوں ان کی زندہ دلی اور ظریف طبعی کی داد مشکل سے ہی دی جا سکتی ...ہے۔ یہ جشن انصاری اصغر جمیل کی ادبی خدمات کا ہی نہیں، اہلِ ناگپور کے صبر اور قوتِ برداشت کا بھی ہونا ...چاہیے۔ اگر اسی کا نام ناگپور ہے تو ناگپور کو ہزاروں فرشی اور ایک الوداعی سلام! ■■

(جشن انصاری اصغر جمیل کے موقع پر ناگپور میں پڑھا گیا۔) ———

کوثر صدیقی (بھوپال)

عالم برزخ سے
مُلّا رموزی کا خط
دادا خیریت کے نام

"نسخۂ مکروہ"

السلام علیکم دادا خیریت! آپ تو نکلے حضرتوں کے بھی حضرت، یعنی اعلیٰ حضرت، سکندر قسمت، میں سمجھا تھا آپ کو پیکر ایمان و شرافت، رکھتا تھا آپ سے عقیدت۔ مگر سنبھالتے ہی قلمدانِ وزارت، اس کے بجائے کہ کرتے جنتا کی خدمت، شروع کر دی آپ نے جمع کرنا دولت ہی دولت۔ نووارد ین عالم برزخ میں آیا ہے آپ کا ایک سکریٹری جسے ہم کہتے ہیں مشیر، نظر آتا ہے صاحبِ تدبیر، وہ تھا آپ کا رازدار کرتا تھا گھوٹالوں کا کاروبار، آدمی تھا بڑا ہوشیار۔ اور راشی، ہوائیں بوتا تھا گھوٹالوں کے کھیت، روپیوں سے کرتا تھا آبپاشی، فصل ہوتی تھی بارہ ماسی۔ گڑبڑ، گھپلے اور گھوٹالے کرنے کے لیے اُس کے پاس ایک تھا نسخہ جو ملا تھا اُس کو بڑے منسٹر الملک سے، نام تھا اس کا "نسخۂ مکروہ"۔ مکروہ کا فل فارم ہے ... ہے میم سے موکل یعنی گاہک، کاف سے کام یعنی کام کی نوعیت، را یعنی ر سے رشوت، راشی، رقم، روپیہ کا لین دین، واو سے وعدہ کام کرنے کا، ہ سے ہوشیاری یعنی سمجھ، رازداری اور ہوشیاری سے کام کرنا۔ نسخہ استعمال کرنے کی ترکیب تھی کاف کو واو اور ہ کے ساتھ کوٹ کر شربتِ را کے ہمراہ میم کے صحتمند ہونے تک کھلائیں۔ مذکورہ مشیر جو کہ تھا مذکورہ بالا نسخہ کا حکیم میم کو نسخۂ مکروہ کھلا کر ادھر روپیوں کا کھیت بوتا تھا ادھر کاٹ کر خود بھی کھاتا تھا اور دوسروں کو کھلاتا تھا۔

عالم برزخ میں داخلہ کے موقع پر اس مشیر باتدبیر سے جب کی گئی پوچھ تاچھ قبر کے چیک پوسٹ پر اور دیکھے گئے اس کے (IMMIGRATION PAPERS) امیگریشن پیپرس، اور سختی کی منکر نکیر نے تو بیان کئے اُس نے اپنے کرتوت اور آپ کی توتِ لایموت جس کے ذریعہ آزمایا گیا نسخۂ مکروہ۔ دروغ برگردنِ راوی قصہ یوں بیان کیا گیا کہ آپ نے سنبھالتے ہی وزارت کا قلمدان طلب کیا مشیر ہمہ دان کو اور کہا کہ ہم ہیں جمنا کے کنارے اس لیے ہیں بے سہارے گنگا کے کنارے ہوتے تو ہم بھی اپنے ہاتھ دھوتے۔ مشیر نے کہا حضور عقلمند کو کافی ہے اشارا۔ آپ ہیں وزیر اور میں ہوں مشیر تو آپ کو گنگا جی میں ہاتھ دھونے کے لیے جانے کی تکلیف نہیں کرنا پڑے گی کیوں کہ جیسی گنگا ویسی جمنا۔ اور پھر گنگا میں لوگوں نے اتنے ہاتھ دھوئے کہ وہ ہو گئی میلی۔ جمنا سب سے اچھی۔ اسی میں ہاتھ دھو لیجئے۔ کہیں کی

بنٹ کہیں کا روڑا - سرکار ہے تین پاؤں کا گھوڑا۔ یہ کب سے سرپٹ دوڑا۔ آپ کر دیجئے اعلان کہ جمع ہوگیا ہے
یہوں کا بھنڈار۔ کسانوں کے پاس ہے وافر مقدار، لوگوں کی خوراک ہوگئی ہے کم۔ غلہ سنبھال نہیں پا رہے ہیں ہم۔
ر پیروں سے لے کر دو پیروں تک کے چوہے کاٹ رہے ہیں۔ گیہوں کے ورے۔ اس لیے پہلے کہ غلہ سڑ جائے اچھا
ہے کتا کے منہ پڑ جائے۔ حضور آپ دید یجئے مجھے بیس لاکھ ٹن اناج کا ایکسپورٹ آرڈر، میرے پاس ہے ایک خریدار
؛ دے رہا ہے پانچ روپیہ فی بورہ۔ کا آفر۔

جب گیہوں ہلالِ عید ہو کر جنتا کی نظر سے ہو اوجھل۔ اناج کا ہوگیا کال جنتا ہوئی بھوک سے نڈھال۔
نے لگے قائدین اور وزرائے دور اندیش و دوربین اِنَّ اللہَ مَعَ الصّابرین بشکر پروردگار کا کیجیے۔ کھا کے غم گھونٹ
بھر کے پیجیے۔ اس دیس کے لوگ امر ہیں جو بھوک سے کبھی نہیں مرتے اور مر بھی جائے تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھوک
سے مرنے کی سند عطا نہیں کرتے دیتے۔ ویسے بھی بھوک سے کوئی نہیں مرتا۔ دیکھیے سماجی کارکن بھوک ہڑتال کرتے
ہا۔ آمرن اَن شن کرتے ہیں لیکن کسی کو کیا مرتے ہوئے دیکھا۔ ہمارے دیش کے لوگ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلاتے
ہا۔ ہمارا دیش ہے مہان، لنگڑا لولا، نوجوان، دیش کا ان داتا ہے کسان دوسروں کو کھلاتے میں ہے اور شانتی۔
بھارت کا جھنڈا ہے جانتی ـــ ہمارا دیش ہے بھاگوان کہ خوب ملتا ہے دان اور انودان۔ جب گیہوں کی ہوگئی زیادہ ہائے
ے تو پھر منسٹر کو جاکر دی گئی رائے۔ منسٹر نے کہا سر آج ہی دیدیجیے ایک پریس نوٹ۔ گیہوں کی پالیسی میں نہیں ہے کھوٹ۔
ل اب گیہوں زیادہ کھاتے ہیں، بڑھ گیا ہے اسٹینڈرڈ، جوار کھاتا ہے کوئی نہ مکا، سب کو لگتا ہے گیہوں بری
ٹھا، خوب کماتے ہیں لوگ ایک کی جگہ چار چپاتی کھاتے ہیں۔ ہونے نہ دیں گے اب اندھیر، گیہوں کے امپورٹ میں اب
ہوگی نہ دیر۔ اُدھر گیہوں کھیتوں میں لہلہائے گا، اِدھر بیس لاکھ ٹن گیہوں امپورٹ ہو کے آئے گا۔ سر میرے پاس ہے
یک سوداگر جو دے رہا ہے پانچ روپے بورے کا آفر۔ دروغ برگردنِ راوی۔ بزبانِ منسٹر بقلم منکر نکیر بمقام قبر کا چیک اپ۔

□□

کے آر نارائنن، صدر جمہوریہ ہند
ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی

ریل کا ایک سفر

ہندوستانی ریل کے سفر سے بھائی چارگی ایثار و قربانی اور ضبط و تحمل کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف نیتا جو قومی یکجہتی کے بارے میں بھاشن دیتے نہیں تھکتے کیوں اس بھاگتی دوڑتی چیختی دندناتی ریل گاڑی کی تمثیل سے ہم بھارت واسیوں کے دل و دماغ کو راہ راست پر لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب ہمارے دیوی دیوتا آسمانی سفر کے لیے قسم قسم کی گاڑیاں استعمال کرتے ہوئے ہماری دھرتی پر آ کر پھر شانتی جاری رہنے کی ہدایتیں دیتے ہیں تو کیوں نہ ہم بھی ہندوستانی ریل گاڑیوں کے مسافروں کی طرح آپس میں شیر و شکر ہو کر رہنے کی قسم کھائیں۔

ریل کے ہی ڈبے میں خاص طور سے تیسرے درجے کے ڈبے میں ہمیں اپنے ملک میں ہونے والے وہ سارے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں جھگڑوں کے پہلو بہ پہلو اتحاد ہے۔ اور بدگمانی کی گود میں بیٹھی ہوئی خلوص و محبت بھی۔ ٹرین کی ان متحرک کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے ہندوستان کا دل اس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ماضی و حال کے دماغ پر چھوڑے ہوئے ان مٹ نقوش بھی ملتے ہیں۔

ریل میں سوار ہوتے وقت آپ کو اپنے دلنشین عمل ہوں گے افراتفری، بھاگ دوڑ، چیخ و پکار، زبردست کی دھکا پیل سے زیر دست کی شکست خوردگی۔ گھس پیٹ کرسی حاصل کرنے کی کوشش میں دوسروں کا دامن تار تار کرنا۔ اپنا بوجھ دوسروں کے سر لادنا۔ یہ ساری کیفیتیں دیکھنے کو ملیں گی۔ لیکن جوں ہی ریل اپنی پٹڑیوں پر چلنے لگی آپ کو محسوس ہوگا کہ اچانک سارے مسافر من و چین کی چھترچھایا میں آ گئے ہیں۔ آپس کے جھگڑے یک لخت خلوص و محبت میں بدل جائیں گے۔ خود غرضی کے بجائے بانٹ کر بیٹھا ہوا مسافر آپ کے لیے اپنی جگہ چھوڑنے تیار ہو جائے گا ایک دوسرے کی خیریت پوچھی جائے گی۔ دریافت کیا جائے گا کہ "بھیا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں"۔ ایسا معلوم ہوگا کہ سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں — ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں! — اس ڈبے میں ایسا پیار دیکھنے کو ملتا ہے کہ آدمی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید ایسے ہی کسی تیسرے درجے کے ڈبے میں روسو ROUSSEAU اور مارکس MARX نے بھی سفر کیا ہوگا۔ اور ان کے سوشلزم کا فلسفہ بھی شاید ایسے ہی سفر کی دین ہو!

ریل کے ایک سفر کا واقعہ مجھے اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ میں مدراس سے دلّی جا رہا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھے سمرسٹ ماہم کی ناول PAINTED VEIL جس کے سرورق پر اس ناول کی خوبصورت ہیروئین کی ادھ ننگی تصویر چمک رہی تھی، پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ بازو بیٹھے چاندی جیسے سفید بالوں والے پروفیسر نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"کیا میں یہ کتاب دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں - ضرور"

اور میں نے ان کے ہاتھ میں یہ کتاب دے دی۔ سمجھا تھا کہ وہ صرف کتاب یا اس کے ٹائیٹل کو دیکھ کر فوراً مجھے لوٹا دیں گے۔ مگر وہ اس کہانی میں ایسے گم ہوئے کہ انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ اس کتاب کا مالک ان کے پاس بیٹھا بے چینی سے اس کی واپسی کا منتظر ہے۔ قریب بیٹھے ہوئے مسافرین ان کی قسمت سے جل اٹھے کہ حضرت اتنی اچھی کتاب [illegible] پڑھ رہے ہیں۔ مگر مجھے ان کا ان انہماک سے مطالعہ کرنا بہت کھلا لگا۔ اور کتاب واپس لینے کی میری ہمت نہیں ہوئی۔ دو [illegible] اسٹیشن پر میں نے کوئی سستی سی ناول خرید لی اور اس کو پڑھنے لگا۔ رات کے وقت جب میں اپنے برتھ پر سونے کے لیے چڑھا تب انھوں نے شکریہ کے ساتھ میری کتاب واپس کردی۔ برتھ پر لیٹ کر میں نے اس کتاب کو پھر سے پڑھنے کی کوشش کی۔ [illegible] میرے سامنے والے برتھ پر بیٹھے ہوئے [illegible] بیان اٹھ بیٹھے۔ اور کہا کہ میں انھیں یہ کتاب کچھ گھنٹوں کے لیے مستعار دوں۔ میں اندر سے جل اٹھا۔ پھر اپنے آپ [illegible] جواب دیا۔

"جناب۔ یہ کتاب میں نے سفر میں پڑھنے کے لیے اپنے ساتھ رکھی ہے۔"

انھوں نے بڑے [illegible] لہجے [illegible] سے دریافت کیا۔

"کیا یہ کتاب آپ کی خریدی ہوئی ہے؟"

اب تو میں جیسے پھٹ پڑنے والا ہی تھا۔ مگر میرے ضمیر نے مجھے سنبھالا۔ ٹرین میں جھگڑے نہیں۔ امن و شانتی کا ماحول ہونا چاہیئے۔

"جی ہاں! یہ میری اپنی ملکیت ہے۔"

"تو جناب۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کتاب آپ مجھے دے دیں۔ اور گھر جاکر اسے اطمینان سے پڑھ لیں۔"

ان کی اس منطق نے مجھے لاجواب کر دیا۔ کتاب میں نے ان کے حوالے کر دی۔ اس امر کا اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں نے بھائی چارگی کے اصول نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے کروٹ بدل کر تمام رات گہری نیند سوتا رہا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ اس سفر کی ایک یادگار شام بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہماری ٹرین [illegible] کے قریب [illegible] روک دی گئی لیکن غصّہ میں بپھرا ہوا انجن بار بار چیختا رہا۔ اور اپنے منہ سے دھواں [illegible] رہا۔ اس سوٹے سے لمحے میں میں نے جب کھڑکی سے باہر جھانکا تو شام کا جھٹپٹا تھا۔ آسمان ارغوانی رنگ لیے کسی دلہن کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا۔ ہرے بھرے

جنگل سے تازہ ہوا کے جھونکے ہمارے ڈبے میں آ رہے تھے۔ ایسے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صحت مند خوبصورت سفید رنگ کی گائے چپ چاپ مورت بنی کھڑی ہے۔ اس کے نزدیک ہی کھڑے ہوئے ساتھی نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ گائے کے بدن کو چھوا۔ پھر اپنے نتھنے پھلا کر اس جنگل کی میٹھی میٹھی خوشبو کو لگا سونگھنے!! مجھے یوں لگا کہ اس ادھ دھ جیسی شام میں شاہ جہاں اپنے پائیں باغ میں اپنی ممتاز کے بالوں میں لگے ہوئے ادھ کھلے گلاب کو سونگھ رہے ہیں۔!

جب گاڑی آگے دوڑنے لگی تو مجھے شاعر کیٹس (KEATS) کے الفاظ یاد آئے۔

"دھرتی پر پھیلے ہوئے عشق و محبت کے افسانے کبھی نہیں مرتے ——"

جی ہاں! خصوصاً جب آپ بھاگتی، دوڑتی ریل گاڑی سے سفر کر رہے ہوں۔

(انڈین اکسپریس سے ترجمہ)

رفیع احمد (مالیگاؤں)

اِدھر اُدھر

پہلے تو اس نے دیکھا اِدھر اُدھر
جونہی اُٹھا کے پتھر مارا بھاگا اِدھر اُدھر

مل جائے مجھ کو گردشِ دوراں اگر کہیں
کر دوں رسید اس کو طمانچہ اِدھر اُدھر

مدت سے آرزو ہے کہوں اس سے حالِ دل
پاؤں اگر کہیں اُسے تنہا اِدھر اُدھر

وہ جانتے نہیں کہ غریبی ہے کیا بلا
لیڈر تو روز کھاتے ہیں ڈنر اِدھر اُدھر

بیگم سے نوک جھونک کا انجام یہ ہوا
کھاتے ہیں ہوٹلوں ہی میں کھانا اِدھر اُدھر

میں نے اُچھالی اس کی طرف جب بھی دل کی گیند
اس نے لگایا چوکا یا چھکا اِدھر اُدھر

جب سے رفیع پڑھنے لگے ہیں مشاعرہ
ہونے لگا ہے ان کا بھی چرچا اِدھر اُدھر

ازؔ : احمد کلیم فیض پوری
(مہاراشٹر)

گورکھ دھندہ

سیدِ نظرؔ برنی کا شمار ملک کے اُن گِنے چُنے
سکاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شگفتہ تحریروں
سنجیدہ طنز و مزاح کے وسیلہ سے قارئین ادب کے
ں بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں
ماجی و معاشرتی کیفیتوں کا کڑوا کسیلا رنگ جھلکتا
ہے وہیں سیاسی شعبدہ بازوں اور "لال فیتہ شاہوں"
کے چہروں کی سیاہی صاف دکھائی دیتی ہے۔ آج جس
ل سے گھری یہ زندگی ہے اس سے پہلے کبھی ایسی
ں تھی۔ ایک گرد، ایک تعفن ہمارے چاروں طرف
پھیلا ہوا ہے۔ نظرؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ زندگی کی
ی گرد اور تعفن کو دور کرنے کی دیانت دارانہ کوشش
کی ہے۔

آج کی کھنچی کھنچی چنگھاڑتی زندگی نے بچوں تک کو
سنجیدگی بخش دی ہے۔ یہ ناہموار زندگی جینے کے عادی
انسان اپنے اطراف کی تمام لطافتوں سے یکسر محروم ہوتے
جارہے ہیں۔ ایک برس کے تین سو پینسٹھ دنوں میں وہ
لمحات نصیب کے ہوتے ہیں جو ایک تبسم زیرِ لب سے
اپنے مشامِ جاں کو معطر کرسکیں۔ ایسی صورت میں مزاح
کے صرف ایک شعر ہی کو وہ اعزاز حاصل ہے کہ تھکے

مصنف :۔ سیّد نظرؔ برنی
اشاعت :۔ ڈسمبر ۱۹۹۶ء
ناشر :۔ ادبی سنگم، مجیب باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت :۔ ۸۰ روپے۔

ماندے چہروں کو مسکان کی کہکشاں عطا کردے اور
سوہانِ روح بنے لمحات کا بوجھ ہلکا کردے۔ نظرؔ کی
پوری شاعری "من بہشتی" کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔
"پھوہڑپن" ان کی روش کبھی نہیں رہی۔ مزاح کے معیار
کو برقرار رکھتے ہوئے سماجی سیاسی معاشرتی اور مذہبی
ناسوروں کا منہ احتیاط کے ساتھ کھولنا نظرؔ کے طرزِ
نگارش کا خاصہ رہا ہے۔

نظرؔ برنی اس سے پہلے اردو دنیا کو "پیچ" اور "کفگیر" دے
چکے ہیں۔ جس طرح مریض کی حالت کے پیشِ نظر طبیب اپنی
تجویز کردہ "دوائی" کا "ڈوز" بڑھاتا ہے اسی طرح
حکیمانہ طور پر یہی کام نظرؔ نے انجام دیا ہے۔ سرگردان
سی پریشان زندگی کے اضمحلال کو دور کرنے کی غرض
سے چمچوں، چمچوں، چلنے کی بجائے کفگیر کا استعمال کیا ہے
تاکہ ناساعد حالات کی ایسی کوئی کھرچن باقی نہ رہ جائے
جس پر حیات کے دسترخوان کی بدنمائی کا الزام عاید
ہوسکے۔

ہے کون سا وہ کام جو یہ کر نہیں سکتے؟
ارکانِ حکومت ہیں یہ سرکار کے چمچے

چھنتے ہی وزارت کے بدلا جاتی ہیں نظریں
ہر صاحب کرسی کے وفادار ہیں چمچے

مزاح نگاروں میں کم ہی ایسے ہیں جنھوں نے اساتذہ کے کلام کی بہ رنگِ ظرافت پیروڈی کی ہو، یہ کام ناممکن نہیں تو اتنا سہل تر بھی نہیں ہے۔
چند نمونے پیش ہیں:

کب تک رہوں گا "باس" میں ادنیٰ سے اس گریڈ میں؟
"میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر"
(اقبالؔ)

"قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم"
چلا ہے جس پہ "بلڈوزر" وہ میرا ہی مکاں کیوں ہو
(غالبؔ)

اپنی اولاد کو نہ جھڑکو تم
"آج وہ کل تمہاری باری ہے" (امیر حسن)

"تم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے"
بیگموں کے سبھی اسیر ہوئے (میر تقی میر)

لیکچرر ہم کسی طرح نہ ہوئے
"ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا" (مومن)

نظر کا قلم بے باک ہے اور جہاں کہیں بھی ان کو ناہمواری دکھائی دیتی ہے اسے وہ قلم بند کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ کرپشن، خوشامد، نقالی، تصنع، غیبت، منافقت، زن مریدی اور جھوٹی شان وغیرہ ایسے سماجی اور عام زندگی کے مختلف موضوعات ہیں جن کو نظر برنی نے اپنے تیر دل کا نشانہ بنایا ہے

کھاکھاکے روز مرغ پلاؤ رہتے ہیں ہردم
لگتا ہے میرا لڑکا بھی ابا پہ جا گیا

وہی شیخ پیتا ہے چھپ کے کی بوتل
جسے ہر کوئی "پارسا" جانتا ہے

رشوت سے یارانہ کرتے "ڈاکٹر" تم سے خوش ہوجاتا
خود کھاتے اوروں کو کھلاتے ملتے جلتے آتے جاتے

زیر نظر کتاب نظر برنی کے ۵۶ قطعات اور ۵۲ نظموں پر مشتمل ہے۔ جن میں شاعر نے پوری دل سوزی کے ساتھ آسمانِ ظرافت پر مزاح کے ہفت رنگ سجائے ہیں۔ احمد جمال پاشاہ اور پروفیسر قمر رئیس کے تبصرے شامل ہیں۔ جن کے ذریعہ نظر کی شخصیت اور فن کا آئینہ روبرو رکھدیا گیا ہے۔ نفیس کاغذ، عمدہ لکھائی اور دیدہ زیب چھپائی نے اس کتاب کا حسن دو بالا کردیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں "گورکھ دھندہ" کی خوب پذیرائی ہوگی۔ ●●

دے ے کے خط (مراسلے)

مکرمی آداب عرض

شگوفہ بابت ستمبر ۱۹۹۷ء ۲۵ سالہ نثری انتخاب نمبر ملا۔ بہت دلچسپ ہے بطور خاص خامہ بگوش کا مضمون۔

میرے تین بچے ہیں، تینوں ملک سے باہر۔ ان میں سے دو امریکہ میں ہیں۔ ان کے اصرار پر میں نے اور اہلیہ نے دسمبر ۹۷ء کے تیسرے ہفتے میں مستقلاً امریکہ منتقل ہونے کا پروگرام بنالیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اب مجھے شگوفہ بھیجنے کا کرم نہ کریں اب تک آپ مجھے جس طرح نوازتے رہے ہیں۔ اس کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔

مخلص، گیان چند، لکھنؤ

شگوفہ کا تازہ شمارہ (اکتوبر ۹۷ء) دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ خوبصورت ٹائٹل اور معیاری مضامین پڑھ کر بے ساختہ آپ کو داد دینے کو جی چاہا۔ مبارک باد قبول فرمایئے دل چاہتا ہے کہ شگوفہ کا ہر شمارہ ایسا ہی عمدہ اور نفیس ہو۔

اس شمارے کے مضامین خصوصاً، واجد ندیم، شکاگو کا مضمون "امریکہ کی دریافت"، یوسف امتیاز، ٹورانٹو، کینیڈا کا مضمون "قصہ سوٹ کا" اور سید ضمیر جعفری کا رپورتاژ "شکاگو میں حیدرآباد۔ دکن" کو پڑھ کر میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ہر ایک خصوصی شمارہ امریکہ نمبر شائع ہو۔

شجاع الدین غوری (جدہ)

ڈیئر کمال بھائی، سلام علیکم

شگوفہ کا پچیس سالہ نثری انتخاب پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ کیسے دیکھتے دیکھتے وقت گزر جاتا ہے۔ "شگوفہ" ہم ان دنوں پڑھتے تھے جب وہ لڑکپن سے بالغ ہونے چلا تھا۔ آج شگوفہ ایک ہٹا کٹا نوجوان ہو چلا ہے۔ اس شمارہ کی ہتھیلی میں ایک کے بعد ایک اچھی یادیں دیکھنے کو ملیں۔ اور شعیب صاحب نے کئی یادگار ہستیوں کو بڑی خوبی سے ان کے قلم کے ذریعہ ہم تک پہنچایا۔ خدا سے دعا ہے کہ اگلے پچاس سال تک یوں ہی شگوفے کھلتے رہیں اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اسی خوبی سے ان کی باغبانی کرتے رہیں۔ آپ کا

علی خواجہ، بنگلور (خط رومن رسم خط میں)

مکرمی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب!

السلام علیکم! اردو زبان کے ایک دلدادہ کی حیثیت سے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ رسالہ شگوفہ روانہ کرنے کے لیے۔ خاص طور سے میرے ہمعصر اور ہم جماعت ڈاکٹر عابد معز صاحب کا مشکور ہوں کہ انہیں کے تعلقات اور اثر کی وجہ سے اس غیر ملک یا اجنبی ملک میں رہتے ہوئے بھی جہاں اردو کی حیثیت ایک "مرتی زبان" جیسی ہے میرا لگاؤ اس زبان سے ابھی تک برقرار ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔

ماہنامہ شگوفہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اردو زبان کو قائم رکھنے اور پروان چڑھانے کی آپ لوگوں کی یہ کوششیں قابلِ ہمت افزائی اور قابلِ مبارکباد ہیں۔ دعا ہے کہ شگوفہ اسی طرح دنیا کے ہر کونے میں شگوفے کھلاتا رہے۔

(ڈاکٹر) ابوالفضل سید علی
اوکی چوبی، امریکہ

شگوفہ کا نثری انتخاب میں بعض اہم نام چھوٹ گئے ہیں پھر بھی یہ انتخاب لائق ستائش ہے۔ ادب کی ان تحریروں کو محفوظ رکھنے کی سعی آپ نے کی ہے اور مہمان مدیر بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ واقعی آپ سب بڑے دل و جگر کے مالک ہیں۔ خواہ اردو غزل کے عاشق کا سینہ چیرنے کے بعد خون نکلے یا نہ نکلے مگر آپ لوگوں کے ہاں تو وہ سرمایہ ہے جو اردو ادب کی مزاحیہ تحریروں کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

حمایمہ فردوس، بنگلور

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب، سلام مسنون!

شگوفہ کا تازہ شمارہ ملا۔ غزل کی اشاعت کا شکریہ۔ مقطع میں کیوں کی بجائے یوں شائع ہوگیا۔

محبوب اپنی اردو کی نازک بہت ہے شاخ، کیوں آشیانہ اس پہ بنایا نہ کیجئے

محبوب مانجھوی، بلاسپور

Vol.30 Copy :12

HYDERABAD
Ph : 595716

December 1997